ہوائے چمن میں
خیمۂ گل
(کلیاتِ ناول)
مصنّفہ
نذر سجّاد حیدر
مرتّبہ
قرۃ العین حیدر
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

بسلسلہ بازیافت پبلی کیشنز

ہوائے چمن میں خیمۂ گل

ہوائے چمن میں خیمۂ گل

(کلیات)

☆ اختر النساء بیگم ☆ حرماں نصیب ☆ آہِ مظلوماں
☆ جاں باز ☆ ثریا ☆ نجمہ ☆ مذہب اور عشق

مصنفہ: نذر سجاد حیدر

مرتبہ: قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

HAWA-E-CHAMAN MEIN KHEMA-E-GUL

(Kulliyat)

by

Nazar Sajjad Hyder

Edited by

Qurratul-ain-Hyder

Year of 1st Edition 2004
ISBN 81-8223-036-5

Price Rs. 700/-

نام کتاب	ہوائے چمن میں خیمۂ گل
مصنفہ	نذر سجاد حیدر
مرتبہ	قرۃ العین حیدر
سنِ اشاعت اوّل	۲۰۰۴ء
قیمت	۷۰۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540
E-mail : ephdelhi@yahoo.com

فہرست

دیباچہ

نذر سجاد حیدر کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے ان کے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کا ایک مختصر جائزہ لینا نامناسب نہ ہوگا۔

آزادی سے قبل ہمارے سیاستدانوں، ادیبوں اور شاعروں نے قوم پرستی کے جوش میں ماضی کو بہت ہی زریں حروف میں اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اصلیت غالباً یہ تھی کہ دولت اور اقتدار محض بالائی طبقے تک محدود تھا۔ بادشاہوں اور راجاؤں کی شخصی حکومت کے ادوار میں ایک عام آدمی اور امراء کی زندگیوں میں اکثر بہت نمایاں کا فرق رہا ہوگا۔ قلعے یا گڑھی میں سلطان اور راجا اور اس کے لواحقین رہتے تھے عموماً آس پاس کے کچے مکانوں اور جھونپڑیوں میں پرجا اپنی زندگی گزارتی تھی دورِ حاضر کے رامپور میں شاہی خاندان کے علاوہ باقی رعایا کو پکّے مکانوں میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ میں نے خود رامپور میں دیکھا ہے۔ سن ۱۹۸۰ء میں وہاں گئی تھی تو متوسط طبقے کے لوگ کچے مکانوں میں رہائش پذیر تھے۔ ہمارے نوابوں اور جاگیرداروں کے اس تکبر اور نخوت کا اندازہ آج لگائے تو حیرت ہوتی ہے اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلی صدیوں میں امیر غریب کا یہ فرق کس قدر بھیانک رہا ہوگا۔ جبکہ مڈل کلاس وجود میں نہیں آئی تھی۔ مسلمانوں میں نواب اور دور حاشیہ بردار اور اس کے ہم پلّہ۔ ہندو راجا اور ان کی پرجا۔ لیکن یہ محکوم آبادی مخلوط یعنی ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں پر مشتمل تھی۔ رولینگ کلاس مسلمانوں کی تھی۔ لہٰذا ان کو بالادستی حاصل تھی۔ میں نے ایک سترہویں صدی کی مغل مینا طوری تصویر ''ویکلی'' میں شائع کی تھی۔ جس میں ایک مولوی صاحب چند مسلمان لڑکیوں کو پڑھا رہے ہیں۔ وہ لڑکیاں قالین پر بیٹھی ہیں۔ ان ہی طالبات میں ایک ہندو لڑکی جس کے ماتھے پر بندی ہے اور لہنگے میں ملبوس۔ جو قالین سے

ہٹ کر گویا ٹاٹ باہر فرش پر بیٹھی ہے۔

لیکن زیادہ تر تفریق مذہب کے بجائے سماجی مراتب پر منحصر تھی۔ بیگمات اور رانیاں، شہزادیاں اور راجکماریاں ایک طبقے میں شامل تھیں۔ کنیزوں اور داسیوں کا رتبہ یکساں تھا۔ امیر گھرانوں کی لڑکیاں جب بیاہ کے سسرال جاتی تھیں تو ان کے ساتھ ان کی کنیزوں یا داسیوں کو بھی بھیجا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ایک مضمون "بارہ آنے اور ڈلیا بھر کودوں" میں لکھا ہے کہ زمانے حال تک اودھ کے چند قصبات میں بارہ آنے اور ڈلیا بھر کودوں کے بدلے میں ایک کنیز فروخت کی جاتی تھی اور یہ چشم دید حالات مجھے میرے ایک کزن کی بیوی نے بتلائے جو خود ایسے ہی کنیزیں خریدنے والے ایک طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اور اب امریکہ میں مقیم ہیں۔

اب اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پانچ چھ سو سال تک بلکہ اگر آپ سلطان رضیہ کے زمانے سے شروع کریں تو تقریباً ایک ہزار سال تک اس محکومی کے اثرات اکثریتی فرقے پر کس طرح مرتب ہوئے ہونگے لیکن یہ محکومی بھی مذہب کے بجائے کلاس سسٹم کی دین تھی۔ ہندوستانی ریاستوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ سابق نواب کی ہندو رعایا بھی عموماً تہہ دل سے اس کو اپنا راجا مانتی تھی اور ہندو راجا کی مسلمان رعیت اپنے راجا کی بے حد وفادار تھی۔ یہ وفاداری فیوڈل سسٹم کی اساس اور بنیاد تھی۔ جب کہ اس وفاداری کا حصار ٹوٹنے لگا تو یہ کلاس سسٹم بھی منتشر ہو گئی۔ انگریزوں نے اپنے دور میں ان راجاؤں اور نوابوں کو اپنا فرزندِ دلبند پکارا کیونکہ ان کی بالادستی میں اس طبقے کا تعاون بھی شامل تھا۔ ایسے احساسات اکثریت کی اجتماعی سائیکی پر تہذیب و تمدن میں شامل ہو گئے اور کہیں کہیں پر خود انہوں نے کاسٹ سسٹم کے زیرِ اثر اشراف اور ازدال کی تفریق قائم کرلی اور ان کی حکومت بھی وتی ہی ضابر یا روادار تھی جتنی اس دور کے دوسرے ممالک کی حکومتیں رہی ہونگیں۔ سونے پہ سہاگہ سیّد، مغل، پٹھان اور شیخ کے نسلی تفاخر یا امتیاز کا بھی زور رہا۔ قرونِ وسطیٰ کے انگلستان اور یورپ میں آبائی پیشوں کے لحاظ سے کنبے جانے جاتے تھے۔ کارٹر، ویلر، بٹلر، کوک، ٹیلر۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یہ ضروری نہ رہا کہ ٹیلر کا بیٹا درزی ہی رہے۔ اور کوک کی آئندہ نسلیں بھی باورچی گری کریں۔ کسی ٹیلر کی کنبے کی اولاد میں

برطانوی کابینہ وزیر نمودار ہوئے۔ کسی کوک یعنی باورچی کی اگلی پیڑھیوں نے جہازوں کے ذریعے دنیا کے سمندروں پر حکمرانی کی۔ اس کی ایک وجہ عالی ہمتی، اعلیٰ تعلیم اور ایک عالمگیر سلطنت یعنی برٹش امپائر پر ان کی حکومت جتنے زیادہ سے زیادہ فراہم کرسکتی تھی۔ اس کا انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ ہماری اپنی بے توجہی کا یہ عالم تھا کہ سات سو برس تک آل عثمان نے آدھے یورپ پر حکمرانی کی لیکن یورپین احیائے علوم کے دور میں ان کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا۔ البتہ عیاشی اور تن آسانی کی علامت کے طور پر دیوان یعنی تخت، گاؤ تکیہ۔ وہ اپنی نشانی چھوڑ گئے۔ "ایلس اِن ونڈرلینڈ" (۱۸۵۶) میں ایک کیڑا ترکی ٹوپی اوڑھے حقہ پیتا دکھایا گیا ہے۔ "ایلس اِن ونڈرلینڈ کو اگر Allegory سمجھا جائے تو یہ کیڑا انیسویں صدی کی عالمگیر اسلامی برادری کا ایک نمائندہ تھا۔ دولتِ عثمانیہ میں جدید علوم کی یونیورسٹیاں کیوں نہ قائم ہوئیں۔ مسیحی یورپ کے طالب علم آکسفورڈ، کیمبرج اور سوربون جانے کے علاوہ قسطنطنیہ، قاہرہ اور تہران بھی آتے۔ مسلمانوں کے یہاں عیش پرستی اور تن آسانی کی عادتیں اموی اور عباسی خلفہ کے ادوار سے ہی اجاگر ہوگئی تھیں جب شاہان ایران کا نادر ہیرے جواہرات سے مزین قالین مالِ غنیمت میں حاصل ہوا اور اسے حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے بچھایا گیا تو فاروق اعظم نے بہ چشم پرنم فرمایا کہ مجھے اس قالین میں امتِ رسول کی تباہی نظر آرہی ہے۔

تو کیا مسلمان بادیہ پیما ہی کیا کرتے اور چٹائیوں پر بیٹھے رہتے؟ دنیا کی اور قومیں تو سیاسی اقتدار اور دولت حاصل کرنے کے بعد ایسی ناعاقبت اندیش کیوں نہ ثابت ہوئیں۔ انگریزوں نے آدھی دنیا پر اپنا پرچم لہرایا مگر اس طرح غفلت کا شکار نہیں ہوئے، اور جتنی سختی سے اسلام میں شراب نوشی کی ممانعت کی گئی تھی۔ ہمارے مسلمان بھائیوں نے انگور کی بیٹی سے وتنی ہی الفت ظاہر کی۔ قلال بھی عام طور پر مسلمان ہی تھے۔ مئے ناب پارسی اردو شاعری کا محبوب ترین استعارہ ہے۔

لیکن ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ شراب نوشی ہماری سوسائٹی میں اور مسلم سماج میں انتہائی معیوب عادت سمجھی جاتی تھی اور بہت ہی کم افراد اس کے شائق تھے۔ اب ایسا نہیں رہا۔ فیشنیبل طبقے کے مسلمانوں کے یہاں بھی کاک ٹیل پارٹی بھی ایک عام چیز ہے۔

اب اکثر خواتین بھی مے نوشی سے اجتناب نہیں کرتیں۔ مشرق وسطیٰ میں مسلمان خواتین کی شراب نوشی ایک عام نظارہ ہے۔ میں پہلے کہیں لکھ چکی ہوں کہ جب شاہِ ایران نے شہبانوئے فرح پہلوی کے سماجی خدمات کے متعلق ایک کتاب لکھنے کے لئے تہران مطلوب کیا تھا تو وہاں شہبانو کی محفلوں میں خوب خوب جام پہ جام لنڈھائے جاتے تھے۔ اور میرے لیے پہلے سے بتلا دیا جاتا تھا کہ "خانم خارجی راسخ العقیدہ است"۔ انہیں جام پیش نہ کیا جائے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک شام کاخ نیاوران کی ایسی ہی ایک پارٹی میں جو اس قصر کے جنت نظیر باغ میں منعقد کی گئی تھی اور یہ ایک لیڈیز پارٹی تھی اس میں ساری شہزادیاں اور ایران کے اعلیٰ ترین طبقے کی خانمیں مار جام پہ جام لنڈھا رہی تھیں اور میں ایک سنسان کمرے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اور شہبانو کی ایک لیڈی اِن ویٹنگ نے جو کسی سینئر وزیر کی بیوی تھیں مجھے لا کر قہوے کی پیالی اور خشک میوے کی پلیٹ پیش کر دی، اور میں وہاں بیٹھی پستہ و بادام سے شغل کرتی یہ سوچ رہی تھی کہ مسلمان کے پاس جب دولت آتی ہے تو وہ محض عیش و عشرت میں کیوں پڑ جاتا ہے اور تبھی مجھے خیال آیا کہ جب میں بہت بچپن میں والدین اور الّن ماموں کے ہمراہ عراق و ایران کے سفر سے واپس آئی تھی تو ہمارے منجھلے چچا جان سید نصیر الدین حیدر نے ایک Jingle بنایا تھا جو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں وہ کچھ اس طرح تھا۔

بی بی جان سنئے ذری۔ تن کی بھری اور جتنے کیا۔

اس برس ایران میں رہ آئی ہوں دلشاد
ہیں بُوا مغلانی کی سب باتیں مجھے یاد

دال نہ خورم بھات نہ خورم حلوہ خورم تر
پستہ و بدام خورم اور جتنے کیا

اس وقت تہران میں صاف پانی کا انتظام نہیں تھا۔ محض اتنا یاد ہے کہ ایک ایرانی خانم سر پہ رومال باندھے زینے پر آ کر آواز دیتی تھی آبِ طاہر۔ آبِ طاہر۔ لیکن اہل ایران کی قوم پرستی کو قدیم ہمعصر بیرونی مورخین نے محسوس کی تھی۔ خود ہمارے زمانے میں تہران جیسے پسماندہ شہر کو وہ پیرس سے کم نہ گردانتے تھے۔ میں شہبانو کے ہمراہ ان کے چھوٹے کمانڈر نامی طیارہ میں تہران سے اصفہان جا رہی تھی۔ نیچے بنجر زمین پر جگہ جگہ گڑھے سے

بنے ہوئے تھے۔ جسے دوربین سے چاند کی سطح پر نظر آتے ہیں۔ خاصہ ویران اور بدنما علاقہ تھا لیکن شہبانو دریچے میں سے اسے دیکھتے ہوئے بہت مسرور انداز میں بولیں دیکھو کتنا خوبصورت اور دلفریب لینڈ اسکیپ ہے میں نے سوچا اصل وطن پرستی اسے کہتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے یہاں کے ایک سے ایک حسین اور نظر فریب مناظر کی پرواہ نہیں کرتے۔

ان کے یہاں ایک چھوٹی سی ندی ہے جو ایرانی تلفظ میں زاینده رود کہلاتی ہے وہ حد سے حد ہماری گومتی کے برابر رہی ہوگی مگر اس کی کیا دھوم مچ رہی تھی۔ شہنشاہ آریہ مہر اس پر بنے ایک نئے ڈیم کا افتتاح کرنے تشریف لے گئے۔ اس پارٹی میں میں بھی شامل تھی۔ ایک ایرانی درباری نے مجھ سے پوچھا آپ کے یہاں ایسے عظیم دریا ہیں۔؟ مجھے یاد آیا ایک خاتون نے عرصہ ہوا شاید ''تہذیب نسواں'' میں ایک مضمون لکھا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل کا واقعہ ہے کہ انگلستان میں جب ان کی ٹرین وہاں کے بلند ترین پہاڑ Benevis کے قریب سے گذری جو کسی عام ہندوستانی پہاڑی سے اونچا نہیں تھا تو ایک انگریز ہم سفر نے پوچھا تمہارے یہاں اتنے اونچے پہاڑ ہیں۔؟ تو انہوں نے مجبوراً کوہ ہمالہ کی بلندی کا ذکر کیا تو وہ اسے مبالغہ سمجھیں اور مسکرا کر بولیں تمہیں اپنے وطن سے بڑی محبت معلوم ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء ہماری تاریخ کا عظیم ترین واٹرشیڈ ہے۔ اس ہنگامے سے بہت قبل ہندوستانی سوسائٹی کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ مجھے سترہویں صدی کی ایک پینٹنگ ہمیشہ یاد آتی ہے۔ ٹوپیوں میں پر لگائے بانکے یوروپین شہسوار ایک جنگل میں کسی مسلمان درویش کی کوٹیا کے سامنے سے گذر رہے ہیں مجھے یہ تصویر بڑی علامتی سی معلوم ہوئی۔ یوروپین جہاں بانی کرتے یہاں تک آپہنچے اور ہمارا آدمی گویا اس کام سے ریٹائر ہو کر اپنے حجرے میں جا بیٹھا۔ اس وقت تک آدھا یورپ ترکوں کے زیر نگیں تھا لیکن انہوں نے دور جدید کے تقاضوں سے مطابقت نہیں کی۔ روسی توپوں کے مقابلے میں ہمارے ترک جانباز دس دس گز کی گھیر کی شلواریں پہنے اپنی توپنے گھسیٹتے تھے۔ اسلامی دنیا کی آدھی آبادی یعنی عورتیں حرم سرا میں مقید تھیں اور یوروپین ادب میں ان کا اگر کہیں تذکرہ آتا تھا تو ایک نقاب پوش حور یا زر خرید کنیز کی صورت میں مشرقی عیاشی کی ایک سمبل کے طور پر وہ پیش کی جاتی تھیں۔ سر سے پاؤں تک برقع میں ملفوف زنانِ مشرق اہل مغرب کے لئے ایک عجوبۂ روزگار شئے ثابت ہوئی۔ اور

انہوں نے "سحر انگیز" مشرق کے اسرار نے بے پناہ اضافہ کیا۔ اپنے بچپن میں میں نے خود ڈولی اور پینس یا پالکی کی سواری بہت کی ہے۔ لکھنؤ میں والدہ جب کسی عزیز سے ملنے یا مجالسِ محرم کے لئے اندرون شہر جاتی تھیں تو موٹر کار باہر سڑک پر روک دی جاتی۔ ڈولیاں اٹھائے کہار لپکتے اور ہم لوگ ان کی ڈولیوں میں بیٹھ کر محلے کے اندر پیچ دار گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک ڈیوڑھی پر پہنچتے اور کہار آواز لگاتے سواری اتروا لیجیے۔ ادب اور تہذیب کا یہ عالم تھا کہ شاگرد پیشہ بھی ایک دوسرے کو آپ۔ جناب سے مخاطب کرتے تھے۔ انیسویں صدی کا لکھنؤ اعلیٰ ترین نفاست کے معاملے میں آٹھارہویں صدی کے فرانس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ان کی تہذیب ایران کی دین تھی اور ایران قدیم ترین زمانوں سے مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ میں اپنی برتر تہذیب اور نفاست کے لئے مشہور رہا تھا۔ ایک عام ایرانی آج بھی اپنی انتہائی پر تکلف اور شائستہ طور طریق کے لئے الگ سے پہچان لیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار تہران میں دربار شاہی کے ایک افسر کسی کام سے میرے پاس آئے اس وقت میری بھابی کی چھوٹی بہن اور بہنوئی مصطفیٰ جعفری بھی وہاں موجود تھے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے ان صاحب سے کہا آپ کھانا ہمارے ساتھ ہی نوش کر لیجیے۔ وہ تیار ہو گئے۔ کھانے کے بعد جب وہ چلے گئے تو مصطفیٰ جعفری نے کہا۔ یہ شخص یقیناً ترک تھا کوئی اصلی نسل ایرانی اگر آپ زمین کھود کر اسے گاڑ بھی دیتیں تو وہ مارے تکلف کے کھانا کھانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ اودھ کے ایرانی نژاد بادشاہوں اور ان کے متوسلین کی رائج کی ہوئی پر تکلف تہذیب آج بھی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی خالص لکھنوی فرد آپ کی کوئی بات بری لگی تو وہ برملا اس کا ہرگز اظہار نہیں کرے گا۔ خالص اور کلاسیکل لکھنوی تہذیب کی ایک مثالی نمائندہ ہماری عزیزہ بانو داراب وفا بھی ہیں۔ اور ان کی طرح کی ابھی بہت سی خواتین و حضرات لکھنؤ شہر میں موجود ہیں۔ پرانی دہلی اس لحاظ سے بہت بدقسمت رہی۔ یعنی پرانا لکھنؤ ماشاء اللہ صحیح و سالم باقی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے تباہی میں پرانی دہلی کے زیادہ تر خاندان ہجرت کر گئے ان ہی میں سے ایک کنبہ شمس العلما مولانا ذکاء اللہ کا تھا جن کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ (سابق ناظم دارالترجمہ حیدر آباد دکن) تھے انہوں نے اپنے احاطے میں نہایت خوبصورت Zoo بنا رکھا تھا۔ چھوٹے بھائی رضاء اللہ۔ دونوں

بھائی دہرہ دون میں رہتے تھے۔ چچا رضا اللہ کی بیگم ہماری والدہ کی ہی طرح کی ایک پانیئر خاتون تھیں۔ ان کا آبائی مکان پرانی دہلی میں تھا۔ مجھے محلّے کا نام یاد نہیں۔ یہ ایک وضع قدیم کی وسیع اور کشادہ حویلی تھی۔ غالباً عہد مغلیہ کے ڈمسٹک آرکیٹچر میں زیادہ تنوع موجود نہیں تھا۔ قدامت پسندی اس کی ایک وجہ تھی۔ ان تمام مکانوں کا ایک ہی پلان تھا۔ کمرے چوکور کے بجائے طویل ہوتے تھے۔ ان میں ایک قطار میں چار یا چھ دروازے جو بیرونی دلان میں کھلتے تھے۔ یہ پچھلا کمرہ دردلان کہلاتا تھا۔ اس عقبی دیوار کے پیچھے عموماً گلی ہوتی تھی صحن میں اگر مکان بڑا ہو تو ایک کونے میں باورچی کھانہ اور دوسرے میں بیت الخلا۔ اس طرح حفظان صحت کا خیال شاید زیادہ نہیں رکھا جاتا تھا یہ ایک قابل ذکر اور دلچسپ بات ہے کہ پنجاب کے مکانوں میں بیت الخلاء چھت کے اوپر ہوتا تھا۔

ہمارے امیر سے امیر گھرانوں میں بھی باورچی کھانوں کی عموماً دیواریں دھنوئیں سے کالی ہوتی تھیں۔ ایک مثل مشہور تھی۔ پکانے کی جگہ ہندوؤں کی اچھی۔ کھانے کی جگہ انگریزوں کی اچھی کھانا مسلمانوں کا اچھا۔ کشادہ صحنوں میں انار یا لیمو کا درخت ضرور ہوتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے گھروں کے نقشے میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ البتہ ہندو مکانوں میں ایک چوکور گملے کے اندر تلسی کا پودا لازمی تھا۔ جس کے نیچے گھر کی بہو شام کے وقت چراغ روشن کرتی تھی۔ ہندوؤں کے مکانوں میں کمرے عموماً بہت چھوٹے ہوتے تھے وہاں تنگی کا احساس غالب رہتا تھا جبکہ مسلمانوں کے مکانوں میں وسعت اور کشادگی نظر آتی تھی ہندو مکانوں میں حفاظت کے خیال سے سلاخوں دار کھڑکیاں اور بعض مکانوں میں صحن کے اوپر سلاخوں کی چھت بھی ہوتی تھی کیونکہ عموماً وہ اپنی روپیہ سونا چاندی اور گہنے گھر ہی میں رکھتے تھے۔ مسلمان بھائی عموماً اتنا مالدار نہیں تھا بقول شخصے چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا تھا۔ اور اچھے سے اچھا کھانا کھانے کا شوقین تھا۔ لہٰذا کم مایہ گھرانوں کی عورتیں بھی بہترین کھانا پکانا جانتی تھیں۔ اس لحاظ سے مغلیہ تہذیب چینی اور فرانسیسی تمدن کی ہم پلہ تھی دسترخوان، طرز رہائش، ملبوسات زیورات میں نت نئی نفاستیں اختراع کرنا مسلمانوں کا مرغوب مشغلہ رہا۔ مسلمان باورچیوں کے لئے مثل مشہور تھی کہ وہ دو پیسے کی دال پر اشرفی کا بگھار لگاتے ہیں یعنی ان کی بگھار لے لوازمات انتہائی بیش قیمت ہوتے تھے۔

مظلیہ دستر خوان میں ایران وتوران، عربستان سے لے کر چین وماچین تک کے کھانے شامل تھے ہندوستانی مصالحوں نے ان کھانوں میں چار چاند لگائے تھے ورنہ ایران وغیرہ کے کھانے خاصے پھیکے سیٹھے ہوتے ہیں۔ مرچیں ندارد۔ انگریز اپنے ابلے اور سیٹھے کھانوں کے لئے مشہور ہیں۔ لیکن مشرق پر تسلط جمانے کے بعد انہیں یہاں کے انواع واقسام کے پکوان کی عادت پڑ گئی۔ اور رفتہ رفتہ ہندوستان اور انگریزی ملے جلے دستر خوان کا رواج ہوا۔ دوسو سال ہندوستان میں رہ کر انہوں نے اپنے کھانوں میں بہت سے ہندوستانی مصالحے شامل کیے۔ کباب کے علاوہ Pilaf کے نام سے ان کے مینو میں شامل ہوا اور Curry بھی بہت مقبول ہوئی۔ چنانچہ اب نوبت یہ آئی ہے کہ انگلستان میں بے شمار ہندوستانی ریسٹران کھل گئے ہیں جہاں انگریز نہایت رغبت سے پلاؤ قورمہ اڑاتا ہے اب انگریز بھی چٹورا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف حفظان صحت کے چکر میں بہت سے فرنگی سبزی خور بن چکے ہیں۔ ہندوستان میں بے شمار ہندو اب Vegetarian نہیں رہا۔ کاستھ پہلے بھی ماس کھاتے تھے کشمیری پنڈت ہمیشہ سے گوشت خور رہا ہے عام طور پر ہندو گھرانوں میں مرد Non-vegetarian ہوتے ہیں اور عورتیں اپنے قدیم مسلک کی پابندی کرتی ہیں۔

ہندوستان ایک عجیب وغریب ملک ہے جہاں قدم قدم پر کھانا پینا بھی ایک متنازعہ فی مسئلہ بن چکا ہے۔ پہلے ہمارے بزرگ جیو اور جینے دو مسلک پر کاربند رہے۔ چنانچہ جو لوگ چند ہزار کی تعداد میں شمال میں درۂ خیبر کے راستے آئے تھے۔ یا جنوبی ساحلوں پر ان کے جہاز لنگر انداز ہوئے تھے وہ رفتہ رفتہ ایک ہزار سال میں بیس کروڑ ہو گئے لیکن مقامی اسّی کروڑ کی آبادی میں اس کا تناسب پھر بھی ۱۴ سے ۲۰ فیصد رہا۔ فریقین کی رواداریوں کی بنا پر بیرون جات سے آنے والی اقلیت کی تہذیب مقامی اکثریت کے تمدن میں نہ صرف شامل ہوئی بلکہ ان کے برابر کی شریک بھی بن گئی اب اگر تمام حالات خوشگوار رہتے جسے انگریزی میں کہتے ہے Other things being equal تو آپسی ٹکراؤ کا کوئی احتمال نہ رہتا لیکن انسانی سماج میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہاں بھی جنگل کے قانون کے مطابق طاقتور کمزور پر حاوی آتا ہے۔ چنانچہ فوجی طاقت سماجی مساوات کے مسلک اور ذات پات کے بندھنوں سے بے نیازی کی بنا پر بیرونی اقوام مقامی آبادی پر غالب آئیں۔

ہمارے یہاں تاریخ کو جس انداز سے لکھا گیا ہے اس کے بنیادی نسخے ہی میں گڑبڑ ہے۔ یعنی درسی کتابوں میں پہلا عنوان ہوتا ہے۔ Coming of Aryans دوسرے Muslim invasinos یعنی آریہ تو آئے گویا انہوں نے مقامی آبادیوں پر حملہ نہیں کیا بلکہ محض تشریف لائے اور مسلمان حملہ آور ہوئے۔ اس طرح ڈیڑھ دو سو سال سے بچوں کے ذہنوں میں چند مفروضے جاگزیں کر دیئے گئے اس پر طرہ یہ کے خود ہمارے مسلمان مورخین نے حملوں اور لڑائیوں کو نہایت توصیفانہ اور رومانٹک انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ فلاں راجہ مارا گیا۔ لیکن فلاں سپہ سالار نے جام شہادت نوش کیا۔ ہر بادشاہ کا لقب غازی تھا۔ یہاں تو محض کفر و اسلام ہی کی تفریق تھی انگریزوں نے مفتوح اقوام مشرق کو نیم وحشی گردانا۔ شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی کتابوں میں عام طور پر اہل ہند کو Black man لکھا جاتا تھا۔ یعنی ایک گورا چٹا نیلی آنکھوں والا پنجابی پٹھان یا کشمیری بھی ان کے لئے Balck man تھا۔ اہل فرنگ کے نوکر چاکر بھی زیادہ تر دلت ذاتیوں سے تعلق رکھتے تھے وہ تو بیچارے یونہی حقیر فقیر لوگ تھے لیکن صاحب بہادر نے اونچی ذات والوں کو بھی احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کے نزدیک بقیہ امراء محض عیاش اور ستم پیشہ افراد پر مشتمل تھا۔ ان کی عورتیں زنان خانے میں محسور تھیں۔ اہل فرنگ محض "ناچ گرل" اور آیاؤں سے واقف تھے۔ میرا اتفاق سے انگریز سرکار کی تخلیق کردہ اس بیرا خانساماں، آیا والی جماعت سے بچپن سے سابقہ رہا۔ اس وقت اضلاع کی سول لائنز تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہوگئی تھی۔ اور وہاں کی سوسائٹی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے تخلیق کیا تھا ایک مستحکم روایت بن چکی تھی۔ میں نے شاید پہلے کہیں لکھا ہے کہ انگریزوں نے اعلیٰ درجے کے مغلیہ ایڈمنسٹریشن کی بنیادوں پر نظام حکومت کو استوار کیا۔ صوبہ دار کی جگہ گورنر آیا۔ عہدہ داروں کے نام وہی رہے۔ گو ان کی حیثیت گھٹادی۔ مثلاً فوج کا صوبہ دار میجر ایک معمولی Non-Comissioned افسر تھا اور کہاں صوبہ دار بنگالہ۔ اور صوبہ دار دکن وغیرہ وغیرہ سنسکرت استھان سے تھانہ اور تھانے دار بنا۔ عدالت کے معمولی اہلکار ناظر پیشکار کہلائے۔ منشی یعنی لکھنے والا ایسا مقبول ہوا کہ گجرات میں ایک ہندو خاندانی نام بن گیا۔ اس کے علاوہ بنگال میں سرکار یعنی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ، مجمدار۔ مجموعہ دار، تعلقدار، ہالڈر یعنی حوالدار وغیرہ

سب ہندوؤں کے Sur mame بن گئے۔لیکن تعصبات میں کوئی منطق نہیں ہوتی۔اگر آپ کا خاندانی نام سرکار اس دور کی یادگار ہے جب آپ کے اجداد سلاطین بنگالا کے ایڈمنسٹریشن میں سرکار تھے یعنی کسی ڈپارٹمنٹ کے افسر تھے،تو ضروری نہیں کہ آپ کو اس پورے دور کی تاریخ اور اس میں خود اپنے پرکھوں کے رول کا علم بھی ہو۔تاریخ کے یہ رنگین فوٹ نوٹ ہیں جنہیں کوئی یاد نہیں رکھتا۔یہ سوچنے کی بات ہے کہ شمالی ہند کے علاوہ آسام بنگال،دکن،گجرات وغیرہ وغیرہ کتنی عظیم الشان اور ہمہ گیر تہذیبیں تھیں جس میں ایڈمنسٹریشن کی زبان فارسی نے کس حد تک مقامی بھاشاؤں کو متاثر کیا کہ ان میں بیس فیصد سے زیادہ عربی و فارسی الفاظ شامل ہو گئے جو آج تک مشتمل ہیں۔بعض فارسی الفاظ تو ایسے ہیں کہ ان کا سنسکرت مترادف عام طور پر روزمرہ کی زبان میں اتنی آسانی سے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا۔مثلاً نرسنگھ کی فارسی شعر ہی زیادہ آسان ہے۔اس طرح بہت سے الفاظ جن کی اصل فارسی ہے لیکن وہ ہمارے ہندوستانی زبانوں میں اپنی حلاوت یا چستی کی وجہ سے گھل میل گئے ہیں۔مثلاً ایک لفظ بہادر کو ہی لیجئے مکان،کرسی،قلم،مقدمہ،وکیل،دوا،نان،خوان، تکیہ،رجائی،لحاف،توشک،چمچہ،پیالہ،دیگچی،باورچی وغیرہ وغیرہ۔

تاج محل ہوٹل کا کوک،باورچی یا خانساماں کہلائے گا رسویا نہیں۔ہر لفظ کے اپنے Assoceation ہوتے ہیں۔کوٹھی اور بنگلے سے سول لائنز کا تصور منسلک ہے۔ان کے تبادل سنسکرت لفظ لائے گئے لیکن وہ مقبول نہیں ہو سکے۔فارسی زبان کی روانی اور حلاوت کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ بیک وقت لٹریچر اور روزمرہ کی زبان بھی رہی۔تعجب ہوتا ہے کہ سعدی اور حافظ کو ہم آج بھی Archaic نہیں سمجھتے اور اسے روانی سے پڑھ لیتے ہیں۔جبکہ شیکسپیر کی زبان اور بعد کی انگریزی میں بہت بڑا فرق رونما ہوا۔

متوسط طبقہ ابھی وجود ہی میں نہیں آیا تھا۔ایک مغل بادشاہ شاید فرخ سیر نے بھی اپنی بیگم کی علاج کے لئے پرتگالی ڈاکٹرنی کو بلایا تو اس نے معاوضے کے طور پر بجائے ہیرے جواہرات کے اپنے عیسائیوں کو آباد کرنے کے لئے نواح دہلی میں تھوڑی سی زمین کی فرمائش کر لی تھی جو بادشاہ سلامت نے بغیر سوچے سمجھے اس کو عطا کر دی اس نے وہاں فی الفور ایک گرجا تعمیر کروایا۔شفاخانہ اور مدرسہ کھولا اور اپنے دیسی عیسائیوں کو وہاں آباد کر دیا۔

وہ علاقہ آج تک مسیح گڑھ کہلاتا ہے جہاں مشہور معروف کرسچین ادارے مع ہولی فیملی اسپتال موجود ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوروپین جو یہاں قدم جمانے آئے تھے مرد اور عورتیں کتنے دُور اندیش اور ہوشیار تھے۔ اور اسی خردمندی کی وجہ سے انہوں نے آدھی دنیا پر اپنے پرچم لہرائے۔ مشنریوں کی نیک نامی اور ان کی تعلیم و تربیت کی شہرت اتنی بڑھی کہ قدامت پرست پردے دار گھرانوں میں مشنری ڈاکٹرنی نرسوں اور ٹیچروں کو بلایا جانے لگا۔ سب سے زیادہ اہم اور فائدہ مند ڈاکٹرنی اور نرس ثابت ہوئیں۔ شروع شروع میں خاصی تعداد میں ہندو لڑکیاں اور یکا دکا ستم رشیدہ مسلمان لڑکیوں نے بھی نیا مذہب قبول کرلیا۔ چند مسلمانوں نے عیسائی خواتین سے شادی کی اور ان کی اولاد نے بھی اپنے ماں کا دین اختیار کیا۔ اختر قنبر اور زہرہ قنبر ہماری والدہ کی بچپن کی سہلیاں تھیں جو اپنے والد کی بے نیازی کی بدولت عیسائی ہوگئی تھیں۔ اب ان کی طرز رہائش اور کردار و گفتار میں نمایاں فرق آگیا تھا۔ وہ سوشل ضابطے اور سوشل تعلقات کے اصولوں کی زیادہ سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ مثلاً اگر انہیں کوئی چھوٹا سا تحفہ دیا جائے تو گھر پہنچ کر وہ خط کے ذریعے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کرتی تھیں۔ اگر ان سے کسی معمولی کام کے لیے کہا جائے تو ہمیشہ اسے پورا کرتی تھیں اور کبھی یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں کہ اُے ہے میں تو بھول ہی گئی تھی۔ مشنریوں نے خانگی ملازمین کے طبقے کو کس طرح متاثر کیا تھا ہمارا ایک نوکر دولت مسیح جب کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا تھا تو پہلے دوزانو جھک کر کہتا اے ہمارے آسمانی باپ تو نے مجھے آج کی روٹی مہیا کی اس کے لئے میرا شکرانہ قبول کر۔ یہ نوکر کواٹر میں اپنے کمرے یا کوٹھریاں بھی بے حد صاف ستھری اور سجا کر رکھتے تھے۔ صفائی کا حکم سب سے زیادہ اسلام میں دیا گیا ہے۔ لیکن ہماری مماؤں اور اصیلوں کے میلے کچیلے کپڑوں کی مثال دی جاتی تھی اُے ہے یہ کیا ماماؤں کی سی گت بنا رکھی ہے وغیرہ۔ جبکہ آیائیں سفید لہنگے سفید کرتے دوپٹے میں صاف ستھری گھومتی تھیں ان کا یہ لباس میموں نے شاید خاص طور پر اختراع کیا تھا۔ ان کا لہنگا بہت گھیر دار ہوتا تھا اور یہ سفید پوشاک شاید انگریز Nanny کی سفید ساڑی کی مناسبت سے بنائی گئی تھی۔ لہنگا ٹخنوں سے ذرا اونچا اور میموں کے سائے سے قدر نیچا ہوتا تھا۔ گویا لہنگے اور انگلش گاؤن کے بین بین یہ لباس رائج کیا گیا تھا۔ شام کے وقت یہ آیائیں اپنی سفید پوشاک میں ملبوس

اپنے صاحب لوگ کی گوری اولاد کی Permbulater ڈھکتی سول لائنز کی سڑکوں پر نکلتی تھیں۔ ذرا بڑے بچے ان کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ چلتے تھے تو یہ گویا برٹش امپائر کے گوناگوں بوقلموں دلفریب نظاروں میں سے ایک نظارہ تھا۔ آیا، ایک غیر معمولی ہستی تھی۔ اینگلو برٹش سوسائٹی میں ایک اہم حیثیت کی مالک تھی۔ ہمارے یہاں بھی انا اور کھلائی کی جگہ آیا آگئی۔ آیائیں بھی اس نئی دوغلی تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ ''یہ کچن انگلش'' بولتی تھیں۔ اکثر دلت مند طبقے کی عورتیں تھیں جن کے ماں باپ کو مشنریوں نے عیسائی کیا تھا۔ بیرا خانساماں اور آیا کا یہ مثلث کوٹھی یا بنگلے کی نئے تمدن کا محافظ تھا۔ انگریزی کی مثل ہے More Catholic than the Pope یہ شاگرد پیشہ گویا کالے انگریز تھے۔ جب یہ اپنے محلّے یا گاؤں میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے جاتے تھے تو وہ بیچارے ان سے بہت مرعوب ہوتے تھے بڑے دن کی ڈالی اس سوسائٹی کی ایک اور روایت تھی۔ بڑے دن کے ڈالی کے علاوہ عید بقرعید اور ہولی دیوالی کے مواقع پر بھی مسلمان اور ہندو افسروں کے یہاں ڈالیا آتی تھیں۔ یہ نذریہ تحائف کے مانند مغرب میں کرسمس کے تحفے اب ایک بہت بڑی انڈسٹری بن چکی ہے۔ کرسمس کارڈ پر باموقع اشعار زریں حروف میں موجود ہوتے تھے۔ عید کارڈ کی دیکھا دیکھی ہولی اور دیوالی کے تہنیتی کارڈ بھی رائج ہوئے۔ مسلمانوں کی طرح ان کے یہاں تہوار کے موقع پر گلے ملنے کی رسم شروع ہوئی۔ یہ ڈالیاں خشک میوے کے ایک پیسٹری اور پھل اور گلدستہ وغیرہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ غازی پور چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے انگریزوں کا ایک اہم مرکز رہا تھا۔ یہاں بہت ہی اعلیٰ درجے کی کیک اور پسٹری بنائی جاتی تھی۔ ایک کیک اب تک یاد ہے ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے کی شکل میں بنایا گیا تھا خورد و نوش بھی ایک امپریل تہذیب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ مغلیہ طباخی ہمارے یہاں آج تک ان ہی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔

لفظ نرس ہمارے یہاں ہسپتالوں کے لئے مخصوص ہوگیا لیکن انگلستان میں نرس بچوں کی کھلائی کو کہتے ہیں اور اس کی مناسبت سے بچوں کے کمروں کا نام نرسری کہلایا۔ انگلستان اور یورپ میں ہر چوبیس گھنٹے گذارنے کے لئے مختلف کمرے بنائے گئے تھے جن کا تذکرہ مرزا ابوطالب اصفہانی نے اپنے سفرنامہ ۱۷۹۹ء میں کیا۔ ہمارے یہاں عام طور پر

یہ رواج نہیں تھا جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے۔ دلان دردلان میں سارے خاندان کے بیشتر افراد کے لئے پلنگ بچھے ہوتے تھے اور وہیں پر وسط میں تخت یا فرش پر مسند اور گاؤ تکیے، جہاں دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا تھا وہیں ماما یا اصیل یا "اوپر کا کام کرنے والا چھوکرا" چلمچی یا لوٹا اور صابن دانی لا کر دہلیز میں رکھتا اور سب کے ہاتھ دھولاتا۔ فرنگی چھری کانٹے سے کھاتے تھے لہذا انہیں ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلان کے دروں کے نیچے چنبلی یا موتیا کی کیاریاں بنائی جاتی تھیں تا کہ ان پودوں کو متواتر پانی ملتا رہے۔ صحن کی دیوار سے متصل گھڑونچی پر گھڑے اور صراحیاں رکھی جاتیں اور انہیں مرادآبادی کٹوروں سے ڈھکا جاتا۔ گرمیوں میں موتیا کے ہاران پر لپیٹ دیئے جاتے۔ صبح کے وقت دلان میں پلنگوں کے بستر لپیٹ کر سرہانے رکھ دیے جاتے اور دن بھر کنبے کے افراد کا جماؤ وہیں رہتا۔ گویا پلنگ ہمارے یہاں کھانے کی میز اور صوفہ کا بھی کام دیتا تھا۔ یہ طرز زندگی ابھی تک روایت پسند گھرانوں میں موجود ہے۔ گو عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے بہت سے انگریزی طور طریق اور فرنیچر خالص ہندوستانی گھروں میں بھی پہنچ گئے۔ پلنگ ولایت میں محض رات کو سونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں وہ دن میں صوفے اور آرام کرسی کا کام بھی دیتا ہے۔ ولایت میں بیڈروم ایک نہایت خصوصی اور پرائیویٹ جگہ ہے۔ ہمارے یہاں یہ کمرہ دن میں سٹنگ روم بھی بن جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے طرز زندگی میں مکان کی بہت اہمیت ہے خصوصاً خواتین کا زیادہ وقت گھر ہی میں گزرتا ہے۔ ان کی جائے رہائش گویا ان کا لیڈیز کلب بھی ہے۔ خاندانی جھگڑے چکانے کا مرکز بھی اور شادی بیاہ کے مواقع پر تو اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ جہاں ہفتوں پہلے سے مہمان اور ان کے بچے آ کر رونق بڑھاتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل مغرب کے یہاں شادی گرجا گھر میں ہوتی ہے جہاں چند دوست مدعو کر لئے جاتے ہیں۔ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو سوائے بنیادی، مذہبی فریضے یعنی نکاح کے علاوہ تقریباً ساری رسمیں ہندوؤں کی اپنالی لیکن ان میں ایک بین فرق یہ رہا کہ ہندوؤں میں بعض جگہ لڑکی کا باپ دولہا کے پاؤں دھوتا ہے ہمارے یہاں لڑکی کے باپ اور بھائی وغیرہ کی بے حد عزت کی جاتی ہے۔ اودھ کے مسلمان گھرانوں میں لڑکی کے ماں باپ پس منظر میں رہتے ہیں اور سارے مراسم دوسرے بزرگ ادا کرتے ہیں لڑکی کی

ماں اچھے کپڑے بھی نہیں پہنتی۔ ہندوستانی سوسائٹی میں شادی اہم ترین تقریب ہے۔ قدامت پرست گاؤں میں مہمان لڑکی والوں کے یہاں آ کر کھانا بھی نہیں کھاتے۔ گویا اس طرح دولہن کے باپ کو مزید زیر باری سے بچاتے ہیں۔ ایک زمانے میں وضعداری کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص ایسے گاؤں میں جاتا تھا جہاں اس کی گاؤں کی کوئی لڑکی بیاہی تھی تو وہ اس گاؤں کا پانی نہیں پیتا تھا یعنی بیٹی کے گھر کا پانی پینا بھی باعث شرم تھا۔ یہ ساری رسوم اور پابندیاں مسلمانوں نے اپنے پڑوسی ہندوؤں سے سیکھیں۔ اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہوئے۔ آج کل جب کہا جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں اجنبی بن کر رہے تو کوئی اللہ کا بندہ میڈیا کے ذریعے ان حقائق پر روشنی نہیں ڈالتا۔ طلاق اور عقد بیوگان ہمارے یہاں ہندوؤں کی تقلید میں معیوب سمجھا گیا۔ بیوہ عورتیں ساری عمر سفید کپڑے پہنے کانچ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں وغیرہ۔ یہ سب خالص ہندووانی رسوم تھیں۔ مسلمانوں میں صدیوں سے رائج ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب لکھنؤ میں والد کا انتقال ہوا تو اماں کے چچازاد بھائی میجر آل حسنین "رنڈسالہ" لے کر آئے جوان کی والدہ نے مرادآباد سے اماں کو بھجوایا تھا۔ جو ایک سفید جارجٹ کی ساڑی اور سونے کی چوڑیوں پر مشتمل تھا۔ یہ چیزیں لا کر انہوں نے والدہ کے قریب رکھیں اور بیٹھ کر خوب روئے۔ یہ منظر ایک مغربی مبصر کے سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا چوڑیاں بالخصوص کانچ کی چوڑیاں محض اس برصغیر کا گہنہ ہے ہری کانچ کی چوڑیاں سہاگ کی نشانی ہیں اور سارے مشرق کی عورتوں کی چوڑیاں کی نہ کوئی معنویت ہے اور نہ اہمیت۔ ایک پُر اسرار واقعہ یاد آتا ہے جب ساحر لدھیانوی کا انتقال ہوا اور صبح صبح میں ان کے یہاں پہنچی۔ چند خواتین تعزیت کے لئے آ چکی تھیں اور برآمدے میں فرش پر بیٹھی تھیں۔ اتنے میں سیاہ ساڑی میں ملبوس ایک پُر اسرار خاتون برآمدے میں داخل ہوئیں اور دیوار کے سہارے فرش پر بیٹھ کر انہوں نے اپنے قریب کی میز سے کوئی بھاری چیز شاید راگدانی اٹھائی اور اس سے زور زور سے اپنی کانچ کی چوڑیوں پر مارا اور چھن چھن کر کے ساری چوڑیاں توڑ ڈالی۔ اہل بمبئی جیو اور جینے دو کے مقولے پر عمل کرتے ہیں اور کسی غیر معمولی بات پر بھی متعجب نہیں ہوتے۔ چنانچہ ساری بیبیاں بے نیازی سے ادھر اُدھر دیکھتی رہیں۔

لیکن آواخر انیسویں صدی سے ہی مسلم سماج میں نئی روشنی کی کرنیں پہنچ چکی تھیں۔

علی گڑھ تحریک اس نئی جاگیرتہ کی محرک تھی۔ لاہور مسلم تجدیدیت کا ایک بڑا مرکز بنا چونکہ یوپی۔ صدیوں سے انڈو مُغل تہذیب کا گہوارہ رہا تھا۔ یہاں کے مسلمان سماجی لحاظ سے زیادہ قدامت پرست تھے۔ جبکہ اہل پنجاب کو اس قسم کی پابندیوں کا زیادہ سامنا نہیں کرنا پڑا۔ چنانچہ پنجابیوں نے نئی رجحانات زیادہ شرعت سے قبول کیے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان تینوں یکساں طور پر ترقی کے خواہاں تھے لیکن اس زمانے میں دونوں فرقوں میں مذہبی تحریکوں نے حالات کو مختلف ڈھنگ سے متاثر کیا۔ احمدی تحریک خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے برطانوی سرپرستی کے زیر سایہ اپنی تبلیغ شروع کردی۔ اب پنجاب ایک نوع کے مذہبی میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ یہ جنگ اردو اخبارات اور رسائل کے ذریعہ لڑی گئی۔ مذہبی مناظرے ایک قسم کے شو بزنس بن گئے۔ یہ مناظرے عیسائی اور مسلمان، احمدی اور غیر احمدی، آریہ سماجی اور مسلمانوں کے مابین خوب خوب منعقد ہوئے۔ اور بڑی گہما گہمی رہی۔ برٹش سرکار نے ان مناکشوں کو مزید ہوا دی تا کہ قوم پرستی کی تحریک جو رفتہ رفتہ زور پکڑ رہی تھی۔ اس میں رخنہ پڑے حکومت نے اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کی۔ اور پنجابی مثالی تجی اور گرم جوشی کے ساتھ اردو کی آبیاری میں جٹ گئے۔ لاہور اردو صحافت اور نئی اردو ادب کے اشاعت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں سے شائع ہونے والے "نیرنگ خیال"، "عالمگیر"، "ہمایوں" وغیرہ نے سارے ملک پر اپنی دھاک بیٹھا دی۔ مولوی ممتاز علی کے دارالاشاعت پنجاب نے زنانہ ہفتہ وار اخبار "تہذیب نسواں" ۱۸۹۸ء سے شائع کیا۔ اس کے بعد ہفتہ وار اخبار "پھول" بنت نذرالباقر جو اس وقت ایک نامور مضمون نگار بن چکی تھی، مولوی ممتاز علی نے ان کو "پھول" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ دونوں اخبار اتنے معیاری اور اعلیٰ درجے کے تھے کہ تقریباً ایک صدی ہونے کو آئی ان کی ٹکر کے زنانہ رسالے یا بچوں کے اخبار اس برصغیر میں آج تک شائع نہ ہو سکے۔ یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات ہے کیا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر نئی تحریک اپنے ابتدائی جوش و خروش کے دور میں خوب پھلی پھولی ہے اس کے بعد جوش ذرا کم پڑ جاتا ہے یا حالات بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز کا سارے برصغیر کے مسلمانوں نے بالخصوص ان کی خواتین نے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ ایک "One-rupes" فنڈ بھی قائم

کیا گیا۔ ساری تحریکوں میں مس نذر الباقر پیش پیش رہیں۔ یہاں یہ نقطہ بھی قابل ذکر ہے کہ نئے اینڈو برٹش سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے انہوں نے اپنے آپ کو آنسہ کے بجائے مس کہلوایا۔ انہوں نے غرارہ ترک کیا اور ایڈورڈین گاؤن اور غرارے کو ملا جلا کے نئی پوشاک اختراع کی اور وہ ان کے حلقے میں اور سماجی طبقے میں بہت مقبول ہوئی۔

چونکہ ہمارے یہاں سوشل ہسٹری بہت کم لکھی گئی ہے اور اس زمانے کی تصویریں بھی تقریباً ناپید ہیں اس لئے وہ سارا دلچسپ اور عمل پسند اب تک گمنام رہے۔ بنگالیوں نے اپنے یہاں کی سوشل ہسٹری پر خوب خوب لکھا۔ اردو کے زنانہ رسائل بھی ان موضوعات پر خود خواتین نے نہایت قابل قدر مضامین شائع کئے لیکن ان سب کو یکجا کر کے ان پر ریسرچ کرنے کی یا انہیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا آج تک کسی کو خیال نہیں آیا۔

مسلمان عورتوں کی یہ جاگیرتہ اس قدر ہمہ گیر تھی اور صوبہ سرحد سے لے کر مدراس اور آسام سے لے کر سندھ اور گجرات تک لکھنے والیوں کی ایک جماعت کیسے پیدا ہوگئی تھی اس پر غور کیجئے تو تعجب ہوتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر خواتین پردہ نشین تھیں اور انہوں نے کسی کالج اور اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں ریڈیو بھی نہیں تھا۔ محض اخبارات، رسائل اور کتابیں جو وہ حاصل کر سکتی تھیں ان ہی کے ذریعے وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتی رہیں اور اگر ان کے باپ بھائی اور شوہر ان کی ہمت افزائی نہ کرتے تو اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں تھا چونکہ گنتی کی چند مسلمان لڑکیاں عیسائی ہوگئی تھیں۔ مسلمان عام طور پر مشنریوں سے بہت بدگمان اور خائف تھے۔ میرے خیال میں دنیا کے کسی اور ملک میں دورِ جدید کے ان خطرات و خدشات اور آزمائشوں کا سامنا نہیں کیا ہوگا۔ جتنا بچارے مسلمانوں کو اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷) کے بعد اس برصغیر میں کرنا پڑا۔ ایک کے بعد ایک آفت۔ ہمیں عہد مغلیہ کے شب و روز کا تو کوئی علم نہیں کہ اس میں ایک عام مسلمان کنبے کا ٹائم ٹیبل کیا تھا اس کی عورتیں کس طرح رہتی سہتی تھیں۔ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے وہ زیادہ تر رومانٹک افسانے ہیں۔ انگلستان کے پچھلی صدیوں کی خواتین نے روزنامچے لکھے۔ جن کے ذریعے ہمیں اس زمانوں کی بیشتر گھریلو حالات سے واقفیت حاصل ہوگئی ہے۔

ہندوستان میں دراصل ایک متوسط طبقہ موجود ہی نہیں تھا۔ یا چند لوگ بہت امیر

کبیر تھے اور باقی بہت غریب۔ امراء کے حاشیہ بردار اور نوکر چاکر اس وقت کی مڈل کلاس نہیں کہلائے جاسکتے۔ کیونکہ معاشرے کا ایک طبقہ نفسیاتی طور پر خود مختار اور آزاد ہوتا ہے۔ یہ معاشی اور اس کے ساتھ سیاسی آزادی یوروپ میں صنعتی انقلاب کے بعد لوگوں کو حاصل ہوئی۔ اور اس آزادی کے حصول میں مغرب کے نئے مفکرین نے بہت اہم رول ادا کیا۔ کیونکہ وہاں مشرق کے مقابلے میں تعلیم کا چرچہ بہت زیادہ تھا۔ جابجا یونیورسٹیاں موجود تھیں۔ آزادیٔ افکار کا تذکرہ شروع ہو چکا تھا۔ یونانِ قدیم کی روایات کو ازسرِ نو دریافت کیا گیا تھا۔ لیکن تاریخ کی ایک بہت بڑی ستم ظریفی یہ رہی کہ خلافتِ ہسپانیہ کے راستے سے یوروپ کا کلاسیکل ورثہ فرانس، جرمنی اور انگلستان وغیرہ میں پہنچا۔ لیکن خود مسلمانوں نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ اور خواب غفلت میں مبتلا ہو گئے۔ ایک پوری قوم اگر سارے مسلمانانِ عالم کو بہ لحاظ مذہب ایک قوم کہا جائے تو دنیا کی اتنی بڑی آبادی بیک وقت اچانک اتنی پسماندہ کیوں رہ گئی۔؟ جس قوم نے سائنس ریاضی اور فلکیات اور فلسفے میں اتنے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے تھے۔ سولہویں، سترہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے جہالت اور پسماندگی کا سمبل کیوں قرار پائی۔ ایک اندلسی مسلمان ماہر فلکیات کے بجائے گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز پیچوان کے کش لگاتا۔ عیاش ترک یا عرب سلطان عالم اسلام کا نمائندہ کیوں تصور کیا گیا۔ قلم کے بجائے تلوار مسلمان کا ہتھیار کس وجہ سے کہلائی۔ کیا عیسائی اقوام جنگجو نہیں تھیں۔ کیا ان لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف تباہ کن جنگیں نہیں لڑیں مگر وہ لوگ لڑبھڑ کر پھر سنبھل جاتے تھے۔

یوروپین تہذیب کو عربوں کی دین کی فہرست بہت طویل ہے اور یہ تہذیب انہوں نے کچھ اسلامی اسپین کے ذریعے حاصل کی کچھ صلیبی جنگوں کے دوران اور کچھ سلطنتِ عثمانیہ کے ذریعے۔ لیکن نئی ایجادات اور خودکار مشینوں سے بے اعتنائی ان کو لے ڈوبی۔ اس بے نیازی کی وجہ آخر کیا تھی کاہلی اور تقدیر پرستی اور قدامت پسندی۔ قدامت پرست انگریز بھی تھا اور آج تک ہے۔ قدیم مذہبی رسوم کی پابندی کا یہ حال ہے کہ عہد نامہ قدیم کے مطابق عہد عتیق میں اسرائیل کے بادشاہوں کے سر میں تیل سے مسح کر کے ان کی تاجپوشی کی جاتی تھی چنانچہ اسی لفظ مسح سے مسیح نکلا ہے یعنی تیل سے سر کا مسح کیا گیا۔ قدامت

پرستی کا معاملہ یہ ہے کہ جب ملکہ الزابیتھ دوئم کی تاجپوشی ہوئی میں لندن میں موجود تھی اور تبھی میں نے ٹیلی ویژن پر اس کا منظر دیکھا جو سیدھا ویسٹ منسٹر ایبے سے ٹیلی کاسٹ کیا جارہا تھا (لفظ ایبے ایبٹ بھی ابا سے نکلا ہے) اس میں الیزابیتھ ایک کرسی پر بیٹھی تھیں اور لاٹ پادری یعنی آرچ بشپ آف کینٹربری مختلف رسوم ادا کررہا تھا۔ جو ہمارے یہاں کے کسی برہمن پروہیت کے پوجا پاٹ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی پھر سب سے پراسرار رسم ادا کی گئی جس کے لئے ایک پردہ تان دیا گیا۔ لہذا ٹیلی ویژن اسکرین پر کچھ دکھلائی نہیں دیا لیکن اس پردے کے پیچھے لاٹ پادری نے الیزابیتھ کے سر پہ دو چچہ ٹیل اونڈیل کران کو ملکہ بنایا۔ اس کے بعد وہ پردہ ہٹا دیا گیا۔ اب اگر اس قسم کی کوئی رسمیں یا Ritual ہمارے یہاں ہندو پنڈت ادا کرے تو انگریزوں نے اہل ہند کو Barbarian پکارا۔ یعنی جو میں کروں وہ ٹھیک جو آپ کریں وہ غلط۔ ہمارے یہاں بھی یہی لفظ مسح موجود ہے جو وضو کے وقت کیا جاتا ہے۔ الفاظ 'Abbot Abbey' Abbess' کو لیجیے۔ ان سب کا مصدر ایک ہے یعنی مسیحی روایت کے مطابق صلیب پر جاںکنی کے عالم میں خدا کو پکار کر کہا تھا ابا! ابا! لما سبقتنی یعنی تو مجھے کیوں چھوڑ کر آگے چلا گیا۔ اب آپ سوچئے۔ کہ الفاظ کا کیا عجیب و غریب کھیل ہے کہ جب مسلمان بچے اپنے باپ کو ابا پکارتے ہیں تو گویا وہ حضرت عیسیٰ کے ہم زبان ہیں۔ حضرت عیسیٰ قدیم سریانی یعنی Sriac میں بات چیت کرتے تھے جو Sriya یعنی ملک شام کی زبان تھی۔

الفاظ کا معاملہ بھی عجیب و غریب ہے اسی لفظ مسح کو دیکھئے جو دو مختلف تہذیبوں میں یعنی اسلام اور مسیحیت میں ایک ہی معنی میں رائج ہے لیکن دونوں مذاہب کے درمیان بنیادی اعتقادات کی نا قابل عبور خلیج حائل ہے۔ ہم تثلیث کو نہیں مانتے وہ ہمارے نبیؐ کے منکر ہیں چلئے ہوگئی چھٹی۔ چنانچہ ایک ہزار برس تک معرا کہ صلیب و ہلال جاری رہا۔ اور آج اس نے ایٹمی جنگ کے خطرے کی صورت اختیار کرلی ہے۔ میں پہلے کہیں لکھ چکی ہوں کہ ابھی چند سال قبل ہی لندن کے ہائیڈ پارک میں ایک گتے کا عظیم بجثہ کٹ آوٹ مجھے نظر آیا جس میں ایک شمشیر بکف مسلمان شہشوار حملہ آور دیکھلایا گیا تھا۔ اس کٹ آوٹ کے نیچے لکھا تھا "A Muslim Terrorist"

قومی امیج بنتے دیر نہیں لگتی۔ جب سوامی وویکانند اپنا گروا لباس پہنے گیتا کا پاٹ

کرتے شکاگو کی عالمی مذہبی کانفرنس میں پہنچے اس وقت سے ہندومت کا یہ پرامن امیج مغرب میں مستحکم ہوگیا۔اس کے برعکس مسلمانوں کی جارحانہ کاروائیاں اور خونِ آسامی ضرب المثل بنی۔خود ہمارے یہاں اس امیج کو فروغ دیا گیا۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

یہ طے شدہ بات ہے کہ جنگی ترانے ہلکے پھلکے امن و آشتی کے نغموں سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔کیونکہ وہ سننے والوں کے دلوں میں ایک ناقابلِ بیان جوش و سرشاری کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔چنانچہ قاضی نذرالاسلام کا "دو گنگو نے باجے مڈول" نے سارے بنگال کو گویا ایک فوجی کیمپ میں تبدیل کردیا۔اس کے مقابلے میں نرگس باغ میں، بہار کی آگ میں اتنا مقبول نہیں ہوا۔جارحانہ نغمے محض ہوا میں نہیں گائے جاتے ان کے لئے ایک غائبانہ حریف یا دشمن کا وجود ضروری ہے شانتی کے پرچارک عیسائی مبلغین نے بھی ایک دشمن یعنیOnti Christ کو سامنے رکھا۔ان کی تنظیم Salvation Army یا مکتی فوج کہلائی جس کے عہدے دار باضابطہ میجر، کرنل اور بریگیڈیر وغیرہ پکارے جاتے تھے۔عیسائیوں کا ایک بڑا ولولہ خیز نغمہ تھا۔Onward Christian Soldiers, marching on to war with the cross of Jesus marching on before. عیسائی مبلغین نے جب ہندوستان میں اپنا پرچار شروع کیا تو سریلے گیت اور بینڈ باجے عوام کے حواسِ خمسہ پر بڑے ہی دلنشین طریقوں سے حملہ ور ہوئے۔بے لوث اور انتھک خدمت خلق، علاج معالجہ، نرسینگ، درس وتدریس، نرسری اسکول سے لے کر یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین مدارج تک تعلیم و تربیت ورزش، کھیل کود اور حفظانِ صحت ان کا سب سے بڑا وصف تنظیم اور ڈسپلن تھا۔جو ہمارے یہاں مفقود رہا۔جب مشنری دلت افراد کو بپتسمہ دیتے تھے اس کے بعد ان کی قایا پلٹ ہوجاتی تھی۔صاف ستھرے گھر، تمیز و تہذیب، شاگرد پیشہ میں مبلغین کا اثر نمایا ترین رہا۔ہماری میلی کچیلی ماماؤں اور اصیلوں کے مقابلے میں ان کی صاف ستھری آیائیں اسی نمایاں فرق کی وجہ سے اپنے طبقے کے باقی افراد سے خود کو برتر سمجھنے لگی تھیں۔دہرہ دون میں ایسے افراد کافی تعداد میں موجود تھے۔جو ایک پاکٹ میں چٹھیاں سنبھالے اپنے صاحب،

میم صاحب کی ولایتی واپسی کے بعد "کالا لوگ" کے یہاں تلاش ملازمت میں آیا کرتے تھے اور دبیز نیلے رنگ کے لیٹر پیڈ پر بڑی بڑی انگریزوں والی لکھائی پر مشتمل سرٹیفکٹ ہماری والدہ کو دکھلاتے تھے۔ جن میں سابق انگریز صاحب یا میم صاحب نے امام بخش کو کوک یا کریم خاں بیرے کی ایمانداری اور فرض شناسی کی تعریف رقم کی تھی۔ ایسے ملازمین چھٹیوں والے بیرے، آیائیں اور خانساماں کہلاتے تھے۔ اہل ہند سے انگریزوں کا رابطہ زیادہ تر محض ان ہی ملازمین تک محدود رہا۔ انگریزوں کی کوٹھیوں میں تربیت یافتہ نوکروں کی بہت مانگ تھی اور یہ پنجاب و صوبہ سرحد تک بکھرے ہوئے تھے۔

ہماری ایک نمبوری عزیزہ جن کے والد نے غیر منقسم پنجاب میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اور خود ان عزیزہ نے لدھیانہ میڈیکل کالج میں پڑھا تھا ان کی شادی بھی لاہور کے ایک مقتدر پنجابی خاندان میں ہوئی تھی۔ ان سے ملاقات کے بعد مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ تعصب کے کتنے رنگ ہیں۔ انہوں نے مجھے بتلایا کہ ان کی خالص پنجابی سسرالی رشتہ دار یوپی والوں کو بیرا خانساماں پکارتے ہیں۔ کیونکہ یوپی سے گئے ہوئے تربیت یافتہ بیرے خانساماں پنجاب کے مقتدر خاندانوں میں ملازم تھے۔ اور اپنی شائستگی و تمیز داری کی وجہ سے وہاں ان کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ان کے آقاؤں نے یوپی اور پنجاب کے حیرت انگیز تعصب کے بنا پر سارے یوپی والوں کو بیرا خانساماں پکارا۔ ہندو مسلمان کے علاوہ شیعہ، سنی پنجابی اور یوپی والا۔ بنگالی و بہاری غرضکہ جدھر نظر اٹھائیے تنگ نظری و تعصب کارفرما ہے اور زیادہ تر اس کی کوئی منطق یا سبب بھی موجود نہیں۔

یہاں پر انسانی فطرت کے ایک بنیادی کمزوری ان تعصبات کو جنم دیتی ہے۔ وہ بنیادی روّیہ یہ ہے کہ محض ہم سچی ہیں دوسرے سب غلط۔ اسی کمزوری کی وجہ سے اولادِ آدم انگنت فرقوں اور قوموں میں بٹی، اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ خود کو حق بجانب سمجھنے اور دوسرے کو غلط قرار دینے کے اس رویے کو مذہبی اختلافات نے مزید ہوا دی۔ خوفناک جنگیں لڑی گئیں ایک دوسرے کے خلاف منافرت کے رویے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے گئے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد اسکولوں میں ایک ہی انگریزی نصاب پڑھایا گیا۔ اس وکٹورین مدارس نے گویا ایک اسٹیم رولر کا کام کیا۔ دور دراز انگلستان میں چھپنے والی ایک سے ایک

خوشنما درسی کتابیں سارے ہندوستان میں پڑھائی جانے لگیں۔ ہمارے بچپن میں ایک مقبول ترین کتاب King's Reader تھی۔ جس کے شروع میں کنگ جارج پنجم اور ملکہ مری کی تصاویر شامل تھی۔ انگریز حاکم ضرور تھا مگر بڑی حد تک اس نے اپنی رعایا کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔ اور اپنی اس حکمتِ عملی کی بدولت وہ ایک روشن خیال اور بہترین گورا آقا ثابت ہوا۔ ورنہ ولندیزی یعنی ڈچ اور فرانسیسی مقبوضات کی ایشیائی اور افریقی رعایا کی ناگفتہ بہ حالت ان نوآبادیوں کی حصولِ آزادی کے بعد دنیا پر ظاہر ہوئی۔ ان کو نہ مغربی تعلیم سے روشناس کیا گیا تھا اور نہ اپنے غیر ملکی آقا کے سیاسی معاملات میں اسے کوئی دخل حاصل تھا۔ اس کے برعکس آزادی سے پیشتر برطانوی پارلیمانٹ میں مسٹر سکلات والا بطور ممبر براج رہے تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغلیہ ہندوستان جس سے انگریزوں نے حکومت چھینی ایک نہایت ترقی یافتہ اور روشن خیال ملک تھا جس کا اندازہ ہمیں اب ہو رہا ہے۔ چنانچہ مغلوں کے بہت سے مناسب اور ایڈمنسٹریشن کے ضابطے انگریزوں نے جوں کے توں برقرار رکھے۔ جس چیز میں مغل بیرونی دنیا سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کی مغربی علوم سے بے نیازی اس کی بڑی وجہ تھی۔ مجھ سے میری ایک بہت پڑھی لکھی امریکن دوست نے جو بعد میں نیپال میں امریکن سفیر رہی ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم ذرا اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ کرو۔ حکومت ان کے ہاتھ سے چھین گئی۔ محض کچھ عرصہ قبل تک برطانوی سفیر کو مغل شہنشاہ کے دربار میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ اسے کرسی نہیں ملتی تھی۔ اور اب ۱۸۵۷ء کے بعد اس ضلع کے ایک معمولی انگریز حاکم کے سامنے اپنے جوتے اتار کر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ تمہارے ان بزرگوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔

ریلوے اسٹیشنوں پر Europian only کے ریفریشمنٹ روم، ویٹنگ روم اور ٹرینوں میں ان کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ علیحدہ ہوتے تھے۔ اہل ہند سے ان کا رابطہ محض قلی بیرا، خانساماں، آیاہ اور منشی، چپراسی، کوچوان، سائیس، مالی اور گراس کٹ کے ذریعے قائم تھا۔ ہندستان کے تہوار اور مذہبی تقریبات کی شان و شوکت کو Barbaric splendours پکارتے تھے۔ محرم میں تعزیوں کے جلوس اور دسہرے کی رام لیلا ملاحظہ کرنے کی غرض سے ان کے لئے مخصوص اسٹینڈ تعمیر کئے جاتے تھے۔ ان کے رعب داب کا یہ عالم تھا کہ جب وہ

کسی تاریخی امام باڑوں، مندروں یا مغلیہ مساجد کی سیر کرنے کے لئے جاتے تھے تو ان سے جوتے اتارنے کے لئے نہیں کہا جاتا تھا بلکہ ان کے لئے ایسے عظیم جثہ موزے بنوائے گئے تھے جنہیں وہ اپنے جوتوں کے اوپر پہن لیتے تھے۔ اٹھارہویں انیسویں صدی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انگریز بہادر جس رعب داعب سے اس جنتِ ارضی میں بطور حاکم اعلیٰ قیام پذیر تھا اس کا اندازہ آج کی نسل کر ہی نہیں سکتی۔ اور انہوں نے اپنے لئے دہرہ دون، بنگلور، لکھنؤ، دہلی، پونا اور لاہور وغیرہ وغیرہ میں کیسی حسین اور پر تضا سول لائنز اور چھاونیاں آباد کی تھیں۔ جن کی مثال کسی اور ایشیائی نو آبادی میں نہیں ملے گی۔ اور دور افتادہ اضلاع پہاڑی مقامات اور گھنے جنگلوں کے وسط میں انہوں نے یہ بنگلے کس خوبی سے تعمیر کروائے تھے اور ان کے انجینئر اور معمار کہاں کہاں پہنچے تھے۔ محض کوہستانِ ہمالیہ کے دور دراز اور خطرناک پہاڑی راستوں سے گزر کر اوپر پہنچنے والے پہاڑوں کے سنگلاخ سطح اور چٹانوں پر یہ شاندار بنگلے کیسے تعمیر کئے گئے۔ اب یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان چٹانوں میں ان کی نیو کس طرح کھودی گئی ہوگی۔ اور یہ شدید باد و باراں اور زلزالاباری سے کس طرح محفوظ رہے۔ اور یہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر انہوں نے ۱۹۴۷ء میں کس غم واندوہ اور صبر کے ساتھ اس دلفریب ملک کو خیر باد کہا ہوگا۔ مجھے تو محض دہرہ دون کی وہ حسین ترین کوٹھیاں اور ان کے Orchard یاد ہیں۔ لیچی، آم، ناسپاتی، آڑو اور خوبانی کے درختوں میں گھیرے خوشنما بنگلے ان کے اندر یہ بوڑھے انگریز اور ان کی میمیں خاموشی کے ساتھ اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی ڈون ویلی کے پرندوں کے بارے میں کتاب لکھ رہا ہے کوئی فرن کی مختلف اقسام کے متعلق مضمون نویسی میں مصروف ہے۔ واٹر کلر پینٹنگ ایک مرغوب مشغلہ تھا۔ بیلی لاج کی مالک مسز سیل اور ان کی بہن بہترین آرٹسٹ تھیں اور ان کے کمروں کی دیواریں ان کی بنائی ہوئی نہایت سبک اور نفیس واٹر کلر تصاویر سے مزین تھیں۔ یہ دونوں بہنیں شاید گمنام مصور تھیں۔ اور انہوں نے کبھی اپنی نمائش بھی منعقد نہیں کی تھی۔ انگریز نیچر پر عاشق ہے۔ انگلستان میں ہر سال موسم بہار کی آمد پر اخباروں میں خط چھپتے ہیں۔ آج میں نے فلاں جگہ پہلی کوکو کی آواز سنی۔ Today I hard the firstCu cook

چنانچہ جب انگریز یہاں آیا تو یہاں Flora and Fauna کی بہتات اور تنوع

دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور فوراً ان مظاہر فطرت کے سائنٹفک مطالعے میں جٹ گیا مغل مصوروں نے بھی پرندوں اور پھول پتوں کی تصویریں خوب بنائی تھیں۔ لیکن ہم لوگ اپنے مختلف ادوار کے فنی ذخیروں سے عموماً بے نیاز رہے۔ بنیادی طور پر ہم اپنے مکانوں کی آرائش کے بھی زیادہ دلدادہ نہیں تھے۔ ہماری تمام تر توجہ ملبوسات، زیورات اور اشیائے خورد و نوش پر مرکوز رہی۔ ماما نے بہترین کھانا پکا کے سینی میں رکھا تو ہمارے ایک متوسط گھرانے کے افراد نے بان کی چارپائیوں پر زرد فرخ آبادی دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ بستر لپیٹ کر سرہانے رکھ دیئے گئے یا تخت پر دسترخوان بچھا۔ باورچی کھانے کی دھویں سے کالی دیوار اور اونٹ کی کھال سے بنی ہوئی تیل کپی رات کو روشن کی جاتی تھی۔ اس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکی ہوں اپنے ملبوسات اور گہنو کا بہتا خیال رکھا گیا۔ مکان کے آرائش کی طرف اتنی توجہ نہیں رہی۔ وکٹورین انگلستان میں گھر کا ہر کمرہ ہمہ سے بولتا تھا۔ دیواروں پر ایک سے ایک خوبصورت وال پیپر۔ کمرے کی زیبائش میں اضافہ کرتے تھے وال پیپر اس لئے ضروری تھا کہ محض چونے کی کلی والی دیواریں بے حد سرد ہوتیں۔ Central helting کے رواج سے قبل کمرہ گرم رکھنے کے لئے ہر کمرے میں آتشدان اپنے بنگلوں میں متعارف کئے اور اس کا اوپری حصہ کورنس کہلایا جسے ہندوستانیوں۔ نے کارنس کر دیا۔ کلکتے کے بے حد انگریزیت زدہ بھدر الوگ نے اپنے گھروں میں Wall Papen لگائے لیکن یہ رواج باقی ہندوستان میں مقبول نہیں ہوا۔ آتش دان پر اہل خاندان کی تصویریں البتہ سجادی گئیں۔ ایک ہندوستانی روایتی مکان میں الماری کے بجائے دیواروں میں متعدد طاق اور طاقچے ہوتے تھے۔ اسی سے کسی چیز کو فراموش کرنے کے لئے بلائے طاق رکھ دینے کا محاورہ نکلا۔ پہلے بہت نیچے رنگین پاؤیوں کی کرسیاں جو سندلی کہلاتی تھیں مشتمل تھیں۔

بمبئی میں میں نے دیکھا کہ بہرے اور کھوجے ایک ہی قاب کے وسطی انبار میں سے پلاؤ زکال کر اپنے سامنے اسی قاب کے کنارے پر رکھ لیتے ہیں اور سب مل کر نوش کرتے ہیں۔ ان جماعتوں میں دین داری بھی مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے ذرا زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کے مولوی بھی ہمارے ایک عام ملاجی سے زیادہ پڑھے لکھے اور ہوشمند ہوتے ہیں۔ ساحل سمندر پر رہنے کی وجہ سے وہ بیرونی دنیا سے بہتر طور پر روشناس ہیں۔ بمبئی کے بہرے،

کھوجے اور میمن فرقوں کے افراد شمالی ہند کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تعلیم یافتہ اور باخبر کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر انڈو مسلم تہذیب کا نمائندہ محض شمالی ہند کا مسلمان ہی سمجھا جاتا ہے اور غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو تہذیبی لحاظ سے برتر سمجھتا ہے۔ مجھے یاد ہے بمبئی کے مشہور لطیفی خاندان کے ایک رکن دانیال لطیفی نے جو بڑے جید دانشور تھے۔ بہت ہی خفگی کے ساتھ مجھ سے کہا تھا آپ ہم لوگوں کو Barbarian سمجھتی ہیں۔ لطیفی صاحب اور ان کے رشتہ دار فیضی خاندان میں ایک سے ایک عالم پیدا ہوئے۔ فیضی صاحب جو عطیہ فیضی کے بھتیجے تھے اور مصر وغیرہ میں ہندوستانی سفیر بھی رہ چکے تھے بہت ہی عالم فاضل بزرگ تھے۔ ان کا ذخیرہ کتب بھی بیش بہا تھا۔ انہوں نے بھی مجھ سے ایک بار یہی شکایت کی تھی۔

فیضی اور طیب جی کے خاندان کی خواتین انیسویں صدی میں انگلستان جایا کرتی تھیں۔ عطیہ فیضی کی برنارڈ شا سے دوستی تھی۔ انہوں نے بمبئی کے ایک مراٹھی Speeking نومسلم یہودی مسٹر رحمین سے شادی کی تھی۔ جنہوں نے اپنی بیوی کا خاندانی نام اپنے نام میں شامل کر لیا تھا اور فیضی رحمین کہلاتے تھے وہ ایک بلند پایہ مصور تھے اور نئی دہلی کی وائسریگل لاج کے فریسکو یعنی دیواری تصاویر انہوں نے ہی بنائی تھیں۔ لیکن اب کراچی میں ان کا سورج نصف النہار سے اتر چکا تھا حکومت پاکستان نے ایک سرکاری عمارت جو شاید پہلے ایک میوزیم تھی انہیں رہنے کے لیئے دے دی تھی۔ وہاں عطیہ فیضی نے ایک تھری آرٹ سرکل قائم کیا تھا۔ جس میں کچھ ڈپلومیٹ وغیرہ ہفتے میں ایک بار جمع ہوتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں اس اجتماع کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ میری ایک دوست نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اس سے کہا کہ فلاں شخص ان کو بہت پسند کرتا ہے۔ اگر تم اتوار کے روز چار بجے فلاں پارک میں آجاؤ تو میں اس سے تم کو ملوا دوں گی۔ یہ بات بالکل ناقابل یقین تھی لہذا جب اس خاتون نے مجھے بتایا تو میں نے اس کی سنی انسنی کر دی۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے How the mighty fall یہی خاتون تھیں کہ جنہیں اس صدی کے آغاز میں ہمارے مسلمان نوجوان دانشور اپنا Ideal سمجھتے تھے۔ شاید سر عبدالقادر نے کہیں لکھا ہے کہ ایک دن یلدرم بے حد خوش خوش ان سے ملے اور کہا آج ایک ایسی خاتون سے مل کر آرہا ہوں جو نہ صرف آزادی نسواں کی محرک ہے بلکہ خود اس آزادی پر عامل بھی ہے۔ علامہ اقبال بھی عطیہ

فیشن کے معترف تھے۔ دراصل اس زمانے میں ایک اعلیٰ خاندان مسلمان لڑکی جو نہ صرف بے پردہ اور انگلینڈ Retaran بھی تھی یقیناً ایک عجوبہ روزگار رہی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے مسلمان ساحلی مسلمانوں کے مقابلے میں کس قدر پسماندہ اور فیوڈل رہے ہوں گے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گجرات اور ساحل کوکن کا مسلمان ان سماجی ضابطوں سے آزاد تھا جو شمالی ہند کے شاہی اور جاگیری ادوار کی دین تھے۔ نہایت انگریزیت زدہ پارسی اور دور دراز کے مغربی ممالک سے تجارت کرنے والے گجراتی ہندو اس کے پڑوسی تھے تمدنی اعتبار سے بھی وہ ایک دوسرے کے نزدیک تھے اور فلاں ابن فلاں کے بجائے پیشوں کے اعتبار سے جانے جاتے تھے۔ سوڈا واٹر والا۔ باٹلی والا۔ پارسی ہندو اور مسلمان تینوں ہو سکتے تھے۔ محنت کے ذریعے حصول دولت ان کا مقصدِ حیات تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس دولت کا ایک حصہ بہبائے عام پر خرچ کرتے تھے۔ ایک ساحلی مسلمان شمالی ہند کے مسلمان کے مقابلے میں زیادہ باخبر اور عمل پسند تھا۔ جغرافیائی اور تاریخی حالات نے اسے شمالی ہند کے اہل اسلام کے مقابلے میں زیادہ پریکٹیکل بنا دیا تھا۔ اس کی دین داری کا یہ عالم تھا کہ روپیہ شو بنک میں رکھ کر سود خوری نہیں کرتا تھا بلکہ اس روپے سے جائیداد خریدتا تھا۔ چنانچہ شہر بمبئی کی Real Estate کے مالکوں میں مسلمانوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ وضع قدیم کی پابندی ایسی ہے کہ میں نے چند سال قبل تک بمبئی میں برقع پوش عورتوں کو کار چلاتے دیکھا ہے انہوں نے نقاب الٹ رکھی تھی اور فراٹے سے ڈرائیو کرتی نکل جاتی تھیں۔ ان تینوں فرقوں میں سے میمن ایک غیر معمولی طور پر خوش شکل قوم ہیں۔ گورے چٹے اور نہایت تیکھے اور عمدہ خدوخال۔ یہ ایرانی النسل بھی نہیں ہیں۔ افغان بھی نہیں پھر یہ کون ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جنوبی ہند کی تیز دھوپ نے ان کی سرخ و سفید رنگ میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ کرگ میں ایسی ہی ایک بے حد خوش شکل قوم آباد ہے جو مذہباً ہندو ہیں۔ نیلی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت۔ ان کے لئے کہا جاتا ہے کہ ان قدیم یونانیوں کی اولاد ہیں جو ڈھائی ہزار سال قبل بسلسلۂ تجارت ہندوستان آئے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ نسلی تسلسل بھی کم تعجب خیز نہیں۔ شکل وصورت رنگت عادت وخصائل کس طرح ایک پیڑھی کے بعد دوسری پیڑھی میں منجمد رہے یعنی صنعتی انقلاب نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اس کا ایک نظارہ میں نے سندھ میں دیکھا جس

کا میں پہلے بھی تذکرہ کر چکی ہوں۔یعنی موہن جوداڑوں کے میوزیم کے باہر ایک سندھی دیہاتی بالکل اسی وضع کی بیل گاڑی ہانکتا ہوا جارہا تھا اور اس کا عظیم جثہ پگڑ بھی عین میں اسی وضع کا تھا جیسا میوزیم کے ان مورتیوں اور باریلف کی دیواری تصاویر میں دکھلایا گیا تھا جو آج سے پانچ ہزار سال قبل گڑھی گئی تھیں اور اس میوزیم کے اندر موجود تھیں اللہ ہو اکبر۔

اس قسم کے نظارے کے لیے انگریزی میں ایک اصلاح ہے Mind-Boggling لیکن سارے ہندوستان کے مختلف خطوں میں عورتیں جو لباس پہنتی ہیں وہی لباس ہمیں مغل اور گجراتی مینا طوری تصاویر میں بہت ہی کم رد و بدل کے ساتھ نظر آتا ہے۔زیورات تو بالکل وہی ہیں جو آج سے سینکڑوں سال پہلے پہنے جاتے تھے۔لیکن ہم یوروپ یا انگلستان جائیں تو عہد الزابیتھ اوّل بہت دور کی بات ہے ہمیں انیسویں صدی کی وضع کے پوشاک بھی اب نظر نہیں آئے گی۔صنعتی انقلاب کے بد سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن نمایا فرق پہلی جنگ عظیم نے پیدا کیا۔جب مغرب کی عورتوں نے لمبے سائے ترک کیے اور گھٹنوں تک کے فراق پہننے لگیں۔اور اپنے لمبے بال ترشوالئے کیونکہ ان کی زندگیاں زیادہ مصروف ہو گئی تھیں۔ غریب طبقے کے افراد کو فیکٹریوں میں ملازمت مل گئی۔گھریلو ملامین رفتہ رفتہ غائب ہونے لگے۔پہلے ایک خوشحال انگریز کے گھر میں پانچ چھ ملازم مرد عورتیں کام کرتی تھیں اب ایک یا دو ملازم ہی رہ گئے۔خودکار مشینوں کے استعمال کی وجہ سے کیچن کا بھی نقشہ بدل گیا۔

ہندوستان کی آزادی اور قیام پاکستان نے مزید تبدیلیاں پیدا کیں۔انگلستان میں خوشحالی بڑھی۔گھریلو ملازمین اب دوسرے کام کرنے لگے یا جوق در جوق اسٹریلیا اور کینیڈا وغیرہ چلے گئے۔ان کی جگہ معمولی کام کرنے کے لئے بڑی تعداد میں پنجابی وہاں پہنچ گئے۔ہیدوائر پورٹ پر سکھ عورتیں جاروب کشی میں مصروف ہوئیں۔ انگلستان میں اور سارے مغرب میں معمولی کام کرنے کو کسرشان نہیں سمجھا جاتا لیکن ہمارے یہاں عزت اور بے عزتی بہت بڑا ذاتی مسئلہ ہے۔مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں لندن سے واپس آرہی تھی اور نورافشاں جو کراچی سے وہاں گئی ہوئی تھی مجھے خدا حافظ کہنے ائرپورٹ پر آئی تھیں۔ہم لوگ ایک ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک سردارنی جھاڑو لئے کمرے میں داخل ہوئی اور ہمیں دیکھ کر بے طرح جھپی اور ایک آدھ ہاتھ ادھر اُدھر لگا کر فوراً باہر چلی گئی۔

لندن میں بے انتہا دولت مند ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا ایک نیا طبقہ بھی نمایا ہوا۔ Death Tax نے انگریز امرا کو مالی اعتبار سے تباہ کردیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے شاندار کنٹری ہاؤس ہندوستانی اور پاکستانی تجار اور عرب عیش پرستوں کے ہاتھ بیچ کر آسٹریلیا وغیرہ جارہے تھے۔ ان نئے دولت مند عربوں اور ہندوستانی و پاکستانی نودولتے تجار کے لئے ان ہی کی بدمذاقی کے مطابق چمکیلا، بھڑکیلا سامانِ آرائش بھی بازاروں میں ملنے لگا تھا۔ انگریز ایک بنیادی طور پر چالاک دکاندار قوم ہے۔ اس نے یہ دیکھا کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے نئے دولت مند بیش قیمت تصاویر، نوادر یا اعلیٰ درجے کا خوش مذاق کا سامان آرائش خریدنے کے بجائے بھڑکدار چیزیں خرید رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمان اپنی خوش مذاقی اور نفاست کے لئے مشہور تھے لیکن اب ان کو بمبئی کے بھنڈی بازار یا دلی کے جامع مسجد ایریا کے لوگوں کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ لندن میں عربوں کے لئے بھی انتہائی بدمذاقی کی تصاویر چمکیلا اور بھونڈہ سامانِ آرائش فروخت کیا جارہا تھا جسے عرب اونچے داموں پر جوق در جوق خرید رہے تھے۔ الٰہی مسلمانوں کو کیا ہوگیا۔

ایک مرتبہ امپرنٹ کے دفتر میں اسی قسم کا کوئی تذکرہ ہورہا تھا تو میرے ایک مرہٹہ رفیق کار اپارناڈے نے مسلمانوں کے متعلق نہایت خوش دلی سے کہا تھا کوئی بات نہیں We will teach them culture. یہ سن کر میں دنگ رہ گئی تھی۔ انقلاب زمانہ اسے کہتے ہیں۔ آج بھی بمبئی میں مسلمان لڑکیاں بالوں میں ربن لگائے گھیردار فراک نما چکیلی قمیض اور چکیلی شلوار میں ملبوس الگ سے پہچان لی جاتی ہیں اور ان کا اسٹائل بھنڈی بازار نسٹ کہلاتا ہے۔ یہ ترقی معکوس کا تہذیبی تنظر کی کیا وجہ ہے۔ نئی مسلم مڈل کلاس نہایت خوشحال ہے۔ لیکن خوش ذوقی سے عاری۔ کیا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فیوڈل طبقہ جو ان معاملات کی رہنمائی کرتا تھا معدوم ہو چکا اور اس کی جگہ کمرشیل کلاس نے لے لی۔ ان کے یہاں دولت کی فراوانی اور نمائش پسندی تو تھی لیکن خوش ذوقی کا فقدان تھا۔ انگلستان میں جب نئی نویلے امیروں نے مفلوق الحال لارڈس کے محل خرید کران کو بھی بقول شخصے بھنڈی بازار بنادیا ہے۔ اس کی ایک بہت ہی محیر العقول مثال امریکا میں دیکھی جہاں اس نوع کے نئے دولت مند ہندوستانی و پاکستانی بافراط آباد ہیں۔ کیلفورنیا کی ایک پارٹی پر ایک سردار جی

کا تحفہ، باغ میں ایک آبشار اور ہرن۔ دو تین چھوٹے آبشار اندر کمروں میں بھی گر رہے تھے۔ مکان کیا تھا طلسمات و عجائبات کی نمائش گاہ۔ سردار جی مارے خاطر داری کے بچھے جا رہے تھے۔ ان کی بھی وہی داستان تھی۔ چند ڈالر جیب میں ڈال کر امریکا آئے تھے۔ ایک اور صاحب جنھوں نے میری دعوت کی اور زیادہ قابلِ تعریف تھے کہ وہ کافی کم سنی میں اتنے بڑے ٹائی کون بن گئے تھے وہ پاکستانی تھے اور وہ بھی قسمت آزمانے کے لئے یہاں آپہنچے تھے۔ لیکن وہ بہ لحاظ پیشہ ڈاکٹر تھے اور ان کی پریکٹس یہاں ماشاء اللہ خوب چمکی ہندوستانی اور پاکستانی ڈاکٹروں کی مغرب میں اس کامیابی کی ایک وجہ بہت دلچسپ ہے۔ ایک عام مغربی ایک سانولے ہندوستانی پاکستانی ڈاکٹر کو ایک قسم کا ساحر ہی سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں ان لوگوں کے پاس کوئی خفیہ جادو منتر ہے۔ جس سے وہ مریضوں کو صحت یاب کر دیتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مقامی انگریز یا امریکن ٹھیک پانچ بجے شام اپنا دفتر بند کر کے کسی پب میں جا بیٹھتا ہے جبکہ ہندوستانی یا پاکستانی جو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی غرض سے یہاں آیا ہے اپنی دکانیں دیر تک کھلے رکھتا ہے اور وہ سیلز مین یا سیلز گرلز کو ملازم نہیں رکھتا بلکہ اس کے اپنے گھر کی عورتیں دکان میں کام کرتی ہیں۔ چنانچہ اتنا پیسہ وہ اِدھر بچا لیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت مند ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کا کاروبار مزید پھیلتا ہے تو وہ اپنے آبائی وطن ہندوستان یا پاکستان سے اپنے گاؤں والوں کو بھی بلا لیتا ہے۔ جو وہاں جم کے محنت کرتے ہیں۔

اسی طرح گویا انیسویں صدی امریکا کی داستان دہرائی جا رہی ہے جب یوروپ سے مفلوک الحال مہاجروں نے یہاں پہنچ کر جی توڑ محنت کی اور ان امیر کبیر بن گئے۔ اسی وجہ سے امریکہ سنہرے مواقع کا دیس کہلایا۔ لیکن برطانیہ کے ان سانولے مہاجرین نے یہاں کی کلچر اور مذہب اختیار نہیں کیا چنانچہ جا بجا گردوارے، مساجد اور سوامی نرائن کے مندر نظر آتے ہیں۔ میں نے پہلے کہیں ذکر کیا ہے کہ لندن کے انتہائی مہنگے اور عالی شان محلے میں جہاں پہلے محض لارڈ اور دوسرے امرا رہتے تھے اب ان بھوری عمارتوں کی قطار میں اچانک ایک نارنجی رنگ کا دروازہ نظر آ جاتا ہے۔ اور اس دروازے کے اندر ایک سناتن دھرم مندر۔

سجا سجالے جلدی سے مندر کرشن کے درشن ملیں گے اندر کہاں؟ لارڈ جیمز کورڈن کے ٹاؤن ہاؤس کے متصل کنہیا جی کے مندر میں۔

منگل کے روز گجراتی ناریاں رنگ برنگے لہنگے پہنے سر پہ رنگین گاگرے دھرے ہائیڈ پارک جا کر گربا ناچتی ہیں۔ رے واگے بندرابن ما بانسریا خوب خوب بجالیتا۔ برطانیہ پر ہندوستانی اور پاکستانی تہذیبی یلغار حیرت انگیز ہے۔ بعض محلے تو ایسے ہیں جن میں کوئی انگریز نظر آجائے تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ بچارہ کہاں سے آنکلا۔ میں کہیں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ Harrow کے مشہور و معروف انتہائی اپر کلاس اسکول میں اب گجراتی پٹیل بچوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ برطانیہ کی بیرونی جنگوں میں فتوحات کا آغاز ایٹین اور ہیروان کی اسپورٹس فیلڈ سے ہوا۔ لیکن اب دنیا کا نقشہ بدل چکا ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

مجھ سے ایک بار ایک انگریز صحافی نے لندن میں پوچھا تھا کہ برطانوی دور کا آپ کو کوئی ایسا واقعہ یاد ہے جس میں کسی انگریز نے کسی ہندوستانی کی صریحاً توہین کی ہو۔ میں نے کہا میرے والدین کے متعدد دوست نہایت مہذب انگریز خاندان تھے لیکن بدتمیزی کا محض ایک واقعہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ ہم لوگ غازی پور سے آکر ڈالن والا کی ایک کوٹھی حسنین منزل میں ٹکے تھے جس کے مالک خان بہادر سید علی حسنین جو سروے آف انڈیا سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ اپنے کنبے کے ساتھ محلہ کرن پور میں رہتے تھے ان کے برابر کی کوٹھی میں نجف علی خان قیام پذیر تھے جن کے بھانجے ۱۹۴۷ کے ایک نامور پاکستانی ڈپلومیٹ بنے۔

ہم لوگوں نے حسنین منزل میں قیام کیا اور والد مرحوم حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ پچھلے برآمدے کے عین مقابل میں کچھ فاصلے پر ایک انگریز کی کوٹھی تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ اور اماں دن بھر دھوپ میں زیادہ تر وقت اسی برآمدے میں گزارتی تھیں۔ ایک روز اسی برآمدے میں پلنگ پر بیٹھی ایک خانساماں جی سے بات کر رہی تھیں جو پہلے کبھی ان کے یہاں کام کر چکے تھے اتنے میں انہوں نے اچانک کہا ارے زلزلہ۔ میں بھی وہیں موجود تھی مگر میں نے تو شاید زمین کی جنبش محسوس نہیں کی لیکن وہ منظر پوری طرح یاد ہے۔ اگلے روز اخبار سے معلوم ہوا کہ عین اسی وقت بہار میں بھونچال آیا تھا اور وہ کتنا زبردست زلزلہ رہا ہوگا کہ اس کا اثر دہرہ دون کے حسنین منزل تک پہنچا۔ اگر سوچئے کہ ہم سب ایک زیر زمین آتش فشاں پہاڑ کے اوپر بیٹھے ہیں اور کسی لمحے بھی ہمارے

پاؤں تلے کی یہ زمین آگ اور لاوا اُگل سکتی ہے۔ شاید قیامت بھی اچانک اس طرح آئے گی۔ یہ جب پومپی آئی پر ناگہانی قیامت ٹوٹی تھی تو وہ لوگ بھی اپنے اپنے مکانوں میں آرام سے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں گے۔ یا جب کوئٹے میں زلزلہ آیا۔ ناعاقبت اندیش دنیا کتنی بے خوفی سے آگ سے بنے ہوئے اس گولے کی سطح پر جی رہی ہے اور اسے قطعی خیال نہیں آتا کہ کسی لمحے بھی وہ نست و نابود ہو سکتی ہیں۔ جب مذہبی لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ تو انہیں Prophets of Doom پکارا جاتا ہے۔

ایک اتوار کے روز عقبی کوٹھی والے انگریز اپنی چھت پر جمع ہوئے اور گراموفون کا ریکارڈ لگا کر وہاں ناچنے لگے۔ اتنے میں ایک گورے نے ایک کنکر اٹھا کر ہمارے آنگن میں پھینکا۔ والدہ آگ بگولہ ہو کر انہیں گاڑی نکلوائی اور کلکٹر ضلع کے یہاں پہنچ گئیں۔ مجھے یاد نہیں کلکٹر انگریز تھا یا ہندوستانی بہر حال اماں نے اس واقعے کی رپورٹ کی۔ متعلقہ افسر نے معافی چاہی اور دوسرے روز سے وہ بدتمیز گورے اور ان کی میمیں چھت سے غائب ہو گئے۔ اماں کی دوستوں کو بھی اس واقعہ کا علم ہوا۔ یہ گورے ٹامی زیادہ تر لندن کے مزدور پیشہ کوکنی (Cocokney) ہوتے ہیں۔ ہندوستان آتے ہیں تو عام ہندوستانی انہیں بڑا صاحب سمجھتا ہے اور وہ اپنی اس نئی حیثیت کا خوب خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب مجھے یاد آیا اماں نے ضلع کلکٹر سے یہ بھی کہا تھا کہ اس وقت جو اہلِ ہند ہندوستان کے آزادی کا زور و شور سے مطالبہ کر رہے ہیں ان حالات میں آپ کو اس پر متعجب نہیں ہونا چاہیے تو کیا غلط کر رہے ہیں۔ اس کانگریس ایجیٹیشن پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ پھر اس کے تقریباً اٹھارہ بیس سال بعد لندن میں چند گوروں سے ملاقات ہوئی تو جن میں سے ایک کسی عمارت کا چوکیدار تھا اور دوسرا ابھی کسی دوکان میں کام کرتا تھا اس زمانے میں ابھی برطانیہ پر ہندوستانیوں کی یلغار نہیں ہوئی تھی اور ساڑی پوش خواتین خال خال ہی نظر آتی تھیں تو مجھے دیکھ کر بڑی خوشی اور اپنایت سے کہا تھا کہ میں بھی پریزیڈنسی میں رہ چکا ہوں اور اپنے عہدے کا نام بھی بتایا تھا جواب مجھے یاد نہیں۔ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگریس پارٹی آف انڈیا دونوں کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ اور کانگریس ہی ہندوستانیوں کے ایک نمائندہ جماعت تھی اس کے چند سال بعد ہی سیاسی پارٹیوں میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔

چنانچہ والدہ مرحومہ جو اپنے زمانے کی ایک پیشرو خاتون تھیں اور اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئیں تھیں انہوں نے نو عمری ہی میں اپنی مضمون نویسی کی دھاک بیٹھادی کہ شمس العلماء ممتاز علی نے ۱۹۱۰ میں انہیں ہفتہ وار اخبار "پھول" کا باقاعدہ ایڈیٹر مقرر کیا۔ غالباً وہ اس وقت ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جنہیں اس کم سنی میں اتنی بڑی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ لیکن وہ زمانہ ذاتی Publicity اور پبلک ریلیشنز کا نہیں تھا۔ چنانچہ اس قسم کے غیر معمولی واقعات کا کوئی چرچہ نہیں ہوتا تھا۔ اب آپ آج سے نوّے سال قبل کی صحافتی صورتحال کا جائزہ لیجئے اردو میں رسالے اور اخبارات نہایت آب وتاب سے شائع ہو رہے ہیں۔ بلند معیار، اعلیٰ درجے کے لکھنے والوں کی ٹیم ایک نئی تہذیبی زندگی کا جوش و خروش۔ مسلمان عورتیں حالانکہ عام طور پر پردہ نشین ہیں لیکن یہ نئی جاگیرتہ زنان خانون میں پہنچ چکی ہے۔ ان کے لئے رسالے شائع ہو رہے ہیں وہ مضامین اور کتابیں بھی تصنیف کر رہی ہیں۔ ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم والیائے بھوپال اس وقت مسلمان خواتین کی لیڈر ہیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان سے قبل تین اور بیگمات بھوپال بطور فرمانرواں تخت نشین رہیں۔ سلطان جہاں بیگم مسلم یونیورسٹی کی پہلی چانسلر بھی مقرر ہوئیں۔ اس وقت غالباً کوئی اور خاتون کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی چانسلر نہیں تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسلمانانِ ہند ایک بہت ہی پسماندہ قوم تھے اور ان کی عورتوں کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی۔ حالانکہ عورتوں کی حالت سوائے بنگال، مہاراشٹر اور مدراس کی نئی ہندو مڈل کلاس کے علاوہ سارے ہندوستان میں کچھ بہت زیادہ تابناک نہیں تھی۔ لیکن پسماندگی کا لیبل مسلمانوں پر ایسا چسپاں ہوا جو اتارے نہیں اترتا۔ ہر ہائنس نے جب بنتِ نذر الباقر کے مضامین پڑھے اور ان کی ذہانت کا چرچہ سنا تو انہوں نے نذر الباقر صاحب کو اس مضمون کا خط بھیجا کہ وہ بنتِ نذر الباقر کو اپنا سکریٹری مقرر کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن میر صاحب نے ادب کے ساتھ ان کی یہ فرائش قبول نہیں کی۔ بہ فرض محال اگر خان بہادر صاحب نے فرمانروائے بھوپال کی یہ پیشکش منظور کرلی ہوتی تو ان کی صاحبزادی کی زندگی کوئی اور رخ اختیار کرلیتی اور شاید ان کی شادی بھی کہیں بھوپال ہی میں ہو جاتی۔ مگر آج سے پون صدی قبل کے سماجی حالات بالکل مختلف تھے۔

دراصل بنتِ نذرالباقر کاارادہ ڈاکٹری پڑھنے کا تھا اوران کے والدان کو لدھیانہ بھیجنے کے لئے تیار بھی ہوگئے تھے کیونکہ مسلمان لیڈی ڈاکٹر تقریباً ناپید تھیں۔ان کا خیال تھا کہ مسلمان لیڈی ڈاکٹر مستورات کے لئے بہت ضروری ہیں۔مگر کمزوری بصارت کی وجہ نذروزہرا بیگم ڈاکٹری نہ پڑھ پائیں۔گوتصنیف وتالیف کاشغل برابر جاری رکھا اورناول ''اختر النساء بیگم'' پہلے قسط وار ''تہذیب نسواں'' میں شائع ہوکر بے حد مقبول ہوا۔لہٰذا اسے کتابی صورت میں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ۱۹۱۱ میں پیش کیا۔ اس نام کا ایک ناولٹ جومنشی ارشد تھانوی نے تصنیف کیا تھاوہ صدیق بکڈپو لکھنؤ نے ۱۹۲۲ میں شائع کیا۔ لیکن اس ناولٹ کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ارشد تھانوی مشہور کتاب بہشتی زیور کے مصنف تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد کتابیں تصانیف کی ۔مثلاً حسن تخیل۔بیاض ارشد، اجتماع ضدین۔آثار سانچی، مسئلہ ازدواج۔ومترجم طواف زمین وغیرہ۔بنتِ نذرالباقر کا ناول'' اختر النساء بیگم کی غالباً تقلید میں منشی ارشد تھانوی نے اپناناولٹ اختر النساء بیگم لکھا۔گو دونوں کاپلاٹ تقریباً یکساں ہے۔بنت نذرالباقر کے اختر النساء بیگم کے والد دوسری شادی کرلیتے ہیں۔جس کی وجہ سے ہیروین کوبہت مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔لیکن وہ اپنی ذہانت اورصلح کل طبیعت کی بدولت تمام مشکلات پر فتح حاصل کرتی ہے۔منشی ارشد تھانوی کے ناولٹ میں اختر النساء بیگم بن ماں کی لڑکی ہے جواپنے ماموں ممانی کے یہاں پرورش پاتی ہے۔اوراس کی شادی اپنے خالہ کے بیٹے کے بجائے کہیں اور ہوجاتی ہے بعد میں ممانی اپنی لڑکی کواختر النساء کی سوتن بناکراس کے گھر میں بھیج دیتی ہیں۔شوہر اختر النساء بیگم کواپنے گھر سے نکال دیتا ہے اوروہ اپنے مصائب بڑی بہادری سے جھیلتی ہیں آخر میں شوہر انہیں واپس بلالیتے ہیں۔دونوں ناول اس وقت کے رواج کے مطابق اصلاحی ناول تھے ارشد تھانوی کا ناولٹ بیالیس صفحات کا کتابچہ ہے جبکہ بنتِ نذرالباقر کا اختر النساء بیگم دوسو پچاس صفحات کا ناول اورنہایت دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔اسی وجہ سے نہایت بے حد مقبول ہوا۔

ابھی ادبی تنقید بھی اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔چونکہ اس زمانے میں رسالوں میں کتابوں پرتبصرے اورتنقیدی مضامین وغیرہ بہت کم چھپتے تھے چنانچہ بنتِ نذرالباقر اور ارشد تھانوی کے اس تواردکا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔

بنت نذر الباقر کا اختر النساء بیگم جو اس صدی کی پہلی دہائی میں لکھا گیا یعنی آج سے تو ے سال قبل اس کی ہیروین کو جب گھر سے نکال دیا جاتا ہے تو ایک فرضی نام اختیار کر کے وہ زندگی خود آپ بناتی ہے۔ وہ فرضی نام اختیار کرنا کچھ Fantasy معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے مشن یعنی تعلیم نسواں اور حریت نسواں کے پرچار کی غرض سے اس قسم کی Fantasy نوعمر مصنفہ کے نزدیک بالکل جائز رہی ہوگی۔ اسی طرح اس مصنفہ کے ایک اور ناول کی ہیروین میڈیکل کالج میں داخل ہوتی ہے جہاں وہ لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ چونکہ بے حد حسین ہے اپنے چہرے پر کالا پاؤڈر لگایا کرتی ہے۔ تاکہ بدصورت نظر آئے۔ آج ہمیں قصے کا یہ پلاٹ بے حد غیر حقیقی مضحکہ خیز معلوم ہوگا اور مصنفہ کی سادہ لوحی پر شاید ہنسی بھی آئے جیسا کہ پہلے لکھا گیا۔ اپنے مشن کی تکمیل کے جوش میں مصنفہ نے ہیروین کے چہرے پر کالا پاؤڈر لگوا دیا۔ یعنی اس وقت جبکہ دوسرے فرقوں اور قوموں کی عورتیں حسین نظر آنے کے لئے میک اپ کر رہی تھیں۔ ہماری بچاری مسلمان ہیروین اپنے سماج کے ضابطوں اور پابندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے آپ کو بدنما بنا کر باہر نکلتی تھیں۔ چونکہ میڈیکل کالج کی تعلیم وہ نقاب پوش رہ کر حاصل نہیں کر سکتی تھی، اپنا چہرہ چھپانا ممکن نہیں تھا لیکن خود کو بدصورت ظاہر کرنا اس کے بس میں تھا۔

یہ ناول کا ایک بہت چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس زمانے کے حالات پر غور کیجئے جب پردے کی کتنی شدت تھی اور مسلمان لڑکیوں پر کتنی پابندیاں عاید تھیں۔

اسی طرح نذ سجاد حیدر کے ایک اور ناول "ثریا" میں ہیروین ایک اینگلو انڈین کورلس کا روپ دھار لیتی ہے مطلب یہ کہ اس وقت سماج میں اگر آزادیاں حاصل تھیں اور عورتیں اپنا خود مختار کیریر بنا سکتی تھیں تو زیادہ تر برہمو بندو، بنگالی، اینگلو انڈین، کرسچین یا پارسی خواتین ہی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے کانگریس تحریک نے زور پکڑا ہندو خواتین بھی میدان سیاست میں اتر آئیں۔ لہذا ہمارے فکشن رائٹرز کے لئے اب متعدد ٹائپ موجود تھے پہلا تو وہی روایتی نازک اندام، پردہ نشین حسینہ (بقول ہماری پنجابی رائٹر دوست اجیت کور حسینہ مہہ جبینہ) دوسرے کالج کی تعلیم یافتہ ماڈرن مس، تیسرے کندھے سے

جھولا آویزاں کئے سیاسی ورکر یا Wemenslib کی قائد۔

اب عورتوں کی آزادی اتنی عام چیز ہوگئی ہے کہ اس کے متعلق کوئی نئی بات کہنے کے لئے نہیں رہی۔ سوائے اس کے کہ اب ذرا تھوڑی سی پابندی لگانی ضروری ہے۔ ورنہ حد سے زیادہ آزاد معاشرے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ امریکا میں اگر آپ اپنے بچے کو زیادہ ڈانٹئے تو وہ فوراً پولس کو ٹیلی فون کر دیتا ہے۔ امریکا شخصی آزادی کے علاوہ ٹیکنالوجی میں ترقی کی اس اسٹیج تک پہنچ چکا ہے جہاں اس کے نزدیک باقی دنیا والے ابھی محض جنگلی ہیں۔ مجھے چند سال قبل برلن میں ایک جرمن لڑکی نے بتایا کہ جب وہ امریکا گئی تو ایک امریکن خاتون نے اس سے پوچھا کہ کیا جرمنی کے لوگ ندی پر جا کر کپڑے دھوتے ہیں۔ جب جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک ایک اوسط درجے کے امریکن کے خیال میں اس قدر پسماندہ ہے تو بھلا ہندوستان کے لئے وہ لوگ کیا سوچتے ہونگے کہ ہم لوگ بطور زیبائش ناک میں سیفٹی پن آویزاں کر کے گھاس کی بنی ہوئی اسکرٹ پہنتے ہونگے۔ انگلستان میں ایک انگریز خاتون نے ایک ہندوستانی لڑکی کے سنگھار میز پر مچھلی نما بلوری شیشی دیکھ کر پوچھا تھا کیا یہ تمہارا ایک خدا ہے۔ لڑکی نے جواب دیا نہیں یہ تو عطر دان ہے۔ لیکن خدا میں تمہیں ابھی دکھاتی ہوں۔ پھر اس نے الماری میں سے ایک گنپتی نکال کر اس لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔

ایک مشہور چینی فلسفی کی تصنیف کا عنوان ہے The Cloud of Unknowing لاعلمی کا بادل۔ اور یہ بادل بے حد تعلیم یافتہ مغربی معاشرے پر سب سے زیادہ چھائے ہوئے ہیں۔

نذر سجاد حیدر کی تصنیف ثریا (۱۹۳۰) اس طرح شروع ہوتی ہے۔ سر چندر لال کا لڑکا سندر لال کرجی بیرسٹری پاس کر کے انگلستان سے لوٹا ہے اور اس کی خوشی میں اس کے گھر پر ڈنر پارٹی دی جارہی ہے۔ پارٹی میں ازابیلا تھوبرن کالج کی چند لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ زمانہ ۳۰۔۱۹۲۰ کی دہائی کا ہے۔ یعنی ہندوستان کی برٹش کولونیل سوسائٹی کی طرز زندگی۔ ناول کے کردار اس عہد کے افکار و اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اپر مڈل کلاس کے نوجوان ولایت جاکے بیرسٹری پڑھتے ہیں ان کے خاندانوں کی لڑکیاں بھی اگر وہ ہندو ہیں تو زیادہ کالجوں میں پڑھ رہی ہیں۔ اور مسلمان لڑکیاں بھی اگر اکا دکا کالج جارہی ہیں تو بڑی

قابلِ ذکر بات ہے۔ ناول کی ہیروین ثریا بھی ازابیلا تھوبرن کالج فرسٹ ائر میں پڑھ رہی ہے۔ عمر چودہ سال روایتی ہیروئنوں والا سن وسال۔ یہ مصنفہ نے اپنی ساری جدت پسندی کے باوجود ہی روایت پرستی اختیار کی یعنی ہیروین محض چودہ سال کی ہے۔ لیکن انتہائی ہوشمند اور عاقل ودانا۔ کیونکہ ہیروئن کا مجموعہ خوبی ہونا ضروری ہے۔ یہاں ہندوستان کے ناول نگار اٹھارہویں صدی انگلستان کی پیروی کر رہے تھے۔ جہاں اس زمانے کی ہیروئن نہایت کم سن لیکن بے حد عقل مند اور حسین ہوتی تھیں۔ اگلی صدی آتے آتے ناولوں میں انگریزی حقیقت پسندی آگئی تھی۔

ناول ثریا کے آغاز ہی میں ہیرو ہیروئن سے مل کر اظہار مسرت کرتا ہے کہ وہ ایک کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے یعنی ناول میں قدم قدم پر تعلیم نسواں کا پرچار کیا جارہا ہے۔ ایک Point کو شروع ہی میں اظہار کر دیا جاتا ہے کہ ناول میں ہندو مسلم رومانس کی گنجائش نہیں ہیرو ہندو لڑکی مس موہنی چندر لال کو سگی بہن کی طرح مانتا ہے۔ یہ معاملہ صاف ہو جانے کے بعد قصہ آگے بڑھتا ہے کیونکہ اس مسئلہ پر یعنی ہندو مسلم شادی کے موضوع پر مصنفہ نے بعنوان ''مذہب اور عشق'' ایک ناول الگ سے لکھا جو غالباً ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ نواب صاحب کیواں قدر کا اس پارٹی میں ثریا کو دیکھتے ہی Love at first Sight ہو جاتا ہے۔ سندر لال ککڑجی نواب کیواں قدر ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ یہ دوستی قومی یکجہتی کے نظریے سے نہیں دیکھلائی گئی بلکہ اس وقت کی اعلیٰ سوسائٹی میں کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں کا پردہ اور ہندوؤں کی چھوت چھات مڈل کلاس کی خصوصیت تھی۔ بالائی طبقے میں بھی عموماً ہندو خواتین مسلمانوں کے یہاں کھاتی پیتی نہیں تھیں مگر اس پابندی کا برا نہیں مانا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان مرد عموماً ایک دوسرے کے یہاں خورد ونوش کرتے تھے۔ لیکن بعض ہندو گھرانوں میں ان کی قدامت پرست مہیلائیں وہ برتن الگ رکھوا دیتی تھیں جن میں مسلمان دوستوں کے لئے کھانا پروسا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں شیعہ فرقہ ہندوؤں کے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا تھا۔ ان کے یہاں پانی میں تین مرتبہ غوطہ دے کر پاک کرنے کا دستور بھی تھا۔ لہٰذا اگر کپڑے کسی ہندو دھوبی نے دھوئے ہیں تو انہیں گھر میں دوبارہ تین مرتبہ پانی کا غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ پانی کی ناپاکی کا یہ عمل اور دستور مشرقی

ممالک کی خاصیت رہی ہے۔ مغرب میں اس قسم کی کا کوئی پابندی نہیں کہ آپ گرجا میں نہا دھو کر ننگے پیر جائیں۔ سینٹ پال نے مغرب میں عیسائیت کے فروغ کی خاطر وہ بہت سی پابندیاں اٹھالیں جن کی موجودگی میں سرد ممالک کے باشندے شاید یہ نیا ایشیائی مذہب قبول نہ کرتے۔ مثلاً لحم خنزیر۔ یہودیوں کے یہاں وہ حرام ہی رہا لیکن عیسائیوں نے اسے کھانا جائز قرار دیا۔ شراب نوشی کا بھی یہی معاملہ رہا کہ موسم سرما میں اپنے آپ کو سردی سے بچانے کے لئے شراب نوشی لازمی سمجھی گئی۔ چائے اور قہوہ تقریباً زمانہ حال کی دریافت ہیں۔ یوروپ میں سردی سے بچنے کا واحد نسخہ شراب تھی جواب ان کی زندگیوں کا ایک لازمی جز بن چکی ہے۔ علاوہ ازیں خود ان کی کلیسائی عبادت کی رسوم میں شراب شامل ہے۔ عیسائی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے اپنی آخری ضیافت کے موقعے پر ایک ہاتھ میں جامِ شراب اور دوسرے میں روٹی کا ٹکڑا لے کر فرمایا تھا کہ یہ میرا خون ہے اور یہ میرا گوشت۔ چنانچہ گرجا کے Holy Communion کے موقعہ پر پادری روٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تقسیم کرتا ہے جو گویا لحم عیسو ہیں، اور شراب کا گلاس گویا عیسو کا خون ہے۔ اور وہ اس گلاس میں سے سارے عبادت گذار باری باری ایک ایک گھونٹ پیتے ہیں یہ مسیحی عبادت کا ایک بنیادی جز ہے۔ انسانی فطرت کا قاعدہ ہے کہ وہ دوسروں پر معترض ہوتا ہے اور ان کو اوکھا بھی سمجھتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مشرقی مذہب میں Holy Communion جیسی کوئی رسم موجود ہوتی اور مغرب میں ایسی ناپید ہوتی تو یہی اہل مغرب ایشیائیوں کو مطعون کرتے کہ یہ اپنی عبادت کے دوران ایک دوسرے کا جھوٹا پانی پیتے ہیں مگر مثل مشہور ہے کہ اپنی آنکھ شہتیر دیکھلائی نہیں دیتا اور دوسرے کے آنکھ کا تنکا فوراً نظر آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں لاعلمی کی وجہ سے ایک دوسرے کے مذاہب کے متعلق غلط اور بے بنیاد مفروضات بھی عام ہیں۔ جن کی فہرست یہاں گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ مذاہب عالم نے انسانیت کو متحد کرنے کے بجائے ان میں خوب خوب تفرقے ڈالے۔ جنگیں لڑوائیں اور تعصبات کی فصلیں کھڑی کردیں۔ خود ایک مذہب کے مختلف فرقوں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ شیعہ اور سنی کے مابین جو خوفناک غلط فہمیاں موجود رہی ان کا ہم سب کو اندازہ ہے۔

نذر سجاد حیدر کے ناولوں میں اور اس عہد کے دوسرے ناول نگاروں کے یہاں

بھی ہندو مسلم سیاسی لڑائی کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ محض ایک مخصوص طرز معاشرت کی تصویر کشی کی گئی ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان مجھے یاد پڑتا ہے کہ پریم چند کے ناول "چوگانِ ہستی" میں اشور سیوک، جون سیوک عیسائی کردار ملتے ہیں۔ یہ ناول میں نے بچپن میں پڑھا تھا۔ اسی طرح میں نے چچا عنایت اللہ دہلوی کے تراجم "سلامبو" اور شاید "تائیس" پڑھے تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ اناطول فرانس کے ناول تھے یا نہیں۔ اس زمانے میں "ساقی" کا ایک خاص نمبر پورا دانتے کے جہنم پر مشتمل تھا میرے خیال میں وہ اُردو میں مغربی تراجم کا سنہرا دور تھا اور اس وقت ترقی پسند تحریک کے آغاز سے پہلے اردو فکشن عام طور پر خاصہ نحیف تھا۔ روایتی طرز بیاں اور رقعت خیز جذباتیت اس کی خصوصیات تھیں لیکن بعض بعض چیزیں اتنی غیر معمولی اور شاندار تھیں کو ان کی تفصیل یا عنوان یاد نہیں۔ انصار ناصری کا ایک ڈرامے کا عنوان "گندم" بھی مجھے یاد رہ گیا ہے۔ وہ بہت ہی دلچسپ اور زوردار ڈرامہ تھا۔ اس زمانے میں چند چیزیں ایسی لکھی گئیں جو یقیناً غیر معمولی تھیں مثلاً امتیاز علی تاج کا "انارکلی" اس سے بہتر ڈراما اردو میں آج تک نہیں لکھا گیا۔ "چچا چھکن" والی کہانیاں۔ کہا جاتا ہے کہ زیرو م کے زیرو م کا چربہ تھی پتہ نہیں۔ بہت سے افسانوں کے آخر میں نہایت باریک قلم سے بریکیٹ میں "ماخوذ" لکھا جاتا تھا یعنی اس کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس مغربی زبان کے انگریزی ترجمے سے لیا گیا ہے۔ شوکت تھانوی کے افسانے "سودیسی ریل" جس کے لئے یہ مشہور ہے کہ برٹش سرکار نے تحریک آزادی کا مذاق اڑانے کے لئے لکھوائی تھی معلوم نہیں ۔ مجھے کبھی شوکت تھانوی سے اس کے متعلق پوچھنے کا خیال بھی نہیں آیا۔

پنڈت سودرشن کے افسانے پریم چند کی روایت سے تعلق رکھتے تھے۔ پنجاب میں اردو برٹش سرکار نے رائج کی تھی اور ہندو مسلم اردو شاعروں اور ادیبوں کی ایک عظیم الشان جماعت تیار ہو گئی ان تین فرقوں کی یکساں کاوشوں نے جس میں پنجابی انجمن کا بڑا دخل تھا۔ نوے سال کے اندر اندر اردو صحافت اور ادب کو چار چاند لگا دیئے۔ ایک سے ایک شاندار رسالے لاہور سے نکلے۔ لکھنؤ سے ان کے مقابلے کا ایک رسالہ بھی نہ نکل سکا۔ ترقی پسند تحریک کی دھوم دھام بھی لاہور میں زیادہ رہی۔ وہ شہر فیشن کے اعتبار سے پیرس کہلاتا ہی تھا۔ اب ادبی اور انٹیلکچول سرگرمیوں کے باعث گویا پیرس کا لیٹن کوارٹر بن گیا۔ نئے

ہندوستان کی کہانی میں۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

یہ مصرع بار بار سامنے آجاتا ہے جس زمانے میں یعنی ۳۰۔۱۹۴۰ کی دہائیوں میں لاہور واقعی ہندوستان کا پیرس بنا ہوا تھا۔ان ہی دنوں میں محکمہ قضاو قدر اس شہر کی تباہی اور آدھی آبادی کی جلاوطنی کے منصوبے بنا رہا تھا۔لاہور میں فلم سازی بھی کی جارہی تھی وہاں کے ایک فلم خزانچی نے سارے ہندوستان میں دھوم مچادی تھی۔عبدالرحمٰن چغتائی اور امرتہ سرگل جیسے مصور بھی مصروف عمل تھے۔ہندوستانی موسیقی کا چرچہ خوب خوب تھا۔آل انڈیا ریڈیو، لاہور اہل قلم اور فنکاروں کا بڑا مرکز بن چکا تھا۔لیکن یہ گہما گہمی اور رونق اور سربلندی فلک کج رفتار کو ہرگز نہ بھائی۔چنانچہ ۱۹۴۷ء میں وہ بساط ہی الٹ گئی۔ایک بارونق شہر سے دو فرقوں کی مشتعل آبادیوں کا المناک اور خونچکاں انخلا ایک ایسی اجتماعی ٹریجڈی ہے جس پر جتنا غور کیجئے تعجب ہوتا ہے۔اور ایسے دلدوز وقت میں اس قسم کے بے حس کے ریمارک بھی سننے میں آئے کہ جب ہم دسمبر ۴۷ء میں بہ ذریعہ ہوا لاہور پہنچے تو ہماری جائے قیام پر والدہ مرحومہ کے چند پرانے دوست احباب ملنے آئے ان میں سے ایک کے نوجوان فرزند نے مجھ سے کہا پاکستان میں فنون لطیفہ کو بہت نقصان پہنچا ہے۔سکھ چلے گئے۔یعنی اتنی بڑی ٹریجڈی سے ان کے نزدیک نقصان محض یہ ہوا کہ اب سکھوں کے لطیفے سننے کو نہیں ملے گے۔

انتہائی غم وغصہ اور شدید نفرت ابنارمل (Abnormal) نفسیات میں شامل ہیں۔ اور انہیں ابنارمل حالات تخلیق کرتے ہیں۔وہ کرائسس گزر جانے کے بعد نارمل حالات واپس آجاتے ہیں۔لیکن ان دونوں ملکوں کی بات ایسی بگڑی ہے کہ نصف صدی سے زاید گزرنے کے بعد بھی کسی صورت بنائے نہیں بنتی۔دونوں طرف نئی نسلیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ایک دوسرے سے متنفر اور بدگمان۔ایسی خوفناک صورت حال میرا خیال ہے کہ دنیا میں اور کہیں موجود نہیں۔برلن کی دیوار گرگئی روس اور امریکا میں دوستی ہو گی نہیں ملتے تو بھائی، صلّو اور مراری لال اور اس کی زیادہ تر وجہ پریس ہے۔دونوں طرف کا پریس اور سیاست دانوں کی تقریریں۔دونوں ملکوں کے ڈپلومیٹ جب ممالک غیر میں سوشل تقریبات میں کے دوران ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑی دوستی بھی ہو جاتی ہے۔بالخصوص اگر دونوں

فریق پنجابی ہوں تو بے تکلف پنجابی میں گفتگو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سرکاری طور پر ایک دوسرے کے مخالف۔ ہم جیسے سادہ دل بندے ان سے بے ڈھب سوال کر لیتے ہیں تو انہیں بہت غصہ آتا ہے۔ میں شاید ذکر کر چکی ہوں کہ لندن میں ایک مرتبہ وظیفہ دار مسز خورشید اور شیریں کے رقص کا پروگرام تھا میں منتظمین میں شامل تھی۔ V.I.P بکس کی طرف گئی تو دیکھا پاکستانی ہائی کمشنر کی بیگم انڈین ہائی کمشنر مسز کرشنا مینن کے ساتھ بیٹھی قہوہ پی رہی ہیں۔ اصفہانی صاحب والد مرحوم کے دوست تھے اور جب والد مرحوم کلکتہ جاتے تھے تو ان ہی کے یہاں قیام کرتے تھے تو بیگم اصفہانی نے مجھ سے کہا تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ میں نے فوراً جواب دیا آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔ انہوں نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا تو میں وہاں سے سٹک لی۔

سفارتی تعلقات اور ڈپلومیٹک گفتگو اکثر منافقت پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے منافقت کو ڈپلوسی کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے بغل میں چھری منہ پر رام رام۔ تو یہ ساری دنیا کے ڈپلوسی کا دستور ہے۔

الہ آباد برطانوی سرکار نے تینوں پریزڈنسی شہروں کلکتہ، بمبئی، مدراس کے علاوہ دہلی لکھنؤ، لاہور اور پٹنہ میں جو درس گاہیں اپنی یونیورسٹیوں کی طرز پر قائم کیں۔ انہوں نے نئے ہندوستان کی ذہنی تعمیر و تشکیل میں نہایت رفیع شان رول ادا کیا۔ ان کا نصاب تعلیم پروفیسروں کی اعلیٰ علمیت اور درس و تدریس کے بلند ترین معیار پر مبنی تھا۔ یہی درسگاہیں ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے ملک کی تشکیل نو کے ذمہ دار ہیں۔ اگر یہاں انگریزی تعلیم رائج نہ ہوتی تو ہم بھی افغانستان و شام وغیرہ سے زیادہ مختلف نہ ہوتے۔ گذشتہ صدی میں غالباً ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک مورخ کے مطابق جب انگریزی کتابوں سے لدے برطانوی جہاز بنگال کے خضر پور بندرگاہ پر پہنچتے تھے تو بنگالی طلبہ کا جم غفیر وہاں موجود ہوتا تھا۔ اس مجمعے میں مسلمان نوجوانوں کی تعداد غالباً بہت کم تھی ورنہ اس صوبے کا مسلمان اتنا پسماندہ نہ رہتا۔ تعلیم کی طرف سے بے توجہی سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی خصوصیت رہی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ پہلے مولویوں نے فتویٰ دیا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے۔ اس کا ایک سیاسی پس منظر تھا۔ مسلمان اچانک اپنی سلطنت کھو بیٹھے تھے۔ وہ ایک رولنگ کلاس کے

بجائے ایک نہایت آفت زدہ قوم بن چکے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں بھولے تھے کہ ان کے شان سلف کی دربار میں فرنگی جوتے اتار کر حاضر ہوتا تھا۔ آج انہیں انگریز کلکٹر ضلع کے پاس جوتے اتار کر جانا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسی شدید اندوہناک اور عبرت خیز صورتحال تھی جس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے لیکن ہمارے بزرگوں نے اس کا بہ ذات خود تجربہ کیا انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ نئے انگریزی تعلیم یافتہ ہندو فرقے نے مسلمان نوابوں کا لباس اور ان کے طور طریق اختیار کیے۔ کیونکہ وہ مسلمان کو ایک برتر تہذیب گردانتے تھے لیکن وہی نیا مڈل کلاس انگریزی داں بابو مسلمان کو حقیر سمجھتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے والد یعنی نئے بنگال کے ایک عالی ہمت نمائندے نے شمالی ہند میں اپنے کسی سفر کے دوران دیکھا کہ انگریز دہلی کے آخری بادشاہ کو قید کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔ یہ ایک بڑا عبرتناک واقعہ تھا۔ یعنی ایک پوری عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ایک ہزار سالہ تہذیب کا انجام اور نئے ہندوستان کے ایک ماڈرن بنگالی ترقی یافتہ انگریزی تعلیم سے بہرہ ور نئے بنگال کے ایک باشندے نے ایک جملے میں سرسری طور پر قلمبند کیا۔ انگریزی طرز سے گرمیاں گذارنے پہاڑ پر جا رہا تھا۔

سارے دنیا کے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سے یہ بے اعتنائی کیوں۔ یورپ کا واحد ملک البانیہ اس برِّ اعظم کا پسماندہ ترین ملک رہا ہے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں مسلمان لڑکیاں تعلیم میں اپنے بھائیوں سے آگے نکل گئی ہیں اور بھائی سینما اور ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف ہیں۔ بمبئی میں ہر نئی پکچر کا افتتاح ایسے دن ہوتا ہے جب مسلمان زیادہ سے زیادہ آ سکیں۔ اور زیادہ تر فلم مسلمانوں کی سرپرستی کی وجہ سے چلتے ہے۔

چنانچہ ۱۸۹۸ میں جب مولوی ممتاز علی نے رسالہ "تہذیب نسواں" جاری کیا اس وقت مسلم معاشرے میں تعلیم یافتہ عورتیں اتنی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ جو اس اخبار کی خریدار بنیں اور اس میں مضمون لکھے۔ یہ ایک بہت قابلِ ذکر سماجی ترقی تھی یعنی ۱۸۵۷ سے پہلے مسلمان عورتوں کا اخبار شائع ہونا اور اس میں خود ان کی مضمون نویسی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ترقی بہت سست رفتار سہی لیکن ایک سماجی انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ اب اس اولیں دور میں جن مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں نے مضمون نگاری شروع کی اس میں مس نذر الباقر کا نام بھی سرِ فہرست رہا۔ ہر مصنف یا ادیب کی ادبی سرگرمیاں یا تخلیقات

اس کے سماجی پس منظر کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ جب نذر الباقر نے ایک ایسے عبوری دور میں جنم لیا جب برطانوی تہذیب اور برطانوی حکومت ہندوستان میں مستحکم ہو چکی تھی۔ اور انڈیا تاج برطانیہ کا کوہ نور کہلاتا تھا۔ اس دور میں برطانوی ہندوستان راجواڑوں کے طبقۂ نسواں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہندو اشرافیہ کی عورتیں مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ گئی تھیں۔ بنگال، مدراس اور بمبئی کے صوبجات کی عورتیں نسبتاً سب سے زیادہ بہتر حالت میں تھیں۔ بنگالی Natives اور کرسچن عورتیں بہر حال پیش پیش تھیں۔ ان کے متعلق بہت لکھا جا چکا ہے۔ بنگال بالفاظ دیگر کلکتہ ایک ایسا شہر تھا جو گویا ہندوستان میں شامل ہی نہیں تھا بلکہ مغرب کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ جہاں تورو دت ان کی بہن آج سے ڈیڑھ سو برس قبل فرانسیسی زبان میں شاعری کر رہی تھیں۔ بنگالی ہندو اپنی ترقی یافتہ حیثیت کی وجہ سے اپنے آپ کو باقی ہندوستان سے الگ سمجھتا تھا اور سارے ملک کا گویا ذہنی قائد بن چکا تھا۔ اس میں ایک احساس برتری بھی پیدا ہو گیا تھا۔ تاریخ کی ایک ستم ظریفی یہ تھی چونکہ مسلم نوابین کا عکس اس طبقہ اپنی تہذیب کی وجہ سے بہت اعلیٰ و عارفہ سمجھا جاتا ہے۔ انگلش سرکار نے جب حکومت مسلمانوں سے چھین کر ہندو طرفداروں کو سونپی تو ان نئے حکمرانوں نے مذہب کہلانے کے لئے اور انہیں بنگالی ہندو زمیندار طبقہ نئے بنگالی فکشن اور سینما میں خوب خوب اجاگر کیا گیا۔ مسلم نوابوں کا لباس اور طور طریق اختیار کئے۔ چنانچہ ہندو زمیندار جو اپنی تخلیق کے لئے انگریزوں کا مرہونِ منت تھا۔ اس نے اپنے آپ کو خود اس مسلم ارسٹوکریسی کے سانچے میں ڈھالا۔ مسلم اشرافیہ اور نوابین کا طبقہ پسماندہ ہوتا گیا اور ان کی جگہ نئے ہندو ''نوابین'' یعنی زمینداروں نے لے لی۔ یہ نواب Nabab Syndrom بھی ایک عجیب و غریب چیز تھی۔ اس طبقے کے اصل ماڈل امرائے ایران و توران تھے۔ اب یہ ایرانی تہذیب دور دراز چین سے لے کر مشرقی یوروپ تک پھیل چکی تھی۔ میں نے روسی آذربائی جان کے شہر باقو میں ایسے مکانات دیکھے جو لگتا تھا کہ دہلی، لکھنؤ، ڈھاکہ یا حیدرآباد اندرون شہر لاہور سے اٹھا کر وہاں رکھ دیئے گئے ہوں۔ وہی پردار صحن اور کمروں میں قالین گاؤ تکیہ ظروف و سامان آرائش یہ مخلوط ایرانی، ترکی اور مصری طرز زندگی ''نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاقر قاش نمبر'' تو رائج تھا ہی دوسری طرف عرب تمدن سے ہسپانیہ میں آٹھ سو سال جگمگایا اور

جنوبی امریکہ سے لے کر کیلیفورنیا میں یہ طرز تعمیر آج بھی باقی ہے۔ خود ہندستان میں روزمرہ کی ضروریات کا سامان اور ان کے نام آج غیر مسلم سماج میں صدیوں سے موجود ہیں۔ اب پیالہ کٹوری کہہ جا رہا ہے۔ لیکن لحاف، رجائی و تکیے اور چادر کے لئے ابھی کوئی ہندی الفاظ ایجاد نہیں ہوئے۔ بلکہ بہت سے عربی فارسی اسے الفاظ ہندی گیتوں اور دوہے میں صدیوں سے شامل ہیں گو ان کا تلفظ کہیں کہیں بدل گیا ہے۔

تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات
جھینی جھینی بینی چدریہ۔

بچے آج بھی چیز کو چیزی ہی کہیں گے وستو نہیں کہہ پائیں گے۔ زبانوں کے ارتقاء میں صدیوں کا ہیر پھیر شامل ہے اور یہ سرکاری طور پر دفتر کی میز پر نہیں بنائی جاتیں لیکن دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد جب مشرق کے بیشتر ممالک کو مغربی سمراج سے چھٹکارا ملا تو قومی شخصیت کی اہم ترین شناخت کے طور پر زبانوں پر سب سے پہلے توجہ دی گئی۔ عرب کے تمدنی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے پہلے ترکی نے رسم الخط بدلا اور یوروپ سے ناطہ جوڑنے کے غرض لاطینی اسکرپٹ اختیار کیا۔ والد مرحوم نے اس صدی کے بالکل اولین برسوں میں عربی رسم الخط والی ترکی پڑھی تھی وہ اس طرح کہ حاجی اسماعیل خاں رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ مشرق وسطیٰ سے ترکی پڑھ کر آئے تھے اور والد مرحوم ایم۔اے۔او۔ کالج کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ اور اس کے بدلے میں حاجی صاحب سے ترکی سیکھتے تھے۔ چنانچہ برطانیہ کی وزارت خارجہ سے سلطنت عثمانیہ بھیجنے کے لئے ایک ترکی داں نوجوان کی درخواست طلب کی گئی تو والد مرحوم کا اس میں انتخاب ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں وہ مرحوم بغداد روانہ ہوئے۔ اور اپنے سفرنامے میں لکھا کہ جہاز پر ان کی ملاقات سند باد جہازی سے ہوئی گویا سفرنامے میں ایک افسانوی عنصر اور طرز بیان شامل کیا۔ اس لحاظ سے سفر بغداد کو اردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ رپورتاژ ایک نئی اصطلاح ہے آکسفورڈ ڈکشنری کی جدید اصلاحات میں بھی موجود ہیں کرشن چندر کے "پودے" کو رپورتاژ کہا گیا۔

اب معاملہ یہ ہے کہ افسانہ، ناول اور ڈرامہ تینوں کی اساس ان ہی مغربی اصناف

پر مبنی ہیں۔ اور اس کے ماڈل بھی عصری وکٹورین فکشن کے بجائے سترہویں صدی کے ادب سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ تمثیلی انداز کے اخلاقی کہانیاں ہمارے یہاں بہت مقبول ہوئیں۔ افسانے اور ناول کا طرزِ نگارش بھی تمثیلی رہا۔ یعنی کردار کا نام اور اس کے بعد اس کا مکالمہ اور (جس کریا خفگی سے) وغیرہ ہمارے بزرگوں نے انیسویں صدی کے جدید مغربی ناول کو اپنا ماڈل کیوں نہیں بنایا۔ کیونکہ ہمارا مشرقی طرزِ بیان سترہویں صدی انگلستان کے طرزِ بیان سے لگا کھاتا تھا۔ ہمارے یہاں جدید مغربی طرز کے ناول بہت ہی کم لکھے گئے۔ پریم چند کے یہاں بھی مکالمہ ڈرامے کے انداز میں ملتا ہے۔ بالکل نئے مغربی طرز کا ناول سب سے پہلے غالباً عزیز احمد نے لکھا جو کافی عرصہ انگلستان و یورپ میں گزار آئے تھے۔

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ہمارا جدید ادب بنیادی طور پر Original نہیں تھا۔ اس کے برعکس ہماری شاعری قطعاً Original تھی اور اگر ہمارے بنے بھائی ملک راج آنند وغیرہ دوسری جنگ عظیم سے چند سال پہلے انگلستان نہ گئے ہوتے تو شاید یہ نئی لہر بھی اردو میں بہت عرصے کے بعد پہنچتی۔ ان نوجوانوں کے جوش اور ولولے کا کیا عالم رہا ہوگا۔ جب لندن، آکسفورڈ اور کیمبرج میں انہوں نے یہ نئے مغربی ادب سے روشناس ہوئے وہاں کے قہوہ خانوں میں انگریز طلبا کے ساتھ بحثیں کیں۔ ان کے جلسے جلوس میں شامل ہوئے وہ زمانہ بھی پہلی جنگ عظیم کے بعد جو Leftwing intilutuass لیفٹ ونگ انٹلکچول کا دور شروع ہوا تھا۔ اس سے یہ متاثر ہوئے۔ یعنی عالمی تاریخ کے سارے تانے بانے اور دھاگے آپس میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ اگر آپ تبت میں نہیں رہتے تو ان دھاگوں میں الجھ جانا ناگزیر ہے اور اردو کے علاوہ ساری جدید ہندوستانی زبانوں میں نئے دور کا آغاز اسی طرح ہوا۔ اور وہ سب مغرب سے نکل اسی انداز میں ان کا اثر قبول کیا نئے ہندوستان کے ایک علم بردار رابندر ناتھ ٹیگور نے کیٹس اور شیلے سے متاثر ہوکر اپنی شاعری کی۔ مطلب یہ کہ کولونیل مشرق اپنے دورِ جدید میں مغرب کا خوشہ چیں اور مقلد رہا۔ قوم پرستی کے جوش کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

اب ذرا انیسویں صدی کے مشرقِ اوسط اور وکٹورین ہندوستان پر نظر ڈالتے چلیے

رومن امپائر کے بعد خلافتِ اسلامیہ ایک ہمہ گیر سلطنت کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئی۔ وہ کیا زمانہ رہا ہوگا جب اندلس اور شمالی افریقہ سے لے کر مشرقی ایشاء تک ایک ایسی بین الاقوامی تہذیب درخشاں تھی جس کا ثانی بعد میں محض برٹش امپائر کی شکل میں نمودار ہوا اس تہذیب میں بھی ایک نوع کی کاسٹ سسٹم نے جنم لیا۔ یعنی حکمران طبقہ مسلمان۔ تعلیم و تربیت عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی تجارت و مالیات یہودی اور ارمنی عیسائی وغیرہ۔ تقریباً یہی صورت سلاطین ہند اور عہد مغلیہ میں موجود رہی۔ وہاں محکوم عیسائی اور یہودی اقلیت میں تھے لیکن کلیدی اور اہم ترین معاملات حکمران مسلمانوں نے انہیں سونپ دیے تھے۔ اور خود بطور پاشا یا خلیفہ یا سلطان ان کا طرز زندگی رفتہ رفتہ عیش پرستی کے لیے ضرب المثل بن گیا۔

اب صنعتی انقلاب کے بعد یوروپ میں عیاش پاشا۔ کنیزیں۔ چار بیبیاں اور حرم سرا کی ایک مستحکم تصویر اہل مغرب کی ذہنوں میں جاگزیں ہوگئی۔ بردہ فروشی یعنی کنیزوں اور غلاموں کی خرید و فروخت بھی اس تصویر میں شامل تھی اور یہ امیج اس حد تک دیر پا رہا۔ ۱۹۵۴۔۵۵ میں میرے کچھ رشتہ دار بچے مانچسٹر کے ایک اسکول میں داخل ہوئے تو ان کے انگریز ہم درس بچوں نے ان سے پوچھا کیا تمہارے یہاں موٹر کار ہوتی ہیں تو ہمارے ماموں زاد بھائی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا نہیں۔ ہم لوگ ہاتھی پر بیٹھ کر اسکول جاتے ہیں لیکن ہمیں اہل مغرب کے اس لاعلمی پر متعجب نہیں ہونا چاہئے۔

ہندوستان اور باقی مشرق کی عورتوں کے متعلق بہت ہی افسوسناک تصورات اہل مغرب کے ذہنوں میں جاگزیں تھے۔ گذشتہ صدیوں میں جب یوروپین عورتیں ہندوستان پہنچیں تو یہاں کی عورتوں کی دو طبقوں میں منقسم پایا۔ اشرافیہ کی پردہ نشین خواتین اور غریب عورتیں جو باہر نکل کر سودا بیچتی تھیں یا کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ عیسائی مبلغین کو اچھوتوں اور غریب ہندوؤں کے سماج میں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشرق وسطیٰ میں عیسائی مبلغین زیادہ کامیاب نہیں رہے اس کے برعکس انڈیا میں ہندو کاسٹ سسٹم مشنریوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ حالانکہ ذات پات کا ہزاروں سال پرانا رواج تبدیلیٔ مذہب نے فی الفور منقطع نہیں کیا چنانچہ عیسائیوں میں بھی اونچی ذات اور نچی ذات کی تفریق موجود ہے جن کنبوں نے اپنے پرانے ہندو خاندانی نام برقرار رکھے ہیں وہ یہ ظاہر

کرتے ہیں کہ وہ اونچی ذات کے کرسچن ہیں اور وہ عیسائی جن کی خالص یورپین خاندانی نام ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یورپین مشنریوں نے ان کے باپ دادا چھیدو لال اور چھوٹے لال کو فرانسس ڈی کوسٹا اور جان فیرز بنا دیا تھا۔ نام شخصیت کا لباس ہے اور شخصیت میں اس سماجی حد بندی اور یا کلاس کی خصوصیات بھی شامل ہوتی ہے جس میں اس فرد نے جنم لیا۔ ہندوستان میں دیسی عیسائی فرقہ ایک عجیب وغریب دورا ہے پر موجود رہا۔ برطانوی عہد میں اس نے انگریز یا یورپین مشنری کسی غریب ہندوستانی کو بپتسمے دیتے وقت اپنا ہی نام اسے عنایت کر دیتا۔

نذر سجاد حیدر نے شمال ہند کے اس بالائی انگریز زدہ طبقے کی عکاسی نہایت مساقی سے اپنے ناولوں میں کی۔ وہ اسٹائل اس دور کے روح عصر کا حامل تھا۔ ہر دور میں الفاظ کم وبیش وہی رہتے ہیں لیکن ان کے تلازمات مختلف ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا مصنفہ کے اسٹرا ہیٹ پہننے والے فیشنبل نوجوان اور ستار بجانے اور انگریزی بولنے والی حسینائیں دوسری جنگ عظیم سے قبل کی تین دہائیوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ یہ سول لائنز کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والا طبقہ انگریزوں نے تخلیق کیا تھا اور اسی طبقے کے چند نوجوان جب لندن آکسفورڈ اور کیمبرج پڑھنے کے لیے گئے تو وہاں برطانیہ کی نئی لیفٹ ونگ تحریک سے متاثر ہو کر لوٹے۔ نیا ادب بھی اسی تحریک کے زیر اثر لکھا گیا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اور چند بنگالی نوجوان اس Movement کے قاعد تھے۔ مجھے یاد ہے ایک روز بنے بھائی ۲۱ فیض آباد روڈ پر بہت دیر تک والد مرحوم سے باتیں کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد ہمارے بھائی نے ذرا استہزہ کے ساتھ یہ سوشلیسٹ بنتے ہیں۔ ان کے والدین ہمارے ابا جان اور اماں کے بہت پرانے اور قریبی دوست تھے۔ والد مرحوم کو نئی ترقی پسند تحریک سے بہت دلچسپی اور ہمدردی تھی، کیونکہ وہ خود پینتیس ۳۵ چالیس سال قبل اردو کی نئی تحریک سے وابستہ رہے تھے اور اُردو ناول نویسی کے متعلق اپنے طویل مضمون میں ۱۸۹۸ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ ہر ناول میں امیروں یا نوابوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ابھی اردو میں مفلسی اور ناداری کی تصویر کشی نہیں کی گئی مجھے الفاظ صحیح طور پر یاد نہیں ہیں مگر مطلب یہی تھا۔ اماں کے روزنامچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک آزادیٔ نسواں کی وہ ایک پیشرو رہیں اور سرگرمی سے اس میں

حصہ لیا۔ لیکن انہوں نے اسٹیج پر جا کر تقریریں کبھی نہیں کی۔ البتہ اپنے قلم کے ذریعے خوب خوب جدوجہد کی۔ آزادی نسواں اور آزادی ہندوستان کے لئے سرگرم رہیں۔ "عصمت" اور "تہذیب" کے مدیروں نے بھی غالباً کوئی مبسوط تذکرہ اسی خواتین کا شائع نہیں کیا۔ لہٰذا ہماری موجودہ نسل اور بالخصوص ہندوستان کے دوسرے فرقوں کو پکا یقین ہے کہ ہندوستانی مسلم خواتین سب پردے میں مقید اور اَن پڑھ اور مردوں کی محکوم آبادی کے لحاظ سے ان کی قلیل تعداد بھی زیادہ تعجب خیز نہیں۔ حالانکہ تعلیم کے میدان میں وہ اپنے تناسب کے لحاظ سے بھی بہت آگے تھیں۔ علی گڑھ، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد دکن، کلکتہ، بھوپال اور جنوبی ہند میں مسلمان اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے کہ غازی پور جیسے دور افتادہ اور پسماندہ شہر میں ۳۳۔۱۹۳۲ء کے زمانے میں ڈاکٹر زبیدہ صالح ایم۔ بی بی ایس، مس حمید جہاں لیڈیز یونیورسٹی انگلستان کی ڈگری یافتہ انسپکٹرس آف اسکول اور زینب امجد علی لکھنؤ یونیورسٹی کی گریجوٹ بیک وقت موجود تھیں۔ آپا حمید جہاں جو علی گڑھ والی اعلیٰ بی کی بھانجی تھیں جب دورے پہ آتیں تو ہمارے یہاں قیام کرتیں۔ اردو کا زنانہ پریس نہایت زوردار، بااثر اور بلند پایہ تھا۔ میرے خیال میں اس برصغیر کی دوسری زبانوں میں باتصویر "عصمت" اور "تہذیب نسواں" جیسے شاندار رسالے اور ہفتہ وار اخبار کم ہی نکلتے ہونگے۔ عام طور پر گھروں میں خاتونِ خانہ اور دوسری عورتوں کی بہت عزت کی جاتی تھی اور گھر کے اندر حکومت بھی ان ہی کی تھی۔

تو پھر یہ مسلمان عورتوں کی پسماندگی، جہالت، مجگومی اور بے علمی کا یہ امیج کس طرح بنا۔ بے عملی کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مسلمان گھرانوں میں آتو جی یا استانی جی ایک خاص اہمیت کی مالک تھیں۔ آتو سے ظاہر ہوتی ہے کہ شاید یہ ترکی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

آتو جی شادی کرنے پہ مائل ہے فاضلہ
پڑھنے کو حسن و عشق کی اس کو کتاب دو
آتو صاحب اُسے بلاتی ہے
منتظر ہیں محل میں جاتی ہیں

(مہذب اللغات از مہذب لکھنوی)

اتاترک، اتابیک سے ہم سب واقف ہیں۔ الماتا یعنی بڑا سیب روسی ترکستان کا مشہور شہر ہے۔ اودھ میں الوانوچمن مشتمل ہے۔ الفاظ کا سفر حیرت انگیز ہے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ قلم، کرسی، کتاب کو لیجئے۔ کتاب تو پستک ہوگی لیکن قلم اور کرسی کے لئے ہندی میں غالباً کوئی الفاظ نہیں۔ اسی طرح عینک، چشمہ، دوا، تکیہ، کرتہ وغیرہ۔

نذر سجاد حیدر نے وکٹورین ہندوستان میں جنم لیا اور آزادی کے بیس[۲] سال بعد وفات پائی۔ اس طرح برٹش انڈیا پاکستان اور آزاد ہندوستان تینوں ادوار کا تجربہ کیا۔ ان کی نسل کے بیشتر افراد سیاسی بدامنی، تقسیم ہند کی خونریزی، پاکستان یا دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کے مسائل سے دوچار رہے۔ سڈنی اسٹریلیا میں میری ملاقات مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی نواسی سے ہوئی جو وہاں اپنی پوتی کے ساتھ مقیم تھیں اور وہاں کی تنہائی سے بے حد دل برداشتہ تھیں کیونکہ ان کا کوئی ہم زبان بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ آج کے دور میں بزرگ بھی خانہ بدوش ہوگئے ہیں اور اپنے پوتوں نواسوں کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ جو بیگمات انگنائی سے باہر بھی کم جاتی تھیں اب لندن یا اسلو یا کسی امریکن شہر کی گلیوں میں سوپنگ بیگ لئے سودا سلف خریدتی پھرتی ہیں۔ ان کی اولاد نے انہیں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے اپنے وطن ہندوستان یا پاکستان سے وہاں بلوالیا ہے۔ والدہ مرحومہ جو پہلے متعدد بیرونی سیاحتیں کرچکی تھیں ایک مرتبہ میرے ساتھ انگلستان گئیں لیکن وہاں خوش قسمتی سے ان کو تنہائی کا سامنا نہ کرنا پڑا کیونکہ لندن میں ان کی آمد کی اطلاع شاید ''عصمت'' کراچی میں شائع ہوگئی تھی اور لندن میں مقیم ان کی مداح خواتین نے ان کے پاس آنا شروع کردیا۔ سب سے پہلے سجاد حیدر صاحب مع بیگم تشریف لائے جو اس وقت وہاں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ ان کی کہانی یہ ہے کہ غالباً ان کے نانا نجف علی خاں سے والد مرحوم نے دہرہ دون میں امیر کابل کے اسسٹنٹ پوٹیکل ایجنٹ کے عہدے کا چارج لیا تھا۔ اور اس کے بعد جب نجف علی خان صاحب کے یہاں نواسہ پیدا ہوا تو اس کا نام والد مرحوم کے نام پر سجاد حیدر رکھا گیا۔ جس روز سجاد حیدر صاحب والدہ مرحوم سے ملنے کے لئے آئے وہ حسب معمول ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے صاحب فراش تھیں۔ سجاد حیدر صاحب اور ان کی بیگم روح افزاں ان کے پلنگ کے پاس تشریف فرماتے۔ اتنے میں خواجہ احمد عباس

بھی آ گئے جو یوری گاگارین کو انٹرویو کرنے برائے لندن ماسکو جارہے تھے۔ ہمارے والدین کی ان کے خاندان سے بھی بہت پرانی دوستی تھی۔ پہلے زمانے میں دستور تھا کہ ایسے تعلقات نسلاً بعد نسلٍ قائم رہتے تھے چنانچہ خواجہ غلام حسنین شاید اماں کے چچا سید ظہور حسنین کے ایم۔اے۔او، کالج علی گڑھ میں ہم درس اور دوست رہے تھے۔ خواجہ صاحب بچارے اب جو لندن میں ہمارے یہاں پہنچے تو انہوں نے پاکستانی ڈپلومیٹ کو والدہ کے پلنگ کے پاس تشریف فرما پایا۔ وہ ذرا جھجکے۔ اماں نے دو چار باتوں کے بعد بڑے اطمینان سے ان سے کہا ذرا باورچی خانے سے چائے تو بنوا لائیے۔ کچن میں اس وقت میری دوست فیروز جبیں اور ہمن آپا کے صاحبزادے مٹن (عمر عزیز سید) بھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے اطلاع دی کمال ہے ان ہی صاحب نے مجھے کراچی میں بلیک لیسٹ کروا رکھا ہے اور میں اب ان کے لیے چائے بنوا کر ان کی خدمت میں پیش کرنے جا رہا ہوں۔ ہم سب کو اس عجیب وغریب صورتحال پر ہنسی آ گئی۔ اسی وقت دو امریکن لڑکے کچن کے دروازے پر نمودار ہوئے ان کے ہاتھوں میں چند پمفلیٹ تھے۔ انہوں نے کہا آپ لوگ ہنس رہے ہیں کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ دنیا عنقریب تباہ ہونے والی ہے؟ سرمایہ دار امریکن جو ایٹم بم بنایا ہے وہ کسی لمحے بھی لندن پر بھی گر سکتا ہے۔ مٹن نے کہا آؤ بیٹھو مرنے سے پہلے ہم لوگ تھوڑی سی چائے پی لیں۔

والدہ مرحومہ کی ساری زندگی سیر و سیاحت میں گذری اور آخر وقت تک سفر کرتی رہیں۔ ۱۹۶۷ء میں وہ انگلستان آئیں وہاں سے واپس کراچی اور اس کے بعد بمبئی۔ لیکن یہ ان کا آخری سفر ثابت ہوا۔ کیونکہ چھ سال بعد اکتوبر ۱۹۷۱ء میں انہوں نے بمبئی میں سفر آخرت اختیار کیا۔

اختر النساء بیگم

عرضِ حال

اخبار تہذیب نسواں کی سابقہ اڈیٹرس کے انتقال کے بعد خاکسار کو تہذیب کا خاص خیال پیدا ہو گیا۔ جس کے پورا کرنے کی میں نے حتی الامکان کوشش کی۔ اپنی دیگر قابل بہنوں سے بھی مضامین امداد کی درخواست کی اور خود بھی اپنے قلم کج مج رقم سے ایک مسلسل مضمون قصے کے پیرائے میں لکھنا شروع کر دیا جس میں بے سوچے سمجھے دوسری شادی کرنے کی خرابیاں۔ جاہل ماں کی سوتیلی اولاد سے بُرا برتاؤ۔ تعلیم یافتہ لڑکی کا بدمزاج جاہل سوتیلی ماں کی اطاعت کرنا۔ دوسری شادی کے بعد باپ کا بیٹی کی طرف سے بے پروا ہو جانا اور جاہل بیوی کے کہنے سے ایک جاہل و ذلیل گھر بیٹی کی شادی کر دینا۔ اور اُس سمجھدار لڑکی کا صبر و تحمل کے ساتھ سب مصیبتیں برداشت کرنا۔ اور بعد انتقال شوہر لاوارثی کی حالت میں نہایت کوشش اور محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے قومی خدمت میں عمر بیوگی بسر کرنا وغیرہ مضامین مذکور تھے۔ برعکس اس کے ایک تعلیم یافتہ بی بی کا حُسن انتظام خانہ داری، اعلیٰ پرورش و تربیت اولاد، رسُومات قبیحہ کو ترک کر کے اپنے خاندان میں شرعی مہذب طریقوں کی نظیر قائم کرنا وغیرہ وغیرہ بیان کیا گیا۔ کیونکہ ہماری قوم میں بیسیوں نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں گھرانے انھیں آزاروں میں مُبتلا تھیں۔ جاہل و ظالم سوتیلی ماؤں کے ہاتھوں ہزاروں بن ماں کے بے بس و بیکس بچّوں کی جانیں عذاب میں ہیں۔ لڑکے تو پھر بھی تھوڑے عرصے بعد خود مختار ہو کر ان عذابوں سے نجات پا لیتے ہیں۔ لیکن افسوس بیچاری لڑکیوں کی حالت پر۔ جو بوجہ بے زبانی و بے بسی و کم علمی کے عمر بھر کو برباد اور زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔ اوّل تو سوتیلی ماں کے اختیار میں میکے ہی میں سخت مصیبت اُٹھاتی ہیں۔ پھر ماں کی مہربانی سے دوسرا گھر بھی دوزخ سے کم نہیں ملتا۔

علاوہ سوتیلی ماں کے (جو اتفاقی امر ہے) صدہا لڑکیوں کے حق میں خود اُن کی

حقیقی مائیں بھی دشمن ثابت ہوتی ہیں۔

یہ سب خرابیاں صرف جہالت کی وجہ سے ہیں۔ کیونکہ ناتعلیم یافتہ بی بی اپنے حقیقی اولاد وغیرہ کو اچھی طرح کیا بالکل نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن جہالت قصور مستورات کا نہیں۔ یہ اُن کی قسمت کے مالکوں بلکہ قوم کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ کہ وہ تعلیم نسواں کو اپنے حقیقی فرائض میں شمار نہیں کرتے اور اُس کے لئے عام کوشش نہیں کرتے۔ بعض تو فضول ہی سمجھتے ہیں۔ اور بعض سخت مخالف ہیں۔ تعجب یہ کہ وہ لوگ پر بھی ترقی قوم کے خواہاں ہیں۔ حالانکہ یہ ناممکن بات ہے۔ کہ ایک ہاتھ کو بیکار رکھ کر صرف ایک ہاتھ سے کام لیا جائے۔ اور پھر یہ خواہش ہو۔ کہ تمام کاروبار دُنیا اُس ایک ہی ہاتھ سے انجام پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم نے اب تک کچھ بھی ترقی نہیں کی۔ جن اقوام میں تعلیم نسواں کا رواج ہے۔ وہ اعلیٰ معراج ترقی پر پہنچ چکی ہیں۔ جن قوموں اور جن ملکوں میں تعلیم نسواں کی طرف توجہ نہیں۔ ان پر تباہی اور بربادی کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ خدا کا لاکھ شکر ہے۔ کہ تہذیب نسواں کی زبردست چیخ پکار سے یہ غفلت شعار قوم بھی بیدار ہو چکی ہے۔ اور اب کئی سچے خیر خواہ قوم اُس کی فکر میں ہیں۔ اگر اللہ کو ہماری بہتری منظور ہے۔ تو سب راہ راست پر آ جائیں گے۔ کیونکہ علم کے فوائد پوشیدہ نہیں۔ فی زمانہ جس قدر گھروں میں علم کی راحت بخش شعاعوں سے دماغ نسوان منوّر ہو چکے ہیں۔ اُن گھروں کی قابلِ رشک اس کی ثبوت ہے تعلیم نسوان کے مفید نتائج کا۔ چنانچہ دو ایک ایسے ہی گھروں کا حال ناول کے پیرائے میں مَیں نے تہذیب نسوان میں لکھنا مناسب جانا تھا۔ جس کا تھوڑا ہی حصہ شائع ہونے پایا تھا کہ وہ پسند عام ہُوا اور کئی خطوط میرے اور اڈیٹر صاحب تہذیب کے پاس اس مضمون کے پہنچے کہ اس قصے کو اخبار میں چھاپنے کی بجائے مستقل طور پر علیحدہ چھاپنا مفید ہوگا۔ چونکہ اڈیٹرس صاحبہ تہذیب کو اپنے ناظرین اخبار کی خوشی ہر حالت میں مدِ نظر رہتی ہے۔ اِس لئے اُن کی خوشی پوری کرنے کو اُنھوں نے یہ قصہ کتاب کی شکل میں علیحدہ علیحدہ چھپوالیا ہے۔ یہ کتاب درحقیقت نہ دلچسپ ناول کہلانے کی مستحق ہے۔ نہ زنانہ لٹریچر میں شمار ہونے کے قابل۔ ہاں چُونکہ ناظرینِ تہذیب نے اسے پسند کیا ہے۔ اس واسطے رفاہ عام پریس لاہور کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ ضرور ہو گیا ہے۔

خاکسار : بنت نذر الباقر

پہلا باب

شبنم کہیں گرائی کہیں گل کھلا دیا
رویا کوئی کہیں تو کسی کو ہنسا دیا

رفیق منزل

اختر النساء کو آٹھواں سال تھا۔ جب اُس کی والدہ نے اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ ماں کے بعد اختر تنہا گھر میں رہ گئی۔ ایک انّا اور دو مامائیں اُس کی خدمت کے لئے تھیں۔ اس کے والد مسٹر رفیق احمد بی اے۔ ایل بی نہایت آزاد خیال جنٹلمین تھے۔ جو اپنے وطن میرٹھ ہی میں وکالت کرتے تھے۔ ڈھائی تین سو روپیہ وکالت سے ہو جاتا تھا۔ اور تین سو روپے ماہوار کی آمدنی جائداد جدّی سے تھی۔ خوش قسمتی سے بیوی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ملی تھی۔ چونکہ وہ ہندوستانی وضع کے مکان میں رہنا پسند نہ کرتی تھیں۔ اُنھوں نے شہر سے باہر چھاؤنی کے قریب ایک نئی وضع کی عالیشان کوٹھی بنوائی تھی۔ اور بالکل نئے طرز سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی خوشحال اور پُرلطف زندگی کے نو ہی سال گذرنے پائے تھے اور اُنھیں شاید کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ ہماری اس یکساں حالت میں آ کسی جلدی کوئی جھٹکا بھی لگ سکتا ہے۔ کہ اُن کی نو سالہ رفیق نے ہمیشہ کے لئے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔

بیوی کے انتقال کے بعد ایک سال تو وکیل صاحب نے لڑکی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ پھر گرلز سکول کانپور میں داخل کرآئے۔ لوگوں نے تو اُسی دن سے کان بھرنے شروع کردیئے تھے۔ کہ دوسری شادی کرلو۔ مگر ایک سال تک تو وہ اسی خیال پر قائم رہے۔ کہ وہ نہ ایسی قابل بیوی ملے گی۔ نہ شادی کرونگا۔ لیکن کُچھ کہنے سُننے کا اثر۔ کچھ تنہائی سے گھبرا کر دوسری شادی کرنے پر آمادہ ہو ہی گئے۔ چند اشخاص نے لکھنؤ میں بندوبست کیا۔ اُن سے تو یہ بیان کیا کہ: ''ایک بڑے نواب کی لڑکی ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ کُل جائداد کی مالک لڑکی ہی ہے۔ تعلیم یافتہ ہے، حسین ہے۔'' غرضیکہ عقد ثانی ہو گیا۔ یہ بی بی تعلیم یافتہ تو خاک نہ نکلیں۔ البتہ حسین ضرور تھیں۔ اور ان کو گھر میں جو کچھ عزت وحکومت وحجت حاصل تھی۔ وہ صرف حُسن صُورت کے زور پر۔ مگر دیکھنے والے حیران تھے۔ کہ کس طرح ایسا عالی خیال شخص ایسی جاہل، ضدی، کج خُلق، بدسلیقہ عورت کا محکوم ہو گیا۔ ان بیگم صاحبہ نے جن کا نام جانی بیگم تھا شادی کے دوسرے ہی دن سے یہ تقاضا ضرور کردیا۔ کہ ''میری بچی اختر کو کانپور سے بُلوالو۔ مَیں اُس اکیلی کو غیروں میں نہیں چھوڑونگی۔'' وکیل صاحب کو بھی خیال ہوا کہ دوسری یہاں سے لڑکی کو مانوس کردینا ضروری ہے۔ اس لیے بیچاری اختر کو کانپور سکول سے لے آئے۔ وہ سُن چکی تھی۔ کہ ابا جان نے دوسری شادی کرلی ہے۔ نہایت پریشانی و سراسیمگی کے عالم میں گھر پہنچی۔ کہ دیکھئے کیسے گذرتی ہے۔ گو ابھی ان بیگم صاحبہ کو آئے ایک ہفتہ ہی گذرا تھا۔ لیکن اختر نے گھر کا انتظام اور ہی پایا۔ کیونکہ اُنھوں نے یہاں آتے ہی سب ردوبدل کردیا تھا۔ اختر کی والدہ مرحومہ کے وقت میں کوٹھی کے احاطے کے باہر باورچی خانے میں خانساماں کھانا پکایا کرتا تھا۔ ان بیگم صاحبہ کو یہ منظور نہ ہُوا۔ آتے ہی خانساماں برطرف کیا۔ اور اپنے ساتھ کی ملازمہ عورت کو باورچیخانے کے کالم پر مقرر کیا۔ بیچاری اختر یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئی۔ کہ کوٹھی کے اُس برآمدے میں جس کے در باغیچے میں تھے۔ کھانا پک رہا ہے۔ اور تمام دُھواں کمروں میں جا رہا ہے۔ وہ ایسے ایسے نئے انتظامات دیکھ کر کُڑھتی اور گھبراتی تھی۔ اور ہر ایک بات تعجب سے دریافت کرتی تھی۔ کہ لتاں جان یہ آپ نے ایسے کیوں کیا؟ اس سے کیا ہرج تھا؟ یہ کیوں بدلا؟

ایک دن بیگم صاحبہ نے کھانے کے کمرے سے میز کُرسیاں نکلوا کر مُکلّف فرش

کرایا اور دسترخوان پر کھانے کا انتظام کیا۔ اختر یہ خیال کر کے۔ کہ امّاں جان مرحومہ کس شوق سے اس کمرے کو سجایا کرتی تھیں۔ دل ہی دل میں گھلی جاتی تھی۔ لیکن آفرین ہے وکیل صاحب کے یک دم پلٹ جانے والے دل پر۔ کہ نہایت شوق سے فرش پر بیٹھ کے کھانا کھا لیتے تھے۔ اُنھیں کچھ معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔ کہ مَیں کیا سے کیا ہو گیا، یہاں تک کہ اُنھوں نے بیوی کے کہنے سے پتلون کا استعمال بھی بہت کم کر دیا تھا کہ اُٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے اور اکثر اوقات گلے اور ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لپیٹے رکھتے تھے۔ ایک دن شام کے وقت بیگم صاحبہ برآمدے میں مسہری پر لیٹی تھیں کہ آپ باہر سے آئے۔

وکیل صاحب: ہَیں تم اس وقت یہاں کیوں لیٹی ہوئی ہو؟ چمن میں کیوں نہیں گئیں؟

بیگم صاحبہ: مَیں چمن میں کس طرح جاؤں؟ ذرا سا تو جنگلا لگا ہے۔ بے پردگی ہوتی ہے اور کچھ بیٹھنے کا بھی سامان نہیں۔ لکڑی کے سخت بنچوں پر رنج سے تو بیٹھا جاتا نہیں۔

وکیل: اچھا مَیں بہت جلد دیوار کھینچوا کر جگہ ٹھیک کرا دونگا۔

اور اس ارادے سے کہ جب تک دیواریں تیار ہوں قناتیں لگوا کر بیگم کے بیٹھنے کا انتظام کیا جائے۔ وکیل صاحب چمن میں آئے۔ یہاں دیکھا کہ اختر غریب ایک گلاب کے درخت کے پاس زمین پر بیٹھی ہے اور پھولوں کو دیکھ دیکھ کر رو رہی ہے۔ آپ بیٹی کے قریب بیٹھ گئے۔ اور پُوچھنے لگے۔

وکیل: کیوں اختر روتی کیوں ہو؟ کیا تمہاری امّاں جان نے کچھ کہا؟ وہ تو تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ پھر تُم کیوں رنجیدہ رہتی ہو؟

اختر: نہیں ابا جان مَیں بیگم صاحبہ سے تو رنجیدہ نہیں۔

وکیل: ہَیں بیگم صاحبہ؟ امّاں جان کیوں نہیں کہتیں؟

اختر: ابا جان میری حقیقی ماں تو دُنیا میں ایک ہی تھی۔ جواب نہیں رہی۔ مَیں اُن کی جانشین کو بھی ماں کہہ سکتی ہوں۔ اگر وہ مجھے بیٹی سمجھے۔ بیگم صاحبہ نے آج ہی حکم دیا ہے کہ آئندہ مجھے امّاں جان امّاں جان کہہ کر نہ بلایا کرو۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ مَیں نے کہا کہ "امّاں جان نہ کہوں تو کیا کہوں؟" تو اُنھوں نے جواب دیا کہ

"بیگم صاحبہ کہو۔ جو سب کہتے ہیں۔"

وکیل: تو اس لئے تم روتی تھیں؟

اختر: نہیں ابا جان۔ یہ تو بات ہی کیا ہے۔ خدا جانے ابھی آگے کو کیا کیا ہونا ہے؟ اس وقت تو باغیچہ کو دیکھ کر میں رو پڑی۔ آپ کو معلوم ہے کہ امّاں جان نے کس شوق سے اپنے ہاتھوں سے یہ کیاریاں بنائی تھیں۔ وہ مالی پر بھی اطمینان نہ کرتی تھیں۔ بلکہ اپنے ہاتھوں سے انہیں سینچا کرتی تھیں۔ اُن کے بعد بھی دو سال تک حالانکہ میں کانپور رہی۔ باغیچ ہرا رہا۔ لیکن آج مجھے کانپور سے آئے آٹھواں دن ہے۔ میں اسے بالکل خشک دیکھتی ہوں۔ پھول کیسے مرجھا گئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا دل بھی مرجھایا جاتا ہے۔

وکیل: بیٹی یہ تو تمہیں چاہئے کہ خود کہہ کر مالی سے درست کرایا کرو۔ تم جانتی ہو۔ وہ تو لکھنؤ کی بیگم ہوئیں۔ جنہیں اپنے ہاتھ سے پھول کی پتیاں الگ کرنے میں بھی عار ہے۔ دوسرے ابھی باغیچے میں پردے کا پورا انتظام نہیں۔ وہ اس میدان میں کیسے آ سکتی ہیں؟

اختر: ابا جان آخر امّاں بھی اِسی میدان میں آیا کرتی تھیں۔ کیا اُن کا پردہ نہ تھا؟ اور میں باغیچہ کا کام کس سے لوں؟ آج پانچواں دن ہے کہ بیگم صاحب نے مالی کو برخاست کر دیا ہے۔ صرف اتنے قصور پر کہ مالن نے ہار بنانے میں دیر کی تھی۔ یعنی چھ بجے کے بجائے ساڑھے چھ بجے پھول لائی تھیں۔ ہائے بیچارہ مالی کس قدر رو رو کر مجھ سے رخصت ہوا ہے۔ اُس وقت میرا دل پھٹا جاتا تھا۔ میری امّاں جان اِس ہنر مند مالی کی کتنی قدر کیا کرتی تھیں۔ آہ یہ سخت رنج میرے دل پر ہے۔

وکیل: اچھا خیر۔ ہم دوسرا مالی کہیں رکھ دینگے۔ اُٹھو یہاں سے۔ منہ دھو ڈالو۔ میں اس بنگلے کے گرد قنات لگواتا ہوں۔ تاکہ تمہاری والدہ یہاں آ سکیں۔

اختر بیچاری روتی ہوئی اُٹھی۔ اور اندر جا پڑی۔

☆☆

دوسرا باب

قسمت میں گر لکھے تھے میری بے شمار رنج
سنگ ریزہ ایک رکھ دیا ہوتا بجائے دِل

اختر النساء بے چاری کے کس طرح رات دن گذرتے تھے۔ یہ لکھنا بہت مشکل ہے۔ دیکھنے والوں کی نظروں میں اچھا سامان تھا۔ مائیں انائیں محبت کرنے والے ماں باپ لیکن ان سب کی محبت کا اندازہ وہی ننھا سا غمگین دل کر سکتا تھا۔ اختر النساء کو اسی حالت میں رہتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔ شروع شروع کے دو چار دن تو بیگم صاحبہ نے بہت پیار محبت جتایا۔ آخر کو میاں سے شکایتیں ہونے لگیں۔ ایک دن شام کے سات بجے کا وقت تھا اختر بیچاری اپنے کمرے میں پڑی رو رہی تھی۔ انہیں خیال آیا کہ یہاں آئیں گے۔ بیٹی کو روتا دیکھیں گے تو برا نہ ہو۔ خود بھی منہ پر رومال رکھ کر لیٹ گئیں۔ وکیل صاحب باہر سے سیدھے بیوی کی طرف آئے۔ دیکھا تو پھولوں کی ٹوکری زمین پر پڑی ہے۔ پھولوں کا زیور جو وہ ہر روز شام کو پہن کر بیٹھا کرتی تھیں۔ وہ بھی نہ پہنا تھا۔ وہ آتے ہی گھبرا گئے اور کہا:

وکیل: کیوں جی طبیعت کیسی ہے۔ تمہارے پھول بھی نیچے پڑے ہیں۔ یہ لیٹنے کا وقت ہے؟

بیگم: (رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے) کچھ نہیں ہماری قسمت ایسی ہی تھی۔ سوکن سو کیلوں سے واسطہ پڑا۔ میں نے اس بچی کو خدا جانتا ہے۔ تمہاری نہیں اپنی سمجھا

اور تمہارا بھی دل جانتا ہوگا کہ کس پیار سے اُسے رکھا مگر اُس نے اپنی کرنی کی سوتیلا پن جتلا کے چھوڑا۔

وکیل: کہو تو سہی۔ بات کیا ہوئی؟ اس سے اگر کوئی بے ادبی بھی ہوئی ہو گی تو تمہیں معاف کرنا چاہئے۔ وہ بچی ہے۔ بھلا اس قدر رنج کہ خود رونے لگیں۔ اُسے نہ سمجھایا؟

بیوی: سمجھاؤں کیسے وہ مجھے جانتی ہی کیا ہے۔ آخر میں جو اس گھر میں ہوں تو مالک ہی بن کر رہوں گی۔ مہمان تو نہیں کہ کسی چیز سے واسطہ نہ رکھوں۔ آج ان کی امّاں جان کا کمرہ جو برسوں سے بند پڑا تھا۔ کھلوا کر دیکھا کہ کہیں قیمتی چیزیں خراب نہ ہو جائیں۔ کرسیاں وغیرہ دھوپ میں رکھنے کو نکلوائیں۔ کپڑوں کے صندوق کھول کر دیکھے کہ اُنہیں کیڑا نہ لگ جائے۔ وہ بھی آ کھڑی ہوئی کہ امّاں جان کے زیور کا صندوقچہ اس الماری میں رکھا ہے۔ نکلوا کر حفاظت سے رکھوائیں۔ میں نے الماری کھولی تو اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ دو چار صابون کے بکس اور لیسوں کے بنڈل نکلے جو اُن کے حوالے کئے۔ وہ یہی کہے گی کہ وہ صندوقچہ اسی میں تھا اور ابّا جان نے میرے سامنے اس میں رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ میں تو جس دن سے یہاں آئی ہوں۔ آج یہ کمرہ کھولا ہے۔ تمہارے ابّا جان نے نکال لیا ہوگا۔

وکیل: (گھبرا کر) نہیں تو مَیں نے تو نہیں نکالا۔ ڈیڑھ سال ہوا۔ اسی طرح کمرہ بند پڑا ہے۔

بیوی: (بے قراری سے رو کر) ہیں! تو تمہارا بھی یہی خیال ہے؟ اب میرا گذارہ اس گھر میں مشکل ہے۔

وکیل: تم بات تو سُنو۔ خدا نہ کرے۔ میرا تو یہ خیال نہیں ہے۔ تم اس قدر کیوں رنجیدہ ہوتی ہو؟ نوکروں وغیرہ نے نکال لیا ہوگا۔ پھر اس میں تمہارے رونے کی وجہ اور لڑکی پر رنج فضول۔ کیا اُس نے کچھ تمہیں کہا؟

بیوی: یہ اُس نے تھوڑا کہا۔ کہ "نہیں زیور اسی میں ہے۔

وکیل: خیر اتنی اتنی باتوں پر رنج نہیں کیا کرتے۔ اُٹھو منہ ہاتھ دھو کھانا کھائیں۔

یہ کہہ کر لوٹا اُٹھایا اور منہ دُھلانے لگے۔ دل میں خیال تو بہت تھا بیٹی کا مگر اُنہیں بغیر درست کئے چلے جاتے تو گھر میں رہنے کا ٹھکانا بھی نہ ملتا۔ کھانا آیا تو بیٹی کو بھی بلایا۔ اس

کی اناّ نے آکر کہا کہ وہ سو رہی ہیں۔ اس وقت نہیں جگاتی۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔

جب کھانا کھا چکے۔ تو بیوی سے کہا۔ "میں لڑکی کو دیکھ آؤں؟ اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔" اُس کے کمرے میں آئے تو دیکھا۔ گرمی کا موسم اور شام کا وقت۔ وہ بے چاری ایک کونے میں سوفے پر پڑی ہے۔ پاؤں نیچے لٹک رہے ہیں اور رو رہی ہے۔ آپ وہیں فرش پر بیٹھ گئے اور اس کا ہاتھ پکڑا جو بخار سے جل رہا تھا۔ اُٹھا کر بٹھالیا اور پوچھنے لگے۔

پیاری اختر اس وقت تم اندر کیوں چھپی ہو۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تمہیں تو بخار ہے!

آفرین ہے اس لڑکی کے حوصلے پر کس سنجیدگی سے بولی: "کچھ نہیں ابا جان پڑھتے پڑھتے نیند آ گئی یہیں پر سو گئی۔"

وکیل: نہیں اختر تمہیں بخار ہے اور تمہاری آنکھیں بھاری ہو رہی ہیں۔ سچ سچ کیا بات ہے؟

اختر نے باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ کچھ نہیں ابا جان میرے دن ہی ایسے ہیں۔ میرے نصیب اچھے ہوتے تو میری امّاں جان کیوں مرتیں! مجھے صرف یہ رنج ہے کہ میرے ساتھ والیاں ہم جماعت مجھ سے آگے بڑھ جائیں گی اور میں پیچھے رہ جاؤں گی اور مجھے کسی کی کچھ شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو یہ کہ بیگم صاحبہ سکول میں مجھے کیوں نہیں جانے دیتیں؟

وکیل: خیر یہ تو ہوا۔ اس کا سبب تو بتاؤ کہ آج کیا بات ہوئی جس کا اس قدر رنج کر رہی ہو تمہاری امّاں جان خود ا رو رہی تھیں۔

اختر: ابا جان زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ آپ کی غفلت یا ہماری قسمت سے میری امّاں جان کے زیورات کا صندوقچہ جو عرصے سے اُن کے کمرے کی الماری میں مقفل تھا نہ معلوم کس طرح ضائع ہو گیا۔ اس کا مجھے رنج ہے کہ وہ زیور ان کے پہنے ہوئے تھے جن کی مجھے بے انتہا قدر تھی۔

وکیل: تو اس کا رنج انہیں کیوں ہوا۔ وہ کیوں روئیں؟ قدر تو تمہیں تھی نہ کہ انہیں۔

اختر: انہیں بھی اس کا رنج ہو گا کہ گھر کا نقصان ہو گیا۔

بیٹی کی اس تقریر کا باپ کے دل پر بے انتہا اثر ہوا اور زیادہ نہیں تو چند منٹوں کے لئے انہیں معلوم ہو گیا کہ تعلیم کا کیا اثر ہوتا ہے اور جہالت کا کیا ہوتا ہے۔ اسی وقت بیوی

نے اُنہیں کس رنگ میں قصہ سنایا تھا اور بیٹی نے کس طریق سے۔ چوں کہ وہ اصل معاملے کو معلوم کرنا چاہتے تھے پھر کہا۔

وکیل: اختر تم مجھ سے چھپاتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری اماں تم پر خفا ہوئی ہوں گی۔ میں تمام قصہ نوکروں کی زبانی سن چکا ہوں۔ تم مجھے صحیح صحیح بتادو تا کہ جھوٹ سچ میں تمیز کر سکوں اور ایسی باتوں کا انتظام کرو۔

اختر: میرا بتانا فضول۔ میں یوں ہی اُن سے بُری بنوں گی اور آپ کی کوشش بے سود۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ہمارے گھر کا انتظام ہونا اب ناممکن ہے۔ بس اب صرف آپ اتنا کریں کہ مجھے کانپور بھجوادیں۔ اب یہ اپنی بیٹی کو بلانا چاہتی ہیں۔ اب میرا یہاں رہنا اس کی موجودگی میں بہت مشکل ہے۔ میں اس کو دیکھ چکی ہوں۔ وہ بڑی بدمزاج اور بدتہذیب لڑکی ہے۔

وکیل: نہیں اُن کی بیٹی وہ تو اُن کی بھتیجی ہے اور تم اسے کس طرح جانتی ہو؟

اختر: خیر بھتیجی ہی ہوگی لیکن مجھے بخوبی معلوم ہے کہ جب بیگم صاحب کے شوہر کا انتقال ہوا تھا تو اس لڑکی کے چچا اسے اِن سے چھین کر کانپور لے آئے تھے اور یہاں اس لڑکی کے چچا کی لڑکی اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔ اس طرح میری اس کی ڈیڑھ سال سے واقفیت ہے۔ اب بیگم صاحبہ نے اس لڑکی کے بدلے میں کئی ہزار کے قیمتی زیورات اس کے چچا کو دینے کہے۔ تب اس نے منظور کیا ہے کہ لڑکی کو یہاں بھیج دے گا۔

یہ بالکل نئے اور خفیہ حالات سُن کر وکیل صاحب سرد پڑ گئے اور چند منٹ کو خاموش ہوگئے۔ کیوں کہ اُنہیں ابھی یہ حالات معلوم نہ تھے۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اختر سے کہا:

وکیل: خیر یہ تو ہوا۔ تم مجھے آج کا قصہ سناؤ۔ تم نے لڑکی کے بدلے زیورات دینے کا وعدہ کس طرح معلوم کیا اور آج دن میں کیا گذری؟

اختر اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور اپنی الماری کھول اس میں سے ایک خط نکال ابا کو دے دیا۔ جب وہ پڑھ چکے تو بولے۔ تم نے کس طرح یہ خط لے لیا؟ اور جب یہ تمہیں مل گیا تو انہوں نے دوسرا لکھوایا ہوگا۔ یہ تو اُن کی مغلانی امانی بیگم نے لکھا ہوا ہے۔

اختر: ابا جان میں ہر چند چاہتی تھی کہ آپ سے میں اس معاملے کا ذکر تو

کروں لیکن آپ دل سے چاہتے ہیں کہ میں کل حال سناؤں۔ اس نے یہ خط اُنہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا لے لیا تھا کہ میں جھوٹی نہ ٹھیرائی جاؤں۔ دلفریب! چھ دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت میں بی مغلانی کے کمرے میں چلی گئی۔ اسی وقت کچھ لکھتے لکھتے کاغذ قلم دان میں چھوڑ کر باہر گئی تھیں۔ چوں کہ انہیں خیال بھی نہ تھا کہ میرا گذر اس طرف ہوگا۔ وہ قلمدان کھلا ہی چھوڑ کر چلی گئیں، میں دو تین دن پہلے سے گھر میں کچھ گھسر پھسر سُن رہی تھی اور مجھے شک تھا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ گو دل نہ چاہتا تھا لیکن بہت حوصلہ کر کے قلمدان سے کاغذ نکال لیا اور باغیچے کے راستہ سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہاں آ کر بہت کوشش سے اس کی نقل اسی خط سے ملتی جلتی کی اور یہ اپنے پاس رکھ لیا اور وہ خط قلمدان میں رکھ آئی۔ اسی وقت بی امانی نے وہ خط بیگم صاحبہ کو دکھایا اور ملفوف کر کے پوسٹ کر دیا۔ اب اس کے بعد میں اس فکر میں تھی کہ وہ زیورات کون سے اور کہاں سے دیں گی۔ یہ خیال بھی نہ تھا کہ میری امّاں جان کا کمرہ کھولا جائے گا۔ پرسوں رات جب آپ بیرسٹر صاحب کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں بہت کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ میں اس وقت کچھ نہ سمجھی۔ آخر اس کارروائی کا نتیجہ نکل آیا۔ بیگم صاحبہ نے آج دن میں ۱۲ بجے کے قریب مجھے بلوا بھیجا اور کہا کہ چلو تمہاری امّاں جان کے کمرے کو دُھوپ لگا دیں۔ کئی سال سے بند پڑا ہے۔ چیزیں خراب ہو جائیں گی۔ چنانچہ میری موجودگی میں تمام فرنیچر باہر نکالا گیا اور الماری کی کنجی مجھے دے کر کہا کہ اسے بھی کھولو۔ میں ہر چند اسے کھولنا نہ چاہتی تھی۔ کیوں کہ اس میں میری امّاں جان کا زیور تھا۔ اُنہوں نے خود کھولا اور دیکھا تو سوائے چند صابون کے بکسوں کے کچھ نہ تھا۔ صرف ایک بار حیرت سے میں نے دیکھا اور کہا: ہیں امّاں جان اس میں تو میری امّاں جان کا زیور تھا۔ کہاں گیا؟ وہ بہت ناراض ہو کر بولیں کہ "مجھے کیا خبر؟ مَیں نے تو آج ہی کھولا ہے۔ تمہارے ابا جان نے کھولا ہوگا اور نکال لیا ہوگا۔" پھر میں نے کہا "ابا جان نکالتے تو مجھے خبر کر کے نکالتے۔" "بس اتنا۔" ڈکیل۔

وہ بہت ہی بگڑیں اور جو کچھ منہ میں آیا کہا۔ مجھے اس قدر افسوس اس زیوروں کے کھو جانے کا نہیں ہوا جس قدر اُن الفاظ کا ہوا ہے جو تمام عمر میں آج سننے پڑے۔ میں کچھ نہیں بولی اور اسی وقت سے یہاں آ پڑی۔

مجھے اُن کی ماما کی لڑکی شریفن سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ بکس پرسوں رات کو نکالا گیا تھا اور نرگس کے ہاتھ اُسی دن صبح کانپور بھیج دیا گیا۔ یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ نرگس پرسوں صبح اُن کے میکے لکھنؤ جانے کا نام کر کے گئی ہے۔ وہ لکھنؤ میں نہیں گئی۔ کانپور گئی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اس میں سے جڑاؤ زیورات جو بیش قیمت تھے۔ وہ رکھ لئے ہیں اور سادے سونے کے جو ڈھائی تین ہزار کے ہوں گے۔ بھیج دیئے ہیں۔ زیور کپڑے کی اُنہیں کچھ پرواہ نہیں۔ تین ہزار میں اُنہیں لڑکی بِل جائے گی جو سات سال سے علیحدہ ہے۔

یہ بات سُن کر وکیل صاحب تھوڑی دیر کے لئے دیوانے سے ہو گئے۔ لیکن کیا۔ جب تک یہاں ہیں۔ تب تک کے لئے، اس وقت بیوی پر بہت غصہ آیا۔ خیر کھانا منگوا کر اپنے ہاتھ سے اختر کو کھلایا اور سمجھانے لگے کہ تم رنج نہ کرو۔ میں سب انتظام کر لوں گا۔

اختر: ابا جان میں کہہ چکی ہوں کہ اس گھر کا انتظام اب آپ سے نہیں ہوگا۔ بس مجھے اسکول بھیج دیں اُور تو میرے سب نقصان ہو رہے ہیں اور ہوں گے، تعلیم سے تو نہ رہ جاؤں۔

وکیل: اچھا اس کی بابت بھی سوچوں گا۔ اب تو تم آرام سے سوؤ۔

بیٹی کو سُلا کر اُس طرف آئے۔ ہر چند دل نہ چاہتا کہ بیوی کی طرف جائیں اور اُس کی صورت دیکھیں لیکن بڑا حوصلہ کر کے بیوی کی طرف آئے۔ نہ معلوم اس فرین میں کیا جادو بھرا تھا یا اُن کی عقل ماری گئی تھی کہ اِدھر آتے ہی سب کچھ بھول گئے۔ دیکھا تو میاں کے انتظار میں ٹہل رہی ہیں۔ بہت ہی ملاحت سے مسکرا کر بولیں۔ ''آپ نے کہاں اس قدر دیر لگا دی؟ میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔''

یہ بہت ہی خوش ہو گئے اور دل میں کہنے لگے کہ ایسی پری چہرہ دل فریب بی بی سے اگر کچھ قصور بھی ہو جائے تو اُسے معاف کرنا چاہئے۔ یہ دُنیا کا قاعدہ ہی ہے کہ سوتیلے بچوں سے جلنا اور اپنا بھلا چاہنا اگر اس نے کیا تو کیا انوکھا کیا؟

اس وقت تو وکیل صاحب نے اپنی بیوی کو معاف کر دیا لیکن اِن نئے حالات کو معلوم ہونے سے اُن کے دل میں اُلجھن سی پیدا ہو گئی اور چوں کہ یہ حالات اپنی بھولی بھالی بچی معصوم لڑکی کی زبانی معلوم ہوئے تھے جس میں اُنہیں ذرا بھی شک نہ ہو سکتا تھا۔ مزید

حالات معلوم کرنے کی سخت فکر تھی لیکن پوچھتے کس سے؟ احباب کے آگے ذکر کرتے شرم آتی تھی۔ اسی فکر نے انہیں چین سے نہ سونے دیا اور دو بجے کے قریب آنکھ کھلی تو اس وقت سے جاگتے انہیں صبح ہوگئی۔ کمرے کے کلاک نے بھی چار بجا دیئے اور گھنٹے کی آواز سُن کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور باغیچے میں آکر ٹہلنے لگے۔ چند ہی منٹ بعد بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بھی باغیچہ میں آگئیں۔ وکیل صاحب کے ساتھ ٹہلتے ہوئے کہنے لگیں۔

بیگم: آج تین دن ہوئے ماما لکھنؤ گئی ہوئی ہے۔ میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ وہاں سے واپسی کے وقت میری بھتیجی لاڈلی بیگم کو بھی کانپور سے ہمراہ لیتے آنا۔

وکیل: ہَیں کانپور سے! تم نے تو کہا تھا کہ میں نے اُسے میکے بھیجا ہے۔ بھتیجی کانپور۔ یہ کیا بات ہے!

بیگم: آپ کو یہ حالات معلوم نہیں ہیں۔ میرے ابا جان اور بڑے بھائی کے انتقال کے وقت گھر میں بڑا جھگڑا پڑ گیا تھا۔ بھائی جان کے مرتے ہی بھابی صاحبہ میکے چلنے پر مع اس لڑکی کے تیار ہوگئیں۔ چوں کہ اس بچی کو بچپن سے میں نے پالا تھا۔ میں نے اور چھوٹے بھائیوں نے اصرار کیا کہ اسے ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔ کیوں کہ مجھے یہ کسی طرح منظور نہ تھا کہ یہ بچی ہمیشہ کے لئے ماں کے ساتھ ننھیال چلی جائے۔ میں نے بہت ہی زور لگایا کہ بچی میرے پاس رہے۔ جب میری نہ چلی تو میں نے اپنے چچازاد بھائیوں کو سمجھایا کہ کسی طرح اس بچی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ اُنہوں نے یہ کیا کہ زبردستی بچی کو اپنے ساتھ لے کر کانپور چلے گئے۔ میری بھاوج اپنے میکے چلی گئیں۔ میں اُسے بلا تا بلا تا ہی کرتی رہی۔ اِس میں پانچ چھ ماہ گذر گئے۔ پھر میری شادی کا بندوبست ہو گیا اور میں یہاں آگئی۔ اس وقت مجھے شرم آئی۔ تم سے یہ بات کہتے ہوئے کہ میری بھتیجی کو بھی ساتھ لو۔ اب آپ کے مزاج سے واقف ہوگئی ہوں اور خیال کرتی ہوں کہ جہاں آپ اس قدر نوکر چاکر وغیرہ کا خرچ برداشت کررہے ہیں وہیں اگر میری پیاری بچی نے دو چپاتیاں کھالیں تو آپ کو ناگوار نہ ہوں گی۔ میں اس کے بغیر بے چین رہتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ آپ کو میری خوشی اور آرام کا خیال ہے۔ انہیں باتوں کو سوچ کر میں نے لاڈلی بیگم کو بلا لیا ہے اور وہ آج شام کو اسی ماما کے ساتھ آجائے گی۔

وکیل: ہُوں۔ تم نے یہ حالات آج بیان کیے پہلے سے ذکر کرتیں تو لڑکی کو اپنی اختر کے ساتھ ہی لے آتا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اُسے بلوالیا۔ جب وہ تمھیں اس قدر عزیز ہے تو میں کیوں نہ خوشی سے اُسے رکھوں گا؟ وہ ہمارے گھر کی رونق ہوگی۔ کیوں کہ اختر کو اسکول کھلنے پر کانپور بھیج دینا چاہتا ہوں۔

یہ باتیں کرتے کرتے اُنھیں خیال آیا کہ رات لڑکی کو بیمار چھوڑ آیا تھا اُسے بھی دیکھنا چاہیے۔ چلنے لگے تو بیوی نے کہا: ''کہاں جاتے ہو؟''

وکیل: اختر کو دیکھتا ہوں۔ رات اُسے بخار تھا۔

بیگم: میں اس کے پاس صبح ہی گئی تھی۔ چاہتی تھی کہ منہ ہاتھ دُھلاتی جاؤں۔ لیکن وہ مجھ سے خفا ہے۔ وہ میرے جگانے سے نہیں اُٹھی۔

وکیل صاحب وہاں سے اختر کے پاس آئے۔ دیکھا تو اپنی میز پر خط لکھ رہی تھی۔ ابا کو آتے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور سلام کیا۔

وکیل: پیاری بیٹی تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ کیا لکھ رہی ہو؟ مجھے تو بہت فکر تھی یہ سُن کر کہ آج تم دیر سے اُٹھی ہو۔

اختر: نہیں ابا جان میں تو بہت سویرے اُٹھی ہوں۔

وکیل: تمہاری امّاں جان کہتی ہیں کہ میں صبح جگانے گئی تھی تو وہ نہیں اُٹھی تھی۔

اختر: اماں جان تو ادھر بالکل آئی ہی نہیں۔ میں جس وقت اٹھی ہوں وہ سو رہی تھیں۔ آج مجھے بہت فکر ہے اور اس سے صبح ہی آنکھ کھل گئی۔ آج شام کو لاڈلی آجائیں گی۔ میری بہت مشکل ہوگی۔ میں بیگم صاحبہ کی خدمت کرسکتی ہوں لیکن لاڈلی کے ساتھ ایک منٹ بھی گزارنا مشکل، وہ مجھ سے لڑتی رہتی تھی اور جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کی والدہ نے میرے ابا جان سے شادی کر لی ہے تو وہ مجھ سے سخت بیر کرنے لگی تھی اور میری کلاس کی لڑکیوں سے کہتی تھی کہ ''اختر تو اب مجھ سے دشمنی کرے گی یہ تو اب میری اماں جان کی سوتیلی بیٹی ہوگئی۔ اس سے میں کیا کھیلوں اور کیسے بولوں؟''

وکیل: (نہایت متفکر ہو کر) پیاری اختر پھر بتاؤ۔ میں کیا کروں؟ تمہارا اسکول کھلنے میں ابھی پندرہ دن ہیں۔

اختر: ابا جان اتنے عرصے کے لیے مجھے خالہ جان کے گھر بھیج دیں۔ اُن کا کل رقعہ بھی آیا تھا۔ وہ مجھے بلاتی ہیں۔ لکھا ہے کہ تمہارے بھائی اختر حسن بھی علی گڑھ کالج سے رخصت پر آئے ہوئے ہیں۔ ان سے بھی مل لوں گی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ اپنی اماں جان اور ابا جان سے اجازت لے کر جلدی آ جاؤ پھر تمہارا اسکول کھل جائے گا۔

وکیل: بہت اچھا میں تمہیں وہیں پہنچا آؤں گا۔ تمہاری اماں جان سے ذکر کر لوں۔

اختر: ان سے ذکر کیا تو وہ مجھے کبھی نہ جانے دیں گی۔ وہ میری خالہ جان سے بہت ہی جلتی ہیں۔ جب میری مری ہوئی مٹی میں ملی ہوئی اماں جان کا ذکر تک نہیں سن سکتیں تو خالہ جان تو پھر اُن کی بہن ہیں اور زندہ ہیں۔ آپ ابھی چاء کے بعد مجھے وہاں بھجوا دیں اگر سہ پہر کو گئی تو اُنہیں برا لگے گا کہ لاڈلی کے آنے کی خبر سے گئی۔

وکیل: اچھا تو تم رقعہ بھیج کر اپنے بھائی اختر حسن کو بلا لو۔ وہ آ کر تمہیں لے جائیں گے۔

اختر النساء نے رقعہ لکھ کر خالہ کے گھر بھیجا اور دونوں باپ بیٹی باغیچے میں آ گئے۔ جہاں تینوں نے مل کر چاء پی۔ وکیل صاحب نے بیوی سے ذکر کر دیا کہ اختر کی خالہ نے اسے بلایا ہے۔ اس کے بھائی بھی علی گڑھ سے آئے ہوئے ہیں۔ پھر وہ بھی چلے جائیں گے اور اُس کی بھی چھٹیاں تمام ہو جائیں گی۔ اس خیال سے میں نے بھی کہلا بھیجا ہے کہ اختر حسن کو بھیج دو۔ وہ اختر النساء بیگم کو لے جائیں گے۔

تیسرا باب

آدم سے باغ خلد چھٹا، ہم سے اپنا گھر
وہ ابتدائے رنج تھی، یہ انتہائے رنج

وقار منزل

"رفیق منزل" سے داہنی جانب تقریباً ڈیڑھ سو قدم کے فاصلہ پر ایک عالی شان کوٹھی ہے جس کے بورڈ پر "وقار منزل" لکھا ہے۔ اس میں یہاں کے ڈپٹی کلکٹر مولوی وقار احمد ایم اے رہتے ہیں۔ اُن کی بیوی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال لیڈی ہیں اور اور کیوں نہ ہوتیں؟ یہ بھی مولوی محمد یونس صاحب مرحوم کی بڑی صاحبزادی ہیں جن کی چھوٹی صاحبزادی مرحومہ مسز رفیق احمد تھیں۔ مولوی محمد یونس صاحب مرحوم ایک بڑے زمانہ شناس و آزاد خیال بزرگ تھے۔ جنہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو نہایت کوشش سے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ خوش قسمتی سے اُنہیں داماد بھی دونوں نہایت تعلیم یافتہ ملے تھے۔ مسٹر وقار احمدؒ کے چار بچے دو لڑکے اور دو لڑکیاں اس کوٹھی کی رونق تھے۔ سب سے بڑے لڑکے اختر حسن کی عمر اس وقت ۱۵ سال کی تھی۔ اس سے چھوٹی قمر النساء بیگم ۱۱ سال کی تھی اور ایک چھوٹا بچہ اظہر حسن دو سال کا تھا۔ اختر حسن انٹرنس میرٹھ ہی میں پاس کر چکا تھا اور اب علی گڑھ کالج میں ایف اے میں پڑھتا تھا۔ آج کل چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ یہ اپنی لائق بہنوں کو بہت ہی چاہتا تھا اور لیاقت ہی کی وجہ سے اپنی خالہ زاد بہن اختر النساء سے بھی بہت محبت کرتا تھا اور چونکہ اختر النساء بیگم کا اپنا بھائی

کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ اختر حسن و اظہر حسن سے بے حد محبت کرتی تھی۔ کھانے والے کمرے کے آگے برآمدے میں چھوٹی گول میز کے گرد مسٹر و مسز وقار احمد مع اپنے چاروں بچوں کے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ قمر النساء بیگم بنا بنا کے پیالیاں دے رہی تھی۔

یہ سب اس وقت بہت ہی خوش تھے اور کیوں نہ ہوتے؟ خدا نے سب نعمتیں اُنہیں دے رکھی تھیں۔ بچوں کے سر پر شفیق والدین۔ والدین کے آگے خوب صورت فرماں بردار بچے۔ رہنے کو عالی شان مکان۔ خدمت کو دست بستہ نوکر۔ غرض پُر لطف زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہاں رہ رہ کر اختر حسن اور اُس کی والدہ کے دل میں ایک کانٹا سا کھٹک جاتا تھا۔ وہ اختر النساء کی والدہ کی بے وقت موت اور پھر بے چاری اختر کا سنگ دل سوتیلی ماں کے بس میں رہنے کا خیال۔ بس اس خیال کے آجانے سے یہ دونوں رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اس وقت بھی اِسی خیال میں اختر حسن نے کہا۔

اختر حسن: اماں جان کل آپ نے اختر النساء کے بلانے کو لکھا تھا۔ وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں خود جاؤں لینے کو؟

مسز وقار احمد: ہاں میاں وہاں سے جواب اب کہاں ملتے ہیں؟ بیگم صاحب نے اس کا بھیجنا منظور نہ کیا ہوگا۔ یہاں یہ ہی ذکر تھا کہ ایک لڑکے نے دستی چٹھی میز پر لا کر رکھ دی۔ مسز وقار احمد نے پڑھی لکھا تھا:

> پیاری خالہ جان۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مشکور کیا۔ میں نے ابا جان سے آنے کی اجازت لے لی ہے۔ آپ میرے لینے کو بھائی اختر حسن کو بھیج دیں۔ زیادہ حدِ ادب۔
>
> آپ کی بدنصیب اختر رفیق احمد

یہ رقعہ سنتے ہی اختر حسن نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور کھڑے ہو گئے۔ جلدی جلدی کپڑے پہن وہاں پہنچے اور آدھے گھنٹے میں اختر النساء کو لے کر واپس آ گئے۔ یہ سب اُن کے انتظار میں یہیں بیٹھے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھ کر خالو نے اُٹھا لیا اور خالہ دیکھ کر رونے لگی۔ کیوں کہ اختر النساء پہلے کبھی ایسی حالت میں نہ آئی تھی۔

ہمیشہ اُس کی والدہ اُس کے کپڑے بدلا کر بال بنا کر گھنٹوں میں تیار کر کے بھیجا کرتی تھیں۔ آج اس کے بالوں میں نہ تیل تھا نہ کنگھی تھی۔ نہ فیتہ تھا۔ معمولی ساڈوریے کا فراک پہنے تھی۔ خالہ بھانجیاں خوب مل کر رو دیں۔

مسز وقار: بیٹی کتنے دن کی اجازت ملی ہے؟ کوئی دن رہو گی بھی؟

اختر حسن: لمّاں جان جب تک میں یہاں ہوں۔ بہن کو نہ جانے دیں۔

مسز وقار: میاں بھلا میرا کیا اختیار؟ جب چاہیں گے بلا لیں گے۔

اختر النساء: ہائے مجھ سے اب گھر چھٹا ہی سمجھیں۔

آدم سے باغِ خُلد چُھٹا، مجھ سے اپنا گھر
وہ ابتدائے رنج تھی، یہ انتہائے رنج

خالہ جان اسکول کھلنے میں پندرہ دن باقی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ دو ہفتے یہیں گذاروں۔ کیوں کہ اُن کی لڑکی لاڈلی اب آجائے گی۔ ابّا جان کہتے تھے۔ وہ بھی شام کو آئیں گے، آپ ان سے ذکر کر لینا۔

اختر النساء نے نہایت افسردگی کے لہجے میں یہ شعر اس طرح ادا کیا کہ خالو اور خالہ دونوں بہنیں اور اختر حسن آبدیدہ ہو گئے۔ اختر النساء کے بھی آنسو جاری تھے۔

مسز وقار: (اختر النساء کو پیار کر کے) پیاری اختر تم اس قدر رنجیدہ نہ ہو۔ گھر تمہارا ہی ہے۔ یہ بھی چار دن کی بات ہے۔ اُنہیں اچھی طرح زور اُٹھانے دو۔ تم بالکل اطمینان اور آرام سے یہ دن اپنی خالہ کے گھر گذارو۔

اب آٹھ بج گئے تھے۔ قمر النساء کی اُستانی مس جیکسن آگئیں اور یہ تینوں لڑکیاں دوسری طرف کمرے میں چلی گئیں۔

اسی طرح اختر النساء کو اپنی خالہ کے گھر رہتے ڈیڑھ ہفتہ گذر گیا، اس کو خالہ خالو بہن بھائی سب نہایت محبت سے رکھتے تھے۔ یہ بھی بہت خوشی سے رہتی تھی گویا ماں ہی زندہ ہے اور جس وقت اسے اپنی ماں کا خیال آتا تھا تو وہ اپنی رنجیدگی کی گھڑیاں خالہ کے سب سے چھوٹے بچے کے ساتھ کھیل کر گذار دیتی تھی یا پائیں باغ میں گلاب کے درخت کے نیچے خاموش بیٹھ کر کاٹتی تھی۔

اِدھر اُس کے گھر لاڈلی بیگم کانپور سے آچکی تھی۔ اس درمیان میں بیگم صاحبہ نے اختر کو کئی دفعہ بلایا تھا کہ آکر بہن سے مل جاؤ مگر مسز وقار احمد یہ ہی کہہ کر ٹالتی رہیں کہ ابھی آئے دو چار دن ہی تو ہوئے ہیں۔ بہن بھائیوں کے پاس کچھ دن رہ لے تو بھیج دوں گی جس دن یہاں آئی۔ اُسے بارہواں دن تھا۔ بیٹی کے نام وکیل صاحب کا رقعہ آیا کہ تمہاری امّاں جان بہت اصرار کرتی ہیں۔ اب ضرور آجاؤ۔ میں کل صبح گاڑی بھیج دوں گا۔

شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ اختر النساء ابھی سو رہی تھی کہ رقعہ ملا۔ پڑھ کر بہت ہی رنجیدہ ہوگئی کہ دیکھوں گھر جا کر کن کن مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ چند منٹ خاموش پڑی سوچتی رہی۔ پھر باغیچے میں آکر اسی اپنے تنہائی کے مونس گلاب کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ گھر میں حسب معمول سب اُٹھے اور منہ ہاتھ دھو کپڑا وغیرہ سے درست ہو کر چائے کے لئے جمع ہوئے۔ مسز وقار احمد نے بھانجی کو وہاں نہ پا کر اختر حسن سے کہا: ''میاں تمہاری بہن اختر یہاں نہیں ہے۔ دیکھو تو کیا کر رہی ہے؟''

اختر حسن یہ خیال کر کے باغیچے میں ہی ہوگی۔ سیدھا اسی طرف آیا۔ دیکھا کہ وہ نہایت خاموشی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑے زمین پر بیٹھی تھی۔ اختر حسن بالکل اس کے قریب آ کھڑا ہوا مگر اُسے خبر تک نہ ہوئی۔ اختر حسن اس کی حالت دیکھ کر نہایت افسردہ ہوا اور اس کے قریب بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اُس کے سر کو اُٹھا کر کہا۔

اختر حسن: پیاری بہن کیوں؟ تم اس قدر رنجیدہ کیوں ہو؟ آج چائے پر بھی نہیں گئیں۔ افسردہ تو رہتی ہی ہو مگر معمول میں کبھی فرق نہیں ڈالتیں۔

اختر النساء: کچھ نہیں۔ میں زیادہ رنجیدہ تو نہیں ہوں۔ یوں ہی سونے سے اُٹھ کر یہاں آبیٹھی۔ خیال کیا کہ یہاں سے ہی منہ دھو کر چلی جاؤں گی۔ ئیں کیا چائے کا وقت ہوگیا؟ میرا خیال تھا کہ آج جلدی اُٹھی ہوں۔ چلئے میں اب چلتی ہوں۔

اختر حسن: نہیں ہم نہ مانیں گے۔ تمہاری رنجیدگی کا کچھ سبب ضرور ہے!

اختر النساء: (ٹالنے کے خیال سے مسکرا کر) کچھ بھی سبب نہیں بھائی۔ آپ متفکر نہ ہوں اور جلدی سے بھائی کا ہاتھ پکڑ کے خالہ کے پاس آگئی۔

مسز وقار احمد: پیاری اختر آج تم نے کہاں دیر لگادی؟

اختر النساء: خالہ جان معاف کریں۔ اُٹھ کر ادھر جا بیٹھی۔ گلاب کے پھولوں سے کھیلنے لگی۔

جب چائے پی چکے تو مسز وقار احمد باہر چلے گئے اور اختر حسن بڑی بہن قمر النساء کو لے کر اخراجات خانگی کا ماہواری حساب درست کرنے کو دوسری طرف برآمدے میں جا بیٹھے۔ تب اختر النساء نے خالہ سے کہا۔

اختر النساء: خالہ جان کل تو مجھے رخصت ہی کر دیجئے۔ اب تک تو میں ٹالتی رہی کہ وہ بلا رہی تھیں۔ آج ابا جان کا رقعہ آیا ہے۔ اب مجھے جانا ضروری ہے۔ صبح گاڑی آئے گی اور اب تو جانا بھی ضرور ہوگا۔ کیوں کہ کانپور کے واسطے کپڑے وغیرہ درست کرنے ہوں گے۔ اس لئے کیوں نہ کل ہی چلی جاؤں جس سے وہ خوش ہو جائیں کہ لاڈلی سے ملنے آئی ہے۔

مسز وقار احمد: بیٹی میرا تو یہ خیال تھا کہ تمہیں چلنے سے دو دن پہلے بھیجوں گی تمہاری یہ ہی مرضی ہے تو خیر کل صبح چلی جانا۔

خالہ بھانجیوں کی یہ باتیں اُن کی چھوٹی لڑکی نجم النساء نے سنیں جو پاس ہی کھڑی تھی۔ اسی وقت جا کر اپنے بڑے بھائی بہن کو خبر کر دی کہ کل صبح اختر النساء جاتی ہیں۔ یہ سن کر اختر حسن اور قمر النساء کو بہت ہی افسوس ہوا۔ گو اختر النساء کی ہم عمر سہیلی تو نجم النساء ہی تھی۔ مگر قمر النساء اُسے بہت چاہتی تھی۔ قمر النساء نے اختر حسن سے کہا۔

قمر النساء: چلو بھائی آج یہ آخری شام اور رہ ہے۔ اختر النساء کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل لیں۔

اختر حسن: بہن میں نہیں جاتا۔ اُس نے ہم سے بغیر صلاح کئے اماں جان سے اجازت مانگ لی۔

قمر النساء: بھائی اس بیچاری کا کیا قصور؟ جانا تو وہ بھی نہیں چاہتی مگر کیا کرے۔ ماں باپ کا ڈر بھی تو ہے۔

اختر: خیر تو تم جا کر کھیلو۔ ہم اگر آج کھیل لئے تو کل کیا ہوگا؟

اختر حسن وہیں بنچ پر لیٹ گیا اور قمر مع اختر و نجم کے باغیچے میں آئیں۔

قمر: آؤ اختر کچھ کھیل لیں۔ کل تو تم چلی ہی جاؤ گی۔

اختر: ہاں کھیلیں گے۔ پر بھائی تو آئے ہی نہیں۔ اُنہیں بھی تو بلاؤ۔

قمر: وہ تو تم سے ناراض ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیوں ہم سے بغیر صلاح کیے چلنے کو تیار ہو گئیں؟ میرے کہنے سے تو آئے نہیں۔ تم خود ہی جا کر بلا لاؤ۔

اختر النساء: (اختر حسن کے پاس آ کر) بھائی یہ وقت لیٹنے کا نہیں ہے۔ چلئے کھیلیں۔

اختر حسن: تم تو صبح جاتی ہو۔ کھیل کر کیا کریں گے؟ جاؤ اپنی لاڈلی بیگم کے ساتھ کھیلو۔

اختر: پیارے بھائی اس میں میرا کیا قصور؟ اتنے دنوں سے تو میں ٹال رہی تھی۔ اب ابا جان کا رُقعہ آیا ہے۔ اب تو جانا ضروری ہے۔

اختر حسن: اس میں شک نہیں کہ تمہیں جانا ضرور ہے مگر ہم سے بھی تو کہنا تھا۔

اختر: آپ معاف کریں۔ میں کہنا بھول گئی۔ میری گھڑی اور بروچ تو ابھی نہ بنا ہوگا۔ آپ کسی آدمی کو بھیج کر معلوم تو کریں۔

اختر حسن: تم نے مجھے دیا تھا جو مجھ سے مانگتی ہو؟

اختر: میں نے جمال منشی کو دیا تھا اور اس نے یہ کہہ کر واپس لا دی تھی کہ گھڑی ساز اس کی بنوائی پانچ روپے مانگتا ہے اور بروچ کی جڑوائی میں بھی دس روپیہ لگیں گے اگر اتنا صرف کرنا منظور ہے تو پھر دے آؤں گا۔

اختر حسن: (مسکرا کر) تو پھر تم نے منظور کیا؟

اختر: جمال کہتا تھا کہ مجھ سے میاں اختر حسن نے لے لیا ہے۔

اختر حسن: اچھا تم بجائے کل صبح کے کل شام کو جاؤ تو ہم لا دیں گے۔

اختر: نہیں بھائی مجھے صبح ہی جانے دو۔ آپ سہ پہر کو ہمارے گھر لے آنا۔

اِن باتوں کے بعد یہ باغیچے میں آ گئے۔ کچھ دیر تو بیڈ منٹن کھیلا۔ پھر اختر حسن کہیں باہر چلے گئے اور یہ تینوں بہنیں چاندنی رات میں سبز گھاس پر بیٹھی باتیں اور اپنی جدائی پر افسوس کرتی رہیں۔ آٹھ بجے کے قریب جب لیمپ بھی جل چکے تھے۔ اختر حسن واپس آئے اور کہا:

اختر حسن: امّاں جان یہ اختر کی گھڑی اور بروچ بن کر آ گئے ہیں، اُس دن ہمارے منشی جمال نے کیسی غلطی کی کہ صاف صاف اختر النساء سے کہہ دیا کہ پندرہ روپے خرچ ہوں گے۔ نہ معلوم اس بے چاری کے پاس اس وقت یہاں پندرہ ہوں گے یا نہیں؟ اور یہ تو بھرنا بھی ہمیں چاہئے تھا۔ کیوں کہ نجم النساء کے ہاتھ سے گھڑی گر کر ٹوٹ گئی تھی اور اسی طرح کھیلنے ہی میں بروچ کے نگ گر گئے تھے۔

مسز وقار: بے شک مجھے اس دن جمال کی غلطی پر بہت غصہ آیا اگر ہمارے ہاتھ سے نہ بھی ٹوٹتی تب بھی ہمیں مناسب نہ تھا کہ اس سے روپے لیتے کیوں کہ وہ اور نجم برابر ہیں۔

دیکھو وہ میری میز کی دراز میں پندرہ روپے پڑے ہیں نکال کر بھیج دو۔

اختر حسن: امّاں جان روپیہ میں دے آیا ہوں۔ اِدھر آ کر اختر سے کہا۔

اختر: لو بہن اپنی گھڑی۔

اختر نے اُس وقت تو شکریہ ادا کیا اور دونوں چیزیں لے کر رکھ لیں۔ صبح اپنے گھر چلتے وقت ایک ساورن نیچی آنکھیں کر کے اختر حسن کو دینے لگی۔

اختر حسن: یہ کیسا؟

اختر النساء: گھڑی ساز کو دے دیں۔

اختر حسن: اُسے تو میں نے روپے دے دیئے۔

اختر: (شرماتے ہوئے) تو پھر آپ رکھیں۔

اختر حسن: تمہیں شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے۔ کہ "پھر آپ رکھیں۔" میں تم سے بڑا ہوں یا چھوٹا؟

نجم: بہن اختر گھڑی ساز ہمارے بھائی جان کا دوست ہے۔ وہ ہم سے قیمت نہیں لیا کرتا۔

قمر: (مسکرا کر) اور سنار بھی ہمارے بھائی جان کا دوست ہے۔ وہ ہم سے زیور کی بنوائی نہیں لیتا۔

اختر حسن: ان فضول باتوں سے فائدہ؟ کوئی بھی میرا دوست نہیں۔ میں

تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ تم سے پیسے نہیں لیتا۔

اختر النساء ان سب کو رنجیدہ چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی اور چار دن کے بعد اسکول کھل گیا۔ وہاں سے کانپور روانہ ہو گئیں۔

☆

چوتھا باب

یاس ہی یاس ، ارماں دِل ویراں میں نہیں
ایک سر سبز شجر میرے گلستاں میں نہیں

ہماری اختر کے بچپن کا زمانہ اسی طرح گذرا جاتا تھا۔ ایام تعطیل کچھ اپنے اور کچھ خالہ کے ہاں بسر کر جاتی۔ باقی دن اسکول میں۔ اس کے گھر میں میم صاحب اور اُن کی بیٹی لاڈلی بیگم کا راج تھا۔ کیوں کہ وہ کانپور رہتی تھی۔ لاڈلی کو خدا نے موقع دیا۔ اوّل تو اُس نے اپنی بناوٹی میٹھی میٹھی باتوں سے وکیل صاحب کے دل میں گھر کر لیا۔ اُن کا دل محبت کرنے کے لئے ایک بچہ ڈھونڈتا تھا۔ اختر کی غیر موجودگی میں یہ اُنہیں اُس سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی۔ غرض کہ تمام گھر پر شہزادیوں کی طرح حکومت کرنے لگی۔ اس کا مزاج نہایت خراب تھا۔ بات بات پر بگڑنا۔ اپنا کہنا کروانا۔ ماماؤں اصیلوں پر خفا ہونا اُن کے بچوں کو مارنا۔ یہ دن بھر اس کا کام تھا۔ جب وکیل صاحب کے آنے کا وقت ہوتا۔ کپڑے درست کر بن بنا کر بیٹھ جاتی اور کوئی کام کرنے لگتی۔ ابا جان ابا جان کر کے آگے پیچھے پھرنے لگتی۔

اوّل اوّل تو اُس کی بدمزاجی اور ضدوں سے وکیل صاحب بہت تنگ ہوئے۔ پھر انہیں بھی عادت ہو گئی اور انہیں یہ خیال ہی نہ رہا کہ اُس سے اچھی عادتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ اختر سال بھر میں ایک مہینے کے واسطے آتی اس میں سے بھی دو ہفتے خالہ کے ہاں کاٹتی اور دو ہفتے مسافرانہ طریق سے اپنے گھر میں۔ اسی طرح چار سال گذر گئے۔

لاڈلی جو بچپن میں ذرا بیوقوف تھی۔ اب چودہ سال کی جوان ہو کر بہت ہوشیار ہوگئی اور پوری طرح گھر پر اپنا قبضہ کر چکی تھی ماں سے کہا کرتی تھی کہ اب اختر کے اسکول چھوڑنے میں سال بھر رہ گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے اختیارات اس قدر مضبوط کر لوں کہ جب وہ اسکول سے رُخصت ہو کر گھر آئے تو خانگی امور میں اس کا کچھ دخل نہ ہونے پائے اور میں ہی مختار رہوں۔ اس کی ماں کہتی کہ بیٹی اس طرح تمہارے ابّا جان کو کوئی خیال دلادے گا کہ سگی بیٹی کا کچھ اختیار نہیں اور لاڈلی کا یہ زور شور۔ اس لئے میں نے یہ سوچا ہے کہ اسکول سے آتے ہی اس کا کالا منہ کر دوں (یعنی شادی کر دوں) نہ وہ گھر میں رہے گی نہ کوئی مقابلہ کرے گا۔

جہاں ان تین سال میں لاڈلی میں ہوشیاری و چالاکی آگئی تھی۔ وہیں ہماری اختر کی سمجھ بھی کہیں سے کہیں پہنچی تھی۔ اُس نے تو اپنی جاہل ماں کے پاس رہ کر یہ چالاکیاں سیکھیں تھیں اور اختر نے تعلیم یافتہ اُستانیوں کی صحبت میں اسکول کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی تھی۔ وہ بھی اپنی عمر کا چودھواں سال اسکول میں ہی ختم کر چکی تھی اور اب چھٹیوں میں گھر آنے والی تھی۔

ہمیشہ اسکول بند ہونے پر وکیل صاحب اسے لے آیا کرتے تھے۔ اس دفعہ اُنہیں معلوم ہوا کہ علی گڑھ کا کرکٹ ٹیم کانپور گیا ہوا ہے اور اختر حسن وہاں سے گھر آنے والے ہیں۔ اس خیال سے کہ اُنہیں دنوں بیگم صاحبہ کے بچہ ہونے والا ہے۔ ایسی حالت میں انہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے۔

اختر حسن کو تار دے دیا کہ بہن کو ہمراہ لیتے آؤ۔ اسکول دو دن سے بند ہو چکا تھا اور اختر اپنی ایک پہلی کلاس فیلو مس محمد زمان صاحبہ کے مکان پر وکیل صاحب کے انتظار میں ٹھیری ہوئی تھی۔ اختر حسن کو شام کے ۵ بجے خالہ کا تار ملا۔ وہ اسی وقت محمد زمان تحصیلدار کے مکان پر پہنچے۔ گھر میں اطلاع ہونے پر مسز محمد زمان نے اپنے ایک کمرے میں جس کا دروازہ باہر بھی تھا۔ اختر حسن کو بلا لیا اور اختر کو کہا کہ بی بی اپنے بھائی سے مل لو۔

اختر جب اپنے بھائی سے چھٹی تھی۔ تو دس سال کی عمر تھی۔ جب کہ وہ بچپن کا فراک پہنا کرتی تھی۔ اب یہ چودہ سال کے پورے زنانہ لباس میں تھی۔ وکیل صاحب نے

اس کو ہندوستانی لباس نہ پہننے دیا تھا۔ یہ اپنی والدہ مرحومہ کی طرح ترمیم شدہ غرارہ، بلاؤس اور دوپٹہ پہنتی تھی۔ اختر اور اس کی سہیلی شکیلہ مس محمد زمان اس برآمدے میں آئیں جس کے کمرے میں اختر حسن بیٹھے تھے۔ اختر نے اندر آکر بھائی کو ذرا جھک کر سلام کیا اور بیٹھ گئی۔ اختر حسن نے وکیل صاحب کا تار دے کر کہا۔

اختر حسن: یہ تمہارے ابا جان کا تار آیا ہے۔ آج رات کی گاڑی سے میں میرٹھ جاؤں گا۔ تم چلنے کو تیار ہو؟

اختر: جس دن سے اسکول بند ہوا ہے۔ میں اسی دن سے تیار ہوں۔ ابا جان کے انتظار میں یہاں ٹھیری ہوئی تھی۔ اب انہوں نے آپ کو لکھ دیا ہے۔ جس وقت چلیں میں بھی تیار ہوں۔

اختر حسن: اچھا سامان درست کر لو۔ ہم ۹ بجے چلیں گے۔ بہن ہم بہت ہی دنوں میں ملے۔

اختر: ہاں بھائی ۴ سال ہو گئے۔ میں تو ان چار سال میں چار دفعہ میرٹھ گئی لیکن اتفاق سے کچھ نہ کچھ ایسا سبب ہوتا رہا جس سے ہمارا ملنا نہ ہوا۔

اختر حسن: ہاں ایک دفعہ تو جب میں گیا۔ تم چلی آئی تھیں اور تین سال برابر میں ڈیوٹی ڈپوٹیشن کے ساتھ پھرتا رہا۔ اس سال خوب ہوا کہ تم بھی جا رہی ہو اور ایک ہفتہ کے بعد میں بھی آجاؤں گا۔

اختر: اور اب جو جا رہے ہو۔ کیا وہاں سے پھر واپس آجاؤ گے؟

اختر حسن: اب تو ٹیم کے ساتھ آیا ہوں۔ بہن قمر کی طبیعت خراب ہے۔ اس کے دیکھنے کو صرف ایک رات کے لئے جاتا ہوں۔ کل صبح واپس آکر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ واپس علی گڑھ جاؤں گا۔ ایک ہفتہ کے بعد میرٹھ آؤں گا۔ کہو تم کانپور میں کب تک اور ہو؟

اختر: اگلے سال میرا امتحان ہوگا۔ پھر ہمیشہ کے لئے سکول چھوڑ دوں گی۔

اختر حسن: خوشی کی بات ہے کہ میں بھی ایک ہی سال کے لئے کالج میں اور ہوں پھر علی گڑھ چھوڑ دوں گا۔

اختر: اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟ ہمیں تو اسکول چھوڑنے کا رنج ہوگا۔

اختر حسن: خوشی کیوں نہیں؟ دونوں بہن بھائی ساتھ ہی ساتھ گھر جائیں گے۔ بہن قمر و نجم کی شادیاں ہوں گی۔ کیوں کہ اسی خیال سے اب تک رُکی ہوئی ہیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں اگر خدا نے کامیاب کر دیا تو اُنیسویں ہی سال بی.اے.کی ڈگری مل جائے گی۔اس سے بڑھ کر اُور کیا خوشی ہو سکتی ہے؟

اختر: ہاں اس سے بڑھ کر بھی ایک اُور خوشی ہو سکتی ہے۔

اختر حسن: وہ کیا؟

اختر: میرے پیارے بھائی اختر حسن کی شادی۔

اختر حسن: شادی کی خوشی تو جاہل بہنوں کو ہوا کرتی ہے۔تم تو تعلیم یافتہ ہو۔ تمہیں تو علمی کامیابی میں زیادہ خوشی ہونی چاہئے۔اچھا لو میں یہ خوشخبری بھی سنا دوں بیگم صاحبہ کی ماماؤں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی مجھ سے کرنا چاہتی ہیں۔

اختر: لیکن وہ تو کچھ بھی لکھی پڑھی نہیں۔ پچھلے سال جب میں گھر گئی تھی تو وہ تختی لکھا کرتی تھی کہ کسی طرح خط لکھنا آجائے۔

اختر حسن: اگر پڑھی لکھی ہو بھی تو اماں جان اُسے بہو بنانا منظور کر سکتی ہیں؟ اپنی بہن کی دُشمن کی لڑکی اور پھر اُن کی پیاری بھانجی کی دُشمن؟

اختر: باجی قمر اور بہن نجم کی منگنیاں کہیں ہو گئی ہیں؟

اختر حسن: نجم کی منگنی تو ہمارے پھوپی زاد بھائی اجمل حسن سے جو میڈیکل کالج آگرہ میں تعلیم پاتا ہے قرار پائی ہے (مسکرا کر) تمہیں تو اُس نے خبر دی ہوگی کہ اور بہن قمر کی ابھی کچھ ٹھیک نہیں لیکن بہت جلد ہو جائے گی۔

اختر اسی طرح گھر کے حالات پوچھتی رہی۔شکیلہ نے یہیں چائے بھی بھجوا دی۔ اختر حسن چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے اور اسی رات وہاں سے روانہ ہو کر میرٹھ پہنچے جس دن اختر گھر پہنچی۔اسی دن شام کو دوسری بہن یعنی بیگم صاحبہ کے دختر پیدا ہوئی۔ سامان تو بڑے کیے گئے تھے لیکن افسوس کہ بیگم صاحبہ کی اُمیدوں کے خلاف ظہور میں آیا۔یہ لڑکے کی اُمیدوں میں تھیں۔سوچا کرتی تھیں کہ گھر کا ولی عہد پیدا ہوگا۔چوں کہ لاڈلی نا حق

ثابت ہوئی ہے۔ اُسی دم سے میں جائداد کی مالک بن جاؤں گی۔ لڑکی کو دیکھ کر اُن کا دل بجھ گیا لیکن لوگوں کی نظروں میں بھاری رہنے کو انہوں نے اور اُن کی ملازمہ عورت نے یہی کہا کہ "پہلے ہی کون سی وکیل صاحب کی بہت سی اولاد ہے۔ ایک لڑکی کا دم ہے۔ وہ بھی اب بیاہی جائے گی۔ یہی بیٹی ہمیں بیٹے کے برابر ہے۔ اب یہی خیر سے اس گھر کی رونق ہے۔"

اس دفعہ اختر النساء نے میرٹھ پہنچ کر گھر کا کچھ اور ہی رنگ پایا۔ آج تو بہت شور وغل پڑا ہوا تھا جو بیگم صاحبہ کی نظروں میں دل خوش کن چہل پہل ہوگی۔ وہ ایک کمرے میں کسے ہوئے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اس لئے کہ صبح سے طبیعت اچھی نہ تھی۔ دائی لکھنؤ سے بلائی گئی تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ یہاں کی دائی کو وکیل صاحب کی سالی مسز وقار احمد یا کوئی اور کچھ سمجھا دے اور وہ میرے ساتھ کچھ برائی کر دے۔ حالانکہ مسز وقار احمد صاحب اُن سے بہت ہی محبت سے پیش آتی تھیں اور انہوں نے معلوم نہ ہونے دیا تھا کہ یہ میری مرحومہ بہن اور اس کی اولاد کی دُشمن ہے۔ اوّل تو بیچاری مسز وقار احمد تھیں ہی نیک دل اور دوسرے اس خیال سے کہ ذرا بھی اُن سے بے رُخی کی تو اختر کو نہ ملنے دیں گی۔ وہ بہت محبت کا برتاؤ کرتی تھیں۔ آج ہندوستانی دستور کے موافق بہت سی مہمان بیبیاں گھر میں جمع تھیں۔ مسز وقار احمد صاحبہ کو بھی بلوا لیا گیا تھا۔

اختر اس بے ڈھنگے طریق کی مہمانوازی کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ بچے شور وغل مچا رہے ہیں۔ جوان جوان لڑکیاں جن کے پیروں کے زیور کی جھنکار نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ لاڈلی بیگم کے ساتھ اِدھر اُدھر دوڑی پھر رہی تھیں۔ سروتوں کی آواز سے الگ کان کھائے جا رہے تھے کیوں کہ جتنی بڑی بوڑھیاں ہیں ہر ایک کے ہاتھ میں چھالیہ اور سروتے۔ غرض وہی گھر جو اعلیٰ تہذیب کا نمونہ تھا۔ آج بد تہذیبی اور بے ڈھنگے پن کا اعلیٰ نمونہ بن رہا تھا۔ وکیل صاحب اسٹیشن پر بیٹی کو لینے گئے تھے۔ بس ویٹنگ روم ہی میں مل گئے۔ مہمانوں کی وجہ سے اندر نہ آسکتے تھے۔ اختر لاڈلی بیگم کے ملنے کے بعد جو چمکدار جوڑا پہنے اپنے خیال میں گھر کی منتظم بنی خوشی خوشی پھر رہی تھی۔ سیدھی بیگم صاحبہ کے پاس گئی۔ اس کا لباس بہت بیبیوں سے مختلف تھا۔ اُسے دیکھ کر سب آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ کہ مدرسہ میں پڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹی بالکل میم بنی ہوئی اُتری ہے۔ ایک ہماری لاڈلی بیگم

ہے جیسے ہندوستانی شریفوں کی بہو بیٹیاں ہونی چاہئیں اختر برابر دو گھنٹے تک بیگم صاحب کے پاس بیٹھی رہی۔

بیگم: بہت دیر ہوئی تمہاری خالہ صاحبہ کو گاڑی بھیجی ہے۔ ابھی تک نہیں آئیں اور سب بیبیاں آ گئی ہیں۔

اختر: باجی قمر کی طبیعت خراب ہے اس واسطے نہ آئی ہوں گی۔

یہ باتیں کر رہی تھیں کہ اتنے میں وقار منزل سے ملازمہ عورت آئی۔

ملازمہ: بیگم صاحبہ اب تک اپنے یہاں نہ پہنچنے کا افسوس کرتی ہیں اور کہا ہے کہ "قمر النساء کی ناسازی طبیعت سے میرے آنے میں دیر ہوئی۔ دوسرے اختر حسن کو ابھی واپس کان پور جانا ہے۔ انہیں رخصت کرلوں۔ اتنے میں قمر کی طبیعت بھی شاید درست ہو جائے گی۔ ۵ بجے ضرور پہنچوں گی۔" اور یہ بھی کہتی تھیں کہ "بڑی مہربانی ہو اگر چند منٹوں کے لئے اختر کو یہاں بھیج دو کیوں کہ جس وقت سے بی بی قمر النساء کو بھائی سے بی بی اختر النساء کے آنے کا حال معلوم ہوا ہے، بہت بے قراری سے ملنے کی منتظر ہیں۔"

بیگم: بوا حسن افروز تم ہی سوچو میرا یہ حال ہے۔ اس کا آج وہاں جانا کیسے ہو سکتا ہے؟

حسن افروز سلام کر کے واپس چلی گئی۔ اختر وہاں سے اپنے کمرے میں آئی دیکھا تو تمام فرنیچر گرد آلود ہے۔ مہمان داری کے اس قدر سامان ہوئے لیکن افسوس بیچاری کا کمرہ بھی کسی سے صاف نہ کرایا گیا۔ ایک ٹیبل کلاتھ جھاڑ کر صوفے پر بچھایا اور لیٹ گئی۔ اختر کی اس وقت کی پریشانی کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ کیسے کیسے رنج دہ حالات نے اسے گھیر رکھا تھا۔ اپنے گھر میں غیروں کا زور شور خود مہمانوں کی طرح ایک طرف کو بیٹھی عزیز بہن کی علالت کی خبر سے سخت بے چین۔ جا کر دیکھ سکنا ناممکن اور کیا عجب ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ رنج دینے والا خیال اُسے یہ ہوا کہ جب لاڈلی کے سبب میں بالکل گھر سے بے تعلق ہو گئی ہوں۔ جو صرف بیگم ہی کی لڑکی ہے تو اس کا ہونا جس کے داخلۂ دنیا کی خوشی میں اس قدر دھوم مچ رہی ہے اور جو میری حقیقی شریک ہو گی۔ کہاں تک باعثِ تکلیف ہو گا۔

غرض آج وہ غم کی پتلی بن رہی تھی۔ کسی آئندہ خوشی کا خیال بھی اُس کے دل میں

نہ آتا تھا۔

یاس ہی یاس تھی، ارماں دلِ ویراں میں نہ تھا

لاڈلی نے تو تمام دن مہمانوں کی خاطر تواضع میں خوشی خوشی سے گزارا اور اختر نے اپنے کمرے میں تنہا ہر اک بات سے بالکل بے دخل بیٹھ کر۔

۵ بجنے والے تھے کہ مسز وقار احمد صاحبہ تشریف لائیں۔ ایک لڑکی نے اختر کو اطلاع دی کہ وقار منزل سے فٹن آئی ہے۔ چل کر اپنی خالہ جان کو اُتروا لو۔ اختر اپنی خالہ کے استقبال کو مع لاڈلی کے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑی تھیں اور مسز وقار احمد گاڑی سے اُتر کر اُن کا سلام لیتی ہوئی زچہ بیگم کے پاس جا رہی تھی کہ چند بیبیوں نے اُنہیں اپنی باتوں میں لگا لیا۔ اُن کا لباس دیکھنے کے لئے۔

مسز وقار احمد یوں تو ہر وقت ہندوستانی دوپٹے کے ساتھ ترکی لباس میں رہتی تھیں لیکن بعض اوقات ہندوستانی جلسوں کی شرکت کے وقت ہندوستانی لباس یعنی ساڑی پہنا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی اسی لباس میں تھیں۔ نہ معلوم پھر کیوں ہندوستانی بیگمات نے اُنہیں نظرِ استعجاب سے دیکھا؟ مسز وقار احمد ہلکے گلابی رنگ کی جس پر سبز مخملی بیل سلمہ ستارے کی ٹکی ہوئی تھی، ساڑی باندھے ہوئے تھیں۔ ہلکے فیروزی رنگ کی ریشمی بلاؤس تھی۔ ساڑی کا آنچل بجائے آگے کے پیچھے سے لا کر سینہ پر بروچ سے اٹکایا تھا۔ کانوں میں زمرد کا ایک ایک گوشوارہ تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کی ست لڑی۔ ہاتھوں میں ایک جڑاؤ چوڑی اور کڑے، پیروں میں سیاہ بوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اس وقت اُن تمام بیگمات سے جو فاخرہ جھم جھماتے جوڑے، دو دو سیر چاندی اور آدھ آدھ سیر سونا لادے بیٹھی تھیں۔ سب سے زیادہ مسز وقار احمد اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ چند منٹ کھڑے کھڑے ہی ان مہمان بیبیوں کی باتوں کا جواب دے کر بیگم صاحبہ کے پاس جا بیٹھیں۔ ساڑھے پانچ بجے خدا خدا کر کے کہیں وہ وقت آیا جس کی لاکھ لاکھ ارمانوں سے بیگم صاحبہ منتظر تھیں لیکن افسوس خلافِ اُمید ظہور میں آنے سے اُن کا دل بالکل بجھ گیا مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ انہوں نے ظاہراً خوشی میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا۔ جب اس وقت کے سب کام ختم ہو چکے اور بچی کو نہلا دھلا کر ماں کے پاس لٹا دیا تو اختر اور لاڈلی بیگم کو

بہن کو دیکھنے کو بلایا گیا۔ انہوں نے نہایت فرخندہ پیشانی سے اپنی نوزائیدہ بہن کو ہاتھوں پر اُٹھا اُٹھا کر دیکھا اور پیار کیا۔ اس وقت تک تو گھر میں ہی ڈھول اور گیتوں کی آواز سے شور مچ رہا تھا۔ لڑکی کی خبر باہر پہنچتے ہی نقارچیوں نے جو بیٹے کی خبر کے منتظر تھے۔ نوبت بجانی شروع کر دی۔ گو بیٹی کے ہونے پر دستور کے موجب یہ باجا نا مناسب تھا لیکن گھر سے بی امانی بیگم مغلانی کا حکم آیا کہ ہمارے یہ لڑکی بھی لڑکا ہی ہے اور پہلوٹھی لڑکی تو لڑکے ہی کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ کہہ دو نوبت بجائیں اور چھ دن تک برابر رہے۔

وکیل صاحب کو نوبت سے شرم آتی تھی کہ دوست کیا کہیں گے کہ پہلی لڑکی کی پیدائش کے وقت تو کچھ نہ ہوا تھا اور اب دوسری کے وقت جس کو کہ تیسری کہنا چاہئے۔ یہ دھوم دھڑکے۔ مگر کیا کرتے؟ اُن کے لئے خدا کے حکم سے زیادہ امانی بیگم کا حکم تھا۔ بس مجبور تھے۔

اختر شرم سے دل میں پانی پانی ہوئی جاتی تھی کہ دیکھنے سننے والے اور ابا جان کے تعلیم یافتہ دوست منہ پر نہیں تو دل میں کیا کہیں گے۔ غرض چھ دن گھر میں یہی طوفان بے تمیزی بپا رہا۔

پانچواں باب

جھونکے نسیم صبح کے آئے چلے گئے
لیکن نہ اپنے دل کی شگفتہ کلی ہوئی

چھٹی کی تیاریاں

آج لڑکی پانچ دن کی ہو چکی تھی۔ چھٹے دن کی صبح کو نہایت اہتمام سے بیگم صاحبہ اور بچی کو غسل دیا گیا اور اس رسم کی تیاریاں شروع ہوئی جو شام کو ادا ہونی تھی۔ قریبی رشتہ دار آٹھ دن اور مہمان بیبیاں چھ دن سے یہاں موجود تھیں اور جو اس دن چلی گئی تھیں۔ وہ آج پھر آ گئیں اور شام کو سو بیبیوں کا مجمع ہو گیا۔ چھٹی کی دعوت کا کھانا بہت مکلف باہر باورچیوں نے تیار کیا لیکن چھٹی کی رسوم کے لئے سات قسم کا کھانا گھر میں تیار کیا گیا۔ غرض کہ تمام دن انہیں تیاریوں میں گزرا۔ شام کے پانچ بجے تک سب مہمان بیبیاں آ چکی تھیں لیکن مسز وقار احمد ابھی نہیں آئی تھیں۔ وہ اس وقت پہنچیں۔ جب دستر خوان چنا جا چکا تھا اور سب مہمان بیبیاں زچہ کے کمرے میں کھانے کے لئے جمع تھیں۔ اور دو عورتوں نے بیگم صاحبہ کو جو اس وقت فاختئی، جوڑہ اور ناک میں نتھ پہنے ہوئے تھیں۔ پلنگ سے اُتار کر فرش پر بٹھا دیا۔ پلنگ سے فرش پر اُترتے میں گود میں بچی بھی رکھی گئی تھی۔ اس خیال سے کہ پہلی دفعہ زمین پر قدم رکھتے وقت گود خالی نہ ہو بدشگونی ہو گی۔

اب کھانا اس طرح ہوا کہ سب سے پہلے سات سہاگنوں نے ہاتھ ڈالا اور ہر

ایک قسم کا کھانا چکھا۔ ان سات سہاگنوں کو امانی بیگم مغلانی نے نہایت کوشش سے منتخب کیا تھا۔ پہلے بخوبی اطمینان کر لیا تھا کہ ہر اک کی گود میں بچہ ہے۔ کسی کو اٹھرا کا مرض نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان سب کے بعد بیگم صاحبہ نے ہر ایک چیز تھوڑی تھوڑی چکھی۔ اس رسم کے بعد ایک بڑی بوڑھی کی نکتہ چین نظر چوبے کے طباق پر پڑی تو کہا۔ "اے ہے یہ کیا غضب۔ چوبے کے طباق میں پالک کے ساگ کی بھجیا تو رکھی نہیں گئی!"

یہ سنتے ہی بیگم صاحبہ کا کلیجہ مٹھی میں آ گیا کہ پہلی رسم میں ہی بدشگونی ہوئی۔ آگے دیکھیے کیا ہو!

بوڑھی: کیوں لاڈلی بیگم تم ہی نے تو یہ چوبا بنوایا ہے۔ اتنا بھی خیال نہ کیا کہ ساگ ہے یا نہیں؟ اختر بھی پاس ہی کھڑی تھیں۔ انہیں بھی یہ خیال نہ آیا؟

لاڈلی بیگم: دادی امّاں مجھے بالکل خیال نہ رہا۔

اختر: مجھے تو قابلِ معافی سمجھیں۔ کیوں کہ آج کے سواء میں نے کبھی ایسا سامان دیکھا ہی نہ تھا۔ مجھے زیادتی کمی کی کیا خبر ہو سکتی ہے؟

اب تو بیگم صاحبہ بھی چپ نہ رہ سکیں۔ جو اَب تک دُلہن بنی بیٹھی تھیں۔ تخی کے لہجے میں ناراض ہو کر بولیں۔

بیگم: لاڈلی کو بھلا کیا خیال ہونا تھا اور اختر تو ان باتوں کو جانتی ہی نہیں وہ تو میم صاحبہ ہیں۔ یہ خیال بی بی امانی کو چاہیے جو اس وقت بجائے میری ماں کے ہیں۔

امانی بیگم: لڑکیاں جو انتظام کر رہی تھیں۔ میں نے سمجھا ہندوستانی ہیں۔ سب کچھ جانتی ہوں گی۔

مسز وقار احمد بھانجی کو میم کا خطاب اور اُلٹی سیدھی باتیں سُن کر بہت ہی رنجیدہ ہوئیں۔ اور دل ہی دل میں اس ہرزہ گوئی پر بہت پیچ تاب کھا رہی تھیں۔ غصہ کو ضبط کر کے مسکرا کر کہا:

مسز وقار: خیر کیا مضائقہ ہے۔ اس قدر سبزی جو کھانے کے ساتھ موجود ہے۔ اگر میٹھے چاولوں میں نمکین ساگ نہ رکھا گیا تو کیا ہوا؟ اس وقت بی امانی بھی بے قصور

ہیں کہ انہوں نے سمجھا لڑکیاں سب درستی سے کرلیں گی اور لاڈلی بھی کیوں کہ اس نے آج تک میرٹھ میں ایسی رسم دیکھی نہیں اور بچپن کا دیکھا ہوا اُسے یاد نہ ہوگا۔ یہ الزام عائد ہوسکتا ہے۔ تو اختر پر ہی ہوسکتا ہے کہ جب یہ جانتی تھی کہ میں اُن رسومات سے واقف نہیں تو کسی سے کیوں نہ پوچھ لیا؟

اختر نے خالہ کی تقریر کے مطلب کو سمجھ کر کہا:

اختر: بے شک مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے کسی سے دریافت نہ کرلیا۔

ان خالہ بھانجیوں کی باتوں نے سب کو اس قدر شرمندہ کیا کہ کوئی بول نہ سکی۔ مسز وقار احمد نے بھی سوچ سمجھ کر بھانجی پر الزام دیا کہ ویسے یہ جھگڑا طول پکڑ لے گا اور بجائے خوشی کے لڑائی ہوجائے گی جس سے اختر کو صدمہ ہوگا۔ اس لئے اُنہیں سب کو شرمندہ کرنا چاہئے ورنہ اختر کو بیگم کی زبانی میم سن کر اُن کے دل پر کم صدمہ نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ اس وقت رسومات ادا ہونی چاہئیں۔ میم کہنے کو بھی اسی طرح سمجھ لوں گی۔

یہ سب اس ذکر سے شرمندہ تو ہو ہی چکی تھیں۔ ٹالنے کی غرض سے اُنہیں بڑی بوڑھی سے کہا۔ لو اب تارے نکل آئے ہیں۔ زچہ اور بچی کو سہرا باندھو کہ یہ رسم بھی ادا ہوجائے۔ آفرین مسز وقار احمد کے حوصلے پر کہ گو وہ اسی وقت کس قدر رنجیدہ ہوچکی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ سماں دیکھ کر اپنی بہن کی یاد بھی کس قدر بے چین کررہی ہوگی کہ اُسی کا گھر ہے اور اُسی کی سوکن ہے، زچہ خانے کے ارمان پورے ہورہے ہیں اور وہ صرف آنکھوں سے دیکھ ہی نہیں رہی بلکہ خس خس کے سب رسمیں ادا کرنے کو تیار ہیں اور اُس مردہ بہن کی نشانی کو کس قدر جلایا جارہا ہے۔ بڑی بوڑھی سے یہ سُنتے ہی کہ اب سہرا باندھنا چاہئے فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئیں اور بیگمات کے حلقے میں بہ خندہ پیشانی کھڑی ہوکر بولیں۔

مسز وقار: میں یہ رسم نہایت خوشی سے ادا کرنے کو موجود ہوں اگر میرے سوہاگ میں کوئی کمی نہ ہو اور مجھے رسم ادا کرنے کے قابل سمجھا جائے۔

کئی بیبیاں: (ایک زبان ہوکر ہنستے ہوئے) نہیں بہن خدا نہ کرے جو آپ میں کوئی کمی ہو۔

بی امانی نے پھولوں کی ٹوکری آگے رکھ دی۔ مسز وقار نے جوں ہی سہرا ہاتھ میں

لیا۔ ایک بیوی نے قریب ہی سے کہا۔

بیوی: اے ہے کہیں تم بھی انجان بن کر سب سے پہلے بچی ہی کو سہرا نہ باندھ دینا۔ پہلے سات سہاگنوں کے سر سے چھواتے ہیں۔

مسز وقار: یہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر میں اس قابل سمجھی جاؤں تو یہ خوشی مجھے دی جائے اور آپ سب نے پاس کر دیا۔ تب میں نے ہاتھ لگایا اور دانستہ انجان بن کر ایسا تو مجھ سے نہ ہوگا اور میں انجان ہی کیوں ہوتی؟ چھوٹی سے بڑی میرٹھ ہی میں ہوئی۔ گو ہمارے گھر میں ان رسومات کو ابا جان نے کبھی ہونے نہیں دیا مگر کنبہ برادری کی تقریبوں میں شریک ہو کر اچھی طرح واقفیت حاصل کر لی ہے۔ اختر بے چاری تو اس واسطے انجان ہے کہ ۵ سال سے ۱۳ سال کی اسکول ہی میں ہوئی مجھے کوئی انجان نہیں بنا سکتا۔ میں آپ سب کو وہ پرانی متروک شدہ رسومات بھی بتا سکتی ہوں جن سے آپ بالکل ناواقف ہیں۔

وہی بیوی: (ہنسی سے شرمندگی کو ٹال کر) میں نے یوں ہی مذاقیہ چھیڑا تھا۔ اچھا تو بسم اللہ کرو۔ سہرا باندھو۔

مسز وقار نے سب سے پہلے لاڈلی بیگم کے ماتھے سے چھوا اور پھر دوسری سہاگنوں کے ماتھوں سے لگا کر اور سب کے بعد اپنے ماتھے سے لگا کر بچی کے باندھنے لگیں تو بیگم صاحبہ نے روکتے ہوئے کہا۔

بیگم: نہیں بہن آپ نے اختر النساء کے تو چھوا ہی نہیں۔ اُس کی حقیقی بہن تو وہی ہے۔ سب سے پہلے اس کے چھوایا ہوتا۔

مسز وقار: پیاری بہن اس بدنصیب کے ماتھے سے میں نے دانستہ نہیں چھوایا کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ خدا آپ کو اس بچی کے سر پر سلامت رکھے۔ میں ماں مری کے سر سے چھو کر اس بچی کے سر سے کیوں باندھتی؟ مجھے ایسا کرتے ہوئے وہم آتا تھا۔

بے وقوف بیگم یہ محبت بھرے الفاظ سن کر بہت ہی خوش ہوئیں اور اس جیسی سمجھدار شریک محفل بیبیوں نے بھی آفرین کہا۔ مسز وقار کو خدا نے بلا کا دماغ دیا تھا۔ اپنی ہر ایک بات سے اُن کم سمجھ بیبیوں کو خوش بھی کر دیتی تھیں اور شرمندہ بھی۔ اسی طرح بیگم کو سہرا باندھا گیا۔

اب گود بھرنے کا وقت آیا چونکہ اس کی ادائیگی شرع مستورات نے دھیانی کے سر واجب کر رکھی ہے۔ دونوں بلائی گئیں۔

اختر اور لاڈلی بیگم گود بھرنے لگیں۔ لو بیگم صاحبہ نے کہا۔

بیگم: کیا نجم اور قمر اس گھر کی دھیانیاں نہیں؟ انہیں بھی تو اس وقت یہیں ہونا چاہئے تھا۔

مسز وقار: انہیں بھی اس وقت شریک ہونے کی بہت خوشی تھی لیکن افسوس کہ قمر کی ناسازی طبیعت کی وجہ سے نجم اُسے تنہا چھوڑ کر نہ آسکی اور قمر میں تو اُٹھنے کی طاقت ہی نہ تھی۔

اختر: (انگریزی میں خالہ سے) کیا دراصل سسٹر کی طبیعت آج پھر خراب ہوگئی۔

مسز وقار: (انگریزی میں) نہیں تو وہ آج اچھی ہے اور میں بھی یہ رسومات دکھانے کو ساتھ لانا چاہتی تھی لیکن تمہارے خالو جان نے نہ آنے دیا کہ وہاں بے ہودہ گیت گائے جائیں گے۔ خلاف تہذیب رسومات عمل میں آئیں گی۔ مجھے اختر ہی کا وہاں آج ہونا سخت ناگوار ہے۔ نہ کہ اِن دونوں کو بھی وہاں بھیج دوں۔

گود بھرنے کے سامان میں ناریل، بادام، چھوہارے، کشمش، پستہ، کھیلیں، بتاشے اور پانوں کے بیڑے وغیرہ وغیرہ چیزیں تھیں۔ گود میں بچی بھی تھی اور یہ چیزیں بھی ڈالنی تھیں۔ اختر حیرانی سے خالہ کا منہ دیکھنے لگی کہ اب کیا کروں؟ لاڈلی بیگم نے جلدی سے بہن کو ہاتھوں میں اُٹھا کر اختر سے کہا۔

لاڈلی: لو بہن یہ سب کچھ گود میں بھر دو۔

پھر بچی کو اس پر لٹا دیا۔ باہر سے وکیل صاحب بلوائے گئے۔ مسز وقار اوّل دن سے لائق بہنوئی کے ایک دم خیالات پلٹ جانے پر دل ہی دل میں جل رہی تھیں کہ اس وقت جب کہ تیس بتیس برس کی عمر ہے۔ دوسری بیوی، دوسرا بچہ، وہ بھی لڑکی۔ ایسے روشن خیال ہو کر جاہل بیوی کے حکم پر خوشی سے چل رہے ہیں۔ اِن رسومات کے ادا کرتے تو کم سن لڑکوں کو بھی شرم آیا کرتی ہے جن کا پہلا ہی بچہ ہوتا ہے اور والدین سر پر ہوتے ہیں پر انہیں ماں کی زبردستی سے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تعجب ہے کہ اِن لغو رسومات کے ادا کرنے میں وکیل صاحب کو شرم نہیں آتی۔ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال۔ خود ہی بوڑھے باوا۔ اپنی

ہی کی ہوئی دوسری بیوی اور لڑکی کی پیدائش اور خوبی یہ کہ اس سے پہلے ایک ۱۳ سالہ لڑکی موجود۔ مسز وقار نے وکیل صاحب کو شرمندہ کرنے کا اچھا موقع پایا، انہوں نے شریفن کو بھیجا کہ وکیل صاحب کو بلالا۔ اُس نے جا کر کہا کہ چلئے ڈپٹن صاحبہ بلاتی ہیں۔ وکیل صاحب سرد پڑ گئے کہ تعلیم یافتہ سالی کے آگے کس قدر شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اوّل سرکاری کام کا بہانہ کر کے ٹال دیا لیکن جب امانی بیگم کا حکم پہنچا کہ ضرور آنا ہوگا تو مجبوراً چلے آئے۔ اس وقت کہیں سے پھر کر آئے تھے۔ سیاہ سوٹ اور شام کی اسٹرا ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔ دو چار سامنے آنے والی بیبیاں بیٹھی رہیں۔ باقی سب پردے میں ہوگئیں۔ مسز وقار دانستہ نیچے آنکھیں کئے رہیں۔ حالانکہ وہ سر پر آ گئے۔

لاڈلی بیگم: خالہ جان دیکھئے ابا جان آ گئے۔ کیا حکم ہے؟

مسز وقار: اب بھی نہ آتے؟ یہ کوئی میرا بلاوا نہ تھا کہ سرکاری کام کا بہانہ کر دیتے! یہ بی امانی بیگم کا خدائی حکم پہنچا تھا۔

یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئیں اور سر پر سے ٹوپی اُتار لی۔

رفیق احمد: (شرمندگی کے لہجے میں) ہیں ہیں۔ بہن یہ کیا؟

مسز وقار: بھائی جان آپ کو خبر نہیں کہ ۲ دن ہوئے آپ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے اور کسی طرح نہیں تو نوبت کی آواز سے تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔

یہ کہہ کر نکٹائی کالر کھول کر کوٹ اُتارنے لگیں۔

وکیل صاحب: (شرم میں گڑتے ہوئے) وہ سب کچھ تو معلوم ہے لیکن یہ کپڑے کیوں اُترنے لگے؟

مسز وقار: یہ اس لئے کہ رکھ رکھاؤ کی ضروری رسومات فرنگیوں کے لباس میں ادا نہیں ہو سکتیں؟

امانی بیگم: (خوشی سے ہنس کر) ہاں میاں بہت ٹھیک ہے۔ ایک نگوڑے فرنگیوں کا لباس۔ دوسرے کالے کپڑے سے وہم آتا ہے۔

مسز وقار: کوٹ اور ٹوپی وغیرہ اُتار کر الگ ہو گئیں اور بی امانی نے قرآن

شریف اور تلوار لا کر وکیل صاحب کے ہاتھوں میں دی۔

رفیق احمد: ان کا کیا کروں۔؟

امانی بیگم: اے میاں اللہ اللہ کرو پہلے بھی ایک بچی ہو چکی ہے۔ سب کچھ کر چکے ہو گے۔ اب بھول گئے؟

مسز وقار: بی امانی آپ کا یہ خیال غلط ہے، بھائی میرا بالکل بے قصور اور انجان ہے۔ اختر چوں کہ ہمارے میکے میں پیدا ہوئی تھی اور ہمارے والدین شرع کے پابند تھے۔ وہاں کوئی رسم عمل میں نہیں آئی تھی۔ لیجیے میں سب کچھ اُن سے کرواتی ہوں۔

مسز وقار نے دونوں ہاتھوں میں قرآن شریف اور تلوار دے کر وکیل صاحب کو بیگم صاحبہ کے پیچھے اس طرح کھڑا کیا کہ اُن کا سایہ ان پر پڑتا رہے اور اپنے اور امانی بیگم کے سہارے سے آہستہ آہستہ چلاتی مع لڑکی اور اس سامان کے باہر لائیں۔ وکیل بے چارے کی آنکھیں شرم سے بند ہوئی جاتی تھیں اور سالی کے حکم سے بیوی کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے چلے آتے تھے۔ باہر لا کر چاروں طرف کے سات سات تارے زچہ سے گنوائے پھر چاروں کونوں کو سلام کروایا اور چاروں کونوں میں ایک ایک مٹھی کھیلیں پھینکیں جس وقت یہ رسم ادا ہو رہی تھی۔ اختر مذہبی خوف سے لرز رہی تھی اور دعا مانگ رہی تھی کہ خدایا میرے باپ کے اس گناہ کو معاف کر کہ قرآن شریف ہاتھ میں لے کر اپنی مسلمان بیوی سے گھر کے کونوں کو سلام کروا رہے ہیں اگر بیوی کی دل شکنی کا خیال نہ کر کے منع کر دیتے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ یہ رسومات عمل میں آتیں۔ مسز وقار احمد کا دل بھی ایسی بیہودہ باتوں میں شرکت کرتے ہوئے جو گناہ میں داخل ہیں۔ خود اپنے تئیں ملامت کر رہا تھا اور رفیق احمد خواہ کتنا ہی خوف خدا اور حیا کو دل سے نکال چکے تھے۔ پھر بھی تو اُن کا دل کانپ رہا تھا اور شرم سے حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اختر نے خود باپ کی طرف سے اپنا منہ پھیر رکھا تھا۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو بیگم صاحبہ پلنگ پر بٹھائی گئیں اور وکیل صاحب دل ہی دل میں ذلیل ہوتے باہر چلے گئے۔ آج کی تمام رات ناچ گانے میں گذرنی تھی۔ تمام بیبیاں یہیں رہیں۔ مسز وقار احمد چوں کہ گانا بالکل نہ سنتی تھیں۔ نہایت نرم الفاظ میں بیگم صاحبہ سے جانے کی اجازت مانگ کر رُخصت ہونے لگیں۔ اختر پائیں باغ کے پھاٹک

تک خالہ کے ساتھ آگئیں۔

مسز وقار: آج تو میرا دل بہت ہی مجھے ملامت کرتا رہا۔ ان باتوں میں شریک ہونے پر۔

اختر: خالہ جان میں تو لرز رہی تھی۔ دیکھا اس وقت ابا جان کا بھی کیا حال تھا؟

مسز وقار: ہاں بے چارے کا دل تو نیک ہے نہ۔ کسی وقت بھی اپنے کئے پر پشیمان نہ ہوں؟ بھانجی سے پیار کر کے چلی گئیں۔ چوں کہ رات کے ۱۱ بجے کا وقت تھا اور ان کی کوٹھی بہت قریب تھی۔ اس وقت بُرقع اوڑھ کر شرعی پردے سے پا پیادہ جانا ہی پسند کیا۔ گاڑی کا کہاں تقاضا ہوتا؟

اختر النساء اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئیں اور سوچنے لگیں کہ گھر میں کس قدر خوشی مچی رہی لیکن میرا دل ذرا خوش نہ ہوا۔

جھونکے نسیم صبح کے آئے، چلے گئے
لیکن نہ اپنے دل کی شگفتہ کلی ہوئی

چھٹا باب

میرے نالوں سے ملا دیکھو فغانِ عندلیب
ہو چمن میں آج مجھ سے امتحان عندلیب

چھٹی کے دوسرے ہی دن سے مسز وقار احمد نے دن میں کئی کئی آدمی اختر کے بلانے کو بھیجنے شروع کر دیئے تھے لیکن بیگم صاحبہ کچھ نہ کچھ عذر ہی کرتی رہیں مگر جب دسواں چلّہ بھی نہا چکیں اور صبح ۷ بجے ہی اختر حسن لینے آئے تو کچھ عذر نہ کر سکیں۔ اس وقت بیگم صاحبہ بچی کو گود میں لئے بیٹھی تھیں، لاڈلی بھی تھیں۔ اختر حسن کے آنے کی اطلاع ہوئی تو بیگم صاحبہ نے وہیں بلوا لیا۔ اختر حسن ان دنوں ۱۸ سالہ نہایت خوب صورت بجیلا نوجوان تھا اس وقت سیاہ سوٹ اور نکٹائی کالر سے ڈریس۔ سر پر تُرکی ٹوپی تھی۔ اس کی لیاقت اور خوب صورتی کی وجہ سے بیگم صاحبہ بھی نہایت محبت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ حالانکہ سوکن کا بھانجا تھا۔ جوں ہی اختر حسن نے برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ بیگم صاحبہ کی نظریں اس پر گڑ گئیں۔

اختر حسن نے قریب آ کر مؤدّبانہ سلام کیا۔ لاڈلی بیگم نے بھی کھڑے ہو کر ہندوستانی طریق سے سلام کیا۔

بیگم صاحبہ نے اختر حسن کو بجائے کرسی کے اپنے پلنگ پر بٹھایا چوں کہ لاڈلی بیگم اختر حسن کے مقابل بیٹھی تھیں۔ یہ شرم سے نیچی نگاہ کئے رہے۔

بیگم: اختر حسن تم تو اختر کو پہنچا کر واپس چلے گئے تھے۔ کب آئے؟

اختر حسن: جی ہاں تب تو چلا گیا تھا۔ رات ہی آیا ہوں۔ اس وقت آپ کے پاس آنے کو تیار ہوا۔ تو اماں جان نے کہا کہ خالہ جان سے کہنا اگر آپ اجازت دیں تو اختر کو لیتا جاؤں۔

بیگم: ہاں وہ کئی دن سے بلا رہی ہیں۔ میں نے بھی کل کہلا بھیجا تھا کہ صبح کو بھیج دوں گی۔ اس وقت تم ہی آ گئے۔ خوشی سے لیتے جاؤ۔ وہ اس وقت شاید اپنے کمرے میں ہوگی۔ لاڈلی کسی سے کہو۔ اُسے کہہ دے کہ بھائی لینے آئے ہیں۔

اختر حسن: میں خود ہی بلائے لاتا ہوں۔ یہ کہا اور بہن کے کمرے میں چلے گئے۔ اختر بے چاری اس وقت بہت ہی سادی معمولی حالت میں تھی۔ کپڑے بھی کئی دن کے پہنے ہوئے میلے سے تھے۔ آرام کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ بھائی کو آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور سلام کیا۔

اختر حسن: تم بھی ہندوستانی جاہل لڑکیوں کی طرح جھک کر سلام کرنے لگیں۔

اختر: (سادگی سے) سلام نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟

اختر حسن: شیک ہینڈ کرتیں یا اپنے اسلامی طریق سے سلام علیک کہتیں، تم تو اسکول کی تعلیم یافتہ ہو۔

اختر: (مسکرا کر) پھر تو گڈ مارننگ کہنا چاہیے تھا۔ اچھا خیر کچھ ہی ہوا۔ آپ اپنی چھوٹی بہن کی غلطی کو معاف کریں۔

اختر حسن: اچھا چلو میں نے معاف کیا۔ فٹن تیار ہے تم بھی تیار ہو جاؤ۔

دونوں بیگم صاحبہ کے پاس آئے اور سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اختر حسن بہن کو جب سوار کرا چکے تو کوچ مین سے کہا کہ کمپنی باغ سے ہوتے ہوئے گھر چلو۔ اندر بیٹھ کر بہن سے باتیں کرنے لگے۔

اختر حسن: بہن آج بہت عرصہ بعد تمہیں اپنے گھر لے چلا ہوں۔

اختر: پورے تین سال بعد لیکن بھائی آپ نے اس قدر پھیر کیوں کھایا؟ کمپنی باغ سے ہوتے ہوئے تو بہت دیر میں گھر پہنچیں گے۔

اختر حسن: اس لئے کہ تمہاری صحت بہت خراب ہے۔ رنگ زرد ہو رہا ہے۔

بیگم صاحبہ کی قید میں تازی ہوا سے بالکل ہی محروم ہوگئیں اور کچھ اپنی حالت تم نے اپنے ہاتھوں بگاڑ رکھی ہے۔لباس میلا۔سر میں کنگھی نہیں۔اس لئے اس راستہ سے لے چلا ہوں کہ آج تو کچھ تازی اور مفرح ہوا تمہیں نصیب ہو جائے۔

اختر: یہ بالکل سچ ہے مگر میری حالت کا صحیح صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔خدا کسی پر ایسا وقت نہ ڈالے اور مجھ سا کوئی دردمند نہ ہو۔میری حالت کو پوری طرح کچھ وہی جانچ سکتا ہے جو مجھ سا ہو۔

اختر حسن: (نہایت رنجیدہ و آبدیدہ ہو کر) پیاری بہن میرے الفاظ واپس دے دو اور معاف کرو۔

بے شک مجھ پر تم سا وقت نہیں پڑا اور خدا نہ ڈالے اور کہنے کو میں تم سا دردمند بھی نہیں ہوں مگر میرا خدا گواہ ہے کہ تمہیں اپنی حقیقی بہن نجم النساء کے برابر چاہتا ہوں۔میں تم میں اور نجم میں ذرا فرق نہیں سمجھتا اور تمہاری تکلیفوں کو پوری طرح محسوس کرتا ہوں۔

غرض اس طرح کی باتوں میں راستہ تمام ہوا اور گھر پہنچے۔اختر تو گاڑی سے اُتر کر سیدھی خالہ کے پاس گئی اور اختر حسن نے اپنی بہنوں کے پاس جا کر کہا۔

اختر حسن: مٹھائی کھلاؤ تو ہم تمہیں ایک چیز دیں۔

نجم: آپ کیا دیں گے؟

اختر حسن: ایک بہت اچھی چیز۔

قمر: بہت اچھی کیا ہوگی اگر میری پیاری اختر کو لا دو تو میں مٹھائی کھلا دوں یہ ذکر ہی تھا کہ اختر بھی آ پہنچیں۔

اختر حسن: یہ لو وہ چیز۔

دونوں بہنیں بہت بے قراری سے اُٹھ کر اختر سے ملیں اور نجم تو رونے ہی لگی۔

قمر: یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ سال بھر بعد اختر میرٹھ میں آئے اور میں سخت بیمار پڑی رہوں اور یہ اس قدر قریب رہ کر مجھ سے دس دن تک نہ مل سکے۔

اختر حسن: خیر بہن اب رنج کی باتوں کو جانے دو۔اچھی اچھی باتیں کرتے ان کا دل خوش کرو۔یہ چاروں بہن بھائی یہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور ۱۲ بج گئے۔

کھانے کے کمرے سے گھنٹی کی آواز آئی اور سب چھوٹے بڑے کھانے کی میز کے گرد جمع ہو گئے جس پر انواع واقسام کے کھانے چنے تھے۔ مسٹر وقار احمد بھی بھانجی سے کھانے پر ہی ملے۔ تقریباً دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ چھوٹے اظہر جواب پانچ سال کا تھا۔ بہن کے آنے کی خوشی میں برابر خود ہی گراموفون بجاتا رہا۔ پھر سب نے اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام کیا۔

چار بجے سہ پہر کو پھر سب چائے پر جمع ہوئے تو قمر النساء اور نجم النساء کی شادی کا ذکر ہوا۔

مسز وقار: (مسٹر وقار سے) آپ کیوں نہیں اُن خطوں کا جواب دیتے؟ اُنہوں نے میرے کان کھا لیے ہیں۔ دن میں کئی کئی دفعہ دونوں گھروں سے آدمی اور رُقعے آتے ہیں۔ اب تک تو یہ تھا کہ اُس کے بھائی کی پسند سے ہوگا۔ وہ علی گڑھ سے آئے، وہ بھی آ گئے۔ ہاں ناں کا کچھ جواب دو جو میں روز روز کے تقاضوں سے چھوٹوں۔

مسٹر وقار: بھلا میں کیا جواب دوں؟ دونوں گھروں میں سے جو پسند ہو۔ اختر حسن کی صلاح سے آپ ہی جواب لکھ دیں اور ہاں اب تو ہماری سمجھ دار اختر بھی آ گئی ہیں۔ اِن سے بھی صلاح لے لو۔

اس ذکر کے چھڑتے ہی قمر اور نجم یہ کہہ کر باغیچے میں چلی گئیں کہ ہمیں ٹی کوزی پر ستارے ٹانکنے ہیں اور وہ آج ہی رات مس جیکسن کے پاس بھیجنی ہے۔

اختر حسن: ہاں بہن اختر سے ضرور صلاح لینی چاہئے۔ گو یہ چھوٹی ہیں مگر بڑی سمجھ دار اور تجربہ کار ہیں۔

اس فقرے پر سب ہنس پڑے۔

مسٹر وقار: ہاں بی تجربہ کار صاحبہ کہو تمہاری کیا رائے ہے؟

اختر: جناب میں کیا اور میری رائے کیا؟ اور بزرگوں کے معاملہ میں دخل دینا سراسر حماقت ہے۔

مسٹر وقار: (مسکرا کر) جناب یہ بزرگوں ہی کا تو معاملہ نہیں۔ یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے۔ ایسے معاملات میں آپ سے صلاح نہ لیتی بزرگوں کی سراسر حماقت ہے۔

اختر: یہ آپ کی زمانہ شناسی اور دُور اندیشی اور اس بے بس و بے زبان فرقے کے حال پر کمال مہربانی ہے کہ اپنا ہر طرح کا اطمینان اور سوچ بچار اور پسند کر لینے پر بھی اُن کم عمر کم سمجھ بیچاریوں کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی تمام عمر کے ساتھ ان معاملات کا تعلق ہے۔ میرے خالو جان میں آپ کی اس اعلیٰ ہمدردی اس سچی محبت کا جو اپنی لڑکیوں سے ہے بلکہ یوں کہوں کہ اس بیکس فرقے سے ہے تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں پھر کہتی ہوں کہ جب آپ پسند کر چکے ہیں اور غالباً بہنوں کو بھی معلوم ہو چکا ہوگا تو اب میری رائے کی کیا ضرورت ہے؟

مسٹر وقار: پیاری بیٹی اختر ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔ دونوں جگہ اچھی ہیں اور دونوں ہی خواستگار۔ اب فکر یہ ہے کس کو ترجیح دی جائے؟

اختر: مجھے تو اب تک اِتنا بھی معلوم نہیں کہ وہ کون گھرانے ہیں! اور بہن نجم کی تو منگنی ہو چکی ہے نہ؟

مسٹر وقار: بے شک تمہیں معلوم نہیں! مفصل حال تمہیں اختر حسن بتادیں گے اور نجم پیاری کی منگنی کی کیا بات قرار پا گئی ہے، ہم تو فضول رسومات کو پسند ہی نہیں کرتے اور میرے بہنوئی مرزا ضیاء الحسن بی۔اے۔ بھی روشن خیال ہیں۔ وہ بھی ان باتوں کو گناہ جانتے ہیں۔ پچھلی عیدالاضحیٰ کو میری بہن نجم کو منگنی کی انگشتری پہنا گئی تھیں۔ بس یہ رسم ہوئی تھی۔ نہ کھانے پکے، نہ باجے بجے، نہ مہمان آئے۔ منگنی کے بعد قریبی رشتہ داروں سے پردہ ہو جانا بھی برا سمجھتا ہوں اور نجم کی ساس تو میری حقیقی بہن ہے اور اس کا بیٹا میرا بھانجا کنبے برادری کے برا کہنے کی پرواہ نہ کر کے میں نے نجم کو کسی سے بھی پردہ نہیں کرایا۔ وہ اپنے پھوپی، پھوپا، اُن کے بھائی اور بھاوجوں سب کے سامنے ہوتی ہے اور میں تو تجمل حسن کو بھی اپنے گھر میں کھلے ڈوبے آنے دیتا ہوں۔ وہ خود ہی شرم کرتی ہے اور اُس کے سامنے نہیں آتی۔ اب میں باہر جاتا ہوں کچھ سرکاری کاغذات دیکھنے ہیں۔ تم صلاح مشورہ کر رکھو۔

مسٹر وقار: پیاری اختر جس طرح ہو سکے۔ تم اپنے سامنے ان خطوں کے جواب دلواتی جاؤ۔

اختر: خالہ جان مجھے بھی تو معلوم ہو کہ وہ کیسے گھر ہیں۔ کیسے لڑکے ہیں؟

اختر حسن: ہم سب بتادیں گے، شام ہوگئی چلو ٹینس کھیلیں۔
اختر: آخر کب بتائیں گے؟
اختر حسن: رات کو کھانے پر۔
اختر: نہیں اُس وقت بہنیں بھی موجود ہوں گی۔ اُنہیں شرم آئے گی۔
اختر حسن: اچھا پھر صبح کو بتادیں گے۔ چلو اب تو ٹینس کھیلو۔

یہ دونوں باغیچے میں آئے۔ قمر اور نجم پہلے ہی موجود تھیں۔ کھیلنے لگے۔ ۷ بجے کے قریب تھک کر بیٹھ گئے۔ یہاں ٹھنڈ بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ چاروں کمرے میں آئے۔ تینوں بہنیں تو کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور اختر حسن لیٹ گئے اور کہا۔

اختر حسن: پیاری نجم پیانو سناؤ۔ بہت دن ہوئے باجا سُنے۔
نجم: میں تو ابھی سیکھ رہی ہوں۔ اچھا نہیں آتا۔ بہن سے کہو یہ سنائیں گی۔
قمر: مجھے سنانے میں تو کچھ عذر نہ تھا۔ چوں کہ ابھی بیماری سے اُٹھی ہوں۔ کمزوری کی وجہ سے آواز تھرتھرا جاتی ہے۔ پرسوں مس جیکسن کے ہاں پارٹی تھی۔ مجھے بہت چھوٹی سی تقریر کرنی پڑی۔ اُس میں بھی آواز کانپ گئی اور بولا نہ گیا۔ آپا اختر سنائیں گی۔ انہیں بہت پریکٹس ہے۔ اُن کی سکول کی استانیاں تعریف کرتی ہیں تو کہتی ہیں کہ یہ لڑکی موسیقی میں کمال حاصل کرے گی اور ہمیشہ اُن کے خط سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سب سے زیادہ نمبر پائے گی۔
اختر: مجھے آپ کے حکم کی تعمیل میں ذرا عذر نہیں ہے۔ مگر اس شرط پر کہ نجم بھی بجائیں۔
نجم: بہن میں بجانے کو حاضر ہوں پر کیا کروں پیانو ابھی اچھی طرح نہیں آتا ہارمونیم سنادوں گی۔
اختر: نہیں آتا تو کیا ہے۔ میں بتادوں گی۔
نجم: اچھا چلئے۔ اختر اور نجم پیانو کے پاس جا بیٹھیں۔ اختر حسن اور قمر بہت اشتیاق سے سننے کے منتظر رہے۔ دراصل اس چھوٹی سی عمر میں کہ اختر ابھی ۱۳ سال کی تھی۔ موسیقی میں اِس نے وہ دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ جس سے آئندہ اس کی اعلیٰ ترقی کی اُمید

ہوتی تھی۔ اختر نے باجے پر اُنگلیاں رکھ کر آہستہ سے نجم سے کہا۔

''مگر میں گاؤں کیا؟ مجھے تو انگریزی گانے پسند ہیں یا دو ایک ہندوستانی اخلاقی نظمیں اور میرے خیالات کچھ اس قدر منتشر ہو رہے ہیں کہ نہ انگریزی گیتوں پر ہی دل جمتا ہے نہ نظمیں اچھی لگتی ہیں۔ صدمات و تفکرات کے بوجھ سے دل کچھ ایسا کچلا گیا ہے کہ کوئی دلچسپی کی بات پسند نہیں آتی۔ کوئی خوشی میرے دل پر اثر نہیں کرتی۔ کسی بات سے دل خوش نہیں ہوتا۔ اسکول میں مجبوراً ضابطے کے سبب سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خالی اوقات میں اماں جان کی یاد اور ابا جان کی جدائی کے رنج سے پریشان ہو جاتی ہوں۔ وہ ویسے بہلی رہتی ہوں اور گھر آ کر تو ایک منٹ بھی آرام و اطمینان سے نہیں گذرتا میں کیا خاک بجاؤں؟''

نجم: پیاری اختر اس وقت اِن خیالات کو دُور کر دو اور اپنی بہن اپنے بھائی کی خوشی کا خیال کرو۔ گو یہ باتیں بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھیں مگر اختر حسن اور قمر نے بھی سُن لیں اور وہ رنجیدہ ہو گیے۔

اختر: آہ نجم مجھ سا بدنصیب بھی کوئی نہ ہو۔ یہ کہا اور باجے کی طرف متوجہ ہوئی۔

میرے نالوں سے بِلا دیکھو فغانِ عندلیب
ہو چمن میں آج مجھ سے امتحانِ عندلیب

اس نے اس شعر کو کئی بار ادا کیا اور بہت ہی رنجیدہ ہو کر ہاتھ اُٹھالیا۔

اختر: نجم میں کیا کروں۔ مجھے کچھ سوجھتا نہیں۔ غزلیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ لیکن میرے رنجیدہ دل سے حسب حال ہی شعر نکلتے ہیں۔ اس وقت بھائی موجود ہیں۔ یہ مناسب نہیں۔

قمر: اختر ٹھیر کیوں گئیں؟ اس کے ساتھ کا کوئی اَوْر شعر بھی یاد ہو تو کہہ دو۔ اختر نے بہن کے حکم سے مجبور ہو کر کہا۔

برق و صرصر نے اُڑایا، آشیانِ عندلیب
اب بھلا کیوں کر رہے گی تن میں جانِ عندلیب
باغباں، صیاد گل چیں، برق، صرصر رات دن
فکر میں رہتے ہیں، اتنے دُشمنانِ عندلیب

بدنصیب ستم دیدہ اختر نے یہ شعر کچھ اس طرح ادا کئے کہ اختر حسن و قمر رو پڑے۔
اس خیال سے کہ اپنے حسب حال کہہ رہی ہے۔ ماں کے نہ ہونے سے اس کا گھر برباد ہو گیا۔ سوتیلی ماں اور زہریلی بی امانی اور حق تلف لاڈلی اس کی دُشمن ہیں۔ اختر حسن سے سنا نہ جا سکا اور بہن کو منع کر دیا کہ یہ شعر بند کرو۔ باجا خوش ہونے کو بجوایا ہے نہ کہ غمگین ہونے کو، لیکن قمر اور نجم کی بیحد فرمائش نے کہ تھوڑا سا کچھ اور سناؤ۔ اُسے مجبور کر دیا۔ بھلا اختر بیچاری کے پاس دل خوش کن الفاظ کہاں تھے۔ اُس نے اب کے یہ شروع کیا۔

دل ہے غذائے، رنج، جگر ہے غذائے رنج
رنج ہے ہمارے واسطے، ہم ہیں برائے رنج
دُنیا میں آکے ہم نے نہ پائی کوئی خوشی
حاصل یہاں سے کچھ نہ ہوا آہ سوائے رنج

اختر حسن: بس بہن اب تم بند کرو۔ نجم کی باری ہے۔ اس سے بھی تھوڑا سا سُن کر اصلاح کر دو۔

اختر یہ سنتے ہی کھڑی ہو گئی اور نجم کو کرسی پر بٹھا دیا۔

نجم: اب بھلا کیا کروں؟

اختر حسن: اپنا سر کرو۔ کوئی اچھی سی نظم سناؤ جس سے بہن خوش ہو جائیں اور کیا کرو؟ میں نے اس خیال سے اس وقت باجے کو کہا تھا کہ تھوڑی دیر اسی میں لگ کر بہن اختر اپنے گھر کی باتوں کو بھول جائیں گی جب ایسا نہ ہو گا تو میں کیوں اُنہیں رنجیدہ کروں؟

نجم: اچھا لیجیے میں نظم سناتی ہوں۔

یاد آگیا وہ مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

اختر حسن: نہیں نہیں نجم بند کر۔ تم ان سے بھی زیادہ غمگین اشعار لے بیٹھیں۔

نجم: آپ ہی نے کہا تھا کہ نظم سناؤ۔

اختر حسن: اس نظم کو تو نہیں کہا تھا۔

اختر: بھائی برائے خدا آپ بھی گانے دیں۔

اختر حسن: ہاں ضرور۔ تمہاری صحت کے لیے غم کھانا بہت ضروری ہے۔

اختر: بھائی آپ کو میری قسم۔ دو تین شعر کہنے دیں۔ مجھے یہ نظم بچپن سے پسند ہے اور لمّاں جان کے انتقال کے بعد سے تو اس کی نقل اپنی کاپی میں مَیں نے سنہری حرفوں میں کر رکھی ہے۔

اختر حسن: اچھا تمہاری مرضی مگر رنجیدہ نہ ہونا۔

نجم نے پھر شروع کی۔

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دُھلانا

اختر اس شعر سے بے چین ہوگئی اور نجم کو کرسی سے اُٹھا کر کہا۔ ہٹو تمہیں آتا ہی نہیں۔ میں سناؤں گی اور خود دوبارہ ادا کیا۔

یاد آگیا وہ مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
اماں تیری گودیوں میں وہ کھیلنا خوشی سے
ٹھنڈی ہوا میں پھرنا وہ تالیاں بجانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
لمّاں کا صبح اُٹھ کر وہ میرا منہ دُھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ
خوشیاں کہاں ہیں، اماں کے وقت کی اب؟
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

دوبارہ پُر درد آواز سے۔

اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

”اس کے بعد باجا بند کر دیا اور آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ اس کی اصلاح کی ہوئی نظم سن کر اختر حسن قمر اور نجم بھی بے اختیار رو رہے تھے۔ یہ چاروں تو مرحومہ کو یاد کرکے اور

غریب اختر کی مصیبت پر ابھی اور روتے مگر خدا بھلا کرے خانساماں کا جس نے کھانے کی گھنٹی دے دی۔ مجبور چاروں ادھر چلے گئے اور قریب دس بجے کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔

☆

ساتواں باب

آج کیوں طرزِ تپش میں ہے تسلّی کی ادا
آج کے دن کون سی اُمید برآئی میری

صبح کو چائے کے بعد چاروں بہن بھائی پائیں باغ میں بنچوں پر بیٹھے تھے قمر اور نجم لیس بنا رہی تھیں اور اختر نکٹائی بن رہی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ شام بھائی نے قمر کی منگنی کے متعلق مفصل حالات بتانے کا وعدہ کیا تھا چوں کہ یہاں دونو بہنیں بھی موجود تھیں۔ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر باغیچہ کے اگلے حصے میں ٹہلتی ہوئی نکل آئی اور کل شام کا وعدہ یاد دلایا۔

اختر حسن: ہاں مجھے یاد بھی تھا چونکہ قمر پاس تھیں۔ اس لے آؤ اس روش پر بیٹھ جائیں۔ سب سنا دوں گا۔ اختر کو سننے کی جلدی تھی۔ جھٹ روش پر بیٹھ گئی۔

اختر حسن: تم نے نام تو سنا ہوگا۔ یہاں کے رئیس اعظم خان بہادر میرزا محمد احسن اپنے بڑے صاحبزادے کے لئے خواستگار ہیں۔ پان سو روپیہ ماہوار آمدنی کی معقول جائداد ہے۔ دو سو روپیہ پنشن پاتے ہیں مگر ساتھ یہ بھی ہے کہ چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ جن میں آئندہ یہ جائداد ٹکڑے ٹکڑے ہونے والی ہے اور چاروں لڑکے ابھی زیر تعلیم ہیں۔

اختر: پھر انہوں نے کس بوتے پر پیغام بھیجا ہے؟

اختر حسن: اس خیال سے کہ صاحب جائداد ہیں۔ عالی شان مکان میں رہتے ہیں۔ بڑا لڑکا میر اکلاس فیلو علی گڑھ میں تعلیم پاتا ہے۔

اختر: اچھا دوسری جگہ کا حال؟

اختر حسن: دوسرے صاحب بھی میرٹھ ہی کے بڑے بھاری جاگیردار ہیں۔ کمشنر ڈپٹی کلکٹر ہیں جس طرح یہ جائداد زیادہ یعنی ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی رکھتے ہیں۔ اسی طرح اُن کی اولاد بھی زیادہ ہے یعنی چھ لڑکے اور چار لڑکیاں۔ تین لڑکوں کی شادیاں ہو چکی ہیں جن سے اس وقت ایک درجن پوتے پوتیاں ہوں گی اور چاروں لڑکیاں ابھی ناکتخدا ہیں۔ ڈپٹی صاحب چوتھے صاحبزادے کے لئے ہم سے خواستگار ہیں۔

اماں: یہ صاحبزادے کچھ پڑھتے بھی ہیں۔ یا نرے تو اب ہی ہیں؟

اختر حسن: نہیں یہ پنجاب یونیورسٹی کے ایم.اے. ہیں اور اب بیرسٹری پڑھنے کے لیے انگلستان جانے والے ہیں۔

اختر: جب یہ میرٹھ کے رئیس ہیں تو آپ لوگ ان کے خاندان رسم و رواج چال چلن صورت شکل، صحت، خیالات وغیرہ سے بخوبی واقفیت رکھتے ہوں گے؟

اختر حسن: ہاں خوب اچھی طرح، یہ دونوں گھرتے تہذیب یافتہ روشن خیال ہیں اور اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر۔ یوں تو سب ہی اچھی شکل کے ہیں مگر ان دونوں گھروں کے یہ دونوں لڑکے نہ معلوم کیوں بہت ہی خوب صورت ہیں؟ بالکل تندرست موٹے تازے رنگتیں بھی گوری ہیں مگر قمر سے مدھم سرخی بھی بہت ہی کم لیکن پھر بھی اچھے خوبصورت ہیں اور روشن خیال کیا پورے آزاد خیال ہیں مگر کنبہ برادری کے احکام کے پابند۔

اختر: اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ درخواستیں صرف والدین ہی کی طرف سے ہیں یا لڑکوں کی بھی رضامندی اور دلی خواہش اس جگہ کے لئے ہے؟

اختر حسن: یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔

اختر: واہ یہی معلوم کرنا سب سے زیادہ مقدم تھا۔

اختر یہ کہہ رہی تھی کہ مسٹر و مسز وقار احمد بھی آپہنچے جو درختوں کے پیچھے کھڑے شروع سے اخیر تک ان کی تمام گفتگو سن رہے تھے۔ یہ دونوں اختر کے اس قدر دوراندیشانہ سوالات سے بہت ہی خوش ہوئے اور دونوں نے اسے پیار کیا۔

مسٹر وقار: میری لائق و سمجھ دار بیٹی۔ اب تو تم نے تمام حالات معلوم کر لئے۔ بتاؤ کس پر کس کو ترجیح دوں۔

اختر: (تھوڑے سکوت کے بعد) جناب میں خود کچھ نہیں کہہ سکتی۔ غالباً عام نظروں میں وہ ایم۔اے۔ولایت جانے والے اچھے ہوں گے اور چند وجوہ سے بھائی اختر کے کلاس فیلو طالب علم بی۔اے۔کلاس قابلِ ترجیح ہوں گے اور ہے بھی ٹھیک اچھے امیر گھرانے تعلیم یافتہ لڑکے ایسے وقت میں کس کو ناپسند ہو سکتے ہیں۔ جب کہ اچھے لڑکوں کا کال ہے اور میں بھی ان دونوں کو اچھا سمجھتی ہوں ایسی حالت میں کہ آپ کے پاس ان سے زیادہ اچھی کوئی اور درخواست آئی ہوئی نہیں۔

مسٹر وقار: ہاں بیٹی بس یہ حالات ہیں، اب فکر یہ ہے کہ ان دنوں میں سے کس کو منظور کروں؟

یہ ذکر یہیں تک پہنچا تھا کہ ایک لڑکے نے چاندی کی خوبصورت نقشیں پلیٹ میں اس وقت کی ڈاک پیش کی۔

مسٹر وقار: ان خطوں نے اس وقت بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ہاں بیٹی تم باتیں کرو۔ میں اُنہیں پھر دیکھ لوں گا۔

اختر: نہیں خالو جان آپ ڈاک اطمینان سے دیکھ لیں۔ شاید کوئی ضروری چٹھی ہو۔

مسٹر وقار: اچھا تو کہو اپنی خالہ سے۔ یہ کام تو اُن کا ہے۔ میرے عام خطوط منشی سناتا ہے اور پرائیوٹ ڈاک یہی کھولا کرتی ہیں۔

مسز وقار تین چار خط سنا چکیں تو اُنہوں نے ایک انگریزی ٹائپ میں چھپا ہوا لفافہ کھولا اور سنانا شروع کیا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

از آگرہ خورشید لاج۔

مورخہ سنہ

جناب مکرم و معظم من سلامت پس از آداب معروج آنکہ میں یہ عریضہ ارسالِ خدمت کرتے ہوئے اس جرأت کی معافی چاہتا ہوں۔

کیوں کہ ہندوستانی دستور کے لحاظ سے یہ خط خود لکھنا ذرا نامناسب ہے
مگر میں مجبور ہوں کہ مجھ بدنصیب کا کوئی بزرگ اس وقت سلامت نہیں
اور دوستوں کے ذریعے یہ درخواست کرنی مجھے ناپسند ہوئی۔

جناب کی لائق فائق صاحبزادی۔ کیو. این. وقار احمد
صاحبہ کی اعلیٰ قابلیت کا شہرہ میں سن چکا ہوں اور اکثر اخبارات میں
اُن کے لکچر واسپیچیں پڑھیں جو وقتاً فوقتاً وہ زنانہ پارٹیز میں دیتی رہتی
ہیں۔ میں نے اب تک اسی لئے شادی نہیں کی کہ جس اعلیٰ قابلیت کی
رفیق زندگی چاہتا تھا۔ نہ پائی۔ اب آپ کی خدمت میں نہایت
ادب سے غلامانہ عرض ہے کہ اگر اس قابل پائیں تو خاکسار ہی کو
شرف قبولیت بخش کر فرزندی میں منظور کرلیں۔ اپنے حالات بلاکم
وکاست عرض کئے دیتا ہوں۔

۱۔ میرے والد مرحوم مرزا بدرالزماں صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ
شاہ جہان پور کے رئیس تھے اور میرے سوا کوئی اولاد نہیں رکھتے تھے۔
وہ نہایت علم دوست تھے۔ جب میں علی گڑھ کالج سے ایم. اے.
پاس کر چکا تو ڈاکٹری کے لئے انگلستان بھیجا گیا۔ افسوس میرے
قیام انگلستان ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

۲۔ مرحوم کوئی جائداد نہ رکھتے تھے۔ صرف ایک مکان شاہ جہان
پور میں ہے جو میں نے اپنی بیوہ پھوپھی کے نام لکھ دیا ہے۔ ملازمت
سرکار سے جس قدر روپیہ حاصل کیا سب میری تعلیم پر خرچ کر دیا۔

۳۔ مجھے انگلستان سے واپس آئے پانچواں سال ہے۔ یہاں
سول سرجن ہوں۔ اس وقت میری تنخواہ ۸۰۰ روپیہ ماہوار ہے۔

۴۔ میں نے اپنے مستقل قیام کے لئے آگرہ کو پسند کیا ہے۔
اور اپنے ذاتی روپے سے جمنا کے کنارے ایک مختصر خوش نما بنگلہ تعمیر
کرایا ہے۔ بس یہ میری جائداد ہے اور یہ میری آمدنی ہے۔ اس کے

سوا اور کچھ نہیں رکھتا ہاں اپنے کام میں امید ترقی ہے۔
میری عمر اس وقت ۳۲ سال کی ہے۔ صحت بالکل درست ہے۔
۵۔ میں اپنی تصویر بھی اس عریضے کے ساتھ ارسال خدمت کرتا
مگر اس خیال سے کہ پہلے ہی خط کے ساتھ نامناسب نہ ہو۔ نہیں بھیجی۔
اس عریضے کا جواب ملنے پر پیش خدمت کروں گا۔ زیادہ حدِ ادب۔

خاکسار

ایم خورشید الزمان ایم۔ اے۔

سول سرجن، آگرہ

مسز وقار احمد یہ خط پڑھ رہی تھیں اور اختر حسن اور اختر کا چہرہ خوشی سے نظر آتا تھا جب خط ختم ہوا تو مسٹر وقار احمد نے کہا۔

مسٹر وقار: خدا کا شکر ہے کہ خورشید کو میں بالکل اپنی مرضی کے موافق پاتا ہوں۔ ان دونوں جگہوں پر تو پوری دل جمعی نہ تھی۔ کہو اختر تمہاری کیا رائے ہے؟

اختر: خالو جان اس خط سے تو جہاں تک معلوم ہوا ہے۔ حالات نہایت پسندیدہ ہیں۔ زیادہ تحقیق کرنے سے یقیناً سب پر قابلِ ترجیح ہوگا۔

مسٹر وقار: بیٹی زیادہ تحقیق کس طرح ہو؟ میں آگرے میں کس سے پوچھوں؟ میرے خیال میں صرف تصویر دیکھ لینی کافی ہوگی۔

اختر: تصویر تو کیا انہیں یہاں بلانا ضروری ہے۔ آپ بھائی تجمل حسن سے پوچھیں انہیں ضرور پوری واقفیت ہوگی۔ کیوں کہ وہ میڈیکل کالج میں ہیں اور وہ سول سرجن۔

اختر حسن: (جواب تک کسی گہری سوچ میں تھے) ابا جان میرے پاس ایک نہایت خوب صورت شخص کی تصویر ہے۔ اس پر نام کی جگہ صرف کے۔ زیڈ لکھا ہوا ہے۔ چونکہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ اپنے البم کی سجاوٹ کے لئے میں نے تجمل حسن کے البم سے نکال لی تھی۔ پوچھا تھا کہ یہ کس کی ہے تو انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے پروفیسر سے لی ہے، وہ ولایت سے لائے تھے، لیکن یہ ذکر کوئی دو سال کا ہے۔

مسٹر وقار: میاں تصویر سے اور خورشید سے کیا نسبت؟ اچھا لاؤ دکھاؤ تو سہی اور ان دونوں لڑکوں کی بھی تصویریں لیتے آنا۔ اختر دیکھیں گی۔

اختر حسن: ابا جان اس تصویر سے اور ڈاکٹر خورشید سے ضرور کچھ تعلق ہوگا۔ میرا دل یہی گواہی دیتا ہے۔

اختر حسن گئے اور تینوں تصویریں لے آئے۔ پہلے وہ دونوں تصویریں اختر کو دکھایا۔

اختر: (تینوں تصاویر کو نہایت غور سے دیکھنے کے بعد) ہاں اچھی ہیں اور یہ کے زیدی کی تو مجھے معلوم ہوتا ہے۔ فرضی بنائی ہوئی ہے اگر اصلی بھی ہو تو بھی کوئی تعجب نہیں۔ دُنیا میں خدا نے ایک سے ایک اچھی شکل بنائی ہے مگر ہمیں شکلوں سے زیادہ بعض دوسرے امور پر غور کرنا ضروری ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ ان تینوں میں سے کون سی جگہ قابلِ ترجیح ہے۔

مسٹر وقار: میرے خیال میں خورشید ہی کو ترجیح دینی چاہئے کیوں کہ اس بیچارے کے کنبہ برادری کے بکھیڑے نہیں ہیں۔ ہندوستانی رسومات سے نجات ملے گی۔ گو ہم میرٹھ والوں کو بھی کوئی رسم نہ کرنے دیتے مگر اُن کی مستورات ضرور ضد کرتیں۔

اختر: خالو جان علاوہ ازیں ہمیں اور باتوں میں بھی ان تینوں کا مقابلہ کرنے سے آگرہ ہی سب سے زیادہ اچھا معلوم ہوگا کیوں کہ ایک تو اُن گھروں میں درجنوں اولاد ہے، گو جاگیردار ہیں مگر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوئی نہ ہوئی برابر ہو جائے گی۔ دوسرے لڑکے ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ نہ معلوم فارغ التحصیل ہو کر کام کریں، معزز عہدوں پر ممتاز ہو سکیں یا نہ ملنے سے امیری کے گھمنڈ میں گھر بیٹھے روٹیاں توڑیں۔

سب سے زیادہ قابلِ غور یہ بات ہے کہ ان لڑکوں کی اس جگہ اپنی وضع بھی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا ہی نہ ہو۔ کہ "ماں باپ کا کیا سر پر دھرا" کے لحاظ سے لڑکے خاموش ہوں۔

مسٹر وقار: ہاں بیٹی تمہاری یہ سب باتیں بالکل درست ہیں مگر اب بتاؤ اس آگرہ کی بابت کیا کرنا چاہئے۔ اس خط کا جواب کیا دوں؟

اختر: یہ آپ خالہ جان سے پوچھ سکتے ہیں۔

مسز وقار: یہ مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔ سب بتا سکتے ہیں کہ اگر ہو سکے کچھ حالات معلوم کرنے چاہئیں اور پھر انہیں بلا کر دیکھنا چاہئے۔

اختر حسن: حالات معلوم کرنے تو بہت آسان ہیں۔ میں ابھی تجمل حسن سے بات کرتا ہوں۔ وہ ضرور جانتے ہوں گے کیوں کہ ایک شہر کی بات اور پھر ڈاکٹری کا۔

اختر: کیا بھائی تجمل حسن یہاں ہی ہیں؟ میرے سامنے تو آئے نہیں۔

اختر حسن: ہاں وہ پرسوں رات سے آٹھ دن کی رُخصت لے کر آئے ہوئے ہیں۔ کل کسی کام کو دہلی گئے تھے۔ صبح ۹ بجے واپس آ گئے ہیں۔

اختر: اچھا تو آج دوپہر کے کھانے پر اُنہیں بلا لینا۔ میں اُن سے خود پوچھ لوں گی۔

دن زیادہ چڑھ گیا تھا۔ یہ سب باغیچے سے چلے آئے۔ دوپہر کے کھانے پر قمر اور نجم نہ گئیں اس لئے کہ قمر کی نسبت پر گفتگو ہونی تھی اور نجم کے منگیتر تجمل حسن شریک تھے۔ کھانے کے بعد اسی کمرے میں اختر نے تجمل کو سول سرجن صاحب کا خط دکھایا اور کچھ حالات دریافت کیے۔

ڈاکٹر تجمل حسن: اوہ بھی آپ اس قدر فکر کیوں کرتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب سے بخوبی واقف ہوں۔ آگرے میں اس وقت اُنہیں عزت و ناموری حاصل ہے۔ ہمارے کالج کے طلباء تو کیا پروفیسر و پرنسپل تک اُن کی طبی قابلیت کے مداح ہیں۔ ڈاکٹر موصوف اکثر اوقات ہمارے کالج میں بھی لکچر دیتے رہتے ہیں۔ ڈیڑھ سال ہوا انہوں نے کالج کے طلباء کو اپنے بنگلہ پر ٹی پارٹی دی تھی۔ اس دن سے میری اُن کی اچھی واقفیت ہوگئی۔ اب بھی اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے اگر میں نہ جاؤں تو وہ خود بلوا لیتے ہیں۔ نہایت خلیق ملنسار آدمی ہیں۔

اختر: یہ تو ہوا۔ آج کل کے جنٹلمینوں کی طرح فضول خرچ ہیں یا کفایت شعاری کی بھی صفت رکھتے ہیں۔ اُن کے ملنے والے کیسے لوگ ہیں؟

ڈاکٹر تجمل: بہن وہ ہمہ صفت موصوف ہیں۔ میں اُن کے بنگلے پر جاتا ہوں تو گھنٹوں گھر کے انتظام اور اُن کی باتوں پر غور کیا کرتا ہوں۔ فضول خرچی کی بابت تو یہ سنو کہ اس وقت وہ آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں گو بہت ہی کم فیس لیتے ہیں۔ تب بھی فیسوں میں دو سو سے کم نہیں ملتا تو ایک ہزار روپیہ ماہانہ سمجھو۔ اس قدر معقول آمدنی ہے اور اکیلا دم چاہئے تھا کہ بنگلے کی مناسبت کو درجنوں نوکر ہوتے مگر صرف چھ ملازم ہیں۔ ایک خانساماں

ایک بیرا، ایک بٹلر، ایک مالی اور دو چوکیدار وہاں چھ کتے بھی ہیں، بس سب کچھ یہ ہے اس کو فضول خرچی سمجھئے یا کفایت شعاری، ان کو فرصت ہی نہیں ہوتی اور جن کو ان سے ملتے جلتے دیکھا۔ وہ چند نہایت ہی معزز اصحاب ہیں اور جن سے پُر تکلف محبت دوستی ہے۔ وہ میرے کالج کے دو پروفیسر ہیں۔

ہاں ایک شکایت سنی کہ اسٹیشن کی یورپین لیڈیز ہمیشہ اُن سے خائف رہتی ہیں کیوں کہ یہ اُن سے زیادہ ربط ضبط نہیں رکھتے۔ ایک دن مجھ سے کہتے تھے کہ "تجمل میں سخت مشکل میں ہوں۔ ہمیشہ یوروپین کلب میں مجھے بلایا جاتا ہے اس میں لیڈیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس لئے میں جاتا ہوا گھبراتا ہوں اور ہمیشہ عذر کر دینا بھی تہذیب و اخلاق کے خلاف ہے۔"

بس اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر تجمل نے اختر حسن سے مخاطب ہو کر کہا۔

ہاں خوب یاد آیا۔ مسٹر اختر آپ کو یاد ہو گا کہ دو سال ہوئے آپ نے میرے البم سے ایک خوب صورت تصویر نکال لی تھی جس کی بابت معلوم نہ تھا کہ کس کی ہے۔ آپ خوش ہوں کہ وہ بھی انہیں صاحب کی تھی۔ جب میرے پروفیسر مسٹر الفریڈ نے مسٹر خورشید سے مجھے پہلی دفعہ ملوایا تو کہا کہ وہ تصویر جس پر کے نز ڈیڈ لکھا تھا۔ وہ انہیں صاحب خورشید زمان کی تھی۔

اختر حسن: ابا جان میں نہ کہتا تھا کہ اس تصویر سے اور اس خط سے ضرور کچھ تعلق ہے۔ میرا خیال کیسا سچا نکلا۔

اس گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ سول سرجن صاحب کو بلایا جائے اور مسٹر وقار احمد نے آج ہی یہ خط لکھ دیا کہ آپ کو میرٹھ آنا چاہئے۔ زبانی گفتگو ہو گی۔

اس خط کے پہنچتے ہی جواب میں تار ملا کہ "کل ۱۱ بجے پہنچوں گا۔" مسٹر وقار احمد تو نہیں اختر حسن و تجمل حسن ڈاکٹر صاحب کے لئے کو سٹیشن پر گئے۔ جس وقت یہ دونوں مع سول سرجن صاحب کے گھر پر پہنچے۔ مسٹر وقار احمد ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر اخبار پڑھ رہے تھے۔ مسٹر خورشید کو قریب آتا دیکھ کر فوراً اخبار میز پر رکھ دیا اور نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ تھوڑی دیر معمولی گفتگو کے بعد کھانے پر بلائے گئے۔ وہاں اس وقت مسز وقار احمد وغیرہ میں سے کوئی نہ تھیں اُنہیں چاروں نے کھانا کھایا۔ ہاں چھوٹا لڑکا اظہر بھی شریک تھا

جس کو مسٹر خورشید گود میں بٹھا کر کھانا کھلا رہے تھے۔ مسٹر وقار احمد نے گھر میں ذکر کر کے اور یہ پختہ ارادہ کر کے کہ قمر کی شادی اُنہیں سے کرنی ہے بیوی کے بہنوئی مسٹر رفیق احمد اور اپنے بہنوئی مسٹر ضیاء الحسن کو اس لئے بلا بھیجا تھا کہ انہیں بھی اس مشورے میں شریک کرنا ضروری ہے کہ بعد میں شکایت نہ ہو اور دوسرے یہ کہ وہی دونوں منگنی کی رسوم وغیرہ کی بابت مسٹر خورشید سے ذکر کر لیں گے۔ چنانچہ دوپہر میں یہ باتیں طے ہو گئیں اور یہ قرار پایا کہ اس وقت مسٹر خورشید کے آنے کا اور نسبت قرار پانے کا کسی سے ذکر نہ کیا جائے اور یہاں سے ڈاکٹر صاحب ہندوستانی دستور کے موافق (جیسے کہ نائی وغیرہ منگنی کی نشانی لے کر آتے ہیں) اپنے آدمی کو انگشتری وغیرہ دے کر بھیجیں جس سے برادری میں معلوم ہو جائے کہ منگنی ہو گئی چونکہ مسٹر خورشید و مسٹر وقار احمد میں کچھ رشتہ داری نہ تھی۔ مسز وقار احمد اور لڑکیوں کا اس دفعہ ڈاکٹر صاحب سے پردہ رہا لیکن مسز وقار احمد اور اختر و نجم کو اپنے آئندہ حقیقی رشتہ دار بننے والے مسٹر خورشید کو دیکھنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے یہ تجویز کی کہ شام کی چائے اُنہیں پائیں باغ میں پلائی جائے۔ بڑی خوشی خوشی اختر و نجم نے میز پر چائے کا سامان رکھوایا اور خود باغیچے کی بارہ دری میں ہو گئیں اور چِکوں میں سے دیکھتی رہیں۔ اختر حسن اور تجمل حسن اِدھر اُدھر ڈاکٹر خورشید بیچ میں چائے پر آ بیٹھے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت بھورے سے رنگ کا سوٹ پہنے تھے۔ سر پر ٹوپی نہ تھی۔ اُن کی شکل کیسی تھی؟ اس وقت کیسے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ یہ تو کوئی مسز وقار احمد صاحبہ سے پوچھے، اختر و نجم سے جو اپنا نیا بھائی بننے والے کو اس وقت قدر کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جب چائے پی چکے تو دونوں بہنوں نے پان بھیجے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کس نے بھیجے ہیں اگر مسز وقار احمد صاحبہ مکرمہ نے بھیجے ہوں تو میرا سلام کہو اور جو چھوٹی این۔ ایس۔ صاحبہ نے بھیجے ہیں تو ہماری طرف سے تھینک یو کہو۔ مسز وقار احمد صاحبہ نے دُعا اور بہنوں نے سلام بھیجا۔ اختر حسن اس وقت یہاں سے عمداً اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ تجمل حسن نے بآوازِ بلند کہا۔ نرگس کیا مس رفیق احمد صاحبہ یہیں ہیں؟ ڈاکٹر صاحب سلام کہتے ہیں۔

خورشید زمان: مس رفیق احمد صاحبہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟

تجمل حسن: جناب وہ میری بہن لگتی ہیں۔ کیوں کہ بھائی اختر حسن کی خالہ زاد

بہن ہیں۔وہ وکیل صاحب جو آج دو پہر آپ سے ملنے آئے تھے۔اُن کے والد ہیں۔

خورشید: تو پھر وہ ہماری بھی بہن ہیں۔اچھا اب میرا ڈبل سلام دو۔

تجمل حسن: بہن سنتی ہو۔ڈاکٹر صاحب دو دو سلام دے رہے ہیں۔

نرگس: وہ بھی سلام کہتی ہیں۔

خورشید: ہاں بھئی بہن این این صاحبہ سے پوچھ دو۔کیا مجھ سے خط وکتابت کرنا پسند کریں گی اگر میں خط بھیجوں تو جواب دیں گی؟

تجمل حسن: جناب یہ میں نہیں پوچھ سکتا۔آپ نرگس سے کہیں۔مَیں بلائے دیتا ہوں۔

خورشید: یہ کیوں۔کیا وہ آپ سے ناراض ہیں؟

تجمل حسین: نہیں تو (آہستہ سے) میری اُن سے منگنی ہو چکی ہے۔

خورشید: (ہنستے ہوئے نہایت خوش ہو کر) اچھا تو یوں کہیے معاف کرنا مجھے معلوم نہ تھا۔

تجمل نے نرگس کو بلایا اور ڈاکٹر صاحب نے اس کی زبانی کہلا بھیجا۔نرگس نے آکر کہا کہ "آپ کی چھوٹی بہن نجم النساء بیگم صاحبہ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ خط بھیجیں میں بہت خوشی سے جواب دوں گی۔"

اب یہ دونوں بھی باہر چلے گئے اور رات کے ۱۱ بجے کی گاڑی سے سول سرجن آگرہ روانہ ہو گئے۔وکیل صاحب نے بیگم صاحبہ کو اور مسٹر ضیاء الحق صاحب نے ہمشیرہ صاحبہ وقار احمد کو اس نسبت کا حال سنا دیا۔

جس روز ڈاکٹر صاحب یہاں سے گئے۔اس کے چوتھے دن دو معتبر ذی عزت آدمی جو اُن کے والد مرحوم کے وقت میں اُن کے پرائیویٹ منشی تھے۔منگنی کا سامان لے کر میرٹھ پہنچے۔آج قمر کی پھوپی یعنی مسز ضیاء الحسن بھی آئی تھیں۔یہ چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ایک بیش قیمت سنہری بکس میں ایک سنہری جڑاؤ پیٹی باور دو جڑاؤ انگوٹھیاں صرف تین چیزیں تھیں جن کی قیمت کم از کم ڈیڑھ ہزار روپیہ ہو گی۔اسی دن شام کو قمر النساء کو ایک اچھا سا جوڑا پہنا کر یہ تینوں چیزیں پہنا دیں اور اُن کی چھ سات یورپین سہیلیوں اور چار

رشتہ دار لڑکیوں کو جن میں لاڈلی بیگم بھی تھیں شام کی چائے پر بلا بھیجا۔ صرف اس غرض سے کہ اپنے اپنے گھر جا کر ذکر کریں گی تو برادری میں یہ نسبت معلوم ہو جائے گی اور لوگ پیغام بھیجنا بند کر دیں گے۔ اسی خبر کو وسعت دینے کی غرض سے ان سمجھ دار منشیوں نے یہ کہا کہ ''آپ پسند کریں تو من دو من مٹھائی منگالیں اور تمام شناسائی میں تقسیم کر دی جائے۔'' لیکن مسٹر وقار احمد نے نامنظور کیا کہ یہ فضول رسم ہے۔ ایسی فضول خرچی مجھے پسند نہیں۔ آج کا دن بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ چاروں دن ہماری رنجیدہ اختر پر بڑی خوشی کے گذرے۔

آٹھواں باب

بات چھوٹی ہے چمن میں میرے مرجھانے کی
نہیں اُمید یہاں آب و ہَوا پانے کی

کانپور

یہاں کوتوالی کے قریب معمولی سے دو مکان ہیں۔ ایک مکان میں بڑا بھاری املی کا درخت کھڑا ہے۔ اور دوسرے میں بیری۔ بیری والا بڑا مکان ہے اور املی والا بہت ہی مختصر۔ بڑے مکان میں دالان دردالان اور دو طرفہ بغلی کوٹھریاں ہیں۔ آگے آدھ فٹ اونچا چبوترہ ہے۔ جس کے نیچے میتھی، پالک، دھنیا، پیاز وغیرہ کی کیاریاں ہیں۔ سامنے چھوٹی سی باورچی خانہ کی کوٹھری جس کے آگے چھپر پڑا ہے اور چولہے بنے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹا سا غسل خانہ ہے اور اس کے ساتھ پاخانہ ہے۔ ذرا ہٹ کر دروازہ اور ڈیوڑھی ہے۔ ڈیوڑھی میں بائیں جانب ایک مختصر سی اَور کوٹھری ہے جس میں جاجم کا فرش ہے اور ایک میلا سا قالین بچھا اور ویسا ہی میلا گاؤ تکیہ پڑا ہے اور قالین کے پاس ایک اُگال دان رکھا ہے۔ کوٹھری کے سامان سے پایا جاتا ہے کہ یہ صاحب خانہ کی وہ جگہ ہے جسے عام زبان میں مردانی بیٹھک کہتے ہیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بڈھا بیٹھا ہے جو شاید نوکر ہے۔

املی والے چھوٹے مکانوں میں صرف ایک کھلے دروں کا اچھا بڑا دالان ہے اور بغلوں میں چھوٹی چھوٹی دو کوٹھریاں اس کے آگے بھی چبوترہ ہے مگر بالکل ٹوٹا ہوا۔ دالان

کے آگے کی اونچائی سے پایا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں بھی چبوترہ بنایا گیا ہوگا۔ دالان کے سامنے ہی ایک چھپر ہے جس میں چولہوں کا ہونا بتا رہا ہے کہ یہی باورچی خانہ ہوگا۔ نیچی نیچی کچی دیواروں کا ایک پاخانہ تو ہے مگر غسل خانہ نہیں۔ اس مکان میں بیٹھک تو کیا۔ ڈیوڑھی کی کوٹھڑی بھی نہیں۔ صحن کا دروازہ سڑک پر کھلتا ہے۔ املی اس قدر گھن دار ہے جس نے چھوٹے سے صحن پر چھت ڈال رکھی ہے۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں تو کیا صحن میں بھی ہوا کا گزر تک نہیں۔

یہاں دو حقیقی بھائی حیدر علی و نثار علی رہتے ہیں۔ اس املی والے گھر کے مالک بڑے بھائی حیدر علی بیس روپیہ ماہوار پنشن پاتے ہیں اور صرف ایک لڑکا اُن کی زندگی کا سہارا ہے۔ دوسرا بیری والا گھر نثار علی کا ہے جو اس وقت پچاس روپیہ ماہوار پر کچہری میں مثل خواں ہیں۔ ان کا مکان بھی پہلے ویسا ہی تھا۔ جیسا بڑے بھائی کا مگر اُنہیں کام اچھا مل گیا۔ مکان کو خود وسعت دے لی۔

اُن کے والد مرحوم کے تین بیٹے تھے۔ چھوٹا بیٹا ذاکر علی کسی بات پر ناراض ہو کر لکھنؤ چلا گیا تھا۔ اُس کی شکل ان بھائیوں سے اچھی ہی نہیں بلکہ خوب صورت تھی۔ ویسے ہی قسمت بھی اچھی تھی۔ لکھنؤ جاتے ہی ایک بڑے نواب صاحب کے گاؤں کی مختار کاری مل گئی۔ لکھنؤ کے نوابوں کے محل میں ماتن، ڈومنی، بساطن وغیرہ کی بھرتی ہوتی رہتی ہے جو سب بیگمات کہلانے لگتی ہیں۔ اُنہیں بیگموں میں سے کسی ایک کی لڑکی (جس کو نواب زادی کہتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے) ذاکر علی پر مہربان ہو گئیں۔ اِدھر نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اُن نواب زادی صاحبہ نے اُن سے شادی کر لی۔

حیدر علی کے والد مرحوم نے اسی خیال سے کہ ذاکر علی کو تو لکھنؤ میں بے انتہا دولت مل گئی ہے۔ یہ دونوں مکان اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے نام لکھ دیئے تھے۔ نثار علی کے دو لڑکیاں اور ایک چھوٹا سا لڑکا ہے۔ گھر میں ایک عورت کھانا پکانے پر نوکر ہے اور باہر ایک ڈیوڑھی وان۔

بڑے بھائی حیدر علی بچارے کی حیثیت تو معلوم ہی ہو چکی ہے۔ وہ بیس روپے میں نوکر نہیں رکھ سکتے۔ ان کی بیوی خود ہی کام دھندا کرتی ہیں۔ سودا سلف خود لا دیتے ہیں۔

لڑکا بھی سولہ سترہ سال کا ہے مگر افسوس محض جاہل اور نالائق ہے۔ باپ نے بہت ہی کوشش کی کہ کچھ پڑھ لے مگر یہ صاحبزادے پرائمری پاس کر کے جو نکلے تو پھر اسکول جا کر نہ دیکھا۔ شکل خدا نے انہیں بھی ان کے چھوٹے چچا کی طرح اچھی دی تھی۔ نئی روشنی کی ہوا نے ان پر بھی اپنا اثر کیا مگر صرف اتنا ہی کہ کوٹ بوٹ کا شائق بنا دیا۔ باوا بچارے تو اب تک آڑا پاجامہ اور انگرکھا پہنتے ہیں۔ انہیں کوٹ بوٹ کمیص کی ضرورت ہوئی۔ باوا بچارے کہاں سے پورا کرتے؟ تنگ آ کر صاحبزادے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کو تو بھلا کہاں نوکری مل سکتی؟ ایسے محض صاحبزادوں کا ٹھکانہ ریل ہے یا ڈاک خانہ، منت سماجت کر کے کسی چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر دس روپے ماہوار کا کوئی کام مل گیا اب کیا تھا۔ لناں باوا پھولے نہ سماتے تھے۔ وہی بیٹا جس کو نالائق ناشدنی کہہ کر پکارتے تھے اور ہر اک کے آگے اس کی بدکرداریوں کا رونا رویا کرتے تھے۔ اب بڑا لائق فایق کماؤ بیٹا تھا۔ اس کی شادی کی فکر تو پہلے ہی تھی مگر سوچتے تھے کہ ایسے نکھٹو کو ہم مفتی غریب کی بیٹی آ جائے گی مگر بیٹا نوکر ہوتے ہی اُن کی نظروں میں بادشاہ ہو گیا۔ اب ایک بڑی امیر زادی کے لانے کی فکروں میں پڑے اور درخواست کا خط بھی لکھ دیا۔ ایک دن تیسرے پہر کے وقت باہر سے خط لئے ہوئے آئے۔ بیوی ماش کی دال دھو رہی تھیں۔ اُن سے کہا۔

حیدر علی: لو مبارک ہو۔ یہ خط آ گیا۔ ذرا چلو نثار علی کے وہیں سُنتا۔

بیوی بہت ہی خوش ہو کر وہیں کھڑی ہو گئیں۔ خوشی میں دال ڈھکنا بھول گئیں۔ پیچھے کوّے کھاتے رہے۔ دیوار درمیان گھر تھا۔ جھٹ کھڑکی میں سے نکل وہاں پہنچی۔ یہاں چبوترے پر پلنگ بچھے تھے اور نثار علی مع بیوی بچوں کے پوریاں کھا رہے تھے۔ باورچی خانے سے ماما پکا پکا کر چھوٹی لڑکی کے ہاتھ بھیج رہی تھی۔ جیٹھ جٹھانی کو آتے دیکھ کر نثار علی کی بیوی نے کہا۔

سلطانہ بیگم: ایلو بھائی بھابی خود ہی آ گئے۔ میں ابھی چھٹن سے کہہ رہی تھیں کہ جا کے تائی اماں کو بلا لا۔

حیدر علی: اجی خیر تم پوریوں کو تو رہنے دو۔ میں ایک اور ہی خوشخبری تمہیں سنانے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر بھائی کے ہاتھ میں خط دے دیا۔ انہوں نے پڑھا اور خوشی سے اُچھل پڑے۔

نثار علی: مگر بھائی یہ کام تو ڈراوے ہی سے بنا۔

حیدر علی: بے شک یہ تمہاری عقل نے بنایا۔ بس اب ہم بھی مالا مال ہو جائیں گے۔

نثار علی: دیکھئے بھائی جان میں نے کیسا آپ کا گھر بنا دیا۔ آپ تو پہلا ہی انکار سن کر چپ ہو گئے تھے۔ میں نے حوصلے سے کام لے کر ڈراوے دیئے۔ دیکھو کیسی بازی جیت لی۔ ہمیں لڑکیوں سے کیا واسطہ؟ وہ نہ سہی وہ سہی۔ مال ملنے کا ذریعہ ہو گیا بلکہ اور بھی اچھا ہوا۔ اس لڑکی کے وہاں دینے سے ہم ہمیشہ کے لئے دعویٰ دار رہیں گے۔

دونوں بیویاں: ہمیں بھی سناؤ۔ کیا معاملہ ہے؟

حیدر علی نے آہستہ آہستہ کچھ کان میں کہہ دیا۔ اُن کے چہرے بھی گو سانولے تھے مگر خوشی سے سُرخ ہو گئے۔

افسوس دُنیا بھی کس قدر بری جگہ ہے۔ اس میں کیسے کیسے جعل فریب ہیں۔ نہ معلوم ان بدباطنوں نے مل کر کیا جعل سازی کی ہے۔ کس بے بس معصوم کے درپے آزار ہیں۔ آہ اس بھولی بھالی لڑکی کو کچھ خبر نہیں کہ اس پر کیا ظلم ہونے والا ہے، نہیں ضرور خبر ہو گی۔ دنیا کے بندے خبر دیں یا نہ دیں۔ کسی نامعلوم طاقت نے اس کے دل میں ضرور خبر کر دی ہو گی۔ وہ بے زبان بول نہیں سکتی ہو گی۔ پر دل ہی دل میں کہتی ہو گی۔

بات پھوٹی ہے چمن میں تیرے مرجھانے کی
نہیں امید یہاں آب و ہوا کھانے کی

نواں باب

غم بھلا دیتے ہیں ہو اَوروں کی محفل میں شریک
یُونہی تسکین دلِ زار کیا کرتے ہیں

رات کے دس بج چکے تھے مسٹر و مسز وقار احمد اپنے دوستوں کو رخصت کر کے جو شام کے کھانے میں شریک تھے۔ بیڈروم میں آئے۔ مسٹر وقار احمد نے کپڑے بدل کر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں تو مسز وقار احمد نے کہا۔

مسز وقار: ہاں آج آپ کو اس قدر جلد نیند آ گئی؟ اخبار بھی نہ دیکھا؟

مسٹر وقار: ہاں آج میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اس لئے جلدی سو جانا چاہتا ہوں۔

مسز وقار: مجھے نیند تو نہیں آ رہی۔ میں آپ ہی کی طرف متوجہ ہوں۔ کہئے شوق سے۔

مسز وقار: قمر کی نسبت ٹھیرے دو ہفتے گذرے۔ اس قلیل عرصے میں آپ کو نہیں معلوم میرے پاس خورشید زمان کے کس قدر خط آئے ہیں۔ آج شام کو ملا۔ اس میں لکھا ہے کہ "اگر اس خط کا جواب بھی نہ ملا تو میں حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔" میں نے اس وقت آپ کو اس لئے نہیں دکھایا کہ کھانے میں چند احباب شریک تھے اگر پرسوں کو وہ خود ہی آن پہنچے تو پھر ضرور ہی آپ کو ملنا پڑے گا۔ اس خیال سے میں مناسب سمجھتی ہوں کہ اُن کے حسب دلخواہ جو لکھ دیا جائے۔ قمر بھی تعلیم سے فارغ ہو چکی ہے۔ اُدھر بیچارے کا گھر تو کردں

کے ہاتھوں برباد ہو رہا ہے۔ اس مہینے شادی کرنے میں یہ فائدہ ہوگا کہ بے چاری اختر بھی بہن کی شادی میں شریک ہو سکے گی۔ اگلے مہینے اسے کانپور جانا ہے۔ پھر بھلا وہاں سے کون بلانے دے گا۔ اُسی دن شام کو جب منگنی میں لاڈلی بیگم آئیں۔ زبردستی اختر کو ساتھ لے گئیں۔ ہم نے ہر چند روکا ایک نہ مانی۔

مسٹر وقار: بہت اچھا۔ جو آپ کی رائے۔ سامان کرنے کو بہن (مسز ضیاء الحسن) اور اختر کو بلا لو۔

مسز وقار: اُن کو تو میں ویسے بھی بلا لوں گی اور سامان ہی ایسا کیا کرنا ہے۔ فون سے جوڑے، تلیدانیاں، بوغبند چلیں گے۔

مسٹر وقار: اچھا صبح ہی ان دونوں کو بلا کر مشورہ کر لینا کہ کیا کیا دینا چاہئے؟

مسز وقار: یہ آپ کو بتانا چاہئے۔ وہ بیچاریاں کیا جانیں؟

مسٹر وقار: اور میں بیچارا کیا جانوں؟ یہ کام تو بیگمات کے مشورے کے قابل ہیں۔

مسز وقار: آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرٹھ کی بیگمات سے اگر میں نے مشورہ لیا تو وہ دو سو جوڑا اور ایک سو بٹوا تیار کرنے کا حکم دے دیں گی۔ وہ آپ کو منظور ہوگا؟ ہم تو یہ شادی نئے طریقے پر بالکل سیدھی سادی شرعی طور سے کرنا چاہتے ہیں۔

مسٹر وقار: اچھا صبح کو مل کر سب کچھ سوچیں گے۔ بس اب سو جانا چاہئے۔

مسز وقار۔ دیکھئے۔ وہی ہوا ناں۔ آپ گھبرا گئے۔ اچھا اتنا اور کہہ دیجئے کہ اس کام کو اب تو نہیں ٹالیں گے؟ میں کوئی تاریخ مقرر کر کے ڈاکٹر صاحب کو لکھ دوں؟

مسز وقار: توبہ جی۔ بھلا اب ٹال سکتا ہوں۔ آپ کے خلاف رائے کوئی بات ہو سکتی ہے؟

میاں کے یہ الفاظ سُن کر مسز وقار احمد ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

مسٹر وقار: ہیں کہاں چلیں؟ کیا ابھی بہن بھانجی کو بُلواتی ہو؟

مسز وقار: نہیں تو اس وقت بلانا کیسا۔ آپ کو تو نیند نے بے ہوش کر رکھا ہے میں مسٹر خورشید زمان کو خط لکھنے لگی ہوں۔

مسٹر وقار: اوہ یہ بھی خط لکھنے کا وقت ہے۔ ایسی کیا جلدی ہے۔ صبح کو خط لکھ

دیتا اب سو جاؤ۔

مسز وقار: آپ کو تو ایک نیند ہی پڑی ہے۔ مجھے اور سو دھندے ہیں جس کے پندرہ خطوں کا ایک جواب نہیں گیا۔ اُس کو کتنا فکر نہ ہوگا اور اس خط کا جواب نہ پا کر پرسوں وہ خود آنے کو تیار ہو جائے گا۔ اس لئے اسی وقت لکھ کر ابھی اسٹیشن پر بھیج دوں گی۔

یہ کہہ کر مسز وقار احمد خط لکھنے کو میز پر جا بیٹھیں اور مسٹر وقار احمد سو گئے انہوں نے اس خط کے ساتھ رات ہی دو رُقعے نند اور بھانجی کے نام لکھ دیئے جس میں بہت تاکید کی کہ نہایت ضروری کام ہے۔ صبح اس قدر سویرے پہنچ جاؤ کہ چائے میرے ساتھ پی سکو۔

اس کام سے فراغت پا کر یہ بھی سو رہیں۔ ابھی رات کی سیاہی بخوبی موجود تھی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رات باقی تھی کہ اُن کے دروازوں کے شیشوں پر کسی نے زور سے ہاتھ مارے گو اس وقت مسز وقار احمد بہت گہری نیند سو رہی تھیں کیوں کہ قریب ایک بجے کے لیٹی تھیں مگر کھٹا کھٹ نے بہت جلد جگا دیا اور مسٹر وقار احمد بھی اُٹھ بیٹھے۔

مسٹر وقار: کون ہے؟ خیریت ہے؟ اس وقت کیوں ایسا شور مچایا؟

آواز: جناب آپ ہی نے بلایا ہے تو آئے ہیں۔

مسٹر وقار: کون ہے، کس نے بلایا ہے؟

مسز وقار: آپ کیا کر رہے ہیں؟ بیٹھے بیٹھے سوال کر رہے ہیں؟ اُٹھیے اور دروازہ کھول کر دیکھئے کون ہے۔

مسٹر وقار: نہ معلوم اس وقت کیوں آ کر شور مچایا؟

لکھ دیا جانثار۔ (پلنگ سے اُٹھ کر جھنجلاتے ہوئے) آپ یہیں سوچے جایئے کہ کون ہے۔ کیا ہے۔ اُٹھ کر نہ دیکھئے۔ شاید ڈر گئے۔ اچھا میں خود دیکھتی ہوں۔

مسٹر وقار: (بیوی کا ہاتھ پکڑ کر) نئیں نئیں آپ نہ جائیں مَیں خود پوچھے لیتا ہوں۔

چھنا چھن ٹوٹتے ہوئے شیشے نیچے گرے۔

مسٹر وقار: ارے بھئی کون ہے۔ میرے شیشے بھی توڑ دیئے۔ او کمندر ام چوکیدارو۔ کہاں مر گئے۔ دیکھو دروازے پر کون ہے؟

آواز۔ جناب چوکی داروں کا کوئی قصور نہیں۔ آپ ہی نے طلب کیا ہے تو اس وقت مصیبت بھرتے ہوئے حاضر ہوئے ہیں۔

مسٹر وقار: یا خدا یہ کون آفات ہیں؟

مسز وقار احمد نے جلدی سے اُٹھ کر کواڑ کھول دیے اور سب ہنسنے لگے۔

مسٹر وقار: تم سے خدا سمجھے۔ مجھے اس قدر تنگ کیا۔ یہاں خیریت تو ہے؟ اس وقت گھر سے کیوں چل پڑیں۔ تجمل کہاں ہیں؟

مسز ضیاء الحسن: (بھائی کی گود میں سر رکھ کر) بھائی جان سب خیریت ہے اور میرا کوئی قصور نہیں۔ اُنہیں سے پوچھیے۔ آدھی رات کو کیوں نکل پڑے۔

ضیاء الحسن: دیکھیے بھائی۔ یہ اُلٹا مجھ کو قصور وار بناتی ہیں۔ قصور تو سارا مسز وقار احمد صاحبہ کا ہے جن کا رقعہ رات کے ۱۲ بجے پہنچا۔ سوتوں نے اُٹھ کر پڑھا۔ لکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے صبح ہی پہنچو اور چائے میرے ساتھ پیو۔ بس تب سے اب تک یہ وقت ہم نے جاگ کر کاٹا اور صبح ہونے سے پہلے ہی چل پڑے۔ ہم نے سمجھا کہ اب چائے آپ بہت سویرے پینے لگی ہوں گی۔

مسٹر وقار: آپ بھی عجب آدمی ہیں۔ مذاق کرنے سے کسی وقت نہیں چوکتے اور یہ میرے قیمتی شیشے کیوں توڑ ڈالے؟

ضیاء الحسن: ہم تو آدھی رات کی اپنی نیند خراب کر کے آئے اور آپ کو جگا دیا، ارے کسی طرح آنکھیں نہ کھلتی تھیں۔ مجبوراً شیشے توڑنے پڑے۔

مسز وقار: یہ تو سب کچھ ہوا۔ مجھے تو ان پر تعجب ہوتا ہے کہ اُنہیں کیا ہو گیا تھا کہ بیٹھے بیٹھے آوازیں دیے گئے اور دروازے تک نہ گئے۔ شاید ڈر گئے۔

مسٹر وقار: نہیں ڈرا تو نہیں۔ اس وقت نیند میں مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ پلنگ سے اُٹھا نہ جاتا تھا۔ چوکی داروں پر غصہ آ رہا تھا اور یہی چاہتا تھا کہ میں نہ اُٹھوں اور چوکیدار آ پہنچیں۔ خیر اور تو کچھ نہیں۔ مجھے یہ بہت افسوس ہے کہ میری بہن کو تکلیف ہوئی۔

مسز وقار: ہَیں بھول گئے؟ یوں کہیے کہ دو سخت رنج ہیں۔ ایک تو بہن کو تکلیف پہنچی۔ دوسرا آپ کے قیمتی شیشے ٹوٹ گئے۔

اسی وقت مسز وقار نے چائے تیار کرنے کا حکم دے دیا اور اُسی کمرے میں سب نے چائے پی۔ اختر حسن، قمر اور نجم کو بھی یہیں بلوایا۔ اسی جگہ بیٹھے باتیں کرتے بہت دن چڑھ گیا۔ اختر کے لئے گاڑی بھیجی۔ قریب ۷ بجے کے وہ بھی آ پہنچی۔ مسٹر و مسز ضیاء الحسن کی آمد کا حال سنایا۔

مسٹر وقار: اچھا اب ہنسی مذاق تو ہو چکا اب وہ ہونا چاہئے جس مشورے کے لئے انہیں رات کو بلایا گیا تھا۔ مجھے پھر کچہری جانا ہے۔ بنی اختر کی رائے سننی چاہتا ہوں۔

اختر: (قمر النساء سے) باجی جان اس وقت باغیچے میں نشست کا سامان کرائیں وہاں بیٹھیں گے آخر کب تک پلنگ پر، آٹھ بجنے والے ہوں گے۔

قمر اختر کے ان فقروں کے مطلب کو سمجھ کر "بہت اچھا" کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

اختر: خالو جان کیسا مشورہ، کس بات میں میری ناچیز رائے درکار ہے؟

مسٹر وقار: بنی تمہاری خالہ چاہتی ہیں کہ تمہاری بہن قمر کی شادی اُنہیں دو ہفتوں کے اندر اندر کر دی جائے۔ اُس کے جہیز کے متعلق سوچنا ہے کہ کیا کیا دیا جائے۔ مَیں اس شادی میں فضول رسومات مروّجہ اُٹھا دینی چاہتا ہوں اور یہی شادی ہماری برادری کے لئے نظیر قائم ہو گی۔ اسی طرح جہیز میں بھی کمی کی جائے۔ سینکڑوں جوڑے کپڑے اور دیگر فضول چیزیں بالکل نہ ہوں۔

اختر: جناب پھوپی جان کی رائے کے آگے میری ناقص رائے کیا چیز ہے؟ اور اس وقت تو مشورے کی بھی کچھ ضرورت نہیں۔ خالہ جان سب کچھ تیار کر چکی ہیں۔

مسٹر وقار: مجھے اس کی کچھ خبر نہیں۔ وہ تو رات ہی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

مسز وقار: آپ کی طرح اگر میں بھی بے فکر رہتی تو اس وقت تک کچھ بھی نہ ہوتا جن کو مشورہ کرنے کے لئے آپ نے آج بلوایا ہے میں اُنہیں سے صلاح لے کر سب سامان کر چکی ہوں۔ اب آپ کو وقت پر معلوم ہو جائے گا کہ کیا ہوا۔ یہ اطمینان رکھیں زیادہ روپیہ خرچ نہیں کیا جس قدر آپ نے اس کے نام کا کیا ہوا تھا۔ اس سے آدھا صرف کیا ہے۔ چاہتے ہیں تو لسٹ دکھا دوں؟

مسٹر وقار: چلو فضول باتیں نہ کرو۔ میں باہر جاتا ہوں۔

اختر: خالہ جان آپ نے آگرہ خط لکھ دیا؟

مسز وقار: ہاں بیٹی میں نے رات ہی لکھ دیا اور تاریخ بھی مقرر کردی۔ آج سے نویں دن یعنی اتوار کو۔ اس خیال سے کہ اتوار کے دن میری اور اس کی یورپین سہیلیاں جو ہسپتال اور مشن و ریلوے اسٹیشن وغیرہ پر ملازم ہیں، وہ بھی شریک ہوسکیں گی۔ مجھے زیادہ یوں جلدی پڑی ہے کہ تمہارے سامنے ہوجائے۔

اختر: خالہ جان آپ نے یہ بھی لکھا کہ وہ کتنے آدمیوں کو ہمراہ لائیں؟

مسز وقار: میں نے لکھ دیا ہے کہ اس خیال سے بہت سے آدمی ساتھ لانے کی فکر میں مت پڑنا کہ ہماری برات سے ہم خوش ہوں گے۔ ہمیں ایسی فضول شیخی پسند نہیں۔ صرف اپنے رشتہ داروں اور چند عزیز دوستوں کو ساتھ لے آؤ تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اختر: بری کے جوڑوں کی بابت کیا لکھا؟ انہوں نے پوچھا تھا کہ کتنے تیار کراؤں؟

مسز وقار: میں نے لکھ دیا ہے کہ "صرف ایک جوڑا کافی ہوگا۔ اس نمونہ کا تیار کراؤ جیسا جوڑا بھیجا جاتا ہے۔" آج ہی درزی سے کہلا بھیجا ہے۔ وہ لڑکے کا ایک جوڑا نمونہ کے لئے پارسل کردے گا۔ نتھ کے لئے جو انہوں نے پوچھا تھا کہ کیا کروں؟ چند احباب کہتے ہیں کہ تمہیں تیار کرانی ہوگی۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ اس واہیات نشان بے عزتی و کنیزی کی ہمیں بالکل ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں ناک میں سوراخ کرانے کا بالکل دستور نہیں۔

مسز ضیاء الحسن: بھابی جان مہمانوں کو کس دن بلائیں گی اور تمام برادری کی بیگمات کو مدعو کریں گی یا صرف چند کو؟

مسز وقار: میری تو یہ رائے ہے کہ پہلے سے مہمانوں کو بالکل جمع نہ کیا جائے۔ یہی تو فضولیات ہیں جن سے بہت سا روپیہ برباد ہوجاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ لڑکی کی رخصت کے وقت برادری کیا بلکہ جہاں تک واقفیت ہے۔ سب عورات کو جمع کروں اور ان سب کے سامنے میری طرف سے اختر اور تم اپنی تقریروں میں رسومات قدیمہ کی برائیاں اور اس شادی کا حال بیان کردو۔ اس وقت صرف چائے سے اُن کی تواضع کی جائے۔ کھانے

کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسز ضیاء: بہت ٹھیک۔ ایسا ہی میرا خیال تھا مگر جانی بیگم اور لاڈلی کو دو دن پہلے بلا لینا چاہیئے۔

مسز وقار: ہاں اُن کو اُسی دن بلالوں گی جس دن تم آؤ گی۔

جس دن ان سب میں یہ مشورہ ہوا۔ اسی شام کو اختر و مسز ضیاء الحسن اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ ایسی جلدی اس گھر میں شادی ہونے والی ہے۔ کیوں کہ لڑکی کی ماں ہندوستانی جاہل ماؤں کی طرح نہ تھی جو مہینوں پہلے سے شور مچا دیتی ہیں کہ لڑکی یا لڑکے کا بیاہ ہے۔ ہر ایک اپنے پرانے نوکر اصیل یہاں تک کہ در و دیوار سے مشورہ کرتی ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ پھر تاریخ مقرر کرنا ایک کٹھن مہم ہوتی ہے جو کسی طرح سر نہیں ہوتی۔ اس کے بعد دولہا والوں کو خط لکھنا ایک مصیبت ہوتی ہے کہ کون لکھے۔

غریب تو الگ رہے۔ بڑے بڑے امیروں کے ہاں مہینوں آگے سے سامان شروع ہو جاتا ہے۔ مکان پر سفیدی کرانی، برتنوں پر قلعی ہونی، فرش بچھانے، لڑکی کے والدین کے لئے یہ سخت مصیبت ہے مگر یہ مصیبت آسانی سے حل ہو سکتی ہے۔ اس کا سہل علاج "تعلیمِ نسواں" ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسز وقار احمد کو یہ مشکلات پیش نہیں آئیں۔ اُنہوں نے سوائے اپنے اور بچوں کے حقیقی خیر خواہ مسٹر وقار احمد اور اپنی لڑکی کی تعلیم یافتہ سمجھدار ہم جولی اختر کے اور کسی سے اس باب میں مشورہ نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ روشن خیال بیگم جانتی تھیں کہ میرٹھ میں دو گھرانے خواستگار ہیں اگر کنبہ برادری سے مشورہ لیا تو یہ خبر ضرور ان تک پہنچ جائے گی اور وہ ہر طرح سے مخالفت کریں گے ہندوستانی جھوٹی رسمی شرم کی وجہ سے لڑکی کے والدین خود خط و کتابت نہیں کر سکتے جس سے بہت نقصان اُٹھاتے ہیں۔ دوسروں کے ہاتھ بات ہوتی ہے وہ جیسا بھی چاہیں کرتے ہیں۔ سمجھدار مسز وقار احمد نے تمام خط و کتابت اپنے داماد سے خود ہی کی۔ یہاں تک کہ میاں کو خبر بھی نہ ہوئی اور اُنہوں نے تاریخ عقد مقرر کر دی۔

اُن کا مکان ہمیشہ ہر وقت مثل آئینہ صف رہتا ہے۔ اس لئے اس خاص صفائی کی مصیبت و انتظام سے بھی بچیں جو شادی بیاہ کے موقعوں پر دیگر تمام شریف و امیر گھر والوں

پر عموماً پڑتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ بی بی نے اپنے شوہر کو کس قدر زحمت سے بچایا۔ مسز وقار احمد کے گھر یہ ہفتہ بھی چپ چاپ آرام سے گذر گیا۔ گانا باجا مایوں منڈھا وغیرہ تو ایک طرف رہا۔ یہاں مکان کی صفائی مہمانداری کا اہتمام بھی کسی کو نہ کرنا پڑا۔ چونکہ بہت سے مہمان بلانے نہ تھے۔ اس لئے ایسی اشیاء خوردنی کا انتظام بھی نہ کرنا پڑا۔ اتنا ہوا کہ جمعہ کے دن جب نوکر معمول مکان جھاڑ پونچھ چکے تو ہر ایک کمرے میں نجم نے احتیاطاً دوبارہ صفائی کرائی اور بہت سے گلدستے کوٹھی میں رکھے گئے۔ ڈرائنگ رُوم پھولوں سے دُلہن کی طرح سج گیا۔

ہفتہ کے دن صبح ہی بیگم صاحبہ رفیق احمد مع اختر، لاڈلی اور دو مغلانیوں اور ایک انا کے آ پہنچیں۔ مسز ضیاء الحسن بھی آ گئیں۔

بیگم صاحبہ نے آتے ہی مسز وقار کو بہت کچھ برا بھلا کہا کہ تم نے بڑی بی بُرا کیا۔ شہر کے دونوں پیغام پھیر دیئے۔ بچی شہر کی شہر میں رہتی اور خورشید کو منظور کرنے میں ایسی جلدی کی کہ اپنی عزت کا بھی خیال نہ کیا۔ وہ کہتا ہوگا بچی کو لئے بیٹھے ہوں گے۔ ایک دفعہ کے کہنے میں دھکیل دی۔ برسوں پیغام سلام ہوا کریں ہیں۔ مہینوں آدمی آدیں جاویں ہیں۔ یہ مثال مشہور ہے کہ ”اتنے پھیر کرے کہ جوتی اور کپڑے پھٹ جائیں تب ہم جواب دیں گے۔“

مسز وقار احمد نے ان سب باتوں کے جواب میں اتنا مسکرا کر کہہ دیا کہ ”سب درست ہے مگر اس کے والد کے خیالات اور اس کی قسمت میں ایسا ہی ہونا تھا۔“

ہفتے ہی کی شام کو ڈاکٹر خورشید زمان صاحب مع چند براتیوں کے (جن میں آگرہ میڈیکل کالج کے چار یوروپین پروفیسر اور دس اُن کے کلاس فیلو علی گڑھ گریجوایٹ اور دو پنشنر مسلمان جج جوان کے والد مرحوم کے بہت عزیز دوست تھے اور دو ہی پرانے منشی اور چار ملازم) میرٹھ پہنچنے والے تھے اُن کے استقبال کے لئے اختر حسن و تجمل حسن مع اپنے چند احباب اور ملازمین سے کئی فٹنیں لے کر اسٹیشن پر گئے۔ گو اس استقبالیہ کمیٹی کے ممبر سب لڑکے ہی تھے لیکن اس وقت اُنہوں نے اپنی لیاقت کا عمدہ ثبوت دیا۔ نہایت عزت و احتشام کے ساتھ ان معزز اعلیٰ عہدہ دار براتیوں کا استقبال کیا، چونکہ گاڑیوں کا پہلے ہی بندوبست کر رکھا تھا۔ گڑبڑ تو کیا کسی ملازم کو آواز دینے تک کی ضرورت نہ پڑی جس وقت یہ سب

گاڑیوں پر سوار ہونے لگے تو مسٹر خورشید ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اس پر ایک جج صاحب نے جن کو ڈاکٹر صاحب چچا کہتے تھے ان سے پوچھا:

جج صاحب: میاں خورشید کس فکر میں کھڑے ہو؟

خورشید: چچا جان مجھے کس کے ساتھ بیٹھنا چاہیے؟

جج صاحب نے مسٹر جوزف پروفیسر میڈیکل کالج اور مسٹر نظیر الاسلام بی اے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو جو دولہا کے نہایت عزیزی دوست تھے۔ ایک فٹن پر اُن کے دائیں بائیں بٹھایا۔ گو یہ تینوں اس وقت انگریزی لباس میں تھے مگر بہت اچھی طرح یہ پہچانا جا سکتا تھا کہ دولہا بیچ میں ہے کیوں کہ پروفیسر صاحب کے سر پر انگلش ہیٹ تھی اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ٹرکش کیپ اور ڈاکٹر صاحب کے سر پر نہایت بیش قیمت کابلی لنگی اور بادامی رنگ کا سوٹ زیب دے رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہی دولہا ہے۔ براتیوں کی گاڑیاں تو آہستہ آہستہ وقار منزل کو چلیں لیکن تجمل و اختر بھی فٹن کو بہت تیزی سے چلا کر اُن کے پہنچنے سے پہلے کوٹھی پر پہنچ گئے۔ کیوں کہ وقار منزل کے پھاٹک پر بھی اُنہیں کو استقبال کرنا تھا۔ آج وقار منزل گیٹ بھی ہنرمند مالیوں کی خوش سلیقگی سے سراسر پھولوں کا پھاٹک بن رہا تھا۔ یہاں سے ہال والے برآمدے کی سیڑھیوں تک سرخ قسم کا فرش بچھ رہا تھا۔ جوں ہی یہ معزز مختصر بارات وقار منزل کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ فوراً پھولوں کی ٹوکریاں اس پر نثار کر دی گئیں۔ اس دریا دلی سے پھول برسائے گئے کہ گویا وقار منزل میں پھولوں کی بارش ہو گئی۔

یہاں اُن کے استقبال کے لیے مسٹر رفیق احمد و مسٹر ضیاء الحسن صاحب بھی موجود تھے۔ آگے چل کر برآمدے کے زینہ پر مسٹر وقار احمد صاحب کھڑے تھے۔ یہ سب سے پہلے ان دونوں بزرگوار ججوں سے ملے اور رسم انٹروڈکشن اس طرح ادا ہوئی کہ اول تو اُن دونوں بزرگوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہمیں تو آپ نے پہچان لیا ہوگا کہ انہیں کو میاں خورشید نے چچا لکھا ہوگا۔ اب اُن کے احباب سے آپ کو تعارف کرانا ہے۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے پہلے نوشہ کا ہاتھ پکڑ کر پیش کیا۔ اور ہنس کر کہا۔ "یہ آپ کا نیا خادم ڈاکٹر خورشید ہے۔" اس کے بعد اَور۔ پھر یکے بعد دیگرے ایک ایک سے تعارف کراتے گئے۔ مسٹر وقار احمد نہایت خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے ہر ایک سے شیک ہینڈ

کرتے رہے۔ جب ان سب سے مل چکے تو پھر مسٹر ضیاء الحسن نے اپنے احباب (جو اس وقت یہاں موجود تھے) انہیں ملوایا اور سب ہال میں آ پہنچے۔

اب مسٹر ضیاء الحسن نے کھڑے ہو کر ایک چھوٹی سی تقریر میں پہلے سب مہمانوں کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور پھر کہا کہ "اس وقت ہمارا یہ مجمع عام طور پر جس رنگ میں ہونا چاہئے تھا۔ اس کے بالکل برعکس ہے۔ شادی کا گھر ہے لیکن باجے گاجے کی آواز تک نہیں۔ ایسے ہی بارات بالکل خاموش آئی ہے جس کے ساتھ نہ ناچ اور نہ آتشبازی اوّل تو آپ کی نظروں میں یہ بارات ہی معلوم نہ ہوتی ہوگی۔ کیوں کہ ہمارے معزز مہمان پارٹی کے ممبر صرف سولہ ہیں اگر اس وقت طرفین کی حیثیت پر خیال کیا جائے تو کم از کم ایک ہزار نہیں تو پانچ سو مہمان نوشہ کے ہمراہ ہونے چاہئیں تھے مگر چونکہ دُلہا اور دُلہن والے روشن خیال ہیں۔ فضول سمجھ کر ایسا نہیں کیا گیا۔"

بس اس قسم کی چند اور باتیں بیان کر کے جن میں فضول رسومات قدیمہ کی قباحتیں ونقصان جتائے گئے۔ مسٹر ضیاء الحسن نے اپنی تقریر کو ختم کیا اور بیٹھ گئے۔ پھر نوشہ کی طرف سے مسٹر نظیر الاسلام کھڑے ہوئے اور کہا:

"ہمارے کرم فرما جناب ڈپٹی صاحب ودیگر حاضرین! سب سے پہلے میں اپنے معزز دوست جناب ڈاکٹر خورشید زمان صاحب وتمام معزز ہمراہیوں ڈاکٹر موصوف کی طرف سے آپ سب کی نوازش وعنایات بے پایاں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر افسوس وہ الفاظ نہیں پاتا ہوں جن میں تمام احباب اور خصوصاً ڈاکٹر صاحب کی دلی شکرگزاری کی کیفیت بیان کرسکوں۔

میں ہمیشہ اپنے پیارے دوست ڈاکٹر خورشید سے کہا کرتا تھا کہ آپ اپنی شادی بالکل اسلامی طریق پر کرنا جس میں کوئی بیہودہ رسم نہ ہو۔ آج میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اپنے پیارے دوست کی بارات میں آیا ہوں بلکہ یوں کہوں کہ اُن کا شہبالہ (شہبالے پر سب بے اختیار ہنس پڑے) ہوں لیکن میری آنکھوں کے سامنے کیسا مہذب ودلکش سین کھینچا ہے جو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ میں بارات کے ساتھ شہبالہ بن کر آیا۔ لیکن ہمارے ساتھ نہ ناچ تھا، نہ آتشبازی، نوشہ بھی فٹن پر سوار تھے اگر یہ ہاتھی پر ہوتے تو آج

مجھے بھی اس کی سواری نصیب ہو جاتی مگر ان سب باتوں میں سے ایک بھی نہ ہوئی۔ معزز حاضرین! اس تمام شائستہ کارروائی کو آپ میرے دوست نوشہ ہی کی روشن خیالی کا نتیجہ نہ سمجھیں۔ یہ سب ہمارے فخر قوم قابل تقلید ہمارے لیڈر وریفارمر جناب ڈپٹی صاحب کی بیدار مغزی، قومی ہمدردی و اصلاح پسند طبیعت کا اثر ہے جس نے ہمیں بھی اس قدر متاثر کر دیا ہے۔

یہ پانچ سو روپے کی اشرفیاں ہیں جو میرے دوست نوشہ نے اس حساب سے مجھے دی ہیں کہ اگر میں ہندوستانی دستور کے موافق سب رسوم ادا کرتا تو کم از کم اس قدر خرچ ہوتا۔

قیمت آتش بازی سو روپیہ

ناچ پر دو سو روپیہ

مائیوں کے سامان پر سو روپیہ۔

دیگر چھوٹی چھوٹی رسومات کا مصارف سو روپیہ

یہ پانچ سو کی رقم جو ان فضول وتباہ کن اخراجات سے بچی۔ انہوں نے مجھے ان اخراجات ضروری کے لئے دے دی ہے۔

۱۔ سرسید میموریل فنڈ میں..................... یک صد روپیہ

۲۔ انجمن الفرض کو..................... یک صد روپیہ

۳۔ اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ..................... یک صد روپیہ

۴۔ محمڈن کانفرنس فنڈ میں..................... یک صد روپیہ

رسومات قبیحہ کے حامی بتائیں کہ اس رقم سے اتنے قومی کاموں میں مدد ہوئی یہ اچھا ہوا یا وہ اچھا ہوتا کہ سو روپے کو آگ لگا کر تماشہ دیکھا جاتا دو سو روپے اس ننگ قوم غیر مستحق فرقہ کو دے دیا جاتا جس کا نام لیتے بھی شرم آتی ہے۔ ایک سو روپیہ زرد جوڑے، چوکی، اوبٹنے پینڈیوں میں برباد کیا جاتا اور اسی طرح باقی کا سو بھی نائی ڈوم وغیرہ وغیرہ کو خواہ مخواہ دے دیا جاتا اُن رسومات کے حامی خواہ کہیں یا نہ کہیں ان کا دل وایمان بخوبی جانتا ہوگا کہ وہ اچھا کرتے ہیں یا ہم نے اچھا کیا۔

اب میں اپنے معزز میزبانوں کا دلی شکریہ ادا کر کے اپنی اس سمع خراشی کو ختم

کرتا ہوں۔"

اپنی تقریر ختم کر کے نظیر الاسلام صاحب تو بیٹھ گئے اور ڈاکٹر تجمل حسن صاحب نے ایک مجلد سفید ورقوں کی کاپی میز پر کھول دی اور ایک چھوٹی سی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ یہی رسومات ہیں جنہوں نے ہماری قوم کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ علاوہ نقصان مالی کے بعض رسومات ہمیں مشرک و ناشائستہ بناتی ہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو تباہ کرنا کوئی پسند نہ کرے گا۔ پس حاضرین جلسہ میں سے جن اصحاب کے دل متاثر ہوئے ہیں اور جنہوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر مستورات نے مان لیا تو ہم بھی اپنے گھر سے یہ بیہودہ رسومات اُٹھا دیں گے۔ میں اُن حضرات سے بہ ادب التجا کرتا ہوں کہ وہ اگر مستورات کی منظوری کی شرط دل سے ہٹا دیں اور ہمت مرداں مدد خدا کہہ کر خدا اس کا عہد کر لیں کہ اس قسم کی تقریبات میں کوئی رسم عمل میں نہ آنے پائے گی۔ وہ اس طرف تشریف لائیں اور اس کاپی پر دستخط کر دیں۔

یہ سُن کر پچیس تیس اصحاب نے فوراً دستخط کر دیئے البتہ جو اصحاب مستورات کی منظوری کے پابند تھے۔ وہ بیچارے نہ ہل سکے۔ اُسی وقت ڈرائینگ ہال سے گھنٹی کی آواز آئی اور اختر حسن نے گھڑی دیکھی۔ ۹ بج گئے تھے بس اس آواز نے ان سب میں ہل چل مچا دی۔ یکے بعد دیگرے سب ڈرائینگ ہال میں جا پہنچے۔ دو گھنٹے سے زیادہ عرصہ ڈرائینگ ہال میں لگا۔ اس کے بعد سب سو رہے۔ ۱۲ بجے کے قریب کوٹھی بالکل سنسان تھی اندر باہر سب سو رہے تھے۔

☆

دسواں باب

گر خوشی دل کو ہوئی ساتھ ہی اک غم آیا
عید آئی تو میں سمجھا کہ محرم آیا

آج صبح معمول سے پیشتر سب جاگ اُٹھے اور سب برات والوں نے مع نوشہ کے غسل کیا۔ نماز پڑھی اور ڈریس ہو چکے تو قاضی صاحب اپنا فرض ادا کرنے لگے۔ اس وقت نوشہ کے انگریز دوست تعجب کی نظروں سے مسکراتے ہوئے کبھی نوشہ اور کبھی قاضی صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ نکاح خوانی کے بعد پائیں باغ میں گئے۔ جہاں چائے کی میزیں لگی تھیں۔ اس وقت کی چائے بے انتہا پر تکلف تھی۔ طرح طرح کی مٹھائیاں۔ پنیر، میوے وغیرہ وغیرہ تو تھے ہی مگر سب سے زیادہ قابلِ قدر دلکش کیک تھے جو اس وقت کے لئے خاص طور پر بنوائے گئے تھے جو ابرک کی طرح چمکیلے اور مختلف رنگوں کے مصنوعی پھول پتوں سے سجائے گئے تھے۔ طلائی ورقوں سے اس قدر کام کیا تھا کہ بالکل سونے کے معلوم ہوتے تھے۔ کیکوں کی خوشنمائی دیکھ کر سب بہت ہی محظوظ ہوئے۔

نوشہ کے شہبالے مسٹر جوزف نے چھری اُٹھا کر سب سے بڑے شش منزلہ کیک پر رکھی اور آہستہ سے کہا کہ "مجھے تو یہ بہت پسند ہے۔ آپ اپنے ہاتھ سے کاٹ کر سب کو تقسیم کریں تو کیسا اچھا ہو۔"

اس قسم کی باتوں میں دو گھنٹے چائے پر لگا دیئے۔ اسی اثناء میں نوشہ کو اندر طلب کیا گیا۔ اس وقت یہ گھر میں اور ہی حیثیت سے جا رہے تھے۔ اُدھر مسز وقار احمد و مسز ضیاء الحسن اور چھوٹی نجم النساء و اختر النساء پہلی بار اُن کے سامنے آنے والی تھیں۔ یہ چاروں

برآمدوں پر کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ اُن کے پاس اَور مہمان بیگمات بھی تھیں جس وقت نوشہ کے آنے کی اطلاع ملی۔ جانی بیگم رفیق احمد، لاڈلی بیگم اور دیگر پردہ دار بیبیاں کمروں میں چلی گئیں۔ جوں ہی نوشہ نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ اختر اور نجم تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ اُنہوں نے بھی آتے ہی مسز وقار و مسز ضیاء الحسن کو مؤدبانہ سلام کیا اور کھڑے رہے۔

اختر: آپ نے پہچانا بھی؟ اختر کون ہے اور آپ کی بہن این این کون ہیں۔

نوشہ: آپ نے بتایا ہی نہیں تو میں کس طرح بتا دوں؟

مسز ضیاء: بھائی کو بٹھاؤ گی بھی یا کھڑا ہی رکھو گی؟

اختر: اچھا آپ بیٹھ جائیں تو بتاؤں گی۔

نوشہ: نہیں پہلے آپ بتائیں۔

نجم: واہ بہن آپ تو میرے بھائی جان کو تھکا دیں گی۔ آپ بھی اچھی تہذیب یافتہ ہیں۔ سب سے پہلے انٹروڈکشن کرانا تھا۔ اُنہیں آتے ہی حیران کر دیا۔ ہٹو میں خود بتائے دیتی ہوں۔ (اپنی والدہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ میری امّاں جان بیگم وقار احمد صاحبہ ہیں اور یہ میری پھوپی جان بیگم ضیاء الحسن صاحبہ ہیں، اب یہ کہنا فضول کہ یہ اختر رفیق احمد ہیں۔ کیوں کہ آپ سمجھ چکے ہیں کہ بیگم وقار احمد صاحب میری والدہ ہیں تو نجم میں ہی ہوئی اور پھر جو بچیں وہ اختر ہی ہوں گی۔

نجم کی اِن سیدھی سادی باتوں پر سب ہی کو ہنسی آئی اور نوشہ اپنی بہن کا شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت جو چھ سات رشتہ دار بیگمات موجود تھیں۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ پہلے مسز وقار اپنے داماد کو سلامی دے چکیں تو پھر ہم سب بھی دیں لیکن یہاں دونوں نند بھاوجوں میں سے ایک نے بھی کچھ نہ دیا تو آخر کار سب سے پہلے جانی بیگم رفیق احمد نے ملازمہ کے ہاتھ دو اشرفیاں سلامی بھیجیں۔ چھ سات اشرفیاں اندر سے اور آئیں تو مسز وقار احمدؔ نے کہا کہ یہ تکلیف آپ سب کیوں کر رہی ہیں جب میں نے پہلی دفعہ دیکھ کر کچھ نہیں دیا تو آپ پر کہاں لازم ہے؟

یہ کہہ کر مسز وقار احمد نے وہ سب واپس کر دیں تو اندر سے مسز وقار بیچاری پر اَن گنت صلواتیں پڑنی شروع ہو گئیں اور جانی بیگم نے تو بہت ہی اصرار سے کہا کہ ”تم نے

نہیں دیا تو نہ دو۔ آخر میں خلیا ساس ہوں میں ضرور دوں گی۔"

جب اس قدر اصرار سنے تو نوشہ تو تھے خورشید زمان، اتنی رقم ہاتھوں سے جاتی دیکھ کر اُن سے رہا نہ گیا۔ ساس سے انگریزی میں کہا۔

نوشہ: اگر وہ سب اسے دینے کے لئے اصرار کر رہی ہیں تو آپ کیوں انکار کرتی ہیں؟ ہمارے کالج کے کام آئے گا۔ آپ اس میز پر اپنے سامنے جمع کراتی جایئے۔ وظیفہ فنڈ میں بھیج دیا جائے گا۔

مسز وقار احمد اپنے لائق داماد کی یہ نیک خواہش معلوم کر کے بہت ہی خوش ہوئیں اور انگریزی میں ہی جواب دیا" کہ میں بہت خوش ہوں کہ تمہیں اس قدر اس کالج سے محبت ہے۔ میں نے تمہارا وہ حق جو مدت سے سلامی کے نام سے چلا آتا ہے دبایا نہیں تمہیں میں ضرور دوں گی اور تم علی گڑھ بھیج دینا مگر اس وقت صرف اس لئے نہیں دیا اور ان سب کا بھی نہیں لیا کہ یہ رسم بالکل اُٹھا دی جائے کیوں کہ اس سے بھی بہت نقصان ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سے عزیز و اقارب جو بالکل تنگدست ہوتے ہیں اور برادری میں شادی کی تقریب ہوتی ہے تو شریک ہوتے ہوئے سخت حیران ہوتے ہیں کہ سلامی اور رونمائی کے لئے کہاں سے لائیں گے۔ میں اپنی لڑکی کی شادی میں ایسی ایسی فضولیات کو ترک کر رہی ہوں تاکہ کنبہ برادری بلکہ شہر تک کے لئے نظیر قائم ہو جائے۔

لائق داماد نے روشن خیال ساس کی اس تقریر کا شکریہ ادا کیا۔ سلامی کرنے والیاں بگڑتی رہ گئیں۔ اُنہوں نے ایک نہ مانی۔

مسز وقار: دس تو بج گئے ہوں گے۔ کھانے کے بعد تمہارے دوست کیا کریں گے یا گھر پر خالی بیٹھے رہیں گے یا کہیں شہر میں جائیں گے؟

نوشہ: صبح کہتے تو تھے کہ کھانے کے بعد یہاں کی سیر کو نکلیں گے۔

اختر: بھائی آپ اس وقت کا ہمارے پاس آنا کیا یاد کریں گے؟ اپنے ہندوستانی دستور کے موافق ہم نے آپ کو نہ کچھ کھلایا نہ پلایا۔ خشک منہ بیٹھے ہیں۔ پان بھی کھا لیا کرتے ہیں یا نہیں؟

نوشہ: آپ سب کی مہربانیوں کا شکریہ نہ مجھ سے ادا ہو سکتا ہے اور نہ ہو سکے گا

اور کھلانے پلانے کی ایک ہی کی۔ ابھی چائے پی کے اور بہت کچھ کھا کر کے آیا ہوں۔ کیا یہ بھی کوئی رسم ہے کہ آج کے دن برابر کھاتا ہی رہوں۔

پان کا ذکر سنتے ہی لاڈلی بیگم نے جھٹ پٹ بہت سی مرچیں ڈال کر پان کا بیڑا بنا بھیجا اگرچہ ڈاکٹر صاحب کبھی پان نہ کھاتے تھے مگر آج شادی کے دن سالی کا بنا ہوا پان کھالینا ضروری سمجھا اور لیتے ہی منہ میں رکھ لیا مگر اس میں کس غضب کی مرچیں بھری تھیں کہ آدھے منٹ میں ڈاکٹر نوشہ کو پسینہ آگیا اور منہ سرخ ہو گیا۔ کرسی سے گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بالکل ان باتوں سے واقف نہ تھے اور اختر و نجم کو بھی اس وقت خیال نہ تھا کہ لاڈلی یہ کرے گی۔ یہ بھی اُن کی تکلیف سے گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ نجم جلدی سے پانی لاؤ بہتیری کوشش کی مگر سر چکرا گیا۔ کسی طرح مرچیں کم نہ ہوئیں۔ آخر وہ بہنوئی سے اجازت لے کر باہر چلے گئے۔

مسز وقار کو بہت ہی افسوس ہوا کہ ایسے تہذیب یافتہ جنٹلمین کے ساتھ ایسی بے تمیزی ہوئی جس سے نہ صرف اُن کو افسوس ہی ہوا بلکہ سخت تکلیف بھی ہوئی مگر کیا کہہ سکتی تھیں۔ یہ تو لاڈلی بیگم کا کام تھا۔

ایک بجے سے پہلے ہی سب اندر باہر کھانا کھا چکے۔ نجم و اختر نے بہن کو دلہن بنایا۔ اُن کی دو یوروپین سہیلیاں بھی شریک تھیں۔ سرخ مخمل کا جوڑا اسلمہ ستارے سے جگمگاتا ہوا جو آگرے سے تیار ہو کر آیا تھا۔ پہنایا گیا۔ سر پر سچے موتیوں کا ہار بالوں کے گرد لپیٹا گیا۔ کانوں میں زمرد کے آویزے پہنائے گئے مگر گلے میں ستلڑی اور گلو بند تھا اور بہت بڑا سہ لڑا مالا۔ ہاتھوں میں ایک ایک جڑاؤ چوڑی اور بلدار کڑے اور آٹھ انگوٹھیاں۔

قریب تین بجے کے جب دُلہن کو بالکل تیار کر چکیں تو مہمان بیبیاں آنی شروع ہو گئیں کیوں کہ اسی وقت بلاوا تھا۔ مسز وقار احمد نے رخصت کے وقت بلایا تھا اور صرف چائے کی دعوت۔ جگمگاتے ڈرائنگ روم میں سب مہمان بیبیاں جمع ہوئیں اور ایک ایک نے اس نئے طریقے کی شادی پر اعتراض کرنے شروع کر دیئے۔ مسز وقار احمد ہنس کر ٹالتی رہیں۔ کسی کا کچھ جواب نہ دیا جن جن کو بلاوا گیا تھا۔ وہ سب آ چکیں تو مسز ضیاء الحسن نے اپنی بھابی کی طرف سے یوں تقریر کی۔

میری معزز بہنو! میں اپنی بھابی جان کی طرف سے آپ سب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتی ہوں یہ تو معلوم ہی ہے کہ اس وقت آپ سب میری پیاری بھتیجی بنت وقار احمد کے رُخصت کرنے کو تشریف لائی ہیں، آپ سب کو تعجب ضرور ہوگا کہ ہمیں عین رخصت کے وقت کیوں بلایا گیا۔ ہمارا ہندوستانی دستور تو یہ ہے کہ شادی سے کچھ عرصہ پہلے یعنی مایوں والے دن مہمان بلائے جاتے ہیں لیکن یہاں کچھ عرصہ پہلے تو کیا صرف ایک رات کی بھی آپ کو تکلیف نہیں دی گئی۔ اس لئے کہ یہ رسومات بربادی بخش و تباہ کن ہیں اور اُنہیں جھوٹی شیخیوں نے ہمیں اس حالت کو پہنچایا کہ وہ بیوہ عورت جس کی آمدنی کا کوئی سہارا نہیں ہوتا اور لڑکی کی شادی کرتی ہے۔

تو یہی چاہتی ہے کہ تمام دنیا کی رسومات ختم کر دوں۔ کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے بٹنا، کنگھا، رتجگہ، منڈھا اور ساچق غرض کہ سب ہی فرض ادا ہوں پھر اس کے لئے خواہ زیور چھوڑ زمین بیچنی پڑے۔ خواہ گھر تک رہن ہو جائے اور غریبوں پر ہی کیا منحصر ہے بڑے بڑے امیروں اور نوابوں کے خزانے لٹ گئے۔ جائدادیں قرضے میں لگ گئیں جن کے دروازوں پر ہاتھی جھولتے تھے۔ وہ انہیں رسومات قبیحہ کی پابندیوں سے ٹکڑوں کو محتاج ہو گئے۔ میری سمجھ دار بہنوں۔ میرا مفصل بیان کرنا فضول ہے۔ آپ خدا کے فضل سے سب کچھ جانتی ہیں۔ اہل عقل کے نزدیک یہ کب درست ہو سکتا ہے کہ کسی امر کو مضر سمجھیں اور پھر اسی کو روا رکھیں؟ پس انہیں وجوہات پر ہم نے ضروری سمجھا کہ جس قدر ممکن ہو سکے۔ اس بربادیٔ قوم کی جڑ کو بالکل کاٹیں کیوں کہ یہ کام ہمارے ہی کرنے سے ہوگا۔ آپ میں سے، بہت سی بہنیں ایسی بھی ہوں گی جو ان رسومات کو اُٹھا دینا چاہتی ہوں گی مگر لوگوں کے برا بھلا کہنے کے خیال سے حوصلہ نہ پڑتا ہوگا۔ لیجئے ہم نے سبقت کر کے ایک نظیر قائم کر دی۔ اب آپ کو کسی قدر آسانی ہوگی۔

ہماری برادری میں یہ سب سے پہلی شرعی طریقے کی شادی ہے جس میں بالکل دھوم دھڑکا، باجا گاجا ناچ رنگ، تیل منڈھا اور مہمانوں کی چہل پہل کچھ نہیں ہوا۔ صرف سولہ آدمی باراتی ہیں۔ بفضلِ خدا نوشہ بھی معزز اعلیٰ عہدہ دار ہے اور میرے بھائی جان کی بھی حیثیت آپ کو معلوم ہے۔ زیادہ نہیں تو ان دونوں کی حیثیت کے موافق کم از کم پانچ سو آدمی تو نوشہ کے ساتھ آنے چاہئیں تھے اور اسی قدر مہمان یہاں جمع ہوتے مگر کچھ نہیں ہوا اور ایسا نہ کرنے سے

ہمیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا بلکہ دو فائدے ہوئے۔ ایک تو صرف کثیر کا بوجھ میرے بھائی کے سر پر نہ پڑا۔ دوسرے غیر شرعی رسومات پر عمل نہ کرنے سے گناہ سے بھی بچے۔ ابھی میرے بھائی کو دو لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانی ہے۔ پھر ولایت بھیجنے کا ارادہ ہے اگر بی قمر و نجم کی شادیوں پر بیس تیس ہزار روپیہ خرچ کر ڈالتے تو ان ضروری مصارف کے لئے روپیہ کہاں سے آتا؟

اتنا کچھ سُن کر غالباً آپ کو یہ خیال بھی ضرور ہوگا کہ خدا جانے کنیا بیچاری کو جہیز بھی دیا جائے گا یا نہیں۔ اس لئے مناسب سمجھتی ہوں کہ جہیز کا حال بھی کچھ سنا دوں۔

میرے بھائی جان نے اپنی دونوں لڑکیوں کے نام دس دس ہزار روپیہ جمع کر رکھا تھا اور اُن کی یہی رائے تھی کہ جس دن لڑکی کی شادی ہو۔ اُسے دس ہزار کی پاس بک بطور جہیز اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوگا اور چھوٹی نجم کو دس ہزار کی پاس بک دے دی جائے گی۔ چونکہ قمر کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی ہے جس کے والدین زندہ نہیں اور وہ خانگی معاملات میں بالکل ناتجربہ کار ہے اور زنانہ ضروریات کا سامان گھر میں موجود نہیں۔ خود بھی کرائے کے سامان سے گذارا کر رہا ہے۔ اس لئے بھابی جان نے اس خیال سے کہ اس کی ماں کے بجائے اب وہ خود اُن کی ماں بننے والی ہیں۔ تمام ضروریات کی چیزیں یہیں سے لڑکی کے ساتھ کر دینی مناسب جانیں۔ آپ جانتی ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے اور زمانہ گذشتہ اور حال کی ضروریات میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ پس لڑکی کے جہیز میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے، چونکہ یہاں کی بھی انگریزی طرز معاشرت ہے اور جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے وہ بھی انگریزی طریقہ سے بسر کر رہا ہے۔ اس لئے وہی سامان دینا چاہئے تھا جو ان کے کام آسکے۔ چنانچہ تین ہزار میں یہ سامان کر دیا ہے اور سات ہزار بنک میں جمع رہے گا جو اس کے ذاتی مصارف کے لئے کافی ہوگا۔ اس کی بھی تفصیل سنا دوں۔ ۲ ہزار کا تھوڑا سا زیور بنوا دیا ہے۔ ایک ہزار میں سامان رہائش، مثلاً پانچ دریاں، دو درجن پردے، ایک کھانے کی بڑی میز، ایک درجن کرسیاں، دو بڑی آرام کرسیاں دو کتابوں کی الماریاں، سنگھار میز، لکھنے کی میز، منہ دھونے کا سامان اور کھانا پکانے وغیرہ کے لئے کافی تعداد برتنوں کی۔ دو سیٹ چائے کے۔

اس کی شادی کے لئے سوا دو جوڑوں کے کوئی کپڑا خاص طور پر نہیں سلوایا گیا۔ نہ گرم کپڑے سلوائے جس قدر گھر میں پہننے کے تھے۔ وہ سب ساتھ کر دیئے جائیں گے۔

گائے، بھینس، پالکی، باندیاں وغیرہ میں سے کوئی چیز نہیں دی گئی۔

اب اس دعا پر میں اپنی اس لمبی تقریر کو ختم کرتی ہوں کہ اے پروردگار اس لڑکی کو جو آج دُنیا کی گاڑی میں جوتی جاتی ہے ہمہ وجوہ اس قابل کر کہ وہ اپنے دینی و دنیاوی فرائض کو کامیابی کے ساتھ انجام دے کر تیرے دربار میں سرخ روئی حاصل کرے۔ آمین۔" (حاضرین بیبیاں یک زبان ہو کر) آمین۔

اب چار بج چکے تھے۔ مسز ضیاء الحسن سب بیگمات کو دوسرے کمرے میں لائیں۔ جہاں چائے تیار تھی۔ ان سب نے چائے پی۔ پھر یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم لڑکی کو دیکھ کر جائیں گی۔

اختر باری باری سے دو دو بیبیوں کو دُلہن کے کمرے میں لے گئیں۔ وہ اس وقت ایک آرام کرسی پر سر جھکائے نہایت غمگین بیٹھی تھی۔ یہ وقت بھی عجب پُر اثر وقت ہوتا ہے۔ اپنے پیارے شفیق والدین کو چھوڑنے کا غم بہن بھائیوں کی جدائی کا خیال۔ در و دیوار سے رخصت جان نثار خدمتگاروں کی علیحدگی اور پھر ایک نئی دُنیا میں داخلہ جس کے ساتھ جانا وہ بالکل اجنبی پھر ایک نئے گھر کا بوجھ اُٹھانا جو سمجھ دار لڑکی کے لئے سلطنت کے بوجھ سے کم نہیں اور پھر دُلہن قمر النساء جیسی دُلہن ہزار ہا آئندہ تفکرات نے ابھی گھیر لیا تھا۔

ان سب بیگمات سے ملنے میں ایک گھنٹہ صرف ہوا اور پانچ بجے سب اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں اور دلہن کے کمرے میں اختر، انجم، لاڈلی اور چار انگریز لڑکیاں بیٹھی رہ گئیں جس کمرے میں اس کے جہیز کا سامان سجایا گیا تھا۔ وہاں اس وقت مسز وقار احمد کی چھ سات یوروپین اور ہندو سہیلیاں کھڑی اپنی طرف سے شادی کے تحفے میزوں پر رکھ رہی تھیں۔ مسٹر و مسز وقار احمد وہیں تھے۔ کسی نے ایک درجن چاندی کے کانٹے مخملی کیس میں رکھ دیئے۔ کسی نے چھریوں اور چمچوں کا بکس دیا۔ ایک ہندو لیڈی نے خوشنما بلوری گلدان دیئے۔

جب یہ سب رکھ چکیں تو لیڈی ڈاکٹر مس الگونڈر نے ایک قیمتی چرمی کیس کھول کر میز پر رکھ دیا جس کو دیکھتے ہی سب ہنس پڑے کہ ڈاکٹر صاحبہ نے تحفے میں بھی دوائیں ہی دیں۔ کیس کے خانوں میں درجنوں چھوٹی چھوٹی خوب صورت شیشیاں رکھی تھیں جن کو گھر میں ہر وقت موجود رکھنے کی ہر قسم کی ضروری ادویات تھیں۔

مسٹر وقار احمد نے بہت ہی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ سب سے زیادہ قیمتی و قابل قدر تحفہ میری معزز دوست ڈاکٹر مس الگزینڈر کا ہے جو میری لڑکی کی صحت کی محافظ ہے گو اس کا شوہر خود ڈاکٹر ہے۔ تاہم میں مس الیگزینڈر کی اس قدر محبت و دلی خیر خواہی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ پھر مسٹر وقار احمد قمر النساء کے کمرے میں گئے اور بیٹی کے پاس بیٹھ گئے اور اختر النساء نے سامان جہیز کی فہرست لکھی۔ اختر و تجمل پھوپی پھوپا سب مل لیے۔ ساڑھے چھ بجے ٹرین کا وقت تھا۔ سب سے رخصت ہو کر قمر النساء فٹن میں سوار ہوئی۔ نجم و اختر اور چاروں یورپین سہیلیاں اختر حسن و تجمل حسن اسٹیشن تک ساتھ گئے۔

بہن کو رُخصت کر کے چاروں بہن بھائی گھر آئے تو شام ہو چکی تھی۔ چوں کہ تجمل حسن ساتھ تھے۔ نجم گاڑی سے اُترتے ہی لاڈلی بیگم کے پاس کمرے میں چلی گئیں اور یہ تینوں باغ ہی میں بنچ پر بیٹھ گئے۔ چونکہ رات کی سیاہی پھیل چکی تھی اور لالٹین ان سے ذرا فاصلے پر تھی۔ اُن کے قریب روشنی بہت ہی کم پہنچ رہی تھی۔

اختر: بھائی یہاں تو اندھیرا ہے۔ چلو کمرے میں بیٹھیں۔

تجمل حسن: چلیے بسم اللہ۔

اختر حسن: میری طبیعت اس وقت بہت ہی پریشان ہو رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر یہیں تنہائی میں لیٹوں گا۔

اختر: اچھا تو ہم دونوں ابھی چلے جائیں؟

تجمل حسن: بہن اُن کے کہنے کا اس وقت برا نہ مانو۔ ابھی بچارے بہن کو رُخصت کر کے آئے ہیں۔ طبیعت بے چین ہو رہی ہے۔ اُن کا دل بہلانا چاہئے نہ کہ اِن سے بگڑ جانا۔

اختر: بہن کی رخصت کا کچھ صرف اُنہیں کو غم نہیں۔ خدا ہی جانتا ہے میرے دل کا کیا حال ہے اور مجھے تو یہ بھی رنج ہے کہ کل اسی وقت میں بھی رُخصت ہونے والی ہوں۔

تجمل حسن: ہیں ایسی جلدی اور اس بے خبری میں کہ کسی کو پتہ تک نہیں تم نے تو دل ہی ہولا دیا۔

اختر حسن: آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔

اختر: میرا مطلب یہ ہے کہ کل اس وقت اپنے گھر چلی جاؤں گی تو بھائی اگر گھر ہی جانا ہوتا تو کیا رنج تھا؟ میرے ایام تعطیل ختم ہو گئے ہیں۔ پرسوں اسکول کھل جائے گا۔ مجھے کل روانہ ہونا چاہئے۔ ابا جان کہہ گئے ہیں۔

اختر حسن: اوہو اس قدر جلدی! ہمیں تو ابھی خیال بھی نہ تھا تو یہاں سے کس وقت جانا ہے؟

اختر: ابھی کھانے کے بعد۔

تجمل حسن: اچھا تو میں اس وقت کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔ کپڑے بدل لوں۔ میرا انتظار کرنا ابھی آتا ہوں۔

اختر: آؤ کمرے میں چلیں۔ یہاں ٹھنڈ ہو گئی ہے۔

اختر حسن: نہیں مجھے اس وقت یہاں ہی رہنے دو۔ طبیعت بہت خراب ہے۔

اختر: آپ کیوں اس قدر رنج کرتے ہیں یہ تو خوشی کی بات ہے۔ بہن اپنے گھر گئیں ہیں۔ چند روز میں آ جائیں گی۔

اختر حسن: بہن کی جدائی کا تو رنج ہے ہی مگر زیادہ ایک اور بات کی فکر ہے۔ اور وہ سخت فکر ہے۔ اس پر تم نے اپنے جانے کی سنائی۔ بس اب میرے دل کو تفکرات نے گھیر لیا ہے۔ میں اس وقت کھانا نہ کھاؤں گا۔ تم اصرار نہ کرنا۔ تجمل بہت ستاتے ہیں۔

اختر: (رنجیدہ ہو کر) اس وقت تو آپ کو ضرور کھانا چاہئے کیوں کہ میرے ساتھ یہ آخری کھانا ہو گا۔

اختر حسن: تم افسوس نہ کرو اور خفا نہ ہو مجھے مجبور مجبور سمجھ کر معاف کرو۔ ایسا نہ کہو کہ یہ آخری کھانا ہے۔ خدا نے چاہا تو پھر کھائیں گے۔

اتنے میں تجمل حسن آ گئے اور یہ تینوں کھانے پر بلائے گئے۔ اختر حسن نے تو انکار کر دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تجمل حسن نے بھی کھانا نہ کھایا کیوں کہ میز پر جانی بیگم، لاڈلی بیگم اور نجم تھیں۔ اختر نے بھی یونہی سا کچھ کھایا۔ اس کے ساتھ ہی نجم اور لاڈلی بھی کھڑی ہو گئیں۔ ان تینوں کے بعد مسز وقار احمد نے اپنے بہنوئی وکیل صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ سے اختر حسن کی شادی کا ذکر چھیڑا۔ لمبی چوڑی خوشامدانہ تقریر کی ضرورت

نہ تھی اور معمولی الفاظ میں کہہ دیا کہ اب ایک سال بعد اختر و اختر حسن بھی تعلیم سے فارغ ہو کر آجائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ اُن کی منگنی کی رسم بھی تھوڑی سی ادا کر دی جائے۔

وکیل صاحب تو خاموشی سے سنتے رہے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اختر کی والدہ مرحومہ بچپن سے اس کو اختر حسن کی دُلہن کہا کرتی تھیں لیکن جانی بیگم ایک چیز تھیں۔فوراً یہ اعتراض کیا کہ "یہ بھی کوئی دستور ہے کہ اپنے گھر آئے ہوئے بہنوئی سے پیغام لے بیٹھیں؟ باقاعدہ پیغام دینا چاہیے تھا۔خود وہاں جا کر کہتیں۔نہیں تو نائن ہی کو بھیج دیتیں۔"

مسز وقار احمد نے کہا کہ مجھے کوئی سرے سے پیغام سلام نہیں کرنے تھے کہ اوّل رقعہ جاتا۔ پھر مشاطہ جاتی اور پھر مَیں خود جاتی۔ یہ باتیں نئی جگہ اور غیروں میں ہوا کرتی ہیں۔اختر کی منگنی تو دراصل آج سے تیرہ سال پیشتر ہی ہو چکی ہے۔جس دن یہ پیدا ہوئی تھی۔ اسی دن مَیں نے اپنی بہن سے اقرار کر لیا تھا۔ چونکہ ہم لوگ صغر سنی کی منگنی وشادی کے مخالف ہیں۔اس لئے کوئی رسم اُن کی زندگی میں نہ کی گئی۔خیال تھا کہ جب دونوں تعلیم سے فارغ کر دیئے جائیں گے تو دیکھا جائے گا۔سو اب بفضلِ خدا بہت جلد دونوں فارغ التحصیل ہونے والے ہیں۔آج ہم سب موجود ہیں۔اس لئے مَیں نے مناسب سمجھا کہ سامان وغیرہ کرنے کے لئے آپ کو اطلاع کر دوں۔

غرضیکہ مسز وقار احمد نے بہت ہی اچھی طرح سمجھایا لیکن بیگم صاحبہ کے غصے کی آگ بھڑکی ہی ہوگی اور کیوں نہ بھڑکتی؟ وہ تو خدا سے ایسا موقعہ چاہتی تھیں کہ کہیں یہ ذکر چھڑے اور میں ایک پر ایک کر کے الگ ہوں۔ کیوں کہ اُنہیں اُسی دن سے سخت رنج تھا جب سے لاڈلی کا پیغام انہوں نے منظور نہیں کیا تھا۔بیگم نے بھی قسم کھائی تھی کہ میری لاڈلی کو منظور نہیں کیا تو میں بھی اب اختر نہیں دوں گی۔

ہر چند مسٹر وقار احمد اور وکیل صاحب سمجھاتے تھے کہ اس قدر تیزی نہیں ہونا چاہیے مگر وہ ایک نہ سنتی تھیں۔غصہ سے کانپنے لگیں۔چہرہ سرخ ہو گیا اور یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں کہ آخر انہوں نے مجھے سمجھا کیا یہی جانا کہ سوتیلی ماں ہے۔اپنے گھر ہی ایک دو بول میں لڑکی دینے پر راضی کر لوں گی۔سو مجھ سے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ایسی ذلت و بے عزتی گوارا نہیں، میرے ہاتھوں تو اختر یہاں ہونے سے رہی۔مَیں وکیل صاحب کو کیا جانتی ہوں؟

اختر میری بچی ہے۔اپنی جان دے دوں گی اور اس بے عزت گھر بچی نہ دوں گی اوساز گار فوراً گاڑی دروازہ پر منگا۔اختر اور لاڈلی کہاں ہیں؟

ہیں نہ سلام نہ دُعا۔پائینچے سنبھالتی کمرے سے باہر آئی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا اور سوار ہو گئیں۔

اُن کے جاتے ہی وکیل صاحب کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ ''میں کیا کروں مجبور ہوں۔اب جو ہونا تھا سو ہو چکا۔بیگم خواہ اچھی ہیں خواہ بری، اب میری عزت ہیں۔میں اُن کی خلاف مرضی کچھ نہیں کر سکتا اور آپ جانتے ہیں کہ اولاد پر باپ سے زیادہ ماں کو اختیار ہوتا ہے۔خواہ وہ سوتیلی ہے مگر اب اختر کی ماں ہے۔وہ بات گئی مرحومہ کے ساتھ۔جہاں آپ نے مرحومہ کا صبر کیا ہے۔وہیں اختر کا بھی کر لیں اور اب اس خیال کو دل سے ہٹا دیں۔''

مسز اور مسٹر وقار احمد حیران رہ گئے کہ خیر جانی بیگم سے تو یہی اُمید تھی مگر رفیق احمد نے حد کر دی۔بالکل کوئی بات نہ سنی۔اُن کے رنجیدہ دلوں کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔دونوں بالکل حیرت و افسوس کے عالم میں رہ گئے۔

صبح کو یہ تمام قصہ نجم نے اپنے بھائی اختر حسن کو سنایا۔اختر آج ہی شام کو کان پور روانہ ہونے والی تھی مگر یہ حالات سن کر اختر حسن یا نجم کس طرح ملنے جا سکتے تھے؟ سب صبر کر کے رہ گئے۔اب رہ رہ کر اختر حسن کو اختر کا یہ کہنا یاد آتا تھا کہ ''کل اسی وقت میں بھی رُخصت ہو جاؤں گی۔'' آج وہ کہتا تھا کہ قمر رخصت نہیں ہوئی کیوں کہ اس سے پھر ملنے کی اُمید ہے۔در اصل رُخصت تو اختر ہوئی۔افسوس میں نے شام کو کھانا بھی اس کے ساتھ نہ کھایا۔وہ اس کو بھی آخری کہہ رہی تھیں۔

رات کے گیارہ بجے جانی بیگم گھر پہنچیں۔بہت کچھ میاں کے کان بھرے اور اُن سے اقرار کرا لیا کہ اختر کی شادی وہاں نہ کریں گے۔شام کی ریل میں رنجیدہ اور بدنصیب اختر اپنی زندہ خالہ اور مردہ ماں کی دائمی جدائی پر آنسو بہاتی رخصت ہوئی۔اختر کے لئے قمر النساء کی شادی عید تھی اور اس کے بعد اپنے لئے محرم۔

☆

گیارھواں باب

اب آرزوئے دل ہے کہ آنکھوں کو بچھاؤں
جس وقت جہاں پہ قدمِ رشکِ قمر ہو

خورشید لاج آگرہ

مسٹر اور مسز خورشید کے انتظار میں اُن کے بہت سے ہندو اور مسلمان دوست مع مسز نظیر الاسلام سپرنٹنڈنٹ پولیس اور چند یورپین لیڈیز کے اسٹیشن پر موجود تھے۔ انہوں نے نہایت گرمجوشی و تپاک سے دونوں کو لیا اور سیروں پھول نثار کیے۔

ڈاکٹر صاحب کو تو اُن کے دوستوں نے گھیر لیا اور مسز خورشید زمان کو لیڈیاں ویٹنگ روم میں لے گئیں۔ یہاں دُلہن کی رونمائی ہوئی کہ جونہی مسز جوزف اُنہیں لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں بہت جلد ہی مسز نظیر الاسلام نے اُن کا برقعہ اُتارا تو مسز جوزف نے کہا کہ "مسز نظیر پہلے منہ میں دیکھ لوں پھر آپ دیکھنا۔"

مسز نظیر نے کہا: "مَیں نے تو دیکھ بھی لیا۔"

پھر مسز نظیر ہی نے دیگر لیڈیز کا دُلہن سے تعارف کرایا اور کہا کہ "مجھے تو آپ نے جان لیا ہوگا کہ آپ کی دیورانی ہوں اور یہ مسز جوزف آپ کی جٹھانی۔" پھر باتھ رُوم میں لے جا کر منہ ہاتھ دُھلوایا۔ بال درست کیے۔ غرضیکہ دو تین گھنٹے تک اُن کی مشتاق لیڈیوں نے مسز خورشید کو نہ چھوڑا اور مسز نظیر الاسلام نے رات کے کھانے کی دعوت دی اور دوسرے دن کی

ایوننگ پارٹی منظور کرنے کو مسز جوزف نے کہا۔ اسی طرح دوسری لیڈیوں میں سے کسی نے چائے اور کسی نے کھانے پر اپنے اپنے گھر آنے کو کہا۔ ان سب کا شکریہ ادا کر کے مسز خورشید نے صرف اتنا کہا کہ "میں اس بات سے بہت خوش ہوئی کہ مجھ نوارد کی آپ سب کے دلوں میں اس قدر محبت ہے لیکن ابھی تو میں آئی ہوں اور یہیں رہنا ہے، اس قدر جلدی کیا ہے؟

مسز جوزف یہ سنتے ہی باہر گئیں اور بگڑ کر کہا کہ "مسز خورشید ہم سب کی دعوتیں منظور نہیں کرتیں"۔ مسٹر خورشید ہنسنے لگے اور جواب دیا کہ "یہ کیا وقت ہے دعوتیں منظور کرانے کا؟ ابھی تو وہ آئی ہیں۔ گھر تو پہنچنے دو اب دعوتیں ہی ہوتی رہیں گی۔"

یہ جواب سُن کر مسز جوزف اندر چلی آئیں اور کہہ دیا کہ جب تک مسز خورشید ہماری دعوتیں منظور نہ کرلیں۔ ہم اُنہیں گھر نہ پہنچنے دیں گے۔ غرضیکہ ڈاکٹر صاحب کو تنگ کر دیا اور مسز خورشید کو نہ چھوڑا جب تک کہ اپنے اپنے گھر آنے کا اقرار نہ کرا لیا۔ اس کے بعد وہ سب رُخصت ہوئے اور ڈاکٹر صاحب مع اپنی ہر دل عزیز دُلہن کے اپنے گھر آئے۔ وہ اپنے دل میں بہت ہی خوش تھے کہ ایسی لائق اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذب و مرغوب جہاں بیوی ملی ہے جس نے ان لیڈیوں کے دلوں کو اس قدر جلد تسخیر کر لیا کہ وہ دیکھتے ہی مثل پروانوں کے گرد ہو گئیں اور بے وقت و بے قاعدگی کا خیال نہ کر کے اسی وقت دعوتیں منظور کرانے بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دلہن کو نہایت مکلف کمرے میں بٹھایا۔

مسز خورشید زمان نہایت شرمیلی لڑکی تھیں اور اب والدین اور بہن بھائی کی جدائی کا رنج تھا۔ اس لئے بالکل خاموش تھیں۔ اُن کا دل بہلانے کے لئے مسٹر خورشید نے بہتیری باتیں کیں اور تمام وقت اُن کے پاس ہی گزارا جب سہ پہر کے چار بج چکے تو ڈاکٹر صاحب نے بیوی سے کہا:

مسٹر خورشید: آپ کو یاد بھی ہے۔ شام کو مسز نظیر کے ہاں کھانے پر جانا ہے؟ اُنہوں نے تو دستخط کرا لیا تھا تب آپ کو چھوڑا تھا۔ تکلیف تو ہوگی مگر اقرار کا پاس ہے۔

مسز خورشید: جب آپ اقرار کر چکے ہیں تو مجھے کیا عذر ہے؟

مسٹر خورشید: خدا آپ کو خوش رکھے۔ مجھے تو اُمید تھی۔ کچھ دنوں تو آپ کو بہت ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی کیوں کہ میرے دوست نظیر و مسٹر جوزف بہت ہی

بے تکلف ہیں۔ یہ اپنی خوشی کر گذرتے ہیں۔ خواہ اس میں دوسروں کو تکلیف ہو۔ ان دونوں کو بہت ارمان تھا کہ میری شادی ہو۔ خاص کر مسز نظیر و مسز جوزف تو بہت ہی دِق کیا کرتی تھیں کہ جلدی شادی کرو۔ یہ دونوں بڑی چنچل بلائیں ہیں۔ اوّل اوّل اُن کی باتیں آپ کو ناگوار گذریں گی یہی دیکھو سٹیشن پر دعوتوں کا قضیہ لے بیٹھیں اور اُن کی ریس میں اور سب بھی اقرار کرانے لگیں لیکن ہیں بہت محبت شعار۔ جب آپ اُن سے مانوس ہو جائیں گی تو اُن سے مل کر بہت ہی خوش ہوا کریں گی۔

مسز خورشید: میں تین چار گھنٹے ان سب کے ساتھ رہی ہوں جس قدر بھی غور کیا۔ اُن کے اخلاق و عادات کو بہت ہی قابلِ تعریف پایا۔ آپ کا خیال ہے کہ مجھے تکلیف ہو گی۔ بالکل نہیں۔ میری پرورش تنہائی میں نہیں ہوئی۔ میری ملاقات کا دائرہ بہت وسیع ہے جن دو کی نسبت آپ کا خیال ہے کہ مجھے دِق کریں گی۔ انہیں دونوں کو میں نے سب سے زیادہ پسند کیا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ان سب کا بے وقت و بے قاعدہ دعوت منظور کرانے پر اصرار کرنا مجھے ناگوار گذرا ہو گا ذرا نہیں۔ میں اس خیال سے بہت خوش ہوئی کہ سب کچھ آپ کی ملنساری و خوش خلقی کا نتیجہ ہے ورنہ مجھ نووارد کو کوئی کیا جانے؟

مسٹر خورشید: مَیں نہیں بیان کر سکتا کہ آپ کے یہ خیالات معلوم کر کے "کس قدر خوشی ہوئی اور آپ جو کہتی ہیں کہ یہ میری خوش خلقی کا نتیجہ ہے ورنہ آپ کو کوئی کیا جانے۔ یہ بالکل ٹھیک نہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ مَیں ان لوگوں سے کس طرح ملتا ہوں۔ سوائے کسی خاص دعوت یا پارٹی کے آئے دن کے کھانوں میں اُن کی خواہش کے مطابق مَیں کبھی شریک نہیں ہو سکتا۔ کلب میں نہیں جاتا۔ اس وجہ سے وہ بھی مجھ سے خوش نہیں رہتیں۔ یہ صرف آپ کی قابلیت و حسنِ اخلاق ہی کی کشش تھی کہ باوجود ان باتوں کے وہ میری بیوی کی قدر و منزلت میں وہاں پر پہنچیں۔

مسز خورشید: یہ آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ میں اس قابل کہاں؟

مسٹر خورشید: اچھا چلو۔ اب منہ دھو کر زیور کپڑا درست کر لو۔ پھر چلنا چاہئے۔ شاید مسز نظیر خود ہی لینے آ جائیں۔

مسز خورشید شرماتی ہوئی اُٹھیں اور ساتھ والے ڈریسنگ رُوم میں چلیں۔

مسز خورشید: ۔

اب آرزوئے دل ہے کہ ہم آنکھوں کو بچھائیں
جس وقت جہاں پر قدمِ رشکِ قمر ہو

آدھے گھنٹے بعد مسز خورشید زمان تیار ہو کر آئیں۔ اس وقت وہ فیروزی رنگ کا ستاروں بھرا اٹر کی وضع کا ایوننگ گون پہنے ہوئے تھیں اور گلابی کریب کا سلمہ کا کام کیا ہوا دوپٹہ بروچ سے اٹکا کر اوڑھا ہوا تھا۔ آہستہ قدم رکھتی نیچی آنکھیں کئے کرسی پر آ بیٹھیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

کیا حور پری آئیں مقابل میں تمہارے؟
تم غیرتِ خورشید ہو تم رشکِ قمر ہو
اِک مدت دیرینہ سے اندھیرا پڑا تھا
حسرت تھی کہ تم آؤ تو روشن میرا گھر ہو

مسز خورشید: (چیں بجبیں ہو کر) آپ تو شعر و سخن لے بیٹھے اور مجھے تاکید تھی کہ جلدی تیار ہو۔ آپ نے ابھی منہ بھی نہیں دھویا۔

بارہواں باب

صد حیف نہ کچھ رحم کیا حال پہ میرے
غیروں کی خوشی پر مجھے برباد کیا ہے

آغازِ مصیبت

اختر النساء کو قمر کی شادی کے بعد کانپور گئے ایک مہینہ ہو گیا۔ اس عرصے میں مسز و مسٹر وقار احمد نے بہت ہی کوشش کی کہ کسی طرح جانی بیگم اور اُن کے تابعدار شوہر کو راضی کرلیں۔ کئی بار یہ دونوں اُن کے گھر گئے۔ اپنی عزت کا بالکل خیال نہ کر کے بے حد اُن کی منت خوشامد کی۔ مسز وقار احمد بچاروں نے تو یہاں تک کیا کہ اپنے بہنوئی کے آگے ہاتھ جوڑ کے رو رو کر کہا "للہ مجھ پر رحم کرو اور ہم دونوں سے خوش ہو جاؤ اور میری بے ماں کی نصیب والی بچی اختر کو مجھ سے علیحدہ نہ کرو۔"

چونکہ وکیل صاحب دراصل نیک خصلت اور رقیق القلب تھے۔ سالی کے ساتھ خود بھی رونے لگے لیکن بیوی کے ڈر سے مجبوراً صاف کہہ دیا کہ پیاری بہن مجھے خود رنج ہے کہ تمہاری مردہ بہن کی بچی کو میں تم سے جدا کرتا ہوں، پر کیا کروں اور پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بیگم کے خلاف میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اپنی بہن کی طرح تم اختر کی جدائی پر بھی صبر کرلو۔ ویسے ہم دونوں میں اور میری بیوی بالکل خوش ہیں۔ راہ و رسم میل ملاقات بدستور قائم رکھ سکتے ہیں۔

یہ آخری جواب سن کر مسٹر و مسز وقار احمد نہایت رنجیدہ ہو کر ہمیشہ کے لئے وہاں سے چلے آئے۔ اس دن کے بعد انہوں نے بالکل راہ رسم ترک کر دی۔ کئی دن مسز وقار احمد غمگین روتی رہیں اور اسی قدر رنج نجم و اختر حسین کو بھی ہوا۔ ان دونوں نے کئی وقت کھانا بھی نہ کھایا۔

اب اُدھر کی سُنیں۔ جانی بیگم بہت خوش تھیں کہ میری کوششیں کامیاب ہوئی جس دن مسز وقار احمد وہ سخت و مایوسانہ جواب پا کر ہاں سے رُخصت ہوئیں۔ اُس کے دوسرے دن صبح کے وقت جب کہ جانی بیگم وکیل صاحب کے ساتھ پائیں باغ میں معروف گلگشت تھیں۔ اثناء گفتگو میں میاں سے کہا۔

بیگم: دیکھو جی تم ہمیں ٹھیک نہیں بتاتے ہو کہ اختر کے باب میں کیا جواب دیا جائے۔ ان لوگوں کے ضروری حالات و حیثیت آپ مجھ سے اور بی مغلانی سے اچھی طرح سن چکے ہیں۔ مالی حیثیت میں وہ ہمارے برابر بلکہ ہم سے زیادہ ہیں۔ لڑکا ابھی کم عمر ہے۔ اس لئے زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ اس کی عادات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ بہت ہی بھولا بھالا شرمیلا اور خوب صورت ہے۔ آخر تمہیں اب لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے۔ نو دس مہینے میں وہ پڑھائی ختم کر کے آجائے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس عرصے میں اختر کی منگنی کر دی جائے اور پھر آتے ہی شادی ہو جائے۔

میاں: جب تم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے؟ میں بہت دولت کو بھی پسند نہیں کرتا۔ ہاں خاندانی عزت ہونی چاہیے سو اس کا تم یقین دلاتی ہو۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں۔ اس کا ذرا خیال ہے بہر حال مجھے تمہاری خوشی منظور ہے۔ تم کہتی ہو وہ اسٹیشن ماسٹر ہے اگر یہ ہے تو اچھا ہے گو بوجہ کم علمی کوئی معزز عہدہ نہ پا سکے گا مگر اتنا تو ہے کہ خود ملازم ہے۔ لڑکی اس کے والدین کی دست نگر نہ رہے گی مگر شادی سے ایک بار پہلے اس کو دیکھنا ضروری ہے۔ ہمیں اب تک یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس رنگ روپ کا ہے؟ گو مردوں کے لئے بہت خوب صورت ہونا ضروری نہیں تاہم وجاہت بھی بڑی بات ہے۔

بیگم: شکر ہے تمہیں پسند آ گیا۔ اطمینان رکھو۔ لڑکا بہت خوب صورت ہے۔ میں اُسے بہت جلد بلا کر دکھا دوں گی۔ جب اُسے میرے کہنے کے مطابق خوب صورت

پاؤ گے تو میری اور سب باتوں کا بھی یقین آ جائے گا۔ میں تو اپنی لاڈلی کو اس کے ساتھ بیاہ دیتی مگر اس خیال سے کہ وہ بے حد انگریزیت پسند ہے۔ بالکل تمہاری طرح کوٹ پتلون انگریزی ٹوپی پہنتا ہے۔ مناسب جانا کہ اختر النساء کے لیے منظور کروں۔ کیوں کہ وہ بھی انگریزی لباس پہنتی ہے۔ دونوں کی خوب گذرے گی۔

اس گفتگو کے بعد تیسرے ہی دن وہ خوب صورت نوجوان وکیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بیگم صاحبہ کا کہنا بہت درست نکلا۔ نوعمر شکیل لڑکا کوٹ پتلون اور ہیٹ پہنے آیا۔ بیگم صاحبہ تو بہت خوش ہوئیں کہ اس نقلی دھج میں دیکھ کر وکیل صاحب بہت پسند کریں گے لیکن اس موقعہ پر یہ انگریزی ٹوپی وکیل صاحب کو بہت بری اور سخت نا مناسب معلوم ہوئی اور دل میں افسوس کیا کہ کم علمی کی وجہ ہے کہ اس وقت لڑکا ہیٹ لگا کر آیا ہے مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔ اس کی خوب صورتی سے تو بہت خوش ہوئے مگر دوسری باتوں کی تعریف میں بیوی کی ہی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ پر دل میں خوش نہ تھے کیوں کہ ایک جاہل اور عالم بلکہ کم علم اور عالم کے طریق گفتگو و آداب ملاقات وغیرہ میں بے انتہا فرق ہوتا ہے۔ خواہ اپنے آپ کو کوئی کتنا ہی بنانا چاہے مگر نہیں بن سکتا۔ پس اسی باعث وکیل صاحب کو اپنا داماد بننے والا خوشرو لڑکا پسند نہ آیا۔ وہ اپنی اخلاقی حالت جتانے کے لیے بے انتہا شرمیلا پن ظاہر کرتا تھا۔ وکیل صاحب کی باتوں کا جواب دیتے وقت زمین کی طرف آنکھیں جھکائے ہوئے گردن نیچی کر لیتا تھا اور سر پر ہیٹ بدستور رکھی تھی۔ وہ اپنی خوبی سمجھ کر ایسا کر رہا تھا اور وکیل صاحب کو یہ بے ادبی و بیہودہ پن سخت ناگوار گزر رہا تھا کہ تم تو اس قدر کہ دوہرے ہوئے جاتے ہیں مگر ایک معزز بزرگ کے آگے سر پر ہیٹ ٹنگی ہے۔

دوسرا یہ اوچھا پن کہ ایک دن کے لیے آئے ہیں اور ٹرنک کپڑوں کا ساتھ ہے اور دن میں کئی بار لباس تبدیل کیا گیا۔ انہوں نے یہ بھی اس غرض سے کیا تھا کہ میں وکیل صاحب کی نظروں میں امیر اور فیشن ایبل معلوم ہوں مگر اس کے برعکس ہوا۔ وکیل صاحب نے اسے انگریزی طریق سے محض ناواقف اور اوجھا سمجھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ڈریسنگ روم میں گھس کر دو گھنٹے تک نہ نکلے۔ شیشہ، کنگھی، نکٹائی کے باندھنے میں بے انتہا وقت لگایا۔ صرف اس زمانہ سنگھار ہو گیا۔ لیڈیاں بھی ایک گھنٹے میں تیار ہو جاتی ہیں۔"

بیگم صاحبہ بہت خوش ہو ہو کر وکیل صاحب کو سنا رہی تھیں کہ دیکھو لڑکا بالکل انگریز ہے۔ اس کی سب باتیں انگریزی ہیں۔

غرض کہ ایک دن میں اپنی اس قدر خوبیوں کے نقش شکیل دولہا وکیل صاحب کے دل پر کر گئے۔ وہ کچھ بھی کرتے منظور تو ہونا ہی تھا۔ اسی دن تاریخ مقرر کر دی گئی کہ فلاں دن منگنی کی رسم ادا کرنے کو دولہا کی ماں بہن وغیرہ سامان کے ساتھ یہاں آئیں اور ساتھ ہی بیگم صاحبہ نے وکیل صاحب کو مجبور کر کے کان پور بھیجا کہ ایک دن کی رُخصت دلوا کر رسم کے لئے لڑکی کو گھر لے آئیں۔

صبح کے وقت اختر میرٹھ پہنچ گئی۔ حیران تھی کہ یا خدا کیا سبب ابھی دو مہینے بھی اسکول گئے نہیں ہوئے۔ ایسی جلدی کیوں بلایا گیا۔ ابا تو کچھ بتا ہی نہ سکتے تھے کہ کیوں لے چلا ہوں۔ ہاں انجم کی اختر سے خط و کتابت تھی اور ان سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ اختر کی منگنی ہونے والی ہے مگر اس خیال سے اس کو اطلاع نہ دی تھی کہ وہ اچانک یہ خبر سن کر سخت پریشان ہو گی کہ کہاں اور کس سے نسبت ہونے لگی ہے اور اس پریشانی سے اس کی تعلیم میں ہرج ہو گا۔

انجم نے تو اطلاع نہ دی لیکن گھر پہنچتے ہی لاڈلی بیگم نے مبارک باد کہی اور یہ خبر سنادی۔ بس وہ اسی وقت سے سکتہ کے عالم میں خاموش رہ گئی۔ یک دم سردی لگ کر بخار ہو گیا۔ جانی بیگم اور نثار ہونے لگی کہ بچی کو کیا ہو گیا۔ ابھی تو آئی ہے، وکیل صاحب بھی فکر مند ہو گئے کہ وہاں سے تو اچھی خاصی آئی۔ یہاں آتے ہی کیا ہو گیا؟

اختر کہتی تھی کہ میں اچھی ہوں۔ یوں ہی سفر کی تکلیف سے طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ لاڈلی بیگم تو اختر کے پاس بیٹھی باتیں بناتی رہیں اور بیگم صاحبہ سمدھنوں کی آمد کا انتظار کرنے لگیں۔ بارہ بجے دن کی ٹرین میں بڑے ساز و سامان کے ساتھ سمدھنیں پہنچیں، کچھ ڈومنیاں پہلے ہی یہاں گا بجا رہی تھیں۔ کچھ اُن کے ساتھ ناچتی گاتی اُتریں جوں ہی وہ سب گاڑی سے اُتر کر دروازے پر پہنچیں۔ بیگم صاحبہ کی کئی چھوکریاں کھڑی ہو گئیں۔ ایک تو دودھ کا شربت سمدھنوں کے آگے آگے لوٹوں کی دھار کے ساتھ گراتی چلیں اور دوسری لڑکیاں اور بی امانی وقیہ پھولوں کی چھڑیاں اُنہیں مارنے لگیں۔ بیگم صاحبہ اس وقت شہ نشین میں بیگمات کے درمیان مسند نشین تھیں۔

سمدھنیں دو تھیں۔ایک دولہا کی ماں، دوسری دُولہا کی چچی۔اُن کے بیٹھتے ہی شربت پلایا گیا۔سب سے پہلے دولہا کی ماں کو دیا پھر چچی کو۔ان دونوں نے پانچ پانچ روپے شربت کے کٹورے میں ڈالے۔پھر پان کی گلوریاں تقسیم ہوئیں اور گوٹے اور پھولوں کے گوندھے ہوئے ہار سب کو پہنائے گئے۔

ان رسومات کے بعد سب نے کھانا کھایا۔لاڈلی نے منگنی کا وہ جوڑا جو اسی وقت سمدھنوں کے ساتھ آیا۔بے بس بے زبان بدنصیب اختر کو پہنا کر دُلہن بنایا۔کھانے کے بعد وہ سب اس طرف آئیں۔دُولہا کی چچی نے دُلہن کو سہرا باندھا۔منہ میں پان کا بیڑا دیا۔گود بھری اور منہ دیکھنے کو کہا۔

اختر کا دل ہی نہیں، جسم بھی اس وقت لرز رہا تھا۔وہ اپنی ماں کی یاد اور اپنی بے کسی کا خیال کر کے بیہوش ہوئی پیچھے کو گری جاتی تھی مگر گر بھی نہ سکتی تھی۔لاڈلی اور بی امانی وغیرہ اس کو گودی میں دبوچے بیٹھی تھیں۔جب انہوں نے منہ دیکھنا چاہا تو بی امانی نے آہستہ سے گھونگھٹ اُٹھا دیا۔ہندوستانی دُلہنوں کا قاعدہ ہے کہ جس وقت منہ دیکھا جائے۔وہ شرم سے آنکھیں بند کر لیتی ہیں مگر آہ اختر غریب کی آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں۔وہ اپنی حالت پر جس قدر رویا جا سکا، صبح ہی رو چکی تھی۔اب بالکل مثلِ تصویر ساکت تھی۔چہرہ زرد تھا۔

ان دونوں نے منہ دیکھا۔اور سونے کے کنگن اور آرسی پہنا دی۔پھر ان کے ساتھ والیوں نے دُلہن کو دیکھا اور بلائیں لیں۔پھر سب اُس کمرے سے چلی گئیں۔بی امانی نے رحم کیا اور اختر کو جلدی لٹا دیا۔

چار بجے سمدھنیں رُخصت ہو گئیں تو وکیل صاحب بیٹی کے پاس آئے۔بہت دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور یہ بھی کہا کہ " میں تمہاری ہیڈ مسٹرس کو تار دیتا ہوں کہ لڑکی کی طبیعت اچھی نہیں۔چار دن کی اور اجازت دو۔" مگر اختر نے نہ مانا اور کہا کہ " میں بالکل اچھی ہوں۔یوں ہی کسی کسی وقت ضعف ہو جاتا ہے۔یہ معمولی بات ہے۔اسکول کھلے ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے۔میری تعلیم کا سخت ہرج ہوگا۔ضرور آج ہی رات کو جاؤں گی۔" آخر انہوں نے بھی کہا: " اچھا تمہاری مرضی"۔پھر تمام دن کی جھوٹی رپورٹ سننے کے لئے اپنی بیگم کے پاس چلے گئے۔اس وقت کوئی بھی اس کے کمرے میں نہ تھا۔اختر بالکل تنہا

تھی۔فرش سے اُٹھی پہلے وہ کپڑے اور زیور علیحدہ کیا۔پھر پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی یا اللہ آج یہ کیا ہو گیا؟ گو مجھے اپنی بد نصیبی تو پہلے ہی سے معلوم تھی جس دن میری اماں جان۔آہ پیاری اماں جان مجھ سے جدا ہوئیں اُسی دن سے میں خوش نہ رہی۔پھر بیگم صاحبہ آئیں۔ مجھ پر بڑی مصیبت پڑی۔لاڈلی آئی تو جان اَور بھی عذاب میں ہو گئی۔پھر میں اپنی پیاری خالہ جان اور پیارے بہن بھائی سے جدا کی گئی۔یہ صدمہ میرے لئے کچھ کم نہ تھا۔آہ اب یہ اچانک گولہ کہاں سے آپڑا!!! افسوس مجھے اتنا بھی معلوم نہیں کہ میں آج سے جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔وہ لوگ کون ہیں۔کہاں کے ہیں؟ کیسے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہو گی اس کی عادات، مزاج، اخلاق، تعلیم، عمر، خیالات، نام تک بھی تو مجھے معلوم نہیں۔ مجھے بیگم پر کچھ افسوس نہیں۔وہ سوتیلی ماں ہے۔میرے ساتھ جو کچھ بھی کرے بجا ہے۔ ہائے افسوس تو پیارے ابا جان پر ہے انہوں نے مجھ پر ذرا رحم نہ کیا اور غیروں کی خوشی پر مجھے قربان کر دیا۔

غرض ان خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ رات کے ۱۱ بجے اور وکیل صاحب نے آکر اُٹھایا اور اسٹیشن پر لے گئے۔

تیرہواں باب

شادی بربادی

وہ بھی ہوں گے کہ جو اس دہر میں شاداں ہوں گے
ایک میں ہوں کہ میری شادی بھی بربادی ہے

جب اختر کی منگنی کو دس مہینے گزر چکے اور وہ تعلیم سے فارغ ہو کر میرٹھ آ گئی تو فوراً ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جہیز وغیرہ تو جانی بیگم نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ اُنہوں نے وکیل صاحب سے سامان شادی کے لئے دس ہزار روپیہ نقد لے لیا تھا۔ اس حساب سے کہ پانچ ہزار میں سچے جواہرات اور سونا خریدا جائے گا۔ دو ہزار ریشم اور اس کے مصالح پر خرچ ہوگا۔ ایک ہزار میں تانبے چاندی کے برتن خریدے جائیں گے۔ باقی دو ہزار کھانے وغیرہ پر صرف ہوگا۔ یہ حساب سن کر وکیل صاحب نے بے سوچے سمجھے فوراً دس ہزار کی اشرفیاں حوالے کر دیں۔ اب کیا تھا؟ خوب دھوم دھام سے سامان کیا گیا۔ وکیل صاحب اسی خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے کہ سوتیلی ماں ہو کر کس فیاض دلی سے اور خوشی سے بیٹی کی شادی پر خرچ کر رہی ہے۔

اختر کو میرٹھ پہنچے ساتواں دن تھا کہ وہ غریب مایوں بٹھا دی گئی۔ چونکہ سسرال میرٹھ سے دور تھا۔ اس لئے دولہا کی والدہ وغیرہ مایوں کے سامان کے ساتھ نہ آسکیں۔ نائن

ڈومنیوں کے ساتھ کل سامان بھیج دیا۔ اسٹیشن سے گھر تک مایوں کا سامان باجے کے ساتھ پہنچا۔ یہاں پہلے سے طوفان بے تمیزی بپا تھا۔ تقریباً سو مہمان بیبیوں سے گھر بھر رہا تھا اور ڈھول پر ڈھول ٹرٹ رہا تھا۔ شام کے پانچ بجے مایوں کی رسم اس طرح ادا ہوئی کہ اختر کے کمرے کا تھوڑی جگہ سے فرش ہٹا کر چوکی بچھائی گئی۔ اس کے گرد ڈوئی کی ڈنڈی سے ناپ ناپ کر خشک آٹا چھڑک کر حلقہ بنایا گیا۔ پھر بے چاری کو بی امانی نے گود میں لا کر چوکی پر بٹھا دیا۔ وہ اس وقت مایوں کے زرد کپڑوں میں تھی اور بہت لمبے گھونگھٹ میں اُس کا منہ چھپایا گیا تھا جو عورات سسرال سے آئی تھیں۔ انہوں نے پہلی بار اس کے ہاتھ پر ملا ہوا اوبٹنا رکھا اور منہ میں پینڈی کا ٹکڑا دیا۔ اختر کا جھوٹا پینڈی کا ٹکڑا اور ہاتھ پر ملا ہوا اوبٹنا دولہا کے واسطے احتیاطاً رکھا گیا۔ دلہن کے طوانے کے بعد آپس میں ایک کو دوسری نے ملنا شروع کیا۔ سب مہمان بیبیوں میں شور مچ گیا۔ کسی نے کسی کے منہ پر ملا، کسی نے دوسری بی بی کی آنکھ میں ڈال دیا۔ کسی نے کسی کے کپڑوں پر مل دیا۔ سب کے قیمتی ریشمی کپڑے خراب ہو گئے۔ غرض کہ معزز بیگمات میں ایک بلو پڑ گیا۔ شام کی گاڑی سے جو عورتیں دُلہن کو مایوں بٹھانے آئی تھیں۔ واپس گئیں اور انہیں کے ساتھ بیگم نے دولہا کی مایوں کا سامان چاندی کی چوکی، تھال، کٹورہ، زرد جوڑا، سرخ قند کی لنگی، بہت سا اوبٹنا، پانچ سو پینڈیاں وغیرہ بھی بھیج دیا۔ ہاں سو روپیہ بھی دولہا کے دودھ پینے کے واسطے بھیجا گیا۔ بہت سی مہمان مستورات تو اُسی دن شام کو مایوں بٹھا کر چلی گئیں۔ صرف قریبی رشتہ دار دس پندرہ بیبیاں رہ گئیں۔

مایوں کے ساتویں دن منڈھے کا دن تھا۔ کم حیثیت لوگ رسم کی پابندی کو کپڑا تان لیتے ہیں مگر یہ امیر بیگم صاحبہ کا گھر تھا۔ کوٹھی کے زنانہ حصہ صحن پر ایک بہت بڑا خوب صورت شامیانہ لگایا گیا جس سے آسمان بالکل نظر نہ آتا تھا۔ اُس کے نیچے اور کئی رسومات ادا کی گئیں۔

منڈھے کے دوسرے دن اختر کو مہندی لگائی گئی۔ اُس دن پھر مہمان جمع ہوئے۔ رتجگا اور صحنک فرض سمجھ کر مقررہ دستور کے مطابق ادا کیا گیا۔ اختر کو مایوں کے دن سے بخار ہو گیا۔ بہتیری دوائیں دی جاتی رہیں مگر بدنصیب اختر کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اُس کے بخار میں زیادتی ہوتی گئی۔ غذا بالکل چھوٹ گئی اور وہ نہایت کمزور ہو گئی۔ ڈاکٹر مس الگزینڈر ہر وقت اُس کے پاس رہنے لگیں۔

مس صاحبہ اختر سے بے انتہا محبت کرتی تھیں کیوں کہ وہ اس کی والدہ مرحومہ اور خالہ مسز وقار کی بچپن کی ساتھ کھیلی دوست تھیں۔ ان تینوں میں اسی قدر محبت تھی جس قدر حقیقی بہنوں میں ہو سکتی ہے۔ مسز وقار احمد کے بچے اور اختر ڈاکٹر صاحبہ کو آنٹی کہتے تھے۔ وہ اب تک اختر کی ماں کو یاد کر کے رویا کرتی تھیں چونکہ اختر گرفتار مصیبت تھی۔ اس لئے مس صاحبہ کو اس سے بہت ہی ہمدردی تھی۔ اختر کی شادی اُن کو بالکل ناپسند تھی اور بہت سمجھاتی تھیں کہ "تم انکار کر دو۔" مگر اختر ہندوستانی شرم کی پتلی تھی۔ وہ اُن کی اس قسم کی باتیں سن بھی نہ سکتی تھی۔ اور کہہ دیتی تھی کہ "آپ اس باب میں کچھ نہ کہیں جو میرے والدین کو منظور ہے۔ وہ ہوگا۔"

جس دن سے اختر کی طبیعت علیل ہوئی۔ انہوں نے رات کو بھی گھر جانا چھوڑ دیا۔ ہر وقت اس کے پاس بیٹھ کر اُس کا دل بہلاتی اور دوائیں دیتی رہتی تھیں۔ کمرے میں زیادہ ہجوم بھی نہ ہونے دیتی تھیں۔ روزانہ اپنا ملنا بھی بند کروا دیا تھا لیکن پھر بھی بیگم صاحبہ اُن سے بہت خوش تھیں۔ ورنہ سوت کی سہیلی اور سوتیلی ہمدرد اور پھر بیگم کو عزیز! وجہ یہ تھی کہ مس الگزینڈر نہایت عقل مند زمانہ شناس لیڈی تھیں۔ وہ ظاہراً اختر سے زیادہ بیگم صاحبہ اور لاڈلی سے محبت کرتی تھیں اور اُن کے تابع فرمان تھیں۔ صرف اس لئے کہ بیگم کے ساتھ موافقت رکھنے میں اختر سے ملتی رہوں گی۔ ان دنوں میں اگر ڈاکٹر صاحبہ چند منٹ کو اختر سے الگ ہوتی تھیں تو مسز وقار احمد کے پاس جاتی تھیں۔ وہ سب آج کل نہایت رنجیدہ و پریشان تھے۔ اختر کا زندہ جنازہ میرٹھ سے نکل رہا تھا اور وہ آخری نظر بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ ناچار اختر کو بے دست و پا، قید بے زنجیر پلنگ پر پڑے آٹھواں دن تھا۔ شام کے سات بجے سے وہ چادر اوڑھے پلنگ پر خاموش پڑی تھی۔ اور لاڈلی یہاں سے ابھی گئی تھی۔ جب کمرے کے کلاک نے سات بجا دیئے تو اختر کو فکر ہوئی کہ آنٹی ابھی تک کیوں نہیں آئیں؟ خالہ نے تو لکھا تھا کہ پانچ منٹ کے لئے آؤ نہ معلوم کیا سبب ایک گھنٹہ ہو گیا۔ کہیں کسی کی طبیعت خراب نہ ہو۔ ہائے آج میری خالہ کے دل پر کس قدر صدمہ ہوگا! ایک سال ہوا مجھ سے ملے اور پرسوں بے ملے ہی میں میرٹھ سے چلی جاؤں گی۔ اس کا سلسلہ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اختر بے تابانہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر صاحبہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی پلنگ کے قریب کرسی پر آ بیٹھیں۔

اختر: آنٹی آپ نے تو مجھے بہت پریشان کیا۔ اس قدر دیر لگا کر۔ کہئے خیریت تو ہے؟

آنٹی: ہاں ہاں خیریت ہے۔ تم گھبراؤ نہیں مجھے دیر دو باتوں میں ہو گئی کیا کہوں تمہاری چھوٹی آنٹی (مسز وقار) بہت غمگین ہیں۔ آج تو وہ سب رو رہے تھے۔ میں نے سنا ہے تین وقت سے کسی نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ مسز وقار کہتی تھیں کہ پرسوں میری اختر چلی جائے گی۔ پھر مجھے قیامت تک نظر نہ آئے گی جس طرح ہو سکے آج رات کو کوشش کرکے اختر ہمیں دکھا دو کیوں کہ کل رات کو بارات آئے گی۔ پھر موقع نہ رہے گا۔ مجھے اُن کی حالت پر بہت رحم آیا۔ پھر تو ہم سب رونے لگے۔ سب تمہاری ماں کو یاد کرتے تھے کہ آہ آج وہ زندہ ہوتیں تو یہ ظلم کیوں ہوتا۔ میں نے اُن سے اقرار کرلیا کہ جس طرح ہو سکا آج رات تمہیں اختر سے ملا دوں گی۔

اختر: آنٹی آپ نے وعدہ کیوں کیا؟ آپ کس طرح ملا سکتی ہیں؟ میں قید میں ہوں اور کل سے قید شدید بھگتنی پڑے گی۔ آپ نے میری خالہ کو سمجھایا ہوتا۔ اُنہوں نے بہن کو صبر کرلیا۔ بھانجی کو نہیں کر سکتیں؟

آنٹی: پیاری اختر شمسہ بیاری کا بہت ہی برا حال ہے۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور ملانے کا وعدہ کرلیا اور اس کا بندوبست بھی کر آئی ہوں۔

اختر: وہ کیا؟۔

آنٹی: وہاں سے سیدھی مسٹر رفیق احمد کے پاس گئی اور اُن سے کہا کہ "لڑکی ایک ہفتہ سے بند ہے جس سے اس کی صحت سخت خراب ہو گئی۔ بخار ایک دم کو نہیں اترتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایسا ہی رہا تو کئی سخت امراض کا خطرہ ہے۔ کل بارات آجائے گی۔ پھر کئی دن تک سسرال میں رہے گی۔ اس خیال سے مناسب ہے کہ آج رات کو کچھ دیر میں اس کو باغیچے میں بٹھاؤں۔ اس لئے آپ سے ذکر کیا ہے کہ بیگم صاحب مانع نہ ہوں۔ آپ اُن کو سمجھا دیجئے۔"

اُنہوں نے کہا کہ "میری طرف سے اجازت ہے۔ بے شک تم لڑکی کو پائیں باغ میں لے جاؤ اور بیگم صاحب کو اس کی خبر بھی نہ کرو۔ اندر سے دروازہ بند کرلینا اور بیگم سے

کہ دینا کہ ہم جلدی سوتے ہیں۔"

اُن کا شکریہ ادا کر کے کھڑی ہوگئی اور وہاں سے پیاری مسز وقار کو اطلاع دینے پھر گئی کہ رات کے ۱۱ بجے تم باغیچہ میں آجانا۔ میں امید کرتی ہوں کہ میرا خدا اس دروغ گوئی کو معاف کر دے گا کہ میں نے تمہارے ابا جان سے صاف نہیں کہا۔ اس خیال سے کہ وہ اُن سے ناراض ہیں۔ کبھی اُن سے ملنے کی اجازت نہ دیں گے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ کوئی بری بات نہیں۔ ماں سے بچھڑی ہوئی بیٹی کو ملانا ہے یہ ثواب کا کام ہے۔

اس گفتگو کے بعد آنٹی نے اختر کو دوا دی۔ تھوڑی یخنی پلائی اور بیگم صاحب سے کہہ آئیں کہ میں اور لڑکی سوتے ہیں۔ ۱۱ بجے تک ڈاکٹر صاحب تو اخبار دیکھتی رہیں اور اختر کی آنکھ لگ گئی۔

ساڑھے گیارہ بجے دروازے پر کھٹکا ہوا تو مس صاحب نے جا کر دیکھا۔ مسز و مسز وقار احمد نجم النساء اور اختر حسن کھڑے تھے۔ انہیں بنچ پر بٹھایا اور کمرے میں آکر اختر النساء کو خبر کی۔ یہ سنتے ہی اُس کا دل دھڑکنے لگا اور روتے ہوئے کہا۔

اختر: آنٹی آپ خیال کریں۔ مجھ پر یہ وقت کیسا ہے؟ میرے گھر میرے خالو اور خالہ آج چوروں کی طرح آئے ہیں، ہائے امّاں زندہ ہوتیں تو ایسا کیوں ہوتا؟ مجھے یہ بھی خیال ہے کہ ابّا جان کی بے اجازت اُن سے کس طرح ملوں؟

آنٹی: اس بات کا کچھ خیال نہ کرو۔ وہ تمہاری سہیلی نہیں۔ کوئی غیر نہیں۔ خالہ ہے اور ماں کے برابر چاہنے والی خالہ ہے۔

اختر رومال سے منہ چھپائے ہوئے روتی رہی اور آنٹی پکڑ کر آہستہ آہستہ باغیچہ کی بارہ دری میں لے آئیں۔ مسز وقار احمد دیکھتے ہی اُٹھ کر لپٹ گئی اور گودی میں بٹھا لیا۔ خالو نے پیار کیا۔ نجم اور اختر حسن متعجب نگاہوں سے اختر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کا کچھ اور ہی حال ہو گیا تھا۔ نہایت دُبلی ہو گئی تھی اور زرد رنگ کا میلا لباس تھا اگر رُوحوں کو دُنیا کی باتوں کی خبر ہوتی ہے تو ضرور اس وقت اختر کی والدہ مرحومہ کی روح ان سب کی حالت معلوم کر کے بے قراری سے تڑپ رہی ہوگی۔ بہت دیر تک یہ سب مع ڈاکٹر کے روتے رہے پھر مس صاحبہ ہی نے سمجھا کر دوسری باتوں میں لگایا۔

ڈاکٹر صاحبہ: بے شک آپ لوگ شادی میں شریک نہیں کیے گئے مگر لڑکی کو دینا فرض ہے۔ بتاؤ شادی کے تحفے میں آپ چاروں کیا کیا لائے ہیں؟

مسز وقار: آہ میں بدنصیب کس قابل ہوں۔ اختر نہیں جاتی۔ میری رُوح جا رہی ہے۔ افسوس میرے سب ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

مسٹر وقار: یہ تھوڑا سا وقت ہے۔ اب رنج کی باتوں کو جانے دو اور لڑکی کے بہلانے کی کوشش کرو۔ اس کے لیے جولائی ہو دو۔ (اختر سے مخاطب ہو کر) بیٹی مجھے یہ منی بیگ بہت پسند آیا تھا۔ تمہارے لئے خرید لیا۔ اس میں اپنا روپیہ رکھا کرنا۔

اختر نے سر نیچا کر لیا اور خالو نے سنہری تاروں سے بنا ہوا چھوٹا سا خوب صورت منی بیگ جیب سے نکال کر اختر کے سامنے بنچ پر رکھ دیا۔ پھر مسز وقار احمد نے بالکل خاموش بچشم تر نہایت خوب صورت طلائی مالا جو کم از کم پانچ سو روپیہ کا ہوگا۔ اختر کے گلے میں ڈال دیا اور فوراً ہی بنچ سے کھڑی ہو گئیں۔ ہجوم غم سے اس قدر طبیعت گھبرائی کہ وہاں سے ہٹ کر بیس قدم کے فاصلہ پر ٹہلنے لگیں۔ اُن کے جاتے ہی گھبرا کر مسٹر وقار احمد بھی کھڑے ہو گئے اور ان کی طبیعت بہلانے کو ساتھ ٹہلنے لگے۔

ڈاکٹر صاحبہ: نجمہ تمہارے ماما پاپا تو دے گئے۔ اپنی پیاری بہن کو شادی کے تحفہ میں تم بھی کچھ دو۔

نجم: آنٹی کیا کروں حیران ہوں، اس خیال سے بھی تو میرا دل پھٹا جاتا ہے کہ میری پیاری اختر کہاں جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ: بے شک تم کو بہت صدمہ ہے اور اختر غیروں میں دور جا رہی ہے۔ پر کیا دور جانے والی کو نہیں دیا کرتے؟

نجم: آنٹی ہمارے دل بالکل مر گئے ہیں اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ چلتے وقت ہم تینوں نے چیزیں لیں اُن کے دینے کو اور بھائی خالی چل پڑے تو اماں جان نے پوچھا کہ تم بہن کے دینے کو کیا لے چلو گے؟ بھائی جان نے کہا " کچھ بھی نہیں میرے پاس کیا رکھا ہے جو لے چلوں۔" پھر اماں نے بتایا کہ وہ چیزیں لے چلو جو قمر کی شادی کے وقت اختر کے لئے تم نے خریدی تھیں۔

ڈاکٹر صاحبہ: اچھا انہوں نے تب سے ہی خرید رکھی ہیں؟
نجم: ہاں آنٹی۔ تب ہی لے آئے تھے۔ سسٹر قمر کی شادی کے لئے زیورات خریدے تھے۔ اتفاقاً تین جوڑے ایک وضع کے مل گئے۔ آپ تینوں ہی لے آئے۔ دو سسٹر کو دیئے۔ اور دو مجھے دیئے۔ اور دو اپنے پاس رکھ چھوڑے۔
آنٹی: رکھ کیوں چھوڑے؟ تب ہی کیوں نہ دے دیئے؟
نجم: یہ مجھے معلوم نہیں۔ اچھا بھائی جان۔ اب دے دیجئے ناں؟
آنٹی: اُن کا ارادہ دینے کا معلوم نہیں ہوتا اور معلوم ہوتا ہے اُنہیں اختر سے محبت نہیں رہی۔ دیکھو تم سب رو رہے ہو۔ اُن کی آنکھ سے ایک قطرہ نہیں نکلا۔ نہ کوئی بات کی۔

ڈاکٹر آنٹی کی یہ طنز آمیز گفتگو سن کر یہ کہتے ہوئے اختر حسن اپنی جگہ سے اُٹھے۔

اختر حسن: آپ کا یہ گمان کہ بہن اختر سے محبت نہیں رہی اور میں نے اس اشک فشانی میں آپ سب کا ساتھ نہیں دیا۔ سخت غلط ہے، آنٹی میں اختر کے سہمے ہوئے دل کو اور سہمانا اور روتی کو زیادہ رُلانا نہیں چاہتا۔ ہم سب کو کوشش کرنی چاہئے۔ اُن کے خوش رکھنے کی، دل بہلانے کی، نہ کہ خود بھی رو کر یہ جتائیں کہ دراصل تم پر سخت مصیبت پڑ رہی ہے (اختر کے قریب بیٹھ کر) پیاری بہن معاف کرنا۔ میں اب تک مزاج پرسی نہ کر سکا کیوں کہ تم اپنے خالہ خالو سے مل رہی تھیں۔ ایک تو تم بیمار، دوسرے ان سے مل کر زیادہ رنجیدہ ہوئیں۔ اس لئے میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ تم ہی خیال کرو کہ میں نے تمہیں ایک سال کے بعد دیکھا ہے اور کس طرح اور کس قدر تھوڑے وقت کے لئے۔ کس قدر اچانک جدا ہوئی تھیں اور پھر کس قدر سخت رکاوٹیں حائل ہو گئیں اور اس وقت ہم کس حالت میں تمہارے گھر لوگوں سے پوشیدہ تم سے ملے۔ تمہیں رخصت کرنے آہ آخری رخصت کرنے آئے ہیں مگر اس تنگ وقت میں یہ باتیں کر کے تمہیں زیادہ رنجیدہ کرنا نہیں چاہتا پہلے ہی تم نے غم کھا کھا کر اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بے شک تمہیں سخت صدمات برداشت کرنے پڑے ہیں لیکن بہن انسان ہی برداشت کیا کرتا ہے۔ تم واقعات دُنیا پر غور کر کے صبر حاصل کرو۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں لڑکیاں ایسی ہوں گی جن کی ماؤں کا سایہ بے وقت اُن کے سر سے اُٹھ چکا ہوگا اور سوتیلی

مائیں اُن پر حکمرانی کرتی ہوں گی۔ جنہیں ہر طرح کے ظلم کرنے روا ہیں اور سوتیلی اولاد کو اس کے پیچھے عزیزوں سے چھڑانا تو ایک معمولی بات ہے۔

شادیاں بھی سب ہی کی ہوتی ہیں۔ آخر تم اس قدر گھلی کیوں جاتی ہو؟ تم ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے والی ہو جس کو اس وقت اپنے لئے بہت بری سمجھ کر ڈر رہی ہو مگر ممکن ہے کہ آئندہ زندگی تمہاری بہت اچھی گذرے۔ یہی سب سامان تمہارے لئے بہت اچھے ثابت ہوں۔ اختر کچھ تو بولو۔ تم تو بات کا ایک جواب نہیں دیتیں۔ کیا تمہیں اپنے بھائی سے اس قدر شرم کرنی مناسب ہے۔ ذرا منہ پر سے رومال ہٹاؤ اور باتیں کرو۔

اختر چونکہ بیماری سے نہایت ضعیف ہو گئی تھی۔ زیادہ دیر بیٹھا نہ جاتا تھا پہلے خالہ نے گود میں بٹھائے رکھا تھا۔ پھر وہ نجم کے زانو پر سر رکھ کر وہیں نیچے لیٹ گئی تھی۔ آنکھوں پر رومال رکھ کر اب بھائی کے کہنے سے اُٹھ بیٹھی۔

اختر حسن: اوہو۔ بہن تم تو اُٹھ بیٹھیں۔ اتنی تکلیف نہ کرو۔ لیٹی رہو اور منہ پر سے رومال ہٹا دو۔

اختر: (نہایت نحیف آواز سے) مجھے تھوڑی دیر بیٹھنے میں تکلیف نہ ہوگی۔ میں آپ کی اس ہمدردانہ نصیحت کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ آہ میں سخت شرمسار ہوں کہ آپ سب مجھ سے ملنے آئے ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں۔ والدہ زندہ ہوتیں تو ایسا کیوں ہوتا۔

نجم نے دیکھا کہ اس قسم کی باتوں سے اختر پھر زیادہ روئے گی۔ اسی بہانے ذکر کے بند کرنے کو ایک نہایت خوب صورت ہاتھ کی طلائی زنجیر (بریسلٹ) جس کے خوش نما پھول کے بیچ میں الماس جڑا تھا۔ آہستہ سے اختر کو پہنا دی اور کہا۔

نجم: پیاری اختر یہ میری نشانی بطور یادگار ہاتھ میں رکھنا۔

اختر: پیاری نجم آپ سب کی از حد مہربانی و محبت کی نشانیاں میرے سر آنکھوں پر مگر آپ سب اس قدر تکلف کیوں کرتے ہیں۔ تمہاری محبت کے نقش میرے دل پر ہیں۔ کیا نشانی دیکھ کر یاد کروں گی؟

نجم: نہیں بہن میرا یہ مطلب نہیں۔ یاد کر لینا کیا تم تو مجھے دل میں رکھو گی مگر رسم دنیا بھی تو ہونی چاہئے (اختر حسن کی طرف دیکھ کر) ''بھائی جان آپ بھی جو چیزیں لائے

ہیں۔ بہن کو پہنا دیں۔"

اختر حسن: پیاری بہن عرصہ ہوا۔ تمہارے لئے یہ چیزیں میں نے لے رکھی تھیں۔ ان دنوں جب قمر کی شادی تھی۔ تمہیں دینے کا وقت نہ ملا۔ قمر کی رخصت کے بعد دیتا تو پھر موقع ہی نہ رہا۔ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ مجھے تو اس وقت بھی یاد نہیں تھا۔ کیوں کہ دل میں کوئی خوشی ہی نہیں جو لینا دینا اور دُنیا کی باتیں یاد ہوں۔ اماں جان کے یاد دلانے سے چونکہ یہ تمہارے نام کی چیزیں تھیں۔ لیتا آیا۔ اُمید کرتا ہوں کہ قبول کر کے مجھے مشکور کرو گی۔

اختر نے شکریہ میں ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش رہی تو نجم بولیں:

نجم: جس طرح میں نے اور اماں جان نے پہنایا ہے۔ آپ بھی پہنا دیں۔ اس طرح تو وہ لینے والی نہیں۔

اختر حسن: وہ خود ہی پہن لیں گی۔ وہ نہایت کمزور علیل ہیں۔ اس وقت زیادہ چیزیں پہنانے سے تکلیف ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ مالا بھی اُنہیں چبھ رہا ہو گا۔ تمہاری زنجیر کا بوجھ بھی ہاتھ کو تکلیف دیتا ہو گا۔ یہ تو بے انتہا دُبلی ہو گئی ہیں (اور اختر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) آہ بہن کی یہ انگلیاں کبھی پیانو پر کس طرح چلا کرتی تھیں۔ دیکھیں پھر کب ایسا موقع ملتا ہے کہ اختر ہمیں باجا سنائیں۔

اختر: بھائی جان میں اب باجا بجا چکی۔ بس آخری وہی مسز قمر کی شادی میں بجا لیا۔

اختر حسن: بہن یوں نہ کہو۔ خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔ امید ہے بیگم صاحبہ تمہیں پیانو، ہارمونیم وغیرہ تو ضرور دیں گی۔ گو میری اماں جان کو منع کرتی تھیں۔ قمر کے جہیز میں باجے نہ دو مگر تمہارے باجوں کو رکھ کر ہی کیا کریں گی۔ نہ اُن کے کام کے نہ لاڈلی کے۔ تم ضرور اپنی پریکٹس جاری رکھنا۔ اس سے تنہائی میں تمہارا دل بہلا رہے گا۔

بھائی اس قسم کی باتیں کر کے بہن کو سمجھا رہے تھے کہ مسز و مسٹر وقار احمد بھی ٹہلتے ہوئے اُن کے قریب آ گئے۔

مسز وقار احمد وہاں بھی برابر روتی رہی تھیں اور مسٹر وقار احمد تسلیاں دیتے تھے۔ جب وہ کسی طرح بھی خوش نہ ہوئیں۔ تو میاں اُنہیں اُدھر ہی لے آئے۔ مسز وقار احمد پھر

بھانجی کے پاس بیٹھ گئیں اور اُس نے اُن کے سینے سے سر لگا دیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحبہ نے گھڑی دیکھی تو ایک بج چکا تھا۔ اُنہوں نے مسز وقار سے کہا:

ڈاکٹر: ڈیر شمسہ گو دل تو نہیں کرتا مگر اب کہنا پڑا۔ ایک بج گیا ہے۔ اسی وقت وہ بیٹی کو دیکھنے آیا کرتی ہیں اور پھر صبح تک دو تین بار آتی رہتی ہیں اور آپ کو پیاری اختر سے رخصت ہونا چاہئے کہ میں اسے پلنگ پر لٹا دوں۔

مسز وقار: ڈیر ایلس (یہ ڈاکٹر کا نام ہے) میں آپ کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتی۔ اس بے درد کی قید میں اختر کو مجھے دکھا دیا۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ تھا۔ اچھا اب میں رُخصت ہوتی ہوں۔

اس گفتگو کے بعد وہ چاروں اختر سے مل کر بادلِ بریان و چشمِ گریاں رُخصت ہوئے اور اختر کی آنٹی ڈاکٹر نے لا کر اُسے کمرے میں پلنگ پر لٹا دیا وہ ایک گھنٹہ آنکھیں بند کیے بالکل خاموش پڑی رہی۔

اسی اثناء میں بیگم صاحبہ بھی اس کمرے میں بیٹی کے دیکھنے کو آئیں مگر ڈاکٹر صاحبہ نے دیکھنے نہیں دیا اور کہہ دیا کہ سو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ جانتی تھیں کہ اس وقت اختر کو نیند نہ آئی ہوگی۔ صرف عزیزوں کی جدائی کے رنج اور اُٹھنے بیٹھنے کی تکان سے خاموش ہو گئی ہے۔ اس کا خیال بدلنے کی غرض سے اُنہوں نے خود ہی بلایا۔

ڈاکٹر: بیٹی کیا تم سو گئیں؟

اختر: (آنکھیں کھول کر) نہیں تو میں تھک گئی تھی۔ اس لئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ڈاکٹر: تم نے یہ بھی تو نہ دیکھا کہ تمہارے بھائی نے جو رومال دیا ہے اس میں کیا ہے اور خالو والے منی بیگ میں کیا ہے؟

اختر: آپ کھول کر دیکھیں۔ رومال میں تو شاید کوئی زیور ہوگا اور بیگ میں کیا ہونا تھا؟ وہ آپ ہی بہت قیمتی ہے۔ روپیہ رکھنے کو خالہ جان نے دیا ہے۔

ڈاکٹر: (مسکرا کر) شاید تم نے ہاتھ میں اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ بہت بھاری معلوم ہوتا ہے ضرور اس میں کچھ ہوگا۔

اختر: آنٹی میں نے ہاتھ میں تو نہیں اُٹھایا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں کچھ روپیہ

ہو۔ اب تو میں واپس بھی نہ کرسکوں گی۔ افسوس میں نے اُسی وقت کھول کرنہ دیکھ لیا۔ آپ دونوں چیزیں دیکھیں تو!

ڈاکٹر صاحب نے پہلے رومال کھولا۔ اس میں سے وہ نہایت خوب صورت گلے کے زیور نکلے۔ ایک بیش قیمت گلوبند تھا۔ جس پر تمام سچے جواہرات جڑے تھے اور دوسرا سادہ مرصع ولایتی جگنیوں کا سنکوا تھا ڈاکٹر اُن کی چمک دمک وخوشنمائی دیکھ کر نہایت خوش ہوئیں۔ پھر منی بیگ کھولا تو اس میں بہت سی چمکیلی اشرفیاں نظر پڑیں۔ فوراً ہی چھوٹی گول میز پر الٹ کر گنیں اور اختر سے کہا:

ڈاکٹر: "لو بیٹی یہ پورے پانچ سو روپے کی اشرفیاں ہیں۔"

اختر یہ سن کر حیران رہ گئی اور بہت افسوس ہوا مگر کیا کرسکتی تھی۔ وہ دے گئے تھے اور یہ لے چکی تھی۔

اختر: افسوس میری خالہ بہت ہی خرچ کر گئیں۔ اور پھر بے معلوم میرے والدین کو خبر بھی نہیں کہ کیا دیا اور نہ میں بتا سکتی ہوں۔ آنٹی میں ان چیزوں کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتی۔ کیوں کہ میری کنجیاں کل کو عام ہاتھوں میں ہوں گی۔ میرے تمام ٹرنک کھولے جائیں گے۔ اس لئے آپ اپنے بکس میں ہی رکھ لیں۔

ڈاکٹر صاحبہ نے وہ سب چیزیں اپنے ٹرنک میں رکھ لیں اور دونوں کو جاگتے ہی جاگتے صبح ہو گئی۔

چودھواں باب

سر پر آئی ہے بلا لٹتی ہے آزادی مری
جس کو سب کہتے ہیں شادی ہے وہ بربادی مری

صبح دس بجے دولہا کے والدین مع باراتیوں کے آ پہنچے۔ اُن کے ٹھہرنے کے لئے وکیل صاحب نے اپنی دوسری کوٹھی جو قریب ہی تھی کرائے دار سے خالی کرائی تھی وہاں وہ سب اُترے۔ قریب چھ بجے شام کے وہاں سے بری آئی۔ چوبی رنگین چودہ خوابوں میں کھیلوں بتاشوں پر بری کے جوڑے رکھے اور باجا ساتھ تھا۔ بیگم صاحبہ نے ہر چند اصرار کیا کہ آج اختر کو ضرور غسل کرایا جائے۔ زیادہ نہیں تو شگون پورا کرنے کو ایک لوٹا پانی جسم پر ڈال کر جلدی اُٹھا لیا جائے مگر لیڈی ڈاکٹر صاحبہ نے کسی طرح اجازت نہ دی کیوں کہ آج اُسے بہت تیز بخار تھا۔ بیگم صاحبہ تو بہت ضد کرتیں مگر وکیل صاحب نے سمجھا دیا کہ لڑکی کو سخت نقصان پہنچے گا۔ غسل کرانا کوئی فرض نہیں۔

بی امانی نے بدیوں کے خوان اُتروائے۔ ان میں چودہ ہی جوڑے تھے۔ ایک سب سے بھاری تھا اور بارہ معمولی اور چودھواں باریک سرخ قند کا دوپٹہ۔ پشواز اور سرخ اطلس کا چھوٹے پائینچوں کا غرارہ۔ یہ سب سامان ان خوانوں سے نکال کر بی امانی نے انہیں خوانوں میں اپنے گھر کی کھیلیں، بتاشے اور دولہا کا جوڑا سہرا وغیرہ سجا کر بھیج دیا۔ پھر ایک بجے رات کے نہایت دھوم دھام سے آتشبازی اور ناچ کے ساتھ بارات ''رفیق منزل''

پہنچی۔ جونہی وہ سب رفیق منزل گیٹ کے قریب پہنچے۔ اس کوٹھی کا سقہ دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہا کہ جب تک میرا حق نہ ملے گا بارات اندر نہ جانے دوں گا۔

اسی وقت دولہا کے چچا نے پانچ روپے سقے کو دیئے۔ پھر سب احاطے میں داخل ہوئے۔ یہاں وکیل صاحب کے بہت سے احباب اور منشی وغیرہ بارات کے استقبال کو کھڑے تھے۔ صرف معمولی صاحب سلامت ہوئی، کسی نے کسی سے تعارف نہ کرایا چونکہ وکیل صاحب تعلیم یافتہ روشن خیال جنٹلمین تھے۔ وہ ضرور باقاعدہ کارروائی کرتے اور اپنے سمدھی کے استقبال کو خود باہر آتے مگر مجبور تھے۔ کیوں کہ بیگم صاحبہ سے حکم ملا کہ "تم اپنے ہم زلف وقار احمد کی طرح انگریزی طریق کا برتاؤ بارات کے ساتھ ہرگز نہ کرنا۔ بیٹی کے باپ کو شرم کرنی چاہئے۔ خود کسی کمرے میں بیٹھے رہنا۔ دوسرے لوگ استقبال کے لئے موجود رہیں گے۔"

اس حکم کی وجہ سے وکیل صاحب باہر نہ نکلے۔ اتنا کیا کہ جس ہال میں بارات کی نشست کا سامان کیا تھا۔ خود بھی وہاں ایک کرسی پر آبیٹھے اور جب سمدھی اور معزز باراتی ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اُٹھ کر دُولہا کے والد اور چچا دو ایک ایسے ہی معزز جیسے آدمیوں سے مصافحہ کر لیا۔ اس وقت وکیل صاحب اپنے سمدھیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ دونوں اُن سے عمر میں کہیں زیادہ پچاس اور ساٹھ کے درمیان میں ہوں گے لیکن دونوں ہی نے اس وقت سرخ مخمل کے چغے پہن رکھے تھے جن پر سنہری ڈوری اور چیک کا کام ہو رہا تھا۔ سر پر بھی سرخ کلابتونی شالیں لپیٹ رکھی تھیں اور کندھوں پر ریشمی رومال پڑے تھے۔ چونکہ بیگم صاحبہ کے حکم سے کرسیاں ہال سے نکال دی گئی تھیں اور نشست کے لئے مکلف فرش بچھایا گیا تھا۔ وکیل صاحب تو تین چار اشخاص سے ہاتھ ملا کر دل ہی دل میں سخت افسوس کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر صوفے پر لیٹ رہے اور اُن کے منشی نے دولہا اور اُس کے باپ چچا کو صدر مسند پر بٹھایا اور سب بھی مناسب طریق سے بیٹھ گئے۔ اس وقت ہال میں چار سو آدمی موجود تھے۔ چونکہ شام کا کھانا یہاں سے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ باراتی کھا کر آئے تھے۔ اب پان حقہ کا زور و شور تھا اور ناچ بھی شروع ہو گیا تھا۔ مراسی اور بھانڈ وغیرہ بہت کچھ بیہودہ بک رہے تھے جو سن کر سمدھی صاحبان کھلے جاتے تھے اور

لغو فقروں پر چار چار روپے اُن کی طرف پھینک رہے تھے۔ بس اسی قسم کی لغویات میں رات کے باقی گھنٹے گزارنے تھے۔

یہ تو ہوا باہر کا حال۔ اب ذرا اندر کا بھی سنیں۔ جس وقت زنانی گاڑیاں باغیچے کے دروازے پر پہنچیں۔ بی امانی بیگم کئی ماماؤں کے ساتھ اُن کے اُتروانے کے لئے موجود تھیں اور چند مہمان بیبیاں بھی سمدھنوں کے لینے کو کھڑی تھیں۔ ان سب کے ہاتھوں میں پھولوں کی چھڑیاں تھیں۔ جونہی باراتی بیبیاں صحن باغ میں داخل ہوئیں۔ وہ چھڑیاں پھولوں کی ان سب کو لگائی گئیں۔ بیبیوں کے کریب کے بھاری دوپٹے پھٹ گئے۔

اس رسم کے بعد بی امانی ان سب باراتی بیبیوں کو جو تقریباً سو سے کم نہ ہوں گی۔ صدر دالان میں لے گئیں۔ جہاں مسند پر بیگم صاحب رونق افروز تھیں، ایک تو بج ہی چکا تھا۔ باقی کے تین گھنٹے بھی ناچ گانا سننے میں ختم ہو گئے اور چار بجے وہ گھڑی پہنچی۔ جب کہ بے بس و بے زبان مظلوم و بدنصیب اختر اب سے عمر بھر کے لئے ایک ایسے شخص کے حوالے کردی گئی جس کی تعلیم اختر سے آدھی بھی نہ تھی جس کے عادات و مزاج و اخلاق و خیالات اختر کے بالکل خلاف تھے جس کا نام بھی اختر اس وقت تک نہ جانتی تھی اور نہ کبھی ذکر ہی سنا تھا۔

نکاح خوانی کے بعد دُولہا زنان خانہ میں طلب کیا گیا اور اُس کی چچازاد نو سالہ بہن اپنی اوڑھنی کا آنچل دولہا کے سر پر ڈال کر برآمدے میں لائی اور اس پلنگ پر جو اختر کو جہیز میں دیا جانا تھا بٹھایا گیا۔ دُولہا کے گرد تمام بیبیوں کا مجمع ہو گیا۔ اس وقت کسی نے بھی دولہا سے پردہ نہ کیا۔ کیوں کہ شادی کے دن مستورات کی شرع میں دولہا سے پردہ ضروری نہیں۔ اب ہنسی مذاق ٹونے ٹوٹکے شروع ہو گئے۔ ایک ڈومنی ''شہزادہ ڈوری ڈیاں (بڑی لے سے) ڈوری ڈیاں۔ چھوڑائے کون ری۔ چھوڑائے بنے کی اماں۔ چھوڑائے نوشہ کی بھینا، چھوڑائے کون ری۔''

دوسری ڈومنی نئے کچے سُوت کا دھاگہ دولہا کے گرد لپیٹ رہی تھی اور وہی گیت گا یا جا رہا تھا۔ جب یہ ٹونا ختم ہوا تو دولہا کی چچی نے ڈومنیوں کو روپیہ دے کر اپنے لڑکے کے گرد سے دھاگہ ہٹا دیا۔

اس کے بعد ایک عورت آئی اور دُولہا کے سر پر چھلنی میں آٹا ڈال کر شگون کے

لیے تھوڑا سا چھان گئی۔

ان ٹوٹنوں کے بعد دولہا کو باہر جانے کا حکم ہوا۔ وہ اُٹھنے لگا تو جوتی غائب۔ وہ اس کی سالی لاڈلی بیگم نے چھپائی تھی۔ جب دولہا نے پانچ روپے لاڈلی بیگم کو دیئے۔ تب جوتی ملی اور دولہا باہر گئے۔ چند ہی منٹ بعد پھر اس کی طلبی ہوئی اور اُسی طرح بہن سر پر آنچل ڈال کر پھر اندر لائی اور اب کی دفعہ ڈومنیوں نے یہ تاکید کر کے کہ ہم سات ٹوٹنے سنائیں گے تم ہر اک کا جواب دیتے جانا۔ ٹوٹنے گانا شروع کر دیا۔

ڈومنی: کورا کرو کچا سوت۔ میں باندھوں ساسل کا پوت، باندھ، بوندھ کے کیا غلام، ویلی بیٹھا کرے سلام۔ کرو میاں نیڑے سلام۔ کہو ٹوٹا لاگا۔

دولہا خاموش۔ دولہا کی والدہ نے کہا۔ کہہ دو میاں لگا۔

ڈولہا: (آہستہ سے) لگا۔

اِسی طرح سات بار یہی ٹوٹا گایا گیا اور دولہا سے کہلوایا گیا کہ لاگا۔ پھر ایک ہاتھ سے دولہا نے سہاگ پوڑے کا فیروزہ پیا اور ایک ہاتھ سے اور کئی کام کیے۔

اب دُلہن کو باہر لانے کے لئے بی امانی بیگم کمرے میں گئیں۔ آہ اختر بیچاری پر یہ قیامت کا وقت تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پیشتر اسے شادی کا وہ سادہ سرخ جوڑا پہنایا گیا تھا جس کا ذکر پیچھے کیا گیا ہے اور تمام زیورات سے ناتوان جسم کو لاد دیا تھا۔ بخار اس وقت بھی اس کا شریکِ حال تھا۔ ابھی ڈاکٹر صاحبہ نے فیور مکسچر پلایا تھا اور زانو پر اُس کا سر رکھے بیٹھی تھیں۔ امانی نے اختر کو اُن کی گود سے اپنی گود میں اُٹھا لیا اور لاڈلی نے سہرا باندھ دیا۔ اس سے پہلے پھولوں کی تیز خوشبو کے خیال سے ڈاکٹر صاحبہ نے نہیں باندھنے دیا تھا۔ اگرچہ امانی اس کو گودی میں اُٹھائے تھیں۔ پھر بھی بری کی جوتی جس میں چاندی سونے کے گھنگھرو لگے تھے اور وزن میں دو سیر سے کم نہ تھی۔ وا جب سمجھ کر پہنا دی گئی۔ ڈاکٹر بے چاری حیران و بے بس دیکھتی رہ گئیں۔ بی امانی دبوچے باہر لائیں۔ وہ بیچاری پیچھے پیچھے آئیں۔ یہاں اس پلنگ کے قریب آ کر جس پر دولہا تھا۔ پہلے بی امانی نے یہ کیا کہ دلہن کے جوتے سمیت پیر دولہا کے سر سے لگا کر جوتی چھوائی گئی۔ یہ اس لئے کہ میاں ہمیشہ بیوی کی جوتی کے نیچے رہے پھر دلہن کو سرہانے کی طرف دولہا کے مقابل بٹھا دیا۔ مس الگو بینڈرا صاحبہ حیرت و افسوس کے

عالم میں کھڑی سب کچھ دیکھتی رہیں۔

اختر ایک تو بے حد کمزور تھی۔ اس پر زیورات پر سہرے کا بوجھ اور پھر ہجومِ غم۔ بہت ہی جھکی بیٹھی تھی اور جسم بالکل لرز رہا تھا۔ اب ایک اور رسم کی گئی جس کو تخت جلوہ یا آرسی مصحف کہتے ہیں۔ دولہا اور دلہن کے سر پر ایک ریشمی گوٹے لچکے کا کپڑا ڈال دیا گیا جس میں یہ دونوں چھپ گئے اور درمیان میں آئینہ اور قرآن شریف رکھ دیا۔ پھر دولہا کی والدہ نے کہا کہ میاں پہلے سورۂ اخلاص پڑھو۔ پھر آئینہ میں دلہن کا منہ دیکھو۔"

دولہا نے اسی طرح کیا۔ سورۃ پڑھنے کے بعد ہر کوشش کی کہ آئینہ میں دلہن کا چہرہ نظر آئے مگر سوا پھولوں کی لڑیوں کے اور کچھ نہ دیکھ سکے۔

اس وقت ایک اور رسم بھی ہوئی۔ لاڈلی بیگم پلنگ کی پٹی میں قفل لگا گئیں گویا اپنے خیال میں دلہن دولہا کو تالا دے دیا۔ یہ اس لیے کہ تمام عمر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مقید رہیں۔

ان ٹونوں ٹوٹکوں میں دو گھنٹے گذر گئے اور پھر دولہا کو باہر جانے کا حکم ملا۔ جب وہ باہر چلا گیا تو ڈاکٹر صاحبہ نے نہایت لجاجت سے پوچھا۔

ڈاکٹر: بیگم صاحبہ اگر سب کام پورے ہو گئے ہوں تو مجھے اجازت دیں کہ لڑکی کو کمرے میں لٹا دوں۔ وہ سخت کمزور ہے۔ مجھے خیال ہے کہ کہیں غش نہ آ جاوے۔

بیگم: "بہت اچھا بی امانی سے کہیے۔ لڑکی کو اٹھا لے۔"

اجازت ملتے ہی ڈاکٹر صاحبہ نے نہایت جلدی اور آرام سے اختر کو گودی میں اٹھا لیا اور کمرے میں لا کر طاقت کی دوا دی اور لٹا دیا۔ ایک گھنٹے بعد اس میں کچھ طاقت آ گئی۔ آنکھیں کھول کر آنٹی سے کہا۔

اختر: میری سچی ہمدرد۔ میری پیاری آنٹی۔ اب میں یہاں چند گھنٹوں کی مہمان ہوں۔ آپ میری حالت دیکھ رہی ہیں کہ ذرا طاقت نہیں ہے۔ آپ کے بغیر میں ایک منٹ نہ جی سکوں گی۔ یہ لوگ ابھی اپنے گھر نہ جائیں گے جو مجھے کسی قسم کا خیال ہو۔ ابھی چند روز اسی کوٹھی میں ٹھہریں گے۔ وہ میرے ابا جان کا مکان ہے۔ کھانا بھی یہیں سے جایا کرے گا۔ جہاں آپ نے اس قدر تکلیف اٹھائی ہے۔ وہاں چند روز کی اور برداشت

کر لیں اور میرے ساتھ چلیں۔

ڈاکٹر: ہاں بیٹی میں برابر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ جب تک تم صحت حاصل نہ کر چکو۔

اب جہیز کا سامان باہر نکلنے لگا۔ وکیل صاحب کے منشی نے جہیز کی فہرست لکھی۔ یہ سامان بیگم صاحبہ نے کچھ اپنی حیثیت کے موافق نہ دیا تھا اور وکیل صاحب سے یہ کہہ دیا تھا کہ ان چیزوں پر بہت سا روپیہ خرچ کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ تو ساس سسر کے کام آئیں گے۔ ہمیں تو روپیہ اس چیز پر خرچ کرنا چاہئے جو لڑکی کی ملکیت ہو۔ چنانچہ پانچ ہزار کا زیور بنوا دیا ہے یہ کاٹ کباڑ تو رسم کے لحاظ سے دیا جاتا ہے۔ بیگم کی اس تجویز سے وکیل صاحب خوش ہوئے تھے کہ جو کچھ دیا ہے۔ میری بیٹی کے کام آئے گا۔ برتن وغیرہ زیادہ دینے سے کیا فائدہ ہوتا؟ فہرست جہیز یہ ہے۔

زیورات طلائی، مرصع ۲۰، زیورات نقرئی ۱۰، ظروف نقرئی ۱۱، چھپر کھٹ یک، پلنگ گیری یک، تخت چوکی (ان تینوں چیزوں پر بھی چاندی کا پتر چڑھا تھا) تانبے کے برتن یک صد، ریشمی جوڑے ۲۵، پہنائی کے جوڑے یک صد، بٹوئے تلے دانیاں ۵۰، ہارمونیم یک، قرآن شریف ۲۔

یہ فہرست منشی نے دُولہا کے چچا کو دی۔ ایک بجے تک سب کھانا کھا چکے اور رخصت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مہمان بیبیاں دُلہن سے مل چکیں تو وکیل صاحب کو بلایا گیا۔ انہوں نے آ کر دیکھا کہ اختر پلنگ پر نڈھال پڑی ہے۔ لاڈلی اور بیگم پاس بیٹھی رو رہی ہیں۔ خود بھی وہیں بیٹھ گئے اور بیٹی کا سر گود میں رکھ لیا۔ ایک گھنٹہ چشم تر بیٹھے سمجھاتے رہے۔ جب باہر سے تقاضا ہوا کہ جلدی سوار کرادو تو وہاں سے اُٹھے۔ اختر کو اسی وقت غش آ گیا۔ فوراً واپس آ گئے اور ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے میں ہوش آیا۔ تو مجبوراً پھر باہر چلے گئے۔ دولہا کو گھر میں بلایا۔ اس وقت رسم سلامی ادا ہوئی۔ سو روپیہ بیگم صاحبہ نے دیا اور ڈیڑھ سو کے قریب مہمان بیبیوں کیطرف سے ہو گیا۔ یہ سب دولہا کی اماں نے رومال میں باندھ لیا۔ اس کے بعد دولہا نے فینس میں بٹھانے کے لیے اختر کو پلنگ سے اُٹھایا۔ مس ڈاکٹر ڈر رہی تھیں کہ یہ خود بھی چھوٹا سا لڑکا

ہے۔ کہیں اختر کو گرا نہ دے۔ انہوں نے کئی دفعہ بیگم سے کہا کہ "لڑکی ناتوان ہے۔ اسے تکلیف نہ پہنچے۔ اُسے میں خود اُٹھا کر ڈولی میں سوار کیے دیتی ہوں۔" مگر کسی نے نہ مانا کہ ہماری یہی رسم ہے۔ اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔

ڈولہا بیچارے کو اپنے کپڑے ہی سنبھالنے بہت مشکل ہو رہے تھے۔ بڑا بھاری گھیر دار جامہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر سیروں پھولوں کا سہرا پڑا تھا۔ بمشکل تمام پالکی میں بٹھا دیا۔ خود اپنے شہبالے کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہوئے۔ تمام عورات جو اُدھر سے آئی تھیں، سوار ہو چکیں تو بارات روانہ ہوئی۔

بیس قدم کے فاصلے پر تو کوٹھی تھی ہی۔ بہت جلدی وہاں پہنچ گئے۔ پالکی پر صدقہ کر کے پہلے بکرا ذبح کیا گیا۔ اُس کا خون دُلہن کے پاؤں کے انگوٹھے پر لگایا۔ جب دولہا کی ماں چچی وغیرہ اتر چکیں تو دولہن کو اُتروایا۔ دولہا نے اُس کو پالکی سے نکال کر کمرے میں فرش پر رو بہ قبلہ بٹھا دیا اور والدہ کے کہنے سے دُلہن کے دوپٹے کے آنچل پر دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر رسم دو دا بھاتی یوں ادا ہوئی کہ دُلہن کے ہاتھ پر دولہا کی چچی نے کھیر رکھ کر دولہا کو چٹائی۔ پھر دولہا کے ہاتھ سے دُلہن کو کھلائی۔ ڈاکٹر ایلس صاحبہ اس وقت دُلہن کے پاس فرش پر بیٹھی تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ اختر اس وقت بالکل کچھ نہ کھا سکے گی۔ جونہی دولہا نے اختر کے منہ میں کھیر دی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے فوراً رومال سے اُس کے لب پونچھ دیے۔ پھر رونمائی شروع ہوئی۔ پہلے دوالدہ کی وادلہ نے بہو کا منہ دیکھا۔ پھر یکے بعد دیگرے سب دیکھتی گئیں۔ ایک گھنٹہ کامل اس میں بھی صرف ہو گیا۔ اختر اتنی دیر کبھی نہ بیٹھ سکتی اور ضرور گر جاتی مگر ڈاکٹر صاحبہ اپنے سہارے سے نہ بٹھائے ہوتیں۔ خدا خدا کر کے چار بجے خلاصی ہوئی۔ دُلہن کو وہاں سے اُٹھا کر کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحبہ دوا کی شیشیاں ساتھ لائی تھیں۔ اپنے اپنے وقت پر دوا پلاتی رہیں اور پاس بیٹھی سمجھایا کیں۔ تین چار گھنٹے دُلہن اور ڈاکٹر صاحبہ کمرے میں تنہا رہیں۔ شام کے سات بجے دولہا کی والدہ نے کمرے میں آ کر ڈاکٹر صاحبہ سے کہا:

دولہا کی اماں: میم صاحب مہربانی کر کے ذرا آپ باہر تشریف لے آئیں۔ وکیل صاحب کے گھر سے عورت آپ کا کھانا لے کر آ گئی ہے۔

ڈاکٹر: بی بی صاحب ہم اپنی بیمار لڑکی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمارا کھانا یہیں منگوا دو۔ ہم اپنا برتن الگ رکھ دیں گے۔

دولہا کی اماں: نہیں میم صاحب آپ کو وہیں چلنا ہوگا۔ یہاں دُلہن دولہا کو کھانا کھلایا جائے گا۔

ڈاکٹر: ہمارے حکم کے سوا آپ دُلہن کو کیا کھلا سکتی ہیں۔ سوائے ایک پیالی یخنی کے اختر اور کچھ نہیں کھا دیں گی۔ ہم حکم دے آئے تھے۔ یخنی ہمارے کھانے کے ساتھ آگئی ہوگی۔ یہیں منگوا دو۔ ہم اُس کو بھی پلا دیں گے اور اپنا کھانا بھی کھا لیں گے۔

دولہا کی اماں: اور ہمارا لڑکا؟ وہ بھی تو آج یہیں کھانا کھائے گا۔ یہ ہماری رسم ہے۔

ڈاکٹر: اچھا آپ کی رسم ہے تو آپ اپنے لڑکے کو بھی اس جگہ بلا لیں وہ ہمارے ساتھ کھانا کھا لے گا۔

ڈاکٹر کی یہ تقریر سن کر دولہا کی اماں اس خیال سے باہر نکلیں کہ ابھی جانی بیگم کو کہلا بھیجوں گی کہ میم وہاں سے نہیں ہٹتی۔ اُسے بلا لو۔ برآمدے میں اُن کا لڑکا کھڑا تھا۔ جو اُن کی اور مس صاحبہ کی گفتگو سن چکا تھا گو وہ محض جاہل و نالائق تھا۔ تاہم اپنی ماں سے زیادہ سمجھ رکھتا تھا۔ اُس نے والدہ سے کہا کہ تم زیادہ اصرار نہ کرو۔ میرا اور ڈاکٹر صاحبہ کا کھانا اندر ہی بھیج دو۔ ہم دونوں وہیں کھا لیں گے۔ ماں نے جواب دیا کہ ''ہے ہے بچے ابھی سے تو کرستان ہو گیا۔ فرنگن کے ساتھ کھانا کھائے گا؟'' اس نے کہا کہ میں علیحدہ برتنوں میں کھاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ ڈاکٹر نے پہلے اُسے بہت ہی عجیب حالت میں دیکھا تھا۔ جامہ اور سہرا باندھے ہوئے تھا اور اس وقت وہ کپڑے بدل دیے تھے۔ علی گڑھ فیشن پاجامہ اور گلابی بند کی دار ریشمی قمیض پہنے تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ کمرے میں آتا دیکھ کر تعجب سے کھڑی ہو گئیں کہ یہ کون آ گیا؟

دُولہا: گڈ نائٹ ڈاکٹر صاحبہ

ڈاکٹر: گڈ نائٹ میں آپ کو نہیں پہچانتی۔ بولو کہ یہاں کیوں آئے ہو؟

دولہا: بے شک آپ مجھے نہ پہچان سکی ہوں گی۔ کیوں کہ جب آپ نے مجھے

دیکھا تھا۔ اس وقت میں اور لباس میں تھا۔ میں بے اجازت کمرے میں آجانے کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اُن کی طبیعت کی طرف سے فکر تھا۔ اس لئے جلدی چلا آیا اور والدہ نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ نے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلانے کو طلب کیا ہے۔

ڈاکٹر: او میں نے اب جانا کہ تم وہی ہو۔ ایک تو لباس کا فرق۔ دوسرے اُس وقت پھولوں سے تمہارا منہ چھپا ہوا تھا۔ اس لئے میں تمیز نہ کر سکی۔ لو اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔

دولہا: اب اُن کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا سو گئی ہیں؟

ڈاکٹر: طبیعت کا وہی حال ہے۔ کمزوری بہت ہے اور بخار بھی۔

اتنے میں ان دونوں کا کھانا آ گیا۔ دُولہا اور ڈاکٹر نے ایک ہی میز پر کھایا۔ اختر اسی طرح لیٹی رہی۔ ڈاکٹر نے ہر چند کوشش کی کہ ایک پیالی یخنی کی پی لے تو بہت اچھا ہو مگر اُس نے نہ پی۔ ڈاکٹر نے کپڑے بدلوانے چاہے کہ رات کی قمیص پہن کر آرام سے سو سکے مگر اُس نے یہ بھی نہ مانا۔ تمام زیور انہوں نے اُتار دیا۔ دولہا اور ڈاکٹر صاحبہ بھی اس کمرے میں سوئے اور رات کو دونوں دوا دینے کو اُٹھتے رہے۔

صبح سویرے ہی بیگم نے چوتھی کا بلاوا بھیج دیا۔ دس بجے سے پیشتر ڈاکٹر اور دُلہن دولہا وغیرہ سب رفیق منزل چلے گئے۔ دولہا کی اماں نے منوں ترکاریاں دُلہن کے ساتھ کی تھیں۔ دُلہن بیچاری تو وہاں جاتے ہی لٹا دی گئی اور لاڈلی اور مہمان بیبیوں نے دولہا کے ساتھ چوتھی کھیلی۔ اُسی دن شام کو دُلہن دولہا اور ڈاکٹر پھر واپس دوسری کوٹھی چلے گئے۔ بس اسی طرح چالے ہوتے رہے۔ ایک ہفتہ اختر کے سسرال والے چاروں چالوں کے لئے یہاں ٹھہرے۔ آٹھویں دن جمعہ کی صبح کو میرٹھ سے چلے جانا تھا۔ جمعرات کے دن اختر اپنے والدین سے رُخصت ہونے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کی صحت کا وہی حال تھا اور وکیل صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو ساتھ جانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ رات کے ۹ بجے کا وقت تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ اپنے چلنے کا سامان کرنے کو گھر گئی ہوئی تھیں۔ لاڈلی بھی اختر کے کمرے سے نکلی تھی۔ غمگین اختر پلنگ پر پڑی اپنے کمرے کے در و دیوار کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ باغیچے کے دروازے سے ڈاکٹر صاحبہ کی ملازمہ لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

اختر: بشیرن اس وقت کیوں آئی ہے۔ کیا آنٹی کے آنے میں کچھ دیر ہے۔

بشیرن: (آہستہ سے) نہیں تو۔ ڈاکٹر صاحبہ ابھی آتی ہیں۔ مجھے تو مسز وقار احمد صاحبہ نے بھیجا ہے۔ انہیں ایک چٹھی آپ کو بھیجنی تھی۔ اپنی کسی لڑکی کے ہاتھ اس لئے نہیں بھیجا کہ شاید کوئی اندر آنے سے روکے۔

مجھے بلا کر چٹھی دی ہے کہ آپ تک پہنچا دوں۔ کیوں کہ میں ہر وقت آتی جاتی رہتی ہوں۔

اختر نے دونوں لفافے لے کر پڑھے۔ ایک تو خالہ کا تھا جس میں بہت کچھ سمجھایا اور اس کی دلجوئی کی تھی اور دوسرا اختر حسن کا تھا۔ وہ بھی خالہ ہی نے لکھوایا تھا کیوں کہ جن باتوں کو وہ جانتی تھیں کہ اختر مجھے جواب نہ دے گی۔ وہ اس کے بھائی سے لکھوا دیتی تھیں۔

اختر حسن کا خط

میری نہایت پیاری بہن۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

مجھے تم سے ملے آج ۱۱ دن ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱ سال گذر گئے اور وہ ملنا بھی کیا ملنا تھا جس کے خیال سے دل گھبرا جاتا ہے۔ تمہیں کس قدر کمزور دیکھا تھا۔ اچھا خدا اب تمہیں صحت دے اور یہ نئی دنیا تمہیں مبارک ہو۔

پیاری بہن کیا افسوس اور تعجب کی بات نہیں کہ تمہاری شادی کو آج ۸ دن ہوئے اور ہمیں آج تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ وہ لوگ کون ہیں اور میرے عزیز بہنوئی کا نام کیا ہے؟ اتنا تو سنا ہے کہ وہ لوگ کانپور سے آئے ہیں۔ میں نے ہر چند چاہا کہ کسی طرح اس شخص کو دیکھ لوں جس کے ساتھ میری عزیز بہن کی زندگی وابستہ ہوئی ہے مگر افسوس کہیں نظر نہ پڑا۔ میں تو خالو جان کی خدمت میں حاضر ہونے کو تیار تھا۔ گو وہ مجھے عزت و محبت کی نظر سے نہ دیکھتے مگر ''اُسے'' دیکھ لیتا۔ افسوس کہ اماں جان نے وہاں جانے کی اجازت

نہ دی۔ آج آنٹی ایلس سے معلوم ہوا کہ صبح تم میرٹھ سے رخصت ہونے والی ہو اور صحت کی یہ حالت ہے کہ آنٹی ساتھ جاتی ہیں۔ نہ معلوم تمہارے سسرال والے ہم سے خط و کتاب کی اجازت دیں یا نہ دیں۔ اس لئے تکلیف دیتا ہوں کہ مجھے اتنا بتاتی جاؤ کہ یہ لوگ کس حیثیت اور کن خیالات کے ہیں اور تمہارے شوہر کا نام کیا ہے میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ عمر کیا ہے اور کس قدر تعلیم پائی ہے۔ ملازم ہیں یا طالب علم۔ یا خالی بیٹھے ہیں؟ روشن خیال کس قدر ہیں؟ مزاج تمہارے موافق ہے یا کچھ اختلاف ہے؟ سب باتوں کا جواب لکھو نہیں تو لکھوا دو اور اُن کے والد کا نام بھی تا کہ مجھ خط تو لکھ سکے۔ اب ختم کرتا ہوں کہ زیادہ پڑھنے کی تکلیف نہ ہو۔

تمہارا طالب خیر بھائی
اختر حسن

اختر النساء نے یہ خط پڑھ کر بشیرن سے پنسل کاغذ منگوا کر وہیں لیٹے لیٹے یہ جواب لکھا:

میرے پیارے بھائی آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مشکور کیا۔ آپ نے جن سوالات کا جواب مانگا ہے۔ افسوس اُن سے اس وقت میں خود بھی بے خبر ہوں۔ بس اسی قدر جانتی ہوں کہ کل کانپور جانا ہے جس شخص کو آپ نہیں دیکھ سکے۔ اس کی شکل سے میں بھی اب تک ناواقف ہوں کیوں کہ سخت بیمار ہوں۔ ہر وقت منہ لپیٹے پڑی رہتی ہوں۔ ہاں کئی بار دوا اُن کے ہاتھ سے پی چکی ہوں۔ سنتی ہوں کہ بہت خوش رُو ہیں۔ نام بھی اب تک نہیں سنا۔

خط و کتابت کی بابت یہ عرض ہے کہ اب میرا لکھنا ختم ہوا۔ میں بہن نجم کے خط کا جواب نہ دے سکوں گی۔ آپ سمجھ لیں کہ اختر مرگئی۔ کاش یہ بیماری میرا فیصلہ کردے۔

سچ اگر پوچھو، تو مرجانا ہے جی جانا میرا
غم مجھے کھالے گا جب جائے گا غم کھانا میرا
اپنے بیگانے عزیز و اقربا چھٹتے ہیں اب
وقت آخر یہ نہیں بیکار گھبرانا میرا

آہ پیاری نجم کو کیا لکھوں؟ بس کچھ نہیں لکھا جاتا اور نہ آئندہ لکھا جاسکے گا کیوں کہ اب میں اپنے شوہر کی بے اجازت کوئی کام نہ کروں گی۔ گو انہوں نے مجھے اب تک کچھ نہیں کہا۔ لیکن آپ سب سے خط و کتابت کرنے کی میں ان سے اجازت نہ مانگوں گی۔ کیوں کہ جس طرح میری زندگی نے پلٹا کھایا ہے۔ اسی طرح میں بھی اس کے مطابق بسر اوقات کروں گی۔ کل میں آخری بار میرٹھ سے رخصت ہوتی ہوں۔ افسوس کہ خالہ جان کی صورت اور والدہ مرحومہ کی قبر تک نہ دیکھ سکی۔ میں جب پڑھنے کو جایا کرتی تھی تو قبر سے ہوتی ہوئی اسٹیشن پر جاتی تھی۔ اب جو ہمیشہ کے لئے چلی تو قبرستان جانا بھی نصیب نہ ہوا۔ اس لئے کہ میں دلہن ہوں۔ قبرستان جانا نحس اور بدشگونی ہے۔ میں نے اس کو بھی صبر کیا۔ یہ ظلم بھی اُٹھالیا۔ بھائی میرا یہ آخری خط ہے۔ اب کبھی لکھ کر بھی اپنا نہ بتاسکوں گی اور آپ کو بھی منع کرتی ہوں کہ میرے لئے خالہ صاحبہ پیاری نجم اور آپ کا کوئی خط کانپور نہ جائے۔ بس اب سے میں خاموش ہوتی ہوں۔ لیکن۔

سب زبانِ حال سے کہتی ہے حالِ درد و غم
جس کو کہتے ہیں خموشی ہے وہ گویائی میری

گھٹ نہیں سکتی ہے میری ہمت صبر و شکیب
کچھ گئی گذری نہیں ایسی شکیبائی میری

اب ختم کرتی ہوں۔ سر میں سخت درد ہونے لگا۔ خالہ اور خالو جان کی خدمت میں میرا آخری سلام پہنچادیں اور یہی پرچہ میری انجم کو دے دیں۔

آپ کی بدنصیب بہن
اختر

خط تمام کر کے بشیرن کو دیا۔ اس کے نکلتے ہی ڈاکٹر صاحبہ مع سامان سفر کے آگئیں اور انہوں نے اپنے اسباب میں سے ایک بکس اختر کے سامنے کھولا جس میں ایک بیش قیمت ریشمی جوڑا اختر کے لئے تھا اور بہت سی چیزیں، کیک، بسکٹ، سیب، انگور وغیرہ ناشتہ کے لئے مسز وقار احمد صاحبہ نے ڈاکٹر صاحبہ کے گھر بھجوادی تھیں۔ تا کہ راستے میں ڈاکٹر صاحبہ کو تکلیف نہ ہو۔ مس صاحبہ اختر کو یہ سامان دکھارہی تھیں کہ ظفریاب (یہ خطاب بیگم صاحبہ نے داماد کو دیا تھا) دولہا بھی آگئے۔ ان دونوں نے کھانا بھی ساتھ ہی کھایا۔ اختر لیٹی رہی اور سب سو رہے اور صبح سب سدھیانے والے مع دلہن اور اس کی ڈاکٹر کے کانپور روانہ ہوگئے۔

پندرہواں باب

اختر النساء کا سسرال کانپور

اب یہ ساری عمر کا ہے رنج و غم کھانا مرا
میری شادی تھی کہ تھا آفت میں پڑ جانا مرا

آج پھر ناظرین حیدر علی کے گھر کا سماں دیکھیں۔ مکان تو اسی حالت میں ہے۔ نہ صفائی ہی نظر آتی ہے اور نہ کہیں فرش وغیرہ۔ لیکن آج اس مکان میں غیر معمولی چند نئے آدمی جمع ہیں۔ نثار علی کے بیوی بچے وغیرہ بھی سب یہیں ہیں۔ لباس بھی ان سب کا عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوشی کی تقریب ہے۔ بہت سا نیا سامان بھی جابجا گھر میں رکھا نظر آتا ہے جس کے سنبھالنے میں حیدر علی کی بیوی سرپٹ مصروف ہیں، کہیں انہوں نے اپنے بیٹے ظفر علی کی شادی تو نہیں کر لی؟ بے شک ہمارا خیال درست نکلا۔ ذرا سنئے، صحن کی دیواروں اور کوٹھے پر بہت سی پڑوسنیں حیدر علی کی بیوی سے کہہ رہی ہیں کہ بوا اپنی بہو کا منہ کب دکھاؤ گی؟ کتنی دیر ہوئی تمہاری بہو کو آئے؟ ہمیں منہ دیکھنے کے لئے ازاجت (اجازت) کیوں نہیں ملتی؟"

نہ معلوم دیوار کے قریب جا کر حیدر علی کی بیوی نے کیا کہہ دیا کہ وہ سب خاموش ہو گئیں۔ حیدر علی کی بیوی (جن کو آئندہ والدہ ظفر لکھا جائے گا) نے چولہے کے پاس آ کر آگ جلائی اور ہنڈیا رکھی۔ دالان کی طرف سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ دیکھیں

تو یہاں کون کراہتا ہے؟ او ہو لیڈی ڈاکٹر بھی موجود ہے۔ ایک بان کے بنے ہوئے پلنگ پر جھم جھماتا سرخ لباس پہنے ایک لڑکی بیمار پڑی ہے جس کا سر زانو پر دھرے سرہانے میم بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں دوا کی شیشیاں اور پیمانہ ہے اور آہستہ آہستہ بیمار سے کچھ کہہ رہی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر: میری پیاری بچی دیکھو۔ ذرا ہوش کرو۔ تم سمجھ دار ہو۔ یہ دوا پی لو گذشتہ چند گھنٹوں میں تمہیں تین بار غش آچکا ہے۔ یہ دوا پی لو کہ تم میں کچھ طاقت آئے اور میں کوئی تدبیر کروں۔

بیمار: ہائے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اب اچھی ہو چکی۔ آہ میرے ساتھ سخت فریب کیا گیا۔ اب میرا زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔

ڈاکٹر: نہیں نہیں تم کیا کہتی ہو؟ ایسی باتیں نہ کرو۔ انسان دنیا میں سختیاں جھیلنے کو پیدا کیا گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ میری چاند دوا پی لو۔

بیمار: ہیں میرا اسرال یہ گھر ہے؟ یہ تو میرا مدتوں کا دیکھا ہوا ہے۔ گو میں بیمار ہوں مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ اُن کا گھر ہے۔

ڈاکٹر: کیا تمہیں یہاں آنے کی اُمید نہ تھی اور کوئی گھر سمجھتی تھیں یا یہاں کا غریبانہ سامان دیکھ کر گھبرا گئیں؟

بیمار: بے شک یہی بات ہے۔ میں اب تک نہ سمجھتی تھی کہ یہاں آنا ہے یہ تو فقیرانہ ذلیل اُنہیں کا گھر ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہی تھا۔ میرٹھ میں میرے سسرال والے کس شان و شوکت کے آدمی معلوم ہوتے تھے، کیسا امیرانہ ٹھاٹھ تھا۔ آہ آہ یہ سب میرے ابا جان کے لئے جعل سازی کی گئی تھی۔ ہائے یہ لوگ تو وہی ہیں وہی۔

یہ آخری الفاظ کہتے ہی بیمار بیہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے سر پلنگ پر رکھ دیا اور فوراً کھڑی ہو کر ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔

اسی وقت بیمار لڑکی کا شوہر ظفر علی بھی آگیا اور پریشانی میں پلنگ کے اِس طرف کبھی اُس طرف پھرتا رہا۔ بہت دیر بعد بیمار کو ہوش آیا اور آنکھیں کھول کر ڈاکٹر اور شوہر کی طرف دیکھا۔ اس کو ہوش میں دیکھ کر ڈاکٹر کو ذرا اطمینان ہوا تو ظفر علی سے کہا۔

ڈاکٹر: ہم حیران ہیں کہ تم کون اور کیسے آدمی ہو؟ میرٹھ میں تمہاری اور ہی

شان تھی۔ امیرانہ ساز و سامان بالکل نواب ہی معلوم ہوتے تھے اور گھر میں کچھ اور ہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے تم نے امیر کی لڑکی حاصل کرنے کو یہ جعل کیا تھا۔ خیر وہ بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ دُنیا پرست بد باطن لوگ دولت حاصل کرنے کو ایسے ایسے جعل کر لیتے ہیں لیکن بڑی سخت وحشیانہ خلاف انسانیت بات یہ ہے کہ تم نے اپنی امیر اور بیمار بی بی کے لیے ذرا بھی آرام کا سامان نہیں کیا۔ جہاں میرٹھ میں اس قدر روپیہ خرچ کیا تھا۔ یہاں بیٹھنے تک کو ٹھکانا نہیں۔ کتنی دیر گذر چکی ہے۔ ہمیں آئے۔ اس بے بستر کے پلنگ پر ہی بیمار پڑی ہے اور تمہارے اماں باوا سامان جہیز سنبھالنے بند کرنے میں لگے ہیں۔ اتنا خیال نہیں کرتے کہ جب آ گیا ہے تو اُنہیں کا مال ہے۔ پہلے بہو کو آرام دے لیں۔ پھر اسباب سمیٹیں۔ اے دنیا پرستو خدا سے ڈرو۔

ڈاکٹر صاحبہ کی یہ لمبی تقریر سن کر شرم سے ظفر کا سر نیچے جھک گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کر کانپتی ہوئی آواز میں اتنا کہا۔

ظفر: جناب ڈاکٹر صاحبہ جو کچھ آپ نے فرمایا۔ سب بجا ہے۔ بے شک ہم اس نعمت کے قابل نہ تھے۔ یہ سب میرے والدین کی جعل سازی کا نتیجہ ہے کہ یہ قابل قدر عالی رتبہ بیمار بیگم اس فقیر خانے میں سخت مبتلائے مصیبت ہیں۔ کاش میں پیدا نہ ہوا ہوتا اور ہوا تھا تو زندہ نہ رہا ہوتا کہ میرے ذریعے میرے ناخدا ترس ظالم والدین ایک معصوم، فرشتہ خصلت، ناز پروردہ لڑکی کو گرفتار مصیبت کرتے۔ آپ یقین کریں کہ میں بالکل بے قصور ہوں اور اپنی قابل پرستش بیگم کا غلام فرمانبردار ہوں۔

ان دونوں کی باتیں بیمار نے سنیں اور کہا۔

بیمار: میری مہربان ڈاکٹر آپ چند منٹ کے لئے صحن میں چلی جائیں تاکہ میں اپنے شوہر سے کچھ پوچھ لوں۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر فوراً کمرے سے باہر ہو گئی اور ظفر پلنگ کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بیمار دُلہن نے اپنے شوہر کے روبرو ہو کر بات کی۔

دُلہن: میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ چونکہ میں بیمار ہوں مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ پہلے میں کون تھی اور کیا تھی، وہ سب جاتا رہا۔ اب آپ کی ادنیٰ تابعدار ہوں اور آپ کی ذات سے میری زندگی وابستہ ہے۔ للہ میری والدہ اور اپنے

والدین کی طرح مجھے دھوکے میں نہ رکھو نہ معلوم میں کتنے عرصے کے لئے آپ کی خدمت میں مہمان ہوں۔ اس لئے جو کچھ میں پوچھوں سچ بتادو۔

ظفر: (روتے ہوئے نہایت شرمندگی کے لہجہ میں) میری باعث فخر بیگم۔ آپ اس قدر بے جا انکسار نہ کریں۔ آپ میری ملکہ ہیں اور میں ناچیز خادم جو کچھ بھی دریافت کرنا چاہتی ہیں۔ بے تامل کہہ دیں۔ میں جواب دینے کو حاضر ہوں۔

شوہر کے یہ الفاظ سن کر بیمار دُلہن نے نہ معلوم نہایت آہستہ کیا کیا کہا جس کا جواب بھی اس قدر آہستہ دیا گیا۔ اس کے بعد بیمار نے آنکھیں بند کرلیں اور ظفر نے ڈاکٹر صاحب کو اندر بلالیا۔ اُنہیں یہاں بٹھا کر خود باہر گیا اور ماں پر بہت خفا ہوا کہ تم نے بیٹھنے تک کو جگہ نہیں بتائی۔ کھرے پلنگ پر بیمار کو ڈال رکھا ہے۔ تمہارے گھر واہے میں سامان نہیں تو اُن کے ساتھ تو سب کچھ آیا ہے۔ وہی پلنگ کیوں نہ بچھوادیا؟

والدہ: اللہ رے اللہ! ابھی سے یہ پاؤں نکالے! بیوی کو آتے دیر نہیں لگی کہ ماں سے بگڑنے لگے۔ میں کام دھندا کروں کہ بی نازہ کے پلنگ بچھاؤں؟ اور چاندی کا پلنگ تو بڑے بڑے امیر بھی نہیں بچھاتے وہ تو کھڑا ہی رہتا ہے۔

ماں کا یہ جواب سن کر ظفر نے خود دوسری کوٹھری سے جہیز کی پلنگیری نکال کر اپنی کوٹھری میں بچھائی۔ یہ کوٹھری بھی نہایت تنگ و تاریک تھی اور چھت کی کڑیاں بھی نیچے کو جھک رہی تھیں۔ سفیدی بھی بہت پرانی تھی۔ جھاڑو بھی بہت دن سے نہ دی گئی تھی۔ ایک دیوار سے کھونٹیاں لگی تھیں۔ جن پر ظفر کے کوٹ واسکٹ وغیرہ ٹنگ رہے تھے اور دوسری دیوار سے لگے ہوئے زمین پر دو ٹرنک رکھے تھے۔ دُلہن کے سامانِ جہیز سے یہاں کچھ نہ رکھا گیا تھا اس کے لئے جعل سازی کی گئی تھی۔ ہائے یہ لوگ تو وہی ہیں وہی کہ جہیز کی کل چیزیں حیدر علی کی بیوی اپنے ہی قبضہ میں رکھنی چاہتی تھیں۔ ظفر جب پلنگ بچھا کر بستر کر چکا۔ تو ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اُن کو میں اندر لے چلوں۔ اُنہوں نے خود ہی بیمار کو وہاں سے اُٹھا کر کوٹھری میں لٹادیا اور چاروں طرف دیکھ کر ظفر سے کہا۔

ڈاکٹر: تم نے کہاں پلنگ بچھادیا؟ یہ جگہ بالکل تاریک ہے۔ روشنی اور ہوا کا گذر نہیں۔ بیمار کو ایسی جگہ نہیں رکھنا چاہیے۔ ان کو بخار تو پہلے ہی ہے۔ اس سیلاب و تاریکی

کے اثر سے لنگز (پھیپھڑے) خراب ہونے کا بہت خطرہ ہے۔

ظفر: آپ کا خیال بالکل درست ہے مگر میں مجبور ہوں کہ اس کے سوا میرے مکان میں اور کوئی جگہ نہیں۔ دوسری کوٹھری میں گھر کا اور اُن کا اسباب ہے اور وہ بھی ایسی ہی تاریک ہے۔ دالان میں جہاں سے آپ آئیں ہیں۔ اماں اور آبا سوتے ہیں اور صحت کے لحاظ سے وہ بھی کچھ اچھا نہیں۔

ڈاکٹر: آہ اس بیمار کی قسمت! میں اب کیا کروں؟ کہاں لے جاؤں اگر آگ جلاتی ہوں تو کوٹھری تو بے شک گرم ہو جائے گی لیکن دھواں اس کی صحت کو سخت مضر ہوگا، نہ یہاں چمنی، نہ روشن دان۔ دروازہ بہت تنگ ہے جو دھوئیں کو باہر نہ نکال سکے گا۔ کیا تم اور میں اس کو زنانہ ہسپتال میں لے جائیں؟ وہ بہت اچھی پردہ کی جگہ ہے اور تمہارے مکان سے بہت قریب ہے۔ ایسا کرو تو بہت اچھا ہو۔

ظفر: آپ بہت درست کہتی ہیں۔ وہاں لے جانے سے بہت جلد تندرست ہو جائیں گی مگر میرے والدین کبھی اجازت نہ دیں گے کہ نئی بیاہی دُلہن شفا خانے بھیج دی جائے کیوں کہ یہ لوگ شفا خانے جانا سخت عیب سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر: اچھا شفا خانے نہ سہی۔ میں یہاں ڈاک بنگلے کے دو کمرے لے لوں گی۔ دوائیں تو سب میرے ساتھ ہیں۔ ہسپتال کی ضرورت نہیں۔ صرف جائے رہائش عمدہ چاہئے۔

ظفر: ہم لوگ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنا بھی سخت معیوب سمجھتے ہیں۔ سرائے کی تکلیف برداشت کرتے ہیں مگر وہاں نہیں جاتے۔

ڈاکٹر: یہ بھی نہ سہی۔ ہمارے پاس روپیہ کافی ہے۔ تم خرچ سے نہ ڈرو۔ میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لوں گی۔ تم اپنے ماں باپ کو بھی وہیں لے چلو جب تک یہ بیمار ہے۔ وہیں رہیں گے۔ پھر میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ تم سب اس مکان میں چلے جانا۔ تندرست ہوتی تو وہ سب تکلیفیں برداشت کر لیتی اور جب تک زندہ رہے گی کرے گی۔ یہ صلاح تو صرف ایام بیماری کے لئے ہے۔ آخر اُس کی جان رکھنی بھی فرض ہے۔

ظفر: مَیں آپ کی اس قدر مہربانی کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ پر کیا کروں؟ والدین یہ بھی نہ مانیں گے۔

بیمار: ڈاکٹر صاحب آپ کیوں فضول جھگڑا کرتی ہیں؟ میرا یہی گھر ہے اور اب میں یہیں زندگی بسر کروں گی۔ اچھا ہے یا برا جیسا بھی ہے اگر زندہ رہی تو دسیوں دفعہ بیمار پڑوں گی۔ جہاں رہنا، وہیں بیمار بھی ہونا، اور وہیں مرنا۔ اب تو سب کچھ یہیں ہوگا۔ آپ کہاں تک کوٹھیوں میں لے جایا کریں گی؟ معلوم ہوتا ہے آپ یہاں کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتیں۔ سو میں نہایت خوشی سے کہتی ہوں کہ آج ہی شام کی ٹرین سے آپ میرٹھ تشریف لے جائیں۔ آپ کی مہربانی سے مجھے بھی اتنی شناخت ہوگئی ہے کہ مناسب اوقات پر دوا پیتی رہوں گی۔

ڈاکٹر صاحب ابھی اس کا جواب نہ دینے پائی تھیں کہ ایک عورت کھانا لے آئی۔ ظفر نے ایک پرانا سا اسٹول جس پر وہ لالٹین رکھا کرتا تھا۔ ڈاکٹر کی کرسی اور پلنگ کے درمیان رکھ کر اس پر کھانے کی سینی رکھوالی۔ اوپر سے کپڑا اٹھایا تو صرف تین رکابیوں میں میٹھے چاول رکھے تھے۔ دیکھ کر حیران رہ گیا اور ڈاکٹر سے کھانے کو بھی نہ کہہ سکا۔

ڈاکٹر: ظفر یہ تمہارے واسطے کھانا آیا ہے تو کھاؤ نا!

ظفر: جناب ہم دونوں کا ہے۔

ڈاکٹر: (تھوڑے سے چاول چکھ کر) یہ سب میٹھے چاول ہیں۔ ہم نے ایسے شیرے میں پکے ہوئے چاول کبھی نہیں کھائے۔ خیر ہماری کچھ پرواہ مت کرو۔ ہمارے کھانے کی چیزیں ساتھ ہیں۔ اس غریب بیمار کے واسطے کچھ منگاؤ۔

ماما: میم صاحب دُلہن جی کے لئے بھی یہی چاول ہیں۔

ڈاکٹر: اوہو، یہی چاول ہیں! بیمار ایسی ثقیل غذا ہضم کرسکتی ہے؟ کیا تمہارے گھر کبھی کوئی بیمار نہیں ہوتا؟

ماما: میم صاحب بیمار کیوں نہیں ہوتے۔ ہم لوگوں میں تو مونگ کی دال چپاتی بیمار کو کھلاتے ہیں اور ڈاکٹر لوگ دودھ اور خشکا بتایا کرتے ہیں۔ اس واسطے ہم نے میٹھے چاول پکائے ہیں کہ دودھ ملا کر دُلہن جی کو کھلادوں گی تو وہی بات ہوجائے گی۔ آخر دودھ اور خشکے میں بھی میٹھا پڑتا ہے اور اس میں بھی وہی ہے۔

ڈاکٹر: اچھا تم یہاں سے چلی جاؤ اور ہمارے واسطے جس قدر چاول لائی ہو

لے جاؤ۔ ہمارے ساتھ دونوں کی خوراک ہے۔ چونکہ ہم بیگم صاحب کے واسطے تازی یخنی چاہتے تھے۔ اس واسطے تم سے بولا تھا۔

یہ حکم سن کر وہ عورت یخنی اُٹھا کر چلتی ہوئی اور پیچھے ظفر بھی چلا گیا۔

ڈاکٹر صاحبہ نے اپنا ٹفن باسکٹ کھول کر اپنے لئے بسکٹ، دو انڈے، تھوڑا کیک وغیرہ نکالا اور بیمار کے لئے ایسنس آف چکن (چوزوں کی یخنی جو ولایت سے بنی بنائی ڈبیوں میں بند ہو کر آتی ہے) کی ڈبیا کھول کر دو چمچے یخنی نکالی۔ بس اسی میں دونوں کا گذارہ ہو گیا۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر نے بیمار سے کہا:

ڈاکٹر: بیٹی تم اس طرح زندگی کیسے بسر کرو گی؟ جب شروع میں یہ حال ہے تو آئندہ کیا کچھ نہ ہو گا۔

بیمار: آپ کچھ فکر نہ کریں۔ میری اسی طرح گذر جائے گی۔ اوّل تو شاید یہی بیماری میرا خاتمہ کر دے اور اگر زندہ رہی تو جس طرح مصیبت زدہ بسر کرتے ہیں میں بھی کروں گی۔ آپ کو سخت تکلیف ہے مجھے اس کا بہت رنج ہے۔ آپ تشریف لے جائیں تو اچھا ہے۔

ڈاکٹر: میں تم کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ جب تک تمہارے آرام کا بندوبست نہ کرلوں گی نہ جاؤں گی۔ میں نے پندرہ دن کی رخصت کی تھی۔ ابھی تو پانچ دن اُس کے باقی ہیں۔

بیمار: آپ میرا کیا بندوبست کریں گی۔ مَیں کچھ نہیں کروانا چاہتی۔ بس اسی طرح رہوں گی۔

یہ دونوں یہی باتیں کر رہی تھیں کہ والدہ ظفر مع بہت سی عورتوں کے آ پہنچیں اور بے کہے سنے بیمار بہو کو اُٹھا اٹھا کر ان سب کو منہ دکھانے لگیں۔

ڈاکٹر صاحبہ بالکل خاموش دیکھتی رہیں اور اس خیال سے کچھ نہ کہا کہ یہ جاہل ضدی عورتیں کبھی نہ مانیں گی۔ آدھا گھنٹہ اس بیمار پر اس کشمکش میں گذر گیا جب وہ عورتیں منہ دیکھ کر چلی گئیں تو آپ نے وہ رومال سمیٹا جو رونمائی کے پیسے جمع کرنے کو دلہن کے آگے بچھا دیا تھا۔ پھر دلہن کو اسی طرح لٹا دیا تو ڈاکٹر صاحبہ نے کہا۔

ڈاکٹر: بی بی ہم تو تمہیں انسان اور شریف جانتے تھے۔ پر افسوس تم بالکل وحشی نکلیں۔ ابھی تھوڑی دیر پیشتر تمہاری بہو کو غش آیا تو تم نے آکر دیکھا بھی نہ تھا اور پیسہ جمع کرنے کے لئے بیمار کو اس قدر تکلیف دی۔ تم سے خدا سمجھے۔

ظفر کی والدہ نے کچھ جواب نہ دیا اور کوٹھری سے باہر چلی گئیں اور اسی مصیبت میں چار دن گذر گئے۔ کھانا ڈاکٹر صاحبہ اپنے پاس سے ہی کھاتی رہیں۔ اُن کا تو کیا۔ بیمار کے کھانے کا خیال بھی کسی نے نہ کیا۔ ظفر بے چارا کر ہی کیا سکتا تھا؟ وہ ماں باپ کا تابعدار تھا۔ اپنے پاس پیسہ نہ تھا۔ بیمار اپنے آپ کو بہت سنبھالتی تھی کہ کسی طرح صحت میں فرق معلوم ہو تو ڈاکٹر صاحبہ یہاں سے چلی جائیں۔ ہر چند اُن کو جانے پر مجبور کرتی تھی مگر بیمار چھوڑ کر وہ بھی نہ جاتی تھیں۔ انہوں نے ایک ہفتہ کی رُخصت کی اور درخواست کر دی تھی اور اُن کا ارادہ تھا کہ جب تک اسے پوری صحت نہ ہو جائے دشمنوں میں تنہا چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔

ان کو یہاں آئے پانچ دن ہو گئے تھے۔ چار بجے سہ پہر کا وقت تھا۔ دالان کے آگے ٹوٹے ہوئے چبوترے پر پلنگ بچھا تھا جس پر اپنی مریضہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحبہ بیٹھی تھیں۔ اور ظفر پلنگ کے قریب ٹہل رہا تھا۔ اس کی والدہ چولہے پاس آٹا گوندھ رہی تھی کہ ہاتھ میں تار لئے حیدر علی باہر سے سیدھے مس صاحبہ کے پاس آئے اور لفافہ اُن کو دے کر کہا۔

حیدر: میم صاحبہ مہربانی کر کے یہ تو پڑھ دو۔ یہ تار کس کا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ تار والا کہتا ہے کسی اور کا ہے اور تمہارے پتے سے آیا ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ نے لفافہ دیکھتے ہی فوراً چاک کر کے پڑھنا شروع کیا اور تار کا نام سن کر آٹا چھوڑ بھرے ہوئے ہاتھوں سے پریشان، منہ فق، تیز قدم چلتی والدہ ظفر مس صاحبہ کے پاس پہنچیں اور گھبرا کر کہا۔ خیر تو ہے۔ یہ تار کس کا ہے؟ ہے ہے میرے تو ہوش اُڑ گئے۔

ظفر: اماں تم کیوں اتنا گھبرائی جاتی ہو۔ تمہارا کون دور ہے جس نے تار دیا ہو گا؟

والدہ: اے بیٹے تار کا نام ہی ایسا ہے میں کیسے نہ گھبراؤں؟ نہ جانے کس کا ہے۔

ڈاکٹر: (نہایت افسردگی سے) آپ ذرا نہ گھبرائیے۔ یہ تار مجھ بدنصیب کا ہے تب ہی میں نے کھول دیا۔

پھر حیدر علی سے کاغذ پنسل لے کر رسید پر دستخط کئے اور تار ظفر کے ہاتھ میں دے

دیا۔ چند منٹ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد یہ کہہ کر کہ مجھ سے سارا نہیں پڑھا گیا۔ دو سطریں میری سمجھ میں بالکل نہ آئیں۔ تار پھر ڈاکٹر کو دے دیا۔

بیمار نے وہ کاغذ ڈاکٹر سے لینا چاہا لیکن انہوں نے نہ دیا تو اس نے کہا۔

بیمار: آپ مجھے کیوں نہیں دیتیں؟ شاید میرے ابا جان یا خالہ صاحبہ کا ہے اور کسی کی طبیعت علیل ہے۔

ڈاکٹر: (کاغذ ہاتھ میں دے کر) لو دیکھ لو۔ مَیں نے اس لئے نہ دیا تھا کہ میرے رنج سے تمہیں رنج ہوگا۔ اب تم اپنے عزیزوں پر خیال کرنے لگیں۔ اس لئے دیتی ہوں۔ آہ میری عزیز جان سے زیادہ عزیز بہن ایرس دُنیا سے اُٹھ گئی اور پیارا بھائی جیمس الگزینڈر بھی پلیگ سے بیمار ہے۔

اب مس صاحبہ کو ضبط کا یارا نہ رہا اور منہ پر رومال رکھ کر رونے لگیں۔ بیمار نے کاغذ پڑھ کر پلنگ پر ڈال دیا اور روتی ہوئی ڈاکٹر کے زانو پر سر رکھ دیا۔ چند منٹ یہی حال رہا لیکن کسی نے اُن کی دلجوئی و تسلی نہ کی۔ والدہ ظفر تو آہستہ منہ میں یہ کہتی ہوئی کہ "توبہ میرا تو کلیجہ دہل گیا اور موئے فرنگی کی خبر ملی۔" چولہے پاس جا بیٹھی۔

ظفر چاہتا تھا کہ کسی طرح ان دونوں کو تسلی دے مگر اس خیال سے جھجکتا تھا کہ مجھ میں اتنی لیاقت نہیں اور نہ انگریزوں کے طریق معلوم کہ کس طرح غمگین کو تسلی دیا کرتے ہیں۔ اس لئے الگ ہی ٹہلتا رہا۔ آخرکار بیمار کی کمزوری کا خیال کر کے ڈاکٹر نے خود ہی دل کو سنبھال کر رونا بند کیا اور بیمار کو علیحدہ کر کے بٹھایا اور سمجھانے لگیں۔

بیمار: آہ آنٹی کیا اب میں پیاری ایرس کو نہ دیکھوں گی؟ میری ایرس ہمیشہ کو مجھ سے جدا ہوگئی۔

ڈاکٹر: ہاں وہ تو ہوگئی۔ پر تم صبر کرو۔ اپنی حالت نہ بگاڑو۔ تمہاری دوست تھی اور میری حقیقی بہن تھی۔ دیکھو میں نے صبر کیا۔

بیمار: اب آپ کو بہت جلد چلا جانا چاہئے۔ پر یہ واقعہ کہاں گزرا ہے؟ وہ سب کہاں ہیں؟

ڈاکٹر: تم نے تار نہیں پڑھا؟ یہ بمبئی سے آیا ہے۔ ایرس وہاں ڈاکٹری پڑھتی

تھی۔ تم جانتی ہی ہو۔ میرا بھائی الگزینڈر لنڈن سے آرہا تھا۔ میرے پاس آنے کو تھا۔ چھوٹی بہن سے ملنے کو کچھ دن بمبئی ٹھہر گیا۔ بس اب اسی ہفتہ میں ایرس کو پلیگ ہو گیا ہوگا جب وہ مرگئی۔ تو وہ بھی بیمار ہو گیا اگر صرف ایرس کے مرنے کی خبر آتی تو میں تمہیں بیمار چھوڑ کر کبھی نہ جاتی۔ کیوں کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا لیکن جیمس بھی بیمار ہے۔ اس لئے میں ضرور جاؤں گی۔ مجھے اُمید ہے، وہ بھی نہ بچے گا، اُسے دیکھ تو لوں۔

بیمار: یہ سب کچھ بمبئی میں ہوا۔ آنٹی ایرس کی موت کی خبر پڑھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا تھا۔ اس لئے کچھ نہ پڑھ سکی۔ تار تو میرٹھ سے واپس ہو کر آیا ہوگا۔

ڈاکٹر: ہاں وہیں سے آیا ہے۔ چونکہ میں گھر پر نہ تھی۔ تار تمہارے گھر گیا ہوگا وہاں سے تمہارے والد صاحب نے یہاں بھیج دیا۔ اچھا اب میں جانے کا سامان کرتی ہوں۔

ظفر: ڈاکٹر صاحبہ آپ کی بہن کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔

ڈاکٹر: آپ کو بھی افسوس ہوا۔ میں اس ہمدردی کی مشکور ہوں (بیمار سے) تمہیں تکلیف تو ہوگی۔ چلو ذرا میرے ساتھ اندر۔ میری چیزیں الگ کردو۔

بیمار: چلئے تکلیف کاہے کی ہے۔ اب میں چلنے پھرنے کی عادت ڈالتی ہوں۔ بخار تو اُترتا ہی نہیں۔ پلنگ پر کب تک رہوں گی؟ دونوں کوٹھری میں آئیں۔ ڈاکٹر نے اپنا اسباب درست کیا اور مریضہ لڑکی سے کہا۔

ڈاکٹر: تمہاری جو چیزیں میرے پاس ہیں۔ وہ لے لو تو اچھا ہے۔ کیوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ واپس آؤں گی بھی یا نہ آسکوں گی اگر جیمس بھی ایرس کے پاس گیا تو پھر میرا ہندوستان میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ والدین کے بعد میں ضرور انگلستان چلی جاتی لیکن ایرس سے میرا دل لگا رہا۔ ادھر تم لوگوں نے نہ چھوڑا دن گزر گئے۔ اب مجھ سے تنہا نہ رہا جائے گا۔

بیمار: (بیقرار ہو کر) ہائے آنٹی یوں نہ کہیے۔ خدا انکل جیمس کو صحت دے اور آپ پھر واپس میرٹھ آئیں۔ یہ چیزیں میں یہاں نہیں رکھ سکتی۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ جو کچھ میرے ساتھ آیا ہے۔ وہ کہیں رکھا گیا ہے اور اس کی کنجیاں کس کے پاس ہیں اگر یہ بھی

میں نے لے لیا تو انہیں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ میرا شوہر اَن پڑھ اور غریب آدمی ہے۔ وقت بے وقت کے لئے کچھ میرے پاس رہنا چاہئے کیوں کہ اُن کے والدین میرے جہیز میں سے بھی اس کو کچھ نہ دیں گے، نہ معلوم مجھے کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ اوّل تو میرا دل ہی کب گوارا کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کی محبت بھری نشانیاں ہاتھوں سے گنواؤں۔

ڈاکٹر: اچھا تو میں یوں کرتی ہوں کہ سب زیور اور روپیہ اسی وقت یہاں کے ڈاک خانے میں تمہارے نام سے رکھوا آتی ہوں۔ بتاؤ کتنے عرصے کے لئے؟

بیمار: جیسا آپ چاہیں۔ ایک سال کے لئے سہی اگر زندہ رہی تو دیکھا جائے گا مرگئی تو خالہ صاحبہ کے نام کرا جاؤں گی۔

اس تجویز کے بعد رنجیدہ و مغموم ڈاکٹر صاحبہ نے وہ چیزیں ایک ہینڈ بیگ میں بند کر کے ہاتھ میں لیں اور ظفر سے یہ کہہ کر کہ ڈاک خانے سے روپیہ لینے جاتی ہوں۔ سیدھی ڈاک خانے گئیں۔ وہاں سے آئیں تو شام ہوگئی۔ کچھ عرصہ اپنی مریضہ کے پاس بیٹھی روتی رہیں۔ اور ۹ بجے شب کی ٹرین سے روانہ بمبئی ہوگئیں۔

اُن کے جانے کے بعد اس بدنصیب مریضہ اختر (ناظرین آپ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ گرفتارِ مصیبت ہماری اختر ہی ہے) پر کیا گذرا۔ پہلے تو وہ ڈاکٹر کے جاتے ہی بے ہوش ہوگئی اور جب ہوش آیا تو روتے روتے صبح کردی۔ آج وہ بالکل بے یارومددگار تن تنہا سنگ دلوں میں گرفتار تھی۔ ساس ہر وقت باتوں میں چٹکیاں لیتی تھی اگرچہ وہ بالکل خاموش تھی۔ پھر بھی کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ ہزاروں صلواتیں اس پر نہ پڑتی ہوں۔ جب اُنہوں نے کہا کہ امیر تھیں تو باپ کے گھر تھیں۔ اب تو غریبوں میں آئی ہیں۔ غریب ہیں کب تک باوا کے گھر کی یخنی پر گزارہ کریں گی؟ کھائیں یا نہ کھائیں۔ یہی دال روٹی ہے۔ اس دن سے اپنی صحت کا خیال نہ کر کے غریب اختر نے تھوڑا تھوڑا گھر کا پکا کھانا بھی شروع کردیا۔ پھر یہ کہا گیا کہ کب تک پلنگ چڑھی کھایا کریں گی؟ مانا کہ نئی دلہن ہیں۔ بیمار ہیں لیکن ایسے چوچلے امیروں میں ہوا کرتے ہیں۔ غریبوں کی بہوئیں ڈولے سے نکلتے ہی کام کرنے لگتی ہیں۔

یہ سن کر مصیبت زدہ اختر نے بخار کی حالت میں تھوڑا تھوڑا کام کرنا بھی شروع

کر دیا۔ ترکاریاں بنادیتی، چولہے پاس بیٹھ کر ہنڈیا بھون دیتی لیکن اُس پر بھی اس کا چھٹکارا نہ ہوتا۔ ایک دن بیٹے نے اماں سے کچھ روپیہ مانگا۔ انہوں نے انکار کیا۔ کہ میرے پاس نہیں اور کہا کہ تمہیں ضرورت ہی کیا ہے؟ شاید بیوی کی خاطریں کرنے کو مانگتے ہو۔ اس لئے میرے پاس نہیں ہے۔

بیٹے نے کہا کہ اتنا بہت سا تمہارے پاس جمع ہو گیا کہاں گیا؟ تین سو سے زیادہ تو میری سلامی کا میرٹھ ہی میں ہو گیا۔ خرچ کا یہ حال ہے کہ پیسے کی سونگ کی دال میں دونوں وقت کا گزارہ کرتی ہو۔

ماں بیٹوں کا یہ جھگڑا اس قدر بڑھا کہ انہوں نے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ غصہ تو ظفر کو اس قدر آیا کہ مع بیوی کے ابھی چلا جاتا مگر سوچا کہ دس روپیہ ماہوار میں گذر ہونی مشکل ہے۔ جا کر کیا کروں گا؟ پھر تیز ہو کر ماں سے کہا:

ظفر: آخر تم اتنی سنگدلی کیوں کرتی ہو؟ ہمیں اتنا تنگ کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ میری بیوی کا جہیز ہے۔ اس کا مالک میں ہوں نہ کہ تم۔

اماں: تم جہیز کے مالک جب ہوتے کہ اس شاہانہ طریق سے شادی کا کل خرچ اپنی گرہ سے کرتے۔ کئی ہزار روپیہ قرض لے کر تمہاری شادی کی ہے۔ جہیز کے مالک تم کہ ہم؟ چلو مجھے دق نہ کرو اور مع اپنی ملکہ کے میرے گھر سے منہ کالا کر جاؤ۔

یہ سخت الفاظ سن کر ظفر سے ضبط نہ ہو سکا اور بیوی سے آ کر کہا جو اس وقت اپنی کوٹھری میں جھاڑو دے رہی تھی۔

ظفر: ہاتھ سے جھاڑو پھینک آپ اس گھر کو آگ لگائیں اور چلیں۔ میں یہاں ایک منٹ نہ ٹھہروں گا۔ تم نے سنا ہو گا، والدہ نے کیا کیا کہا؟

اختر: اس قدر جلد بازی سے کام نہ لینا چاہئے۔ وہ ماں ہیں اور تم بیٹے، غصے کو جانے دو۔

ظفر: مَیں کہہ چکا ہوں کہ اب یہاں ایک منٹ نہ ٹھہروں گا۔ تمہیں یہاں آئے تین ہفتے ہوئے۔ یہ عرصہ جس طرح گزارا ہے۔ دل ہی جانتا ہے۔ گو تکلیفیں بھی ہوں گی کیوں کہ میں از حد نادار آدمی ہوں لیکن ہر وقت کا دل جلنا تو نہ ہو گا۔

اختر: اچھا اگر ایسا ہی ہے تو چند روز کے لئے تم چلے جاؤ۔ میں اُنہیں کی خدمت میں رہوں گی۔

ظفر: اُنہوں نے کہا ہے کہ اپنی بیوی کے میرے گھر سے منہ کالا کرو۔

اختر: خیر کیا ہوا۔ وہ ہماری بزرگ ہیں۔ بڑے کہا ہی کرتے ہیں۔ مجھے یہیں رہنا چاہئے۔

ظفر: آپ یقین کریں۔ میں اس حالت میں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گا اور یہاں رہ بھی نہیں سکتا اگر آپ نے میرا ساتھ نہ دیا تو آپ کی قسم ہے، ہمیشہ کے واسطے اسی باہر والے کوئیں میں منہ چھپالوں گا۔

یہاں یہ ذکر ہی تھا کہ غضب ناک ہوتے ہوئے حیدرعلی کوٹھری میں داخل ہوئے اور چلا کر کہا۔ او ناشدنی بے ایمان تو نے اپنی ماں کی بے ادبی کی۔ تجھے اس دن کے لئے پالا تھا؟ نکل جا میرے گھر سے ابھی اور اس ملکہ کو بھی لے جا جس کے فخر سے تو زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔

حیدرعلی تو یہ حکم دے کر باہر چلے گئے اور اختر زاروقطار رونے لگی۔

ظفر: اسی لئے کہتا تھا! اب بتاؤ کس کی خدمت میں رہو گی؟ میں تو ریل کے وقت کا انتظار بھی اس گھر میں نہ کروں گا۔ اس وقت چھ بجے ہوں گے۔ ۹ بجے رات کے ریل جاتی ہے۔

بدنصیب اختر فوراً کھڑی ہو گئی اور باہر آ کر ساس کے قدموں پر سر رکھ دیا لیکن اس سنگ دل کافر سینہ عورت کو بے قصور بہو پر ذرا رحم نہ آیا۔ ظفر نے دوڑ کر بیوی کو ماں کے قدموں سے اُٹھالیا اور اپنی چادر اُڑھا کر گھر سے نکل گیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد آپ میاں سے بولیں تو یہ کہ یاد نہیں بہو کیا کیا گہنا پہنے تھیں؟ بھاری بھاری چیزیں تو میں نے یہ کہہ کر پرسوں شام اتروالی تھی کہ صحن کی دیوار ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس لئے میں قیمتی چیزیں یہاں نہیں رکھتی۔ گہنا اُتار دو، تو تمہارے چچا نثار علی کے گھر رکھ آؤں، تو وہ بچ گیا۔ ہاں کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں پہنچیاں، چار چار انگوٹھیاں اور جگنی پہنے تھی بس ہاتھوں سے گیا!

اب سنئے اختر بیچاری پر کیا گذرا۔ کمزوری اور شرم سے قدم نہ اُٹھتا تھا اور میاں

کے ساتھ ساتھ چلنا پڑ رہا تھا، مصیبت بھرتی اُٹھتی بیٹھتی دو گھنٹے میں اسٹیشن پر پہنچیں۔ آٹھ بج چکے تھے اور ۹ بجے گاڑی آنے والی تھی۔ ان دونوں کے پاس اس وقت ایک پیسہ نہ تھا۔ ظفر حیران کہ ٹکٹ کس طرح خریدوں؟ وہ بھی جانتی تھی کہ میاں کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اسٹیشن پر آتے ہی ظفر نے بنچ پر اپنا کوٹ بچھا کر اختر کو لٹا دیا۔ تھوڑی دیر خاموش پڑے رہنے کے بعد اختر نے اپنی دو انگوٹھیاں اتار کر ظفر کو دے دیں اور کہا کہ اُن کی قیمت سے ٹکٹ خرید لینا۔

ظفر: اس وقت میں انگوٹھیاں کہاں بیچوں۔ گاڑی آنے میں تھوڑی دیر ہے۔ اور اسٹیشن پر کوئی لے گا نہیں۔

اختر: آپ بیچیں نہیں۔ بے شک اس وقت فروخت کرنے میں سخت وقت ہے۔ ٹکٹ ماسٹر کو دے کر ٹکٹ لے لیں۔

ظفر: ایسا کرنے میں بھی خطرہ ہے۔ آج کل یہاں کا ٹکٹ ماسٹر انگریز ہے۔ وہ مجھے کیا جانے؟

اختر: میں یہاں کے ٹکٹ ماسٹروں سے واقف ہوں، کیا اس کا نام آپ جانتے ہیں، آج کل جو یہاں کام کرتا ہے؟

ظفر: اس کو مسٹر جانسن کہتے ہیں۔

اختر: اوہو مسٹر جانسن ابھی یہیں ہیں؟ پھر تو کوئی فکر نہیں۔ آپ یہ کہیں کہ اختر رفیق احمد یہاں سے امروہہ (وہاں ظفر اسٹیشن پر ملازم تھا) جاتی ہیں۔ ٹکٹ دے دیں گے۔ افسوس میرا دستخطی کارڈ اس وقت موجود نہیں۔ خیر میں ایک رقعہ لکھے دیتی ہوں۔

ظفر: اس وقت قلم کاغذ یہاں کہاں ہے؟

اختر: میں اسٹیشن ماسٹر صاحب سے منگوالوں گی۔ یہ مسٹر الفریڈ صاحب بھی میرے ابا جان کے بہت عزیز دوست ہیں۔ میں ہمیشہ میرٹھ آتی جاتی رہتی ہوں، ان دونوں صاحبان سے مجھے بہت آرام ملتا ہے۔ اس وقت اُن کا یہاں ہونا غنیمت ہے۔

بیوی کی باتیں سن کر ظفر حیران ہو رہا تھا کہ ایک پردہ نشین لڑکی اس قدر عزت و شہرت رکھتی ہے جو بڑے بڑے خاندانوں کے مردوں کو نصیب نہیں۔

☆

سولہواں باب

امروہہ

موت آئے کہیں، ہو رنج و کلفت سے نجات
تنگ مرغِ رُوح اس زندانِ آب و گل میں ہے

ظفر نے اپنی شادی کے لئے چھ ہفتے کی رُخصت لی تھی اور چار ہی ہفتے ختم ہوئے تھے کہ وہ مع اپنی بیوی کے امروہہ آ پہنچا۔ دیگر ملازمین اسٹیشن نے اس قدر جلدی آجانے پر تعجب کیا۔ اختر کمزور تو تھی ہی، راستے کی تکلیف سے پھر بخار تیز ہو گیا۔ یہاں آ کر اپنا اصلی گھر دیکھا تو اُور بھی سخت پریشان ہوئی۔ ایک نہایت چھوٹی سی کوٹھری تھی اور اس کے آگے اُسی قدر چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ کوٹھری میں ایک طرف ظفر کا پلنگ بچھا تھا اور ٹرنک رکھا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی ظفر نے اختر کو پلنگ پر لٹا دیا۔ بہت دیر تک اختر آنکھیں بند کیے پڑی رہی اور ظفر پریشان پاس بیٹھا رہا۔ باہر سے کسی نے آواز دی، حیران تھا کہ اختر کو تنہا کس پر چھوڑ جائے۔ دوبارہ آواز سن کر اختر نے کہا:

اختر: دیکھو باہر کون ہے؟

ظفر: آپ کو اکیلا چھوڑ کر کس طرح جاؤں؟

اختر: اس قدر میری تنہائی کا خیال کیا تو کیوں کر بسر ہو گی؟ اپنی ڈیوٹی پر کس طرح جایا کرو گے؟

ظفر: ابھی تو چندرہ دن کام پر نہیں جانا تب تک خدا کوئی سامان بنا دے گا۔

اختر: خیر تو اس وقت تو دیکھو کہ کون بلاتا ہے، دور جانا نہیں پڑے گا۔ برآمدہ سے سن لو۔

بیوی کے اصرار سے ظفر برآمدے میں آیا۔ یہاں اسی اسٹیشن کا بکنگ کلرک واجد علی کھڑا تھا۔

واجد: ارے بھئی تم سنتے ہی نہیں۔ بیگم صاحبہ کیا تشریف لائیں کہ تم اندر ہی کے ہو رہے۔

ظفر: بھائی کیا کروں میں تو عجیب پریشانی میں مبتلا ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری شادی کیسی اعلیٰ و معزز جگہ ہوئی ہے۔ ایک امیر گھر کی لڑکی اور پھر بیمار۔ حیران ہوں کیا کروں؟

واجد: میں تو تمہاری بھابی کی طرف سے لڑنے آیا ہوں۔ جب انہوں نے سنا کہ تم اپنی بیگم صاحبہ کو لے آئے تو بہت بگڑیں۔ بہت جھلائیں کہ اوّل تو بے خبر آئے پھر اپنے ہی گھر اُترے۔

ظفر: میں بتا چکا ہوں کہ وہ بیمار ہیں۔ اس لئے اپنے ہی جھونپڑے میں اُتارا اور اپنے آنے کی خبر اس لئے نہ کر سکا کہ اچانک ہی آنا ہو گیا۔

واجد: اچھا تو میں کھانا ابھی بھجواتا ہوں اور تم اُن سے کہہ دو کہ ذرا آرام ہونے پر میرے گھر تشریف لائیں۔

ظفر: اچھا میں کہہ دوں گا لیکن ابھی وہ جانے کے قابل نہیں ہیں۔ ہاں بھائی تو کھانا تو بھیجو ہی گے۔ مہربانی کر کے پہلے دو پیالی چاء کی بھجوا دو تو بہت اچھا ہو۔

واجد علی تو کھانا بھجوانے کے لئے اپنے گھر چلا آیا اور ظفر اندر آیا۔

اختر: تم نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔ اس وقت اپنے کھانے کا کچھ بندوبست کرو۔

ظفر: میں بازار سے دودھ منگوانے کو تھا۔ میرے دوست واجد علی نے جو آوازیں دے رہے تھے کہا کہ کھانا میں بھجواتا ہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ پہلے چائے بھیج دو

پھر کھانا بھیج دینا۔

اختر: تم نے پرایا احسان کیوں اُٹھایا؟ اور چاء کیوں منگوائی؟ تم بالکل پیتے نہیں۔ فضول کیا ہوگی؟

ظفر: چاء میں نے آپ کے لئے منگائی ہے اور ایک وقت کی روٹی کی احسان ہی کیا ہے۔

اختر۔ میرے لئے چاء کیوں منگائی؟ تین ہفتے ہوئے مجھے چائے چھوڑے۔ اب عادت ہوگئی ہے اور تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ کیا چھٹی ہوئی بلا پھر اپنے گلے ڈال لوں؟ اور نانبائی کی دُکان پر حساب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے یہاں کس کام کے لئے لائے ہو؟ اگر اب بھی تم نے بازار سے روٹی کھائی تو میرا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔ آٹا دال وغیرہ منگوالو۔ گھر ہی میں تیار کرلیا کروں گی۔

ظفر: بے شک آپ کو تین ہفتے چائے نہیں ملی، اس کا مجھے بہت رنج ہے مگر وہاں میرا اختیار نہ تھا۔ یہ غریبانہ جھونپڑا آپ کا اپنا ہے اگر آپ کو بازار سے روٹی منگوانی پسند نہیں، تو نہ سہی، میں ایک ہی دفعہ کچی جنس منگالوں گا۔ دو ایک روز کاٹنے والے کی بیوی کھانا پکادیا کرے گی جب تک ہمیں کوئی عورت کھانا پکانے والی نہ ملے۔

اختر: بے شک یہ میرا اپنا گھر ہے تب ہی تو میں دوبارہ چاء شروع کرنا نہیں چاہتی۔ دس روپیہ ماہوار تمہاری آمدنی ہے۔ اس میں ایسے ایسے فضول اخراجات نہیں چل سکتے۔ تم کاٹنے والے کی عورت سے کھانا پکوانا چاہتے ہو۔ مجھے یہ بھی پسند نہیں جب کام کیا تو اس کو بھی کچھ ضرور دینا پڑے گا اور نوکر تو مجھے رکھنی نہیں۔ جیسے ہوسکا، خود ہی کام کرلیا کروں گی۔

میاں بیوی میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ واجد علی کھانا لے آئے۔ ظفر نے لاکر بیوی کے آگے رکھ دیا۔ ایک چوبی پرانے خوان میں جس کا روغن بھی اُتر چکا تھا۔ تین رکابیاں اور آٹھ چپاتیاں رکھی تھیں۔ ایک میں پلاؤ۔ دوسری میں فرنی اور تیسری میں آلو گوشت تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آلو گوشت اور فرنی واجد علی کے گھر میں پکا ہوگا۔ اُن کے آنے کی خبر سن کر تھوڑے سے چاول پکالئے۔

اختر کے آگے یہ رکھ کر ظفر پھر باہر سے ایک چھوٹی سی دیگچی جس پر دو پیالیاں رکھی تھیں لائے اور بیوی سے کہا کہ پہلے تم یہ پیو۔ اختر نے دیگچی کھول کر دیکھی۔ اس کا دل دیکھتے ہی خراب ہو گیا۔ دودھ چائے اور مٹھائیوں ملا کر جوشاندے کی طرح خوب پکائی ہوئی چاء تھی۔ زیادہ جوش دینے سے رنگ بھی سیاہ ہو گیا تھا۔ اختر بے چاری نے اس قسم کی چاء کب پی تھی۔ وہ تو اپنے نوکروں کو بھی منع کیا کرتی کہ اس طرح کی چاء صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ آہ اب اس کے واسطے وہی جوشاندہ تیار ہو کر آیا تھا۔ سب چیزیں دیکھ کر اس نے کہا:

اختر: تم کھانا کھالو ٹھنڈا ہو جائے گا۔

ظفر: اور آپ؟

اختر: مجھے ابھی مطلق بھوک نہیں۔ تم جانتے ہو اس بیماری سے میری خوراک بہت کم ہو گئی ہے۔

ظفر: پھر بھی کچھ تو کھانا چاہئے۔ وہاں اور کچھ نہ تھا۔ تو ڈبیوں کی یخنی پی لیا کرتی تھیں۔ ایسے سنگ دل والدین کو خدا سمجھے۔ میری اماں نے چلتے وقت اتنا بھی نہ کیا کہ آپ کی شیشیاں دوا کی اور یخنی کی ڈبیاں ہی ساتھ کر دیتیں۔ افسوس پہلے ڈاکٹر صاحب الگ ہوئیں۔ پھر دوائیں بھی چھٹ گئیں۔

اختر: ہیں تم نے یہ کیا کہا؟ کیا تعلیم کا یہی نتیجہ ہے اگر تم نے اعلیٰ تعلیم پائی ہوتی تو والدین کے حق میں یہ کلمہ کبھی نہ کہہ سکتے۔ دیکھو والدین نہیں صرف والدہ اور وہ بھی سوتیلی والدہ کی رضامندی کے خیال سے میں نے کیا کچھ برداشت کیا ہے، ورنہ میں کہاں اور آپ لوگ کہاں؟ پھر بھی اُن کے حق میں خلاف ادب میری زبان سے ایک حرف نہیں نکلتا۔ صرف وجہ یہ ہے کہ گو میں نے اعلیٰ تعلیم نہیں پائی لیکن اچھی طرح تعلیم یافتہ استانیوں کی صحبت و تربیت میں آٹھ نو سال گذارے ہیں اور تم نے سخت غلطی کر کے اپنا وہ زمانہ فضولیات میں گزار دیا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے ذرا اشتہا نہیں، ورنہ کھا لیتی۔

ظفر: (نہایت شرمندگی سے) اس وقت پرہیزی چیز بھی تو کوئی نہیں ہے۔ چاول آلو وغیرہ ثقیل ہیں۔ میں دودھ منگواتا ہوں۔

اختر: کچھ ثقیل و کیل نہیں اور نہ مجھے اب اس کا خیال ہے۔ آخر کہاں تک

پرہیز کئے جاؤں گی؟ اب یہی سب کچھ کھاؤں گی۔ تم فکر مت کرو۔ کھانا کھالو پھر گھر کی چیزوں کا بندوبست کرنا ہوگا۔

بیوی کے اصرار سے ظفر نے کھانا کھایا۔ چونکہ کئی وقت سے کچھ نہ کھایا تھا۔ پلاؤ فرنی وغیرہ کی سب رکابیاں صاف کردیں۔ پھر بیوی سے کہا کہ میں کانٹے والے کی بیوی کو آپ کے پاس بٹھا کر سودا منگوانے جاتا ہوں۔

اختر: میرے پاس کسی کے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ میں بچہ نہیں کہ ڈر جاؤں گی۔ ان کمینی رذیل عورات کو اپنے پاس بٹھانا تو کیا، میں اندر آنے کی اجازت دینا بھی پسند نہیں کرتی۔ تم بے فکری سے اپنے کام کاج کو باہر جایا کرو۔

یہ جواب سن کر سر جھکائے ہوئے خاموش ظفر باہر چلا گیا۔

اختر: چلے تو ہو۔ روپے کا کیا بندوبست کیا؟

ظفر: واجد علی سے قرض لے لوں گا اور تنخواہ ملنے پر دے دیا جائے گا۔

اختر: ہرگز نہیں۔ یہ ذلت میں کبھی گوارا نہ کروں گی۔ یہ لو میری چاروں انگوٹھیاں کسی سنار کی دوکان پر فروخت کرکے تھوڑی تھوڑی سب چیزیں منگالو۔

ظفر: زیور بیچنے کو تو میرا دل نہیں چاہتا۔ یہاں اسٹیشن کے بابوؤں کی بیویاں آپ سے ملنے آئیں گی۔ ایک آدھ زیور تو ضرور ہونا چاہیئے۔

اختر: اس جھوٹی شیخی کی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے اور نہ مجھے ان کم درجہ عورت سے ملنا ہے۔ یہ میری عقل میں نہیں آتا کہ زیور کے نہ ہونے کو تو ذلت خیال کروں اور قرض مانگ کر کھانے کو عزت۔

اب تو ظفر بیوی سے ڈرے اور چاروں انگوٹھیاں لے کر بازار چلے گئے۔ اس کے جانے کے بعد تنگ و تاریک کوٹھری کے کواڑ بند کرکے غریب اختر پلنگ پر پڑ رہی اور اپنی مصیبت و تنہائی پر آنسو بہانے لگی۔

وہ اپنی حالت پر غور کرکے سکتہ کے عالم میں رہ جاتی تھی۔ ایسی سنگین کوٹھری اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی یہاں اس زندانِ تاریک میں اس کو زندگی بسر کرنی پڑی۔ اس کی صحت کا وہی حال رہا بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب۔ میاں نے ہر چند چاہا کہ

روپیہ بارہ آنے مہینہ پر ملازمہ رکھ لی جاوے مگر اختر نے نہ مانا۔ اسی حالت کمزوری میں خود ہی گھر کا کام کرتی تھیں۔ جب یہاں آئی تو سردی تھی۔ اس قدر تکلیف معلوم نہ ہوتی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد سخت گرمی پڑنے لگی۔ اب تو یہ کوٹھری مثل تنور کے سوختہ دل اختر کو جلانے لگی۔ پردے کے لئے برآمدے کے دروں پر ٹاٹ کے پردے لگا لئے گئے جن میں سے ہوا کا گذر نہ ہوسکتا تھا۔ لوٹ پیٹ کر دن تو اسی کوٹھری میں بسر ہو جاتا تھا مگر رات کو وہی کوٹھری دوزخ کا نمونہ بن جاتی تھی۔ آگے صحن نہ تھا۔ اختر غریب پلنگ کہاں بچھاتی؟ برآمدہ نہایت تنگ تھا۔ اس میں تو صرف دو گھڑے اور چولہے کی بہ مشکل جگہ تھی۔ آہ گرمی کی وہ سخت راتیں اسی گرم کوٹھری میں لوٹ لوٹ کر کاٹتی تھی۔ انقلاب زمانہ اسی کو کہتے ہیں۔ ناظرین یہ وہ اختر ہے، جس کے کمرے میں کبھی تمام رات برقی پنکھا چلا کرتا تھا۔ وہی اختر آج اس مصیبت میں بسر کر رہی ہے۔

اسے یہاں آئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں حیدر علی کے کئی خطوط آئے کہ تمہاری والدہ بلاتی ہیں۔ مع بیوی کے چندروز کے لئے چلے آؤ۔ بڑے ناراض ہوا ہی کرتے ہیں۔ کیا بچے گھر چھوڑ دیتے ہیں؟

جانا تو کیا۔ ظفر نے جواب بھی نہ دیا۔ پھر ایک بہت لمبا خط آیا جس میں بہت ہی منت سماجت کی تھی اور لکھا تھا کہ ہمارا بڑھاپا ہے۔ کوئی دن کے مہمان ہیں۔ چندروز کے لئے آ کر ہمارے کلیجے ٹھنڈے کر دو اور اپنا اسباب سنبھالو۔

اختر ان خطوط کو پڑھ کر دل ہی دل میں ہنسا کرتی تھی کہ یہ لوگ کس قدر جعلساز ہیں۔ اب جو اتنی منت خوشامد کر کے بلا رہے ہیں۔ ضرور اس میں کوئی مطلب ہے۔ یوں تو جب بھی خط آتا تھا۔ وہ ظفر کو جانے کے لئے مجبور کیا کرتی مگر وہ نہ مانتا تھا۔ اب جو یہ خط ملا کہ تم آ کر اپنا اسباب سنبھالو تو ظفر چلنے کو تیار ہو گیا۔ کیوں کہ زر کا لالچ بھی عجیب چیز ہے۔ اختر نے کہا کہ مجھے بھی لے چلو تا کہ اماں جان مجھ سے بھی خوش ہو جائیں مگر اس نے نامنظور کیا۔ اور کہا کہ اس جگہ اپنی زندگی میں نہ لے جاؤں گا۔ جہاں اس قدر ذلت ہوئی تھی۔ غرض کہ دو دن کے واسطے ظفر اکیلا ہی کانپور گیا۔

☆

سترہواں باب

مرگِ ناگہانی

ہائے وہ مرنا کسی کا چھوڑ کر تنہا مجھے
اور دل کو تھام کر اُف کہہ کے رہ جانا مرا

ظفر کو کان پور گئے تین دن ہو گئے ۲ بجے شام کا وقت تھا۔ اختر چولہے پر دال کی ہنڈیا رکھے ظفر کے نہ آنے سے فکر مند بیٹھی تھی کیوں کہ وہ دوسرے دن ضرور آجانے کو کہہ گیا تھا۔ اختر کو طرح طرح کے خیالات پریشان کر رہے تھے کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ میں سنگ دل دشمنوں میں پھنسی ہوئی ہوں۔ اس کو یہ بھی کھٹکا تھا کہ حیدر علی کا بیٹے کو اس قدر خوشامد و اسباب کا لالچ دے کر بلانا خالی از علت نہیں۔ جب دال پک چکی تو اس نے دو چپاتیاں پکائیں۔ پھر خیال آیا کہ شاید رات کی گاڑی سے ظفر بھی آجائے۔ اس لئے چھ پھلکے پکا رکھے اور آگ بجھا کر ہانڈی روٹی چھینکے پر رکھ دی اور ہاتھ میں پنکھا لے کر پلنگ پر جا لیٹی اور اپنی زندگی کے انقلاب پر حسرت سے غور کرتی رہی۔ آٹھ بجے پہنچنے والی ٹرین کی آواز آئی تو اُٹھ بیٹھی۔ آنکھیں دروازے پر لگی تھیں کہ نہایت پریشان صورت ظفر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ عیاں پا کر سخت متفکر ہوئی اور گھبرا کر کہا۔

اختر: خیریت تو ہے، تم پریشان معلوم ہوتے ہو۔

ظفر: خیریت ہے، آپ فکر نہ کریں۔

اختر: فکر کی بات ہے تو میں فکر کیوں نہ کروں؟

ظفر: آپ نے کچھ کھایا بھی؟

اختر: تمہارا انتظار تھا۔ اس لئے کچھ نہیں کھایا۔

ظفر: اچھا میں لاتا ہوں پہلے کھالیں پھر گھر کا ذکر کروں گا۔

اختر: تم کہاں سے لاؤ گے۔ میں خود لاتی ہوں۔

اختر برآمدے میں چھینکے پر روٹی اتارنے آئی۔ ظفر بھی ساتھ ہی چلا آیا۔ اس نے کھانا نکالا اور اس نے باہر سے تازے پانی کی ٹھلیا منگوائی دونوں نے صبر و شکر کر کے روٹی کھائی۔

جب اختر برتن وغیرہ سنبھال کر فراغت کر آئی تو ظفر نے گھر کا حال سنانا شروع کیا۔

ظفر: میں آپ سے کہہ گیا تھا کہ "وہاں ایک دن ٹھہروں گا۔" کیوں کہ اپنی زیادہ بدقسمتی اور پڑنے والی مصیبت سے آگاہ نہ تھا۔ کاش میں تو پیدا ہی نہ ہوا ہوتا! مجھ سا سخت بدنصیب بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا جس کی شومئ بخت نے ایک دوسری طالع اور خوش قسمت کو بھی برباد کیا۔

اختر: تم ایسے برے الفاظ زبان سے نہ نکالو۔ اصلی بات کہو کہ کیا ہوا؟

ظفر: (سرد آہ بھر کر) جس دن میں مکان پر پہنچا اماں و ابا، چچا چچی نے بہت اچھی اچھی چیزیں پکا کر کھلائیں اور آپ کے نہ جانے پر افسوس ظاہر کیا۔ رات کے دس بجے تک سب میرے اردگرد باتیں کرتے رہے۔ پھر چچی اور چچا چلے گئے تو اماں جان نے کہا کہ "زمانے کا بھروسہ نہیں ہے۔ آج کل عزیزوں کے بھی خون سفید ہو گئے ہیں۔ کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے چونکہ ہمارے گھر کی دیواریں بہت نیچی اور ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس لئے میں نے تمہاری دلہن کا زیور اور چاندی کے برتن ریشمی جوڑے یہ سب قیمتی چیزیں تمہارے چچا کے ہاں رکھ دی تھیں اور تانبے کے برتن اور تخت وغیرہ اپنی کوٹھری میں تھا مگر اب ہم دونوں کا ارادہ حج کو جانے کا ہے۔ اس واسطے تمہیں بلایا ہے کہ اپنا مال سنبھال لو۔ چاہے کہیں رکھ جاؤ۔ چاہے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

میں نے کہا کہ یہاں کس کا اعتبار ہے۔ جہاں رکھ جاؤں؟ جب کہ آپ چچا ہی کے ہاں نہیں رکھنا چاہتیں تو ان سے زیادہ معتبر کون سی جگہ ہے؟

پھر اماں چراغ جلا کر اور مجھے ساتھ لے جا کر اسباب والی کوٹھری میں گئیں اور صندوقچیاں صندوق کھول کر سب چیزیں دکھائیں۔ ابا جان نے سامان جہیز کی فہرست میرے ہاتھ میں دے دی اور فہرست کے مطابق سب چیزیں مجھے دکھا دیں۔ اس میں چار چیزیں کم تھیں۔ سادی بالیاں، جگنی، پہنچیاں اور انگوٹھیاں۔ سو اماں جان نے کہا کہ یہ چیزیں دلہن پہنے ہوئے گئی ہیں۔ وہ سب کچھ دکھا کر کوٹھری کو قفل لگا دیا اور ہم تینوں دالان میں لیٹ رہے۔ اماں جان نے یہ بھی کہا کہ یہ سب سامان آج ہی صبح میں تمہارے چچا کے گھر سے لائی ہوں۔

آخر کار یہ تجویز ہوئی کہ دوسرے دن تو میں سب اسباب لے کر امروہہ چلا آؤں۔ اور یہاں کسی حفاظت کی جگہ رکھ کر اُن سے ملانے کو تمہیں کان پور لے جاؤں۔ کیوں کہ وہ بہت جلد روانہ ہونے والے ہیں۔ ابھی ۱۲ نہیں بجے تھے کہ ہم سب سو گئے اور قریب ۲ بجے کے کھٹکے کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں نے ابا جان کو جگایا۔ اماں بھی اُٹھ بیٹھیں اور ابا لالٹین لے کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ وہاں کچھ معلوم نہ ہوا۔ تو ہم دونوں کوٹھے پر گئے، دیکھا کہ اُسی کوٹھری کی چھت گری ہوئی ہے۔ ابا جان کا تو سناٹا نکل گیا اور وہ وہیں سے کوٹھری میں گرنے لگے۔ میں بمشکل سنبھال کر انہیں نیچے لایا، تالا کھولا اور اندر گئے، دیکھا تو وہاں بالکل صفایا تھا۔ صندوق پلنگ تخت وغیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ چھت کی اینٹوں اور تختوں کا ڈھیر لگا تھا۔ لماں جان تو یہ دیکھتے ہی زمین پر گر پڑیں۔ نہایت مصیبت سے صبح کی، میں نے اسی وقت پولیس کو اطلاع دی۔ بس اسی کی پوچھ پکار میں دو دن لگ گئے۔ میرے سامنے تک تو کچھ نہ ملا اور نہ چوروں کا پتہ لگا۔ پولیس تفتیش میں ہے۔ ابا اور چچا بہتیری سرگردانی کر رہے ہیں۔ تمہاری تنہائی کے خیال سے میں چلا آیا۔

اختر: اوہ یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے، میں تو گھبرا گئی کہ خدا جانے کیا ہوا۔ لماں بھی فضول فکر اُٹھاتی ہیں۔ کون ایسی محنت کا جمع کیا ہوا تھا جس کے ضائع ہونے پر اس قدر جان گھلائی جائے جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل گیا۔

ظفر: بے شک یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے محنت سے جمع نہ کیا تھا لیکن غریب آدمیوں کے لئے یہی غم کیا تھوڑا ہے کہ بہو کے میکے کے ساتھ آیا بھی اس کے کام نہ آئے۔

خود تو کسی قابل ہی نہیں اور کس طرح بنائیں گے۔ ابھی اخراجات شادی کا قرض بھی نہ اُترا۔

اختر: یہ کوئی فکر کی بات نہیں کہ میرے کام نہ آیا۔ میری قسمت میرے ساتھ ہے اور اس کا تم ذرا بھی خیال نہ کرو۔ اخراجات شادی کے لئے قرض لیا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری والدہ بیگم صاحبہ نے تمہارے والدین کو ایک پیسہ بھی قرض لینے نہیں دیا۔ وہ تمام خط و کتابت میں نے دیکھی ہے۔ جو در بارۂ اصراف شادی بیگم صاحبہ اور تمہارے والد صاحب میں ہوئی تھی۔ اُنہوں نے لکھا تھا کہ امیرانہ طریق سے اخراجات شادی کے برداشت کرنے کا میں متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ مجھے قرض ہی مل سکتا ہے۔ تب بیگم صاحبہ نے لکھ دیا تھا کہ "تم اس کی بالکل فکر نہ کرو۔ اُس طرف کے خرچ کرنے کے لئے بھی روپیہ میں ہی بھیج دوں گی۔" اور تب ہی پانچ سو روپے کے نوٹ اپنے ملازم خاص (جو ایسے خفیہ کام انجام دیتا ہے) شمشاد علی کے ہاتھ کان پور بھجوا دیئے تھے۔ تم اس بات کا ہرگز یقین نہ کرو کہ شادی کے لئے ان لوگوں نے قرض لیا تھا۔

ظفر: بے شک جو آپ نے کہا بالکل درست ہے۔ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ صرف مجھ پر احسان چڑھانے کو ابا اماں نے کہا کہ تیری شادی کے لئے دو ہزار روپیہ لیا ہے۔ میں بھی تو حیران تھا کہ دو ہزار کی بڑی رقم یک مشت ان کو کس نے دے دی۔ دراصل میرے والدین سخت گنہگار ہیں۔

اختر: او ہو انہوں نے تم کو دو ہزار قرض لینا بتایا ہے! اس قدر کرنا ہی کیا تھا؟ چودہ ریشمی جوڑے بریوں کے اور وہ زیورات جو منگنی کے وقت مجھے پہنائے گئے تھے۔ نقرئی کام کی چوڑی وغیرہ وغیرہ یہ سب سامان لکھنؤ میں تیار کرا کے بیگم صاحبہ نے بالا بالا کان پور بھیج دیا تھا۔ میرے ابا جان کو ان باتوں کی ذرا خبر نہیں۔ کیوں کہ ان پر ظاہر کیا گیا ہے کہ سمدھی صاحب بہت امیر و کبیر جاگیردار ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر ایسا نہ کرتیں تو ابا جان کبھی یہ رشتہ منظور نہ کرتے۔ تمہاری نسبت بیگم صاحبہ نے ابا جان سے یہ کہا ہے کہ لڑکا اسٹیشن ماسٹر ہے۔ میں ان باتوں کو کبھی زبان پر نہ لاتی مگر چونکہ تم کو بھی اس جعل و فریب کی خبر نہیں اور تم قرض داری کے رنج سے گھلے جاتے ہو۔ تمہاری فکر کم کرنے کو میں نے اس خفیہ کارروائی کا ذکر کر دیا ورنہ یہ منہ سے کہنا مجھے پسند نہ تھا۔ جب میں نے ابا جان سے نہ کہا تو اَور کسی سے

کہنا فضول ہے جو ہونا تھا ہو گیا اور ابا جان کی غفلت سے جو کچھ میرے سر پڑنا تھا۔ وہ بھگت رہی ہوں اور میں یہ بھی کہتی ہوں کہ اس چوری کا بھی فکر نہ کرو۔ کیوں میں جانتی ہوں کہ گو چوروں نے نکالا ہے مگر یہ اسباب بھی غیروں کے ہاتھوں میں نہیں گیا۔ تمہارے کام تو نہ آئے گا لیکن ہے گھر ہی میں۔

ظفر: میری فرشتہ خصلت بیگم! آپ کا کہنا بالکل بجا ہے جو سچے اور خفیہ حالات آپ نے بتائے ہیں مجھے اُن کا دل سے یقین ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ شادی کے وقت جس قدر جھونجھا ہی تھی۔ وہ سب ناخدا ترس بیدرد بیگم صاحبہ کی مہربانی کا نتیجہ تھا اور ضرور اس چوری میں کوئی راز ہوگا۔ آپ کا مال میرے والدین ہی نے خالص اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے کہیں خورد بُرد کرا دیا ہوگا لیکن اب تو مجھے اُور بھی زیادہ رنج ہوگا کہ وہ سب کچھ بچے چوروں کے ہاتھوں میں نہ گیا، رہا بھی سنگ دِل ظالموں کے پاس اور آپ کے کام بھی نہ آیا۔ میں محض نادار ہوں۔ آپ کو سخت مصیبت ہوگی۔

ہاں یہ میں نہ سمجھ سکا کہ آپ نے وہ خطوط کس طرح دیکھے؟ اور دیکھ چکی تھیں تو کان پور کے غریب جھونپڑے میں پہنچ کر اس قدر حیران کیوں ہوئی تھیں۔ جب کہ آپ واقف تھیں کہ یہ لوگ بہت غریب ہیں؟

اختر: ظفر مجھے پہلے یہ معلوم نہ تھا اور دو ہفتے تک کان پور میں رہنے کے بعد بھی معلوم نہ ہوا۔ آپ کی اصلیت تو میں نے اُسی دن آئنے کو ہٹا کر معلوم کر لی تھی لیکن وہ خطوط نہ دیکھے تھے۔ وہ تو امروہہ آنے سے چار دن پیشتر میری نظر سے گذرے۔ تمہارے والد صاحب کے خط اور بیگم صاحبہ کے جواب سب ایک پرانے کپڑے میں لپیٹے ہوئے تمہارے والد کے سرہانے جو طاق ہے اس میں رکھے تھے۔ جھاڑو دینے کے واسطے تمہاری والدہ نے اُن کا پلنگ کھڑا کیا تھا اور جب بچھانے لگیں تو اس کے پائے سے اٹک کر وہ پلندہ زمین پر گر پڑا۔ اُن کا اس طرف خیال نہ تھا۔ پلنگ بچھا کر باہر چلی گئیں۔ میں تمہاری کوٹھری کے دروازے میں نماز پڑھ رہی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ وہ پوٹلی پھر اوپر رکھ دینے کی غرض سے میں نے اُٹھائی (میرا خیال تھا کہ اس میں سوکھا ہوا ساگ وغیرہ بندھا ہوگا) تو بی امانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا لفافہ نظر پڑا۔ میں نے اس کو کھولا تو بہت سے خطوط انہیں کے لکھے ہوئے

نکلے۔ چونکہ وہ میرے گھر کے خط تھے۔ تمہارے گھر والوں سے پوشیدہ اُن کا پڑھ لینا گناہ نہ سمجھا۔ اس دن یہ حالات مجھے معلوم ہوئے۔ جانی بیگم بڑی چالاک اور ہوشیار عورت، ہے۔ اس نے دوراندیشی سے اپنے خطوط یہاں بھیج دیئے ہوں گے کہ وہاں رکھنے سے شاید کسی کی نظر پڑ جائے کیوں کہ پہلے اُن کے دو ایک خطوط میرے ہاتھ لگ گئے تھے جس دن خفا ہونے میں تمہاری والدہ یہ کہہ رہی تھیں کہ "سامان جہیز کا تو مالک نہیں ہوسکتا کیوں کہ ہم نے شادی پر کئی ہزار روپیہ خرچ کیا ہے۔" میں تو دُنیاداروں کی دروغ گوئی اور زر پرستی پر دل ہی دل میں تعجب و افسوس کر رہی تھی۔

ظفر: ہائے آپ نے بڑا غضب کیا۔ اسی وقت وہ خطوط مجھے کیوں نہ دے دیئے جس سے میں ان کو جھوٹا کر سکتا۔

اختر: میں شر بڑھانے کی کبھی کوشش نہیں کرتی اگر میری یہ عادت ہوتی تو جانی بیگم کی خفیہ و نادرست کارروائیاں ابا جان پر منکشف کرتی رہتی جس سے کبھی کی میرے گھر سے اُن کی بنیاد اُکھڑ جاتی اور آج وہ اندھا راج نہ کرتی ہوتیں۔

ظفر: آپ کو خدا نے دنیا میں ایک بنایا ہے۔ ایسا جفاکش بھی کوئی نہ ہوگا۔ ایثار نفسی آپ پر ختم ہے۔ آپ پر جو گذرنا تھا گذر گیا اور جو جو مصیبت پڑتی جائے گی برداشت کریں گی مگر میں آج سے قسم کھاتا ہوں کہ اپنے بدباطن، سنگ دل جابر والدین کی شکل عمر بھر نہ دیکھوں اور اگر اُن کی زندگی میں مرگیا تو آپ میرے جنازے پر بھی اُن کو نہ آنے دینا۔

اس گفتگو کے بعد یہ دونوں سو گئے۔

اختر کو اپنا جہیز چوری جانے کا ذرا بھی غم نہ تھا کیوں کہ اسے اس قدر صدمات برداشت کرنے پڑے تھے کہ اب کوئی رنج اُسے رنج ہی معلوم نہ ہوتا تھا۔ بقولے کہ ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ہاں ظفر اُس دن سے بہت افسردہ رہنے لگا۔ نقصان تو بڑے بڑے امیروں پر شاق گذرتا ہے رہ گیا تو ایک کم حوصلہ غریب جس نے کبھی بھی کچھ نہ دیکھا ہو۔ آئے اوائے مال کا ہاتھ سے نکلا جانا مفلس ظفر کے لئے کچھ کم صدمہ نہ تھا۔

چوری ہوئے دو ماہ کا عرصہ گذر گیا اور ظفر کے والد کے یہی خط آتے رہے کہ "اب مال ملنے کی کچھ اُمید نہیں۔"

سخت گرمی تو اب ختم ہوگئی تھی اور برسات شروع تھی۔ ساون کا مہینہ لگتے ہی امروہہ میں سخت ہیضہ پھیل گیا۔ روزانہ بیسیوں موتیں ہیضہ سے ہونے لگیں۔ اختر تو نہیں۔ لیکن ظفر سخت پریشان تھا کہ کہاں جاؤں کیا کروں؟ کوئی ٹھکانا نظر نہ آتا تھا۔ جہاں اختر کو بھیج دیتا۔ اپنی جان کی تو اُسے پرواہ بھی تھی تو اسی لئے کہ میرے بعد اختر کا کوئی سنبھالنے والا نہ ہوگا۔ بس فکر تھی تو اختر کی۔

رات کے ۹ بج چکے ہوں گے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اختر و ظفر ابھی سوئے تھے کوئی آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ یکا یک گھبرا کر ظفر اُٹھ بیٹھا۔ دل بہت مالش کرنے لگا۔ فوراً برآمدے میں آیا اور ٹہلنے لگا۔ کھڑا نہ ہوا گیا تو وہیں بیٹھ گیا اور قے کی جس کی آواز سے اختر کی آنکھ کھل گئی وہ فوراً اُٹھی اور اس کے پاس آکر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر کلی کرا کے الائچی کھلائی اور کوٹھری میں لا کر لٹا دیا۔

لیٹتے ہی پھر دل خراب ہوا اور ظفر نے وہیں دوسری قے کی۔ اس دفعہ اس سے اُٹھا بھی نہ گیا جب دوبارہ کلی وغیرہ کر چکا تو اختر سے کہا:

ظفر: پیاری اختر تمہارا خداحافظ۔ اب یہ ناچیز خادم آپ سے جدا ہوتا ہے۔ افسوس اس جنگل میں تم تنہا ہو۔ اتنا بھی کوئی نہیں جو میرے بعد تمہیں سنبھالے۔

اختر: ئیں ئیں کیا باتیں کرتے ہو؟ خدا نہ کرے۔ ایسے منحوس الفاظ زبان سے نہ نکالو۔ گرمی زیادہ ہے۔ اس لئے طبیعت خراب ہوگئی۔ تم تو بالکل بچوں کی طرح دل رکھتے ہو۔

ظفر: نہیں میں گھبرایا تو نہیں۔ میری طبیعت بے طرح بگڑی جاتی ہے۔ یہ معمولی طبیعت کی خرابی نہیں۔ آہ جس بات کا مجھے کھٹکا تھا وہی ہوا۔ افسوس تو یہ ہے کہ آپ بالکل تنہا بے یار و مددگار اس جنگل میں رہ جائیں گی۔ کوئی ہمدرد نہ ہوگا۔

اختر: تم خواہ مخواہ ان وہموں میں پڑ کر اپنی طبیعت بگاڑ لو گے۔ افسوس کہ

میری دواؤں کا بکس میرے پاس نہیں۔ ورنہ ابھی طبیعت درست کر کے دکھا دیتی۔ اب بھی کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں طبیعت خود ہی ٹھہر جائے گی۔

اس اثناء میں ظفر کو ایک اور قے ہوئی۔ اس کے بعد وہ پاخانہ گیا اور وہاں سے واپس آیا تو بالکل طاقت نہ رہی، پلنگ تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ اختر نے پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا۔ چند منٹ خاموش رہا اور پھر روتے ہوئے بیوی سے کہا۔

ظفر: آہ اختر کیا کروں؟ میں پریشان ہوں۔ ہائے تمہارے پاس کوئی بھی تو نہیں۔

اختر: (بے قراری سے رو کر) میرے ظفر تم کیوں اس قدر ہراساں ہوتے ہو۔ خدا فضل کرے گا۔ کہو تو کسی طرح واجد علی کو جگوا کر ڈاکٹر کو بلوا لوں؟

ظفر: نہیں ہرگز نہیں۔ نہیں ایسا نہ کرنا، میرا بچنا تو مشکل ہے، اگر ڈاکٹر کو خبر ہو گئی تو مجھے شفا خانے لے جائے گا۔ یہ دو چار چیزیں بھی جلوا دی جائیں گی۔ آپ پر اور مصیبت پڑ جائے گی۔

اختر: ایسے مایوسانہ خیال دل میں نہ لاؤ۔ تمہیں آرام ہو جائے میں سب مصیبت بھر لوں گی۔

ظفر: آہ مجھے آرام ہو چکا۔

ہوں مسافر میں عدم کا چار دن کے واسطے
ہو گیا تھا تیری بربادی کو یاں آنا مرا
عازمِ ملکِ عدم ہوں، دیکھ لوں جب تک کہ ہوں
پھر نہ ہوگا دیکھنے کو تیرے یاں آنا مرا
باقی سب ارمان دل کے خاک میں مل جائیں گے
حسرت و افسوس کے قابل ہے مر جانا مرا

کہے کہ آئندہ بربادی کے خیال سے اختر کا دل بھر آیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کو تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ ظفر اس سخت وبائی مرض میں مبتلا ہو گیا ہے لیکن اس کا دل گھٹنے کے خیال سے ذرا افسوس ظاہر نہ کیا تھا۔ حیران تھی کہ ڈاکٹر کو کس طرح بلاؤں۔ رات کا وقت

بارش ہو رہی ہے کوئی آدمی پاس نہیں اگر کسی اسٹیشن والے کو خبر بھی کرے تو کیسے؟ غرضیکہ بدنصیب اختر کے لئے سخت مصیبت کا سامنا تھا، جب اس نے بہت بے قراری سے رونا شروع کیا۔ تو ظفر نے کہا:

ظفر: ہائے آپ تو مجھ سے بھی زیادہ کم حوصلگی کرنے لگیں۔ آپ نے تو بہت مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ اس کو بھی صبر و تحمل سے برداشت کرو۔ ہائے نہ معلوم خدا نے کیا سوچا۔ میں تو بالکل ہی کسی قابل نہ تھا۔ آپ کو ذرا آرام نہ پہنچایا۔ کوئی خدمت نہ کی۔ خدا کو ایسا بھی منظور نہ ہوا۔

چار دن بھی میں نہ ٹھیرا اس سرائے دہر میں
اک تماشا بن گیا آنا مرا جانا مرا

شاید خدا کو اس میں بھی کچھ بہتری منظور ہو گی چونکہ میں اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل نہ تھا۔ زندہ رکھ کر مجھے شرمندہ نہ کیا۔

موت نے دُنیا میں رکھ لی میری ناداری کی شرم
میرے حق میں ہو گیا اکسیر مر جانا مرا

نہایت پُر درد لہجہ میں دو شعر کہے اور آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گیا۔ چند منٹ اختر نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر یہ کہہ کر کہ الائچیاں لے آؤں۔ برآمدے میں آئی پردہ اُٹھا کر کانٹے والے کی بیوی کو جگایا۔ اس کا پلنگ اُن کے دروں کے ساتھ ہی بچھا ہوتا تھا۔ وہ اندر آئی تو کہا کہ ''اپنے میاں کو کہو کہ بابو واجد علی کو جگا لائے۔ اُن سے کہے کہ تمہارے دوست ظفر بلاتے ہیں؟'' خود وہیں کھڑی رہی۔ اسی وقت واجد علی آگئے آواز سے کہا: ''کہئے حضرت اس وقت کیا کام ہے بارہ بجے طلب کیا گیا ہوں۔''

اختر: (نہایت شرگین آواز سے) اس وقت میں نے تکلیف دی ہے۔ آپ دوسرے دروازے سے کوٹھری میں آجائیں۔ میں یہیں رہوں گی۔

واجد: بتائیں تو خیر ہے؟

اختر: آہ خیر کہاں؟ آپ دیکھیں تو سہی۔

واجد نے اندر آ کر ظفر کو پلنگ پر بیمار پڑا دیکھا۔ آہستہ سے ہلا کر کہا۔ کیوں بھئی

خیریت ہے؟

ظفر: (کانپتی ہوئی آواز سے) واجد واجد۔ تم ہو۔ تم اس وقت کیسے آئے؟ آہ انہوں نے بلایا ہوگا؟ واجد وہ سخت پریشان ہیں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ انہیں کس کے سپرد کروں؟ تم میری حالت دیکھتے ہو، کیا میں بچ جاؤں گا؟

مجھ کو دیکھا ہے مسیحا حال پہچانا مرا
کہئے ممکن ہے کہ ناممکن شفا پانا مرا

واجد: بھائی آپ گھبرائیں نہیں۔ انشاء اللہ صحت ہوگی۔ تمہاری بھابی اس وقت میرے یہاں آنے سے پریشان ہے۔ میں اس کو اطمینان دلا کر ابھی آتا ہوں۔

یہ کہہ کر واجد پھر برآمدہ کے دروازے پر آیا۔

واجد: میں نے اُن کو دیکھا، مرض کے آثار نمایاں ہیں۔ افسوس آپ کو پردیس میں سخت پریشانی ہوئی۔

اختر: (رو کر) میں آپ کی ہمدردی کی بہت مشکور ہوں۔ مہربانی کر کے اسی وقت ڈاکٹر کو بلا دیں۔

واجد: ڈاکٹر کا بلانا خطرہ سے خالی نہیں۔ وہ ان کو شفاخانے لے جائے گا۔

اختر: مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں جو تکلیف ہوگی برداشت کروں گی لیکن ان کا علاج ضرور کروں گی۔

واجد: اچھا تمہاری مرضی، میں کپڑا پہن لوں۔ پھر میں ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں۔

اختر: ایک اور مہربانی کریں۔ اس پرزہ پر میں نے تار کا مضمون لکھ دیا ہے اُن کے والد، کو لیجیے یہ روپیہ اور کاغذ ہے۔ تار ابھی دے دیں۔ چونکہ اُن کی بیماری خطرناک ہے۔ اُن کا آجانا ضروری ہے۔

کاغذ اور روپیہ لے کر بہت اچھا کہتا ہوا واجد تو چلا گیا اور بدنصیب اختر ظفر کے پاس آبیٹھی۔ اس کی حالت دم بدم بدتر ہوتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر اور واجد کے انتظار میں چار گھنٹے گزر گئے۔ جب کوئی بھی نہ آیا تو اختر نے پھر کاٹنے والے کو بھیج کر دریافت کیا۔ اس نے آکر کہا کہ بابو صاحب کہتے ہیں کہ تار تو ہم نے دے دیا ہے۔ ڈاکٹر اس وقت نہیں ملا۔

صبح کو پھر جائیں گے۔ صبح بھی ہوگئی اور اسی حالت میں پریشان بیٹھے دن کے دس بج گئے اختر کو معلوم ہو گیا کہ واجد سے کچھ مدد نہیں ملتی۔ اس نے تار کا روپیہ بھی رکھ لیا ہوگا۔ پھر اٹھی اور اسی مضمون کو دوبارہ تار فارم پر لکھا۔ ایک سول سرجن صاحب مراد آباد کے نام لکھا اور کانٹے والے کے ذریعہ سے ریلوے اسٹیشن سگنیلر کو دروازے پر بلا کر تین روپے اور تازہ فارم دیا۔ سول سرجن کو تار تو دے دیا۔ اب حیران تھی کہ ڈبل فیس کہاں سے دوں گی۔ تھوڑی دیر سوچ کر اپنے کانوں کی بالیاں اُتار دیں اور اسٹیشن ماسٹر امروہہ کے نام ایک چٹھی لکھ کر معہ بالیوں کے اس کانٹے والے کے ہاتھ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو بھیج دی۔ تھوڑی دیر بعد اسٹیشن ماسٹر صاحب کا ملازم ایک لفافہ دے گیا جس میں پچاس روپے کا نوٹ تھا اور رقعہ میں لکھا تھا کہ اس وقت اس قدر روپیہ موجود تھا۔ باقی حساب کر کے پھر دیا جائے گا۔ آج اس بچاری کو کھانا پکانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔

ظفر کے ہاتھ پیر دباتی جاتی تھی اور رو رہی تھی۔ ۱۲ بجے کی ٹرین سے سول سرجن صاحب آ پہنچے۔ یہ اسٹیشن ماسٹر کو اُن کے آنے کی اطلاع دے چکی تھی۔ گاڑی سے اُترتے ہی ماسٹر صاحب ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر ظفر کے گھر آئے۔

اختر پردے میں ہوگئی۔ جب وہ ظفر کو دیکھ چکے تو ماسٹر صاحب نے سمجھا دیا کہ اس کی بیوی ایک نہایت تعلیم یافتہ لیڈی ہے۔ وہ ایسی حالت میں اس سے جدا ہونا بھی نہیں چاہتی اور یہ آپ نے دیکھ ہی لیا کہ یہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ اس کا شفاخانہ میں لے جانا فضول ہے۔ اس کے خاتمہ کے بعد وہ لیڈی فوراً ہی اپنے گھر کانپور چلی جائے گی اور اس کوٹھری کو میں بالکل صاف کرا دوں گا۔ اسباب وغیرہ اپنے سامنے جلوا دوں گا۔ اس لیڈی کی طرف سے آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ اس وقت رحم کیا جائے اور باضابطہ کارروائی نہ کی جائے۔ اس کے بعد کل انتظام کا میں ذمہ دار ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اچھا ہم منظور کر لیں گے کیا وہ لیڈی خود ہم سے اس بارے میں گفتگو نہیں کر سکتیں؟

ماسٹر صاحب نے کہا کر سکتی ہے اور اختر کو اطلاع دی۔

کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اُدھر ڈاکٹر کھڑے تھے اور اِدھر اختر۔ انگریزی

میں دونوں کے بخوبی سوال و جواب ہوئے۔ڈاکٹر صاحب نے اُن کی استدعا منظور کرلی۔ کوئی معمولی سا عرق ظفر کے پلانے کو دے گئے۔اختر سے بہت ہمدردی ظاہر کی اور کہا کہ تم کبھی مسز چارلس (سول سرجن صاحب کی میم) سے ملنے کو مرادآباد ضرور آنا۔

اختر نے دوہری نہیں تگنی فیس ادا کی مگر اُنہوں نے زیادہ روپیہ لینا منظور نہ کیا۔ صرف ایک ساورن رکھ لیا۔باقی واپس کردیا اور ڈاک بنگلہ چلے گئے۔

اختر نے اسٹیشن ماسٹر کے خانساماں سے کھانا تیار کرا کے وہاں بھجوادیا اور عالم یاس میں ظفر کے سرہانے بیٹھی رہی۔کانپور سے تار کا جواب نہ آیا۔دوسری رات آگئی۔اختر نے ایک جوابی تار اُور کان پور دیا اور دوسری تمام رات اسی طرح تنہائی میں جاگ کر گزاردی جو دوا وہ دے گئے تھے پلاتی رہی مگر فضول تھا کیوں کہ ڈاکٹر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ دوا دینی فضول ہے۔بیمار چند گھنٹے کا مہمان ہے۔ظفر اب بالکل بے ہوش تھا۔اس کے حواس جواب دے چکے تھے۔چار بجے صبح سے نزع کی تکلیف شروع ہوئی۔ہائے اس وقت اختر کی حالت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے،اس نے اب تک کوئی موت نہ دیکھی تھی۔والدہ کا واقعہ بچپن میں ہوا تھا،وہ بھی اُس نے نہ دیکھا تھا۔آہ یہ موت۔کیسی موت؟ جوان کی موت۔اس کے شوہر کی موت اُس کے ہاتھوں میں اور نظروں کے آگے ہورہی تھی اور ایسا عالم تنہائی کہ دو سے تیسرا نہ تھا۔اُن کا ہمدرد یا دوست جو کچھ بھی تھا واجد ہی تھا لیکن اس وقت اُس نے بھی آنکھیں موڑ لیں۔وبائی موت کے ڈر سے نہ خود آیا نہ بیوی کو آنے دیا۔کانٹے والے کی عورت بھی آج اندر نہ آئی۔اکیلی اختر پر یہ وقت گذر رہا تھا۔اس کا غریب شوہر اس کے زانو پر سر رکھے دم توڑ رہا تھا۔آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کو دیکھنا چاہتا تھا مگر بینائی سلب ہوچکی تھی۔ہمیشہ کی جدائی پر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان میں طاقت گویائی نہ تھی۔اسی حالت میں چار سے آٹھ بج گئے اور وہ وقت آگیا جب کہ ظفر نے آہ و نامراد و ناشاد ظفر نے اپنی جان شیریں خدا کے حوالے کردی۔آخری لمبا سانس بھر کر ایک بار پھر اختر کی طرف نگاہ کی اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔اختر بے قراری کے ساتھ جھک جھک دیکھتی تھی۔ کبھی نبض پر کبھی پیشانی پر ہاتھ رکھتی تھی مگر وہاں کچھ نہ تھا۔تمام جسم سرد پڑا تھا۔جب کئی بار ہلانے سے اُس نے ذرا حرکت نہ کی تو اختر نے بیتاب ہوکر کہا ”ظفر ظفر ہیں تم تو بالکل

خاموش ہو گئے! آہ ظفر اس قدر جلدی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھ بدنصیب کو تم بھی نہ بھر سکے۔ اب میں کدھر جاؤں؟ میرا دُنیا میں کہیں ٹھکانہ نہ رہا۔ کاش یہ موت میرا خاتمہ کرتی۔ آہ میری نحوست تم پر پڑی۔ میں مصیبتیں اُٹھانے کو رہ گئی اور تم چل دیے۔

اتنا کہا اور غش کھا کر پیچھے گر پڑی اور آدھا گھنٹہ اسی طرح پڑی رہی۔ زانو پر سر دھرے ظفر بے جان پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی اختر غش میں۔ چونکہ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو ان کی طرف سے فکر تھا۔ حال معلوم کرنے کو وہ اِدھر آئے۔ کئی آوازوں کا جواب نہ پا کر کانٹے والے کی عورت کو اندر بھیجا۔ اس نے یہ حال بتایا۔ اُنہوں نے اسی وقت اپنی بیوی کو بھیج کر بیوہ مصیبت زدہ اختر کو اپنے گھر بلوا لیا اور اس نامراد جوان مرگ کی تجہیز و تکفین اپنی موجودگی میں نہایت اچھی طرح کی اور جب تابوت تیار ہو چکا تو آخری بار منہ دیکھنے کو پریشان حال اختر جنازے پر آئی اور اس حال میں مرحوم کو دیکھ کر بے ہوش گر پڑی۔ اس وقت ظفر کی روح زبانِ حال سے کہہ رہی ہوگی۔

بال کھولے کون یہ آیا جنازے پر میرے
ہو گیا کیوں درہم و برہم عزاخانہ میرا

اختر کو دن بھر میں چار غش آئے۔ جب یہاں سے ظفر کی موت کا تار گیا تب سنگدل حیدر علی امروہہ آئے اور اسباب وغیرہ کی اچھی طرح پوچھ گچھ کر کے ظفر کی بیوہ کو اپنے ہمراہ کانپور لے گئے۔ پھر تو وہاں بہت کچھ رونا دھونا اور سوگ تا اب ہوا ہوگا۔ آہ بدنصیب اختر گرفتارِ مصیبت تو تھی ہی۔ بیوگی کی بلا میں بھی گرفتار ہو گئی۔ اب نحوست کے طعنے ہوں گے اور غریب اختر۔ ساس کی جھڑکیاں ہوں گی اور بدنصیب اختر۔

اٹھارواں باب

اے خدا آسان کر مشکل کو جلدی رحم کر
مجھ پر اب بھاری ہوئی جاتی ہے تنہائی میری

حیدر علی جب بیوہ ظفر کو لے کر گھر پہنچے تو ایک کہرام مچ گیا۔ صف ماتم بچھائی گئی۔ بیسیوں مہمان تعزیت کو جمع ہوئے۔ والدہ ظفر پیٹ پیٹ کر اپنا خون کئے دیتی تھیں۔ میرٹھ خط گیا۔ وہاں سے داماد کے پرسے کو جانی بیگم، بی امانی کے ساتھ کانپور آئیں۔ بیٹی سے از حد ہمدردی ظاہر کی، اور کہا کہ "بعد ایامِ عدّت ختم کرنے کے تم کو بھی میرٹھ بلالوں گی۔"

یہ تو کہا اختر سے اور والدہ ظفر سے تنہائی میں یوں کہا کہ جس وقت یہ خبر ملی تھی۔ وکیل صاحب فوراً کانپور آنے کو تیار ہو گئے۔ میں گھبرائی کہ اگر وہ آگئے تو اب تک کا رکھا رکھایا پردہ فاش ہو جائے گا۔ تمہیں نہیں معلوم میں نے بڑی مشکلوں سے اب تک حالات ان پر ظاہر نہیں ہونے دیئے۔ رخصت ہو کر اختر کو یہاں آئے ہفتہ ہوا تھا کہ وہ اختر کے لے جانے کو آدمی بھیجنے کو تیار ہوئے۔ میں نے یہ کہہ کے روکے رکھا کہ چوتھی چالے تو یہاں ہو ہی گئے ہیں۔ اب کچھ دنوں وہاں اُسے اپنے گھر رہنے دو۔ پھر یہاں سے خبر گئی کہ میاں بیوی اپنے گھر امروہہ چلے گئے ہیں تو میں نے کہہ دیا کہ نئے گھر کے شوق میں ظفر بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب کچھ دنوں وہاں اختر کو رہنا چاہئے۔ ایک ماہ گذرنے کے بعد وہ پھر اختر کو بلانے کو تیار ہوئے تو میں نے کہہ دیا کہ تم اس قدر جلدی کرتے ہو۔ اختر کے بلانے کی اور ظفر کے خط میرے نام آرہے ہیں کہ خدا کے واسطے ابھی اُنہیں نہ بلاؤ۔ یہی

دیکھو تمہاری سالی کی لڑکی قمر النساء جو رخصت ہو کر آگرہ گئی تھی تو پھر آٹھ ماہ کے بعد آئی تھی۔ سالی کی نظیر پیش کرنے سے میری بات بن گئی۔ پھر انہوں نے بلانے پر زور نہ دیا۔ اب بیوگی کی خبر سن کر بہت ہی بے قرار ہو گئے تھے اور ضرور آنا چاہتے تھے۔ میں نے ہزار ہزار بہانے بنا کر انہیں روکا اور بی امانی کو لے کر خود آ گئی۔ کوئی نوکر بھی اسی لئے ساتھ نہ لائی کہ یہاں کے حالات بیان کرے گا اور اب یہ کہہ آئی ہوں کہ ابھی میرا ہی جانا مناسب ہے اور عدت کے بعد اس کو یہیں بلا لیا جائے گا۔ تمہارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں نے سوچ لیا ہے کہ عدت ختم ہونے کے بعد اُن سے یہ کہہ دوں گی کہ چھ ماہی کی فاتحہ ہو جانے دو۔ پھر بلا لینا اور چھ ماہی کے بعد نو ماہی قریب ہوگی اور نو ماہی کے بعد یہ کہا جائے گا کہ اب برس بھی ہو جانے دو۔ جہاں اتنے عرصہ چھوڑے رکھا۔ ۳ ماہ اور سہی۔ لڑکی برسی کر کے آئے گی تو کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا۔ اسی طرح کی باتوں میں ایک سال اس کا اور گزر جائے گا اور میں جو اپنا انتظام کر رہی ہوں کر چکوں گی۔ اس کے بعد یا تو وہ بیٹی کو بھول جائیں گے اور اگر بلا بھی لیا تو پھر اختر کا وہاں ہونا مجھے نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

جانی بیگم رات کے ۱۱ بجے جب سب سو چکے تھے تو دالان میں بیٹھی حیدر علی کی بیوی سے یہ باتیں کر رہی تھی۔ ان کے خیال میں اختر سو رہی تھی مگر اس سوختہ دل کو نیند کہاں؟ وہ آنکھیں بند کئے سب صلاح و مشورے سن رہی تھی اور دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ اب برس کے بعد بھی اگر بلائی تو نہ جاؤں گی اور جس طرح بھی ہوگا۔ انہیں ظالم ساس اور خسر کی خدمت میں عمر بسر کروں گی۔

دسویں کی فاتحہ کر کے جانی بیگم مع امانی کے میرٹھ روانہ ہو گئیں۔ چلتے وقت اختر غریب کو ایک پیسہ نہ دیا۔ سوا مہینہ غریب بیکس اختر کا حالت بخار میں پلنگ پر گذرا۔ بیٹے کی فاتحہ چہلم کر کے حیدر علی مع بیوی کے حج کے لئے جانے کو تیار ہو گئے۔ اپنا مکان بند کر کے جو تھوڑا بہت اپنا غریبانہ اسباب تھا وہ نثار علی کے گھر بند کر دیا اور بیوہ ظفر کو بھی انہیں کے سپرد کیا۔ چلنے سے ایک دن پیشتر حیدر علی و نثار علی اور ان دونوں کی بیبیوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔

حیدر: میاں نثار کل ہم بمبئی روانہ ہو جائیں گے۔ لاؤ اُس روپے کا حساب تو کر لیں۔

نثار: بھائی حساب ہی کیا ہے؟ ڈیڑھ ہزار روپے آپ کے ہیں۔

حیدر: ہیں کل ڈیڑھ ہزار؟ بہو کا جہیز تو ہزاروں کا تھا۔ اس کی تو تخت چوکی چھپر کھٹ وغیرہ پر چاندی چڑھی تھی۔

نثار: تب ہی تو ڈیڑھ ہزار بھی ہوا ورنہ اس سے بھی کم ہوتا اور وہ چاندی تھی ہی کیا؟ ایک ہوائی ورق تھا۔ تمام چیزوں کی چاندی ملا کر تین سو روپے کو بکی۔ چاندی کے برتن اور پیروں کا زیور کل پانچ سو میں بکا۔ سونے کا زیور سادا و جڑاؤ ڈیڑھ ہزار میں۔ تانبے کے برتن، انگریزی باجہ (ہارمونیم) اور دوسری چیزیں صندوق ٹرنک وغیرہ دو سو میں گئے اور ریشمی جوڑوں کا مول پانچ سو پڑا۔ غرض کہ تمام سامان ۳ ہزار میں بیچا گیا۔

حیدر: ارے بھائی غضب ہوگیا۔ ہم بہت گھاٹے میں رہے۔ آخر امیر گھر کا جہیز تھا۔ کم از کم ہوگا جب بھی جانی بیگم نے پانچ ہزار کا دیا ہوگا۔ تم نے دہلی میں ناحق بیچا۔ لکھنؤ میں لگاتا تھا۔ شاید وہاں اچھے داموں بکتا۔

نثار: تمہیں تو دنیا کی خبر نہیں۔ یونہی اپنی چلا دیتے ہیں۔ لکھنؤ میں ہم نے جان کر نہیں بیچا کیوں کہ وہ سب سامان جانی بیگم نے وہیں تیار کرایا تھا۔ برتن وغیرہ وہیں سے خریدے تھے۔ بات کھل جاتی۔

حیدر: خیر جو ہونا تھا ہوگیا۔ ہمیں یہ تو بتاؤ کہ ہمیں ڈیڑھ ہزار کیسا دیتے ہو؟

نثار: ڈیڑھ ہزار نہیں تو اور کتنا دیں۔ تمہارا اقرار تھا کہ امیر بہو سے جتنا مال ملے گا اس کا تیسرا حصہ تمہارا، سو ایک ہزار تو میرا ہوا۔ اب بتاؤ ان دونوں کو بھی کچھ دو گے۔ جنہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر آدھی رات میں چھت کاٹی اور اسباب نکالا۔ اب تک پولیس ان کے سراغ میں ہے، ڈھائی ڈھائی سو اُن دونوں کو دیا جائے گا۔ وہ تو شکر ہے کہ دونوں چور اپنے پھوپھی زاد بھائی ہیں جو پانچ سو پر بھی رضامند ہوگئے ہیں ورنہ غیر ہوتے تو برابر کا ایک ہزار لیتے۔ اب اگر پانچ سو سے بھی کم دیا گیا تو راز افشا ہونے کا خطرہ ہے۔ یہی دونوں پولیس کو خبر کر دیں گے۔

حیدر: اچھا بھائی جو تم نے کیا۔ پانچ سو روپیہ آج ہی انہیں دے دو اور میرا مال میرے حوالے کر دو۔ میری بہو تمہارے حوالے ہے جب تک ہم واپس آویں۔ اس کو

اپنی خدمت میں رکھو۔ تمہاری بیوی کے باورچی خانہ کا کام کرے گی اور تمہارے بچوں کو پالے اور سنبھالے گی۔

اس مشورے کے دوسرے دن حیدر علی مع بیوی کے بمبئی روانہ ہو گئے اسی دن سے مصیبت زدہ بیمار اختر نثار علی کے گھر خدمتگاری میں مصروف ہو گئی۔ نثار علی کی بیوی سلطانہ نے کسی معمولی سی بات پر خفا ہو کر کھانا پکانے والی عورت کو بھی نکال دیا۔ اب باورچی خانے کا تمام کام اسی پر آپڑا۔ اُن کے گھر ایک گائے بھی تھی جس کا دودھ بلونا۔ گوبر تھاپنا وغیرہ وہی ملازمہ عورت کیا کرتی تھی۔ اب سلطانہ بیگم کو تو کیا ہی مصیبت پڑی تھی کہ وہ خود کرتیں۔ یہ کام بھی اسی آفت رسیدہ کے سپرد ہوا۔ غریب اختر کا ٹائم ٹیبل یوں تھا۔

صبح سب سے پہلے نماز پڑھتی اور تلاوت قرآن کرتی۔ پھر تمام گھر میں جھاڑو دے کر آگ جلاتی۔ باسی روٹی سالن بچوں کے لئے گرم کر کے دودھ بلوتی اور گوبر تھاپتی۔ اتنے میں سلطانہ کے بچے اُٹھ بیٹھتے۔ اُن کا منہ ہاتھ دُھلا کر روٹی کھلا کر مدرسہ بھیجتی۔ اس وقت تک بازار سے سودا بھی آجاتا۔ پھر چولہے پر جھک جاتی۔ کھانا تیار کر کے میاں بیوی کو کھلاتی۔ بعد میں بچا کھچا چولہے پاس بیٹھ کر خود کھالیتی۔ دوپہر کو سلطانہ بچوں کے کپڑے سینے کو دے دیتیں۔ تیسرے پہر سے پھر باورچی خانے کے کام میں مصروف ہو جاتی۔

ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا۔ اس کی خوش سلیقگی سے نثار علی بہت خوش تھے۔ دو ایک دفعہ انہوں نے بیوی سے کہا بھی کہ اختر کو کھانا ساتھ کھلایا کرو۔ وہ تمہاری بہو ہے۔ کوئی نوکر تو نہیں۔ سلطانہ نے جواب دیا کہ میں نے اس سے کہا تھا وہ تم سے شرم کرتی ہے۔ اس لئے ساتھ نہیں کھاتی۔

جب اس کے کپڑے بہت میلے ہو گئے تو نثار علی نے معمولی سا ایک نیا جوڑا بنا دیا۔ سلطانہ کو یہ بھی بہت برا لگا۔ اُس دن سے وہ اختر سے جلنے لگیں۔ اختر چونکہ بہت اچھی طرح گھر کا کام کرتی تھی اور سلطانہ کے آگے بالکل نہ بولتی تھی اس لئے نثار علی کے دل میں اس کی بہت عزت وقدر ہو گئی۔ وقتاً فوقتاً بیوی سے کہتے رہتے کہ اختر کمزور ہے۔ اس لئے اس قدر زیادہ کام نہ لیا کرو اور نہ نوکروں کی طرح جھڑکا کرو۔ تین مہینے کی بات ہے۔ بھائی آجائیں گے تو وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔

میاں کے اتنے کہنے سے سلطانہ آگ بگولہ ہو گئیں اور اختر کو اپنا دشمن سمجھنے لگیں۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہندوستانی جاہل مستورات اپنے میاں کو اس کی ماں بہن کی طرف داری کرتے بھی نہیں دیکھ سکتیں اور غیر عورت کی طرف تو دیکھنا بھی غضب ہے۔ اب انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ اختر نہایت قابل حسین لڑکی ہے اور اس کا والی وارث بھی کوئی نہیں۔ کہیں ایسا ہی نہ ہو کہ میاں نکاح کر لیں جس طرح ہو اس کو یہاں سے نکالنا چاہئے۔

حیدر علی کو یہاں سے گئے دو ماہ گذر چکے تھے۔ اختر کے ایام عدت بھی ختم ہو گئے تھے کہ ان تحصیلدار صاحب کا (جن کے ساتھ حیدر علی حج کو گئے تھے) خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ حیدر علی نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی ہیضہ سے انتقال کیا چونکہ بیوی بیمار کی خدمت میں رہیں اُن کے دوسرے دن ان پر بھی وبائی اثر ہو گیا اور میاں کے سوم کے دوسرے دن وہ بھی اُن کے پاس جا پہنچیں۔ اُن کے پاس سے روپیہ تو کچھ نکلا نہیں، دو بستر ے اور ایک گٹھری ہے جو تم کو پہنچا دی جائے گی۔

جس دن یہ خط ملا۔ گھر میں رونا پیٹنا پڑ گیا۔ نثار علی اور اُن کی بیوی کو بھائی بھاوج سے زیادہ اس ڈیڑھ ہزار روپے کا غم تھا۔ جو اُن کے ساتھ ضائع ہوا۔ آفت رسیدہ اختر پر ایک اَور مصیبت پڑی۔ وہ ایک ایک گھڑی یہاں مصیبت سے گزار رہی تھی کیوں کہ اُسے سلطانہ کے بدلے ہوئے خیالات معلوم ہو گئے تھے۔ ٹیڑھی آنکھ تو ہر ایک پہچان سکتا ہے اور وہ تو تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اس اُمید پر گن گن کر دن گزار رہی تھی کہ کہیں ساس سسر آ دیں تو میں اس سخت ذلت سے نکلوں۔ گو وہاں بھی ہزاروں مصیبتیں اور دُکھیں برداشت کرنی پڑیں گی مگر اس قابل شرم بدگمانی سے تو نجات ملے گی لیکن اس بدنصیب کے لئے وہ بھی نہ رہا۔ ان دونوں کے انتقال کی خبر نے اس کے ٹوٹے دل پر اَور بھی بجلی گرا دی۔ اب اس کو دنیا میں اپنا کوئی ٹھکانا نظر نہ آتا تھا۔

عدت کے بعد بھی میرٹھ میں نہ بلائی گئی۔ کیسے بلائی جاتی؟ وہاں تو بیگم صاحبہ کے مشوروں کی پابندی تھی۔ وہ جو کچھ یہاں کہہ گئی تھیں۔ وہی ہونا تھا۔ آفرین ہے اختر کے حوصلے پر اگر اس کی بجائے کوئی جاہل غریب گھر کی لڑکی بھی ہوتی تو اس قدر مصیبت و ذلت برداشت نہ کرتی۔ اوّل تو نالائق شوہر کے ساتھ ہی بسر کرنا مشکل تھا اور اس کے بعد تو یہاں

رہنا اب بالکل فضول اور سخت مشکل تھا کیوں کہ جس کے وسیلہ سے آئی تھی وہ بھی نہ رہا اور پھر حقیقی ساس سسر بھی نہ رہے۔ چچیا سسر کے گھر کی خدمت اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ ساس جلنے لگے کس قدر دشوار تھی۔

گو اختر کا ٹھکانہ اس کے باپ کے گھر نہ رہا تھا لیکن وہ تعلیم یافتہ تھی اس کی زندگی اب بھی کچھ اچھی گزر سکتی تھی اور کچھ نہیں تو اسکول ہی میں کام کر کے بافراغت بسر اوقات کر سکتی تھی مگر اس خیال سے اس قدر مصیبتیں اپنے سر لئے ہوئے تھی کہ تعلیم نسواں کے مخالف یہ نہ کہیں کہ "دیکھو تعلیم کا اثر۔ وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کو پڑھایا تھا۔ اس کا کیا اچھا نتیجہ نکلا؟ ہندوستانی رانڈیں ایک کونے میں پڑ کر ساس سسر کی جوتیوں میں عمر بھر بسر کر دیتی ہیں۔ یہ علامہ نوکری کرنے نکلی۔"

مخالفین تعلیم نسواں کے اس قسم کے اعتراضات گو قابلِ توجہ نہیں تاہم وہ زمانے کی نازک حالت سے ڈرتی ہوئی محض اسی لئے مصائب سخت برداشت کر رہی تھی کہ مجھ پر جو گذرتی ہے گذر جائے گی۔ مجھ سے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے ناسمجھ مخالفین تعلیمِ نسواں کو بدنام کریں۔ بس اسی لحاظ سے وہ اب بھی سلطانہ کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کرنے کو تیار تھی مگر صرف اُسی کی ایثار نفسی سے کیا ہو سکتا تھا جب کہ گھر کی مالکہ سلطانہ ہی اس کو نہ رکھنا چاہتیں؟

جس دن جیٹھ جٹھانی کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ وہ بہت پریشان ہو گئی تھیں کہ اب تو یہ ساری عمر کو میرے ہی سر پڑی اور بات بات پر موقعہ ڈھونڈتی تھیں اس کو گھر سے نکال دینے کا۔

ایک دن رات کے وقت جب کہ بارش ہو رہی تھی اور سلطانہ بیگم مع بال بچوں کے کھانا کھا چکی تھیں۔ اختر بھی کام سے فراغت پا کر اپنی کوٹھری میں جا پڑی تھی۔ نثار علی باہر بیٹھک میں تھے کہ بی سلطانہ میاں کی فکر میں باہر نکلیں۔ پہلے بچے کو پیشاب کرایا اور دروازے کی زنجیر ہلائی میاں کے بلانے کو مگر جب باہر سے جواب نہ پایا تو غصہ میں آ کر بچے کو پیٹ دھرا۔ وہ لگا رونے اور شور مچانے، اس کو وہیں چھوڑ آپ باورچی خانے گئیں اور چیخ کر کہا کہ اس کو ذرا گھر کا درد نہیں۔ شام ہوئی اور جا سوئی۔ باورچی خانے میں پڑے کتے لوٹیں!

یہ آواز سنتے ہی اختر باہر آئی اور کہا:

اختر: چچی جان آپ کیا فرما رہی ہیں۔ میں تو بہت دیر بعد پلنگ پر گئی تھی جب کہ آپ سب کھانا کھا چکے تھے اور تمام برتن سنبھال کر رکھ گئی ہوں۔ بے شک کتوں کو میں نہیں روک سکتی کیوں کہ وہ نالی یا دیوار پر سے آجاتے ہیں۔

سلطانہ: (جھلا کر) چل چل فقیرنی۔ لگی مجھے جواب دینے۔ اللہ رے اللہ ٹکڑ گدا کو بھی زبان ہوئی۔ ہمارا ہی کھائے، ہمیں ہی غرائے۔

یہ تیزی سے برس رہی تھیں کہ میاں باہر سے آ گئے۔

نثار: ہیں ہیں خیر تو ہے۔ کیا ہوا؟ اس وقت کیوں ناراض ہونے لگیں؟ بچے کو تو اُٹھاؤ۔ دیکھو وہ بارش میں بھیگ رہا ہے۔

سلطانہ: بس جی بس۔ تم ہمارے معاملے میں مت بولا کرو۔ بچے کو مرنے دو میں اکیلی کیا کیا کروں؟ اس اپنی بچہ لگتی کو نہیں کہتے۔ سرِ شام سے اندر گھس کر پڑ رہتی ہے نہ بچوں کی فکر نہ کام کا خیال۔ میں ننھے کو پیشاب کرانے نکلی، دیکھا کہ باورچی خانے میں کتوں کا راج ہے۔

میاں: وہ تو ہمیشہ برتنوں کو سنبھال کر سویا کرتی ہے۔ آج شاید بخار تیز ہو گیا ہوگا جو جا پڑی اور یہاں تو کوئی برتن بھی نہیں۔ کتوں نے کیا نقصان کیا؟

بیوی: تم نے پھر اسی کی طرفداری کی۔ خدا کی قسم ہے کہ اگر پھر اُس کی طرفداری میں بولے تو تو میں جان دے دوں گی۔ تم ہی نے اس کو میرے سر پر چڑھایا ہے۔ خدا کی شان۔ ٹکڑے کی محتاج اور ہمارے آگے جواب دے۔ بس اس گھر میں یا مئیں رہوں گی یا وہ۔ دو کا اب گزارہ نہ ہوگا۔

میاں: خدا کے واسطے اس قدر غصہ نہ کرو اور ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ تمہاری اور اس کی کیا برابری؟ وہ بیچاری تمہاری بیٹیوں کے برابر ہے اور تم اس کی ماں ہو۔

بیوی: بیٹیوں کے برابر ہی ہے ناں۔ بیٹی بنتی تو نہیں۔ بس میں کہہ چکی کہ وہ اور مئیں ایک گھر میں نہ رہیں گے۔

اختر یہ کہتی ہوئی سلطانہ کے قدموں پر گر پڑی کہ "چچی جان للہ معاف کرو۔ اب کبھی

زبان نہ ہلاؤں گی اور میں نے اب بھی صرف اتنا کہا تھا کہ سب برتن سنبھال کر اندر گئی تھی۔"

سلطانہ نے جھٹک کر اُسے اپنے پیروں سے الگ کر دیا اور بہت بگڑ کر کہا۔

سلطانہ: بس بس ہٹ پرے کو۔ اب لگی خوشامد کرنے۔ میں ان باتوں میں آنے والی نہیں۔ خدا نے تجھے اپنے گھر سے بھی زیادہ آرام دیا ہے تو اس گھر کو کیوں چھوڑنے لگی؟ مگر میں بچوں والی ایسی نادان نہیں ہوں کہ تجھ دشمن کو اپنے گھر میں رکھوں۔ خیر اسی میں ہے کہ نکل جا ابھی میرے گھر سے۔

اختر: (بیکسی سے رو کر) چچی نکل کر میں کہا جاؤں؟ میرا کہاں ٹھکانا ہے؟ جانی بیگم نے تو آپ کے سپرد کر دیا۔

نثارہ: (بیوی سے) غصہ کو جانے دو اور اس پر رحم کرو۔ بارش ہو رہی ہے اور رات کے ۱۱ بجے ہیں۔ یہ بیکس لاوارث نکل کر کہاں جائے گی؟

سلطانہ: (غصہ سے تھرا کر) دیکھا۔ تم پھر بولے اس کی بات میں اب تو میں ایک لحظہ بھی اس چڑیل کو اپنے گھر نہ رکھوں گی۔

یہ کہا اور اختر کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ڈیوڑھی تک لے گئیں اور نوکر سے کہا کہ: "اپنا منہ چھپا لے، میں اس چڑیل کو گھر سے نکالتی ہوں۔" اور ڈیوڑھی کے دروازے سے بھی باہر یعنی گلی میں نکال کر دونوں دروازے کی زنجیریں لگاتی ہوئی اندر چلی آئیں۔ بچے کو اُٹھائے صحن میں میاں حیران کھڑے تھے۔ اُن سے بچہ تو خود لے لیا اور ہاتھ پکڑ کر میاں کو دالان میں لے گئیں۔

اب ذرا اختر کا حال دیکھیے۔ سخت بارش اور اندھیری گلی، بخار میں کانپتی ہوئی، حیران کھڑی اپنی بیکسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ کہاں رات بسر کرے۔ بارش زیادہ ہوتی جاتی تھی جس سے چند منٹ ٹھیر کر وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ یوں تو کانپور میں اس کے بہت سے واقف تھے۔ اس کی کلاس فیلو، کئی معزز سہیلیوں کے گھر بھی یہیں تھے اور اُستانیوں کے بھی لیکن اپنی ذلیل حالت سے وہ کسی کو آگاہ نہ کرنا چاہتی تھی، نہ کسی سے مدد لینا اس کا غیور دل گوارہ کرتا تھا۔

آخر کار مجبور ہو کر اختر نے اسٹیشن کا راستہ لیا۔ کیوں کہ وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں

وقت بے وقت مسافروں کے جانے نہ جانے پر کوئی تعجب نہیں کرسکتا اگر اس وقت وہ اچھے لباس میں ہوتی تو اپنی مہربان مسز الفرڈ (اسٹیشن ماسٹر کی بیوی) کے گھر چلی جاتی مگر چونکہ بہت ہی رڈی حالت میں تھی۔ یعنی سوتی کا ہندوستانی وضع کا تنگ پاجامہ، موٹی ململ کا میلا سا کرتہ اور دوپٹہ پہنے تھی۔ اس لئے اس نے یہی مناسب جانا کہ یہاں کے کانٹے والے عبداللہ (جو ظفر کا واقف تھا) کی کوٹھری میں رات کے باقی گھنٹے گزارے۔ چنانچہ اس کی بیوی کو آواز دے کر جگایا اور وہیں وقت گزار دیا۔ صبح آٹھ بجے تو یہاں سے نکلی۔ چونکہ اب وہ سخت مجبور تھی۔ کوئی اس کا مددگار نہ تھا۔ اس لئے ایسے آڑے وقت میں وہ ہندوستانی پردہ قائم نہ رکھ سکتی تھی۔ اس وقت اس کے پاس سوائے ایک سونے کی انگوٹھی کے اور کچھ نہ تھا۔ وہی بزاز کی دوکان پر پانچ روپے میں فروخت کی اور وہیں سے دو روپے میں موٹی ململ کی ایک ساڑی خریدی اور تھوڑی دور آگے چل کر کباڑی کی دُکان سے ایک پرانی بلاؤس ایک روپے میں خریدی۔ یہ دونوں کپڑے خرید کر پھر عبداللہ کے ہاں آئی۔ یہاں ٹکڑا کھایا اور وہ کپڑے پہنے اور وہ تینوں کپڑے جو پہلے پہنے ہوئے تھی۔ ہمدردی کے صلے میں عبداللہ کی عورت کو دے دیئے۔ گو ایک بار بازار سے ہو آئی تھی لیکن اس کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ کھلے منہ قدم باہر نکالے۔ گو بازار سے چیزیں خرید لائی تھی لیکن اس طرح کہ تمام چہرہ دوپٹہ سے چھپائے رکھا تھا۔ چونکہ باہر نکلنا تھا اس واسطے اختر نے لباس تبدیل کیا۔ اس خیال سے کہ ساڑی میں ہندو اور پارسی لیڈیز بے پردہ چلتی پھرتی عام نظر پڑتی ہیں۔ مجھے کوئی خصوصیت سے نہ دیکھے گا اور نہ معلوم ہوں گی۔

جب دس بج گئے تو اختر وہاں سے سیدھی ڈاک خانے گئی۔ وہاں سے وہ ڈاکٹر ایلس کا رکھوایا ہوا روپیہ اور زیور برآمد کرایا۔ پانچ سو روپے کے نوٹ اور خالہ زاد بہن کی دی ہوئی بر سلٹ لے کر اُسی منی بیگ میں ڈال کر ساتھ لیا اور خالہ کا دیا ہوا مالا اور اختر حسن کا ستلوا و گلوبند پھر وہیں رکھوا دیا۔ وہاں سے اسٹیشن پر آئی چونکہ ٹرین کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اسی وقت مسز الفریڈ سے ملنے بنگلے پر گئی۔ انہوں نے کھانا کھلایا۔ وہیں اُس نے ایک بہت لمبا خط وکیل صاحب کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

از ریلوے اسٹیشن کان پور

حالت پہ میری آپ توجہ نہیں کرتے
اور کان لگا رکھے ہیں غیروں کی صلاح پر

میرے پیارے ابّا جان!

آہ آپ مجھے مدت سے بھلا چکے ہیں۔ پھر میں یہ خط کیوں لکھ رہی ہوں؟ آپ اس کو بھی نہ پڑھیں گے۔ اوّل تو امید ہے آپ تک کوئی پہنچنے ہی نہ دے گا۔ ہائے میرے پیارے ابا، آپ کے دل کو کیا ہو گیا؟ ایک غیر کی خوشی پر اپنی اختر کو قربان کر ڈالا۔ میں اپنی مصیبت کی داستان کیوں اور کس طرح سناؤں؟ مگر آپ کو بھی نہ سناؤں تو اور کس کو سناؤں؟ آپ کے سوا دُنیا میں میرا اور کون ہے؟

ابا جان غیروں کی صلاح سے بلا تحقیق حالات آپ نے مجھے ایک ذلیل گھر دے دیا۔ آپ کی خوشی پر میں نے وہ ذلت بھی منظور کی۔ آپ سے رُخصت ہو کر یہاں آئی۔ پھر آپ نے میرا نام ہی نہ لیا۔ مرحوم ظفر کے والدین نے نہایت ذلت و حقارت سے تیسرے ہی ہفتے ہم دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ پھر میں اسی آپ کے دیئے ہوئے نا قابل و نادار شوہر کے ساتھ اُس کی جائے ملازمت پر امروہہ گئی۔ جہاں وہ بیچارہ دس روپیہ ماہوار پر کام کرتا تھا اور آپ کی دانش میں وہ اسٹیشن ماسٹر تھا۔ آٹھ ماہ اس زندانِ تنگ و تاریک میں ایک محض جاہل کے ساتھ نہایت خوشی سے بسر کئے اور میرے پیچھے مرحوم والدین ظفر نے میرا تمام جہیز فروخت کر ڈالا اور یہ مشہور کیا کہ چوری ہو گئی۔ اسکے بعد ظفر نے بھی تنہائی و غربت میں مجھ سے منہ موڑ لیا۔ میں پھر کان پور لائی گئی۔ یہاں تعزیت کے لئے بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ ان میں اور مرحومہ والدہ ظفر میں میری بابت جو

مشورہ ہوا۔ وہ میں نے سنا۔ ابا جان خدا گواہ ہے کہ میں بیگم صاحبہ کی برائی میں ایک لفظ بھی زبان و قلم سے نکالنا نہیں چاہتی ورنہ وہ مشورہ میں حرف بہ حرف آپ کو لکھتی۔ بس اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد عدت بھی آپ نے مجھے نہ بلایا۔

مرحوم کے والدین مجھے اپنے ایک عزیز کے سپرد کر کے حج کو گئے اور وہیں انتقال کیا۔ میں نے اُن کی بھی نہایت جان کاہی سے خدمت کی مگر وہ لوگ بھی مجھ سے جلنے لگے۔ بھلا کون کسی کو روٹی دے سکتا ہے؟ ابا جان آپ کی کنیز نے وہ وہ کام کیے جو کبھی اس کی کنیزوں نے بھی نہ کیے تھے۔ جھاڑو ئیں دیں، برتن مانجھے، کپڑے دھوئے، گوبر تھاپا، غرض جو کرنا تھا، وہ کیا لیکن پھر بھی میرا گزارہ نہ ہوا۔ رات کو سخت بارش ہو رہی تھی اور ۱۱ بج چکے تھے کہ مرحوم کی چچی نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ آہ اس وقت میری نظروں میں تو دُنیا اندھیر تھی ہی مگر ویسے بھی سخت اندھیرا تھا۔ کوئی راستہ یا ٹھکانہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کدھر سے کہاں جاؤں بخار تیز تھا اور اُس سے کہیں زیادہ بارش زوروں پر تھی۔ بمشکل گرتی پڑتی اسٹیشن تک پہنچی اور رات کے باقی گھنٹے مرحوم کے واقف کانٹے والے کی بیوی کے پاس گزارے۔

میرے ابا جان اس وقت بے اختیار دل چاہتا ہے کہ اپنے اصلی ٹھکانے یعنی آپ کے قدموں میں حاضر ہو کر بقیہ زندگی بیگم صاحبہ کی خدمت میں گذار دوں چونکہ میں اُن ذلیلوں کی خدمت کر چکی ہوں اور آئندہ کرنے کا بھی ارادہ رکھتی تھی جو اُنہیں منظور نہ ہوا تو بیگم صاحبہ تو پھر میری والدہ کی جانشین ہیں مگر آہ میری قسمت ایسی کہاں؟ وہاں ایک منٹ کے لئے میرا گذارہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ میں اپنے قیام میرٹھ کے متعلق مخالفانہ بندوبست کا پورا حال بیگم صاحبہ کی زبانی سن چکی ہوں۔ میں آپ سے کچھ نہیں کہتی۔ خدا منصف ہے۔ کبھی نہ

کبھی یہ جعل وفریب سب خود ہی کھل جائے گا جس وقت یہ رازِ سنگین ظاہر ہوگا آپ کو سب حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت بھی کہ بالکل برباد وتباہ ہو چکی ہوں۔ میں آپ پر کوئی خفیہ بات ظاہر نہیں کرتی اور اتنا بھی نہیں لکھتی کہ جہاں آپ نے میری شادی کردی تھی، یہ لوگ کون اور کس حیثیت کے ہیں؟ بیگم صاحبہ کا اُن سے کیا تعلق ہے؟ اور یہاں میری شادی کیوں کی گئی؟ میں یہ سب خدا پر چھوڑتی ہوں۔ وہی ان سنگین معاملات کا انکشاف کرے گا۔

پیارے ابا! میں اب خط ختم کرتی ہوں اور یہ عرض کیے دیتی ہوں کہیں اپنا ٹھکانہ پا کر اور دُنیا میں بالکل بے کار ثابت ہو کر اب اپنی زندگی اپنی ہم جنسوں کی خدمت میں صرف کرنے کو تیار ہوں۔ ابا جان زمانہ بہت برا ہے اور خصوصاً ان اطراف پر تو جہال کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کان پور اور میرٹھ کے بہت سے مخالفین تعلیمِ نسواں میری بابت آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہیں گے اور بیگم صاحبہ تو غضب ہی ڈھائیں گی جس کا مجھے از حد خیال ہے مگر میں مجبور ہوں کہ سوائے قومی خدمت کے میری بسر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لیے عرضِ خدمت ہے کہ جو کوئی بھی آپ سے کچھ کہے۔ آپ یہی کہہ دیں کہ "میری اجازت سے میری بیوہ لڑکی زنانہ اسکولوں کی نگرانی کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ میں نے خود اُسے کام میں لگا دیا ہے تاکہ اس کی زندگی بیکار ضائع نہ ہو اور جس قدر تعلیم وہ حاصل کر چکی ہے۔ اس سے اپنی ہم جنسوں کو فائدہ پہنچائے۔"

ابا جان ۱۲ بج گئے اور ٹرین آ پہنچی۔ اس خط کو بند کر کے آپ کی کنیز نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ کان پور چھوڑتی ہے۔

آپ کی بدنصیب وتباہ حال اختر

خط بند کر کے اختر نے پوسٹ کیا اور اس ارادے سے مراد آباد کا ٹکٹ لیا کہ وہاں سے سول سرجن صاحب کے مشورے سے کوئی کام اپنے ذمے لوں گی اور یہ کہتی ہوئی مراد آباد کے لئے گاڑی میں جا بیٹھی۔

دیکھتی ہوں اور کوئی صورت نظر آتی نہیں
ہائے کس آفت کی تنہائی ہے، تنہائی مری
بیکسی پر یوں میری آنکھیں نہیں ہیں اشکبار
رو رہی ہے اپنی تنہائی پہ تنہائی مری
بیکسی تو ساتھ دے ، تنہائی تو غمخواری
ہوں میں آوارہ وطن اپنا نہ بیگانہ میرا

اُنیسواں باب

افشائے راز

قیصری باغ لکھنؤ

گو ظلم کئے تُو نے تھے پوشیدہ ستم گر
پر رازِ نہاں چھپ نہ سکے کھل گئے آخر

رفتار زمانہ کبھی یکساں نہیں دیکھی۔ اس کی روانی بہتے ہوئے پانی سے زیادہ تیز رو اور بدلنے والی ہے ع

زمانے کی یہ حالت ہے، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

زمانے کو اپنے موافق پاکر یہ سمجھ لینا کہ ہمیشہ ہماری خوشحالی میں بسر ہوگی۔ سخت نادانی ہے۔ اس کم بخت نے تو کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا اور نہ دے گا۔ اہلِ عقل اس کو اپنے موافق سمجھ کر کبھی خوشی نہیں کرتے چونکہ وہ اس کی بیوفائی سے آگاہ ہیں۔ دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

اس لئے کہ جب زمانہ ہمارے خلاف پلٹا کھائے تو یہ رنج نہ اُٹھانا پڑے کہ ہائے یہ ہم سے کیوں بدل گیا؟ وہ تو ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں۔

ممکن نہیں کہ اب ہے جو صورت وہی رہے
ویسا کبھی رہا ہے نہ ایسا کبھی رہے

گو سنگدل جانی بیگم کئی سال سے نہایت عزت و حرمت کے ساتھ وکیل صاحب کے گھر پر حکمرانی کر رہی تھیں اور شاید یہ سمجھتی ہوں کہ ہمیشہ اسی طرح بسر ہو گی مگر کب ممکن تھا؟ آخر وہ بھی اسی دنیا میں تھیں اور اسی زمانے کے زبردست ہاتھوں نے اس معزز شاندار گھر میں حکمرانی پر بٹھایا تھا اور یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ ہمیشہ اسی حالت میں رکھوں آخر ان کی حالت میں بھی تبدیلی ہونی تھی۔ اب وہ زمانہ آ پہنچا تھا کہ اُن کی بدکرداریاں روزِ روشن کی طرح وکیل صاحب پر ظاہر ہوں۔

اختر النساء کو بیوہ ہو کر نثار علی کے گھر سے گئے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ وکیل صاحب کسی مقدمے کی پیروی میں میرٹھ سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور مرزا اقبال بہادر کی کوٹھی متصل قیصری باغ میں فروکش تھے۔

وکیل صاحب اور مرزا صاحب میں کبھی کی واقفیت نہ تھی مگر نہ معلوم کیوں مرزا صاحب کو وکیل صاحب سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اب سے نہیں اُن دنوں میں جب کہ وکیل صاحب جانی بیگم کو یہاں سے شادی کر کے لے گئے تھے۔ شادی کے بعد دو ایک دفعہ وہ آئے بھی مگر مرزا صاحب کو ان سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اب جو انہیں معلوم ہوا کہ مسٹر رفیق احمد صاحب وکیل کسی مقدمے میں آئے اور ڈاک بنگلے میں ٹھیرے ہوئے ہیں تو مرزا صاحب فوراً وہاں پہنچے اور بعد معمولی تعارف کے اُن کا اسباب اپنے گھر لے آئے۔ دو تین دن کے ساتھ رہنے میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ وکیل صاحب کو اُن کے ہاں ٹھیرے چوتھا دن تھا۔ شام کے کھانے کے بعد میزبان و مہمان میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔

اقبال بہادر: مجھے آپ سے ملنے کا ایک عرصے سے شوق تھا۔ جواب پورا ہوا۔ آپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر میں خدا کا بہت بہت شکر گزار ہوتا ہوں۔ آپ نے میری دیرینہ آرزو پوری کی۔

وکیل صاحب: (مسکرا کر) آخر کیوں؟ آپ نے مجھ میں کیا ایسی خوبی سی تھی جس نے اس قدر ملنے کا اشتیاق پیدا کر دیا اور پھر مدت سے؟

اقبال: آپ کی روشن خیالی۔ قومی ہمدردی وغیرہ کی تعریف تو آپ کے زمانہ طالب علمی سے سُن چکا تھا اور جب آپ کی پہلی شادی ہمارے قابلِ تقلید بزرگ مولوی محمد یونس صاحب مرحوم کی اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال صاحبزادی سے ہوئی تھی تو یہ خبر سُن کر میں بہت خوش ہوا تھا کہ روشن خیال جنٹلمین کو بیوی بھی ویسی ملی۔ اس کے بعد یہ سن کر بے انتہا خوش ہوا کہ آپ نے اپنی لڑکی اختر النساء بیگم کو نہایت کم سنی میں بغرض تعلیم کانپور بھیج دیا ہے مگر افسوس کہ جلدی قابلِ فخر مرحومہ مسز رفیق احمد کے انتقال کی خبر ملی اور اس کے بعد تو پھر بُری سے بُری قابلِ افسوس خبریں سنتا رہا۔ شاید آپ نے کسی جگہ دوسری شادی کر لی ہے؟

وکیل: مجھ سے آپ اس قدر واقفیت رکھتے ہیں مگر افسوس کہ اس ہفتے سے پیشتر میں آپ کے اسم گرامی سے بھی آگاہ نہ تھا۔ بے شک آپ نے دوسری شادی کا حال بھی سنا ہوگا۔ میں اپنی قابل بیوی والدہ اختر کے بعد دوسری شادی کرنا نہ چاہتا تھا اور ایسے خیال کی بھی حقارت کیا کرتا تھا مگر آپ جانتے ہیں۔ بعض وجوہات ایسی پیش آجاتی ہیں کہ انسان اپنے خیالات اور ارادوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اسی قسم کے اسباب نے مجبور کیا دوسری شادی کرنے پر اور یہیں آپ کے لکھنؤ کے ایک معزز نوابی خاندان کی سمجھ دار بیگم سے شادی کر لی۔

اقبال: یہ آپ نے کیا کہا کہ بیگم سے؟ کیا وہ معزز لڑکی بیوہ تھی؟

وکیل: جی نہیں وہ نا کتخدا تھیں۔ میں نے لڑکی نہ کہا بیگم کہہ دیا۔

اقبال: جب آپ نے شادی کی ہے اس وقت ان نواب صاحبزادی صاحبہ کی عمر کیا تھی؟

وکیل: پچیس یا چھبیس سال ہوگی۔

اقبال: یہ رشتہ آپ نے اپنی واقفیت و تحقیق سے کیا تھا یا کسی اور کی معرفت؟

وکیل: میں تو بالکل بھی واقف نہ تھا۔ دو شخصوں نے جو لکھنؤ کے رہنے والے ان دنوں کچہری میرٹھ میں اُمیدوار تھے۔ نسبت ٹھیرائی۔ میرے چند احباب نے بھی یہی صلاح دی۔ چنانچہ رشتہ ہوگیا۔

اقبال: آپ نے بھی کچھ تحقیق کی یا انہیں کے بھروسے پر رہے؟

وکیل: جب معلوم ہو گیا کہ وہ نواب زادی شریف خاندان کی ہیں تو پھر تحقیق مزید کی مجھے کیا ضرورت تھی۔

اقبال: افسوس اس قدر تعلیم یافتہ روشن خیال ہو کر آپ نے یہ کیا کیا؟

وکیل: مگر اس سے قباحت ہی کیا ہوئی؟

اقبال: پیارے وکیل صاحب مجھے اپنا مخلص دوست جان کر سچ سچ کہہ دیں کہ اُن کے ہاتھوں آپ نے کوئی قباحت نہیں اُٹھائی؟ مجھے تو سب معلوم ہے۔ صرف آپ سے سننا چاہتا ہوں۔

وکیل: بیشک آپ کا خیال بجا ہے اور جس قدر تکلیف مجھے اور میری چہیتی اختر کو پہنچی ہے وہ آپ کو معلوم ہو گی لیکن یہ صرف بیگم پر ہی منحصر نہیں ہر ایک سوتیلی کا یہی شیوہ ہے۔ رذیل ہو خواہ شریف، غریب ہو یا امیر۔ ہاں یہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ بہ نسبت جاہل سوتیلی ماں کی تعلیم یافتہ سوتیلی ماں اپنی سوتیلی اولاد کو اچھی طرح رکھتی ہو گی۔

اقبال: آپ نے میرے خیال کو بجا کہا لیکن آپ کی اس تقریر کے کل الفاظ سے ایک فقرے کو بھی میں بجا نہیں کہہ سکتا۔ افسوس آپ نے اس قسم کے معاملات پر ذرا غور نہیں کیا ورنہ آپ کا قانون دان دماغ میرے دماغ سے کہیں زیادہ گہرے نتائج اخذ کر سکتا۔

اگر میں آپ کی ان دونوں باتوں کو (کہ بیگم کے ہاتھوں آپ کی لائق فائق صاحبزادی کو تکلیف پہنچی۔ وہ ضرور پہنچی تھی کیوں کہ سب سوتیلی مائیں اولاد کو اسی طرح رکھتی ہیں۔ ہاں تعلیم یافتہ ماں ان سے ذرا اچھا رکھتی ہو گی) معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دوں۔ تب بھی اس بات کا جواب لوں گا کہ آپ نے شادی سے پہلے بیگم صاحبہ کے حالات سے اچھی طرح واقفیت کیوں نہ کی؟ ممکن ہے کہ اُن کی نسبت جو کچھ لوگوں نے آپ سے کہا اس کے خلاف ہو۔

وکیل: مجھے ان کے حالات جیسے بتائے گئے تھے۔ وہ بالکل قابلِ اطمینان تھے۔ ممکن ہے کہ اس کے خلاف ہی کہا گیا ہو اور آپ اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں مگر کچھ بھی ہو، میری اختر کو ضرور ہی تکلیف پہنچی تھی اور اس تکلیف کا باعث صرف بیگم ہی نہیں بلکہ میری دوسری شادی ہوئی اگر ان کے علاوہ کوئی اور بیوی ہوتی تو وہ بھی اس کی سوتیلی ماں ہی ہوتی۔

اقبال: آپ کا یہ خیال تو بالکل بجا ہے کہ لڑکی کا باعث تکلیف آپ کی دوسری شادی ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ جو بیوی بھی ہوتی وہ لڑکی کی دشمن ہی ہوتی۔ اوّل تو یہی مناسب تھا کہ دوسری شادی نہ کرتے۔ آپ کا دل دنیا میں لگائے رکھنے کے لئے ایک لڑکی ہی کافی تھی۔ صاحب اولاد کو دوسری شادی نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے بعض ہندوستانی لوگوں کا خیال ہے کہ کم ازکم ایک بیٹا ضرور ہونا چاہئے جو جائداد وغیرہ کا مالک ہوگا۔ تو باپ کو ثواب پہنچے گا اور کسی غیر کے کام آیا تو گناہ ہوگا؟ نام چلنے کی آرزو ہی محض بیوقوفی ہے۔ فرض کرو، بیٹا ہوا اور وہ زندہ رہا۔ پھر اس کے اولاد ہوئی اور اس کی اولاد کے اولاد ہوئی۔ تو یہ سلسلہ قیامت تک چلا جائے گا لیکن نام آوری کی آرزو رکھنے والے شخص کا نام خیال کیجئے کہاں تک باقی رہ سکتا ہے اور کون کون اسے جانتا ہے؟ مجھے اپنے دادا مرحوم کے دادا کا نام بھی معلوم نہیں۔ حالانکہ ان کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ میری نسل باقی رہے اور نام چلے لیکن کون جانتا ہے کہ ان کا کیا نام تھا؟ سو مہربان من ایسی ایسی فضول آرزوئیں جہلا کو ہونی چاہئیں نہ کہ تعلیم یافتہ روشن خیالوں کو۔

وکیل: میں آپ کے خیالات معلوم کر کے نہایت خوش ہوا۔ اس ہمدردانہ نصیحت کا دل سے مشکور ہوں لیکن آپ اس بات کا یقین کریں کہ میں نے اولادِ نرینہ کی آرزو میں دوسری شادی نہیں کی۔

اقبال: شکر ہے کہ اس امر میں آپ میرے ہم خیال ہیں مگر میں اس بات پر آپ کو اور قائل کرنا چاہتا ہوں کہ اصل اور کم اصل کے فرق کو مانیں۔

وکیل: اس بات سے میں نے کب انکار کیا؟

اقبال: آپ صریحاً انکار کر چکے ہیں۔ ان الفاظ میں کہ اعلیٰ و ادنیٰ ہر ایک سوتیلی ماں اولاد سے برابرتاؤ کرتی ہے۔

وکیل: جناب میرے خیال کو صحیح مانیں۔ یہ میں تجربے سے کہتا ہوں اور کسی کو دیکھ کر نہیں کہتا بلکہ اپنے گھر میں آزما کر۔

اقبال: پھر آپ نے وہی کہا کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایسے زمانہ شناس جنٹلمین نے دوسرے لوگوں کا کیا سچ سمجھ رکھا ہے۔

وکیل: میں تو اب تک یہی سمجھا ہوا ہوں لیکن آپ کی تقریر سے شک ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔

اقبال: بے شک غلط اور بالکل غلط اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اتنی بڑی بات بے سوچے سمجھے آپ نے کہہ دی کہ "رذیل و شریف۔ غریب اور امیر سوتیلی ماں اولاد کے حق میں یکساں ہوتی ہے۔ شکر ہے۔ اتنا بھی کہا کہ تعلیم یافتہ اولاد کو اچھی طرح رکھتی ہوگی۔ آپ کے یہ شریف و رذیل والے الفاظ ان صدہا شریف، خاندانی، رحم دل، نیکی مجسم ماؤں کے اخلاق پر ظالمانہ حملہ ہے اس خیال کو دل سے نکال دینا لازم ہے۔ ایک شریف بی بی اس قدر ظلم کا خیال بھی نہیں کر سکتی جو ایک رذیل عورت سے عمل میں آتے ہیں۔ خیر اس کو بھی جانے دیں۔ جب آپ کا یہ خیال ہے کہ تعلیم یافتہ سوتیلی اولاد کو اس طرح رکھ سکتی ہے تو آپ نے اپنی پیاری لڑکی پر ظلم کیوں کیا؟ کہ محض ایک جاہل عورت سے شادی کر لی۔

وکیل: مجھ سے کہا گیا تھا کہ بیگم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔

اقبال: یوں کہئے ناں! یہی تو میں سننا چاہتا تھا۔ دیکھئے آخر ان بدباطنوں کا کہنا غلط ہی نکلا ناں؟ ممکن ہے کہ اسی طرح سب باتیں غلط ہوں۔

وکیل: میرے سچے ہمدرد میں مانتا ہوں کہ سب باتیں غلط ہوں گی۔ آپ جس قدر واقفیت رکھتے ہیں۔ اس سے مجھے آگاہ کر کے مشکور کریں۔ افسوس صرف میری زندگی تلخ نہیں ہوئی۔ آہ میری اختر بھی برباد ہوگئی۔

اقبال: میں سب کچھ جانتا ہوں۔ بیگم کی جڑ بنیاد سے بخوبی واقف ہوں۔ آہ افسوس ہے تو مجھے بھی اس بات کا ہے کہ لائق و ہونہار، فخر نسوان ہند اختر کو آپ نے تباہ کر دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ اختر کے خسر حیدر علی مرحوم کانپوری سے آپ کی بیگم صاحبہ کا کیا رشتہ ہے؟

وکیل: کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے یہ بتایا تھا کہ میرے واقف ہیں اور کانپور میں نہایت معزز گنے جاتے ہیں۔ بڑے بھاری امیر، جاگیردار ہیں، لڑکا تعلیم یافتہ نہیں۔ اس کا مجھے خیال تھا لیکن ان کی خوشی کے خیال سے چپ ہو گیا۔ دوسرے انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ لڑکا اسٹیشن ماسٹر ہے۔

اقبال: یوں کہیے تو بیٹی بھی بلا تحقیق بیاہ دی۔ آپ نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ جاہل میاں اور تعلیم یافتہ بی بی میں نبھ جائے گی۔

وکیل: یہ تو پوچھیے نہیں، میں تو پہلے کہہ چکا کہ لڑکی بھی اپنے ہاتھوں برباد کر دی۔

اقبال: اچھا یہ تو بتائیے کہ وہ لڑکی لاڈلی بیگم، بیگم صاحبہ سے کیا رشتہ رکھتی ہے؟

وکیل: وہ اپنے بھائی کی لڑکی بتاتی ہے۔

اقبال: کیا خوب! ہاں تو آپ کبھی اُن کے بھائی سے ملے بھی ہیں یا نہیں؟

وکیل: وہ کہتی ہیں اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے یہ لڑکی میرے پاس ہے۔

اقبال: مجھے یہ بھی بتا دیں کہ جب آپ کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت بیگم کے سرپرستوں میں سے بھی کوئی تھا یا نہیں؟ ان کی شادی کس نے کی تھی؟

وکیل: سرپرستوں میں سے اس وقت کون ہوتا؟ ہماری شادی کو دسواں سال ہے اور اُن کے والد نواب صاحب کے انتقال کو شاید پندرہ سال سے زیادہ عرصہ ہوا اور والدہ کا نواب صاحب کی زندگی میں انتقال ہو چکا تھا۔ بہن بھائی کوئی نہ تھا۔ صرف ایک مغلانی بی امانی اُن کے سرپرستوں میں تھیں، اور دو چھوکریاں، نرگس اور سازگار جواب تک میرے گھر میں موجود ہیں۔

اقبال: (ہنس کر) ان سب باتوں کے سچ ہونے کا آپ کو دل سے یقین ہے؟ ہاں کوئی ملازم بھی اُن کے ساتھ لکھنؤ سے گیا ہے؟

وکیل: اب تک تو یقین تھا مگر اب نہیں رہا۔ اُن کے ساتھ نوعمر لڑکا شمشاد نامی یہاں سے ساتھ گیا۔ جواب تک موجود ہے اور وہ کہتی تھیں کہ شمشاد میری انا مرحومہ کا لڑکا ہے۔ جس کو میں نے پالا ہے۔

اقبال: آپ نے تو اپنے ذہن نشین حالات بیان کر دیے۔ اب اگر اجازت دیں اور یقین کریں تو تمام سچے حالات بلا کم و کاست میں بھی عرض کر دوں۔ مَیں کچھ بھی نہ چھپاؤں گا جو میری قابل شرم و افسوس باتیں ہیں وہ بھی عرض کر دوں گا۔ اسی طرح آپ بھی اجازت دیں کہ ہر ایک بات کہتا چلا جاؤں اور آپ برا نہ مانیں؟

وکیل: (بچشم نم) نہایت خوشی سے بلا تکلف اپنے سچے خیر خواہ مخلص دوست سے التجا کرتا ہوں کہ تمام حالات مفصل بیان کر دیں۔

اقبال: چونکہ اب وہ آپ کی بیوی ہے۔ آپ اپنی عزت سمجھتے ہیں (گو دراصل بے عزتی ہے) اس لئے ڈرائنگ رُوم میں ان حالات کا بیان کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مہربانی کر کے آپ میرے سونے کے کمرے میں تشریف لے چلیں یا مجھے اپنے بیڈروم میں چلنے کی اجازت دیں۔

وکیل: مجھے دونوں باتیں منظور ہیں۔

اقبال: (ظرافت سے) اچھا تو آپ میرے پلنگ پر آرام کریں اور میں آپ کے کمرے میں جا پڑوں گا۔

وکیل: پیارے دوست آپ تو مذاق کرتے ہیں اور میرا دل دھڑک رہا ہے۔

اس گفتگو کے بعد دونوں بیڈروم میں آئے اور آرام کرسیوں پر لیٹ گئے جو گفتگو ان میں ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

اقبال: آج سے بیس سال پیشتر جب کہ میری عمر ۱۵ سال کی تھی اور میں انٹرینس میں تعلیم پاتا تھا۔ میرے والد تحصیل دار افضال بہادر مرحوم شاہجہانپور سے تبدیل ہو کر لکھنؤ آئے تھے اور آپ کے خسر نواب صاحب کے عالیشان مکان کے ساتھ ہی مکان لیا تھا۔ اس زمانے میں نواب صاحب مرحوم بھی زندہ تھے اور ان کی ساتوں بیگمات بھی موجود تھیں۔ میری والدہ مرحومہ اور نواب صاحب کی پہلی بیگم میں بہت محبت ہو گئی۔ وہ اکثر محل میں جایا کرتی تھیں اور بیگمات ہمارے گھر آیا کرتی تھیں۔ میں اُن کی ساتوں بیگمات کا حال بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

بیگم اوّل تو نواب صاحب کی چچازاد تھیں اور دوسری بھی ایک شریف خاندانی بی بی تھیں اور تیسری مالن کی لڑکی تھی اور چوتھی پانچویں چھٹی بھی ایسی ہی رذیل مراثن دھوبن وغیرہ تھیں اور ساتویں منا جان نامی ایک نہایت حسین بازاری عورت تھی۔ یہ عورت منا جان اس دن محل میں داخل ہو کر بیگم کہلائیں جس دن ہمیں لکھنؤ آئے پندرھواں دن تھا۔ اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی محل میں داخل ہوئی جس کی عمر اس وقت ۱۲ سال کی تھی۔ اس کا نام

فیروزہ جان تھا۔ منا جان چونکہ اپنے گناہوں سے تائب ہو کر نواب صاحب کے گھر میں آئی تھی۔ اس لئے اپنی بیٹی فیروزہ کو بھی اس خیال سے ساتھ لے آئی تھی کہ پیچھے رہ کر مبتلائے گناہ نہ ہو۔

نواب صاحب خوب صورت فیروزہ کو بیٹی کہتے تھے۔ فیروز جان اپنی ماں سے بھی زیادہ حسین تھی چونکہ وہ اپنے آزاد گھر میں آزادی سے زندگی بسر کرتی تھی۔ اس لئے محل میں نہایت افسردہ رہنے لگی چونکہ بیگمات اور ہمارے گھر کی مستورات میں میل جول تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹیاں بھی آتی تھیں گو میں پندرہ سال کا تھا مگر بیگمات مجھ سے پردہ نہ کرتی تھیں اور فیروزہ بھی میرے روبرو ہوتی تھی جس کا نام بدل دیا گیا تھا۔

دو سال میں لکھنؤ میں رہا۔ اس عرصہ میں منا جان کی لڑکی نے مجھ سے اقرار کر لیا تھا کہ "میں شادی تمہارے ہی ساتھ کروں گی۔" اس زمانے میں اونچ نیچ کی مجھے بھی تمیز نہ تھی۔ اس لئے میں اس کے اقرار سے دل میں بہت خوش تھا۔ جب میری عمر ۱۷ سال کی ہوئی اور اس لڑکی کی سولہ سال کی۔ تو میں نے انٹرینس پاس کر لیا اور ایف اے کے لئے علی گڑھ بھیجا گیا اور میرے پیچھے ایک نو عمر آدمی ذاکر علی نامی نواب صاحب کے گاؤں کی مختار کاری پر نوکر رکھا گیا اور یہ خبر مجھے اس لڑکے نے علی گڑھ پہنچائی جس کو میں منا جان کی لڑکی کے خط لکھوانے کے لئے اس کے پاس نوکر رکھوا آیا تھا کیوں کہ وہ خود لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھی۔ مجھے علی گڑھ گئے چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔

وہ درمیانی پانچوں بیبیاں مالن دھوبن مراثن وغیرہ نواب صاحب کے سویم کے دن ہی گھر سے نکل گئیں اور تین ماہ کے بعد اصلی نواب بیگم صاحبہ کا بھی انتقال ہو گیا چونکہ نواب صاحب مرحوم کی کسی بی بی سے بھی اولاد نہ تھی اب تمام جائداد کی مالک اور محل پر حکمرانی کرنے کے لئے صرف منا جان ہی منا جان رہ گئیں۔ نواب صاحب کی فاتحہ سہ ماہی اور بیگم صاحبہ کے چہلم کے بعد منا جان کی لڑکی نے اپنے اسی مختار کار ذاکر علی سے نکاح کر لیا مجھے اس ملازم لڑکے کا خط گیا کہ "آپ فوراً لکھنؤ آ کر خبر لیں۔ صاحبزادی صاحبہ نے ذاکر علی مختار کار سے نکاح کر لیا ہے۔"

یہ خبر سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نہ اس لئے کہ ایک حسین لڑکی مجھ

سے جدا ہوئی بلکہ اس لئے کہ مجھ سے ایسے پختہ اقرار کے بعد اس نے یہ کیا کیا؟ وکیل صاحب اب میں وہ اقبال بہادر نہ تھا جو منا جان کی لڑکی کی مہربانی سے خوش ہوا کرتا تھا میرے خیالات اس ایک سال میں بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ علی گڑھ کی تعلیم نے مجھے کچھ کا کچھ کر دیا تھا۔ جن باتوں سے مَیں لکھنؤ میں خوش ہوتا تھا۔ ان کو سوچ کر دل ہی دل میں ذلیل ہوا کرتا تھا۔ وکیل صاحب آپ یقین کریں۔ اس ملازم لڑکے کا خط پڑھ کر میں نے خدا کا ہزار ہزار شکر کیا جس نے مجھے اس قعرِ مذلّت سے نکالا۔ میں نے سوچا جو اپنے اقرار پر قائم نہ رہی وہ اگر میرے گھر آ کر ایسا ہی کرتی تو کچھ بعید نہ تھا۔ میں چھٹی لے کر لکھنؤ نہ گیا اور اس لڑکے کو لکھ دیا کہ ''اگر اب وہ تجھے نہ رکھنا چاہیں تو فوراً وہاں سے الگ ہو کر میرے پاس علی گڑھ چلا آ۔''

اس کا جواب آیا کہ ''میں نے خود بیگم صاحبہ سے علیحدگی چاہی تھی مگر وہ مجھے علیحدہ کرنا نہیں چاہتیں۔ پہلے دو روپیہ ماہوار دیتی تھیں۔ اب پانچ کر دیئے ہیں۔'' مَیں بھی چپ ہو رہا کہ غریب کی روزی لگی رہے۔ ایک ماہ مجھے کالج سے سالانہ چھٹیاں مل گئیں اور لکھنؤ گیا۔ لیکن اُن کی طرف رُخ نہ کیا اور وہ تو تھیں ہی شرمندہ۔ بعد اختتام تعطیل علی گڑھ چلا گیا لیکن وہاں کی خبریں وہ نمک حلال لڑکا مجھے لکھتا رہا۔

نواب صاحب مرحوم کی برسی کے بعد منا جان نے بھی قضا کی۔ اب صرف ذاکر علی اور اس کی بیوی وراثت کی مالک رہ گئی۔ چونکہ نواب صاحب بے انتہا قرض دار تھے تمام جائداد قرض خواہوں میں لگ گئی۔ صرف ایک رہنے کا مکان اور ایک پچاس روپیہ ماہوار آمدنی کا چھوٹا سا گاؤں رہ گیا۔ وہ درجنوں نوکر اور لونڈیاں مہریاں وغیرہ بھی نہ رہیں۔ صرف ایک مغلانی (جو ساتویں بیگم منا جان کی چٹھی نویس تھی) اور دو مامائیں اور ایک وہی ملازم لڑکا گھر میں رہ گئے۔ ایک بڈھا ملازم ڈیوڑھی پر۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ موت نے بھی وہی گھر دیکھ رکھا تھا۔ شادی کے آٹھویں مہینے ذاکر علی نے بھی نمونیا سے انتقال کیا۔ اب تنِ تنہا بیگم صاحبہ محل میں رہ گئیں۔ تھوڑے دنوں بعد ایف اے پاس کر کے مجھے بھی علی گڑھ چھوڑنا پڑا کیوں کہ والد صاحب سخت بیمار ہو گئے تھے۔ میں گھر چلا آیا اور انہیں دنوں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مجھے علی گڑھ گئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ

والد صاحب کو پنشن مل گئی تھی اور انہوں نے یہیں قیام کا بندوبست کر لیا تھا۔ وہ کرائے کا مکان چھوڑ دیا تھا اور یہ کوٹھی خرید کر یہاں رہنے لگے تھے۔ کچھ زمین خرید لی تھی۔ کارخانہ کھول دیا تھا اور میں ایک ہی ایک بیٹا تھا اُن کے بعد بہنوں کی شادیاں کرنی تھیں۔ اس لئے والدہ نے سرکاری ملازمت کی تلاش نہ کرنے دی اور نہ زیادہ پڑھنے دیا کیوں کہ میرے سوا گھر پر رہنے والا کوئی نہ تھا۔

جب بیگم صاحبہ نے سُنا کہ اقبال بہادر لکھنؤ آ گیا ہے اور ابھی کہیں شادی کا بندوبست بھی نہیں ہوا تو بہت منت خوشامد کے خط لکھوائے کہ" جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں والدہ کے اختیار میں تھی۔ اُنہوں نے ذاکر علی سے شادی کر دی تھی ورنہ میں دل سے آپ ہی کی کنیز ہوں اور اب سوا آپ کے دُنیا میں کوئی میرا وارث نہیں۔ للہ مجھ پر رحم کرو اور مجھ کنیز اور میرے کل مال اسباب کے مالک بنو۔"

میں نے ان درخواستوں کے جواب میں ایک پُرزہ نہ لکھا اور اس لڑکے کی زبانی کہلا بھیجا کہ" اس قسم کی درخواستیں تو درکنار اب تمہارا رقعہ و ملازم بھی میرے گھر نہ آنے پائے۔"

مایوس ہو کر وہ خاموش ہو گئیں۔ ہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ بیگم صاحبہ کے ایک لڑکی بھی تھی جو اپنے باپ ذاکر علی کے مرنے کے ایک ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔

جب ذاکر علی کے انتقال کی خبر اس کے گھر کانپور پہنچی تو اس کے دونوں بڑے بھائی لکھنؤ آ گئے اور بیگم صاحبہ سے جائداد کا جھگڑا شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ مع بیٹی کے ہمارے ساتھ چلو۔ کیوں کہ اب تمہارے اور تمہاری جائداد کے مالک ہم ہیں۔ بیگم کہتی تھیں کہ جائداد میرے میکے کی ہے۔ اس پر کسی کا حق نہیں۔ جھگڑا ہوا کر یہ فیصلہ ہوا کہ بیگم نے اپنی بیٹی اپنے مرحوم شوہر کے بھائیوں کے حوالے کر دی اور دس روپے ماہوار اس کی پرورش کے لئے مقرر کر دیئے۔

آٹھ سال بیگم نے حالت بیوگی میں بسر کیے لیکن مالدار شوہر کی تلاش جاری رکھی کیوں کہ چالیس روپیہ ماہوار میں اُن کی مرضی کے موافق گذر نہ ہوتی تھی۔ اتفاق دیکھیے پھر اُن کی قسمت کا ستارہ چمکا اور ایک میرٹھ (مسکرا کر) کا تعلیم یافتہ رئیس زادہ اُن پر مہربان ہوا اور وہ عقد ثانی کے بعد اپنا مکان کرائے پر دے کر ایک اچھے خاصے آباد گھر کو برباد کرنے

میرٹھ جا پہنچیں۔ معزز وکیل صاحب یہ جانی بیگم صاحبہ وہی فیروزہ جان دختر منا جان ہیں۔

وکیل صاحب یہ خفیہ حالات سُن کر محو حیرت ہو گئے۔ ایک آہ سرد بھری اور رومال سے منہ چھپا کر اپنی سخت غلطی کی پشیمانی میں آنسو بہانے لگے۔ پندرہ منٹ کی خاموشی کے بعد کہا۔

وکیل: میرے قابلِ قدر سچے دوست جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب مجھے کوئی تدبیر بتاؤ جس سے اس بلا سے نجات ہو۔

اقبال: ابھی سنئے تو سہی۔ غریب اختر کی نسبت تو آپ کو کچھ معلوم نہیں۔

وکیل: (گھبرا کر) ہاں پہلے وہی سنائیے۔

اقبال: جس زمانے میں آپ جانی بیگم کو نکاح کر کے میرٹھ لے گئے مجھے معلوم ہے کہ آپ کی صاحبزادی ان دنوں کانپور اسکول میں تھیں جو بیگم صاحبہ کے حکم سے میرٹھ لائی گئی اور اُنہیں دنوں آپ کی بیگم صاحبہ مرحومہ کے زیورات چوری ہوئے اور پھر جانی بیگم نے اپنی بھتیجی لاڈلی کو میرٹھ بلا لیا۔ پھر اختر کی شادی مسٹر وقار احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر میرٹھ کے گھر نہ ہونے دی اور کسی رئیس اعظم کانپور کے لڑکے سے کی۔ شاید آپ حیران ہوں گے کہ مجھے یہ حالات کس طرح معلوم ہوئے؟ میں آپ سے ذکر کر چکا ہوں کہ ایک لڑکا جانی بیگم کے پاس میں نے ملازم رکھوایا تھا۔ بس اسی کے ذریعہ یہ سب خبریں پہنچتی رہیں۔

وکیل: مگر میرے گھر تو کوئی ملازم لڑکا نہیں۔

اقبال: آپ کہہ چکے ہیں کہ ایک مغلانی اور دو مامائیں اور ایک ملازم بیگم صاحبہ کے ہمراہ یہاں سے گئے ہیں مگر اُن کی اصلیت سے آپ باخبر نہیں۔ وہ مجھ سے سنئے وہ مغلانی بی امانی بیگم صاحبہ تو وہی منا جان مرحومہ کی چٹھی نویس ہیں اور ساز گار اور نرگس دونوں چھوکریاں ہیں اور وہ جو ملازم شمشاد باہر ہے جس کو جانی بیگم اپنی انا کا بیٹا بتاتی ہیں۔ وہ وہی میرا رکھوایا ہوا لڑکا ہے۔ شمشاد بڑا نمک حلال نیک نوجوان ہے جو آپ کے حق میں نمک حرام و بد ثابت ہو رہا ہے کیوں کہ وہ جانی بیگم کا تابع فرمان ہے۔ اُن کے خفیہ کام انجام دیتا ہے۔

وکیل: اُف اُف میں سخت متحیر ہو رہا ہوں۔ دُنیا کس قدر جعل سازوں سے بھری ہے۔

اقبال: اختر کے سسرال والے آپ کو بہت مالدار بتائے گئے ہیں حالانکہ وہ نہایت تنگ دست ذلیل آدمی ہیں۔ میں اُن کی حیثیت سے بخوبی واقف ہوں۔ شاہجہاں پور سے پیشتر والد مرحوم کان پور میں تھے اور ہمارے مکان کے قریب ہی ایک رذیل شخص منشی مردان علی رہتا تھا جو پندرہ روپیہ ماہوار پر کسی رئیس کے خانگی حساب کتاب پر ملازم تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام حیدر علی منجھلے کا نثار علی اور چھوٹے کا ذاکر علی تھا۔ مردان علی کی خوش قسمتی سے منجھلا بیٹا نثار علی کچہری میں مقرر ہو گیا تھا۔ جواب مثل خواں ہے اور بڑا حیدر علی بھی ایسا ہی کوئی کام کرتا تھا جس کی پنشن بیس روپیہ ماہوار ملتی تھی اور چھوٹا ذاکر علی کسی بات پر ناراض ہو کر لکھنؤ چلا آیا تھا اور یہاں نواب صاحب کی مختار کاری پھر دامادی نصیب ہو گئی۔ وہ جو آپ کی بیگم صاحبہ مرحومہ کے زیورات چوری ہوئے تھے۔ وہ انہیں جانی بیگم نے نکال کر اپنے جیٹھ نثار علی کو کانپور بھیج دیئے تھے جس کے عوض میں اُن کی لاڈلی بیگم انہیں مل گئی تھی اور آپ پر یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ لاڈلی بھتیجی ہے۔ دراصل وہ بھتیجی نہیں ہے چونکہ جانی بیگم نے آپ سے شادی کا حال پوشیدہ رکھا ہے، اس واسطے بیٹی کو بھتیجی ظاہر کیا ہے۔ جب لاڈلی جوان ہو گئی تو حیدر علی نے اپنے لڑکے ظفر کی لاڈلی سے کرنی چاہی۔ اس غرض سے کہ وہ جہیز میں آپ کے گھر سے امیرانہ سامان لے کر جائے گی لیکن جانی بیگم نے جواب دیا کہ میں اپنی بچی کو ایسے غریب گھر میں نہیں دے سکتی۔ جہاں وہ اپنی ضروریات بھی پوری نہ کر سکے۔ نثار علی بڑے بھائی سے بھی زیادہ ہوشیار نکلے۔ انہوں نے جانی بیگم کو یہ دھمکی دی کہ اگر تم نے لاڈلی کی شادی ظفر سے نہ کی تو ہم بحیثیت اس کے حقیقی وارث ہونے کے عدالت میں دعویٰ کر دیں گے۔ پھر تو جانی بیگم ڈریں کہ ایسا ہی نہ ہو جائے اور بنا بنایا جعل نہ ٹوٹ جائے۔ انہوں نے فوراً اپنے جیٹھ کو لکھ کر بھیجا کہ "لاڈلی بیگم کی منگنی تو میرٹھ میں ایک نواب کے گھر ہو چکی ہے۔ ہاں میں اپنی سوتیلی بیٹی اختر دیتی ہوں۔" حیدر و نثار اس بات سے بے انتہا خوش ہوئے کہ کام بھی بن گیا اور ہم ہمیشہ کے لئے دعویٰ دار بھی رہے۔ کیوں کہ ان کا مطلب تو صرف مال دار لڑکی لینے سے تھا، نہ لاڈلی سے۔ حیدر علی سے یہ اقرار کرنے کے بعد جانی بیگم نے مسٹر وقار احمد صاحب کو جواب دے دیا اور اختر کی شادی ظفر سے کر دی۔

وکیل: لیکن کانپور والے تو بہت امیرانہ ٹھاٹھ سے شادی کرنے میرٹھ آئے

تھے۔ شاید قرض لے لیا ہوگا؟

اقبال: بالکل نہیں۔ انہوں نے قرض ایک پیسہ نہیں لیا اور اُن کو دیتا ہی کون ہے؟ تمام شان وشوکت صرف ایک ہی پیسے کی تھی۔ یہ حساب بھی مجھ سے سن لیجئے۔

جانی بیگم نے آپ سے لڑکی کی شادی کے لئے دس ہزار روپیہ لیا تھا جس میں کل پانچ ہزار صرف کیا گیا ہے اور پانچ ہزار جانی بیگم کی تحویل میں ہے۔ پانچ سو روپیہ نقد تو انہوں نے حیدر علی کو اوپر کے سامان کے لئے کان پور بھیج دیا تھا اور چودہ جوڑے بریوں کے اور زیورات جو اُن کی طرف سے آئے تھے۔ وہ سب لکھنؤ سے تیار کر کے کان پور بھیجے گئے تھے۔ لڑکی کا زیور بھی یہیں تیار کرایا گیا تھا۔ آپ سے سچے جواہرات کی قیمت وصول کی تھی اور یہاں میں نے خود سُنار کی دوکان پر جا کر دیکھا کہ تمام زیورات پر جھوٹے نگ جڑے جارہے تھے اور کپڑوں کا مصالحہ بھی سچا نہ تھا۔ غرض کہ صرف پانچ ہزار میں کام پورا کر دیا گیا تھا۔ اس تمام سامان کی قیمت کی لسٹ میرے پاس موجود ہے جو شمشاد مجھے بھیجتا رہا تھا چونکہ وہ ایک اچھے گھر کو برباد کر رہی تھیں۔ اس کا مجھے سخت افسوس تھا اور آپ سے غائبانہ ہمدردی ہوگئی تھی۔ پھر ایک تعلیم یافتہ بے زبان لڑکی پر سخت ظلم ہو رہا تھا۔ اس واسطے آپ کے خانگی حالات سے میرے دل کو خاص تعلق ہو گیا تھا۔ اس لئے تمام حالات نہایت کوشش سے شمشاد کے ذریعے معلوم کرتا رہتا تھا۔ کوئی تدبیر بن نہ پڑتی تھی جس سے آپ کو آگاہ کیا جاتا۔

وکیل: میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ آہ میں نے اپنی لڑکی پر کس قدر ظلم کیا۔ کیا اس سے آگے بھی آپ کو معلوم ہے کہ اختر کے ساتھ ان لوگوں نے کیسا برتاؤ کیا؟

اقبال: ہاں قدرے معلوم ہے۔ اختر کا شوہر ظفر اسٹیشن ماسٹر نہ تھا۔ وہ امروہہ اسٹیشن پر دس روپیہ ماہوار پر کوئی ذلیل کام کرتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہو گیا۔ تو شاید تعزیت کے واسطے جانی بیگم کان پور گئی تھیں۔ اُن کے ہمراہ میرا شمشاد بھی تھا۔ اس کو نرگس کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ اختر کا جہیز چوری ہو گیا جس میں حیدر و نثار کی سازش تھی اور شادی کے بعد آپ نے کئی بار اختر کو بلانا چاہا تو جانی بیگم نے کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے بلانے نہ دیا۔ یہاں تک کہ اسکی بیوگی کی خبر سُن کر آپ کانپور جانے کو تیار ہوئے تب بھی

انہوں نے نہایت کوشش سے آپ کو روکا اور خود چلی گئیں اور وہاں حیدر علی کی بیوی سے کہا کہ جس طرح بن پڑا میں ایک سال تک اختر کو میرٹھ نہ آنے دوں گی۔ کیوں کہ ان دنوں اس کا وہاں جانا میرے حق میں بہت بُرا ہوگا۔ یہ بات بھی نرگس نے شمشاد سے کہہ دی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ نے اُن کے حکم کی پابندی کی اور اختر کو وہاں سے چھوڑے رکھا۔ پھر حیدر علی مع بیوی کے حج کو گئے تو مصیبت زدہ اختر نثار علی کے گھر اُن کی بیوی بچوں کی خدمت میں رہی اور افسوس کے اس کی خدمات بھی منظور نہ ہوئیں اور نثار علی کی بیوی نے اپنے گھر نہ رکھا۔

وکیل: یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا؟

اقبال: انہیں دنوں شمشاد نے لکھا تھا کہ کان پور سے نثار علی کا خط آیا ہے کہ ''امیر زادی بہو کی غریب گھر میں گذر نہ ہو سکی اور آج ۱۲ بجے رات ہمارے گھر سے نہ معلوم کہاں چلی گئی۔''

وکیل صاحب سچ عرض کرتا ہوں کہ اس خبر سے جس قدر صدمہ میرے دل کو پہنچا تھا خدا ہی جانتا ہے لیکن نثار علی کے خط کا ایک لفظ سچا نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ ضرور اس کی بیوی نے روٹی کپڑا دینے سے تنگ آ کر غریب اختر کو نہ رکھا ہوگا کیوں کہ اختر نہایت صابر و جفاکش لڑکی تھی اگر وہ تکلیفوں سے گھبراتی تو اتنا عرصہ حالت بیماری میں غریب شوہر کے گھر کبھی نہ گذارتی۔ آپ کے پاس یوں نہ گئی ہوگی کہ بیگم نہ رہنے دے گی۔

وکیل: خدا اس ہمدردی کا آپ کو نیک اجر دے۔ میری کوئی بات اب آپ سے پوشیدہ نہیں رہی۔ میں آپ کا مخلص خادم ہوں اور آپ بھی میرے خیر اندیش ہیں۔ اب یہ بتائیں کہ میں کیا تدبیر اختیار کروں جس سے اس بلا سے نجات ہو اور اپنی پیاری اختر کو پا سکوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ دس سال ہوئے اس سے واسطہ پڑے۔ لیکن اس کی طرف سے ایک دن میرے دل میں برائی نہ آئی تھی۔ ہاں ایک دفعہ لکھنؤ آنے سے پیشتر اختر کا ایک خط میری نظر سے گذرا۔ جواب سے چار سال پیشتر اسی دن لکھا ہوا ہے جس دن رات کو وہ نثار علی کے گھر سے نکلی تھی۔ آفرین ہے اس لڑکی کے حوصلے پر کہ جو حالات آپ نے مجھے سنائے۔ ان سب سے اختر واقف تھی لیکن ایک بھی میرے سامنے زبان پر نہ لائی تھی اور اخیر وقت تک

کہ اُس بلا کے ہاتھوں اس کا کیا سے کیا حال ہو گیا لیکن اس خط میں بھی ایک لفظ اس کے خلاف نہیں لکھا۔ خط میری جیب میں ہے۔ دیکھ لیجئے اور للّٰہ کوئی رہائی کی تدبیر بتایئے۔

اقبال: (خط پڑھ کر) آپ نے اس خط کا ذکر بیگم سے بھی کیا یا نہیں؟ اور یہ خط چار سال تک آپ کو کیوں نہیں ملا؟

وکیل: مجھے سخت غصہ آ گیا تھا۔ اس لئے خط پڑھنے کے بعد حالانکہ سولہ گھنٹے میرٹھ میں رہا۔ لیکن اندر نہ گیا نہ اِن کے منہ لگا۔ باہر ہی سے اسٹیشن پر چلا گیا۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ میرا دل اس سے بگڑا اگر آپ کی رائے ہو تو اسی وقت امانی کے نام خط لکھ دوں کہ میرے آنے سے پہلے تم سب میرے گھر سے نکل جاؤ۔

اقبال: ہرگز نہیں۔ اس میں آپ کا سراسر نقصان ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ منکوحہ بیوی ہے۔ آپ کو اس طرح دھکانے کا حق نہیں۔ وہ بے ننگ و نام ہے۔ عدالت میں جا کھڑی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اگر ڈر کر نکل بھی گئی تو آپ کا تمام مال و اسباب ہمراہ لے جائے گی۔ اس قدر جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ آپ کو کل یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ میں آپ کے ہمراہ چلوں گا اور ڈاک بنگلہ میں ٹھیروں گا۔ شمشاد کے ذریعے تمام حالات معلوم کروں گا۔ پھر جو کچھ مناسب وقت ہوگا۔ کیا جائے گا۔ اختر کی طرف سے آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ضرور کسی زنانہ اسکول میں کام کرتی ہوں گی۔

اسی قصے میں تمام رات گزر گئی۔ اس مشورے کے بعد مرزا اقبال بہادر نے گھڑی دیکھی تو پانچ بجے تھے۔ اب کیا سونا تھا؟

بیسواں باب

وکیل صاحب کی پشیمانی

میں نہ کاشانے کے قابل ہوں نہ کاشانہ مرا
خانہ بربادی سے ہے آباد ویرانہ مرا

جانی بیگم: اچھی بی امانی پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟
امانی: تمہیں رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی؟
جانی بیگم: تو یہ اب بھلا رہنا ہو سکتا ہے؟ ہماری تمام گذشتہ کارروائیاں وکیل صاحب پر ظاہر ہو گئی ہیں۔ اب تو ان کی آنکھوں میں میری ذرا بھی عزت نہ ہو گی۔
امانی: وہی اختر کا خط ہی ہاتھ لگا ہے ناں؟ اور کس طرح ظاہر ہوا؟ وہ خط میں نے تمہیں سنایا ہی تھا۔ مفصل ایک بات بھی نہ لکھی تھی۔ تم نے بڑی غلطی کی جو اس خط کو پھاڑ نہ ڈالا۔

جانی بیگم: آہ بی امانی کیا بتاؤں کہ کیا کا کیا ہو گیا۔ بے شک یہ بہت بُرا ہوا کہ وہ خط اُن کے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے بہت چھپا کر رکھا تھا۔ قسمت کی بات ہے کہ پورے چار سال بعد پھر انہیں کو ملا۔ میں تو ایسے خطوط کی بہت ہی حفاظت کرتی ہوں۔ اختر کی شادی کے متعلق جس قدر خط و کتابت حیدر علی مرحوم سے ہوئی تھی۔ وہ تمام خطوط جمع کر کے میں نے کانپور انہیں کے پاس بھجوا دیئے تھے۔ یہ خط میں نے شمشاد کو دے دیا تھا کیوں کہ اس

کے پاس بھی میرے پوشیدہ کاغذات حفاظت سے رہتے ہیں۔ بُری گھڑی تھی کہ اس کے پاس سے بھی اُن کی نظر پڑ گیا۔ پر صرف اس خط کا ہی معاملہ ہوتا تو بھی سنبھال لیتی وہ تو اور غضب ہوگیا کہ میرے رازدار دُشمن جان مرزا اقبال بہادر نے ان کو اپنے گھر ٹھہرایا۔ اُس نے ماتم حالات اُن کو سنا دیے ہوں گے۔

امانی: تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ وہ اقبال بہادر کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟

جانی بیگم: تم جانتی ہو۔ ان کے لکھنؤ جانے سے میں کس قدر گھبراتی ہوں۔ جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ اس دس سال کے عرصے میں دو دفعہ لکھنؤ گئے تھے اور ایک ایک دن ٹھہرے تھے تب بھی ڈرتی ہی رہی تھی کہ نہ جانے کوئی کچھ خبر سنا دے تب تو خیر گذری لیکن جس بات کا خطرہ تھا وہ اب ہو کے رہی۔ ایک تو وہ خط ہی پڑھ کر بگڑ گئے تھے۔ بغیر گھر میں آئے لکھنؤ چلے گئے اور شمشاد کو وہ اختر والا خط دکھا کر ساتھ لے گئے۔ یہی کیا تھوڑی بات تھی؟ شمشاد سے انہوں نے اسی لئے کہا تھا کہ وہ گھر میں کہہ دے گا۔ ان کے جاتے ہی دوسری ریل سے میں نے نرگس کو لکھنؤ روانہ کر دیا تھا کہ معلوم کرے کہ وہ کہاں ٹھہرے ہیں اور میری طرف سے اُن کا دل کیسا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ۱۲ بجے کی گاڑی سے نرگس واپس آئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وکیل صاحب اسی ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے تھے جس میں ہمیشہ ٹھہرا کرتے تھے لیکن دوسرے دن مرزا اقبال بہادر انہیں اپنی کوٹھی لے گیا اور کئی دن اپنے ساتھ رکھا۔ آج شام کو وہ واپس آنے والے ہیں۔ یہ معلوم کر کے نرگس اُن سے پہلے ہی چلی آئی ہے۔

امانی: ہے ہے غضب ہوگیا۔ اب ہمارا یہاں ایک دم کا ٹھکانہ نہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ پیچھے یہ کچھ ہونا ہے۔ ورنہ میں کانپور نہ جاتی اور وہاں جا کے بنایا ہی کیا؟ سلطانہ بیگم نے کہہ دیا کہ چار سال سے ہمیں کچھ خبر نہیں کہ اختر کہاں ہے۔ میں نے اس کے مدرسے سے بھی معلوم کیا مگر کچھ پتہ نہ لگا۔

جانی بیگم: اجی وہ تو چولہے میں جائے۔ ہمیں اپنی سوچنی چاہئے کہ ہم کیا کریں۔ اُن کے آنے میں صرف چند گھنٹے باقی ہیں۔

امانی: اس بات کا یقین ہے کہ اقبال بہادر نے ہمارے سب حالات

سنا دیئے ہوں گے۔ ہمیں اب یہاں سے چلنے کی فکر کرنی چاہئے۔ گھر میں جو کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ سب ساتھ لے لو۔ روپیہ کتنا ایک ہوگا۔

جانی بیگم: بیس ہزار تو میرے پاس اخراجات خانگی سے بچایا ہوا ہے۔ کیوں کہ دو ہزار روپیہ سالانہ بچاتی رہی ہوں اور پانچ ہزار اختر کے جہیز کے روپے سے بچایا تھا اور پانچ ہزار کا زیور اُن کا بنوایا ہوا ہے۔ لاڈلی کی شادی پر تو پورا دس ہزار جو انہوں نے دیا تھا لگ گیا تھا بس یہ تیس ہزار تو جیب کا مال سمجھو۔

امانی: اور تمہارے چاندی کے برتن جو ہیں؟ اوگالدان ، پاندان، سنگاردان، اور چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ یہ سب کچھ بھی ایک صندوق میں بند کر کے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔

جانی بیگم: ہاں یہ چیزیں تو ساتھ جائیں گی بلکہ پلنگڑی اور چھپر کھٹ کے پائے بھی اکھیڑ کر ساتھ لے چلیں گے۔ یہ سب سامان وکیل صاحب نے دو ہزار کی چاندی میں بنوایا تھا اور ریشمی کپڑوں کے صندوق بھی ساتھ لوں گی۔ افسوس کہ گھر کے سامان، تانبے اور چینی کے برتن، میز، کرسی، فرش وغیرہ میں سے میں کچھ ساتھ نہ لے سکوں گی۔ کیوں کہ وقت بہت کم ہے اور دن میں جانا ہے۔

امانی: جانے بھی دو۔ چھوڑ دو ان چیزوں کو۔ اپنی جان ہی بچے تو لاکھوں پائے۔ یہی بیس ہزار نقد کیا تھوڑا ہے؟ لاڈلی تم نے بیاہ ہی دی ہے۔ چھوٹی بچی مر گئی۔ ایک اکیلی جان کو اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے بھی دو چپاتیاں دے ہی دوگی۔

جانی بیگم: اچھا تو اُٹھو۔ اسباب درست کرلیں اور نوکروں سے کہہ دیں گے کہ چار دن کے واسطے کانپور جاتے ہیں۔ سمدھیانے میں کسی کی شادی ہے، افسوس کہ لاڈلی کو نہ دیکھ سکی۔ ایک تو وہ بچاری میاں کی طرف سے جلتی رہتی ہے۔ اس پر میری جدائی اُسے بڑی مصیبت ہوگی۔

اس مشورے کے بعد دونوں نے سامان سفر درست کیا۔ جو چھ صندوق اور چار چھوٹے بکس اور بسترے وغیرہ تھے۔ سب کچھ باندھ کر گھر کے نوکروں سے کہا کہ بی امانی خبر لائی ہیں کہ سلطانہ کے یہاں شادی ہے۔ ہم وہاں جاتے ہیں۔ بی امانی، نرگس، ساز گار

اور شمشاد جائیں گے۔

چار بجے سہ پہر کی گاڑی سے روانہ ہونا تھا مگر اسٹیشن جاتے وقت شمشاد غائب تھا۔ تمام شہر میں تلاش کیا لیکن کہیں پتہ نہ لگا۔ مجبور بیگم صاحبہ انہیں تینوں کو ہمراہ لے کر میرٹھ سے روانہ ہو گئیں۔ اب نہ معلوم کہاں گئیں مگر دل میں کھٹک گئی تھی کہ شمشاد ہی کی شرارت سے وہ خط وکیل صاحب کو ملا اور اب اقبال بہادر کی طرح شمشاد بھی راز افشاء کرے گا مگر وہ کسی ایسی پُرامن جگہ گئی ہوں گی۔ جہاں کسی بات کا خوف نہ ہوگا۔ چار بجے وہ روانہ ہوئیں۔ اور دو بجے شب کی ٹرین سے وکیل صاحب مع اقبال بہادر صاحب کے میرٹھ پہنچے۔ انہیں کسی ضروری کام کی وجہ سے لکھنؤ دیر لگ گئی۔ ورنہ دن میں ہی آجاتے۔ مرزا صاحب کو مصلحتاً ڈاک بنگلے میں ٹھہرایا اور خود کوٹھی پر آئے اور سیدھے بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچے جو بالکل خالی پڑا تھا۔ پلنگ پر بستر بھی نہ تھا اپنی پُرانی ملازمہ شیریں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ چاروں مع بہت سے اسباب کے کان پور شادی میں گئی ہیں۔ یہ سن کر باہر آئے تو شمشاد کو برآمدے میں حیران کھڑا پایا۔

وکیل: تو اس وقت یہاں کیوں کھڑا ہے؟

شمشاد: جناب آپ کے انتظار میں اب تک سویا نہ تھا۔ گاڑی کی آواز سن کر باہر آیا۔ دیکھا تو آپ اندر تشریف لے گئے تھے۔ اب اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ آپ پھر واپس آئیں گے۔

وکیل: تو نے کس طرح جانا کہ ہم پھر واپس آئیں گے؟

شمشاد: چونکہ بیگم صاحبہ گھر میں نہیں۔ میں نے سمجھا کہ دریافت حال کو آپ ضرور میرے ہی پاس تشریف لائیں گے۔

وکیل: تو بڑا شیطان ہے۔ خدا تجھے سمجھے۔ اچھا بتاوہ کہاں گئی۔

شمشاد: جناب آپ چند منٹ کے واسطے اس کمرے میں تشریف لے چلیں تاکہ میں سب کچھ عرض کر سکوں۔

وکیل: جو کچھ کہنا ہے یہیں کہو۔ میں تم لوگوں کی شکل سے بیزار ہوں۔ تمہارے ہاتھوں نہیں میرے اپنے ہاتھوں میری زندگی تلخ ہو گئی اور میں تباہ و برباد ہو گیا۔

جھوٹ سچ جو کچھ کہنا ہے جلد کہہ دو۔صرف اتنا بتا دو کہ وہ بلائیں کہاں ہیں؟

شمشاد روتا ہوا وکیل صاحب کے قدموں پر گر پڑا اور کہا کہ "میں نا قابل معافی ہوں۔میں آپ کا نمک خوار نمک حرام ہوں۔صرف اتنی عرض ہے کہ جو کچھ اب میں کہوں۔ آپ سچ سمجھیں۔"

یہ کہتے ہوئے کہ "تو نا قابل معافی نہیں ہے کیوں کہ تو میرے عزیز دوست کا نمک پروردہ ہے تو نے جو کچھ کیا، بحیثیت رازدار ملازم کے بہت بجا کیا، کیا کہنا چاہتا ہے۔" اپنے قدموں سے وکیل صاحب نے شمشاد کو علیحدہ کر دیا۔

شمشاد: یہ آپ کی رحم دلی ہے کہ مجھے قابل معافی سمجھتے ہیں ورنہ میں اس قابل نہیں۔آپ معاف کریں یا نہ کریں، میں آپ کے قدموں میں عمر گذار دوں گا۔بیگم کے پچھلے حالات تو آپ کو میرے آقا مرزا صاحب نے سنا دیئے ہوں گے۔اب مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ بیگم کانپور نہیں گئی ہیں۔افسوس کہ وہ بہت کچھ اپنے ساتھ لے گئی ہوں گی۔ خواہ کس قدر تلاش کریں۔اب آپ کو نہیں مل سکتیں۔

وکیل: ہمیں نہیں مل سکتیں مگر تجھے تو پتہ ہوگا۔

شمشاد: نہیں حضور مجھے مطلق خبر نہیں جس قدر مجھے معلوم ہے، عرض کیے دیتا ہوں۔جس روز آپ لکھنؤ تشریف لے گئے تھے چونکہ گھر سے ناراض تھے۔اس واسطے بیگم نے دوسری گاڑی سے اپنی پختہ کار کٹنی نرگس کو لکھنؤ بھیج دیا تھا تا کہ آپ کی جائے قیام کا پتہ لگائے۔چنانچہ وہ گئی پانچ روز وہاں رہی اور کل صبح واپس آ کر بیگم کو بتا دیا کہ آپ ان کے رازدار مرزا اقبال بہادر کی کوٹھی پر فروکش ہیں۔بس وہ سمجھ گئیں کہ اُن سے آپ کو ان کی اصلیت اور تمام پچھلے حالات معلوم ہو گئے ہوں گے۔اسی لئے سخت ذلت سے بچنے کو اُنہوں نے ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلا جانا ہی مناسب سمجھا۔مجھے نرگس نے یہ تو کہہ دیا کہ آپ وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن یہ پتہ نہ لگا کہ وہ سب یہاں سے چلی جانے والی ہیں۔اُن کے جانے کی خبر مجھے اس وقت لگی جب کہ دن کے تین بج چکے تھے۔امانی نے مجھ سے کہا کہ "اب ہمارا یہاں رہنا سخت خطرناک ہے۔اس واسطے ہم چار بجے کی گاڑی سے کہیں جاتے ہیں تو بھی تیار ہو جا۔"

یہ سُن کر میں سخت حیران ہوا کہ آپ کو کس طرح اطلاع دوں اگر تار دیتا تب بھی آپ وقت پر نہ پہنچ سکتے اور گھر پر رہتا تو وہ ساتھ چلنے پر مجبور کرتیں۔ اس واسطے دو گھنٹے کے لئے غائب ہو گیا۔ چار بجے وہ روانہ ہو گئیں تو میں اسٹیشن پر پہنچا۔ ہر طرح معلوم کرنا چاہا۔ مگر کسی طرح پتہ نہ لگا کہ کہاں گئیں؟

وکیل: مگر بیگم کے ساتھ تو نے یہ بے وفائی کیوں کی؟ اُن کے ساتھ ہی جانا تھا۔

شمشاد: جناب میں سخت نادم ہوں کہ بوجہ کم عقل کے آپ کے ایسے ایسے سخت نقصان ہوتے رہے اور آپ کو خبر نہ کر سکا۔ میں سچ عرض کروں کہ اوّل اوّل تو میں بیگم کے کام خوشی سے انجام دیتا رہا کیوں کہ آپ سے ہمدردی نہ کی لیکن جب سے صاحبزادی اختر صاحبہ کی شادی اور بربادی ہوئی۔ تب سے میں سخت پریشان ہوں اور پچھتا رہا ہوں کہ اُن کے ساتھ کیوں آیا۔ صاحبزادی وہ خط جو چار سال بعد آپ کو ملا۔ میں جب ہی حضور کو دکھا دینا چاہتا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح دکھاؤں اور میں تو کبھی کا یہاں سے چلا گیا ہوتا۔ مرزا صاحب کا حکم یہاں رہنے پر مجبور نہ کرتا۔ اُن کے دل میں آپ کے لئے غائبانہ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی مگر اُن سے بھی کوئی تدبیر نہ بن پڑتی تھی جس سے آپ کو بیگم صاحبہ کی کارروائیوں کی خبر دیتے۔ صرف اسی واسطے مجھے یہاں اٹکایا ہوا تھا کہ یہاں کی خبریں انہیں دیتا رہوں۔

میری سمجھ میں جب کوئی تدبیر نہ آئی اور بیگم کے ظلم وستم کی کوئی حد نہ رہی تو میں نے مناسب سمجھا کہ صاحبزادی صاحبہ کا وہ خط آپ کو دکھا دوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اِدھر آپ نے خط دیکھا۔ اُدھر لکھنؤ جانا پڑ گیا اور بیگم کے حالات معلوم ہو گئے۔

وکیل: کاش اتنا حوصلہ تو پہلے ہی کرتا جب کہ اختر پر ظلم ہو رہے تھے اور اب تو جو کچھ ہونا تھا۔ ہو چکا تھا۔ ان دنوں بیگم نے ایسی کیا بات کی تھی جو تو سہار نہ سکا۔

شمشاد: حضور میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں بیوقوف کسی طرح آپ سے نہ کہہ سکا اور بیگم کی متابعت کر کے آپ کو نقصان پہنچاتا رہا لیکن ان دنوں بیگم اَور سخت ظلم کرنے والی تھیں۔ جس کی خبر سن کر میں دو گھنٹے تک روتا رہا۔

وکیل: جلد بتاؤ وہ کیا؟

شمشاد: آپ کے لکھنؤ جانے سے تین دن پہلے امانی شیطانی نے چند روز کے لئے آپ سے لکھنؤ جانے کی اجازت لی تھی۔ وہ لکھنؤ جانے کے لئے نہ تھی بلکہ کانپور جانے کے لئے تھی۔ آپ کے جانے سے دوسرے دن وہ کانپور گئی۔ اس لئے کہ نثار و دیگر کانپور والوں سے معلوم کرے کہ صاحبزادی صاحبہ کہاں ہیں؟ کیوں کہ بیگم کا خیال تھا کہ انہوں نے اپنے اسکول ہی میں ملازمت کر لی ہوگی تو پھر کوئی جھوٹا الزام اُن پر نہ لگ سکے گا اور کانپور اسکول میں نہ ہوں گی تو جو چاہیں گے اُن کی نسبت مشہور کر دیں گے اور یہ صلاح ہوئی تھی کہ امانی کی واپسی پر یہ مشہور کیا جائے گا کہ لکھنؤ کے بڑے گرجے میں (نہایت آہستہ دبی زبان سے) صاحبزادی کے دُشمن خدا نہ کرے عیسائی ہو گئے۔

یہ تجویز اس واسطے کی گئی تھی کہ سب لوگ اور آپ بجائے عزت و محبت کے اُن کے دُشمنوں کو حقارت سے یاد کریں اور حضور کو اُن کی تلاش کی فکر نہ رہے۔ امانی نثار علی کو سمجھا آئی تھی کہ تم ایک خط اس مضمون کا وکیل صاحب کو بھیجنا کہ "آپ کی لڑکی کے دُشمن لکھنؤ میں عیسائی ہو گئے۔" جناب یہ تھوڑا ظلم تھا؟ اگر آپ وہ خط نہ پڑھتے اور لکھنؤ میں جانا نہ ہوتا تو ضرور اس بات کا یقین کر لیتے۔ جب آپ کو یقین آجاتا تو خیال کریں کہ دوسرے کیا کچھ نہ سمجھتے۔ اسی لئے یہ غلط خبر مشہور ہونے سے پیشتر میں نے صاحبزادی صاحبہ کا خط کھڑکی میں ڈال دیا جو آپ کی نظروں سے گذرا اور اِدھر اپنے آقا مرزا صاحب کو خط لکھا کہ اب موقع ہے وکیل صاحب لکھنؤ گئے ہوئے ہیں۔ آپ ڈاک بنگلے سے اُنہیں اپنے گھر لے جائیں اور تمام خفیہ حالات و کارروائیوں سے آگاہ کریں۔

یہ خبر سن کر وکیل صاحب غصہ سے تھرا گئے اور سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ شمشاد نے کہا کہ اندر جا کر پہلے اپنا اسباب تو دیکھیں کہ کچھ باقی بھی ہے یا سب وہ ہمراہ لے گئیں لیکن انہیں اس وقت کچھ ہوش نہ تھا اور کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ سوائے اختر کے۔ اسی وقت کہ دو بجے ہوں گے۔ بائیسکل پر شمشاد کو ڈاک بنگلے بھیجا کہ فوراً مرزا صاحب کو لے آوے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ آ پہنچے تو دونوں کوٹھی کے زنانہ حصے میں آئے۔ وکیل صاحب تو پلنگ پر پڑ گئے اور مرزا صاحب نے تمام کپڑوں میں اسباب کی تلاشی لی۔ فرش، پردے، میز، کرسی وغیرہ تو سب کچھ موجود تھا اور وکیل صاحب کے کپڑوں کی الماریاں بھی۔ لیکن ان

کے روپوں کا بکس نہ تھا۔ چھپر کھٹ اور پلنگڑی ٹوٹے پڑے تھے اور بیگم کے صندوق اور صندوقچے بھی ندارد اور پلنگوں پر بستر ے بھی نہ تھے۔ سب کچھ دیکھ کر مرزا صاحب نے وکیل صاحب سے کہا۔

اقبال بہادر: دیکھئے وہی ہوا ناں؟ جانی بیگم سب کچھ ہی ساتھ لے گئیں؟ اسی خیال سے میں نے لکھنؤ سے آپ کو خط نہیں لکھنے دیا تھا لیکن وہ بھی کچھ کم نہ تھیں۔ آپ کے پیچھے ہی نرگس کو بھیج کر سب کچھ معلوم کر لیا۔ آپ کو کچھ یاد بھی ہے کہ زیور کے علاوہ اُن کے پاس روپیہ کس قدر رہتا؟

وکیل: مجھے اس وقت کچھ یاد نہیں کہ کیا تھا اور کیا نہ تھا اور نہ مجھے اس کی پرواہ ہے۔ میرا دل دُنیا سے سخت بیزار ہے۔ میں ایک منٹ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ خدا اب مجھے اس دارالمحن سے اُٹھالے تو خوب ہو۔ مجھے مالی نقصان کا ذرا بھی رنج و خیال نہیں۔ آہ میں اختر کو ہاتھوں سے کھو چکا۔

اقبال: آپ اس قدر رنج نہ کریں۔ آپ کے برے زمانے نے پلٹا کھایا ہے۔ خدا نے چاہا تو اختر بھی بہت جلد مل جائے گی۔ گھبرانا نہیں چاہئے۔ پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے۔ آخر اختر کے لئے بھی روپیہ درکار ہوگا۔

وکیل: میں کیا خبر لوں؟ پیارے اقبال مجھے تو اب مر ہی جانا چاہئے۔

اقبال: آپ تو بہت کم حوصلہ ہوئے جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں بے سوچے سمجھے جو کام کیے جائیں۔ اُن کا نتیجہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ایسے وقت میں حوصلے سے کام لینا چاہئے۔

وکیل: آہ حوصلہ نہ ہوگا تو اُور کیا ہوگا مجھ سے بدنصیبوں کو موت کہاں؟ آہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ یہ خبر بہت جلد مشہور ہو جائے گی کہ بیگم گھر سے نکل گئی اور بہت سے لوگ افسوس و ہمدردی کریں گے۔ اس وقت میں کہاں جاؤں گا او۔ کیا کروں گا؟ کاش والدہ اختر کی جگہ میں مر گیا ہوتا۔

اقبال: یہ سب درست ہے۔ خدا تمام شریفوں کو ایسی ذلّت سے بچائے مگر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کم حوصلگی سے کیا بن سکتا ہے؟ ایسا ہی ہے تو آپ کو چند دن کے واسطے

میرٹھ چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن پہلے اپنی چیزوں کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہئے کہ کیا کیا گیا اور کیا کیا رہا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ آپ کے گھر میں کیا کیا اور کس قدر نقد روپیہ موجود تھا۔ یہ آپ ہی کے بتانے سے معلوم ہوگا۔

وکیل: پیارے اقبال آپ کو روپے کی فکر ہے اور مجھے اس وقت دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے۔ عزت سے زیادہ کوئی چیز دُنیا میں قابلِ قدر نہیں۔

اقبال: بے شک۔ لیکن اس کا خیال تو شادی کے وقت چاہئے تھا اب سوائے اس کے کہ رنج میں اپنی جان گھلائیں اور کیا کر سکتے ہیں؟

وکیل: ہائے میں کہاں غرق ہو جاؤں؟ صبح ہی لاڈلی کے سسرال والے میرے پاس آویں گے اور خوب شرمندہ کریں گے۔ وہ لوگ ایسا موقع دیکھتے رہتے ہیں کیوں کہ لاڈلی کی بدمزاجی کی وجہ سے ہم میں اور اُن میں سخت مخالفت ہو گئی ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا اختر کے شوہر کی برسی کے اندر ہی بیگم نے لاڈلی کی شادی کر دی تھی اور اختر غریب کو اس وجہ سے شریک بھی نہ کیا تھا کہ وہ شوہر کے سوگ میں ہے۔ اُدھر میں اپنے قابلِ قدر ہم زلف مسٹر و مسز وقار احمد سے سخت شرمندہ ہوں اور اب دل چاہتا ہے کہ اُن کے قدموں پر گر کر اپنے افعالِ بد کی معافی مانگوں لیکن شرمندگی کی وجہ سے اُن کے سامنے منہ کرنے کا حوصلہ نہیں پڑ سکتا۔ یا اللہ میں ان سب سے منہ چھپا کر کہاں چلا جاؤں؟

اقبال: اب جس مصیبت کا سامنا ہے۔ نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اس کو برداشت کرنا چاہئے۔ خدا کا لاکھ شکر کیجئے کہ وہ لڑکی جو بیگم سے پیدا ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں مر گئی اگر اس وقت وہ زندہ ہوتی تو یہ مصیبت دوگنی ہو جاتی۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ ضرور مسٹر و مسز وقار احمد صاحبان سے معافی مانگیں۔ اس دُنیا میں وہی آپ کے سچے ہمدرد و خیر خواہ ہیں۔ گو آپ نے سخت بیدردی سے اُن کے دل دُکھائے ہیں لیکن ضرور وہ آپ کو معاف کر دیں گے اور اس مصیبت میں ہمدرد شریک ہوں گے۔ اُن سے ملنے کا بندوبست صبح کیا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کی دانست میں گھر میں کیا کچھ تھا۔

وکیل: میرے اقبال مجھے اس وقت کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ میرا جسم سنسنا رہا ہے اور بخار ہوا جاتا ہے۔ آپ شمشاد کو یہیں بلا کر دریافت کر لیں۔ اُسے کچھ معلوم ہو۔

مرزا صاحب نے وکیل صاحب کو پلنگ پر لٹا کر کمبل اڑھا دیا اور شمشاد کو بلا کر دریافت کیا اُس کے پاس کل حساب کے جس قدر کاغذات موجود تھے لا کر مرزا صاحب کے آگے میز پر رکھ دیے۔

اقبال: تم کو یہ کاغذات کس طرح ملے؟

شمشاد: حضور بیگم کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہ رکھتی تھیں کیوں کہ ان کو مجھ پر پورا اعتبار تھا۔ معمولی خط و کتابت تو امانی سے کراتی تھیں اور حساب وہ بالکل نہ جانتی تھی۔ اس واسطے یہ کام میرے سپرد تھا۔ رات کے وقت جب کہ اندر باہر سب سو جاتے تھے تو حساب لکھوانے امانی میرے پاس جایا کرتی تھی اور تمام کاغذات اپنے سامنے ایک مضبوط آہنی بکس میں بند کرا کے کنجی اپنے ساتھ اندر لے جاتی تھی۔ وہ بکس باہر میری کوٹھری میں اس واسطے رہتا تھا کہ گھر میں رکھنے سے شاید پوشیدہ کاغذات کسی کے ہاتھ لگ جائیں اور اب چلتے وقت اسی لئے میری بہت تلاش کی کہ اُن کے تمام کاغذات حساب و پرائیویٹ خطوط میرے پاس تھے۔

مرزا صاحب نے نہایت غور سے ان کاغذات کو دیکھا اور پھر وکیل صاحب سے کہا:

اقبال: آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن مہربانی کر کے مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ گذشتہ دس گیارہ سال میں آپ اخراجاتِ خانگی کے واسطے جانی بیگم کو کس قدر روپیہ ماہوار دیتے رہے؟

وکیل: میرا جو کچھ بھی تھا۔ جانی بیگم کا ہی تھا۔ تین سو روپیہ ماہوار آمدنی جائداد سے ہے اور اسی قدر وکالت کی سمجھیں اور کبھی اس سے زیادہ بھی بس۔ سب کچھ اُنہیں کے ہاتھ میں جاتا تھا اور وہ کہتی تھیں کہ ”تنخواہ ملازمین و دیگر اخراجات خانگی پر چھ سو روپیہ ماہوار خرچ ہوتا ہے۔“ اس حساب سے تو اُن کے پاس بہت کم بچتا ہوگا۔

اقبال: اچھا اور یہ بھی بتا دیں کہ اختر و لاڈلی کی شادی پر جس قدر روپیہ خرچ ہوا ہے وہ آپ نے کہاں سے دیا؟ آیا بنک سے نکلوا کر یا کچھ اپنے پاس علیحدہ بھی رکھا کرتے تھے۔

وکیل: نہیں میرے پاس کیا رکھا تھا جو دیتا؟ دونوں لڑکیوں کی شادی کے

واسطے دس دس ہزار روپیہ بنک سے لے کر دیا تھا۔

اقبال: بنک میں روپیہ آپ کے والد مرحوم کے وقت کا تھا یا آپ نے خود رکھوا دیا تھا؟

وکیل: والد مرحوم نے صرف جائداد چھوڑی تھی اور جس وقت میری شادی ہوئی تھی اس وقت تک بنک میں ایک پیسہ نہ تھا اور مجھے وکالت کرتے بھی دو ہی سال ہوئے تھے لیکن نہ معلوم والدہ اختر کس طرح انتظام کیا کرتی تھیں کہ اسی چھ سو روپیہ ماہانہ آمدنی میں فیشن ایبل اعلیٰ طریق پر گھر کا انتظام بھی کر لیتی تھیں اور پس انداز بھی کرتی جاتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے میرے گھر کی نو سالہ زندگی میں اٹھارہ ہزار روپیہ جمع کر لیا تھا۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو پورا اٹھارہ ہزار بنک میں جمع تھا۔

اقبال: اور اس کا سود کہاں جاتا تھا؟

وکیل: اُن کی زندگی میں اسی میں پڑتا رہتا تھا اور اُن کے بعد بھی دو سال تک پڑتا رہا جس وقت میں گرفتار بلا ہوا یعنے بیگم گھر میں آئی اور اس وقت بیس ہزار بنک میں تھا۔ اس کے بعد سے اس جمع شدہ رقم میں اضافہ ہونا بند ہو گیا کیوں کہ اس روپے کی آمدنی سے پھر میں بیگم کے واسطے زیور و نقرئی ظروف وغیرہ بنواتا تھا۔ اس کے بعد لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں اور اس مرحومہ کی پیسہ پیسہ کر کے جمع کی ہوئی رقم بیگم کے ہاتھوں شادیوں پر برباد ہوئی۔

اقبال: تو اس وقت بنک میں کچھ نہیں ہے؟

وکیل: ایک پیسہ نہیں۔

اقبال: آخر سبب؟ جب وہی آمدنی رہی جو کہ آپ کی بیگم صاحبہ مرحوم کے وقت میں تھی تو اب کیوں نہ جمع ہوا؟

وکیل: بھائی جمع کہاں سے ہوتا۔ جب کل آمدنی اخراجاتِ خانگی پر صرف ہو جاتی رہی؟ وہ تو وہی تھیں کہ اس قدر تھوڑی رقم میں سب کچھ کر لیتی تھیں۔

اقبال: بیگم نے بھی تو کیا۔ جب وہی آمدنی اور وہی اخراجات تھے تو پھر کیوں نہ جمع ہوتا۔ دیکھئے رذیل و شریف میں اس قدر فرق ہے کہ مرحومہ نے جمع کر کے بنک میں آپ کے واسطے رکھا اور جانی بیگم نے اپنے پاس رکھا اور ساتھ لے گئیں۔ یہ سن لیجئے

حساب، دو ہزار سالانہ کے حساب سے دس سال میں بیگم نے اخراجات خانگی سے بیس ہزار بچایا اور پانچ ہزار اختر کی شادی کے دس ہزار سے رکھا۔ چنانچہ پچیس ہزار روپیہ نقد ہماری دانست میں اُن کے ساتھ گیا ہے اور اس کے علاوہ جس قدر اُن کے پاس ہو گا۔ وہ ہمیں معلوم نہیں۔

وکیل: اوہو مجھے اس کا بالکل علم نہ تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں کہ بمشکل مہینہ پورا کرتی ہوں مگر نہ معلوم وہ رکھتی کہاں تھیں۔ گھر میں تو تمام بکس وغیرہ کھلے یعنی بے قفل کے پڑے رہتے تھے۔

شمشاد: حضور گھر پر اُنہیں بالکل اعتبار نہ تھا۔ اسی واسطے حساب بھی میرے پاس رکھتی تھیں اور روپیہ نواب بیگم ابوالحسن صاحبہ کے پاس جمع رکھتی تھیں۔ جب لاڈلی بیگم کی شادی وہاں ہو گئی اور اُن کی خرابیِ مزاج کے سبب آپس میں ان دونوں بیگموں کی بگڑنی شروع ہوئی۔ تب بیگم نے کل روپیہ ان سے لے لیا اور تین سال تک اپنے پلنگ کے نیچے روپیہ کا صندوقچہ زمین میں دفن کیے رکھا جو چلتے وقت نکالا گیا۔

وکیل: بے شک بہت درست ایسا ہی ہوا ہو گا۔ بیگم ابوالحسن اور ان میں بہت ہی محبت تھی اور اسی بنا پر لاڈلی بیگم کی شادی ان کے لڑکے سے کی گئی تھی مگر چونکہ دونوں سمدھنیں اور تیسری لاڈلی محض جاہل تھیں۔ نبھ نہ سکی اور بہت جلد مخالفتیں پڑ گئیں۔

اقبال: خیر یہ تو ہوا۔ کیا آپ کو یہ یاد ہے کہ بیگم کے واسطے زیورات پر آپ نے کس قدر خرچ کیا ہو گا؟

وکیل: قریباً چھ سات ہزار لگا ہی ہو گا۔ ان کی پلنگڑی وغیرہ پر بھی نقرئی کام ہو رہا تھا۔ دیکھیے تب ہی تو پلنگ ٹوٹے پڑے ہیں۔

اقبال: بیگم بڑی قسمت والی تھی۔ اس گھر کو خوب لوٹا۔ اتنا تو اس نوابی گھر سے بھی نہ ملا تھا۔ ان کاغذات کو دیکھ کر اور آپ سے پوچھ کر میں نے جس قدر تخمینہ کیا ہے۔ وہ چالیس ہزار سے زیادہ ہی کا مال لے کر نکلی ہے اور جس قدر آپ کو پشیمانی اور شرمندگی ہوئی وہ بے حساب۔ خیر اس کا خیال نہ کیجئے اپنے دل کو سنبھالیے۔

وکیل: میں کس طرح دل کو سنبھالوں؟ ہائے میں بالکل برباد ہو گیا۔ نہ عزت

رہی نہ اختر۔

اقبال: گھبرایئے نہیں۔ سب کچھ مل جائے گا۔ آپ کی صحت قائم رہے۔ صبح ہی آپ مسز وقار احمد صاحبہ سے معافی مانگنے تشریف لے چلیں اور بعد اُن کی رضامندی سے چند روز کے واسطے ہم بمبئی چلیں گے۔ دو تین ماہ کے سفر میں آپ کا دل بھی بہل جائے گا اور اختر بھی مل جائے گی۔

اس قسم کی باتوں میں شب تمام ہوگئی لیکن وکیل صاحب کو سخت بخار ہوگیا۔ مسز وقار احمد کو بیگم کے جانے کی خبر تو اسی روز مل گئی۔ دوسرے دن وکیل صاحب کی سخت علالت کی خبر سنی۔ اس رحم دل ومحبت شعار بہن سے نہ رہا گیا۔ مع میاں کے فوراً یہاں پہنچیں اور کئی دن یہیں رہ کر اُن کا علاج کرایا اور ایک ہفتے بعد جب اُن کی طبیعت ذرا درست ہوئی تو اپنے ساتھ کلکتے لے گئیں۔ کیوں کہ ان دنوں ان کے تینوں بچے وہیں جمع تھے۔ ڈاکٹر خورشید زمان صاحب آگرہ سے تبدیل ہو کر کلکتے گئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر تجمل حسن و مسز تجمل حسن (اپنی سالی نجم النساء) کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اختر حسن صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لاء بھی ان دنوں کلکتے میں تھے۔ اختر النساء کی شادی کے بعد اختر حسن بیرسٹری کے لئے انگلستان چلے گئے تھے اور تین سال بعد بیرسٹر ہو کر واپس آئے تو بجائے میرٹھ کے کلکتے کی رہائش اختیار کی تھی۔ وہ تو ایک سال سے کلکتے تھے اور چند ہفتوں سے ڈاکٹر خورشید صاحب مع فیملی کے وہاں پہنچ چکے تھے۔ مسٹر ومسز وقار احمد اپنے بچوں کی بہار دیکھنے کلکتے جانے والے تھے کہ وکیل بیچارے پر یہ حادثہ گزر گیا۔ انہوں نے ان کی طبیعت بہلانے کے خیال سے وکیل صاحب کو بھی ساتھ لے لیا اور اقبال بہادر تو اُن کے ساتھ ہی تھے۔ میرٹھ سے چلتے وقت وکیل صاحب نے اپنی دونوں کوٹھیاں فروخت کردینی چاہیں۔ کیوں کہ اُن کا ارادہ تھا کہ "اب واپس میرٹھ نہ آؤں گا۔ بقیہ زندگی آوارہ وطنی میں گذر جائے گی۔ میں گھر کے قابل نہیں۔" لیکن مسز وقار احمد نے ایسا نہ کرنے دیا۔ ایک کوٹھی تو کرائے پر تھی ہی جس میں رہتے تھے۔ اس کو بھی کھلا رہنے دیا۔ دو ملازم باہر ایک پرانی ملازمہ شیریں گھر پر رہے۔

☆

اکیسواں باب

اختر لاج کلکتہ

کیا پوچھتے ہو میرا فسانہ میں کیا کہوں؟
تم جس کو سن سکو وہ مری داستاں نہیں؟

اختر لاج کے پائیں باغ میں مسٹر اختر حسن وقار احمد بی اے بیرسٹر ایٹ لا مع دونوں بہنوں و بہنوئیوں کے ٹینس کھیل رہے تھے۔ سہ پہر کے چار بج چکے ہوں گے۔ ایک ملازم لڑکا اس وقت کی ڈاک لایا اور ان کو معروف دیکھ کر میز پر رکھ کر چلا گیا۔

مسز تجمل حسن: بھائی جان ڈاک دیکھ لیجئے۔

اختر: دیکھ لوں گا۔ ایسی کیا جلدی ہے؟

ڈاکٹر خورشید: بھائی دیکھ لیتی چاہئے۔ شاید کوئی سرکاری چٹھی نہ ہو۔

ان سب کے کہنے سے بیرسٹر صاحب نے ڈاک دیکھی۔ سب سے پہلے وہ اپنی والدہ کا خط کھولا۔

مسز خورشید: بھائی گھر کی بھی کوئی چٹھی ہے؟

بیرسٹر صاحب: ہاں یہ والدہ صاحبہ کا خط ہے۔ سُن لو۔

از میرٹھ

مورخہ.........

پیارے اختر۔ تمہارا خط ملا۔ افسوس کہ میں جواب جلدی نہ دے سکی۔ وجہ یہ کہ میں بھائی رفیق احمد صاحب کی تیمارداری میں معروف رہی۔ میں ایک نئی خبر سناتی ہوں کہ پرسوں جانی بیگم مع بہت سے اسباب کے گھر سے غائب ہو گئیں۔ تخمیناً چالیس ہزار کے قریب وکیل صاحب کا مالی نقصان ہوا۔ اسی روز سے بھائی وکیل صاحب سخت علیل ہیں اور ہم دونوں اُن کی خبرگیری کے واسطے "رفیق منزل" چلے آئے ہیں۔ بیچارے بہت ہی پشیمان و شرمندہ ہیں۔ ہم دونوں کے قدموں پر گر کر رو رو کر معافی مانگی ہے۔ اب وہ کچھ عرصہ کے لئے میرٹھ چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ میں اس انتظار میں ہوں کہ ذرا وکیل کی طبیعت سنبھل جائے تو ہم اُن کو اپنے ہمراہ علیگڈھ لے آویں۔ باقی حالات زبانی سناؤں گی۔

نہ معلوم تمہارے بھائی سول سرجن صاحب ابھی تمہارے ہی مکان پر ہیں یا علیحدہ ہو گئے؟ پچھلے خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ میں اب علیحدہ ہو جاؤں گا؟ پچھلے خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ میں اب علیحدہ مکان لینا چاہتا ہوں لیکن اختر ابھی الگ نہیں ہونے دیتے۔

اپنی اور سب کی خیریت سے اطلاع دو۔ خورشید آرا (قمر النساء کی دوسری لڑکی کا نام ہے) تو اب باتیں کرتی ہوگی؟ ہماری طرف سے تم سب کو پیار۔

تمہاری والدہ

ایس این وقار احمد

مسز تجمل: خدا کا شکر ہے کہ گئی۔

مسز خورشید: خالو جان کو بھی خوب نتیجہ ملا۔

بیرسٹر: بے زبانوں کا صبر کبھی ضائع نہیں جاتا۔ غریب اختر پر کم ظلم نہ ہوئے تھے۔ گو مال واسباب لے نکلی لیکن ذلت بھی ہوئی ہوگی۔ نہ معلوم وہ بدنصیب کہاں ہے؟ افسوس ہے کہ اس کو اتنی بھی خبر نہیں کہ گھر پر کیا گزری؟

ڈاکٹر: چار سال سے اُن کا کچھ پتہ نہیں؟

بیرسٹر: بالکل نہیں چار سال گزرے انگلینڈ میں مجھے والدہ کے خط سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ بیوہ اختر کو اس کے شوہر مرحوم کی چچی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب نہ معلوم وہ کہاں ہیں اور کس طرح بسر اوقات کرتی ہیں؟

ڈاکٹر: وہ تعلیم یافتہ تھیں۔ ضرور کسی زنانہ اسکول میں کام کرتی ہوں گی؟

ایک ملازم لڑکا۔ حضور یہ ٹیلیگرام ہے۔ دستخط کر دیجئے۔

بیرسٹر صاحب نے لفافہ چاک کر کے پڑھا۔ لکھا تھا:

"وقار احمد

ہم مع رفیق احمد واقبال بہادر آج شام کلکتہ پہنچیں گے۔"

مسز خورشید زمان: ایسی جلدی؟

بیرسٹر: وہ خط آج سے تین دن پیشتر کا لکھا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں اُن کی طبیعت درست ہوگئی ہوگی؟ اچھا اب اسٹیشن پر چلنے کی تیاری کرنی چاہئے۔ سات بجے ٹرین کا وقت ہے۔

ڈاکٹر تجمل: کون کون چلے گا؟

مسز تجمل: سب چلیں گے بچے گھر پر رہیں گے۔

قمر آرا: اوں اوں! ہم بھی چھات جائیں گے۔ ماموں جان مجھے لے چلو گے ناں؟ (قمر النساء کی بڑی لڑکی کا نام ہے)

بیرسٹر: ہاں بی بی تم ضرور چلنا۔

قمر آرا: خالہ جان کہتی ہیں بچے گھر میں رہیں گے۔

بیرسٹر: تم اپنا فراک بدل کر گرم کوٹ پہن آؤ۔ ہم بھی تیار ہوتے ہیں۔

یہ سب اسٹیشن پر اُن کو لینے گئے اور ساڑھے سات بجے اپنے چاروں معزز و بزرگ مہمانوں کو لے کر گھر آئے۔ وکیل نہایت محبت سے ان سب سے ملے۔ اختر حسن کی عالی شان کوٹھی نوکر چاکر ساز و سامان دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے لیکن اختر کے نہ ہونے سے سخت رنجیدہ تھے۔ ان کو یہاں آئے تیسرا دن تھا چونکہ مرزا اقبال بہادر صاحب ساتھ تھے۔ اس وقت مرزا صاحب وکیل صاحب وڈپٹی صاحب وڈاکٹر خورشید و تجمل صاحبان و صاحب خانہ بیرسٹر اختر حسن صاحب علیحدہ کمرے میں کھانا کھا رہے تھے اور مسز وقار احمد صاحبہ مع اپنی بیٹیوں ونواسیوں کے دوسرے کمرے میں کھانے کی میز پر تھیں۔

مسز خورشید: امّاں جان کس قدر خوشی کی بات ہے۔ کہ سب بھائی اختر کے گھر میں ہیں۔

مسز تجمل: ہائے اس وقت کمی ہے تو اختر کی۔ اب تو خالو جان بھی ہمارے ہی ہیں۔ وہ بھی ہوتی تو کیسی خوشی ہوتی۔

مسز وقار: آہ یہ غم تو زندگی کے ساتھ ہے۔

مسز خورشید: امّاں جان پچھلی جمعرات کا ذکر ہے کہ یہاں کے زنانہ ہائی اسکول کا امتحان تھا۔ ہم بھی وہاں گئے تھے۔ بہت سی تعلیم یافتہ لیڈیز سے ملاقات ہوئی۔ ہندو، مسلمان، بنگالی، پارسی لیڈیاں ملیں لیکن ایک پارسی لیڈی ستارا بائی بی اے جو (انسپکٹرلیس زنانہ مدارس ہیں) جو آج کل دورہ پر آئی ہوئی ہیں۔ اختر کی ہم شبیہ ہیں۔ ان سے ہم دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے کہ اختر نہیں تو اس کی ہم شکل ہی کو دیکھ لیں گے۔

مسز وقار: تم نے معلوم تو کرنا تھا شاید وہی ہو؟

مسز خورشید: نہیں امّاں جان بھلا یہ کب ممکن ہے۔ ستارا بائی بی اے پاس ہے۔ اختر بیچاری نے تو صرف انٹرینس تک تعلیم پائی تھی۔ اس قدر جلد اس کو انسپکٹری کہاں مل سکتی تھی۔

مسز وقار: خیر اس کی ہم شکل تو ہے۔ بلواؤ میں بھی دیکھوں۔

مسز تجمل: ہم نے یہ ذکر بھائی خورشید و بھائی اختر سے بھی کیا تھا۔ وہ بھی کہتے تھے کہ کسی دن چائے پر بلواؤ تو ہم بھی دیکھیں۔

مسز وقار: مگر تم کو کیا خبر کہ وہ مردوں سے ملنا پسند کریں گی یا نہیں؟

مسز خورشید: بھائی اختر نے بھی کہا تھا کہ وہ ہم سے ملنا پسند نہ کریں گی لیکن وہ کہتے تھے کہ پارسی لیڈی ہے۔ ضرور مل لے گی اور شریر تجمل تو کہتے تھے کہ اگر روبرو ہو کر نہ ملی تو دروازہ بند کر کے شیشوں سے دیکھ لیں گے۔ اچھا میں ابھی رقعہ لکھتی ہوں۔

کھانے کے بعد مسز خورشید نے ستارا بائی صاحبہ کو خط بھیجا کہ "شام کی چائے ہمارے ساتھ پئیں۔" جو انہوں نے منظور کر لیا۔

یہاں شام کی چاء کا انتظام باغیچے میں کیا گیا۔ ڈپٹی، وکیل اور مرزا صاحبان چائے پی کر سیر کو چلے گئے۔ ڈاکٹر خورشید و تجمل و اختر حسن گھر پر ہی تھے۔ یہ تینوں ماں بیٹیاں انسپکٹریس صاحبہ کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں۔ ٹھیک چار بجے انسپکٹریس صاحبہ کی گاڑی دروازہ باغ پر پہنچی۔ یہ تینوں منتظر کھڑی تھیں۔ نہایت تپاک سے ملیں۔ ستارا بائی نہایت سادہ لباس میں تھیں۔ فیروزی مرینہ کی ساڑی اور سفید بلاؤس پہنے تھیں اور سیاہ بوٹ تھے اور انگریزی فیشن کے بال بنا رکھے تھے۔ زیور کوئی نہ تھا بعد چند معمولی باتوں کے سب چائے پر بیٹھیں اور مسز وقار احمد نے سلسلہ گفتگو یوں شروع کیا۔

مسز وقار: آپ کلکتے کب سے تشریف لائی ہیں۔

ستارا بائی: ایک ہفتہ ہوا۔

مسز خورشید: کب تک اور ٹھہریں گی؟

ستارا بائی: آپ تو اس دن ہمارے اسکول تشریف لے گئی تھیں بس یہی امتحانات کا جھگڑا ہے۔ اس کے بعد چلی جاؤں گی۔

مسز وقار: آپ کی جائے قیام کہاں ہے؟

ستارا بائی: ابھی کچھ ٹھیک نہیں بتا سکتی۔ اکثر ناگپور میں رہتی ہوں اور ان دنوں دورے پر ہوں۔ ہماری افسر بڑی انسپکٹریس مس ولسن صاحبہ بی اے کلکتے میں رہتی۔ میں اور مس سوشیلا گھوش بی اے کبھی کہیں کبھی کہیں۔

مسز خورشید: مس گھوش صاحبہ بھی بہت ملنسار و خلیق لیڈی ہیں۔

ستارا: ہاں وہ اکثر آپ کی تعریف کیا کرتی ہیں۔ کہتی تھیں کہ کلکتہ

چھوڑنے سے پیشتر ایک بار اُن سے ضرور ملوں گی۔

مسز وقار: آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں؟

ستارا: میں مس گھوش صاحبہ کے بنگلے پر ٹھہری ہوئی ہوں۔ آپ یہاں کب تشریف لائیں؟

مسز وقار: آج تین روز ہوئے میں اپنے بچوں کو دیکھنے آئی ہوں۔

ستارا: وہ یہاں پڑھتے ہوں گے۔

مسز وقار: نہیں وہ دونوں برسر کار ہیں۔ یہ مسز خورشید میری بڑی لڑکی ہے اور یہ دوسری مسز تجمل میری چھوٹی لڑکی ہے۔

ستارا: یہ تو مجھے معلوم ہے۔ جب یہ اسکول میں تشریف لے گئی تھیں۔ تب کہتی تھیں کہ "ہماری والدہ آنے والی ہیں۔" میں نے سمجھا۔ شاید چھوٹے بچے پڑھتے ہیں؟

مسز وقار: میرے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ بڑی لڑکی کے شوہر یہاں سول سرجن ہیں۔ اس واسطے یہ یہاں رہتی ہے اور چھوٹی لڑکی کا شوہر تجمل حسن بھی اسسٹنٹ سرجن ہے۔ چونکہ آج کل وہ چھٹیوں پر ہیں۔ اس واسطے مع بیوی کے یہاں اُن کے گھر آیا ہوا ہے۔ میرا چھوٹا لڑکا اظہر حسن محمڈن کالج علی گڑھ میں تعلیم پاتا ہے اور بڑا لڑکا اختر حسن بی اے بیرسٹ ایٹ لاء کلکتہ میں کام کرتا ہے۔ چنانچہ یہ کوٹھی اختر لاج اسی کی ہے اور آج کل ہم سب اسی کے گھر مہمان ہیں۔

ستارا: میں آپ کی مہربانی کی مشکور ہوں کہ آپ نے اپنے سب حالات بتائے۔

مسز وقار: اسی طرح آپ بھی بتائیں کہ آپ کا وطن کہاں ہے اور آپ کس قدر بہن بھائی ہیں؟

ستارا: آپ جانتی ہیں۔ ہندوستان میں ہم لوگوں کا جو وطن ہے۔ افسوس کہ میرے بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔

مسز خورشید: اس دن اسکول کی ایک ٹیچر مس گوپال صاحبہ سے ہم نے آپ کے گانے کی بہت تعریف سنی تھی۔ وہ یہاں تک کہتی تھیں کہ میں کوشش کروں گی کہ مس

ولسن صاحبہ کسی طرح مس ستارا بائی صاحبہ کو یہیں رکھ لیں جن سے ہم لوگ سنگنگ میں اچھی ترقی کر سکیں۔

ستارا: یہ اُن کا خیال ہے میں نے موسیقی میں کمال حاصل کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی۔ یونہی معمولی اسکول کے دیگر تعلیمی مضمونوں کی طرح یہ بھی سیکھ لیا۔ مس گوپال مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اس واسطے کہتی ہوں گی۔

مسز خورشید: یہ آپ کی کسر نفسی ہے۔ کیا مہربانی کر کے پیانو پر آپ اس وقت کچھ نہ سنائیں گی؟

ستارا: بہت خوشی سے مگر میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تاہم تھوڑا سنائے دیتی ہوں۔

وہاں سے اُٹھ کر سہ دری میں آئیں۔ جہاں باجے رکھے تھے۔

ستارا: آپ کیا سننا چاہتی۔ غالباً بنگالی تو آپ نہ سمجھتی ہوں گی۔ انگریزی میں سناؤں؟

مسز وقار: گو یہ کہتے تو شرم آتی ہے (کیوں کہ ہماری اُردو شاعری میں رکھا ہی کیا ہے) کہ اُردو گیت سناؤ۔ تاہم کہتی ہوں کہ اُردو کی کوئی نظم ہو تو سنائیں۔

ستارا: میں بہت خوشی سے آپ کو اُردو سناؤں گی۔ مولانا حالی کی بہت سی نظمیں مجھے یاد ہیں اور اچھی اچھی غزلیں۔

مسز وقار: آپ کی مہربانی۔ اچھا تو غزل ہی سنائیں۔

ستارا:

نہ قابو میں ہے دل میرا۔ نہ بس میں ہے زباں میری
معاف اے ضبط اب معذور ہے تاب بیاں میری
بجائے داغ خوں دامن میں ہیں آتش کے پرکالے
ہوئی ہے آتش افشاں آج چشمِ خوں فشاں میری
وفورِ اشک میں آہوں سے چشم بادبانی ہے
عجب منجدھار میں ہے کشتیِ عمرِ رواں میری

میری تقدیر میں وارفتگی تھی اور بربادی
ہوئی اک مشتِ خاک آخر غبارِ کارواں میری

مسز وقار: (بہ چشمِ تر) ایک دفعہ پھر یہی شعر کہیں

ستارا: ۔

میری تقدیر میں وارفتگی تھی اور بربادی
ہوئی اک مشتِ خاک آخر غبارِ کارواں میری
تمناؤں کا دل میں اور دل کا خوں ہے آنکھوں میں
بیاں کن سُرخیوں سے ہو رہی ہے داستاں میری
مجھے ہر ہر قدم پر دوریِ منزل کا رونا ہے
ہم آہنگِ جرس ہے شورشِ طرزِ فغاں میری
بتا کوئی سبیل اے خضرِ مرگِ ناگہانی کی
رہینِ سخت جانی ہے حیاتِ جاوداں میری

یہ شعر ختم کر کے ستارا بائی خاموش ہو گئیں۔

مسز وقار: آپ کی اس غزل کا ایک ایک لفظ تیر کی طرح دل پر لگتا ہے۔

ستارا: آپ کچھ افسردہ خاطر سی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا اس کا سبب میں دریافت کر سکتی ہوں؟

مسز وقار: آہ میں کیا بتاؤں۔ میری ایک نہایت عزیز بھانجی عرصے سے مجھ سے علیحدہ ہے۔ اس نے بھی گانا بہت اچھا سیکھا تھا۔ بالکل آپ کی طرح گاتی تھی اور شکل بھی آپ سے ملتی جلتی تھی۔ بس مجھے اسی کی یاد ستا رہی ہے۔

ستارا: کیا وہ آپ سے دانستہ جدا کی گئی ہے؟

مسز وقار: ہاں کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ہم لوگ اس کی جدائی میں سخت پریشان ہیں۔

ستارا: اس کے والدین زندہ ہیں؟

مسز وقار: آہ والدہ ہی تو زندہ نہ رہی۔ تب ہی تو یہ مصیبت پڑی والد زندہ ہیں۔

ستارا: وہ بھی اس کی خبر نہیں لیتے؟

مسز وقار: پہلے تو انہوں نے دوسری شادی کر رکھی تھی۔ سوتیلی ماں نے اس کا نام بھی نہ لینے دیا۔ اب چند روز سے وہ بھی نہیں رہی۔ اس کے بدنصیب باپ کو بھی بہت رنج ہے۔

ستارا: وہ اب کہاں ہیں؟

مسز وقار: وہ ساتھ ہیں۔ چونکہ گھر بہت پریشان رہتے تھے۔ اس واسطے میں اپنے ہمراہ لے آئی ہوں۔

ستارا: معاف کریں۔ آپ لوگوں میں دوسری شادی کا بہت برا رواج ہے۔ اسی کے سب برے نتائج ہیں۔

مسز وقار: بے شک یہی وجہ ہے۔ ہم خود اس کے قائل ہیں۔ ہاں آپ بتائیں آپ کے والدین کس جگہ ہیں؟

ستارا: آہ میں کیا بتاؤں ۔

کیا پوچھتے ہو میرا فسانہ میں کیا کہوں
تم جس کو سن سکو وہ میری داستاں نہیں

مسز وقار: (ستارا کا ہاتھ پکڑ کر) پیاری ستارا میں آپ کو اپنی بیٹی سمجھتی ہوں، چونکہ آپ میری اس بھانجی کی ہم شبیہ ہیں۔ اس واسطے مجھے آپ سے خاص ہمدردی ہے۔ مجھے ضرور بتاؤ۔

ستارا: میرے والدین وطن میں ہیں۔ چونکہ وقت بہت کم ہے۔ میں زیادہ حالات نہیں سنا سکتی۔ اس واسطے آپ سے معافی اور رُخصت چاہتی ہوں۔

یہ کہا اور کھڑی ہو گئیں اور سب سے مل کر رُخصت ہوئیں، ستارا بائی کے جاتے ہی وہ تینوں بھائی یہاں آئے۔

ڈاکٹر تجمل: واہ بھئی ستارا بائی تو خوب تھیں۔

مسز خورشید: تم نے کیسے دیکھا؟

تجمل: کھڑکی سے۔

تجمل: اگر پردہ نشین کو دیکھتے تو بے شک گناہ تھا۔ جب وہ بے پردہ ہیں تو پھر کیا ہے؟ آخر فٹن پر گئی ہیں۔ راستہ میں کسی کی نظر نہ پڑے گی۔ پارسی لیڈیاں کب پردہ کرتی ہیں؟

ڈاکٹر خورشید: آپ نے کیوں ان بیچارے کا پیچھا لے لیا۔ ہم نے تو اختر کے شک میں دیکھا تھا۔ ورنہ کسی کو کیا غرض پڑی تھی؟ اور اختر حسن تو پھر بھی منع کرتے تھے اور انہوں نے خود نہیں دیکھا لیکن اُن کی دردمند غزل سن کر ہم دونوں نے دیکھ لیا۔ آپ اُن سے اجازت لے رکھنا اب کی بار آپ سے ملنے آئیں تو ہم اُن سے ملیں گے۔

مسز وقار: میں نے تو اختر ہی کے خیال سے پہلی ملاقات میں بہت بے تکلفی کر لی لیکن افسوس کہ کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ آہ ہماری ایسی قسمت کہاں؟ کہ اختر کا پتہ ملے۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ وکیل صاحب بھی یہاں آ گئے۔

مسز وقار: بیچارے اقبال کہاں ہیں۔

وکیل: باہر ہیں۔ ان کے پاس آپ کے صاحب بیٹھے ہیں۔ کیوں کیا بحث ہو رہی ہے؟

مسز وقار: وہ انسپکٹرلیس آئی تھی ناں؟ اسی کا ذکر ہے چونکہ وہ اختر کی ہم شکل ہے۔ اس واسطے سب قدر کرتے ہیں۔

وکیل: بنگالی ہندو لیڈی ہے یا کرسچن؟

مسز وقار: پارسن ہے۔

وکیل: پھر وہ پردہ نہ کرتی ہوگی؟ آپ اس کو مجھے دکھا دیں۔

مسز وقار: خورشید و تجمل بھی یہی چاہتے ہیں۔ اس دفعہ بلایا تو اس سے دریافت کر لیا جائے گا کہ وہ آپ سے ملنا پسند کرتی ہے یا نہیں؟

بائیسواں باب

چھوٹتا ہے ہاتھ سے اب دامنِ صبر و قرار
بے قراری سے بدلتی ہے شکیبائی مری

مسز وقار احمد کو کلکتہ آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ شام کے پانچ بجے تھے۔ اس وقت یہ تینوں ماں بیٹیاں مع خورشید اختر، تجمل کے ستارا بائی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ کیونکہ آج رات کے کھانے پر ستارا بائی آنے والی تھی لیکن انہوں نے کھانے سے تین گھنٹے پیشتر ہی بلا بھیجا تھا۔ یہاں اُنہیں کا ذکر تھا کہ فٹن کی آواز آئی۔ مسز خورشید فوراً برآمدے میں آ گئیں۔

ستارا: آج تو آپ نے بہت ہی جلدی کھینچ بلایا۔

مسز خورشید: آپ کو جلدی معلوم ہوتی ہے لیکن ہمارے دلوں سے پوچھیں کہ ایک ایک منٹ کر کے پانچ بجائے ہیں۔ ہاں اس وقت کمرے میں دونوں بھائی اور میرے صاحب موجود ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں اگر آپ بھی منظور کریں تو میں ان کو کمرے میں ہی رہنے دوں؟

ستارا: آپ کے بھائیوں کو میں اپنا بھائی سمجھتی ہوں اور آپ کے صاحب کو بہنوئی۔ گو اب تک میں نے اس قدر آزادی اختیار نہیں کی۔ تاہم آپ کے بھائیوں سے ملنے میں کوئی عار نہیں؟ آپ کے والد صاحب کمرے میں نہیں ہیں؟

مسز خورشید: میرے والد اور خالو صاحب کسی جگہ چائے پر گئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ ان کو بھی آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔

ستارا: آپ کے بزرگ میرے بھی بزرگ ہیں۔ بہت خوشی سے اُن کی خدمت میں نیاز حاصل کروں گی چلئے اندر۔

اِن دونوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوائے مسز وقار احمد کے سب کھڑے ہو گئے اور مسز خورشید نے سب سے ملوایا۔

مسز خورشید: یہ میرے صاحب ڈاکٹر خورشید زمان صاحب ہیں اور یہ میرے بہنوئی ڈاکٹر تجمل حسن صاحب ہیں۔ یہ میرے بھائی اختر حسن صاحب بیرسٹر ہیں۔

ستارا: (مسکرا کر) میں آپ کی بے تکلف محبت کی نہایت مشکور ہوں اور آپ کے بھائیوں سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

مسز وقار: میں بہت خوش ہوئی کہ آپ ان سب سے ملیں۔ یہ سب میرے بچے ہیں اور اسی طرح میں آپ کو بھی اپنی بچی سمجھتی ہوں۔

ڈاکٹر خورشید: ہم تینوں بھائی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور خدا کے شکر گزار ہیں اس نے ماں بہنوں میں ایک معزز و قابل بہن کا اضافہ کیا۔ افسوس کہ آپ بہت جلد یہاں سے چلی جانے والی ہیں۔

ستارا: یہ آپ کی قدر دانی ہے۔ ورنہ میں اس قابل نہیں۔ شاید میں مستقل طور پر یہیں رہنے لگوں۔ کیوں کہ مس ولسن صاحبہ کوشش کر رہی ہیں کہ مجھے کلکتہ میں رکھا جائے۔

ڈاکٹر خورشید: خدا کرے ایسا ہی ہو جائے۔

سوسن: (کمرے میں داخل ہو کر) حضور بے بی دریافت کرتے ہیں کہ اس وقت ہم آپ کے پاس آسکتے ہیں؟

مسز وقار: کیا کریں گے یہاں آ کر؟

ستارا: آپ بلوا لیجیے۔ میں اُن کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

مسز وقار: سوسن تینوں بچوں کو لے آؤ۔

چند منٹ بعد سوسن ملازمہ تینوں بچوں کو لائی۔ جو نہایت صاف ستھرے خوب صورت تھے۔

مسز وقار نے ان تینوں کو ستارا بائی سے ملوایا۔

مسز وقار: یہ لڑکا قمر الزمان میری بڑی لڑکی مسز خورشید کا پہلا بچہ ہے اور یہ لڑکی قمر آرا اس کی بہن ہے اور یہ چھوٹی بچی خورشید آرا ان کی تیسری بہن ہے۔

ستارا: (چھوٹی خورشید کو گود میں بٹھا کر) یہ بہت پیارے بچے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا دل بہت ہی خوش ہوا۔ کچھ سیکھتے بھی ہیں؟

قمر الزمان کو چھٹا سال ہے۔ یہ تو اب پڑھتا ہے اور قمر آرا کنڈرگارٹن اسکول جاتی ہیں۔ یہ ننھی خورشید ابھی اچھی طرح بول نہیں سکتی۔ اس واسطے کچھ سیکھنے کو ابھی باہر نہیں بھیجا۔ اس کی سمجھ کے موافق گھر ہی میں والدہ خالہ کچھ بتاتی رہتی ہیں۔

ستارا: کیا مسز تجمل حسن کے بھی کوئی بے بی ہے؟ میں اس کو بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔

مسز خورشید: مسز تجمل کے ابھی کوئی بے بی نہیں۔

ستارا: ان کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا۔

مسز خورشید: تیسرا سال ہے۔ اس بے چاری کی شادی کیا ہوئی تھی۔ وہ بھی ہم پر ایک مصیبت تھی۔

ستارا: وہ کیوں؟

مسز خورشید: ان دنوں ہماری ایک عزیز بہن سخت مصیبت میں تھی۔ اور ہمارے بھائی اختر بغرض تعلیم انگلینڈ گئے تھے۔ انہیں وجوہات سے ہم سب افسردہ دل تھے۔ بس شرعی طریقہ سے عقد کر دیا گیا۔ دعوت وغیرہ کچھ نہیں ہوئی۔

ستارا: ایسی جلدی نہ کرتے۔ بھائی کے آنے پر شادی کی جاتی؟

مسز خورشید: ہم تو ایسا ہی چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر تجمل حسن نے نہ مانا کیونکہ وہ ڈاکٹری پاس کر چکے تھے اور کام کرتے بھی ایک سال ہو گیا تھا۔ ان کو گھر بنانا ضروری تھا۔

مسز خورشید: بہن نجم تم کہتی تھیں کہ اس دن میم صاحبہ نے تمہیں پیانو سنایا تھا۔ تمہیں چاہئے کہ آج ان کو تم سناؤ۔

ستارا: میں آپ کی اس عنایت وسفارش کی دل سے مشکور ہوں۔ اچھا

مسز تجمل اب بدلہ دیجیے۔ میں ہمہ تن شوق ہوں۔

مسز تجمل: بڑی خوشی سے۔

بیگم اپنی جگہ سے اُٹھ کر پیانو کے پاس جا بیٹھیں اور بجانا شروع کیا۔

مسز تجمل: (ستارا بائی کی طرف اشارہ کر کے)۔

ہم اُن بتوں کے طالب دیدار کیوں ہوئے؟
کافر بنے خدا کے گناہ گار کیوں ہوئے؟
دل لے کے جان لینے کو تیار کیوں ہوئے؟
دلدار بن کے آپ دل آزار کیوں ہوئے؟

پھر ایک نظر ستارا کو دیکھ کر:

دلدار بن کے آپ دل آزار کیوں ہوئے؟
کس کے خیال نے مجھے مرنے نہیں دیا؟
آسان کام ہجر میں دشوار کیوں ہوئے؟

اس کے بعد باجے سے ہاتھ اُٹھا لیے اور خاموش ہو گئیں۔

ڈاکٹر تجمل: (مسز خورشید سے) مسٹر۔ ان کو تو تھکا دیا۔ آپ آرام سے بیٹھی ہیں۔ تکلیف کیجیے اب آپ کی باری ہے۔

مسز خورشید: تم اپنی بیوی کی طرف داری نہ کرو۔ میں خود ہی جاتی ہوں۔ (اور پیانو کے پاس جا بیٹھیں)

مسز خورشید:۔

آرزوؤں سے میرا خانہ دل خالی ہے
صرف اک یاس ہی مہمان ہے مہمانوں میں
دل میں ہے یاد کبھی اس کی کبھی غم اُس کا
بس یہی دونوں میرے گھر کے ہیں مہمانوں میں
سینے میں دل ہے، لہو دل میں ہے اس میں ارماں
قید ہے میری تمنا کئی زندانوں میں

حالِ دل میرا سنیں کان لگا کر تو کہوں
لطف کچھ بھی نہیں گزرے ہوئے افسانوں میں

ستارا کی طرف دیکھ کر:

دیکھئے ہوتی ہے کب اپنی تمنا پوری
دن نکل جائے گا اک دن یونہی ارمانوں میں

سب ہی اس شعر پر آبدیدہ ہو گئے اور تو اور ستارا بائی صاحبہ بھی چشم پُر آب تھی۔

ستارا: کہئے کہئے آپ نے اخیر کے شعر تو چھوڑ ہی دیئے۔

مسز خورشید: مجھ کو یاد نہیں۔ یہ درخواست آپ اپنی دوسری مسز مس صاحبہ سے کریں۔

ڈاکٹر تجمل: خدا جانے وہ منظور کریں یا نہ کریں؟ ان سے کس طرح کہوں؟

مسز خورشید: جیسی میں ہوں ویسی وہ۔ تم کہہ دیکھو، وہ ضرور منظور کریں گی۔

ستارا: آپ کی خوشی مجھے منظور ہے جو شعر باقی ہیں وہ میں سنائے دیتی ہوں۔

مسز خورشید اس کرسی سے اُٹھیں اور مس صاحبہ کو بٹھا دیا۔

ستارا:

ایک لحظہ بھی نہ آرام ملا زیرِ فلک
چرخِ گردوں نے رکھا اور ہی گردانوں میں
وقت گزرتا ہے میرا حسرت و حرماؤں میں
شب کو دل رہتا ہے گزرے ہوئے افسانوں میں

لیجئے میں نے پورے کر دیئے (اور کرسی سے اُٹھنے لگیں)

تجمل: تھینک یُو۔

مسز تجمل: نہیں نہیں ابھی نہ اُٹھئے۔ ہم آپ کو اَور بہت کچھ سنا دیں گے۔ مہربانی کر کے تھوڑا کچھ اَور۔

ستارا: اَور کیا چاہتی ہیں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں رہتا۔ جب سے کام کرنے لگی ہوں۔

مسز وقار: پیاری ستارا کچھ اور سنا دو۔ تم ان دونوں سے اچھا بجاتی ہو۔

ستارا: آپ کا حکم بسر و چشم منظور۔

نالہ بے چھیڑے کسی کے کبھی پیدا نہ ہوا
میں لب نے کی طرح آپ سے گویا نہ ہوا
داغ کیا یاس کو بھی ہجر گوارا نہ ہوا
ایک دل پر میرے کس کس کا اجالا نہ ہوا
صفتِ اشک چکیدہ یہ فلک نے کھویا
کہ دمِ حشر بھی میرا کوئی جویا نہ ہوا
ہائے کیوں کر کروں میں گلۂ محرومی
لاکھ ارمان تھے اور ایک بھی پورا نہ ہوا
خشک آنسو نہ ہوئے طعنۂ اعدا سن کر
خاک اُڑانے سے بیاباں کبھی دریا نہ ہوا
ظلمتِ دل ہے وہی لاکھ جلایا غم نے
پھونک دینے سے بھی اس گھر میں اجالا نہ ہوا
خوں رُلاتی رہی بد فالیٔ شادی برسوں
زخم کی طرح مبارک مجھے ہنسنا نہ ہوا

ڈاکٹر خورشید: یہی شعر ایک بار پھر کہیں۔

ستارا: ؎

خوں رُلاتی رہی بد فالیٔ شادی برسوں
زخم کی طرح مبارک مجھے ہنسنا نہ ہوا

باجا بند کر کے مس ستارا نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئیں۔

مسز وقار: اس وقت ستارا کو پکڑ کر مجھے کس قدر اختر یاد آ رہی ہے۔

ملازم لڑکا: بیگم صاحب سرکار آ گئے ہیں۔

مسز وقار: کہو میں آتی ہوں۔

مسز خورشید: خالو جان بھی ساتھ ہیں؟

لڑکا: جناب دونوں ہیں اور مرزا صاحب بھی ہیں۔

مسز خورشید: (ستارا بائی سے) میں اُن کے پاس ہو آؤں۔ ابھی آتی ہوں۔

ستارا: وہ مرزا صاحب کون ہیں؟ آپ اپنے والد صاحب اور خالو صاحب کو یہیں بلالیں۔

مسز خورشید: مرزا صاحب ان کے دوست ہیں لیکن ہم سب اُن سے پردہ کرتے ہیں۔ آپ میرے والد صاحب کو اجازت دیتی ہیں تو میں بلا لیتی ہوں۔

انہوں نے اُن کے بلانے کو لڑکا بھیج دیا۔

جس وقت وہ دونوں کمرے میں آئے۔ یہ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے اور مسز خورشید نے اپنے والد اور خالو کو ستارا بائی سے ملایا۔ پھر سب بیٹھ گئے اور باتیں ہونے لگیں۔ وکیل صاحب نظر بچا بچا کر اپنی بچھڑی ہوئی لڑکی کی ہم شکل ستارا کو دیکھتے تھے اور ستارہ بھی زیادہ انہیں کی طرف متوجہ تھیں۔

مسٹر وقار: میں اس بات سے بہت خوش ہوا کہ مثل قمر کے آپ نے مجھے یہاں بلوا لیا۔

مسٹر رفیق: آپ تو خوش ہوئے اور میں مشکور بھی۔ اس واسطے کہ مس صاحبہ نے آپ کو اپنا بزرگ سمجھ کر آپ کے ایک عزیز کو بھی یہاں آنے کی اجازت دی۔

ستارا: (نہایت دھیمی آواز سے) میں اپنے دونوں محترم بزرگوں کی اس شفقت و عنایت کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں (مسٹر رفیق سے) آپ یہاں کب تک تشریف فرما ہیں؟

مسٹر رفیق: فی الحال تو یہیں ہوں اور کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

ستارا: شاید آپ کوئی کام نہیں کرتے اور آج کل فرصت میں ہیں؟

مسٹر رفیق: (نامعلوم سی آہ سرد بھر کر) میں فیملی نہیں رکھتا۔ میری وائف کا انتقال ہو چکا ہے۔

ستارا: اور بچے اسکول و کالج وغیرہ میں ہوں گے؟

مسٹر رفیق: میں اولاد بھی نہیں رکھتا۔

ڈاکٹر تجمل: (اختر حسن کے کان میں) سنتے ہو۔ یہ تو وکیل صاحب سے خوب سوال کر رہی ہیں۔ ہم سب میں بولنے کے قابل ان کو وہی نظر آئے۔

اختر حسن: (اسی قدر آہستہ) ہاں اپنی اپنی طبیعت ہے ناں اور دوسرے یہ بات ہے کہ ہم لوگ ان کے ہم سن تھے۔ اس واسطے زیادہ بولنا پسند نہ کیا ہوگا؟

تجمل: تو کیا صرف وکیل صاحب ہی ایک بزرگ ہیں۔ آخر ماموں جان بھی تو ہیں۔ ان سے تو اس قدر متوجہ نہیں۔

ستارا: آپ آج کل تنہا بسر کر رہے ہیں؟

مسٹر رفیق: ہاں یہی حالت ہے۔

یہی ذکر تھا کہ ڈرائنگ روم سے گھنٹی کی آواز آئی اور یہ سب کھانے کے لیے چلے گئے۔ اس وقت ڈپٹی اور وکیل صاحبان نے کھانا اندر ہی کھایا اور مرزا اقبال بہادر کے ساتھ ڈاکٹر خورشید جا شریک ہوئے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کھانے پر لگ گیا۔ کھانے کے بعد ستارا بائی رخصت ہونے لگیں تو انہیں سوار کرنے کو سب گاڑی کے قریب آئے۔ وہ سب سے شیک ہینڈ کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئیں اور سب کے بعد وکیل صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

ستارا: مہربانی کر کے آپ گھر تک میرے ساتھ چلیں چونکہ میں تنہا ہوں۔ رات زیادہ آ گئی ہے۔ ڈر لگتا ہے۔

مسٹر رفیق: نہایت خوشی کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں مگر آپ تو شاید اسکول میں ٹھہری ہوئی ہوں گی۔ میرے ہمراہ جانے سے کسی کو اعتراض تو نہ ہوگا۔

ستارا: بالکل نہیں۔ میں اسکول میں نہیں ہوں۔ دوسری انسپکٹریس صاحبہ مس گھوش کے بنگلے پر ہوں اور وہاں سوائے مس صاحبہ کے اور کوئی مرد یا عورت نہیں ہے۔ صرف دو ملازمہ عورتیں ہیں۔

مسٹر رفیق: چلیے میں تیار ہوں۔

سب کو رخصتی سلام کر کے ستارا بائی مع وکیل صاحب کے رخصت ہوئیں۔ یہ سب حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہوا؟ بنگلے پر پہنچ کر دونوں اُترے۔ مس گھوش صاحبہ برآمدے

میں اُن کی منتظر کھڑی تھیں۔

ستارا: (وکیل صاحب کا ہاتھ مس گھوش کے ہاتھ میں دے کر) "پیاری سوشیلا یہ ہیں پیارے ابا جان۔ مسٹر رفیق احمد بی اے ایل ایل بی" اتنا کہا اور روتی ہوئی وکیل صاحب کے قدموں پر گر پڑی۔

وکیل صاحب حیران رہ گئے اور خود بھی بے اختیار روتے ہوئے اس کا سر زانو پر رکھ کر وہیں بیٹھ گئے اور بہت دیر تک یہی حالت رہی لڑکی کو غش آ گیا۔

مس گھوش بے چاری اِدھر اُدھر پھرتی رہیں۔ پانی پلایا۔ دوا دی۔ چند منٹ بعد اس کو ہوش آیا تو دونوں ستارا کو اٹھا کر کمرے میں لائے اور پلنگ پر لٹا دیا۔ ستارا بے قراری کے ساتھ رو رہی تھی اور وکیل صاحب کے سینے سے لپٹی جاتی تھی۔ بعد ایک گھنٹے کے جب اس کی حالت ذرا درست ہوئی تو وکیل صاحب نے کہا۔

مسٹر رفیق: اختر میری پیاری اختر۔ میں عالمِ خواب میں ہوں یا بیداری میں! مجھے تو اس دن کی امید نہ تھی اور نہ میں بدنصیب گنہگار اس قابل تھا کہ اپنی گم شدہ فرشتہ خصلت اختر کو پاتا۔ بیٹی میں ناقابلِ معافی ہوں۔ خدا مجھے معاف نہ کرے گا لیکن تم اپنے بدقسمت باپ پر رحم کرو اور معاف کر دو۔

اختر: ابا جان، میرے پیارے ابا جان میں بدقسمت آپ کی کنیز ہوں۔ اللہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔ پانچ سال کے بعد میں نے آج یہ سمجھا ہے کہ دُنیا میں ہوں۔ خدا ہمیشہ آپ کو سلامت رکھے۔ میری زندگی بالکل تلخ ہو گئی تھی۔ میرا دل دُنیا۔ سے بیزار تھا اور میں صرف اسی اُمید پر تھی کہ کبھی نہ کبھی آپ کو ضرور دیکھوں گی۔ ابا جان اس حالت میں میں نے اتنا کچھ صرف اس خیال سے کیا کہ جب خدا نے مجھے پیدا کیا ہے تو دُنیا میں بے کار ثابت نہ ہوں۔ اپنی ہستی کو کار آمد بنانے کے لیے اس قدر دقتیں اُٹھائیں۔ ورنہ میرے دل میں حوصلہ اور مجھ میں ذرا ہمت نہ تھی۔ خدا کا لاکھ شکر ہے کہ آج میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔ یعنی آپ کو دیکھ لیا۔ اب خدا مجھے آپ سے جدا نہ کرے اور آپ ہی کے قدموں میں میری عمر تمام ہو جائے۔

مسٹر رفیق: میری اختر آہ میں تم سے اور خدا سے سخت شرمندہ ہوں۔ میری

زندگی تیرے لیے ہے تو مجھے معاف کر اور ویسا ہی سمجھ جیسا اب سے گیارہ سال پیشتر سمجھتی تھی۔ میں نے اپنی بداعمالی کا نتیجہ پالیا۔ میں اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا ہوں۔ اب تیرا گھر بلاؤں سے خالی تو ہی اس گھر کی ملکہ ہے اور تیرا باپ تیرا خادم۔

اختر: ہائے ابا جان یہ نہ کہیے۔ میں تو آپ کی کنیز ہوں۔ مجھے تو بتایئے کہ بیگم صاحبہ اور اُن کی لڑکیاں اب کہاں ہیں؟

مسٹر رفیق: بس بیٹی یہ نام نہ لے۔ اس نام سے میرا دل کانپ جاتا ہے۔ میں تمام مفصل حالات پھر سناؤں گا تو اطمینان رکھ کہ اب سب بلائیں ہم سے بہت دور ہو گئیں۔ اب تجھے کسی طرح نہیں ستا سکتیں۔

اختر: تاہم تو بتایئے کہ کیوں الگ ہو گئیں؟

مسٹر رفیق: اُن کے تمام جعل فریب کھل گئے اور وہ خود ہی ہمارے گھر سے دفع ہو گئیں۔ تمہیں معلوم ہوگا۔ لاڈلی کی شادی نواب ابوالحسن کے لڑکے سے کر دی تھی۔ اپنے مزاج کی بدولت وہ وہاں مصیبت بھگت رہی ہے۔ میاں بیوی میں سخت ناچاقی ہے۔ ساس خسر جان کے دشمن ہیں اور وہ چھوٹی لڑکی جو ہمارے گھر میں پیدا ہوئی تھی دو سال ہوئے مر چکی ہے۔ اور وہ دشمنِ جان و آبرو مع اپنی تینوں خدمت گاروں کے نہ معلوم کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اس کا شمشاد ملازم اب بھی میرے ساتھ ہے۔

اختر: افسوس کہ باوجود اس قدر خاطر و خوشامد کے بیگم صاحبہ نے ہمارا ساتھ نہ دیا اور ذرا ہماری عزت کی پرواہ نہ کی۔

مسٹر رفیق: یہ میری شامتِ اعمال ہے۔ اب میں میرٹھ میں عمر بسر کرنے کے قابل نہیں رہا اور اب میرا وہاں کام ہی کیا ہے۔ ہمارے عزیز یہاں ہیں اور تم یہاں ہو۔ اسی حالات میں بقیہ زندگی گزر جائیگی۔ اختر آفرین ہے تمہاری ہمت و حوصلے پر کہ اس بیکسی و ناداری کی حالت میں تم نے کس قدر علمی ترقی حاصل کر لی۔

اختر: ابا جان کچھ قسمت میں ہی تھا۔ ورنہ میں بالکل بے بس و ناچار تھی۔ جس رات نثار علی کی بیوی نے مجھے بارش میں گھر سے نکالا تھا۔ اس وقت سوا ایک چھوٹی سی طلائی انگشتری کے میرے پاس اور کچھ نہ تھا۔ کیوں کہ جو کچھ بیگم نے مجھے دیا تھا وہ سب

فروخت کر کے حیدر علی مرحوم حج کو جاچکے تھے اور چونکہ وہیں انتقال ہو گیا تھا جو کچھ ان کا اسباب پیچھے تھا وہ بھی نثار کے قبضے میں تھا۔

میں اس وقت نہایت روی، سوتی کا تنگ پاجامہ اور موٹا پرانا کرتہ دوپٹہ پہنے تھی۔ دو گھنٹے تو حیران کھڑی سوچتی رہی کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ چونکہ سخت بخار میں مبتلا تھی۔ قدم اُٹھانا دشوار تھا۔ یوں تو شہر میں میری بہت واقفیتیں تھیں لیکن اپنی ذلت کے خیال سے کسی سے مدد لینے کو دل نہ چاہتا تھا۔ مجبور مصیبت سے راستہ کاٹتی اسٹیشن پر پہنچی اور مرحوم ظفر کے ایک واقف کار کے گھر گئی اور اس کی بیوی کے پاس رات کے باقی گھنٹے گزارے۔ صبح کو وہی انگشتری پانچ روپے میں فروخت کر کے ایک ساڑی اور بلاؤز خریدی اور آپ کو خط لکھ کر مراد آباد روانہ ہو گئی۔ ان دنوں وہاں وہی سول سرجن صاحب تھے جن کو مرحوم کی بیماری میں میں نے امروہہ بلایا تھا چونکہ وہ کہہ آئے تھے کہ "میرے گھر آنا"۔ پس اس وقت اتنا ہی سہارا میرے لیے کافی تھا چونکہ وہ بالکل میری پہلی حیثیت سے ناواقف اور میرے ہمدرد تھے۔ اس واسطے ان سے مدد مانگتے مجھے شرم نہ آئی۔ وہاں پہنچی تو اُن کی رحم دل بیوی نے مجھ سے بہت ہمدردی کی۔ میں ان سے صرف یہ مشورہ لینا چاہتی تھی کہ مجھے کون سا کام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ روپیہ میرے پاس تھا۔ میں یہ بتانا بھول گئی کہ روپیہ کہاں سے آیا؟

ابا جان آپ کے گھر سے رخصت ہونے سے ایک روز پیشتر خالو اور خالہ جان بھائی اختر و نجم کے مجھ سے آخری بار ملنے بیگم صاحبہ سے پوشیدہ ہمارے پائیں باغ میں رات کے ۱۱ بجے گئے تھے اور ایک منی بیگ اور چند زیورات مجھے دے آئے تھے۔ میں ہر چند لینا نہ چاہتی تھی مگر انہوں نے نہ مانا۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ یہ خوب صورت منی بیگ ہی خالو جان دے گئے ہیں۔ اُن کے جانے کے بعد جب آنٹی ایلس نے کھولا تو اس میں سے پانچ سو روپے کے پونڈ نکلے اس کے بعد مجھے موقع نہ ملا کہ آپ سے اس کا ذکر کرتی۔ وہ سب چیزیں آنٹی اپنے بکس میں رکھ کر کانپور لے گئیں اور وہاں سے واپسی کے وقت انہوں نے وہ چیزیں ڈاک خانے میں رکھ دیں جو میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔ ورنہ وہ بھی میرے دیگر اسباب کے ساتھ لٹ جاتا۔ بس کانپور سے مراد آباد چلتے وقت وہ پانچ سو روپیہ میں نے ہمراہ لے لیا تھا۔ مراد آباد پہنچی تو سول سرجن صاحب نے ڈاکٹری پڑھنے کی صلاح

دی لیکن اُن کی بیوی نے کہا "تم اب اعلیٰ تعلیم حاصل کرو۔ ہاسپٹل اسسٹنٹی اچھی نہیں اور ولایت جا کر ڈاکٹری پڑھنے کے قابل تمہاری تعلیم نہیں اگر پہلے انڈیا میں ایف اے تک پڑھو اور پھر ڈاکٹری کے لیے ولایت جاؤ تو اُس کے لیے بہت عرصہ درکار ہے۔ دوسرے یقیناً تمہارے لیے یہ مشکل ہوگا۔"

اُن کی یہ رائے بہت ٹھیک تھی۔ میں نے ڈاکٹری کا خیال نہ کیا اور اعلیٰ تعلیم اپنے لئے ضروری سمجھی۔ ابا جان اگر چہ دل ٹوٹا ہوا اور ہمت پست تھی لیکن ایسا نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟ خدا کا نام لے کر کالج میں داخل ہوگئی اور دو سال بعد ایف اے کے امتحان میں کامیاب ہوئی۔ اب میرے پاس روپیہ بھی ختم تھا لیکن خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے یہ سامان بنا دیا کہ اس دو سال کے عرصے میں یہی صاحب خانہ میری ہمدردی مس گھوش صاحب مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھیں۔ کیوں کہ یہ میری ہم جماعت تھیں۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں بی اے تک پڑھنا چاہتی ہوں اور روپیہ ہے نہیں تو انہوں نے اپنے والد مسٹر گھوش صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا کلکتہ سے میرا وظیفہ مقرر کرانا چاہا جو میں نے منظور نہ کیا اور ان سے کہا کہ ابھی میرے پاس زیورات ہیں۔ ان کو فروخت کر کے گزارا کرلوں گی تب انہوں نے مجھے زیور فروخت کرنے سے روکا اور پندرہ روپیہ ماہوار بطور قرض دینا شروع کیا اور خدا کی مہربانی یہ ہوئی کہ دس روپیہ ماہوار سرکار سے وظیفہ مقرر ہوگیا۔ میرے لیے یہ بہت تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نہ یہاں کامیابی سے آپ کی کنیز نے بی اے پاس کرلیا اور خوش قسمتی دیکھیے کہ کالج سے نکلتے ہی کام بھی مل گیا۔ وہ اس طرح کہ مس گھوش صاحب کے چچا مسٹر زیندرا ناتھ گھوش اسنٹنٹ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تھے۔ ان کی کوشش سے فوراً ہی زنانہ مدارس کی انسپکٹری کا کام مل گیا۔ یہ دوسرا مہینہ ہے مجھے اس عہدے پر کام کرتے۔

ابا جان میں اگر مس گھوش کی شکر گزار نہ ہوں تو خدا کی بھی شکر گزار نہ ہوں گی۔ کام تو خدا کرتا ہے مگر وسیلہ بھی چاہیے۔ مسٹر زیندر ناتھ گھوش نے اپنی بھتیجی کے برابر ہی میرے لئے کوشش کی۔ فی الحال سوشیلا گھوش صاحبہ اور میں ایک ہی ضلع کے اسکولز کی انسپکٹری پر لگائی گئی ہیں۔ آئندہ ترقی ہمارے نصیبوں پر منحصر ہے۔

وکیل صاحب جب بیٹی کی تقریر سن چکے تو اُسے سینے سے لگا کر بے اختیار رونے

لگے۔ مس سوشیلا گھوش جو دروازے کے قریب کھڑی اُن کی حالت دیکھ رہی تھیں۔ اندر آ گئیں اور اُن سے کہا۔

سوشیلا: اب آپ خوشی کریں۔ یہ رنج کا موقع نہیں ہے۔ خدا نے آپ دونوں کو ملا دیا۔

مسٹر رفیق: میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ کی ہی ہمدردی و مدد سے میری بے کس لڑکی نے اس قدر ترقی کی۔ میں آپ کا تا قیامت احسان مند رہوں گا۔

سوشیلا: آپ مجھے ایسے الفاظ کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔ میں غریب کیا اور میری امداد کیا؟ یہ سب اُن کی اعلیٰ ہمتی، روشن دماغی، خوش خلقی و سخت محنت کا نتیجہ ہے۔ اچھا بتائیں کہ اب میں انہیں کیا کہہ کر بلاؤں؟

اختر: میرا نام، ستارا تو صرف ایامِ مصیبت کے لئے تھا۔ ابا جان صرف اس غرض سے میں نے اپنا نام بدلا تھا کہ اختر النساء مشہور ہونے سے سب پہچان لیں گے کہ میں ہندوستانی مسلمان لڑکی ہوں اور مجھے یہ بات اس لئے پسند نہ تھی کہ ایک مسلمان لڑکی کا آزادانہ طریق سے تعلیم پانا ہماری قوم کی نظروں میں کھٹکے گا اور معیوب سمجھ کر عوام کی نظریں مجھ پر پڑیں گی اور میں تماشا بن جاؤں گی۔ لوگ ہزاروں باتیں بنائیں گے اور تو علیحدہ رہے۔ قومی اخبارات ہی لعن طعن کر کے کچھ کا کچھ لکھیں گے۔ اس خیال سے بجائے اختر کے ستارا نام ظاہر کیا کہ پارسی لڑکی سمجھ کر کسی کو حرف گیری کا موقع نہ ملے گا۔

ابا جان مجھے سخت رنج تھا کہ اپنا قومی لباس و نام کیا، قومیت کو چھوڑ کر علم حاصل کرنے کو دوسری وضع اختیار کی، مگر کیا کرتی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا؟ تاہم میں نے اپنی اصلیت اپنی خیر خواہ بہن سوشیلا پر ظاہر کر دی تھی کیوں کہ مجھے اُمید تھی اور میرا کانشنس کہتا تھا کہ میں اپنے پیارے ابا سے ضرور ملوں گی اور آئندہ زندگی انہیں کے زیر سایہ بسر ہوگی۔ یہ اخفا تو تھوڑے عرصے کے لیے ہے سو خدا کا شکر ہے کہ میری امید بر آئی۔

سوشیلا: میری قابلِ قدر پیاری مس احمد آج سے میں آپ کو آپ کے اصلی نام اختر سے یاد کیا کروں گی اور میں سچے دل سے منزلِ مقصود پر پہنچنے کی مبارک باد دیتی ہوں۔

مسٹر رفیق: میں آپ کی مبارک باد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ کیسی اچھی رات

ہے جس کی مجھے امید نہ تھی ۔ میری اختر نے بہت ہی اچھا کیا کہ پہلی ملاقات میں اپنے بد نصیب باپ کو خوش کر دیا۔

اختر: اباجان خدا جانتا ہے تین گھنٹے بھی نہایت ضبط سے گزارے تھے۔ جونہی آپ کمرے میں تشریف لائے تھے بے اختیار دل چاہتا تھا کہ قدموں سے لپٹ جاؤں۔ چونکہ خالہ جان کے داماد ڈاکٹر خورشید وتجمل اس جگہ موجود تھے۔ اس واسطے دل پر جبر کیے رہی۔

مسٹر رفیق: بیٹی میں خود حیران تھا کہ میرا دل تمہاری طرف کیوں کھنچا جاتا ہے میں صرف اپنی اختر کی ہم شکل ہونے کو اس کا سبب سمجھتا تھا۔

انہیں راتوں میں رات کے باقی گھنٹے تمام ہوئے۔ اس اثناء میں اختر لاج کا ملازم دو بار وکیل صاحب کے بلانے کو آیا لیکن سوشیلا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "وکیل صاحب سو رہے۔ صبح آئیں گے۔

صبح چھ بجے وکیل صاحب مع بیٹی کے اختر لاج پہنچے اور سب عزیزوں سے اختر کو ملایا۔ ناظرین وہ وقت کیسا ہوگا۔ جب اختر اُن سے ملی ہوگی۔

☆

تیئسواں باب

اختر النساء رفیق احمد بی اے

آنریری سپرنٹنڈنٹ زنانہ نارمل اسکول علی گڑھ

رہتا ہے دائم اس سے سرسبز باغِ ہستی
ہے بہر مزرعِ عمر ابرِ بہار نیکی

اختر حسن بیرسٹر: پیاری بہن آپ کو اختر بن کر ہم سے ملے آج تیسرا دن ہے مگر افسوس کہ آپ نے اب تک اپنے گزشتہ پنج سالہ حالات میں سے ایک بات بھی ہمیں نہیں بتائی۔ اپنے ابا جان کو تو اسی شب سب کچھ سنا چکی ہوں گی اور اب بھی وقتاً فوقتاً اُن کو پچھلا ذکر سناتی رہتی ہیں۔ پھر ہم غیر ہی سمجھے گئے ناں؟

اختر: میں نے آپ سے ذکر کرنا ایسا ضروری نہ سمجھا تھا۔ دوسرے یہ کہ وقت بھی نہیں ملا۔ پرسوں کا تمام دن تو آپ سے ملنے ملانے میں ہی گزر گیا اور کل مس سوشیلا کی سالگرہ کی تقریب میں رہی۔ اپنی پنج سالہ لائف آپ کو کس وقت سناتی؟

اختر حسن: اچھا میرے شکایتی الفاظ واپس دیں اور اس وقت کچھ ذکر کریں۔

اختر: (ہنس کر) کیا آپکو میری لائف لکھنی ہے؟ جو اس قدر ضروری جان

کر حالات معلوم کرتے ہیں؟

اختر حسن: آپ تو مذاق میں ٹالنا چاہتی ہیں اور میں ضرور سننا چاہتا ہوں۔

اختر: ۔

سر گزشتِ بلا کشاں نہ سنو

نہ سنو میری داستاں نہ سنو

اختر حسن: نہیں میں ضرور سنوں گا۔

اختر: آپ تو سخت مجبور کرتے ہیں۔ میں کیا سناؤں اور کہاں سے شروع کردوں؟

اختر حسن: پہلے یہ بتائیں کہ مرحوم ظفر کتنا عرصہ زندہ رہا؟

اختر: آپ کو یہ نام کس طرح معلوم ہوا؟

اختر حسن: مجھے آنٹی ایلس نے لندن میں بتایا تھا۔

اختر: میری آنٹی اب کہاں ہیں؟ مجھے تو پانچ سال سے کچھ خبر نہیں؟

اختر حسن: وہ آج کل نیویارک میں ہیں۔ آپ نے اُن سے بھی خط وکتابت نہ رکھی۔ ہم لوگ تو بھلا اس قابل نہ رہے تھے۔

اختر: آپ میرے ساتھ ایسے الفاظ کا استعمال نہ کریں۔ میں غریب خود ہی کسی قابل نہ رہی تھی۔ آنٹی سے خط وکتابت کس طرح جاری رکھ سکتی تھی جب کہ مصلحتاً اپنا نام بھی تبدیل کرلیا تھا۔

اختر حسن: اُن کو بھی اس امر سے آگاہ کردیتیں۔

اختر: اس میں بھی قباحت تھی اور ایسا کرتی ہی کیوں؟ جب کہ اپنے ابا جان وخالہ جان ہی سے خط وکتابت نہ تھی تو اُن سے کیوں رکھتی؟

اختر حسن: آپ بڑی سنگدل ہیں۔ کس طرح سب کو صبر کرلیا۔

اختر: بے شک میرا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ میرے برابر طاقتِ برداشت اور کسی میں نہ ہوگی۔ تب ہی تو کہتی ہوں کہ میری سر گزشت نہ سنو۔

نہیں طاقت کسی میں سن سکے جو داستاں میری
جگر پتھر کا کر لے، جو سنے آہ و فغاں میری

اختر حسن: معاف کیجئے۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ اس وقت جانے دیں۔ پھر کبھی سہی۔ میں آپ کے بھولے ہوئے رنج کو تازہ نہیں کرتا۔ ہاں کل آپ نے اپنی دوست سوشیلا کو سالگرہ کے تحفے میں کیا دیا؟

اختر: مرصع کڑوں کی جوڑی۔

اختر حسن: آپ نے اپنے کڑے دے دیئے یا اور خریدے تھے؟

اختر: میرے پاس کڑے تو نہ تھے۔

اختر حسن: کل جس وقت آپ سالگرہ میں گئی تھیں۔ اس وقت تو آپ کڑے پہنے ہوئے تھیں۔

اختر: ہاں وہ کڑے کل صبح ہی ابا جان نے خریدے تھے۔ چونکہ مجھے سوشیلا کو تحفہ دینا تھا ابا جان دو جوڑیاں لے آئے۔ ایک تو میں اُن کے لئے لے گئی اور دوسرے ابا اور نجم کے اصرار سے مجھے پہننے پڑے۔

اختر حسن: بہت گراں ملے ہوں گے؟ کلکتہ میں ہر شے مہنگی ملتی ہے اور زیورات کی قیمت کی تو انتہا ہی نہیں۔

اختر: ابا جان کہتے ہیں کہ ایک ہزار روپیہ چار کڑوں کی قیمت دی ہے۔

اختر حسن: اس قدر قیمتی چیز آپ نے معمولی تحفے میں کیوں دی؟

اختر: ان کے بے انتہا احسانات کے عوض میں یہ پانچ سو روپیہ کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔

اختر حسن: آپ کچھ روپیہ بھی تو لے گئی تھیں؟

اختر: ہاں وہ تو قرضہ ادا کرنا تھا۔ اخراجات تعلیم کے لیے مجھے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ آپ سن چکے ہیں کہ میرے جہیز کا کل سامان تلف ہو چکا تھا اور خالو جان کا دیا ہوا روپیہ بھی صرف کر چکی تھی۔ اس وقت اس نیک دل لیڈی نے مجھے بڑی مدد دی اور پندرہ روپے ماہوار برابر دو سال تک دیتی رہی۔ چنانچہ وہ تین سو ساٹھ روپیہ قرضہ ادا کرنے

کو میں روپیہ ساتھ لے گئی تھی۔

اختر حسن: خدا اس نیک مسز لیڈی کو جزائے خیر دے جس نے اس بے کسی کی حالت میں آپ کی مدد کی مگر انہوں نے خوشی سے کڑے لے لیے؟

اختر: نہیں وہ تو سخت جھگڑا کرتی رہی۔ اوّل تو میں نے تحائف کی میز پر رکھ دیئے۔ جب مہمان چلے گئے اور ہم وہ چیزیں دیکھنے لگے تو سوشیلا نے دیکھتے ہی کڑے مجھے واپس کئے اور بہت کچھ کہا۔ بمشکل تمام میں نے دیئے۔

اختر حسن: آپ نے اپنے ہاتھوں سے کیوں اتار ڈالے۔ ہم نے تو ابھی دیکھے بھی نہیں۔

اختر: میں اس قسم کی نمائشی چیزیں پسند نہیں کرتی اور نہ میری حالت کو زیبا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں میں نے لباس میں کس قدر سادہ پن رکھا ہے۔

اختر حسن: تب ہی تو ہمیں افسوس ہوتا ہے۔ آپ اب وہ اختر ہی معلوم نہیں ہوتیں۔ آپ کو دیکھ کر سب ہی مشکوک ہوئے لیکن مجھے اس قدر شبہ نہ ہوتا تھا کیوں کہ آپ کی حالت میں پہلے سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ کا چہرہ بالکل زرد ہے۔ ابا جان سے مل گئیں۔ آپ کا گھر ہمیشہ کے لیے ان بلاؤں سے پاک وصاف ہوگیا۔ اب رنج کس بات کا؟

اختر: آپ تین سال انگلینڈ رہ کر ہندوستانی رسم ورواج کو بالکل بھول گئے لیکن مجھے تو اس آوارہ گردی میں بھی سب کچھ یاد ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ ہندوستانی بیوائیں کس حالات میں زندگی بسر کرتی ہیں؟

اختر حسن: یہ درست مگر آپ تو تعلیم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اپنے خاندان بلکہ اپنے صوبے میں پہلی مسلمان بی اے لیڈی ہیں۔ ان وحشیانہ وجاہلانہ رسومات

اختر: اب کل سہی

اختر حسن: نہیں اس وقت

اختر حسن نے گھنٹی کے ذریعے اپنی ملازمہ سندری کو بلا کر زیورات کا بکس منگایا اور مسز تجمل کو بھی بلوالیا۔ ان دونوں بہن بھائی نے اختر کو وہ سب چیزیں مالا، گلو بند، ستلوا

وغیرہ پہنادیں۔ اب چائے کا وقت تھا۔ گھنٹی کی آواز پر تینوں چائے پر چلے گئے۔ وہاں سب موجود تھے۔ مسز وقار و وکیل صاحب اختر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اسی طرح نہایت خوشی وخرمی سے عزیزوں کی یکجائی میں دن گذرتے رہے۔ کیوں کہ مسٹر اختر حسن بی اے بیرسٹر ایٹ لاء کے بے حد اصرار سے انہیں کے ہاں مہمان رہے۔ ڈاکٹر جمل صاحب تو اپنی جائے ملازمت پر بعد اختتام رخصت چلے گئے لیکن مسٹر و مسز وقار احمد اور مسٹر و مسز خورشید اور مسٹر و بنت رفیق احمد صاحبان ایک برس یہیں رہے۔ کیوں کہ بنت رفیق احمد صاحبہ بی اے انسپکٹرس آف سکولز مستقل طور پر کلکتہ آ گئی تھیں۔ وکیل صاحب اور ڈاکٹر خورشید زمان صاحب ہر چند علیحدہ مکان لینا چاہتے تھے۔ مگر بیرسٹر صاحب نے ایک نہ مانی غرض کہ نہایت مسرت وانبساط کے ساتھ اختر لاج میں ہی ایک سال گزر گیا۔ اس کے بعد اختر رفیق احمد صاحبہ نے استعفیٰ دے دیا اور میرٹھ جانے لگے تو بیرسٹر صاحب نے ایک نہایت شاندار پرتکلف الوداعی ڈنر دیا جس میں تقریباً دوسو معزز لیڈیز و جنٹلمین مدعو کئے گئے تھے۔ پھر وکیل صاحب مع اپنی لائق فائق صاحبزادی کے میرٹھ روانہ ہو گئے۔

میرٹھ پہنچ کر پہلے تو انہوں نے اپنی جائداد دو کوٹھیوں کا بندوبست کیا۔ پھر قومی خدمت انجام دینے کی غرض سے علی گڑھ گئے اور محمڈن کالج کے آنریری سکریٹری صاحب کی خدمت میں آنریری طور پر قومی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کردی جو نہایت عزت و قدر کے ساتھ منظور ہوئی۔ کالج کا کوئی کام وکیل صاحب کے سپرد ہوا اور زنانہ نارمل اسکول کی آنریری سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ جناب اختر النساء رفیق احمد صاحبہ بی اے کو ملا جس کو وہ نہایت دلی توجہ سے انجام دینے لگیں۔ اُن کی بے انتہا عزت وقدر نہ صرف علی گڑھ ہی میں ہوئی بلکہ تمام قوم کے دل میں اُن کی مردانہ ہمت و اعلیٰ قابلیت و قومی ہمدردی کی قدر تھی۔

اختر النساء صرف نام ہی کو اختر النساء نہ تھی بلکہ دراصل اختر نسوانِ ہند ثابت ہوئی۔

ناظرین! یہ ہے تعلیم نسواں کا نتیجہ۔ اختر النساء نے کیا کیا دقتیں برداشت کیں۔ کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں اور کس بے بسی و بیکسی حالت میں ہندوستانی رسم ورواج کا لحاظ رکھ کر کس کوشش ومحنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس سے خود فائدہ بھی اٹھایا۔ معزز سرکاری ملازمت ترک کر کے قومی خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کردی اور نہایت قدر ومنزلت کی

حالت میں عمر بیوگی بسر کی۔ ورنہ ہندوستانی بیواؤں کی قابلِ رحم حالت سے کون واقف نہیں؟ بڑی بڑی مالدار عورتیں شوہر کے انتقال کے بعد دوسروں کو دستگیر اور سب کی نظروں میں حقیر اور ٹکڑے کو محتاج ہو جاتی ہیں اور اختر بیچاری تو ایک نہایت مفلس و نادار شخص کی بیوہ تھی۔ اگر چار حرف نہ پڑھے ہوئے ہوتے تو اس کا بھی نہایت خراب حال ہوتا۔ چرخہ کات کر یا ماما گیری کر کے بسر اوقات کرنی پڑتی مگر چونکہ تعلیم یافتہ تھی۔ کس سے کس درجے کو پہنچ گئی۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تمام بیوائیں اسی طرح تعلیم پا کر ترقی حاصل کریں کیوں کہ یہ ناممکن سی بات ہے۔ اتفاق زمانہ سے ایک لڑکی کو ایسے اسباب پیش آگئے جن سے وہ بتدریج کوششیں کرتی ہوئی اپنی مرضی کے موافق ایک حد تک پہنچ گئی۔ سب کے لیے ایسا ہو جانا ناممکن امر ہے۔ تاہم تعلیم سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہی دیکھیں۔ بعض غریب یا بیوہ لڑکیاں صرف قرآن شریف بغیر ترجمہ کے پڑھی ہوتی ہیں جن سے ایسی مصیبت کے وقت بہت فائدہ اُٹھاتی ہیں۔ محلے کی کچھ لڑکیوں کو پڑھانا شروع کر کے روٹی کا ذریعہ بنا لیتی ہیں۔ غرض کہ بلا تعلیم اس زمانے میں گزارہ مشکل ہے اور اس کے بغیر ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

اگر بہتری قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ تمام قوم سنبھل گئی کیوں کہ بے علم معراج ترقی پر پہنچنا ناممکن، خواہ آپ کتنا ہی علم حاصل کر لیں۔ کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ جب تک کہ دُنیا میں اپنی سب سے پہلی رہنما عورتوں کو جن کی گود تمام قوم کا ابتدائی اسکول ہے۔ چشمۂ علم سے سیراب نہ کریں گے کیوں کہ تمام نیک کاموں اور تمام درجات ترقی کی بنیاد علم ہے۔ علم حاصل کیا تو سمجھو سب کچھ پایا۔

رہتا ہے اس سے دایم سرسبز باغ ہستی
ہے بیر مزرع عمر ابد بہار نیکی

☆☆☆

حرماں نصیب

دُکھیا

کیا اب تو نہیں آئے گا؟ صبح سے شام اور شام سے رات۔ سینکڑوں دن اسی طرح گزر گئے۔ مگر اے اچانک چلے جانے والے نہ صبح کی روشنی ہی تجھے میرے پاس لائی اور نہ رات کی تاریکی!

صبح کو پرندوں کی معصوم آواز میرے مایوس انتظار جسم میں اُمید کی ایک نئی لہر دوڑا دیتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاید تو آنے والا ہے اور پرندے تیرے ہی انتظار میں استقبال کے گیت گا رہے ہیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ گانے لگتی ہوں۔ مگر آہ دوپہر میں شگفتہ ہو کر آخر مرجھا جاتی ہوں۔ دن میری طرح مایوس ہو کر دم توڑ دیتا ہے اور تو نہیں آتا۔

شام کو تو بڑے چھوٹے سب ہی دن بھر کی مصروفیت کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں بچے مدرسوں سے اُچھلتے کودتے۔ بڑے اپنے اپنے کاموں سے اطمینان اور فراغت کے سانس لیتے ہیں۔ مگر او میرے ننھے سے دل والے معصوم تو ایسے کس کام میں مصروف ہو گیا کہ تجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ تیری منتظر رات کی پریشان گھڑیاں تارے گن گن کر گزار رہی ہے؟

اے جان سے زیادہ پیارے۔ اب میں اس دُنیا میں تنہا ہوں۔ میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔ مجھے کوئی اطمینان کی گھڑی نصیب نہیں۔ میری تو شیریں ساعتیں وہیں تک تھیں جب تو میری آنکھوں کے سامنے رہا کرتا تھا اور میرا تخیل تیرے متعلق اُمیدوں کے ایک پھول کی پنکھڑیوں کی سی نازک دُنیا کی تعمیر میں مصروف رہتا تھا۔

ہائے تو اچانک بستر علالت پر سے مجھ سے جدا کر دیا گیا اور کوئی نہیں بتاتا کہ تو

پھر مجھ سے ملے گا بھی یا نہیں۔ میں سب سے پوچھتی ہوں کہ تو آخر کب واپس آئے گا۔ وہ اس کا کچھ جواب نہیں دیتے۔ مسکراتے ہیں اور مجھے حیرت سے دیکھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ٹھہر کر میری التجا دل کے کانوں سے سن لیتا ہے تو اس کی آنکھیں آبگوں ہو جاتی ہیں اور جب وہ مجھے افسوس سے کہتا ہے کہ اب تو نہ آئے گا تو میں چاہتی ہوں کہ اس خاکی جسم کا بوجھ اُتار کر اپنی رُوح کو تیری تلاش میں آوارہ کر دوں۔

اے دُنیا میں سب سے پیارے تیری محبت کا جوش سرد کیوں پڑ گیا۔ کیا میری کانپتی ہوئی آواز درد تیرے نرم و نازک دل کی خدمت میں میری بے چینی کا اظہار کرنے کے قابل نہیں ہے تو مجھ کو اس سنسان دُنیا میں چھوڑ کر تنہا کس طرح آرام کر رہا ہے۔ یہ جدائی کی ساعتیں جو میری برداشت سے باہر ہیں تو کہاں گزار رہا ہے۔ اگر میں سمجھتی ہوں کہ تیرا وہاں کا آرام مکمل ہے اور میری بے تابیوں کی ٹوٹی پھوٹی صدائیں نارسا تو پھر تو مجھے بھی اپنے قریب ہی بلالے کہ اب اس زندگی کا بار میری برداشت سے بہت زیادہ ہے۔

دُور آبادی سے میلوں کے فاصلے پر سیاہ پہاڑیوں کے سنسان اور ویران دامن میں ایک پتھر کی ننھی سی جھونپڑی ہے۔ جس کے قریب ہی ایک خانقاہ کھڑی ہے۔ اس جھونپڑی میں ایک نوجوان عورت رہتی ہے۔ جس کے متوحش و متجسس دل کے مایوسانہ خیالات سے ناظرین شروع ہی میں آگاہ ہو چکے۔ جنہیں ابھی ابھی وہ عالمِ تنہائی میں ایک پرانے پیپل کے نیچے بیٹھی بڑبڑا رہی تھی چونکہ یہ خانقاہ شہر سے بہت فاصلے پر ہے۔ اس لئے خوش عقیدت لوگ بھی اس طرف بہت کم آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مہینے میں ایک دو جمعراتوں کو جو چند لوگ نذر چڑھانے یا زیارت کرنے کو آجاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ عورت دراصل انسان نہیں کوئی پریشان رُوح ہے۔ کیوں کہ لق و دق میدان میں ایک کم عمر عورت کا اس طرح تنہا اور بے یار مددگار رہنا ممکن معلوم نہیں ہوتا۔

خانقاہ کے مجاور سے بھی جہاں تک پوچھا گیا یہی پتہ چلا کہ تھوڑے ہی عرصے سے وہ اس کو اس جھونپڑے میں دیکھ رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی دیوانوں کی طرح بھٹکتی بھٹکاتی خانقاہ پر بھی آجایا کرتی ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے مجاور کو اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا جس سے اُس کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ ضرور کوئی مغموم روح ہے۔

ایک عرصہ گزرا اسی پتھر کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک ہندو سادھو رہا کرتا تھا مگر جب سے اُس کا انتقال ہوا جھونپڑی خالی اور ویران پڑی تھی جس کو اب اس حسین روح نے پھر آباد کر دیا تھا۔

قریب ظہر وہ اندر سے نکلی۔ کچھ دیر جھونپڑی کے آگے کھڑی رہی۔ پھر پیپل کے نیچے آ بیٹھی اور اپنی دھن میں دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ پھر اُٹھی قریب ہی ایک چشمہ تھا۔ اس پر وضو کیا اور نماز کے لئے پھر اندر چلی گئی۔ معلوم ہوتا ہے یہ روح مسلمان ہے۔

ایک گھنٹہ گزرنے کےبعد دروازہ پھر آہستہ سے کھلا۔ وہ باہر آئی، ایک سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ پریشان قدم اُٹھاتی ہوئی خانقاہ کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار ایسی تھی جیسے کوئی ہرنی جنگل میں رستہ بھول کر بھٹکتی پھر رہی ہو۔ خانقاہ کے باہر مجاور بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ گو وہ عین اس کے سامنے تھا مگر وہ گردوپیش کی تمام چیزوں سے بے خبر تھی وہ اپنی دُھن میں سیدھی مزار پر چلی گئی۔ فاتحہ پڑھی اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے واپس جا رہی تھی کہ مجاور اُس کی محویت میں مخل ہوا اور بولا:

"بی بی ذرا ایک بات سنتی جاؤ۔"

سیاہ پوش عورت یوں ٹھٹکی گویا قریب سے دفعتاً کسی بندوق کی گولی گزر گئی۔ اس نے مجاور کو دیکھا اور مُردہ آواز سے کہا:

"کیا ہے بابا؟"

مجاور: تمہیں اس سامنے کی کٹیا میں رہتے رہتے عرصہ گزر گیا مگر آج تک مجھے کچھ معلوم نہ ہوا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو، کیوں آئی ہو اور کب تک رہو گی؟

مجاور ایک لحہ کو خاموش ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ جواب دے گی۔ لیکن جب وہ ایک بت کی طرح ساکت و خاموش رہی تو اُس نے کھنکار کر کہا: "لوگ یہ خیال کرتے لگے ہیں کہ تم انسان نہیں بلکہ کوئی جن بھوت یا کسی عجیب و غریب مخلوق سے ہو۔ تمہاری وجہ سے میرا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ ایک تو یونہی شہر سے کوسوں دُور ہونے کی وجہ سے لوگ بہت کم آتے تھے۔ کوڑھ پہ کھاج تم آگئیں۔ جب سے تم نے یہاں بسیرا کیا ہے۔ صرف تمہارے خوف کی وجہ سے کوئی بھی اِدھر کا رُخ نہیں کرتا۔ بچوں والی عورتوں ہی کی نذر نیاز سے ہمارے

پیٹ کو ہور ہتا تھا۔ وہ اب ادھر آنے سے کانوں پر ہاتھ دھرتی ہیں۔ سواز برائے خدا کوئی تدبیر ایسی کرو کہ میں بھوکا نہ مروں اگر رہنا ہی ہے تو اپنا حال بتاؤ کہ میں سب کا اطمینان کردوں۔"

عورت خاموشی سے زمین پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کی نظر سامنے اپنی جھونپڑی پر تھی۔ وہ بولی:

"بابا۔ اب میرے لئے زمین کے اس ویران اور غیر آباد حصے پر بھی جگہ نہ رہی۔ اچھا ذرا صبر کرو۔ مَیں نے آج خدا کے سامنے اپنے پیارے سے التجا کی ہے کہ مجھے اپنے پاس بلالے۔ یقیناً وہ مجھے بہت جلدی بلالے گا۔" اور عورت کا چہرہ یکا یک یوں چمکنے لگا جیسے آفتاب بادلوں کے نقاب میں سے چہرہ نکال کر مسکرا دیتا ہے۔

مجاور: کون تمہارا پیارا؟ اگر تم سچ مچ انسان ہو تو بہت ہی غمزدہ معلوم ہوتی ہو کہ حواس تک بجا نہیں مگر مجھے اپنا مفصل حال بتاؤ۔ شاید میں تمہاری مدد کرسکوں۔

عورت کے چہرے پر پھر غم و الم کے بادل گھر آئے۔ اُس نے رُک کر ایک آہ بھری اور آہستہ سے کہا:

"میری مدد کسی کے بس کی نہیں۔ دُنیا والوں کے ہاتھوں پریشان ہو کر میں اس اُجاڑ مقام پر چلی آئی تھی۔ اب تمہیں بھی میرا رہنا دوبھر ہو گیا۔ اچھا تم کل تک اور ٹھہرو کل میں ضرور آسمان پر چلی جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر لڑکی نے جواب کا انتظار نہ کیا۔ کھڑی ہو گئی اور تیز قدم اُٹھاتی ہوئی کٹیا کو چل دی۔ متحیر و متعجب فقیر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی دہشت اور بڑھ گئی اور اسے یقین ہو گیا ہے کہ انسان نہیں بلکہ کسی اور قسم کی مخلوق ہے۔

آج نوچندی جمعرات تھی۔ شہر سے کچھ مزدوری پیشہ لوگ منتیں چڑھانے آنے لگے۔ انہیں دیکھ کر مجاور فقیر کی جان میں جان آئی اور اس پُراسرار لڑکی کے خیالات فراموش ہوئے۔ تھوڑی سی دیر بعد ایک قیمتی فٹن کی تیز رفتار جوڑی کی آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ غریب مجاور کے لئے بہت ہی نادر موقع تھا کہ کوئی رئیس اس طرف بھول پڑے۔ فٹن خانقاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ مجاور جلدی سے اُٹھا تیزی سے گاڑی کے قریب لپکا اور عاجزی اور مسکینی کی تصویر بن کر سواروں کو سلام کیا۔

کوچمین: دروازہ کھولو۔ سرکار فاتحہ پڑھنے اندر تشریف لے جائیں گے۔

یہ سن کر فقیر کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا اور دل انعام کی توقع سے دھک دھک کرنے لگا۔ اتنے ہی میں گاڑی سے دو امیر کبیر شخص اُترے ان میں سے ایک تو پرانے فیشن کا سن رسیدہ شخص تھا اور دوسرا باغ شباب کا شگفتہ پھول۔ نوجوان ایک بادامی ریشمی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی اور عینک لگائے ہوئے تھا۔ گاڑی سے اُتر کر وہ رومال سے پسینہ خشک کرتا ہوا ذرا تیزی سے مزار کی طرف بڑھا۔ بڑے صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو بھئی ذری ٹھہرو۔ پہلے یہ نذرانہ (بٹوے سے چند اشرفیاں نکال کر) لے لو۔ پھر اندر چلنا۔

نوجوان جنٹلمین کی پیشانی پر کسی قدر بیزاری کی شکنیں پڑ گئیں مگر جلدی ہی دُور ہو گئیں۔ اس نے ایک حقارت انگیز تبسم سے کہا: ''ابا جان انہیں تو آپ ہی لیتے چلیے۔''

باپ کے ماتھے پر غصے کے بل پڑ گئے اور کرخت لہجے میں کہا:

''تو نے بھی یہ پر پُرزے نکال لیے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جیسے صاحبزادہ ظفر صاحب نہ آئے کہ شرک ہے ویسے ہی اب تیرے دماغ میں بھی کیڑے پڑنے لگے۔ ارے بے دینو۔ ملعونو۔ تم نے مذہب کو کھو دیا اور پھر اس خیال سے کہ شاید مجاور تک آواز پہنچ رہی ہو ذرا مدھم پڑ گئے اور بولے'' ہم اپنی اپنے ہاتھ سے چڑھائیں گے مگر یہ اشرفیاں ظفر کی والدہ نے ظفر کے ہاتھ سے چڑھانے کی مانی تھیں۔ اُس مرتد نے یہاں آنے میں کسرِ شان سمجھی۔ تو اب اُن کی تاکید ہے کہ انہیں تم خود پیش کرو۔''

نوجوان نے چار و ناچار اشرفیاں لے لیں دونوں گھسے اور چڑھاوے چڑھائے۔ نوجوان تو باہر نکل آیا اور اطمینان کا سانس لے کر چاروں طرف کے منظر کو دیکھنے لگا مگر والد صاحب اتنی دیر تک مراقبہ میں رہے کہ نوجوان تھک گیا اور اسے فکر ہوئی کہ کہیں وہ اسی حالت میں سو نہ گئے ہوں۔ وہ گھبرا گھبرا کر اندر دیکھتا تھا۔ اور بے چینی سے اپنی چھڑی زمین پر مار رہا تھا کہ قبلہ و کعبہ نہایت عقیدت مندانہ طریق پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے برآمد ہوئے۔ دل کے سخی تھے۔ چنانچہ ایک اشرفی مجاور کو انعام دی۔ کوچوان گاڑی بڑھا کر سامنے آیا اور دونوں سوار ہو گئے۔ گھوڑے آہستہ آہستہ بڑھے۔ جوں ہی فٹن اس کٹیا کے سامنے سے گزرنے لگی۔ بڑے صاحب نے کوچبین کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔

جنٹلمین نے باپ کے منہ کی طرف حیرانی سے دیکھ کر کہا: ''اب یہاں کیا کیجئے گا؟''

ابا جان: تم نہیں جانتے اس جھونپڑے میں بھی ایک خدا کا پیارا رہتا ہے۔ مدت کی بات ہے۔ تم ابھی بچے ہی تھے کہ میں اُن سے آخری بار ملا تھا۔ اب تو اس بات کو تقریباً ۱۵ سال کا عرصہ آیا کہ آج ادھر آیا ہوں۔ اب لگے ہاتھ اس خدا پرست سے بھی ملتا چلوں۔

جنٹلمین: تو سائیس کو بھیج کر یہیں بلوا لیجئے۔

ابا جان: انگریزی پڑھ کر نہ معلوم تم نالائقوں کا مزاج کون سے آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ ابھی کسی انگریز کی کوٹھی ہوتی تو کس فخر سے ملنے جاتے مگر ایک نیک بزرگ سے ملنے کے لئے دو قدم چلنے کے لئے دم نکلتا ہے۔ وہ خدا کا پیارا سادھو اُسے کیا پڑی ہے۔ جو کسی سے ملنے ملانے کو جوتیاں چٹخاتا پھرے۔ ہم خود اس کی خدمت میں جائیں گے۔ اُترو تم بھی سادھو کو سلام کرو۔

عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔ جنٹلمین کے کلب کا وقت قریب تھا۔ دل بے چین ہو رہا تھا۔ دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔ سب کو پابندیٔ وقت کا سبق دیتا تھا۔ آج سب مذاق اُڑائیں گے مگر باپ کا سامنا تھا۔ دل میں جلتا بھنتا مجبوراً وہ دل ناخواستہ اُترا اور پانچ ہی منٹ میں یہ سن کر کہ ''سادھو کے انتقال کو چار سال ہو گئے۔'' دونوں لوٹ آئے مگر نوجوان کسی گہری سوچ میں پڑا تھا۔ گاڑی بڑھی اور سنسان جنگل سے نکل کر کھیتوں میں پہنچی۔ لیکن نوجوان اب تک بے سروپا خیال میں غرق تھا۔ آخر کچھ دیر بعد وہ اپنی خاموشی سے خود ہی پریشان ہو کر چونکا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور کسی قدر بے تعلق ہو کر بولا:

''ابا جان جھونپڑی میں یہ لڑکی کون تھی۔ کیا سادھو کی بیٹی ہے؟''

ابا جان: ہم نے خیال نہیں کیا کہ لڑکی تھی یا بڑھیا کوئی مصیبت زدہ فقیرنی ہو گی جو اس سنسان جنگل میں تنہا پڑی ہے۔ مگر تم کو اس کی کیا فکر؟

جنٹلمین نے چہرے پر کچھ بے پروائی پیدا کر کے کہا:

''یونہی دریافت کرتا تھا۔ لڑکی صورت سے تو کوئی شریف اور اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔''

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ☆

افسر محل

زنانہ حال کے مطابق نئے فیشن کی عالی شان کوٹھی موسومہ "افسر محل" میں آج افسر الدولہ افسر الملک بہادر کے اکلوتے بیٹے پانچ سال کے بعد وطن واپس آئے ہیں اور مابدولت وطن کی خوشی میں ایک شان دار جلسہ رقص قرار پایا ہے۔ اندر باہر تمام محل مہمانوں سے پٹاپڑا ہے۔ گھربازار ایک ہو رہا ہے۔ اور کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔

بڑے کمرے میں چاندنی کے فرش پر وسط میں مسند لگی ہے۔ جس پر مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے پانچ بیگمات بڑی شان و تمکنت سے بیٹھی ہیں۔ ان کی خوشی کا آج اندازہ نہیں۔ بلبل کی طرح چہک رہی ہیں۔ بات بات پر ہنس پڑتی ہیں۔ لیکن نواب بیگم صاحبہ (جو افسر دُلہن مشہور ہیں) کے چہرے سے تھوڑی دیر کے بعد کسی فکر کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ بہنوں اور بھاوجوں نے تاڑ لیا اور اُنہیں باتوں میں مشغول کرنا چاہا۔ آخر خود ہی نواب بیگم افسر دُلہن بولیں:

"اے بہن کیا کہوں وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ نیچری تو پہلے ہی تھا مگر اس پانچ برس کے عرصے میں ولایت رہ کر تو پورا عیسائی ہو گیا۔ ہر چند اصرار سے کہا کہ اپنی منگنی اپنے ہاتھ سے چڑھا مگر ایک نہیں مانتا۔"

سردار دُلہن: اے آپا عیسائی نہ کہو۔ عیسائی ہوں اُس کے دُشمن۔ مجھے تو وہ کچھ بے ہوش سا اور کھویا کھویا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کسی بڑے غم و فکر میں رہے۔ ہو نہ ہو، یہ وہاں کسی فرنگن سے دل لگا کر آیا ہے۔

بڑی بیگم: ہاں ہاں یہ تو ہے ہی۔ رات ہی کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے

کہا: "بچے میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ چراغ سحری ہوں۔ جلدی سے دادی کو سہرا دکھا دے۔ اس ذکر پر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کھڑا ہو کر پریشانی سے ٹہلنے لگا۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا دادی! میرا سہرا کیا۔ خدا جانے میری زندگی کس قدر باقی ہے۔ وہ تو کچھ بہت ہی بددل ہو رہا ہے۔"

بیگم کی بھانجی: "آپ سب کو نہ معلوم کیا کیا وہم ستا رہے ہیں نہ اُس نے کسی فرنگن سے دل لگایا اور نہ کوئی مذہب ہی چھوڑنے کی بات ہے۔

لندن جانے سے پہلے بمبئی میں جس لڑکی سے اُن کو محبت ہو گئی تھی اُس سے شادی کرنے کی ان کو خواہش تھی۔ آپ سب کی مرضی کے خلاف وہ اس سے شادی کا وعدہ کر بھی گئے تھے مگر اب جو آئے تو اُس کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ کہاں ہے، اور زندہ ہے یا مر گئی۔ بس اس رنج میں گھل رہے ہیں۔"

افسر دُلہن: "اوہو۔ تو اب تک بھی اُس کم بخت کو نہیں بھولے۔ ولایت بھیجنے میں ہمیں تو سب سے بڑا فائدہ یہی سجھائی دیتا تھا کہ وہ اُس آوارہ گرد بے پردہ لڑکی کو بھول جائے گا۔ اچھا تم یوں کیوں نہ کرو کہ اُس سے کہہ دو کہ وہ مر گئی ہے۔"

بھانجی: "اے خالہ بی۔ خدا کے لئے کہیں یہ ہی اُن سے نہ کہہ بیٹھنا انہیں سخت رنج ہوگا۔ نہ معلوم کیا کر بیٹھیں اگر کچھ نہ بھی کیا تو صحت پر اس کا بہت مضر اثر پڑے گا۔"

افسر دُلہن: "خدا غارت کرے اس نامراد کو میرے بچے کو دیوانہ کر گئی۔ اچھا تو یہ کہنے میں تو مضائقہ نہیں کہ اُس نے کسی اور سے شادی کر لی۔"

بھانجی: "اے نہیں یہ بھی نہیں کہنا چاہئے اوّل تو انہیں اس کا سخت صدمہ ہوگا اور دوسرے یقین بھی نہ کریں گے۔ وہ تو کہتے ہیں صرف دس ماہ کے عرصے سے اُس کا خط جانا بند ہوا ہے۔ اس سے قبل وہ سب حالات انہیں لکھتی رہتی تھی اور اس نے اپنے سب خواستگاروں کو یہ جواب دے دیا تھا کہ میرا منگیتر انجینئری کے لئے انگلستان گیا ہوا ہے۔"

افسر دُلہن: "خدا نہ کرے۔ جو میرا ظفر اُس کا منگیتر ہو۔ اچھا تو عقلمند بیوی پھر تم ہی بتاؤ کہ اب کیا کیا جائے؟ میں تو چاہتی تھی۔ نواب کیوان قدر کی لڑکی سے جلدی شادی کر دوں۔ اسے دیکھو تو کس بلا کی حسین ہے۔"

بھانجی: ''خالہ جان یہ آپ اطمینان رکھیں۔ بھائی ظفر کسی کے انتخاب سے شادی نہ کریں گے۔نواب کی لڑکی حسین سہی، عالی خاندان سہی، امیر سہی، مگر آخر جاہل ہے۔''

یہاں تو یہ گفتگو ہے، لیکن ظفر کیا کر رہا ہے؟

وہ اس وقت اپنے بیڈروم کے آگے چھوٹے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر دراز ہے۔اخبار ہاتھ میں ہے۔نظریں چھت پر اور خیال نہ معلوم کہاں آوارہ ہے کہ پہلو کے کمرے سے ایک نوجوان برآمد ہوا اور اُس کا شانہ ہلا کر کہا:

''ظفر تم یہاں چھپے بیٹھے ہو، دیکھو تو تمہارے اشتیاق میں کون کون جمع ہیں۔ ہر طرف تلاش ہو رہی ہے۔ارے بھئی اس قدر افسردہ تو نہ ہو۔''

ظفر: ''بھئی خدا کے لئے مجھے سب سے بچالو۔ میں پکڑا گیا تو وہ گھنٹوں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا کہہ دو زنان خانے میں ہے۔''

دوست: ''نہیں بھائی یہ مناسب نہیں۔ اس ہر وقت کے رنج سے تمہاری صحت بھی بگڑ جائے گی۔لوگوں سے ملو۔گھڑی دو گھڑی ہنسی مذاق میں بھی گزار دو۔اپنے اوپر نہیں تو ہم پر رحم کرو۔''

ظفر: ''آہ صفدر اب صحت زندگی کس کام کی۔جس اُمید پر پانچ سال محنت کی اور جس کے اشتیاق میں یہ عرصہ دن گن گن کر گزرا جب وہی نہیں تو پھر اب زندگی کیا۔اب میں بالکل مایوس ہوں۔''

صفدر: ''میں جو کہتا ہوں۔ابھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ہم تلاش کریں گے۔ اُن کے دادا بمبئی ہی میں تھے نا۔''

ظفر: ''دادا اب کہاں۔کل شام سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب کا خط ملا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ان بزرگوار کا انتقال ہو گیا ہے۔لڑکی کا حال اُن کو بھی معلوم نہیں۔اُس کے والدین جاپان تجارت کرتے ہیں۔مجھے اُن کے پتے کا بھی علم نہیں۔''

صفدر: ''مگر فیروزہ بیبیں دہرہ دون میں رہتی ہیں۔اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تو تھا۔جو مسوری میں پڑھتا تھا۔میں کل ہی مسوری جا کر اسکول میں دریافت کروں گا۔

لو بس اب اُٹھو غسل کرو، آدمی بنو، کسی سے ملتے نہیں تو سیر ہی کو چلیں۔ ہاں خوب یاد آیا آج تمہیں ایک جنگل کی ایسی پری دکھائیں گے کہ فیروزہ کو بھی بھول جاؤ۔"

ظفر: "صفدر اب تم بھی ہمارا مذاق اُڑانے لگے۔ تم سے یہ اُمید نہ تھی۔"

صفدر: "نہیں بھائی مذاق نہیں۔ سچ کہتا ہوں۔ میں نے ایک نظر ہی دیکھا تھا۔ ایسی حسین و جمیل تھی کہ مجھے تو شک گزرا کہ انسان ہے یا پری۔ کل شام میں اور ابا جان جو آپ کی طرف سے نذریں چڑھانے اُس جنگل والی خانقاہ پر گئے تو وہاں قریب ہی ایک جھونپڑے میں ابا جان اپنے کسی سادھو دوست سے ملنے کے لئے اُتر گئے۔ معلوم ہوا کہ سادھو مر چکا ہے اور اس ویران جھونپڑی کو اسی حور تمثال حسینہ نے آباد کر رکھا ہے۔ ابا جان کے خوف سے میں اُس کے متعلق کچھ زیادہ دریافت نہ کر سکا مگر بھائی بالکل تمہاری فیروزہ کی بہن معلوم ہوتی تھی۔ چلو موٹر پر چلتے ہیں۔ کوئی ہو اس کا حال معلوم کریں گے۔ ذرا تفریح ہی سہی۔ لو اُٹھو۔"

ظفر منہ تو صفدر کی طرف کئے ہوئے تھا مگر خیال اپنی ہی اُلجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔ صفدر نے اُٹھو کہا تو چونکا۔ آہستہ سے کہا۔ "اچھا"۔ مگر یہ کہہ کر پھر ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ صفدر کا دل اس کا مایوس چہرہ دیکھ کر افسردہ ہو رہا تھا۔ وہ پھر اُٹھنے پر اصرار کرنے کو تھا کہ ظفر خود ہی بولا: "میرا خیال ہے، اگر وہ زندہ ہے تو جاپان میں ہے۔"

صفدر: "آپ ایک ہفتہ بمبئی ٹھہرے اور کچھ پتہ نہ لگا یا۔"

ظفر: "مجھے اطمینان تھا کہ وہ یہاں دہرہ دون میں ہوگی اور کچھ خیال یہ بھی تھا کہ شاید جاپان چلی گئی ہو۔ بہر حال کچھ معلوم کیا بھی مگر کچھ خبر نہ ملی۔ اب جو یہاں تلاش کرنے میں بھی مایوسی ہوئی اور کہیں سے اطلاع نہ ملی تو خیال آیا کہ عبدالرحمٰن اور فیروزہ کے دادا صاحب کے دوستانہ تعلقات ہیں اُن سے دریافت کروں۔ اُن کو خط لکھا تو اس کا جواب یہ ملا کہ فیروزہ کے دادا انتقال کر گئے ہیں۔ انہیں کے پاس ہندوستان میں یہ دونوں بہن بھائی پڑھتے تھے۔ جب اُن کا انتقال ہو گیا تو والدین نے جاپان بلا لیا ہوگا مگر یہ بدنصیبی میری کہ اس سے کبھی جاپان کا پتہ بھی دریافت نہ کیا۔"

صفدر نے ظفر کے مایوسانہ خیالات کو بہلانے کے لئے کہا۔ "اس بھائی کے علاوہ

اس کے کوئی اور بہن بھائی بھی تھے؟"

ظفر: "ہاں ایک بہن ماں باپ کے پاس جاپان تھی اور یہ دونوں بہن بھائی دادا کے پاس بمبئی رہتے تھے۔ آہ صفدر! محض میری محبت کی وجہ سے اس نے بمبئی چھوڑ کر یہاں رہنا اختیار کرلیا تھا۔ دادا سے بضد ہوکر بھائی کو مسوری اسکول میں داخل کیا اور خود یہاں دہرہ دون میں رہنے لگی۔ اُف کیسی محبت تھی۔ کیا ہوگیا؟" یہ کہتے ہوئے ظفر کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو اُمل آئے وہ کرسی سے اُٹھ کر مضطربانہ کمرے میں ٹہلنے لگا اور آخر برابر کے ایک ستون کے سہارے ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ صفدر کا دل بھی بھر آیا۔ وہ دفورِ غم سے کانپتی ہوئی آواز میں اسے تسلی دینے لگا۔ جب ظفر دل کا بوجھ آنسوؤں سے نکال چکا تو صفدر نے زبردستی اس کا منہ دُھلایا اور کپڑے پہنائے اور موٹر تیار کرا کے دونوں اس شہر سے باہر والی خانقاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

ناکام ملاپ

موٹر گرد و غبار کے بادل اُڑاتا ہوا سڑک سے خانقاہ کی جانب مڑا مگر بجائے خانقاہ میں داخل ہونے کے اسی سیاہ پتھر کی جھونپڑی پر آٹھہرا۔ جھونپڑی کے سامنے چھوٹے سے برآمدے پر چند خشک اور اُجڑی ہوئی بیلیں چڑھی تھیں۔ چند گملے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ جن کے پودے جھونپڑی کے مکین کی طرح مرجھائے ہوئے تھے۔

موٹر روک کر صفدر اُترا۔ ظفر سے بھی اُترنے کو کہا مگر اس کے غم کی سستی نے اُسے اُترنے نہ دیا۔ صفدر بے تکلف برآمدے میں ہوتا ہوا اندر والی کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ مگر ٹھٹک گیا۔ کواڑ بند تھے۔ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا تو وہی سیاہ پوش غمگین حسینہ دروازے کے قریب آئی اور پوچھا:

''کون ہے کیا کام ہے؟ کیا میری یہاں کی تنہائی بھی دُنیا والوں کو دوبھر ہوگئی؟''

صفدر نے حیران ہو کر ادب سے کہا۔ ''ہمیں آپ سے کچھ دریافت کرنا ہے۔ میرے ساتھ میرے بھائی بھی ہیں اگر اجازت ہو تو ہم یہاں ذرا سی دیر ٹھہر جائیں۔'' سیاہ پوش نے کچھ جواب نہ دیا تو نوجوان نے خاموشی توڑنے کو موٹر کی طرف منہ پھیر کر کہا۔

''بھائی ظفر آجایئے۔''

سیاہ پوش لڑکی: ''ظفر! کون ظفر؟ یہ نام تو میں جانتی ہوں مگر نہیں۔ وہ کہاں! اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے سر جھکا لیا مگر ذرا سی دیر بعد دل سنبھال کر کہا۔'' اچھا کوئی نیک کام ہے تو آجایئے۔''

صفدر کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ بولا:

"آپ کسی ظفر کو جانتی ہیں، کیا وہی ظفر تو نہیں، جو اب پانچ سال کے بعد تعلیم حاصل کر کے انگلستان سے واپس آئے۔"

سیاہ پوش کا چہرہ صبح کے پھولوں کی طرح کھل گیا مگر فوراً کسی خیال کے آتے ہی مرجھا گیا اور وہ بے تابی سے بولی۔ "ہاں ہاں وہی ظفر تو کیا وہ واپس آ گئے ہیں۔ تم نے سچ کہا۔ بہت ہی اچھا ہوا۔ وہ آ گئے۔ اب میں بامراد دُنیا سے اُٹھوں گی۔ کیوں کہ میں اب جلدی ہی اپنے پیارے کے پاس جانے والی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ظفر سے ملاقات ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ ظفر ظفر چلاتی ہوئی دیوانہ وار کوٹھری سے باہر نکل آئی۔

یہ الفاظ ظفر نے موٹر پر سن لئے۔ اس آواز کو سن کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دل کی حرکت بند ہو گئی ہے اور وہ بے ہوش ہوا چاہتا ہے۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور موٹر سے کود کر پاگلوں کی طرح جھونپڑی کی طرف دوڑا۔ دونوں ایک ہی وقت اس برآمدے میں پہنچے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے اور دو پتھر کی مورتوں کی طرح ساکت رہ گئے۔ صفدر ڈرا کہ انہیں کیا ہو گیا لیکن رفتہ رفتہ اُن کے قدم خود بخود اُٹھنے لگے مگر اُن کی صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو خود بخود معلوم نہیں کہ وہ کیا حرکت کر رہے ہیں۔ ایک محویت کے عالم میں وہ ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے اور ہلکی سی چیخ کے ساتھ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں تھے اور بھول گئے تھے کہ وہ کہاں ہیں۔ یہ مؤثر نظارہ دیکھ کر صفدر کا دل بھر آیا۔ اُس نے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور بھائی ظفر کہہ کر اُن کو گویا موت کی نیند سے چونکا دیا۔ اس نے دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اُنہیں آہستہ آہستہ کوٹھری میں لے گیا مگر دفورِ جذبات سے دونوں کی زبان بند تھی۔ صفدر نے باہر آ کر موٹر کو دُور ایک درخت کے نیچے کھڑا کرنے کو کہا اور خود برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ کیوں کہ وہ اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ اس دل خراش نخوگ کے نظارے کو دیکھے۔

ابھی تک دونوں خاموش تھے۔ سیاہ پوش کی آنکھوں میں آنسو اُبل آئے۔ وہ ظفر کے سینے پر سر رکھ اس قدر روئی کہ بے ہوش ہو گئی اور خود فراموش ظفر کے ہاتھوں میں سے نکل کر زمین پر گر گئی۔

ظفر اب تک بھولا ہوا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اسے ایک خواب

کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ لیکن جوں ہی سیاہ پوش زمین پر گری۔ اس کو چوٹ لگنے کے خیال نے اس کے دل میں چٹکی لے کر اسے چونکا دیا۔ اس نے جلدی سے زمین پر بیٹھ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور صفدر کو آواز دی۔ صفدر نے آ کر سیاہ پوش کو بے ہوش دیکھا تو ایک برتن اُٹھا بھاگا ہوا چشمے پر گیا اور پانی لا کر اس کے منہ پر چھینٹے دیئے اپنا معطر رومال اُسے سنگھایا۔ جب اس کو ذرا ہوش آیا تو وہ اپنی نیم وا آنکھیں ظفر کے چہرے پر جمائے ہوئے تھی۔ وہ آہستہ سے بولی: ''وہ خواب تھا یا ابھی تک میں خواب دیکھ رہی ہوں۔'' ظفر کی زبان اب تک بند تھی۔ آخر صفدر نے انہیں اُٹھا کر موڑھوں پر بٹھا دیا اور اب تینوں بالکل خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھ رہے۔

یہ کوٹھری چونکہ سلیقہ شعار جوگن کے رہنے کی جگہ تھی۔ اس لئے تمام سامان قرینے سے لگا تھا۔ ایک طرف زمین پر بستر بچھا ہوا تھا۔ دوسری طرف تین چار موڑھے رکھے ہوئے تھے۔ ایک لوہے کی چھوٹی میز پر ایک سیاہ رومال چند کتابیں اور کچھ تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بانس کی الماری پر تین چار مٹی کے برتن، رکابی، پیالے وغیرہ چنے ہوئے تھے۔ جھونپڑی کی پشت کی طرف جہاں سے چند گز کے فاصلے پر پہاڑی تھی۔ تین کھڑکیاں کھلی تھیں۔ جن میں سے کوہستانی ہوا کے تازے جھونکے آ رہے تھے۔ کچھ دیر اس کوٹھری میں بلا کی خاموشی طاری رہی۔ صرف متحرک ہوا تھی۔ جو دریچوں سے داخل ہو کر اس غمزدہ لڑکی کی روشن پیشانی پر سیاہ بالوں کو بکھیر رہی تھی۔ ظفر ایک بحرِ تحیّر میں غرق تھا۔ اس کے دماغ میں کوئی خیال نہ تھا اور اس کی محویت کی یہ حالت تھی کہ وہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ کس کے مکان میں اور کس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی نہ جھپک رہی تھیں بلکہ زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ صفدر اس کی اس حالت کو پریشانی سے دیکھ رہا تھا اور اس سکوت دل خراش کو توڑنے کا خواہشمند تھا۔ آخر اس نے ہمت کر کے گفتگو شروع کر دی اور ظفر کی طرف دیکھ کر بولا:

صفدر: ''بھائی اب اس وقت بھی رنجیدہ ہو۔ خدا کا شکر بجا لاؤ کہ بالکل ناامیدی میں اللہ نے یہ خوشی کا موقعہ دیا۔'' اور پھر سیاہ پوش لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں پہلے خدا کا اور پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ہمیں اس وقت ایک سخت اُلجھن سے نجات ملی۔ آپ کی بہت مہربانی ہے کہ آپ نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ ورنہ خدا'

جانے ابھی کتنی صعوبات اُٹھانی پڑتیں۔ میرا ارادہ تو عنقریب جاپان جانے کا تھا۔ کیوں کہ آپ کا پتہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بھائی جان کا برا حال ہو رہا تھا۔ بیماروں کی طرح پڑے تھے۔"

لڑکی کا چہرہ اب بہت متین اور سنجیدہ تھا۔ اس نے کسی قدر بے پروائی سے کہا۔

"ہاں خدا کا شکر ہے کہ اُس نے زندگی میں پھر ایک بار ظفر کو دکھا دیا ورنہ میں تو صبر کر چکی تھی۔" لڑکی کی آواز کانپنے لگی۔ جب اس نے کہا۔ "مجھ پر جو کچھ گزر چکا ہے اس کے سامنے کوئی غم بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔"

لڑکی کی باتوں سے ظفر کے دماغ میں خیالات کی ایسی ہلچل مچ گئی جیسے آفتاب طلوع ہونے پر خاموش دُنیا میں ایک ہنگامہ مچ جاتا ہے۔ اس میں بولنے کی قوت پیدا ہو گئی اور آخر بولا:

"فیروزہ پیاری۔ دراصل اگر تم میری فیروزہ پیاری ہو اور یہ خواب نہیں جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں۔ تو للہ سب سے پہلے مجھے اپنے حالات بتاؤ۔ تم نے مجھ سے خط و کتابت کیوں بند کر لی تھی اور آج میں یہ کیا نقشہ دیکھ رہا ہوں۔ تم کس حالت میں ہو۔ بستی سے کوسوں دور یوں ویرانے میں کیوں آ پڑی ہو؟ وہ اپنی راجپور روڈ والی کوٹھی کیوں چھوڑ دی؟ تمہارا بھائی کہاں ہے؟"

ظفر کے سب سوالات کو اُس نے خاموشی سے سنا۔ مگر اس کے آخری الفاظ سے فیروزہ کی بے اختیار چیخ نکل گئی اور وہ پھر بے ہوش ہو کر گر گئی۔ صفدر بے چارے کو پھر پانی لانا پڑا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنی پڑیں۔ مگر جب وہ ہوش میں آئی تو کچھ سنبھلی اور خاموشی سے اُٹھی۔ میز پر ایک رومال میں لپٹی ہوئی کوئی تصویر رکھی تھی۔ وہ تصویر ظفر کے ہاتھ میں دے کر کہا:

"ظفر لو اسے دیکھو۔ میں لٹ گئی۔ میں برباد ہو گئی ہوں۔ ظفر پیارے دیکھو۔ میری جان سے عزیز فیروز جعفری کس صورت میں ہے۔"

ظفر نے دیکھا کہ وہ اس کے نوجوان اور خوبصورت بھائی فیروز کی لاش کی تصویر تھی جو آنکھیں بند کیے چارپائی پر پڑا تھا اور فیروزہ اس کے مردہ جسم سے لپٹی ہوئی تھی۔ ظفر

سے ضبط نہ ہو سکا اور اس تصویر کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ صفدر نے دونوں کو سنبھالا۔ تسلی دی تو ظفر نے بمشکل ہچکیاں لے لے کر فیروزہ سے دریافت کیا:

ظفر: ''آہ بد قسمت فیروزہ۔ یہ سانحہ کب گزرا؟ کیا اس کی قبر اسی خانقاہ میں ہے جو تم یہاں آ پڑی ہو؟''

فیروزہ: ''قبر کیسی۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ میرا فیروز مر گیا؟ نہیں میرا چاند زندہ ہے وہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ وہ ضرور کسی روز میرے پاس واپس آئے گا۔ ہائے ظفر تمہیں علم ہے۔ میرے ضعیف دادا کا انتقال ہو گیا۔''

ظفر: ''ہاں اس کی خبر مجھے مل چکی ہے مگر تم جاپان کیوں نہ چلی گئیں؟''

فیروزہ: ''جاپان جا کر کیا کروں گی۔ میں اپنے فیروز کے آنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس کی جدائی سے میرے حواس بجا نہیں ہیں۔ دادا جان بھی اس کے چلے جانے کے رنج میں دل کی حرکت بند ہونے سے مر گئے مگر آخری وقت مجھے سمجھاتے رہے کہ غم نہ کرو۔ فیروز زندہ ہے وہ عنقریب تمہارے پاس آ جائے گا۔ بس میں اس کے انتظار میں کئی ماہ سے اس ویرانے میں پڑی ہوں مگر اب تو اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہوں اور مجھے کچھ ایسا یقین ہو چلا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔ اب میرا بھی یہی ارادہ ہے کہ بہت جلدی اس سے جا ملوں۔''

ظفر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''اور فیروزہ مجھے یہیں چھوڑ جاؤ گی؟''

فیروزہ کے چہرے پر ایک مردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ آہستہ سے بولی:

''ظفر یہ سب دھندے خوش دلی اور زندگی کے ساتھ ہیں۔ اس جسم میں اب جان نہیں رہی۔ اب جاؤ کسی اور خوش و خرم اور زندہ دل لڑکی کو چاہو۔ اس بد نصیب کو بھول جاؤ اور زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے چھوڑ دو۔''

صفدر ڈرا کہ کہیں ان باتوں سے ظفر کی حالت نہ بگڑے اور اس نے قطع کلام کر کے کہا۔ ''ہاں مس جعفر جی ابھی آپ فرماتی تھیں کہ وہ مرحوم کہیں چلا گیا ہے اور آپ کو اس کی موت کا یقین نہیں تو پھر یہ تصویر کس کی ہے؟''

فیروزہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا ''کیا کہوں میں اس یقین کو پختہ کرنا نہیں چاہتی تھی

کہ وہ مر گیا ہے۔ میں اپنے بھولے دل کو فریب دیتی رہی مگر اب مایوسی کی حد ہو چکی۔ سنو میں تمہیں شروع سے حال سناتی ہوں۔ مجھے ایک روز اچانک ہیڈ ماسٹر صاحب کا تار ملا کہ تم فوراً مسوری آؤ۔ فیروز کو پلیگ ہو گیا۔ میں نے اسی وقت ایک تار دادا جان کو دیا اور خود گھبرائی ہوئی مسوری پہنچی۔ چوتھے دن دادا جان بھی مسوری پہنچ گئے۔ حملہ معمولی تھا اور بخار ہلکا۔ ڈاکٹر اُمید دلاتا تھا مگر دفعتاً ایک روز اس کی حالت بدل گئی اور یہ صورت ہوگئی جس کی یہ تصویر ہے۔ ہیڈ ماسٹر کے لڑکے نے جو اس کا دوست تھا یہ فوٹو لے لیا۔ بس اس قدر مجھے یاد ہے۔ وہ بے چین تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی تکلیف سے بے چین ہو کر اس سے لپٹی جاتی تھی کہ یک دم وہ خاموش اور ساکت ہو گیا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ پھر مجھے خبر نہیں کہ کس وقت مجھ سے علیحدہ کیا گیا اور کہاں بھیج دیا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دوسرے دن کی صبح ہو چلی تھی اور میں مسوری میں اپنی دوست مس سٹیلی کی کوٹھی پر بیمار پڑی تھی۔ دادا جان بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فیروز اچھا ہے مگر علاج کے لئے اُسے ایک سینی ٹوریم میں بھیج دیا گیا ہے۔ مگر اسی ہفتے میں دادا جان کا انتقال ہو گیا۔ جاپان اس حادثے کی خبر دی گئی۔ پاپا نے مجھے بلایا۔ اپنا ایک ایجنٹ بھیجا مگر میں نہ گئی۔ کیوں کہ مجھے تو اپنے پیارے کا انتظار تھا۔ میں نے اسے مسوری کے تمام ہسپتالوں میں تلاش کیا مگر وہ نہ ملا پھر میں بمبئی گئی۔ وہاں اس کو ڈھونڈا جب وہاں بھی نہ ملا تو میں نے دہرہ دون آ کر اپنی کوٹھی اور سامان مس سٹیلی کے ہاتھ فروخت کر دیا اور تمام روپیہ اس کی گمشدگی کی یادگار میں ایک یتیم خانے کو دے دیا اور اب خود اس سنسان تنہائی میں اس جھونپڑی کو آ بسایا۔"

صفدر: "حقیقت میں آپ کی داستان نہایت دل خراش ہے خدا آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اب تو آپ یہی سمجھیں کہ آپ کا پیارا اس دارِ ناپائیدار سے اُٹھ گیا اور اس کی پاک و معصوم روح کو اب راحتِ دارین حاصل ہے۔"

ظفر: "فیروزہ چلو کچھ دن کے لئے جاپان چلے چلیں۔ میں تمہارے والدین اور بہن سے بھی مل لوں اور کچھ تمہارا غم بھی غلط ہو گا۔"

فیروزہ: "آہ ظفر کیا کہتے ہو۔ یہ غم غلط کرنے کے لئے نہیں ہے۔ میرا فیروز نہیں تو اب اس کا غم میری بربادِ زندگی کا سرمایہ ہے اور اسی سے مجھے گونہ راحت ملتی ہے اسی

طرح جب تم انگلینڈ تھے تو جوں جوں میں تمہاری جدائی کی تکلیف سے بے چین و بے قرار ہوتی تھی۔ بجائے دل بہلانے کے اور مشاغل میں مصروف ہونے کے تنہا بیٹھ کر تمہیں یاد کر کے رو دیا کرتی تھی اور اس طرز عمل سے مجھے بے انتہا راحت ملتی تھی۔ تمہاری یاد میں رونا میرے لئے اتنا ہی اطمینان بخش تھا جتنا تم سے ملنا۔"

ظفر: "تو اب تو میں حاضر ہو گیا ہوں۔ مجھے اجازت دو کہ تمہارا دل بہلاؤں۔ آہ فیروزہ تمہاری یہ حالت دیکھ کر میرا دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ میں تم جیسی خوش دل راحت نصیب امیر زادی حسینہ کو یہ کس حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ اپنے اوپر نہیں تو ظفر پر رحم کرو۔"

فیروزہ کے چہرے پر ایک مردہ تبسم ظاہر ہوا۔ وہ بولی۔ "اوہ ظفر وہ باتیں کہاں اور یہ بدنصیب کہاں۔ وہ زندگی تو خواب معلوم ہوتی ہے۔ فیروز رہتا تو ظفر کی رفاقت کا بھی لطف تھا مگر اب تو اس کمزور جسم میں جاں ہی نہیں رہی۔ میں پھر تمہیں سمجھاتی ہوں اور خوشی سے تم کو اجازت دیتی ہوں کہ جاؤ کسی اور سے شادی کر لو۔"

ظفر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ فیروزہ اب مجھ میں کوئی صدمہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ بھائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر صفدر کا دل بھر آیا۔ اس نے بھائی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بھائی گھبراؤ نہیں رفتہ رفتہ خود بخود صبر آ جائے گا۔ فی الحال ان کو اس ویرانے سے لے چلنا چاہئے۔ اپنی کوٹھی میں لے جانا تو مناسب نہیں۔ البتہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا دیا جائے گا۔ ظفر نے رومال سے آنسو پونچھے اور آواز سنبھال کر کہا۔ فیروزہ میرے بھائی کی درخواست سن رہی ہو۔ میرے ساتھ شہر چلو گی؟"

فیروزہ نے کسی قدر بے پروائی سے کہا۔ "آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھ کو بھلا شہروں سے کیا تعلق۔ میرا پیارا فیروز خدا جانے کس ویرانے میں تنہا پڑا ہے۔ وہ اُجاڑ بیابانوں میں ہو اور میں عالیشان مکانوں میں یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" وہ کچھ دیر خاموش رہ کر خوشی سے بولی۔ "اور مجھے تو پختہ یقین ہے کہ وہ آج ہی رات کو مجھے اپنے پاس بلا لے گا۔ اچھا اب میری عبادت کا وقت قریب ہے۔ آپ لوگ رخصت ہوں تو میں اُٹھوں۔"

ظفر نے آہستہ سے صفدر سے کہا "اب کہو میں کیا کروں اور تو کوئی فکر کی بات نہیں؟ میں خود بھی یہیں آ رہنے کو تیار ہوں۔ اس سے میرا دل لرزنے لگتا ہے۔ خدا جانے انہوں نے کیا سوچ رکھا ہے۔" جب صفدر نے کوئی مفید رائے دینے کی بجائے خاموشی اختیار کی تو اس نے اپنا مایوس چہرہ فیروزہ کی طرف اٹھایا اور کہا۔ "فیروزہ تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر میں ہرگز نہ جاؤں گا اگر تم چلنے کو تیار نہیں ہو تو پھر مجھ کو بھی یہیں ٹھہرنے دو۔ میری مصائب سے پُر اور قابلِ رحم حالت پر رحم کرو اور میری التجا منظور۔"

فیروزہ ظفر کے اس اصرار پر بگڑ گئی اور اس نے خشمگین ہو کر کہا: "مسٹر ظفر میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کا مجھ سے ایسا کیا تعلق ہے؟ آپ کا مجھ پر کسی طرح کا حق نہیں۔ صرف دوستی محبت تھی۔ وہ تمام ہو چکی۔"

یہ کہہ کر فیروزہ نے منہ پھیر لیا اور ظفر فیروزہ کی اس سختی سے رومال میں منہ چھپا کر ننھے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

صفدر حیران تھا کہ کیا کرے۔ اس میں خود اپنے آنسو روکنے کی طاقت نہ تھی۔ آخر وہ سنبھلا اور اس نے ظفر کے کان میں کہا۔ غم والم سے اس وقت فیروزہ کے حواس بجا نہیں ہیں۔ اس وقت تم اُٹھو پھر کسی وقت آ کر سمجھا بجھا لیں گے مگر ظفر کے قدم نہ اُٹھتے تھے۔ اس سے وہاں سے ہلا نہ جاتا تھا۔ اس نے اپنی دل و جان کی مالک کو پانچ سال کی طویل جدائی کے بعد آج دیکھا تھا اور اسے خوف تھا کہ رات کو وہ کہیں خودکشی نہ کر لے۔

ظفر کو وہ اس طرح خاموش بیٹھا دیکھ کر غصے میں بھری ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کے زرد رُخسار جوش سے سرخ ہو گئے تھے اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ جب اس نے ظفر کا شانہ ہلا کر جھلاتے ہوئے کہا۔ "ظفر صاحب بس میں اب اس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتی۔ آپ اُٹھیے!"

اب کوئی چارہ نہ تھا۔ ظفر نے ایک عاجزانہ نگاہ سے فیروزہ کو دیکھا۔ لیکن اسے اسی طرح مصر پا کر مجبور قدم اُٹھاتا ہوا وہاں سے نکل آیا اور خانقاہ کے احاطے میں ٹہلنے لگا۔ ظفر کے آنسو اب تک جاری تھے اور صفدر اس کے سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

کچھ دیر بعد ظفر نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "میں اب گھر نہیں جاؤں گا۔"

صفدر: ''آپ کی اس یکایک غیر حاضری سے گھر والے بگڑ جائیں گے۔ سچ تو یہ ہے وہ بھی آپ کو اسی قدر چاہتے ہیں۔ جس قدر آپ فیروزہ کو۔''

ظفر نے روکھی سی آواز میں کہا۔ ''مجھے اب کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم جاؤ اور اُن سے تمام ماجرا سچ سچ بیان کر دو اور کہہ دو کہ وہ فیروزہ کی خودکشی کے خوف سے وہاں ٹھہر گیا ہے مجھے کسی کی ناراضی کی پروا نہیں۔ ان لوگوں کی رائے پر مجھے شادی نہیں کرنی اور آخر ایک دن یہی ہونا ہے۔''

صفدر: ''مگر اس جنگل میں آپ کو تنہا کون چھوڑے گا۔ ابھی اماں جان اور ابا جان خود پہنچیں گے اور آپ کو زبردستی لے جائیں گے۔''

ظفر نے صفدر کے چہرے پر آنکھیں گاڑ کر کہا۔ ''تو فیروزہ کو مر جانے دوں؟''

ظفر نے سر جھکا لیا۔ صفدر حیران کھڑا تھا کہ کیا کرے کہ ظفر نے پھر سر اُٹھایا اور فیصلہ کن آواز میں کہا: ''اچھا تو چلو۔ کل کو میں بھی نہ ہوں گا۔'' یہ سن کر صفدر ظفر کو لے جانے سے مایوس ہو گیا۔ اس نے ظفر کو تسلی دی اور جیب سے پاکٹ بک اور پنسل نکال کر ایک رُقعہ لکھا اور شوفر سے کہا کہ ''یہ رُقعہ گھر میں پہنچا دو اور ہمارے لئے کھانا، دو بستر اور ایک خدمت گار کو لے کر اسی موٹر پر واپس آجاؤ۔''

رُقعہ دے کر صفدر مجاور کے پاس گیا۔ اسے کچھ دے دلا کر ایک کوٹھری خالی کرائی اور اُسے صاف کروا اُس میں دو پلنگ بچھوا دیئے۔ کورے گھڑوں میں چشمہ سے پانی منگوایا اور سب انتظام کرنے کے بعد ظفر کو اندر لے جا کر بٹھایا اور ظفر کا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ وہی ظفر ہیں جو کل منت چڑھانے یہاں تک نہ آئے تھے اور آج جوگن کے لئے خود بیراگ لے بیٹھے ہیں۔

☆

اجازت

شام کے سات بجے ہوں گے کہ شوفر نے گھر پہنچ کر رقعہ اندر بھیجا۔ گھر میں ڈومنیاں موجود تھیں۔ گانا بجانا ہو رہا تھا۔ سب بیگمات نہایت خوش خوش بیٹھی تھیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بی بی نے کہا: ''اے میاں ظفر کو تو بلاؤ۔ ان سے کیا کسی کو پردہ ہے۔''

افسر دُلہن نے بھانجی کی طرف دیکھ کر کہا: ''اپنے بھائی کو بلوا لو''

اتنے ہی میں خادمہ آئی اور اس نے وہ رقعہ لا کر افسر دلہن کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا: ''یہ خط شوفر نے دیا ہے اور کہا ہے کہ بہت جلدی اس کی تکمیل کر دیجئے۔''

افسر دُلہن نے خط بھانجی کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ ''لو پڑھو تو یہ خط کیسا ہے''!

بھانجی (جن کو آئندہ نزہت آرا لکھا جائے گا) نے خط کی تحریر پہچان کر دل ہی دل میں پڑھنا شروع کر دیا۔ رقعہ پڑھتی جاتی تھیں اور چہرے سے کچھ پریشانی ظاہر ہوتی جاتی تھی۔ افسر دُلہن کے اصرار پر اس نے یوں پڑھنا شروع کیا:

سر از خانقاہ حضرت کریم شاہ

عزیزہ نزہت۔ تم کو اور سب کو ضرور تعجب ہوگا کہ یہ رقعہ کیسا اور میں اسے کہاں بیٹھا لکھ رہا ہوں مگر سنو میں تمہیں کس قدر خوشی سے یہ اطلاع دیتا ہوں کہ اب ہمارے ظفر کی پریشانی دور ہوتی نظر آتی ہے۔ آج سہ پہر کو ہم ہوا خوری کرتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ میں نے تم سے کل ابا جان کے ہمراہ یہاں آنے اور ایک سیاہ پوش باہوش لڑکی سے ملنے کا ذکر کیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ غمزدہ لڑکی ظفر کی منسوبہ فیروزہ جعفر جی نکلی مگر سخت رنجیدہ ہے۔ اس کے اکلوتے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ جس رنج و غم میں وہ سب کو چھوڑ کر یہاں ایک جھونپڑی میں

آپڑی ہے۔

گو ظفر سے مل کر اسے خوشی ہوئی۔ لیکن اب وہ ظفر کے ہمراہ زندگی گزارنا پسند نہیں کرتی اور اس کا ارادہ ہے کہ آج رات ہی یہاں سے رخصت ہو جائے۔ اس وجہ سے ظفر آج رات یہیں رہنا چاہتے ہیں کہ فیروزہ کو کہیں جانے سے روکیں اور بھائی کی تنہائی کی وجہ سے میں بھی یہیں ٹھہر گیا ہوں۔

تم فوراً ہمارے لئے کھانا اور دو بستر میرے بیرا احمد کے ہاتھ اس موٹر پر بھیج دو اور یہ رقعہ گھر میں والدہ صاحبہ اور چچی صاحبہ کو سنا کر باہر چچا جان اور ابا جان کی خدمت میں بھی بھیج دو اور دعا کرو کہ خدا فیروزہ کو صبر دے اور وہ بھائی ظفر کی زندگی کو خوشگوار بنا سکے۔ صبح کو ہم واپس آجائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تمہارا بھائی صفدر

افسر دلہن: ''دیکھا۔ آخر وہ چڑیل یہیں نکلی نا مجھے پہلے ہی اُمید تھی اور اس دیدہ دلیری کی ہمت اور بے شرمی تو دیکھو کہ سب حال اماں باوا کو کہلا بھیجا مگر سب کیا دھرا اسی بلا کا ہے۔ خدا موت دے اس بدبخت لڑکی کو۔''

بڑی بیگم: بس بیوی اب کچھ نہ کہو۔ نہ اس پر ناراض ہو۔ میرا بچہ اختیار سے باہر ہے۔ اللہ اسے زندہ رکھے۔ ہم فیروزہ ہی سے بیاہ دیں گے۔''

نزہت آرا: ''ہاں خالہ جان اب ضد کرنی مناسب نہیں۔ بھائی جان کی حالت دیوانوں سے بدتر ہے۔ شکر ہے اللہ کا کہ وہ مل گئی۔ میں تو کل کو خود جاؤں گی اور اسے اپنے ساتھ لاؤں گی۔ اب تو آپ جلدی جلدی شادی کی تیاری کرنے کی ٹھہرایئے۔''

☆

رات

آٹھ بجے تک ملازم کھانا لے کر آ گیا۔ صفدر نے بمشکل ضد کر کر کے ظفر کو چند نوالے کھلائے اور اس سے فارغ ہو کر ظفر اور وہ رات کے گیارہ بجے تک فیروزہ کی جھونپڑی کے آگے ٹہلتے رہے مگر اس کا دروازہ بدستور بند تھا۔ کئی بار انہوں نے دروازے سے کان لگا کر اندر کی حقیقت معلوم کرنی چاہی ہلکے ہلکے فیروزہ کو آواز بھی دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔

کوئی ۱۲ بجے شب کے صفدر کو خیال آیا کہ جھونپڑی کی پچھلی کھڑکیوں کو دیکھنا چاہئے۔ شاید کوئی کھلی ہوئی ہو۔ چنانچہ وہ ظفر سے کہے بغیر اُس طرف چلا گیا اور تینوں کھڑکیوں کو دیکھا۔ چادرِ مہتاب پھیلی ہوئی تھی اور سناٹے کا عالم تھا۔ درمیانی دریچے کا ایک کواڑ کھلا تھا اور اس میں سے دھیمی دھیمی زرد اور اُداس روشنی باہر نکل رہی تھی۔ صفدر نے قریب ہو کر دیکھا تو میز پر ایک موم بتی کسی نامراد کی تُربت کے دیے کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ دریچے کے ذریعے جو چاندنی کی روشنی جھونپڑی میں پڑ رہی تھی۔ اس میں دکھائی دیتا تھا کہ فیروزہ دیوار کے قریب بیٹھی کسی کام میں مصروف ہے مگر چونکہ کھڑکی کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس لئے صفدر دیکھ نہ سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

صفدر حیران تھا کہ بارہ بجے سونے کی بجائے یہ لڑکی اس وقت کیا کام کر رہی ہے۔ جب اُس نے ذرا اندر کو سر ڈال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی چمکدار چیز ایک چھوٹے سے پتھر سے چکل رہی ہے۔ یہ دیکھ کر صفدر کا دل نہایت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً کھڑکی میں سے اندر کود جائے مگر ہمت نہ پڑی صفدر واپس آیا اور آ کر ظفر کو تمام معاملے سے خبردار کیا اور چند منٹ میں پریشان ظفر اس دریچے میں سے کود کر بے

دھڑک کمرے میں آ گیا۔

کھڑکی کے کواڑ کھلنے سے چاند کی روشنی اور زیادہ اندر آنے لگی تھی اور پھر دھماکے کی آواز آئی تو فیروزہ نے چونک کر اس طرف دیکھا اور ظفر کو اپنے سر پر کھڑا پایا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے وہ سنہری انگشتری جس میں ایک چمکیلا نگ جڑا تھا اور پتھر کا ٹکڑا چھوٹ گیا اور وہ غضب آلود نگاہوں سے ظفر کو دیکھنے لگی۔

ظفر نے سب سے پہلے وہ انگوٹھی اور پتھر اس کے آگے سے اُٹھا لیا اور شمع کے قریب جا کر دیکھنے لگا کہ نگینہ ثابت ہے یا کہیں سے کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے۔

فیروزہ غصے سے کانپ رہی تھی مگر ظفر کی خاموشی اور پریشانی نے اس کو بھی متاثر کیا۔ وہ ظفر کے قریب آئی اور کہا ''ظفر تم میرا پیچھا نہ چھوڑو گے۔ تم مجھے اس دار المحن سے ہمیشہ کی نجات حاصل نہیں کرنے دو گے؟ میں سچ کہتی ہوں اب میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ میرے پاس وہ خوشیوں اور تمناؤں سے بھرا ہوا پہلا دل نہیں رہا جو تم کو خوش کر سکے۔ بس خدا کے لئے مجھے ان آفتوں کی زندگی سے نجات پانے دو۔ اگر میں تمہاری زبردستی سے زندہ رہ بھی گئی تب بھی تم اس غمگین و پژمردہ ہستی سے کوئی خوشی یا کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکو گے۔

ظفر نے آہستہ سے کہا۔ ''نہ سہی۔ میں اب تم کو اپنے لئے نہیں بچاتا بلکہ خوف خدا اور عذابِ آخرت سے بچانے کو آیا ہوں جس مذہب میں خدا تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ اس میں ایسی موت حرام ہے اور منع۔''

فیروزہ کا چہرہ اُداس ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور بولی۔

''ظفر تم سچ کہتے ہو۔ بے شک یہ درست ہے اور اسی خوف سے میں آج تک اس حالت میں زندہ رہی۔ مگر ظفر کہاں تک؟ میں کیا کروں فیروز سے نا امید ہو چکی۔ تم کو دیکھ لیا۔ بس اب مجھ سے یہ زندگی کی مصیبت برداشت نہیں ہو سکتی۔''

ظفر کے دل پر چوٹ لگی مگر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ سب درست مگر یہ زندگی چند روزہ ہے بہت جلد مر جاؤ گی اور دنیا کی ان مصیبتوں سے نجات پاؤ گی۔ لیکن اگر خدا نہ کرے اپنے ہاتھوں جان دی تو تم ہو گی اور ہمیشہ کا عذاب۔ بہتر ہو کہ جاپان چلی جاؤ اپنے

والدین سے ملو یہاں نہ رہو۔" ظفر کی نگاہ انگوٹھی پر پڑی۔ اس کو دیکھ کر ایک تیر سا لگا اور وہ بولا: "آہ فیروزہ اس انگوٹھی کی یہ قدر ہوئی؟ یاد کرو تم نے ایک وقت کس تمنا سے اسے مجھ سے لیا تھا اس قاتل خدمت کے لئے؟ میری انگوٹھی ایسا سخت عذاب کبھی نہ کرے گی۔ میں اس کو واپس لیتا ہوں۔"

عہد گزشتہ کا ایک دُھندلا تصور فیروزہ کی نگاہوں میں پھر گیا اس نے ظفر کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "پیارے ظفر اس سے بڑھ کر میں اس انگوٹھی کی اور کیا قدر کرتی کہ ہمیشہ کے لئے اس کے نگینہ کو اپنے دل و جگر میں رکھ کر دنیا سے گزر جاؤں۔ یہ تحفۂ محبت اس قدر عزیز تھا کہ اس کا یہاں چھوڑنا مجھے گوارا نہ ہوا۔ لاؤ پیارے ظفر یہ مجھے واپس دے دو۔ یہ میری زندگی کے لئے سانس کی طرح ضروری ہے۔"

ظفر نے اس کا نگ اسی وقت چھل کر نکال لیا اور خالی انگوٹھی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فیروزہ کو پہنا دی۔ پھر قرآن ہاتھ میں دے کر فیروزہ سے قسم لی کہ وہ آئندہ کبھی اس قسم کا ارادہ نہ کرے گی۔ فیروزہ نے وعدہ کیا اور خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد فیروزہ کے حکم سے وہ کوٹھری سے باہر چلے آئے۔ مگر دونوں کو بے اطمینانی رہی اور انہوں نے باقی رات فیروزہ کی جھونپڑی کے برآمدے میں جاگتے جاگتے گزار دی۔ صبح کو صفدر کے اصرار اور اونچ نیچ سمجھانے پر ظفر چند گھنٹے کے لئے شہر آنے کو رضامند ہو گئے۔ صفدر نے تمام حال باپ اور چچا یعنی ظفر کے والد کو سنایا۔ زنان خانے ہی میں انہیں پہلے نیم راضی کر لیا گیا۔ اب ظفر کی اندیشہ ناک حالت سے مجبور ہو کر انہوں نے اجازت دے دی کہ تم جانو جس طرح ہو سکے اس لڑکی کو راضی کر کے اس سے ظفر کا عقد کروا دو ہم رضامند ہیں۔

تمام رات کے جاگے ہوئے تھے۔ صفدر نے زبردستی ظفر کو آرام کرنے کو لٹا دیا۔ تھکن تو تھی ہی ظفر بے ہوش ہو کر سو گئے مگر صفدر اندر گئے۔ ماں، خالہ اور چچی وغیرہ کو بے حد انتظار تھا۔ سب حال ان سے بھی کہا اور نزہت کے پاس بیٹھے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

نزہت آرا اُن کی بھی خالہ زاد بہن تھی۔ کیوں کہ والدہ صفدر، والدہ ظفر اور والدہ نزہت تینوں حقیقی بہنیں بھی ہوتی تھیں مگر صفدر کو نزہت سے کچھ بہت ہی محبت و

موانست تھی۔ نزہت آرا نہایت خوش شکل، ہمدرد، خوش مزاج، تعلیم یافتہ لڑکی تھی اور چونکہ کنبہ بھر میں یہی ایک تعلیم یافتہ تھی۔ اس لئے **صفدر** بے حد چاہتا اور اس کی قدر کرتا تھا۔

چنانچہ نزہت نے اصرار سے کہا: "ہمیں بھی اپنی بھابی فیروزہ سے ملاؤ۔ جب بھائی جان اس قدر دیوانے ہورہے ہیں تو ہم بھی تو دیکھیں وہ کتنی حسین ہیں؟"

صفدر نے مسکرا کر چھیڑنے کو کہا: "کتنی بھی حسین ہوں۔ ہماری خوبصورت نزہت کے حسن کو کہاں پہنچتی ہیں۔"

نزہت کا دل مسکرا پڑا مگر اس نے بظاہر بگڑ کر کہا: "واہ آپ کو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔"

صفدر: "نہیں پیاری نزہت۔ بخدا مجھے تو تم اس لڑکی سے کہیں زیادہ حسین نظر آتی ہو۔ اپنی اپنی پسند ہے نا۔ برا ماننے کی کیا بات۔"

اسی طرح دیر تک ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں کہ خادمہ نے آکر کہا: "احمد آیا ہے۔ کہتا ہے۔ ظفر بلا رہے ہیں۔" چنانچہ **صفدر** باہر چلے گئے۔ وہاں دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر کو ظفر اندر آئے۔

پھر موٹر تیار کرائی اور گیارہ بجے سے پہلے خانقاہ پر پہنچ گئے۔

☆

مایوسی

جس قدر بے تابی سے ان دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ اسی قدر تیزی سے موٹر بھی برآمدے کے قریب پہنچی۔ دونوں اُترے اور اندر جانے لگے کہ آواز آئی: "ٹھہرو ٹھہرو کون ہے؟" اور فوراً ایک خوبصورت نوجوان سیاہ بوٹ اور انگریزی ٹوپی پہنے کمرے سے نکل آیا اور پھر پوچھا: "تم کون ہو۔ کیا کام ہے؟"

ظفر نے تعجب سے اس شخص کو دیکھا اور کہا "ہمیں مس جعفری سے ملنا ہے۔"

نوجوان: "اس وقت اُن کی طبیعت ناساز ہے۔ پھر کسی روز آیئے گا۔ اس وقت وہ نہیں مل سکتی ہیں۔"

بے پروائی سے کہتے ہوئے نوجوان اندر چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ اس وقت ان دونوں کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ دونوں متحیر تھے کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ ظفر کے دل کو اس قدر تکلیف محسوس ہوئی کہ وہ کھڑا نہ ہوسکا اور برآمدے کے ستون کے سہارے زمین پر بیٹھ گیا۔

صفدر: "ہیں ہیں۔ کیا حال ہے۔ اس قدر بھی نرم دل نہ بنو۔ بس اب صبر کرو۔ میرا تو خیال ہے یہی وجہ تھی کہ فیروزہ کل آپ سے برگشتہ ہورہی تھی اور اسی لیے اُس نے آپ سے خط و کتابت بھی بند کی۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس کا دل آپ سے پھر گیا ہے۔ خیر کیا مضائقہ ہے۔ اب بجائے رنج و غم کرنے کے اس کی بے وفائی کا خیال کرکے دل پر جبر کرو اور صبر سے کام لو۔

گو ظفر کے دل میں چھریاں چبھ رہی تھیں مگر اس نے استقلال سے کہا:

"پیارے صفدر یہ سب سہی مگر مجھ کو اس معصوم دل لڑکی پر کبھی بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ خیر میری بدنصیبی۔ چلو کچھ دیر خانقاہ پر ٹھہریں مجھے بہت ضعف معلوم ہو رہا ہے۔ طبیعت سنبھلے تو گھر چلیں گے۔"

دونوں وہاں سے اُٹھے اور ظفر خانقاہ کے احاطے میں آ کر ایک گھنے درخت کے نیچے گھاس پر لیٹ گیا۔ اس کی عجیب حالت تھی۔ اس کی نظروں میں اس وقت دُنیا اندھیری تھی۔ وہ زندگی سے بیزار تھا۔ دل کو مسل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ صفدر سمجھاتا رہا لیکن دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے اور ظفر کی طبیعت نہ سنبھلی۔

ایک بجے کچھ لوگ زیارت کرنے کے لئے شہر سے خانقاہ کو آئے تو یہ دونوں وہاں سے اُٹھے اور ظفر نے مردہ آواز سے کہا۔ "ایک بار اس جھونپڑی کو اور دیکھ لوں جس میں ہمیشہ کے لئے میری سب خوشیاں اور تمام آرزوئیں دفن ہو گئیں۔"

دونوں جھونپڑی کی پشت کی طرف گئے جہاں سے رات صفدر نے فیروزہ کی جان بچائی تھی ان کی خوش قسمتی سے اس وقت بھی ایک کھڑکی کے دونوں کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ دونوں بھائی بہت آہستہ آہستہ اور چپ چاپ بڑھے اور کھڑکی کے مقابل ایک درخت کی آڑ میں خاموش کھڑے ہو گئے۔

ان کی نظروں کے سامنے وہ دیوار تھی جس کا دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک مونڈھے پر وہ نوجوان ٹوپی اُتارے فیروزہ پر جھکا ہوا تھا اور دوسرے مونڈھے پر فیروزہ تھی۔ جس نے جھک کر اپنا سر اس نوجوان کے سینے سے لگا رکھا تھا اور غالباً رو رہی تھی کیوں کہ نوجوان کے ہاتھ میں رومال تھا اور بار بار اپنا ہاتھ اس کے رخساروں کے قریب لے جاتا دکھائی دیتا تھا مگر فیروزہ کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔

دونوں کو اس طرح کھڑے کھڑے پانچ چھ منٹ گزرے ہوں گے کہ اندر سے کچھ آواز آئی چونکہ ظفر اب کھڑکی کے زیادہ قریب آ گیا تھا۔ اس لئے اس گفتگو کو بخوبی سن لیا۔

"پیاری فیروزہ بس اپنے دل کو سنبھالو۔ دُنیا میں انسان کو سخت سے سخت صدمات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور وہ پھر جیتا ہے۔ تم نے اس عرصے اپنی کیا حالت بنالی۔ میں تم کو اب یہاں چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ اب چلو۔ میں تم سے ملنے نہیں آیا بلکہ تمہیں لینے

آیا ہوں۔"

فیروزہ: میں چلی چلوں گی مگر مجھے فیروز کی قبر تو معلوم ہی نہیں۔

نوجوان: "سب معلوم ہے۔قبر پر پھر آئیں گے۔تمہارے اماں ابا جان بھی تو آئیں گے۔اس وقت چلو۔تمہاری یہ حالت دیکھ کر میں دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔"

پھر ظفر کو نظر آیا کہ اس کی فیروزہ کا سفید و نازک ہاتھ اُس نوجوان نے اُٹھا کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔اب ظفر سے نہ دیکھا گیا وہ اس طرح پیچھے سرکا جیسے اسے کوئی تیر آلگا ہے۔

غضب ناک صفدر نے اسے اپنے بازوؤں پر سنبھالا اور بولا:

"اگر آپ کی بجائے یہ میرا معاملہ ہوتا اور میرے ہاتھ میں ایک پستول ہوتا تو میں ہرگز فائر کرنے سے نہ رُکتا اور ان دونوں کو بھی چمن سے نہ رہنے دیتا۔"

ظفر کچھ دیر خاموش رہا۔آخر بولا:

"ہائے کس دل سے۔میری فیروزہ کو خدا دُنیا میں راحت دے۔خواہ وہ کسی اور ہی کے ذریعے سے ہو۔ہاں اگر پستول ہوتا تو بخدا میں اس وقت اپنا کام تمام کر لیتا کیوں کہ میری زندگی اب بے سود ہے۔صفدر مجھے سنبھالو۔میرے قدم کانپ رہے ہیں میں گرا جاتا ہوں۔" اور پیچھے کو گر کر صفدر کے بازوؤں پر بے ہوش ہو گیا۔

صفدر بہت پریشان ہوا۔ظفر کو اس حالت میں چھوڑ کر چشمہ تک جانا بھی مشکل تھا۔ادھر اُدھر دیکھا۔قریب ہی پہاڑی کے ایک پتھر میں سے تھوڑا تھوڑا پانی رس رہا تھا جو گھاس پر سے بہتا ہوا نالی میں جا گرتا تھا۔صفدر نے اس کو غنیمت سمجھا اور اس سے اپنا رومال تر کر کے ظفر پر چھڑکا۔کچھ پانی ہاتھوں میں لے لے کر اس کے حلق میں پلایا۔غرض کہ پانچ سات منٹ کے بعد ظفر نے کچھ آنکھیں کھولیں تو اسے اُٹھا کر موٹر پر بٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ "افسر محل" پر پہنچے تو ظفر کو تیز بخار ہو گیا تھا مگر صفدر نے کسی سے خانقاہ کے صحیح حالات کا ذکر نہ کیا۔تقریباً ایک ہفتہ تک ظفر سخت بیمار رہا۔اور بیہوشی کی حالت میں وہ اکثر فیروزہ، انگشتری، بے وفائی وغیرہ لفظ بولتا رہا۔صفدر نے اس کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا اور پورے دل سے اس کی خدمت کی۔

جب ظفر کی حالت کسی قدر سنبھلی اور وہ بیٹھنے کے قابل ہوا تو ایک روز وہ ضد کر کے صفدر کے ہمراہ خانقاہ پر گیا۔ مگر اب وہاں اس جھونپڑی کا دروازہ ویرانی کا منہ کھولے ہوئے تھا۔ اندر گئے تو سوائے ٹوٹے ہوئے سونڈھوں کے کوئی چیز نہ پائی۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور ویرانی۔ یہ کیفیت دیکھ کر ظفر اس کوٹھری میں فیروزہ کے بستر کی جگہ پر بیٹھ کر بچوں کی طرح خوب پھوٹ پھوٹ کر دل کا خون رویا۔ صفدر کا دل بھی بھر آیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ دونوں اُٹھے اور خانقاہ کے مجاور سے سیاہ پوش لڑکی کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پانچ چھ ماہ سے یہاں قیام پذیر تھی اور کل شام کو ایک شریف نوجوان کے ہمراہ خانقاہ میں آئی تھی۔ دونوں نے فاتحہ پڑھی اور جو کچھ سامان اس کے پاس جھونپڑی میں تھا وہ میرے حوالے کیا اور بتایا کہ ”کل ہی شب کو ۹ بجے کی گاڑی سے میں کہیں چلی جاؤں گی۔“

یہ رُوح فرسا خبر سن کر ظفر کا دل بھاری ہو گیا۔ اس سے وہاں نہ ٹھہرا گیا۔ دونوں اپنے مکان کو واپس آ گئے مگر جب ظفر کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی تو تبدیل آب و ہوا کے لئے صفدر ظفر کو اپنے ہمراہ مسوری لے گیا۔

بمبئی

سیٹھ محمد ابراہیم جعفرجی مرحوم کی کوٹھی واقع ماؤنٹ روڈ بمبئی میں جو عرصہ آٹھ نو ماہ سے بند پڑی تھی۔ اب پھر چہل پہل ہے۔ سیٹھ مرحوم کے بیٹے محمد مقیم جعفرجی کو کئی تین ہفتے کا عرصہ ہوا۔ جاپان سے اپنے خاندان کے ہمراہ یہاں آ کر مقیم ہوئے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے والد اور اکلوتے لڑکے کی موت کی خبر سنی۔ تو اپنی لڑکی فیروزہ کو بلایا۔ خط لکھے، تار دیئے، مگر جب وہ نہ گئی تو اپنا ایجنٹ اس کے لینے کو ہندوستان بھیجا۔ تب بھی وہ آنے پر رضامند نہ ہوئی تو مجبوراً خود آ گئے۔ کیوں کہ یہاں اب ان کا کوئی اور عزیز نہ تھا جس کے بھروسہ پر فیروزہ کو تنہا چھوڑ دیتے۔

سیٹھ مرحوم عرب سے تنہا آ کر بمبئی میں آباد ہوئے تھے اور ایک ایرانی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ جس کے والدین زندہ تھے اور جو اسکول میں پڑھتی تھی۔ جب ان کے اولاد ہوئی اور سیٹھ مقیم جوان ہوئے تو انہوں نے جاپان میں تجارت شروع کر دی۔ چنانچہ چھوٹی لڑکی، بیوی اور چھوٹے بھائی سیٹھ کریم جی کو وہ اپنے ہمراہ جاپان لے گئے اور ان کے لڑکے فیروز اور لڑکی فیروزہ کو بڑے سیٹھ صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ عرصے بعد جب اُن کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تو یہی دونوں بچے ان کی زندگی کا سہارا رہ گئے۔

ایک سال انہیں معہ پوتی پوتے کے موسم گرما مسوری میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں ہمارے ظفر کا خاندان بھی مقیم تھا۔ بس فیروزہ ابھی پندرہ سال کی کم سمجھ لڑکی تھی کہ مسوری میں ملاقات ظفر سے ہو گئی اور چار ماہ میں اُن کی دوستی اور محبت اتنی بڑھ گئی گویا سالہا سال کے عاشق و معشوق ہیں۔

اکتوبر میں جب سیٹھ صاحب بمبئی اور ظفر کے گھر والے دہرہ دون جانے لگے تو دونوں کو یہ صدمہ سخت شاق گزرا اور ظفر اور فیروزہ رو رو کر جدا ہوئے۔ اس وقت تو فیروزہ چلی گئی مگر دوسرے سال ستمبر میں وہ پھر معہ دادا کے مسوری آئی اور اب کے فیروز کو مسوری کے یورپین اسکول میں داخل کروا دیا۔ اور خود دہرہ دون گرل اسکول میں داخل ہوگئی۔ مجبوراً دادا اکیلے بمبئی واپس چلے گئے۔

ایک سال بعد جب فیروزہ انٹرنس پاس کر چکی۔ تو دادا نے اسے پھر بمبئی واپس بلانا چاہا مگر فیروزہ نے نہ جانا چاہا اور مسوری کالج میں پڑھنے لگی۔ تب سیٹھ صاحب نے دہرہ دون میں اس کے لئے ایک کوٹھی خریدی۔ کیوں کہ وہ کروڑ پتی تاجر تھے۔ شان سے رہنا اور رکھنا فرض تھا اور خود بھی برس میں چھ ماہ یہاں رہ جاتے تھے مگر آہ فیروز کی اچانک وفات نے سب خاک میں ملا دیا۔

فیروزہ ظفر کو تو چاہتی تھی۔ مگر بھائی کی جان میں اس کی جان تھی اور اس کے انتقال سے وہ دیوانی ہوگئی۔ اب اس کی چھوٹی بہن زہرہ بھی فیروزہ تمثال حسین جوان ہوگئی تھی اور اس کی نسبت ٹھہر چکی تھی۔

اس وقت سیٹھ منیم جعفر جی فیروزہ کو اپنے ہمراہ لے جانے اور بمبئی کی کوٹھی اور دکان کا انتظام کرنے کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔

جس روز کا ذکر ہے۔ اس دن فیروزہ کو بمبئی پہنچے ہوئے بیس روز کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اوّل اوّل تو سب دوست احباب تعزیت کو آتے رہے مگر اب اُن کی آمد کی خوشی میں دعوتیں ہو رہی ہیں۔

فیروز کے انتقال کو گیارہ ماہ گزر گئے ہیں اور چھوٹی لڑکی کی شادی برسی کے بعد قرار پائی ہے۔ حسین و جمیل فیروزہ کو بمبئی والے آنکھوں پر جگہ دے رہے ہیں مگر وہ کسی طرح بشاش ہوتی نظر نہیں آتی۔ چہرہ زرد اور افسردہ رہتا ہے۔ لیکن بادل ناخواستہ والدین کی خوشی کے خیال سے دعوت وغیرہ میں چلی جاتی ہے۔ آج بھی ملک التجار سیٹھ اسمٰعیل احمد ابراہیم کے عظیم الشان محل میں ان کو ڈنر دیا گیا ہے۔

ان کا یہ محل ابھی تیار ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب کا بڑا لڑکا بھی جو اس ہفتے ولایت سے

سول سروس کا امتحان پاس کر کے آیا ہے۔ شریک دعوت ہے۔ شام کے چھ بج چکے ہیں۔ مسز منیم جی دونوں لڑکیوں سمیت باغ میں ٹہل رہی ہیں۔

زہرہ: "اماں جان شام ہو گئی۔ چلئے کپڑے بدلیں۔ فیروزہ آپا آپ بھی چلیں۔"

فیروزہ: "میرے کپڑے تو اچھے خاصے ہیں۔ ان کو کیا بدلوں؟"

زہرہ: "واہ آپی ساڑی کچے رنگ کی ہے۔ تمام دھبے پڑ گئے ہیں۔ بری معلوم ہوتی ہے۔"

مسز منیم جی: "تو یہ بدلیں گی بھی کیا۔ خاکی اُتاریں گی کالی پہن لیں گی۔"

فیروزہ: "ہاں وہی سیاہ بنارسی ساڑی پہن لیتی ہوں جو کل خریدی ہے۔"

زہرہ: "واہ۔ وہ نہ پہننا، کالی سوگ کی نشانی، بیل بہت ہی پتلی سی ہے۔ تمام ساڑی سیاہ نظر آتی ہے۔"

تینوں اپنے اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئیں مگر جب موٹر پر سوار ہونے لگیں تو ماں بیٹیوں نے دیکھا کہ فیروزہ وہی سیاہ بنارسی ساڑی اور ایک معمولی سفید ریشمی بلاؤس پہنے ہے۔ زہرہ نہایت نازک زیور پہنے ہوئے تھی مگر فیروزہ کے ہاتھ میں ایک بے نگ کی انگشتری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مسز منیم جی افسردہ ہو گئیں۔ زہرہ بھی دل میں جلی مگر کچھ نہ بولی کیوں کہ سب عزیز فیروزہ کو سمجھا سمجھا کر عاجز آ گئے تھے۔

آدھے گھنٹہ میں ان کی موٹر اسٹیل لاج میں داخل ہو گئی۔ جو بجلی کے لیمپوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ موٹر برآمدے کے آگے آ کر ٹھہر گئی۔ ایک خوش شکل وخوش اوضاع یورپین گورنس مہمانوں کے استقبال کو سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ پکڑ کر مسکراتے ہوئے ان کو اتروایا اور ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

یہاں سیٹھ منیم اور کریم جی دونوں بھائی مع مسٹر کامران (زہرہ کے منگیتر) کے پہلے سے موجود تھے۔ چند اور نوجوان حسین لڑکیاں بھی جمع تھیں جو ان لوگوں سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ زہرہ ان تاروں کی محفل میں ماہ چہاردہم کے مانند چمک رہی تھی۔ سرخ وسفید رنگت پر گہری زمرّدین بنارسی ساڑی جگمگ جگمگ کر رہی تھی اور آتشی گلابی رنگ کے جاپانی ریشم کی بلاؤس پر بڑے بڑے سفید موتیوں کی مالائیں ملتی تھی جیسے شفق میں بجلی کوند جائے

اور بار بار لوگوں کی نگاہیں اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔

زہرہ ہاتھوں کے اشاروں سے اپنی دوست لڑکیوں سے ہنسی کی باتیں کر رہی تھی اور ہاتھ ہلنے سے انگوٹھیوں کے قیمتی نگینے برقی روشنی میں جگنوؤں کی طرح چمک اُٹھتے تھے اور کامران خوش قسمت کامران کا دل اپنی منگیتر کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ آہ کہاں ہے اس وقت بدقسمت ظفر کہ وہ بھی اس منظر رنگین کو ایک نظر دیکھ لے۔ اس کی سوگ نشین فیروزہ صوفے کے ایک کنارے پر غم والم کی ایک زندہ تصویر بنی بیٹھی ہے اور ایک بزرگ بی بی سے کچھ باتیں کر رہی ہے۔ بار بار اس کا گورا چٹا اور زرد چہرہ اور سیاہ ساڑی کا آنچل ہٹ جانے سے یوں باہر نکل پڑتا ہے۔ جیسے چاند بادلوں کے نقاب سے مضطرب ہو کر جھانکنے لگے۔

مس اسمٰعیل اور اُن کے بھائی مسٹر اسحٰق نہایت ادب اور تکلف سے سب کو پان اور الا ئچی تقسیم کر رہے ہیں۔ مس اسمٰعیل گو رنگ کی سانولی ہیں مگر ہیں جامہ زیب اور خط و خال کی اچھی ہیں۔ وہ اس وقت ہلکی گلابی باریک بادلہ بھری ساڑی اور گلابی بلاؤس پہنے ہیں۔ انہوں نے زہرہ کی طرح سفید سفید موتوں کا زیور نہیں پہنا ہے۔ ہاتھوں میں سرخ جڑاؤ چوڑیاں ہیں۔ سرخ ہی نگ کی انگوٹھیاں ہیں اور ان ہاتھوں میں سبز پانوں کی گلوریاں کچھ عجب بہار دکھا رہی ہیں۔

ان کا نوجوان اور خوش وضع بھائی عنقریب پونا کی ڈپٹی کمشنری کا چارج لینے والا ہے۔ وہ فاختئی رنگ کا سوٹ پہنے ایک ہاتھ میں اپنی ٹوپی لئے دوسرے ہاتھ سے مہمانوں کو الا ئچی سگریٹ وغیرہ پیش کر رہا ہے۔ آہ کیسا دلچسپ منظر! فیروزہ خوش نصیب مس اسمٰعیل جی کی یہ رنگین ساعتیں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹ رہی ہے کہ یہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہے۔ اس کا بھائی جوان ہو چکا ہے۔ تعلیم پا چکا ہے۔ اب دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ اس وقت اپنی بہن کے ساتھ کس خوشی سے معروف تواضع ہے اور ایک میں بدنصیب ہوں کہ ایک اکلوتا بھائی تھا۔ کوئی خوشی بھی نصیب نہ ہوئی تھی کہ داغ جدائی دے گیا۔ اگر زندہ ہوتا تو وہ بھی ایک روز اسی طرح ولایت سے واپس آتا اور وہ دن میرے لئے کس قدر روشن دن ہوتا۔

اوّل تو عورت پھر رنج کھا کھا کر سخت رقیق القلب ہو گئی تھی۔ برداشت نہ کر سکی۔ آنسوؤں کا طوفان اُمڈ آیا اور گرمی کا عذر کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی اور دالان میں

ٹہلنے لگی۔

اس کے باہر آنے کے چند ہی منٹ بعد متواضع اور خوش اخلاق میزبان مسٹر اسحٰق ہاتھ میں لیمونیڈ اور برف کا گلاس لئے باہر والان میں آیا اور نہایت منکسرانہ طور پر فیروزہ کو پیش کر کے کہا: "آپ گرمی سے گھبرا گئی ہیں۔ یہ تھوڑا سا سرد پانی پیجئے طبیعت بحال ہو جائے گی۔"

فیروزہ کچھ کھوسی گئی۔ اس نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھ کر کہا: "آپ کی مہربانی۔ آپ نے اس قدر زحمت کیوں فرمائی کہ خود گلاس اُٹھا کر لائے۔ کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔"

اسحٰق نے کمال خندہ روئی سے کہا۔ "کوئی تکلیف نہیں بلکہ ایسی معزز اور قابل لیڈی کی خدمت میرے لئے باعث فخر ہے۔ فیروزہ نے بصد مشکل چہرے پر کچھ تبسم پیدا کیا اور اسحٰق کے ہاتھ سے گلاس لے کر آدھے کے قریب پی لیا کہ کسی طرح اسحٰق اس کے پاس سے چلا جائے مگر وہ کھڑا رہا اور کچھ دیر بعد بولا:

یہاں بھی کچھ ہوا نہیں ہے۔ کمرے میں تو پنکھا بھی چل رہا تھا۔ آپ کو گرمی محسوس ہو رہی ہوگی۔ ذرا تکلیف فرما کر اس کرسی پر تشریف رکھئے۔ میں ابھی اندر سے چھوٹا پنکھا منگا تا ہوں۔ وہیں گلاب کی ٹہنی سے ایک گھنٹی بندھی تھی۔ وہ بجائی۔ فوراً خادم حاضر ہوا۔ اس سے چھوٹا برقی پنکھا منگا کر میز پر رکھا اور اسے چلا دیا۔ فیروزہ مجبوراً کرسی پر بھی اس خیال سے جلد بیٹھ گئی کہ جب اس کے سب کہنے مان لوں گی تو یہ چلا جائے گا مگر وہ اب بھی نہ گیا اور بولا:

اسحٰق: "ان دنوں آپ کی صحت کچھ درست معلوم نہیں ہوتی۔ چہرہ بھی نہایت مضمحل اور کمزور سا نظر آتا ہے۔"

فیروزہ نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں چند ہفتے سے کچھ تندرست نہیں ہوں۔ آپ جائیے۔ شاید کمرے میں کسی کو آپ کی تلاش نہ ہو۔"

مسٹر اسحٰق نے کسی قدر مسکرا کر کہا۔ "نہیں میری تلاش کسے ہو سکتی ہے لیکن اگر میری موجودگی آپ کے لئے بار خاطر ہے تو اجازت چاہتا ہوں۔"

اسحٰق اندر چلا گیا اور شاید اسی نے اندر جا کر کہا جو ذرا دیر بعد مس اسمٰعیل جی باہر آئیں اور بصد اصرار فیروزہ کو یہ کہہ کر ڈرائنگ روم میں لے گئیں کہ "ہز آنر مع لیڈی صاحبہ

کے تشریف لے آئے ہیں اور پھر ڈائننگ ہال کا وقت بھی قریب ہے۔"

آج ڈنر بھی مناسب وقت سے کسی قدر جلدی ہوا تھا۔ کیوں کہ ہز آنر لفٹننٹ گورنر پنجاب آج رات لاہور روانہ ہونے والے تھے غرض کہ بخیر وخوبی ڈنر ختم ہوا اور پھر باجے وغیرہ بجنے لگے۔

مسٹر اٰلحق نے فیروزہ کی خاطر مدارات میں خاص حصہ لیا جو معصوم فیروزہ کو کچھ ناگوار گزرا۔ ابھی گیارہ بھی نہ بجنے پائے تھے کہ فیروزہ سب مجمع کو وہیں چھوڑ کر اور سر کے درد کا عذر کر کے اپنے اسی نوجوان عزیز کے ساتھ جواسے دہرہ دون کی خانقاہ سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ اپنی کوٹھی واپس چلی آئی مگر میزبانوں کے اصرار سے سیٹھ صاحب اور اُن کی بیوی اور زہرہ و کامران وغیرہ ایک گھنٹہ اور ٹھہرے۔

اس کے بعد سے اٰلحق اکثر مجبوراً فیروزہ کی ملاقات کو آتے رہتے۔ فیروزہ کے لئے تحفے بھیجتے۔ باغوں میں ان سے ملتے اور آخر ایک روز جھجکتے جھجکتے شادی کی درخواست بھی کر بیٹھے۔

اُن کے والدین نے فیروزہ کی والدہ سے کہا۔" مگر فیروزہ نے اوّل تو قطعی انکار کیا لیکن زیادہ اصرار پر یہ کہہ کر ٹال دیا کہ" ابھی میں ڈاکٹری پڑھنے انگلینڈ جاؤں گی۔ واپس آنے پر دیکھا جائے گا۔"

ناکام ونامراد مسٹر اٰلحق اپنی جائے تعیناتی پر چلے گئے لیکن دل میں یہ عہد کر لیا کہ حتیٰ الوسع فیروزہ کے سوا اور کسی عورت کو اپنی رفیق زندگی نہ بناؤں گا۔

تین ماہ کے بعد فیروزہ بھی اپنی والدین کے ساتھ جاپان روانہ ہوگئی مگر زہرہ مس کامران یہیں رہیں۔ کیوں کہ کامران ڈاکٹر تھا اور یہیں ملازم۔ ظفر کے علاوہ اب اٰلحق کے دل پر بھی فیروزہ کی صورت کا گہرا نقش بیٹھ گیا۔

☆

مسوری

یہ جس زمانہ کا ذکر ہے۔ اس وقت فیروزہ کو اپنے والدین کے ساتھ جاپان گئے چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مایوسیوں کی بدولت ظفر کا پہلا شوق بیتاب اب ایک صبر مجبور میں بدل کر رہ گیا ہے اور گو وہ ابھی تک زندگی کے اس خوشگوار مرحلے میں ہے جسے شباب کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر وہ پہلی حرارت شباب سرد پڑ چکی ہے اور وہ یاس وحسرت کی زندہ تصویر ہے اور چونکہ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور والدین کی تمام اُمیدیں اسی کے دم سے وابستہ تھیں۔ اس لئے اُس نے اُن کی پریشان اور متفکر حالت پر رحم کیا اور دل پر نہایت جبر کر کے شادی کر لی ہے اور اب دو بچوں کا باپ ہے۔

جب ظفر نے آخری بار فیروزہ کو خانقاہ میں ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ دیکھا تھا اور پھر وہ جھونپڑی سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد ظفر کی شادی ایک ہندوستانی تعلیم یافتہ لڑکی بنت نواب رشید الدین حیدر صاحب دہلوی سے ہو گئی۔ بیوی حسین، سمجھدار اور مزاج شناس ملی۔ اس کی پریشانیوں میں اس کو تسلی دینے والی اور اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے والی۔ تھوڑے ہی عرصے میں میاں کی آنکھوں کا تارا بن گئی اور ظفر سب گھر کی توقع کے برخلاف بیوی پر جان دینے لگا مگر اب بھی جب کبھی فیروزہ کا خیال آجاتا تھا تو مندمل زخموں میں پھر ٹیسیں اٹھتیں۔ دل ٹوٹنے لگتا اور وہ اپنی بدنصیبی اور فیروزہ کی بے وفائی پر سرد آہیں بھرنے لگتا۔

اس وقت ماشاء اللہ ظفر دو ننھے بچوں کا باپ ہے۔ ماہ اپریل آدھے کے قریب گزر چکا ہے کہ ظفر تین ماہ کی رُخصت لے کر مع بیوی بچوں کے مسوری آگیا اور اُن کے

ساتھ نیا بیاہا جوڑا مسٹر صفدر و نزہت آرا بیگم (جواب مسز صفدر تھیں) بھی تھے۔ انہوں نے سوائے ہوٹل کے قریب ایک عالی شان کوٹھی لے لی اور اس میں اکٹھے رہنے لگے۔

انجینئر صاحب یعنی مسٹر ظفر کے بچوں کی نگرانی و پرورش پر ایک یورپین گورنس مقرر تھی۔ وہ بھی ساتھ آئی اور چونکہ مسٹر ظفر پردہ کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اکثر شام کو ان کی بیوی، بھاوج نزہت آرا اور گورنس مس سٹیلی ہوا خوری کو نکلا کرتی تھیں اور کبھی کبھی ظفر اور صفدر بھی ساتھ ہولیا کرتے تھے۔

مسوری کا یہ موسم نہایت ہی خوشگوار اور پرفضا ہے۔ چونکہ ابھی برسات میں کچھ عرصہ باقی ہے۔ اس لئے موسم بہار کے رنگ برنگ کے خوشنما پھول اپنی پوری شادابی پر ہیں اور اُن کے مختلف رنگوں کے تختے عجیب بہار دکھاتے ہیں۔ چنانچہ اکثر شائقین اس پرلطف موسم سے حظ اُٹھانے کو گرمی کی شدت سے پیشتر ہی مسوری چلے آئے ہیں۔

ان لوگوں کو یہاں آئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ دن کے تین بجے ہوں گے کہ صفدر اپنے کمرے سے نکل کر اور گیلری میں صرف ایک آواز دے کر کہ "ہم آجائیں" ظفر کے کمرے میں داخل ہوگئے مگر دروازے کے پردے کے باہر کھڑے رہے۔

ظفر: (مسہری پر سے) "ارے بھائی اب رُک کیوں گئے؟ جالی کے پردے میں ٹھہرنا نہ ٹھہرنا برابر ہے۔ چلے آؤ۔"

صفدر: (ہنستے ہوئے) "ذرا بھابی جان کا خوف تھا۔" (اور مسہری کے پاس والی کرسی پر آبیٹھے)۔

ظفر: "وہ تم سے ناراض نہیں ہوسکتیں بلکہ مجھ سے زیادہ اُن کی تمہاری محبت اور بے تکلفی ہے لیکن صفدر اس میں شک نہیں کہ یہاں پہاڑ پر تم بہت ہی بیباک ہوئے جاتے ہو۔"

صفدر: "بھائی بات یہ ہے کہ یہاں بزرگ تو ہوتے نہیں جن کا خوف ہو یا بے شرم کہلانے کی شرم ہو۔ پھر آپس میں کیا تکلف۔ بھابی ہیں کہاں بولتی نہیں؟"

ظفر: "ابھی ابھی وہ گورنس کے کمرے میں گئی ہیں۔ آج اظہر کو (ظفر کا بچہ) بخار ہوگیا ہے۔"

صفدر: "تو پھر آپ اکیلے یہاں کیا کر رہے ہیں۔ نزہت اکیلی ہیں۔ چلئے وہاں بیٹھیں۔"

ظفر: "ہاں چار بج رہے ہیں۔ اب اُٹھنا چاہئے۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ذرا لائبریری بازار چلیں گے۔"

صفدر: "پیدل پر؟"

ظفر: "نہیں ویسے ہی ٹہلنے کو کئی روز سے گھر سے نکلنا ہی نہیں ہوا۔"

چنانچہ دونوں اُٹھے اپنے اپنے "باتھ روم" گئے کپڑے بدلے اور جب چاروں ڈرائنگ رُوم میں جمع ہو گئے تو چھوکرا چاء لایا اور درمیان میں چھوٹی گول میز پر رکھ دی جس کے گرد چاروں کی کرسیاں تھیں۔

اس وقت اس کمرے کا نہایت دلفریب منظر تھا۔ چاروں طرف کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے تھے جن میں سے پھولوں کی خوشبو، ہلکی ہلکی روشنی اور تازہ ہوا کے جھونکے داخل ہو ہو کر روح کی فرحت وانبساط کا باعث ہو رہے تھے۔ کمرے کے اندر خوبصورت گلدانوں اور گملوں کے پھول پتے باہر کی ہوا کے سرد جھونکوں سے مست ہو ہو کر جھوم رہے تھے۔ اور دونوں خوبصورت نوجوان بادامی ریشمی سوٹ پہنے سروں سے ٹوپیاں اُتارے بے تکلف بیٹھے تھے اور ان کی حسین رفیق عمر جن کو اس وقت خوش رنگ تیتریاں کہا جائے تو بجا ہے۔ پچرنگی یعنی کاسنی، آبی، گلابی، عنابی، دھانی، ہلکے رنگ کی باریک ریشمی ساڑیاں پہنے عجیب ناز سے بیٹھی تھیں۔ مسز ظفر تو تھیں ہی حسین، اور اپنے قدر دان شوہر کے لئے فیروزہ سے بہتر رفیقِ عمر ثابت ہو رہی تھیں مگر نزہت نے بھی شادی کے بعد غضب کا روپ نکالا تھا۔

چائے کی کشتی میز پر رکھی گئی تو ظفر کی فرمائش پر صفدر کی دُلہن نزہت آرا نے اپنے نازک نازک ہاتھوں سے سب کو چائے بنا کر دی۔ اتنے میں ظفر کی دو سال کی ننھی لڑکی عذرا آیا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس ننھی سی پری کو دیکھ کر سب کے دل پھولوں کی طرح کھل گئے اور ایک ایک نے گود میں اُٹھا کر اُسے چاء اور مٹھائی کھلانی شروع کی۔

چاء سے فراغت پانے کے بعد چلنے کی صلاح ہوئی۔ آج یہ تجویز ٹھہری کہ ظفر اور صفدر جدھر چاہیں جائیں کیوں کہ انہیں کچھ دوستوں سے ملنا تھا اور بیگمات تھوڑی دیر کے

بعد باہر نکلیں۔ چنانچہ وہ دونوں ٹوپیاں اُٹھا، سگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور لڑکا پیچھے پیچھے چھتریاں لے گیا وہ دونوں باتیں کرتے کرتے اور نظارے کا لطف اُٹھاتے ہوئے کوٹھی سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر نکل گئے اور وہاں جا کر ایک سبز پہاڑی پر جو رنگارنگ کے پھولوں سے لدرہی تھی، رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔

ظفر: ''بھئی آج کل تو سچ مچ مسوری بہشت ہے۔ کہو مسز صفدر بھی خوش ہیں؟''

صفدر: (مسکراتے ہوئے) ''بھائی ہمیں سب ہی جگہ بہشت ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ آپ کی اور بھابی جان کی عنایت اور محبت سے مسوری کے آگے آج کل بہشت بھی حقیقت رکھتی نظر نہیں آتی۔ ہمیں تو گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ ابھی چوتھی چالے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ کسی نے کہا کہ ''بیاہ کو ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے۔ کیسے بے حیا ہیں۔ اکیلے پہاڑ جا رہے ہیں''۔ کوئی بولا ''انگریزوں کی نقل بھی تو کرنی ٹھہری ہنی مون منانے چلے ہیں۔'' مگر بھائی نے سب کی سنی اور کچھ نہ بولا اور انہیں ساتھ لے کر آ ہی گیا۔''

ظفر: ''صفدر سچ کہتا ہوں مَیں بھی صرف تمہارے ہنی مون کے لئے ہی بہت مشکل سے رُخصت لے کر آیا کیوں کہ اگر میں نہ آتا تو پھر تم بھی نہ آسکتے۔''

ان کا سلسلہ گفتگو یہیں تک پہنچا تھا کہ بالکل اُن کے قریب سے ایک ہندوستانی فیشن ایبل جوڑا ان کو گھورتا اور چھتریاں گھماتا ہوا یوں آہستہ آہستہ گزرا۔ گویا کوشش کی کہ اُن کو پہچان سکیں یا اپنی طرف متوجہ کرالیں۔

ان کے اس طرز عمل سے یہ دونوں کچھ متاثر ہو کر وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ معلوم کرنے کو کہ یہ کون ہیں۔ اُن کے پیچھے لپکے۔ یہ چند قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک اور ہندوستانی مسلمان جنٹلمین تیز قدمی سے اُن کی طرف آتا دکھائی دیا جو اس اگلے جوڑے سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ٹھہرو ٹھہرو میں بھی آ پہنچا۔ کہاں جاتے ہو؟ لائبریری بازار چلیں گے۔ وہ دونوں ٹھہر گئے اور مرد نے مڑ کر جواب دیا۔ ''ہم تو ادھر ہی جا رہے ہیں۔ وہاں مسٹر لال چند سے ملنے کا وعدہ ہے۔'' وہ جنٹلمین اور وہ دونوں ساتھ ساتھ ہو لئے اور یہ دونوں بھائی اُن کے پیچھے آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرتے ہوئے چلے۔

ظفر: ''صفدر تم نے کچھ خیال کیا؟''

صفدر: "کیا"؟

ظفر: "اس حسین لیڈی کو دیکھ کر کچھ یاد آیا۔"

صفدر: "جانے دو۔ بس اب یادو داد کا زمانہ نہیں ہے۔ تم اب بچوں کے باپ ہو اور ایک اور دل کے مالک جو تمہارا ہو چکا ہے۔"

ظفر: "ظالم سمجھ تو تُو بھی گیا تھا، خیال بھی آ گیا تھا، مگر انجان بنا رہا۔ بھائی زمانہ ہو یا نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے اور مجھ کو اپنی بیوی اور اپنے فرائض کا جس قدر خیال ہے۔ اس سے تم آگاہ ہی ہو۔ مگر میاں یاد ہی تو ہے، اگر کبھی آ جائے، تو کیا گناہ ہے؟ مگر صفدر یہ لیڈی کس قدر فیروزہ کے شبیہ ہے۔ طرزِ لباس، وضع بالکل وہی۔"

صفدر: "خدا نے بہت سی صورتیں یکساں بنائی ہیں۔ بھائی سچ تو یہ ہے کہ جب وہ ہماری طرف گھور گھور کر چل رہی تھی تو میں دل میں سہم رہا تھا کہ آپ کو فیروزہ یاد آ جائیں گی۔"

ظفر: "کہیں وہی نہ ہو۔ آخر چار سال گزر چکے ہیں۔ حالت میں کسی قدر تبدیلی ہو جانا کیا عجب ہے۔ لیکن یہ ساتھ والا جنٹلمین وہ شخص نہیں جسے ہم نے درگاہ میں دیکھا تھا۔ صفدر دیکھو اب میرا دل کس قدر پتھر ہو گیا ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہوں کیا کیا خیال کر رہا ہوں مگر برداشت کی طاقت ہے۔ حقیقت میں مرد سنگ دل ہوتے ہیں۔"

صفدر: "مگر آپ کی بے وفا محبوبہ آپ سے بھی زیادہ سنگ دل تھی۔ اچھا چلو۔ اب کہیں چلیں۔"

ظفر: "ہم بھی لائبریری ہی چلیں گے۔ شاید وہاں کچھ پتہ لگے کہ یہ لیڈی کون ہے؟"

صفدر: "مگر اس سے فائدہ بھی کچھ؟ اگر معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل فیروزہ ہے، شادی کر چکی ہے، اور وہ شخص اس کا شوہر ہے تو کیا کرو گے؟ فضول رنج ہو گا۔ بس جانے دو۔"

ظفر: "رنج کاہے کا۔ کیا میں نے شادی نہیں کر لی پھر وہ کیوں تباہ ہوتی؟"

غرض کہ اس گفتگو میں دونوں لائبریری بازار پہنچے۔ وہاں آج بینڈ تھا۔ بنچوں پر بہت سے خوش دل جمع تھے۔ رکشا، ڈانڈیوں اور قلیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ راستہ چلنا

مشکل ہو رہا تھا۔ یہ دونوں اس انتظار میں تھے کہ وہ تینوں ساتھی بیٹھ چکیں تو ہم بھی اُن کے قریب ہی بیٹھ جائیں کہ ان کے متعلق کچھ علم حاصل ہو۔ وہیں کھڑے ہوئے انہیں اپنا ایک ہندو دوست ڈُنی چند ملا جس نے بمبئی میں تجارت کا سلسلہ شروع کر لیا تھا اور جو ظفر کی داستانِ محبت کا راز دار بھی تھا۔

صفدر: ''بھئی ڈُنی چند ہمیں ایک ضروری جستجو ہے۔ کیا کچھ مدد کر سکو گے؟''

ڈُنی چند: ''کہیے۔''

صفدر: ''تم بمبئی سے آ رہے ہو نا؟''

ڈُنی چند: ''ہاں ہاں۔ مسٹر ظفر کو تو اس کا علم ہے۔''

صفدر: ''تو انہوں نے وہاں کے حالات آپ سے نہیں پوچھے؟''

ڈُنی چند: ''اب بے چارے کیا پوچھتے۔ چار سال گزر رے۔ وہ جاپان چلی گئی ہیں۔''

ظفر: ''جاپان؟ کیا والدین کے پاس گئی ہیں۔ تمہیں بخوبی معلوم ہے؟''

ڈُنی چند: جی ہاں خوب۔ میرا تو دو سال سے بمبئی ہی میں قیام ہے مگر میری بیوی سے فیروزہ کی ہمشیرہ کی دوستی ہو گئی ہے۔ اُن کے ذریعے یہ سنا تھا۔''

ظفر: ''ارے تو تم اس کے خاندان کے باقاعدہ دوست بن چکے ہو۔ بھئی اگر ان کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو تو بتاؤ۔''

ڈُنی چند: فیروزہ جعفر جی کی چھوٹی ہمشیرہ زہرا کامران تو آج کل یہیں مسوری پر ہیں۔ آپ سے شاید اُن کی ملاقات نہیں ہے۔ دیکھئے ابھی ملاتا ہوں۔ وہ یقیناً اس وقت یہیں موجود ہوں گی اور سنئے۔ فیروزہ کے متعلق ایک رنجیدہ خبر بھی ہے۔''

ظفر کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے دہشت سے پوچھا۔ ''کیا''؟

ڈُنی چند اس کی حالت پر مسکرایا اور بولا ''آپ گھبرا گئے۔ کوئی خطرناک بات نہیں۔ ایک ڈپٹی کمشنر سے ان کی نسبت ہو رہی ہے اور اتفاق سے وہ صاحب بھی آج کل یہیں ہیں۔ شاید آپ سے تو تعارف ہو چکا ہوگا۔ مسٹر اسحٰق ایم اے ڈپٹی کمشنر ملک التجار سیٹھ اسمٰعیل جی آف بمبئی کے صاحبزادے ہیں نہیں؟ ٹھہریئے وہ دونوں یہاں موجود ہوئے تو

میں اسی وقت ان سے آپ کی ملاقات کرادونگا۔"

صفدر: "بھئی تم نے تو عجیب غریب خبریں سنائیں۔ فیروزہ اب تک کنواری رہی۔ تعجب ہے اور اُن کے بہن بھائی اور آئندہ ہونے والے شوہر یہیں مسوری بلکہ اس جگہ ہیں۔ بھئی ملنا چاہئے، کہو بھائی ظفر ملاقات کیجئے گا؟"

ظفر نے مردہ آواز سے کہا" کیا مضائقہ ہے۔"

ڈُنی چند: "میں انہیں دیکھتا ہوں وہ اس پارٹی میں ہوں گے۔ جہاں مہاراجہ کپورتھلہ کے بھتیجے وغیرہ بیٹھے ہیں۔ ان سے اُن کے تعلقات ہیں" یہ کہہ کر ڈُنی چند ان کو تلاش کرنے بھیڑ میں غائب ہو گئے۔"

ظفر: "صفدر میرا خیال ہے وہ لیڈی ضرور فیروزہ کی ہمشیرہ ہے اور وہ تیسرا جنٹلمین یقیناً الّو ہوگا۔ کتنا خوش نصیب شخص ہے جسے اللہ فیروزہ جیسی نعمت بخشنے والا ہے۔"

اتنے میں ڈُنی چند کچھ فاصلہ پر مسٹر اور مسز کامران سے باتیں کرتا ہوا دکھائی دیا۔

ڈُنی چند: "مسٹر کامران مزاج بخیریت؟"

ڈاکٹر کامران: خدا کا شکر ہے ہم دونوں بخیریت ہیں۔ کہئے آپ ہفتہ بھر سے کہاں چھپے ہوئے تھے۔ آج ہی نظر آئے ہیں۔"

مسز کامران: "ہاں آپ مسز ڈنی چند کو بھی ہمراہ لائے ہیں یا نہیں؟"

ڈُنی چند: "میں اُنہیں ہی لینے کو کچھ دنوں کے لئے دہرہ دون چلا گیا تھا مگر وہ ابھی ایک ہفتہ تک اور نہیں آ سکتیں۔ وہاں ایک شادی ہے۔ اس لئے بعد میں جا کر اُنہیں لے آؤنگا۔

مسز کامران: "ہمارا دل تو یہاں بہت گھبرا گیا ہے۔ یہاں بمبئی کی طرف کا کوئی خاندان نہیں۔ کوئی حسب دلخواہ مستورات ملنے کو نہیں۔ میں تو دو ہی ہفتے میں پریشان ہو گئی ہوں۔ آپ اب انہیں جلدی لائیے۔"

ڈُنی چند: "آپ کی مرضی کے موافق یہاں ایک خاندان ہے (وہ لوگ میرے گھر سے دوست ہیں) غالباً آپ بھی انہیں جانتی ہوں گی آپ کی ہمشیرہ صاحبہ نے کبھی ذکر کیا ہوگا۔ وہی دہرہ دون کے انجینئر صاحب۔"

مسز کامران: "(متعجب ہوکر) اچھا وہ دیکھو نام یاد کروں۔ فخر فخر۔ نہیں نہیں۔ ظفر ظفر صاحب۔ ہاں ہاں ظفر انجینئر میں جانتی ہوں۔ بہن فیروزہ کے پاس اُن کی تصویریں بھی ہیں۔ (شوہر سے مخاطب ہوکر) دیکھئے ڈاکٹر صاحب میرا خیال ٹھیک تھا وہ دو شخص جو راستے میں ہمیں زمین پر بیٹھے ملے تھے۔ اُن میں سے ضرور ایک ظفر ہوں گے۔ کیوں کہ اس شخص کو دیکھتے ہی میری نظروں میں وہ تصویر پھر گئی جو انہوں نے بہن فیروزہ کو دی تھی۔ ہم ان کے خاندان کے لوگوں سے ضرور ملیں گے۔ کیا اُن کی شادی ہو گئی؟"

دُنی چند: "جی ہاں۔ بلکہ دو بچے بھی ہیں۔ اُن کی بی بی اور ایک بھاوج اُن کے ہمراہ ہیں اور دونوں عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ اُن سے مل کر یقیناً خوش ہوں گی۔ اگر آپ اسی وقت ملاقات کرنا چاہتی ہوں تو میں اُنہیں ڈھونڈ لاؤں۔ وہ یہیں تھے ہاں الحق صاحب کہاں گئے؟"

مسٹر کامران: "ابھی تو ہمارے ساتھ ہی تھے مگر ان کے دوست لال چند بیرسٹر زبردستی چائے پلانے اپنی کوٹھی پر لے گئے ہیں۔ دیکھئے وہ سامنے اُن کا بنگلہ ہے۔"

دُنی چند: "تو میں ظفر صاحب کو یہاں بلا لوں۔ اُن کے چچازاد بھائی صفدر بھی اُن کے ساتھ ہیں۔"

مسز کامران: "ہاں میں نے اُن کا نام بھی سنا تھا۔ مسٹر صفدر بھی ہمیشہ فیروزہ کے دوست تھے۔ جائیے بلا لائیے۔"

چنانچہ اجازت ملتے ہی دُنی چند گئے اور فوراً ہی دونوں کو بلا لائے۔ مسٹر دنی چند نے تعارف کرایا اور مسٹر و مسز کامران بخندہ پیشانی ان سے ملے۔ آہ آج بدنصیب ظفر کے دل و دماغ کی عجیب حالت ہے وہ اپنی جان سے بھی عزیز فیروزہ کی بہن کے سامنے حسرت و یاس کی زندہ تصویر بنا کھڑا ہے اور اس کا دماغ عہد گزشتہ کے واقعات کی یاد سے بے طرح پریشان ہو رہا ہے۔

مسز کامران: "مجھے اس وقت اچانک آپ صاحبوں کو دیکھ کر بہت ہی مسرت ہوئی۔ سالہا سال سے اُمید تھی کہ کسی روز اپنی ہمشیرہ کے عزیز دوستوں سے ملاقات ہوگی۔ آج وہ دن میسر ہوا۔"

ظفر: ”مجھے بھی آپ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق تھا کہ ایک بار تو جاپان جانے کا مصمم ارادہ کر بیٹھا تھا مگر خدا کو اس جگہ اس طرح ملانا تھا۔ آپ کے محبت بھرے خطوط اور تصاویر اب تک نہایت احتیاط سے میرے پاس رکھی ہیں اور یہ تو مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ آپ کی شادی ہوگئی ہے اور آپ یہاں ہیں۔ میں قابل ڈاکٹر صاحب مسٹر کامران کو دیکھ کر بھی بہت خوش ہوا۔“

ڈاکٹر کامران: ”آج اتفاق اور ہماری خوش قسمتی ہی سے ملاقات ہوگئی ورنہ ہم اس وقت قبرستان میں فیروز مرحوم کی قبر پر جانے کو تھے۔ مسز کامران ہر روز شام کو وہاں جاتی ہیں۔“

مسز کامران: ”ہمیں مسٹر ڈنی چند کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ جنہوں نے پرانے واقف کاروں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ مجھے اُن کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ مسز ظفر صاحبہ بھی یہیں ہیں۔ میں اُن سے بھی ملنے کی مشتاق ہوں۔“

ظفر: ”آپ سے ملنا میرے اور اُن کے لئے باعثِ افتخار ہوگا۔ آپ کل ہی کوئی وقت مقرر کر لیجئے۔“

کامران: ”مگر مسٹر ظفر ہم اپنے عزیز و معزز مہمان مسٹر اسحٰق کی صلاح لئے بغیر کوئی وقت نہیں بتا سکتے کیوں کہ وہ ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم کسی ایسے وقت آسکتے ہیں جب انہیں کہیں باہر جانا ہو۔“

صفدر: ”اگر اسحٰق صاحب بھی غریب خانہ پر تشریف لائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ غالباً اُن کا ہرج نہ ہوگا۔ آخر تفریح ہی کو تو یہاں آئے ہوں گے۔“

ڈاکٹر کامران: ”بے شک وہ ضرور آجائیں گے (مسکرا کر) بشرطیکہ آپ لوگ ان کو مدعو کریں۔“

صفدر: ”ہمیں اُن سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔“

ڈاکٹر کامران: ”تو ہم سب بھی بہت خوشی سے آئیں گے۔“

ظفر: ”مگر چونکہ ہم لوگوں میں پردے کا رواج ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ ایک وقت آپ دونوں صاحبان تشریف لائیں اور پھر کسی وقت زہرا بیگم تنہا کسی خادمہ کے

ساتھ آجائیں۔"

مسز کامران: "بالکل درست ہے۔ میں پردے کو جانتی ہوں۔ میں انشاء اللہ تعالیٰ کل ہی کسی وقت آپ کے ہاں آجاؤں گی۔ ڈاکٹر صاحب اور اسحق صاحب پھر کسی دن آئیں گے۔"

ظفر: تو آپ سہ پہر کو چار بجے چاء پر تشریف لائیے۔"

مسز کامران: "بہت بہتر مسز ظفر سے آج میرا سلام اور اس ملاقات کا حال کہہ دیجئے گا۔"

ڈاکٹر کامران: (گھڑی دیکھ کر) "اوہو چھ بج رہے ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔ "لال منزل" سے مسز اسحق صاحب کو لے کر گھر جانا ہے وہ ذرا جلد کھانا کھاتے ہیں۔"

اس قدر گفتگو کے بعد دونوں میاں بیوی ان سے رخصت ہوئے اور ڈونی چند کو بھی ہمراہ لیتے گئے۔ پھر ظفر اور صفدر بھی گھر کی طرف چلے۔ ظفر خاموش تھے۔ اور صفدر کوشش کر رہے تھے کہ وہ باتیں کریں۔ راستے میں زور سے بارش ہونے لگی۔ اس لئے ان کو ایک دکان میں ٹھہر جانا پڑا اور کسی قدر دیر میں گھر پہنچے۔

☆

فیروزہ

ایک ہفتے بعد مسز ڈنی چند بھی دہرہ دون سے مسوری آ گئیں۔اب تینوں خاندان آپس میں خوب ملنے جلنے لگے۔لائق اور سمجھ دار شوہر کی خوشی چاہنے والی بیوی بیگم ظفر نے چند ہی دن میں زہرہ سے بہت محبت بڑھالی۔حالانکہ وہ ظفر کے گذشتہ واقعات عشق سے بخوبی واقف تھی مگر اس نے بدگمانی نہ کی جس سے ظفر بے انتہا خوش ہوئے۔

مگر خوشی اور بے فکری کا ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ ڈاکٹر کامران صاحب کی رخصت ختم ہوگئی اور وہ اپنی بیوی سمیت مسوری سے لکھنؤ رخصت ہو گئے۔

اسی عرصے میں الحق اور ظفر میں بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔اس سے فیروزہ کی بابت ظفر کو صرف اسی قدر معلوم ہو سکا کہ وہ ابھی تک شادی پر رضامند نہیں ہوئی مگر الحق سے اس کی نسبت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے اور عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے۔

ظفر کی رخصت بھی آدھی کے قریب ختم ہو چکی تھی اور تعطیل کا صرف ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔تنہائی میں وہ اکثر سیر کو نکلتا اور فیروز کی قبر پر ہو آیا کرتا تھا۔کم از کم وہ ہفتہ میں دو بار ضرور جایا کرتا تھا کہ فیروز اس کی محبوبہ کا از حد پیارا بھائی تھا اور محبوب کا عزیز بھی پیارا ہوتا ہے۔

مسٹر اور مسز کامران کو یہاں سے گئے کوئی تین ہفتے گزرے ہوں گے کہ ظفر کو ''وائٹ وے کمپنی'' میں ایک دن شام کو مسٹر الحق مل گئے۔ظفر نے تعجب سے دریافت کیا۔

''آپ اس قدر جلدی کس طرح واپس آ گئے؟''

الحق: ''ہاں ابھی ابھی میری رخصت ختم ہوئی تھی۔چھٹی ملنی بھی ناممکن تھی مگر ایک سخت ضرورت کی وجہ سے جلدی آنا پڑا۔مس جعفری گزشتہ ہفتے یہاں پہنچی ہیں اور میرا

اُن سے ملنا ضروری تھا۔ میں ''چالیول ہوٹل'' میں ٹھہرا ہوں۔ آپ وہاں مجھے مل سکتے ہیں۔ میں بھی کسی وقت حاضر ہوں گا۔''

ظفر: ''مس جعفری! کیا فیروزہ جعفری؟ اُن کی ہمشیرہ سے سنا تھا کہ وہ تو جاپان تھیں؟''

الحق: ''جی نہیں، جاپان تو نہیں۔ اس وقت امریکہ سے آ رہی ہیں۔ وہیں ڈاکٹری پڑھتی تھیں۔ اتوار کے دن مجھے ڈاکٹر کامران کی چٹھی ملی کہ فوراً مسوری جاؤ۔ فیروزہ جعفر جہاز سے اُترتے ہی سیدھی مسوری گئی ہیں۔ ہم سے ملنے لکھنؤ تک نہیں آئیں۔ بس یہ تار پاتے ہی اُسی روز تین بجے چل پڑا۔ صبح ہی یہاں پہنچا ہوں۔''

یہ خبر سن کر ظفر کا تمام جسم تھرتھرا گیا۔ اس کی تمام روح متزلزل ہو گئی۔ وہ نامعلوم خیالات کی ایک لہر میں کھو گیا۔ اس سے سنبھلا نہ گیا اور قریب ہی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔ آہ اس قدر عرصے کے بعد وہ اور فیروزہ ایک ہی جگہ موجود تھے۔ محبت کے بھرے ہوئے زخموں میں از سرِ نو ٹیسیں اُٹھنے لگیں وہ یہ سوچ کر کانپ اُٹھا کہ اگر اس کی اور فیروزہ کی کہیں اتفاقاً ملاقات ہو گئی تو کیا کرے گا۔ وہ ایک بیوی کا شوہر اور دو بچوں کا باپ ہے وہ فیروزہ سے نہ ملے گا مگر آہ فیروزہ تک رسائی ہو اور وہ اسے نہ دیکھے۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور پوچھنا چاہا کہ فیروزہ کہاں فروکش ہیں مگر ہمت نہ پڑی۔ الحق صاحب کو کچھ چیزیں لینی تھیں۔ اُن کی خرید میں معروف ہو گئے اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جب چلتے وقت اُن سے رخصت ہونے لگے تو ظفر نے بمشکل اُٹھ کر کہا۔

''تو آپ جاتے ہیں؟''

الحق: ''ہاں شاپنگ میں بہت وقت صرف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مس صاحبہ کے جانے کا وقت ہو جائے گا۔ دیر ہو گئی تو قبرستان چلی جائیں گی۔ معاف کیجیے میں پھر ملوں گا۔''

ظفر: ''تو کیا وہ ہوٹل میں نہیں؟''

الحق: ''نہیں وہ کسی کی کوٹھی میں مہمان ہیں مگر آج کل صاحب خانہ گھر پر نہیں۔ کوٹھی خالی ہے۔ اچھا سلام اور چل دیئے۔

اللہ اللہ کیا زمانے کا پھیر ہے۔ ظفر کی آنکھوں کے آگے فیروزہ، اس کی فیروزہ،

اس کی جان اور روح کی مالک، فیروزہ کا دعویدار اسحٰق بن رہا ہے۔ اُن کے جانے کے بعد ظفر بھی دکان سے نکل کر بھٹکتا بھٹکتا گھر پہنچا اور علیحدگی میں یہ خبر صفدر کو سنائی۔ صفدر یہ سن کر بہت پریشان ہوا کہ اب سخت مشکل ہوگی۔ گو ظفر فیروزہ سے اب کوئی تعلق نہ رکھے گا مگر وہ فیروزہ کو اسحٰق کے ساتھ دیکھنا برداشت نہ کر سکے گا اور کبھی راستے، بازار یا دکان وغیرہ پر ملنا ضرور ہوگا۔ خدا معلوم ظفر اب کیا کر بیٹھے۔

ظفر اب بے حد خاموش اور افسردہ رہنے لگا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے خاموش اندر بیٹھا رہتا اور کسی سے بات نہ کرتا۔ اس کی خوراک دن بدن کم ہونے لگی وہ اب سیر کو بھی اکیلا نکلا کرتا اور صفدر کو ہمراہ نہ لیتا تھا۔

چونکہ اسحٰق سے ظفر کے اچھے تعلقات تھے اور اسحٰق نے بتا دیا تھا کہ وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس لئے ایک روز ظفر مع صفدر کے اُن سے ملنے ہوٹل میں گیا مگر وہ وہاں موجود نہ تھے۔ چنانچہ ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دنوں اسحٰق کو کہاں فرصت کہ وہ اُن کے گھر آتے چنانچہ جس دن ظفر اسحٰق سے ''وائٹ اوے'' کی دکان میں ملا تھا۔ اس کے بعد چار دن تک یہ کہیں نہ مل سکے مگر بدقسمتی سے ایک روز شام کو ظفر ٹہلنے کے ارادے سے کوٹھی سے بہت دُور جنگل کی طرف نکل گیا تو ایک جگہ سرسبز ٹیلے پر اس کی آنکھوں نے ایک وہ منظر دیکھا جس کی اسے اپنی زندگی میں کبھی اُمید نہ تھی اور جس کو دیکھنے سے وہ مر جانے کو بہتر سمجھتا تھا۔

جیسے ہی ظفر ایک آڑو کے درخت کے پیچھے سے بڑھا۔ اس کا دل دھک دھک کر کے رُکا اور پھر اس زور زور سے دھڑکنے لگا کہ ظفر کو معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے سے نکل جائے گا۔ سامنے گھاس پر دو شخص بیٹھے تھے۔ ظفر کی زندگی میں یہ دوسرا موقعہ تھا۔ آج سے چار سال پیشتر ایک ایسے ہی منظر نے خانقاہ کی جھونپڑی میں ظفر کے ہوش و حواس کو کھو دیا تھا اور وہ غش کھا گیا تھا مگر آج وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اپنے آپ کو سنبھالے رہا۔ اس نے دیکھا کہ اس سے چند گز کے فاصلے پر خوش قسمت اسحٰق اور حسین فیروزہ دونوں بیٹھے ہیں۔ اسحٰق کی ٹوپی قریب ہی گھاس پر رکھی ہوئی تھی اور فیروزہ کی ساڑی کا آنچل بھی سر پر سے سرک گیا تھا۔ اسحٰق کے ہاتھ میں فیروزہ کا ہاتھ تھا اور ان میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔

آڑو اور دوسری جھاڑیوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر ظفر دس پندرہ منٹ تک یہ دیکھتا رہا

مگر جب رات کی تاریکی اس قدر بڑھ گئی کہ نظر کام نہ کر سکی تو مجبوراً ظفر گرتا پڑتا درختوں کا سہارا لیتا شہر کو روانہ ہوا۔ اس جگہ سے شہر کو صرف ایک سڑک ہی جاتی تھی۔ چنانچہ ظفر ابھی پچاس قدم ہی بڑھا ہوگا کہ اس کو ایک ڈبل سیٹ کا رکشا ملا۔ چونکہ سڑک پر برقی لیمپ روشن تھے۔ اس کی مدد سے اس نے بخوبی پہچان لیا کہ وہی دونوں اس رکشا میں اس کے برابر سے گزر گئے۔ ظفر کو فیروزہ کی جائے قیام معلوم کرنے کا یہ اچھا ذریعہ ملا۔ اپنی مصیبت و پریشانی کے تمام خیالات فوراً اس کے دل سے دور ہو گئے اور وہ رکشا سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اس جگہ سے کوئی دو میل کا فاصلہ چلنے کے بعد رکشا ایک کھڈ میں اُتر گیا۔ ظفر بھی اس کے پیچھے پیچھے اُترتا چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ نیچے ایک سرخ رنگ کی اچھی فراخ کوٹھی ہے۔ رکشا اس کے برآمدے کے سامنے رک گیا اور راشق اور فیروزہ اس میں سے اُتر کر اندر چلے گئے۔ ظفر وہیں ٹھہرا رہا۔ جب قلی رکشا لے کر واپس آیا تو اس نے پوچھا:

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

قلی: "حجور اس نیچے والی روج (روز) کاٹیج سے۔"

ظفر: "یہ کس کی کوٹھی ہے؟"

قلی: "سہارنپور کی ایک میم صاحب کی ہے وہ گرمی میں یہاں آجایا کرتی ہیں؟"

ظفر: "مگر اس رکشا میں تو کوئی میم نہ تھی۔"

قلی: "حجور میم صاحب تو ایک ہفتے سے کسی کام پر گھر گئی ہوئی ہیں۔"

ظفر: "تو یہ کون تھیں؟"

قلی: "یہ کوئی ان کی دوست ڈاکٹرنی ہیں اور انہیں کے ایک مہمان ڈپٹی کمشنر صاحب ہیں۔ آپ کو رکشا درکار ہے؟"

ظفر: "ہاں اوپر لے چلو۔ وہاں سے ہم بیٹھ جائیں گے۔"

فیروزہ کی قیام گاہ معلوم کر کے ظفر اس رکشا میں بیٹھا اور رات کے آٹھ بجے گھر پہنچا اور یہ واقعہ بھی صفدر سے کہہ دیا۔ اس نے بہت ملامت کی کہ "آخر اس کوشش لاحاصل سے فائدہ؟ اب صبر کرو۔"

☆

قبرستان

اس رات ظفر کی طبیعت بہت خراب رہی کھانا بھی نہ کھایا اور سر کے درد کا عذر کر کے جلدی لیٹ گیا۔ نیند کوسوں دُور تھی۔ تمام رات کروٹیں لے لے کر نہایت بے چینی اور بے قراری میں گزاری اور دوسرے دن علی الصباح بیوی سے یہ کہہ کر کہ ''سر میں سخت درد ہے۔ ذرا ہوا خوری کر آؤں شاید فائدہ ہو۔'' جنگل کی طرف نکل گیا۔

عجیب نشے کی سی کیفیت میں جا رہا تھا۔ بے اختیار رو پڑنے کو دل چاہتا تھا۔ پھر طبیعت کو سنبھالتا اور دل کو لعن طعن کرتا کہ جس نے میرے ساتھ اس دیدہ دلیری سے بے وفائی کی مجھے اس کا کیا خیال۔ مجھ سے تعلقات قائم رکھنے میں تو بھائی کا بے حد غم تھا۔ تارک الدنیا ہو جانے کا عہد تھا اور دوسرے سے اب مزے ہو رہے ہیں۔ پھر وہ بھی نہیں جس کے ساتھ زہرہ دون سے گئی تھی بلکہ ایک اور تیسرا شخص!! مگر آخر انسان ہی تو تھا۔ بہتیری کوشش کرتا کہ اس کا خیال دل سے بھلا دے مگر بار بار رشک و حسد کے شعلے سینے میں بھڑک اُٹھتے تھے۔

وہ اندھیرے ہی اندھیرے دل ہی دل میں سلگتا بغیر کسی منزل مقصود کے چلا جا رہا تھا۔ کپڑے بھی نہ بدلے تھے اور اسی سلیپنگ سوٹ (سوتے وقت پہننے کے کپڑے) پر ایک اُوور کوٹ پہن لیا تھا۔ سڑک پر کبھی تیز چلنے لگتا، کبھی آہستہ، کبھی رک جاتا، لیکن کچھ دُور چل کر اس کی چال اعتدال پر آ گئی اور اس نے اس قبرستان کا رستہ لیا۔ جہاں فیروزہ کے بھائی کا مزار تھا۔

فیروز کے دادا سیٹھ مرحوم نے زر کثیر صرف کر کے اپنے پوتے کی قبر تیار کرائی تھی۔ اس تمام قبرستان میں اس بچے کی قبر کے سوا کسی دوسرے مسلمان کی ایسی شاندار اور ایسی خوب صورت قبر نہ تھی۔ پھر جب اس کے والد بمبئی آئے اور زہرہ کی شادی کرنے کے بعد جاپان

جاتے وقت اس قبر کو دیکھنے مسوری آئے تو قبر کے گرد ایک خوبصورت قیمتی جنگلہ اور اوپر ایک شیشہ کی کوٹھی بھی بنواتے گئے۔ کوٹھی میں برقی لیمپ لگوائے۔ جس سے رات کے وقت وہ چمکیلا گنبد بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا اور اس کی روشنی سے وہ تمام شہر خموشاں جگمگ جگمگ کیا کرتا تھا۔ ایک حافظ کو تمام عمر کے لیے مقرر کر دیا کہ قبر پر بیٹھ کر قرآن خوانی کیا کرے۔ آہ جو کچھ بھی کرتے تھوڑا تھا۔ اُن کا یہی ایک اکیلا بچہ تھا۔ جو لاکھوں نہیں کروڑوں روپے کی جائداد کا مالک تھا اور اب اس پر اس کے سوا اور کس طرح کچھ صرف کیا جا سکتا تھا کہ اس کی قبر پر ہی اپنے ارمان نکالتے یا اس کے نام پر خیرات دے دے کر اس کی روح کو فائدہ پہنچاتے۔

ظفر قبرستان پہنچ کر سیدھا اسی بچے کی قبر پر گیا۔ لیمپ ابھی تک روشن تھے مگر جونہیں اس نے برآمدے میں قدم رکھا۔ شیشوں میں سے دکھائی دیا کہ کوئی عورت قبر پر بیٹھی تلاوتِ قرآن کر رہی ہے۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ ایک سیاہ ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اتنی صبح اس قبر پر کون ہو سکتا تھا۔ ظفر نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اس سیاہ لباس میں اس کو ایک زعفرانی چہرہ صبح کاذب کے مرجھائے ہوئے چاند کی طرح نظر پڑا۔ آہ یہ وہی اپنے بھائی کی عاشق بہن فیروزہ مصروف تلاوت تھی۔

ظفر کا دل تو بھر ہی رہا تھا۔ ایک ذرا سی تحریک کی ضرورت تھی۔ اس وقت اس جگر خراش منظر کو دیکھ کر ضبط کا یارا نہ رہا۔ وہیں بیٹھ کر زاروقطار رونے لگا۔ سسکیوں کی آواز سے فیروزہ چونکی۔ ادھر اُدھر دیکھا تو قریب ہی وہ شخص نظر پڑا جو کبھی اس کے عالم خیال پر حکمرانی کیا کرتا تھا۔ فیروزہ کو ظفر سے محبت تھی یا نہ تھی مگر اس وقت کہ اہلِ دُنیا ابھی گرم گرم بستروں میں کروٹیں ہی لے رہے تھے۔ وہ ظفر کو اپنی جان سے زیادہ عزیز بھائی کی قبر پر روتے دیکھ کر بے چین ہو گئی اور قرآن بند کر کے بجائے ظفر کی طرف متوجہ ہونے کے سنگِ مزار سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب بہت بے حال ہو گئی تو ظفر سے نہ رہا گیا۔ وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھا۔ ”گو مجھے اب یہ حق حاصل نہیں کہ میں آپ کو چھو سکوں مگر آپ کی حالت بہت بگڑی جاتی ہے۔ ذرا دیر کو باہر چلیے۔“ فیروزہ کو کھڑا کر کے ہاتھ پکڑے ہوئے باہر لے آیا۔ وہاں آکر وہ گھاس پر گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو ظفر کے سینے سے سر لگا دیا۔

"ظفر......آہ......کچھ نہیں......جاؤ......قبرستان میں زیادہ نہ ٹھہرو......میں......اب جاتی ہوں۔"

ظفر نے حسرت سے فیروزہ کے چہرے کو دیکھ کر کہا "فیروزہ اے کاش فیروز کے ساتھ مجھے بھی موت آجاتی یا تم اپنے ہی ہاتھ سے میرا کام تمام کردیتیں تاکہ جس وقت تم فیروز کی قبر پر آیا کرتیں تو مجھ ناشاد کی رُوح بھی ایک لمحے کو شاد ہو جاتی اور میں زندگی کے اس دوزخ سے نجات پا جاتا۔"

فیروزہ: "وہ زمانہ گزر گیا۔ اب اس ذکر کا دُوہرانا لاحاصل ہے۔ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اچھا اُٹھو اب گھر چلیں۔"

ظفر: "فیروزہ کیا تمہاری طبیعت کی تمام سختی تمام ظلم میرے لئے ہیں؟ کیا مجھے ہی صدمے پہنچانے کی تم نے قسم کھائی ہے۔ ابھی کل شام ہی میں نے اپنی آنکھوں سے تم کو ہنستا بولتا کسی خوش نصیب کے ساتھ محبت کا سلوک کرتا دیکھ چکا ہوں۔"

فیروزہ: (بات کاٹ کر) "ظفر دن نکل آیا۔ قرآن خواں آرہا ہے۔ بس اُٹھو میں بھی اپنے فیروز سے رُخصت ہو کر گھر چلوں۔ پھر تو شام ہی کو آنا ہو گا۔"

ظفر: "کیا آپ کوئی وقت بتا سکتی ہیں جس وقت میں پھر آپ سے ملوں؟"

فیروزہ: "ہاں ملوں گی مگر آج نہیں۔ میرے ہاں ایک مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ آج جا رہے ہیں۔ مجھے فرصت نہ ہوگی۔ البتہ کل جس وقت آپ چاہیں "روز کاٹیج" آسکتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ دفعتہً اُٹھی اور قبر پر چلی گئی۔ اب سورج بھی نکل آیا تھا۔ ظفر نے کچھ دیر وہیں ٹھہر کر اپنی حالت درست کی اور پھر ایک آہ بھر کر گھر واپس ہوا۔ شوہر کی رات کی افسردگی سے ظفر بیگم بے انتہا متردد تھیں۔ شوہر کے آتے ہی بعد بصد اصرار انہیں چاء پلائی بار بار ان کے مغموم چہرے کو پریشان نظروں سے دیکھتی جاتی تھیں۔

چاء سے فراغت پانے کے بعد ظفر نے آج کے تمام واقعات بھی صفدر کو شروع سے آخر تک کہہ سنائے۔

☆

مسوری میں آخری رات

ظفر اگلے دن دوپہر کو فیروزہ سے ملنے روز کانیج گیا۔ فیروزہ منتظر تھی ہاتھ ملا کر بٹھایا اور مزاج پرسی کی۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ رنج وغم نے فیروزہ کے دل پر مہر لگا دی تھی۔ ظفر کا دل اگرچہ شکوہ شکایات سے بھرا پڑا تھا مگر وہ فیروزہ کو کس منہ سے کچھ کہتا۔ کیا وہ خود اب دو بچوں کا باپ نہ تھا۔ اسے خوف تھا کہ اگر فیروزہ نے گفتگو کا رُخ ادھر بدل دیا تو وہ کیا جواب دے گا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے جوش کو سینے میں دبائے خاموش بیٹھا تھا اور دو نوں حیران تھے کہ کیا باتیں کریں وہ کوشش کر کے کوئی بات شروع بھی کرتے تھے۔ تو وہ ذرا سے سوال و جواب کے بعد تمام ہو جاتی تھی اور جس مضمون پر ان کے دماغ میں دفتر کے دفتر جمع تھے۔ اسے وہ چھیڑنا نہ چاہتے تھے۔ آخر فیروزہ اُٹھی اور ظفر کے لئے چاء بنا کر لائی۔ فیروزہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے جو کبھی ظفر کے لئے آبِ حیات ہوتی تھی۔ آج زہر ہلاہل سے کم نہ تھی۔ ایک ایک گھونٹ رُک رُک کر اس کے حلق سے اُتر رہا تھا۔ ظفر کو چونکہ یقین ہو گیا تھا کہ فیروزہ عنقریب اسحٰق سے شادی کرنے والی ہے۔ اس لئے اسے اس کی ہر ہر بات ہر ہر حرکت میں خشکی، تکلف اور احتراز کا پہلو دکھائی دیتا تھا۔ اس ملاقات سے اسے بے حد تکلیف ہوئی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ کبھی یہاں نہ آئے گا۔

جب ظفر فیروزہ سے ہاتھ ملا کر رُخصت ہونے لگا تو فیروزہ نے کہا "میں نے سنا ہے۔ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ بال بچے بھی ہیں۔ اب تمہارا مجھ سے اس طرح چھپ کر ملنا تمہاری بیوی کی نظروں میں قصور ہوگا۔"

ظفر نے اس کے یہ معنے نکالے کہ چونکہ وہ اسحٰق سے منسوب ہو چکی ہے۔ اس

لئے وہ میرا آنا مناسب نہیں سمجھتی۔اس نے ایک زخمی ونیم جان شکار کی طرح فیروزہ کو دیکھا اور دل پر صبر کی سل رکھ کر پھر کبھی "روز کا لج" کا رُخ نہ کیا۔

قبرستان میں ایک روز پھر چند منٹ کو ملاقات ہوگئی مگر سوا سلام اور دو ایک معمولی رسمی باتوں کے اور کچھ بات نہ ہوئی۔

اب ظفر کی رُخصت قریب الاختتام تھی اور صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ظفر کی بیوی نے بھی کسی طرح یہ سن پایا تھا کہ فیروزہ یہاں آئی ہوئی ہے اور گو اسے علم تھا کہ وہ اطلق سے منسوب ہو چکی ہے لیکن آخر انسان تھی۔انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔اسے اتنا بھی ناگوار تھا۔چنانچہ وہ شوہر کی رخصت ختم ہونے سے بے حد خوش ہورہی تھی۔

صفدر نے کہا "میں مستورات کو پہلے دہرہ دون لے چلتا ہوں کہ کچھ روز عزیزوں میں رہیں۔" مگر ظفر بیگم نہ مانیں۔آخر یہ ہفتہ بھی گزر گیا اور سب کا سامان سفر درست ہونے لگا۔

آج وہ دن تھا کہ جس کی رات ان سب کی مسوری میں آخری رات تھی کیوں کہ دوسرے دن صبح ہی دہرہ دون روانہ ہونا تھا۔آج ظفر بیگم وصفدر بیگم کی دعوت ان کی دوست بیگم حسن بیگ کے ہاں تھی اور ظفر وصفدر کا کھانا کسی بنگالی ڈاکٹر کے گھر تھا۔دونوں بیویاں کوئی گیارہ ایک بجے تک دعوت سے فارغ ہو کر کوٹھی میں واپس آگئیں مگر دیکھا کہ ظفر اب تک نہ آیا تھا۔ظفر بیگم سے ضبط نہ ہو سکا۔مسہری پر پڑ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ ان کا پیارا شوہر آج فیروزہ سے رُخصت ہونے گیا ہے اور وہیں اسے دیر لگ رہی ہے۔

حقیقت میں تھا بھی یہی کھانے سے نو ہی بجے فارغ ہو کر صفدر گھر آ گیا اور ظفر بے شرم بن کر پھر آخری بار اس خیال سے روز کالج چلا گیا تھا کہ یہ جدائی اب عمر بھر کی جدائی ہے اب آخری بار بے وفا فیروزہ سے رُخصت ہو آنا چاہئے۔

جس وقت وہ روز کالج پہنچا۔تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔فیروزہ اس وقت بیڈروم میں جا چکی تھی۔اس نے برآمدے میں پہنچ کر آیا سے (جو سونے کو جارہی تھی) کہا: "مس صاحبہ کو ہمارا سلام پہنچاؤ اور کہو کہ وہ دہرہ دون جارہے ہیں۔ایک ضروری کام

ہے صرف پانچ منٹ کو مل لیں۔"

اس نے واپس آ کر کہا کہ "چلئے بیگم انتظار کر رہی ہیں۔" ظفر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم سے گزرتا ہوا بیڈروم میں پہنچا۔ جہاں مسہری کے قریب ہی دو کرسیاں پڑی تھیں اور فیروزہ اپنے نائٹ گون ہی پر ساری لپیٹ کر ان کے انتظار میں کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ گو اس وقت وہ کسی قسم کی آرائش سے مزین نہ تھی۔ صرف سفید ریشمی نائٹ گون پر آسمانی ریشمی ساری جلدی جلدی لپیٹ لی تھی اور بال جو سونے کے لئے کھولے گئے تھے۔ اُسی طرح شانوں پر بکھر رہے تھے گو اس کے چاند سے چہرے پر وہ سیاہ بکھرے ہوئے بال اور ایک طرف کو جھکا ہوا آسمانی ساری کا آنچل بے حد خوش نما معلوم ہو رہا تھا۔

اس وقت شکستہ دل ظفر کو اب سے نو دس سال قبل کا نقشہ یاد آ گیا۔ جب انگلینڈ جانے سے پیشتر ظفر فیروزہ سے دن یا رات کے وقت دہرہ دون اور مسوری میں ملا کرتا تھا اور وہ محبت کے نشے میں اس سے لطیف باتیں کیا کرتی تھی۔ ظفر کے کمرے میں داخل ہونے پر وہ تعظیماً اٹھی، ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئی اور بولی:

فیروزہ: "مجھ سے ملنے کو آپ نے اتنی رات گئے سردی میں آنے کی تکلیف گوارا کی اس کی مشکور ہوں۔"

ظفر: (جیسے کوئی خواب سے چونکے) "کوئی تکلیف نہیں .... میری رخصت ختم ہو گئی ہے .... صبح آٹھ بجے جا رہا ہوں .... آخری بار ملنے کو حاضر ہو گیا .... بے شک آپ کو تکلیف دی کہ آرام کے وقت خلل انداز ہوا۔ اس جسارت کو معاف فرما کر مجھے مشکور کریں۔"

فیروزہ: "ظفر آرام سے اور فیروزہ سے کیا تعلق؟ ابھی ایک گھنٹہ ہوا میں قبرستان سے آئی ہوں کھانا کھایا ہے اور یہاں آ گئی اور تنہا ہوں۔ دل پریشان رہتا ہے۔ مالک مکان میری دوست تھیں۔ وہ چند روز میں واپس آنے کو کہہ گئی تھیں مگر وہاں ان کو کئی ہفتے لگ گئے۔ بڑی قسمت کو روتی رہتی ہوں۔"

ظفر: "مسٹر الحق پھر نہیں آئے؟ وہ تو اچھے رونق کے آدمی ہیں۔"

فیروزہ: "اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ اس دفعہ انہیں ہمیشہ کے لئے رُخصت کردیا گیا ہے۔"

ظفر: "وہ کیوں!!؟ اُن سے تو تقریباً سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ زہرہ سے تو یہی سننے میں آیا تھا۔

فیروزہ: (مسکرا کر) "ہاں اپنے دلوں کو اطمینان دینے اور مجھے مصائبِ دُنیا میں مبتلا کرنے کو لوگوں نے یہی کچھ مشورہ کر رکھا ہے۔ والدین سے زیادہ ان دونوں میاں بیوی زہرہ اور کامران کو اس بات کی فکر ہے۔"

ظفر: "مجھے تعجب ہے کہ زہرہ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ آپ امریکہ میں ہیں اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ مجھے تو یہ اسحٰق صاحب ہی سے معلوم ہوا کہ امریکہ سے آئی ہیں کیا یہ درست ہے؟"

فیروزہ: "ہاں ظفر۔ آخر میں اپنی بے کار زندگی جسے اُس روز تم نے ختم نہ ہونے دیا تھا۔ کسی کام میں لگاتی۔ اس سے زیادہ موزوں میں نے اپنے لئے کوئی شغل نہ پایا کہ بے بس اور بے کس غریب مریضوں کی خدمت کروں اور پیارے فیروز کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے مریضوں کو امداد دوں۔ بس اب بقیہ زندگی اسی کام میں بسر کروں گی۔"

ظفر: (متعجب ہو کر) "تو کیا شادی نہ ہوگی؟"

فیروزہ: "شادی کیسی؟............ آہ ظفر............ سنگ دل دخوش دل ظفر۔ بدگمان ظفر، کیا کیا کہوں، اگر شادی نصیب میں ہوتی تو میرا فیروز زندہ رہتا جس سے میرا دل زندہ رہتا۔ اور شادی اُسی شخص کے ساتھ ہوتی جس سے ایک بار عہد کیا تھا۔ تمہارے خیال میں فیروزہ اس قدر بے وفا عہد شکن اور وعدہ خلاف ہے کہ سالہا سال تک ایک شخص سے عہد و پیمان قائم رکھ کر کسی اور سے شادی پر رضامند ہو جاتی؟ اگر تمہارا ایسا خیال ہے تو حقیقت میں بڑے ظالم اور سنگ دل ہو (ہنس کر) آخر کیا کرو، اپنا سا دل ہی سمجھتے ہونا۔ میرے جاتے ہی شادی رچالی...... اچھا خدا مبارک کرے کہو بچے کیسے ہیں؟ بی بی کیسی ہیں؟ اللہ تمہیں دُنیا میں سرسبز شاد و آباد رکھے۔ میرا ایک پیارا اس گلشنِ حیات سے

بے پھولے پھلے نیست و نابود ہو گیا تو خدا دوسرے ہی کو سرسبز و بامراد کرے۔

آج فیروزہ کی زبان سے یہ الفاظ یہ خیالات سن کر ظفر مثل تصویر کے خاموش و ساکت رہ گیا وہ حیران تھا کہ وہ یہ سب باتیں خواب میں تو نہیں سن رہا۔ کیا یہ اسی فیروزہ کے لب باتیں کر رہے ہیں جو اس کے لئے برف کی مانند بے حس اور پتھر کی طرح سنگ دل ہو گئی تھی .... کیا وہ اسی عہدِ محبت کو اس استقلال سے نبھا رہی ہے۔ لیکن فیروزہ ہی تھی۔ جس نے آج سے کئی سال پیشتر اس کی محبت کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور ایک دوسرے شخص کے ساتھ رُخصت ہو گئی تھی۔ اس خیال سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سانس تیز تیز آنے لگا اور اس نے فیروزہ سے کہا:

"آپ کی اس وقت کی تقریر مجھے سخت حیرت میں ڈال رہی ہے۔ آپ مجھے معاف کریں اگر میں یہ کہنے کی جرات کروں کہ میں تو سنگ دل ہوں ہی مگر آپ بھی مجھ سے کم نہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے کس طرح بے رحمی اور بے التفاتی دکھا دکھا کر مجھے علیحدہ کیا تھا اور بلا اطلاع دہرہ دون سے غائب ہو گئی تھیں جو شخص آپ کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ میں نے اسے بھی دیکھا اور دم نہ مارا۔ اللہ اللہ مجھ سے وہ بیزاری کہ شکل سے نفرت اور ایک دوسرے شخص کے کہنے سے اس قدر جلدی مجھ سے بغیر ملے چلی گئیں۔ پھر خط تک نہ لکھا۔ اب بتاؤ کہ سنگ دلی کس کی طرف سے ہوئی؟...... جب ایک سال تک مجھے کچھ پتہ نہ ملا کہ کہاں ہو تو مجبوراً وہ بھی محض اس خیال سے کہ والد کی قطع نسل ہوئی جاتی تھی جس کا انہیں بے حد صدمہ تھا اور جس کے رنج میں وہ قریب المرگ ہو گئے تھے۔ میں نے عقد کر لیا۔ میری شادی ہوئے اب تین سال ہوئے ہیں۔ ایک لڑکا لڑکی موجود ہے۔ خیر جو خدا کو منظور تھا وہ ہو گیا۔"

فیروزہ: "دو بچے ہیں۔ میرا ظفر دو بچوں کا باپ ہے۔ خدا زندگی دے۔ میں ان کو کس طرح دیکھوں؟ ظفر میں ضرور دیکھوں گی مگر تم تو صبح ہی جا رہے ہو۔"

ظفر: "جانے دو۔ جلانے سے کیا حاصل، اُن کو دیکھ کر اب کیا کرو گی۔ مرنے دو ہم سب کو۔ آج کے بعد پھر تمام عمر بھی شکل نہ دیکھو گی۔ بس اب یہی آخری ملاقات ہے۔ آہ اس کے ساتھ جس کے ہمراہ زندگی بسر کرنی تھی جسے رفیقِ زندگی بنانا تھا" ....دل بھر آیا۔ باوجود کوشش ضبط کے گرم گرم آنسو رُخساروں پر بہہ آئے اور ظفر منہ پر

رومال رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

فیروزہ: (بے چین ہوکر) "ظفر بس اب رنج نہ کرو جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔ بے شک میری طرف سے تم پر بہت سختی ہوئی مگر میں رنج وغم سے دیوانی ہورہی تھی۔ اُس وقت بھی کو تمہاری جدائی کا خیال فیروز کی جدائی سے کم نہ تھا مگر جب وہ برداشت کررہی تھی تو یہ بھی کیا۔ مجھے معاف کردو اور خوشی سے اپنے بال بچوں میں زندگی بسر کرو۔"

ظفر: "........... بے شک آپ کو صدمہ تھا............ آپ مجبور تھیں ....مگر مجھ سے خط وکتابت ہی رکھنی تھی۔ صرف اسی قدر سہارے پر میں اپنی زندگی گزار دیتا۔ کبھی کبھی مل ہی لیا کرتا۔ اس بیوی بچوں کی گرفتاری میں کیوں پھنستا.............. گر یہ دل اب تک اسی کا ہے جس نے پہلی بار اس پر قبضہ کیا تھا مگر اب ایک اور کی دلداری، محبت اور آرام بھی میرے ذمہ واجب ہیں۔ آہ فیروزہ تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ محض تمہاری خوشی کے لئے میں نے جدائی کی سخت کٹھن مصیبتیں جھیلی تھیں اور پانچ سال کی محنت اُٹھا کر اس خوشی میں انگلستان سے واپس آیا تھا کہ تمہارے قابل ہوگیا ہوں مگر آہ تم نے کس حقارت سے مجھے علیحدہ پھینک دیا۔ میری زندگی برباد کرکے ایک دوسرے شخص کے ساتھ بھاگ گئیں۔ کہو وہ صاحب کہاں ہیں؟"

فیروزہ: "وہ میرے چچا کریم جعفری تھے۔ وہ آج کل جاپان میں ہیں۔ جب والد کے تقاضوں پر بھی میں یہاں سے نہ گئی تو مجبوراً انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کریم جی کو جاپان سے میرے لینے کو بھیجا۔ بمبئی سے میرے نام کا تار آیا کہ میں تمہیں لینے آتا ہوں۔ میں نے صاف انکار کردیا کہ ہرگز نہ آؤ، میں نہ جاؤں گی، تب انہوں نے یہ خبر جاپان لکھی۔ یہ سن کر پاپا مع اماں جان اور ہمشیرہ زہرہ کے خود بمبئی آگئے اور چچا کریم جی کو میرے لینے کے لئے یہاں بھیج دیا۔ وہ جس دن صبح یہاں پہنچے اُسی دن شام کو مجھے زبردستی یہاں سے لے گئے۔ بجائے باپ کے تھے میں رُک نہ سکی اور پھر یہ بھی خوف تھا کہ اُن کے ساتھ نہ گئی تو پھر پاپا آجائیں گے۔ تمہیں خبر کرنے کا وقت بھی نہ تھا۔ اور یہ خیال بھی تھا کہ تم کہاں جب تمہارے ساتھ رہنا نہیں۔ پھر تمہیں اس خبر سے رنج دینے کا کیا فائدہ۔ جاپان چلی گئی اور وہاں سب کی رائے سے ڈاکٹری کے لئے امریکہ چلی گئی۔ سنی مصیبت زدہ کی داستان؟"

یہ سن کر کہ وہ شخص فیروزہ کا حقیقی چچا سیٹھ کریم جی تھا۔ ظفر پر ندامت کی بجلی سی گری اور اسے صفدر کی بدگمانی پر بے انتہا غصہ آیا۔ بمشکل ضبط کر کے اسحٰق کے متعلق سوال کیا۔

ظفر: ''اور یہ اسحٰق صاحب کہاں سے واقف ہوئے ہیں؟''

فیروزہ: (مسکراتے ہوئے) ان کا قصہ یہ ہے کہ جب میں بمبئی پہنچی تو وہاں ہماری بہت سی دعوتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک دن وہاں کے بڑے تاجر سیٹھ اسمٰعیل جی نے ہم کو ڈنر دیا۔ اتفاق سے انہیں دنوں ان کا لڑکا انگلینڈ سے فارغ التحصیل ہو کر آیا تھا۔ اُس نے وہاں مجھے دیکھا اور شادی کی درخواست کی جو میں نے نامنظور کر دی مگر پاپا اور اماں جان نے اصرار کیا، سمجھایا، ناراض ہوئے، بہن بہنوئی نے مجبور کیا تب میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پہلے میں تعلیم حاصل کر لوں پھر دیکھا جائے گا۔ یہ حضرت اسحٰق صاحب میرے بہت قدردان ہو گئے۔ بہن بہنوئی نے یہ خبر مشہور کر دی۔ بس چار سال سے گویا میں ان کی منسوبہ مشہور ہوں اور امریکہ سے واپس آنے پر شادی مقرر تھی۔ اس خیال سے کہ والدین پھر اصرار کریں گے۔ میں سیدھی ہندوستان آئی کہ پہلے اسحٰق کو صاف جواب دے لوں۔ پھر والدین کو بھی رضامند کر لوں گی۔ اس غصہ میں کہ بے میرے منظور کیے بہن بہنوئی نے کیوں یہ خبر مشہور کی۔ لکھنؤ جا کر ان سے بھی نہیں ملی۔ سیدھی یہاں پہنچی ہوں۔ اب اسحٰق کو بالکل مایوس کر کے علیحدہ کر دیا ہے اور اس کے متعلق والدہ کو خط لکھ چکی ہوں۔''

ظفر: ''اچھا مجھے سچ سچ بتاؤ۔ وہی چاہنے والا ظفر، اپنا ظفر، خیال کر کے بتاؤ کہ مسوری کس ارادے سے آئی تھیں؟''

فیروزہ: ''آہ ظفر۔ یہ قسمت کہاں تھی کہ کبھی تمہیں اپنا بھی کہہ سکتی۔ اب تم کسی اور کے ہو اور تمہیں اپنا کہنا گناہ سے کم نہیں مگر ارادہ سنو۔ میں اس خیال سے مسوری آئی ہوں کہ اب بقیہ زندگی یہاں فیروز کی قبر پر گزار دوں۔ آہ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ چار سال گزر جانے پر بھی اس کی جدائی میں میرا کیا حال ہے۔ یہ پڑھنا پڑھانا صرف اسی خوشی میں کر لیا کہ اُس کے نام پر اُس کو ثواب پہنچانے کو بے کسوں کی خدمت کروں گی اور اس کی یادگار میں شفاخانہ کھول دوں گی۔ چنانچہ آتے ہی قبرستان کے قریب ایک قطعہ زمین خرید کر تعمیر بھی شروع کرا دی ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ قبرستان کے راستہ میں ایک نیو پڑی ہے۔

بس وہی میری چھوٹی سی کوٹھی اور مختصر سا میڈیکل ہال ہوگا۔ چند کمرے مریضوں کے لئے بھی بنواؤنگی۔ جس قدر روپیہ والد سے ملا ہے اور ملے گا۔ تمام کا تمام اس اسپتال کی نظر کروں گی اور باقی تمام زندگی یہاں مسوری پر اس کی قبر کے نزدیک بسر کر ڈالوں گی۔ جس مسوری کو کسی کی محبت میں وطن بنایا تھا اور بھائی کو مدرسہ میں داخل کرایا تھا۔ اسی مسوری پر اب ہمیشہ کے لئے بھائی کو سلا چکی ہوں اور خود بھی انشاء اللہ یہیں دفن ہوں گی۔ ظفر تمہارے وطن سے یہ مقام بہت قریب ہے بلکہ وطن ہی ہے۔ دہرہ دون اور مسوری کچھ دُور دُور نہیں۔ تم بھی کبھی کبھی میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آجایا کرنا کیوں کہ میں دیکھتی ہوں کہ میری غیر موجودگی میں تم فیروز کی قبر پر بھی جاتے رہے ہو اور اپنی طرف سے ایک پُر حسرت شعر بھی اس کے سنگ مزار پر کندہ کروایا ہے۔ یقیناً میری قبر سے بھی محبت کروگے۔ بس اب تمہارا ہمارا اسی قدر تعلق ہوگا۔ یہ کہتے کہتے فیروزہ کی آواز تھرا گئی اور آنسو آنکھوں سے چھلکنے کو ہی تھے کہ زہر کے گھونٹ کی طرح ان کو آنکھوں ہی میں پی گئی اور طبیعت کو سنبھال کر بولی۔

"اب رات زیادہ آئی ہوگی۔ تمہاری اہلیہ کو انتظار ہوگا۔ تمہیں جانا چاہئے۔"

ظفر یہ سب باتیں سن رہا تھا اور ایک پتھر کے بت کی طرح ساکن و جامد تھا۔

فیروزہ کے یہ پُر حسرت خیالات اور اس کی آئندہ مایوس و بے بہار زندگی کے متعلق سوچ کر اس کے دل میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ اپنی زندگی بچے سب وبال جان ہوگئے اور دل اس خیال سے بے تاب ہوگیا کہ اگر تین سال اور شادی نہ ہوتی تو یقیناً فیروزہ اب شادی کر لیتی۔ ممکن ہے وہ اسی ارادے سے ہندوستان اور مسوری آئی ہو کہ اب مجھ سے شادی کرلے۔ آہ اسے میری بے وفائی سے کس قدر مایوسی ہوئی ہوگی۔ اپنی بے بسی اور ازدواج کی زنجیروں میں گرفتاری کے ناقابل برداشت تصور سے اس کو ایک چکر سا آگیا۔ اس سے کرسی پر سنبھل کر بھی نہ بیٹھا گیا اور کرسی سمیت فیروزہ کے قدموں میں فرش پر گر پڑا۔ آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ ڈھیلے تھے اور باوجود اس وقت کی سخت بارش اور تیز ہوا کی سخت سردی کے اس کو اس قدر پسینہ آرہا تھا کہ تمام جسم تر تھا۔ فیروزہ رنج و غم کی زندہ تصویر بنی بیٹھی تھی۔ دو تین منٹ تک متحیر و مبہوت بیٹھی رہی کہ کیا کرے۔ آخر صبر نہ ہوسکا۔ کرسی سے اُٹھی اور اس کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ اُٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا جو برف کی مانند سرد ہو رہا تھا۔ کرسی

سے کشن اُٹھا کر سر کے نیچے رکھ دیا اور کہنے لگی:

فیروزہ: ''ظفر طبیعت کیسی ہے۔ تمہیں پسینہ آ رہا ہے اور ہاتھ یخ ہو رہے ہیں۔ شال اُڑھا دوں......... طبیعت سنبھالو............. مجھ سے تکلیف بیان کرو کہ کوئی دوا دوں۔ ضروری ادویات اس وقت بھی میرے پاس موجود ہیں۔''

اس وقت جلدی سے کرسی پر سے اُٹھنے میں ساڑی کا بالائی آنچل سر سے گر گیا تھا۔ ظفر نے اپنی نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھا تو لمبے لمبے سیاہ بال تمام پشت اور سینہ پر لہرا رہے تھے اور ان کے درمیان ایک باریک سی سنہری زنجیر لٹکتی نظر آ رہی تھی۔ جس کے ساتھ ایک روپے کے برابر فریم کی گول تصویر آویزاں تھی۔ ظفر کو زنجیر اور تصویر تو نظر آ گئی۔ مگر بالوں کی سیاہی اور سائے کے باعث وہ پہچان نہ سکا کہ کس کی تصویر ہے۔

سالہا سال بعد فیروزہ کی اُس کے حال پر اس قدر شفقت اور مہربانی، اس قدر قرب۔ اس کے نرم اور نازک ہاتھوں میں ہاتھ۔ یہ سب کچھ اس کے مبہوت کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ ہر چند سنبھل کر باتوں کا جواب دینا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی اور اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک شگفتہ پھول کی خوشبو کی مانند اس کی روح رفتہ رفتہ اس کے جسم سے کھینچ رہی ہے مگر یہ کس قدر شیریں موت تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اسی طرح اس کی روح مرجھا کر رہ جائے۔ کیوں کہ پھر ایسا موقع میسر آنے کی اُمید نہ تھی۔ صبح وہ مسوری سے اور آئندہ روز دہرہ دون سے بہت دور دراز جگہ اپنی ملازمت پر رخصت ہونے والا تھا۔

جب پندرہ بیس منٹ وہ یونہیں ساکت و خاموش پڑا رہا تو فیروزہ انتہا سے زیادہ گھبرائی۔ گھڑی اُٹھا کر اس کی نبض کی رفتار دیکھی۔ پھر تھرما میٹر لگا کر حرارت دریافت کی۔ دل کی حرکت کی تیزی اور ضعف معلوم کر کے وہ اُٹھی الماری سے چند شیشیاں نکالیں اور پیمانہ میں ایک مکسچر بنا کر دیا۔

ظفر: ''(آنکھیں کھول کر) میری مہربان ڈاکٹر! یہ دوا دینے کی نسبت مجھ بدنصیب کے حق میں یہ کہیں بہتر ہوگا کہ اپنے ہاتھ سے کوئی ایسی زود اثر چیز دو جسے کھا کر میں اپنی جان سے عزیز ڈاکٹر کے سامنے اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے شفا پالوں اور اس سخت تکلیف و ایذا سے چھوٹ جاؤں جو میرے ساتھ کند چھری کا کام کر رہی ہے۔''

فیروزہ: "(ظفر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر) ظفر دیکھو اس وقت ایسی باتیں نہ کرو۔ تم بہت کمزور ہو رہے ہو۔ دوائی کے یہ چند قطرے جلدی پی لو تا کہ حالت سنبھل جائے۔ تم کو ابھی گھر تک پہنچنا ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ تمہارے دل کی دھڑکن دیکھ کر میرا دل دہلا جاتا ہے۔"

ظفر: "پیاری فیروزہ تم مسیحا ہو اگر شفا اسی کو کہتی ہو کہ میری جسمانی تکالیف دُور ہو جائیں تو اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان چمپئی ہتھیلیوں پر ایک جامِ زہر لا دو اور مسکراتے ہوئے میرے ہونٹوں سے لگا دو۔ فیروزہ یقین کرو۔ مجھ میں یہاں سے جانے کی اور کل صبح مسوری سے (جس میں تم ہو) رُخصت ہونے کی تاب و طاقت نہیں۔ میں یہاں رہ بھی نہیں سکتا کہ ملازمت اور اہل دعیال کا پابند ہوں۔ بس میرا کہا مانو۔ مسیحا بنو اور زندگی کی ان تکالیف و مصائب سے نجات دو۔"

فیروزہ: "ظفر کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ دُنیا کبھی انسان کی مرضی کے موافق نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ پڑے اسے صبر و شکر سے مردانہ وار برداشت کرو۔ تم کو فیروزہ کی قسم ہے۔ یہ دوا پی لو۔"

اتنا کہہ کر اپنے ہاتھ سے ظفر کا سر اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے دوا کا پیمانہ اس کے لبوں سے لگا دیا۔ فیروزہ کی قسم اور اس محبت سے پلانا دوا پئے بغیر نہ رہا گیا۔ فیروزہ کا حسین چہرہ دیکھتا دیکھتا پیمانہ خالی کر گیا اور ذرا دیر بعد اُٹھ بیٹھا۔

فیروزہ: "نہیں ابھی لیٹے رہو۔ ذرا آرام کر لو۔ طاقت آ جائے۔ تب جانا۔ کمزوری بہت ہے۔"

ظفر: "جائے کون اور کہاں۔ فیروزہ میں تو صرف اتنا پوچھنے اٹھا ہوں کہ مجھے یہ بتاؤ کہ کس طرح یہاں سے جاؤں اور کیوں کہ تم سے علیحدہ زندگی بسر کروں؟"

فیروزہ: "جس طرح نو سال سے آج تک زندگی بسر کی ہے۔"

ظفر: "پانچ سال تو یہ اُمید رہی کہ پڑھ کر تمہاری محبت کے قابل ہو جاؤں گا اور عمر بھر کے لئے تمہیں حاصل کر لوں گا اور ایک سال تمہاری جستجو اور جدائی کے غم میں نہایت بے چینی سے گزرا۔ اب تین سال سے بالکل مایوسانہ حالت میں تھا مگر اطمینان تھا کہ تم خوش

سے زندگی گزار رہی ہو گی مگر آہ یہ کچھ اور ہی نکلا۔تم اس طرح رنجیدہ تارک الدنیا ہو۔ تمہارے دل میں مجھ بدبخت کا خیال بھی بدستور موجود ہو۔تم میرے ہی وطن کے ایک قبرستان میں پڑ کر اور دُنیا سے علیحدہ نہایت خوش گوار طریق سے عمر بسر کرنے کو تیار ہو اور میں بیوی بچوں کے درمیان آرام و اطمینان کی زندگی بسر کروں۔ میرا دل مجھ پر لعنتیں کر رہا ہے۔میرا ضمیر مجھے نفرین کر رہا ہے۔یہ میری برداشت سے باہر ہے۔بس اس وقت تم خودکشی کرتی تھیں۔اب میں خودکشی کروں گا۔تم اس حالت میں رہو۔جواں مرگ بھائی کی موت کے سوگ اور میری محبت اور میری جدائی میں عمر کاٹو اور میں سخت جان علیحدگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں۔فیروزہ اب طرزِ زندگی میرے بس کا نہیں۔میں اب یہاں سے نہ جاؤں گا یہیں جان دے کر عذاب دُنیا سے نجات پاؤں گا۔"

فیروزہ: "ظفر تم مرد ہو کر ایک عورت سے بھی کم حوصلہ دل رکھتے ہو۔آخر میں زندہ ہوں جس طرح میں تمہاری جدائی میں عمر بسر کروں گی۔اسی طرح تم بھی زندگی کے بقیہ دن صبر و شکر سے گزار دو۔اچھا اب اس ذکر کو جانے دو۔اُٹھو صوفے پر بیٹھو۔زمین سخت اور ٹھنڈی ہے۔"

ظفر: "فیروزہ عنقریب اس زمین میں ہمیشہ کو چلا جاؤں گا۔"

فیروزہ: "یہ دیکھو اس صوفے کا یہ مخملی کشن میرے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔اس پر لیٹ جاؤ۔"

یہ کہہ کر زبردستی ظفر کو پکڑ کر اُٹھایا اور کمرے کے وسط میں صوفے پر بٹھا دیا۔

ظفر: "تو آپ چاہتی ہیں کہ میں کچھ دیر آرام کر کے گھر چلا جاؤں؟"

فیروزہ: "اور کیا۔ظفر اب جو باتیں بے سود اور رنج دہ ہیں۔اُن کے کرنے سے کیا فائدہ اور اگر تم انہیں چھیڑو تو تم اپنی بیوی کے مجرم ہو۔میرا مالک تو سوائے تمہارے نہ کوئی ہوا نہ ہو گا مگر تمہاری تمام محبت کی ایک اور دعویدار ہے۔تمہارا فرض ہے کہ تم اس سے محبت کرو اور اس کو خوش رکھو۔بیوی سے چھپ کر مجھ سے ملنا یا مجھ سے محبت کرنا اخلاقی گناہ اور خدا کا گناہ ہے۔"

ظفر: "بیوی سے قبل میرا دل اور میری جان سب آپ کی ہو چکی تھی۔اس پر بھی

میں نے اس کو کبھی اپنی بے پروائی سے تکلیف نہیں پہنچائی مگر اب کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے لئے میرے نام پر فیروزہ عمر گزار دے اور میں علیحدہ خوش رہوں تو یہ نہیں ہو سکتا۔"

فیروزہ: "جان سے پیارے ظفر جدائی ہم میں پڑ چکی ہے۔ اب ہم ہمیشہ کے لئے اپنی اپنی زندگی علیحدہ گزارنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ہم دونوں کی روحیں ایک ہیں۔ زندگی کا تھوڑا سا کٹھن عرصہ اور باقی ہے۔ عیش و آرام کی ایک دوسری دنیا ہمارے لئے چشم براہ ہے۔ آؤ ہم دونوں تنہائی میں اپنی اپنی روحیں ایک آئندہ وصال کے لئے مکمل طور پر تیار کر لیں۔ شوق کے دریاؤں کو برابر بہنے دو۔ ان میں طوفان کا آنا درست نہیں۔ لیکن آخر میں یہ مل جائیں اور اکٹھے ہو کر فنا کے بے پایاں سمندر میں ایک ہو جائیں۔ لو ایک بج گیا۔ اب تمہارا جانا مناسب ہے۔ اٹھو میں رکشا نکلواتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی برآمدے میں آ کر آیا کو جگایا جو کوچ پر پڑی پڑی سو گئی تھی۔ اپنا رکشا نکلوایا اور قلیوں کو جگایا۔ اندر آ کر کہا "رکشا تیار ہے۔ بارش بھی ذرا دھیمی ہے۔ بس اب بسم اللہ کرو۔ تمہیں میری قسم ہے۔ اب طبیعت پر جبر کر کے سوار ہو جاؤ۔ میں تمہارے بچے کو دیکھنا چاہتی اس لئے کل صبح تمہیں راستے میں ملوں گی۔"

ظفر: (مجبوراً کھڑا ہو کر) "فیروزہ تمہاری قسمیں مجھے مجبور کر دیتی ہیں مگر بتاؤ کیا کروں۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ میں کس طرح یہاں سے رخصت ہوں۔ فیروزہ میں گھر سلامت نہ پہنچ سکوں گا۔ فیروزہ میں ڈیڑھ ماہ یہاں رہا اگر پہلے سے یہ التفات ظاہر کیا ہوتا تو میں کئی ملاقاتیں کر سکتا چلتے وقت مرتے کو مارا۔"

فیروزہ: "پیارے ظفر محض اسی لئے میں تم سے بے التفاتی سے پیش آئی کہ مجھے یقین تھا۔ ملاقات سے تمہاری گزشتہ محبت میں پھر جوش آ جائے گا اور میں تمہاری اہلیہ کی گنہگار بنوں گی۔ لو سوار ہو۔ اب خدا کے سپرد۔ ہاں میں بچوں کو دیکھنے کو کل راستہ میں "جھاڑی پانی" کے قریب ملوں گی۔ ذرا اُس خوش نصیب کو بھی دیکھوں گی جس کے سر پر خدا نے یہ چمکتا دمکتا عزت کا شاندار تاج رکھا ہے۔"

ان الفاظ نے ظفر کے دل کی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا۔ اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسوؤں کا ایک دریا اُبل پڑا۔ چونکہ دونوں لیمپ کے سامنے کھڑے تھے۔ اس لئے

فیروزہ نے اُس کے آنسو دیکھ لئے۔ کب تک ضبط کرتی۔ اس کے جانے کی تکلیف پہلے ہی بمشکل سہار رہی تھی۔ اس پر ظفر کا بے قراری سے رونا۔ بے اختیار طور پر بیتاب ہوگئی۔ یہ شعر پڑھا۔

جان جاتے دیکھنا کچھ کم نہ تھی ایذا ہمیں
اور جاتے وقت رو کر تم نے تڑپایا ہمیں

ظفر کے سینے سے چمٹ گئی اور ہچکیاں لے لے کر خود بھی رونے لگی۔ یہ عجیب پر حسرت نظارہ تھا۔ یہ رخصت کر رہی تھی اور وہ رخصت ہو رہا تھا مگر نہ یہ رخصت کرنا چاہتی تھی اور نہ وہ اس سے رُخصت ہونا چاہتا تھا لیکن دونوں مجبور و ناچار تھے۔ تقریباً ۱۵ منٹ تک دونوں یونہیں کھڑے روتے رہے کہ آیا نے دروازے میں سے کہا۔ ''حضور رکشا تیار ہے۔ پانی زیادہ ہو چلا ہے۔ اُن صاحب سے کہئے سوار ہو جائیں۔'' اس آواز نے دونوں بے ہوش و بے خبر عاشق و معشوق کو چونکا دیا۔ فیروزہ نے ظفر سے علیحدہ ہو کر اپنے آنسو پونچھے اور ہاتھ پکڑ کر بہزار وقت کہا:

فیروزہ: ''لیجئے اب چلئے۔''

ظفر: ''میں کل نہ جاؤں گا۔ گھر والوں کو روانہ کر دوں گا۔''

فیروزہ نے ظفر کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چیں بجبیں ہو کر کہا۔ ''دیکھو ظفر یوں ہرگز مت کرنا ورنہ یاد رکھو خواہ ہفتہ بھر بھی ٹھہرے رہو پھر میں نہ ملوں گی۔''

یہ سن کر ظفر نے مجبور ہو کر سر جھکا لیا اور رنج و فکر کے ایک سمندر میں ڈوب گیا۔ آخر حسرت بھری نظریں فیروزہ کے چہرے کی طرف اٹھائیں۔ اس کے سینے پر اس زنجیر میں پھر وہی تصویر دکھائی دی۔ اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ اس چھوٹے سے سنہری حلقے میں دو طرفہ دو تصویریں لگی تھیں۔ ایک تو اس کے مرحوم بھائی فیروز کی تھی اور دوسری ظفر کی۔

ظفر: ''اس شبیہ کی یہ قدر کہ سینے پر رہے اور مجھ سے اس قدر نفرت!''

فیروزہ: (آہ بھر کر) ''ظفر پیارے۔ یہی دونوں تصویریں زیست کا سامان ہیں جس وقت دونوں کی یاد سے بے چین ہوتی ہوں۔ ان تصویروں کو آنکھوں سے لگا کر تسکین حاصل کر لیا کرتی ہوں۔ آج سے چار سال قبل یہ ایک اور دس سال سے دوسری۔

ہر وقت میرے سینے پر ہیں۔ دیکھو پھر دیر لگ گئی۔ اچھا خدا حافظ و ناصر۔"

اب مجبور و ناچار ظفر نیچی نظریں کئے ہاتھ ملائے بغیر برآمدے میں نکل آیا پیچھے پیچھے فیروزہ بھی کانپتی ہوئی آئی اور رکشا میں ایک بیش قیمت خوبصورت کشن رکھ کر بمشکل کہہ سکی۔

فیروزہ: "لو یہ کشن پیچھے لگا لینا تو لکڑی نہ چبھے گی۔ اور سنو اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ میرا جانا تمہاری بیوی کو ناگوار گزرے گا تو یہ نہ بتانا کہ میں فیروزہ ہوں بلکہ کچھ اور مناسب بہانہ کر دینا۔ ایسے جھوٹ سے کوئی گناہ نہیں۔"

ظفر کچھ نہ بولا۔ فیروزہ نے خود اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے پھر آنکھوں سے لگائے اور وہ سوار ہو کر رخصت ہوا۔ دونوں کے سینے دفور رنج و غم سے پھٹ جانا چاہئے تھے مگر ایک دوسرے کے سامنے دونوں ضبط کئے رہے مگر رکشا کا بڑھنا تھا کہ خون دل ظفر کی آنکھوں میں اُمنڈ آیا۔ اُدھر فیروزہ گھر میں جا کر ایک صوفے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

ظفر کو اس جدائی کے رنج نے اس قدر بے ہوش کر رکھا تھا کہ اسے قطعی خیال تک نہ ہوا کہ دو بجے گھر پہنچوں گا تو بیوی کیا کہے گی۔ عجیب حالت میں راستہ کٹا۔ سوا دو بجے گھر پہنچا۔ رکشا والوں کو دس روپے انعام دے کر رخصت کیا اور خود گرتا پڑتا بمشکل مسہری پر جا کر پڑا۔ گو بیوی جاگ رہی تھی مگر وہ کچھ نہ بولی۔

صبح کے وقت جب بیگم ظفر اُٹھی۔ تو ظفر نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

"رات بارش رہی۔ ڈاکٹر گھوش کے ہاں سے صفدر تو اِدھر چلے آئے۔ میں ایک کام کے لئے کلبڑی چلا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس غضب کا پانی پڑنے لگا کہ نکلنا دشوار ہو گیا۔ ٹھیک دو بجے تھے جب گھر پہنچا ہوں مگر بارش اس وقت بھی نہ تھمی تھی۔ ہاں تم دونوں ذرا تکلف کے لباس سے چلنا۔ رات ڈاکٹر گھوش کہتے تھے کہ اُن کی ہمشیرہ "جھاڑی پانی" پر تم سے ملیں گی۔ ان کی کوٹھی وہیں ہے۔"

یہ تقریر بیوی نے خاموشی سے سُنی۔ کچھ جواب نہ دیا۔ اور "باتھ روم" میں چلی گئیں۔ اس کے بعد چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

☆

جھاڑی پانی

الوداع! الفراق!

دن کے نو بجے کا وقت ہوگا جب مسٹر ظفر کا خاندان جھاڑی پانی کے مقام پر پہنچا۔ بہت پر رونق قافلہ تھا۔ رکشا ساتھ ساتھ تھیں۔ بیگمیں گورنس اور بچے ڈاڈیوں میں تھے۔ ظفر اور صفدر گھوڑوں پر سوار برابر برابر جا رہے تھے۔ اسباب کے بیسیوں قلی ہمراہ تھے غرض نہایت سازوسامان اور امیرانہ ٹھاٹھ سے یہ سب جھاڑی پانی پر اُترے۔

ملازم نے ایک دری پر قالین بچھا کر کرسیاں رکھ دیں۔ اور دونوں بیگمات جو پر تکلف لباس اور زیورات میں ملکہ معلوم ہو رہی تھیں۔ اُتر کر کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ گورنس بچوں کو لے کر ٹہلانے لگی۔ خوش قسمتی سے موسم اس وقت اچھا ہو گیا تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ ظفر رات کی شرمندگی مٹانے کو بیوی کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ اس خیال سے گھبرا رہا تھا کہ جب فیروزہ نمودار ہوگی تو وہ کیا کرے گا۔ تعارف کرائے گا۔ بات کرے گا یا دلِ بیتاب کو سنبھالے گا اور پھر اس کو یہیں چھوڑ کر کس دل سے یہاں روانہ ہوگا۔

راستہ میں اس نے گزشتہ رات کی تمام داستان صفدر سے بیان کر دی تھی اور اب صفدر بھی فیروزہ کے انتظار میں ہمہ تن چشم تھا۔ ظفر کے تو معمولی کپڑے تھے مگر صفدر نہایت شاندار سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا اور دونوں بیگمات کا بھی نہایت عمدہ اور بیش قیمت ایک سا لباس تھا۔ وہ اس آتشی گلابی کارچوبی کی ساڑیاں اور سفید ریشمی بلاؤس پہنے تھیں۔ جن پر چار چار انچ چوڑی سلمہ ستارے کی بیلیں ٹکی تھیں اور یاقوت اور موتی کا جڑاؤ اور فیشن

واحد زیور تھا۔ سروں پر ایک ایک چاند لگا تھا۔ دونوں بچے بھی رنگین لباسوں میں خوش نما گلدستہ بن رہے تھے۔ ننھی عذرا ادھر اُدھر اُچھلتی پھرتی تھی۔

مغلانی جی فرش پر اپنے بڑے بڑے پائینچے پھیلائے بیٹھی گلوریاں بنا رہی تھیں۔ چاندی کے اُگال دان اور سنہری خاصدان قالین پر رکھے چمک رہے تھے۔

ان سب کو اُترے بیس ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ سامنے سے چند قلی ایک خالی ڈانڈی لاتے نظر آئے۔ ظفر و صفدر نے آگے بڑھ کر دیکھا تو خود ڈاکٹر صاحبہ بھی خراماں خراماں ان کی طرف چلی آ رہی تھیں۔

اس وقت بھی وہ وہی سادہ لباس پہنے ہوئے تھی حالانکہ بیگم ظفر اور صفدر سے یہ پہلی ملاقات کا موقع تھا۔ سیاہ رنگ کی ریشمی ساڑی تھی اور اسی رنگ کی بلاؤس اور سیاہ بوٹ ۔ زیور وغیرہ میں سوائے ایک بے نگینے کی انگشتری کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاں گلے میں وہ سنہری زنجیر ضرور تھی مگر اس کی تصویر اس وقت نظر نہ آتی تھی بلکہ گھڑی کی طرح جیب میں رکھی تھی اور صرف زنجیر دکھائی دیتی تھی۔

چند قدم بڑھ کر انہوں نے ڈاکٹر کا استقبال کیا اور ظفر نے کانپتے ہوئے ہاتھ ملا کر بمشکل مزاج پوچھا اور تینوں اندر بیگمات کے پاس پہنچے۔ بے چاری ظفر بیگم کو کیا خبر تھی کہ ڈاکٹرنی کون ہیں۔ وہ دونوں مسکراتی ہوئی اُٹھیں اور مصافحہ کیا۔ صفدر نے اُن کا تعارف کرا دیا اور چاروں بیٹھ گئے مگر ظفر وہاں نہ ٹھہر سکے اور ٹہلتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔

فیروزہ مسکراتی ہوئی سب کو دیکھ رہی تھی۔ چھوٹے بچے کو بلا کر گود میں لے لیا۔ اور لڑکی کو سینے سے لپٹا کر پیار کیا۔

ظفر بیگم: "آپ کی روا روی کی ملاقات سے بھی بہت ہی خوشی ہوئی کہ ہم نے آپ کو دیکھ لیا مگر اس خیال سے دل کو بہت رنج ہو رہا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے سے کیوں نہ مل سکے۔"

ڈاکٹر: "بے شک پہلے ملاقات ہو جاتی تو میری خوش قسمتی تھی مگر میں یہاں موجود نہ تھی۔ ابھی آئی ہوں۔ میں آپ دونوں بیگمات کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ اس قدر محبت سے پیش آئیں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہو جائے گی۔ مسز صفدر میں آپ کو

شادی کی اور پھر ایسی حسین وخوش مزاج بیوی پانے کی دُہری مبارک دیتی ہوں۔"

صفدر: "آپ کو مسز صفدر کی شکل اچھی لگی۔ میں اس خیال سے پسند کا شکر گزار ہوں۔"

فیروزہ: "اوہو۔ میری پسند کا شکریہ! میں ظفر بیگم کو بھی بہت پسند کرتی ہوں۔ لاکھوں میں ایک صورت ہے۔ بچے کیسے پیارے ہیں۔ خدا ان کو عمر دے۔"

نزہت آرا: "آپ کی پسندیدگی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہنے کی بھی جرأت کرتی ہوں کہ خواہ ہم آپ کو کتنی ہی اچھی لگیں مگر آپ اس سادگی میں بھی غضب کی حسین معلوم ہو رہی ہیں۔ ہمارے ہی دل جانتے ہیں۔"

حقیقت یہ تھی کہ صفدر اپنی بیوی کو سب حال سے آگاہ کر چکے تھے اور وہ جانتی تھی کہ یہ فیروزہ ہے۔

ڈاکٹر: (یہ سمجھ کر کہ وہ آگاہ ہے) "میں کیا اور میرا حسن کیا۔ خدا آپ سب کو خوش رکھے۔ آپ سب کا اب زمانہ بہار ہے۔ آپ پھولیں پھلیں مگر چونکہ آپ میری قدر کرتی ہیں اس لئے میں اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

نزہت: "آپ کی چند ہی منٹ کی ملاقات میں آپ سے الگ ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ ہمارے دل ہی کچھ ایسے اثر پذیر ہیں۔ ابھی گزشتہ ماہ میں ایک سول سرجن صاحب کی بیوی مسز کامران بمبئی سے آئی تھیں۔ ہمیں ان سے اس قدر الفت ہوگئی تھی کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔"

ظفر بیگم: "مگر نزہت میں ڈاکٹر صاحبہ کو دیکھ کر غور کر رہی ہوں۔ بالکل مسز کامران کی ہم شکل ہیں۔ بنگالی لوگ تو اس قدر صاف رنگ نہیں ہوتے مگر ہماری ڈاکٹر صاحبہ کو خدا نے یورپین عورتوں کا رنگ روپ دیا ہے۔"

صفدر: "اسی خیال سے تو ہم نے اُنہیں آپ سے ملایا کہ اپنی عزیز دوست مسز کامران کی تصویر دیکھ لو۔"

ڈاکٹر: "اچھا اب تھوڑا سا ناشتہ کر لیجئے۔ میں کچھ چیزیں ہمراہ لائی ہوں۔ آپ کی حاضری کا یہی وقت ہوگا؟ دس بجنے والے ہیں۔"

ظفر بیگم: "آپ کی مہربانی مگر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔"

صفدر: "اچھا منگوایئے۔ اس وقت سب ساتھ کھائیں گے۔"

ڈاکٹر صاحبہ: "تو قلیوں سے چیزیں منگوا لیجیے۔"

ملازمہ عورت نے درمیان میں میز لگا کر سب کچھ چنا۔ اب ظفر بلوائے گئے مگر انہوں نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر دیا۔

ڈاکٹر صاحبہ بہت پُرتکلف سامان ساتھ لائی تھیں۔ اپنے جاپانی خانساماں کو آدھی رات سے جگا کر تمام چیزیں اپنی نگرانی میں پکوائی تھیں۔ کچھ پھل وغیرہ بازار سے خریدے تھے۔ غرض کہ کئی ٹوکرے بھرے ہوئے اُن کے ہمراہ آئے تھے۔

سب نے کھانا کھایا۔ گیارہ بجے کے قریب کھانا ختم ہوا اور چلنے کی تیاری ہونے لگی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے دونوں بچوں کو دو قیمتی فراک اور ٹوپیاں دیں اور کچھ کھلونے گڑیاں وغیرہ۔ اور ان کی گورنس کو ایک چوڑی دار ہاتھ کی گھڑی۔ بیگم صفدر کو ایک زمرد و یاقوت جڑا سہ لڑا نیکلس پہنایا۔ ظفر دور سے ٹہلتے ہوئے بے تاب دل اور حسرت زدہ آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے مگر نزدیک آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ سب کے بعد فیروزہ بیگم ظفر کے قریب آئی اور ان کے سینے پر ایک ہلال نما الماس مرصع بروچ لگا کر انگلی میں ایک موٹا سا سنہری چھلا (جیسا انگریزوں میں شادی چھلا ہوتا ہے) پہنا دیا اور اُن کے ہاتھ کو چوم لیا۔

صفدر اس انگشتری کے راز سے واقف تھے۔ انگلستان روانہ ہوتے وقت ظفر نے قبل از وقت ہی اپنی شادی کی انگوٹھی فیروزہ کو پہنا دی تھی۔ لیکن اب چونکہ وہ عہد ٹوٹ چکا تھا اور ظفر کی شادی اس بیگم سے ہو گئی تھی۔ اس لیے فیروزہ نے بچشم نم وہ شادی کی انگشتری اس خوش قسمت کی انگلیوں میں پہنا دی کہ

"حق بحق دار رسید"

یہ دیکھ کر مایوس و مجبور دلہن نے ظفر بیگم کو کس حسرت سے وہ نشانِ امتیاز زوجیت بخش دیا ہے اور خود محروم رہ گئی۔ صفدر کو بھی بے انتہا صدمہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے چہرہ پھیر لیا۔

جب فیروزہ ظفر بیگم کے ہاتھ کو بوسہ دے کر ہٹی تو ظفر بیگم نے اس کا بے انتہا شکریہ ادا کیا۔ صفدر نے بھی طبیعت کو سنبھالا اور کسی قدر مسکرا کر بولا۔

صفدر: ”ڈاکٹر صاحب یہ کیا؟ میری بیوی کو ایک چیز اور ظفر بیگم کو دو اس کا سبب بتائیے۔ ورنہ یہ چھلا واپس لے لیجیے۔“

نزہت آرا: ”نہیں بلکہ یہ میرا نیکلس بھی انہیں کو پہنا دیں۔“

ڈاکٹر: آپ کا ہار بڑا ہے۔ اس لئے ایک ہے اور چونکہ یہ چیزیں چھوٹی ہیں اس لئے دو ہیں۔ اچھا اب رُخصت چاہتی ہوں۔ آپ کا بھی حرج ہو رہا ہے اور میرے زیرِ علاج مریض بھی جمع ہوں گے۔ یہ تینوں حیران تھے کہ تمام تحفوں کو بدلہ کس طرح دیں۔ نزہت آرا و ظفر بیگم نے جلدی میں اپنے ہاتھ سے ایک ایک انگوٹھی اُتار کر بطور نشانی زبردستی فیروزہ کو پہنادی اور نہایت گرم جوشی سے بغلگیر ہو کر اس سے رُخصت ہوئیں۔

فیروزہ باہر نکلی۔ تو ظفر کچھ فاصلے پر منہ دوسری طرف کیے کھڑا تھا۔ فیروزہ نے باہر نکل کر اس کی طرف دیکھا۔ ظفر نے بھی چہرہ پھرایا۔ نگاہیں چار ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کی روحیں جسم کے بند توڑ کر باہم مل جانا چاہتی ہیں۔ ظفر کھڑا کانپ رہا تھا۔ اس کا دل شق ہوا جاتا تھا۔ اس کا سر جھک گیا۔ آنسوؤں کے پردے نے فیروزہ کی نگاہوں سے ظفر کا چہرہ اوجھل کر دیا۔ اس نے پلکیں جلدی جلدی جھپک کر آنسوؤں کو پی لیا اور سر جھکا کر مایوس و نامراد قدم اُٹھاتی ہوئی دوسری طرف چل دی۔ اسے رُخصت ہوتے ہوئے دیکھ کر ظفر کے قدم بے اختیار بڑھے کہ دوڑ کر اس سے لپٹ جائے مگر وہ دفعتاً رُک کر رہ گیا۔ صفدر نے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

قافلہ پھر روانہ ہوا۔ آگے آگے بیگموں کی سواری تھی۔ پیچھے مزدور تھے اور سب کے بعد صفدر اور ظفر گھوڑے پر سوار تھے۔ ظفر کا چہرہ اس وقت دُنیا کی ٹریجیڈی کا ایک نہایت صحیح مرقع تھا۔

ایک موڑ پر اُنہوں نے گردن پھرا کر پیچھے دیکھا۔ دُور پہاڑ کی چوٹی پر ایک سیاہ پوش مورت بے حس و حرکت کھڑی اس قافلے کو حسرت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بادل اس کے سر پر بے چینی سے پھر رہے تھے۔ ایک یاس و نااُمیدی کا مدہم ہالہ اس کی پژمردہ ہستی کے گرد دکھائی دے رہا تھا۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہا تھا:

”الوداع ! الفراق“

☆☆☆

آہِ مظلوماں

فصل اوّل

نگاہِ مہر ہم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے
کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

مرزا عزیز الرحمٰن اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لدھیانہ کے گھر باورچی خانہ میں دو ماما ئیں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔

چمپا: ''خبر نہیں کیا بات ہے۔ تھوڑے دنوں سے ہماری بیگم بڑی چپ چپ اور اُداس سی رہتی ہیں۔''

گلاب: ''اُداس کیسے نہ ہوں۔ کوئی پندرہ دن سے سرکار کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ پہلی سی بات ہی نہیں۔ گھر میں کسی وقت بیٹھتے ہی نہیں کھانا تک باہر منگواتے ہیں۔''

چمپا: ''آخر بات کیا ہے؟ سرکار کی تو ایسی عادت نہیں تھی۔ وہ تو کچہری کے سوا کسی وقت بھی باہر نہ جاتے تھے۔''

گلاب: ''اسی بات کا تو غم ہے۔ بیگم بے چاری اندر ہی اندر گھلی جاتی ہیں۔ ظاہراً کچھ خفگی بھی نہیں ہے۔ جب اندر آتے ہیں۔ یہی عذر کر دیتے ہیں کہ آج کل کام بہت ہے یا دوست نہیں چھوڑتے۔''

اتنے میں ڈپٹی صاحب باہر سے آ گئے اور یہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ اس وقت کوئی کتاب دیکھ رہی تھیں۔ ان کے آتے ہی کتاب رکھ دی اور مرزا صاحب کو پریشان دیکھ کر کہا:

بیگم: ”خیر ہے۔آپ کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں؟“

ڈپٹی صاحب: ”ہاں خیریت ہے۔تبدیلی کا حکم آگیا ہے۔یہی فکر ہے۔“

بیگم: ”یہ تو کوئی فکر کی بات نہیں۔تبدیلیاں ہوا ہی کرتی ہیں۔پہلے تو آپ کبھی ایسے پریشان نہیں ہوئے۔“

ڈپٹی صاحب: ”نہیں۔پریشان تو اب بھی نہیں۔“

بیگم: ”نہیں۔آج کل تو آپ بے انتہا فکر مند معلوم ہوتے ہیں۔کوئی دو ہفتے سے میں اندازہ کر رہی ہوں۔گویا آپ کسی گہری سوچ میں ہیں۔کیا خدانخواستہ کوئی پریشان کن امر موجب تبادلہ ہے؟“

ڈپٹی صاحب: ”نہیں تو“۔

بیگم: ”خدا کے لئے آپ مجھے آگاہ کیجئے۔دو ہفتے سے آپ کی ایسی حالت دیکھ کر میں دل ہی دل میں گھلی جاتی ہوں۔“

ڈپٹی صاحب: ”کوئی بات نہیں۔میں صرف اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ گھر کا کیا انتظام کروں؟“

بیگم: ”اس کی آپ کو کیا فکر ہوتی؟ انتظام ہمیشہ ہوا ہی کرتا ہے۔آپ کو تو کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا۔اب بھی اسی طرح ہو جائے گا۔اسباب وغیرہ ساتھ کا سامان میں درست کرلوں گی۔مال گاڑی کا اسباب نوکر درست کرلیں گے۔“

ڈپٹی: ”نہیں نا۔اس وقت ایک اور بھی دقت ہے۔ہمیشہ تم میرے ساتھ چلا کرتی تھیں۔مجھے کچھ فکر نہیں ہوتا تھا۔اب کے یہ خرابی ہے کہ میں تمہیں سردست ہمراہ نہ لے جاسکوں گا کیوں کہ فی الحال راولپنڈی جانا ہے۔وہاں سے پھر کہیں ٹھیک مقام ہوگا۔“

بیگم: ”تو یہ بھی کوئی مشکل نہیں۔اگر اس وقت میرا جانا ساتھ نہیں ہوسکتا تو کیا ہے۔میں چند روز یہیں رہوں گی۔جب آپ جائے قیام پر پہنچ جائیں گے تو بلا لینا۔“

ڈپٹی: ”یہاں بھی اتنا عرصہ تنہا ٹھہرنا ٹھیک نہیں کیوں کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کب تک راولپنڈی ٹھہرنا ہوگا۔میرے خیال میں تو یہ آتا ہے کہ فی الحال تم وطن ہو آؤ۔جتنا عرصہ میرے.......ٹھیک ٹھکانے میں لگے۔تم عزیزوں سے مل لو۔پھر میں بلا لوں گا۔“

بیگم: (تامل سے) ”تو آپ مجھے وطن بھیجنا چاہتے ہیں؟“

ڈپٹی: ”ہاں اسی خیال سے کہ یہ بے اطمینانی کے دن تم عزیزوں میں خوشی سے گزار آؤ۔“

بیگم: ”جو آپ کی مرضی۔ اس سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن خوشی کیسی؟ آپ تو یہاں پریشانیوں میں ہوں اور میں خوشیاں مناؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے آپ سے زیادہ اور کوئی عزیز نہیں۔“

ڈپٹی: (مسکرا کے) ”فکر کی بات کوئی نہیں۔ تم بالکل اطمینان سے یہ دن گزار دینا۔“

اس صلاح کو ایک ہفتہ گزر گیا اور ڈپٹی صاحب کی رائے سے یہی اقرار پایا کہ بیگم اپنے وطن آگرے چلی جائیں اور خود راولپنڈی۔ بیگم کا بھتیجا ظفر حسن انہیں آگرے سے لینے آیا گو بظاہر ڈپٹی صاحب بیوی سے بہت خوش تھے مگر بیگم کے دل پر جو گزر رہی تھی، اس کو کچھ وہی جانتی تھیں۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میاں تبدیلی پر تنہا جا رہے تھے اور وہ وطن۔ ورنہ پہلے ہمیشہ ساتھ ہی جایا کرتی تھیں۔ ڈپٹی صاحب اکثر دورے پر بھی ساتھ ہی لے جایا کرتے تھے۔ اس دفعہ نہ معلوم کیا سبب تھا جو انہوں نے خاص کوشش سے بیوی کو الگ کیا۔ اس بے چاری نے بہتیرا ہی چاہا کہ ہمراہ نہیں لے جاتے تو لدھیانے ہی چھوڑ جائیں مگر میاں نے ایک نہ سنی۔ بیچاری بے بس بیگم نہایت رنجیدہ خاطر آگرے روانہ ہوئیں۔

فصل دوم

جس گھڑی صانع قدرت نے کیا غم پیدا
غم کو درکار تھا ہمدم سو ہوئے ہم پیدا

پہلی بھیت محلہ جامع مسجد کے پرلے سرے پر منشی ہدایت اللہ کے دو مکان ہیں۔ ایک تو پختہ اور بڑا ہے۔ جس میں اُن کے بال بچے رہتے ہیں۔ دوسرا کچا اور چھوٹا سا ہے۔ اس میں بیل، گائے، بھینس، بندھا کرتے ہیں۔

منشی ہدایت اللہ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے لڑکے کے تو بیوی بچے ہیں۔ چھوٹا لڑکا اور دونوں لڑکیاں ابھی کنواری ہیں۔

ہدایت اللہ کی بیوی آبادی بیگم کی کبھی بھی بہو سے نہ بنی۔ اوّل اوّل تو خود ہی بڑے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کرلائیں۔ اب نہ معلوم کیا ہوگیا کہ اس کی جان کی دشمن ہوگئیں۔

بہو تو بہو پوتی پوتا بھی آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور اب یہی دل میں سمائی کہ جس طرح ہو۔ عظمت اللہ (بیٹا) کی دوسری شادی کروں۔ بہو بے چاری ایسی غریب، ایسی کم سخن، خدمت گذار، تابعدار، کہ چراغ لے کر ڈھونڈیں، تو دوسری نہ ملے۔ آپ تینوں ماں بیٹیاں پلنگ پر بیٹھی رہتیں اور سارے گھر کا کام وہی کرتی۔ ننھے ننھے بچوں کو بھی سنبھالتی اور گائے بھینس کی سانی بھی کرتی مگر افسوس اس کی خدمت گزاری کی کسی کو قدر نہ ہوئی۔ بات صرف یہ تھی کہ آبادی بیگم اب اپنی مالدار بھانجی کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ بے چاری عظمت اللہ کی بیوی روٹی پکا رہی تھی اور ساس دالان میں بیٹھی چھالیا کتر رہی اور اپنی

چچازاد بہن کریمن سے باتیں کرتی جاتی تھیں۔

کریمن : "تم کچھ فیصلہ ہی نہیں کرتی ہو۔ آخر اُن کی بیٹی جوان ہوئی۔ اُنہیں تو جلدی ہے۔ تم اگر جواب دے دو تو وہ کہیں اور ہی بندوبست کریں۔"

آبادی: "اللہ نہ کرے جو میں جواب دوں۔ میں نے اندر ہی اندر سب سامان ٹھیک کرلیا ہے۔ بہن مشکل صرف یہ آن پڑی ہے کہ وہ کہتے ہیں زبیدہ کو بالکل گھر سے نکال دو۔ جب بیٹی دیں گے۔ اب میں اس فکر میں ہوں کہ کس بہانے اسے گھر سے نکالوں اور نکالوں تو کہاں پھینکوں۔ ماں باپ اِس کے مر گئے۔ کوئی بھائی بہن بھی نہیں۔ حیران ہوں کہ کیا کروں؟

کریمن: "اے ہے۔ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ اس کو الگ ہی جو کردو۔ کھانے کو دو اور دوسرے گھر میں ڈال دو۔ تمہارا کچا مکان خالی تو پڑا ہی ہے۔"

آبادی: "شاباش بہن۔ یہ ٹھیک کہا۔ اب یہی بندوبست کرتی ہوں۔ تم اُن سے کہہ دو کہ اب انشاء اللہ بہت جلد اس بلا کو دفع کروں گی۔ وہ بیاہ کے لئے تیار رہیں۔"

کریمن: "اچھا بہن تو اب میں جاتی ہوں۔ جا کر اُنہیں اطمینان دلا دوں۔"

آبادی: "اے روٹی تو کھاتی جاؤ۔ کھانا تیار ہے۔ او زبیدہ! روٹی اور برتن یہاں رکھ جا۔ خالہ جا رہی ہیں۔ اُن کو روٹی کھلا دے۔"

زبیدہ: "اماجان ابھی توا رکھا ہے۔ دو تین چپاتیاں ہو جائیں تو لائی۔"

آبادی: "ہیں ابھی توا رکھا ہے۔ شام سے کہاں مر رہی تھی؟"

زبیدہ: "اماں جی چار بجے سے کھانے ہی میں لگی ہوئی ہوں۔"

آبادی: "چار بجے سے لگتیں تو اب تک کھانا تیار نہ ہو جاتا۔ یوں کہو نالال سے چُہل ہو رہی تھی گڈ کڑے میں چڑھائے پھر رہی تھیں۔ کام کون کرتا؟"

زبیدہ: "میں نے تو گودی میں نہیں لیا۔ سیڑھیوں پر سے گر پڑا تھا تو ہاں اُٹھا کر پلنگ پر ڈال آئی تھی۔"

آبادی: "چپ نہیں ہوتی۔ آگے سے تڑاخ تڑاخ جواب دیئے جاتی ہے۔ کام کرنے کو جی نہیں کرتا تو خصم سے کہو۔ آرام سے بٹھا دے گا۔ میرے پاس تو کام ہی ہے۔"

یہ کڑا کا سُن کے زبیدہ تو خاموش ہو گئی۔ ساس اُٹھ کر باورچی خانے میں آئیں۔ دیکھا تو ایک روٹی چنگیر میں تھی۔ دوسری توے پر۔ آتے ہی بہو کا ہاتھ پکڑ کر اسے پرے کھڑا کر دیا۔

زبیدہ: (روکر) ''اماں جی معاف کرو میں ابھی پکائے دیتی ہوں۔''

آبادی: ''چل چل دُور ہو، اب تو پکا چکی اور میں کھا چکی۔ خدا نہ روزی کرے تجھے اس چولہے پاس بیٹھنا۔ تو ہمارے کام سے گھبرا گئی ہے تو ہم بھی تجھ سے اب گھبرا گئے ہیں۔ دُور ہو جا میری نظروں سے۔''

زبیدہ: (قدموں پر گر کے) ''اماں جان! آج کی خطا معاف کرو۔ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔ میں تمہاری نظروں سے دُور ہو کر کہاں جاؤں۔ سوائے تمہارے میرا کہاں ٹھکانا ہے؟ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔''

اسی جھگڑے میں خسر بھی باہر سے آ گئے۔

ہدایت اللہ: ''کیا ہے۔ کیا ہے۔ یہ کیوں رو رہی ہے؟''

آبادی: ''رو رہی ہے۔ اپنے نصیبوں کو، چھیلبائی نے اوّل تو کام بگاڑا پھر لگی ٹسوے بہانے۔ لے جاؤ اِسے کہیں الگ رکھو۔ میں اِسے اب اپنے گھر میں نہیں رکھتی۔''

ہدایت اللہ: ''آخر ہوا کیا؟''

آبادی: ہونا کیا تمہیں تو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ میرا کلیجہ اس نے پکا پھوڑا کر دیا ہے۔ اب تو وہ تڑاخ تڑاخ جواب دینے لگی ہے۔ جس کی کچھ ٹھیک ہی نہیں۔ بس میں اِسے اِس گھر میں نہیں رکھتی۔''

بیوی کا مطلب معلوم کر کے منشی جی نے روتی ہوئی بہو کو باورچی خانے سے اُٹھا دیا۔ وہ بدنصیب اپنی کھپریل کے در میں بیٹھ کر رونے لگی۔ عظمت اللہ بھی آ گیا۔ اماں نے بڑھا چڑھا کر بات کا جھگڑا بنا کر سب حال سنایا اور کہا ''بیٹا! اِسے اب یہاں سے کسی صورت دُور کر جب تک یہ بلا یہاں رہے گی، خالہ اپنی بیٹی نہیں دینے کی۔'' عظمت اللہ گو شروع سے اب تک بیوی کا قدردان تھا لیکن میاں کا سمجھانا سکھانا بے اثر نہ رہا۔ اماں نے خالہ کے گھر کے مال کا لالچ دیا۔ وہ بھی دوسری شادی کے شوق میں پڑ گئے۔ بیوی سے تو یہی کہتے تھے کہ ماں باپ کی مرضی سے میں

مجبور ہوں مگر دل میں خود بھی خوش تھے۔ اب اماں سے سارا جھگڑا ان کر بیوی کے پاس گئے۔

عظمت اللہ: (رنجیدہ سامنہ بنا کر) "اماں جان نے آج بہت برا بھلا کہا۔ میں نے بہتیرا کچھ کہا مگر وہ ایک نہیں مانتیں۔ یہی کہتی ہیں کہ تم دونوں میرے گھر سے نکل جاؤ۔ تم جانتی ہو، میں بے کار ہوں۔ انہیں کا محتاج ہوں اگر کھانے کو بھی نہ دیں تو ہم کیا کریں؟ اُٹھو اپنا اسباب اور بچے سنبھالو۔ چلو اس ساتھ والے مکان میں رہیں گے۔ اناج پانی اماں وہیں ڈلوا دیا کریں گی، اِس روز کی چخ چخ سے تو نجات ملے گی۔"

زبیدہ بے چاری روتی ہوئی اُٹھی۔ دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور کھڑکی سے گزر دوسرے گھر میں چلی گئی۔ میاں نے پلنگ بچھونے پہنچا دیئے۔ اِس گھر میں ایک لمبی کھپریل اور اُس کے پیچھے ایک کوٹھری تھی جس میں گائے بھینس کا بھوسہ دانہ وغیرہ رہتا تھا۔ بدنصیب زبیدہ نے کڑوے تیل کا چراغ جلا کر طاق میں رکھا۔ تھوڑی سی جگہ صاف کر کے دو پلنگ بچھائے اور بچوں کو لے کر بیٹھ رہی۔ سامنے کھپریل میں بیل بندھ رہے تھے۔ اُن کی بُو سے بے چاری کا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ پر کیا کرتی؟

محمودہ (بچی): "امّاں یہاں کیوں آ گئیں۔ چلو اپنے دالان میں یہ برا ہے۔"

صبغت اللہ: "امّاں بھوک لگی ہے۔"

زبیدہ: "بیٹے میں روٹی کہاں سے لاؤں۔ ابا آئیں گے تو اُن سے کہیو۔"

عظمت اللہ بھی ہاتھ میں چنگیری لئے آ گئے۔ ایک مٹی کی رکابی میں شلجم اور دس چپاتیاں آبادی بیگم نے ان سب کے لئے بھیجی تھیں۔ زبیدہ سے اس وقت کچھ نہ کھایا گیا۔ دونوں بچوں اور باوا نے روٹی کھائی۔ پھر یہ تینوں سو رہے مگر زبیدہ مصیبت زدہ کو نیند کہاں؟ جاگتی اور کڑیاں گنتی رہی۔ بہری نہ تھی۔ اپنے میاں کی شادی کی تجویزیں سن رہی تھی۔ حیران تھی کہ اب کیا ہوگا۔ میں بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ محمودہ آج پانچ سال کی ہے۔ کل کو سیانی ہوگی۔

آبادی بیگم بڑی ہی چالاک اور ہوشیار عورت تھیں۔ انہوں نے ذرا سی بات کو بڑھا کر زبیدہ کو بڑے مکان سے نکال کر کچے کھنڈر میں ڈالا اور دو تین دن کے لئے بیٹے کو بھی ساتھ کر دیا۔ جب ان کو نکال دیا تو شادی کے لئے گھر لپا پُتا، اِس کے دالان میں فرش بچھا اور ایک ہی ہفتہ بعد بھانجی بیاہ لائیں۔ ☆

فصل سوم

تکلم خیز ہے ہمدم مرا اندازِ خاموشی
بیانِ دردِ دل منتِ کشِ تابِ بیاں کیوں ہو؟

حامد منزل کے باغیچے میں کرسی بنچ اور تخت پر چند صاحب خانہ بیگمات اور دو یوروپین لیڈیاں بیٹھی ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق کی گفتگو ہو رہی ہے۔

بیگم حامد علی: "ہمیں تو اس وقت تم میں سے کسی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں ہماری باجی جان خاموش ہیں۔ تمہیں ہنسی سوجھ رہی ہے۔"

بیگم محمود علی: "اسی لئے تو ہم ہنس رہے ہیں کہ کسی طرح باجی جان خوش ہوں اور بولیں۔"

بیگم محمد علی: "نہ معلوم کیا سبب۔ اِس دفعہ باجی جان کچھ خوش نہیں آئیں۔ کسی کام، کسی بات میں ان کا دِل ہی نہیں لگتا۔ میں سوچ سوچ کر اس قسم کی باتیں کرتی رہتی ہوں۔ جس میں اِن کا دِل بہلے مگر ان پر اثر ہی نہیں۔"

تمکنت آرا: "مجھے خود باجی جان کی اس گہری خاموشی سے بہت فکر ہے۔ اللہ ہی فضل کرے۔"

مس جارج: "ہاں ہم نے بھی خیال کیا ہے۔ دو مہینے ہو گئے ان کو یہاں آئے۔ بالکل چپ رہا۔"

سلطنت آرا: "آپ سب کیوں اِس قدر فکر مند ہوتی ہیں۔ اگر میں

بالکل خاموش ہوں؟ تنہائی میں رہ کر مجھے خاموش رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔ آپ لوگ خوش قسمت ہیں۔ جو وطن میں .... ایک دوسرے سے ملتے جلتے چہتے بولتے رہتے ہیں۔"

مس ولیم: "نہیں نہیں۔ یہ بات ہرگز نہیں۔ آپ کی خاموشی کا کوئی سبب ضرور ہے۔ پہلے جب آپ آیا کرتے تھے۔ تو خوش ہوتے تھے۔"

سلطنت آرا: "اچھا سسٹر! اس وقت آپ ہارمونیم پر کچھ گانا سنائیں۔"

مس ولیم: "میں خوشی سے سناؤں گی۔ مگر یہ بتاؤ کہ آپ بھی خوش ہوں گی؟"

سلطنت آرا: "ہاں ہاں مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

مس ولیم: "اچھا کیسا گیت سناؤں؟ آپ جانتے ہیں۔ میرا اُردو تو ٹھیک نہیں۔"

سلطنت آرا: "نہیں بہت ٹھیک ہے۔ ہمیں تو بہت پسند ہے۔ آپ اُردو ہی میں سنائیں۔"

مس ولیم: (ہارمونیم پر)۔

شمع کو دیکھ میرے دل کو جلانے والے
خود ہی جل بجھتے ہیں اوروں کو جلانے والے
قید خانے میں مرا حال تو آکر دیکھیں
کیا ہوئے اب وہ مرا ناز اٹھانے والے

"لو ہم کو جو آتا تھا، وہ سنا دیا۔ اب آپ ادھر آیئے۔"

سلطنت آرا: "مجھے اس وقت کچھ یاد نہیں۔ میرے بدلے تمکنت آرا سے کہو۔"

تمکنت آرا: "بسر و چشم میں تیار ہوں۔ مگر باجی جان! آپ کو بھی تھوڑا بہت کچھ ضرور سنانا ہوگا۔"

سلطنت آرا: "اچھا میں بھی سنا دوں گی۔ پہلے تو تم اُٹھو۔"

تمکنت آرا:

رازِ دل اپنا عجب درد کا ساماں نکلا
اس کے ہر پردے سے صد نالہ و افغاں نکلا

نوحۂ غم کی تڑپ ، نغمۂ شادی میں رہی
خندۂ عیش بھی گر نکلا تو گریاں نکلا
زندگی کو طرب آمیز سنا کرتے تھے
یہ تو اِک قصۂ پر درد پر ارماں نکلا

سلطنت آرا: ''بہن اس کو پھر ایک دفعہ اور کہو۔''

تمکنت آرا:۔

زندگی کو طرب آمیز سنا کرتے تھے
یہ تو اِک قصۂ پُردرد و پر ارماں نکلا
بے بسی چارہ گروں کی تھی عجب درد افزا
آس سے یاس ہوئی یاس سے حرماں نکلا

سلطنت آرا: (آبدیدہ ہوکر) ''آخری مصرع ایک بار اور۔''

بیگم حامد: ''بس بس۔ تمکنت رہنے دو۔ بے فائدہ باجی کے رنج کو بڑھا رہی ہو۔''

سلطنت آرا: ''نہیں بھابی! یہ شعر بہت اچھے ہیں، بہن تمکنت! صرف ایک بار۔''

تمکنت آرا:۔

عبرت انگیز ہے نیرنگِ طلسماتِ جہاں
جو یہاں آیا، سراسیمہ و حیراں نکلا

اتنا بجا کر باجا بند کر دیا۔

سلطنت آرا: ''تمکنت! تم نے اپنی بھابی کا کہنا مان لیا۔ ہمارا نہ مانا۔''

تمکنت آرا: ''باجی جان! غزل ختم ہی ہوگئی تھی۔ بس اتنے ہی شعر مجھے یاد تھے۔ اچھا اب آپ آیئے۔''

بیگم محمود: ''ہاں ہاں۔ اچھی باجی جان! کچھ تھوڑا سا۔''

بیگم محمد علی: ''کمال مہربانی ہوگی۔''

سلطنت آرا: ''تم سب کی خوشی تو مجھے دل و جان سے منظور ہے۔ لیکن کیا گاؤں، مجھے تو اب کچھ بھی یاد نہیں رہا''۔

تکلم خیز ہے ہمدم مرا انداز خاموشی
بیانِ دردِ دل منت کش تابِ بیاں کیوں ہو؟

بیگم حامد: ''واقعی یہ خاموشی تو تکلم خیز ہی ہے۔''

سلطنت آرا:۔

ہمارے سامنے بلبل نواسنجِ فغاں کیوں ہو؟
چمن میں بے زباں اہلِ زباں کا ہم زباں کیوں ہو؟

تمکنت آرا: ''بے شک بلبل کیا چیز ہے؟''

سلطنت آرا: ''تب ہی تو میں کہتی تھی۔ اب سب نے پھبتیاں اُڑانی شروع کر دیں۔''

تمکنت آرا: ''توبہ باجی! بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ ناراض نہ ہوں اور ایک آدھ مصرع اور کہہ دیں۔''

سلطنت آرا: ''بس اب نہیں، جو یاد تھا کہہ دیا اور وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔''

بیگم حامد: ''باجی ناراض نہ ہوں۔ ہم نے مذاقیہ فقرہ تو نہیں کہا۔''

سلطنت آرا: ''میں ناراض نہیں ہوں۔ بھلا کوئی بات بھی۔ بس دو ہی شعر یاد تھے۔ کہہ دیئے۔ یہاں اب سردی ہے۔ چلو کمرے میں چلیں۔''

ایک پنج سالہ لڑکا کھیلتا ہوا اِدھر آ کر۔

فضل الرحمٰن: (لڑکے کا نام) ''اماں جان! چلئے کمرے میں۔ مجھے ابھی سبق یاد کرنا ہے۔''

سلطنت آرا: ''چلو میاں۔'' یہ دونوں ماں بیٹے چلے اور ان کے پیچھے ہی اور سب بھی چلی گئیں۔ سات بج گئے، سب نے کھانا کھایا۔ مس جارج اور مس ولیم تو کھانے کے بعد اُن سے رُخصت ہو کر اپنے اپنے گھر گئیں اور یہ سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں۔ رات کے ۹ بج چکے ہوں گے۔ سلطنت آرا بیگم کا لڑکا تو سو رہا اور وہ بھی لیٹی تھیں مگر ابھی سوئی نہ تھیں کہ دروازے پر کسی نے ہاتھ مارا۔''

سلطنت آرا: ''کون ہے؟''

آواز: "باجی جان! میں ہوں۔ ذرا دروازہ کھولئے۔ مجھے کچھ کام ہے۔"

اُنہوں نے دروازہ کھولا اور تمکنت آرا بیگم اندر آئیں۔"

سلطنت آرا: "خیریت ہے۔ تم نے اس وقت کیوں تکلیف کی؟"

تمکنت آرا: "باجی جان! میں سخت پریشان ہوں۔"

سلطنت آرا: (گھبرا کر) "کیوں بچہ تو اچھا ہے؟"

سلطنت آرا: "بچہ تو اچھا ہے مگر میرا دل نہیں اچھا۔"

سلطنت آرا: "کیا تکلیف ہے۔ کہیں درد تو نہیں؟"

تمکنت آرا: "درد تو نہیں مگر درد سے بھی سوا ہے۔ باجی جان! میں آپ کی طرف سے سخت تشویش میں ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے اپنا حال بتاؤ۔ ورنہ میں بیمار ہو جاؤں گی۔"

سلطنت آرا: "تمکنت! تم کچھ رنج نہ کرو۔ آہ! میری قسمت میں جو لکھا تھا وہ ہو گیا۔"

تمکنت آرا: "یہی تو پوچھتی ہوں کہ کیا ہو گیا؟"

سلطنت آرا: "پیاری تمکنت! کیا بتاؤں کہ کیا ہو گیا۔ آہ! رنج تو یہ ہے کہ کس کی طرف سے ہوا۔ ہائے اُس کی طرف سے ہوا۔ جس سے مجھے ایسا گمان تو کیا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ بس رہنے دو مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ میں کس زبان سے اور کس کی شکایت کروں؟"

تمکنت آرا: (رو کر) میری باجی! جلد کہو۔ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔

سلطنت آرا: "اچھا تو روؤ نہیں۔ آرام سے بیٹھ کر سنو۔ اپنے بھائی کے عادات و خیالات سے تم واقف ہی ہو۔ تمہیں اُمید تھی کہ وہ مجھ سے پلٹ جائیں گے؟ میری شادی کو دس سال ہوئے۔ جس خوشحالی میں یہ مدت گزری۔ تم بھی جانتی ہو۔ وہ مجھے کبھی علیحدہ نہ کرتے تھے۔ سوا اس دس سال کے عرصے میں مشکل سے تین بار یہاں آئی تھی۔ وہ بھی پندرہ پندرہ دن کے لئے اور وہاں تو دورے پر بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس دفعہ دیکھو مجھے تیسرا مہینہ گزر رہا ہے۔ یہاں آئے۔"

تمکنت آرا: "تب ہی تو مجھے فکر و تعجب ہے۔ کہ اس بار آپ کیوں اب تک

یہاں ہیں۔ تینوں بھائی اور بھاوجوں کو بھی حیرانی ہے مگر وہ سبب دریافت نہیں کر سکتے کہ کہیں آپ کو ناگوار نہ گزرے۔"

سلطنت آرا: "ہاں سب کو تعجب ضرور ہوگا۔ میں ہر چند چاہتی ہوں کہ بات نہ کھلے مگر آخر کہاں تک؟ ضرور معاملہ کھل کر رہے گا۔"

تمکنت آرا: "للہ باجی! مجھے تو بتایئے۔"

سلطنت آرا: "بہن! میں کیا کہوں۔ تم کو یقین نہ آئے گا۔ ایک ان سے پختہ خیال، تعلیم یافتہ شخص کی بابت، کچھ عرصہ ہوا۔ اُن کے خیالات بگڑ گئے۔ میری طرف سے بے پروائی بے توجہی اختیار کر لی۔ میں سخت پریشان رہی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ انہیں دنوں تبادلہ کا حکم آ گیا تو خلاف معمول مجھے آگرے آنے کے لئے کہا۔ خیر میں آ گئی۔ گر دل میں چبھن سی لگی رہی۔ پہلے اُن کے خط روزانہ آیا کرتے تھے۔ اس دفعہ تیسرے چوتھے دن آئے اور دو ہفتے بعد اتنا بھی نہ رہا۔ ہفتے ہفتے بعد ایک ایک خط ملا۔ آہ! پھر وہ بھی بند۔ اب تو پورا ایک مہینہ اور کچھ دن ہو گئے کہ اُن کا کارڈ بھی نہیں آیا۔ میں بیسیوں بھیج چکی ہوں۔"

تمکنت آرا: "اُف یہ غضب آپ نے اپنے بلانے کو لکھا ہوتا۔"

سلطنت آرا: "بہتیرا لکھا۔ کچھ جواب ہی نہیں۔ اسی دن سے تو خط آنا بند ہو گیا جس دن سے میں نے اپنے جانے کو لکھنا شروع کیا۔"

تمکنت آرا: "آخر اس کا سبب کیا۔ کچھ یہ بھی معلوم ہو؟"

سلطنت آرا: "سبب کیا۔ وہی جو مردوں کا شعار ہے مجھے ایک منشی کے خط سے معلوم ہوا ہے کوئی خراب عورت پلے پڑ گئی ہے۔"

تمکنت آرا: (بے اختیار رو کر) "ہائے ہائے۔ اب کیا ہوگا؟ آپ کیا کریں گی؟"

سلطنت آرا: "ہوتا کیا، اور میں کرتی کیا؟ جیسے اور صدہا بے کس بے بس میری مظلوم بہنیں اپنے دن گزار رہی ہیں۔ میں بھی گزار لوں گی۔"

تمکنت آرا: "باجی! آپ کو خود جانا چاہئے۔"

سلطنت آرا: "کوئی بلائے تو جاؤں۔ خود کیسے چلی جاؤں؟"

تمکنت آرا: ”باجی! اس وقت تو جیسے کیسے ہو۔ خود ہی جانا چاہیے۔“

سلطنت آرا: ”میں نے بھی یہ سوچا تھا مگر جاؤں کس کے ساتھ۔ میں اپنے بھائیوں پر یہ معاملہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ اگر ظفر حسن یا کوئی بھائی پہنچانے گئے تو یہ بات کھل جائے گی اور میں اس خیال سے ابھی پوشیدگی چاہتی ہوں کہ نہ معلوم ابھی کیا بات ہے۔ کیا نہیں یونہی خواہ مخواہ کیوں ان کی بدنامی ہو۔ شاید میرے وہاں جانے سے وہ عورت دفع ہی ہو جائے۔“

تمکنت آرا: ”تو کیا ابھی بات پختہ طور سے معلوم نہیں ہوئی؟“

سلطنت آرا: ”نہیں مجھے منشی کے خط سے اسی قدر معلوم ہوا ہے کہ لدھیانہ کی ایک خراب عورت وہاں پر ہمارے پیچھے آئی ہے۔ اب نہ معلوم وہ میرے گھر میں ہے یا کہیں علیحدہ ٹھہری ہے۔“

تمکنت آرا: ”تو باجی جان! یہ موقعہ تو ایسا ہے کہ آپ کو فوراً پہنچنا چاہیے۔ ہمارے بھائیوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔ آپ ان کے ساتھ چلی جائیں۔“

سلطنت آرا: ”ہاں یہ بات درست ہے۔ رشید الملک (تمکنت کے شوہر) پورا اخفا رکھیں گے۔“

تمکنت آرا: ”مگر پہلے بھائی جان کو اطلاع کر دینی چاہیے۔“

سلطنت آرا: ”اچھا کل خط لکھ دوں گی۔“

تمکنت آرا: ”کل نہیں۔ اسی وقت لکھیں تاکہ صبح کی ڈاک سے نکل جائے۔“

سلطنت آرا: ”اچھا لاؤ۔ مجھے قلم دوات اور کاغذ اٹھا دو۔ تمکنت آرا نے سامان دیا اور انہوں نے خط لکھنا شروع کیا۔“

حامد منزل
شاہ گنج، آگرہ۔

۱۹۱۲ء

دردِ دل دُور سے ہم تم کو سنائیں کیوں کر؟
بھیج دیں ڈاک میں آہوں کی صدائیں کیوں کر؟

آہ! میں کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں؟ بہتیرا لکھا۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ میں کسی طرح اپنی اُس حالت کا اظہار نہیں کر سکتی جو آپ کا خط نہ آنے سے مجھ پر گزر رہی ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی ہوں کہ خط پر خط لکھوں مگر جواب نہ ملے تو کیا کروں؟ چار ہفتوں سے زیادہ عرصہ ہوا کہ آپ کا خط نہیں ملا۔ میں نے پریشان ہو کر تار دیئے۔ کیا تعجب ہے کہ تار کا جواب مل جاتا ہے اور خطوط کا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید کسی وجہ سے آپ کو میرے خط ملتے نہیں۔ لیکن رجسٹری کی رسید مل جانے سے اس کا بھی اطمینان ہوا۔ اب سخت پریشان و متحیر ہوں کہ کیوں آپ نے خط بند کر لیا۔ زیادہ مجھے یہ فکر ہے کہ خدانخواستہ آپ کی طبیعت خراب نہ ہو اور میرے اطمینان کے خیال سے تار منشیوں سے دلوا دیتے ہوں کہ میں اچھا ہوں اس خیال نے مجھے سخت پریشان اور بے چین کر دیا ہے۔ اب میں کسی صورت یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ اطلاعاً یہ خط لکھا ہے کل شب کی ٹرین سے میں عزیز رشید الملک کے ہمراہ راولپنڈی روانہ ہوں گی۔

فضل الرحمٰن بھی بہت گھبرا گیا ہے۔ بات بات پر ضدیں کرتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا کہ تم بیٹھی رہو۔ بیں مجھے اکیلا ہی پنڈی بھیج دو۔ عزیز تمکنت آرا بھی بہت فکر مند ہے اور میرے ہمراہ آنا چاہتی ہے۔ مگر میں اس وقت ساتھ نہیں لاتی۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اب بس کرتی ہوں۔"

آپ کی پریشان
سلطنت آرا

فصل چہارم

جان اس غم کو کھلا دینا ہے، غم کھانا مرا
دخل ہونا غیر کا اور گھر سے اُٹھ آنا مرا

آبادی بیگم کے گھر تو آج بڑی رونق ہے۔ نئی دُلہن ابھی ابھی ڈولے سے اُتری ہے۔ مہمان جمع ہیں۔ رونمائی ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے ہدایت اللہ نے بہو کو دس روپے دے کر منہ دیکھا۔ پھر ساس نے پاؤں سے جھانجن اُتار بہو کو پہنا کر منہ دیکھا۔ دونوں نندوں نے دو دو روپے دیئے۔ خلیا ساس کریمن نے بھی آٹھ آنے دیئے۔ اسی طرح اور سب نے بھی منہ دیکھا۔ نئے دولہا عظمت اللہ صاحب بھی ڈیوڑھی میں بیٹھے اپنے دوستوں کے ساتھ حقہ پی رہے تھے۔ اب ذرا اُس بدنصیب کی حالت دیکھیں۔ جس کا راج بھاگ بلکہ تخت و تاج آج لٹا ہے۔ اُس بے چاری سے چھین کر دوسری کو دیا گیا ہے۔ وہ غم زدہ کھپریل میں جھاڑو دے رہی تھی۔ جس وقت باجے کی آواز آئی۔ اس کا دل اور ہاتھ کانپنے لگے۔ جھاڑو ہاتھ سے گر گئی اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ دیوار سے سہارا لے کر وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی۔ آدھا گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا۔ باہر سے محمودہ دوڑی آئی۔

محمودہ: ''اماں! اماں! بہو آ گئی۔ وہ دیکھو باجا بج رہا ہے چلو تم بھی دیکھو۔''

بچی کی اِن باتوں سے اُس کے دل پر اور بھی سخت چوٹ لگی۔

محمودہ: ''اماں اب مت روؤ۔ چلو نا، دُلہن کو دیکھو۔''

زبیدہ: ''بی بی چلوں گی۔ پہلے تمہارے ابا سے پوچھ لوں۔ کہیں تمہاری دادی خفا نہ ہوں۔''

''دیکھو تو وہ باہر کیا کر رہے ہیں۔ خالی ہوں تو بلا لاؤ۔''

آفریں ہے زبیدہ کے حوصلے پر، گھر سے نکالا، خاوند چھنا، سوکن پڑی، ساس، خسر جان کے دشمن اور وہ پھر سوت کا منہ دیکھنے کے لئے جانے کو تیار۔ صرف اس خیال سے کہ شاید ساس رضامند ہو جائیں، اور مجھے خدمت کے لئے ہی پھر اس گھر میں بلا لیا جائے۔ اس وقت اس کے کپڑے سخت میلے چکٹ تھے۔ اس لئے سوچا کہ اس حال میں گئی تو سب کہیں گے کہ سوگواروں کی شکل بنائی ہے۔ دل پر جبر کر کے گٹھری کھول کر کپڑے نکال لئے۔ اودی چھینٹ کا تنگ پاجامہ اور موٹی ململ کا گلابی رنگا ہوا دوپٹہ کرتہ جوڑا نکال کر پلنگ پر رکھا اور خود منہ دھونے لگی کہ باہر سے نوشہ میاں آئے گو ہزار بے حیائی اور بے شرمی اختیار کی مگر قدرتی شرم سے آنکھیں نیچے جھکی جاتی تھیں۔

عظمت اللہ: ''کیا ہے؟''

زبیدہ: ''خدا مبارک کرے نئی دلہن۔''

عظمت اللہ: ''خیر مبارک و بارک تو ہوگا ہی۔ تم بتاؤ کیا کام ہے؟ محمودہ بلانے گئی تھی۔''

زبیدہ: ''ہاں میں نے بلایا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں دلہن کو دیکھنے جانا چاہتی ہوں۔''

عظمت اللہ: ''جاؤ بڑی خوشی سے۔''

زبیدہ: ''میں تو خوشی سے جاتی ہوں مگر ڈر یہ ہے کہ اماں جان خفا نہ ہوں تم اُن سے اجازت لے دو تو میں ہو آؤں۔ جب وہ تمہاری بیوی ہے تو مجھے بھی اُس سے محبت ہے اور میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں میں سلوک رہے۔ گو اُس کا مجھ سے کچھ واسطہ نہیں۔ میں یہاں الگ پڑی ہوں لیکن محبت رہے تو اچھا ہی ہے۔

عظمت اللہ: ''کچھ پرواہ نہ کرو۔ اماں کو میں سمجھا لوں گا۔ خفا کیسی وہ تو خوش ہوں گی۔ تمہارے جانے سے میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تم دونوں میں بنی رہے۔ دیکھو

تمہارے کپڑے بہت میلے ہیں۔ بدل کر جانا۔ وہاں بہت لوگ جمع ہیں۔"

یہ حکم دے کر سنگدل عظمت باہر گیا، اس وقت تو زبیدہ کو بھی سنگدل بھی کہنا چاہیے اس نے بھی پتھر کا کلیجہ کرلیا اور کپڑے بدل کر اپنی دُشمن کو دیکھنے چلی۔ کھڑکی میں تالا پڑا تھا۔ دروازہ کھٹکٹایا۔ ساس اُدھر سے گزر رہی تھیں۔ پوچھا کون ہے؟"

زبیدہ: "میں ہوں اماں جی ذرا کواڑ کھولو۔"

آبادی: (دروازہ کھول کر) "کیا ہے؟"

زبیدہ: "اجازت دو تو میں بھی بہن خورشید بیگم کا منہ دیکھ لوں۔"

آبادی: "اچھا ذرا ٹھہرو۔ اُس کے میکے کی دو تین بیبیاں بیٹھی ہیں۔ وہ چلی جائیں تو آنا۔"

تھوڑی دیر کے بعد زبیدہ کی نند خدیجہ اُسے بلا کر لے گئی۔ زبیدہ نے اپنے دالان کا آج کچھ اور ہی رنگ دیکھا۔ فرش پر چھپر کھٹ بچھا تھا۔ جس میں دُلہن بیٹھی تھی۔ عظمت بھی وہیں کھڑے بہن سے پان لگوا رہے تھے۔ زبیدہ نے چھپر کھٹ کا پردہ اُٹھایا۔ خدیجہ نے بھاوج کا گھونگھٹ اُٹھا کر منہ دکھایا۔

اُس نے اپنی سونے کی آرسی سوکن کے ہاتھ میں پہنادی۔ ساس بھی خوش ہوئیں اور میاں بھی خوش ہوئے۔ آج شام تک زبیدہ کو یہیں رکھا۔ رات کی روٹی کھا کر وہ سونے کو اپنے گھر گئی۔

نئی دُلہن کے آنے سے کام بڑھ گیا۔ لڑکیوں سے تو کچھ ہو ہی نہ سکتا تھا۔ کوئی نوکر تھی نہیں اور رکھتیں تو تنخواہ دینی پڑتی۔ اس مجبوری کو پھر زبیدہ کو بلانا پڑا۔ شادی کے دوسرے دن بے چاری نصیبوں جلی زبیدہ سوت کی خدمتگاری کو اِدھر آنے لگی۔ نہ معلوم اس کا آنا جانا خورشید بیگم (عزیز دُلہن) کو پسند تھا یا نہیں مگر ان دنوں شرم سے کچھ کہہ نہ سکیں۔ ہر روز صبح آ کر وہ بے چاری پکاتی، ریندھتی، ہاتھ دُھلاتی اور دُلہن دولہا کے آگے کھانا لا رکھتی۔ خود بچوں سمیت چولہے کے پاس کھالیتی اور رات کو اُسی اکیلے گھر میں جا پڑتی۔ کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔

☆

فصل پنجم

دل نکل آیا تڑپ کر آ گیا منہ کو جگر
کچھ قیامت کا نہ آنا تھا یہاں آنا مرا

ڈپٹی عزیز الرحمٰن صاحب کے مکان پر گاڑی کھڑی ہے۔ ڈپٹی صاحب بیوی کو اُتروا کر اندر چلے۔ رشید الملک بھی ساتھ تھے۔ صحن میں داخل ہوتے ہی بیگم نے برقع اُٹھا کر دیکھا کہ عمدہ لباس و زیور سے آراستہ اُن کے استقبال کو کوئی بی بی کھڑی ہے۔ جو نہایت تیزی سے اُن کے قدموں پر جھکی اور سلام کیا۔ رشید الملک تو ایک غیر عورت کو دیکھتے ہی باہر واپس چلے گئے اور ڈپٹی صاحب وہیں کھڑے رہے۔ بیگم اس کو دیکھ کر سخت متعجب ہوئیں اور میاں سے دریافت کیا کہ "یہ کون ہیں؟" اس سے پیشتر کہ وہ کچھ جواب دیں، اُس نے کہا:

عورت: "جناب آپ کی ادنیٰ خادمہ۔"

بیگم: (میاں سے) "میں نہیں جان سکی۔ آپ تعارف کرائیں۔"

ڈپٹی: "میں کیا کہوں۔ وہ خود ہی کہہ رہی ہے۔ تمہاری خادمہ ہوں۔ چلو کمرے میں بیٹھو۔ آرام کرو۔ یہ خدمت کرے گی۔"

اُنہیں تو کمرے میں بٹھایا۔ اور خود فضل الرحمٰن کو گود میں لے باہر چلے گئے۔ گلاب اور چمپا حیران رہ گئیں اور بیگم کی تو گویا جان نکل گئی۔ اُن کو اس قدر بھی اُمید نہ تھی۔ یہ خیال تھا کہ اگر ہوئی بھی تو میرے آنے کی خبر سے نکال دی جائے گی۔ یہ معلوم ہی نہ تھا کہ

اِن ڈھائی مہینے کے عرصے میں وہ پوری گھر والی بن چکی ہے۔ باورچی خانے میں مامائیں کھانا پکارہی تھیں۔ بیگم بے چاری تو اس وقت مثلِ تصویر ساکت رہ گئیں۔ دل پھٹا اور کلیجہ اُڑا آتا تھا۔ بمشکل صحن سے کمرے تک پہنچیں پلنگ پر بیٹھتے ہی پیچھے کو گر گئیں۔ وہ عورت گھبرائی۔ سنبھال کر لٹایا۔ پاؤں سے جوتی اُتاری اور میاں کو بلوایا۔

نئی بی بی: "میاں جی دیکھو تو بیگم صاحبہ کو کیا ہو گیا؟ کیا ان کو غشی کا دورہ پڑا کرتا ہے؟"

ڈپٹی: "نہیں تو یہ سفر کی تکان کا سبب ہوگا۔"

پانی وغیرہ منگوایا۔ اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے آدھ گھنٹے کے بعد بیگم کو ہوش آیا۔ تو میاں نے چاء منگوائی۔ اور رشید الملک صاحب کو بھی باہر سے بلوایا۔ وہ بے چارے نیچی نظر کیے آئے۔ اور اُس عورت کی طرف سے کرسی پھیر کر بیٹھ گئے۔ ڈپٹی صاحب نے اِس وقت اِس خیال سے ان کو اندر بلوالیا تھا کہ نئی بی بی سے پردہ وغیرہ کی قید اُٹھادی جائے تا کہ یہ سب آپس میں بے تکلف ہو جائیں۔ نئی بی بی کی ملازمہ گل جان چائے لائی اور سب کے درمیان اسٹول پر رکھ دی اور انہوں نے خود ہی بنا کر سب کو دی۔ بے چارا ننھا فضل حیرانی سے دوسری ماں کو دیکھ رہا تھا۔ شرم کے سبب وہ ایک غیر کے ہاتھ چائے پیتے جھجکا تو ڈپٹی صاحب نے بیٹے سے کہا۔

ڈپٹی: "میاں لے لو۔" (رشید سے) "کیوں بھئی! تم کچھ اچھی طرح سے نہیں پی رہے۔ شاید چاء پسند نہیں آئی۔ تم شاید دوسری چاء کے عادی ہو۔"

رشید الملک: (افسردگی سے آہستہ) "نہیں جناب! میں پی رہا ہوں۔ اکثر سبز چاء پینے کا بھی اتفاق ہو جایا کرتا ہے۔ مجھے اس وقت یہ فکر ہے کہ ہمشیرہ صاحبہ کو بخار ہو گیا ہے اور اُن کے چہرے سے پایا جاتا ہے کہ تپ میں تیزی ہو رہی ہے۔"

ڈپٹی: (بیوی کی نبض دیکھ کر) "ہائے! خدانخواستہ ابھی تو زیادہ نہیں۔"

اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے کچھ وقت گزر گیا۔ بیگم لیٹی رہیں اور دوسری بیوی پاؤں دباتی رہی۔

کھانے کا وقت ہو گیا۔ گل جان نے ہاتھ دُھلائے۔ الماس کھانا لائی سب نے

کچھ یونہی کھایا۔ پھر ڈپٹی صاحب لباس تبدیل کرنے باہر چلے گئے ان کی بیوی نوکروں کو کھانا دینے باورچی خانے گئیں تو سالی بہنوئی میں باتیں ہوئیں۔

رشید: باجی میں سخت متحیر و پریشان ہوں۔ دُنیا کے عجب رنگ ہیں۔ بھلا اس پختہ دماغ۔ عالی خیال تعلیم یافتہ شخص سے یہ اُمید تھی۔ پھر دیدہ دلیری تو دیکھو کہ مجھے بھی اندر بلوالیا۔ خیر اس کا انتظام بخوبی کرلیا جائے گا۔ ذرا رنج نہ کریں۔ اپنی صحت قائم رکھنی فرض ہے۔ میں یہاں ایک منٹ رہنا نہیں چاہتا اور آپ کو اس حالت میں یہاں چھوڑنا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ رات گزر جائے کل کو واپس چلنے کا بندوبست کیجیے۔"

بیگم: "بھائی! کم حوصلہ جنس تو میں ہوں۔ تم تو مرد ہو۔ اسی بہادر فرقے سے جس کے ایک دلیر ممبر نے یہ کر دکھایا۔ بے شک تمہیں رنج ہوگا۔ میں کل کو تمہیں روانہ کردوں گی مگر میرا ابھی یہاں سے جانا مناسب نہیں۔ ابھی اسی طرح گزارا کر کے دیکھتی ہوں۔ تم بھی خیال کرو۔ اس وقت وہ کس قدر تابعداری کر رہی ہے۔ اگر میری طرف سے بدمزاجی ظاہر ہوئی تو سارا الزام مجھ پر آجائے گا۔"

رشید: "وہ الزام کیسا۔ ملزم تو وہ ہے جس بے درد نے نہایت سنگدلی سے کام لیا۔ ایسے وحشیانہ فعل کا مرتکب ہوا۔ کوئی ضرورت نہیں آپ کو اس وقت غم خوری کرنے کی کیوں کہ بے قصور سراسر آپ پر ظلم ہوا ہے۔ ڈپٹی صاحب نکاح ثانی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور بتائیں۔ اجازت مذہبی کی آڑ میں جس قدر چاہا ظلم کرلیا۔ آخر ان کو ضرورت ہی کیا تھی دوسری کی؟ جب کہ پہلی بیوی تعلیم یافتہ سمجھدار خوب صورت ہنرمند اور سب سے زیادہ یہ حسب پسند شادی ہوئی۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلے غیر مرضی کی شادی ہوئی تھی۔ اب ہم نے خوشی کی کرلی۔ دوسری شادی کے جواز کی یہ بڑی بھاری وجہ قرار دی گئی ہے کہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوتی۔ دوسری کرنی واجب ہے مگر یہاں یہ بات بھی نہیں۔ ڈپٹی صاحب تو کسی صورت بھی قابل معافی نہیں ہوسکتے۔ آپ ہرگز اس وقت خاموشی اختیار نہ کریں۔ آپ کی صدہا ہندوستانی مظلوم بہنیں اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اگر آپ نے بھی انہیں کی طرح رو جھینک کر زندگی گزار دی تو کچھ فائدہ نہ ہوگا آپ کی تعلیم کا۔ آپ کو کوشش کرنی چاہیے۔ اس خرابی کے انسداد کی تاکہ ان ظالموں کو بھی کچھ تو معلوم ہو۔ اور دوسری بہنوں کا

حوصلہ بڑھے اور یہ ایک نظیر قائم ہو۔ خدانخواستہ آپ کوئی تنہا نہیں ہیں۔ بفضل خدا آپ کے تین بھائی مددگار ہیں اور چوتھا میں غلام۔"

بیگم: "او ہو رشیدا تم تو پورے جوش میں آگئے بے شک تمہارا خیال درست تمہارا لیکچر پر اثر، میں بھی یہ سب باتیں جانتی ہوں اور تنہا ہی ان کو پورا مزہ دکھا سکتی ہوں۔ مگر مجھے یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ خلاف دستور شرفا، ہندوستان میں کوئی جھگڑا کروں جو مصیبت ہوگی برداشت کروں گی مگر منہ سے اُف تک نہیں کروں گی۔"

رشید: (جھلا کر) "افسوس آپ کے حوصلے کو تعلیم نے کچھ بھی نہ بڑھایا اگر خدانخواستہ ڈپٹی صاحب کی طرح مجھ سے ذرا بھی غلطی ہو جائے تو تمکنت مجھے زندہ نہ رہنے دے حالانکہ مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہے۔"

بیگم: (مسکرا کے) "یہ تمہارا خیال ہے۔ بے شک اُس کے مزاج میں تیزی ہے مگر ایسا وہ بھی نہیں کر سکتی۔ خواہ تم لوگ ہم پر کتنا ہی ظلم کرو۔ ہماری طرف سے اس کا بدلا کبھی نہیں ملے گا۔ ہماری جانیں جاتی رہیں لیکن وفاداری میں فرق نہ آئے گا خیر جس طرح ہوگا گزارا دی جائے گی۔ تم ذرا رنج اور فکر نہ کرو اور ایک یہ بات سنو! کہ میرے بھائیوں سے بالکل یہاں کا ذکر نہ آئے۔ اِس اخفا کے لئے تمہیں دل پر بہت جبر کرنا پڑے گا لیکن میری خاطر گوارہ کرنا۔"

رشید: "یہ سخت مشکل ہے۔ آخر کہاں تک چھپتے میاں کے کرتب کو چھپائیں گی۔ یہ معاملہ بہت جلد ظاہر ہونے والا ہے۔ اچھا اُن سے میں نے نہ بھی کہا مگر تمکنت سے کہے بغیر نہ رہا جائے گا۔"

بیگم: "ہاں اُس سے تو کہو ہی گے مگر سوائے رنج کے کیا ہوگا۔ وہ بھی کڑھے گی غم اُٹھائے گی۔"

یہی ذکر تھا کہ ڈپٹی صاحب آگئے۔ اور رشید الملک کھڑے ہو گئے۔ ان کے سونے کا انتظام باہر کیا گیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد خود کرسی پر بیٹھ گئے اور بیوی کی طرف متوجہ ہوئے۔

ڈپٹی: "اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ میں کوٹ وغیرہ اُتارنے گیا تھا وہاں

دو ایک آدمی آگئے۔ اِس لئے دیر لگ گئی۔''

بیگم: ''ہاں۔ رات زیادہ آگئی ہے۔ اب آپ آرام کریں۔''

ڈپٹی: ''شاید تمہیں نیند آگئی؟''

بیگم: ''نہیں آپ بھی اُدھر ہی جائیں چونکہ اُس کے ابھی نئے دِن ہیں۔ آپ کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہئے، جس سے وہ دل برداشتہ ہو جائے۔''

ڈپٹی: (شرمندگی سے) ''وہ ایسی نہیں ہے۔ تم اِس قسم کا خیال بھی نہ کرو وہ تو تمہاری ہی خادمہ ہے۔''

بیگم: ''خیر تابعدار تو جیسی ہوگی ویسی ہوگی۔ خادمہ کیسی وہ میری سرتاج ہے کیوں کہ میرے سرتاج کی سرتاج ہے۔''

ڈپٹی: ''ہرگز نہیں۔ وہ ہماری کنیز ہے۔''

بیگم: ''جی کنیز ہے۔ کنیز کے لانے کی کیا ضرورت تھی؟ خدمت کو دو کنیزیں (گلاب اور چمپا) موجود تھیں۔''

ڈپٹی: ''بے شک کوئی ضرورت نہ تھی مگر کیا کہوں کہ کیسی مجبوری کو لانی پڑی۔''

بیگم: (مسکرا کے) بے شک میں مانتی ہوں آپ سخت مجبور ہو گئے ہوں گے تب تو اتنا بڑا کام کیا۔ دل انسان کو سخت مجبور کر دیتا ہے۔''

ڈپٹی: ''توبہ جی۔ یہ بات نہ تھی۔ مجھ پر ایسا گمان کر سکتی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں مجھ پر سخت مصیبت بن گئی تھی۔''

بیگم: ''آپ نے گمان کی خوب کہی۔ بے شک گمان کیا۔ مجھے تو کبھی شبہ بھی نہ گزرتا تھا مگر کیا کیا ظہور پذیر ہوا۔ آپ یقین کریں میں سچ کہتی ہوں کہ اس تعجب خیز واقعے کے نظارے کی میرا دل ناتواں تاب نہ لا سکا۔ اور یہی وجہ تھی۔ اس وقت کی غشی کی نہ صرف اِس وجہ سے کہ اپنے نقصان کا رنج ہوا بلکہ صرف اِس خیال سے کہ یہ کیا ہو گیا اور کس کی طرف سے ہوا اور اب زمانہ کیا کہے گا۔ ایسے روشن خیال تعلیم یافتہ جنٹلمین کے اس فعل کو کیوں کہ ظاہراً سمجھ دار پارٹی کو کوئی وجہ، کوئی ضرورت نظر نہ آئے گی آپ کے عقد ثانی کی۔ اس لئے کہ اب تک میرے ساتھ آپ کی اچھی طرح گزری۔ کسی نے کوئی شکایت نہیں سنی۔

میں یہ بھی نہ کہہ سکوں گی کہ اولاد کے لیے میں نے اپنے صاحب کی دوسری شادی کی ہے کیوں کہ لڑکا موجود ہے۔

ایک بڑی بھاری خرابی یہ واقع ہوئی کہ آپ کی دوسری شادی کسی ہم رُتبہ خاندان میں نہ ہوئی۔ اپنی ہندوستانی ذات پات کی پرچول سے آپ واقف ہی ہیں۔ اب مجھے یہ بھی فکر ہے کہ ہماری اولاد کو آئندہ سخت دقتوں کا سامنا ہوگا۔ بس ایسی ایسی ذلتوں کے خیال سے میں سخت رنجیدہ ہوں۔ اگر آپ کو دوسری شادی کرنی ہی تھی تو مجھ سے صلاح کرتے میں کسی طرح عقدِ ثانی کی ضرورت کو زمانہ پر ثابت کر کے کسی ہم رُتبہ خاندان میں آپ کی شادی کرتی اور شادی کی ضرورت اس طرح ثابت کرتی کہ اپنی صحت کو خراب بتاتی کہ میں انتظام خانہ داری کے قابل نہیں رہی ہوں اپنی مددگار بنانے کو شوہر کی دُوسری شادی کی لیکن آپ نے تو مجھ سے بے انتہا اخفا کیا۔ کن کن ترکیبوں سے مجھے گھر سے نکالا اور پھر یہ ظلم (آبدیدہ ہو کر) کہ خط بھی بند کر لیا۔ وہ تو میں ہی سخت جان تھی کہ اس ناقابل برداشت صدمے کو سہا اور زندہ رہی ورنہ میری دُنیا میں اب کوئی ضرورت نہیں۔ میری ہستی اب بالکل بے کار اور آپ پر بوجھ ہے کیوں کہ میں دُنیا میں جس کے لئے بھیجی گئی تھی وہ اب مجھ سے بیزار ہے۔ بس اب مجھے خدا اُٹھا لے تو خوب ہے۔"

بیوی کی یہ تقریر سنتے جاتے تھے اور ڈپٹی صاحب کا دل کانپتا جاتا تھا۔ عرقِ ندامت سے تر ہو رہے تھے۔ کچھ جواب نہ بن پڑتا تھا۔ بولنا چاہتے تھے مگر زبان میں یارا نہ تھا۔ آخر جب جواب نہ دے سکے تو کرسی سے کھڑے ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے بیوی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"میری فرشتہ خصلت، میری رہنما سلطنت میں تمہارا گناہ گار اور سخت گناہ گار ہوں۔ بے شک میں ناقابل معافی ہوں۔ تم ایسا نہ کہو۔ خدا مجھے اِس دُنیا سے اُٹھا لے۔ مجھ سازوسیاہ زندہ رہ کر کیا کرے گا؟"

بیگم گھبرا گئیں اور بہت جلد دونوں ہاتھوں سے میاں کو اُٹھایا۔ "للہ آپ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ آپ نے کوئی ایسا انوکھا کام نہیں کیا۔ مردوں کا کام ہی یہ ہے۔"

ڈپٹی: "آہ سلطنت! مردوں کا کام ہوگا مگر میرا نہ تھا جو مجھ سے ہو گیا۔ مجھے

خود اپنے آپ سے یہ اُمید نہ تھی۔ آہ میں کیا کر گزرا مگر خدا کے واسطے تھوڑی سی میری بھی سن لو اور میری سچائی کا یقین کرو۔"

بیگم: "کوئی ضرورت نہیں آپ کو اس قدر تکلیف کرنے کی جو ہو گیا، سو ہو گیا۔"

ڈپٹی: "تمہیں میری قسم ہے۔ سنو!"

بیگم: "اے ہے۔ قسمیں دینے لگے۔ اچھا کہئے۔"

ڈپٹی: "لدھیانے میں تبدیلی سے دو ہفتے پیشتر تم میری حالت دیکھ رہی تھیں کہ میں کیسا پریشان تھا بلکہ تم نے دریافت بھی کیا تھا۔ مگر میں نے ٹال دیا تھا۔ اُس پریشانی کا سبب بھی یہ بلائے ناگہانی تھی۔ تم نے اِس کو پہچانا تو بھلا کہاں ہو گا۔ کبھی دیکھا نہ تھا لیکن تم نے نام سنا ہو گا۔ لدھیانہ میں ہماری کوٹھی کے سامنے ایک عورت رہتی تھی۔ اس کے گھر کچھ عرصے سے ایک بمبئی کی عورت زریں جان نامی جا رہی تھی۔"

بیگم: "ہاں میں جانتی ہوں۔ ان کے سب حالات سنتی رہتی تھی۔"

ڈپٹی: "نہ معلوم کیوں بلائے بے درماں کی طرح وہ میرے پیچھے پڑ گئی۔ ہر چند ہٹانے کی کوشش کی۔ نوکروں نے ڈرایا دھمکایا مگر ایک کارگر نہ ہوا۔ اس کا یہی سوال تھا کہ مجھے بیگم کی خدمت کے لئے گھر میں رکھ لو۔ میں سخت حیران تھا کہ کیا کروں کہ انہیں دنوں تبدیلی ہو گئی۔ یہ راولپنڈی بھی میرے ساتھ آنے کو تیار تھی اور کسی طرح میرا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ اس لئے میں نے تمہیں آگرے بھیجا کہ نہ معلوم یہ کیا گل کھلائے گی اگر تم میرے ساتھ آئیں تو تمہیں رنج ہو گا اور میں شرمندہ ہوں گا۔ میں نے سوچا تھا کہ پنڈی جا کر اس کے سرپرستوں کو اطلاع دے کر اس کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ پھر تمہیں بلالوں گا۔ لیکن معلوم نہ تھا کہ یہاں آ کر یہ بلائے جان ہو جائے گی۔ جب ہم اِدھر آئے۔ یہ بھی اُسی ٹرین سے آ کر گھر میں داخل ہو گئی اور بے انتہا عاجزی اور منت سے نکاح کرنے کو کہا۔ اس پر میں نے خوب خبر لی مگر اُس پر ایک اثر نہ ہوا۔ وہ جان دینے کو تیار ہو گئی۔ اس صحن والے کنوئیں میں گرنے کو تیار تھی۔ میں نے اس کی بھی پرواہ نہ کی تو کچہری چلنے لگی کہ "میں عدالت میں کہہ دوں گی کہ لدھیانے سے مجھے نکاح کر کے لائے ہیں اب گھر سے نکالتے ہیں۔" اب تو میں سخت مجبور ہو گیا۔ وہ برقع لے کر کچہری کی طرف چل پڑی تو نوکروں نے روکا اور اُسی

روز سے نہ معلوم کب تک کے لئے یہ بلا ہمارے سر پڑ گئی۔ سلطنت اب میری عزت تمہارے ہاتھ ہے جس طرح چاہو اس کو اپنی خدمت میں رکھو۔"

بیگم: "خدمت کیسی۔ وہ میرے برابر بلکہ مجھ سے بڑھ کر رہے گی اور آپ کی خوشی کے لئے یہ سب کچھ مجھے خوشی سے منظور ہے۔"

ڈپٹی: "یہ کیا کہتی ہو ایسا ہرگز نہ ہوگا اور شاید تمہیں ان واقعات کی سچائی میں کچھ شک ہے۔"

بیگم: "آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ آپ کے کلام میں مجھے شک ہو سکتا ہے؟ اچھا اب وقت بہت گزر گیا ہے شاید بارہ بج گئے ہوں گے۔ جائیں اب آرام کریں۔"

ڈپٹی: "جاؤں کدھر؟ ایسی باتیں نہ کرو۔"

☆

فصل ششم

دل شکستوں کی نہ توڑ آس ترس کھا اے یاس
آسرا آسرے والوں کا لگا رہنے دے

عظمت اللہ کی دوسری شادی کو ایک مہینہ گزر گیا۔ بدنصیب زبیدہ بڑی جانکاہی سے سوکن کی خدمت کرتی رہی۔ مگر خورشید بیگم کو اتنا بھی گوارا نہ تھا کہ وہ آنکھوں کے سامنے اس گھر میں پھرے۔ آخر اس نے نوک جھونک کرنی شروع کی، ساس اور میاں سے یہ کہا کہ ''محمودہ کی ماں مجھ پر جادوٹونے کرتی ہے۔ کھانا پکانا اسی کے ہاتھ ہے۔ ہر ایک چیز میں کچھ نہ کچھ ڈال کر مجھے کھلاتی ہے۔ یہ مجھے مارڈالے گی۔ اگر اسی طرح کام دھندے میں رہی۔''

زبیدہ بہت سویرے اُٹھ کر اِدھر آتی تھی۔ صبح کے پانچ بجے تھے محمودہ اور صبغت اللہ کو سوتا چھوڑا۔ خود اُٹھی، نماز پڑھی اور بڑے گھر آئی۔ باورچی خانے میں جھاڑو دے کر آگ جلائی۔ سب کے منہ دھونے کو پانی گرم کیا۔ اتنے میں ساس نندیں بھی اُٹھ بیٹھیں۔ تو اُن کے دالان میں جھاڑو دے آئی۔ اب یہ خیال کہ بچے نہ اُٹھے ہوں اور روتے ہوں مگر جا بھی نہ سکی کہ ابھی عزیز دُلہن نہ اُٹھی تھیں اگر پیچھے اُٹھیں تو پانی کون دے گا۔ ساڑھے چھ بجے ان کا دروازہ کھلا۔ زبیدہ فوراً گرم پانی لے کر منہ دُھلانے گئی۔

عزیز دُلہن: ''رکھ دو لوٹا۔ میں اپنے آپ دھولوں گی۔''

زبیدہ: (میاں سے) ''اُٹھو تم بھی دھولو۔''

عظمت: ''ہاں دھولوں گا۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔''

زبیدہ تو پانی رکھ کر بچوں کو دیکھنے گئی۔ دُلہن نے اُٹھ کر لوٹے میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ کا پُرزہ پانی سے نکال کر میاں کو دکھایا۔

دُلہن: "یہ دیکھو بیگم صاحبہ کے کرتوت۔ میں نہ کہتی تھی کہ یہ ایک نہ ایک دن مجھے مار ڈالے گی۔ پانی میں تعویذ گھول کر لائی ہے"۔

میاں: (پُرزہ دیکھ کر) بے شک ہے تو تعویذ۔ اچھا انتظام کروں گا۔ اماں جان سے کہہ کر اِدھر آنا پھر بند کرا دیا جائے گا۔"

دُلہن: "خالہ جی کبھی بند نہ کریں گی۔ اُنہیں مجھے مارنا ہی منظور ہے۔ کام کے لئے اسے گھسائے ہوئے ہیں۔ نوکر نہیں رکھی جاتی اگر ایسا ہی خرچ کرنا دُشوار ہے تو خود کریں۔ بیٹیوں سے کرائیں۔ ہم نے تو نہ کبھی کیا نہ اب کریں۔ ہمیشہ باوا کے گھر دو دو اصیلیں رہیں اور ہیں۔

عظمت اللہ: "بہت اچھا تم فکر نہ کرو۔ اصیل کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر میں زبیدہ ناشتہ لائی۔ پراٹھے اور انڈے کی ٹکیاں۔

عظمت: "لے جاؤ یہ جو کچھ لائی ہو۔ ہم نے تو تم پر اعتبار کر کے سب کام لیا۔ مگر افسوس تم خدمت گزاری کے قابل بھی نہیں۔ ہماری جان کی دُشمن ہو گئیں۔ تمہاری سب ترکیبیں ہمیں معلوم ہو گئیں جو ہمیں مارنے کی کر رہی ہو۔ اب ہم تیرے ہاتھ کا پانی بھی نہ پئیں گے۔"

زبیدہ: (کانپ کر) "کیا ہوا۔ مجھے تو خبر بھی نہیں۔ میرا خدا مع میرے دونوں بچوں کے میری جان لے اگر میں تمہارے حق میں کچھ برائی کرتی ہوں۔ وہ تو سب کچھ جانتا ہے۔"

عظمت: "او نابکار! یہ دیکھ پانی کے لوٹے سے یہ تعویذ نکلا ہے۔"

زبیدہ: "میرا خدا گواہ ہے کہ یہ تعویذ نہیں۔ میں تو تعویذوں کو جانتی بھی نہیں۔ صبح کاغذوں سے آگ سلگائی تھی۔ کوئی پُرزہ تیتزے میں پڑ گیا ہو گا۔"

عظمت: "بس باتیں نہ بنا۔ یہ طباق اُٹھا اور دُور ہو جا ہمارے سامنے سے۔"

آو کمبخت زبیدہ لرزتی کانپتی روتی ہوئی باورچی خانے میں گئی۔ یہ سب قصہ ساس نے سُنا۔ انہیں بھی یقین آ گیا۔ اب تو اس کی جان پر بن گئی۔

آبادی : ''یہ سب ٹھیک ہے۔ تو نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ کل بھی روٹی کھانے کے بعد عزیز دُلہن کو تے ہوگئی تھی۔ جب تو میرے بچے اور بھانجی کی جان کی دشمن ہے تو اس گھر سے تیرا کیا کام؟ مریں تیرے دونوں بچے۔ نکل جا میرے گھر سے۔ وہ تو شکر ہے، حال کھل گیا۔ جو میرے بچوں کی جان بچ گئی۔ نہیں تو خدا نہ کرے اگر عزیز دُلہن کا بال بھی بیکا ہوتا تو تجھے زندہ گاڑ دیتی۔''

ہدایت اللہ بھی آگئے۔ بدبخت زبیدہ کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کھڑکی تک لے گئے اور دوسرے مکان کے صحن میں ڈال کر دروازہ بند کرلیا۔ غریب محمودہ اور صبغت اللہ روتے ہوئے کھڑکی پر گئے تو معصوم بچوں پر بھی رحم نہ آیا۔ بڑی پھوپی علیمہ نے دونوں کی بانہیں پکڑ کر کھڑکی سے اُس طرف پھینک دیا اور زنجیر لگالی۔

آہ ایسے ظالموں پر آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ کیا زبیدہ اس گھر کی حق دار نہ تھی یا وہ غریب ان کے بچے نہ تھے؟ ہائے اُس مظلوم پر کیا گزری؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بہت دیر تک زمین پر پڑی روتی رہی۔ کوئی ان کا پُرسانِ حال نہ تھا۔ بہت عرصے کے بعد خود ہی اُٹھی۔ بچوں کو اُٹھایا۔ محمودہ چونکہ منہ کے بل گری تھی۔ اُس کے خون بہہ رہا تھا۔ صبغت اللہ کا گھٹنا چھل گیا تھا۔ دونوں کو پونچھ پانچھ کر گودی میں لے لیا اور بیٹھ رہی۔ دوپہر دن چڑھ آیا۔ کسی نے اُن کی روٹی کی پرواہ نہ کی۔ بچوں نے بھوک سے بلبلانا شروع کیا۔ وہ مجبور کیا کرتی۔ کہاں سے لاتی۔ سوا بھس اور کھلی کے گھر میں کچھ تھا نہیں۔ پڑوسیوں سے ملنے کا حکم نہ تھا۔ تمام دن سخت مصیبت سے گزرا آج چونکہ سزا دی گئی تھی۔ دن بھر کھانے کی کسی نے خبر نہ لی۔ شام کو بارش ہونے لگی۔ بھوکے بچے اور بھی گھبرائے۔ قریب آٹھ بجے رات کے کسی نے کھڑکی کھٹکھٹائی تو اس بدنصیب نے جا کر دیکھا۔ چھوٹی لڑکی خدیجہ روٹی لئے کھڑی تھی بیچاری نے لے لی۔ بچے دیکھ کر خوش ہوگئے۔ مٹی کی رکابی میں چنے کی دال اور چار روٹیاں تھیں شاید دو ماں کی اور ایک ایک بچے کے حساب سے بھیجی ہوں گی زبیدہ کا دل غم سے بھرا پڑا تھا۔ اس کو روٹی کی ضرورت نہ تھی۔ ڈیڑھ ڈیڑھ چپاتی دونوں بچوں کو کھلائی اور ایک صبح کے لئے رکھ دی۔ اُٹھ کر بیلوں پر جھول ڈالی چراغ بجھایا اور دونوں بچوں کو کلیجے سے لگا کر پڑ رہی۔

آہ! زبیدہ بدنصیب کو اب کوئی اُمید نہ تھی۔ اپنے گھر پھرنے کی۔

☆

فصل ہفتم

آہ یوں بے لطف ہو کر گر جیے تو کیا جیے
زندگی اچھی نہیں بہتر ہے مر جانا مرا

زرّیں جان: "یہ تو کچھ کا کچھ ہو گیا۔ میاں جی بالکل ہی بیگم کے ہو گئے۔"
گل جان: "دو مہینے ہو جائیں گے بیگم کو آئے۔ اِدھر تو سرکار کسی وقت آتے ہی نہیں۔"
زرّیں: "خیر کوئی بات نہیں۔ سب درست ہو جائے گا۔ جب ایسے شخص کو قابو ہی کر لیا تو اب تو سب آسان ہے۔ میرے خیال میں اب یہ مناسب ہے کہ علیحدہ علیحدہ گھر کراؤں۔ یہ سب خرابی ساتھ رہنے سے ہوئی ہے۔"
گل جان: "یہ بات تو ٹھیک ہے مگر سرکار مانیں، جب ہے۔"
زرّیں: "اُونہہ۔ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ وہ تو فوراً مان لیں گے۔"
"صبح تو بیوی نوکر میں یہ صلاح ہوئی اور سہ پہر سے یہ مشہور ہوا کہ بیوی کو بخار ہو گیا۔ بیگم خود زرّیں کو دیکھنے اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ سر کو رومال سے باندھے، لحاف اوڑھے پڑی تھیں۔ لحاف کی گرمی سے منہ سرخ ہو گیا تھا مگر بخار بالکل نہ تھا۔ بیگم نے نبض دیکھ کر کہہ دیا کہ تپ ہو گئی ہے۔ ڈپٹی صاحب کو بخار کی اطلاع ملی۔ وہ بھی اِسی طرف آ گئے۔ بیگم کو بھی یہیں زرّیں کا سر دباتے دیکھا۔"
ڈپٹی: "کیا ہے۔ بخار کیوں ہو گیا؟"

زرّیں: (خاموش)

بیگم: "کہتی ہیں سردی لگ کر ہو گیا۔"

ڈپٹی: "ہم سے تو کسی نے نہیں کہا۔"

گل جان: "کہتیں کس وقت۔ اِدھر آ کر آپ بیٹھتے ہی نہیں۔ کھڑے کھڑے آئے اور چلے گئے۔ کوئی بات کرے تو کیسے؟"

اب تو ڈپٹی صاحب چپ ہو گئے۔ بیگم نے اپنا یہاں سے اُٹھنا مناسب سمجھا اور نماز کے عذر سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ڈپٹی صاحب بیٹھ گئے اور لحاف منہ پر سے ہٹا کر کہا۔

ڈپٹی: "زرّیں! کیوں تم بولتی ہی نہیں۔"

زرّیں: (رو کر) "کیا بولوں اور کس سے بولوں۔ آپ تو کسی وقت ملتے ہی نہیں۔"

ڈپٹی: "اب تو بیٹھا ہوں اور ہر وقت آتا جاتا رہتا ہوں۔ تم خود سمجھ دار ہو۔ جانتی ہو کہ ان دنوں مجھے بیگم کے ساتھ اِسی طرح پیش آنا ضروری تھا کیوں کہ ابھی نئی بات ہے۔ رفتہ رفتہ ان کو عادت ہو گی۔ دُوسرا یہ بڑا خیال ہے کہ اُن کے تین بھائی ہیں۔ اب تک انھوں نے اس معاملے کی خبر اپنے میکے نہیں کی۔ مجھے ہر بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ میں دل سے تمہارا ہی ہوں۔"

زرّیں: "یہ سب میں جانتی ہوں مگر کیا کروں طاقتِ برداشت نہیں۔ مجھے اسی رنج میں بخار ہو گیا۔ آپ کی اس قدر علیحدگی گوارا نہیں کر سکتی۔"

ڈپٹی: "زرّیں تمہیں گوارا نہیں تو مجھے بھی کب گوارا ہے؟ اچھا اب تم اطمینان رکھو میں اب آدھا وقت تمہاری طرف صرف کیا کروں گا اور آدھا اُدھر۔"

زرّیں: "بے شک آپ کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہو گا کیوں کہ آپ کا بہت سا وقت باہر صرف ہوتا ہے۔ آپ کو کیا معلوم۔ گھر میں کیا کیا ہوا۔ جس وقت آپ اندر آتے ہیں۔ وہ مجھ پر مہربان ہو جاتی ہیں اور آپ کے پیچھے جس جس طرح مجھے جلایا اور ستایا جاتا ہے۔ وہ خدا ہی جانتا ہے۔ یہ چمپا اور گلاب بڑی آفت ہیں۔ بچھو کی طرح ڈنک مارتی ہیں۔ میری نوکروں سے کہتی ہیں کہ تمہاری بیوی کو ہم جانتے کیا ہیں۔ "رہتی بہتی آئی، گھر

گھساؤں کہلائی۔" بے شک میں اسی طرح سے آئی ہوں مگر اونی کنیزوں کے منہ سے یہ زیبا نہیں اگر بیگم کہیں تو بھی خیر۔ خواہ میں کوئی بھی ہوں لیکن اب تو تمہاری عزت ہوں۔ ایسی ایسی باتوں سے میرا دل پک گیا ہے۔"

ڈپٹی: "اوہو۔ میں ان معاملات سے آگاہ نہ تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم رنج نہ کرو۔ یہ دُنیا کا دستور ہے۔ گلاب اور چمپا سے تو سمجھ لیا جائے گا۔"

اس وقت کی زرّیں کی عیارانہ تقریر کا یہ اثر ہوا کہ ڈپٹی صاحب سہ پہر سے جو اندر گئے۔ پھر باہر نکلے کھانا کھانے کے لئے بیگم کی طرف نہ گئے اور گلاب اور چمپا سے کام لینا چھوڑ دیا۔ بیگم بے چاری حیران کہ یکدم یہ کیا ہوگیا۔ دُوسرے دن صبح کو کچہری جاتے وقت پان کھانے بیگم کے پاس آئے تو کہہ دیا کہ "رات اس کو بخار سے بڑی تکلیف رہی اِس لئے میں اِدھر نہ آسکا۔" اور باہر چلے گئے۔ ان کے اس طریق سے بیگم کو کوئی غیر معمولی رنج نہ ہوا کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ ان کی یہ چاپلوسی میرے ساتھ چندروزہ ہے۔ آخر وہی ہوگا جو دستور زمانہ ہے۔ دوسری عورت ضرور میرے خلاف میاں کے کان بھرے گی اور اُن کا دل ہماری طرف سے پھر جائے گا۔ آخر وہی ہوا، روز بروز ڈپٹی صاحب بیگم سے کشیدہ ہوتے گئے لیکن بیگم نے بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ اِس خیال سے کہ میاں نہ سمجھیں کہ میرا زرّیں کی طرف رہنا انہیں ناگوار گزرا۔ جس وقت جتنی دیر کو بھی آتے۔ وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملتیں لیکن اُس نے اپنی کارروائی جاری رکھی۔ ہر وقت میاں کو یہی سناتی رہی کہ "بیگم مجھ سے سخت ناراض رہتی ہیں اور مجھے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں اور اپنی اصیلوں سے میری بے عزتی کراتی ہیں۔"

ڈپٹی صاحب کو بیگم کی طرف سے سخت رنج پہنچا کہ یہ عجب طریق ہے کہ میرے سامنے بالکل خوش رہتی ہیں اور پیچھے زرّیں کو تنگ کرتی ہیں۔ سات دِن کی شکایات سنتے سنتے وہ سخت تنگ ہوگئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں؟ اُدھر زرّیں کی بیماری نے وہ طول کھینچا کہ کئی ڈاکٹر بدلے گئے اور آرام نہ ہوا۔ اِس بیماری میں بھی مصلحت تھی کہ بخار تو اُتر گیا۔ اب درد رہنے لگا۔ کیوں کہ بخار کو ہر ایک شخص دیکھ سکتا ہے اور درد ایسا مرض ہے جس کو مریض ہی محسوس کرسکتا ہے۔ اب انہوں نے میاں سے یہ کہنا شروع کیا کہ اس گھر

میں مجھے صحت نہ ہوگی۔ ایک تو جگہ تنگ ہے دوسرے یہاں ہر وقت میرا دل جلتا رہتا ہے اور مریض کو آرام اور اطمینان چاہئے۔ میری صحت کے لئے نقل مکان ضروری ہے۔ ڈپٹی صاحب نے بخوشی منظور کیا اسی مکان کے ساتھ دُوسرا مکان انہیں دنوں خالی ہوا تھا۔ وہ لے لیا گیا اور سب انتظام باہر سے باہر ہی ہو گیا۔ جب صرف بیوی کا جانا باقی رہ گیا تو آپ بیگم کے پاس آئے۔

ڈپٹی: "دیکھو جی زرّیں تو اچھی نہیں ہوتی۔ کئی ہفتے ہو گئے علاج کراتے کچھ افاقہ نہیں۔ اب ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ مریضہ کو نقل مکان کرایا جائے۔ میرے خیال میں بھی یہی مناسب ہے کیوں کہ ہمارے اس مکان کا صحن ذرا تنگ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ ساتھ کا منصف والا مکان تجویز کیا ہے۔ اِس کا صحن بہت کشادہ ہے اور کمرے ہوادار ہیں۔"

بیگم: "بہت درست۔ اس مکان کی تعریف سنی ہے۔ اُمید ہے وہاں جاتے ہی صحت ہو جائے گی۔"

ڈپٹی: "تو میں اب اُن کو وہاں لئے جاتا ہوں۔"

بیگم: "بہت اچھا۔ اگر خدانخواستہ اُس کو کچھ تکلیف ہو تو میں بھی آپ کی مدد کو آجاؤں گی۔ ہاں کھانا یہیں سے بھیجا جائے گا یا دہیں تیار ہو گا؟

ڈپٹی: "آج تو یہیں سے بھیج دینا۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

بیگم بے چاری حیران پریشان تنہا بیٹھی رہ گئیں اور ڈپٹی صاحب بیوی کو مع گل جان اور الماس کے دوسرے مکان میں لے گئے۔ بیگم ہزار حوصلہ مند و جبر پسند تھیں مگر آخر کب تک صبر کی کوئی حد بھی؟ اس وقت ضبط نہ ہو سکا اور کمرے میں فرش پر لیٹ کر دیر تک روتی رہیں۔ نماز مغرب کے وقت اُٹھیں۔ وہاں کھانا بھجوایا۔ خود نماز پڑھی اور بغیر کھانا کھائے لیٹ گئیں۔ چھوٹا رحمٰن نئے مکان کی خوشی میں وہیں گیا ہوا تھا۔ اُس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ آہ! اُس وقت کی حالت کو بیگم سے پوچھئے۔ ایسی زندگی پر وہ موت کو ترجیح دیتی تھیں کچھ دیر پڑی رہیں۔ پھر اُٹھیں اور کمرے میں ٹہلنے لگیں کبھی بیٹھ جاتیں کبھی ٹہلنے لگتیں۔ اسی حالت میں ۹ بج گئے تو لڑکا اُدھر سے آ گیا۔

فضل: "اماں جان! وہ گھر بہت اچھا ہے۔ زرّیں جان تو وہاں جاتے ہی

اچھی ہو گئیں۔ ہاں میاں کہتے تھے کہ اماں جان سے کہہ دینا کہ "آج ہم نہیں آسکتے۔ زرّیں کی طبیعت اچھی نہیں۔"

بیگم: "خیر نہیں آئے تو نہ آئیں۔ آؤ تمہارے کپڑے اُتار دوں اور سوؤ۔"

فضل: "نہیں اماں جان کپڑے گلاب اُتارے گی۔ بوٹ بھی اُتارنے ہیں۔"

☆

فصل ہشتم

ظلم ایسا کیوں کیا تھا جو ملی ایسی سزا
بیکسی کو ہاتھ ملواتا ہے پچھتاتا مرا

یہ کارخانہ قدرت عجیب ہے۔ ہمیشہ کسی کی یکساں نہیں گزرتی۔ کل کا ذکر ہے کہ ہدایت اللہ کا رنگین گھر بس رہا تھا۔ آبادی بیگم کا دور دورہ تھا۔ عزیز دلہن کا مزاج آسمان پر تھا۔ عظمت اللہ بے انتہا مغرور تھے۔ ان سب نے سمجھ رکھا ہوگا کہ اسی طرح گزرے گی مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو ہی سال کے عرصے میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔

منشی ہدایت اللہ نے مرض نمونیا سے انتقال کیا اب تو سب کو دن میں تارے نظر آگئے کیوں کہ اُنہیں کے دم سے گھر چل رہا تھا۔ کوئی جائیداد وغیرہ تو بے چاروں کی تھی نہیں۔ مرحوم محنتی شخص تھا۔ ہاتھ پاؤں مار کر بیس تیس روپے ماہوار کما لیتا تھا۔ لڑکے دونوں ہی اَن پڑھ تھے اور پھر کاہل۔ باپ کے سر روٹیاں توڑتے رہے۔ ہدایت اللہ مرحوم بیس روپے ماہوار پر کسی رئیس کی مختار کاری کرتے تھے اور لڑکے پڑھایا کرتے تھے۔ آٹھ دس روپے مل جاتے تھے۔ آبادی بیگم کی کفایت شعاری سے بخوبی گزارا ہو رہا تھا۔ اب کیا ہوتا۔ اُن کے مرتے ہی ٹکڑے کو محتاج ہو گئی۔ عزیز دلہن یہ مصیبت کاہے کو برداشت کرتی۔ وہ اپنے میاں سمیت میکے جا رہیں۔ وہیں ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی مگر اُس دن سے کچھ ایسی بیماری لگ گئی کہ خورشید نے پھر پلنگ سے پاؤں نیچے نہ اُتارا۔ اور خسر کے چھ ماہ بعد ہی وہ بھی وہیں پہنچیں۔

اب تو عظمت اللہ کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی سسرال والے بھی حقارت کرنے

لگے اور کیوں نہ کرتے جس کے سبب اِن کی قدر تھی جب وہی نہ رہی تو اب ان کا پورا کرنے سے انہیں کیا واسطہ؟ بیوی کے چہلم کے دن وہاں سے نکالے گئے۔ انہیں جو غصہ آیا اپنی بیٹی بھی چھین لائے۔ اب پھر آئے اُسی ماں کے پاس جس کی عرصے سے خبر بھی نہ لی تھی کہ کس طرح عمر گزار رہی ہے دو جوان بہنیں ایک نکھٹو بھائی شفیع اللہ۔ آخر انہوں نے کسی طرح پیٹ پالا اور اُس غریب کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں جو گھر سے باہر کورے گھڑے میں چوہے کی طرح بند کھنڈر میں پڑی تھی۔ اتنی مصیبت پڑ گئی لیکن اب بھی خدا نہ سوجھا۔ اُسے جا کر بھی نہ دیکھا۔ اب ماں بہنیں محنت مزدوری کرتیں۔ اور یہ مزے سے دونوں وقت روٹیاں توڑتے۔ کچھ دن اس طرح بھی گزرے۔ قسمت کی خرابی اور ادبار جب آتا ہے تو سب سامان ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔ عظمت اللہ کو پہلے بخار آیا پھر جوڑوں میں درد رہنے لگا۔ مصیبت کی ماری ماں نے قرض دام بہتیرا علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اور سخت مرض گٹھیا میں مبتلا ہو گئے۔ آبادی بیگم سخت گھبرائیں کہ یہ کیا ہوا اگر اللہ نہ کرے کچھ ایسی ویسی ہوئی تو بالکل بے والی رہ جاؤں گی۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بے چھان پھٹک آٹھ دن کے اندر اندر ایک جگہ دونوں لڑکیوں کا نکاح کر دیا۔ دینے لینے کو تو اللہ ہی کا نام تھا۔ شربت کے پیالے پر عقد ہوا۔ اس فرض سے بھی نجات پائی اور شکر کیا اب بیٹے کی تیمارداری اور محنت مزدوری میں مصروف ہو گئیں۔

صاحبزادے شفیع اللہ صاحب سے یہ مصیبت نہ بھری گئی۔ وہ ایک دِن بے اطلاع گھر سے چل دیئے۔ نہ معلوم کہاں گئے۔ اس غم نے بی آبادی کو بھی پلنگ پر ڈال دیا۔ میاں کی موت اور گھر کی تباہی نے بوڑھا اور ناتوان تو کر ہی دیا تھا۔ جوان بیٹے کی جدائی کے صدمے نے کسی قابل نہ رکھا۔ دونوں بیماروں پر مکھیاں بھنکنے لگیں۔ کوئی پانی دینے والا بھی نہ تھا۔ اس وقت دونوں ماں بیٹے دِل سے چاہتے تھے کہ زبیدہ خدمت کرنے کو آ جائے مگر شرم سے بلا نہ سکتے تھے۔ کس منہ سے بلاتے؟ کھڑکی میں برابر قفل لگا تھا۔ اللہ رکھے اب تو محمودہ بھی سیانی ہو گئی تھی۔ اُس کو آٹھواں سال تھا۔ اپنے باپ کی بیماری کا حال سُن سُن کر ماں کے ساتھ برابر روتی تھی مگر مجبور تھیں کہ دونوں ماں بیٹیاں جا نہ سکتی تھیں لیکن جب دونوں کی بیماری سنی تو زبیدہ سے صبر نہ ہو سکا۔ محمودہ کو بھیج کر کھڑکی کھلوائی۔ انہوں نے بھی اِس آڑے وقت میں زبیدہ کا آنا غنیمت جانا۔ زبیدہ روتی ہوئی آئی اور ان کی حالت دیکھ کر

اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دونوں ماں بیٹے کے پلنگ ایک دالان میں قریب قریب بچھے تھے۔ آبادی بیگم اپنا بازو خود ہی دباتی اور روتی جاتی تھیں۔ عظمت اللہ درد کی تکلیف سے ہائے ہائے کر رہے تھے۔ زبیدہ پہلے ساس کے اور پھر میاں کے قدموں پر گری۔ بے قصور نے قصور معاف کرایا۔ اب بے کس اور ناچار بڑھیا نے بھی مظلوم بہو کو سینے سے لگایا۔

آبادی: "بیٹی اللہ تجھے خوش کرے۔ تیرے میاں کو تندرستی دے۔ ہائے تھکے وقت کا کوئی نہیں ہوتا۔ ہمارے لئے جو تو ہے کوئی نہیں ہو سکتا۔ خیر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تو بھی ہمیں معاف کر۔"

زبیدہ: "اماں جی! میں تمہاری ویسی ہی تابعدار کنیز ہوں۔ میری بدقسمتی تھی کہ کچھ دنوں کو خدمت سے بھی روک دی گئی تھی۔ اب پھر حاضر ہوں۔ اللہ تم دونوں کو جلدی اچھا کرے۔ بتاؤ تو وہ لڑکی کہاں ہے؟"

آبادی: "ہمیں اپنی جان کا ہوش نہیں۔ بچی کی کون خبر لے، وہ دیکھو۔ کھٹولے پر پڑی سو رہی ہے۔"

زبیدہ: "ہے ہے اکیلی؟"

آبادی: "اکیلی نہ تو اور کس کے پاس ہو؟"

ہم دونوں کی تمام رات بے چینی سے گزرتی ہے۔ اس لئے اسے الگ ڈال دیا ہے۔

زبیدہ نے فوراً لڑکی کو گود میں اُٹھا لیا وہ بھی جاگ پڑی۔ منہ دُھلایا سرمہ لگایا اور ساس سے پوچھا کہ اس کو کیا کھلاؤں؟"

آبادی: "کیا بتاؤں؟ رات کا بھی کچھ نہیں۔ اور کھچڑی، چاول وہ کھاتی بھی نہیں۔ ننھیال کی پلی ہوئی ہے۔ دُودھ کی عادت ہے۔ یہاں کا تو خدا نے سب کچھ لے لیا۔ گائے بھینس سب ہی تھا۔ خبر نہیں کس کم بخت کی نظر کھا گئی۔"

زبیدہ: "اچھا میں دُودھ بازار سے منگائے لیتی ہوں۔"

آبادی: "تیرے پاس بھی پیسہ کہاں سے آیا؟"

زبیدہ: "اماں جی میرے پاس ایک آنہ ہے۔ آخر گزارہ کرتی ہوں نا۔ کل پڑوسن کا کرتا سیا تھا۔ اُس نے چار پیسے دیئے تھے۔ او صبغت اللہ! ذرا یہاں آ۔ لے ایک پیسے

کا دُودھ جلد لے آ۔ چھوٹی بہن بھوکی ہے۔ ہاں اماں جان بتاؤ تمہارے لئے کیا پکاؤں؟"

آبادی: "بیٹی کیا بتاؤں۔ کوئی پیسہ ہو تو کہوں۔ میں جیسی ناچار ہوں۔ خدا جانتا ہے۔ تمہارے سسر کے بعد جو کچھ اسباب تھا۔ وہ بک کر اُن کی موت پر لگا۔ بچا بچایا پیسہ نکا تو بیماری ہی میں خرچ ہو گیا تھا۔ رہا سہا لگا کر علیمہ، خدیجہ کے نکاح کر دیئے۔ ایک میرا چاندی کا بار پڑا رہ گیا تھا۔ جو شفیا لے نکلا۔ آہ! اُس کے جانے سے تو کلیجہ ہی نکل گیا۔ اب تو بالکل ناچار ٹکڑے کو محتاج ہوں۔ جب تک اچھی تھی محنت مزدوری کر لیتی تھی۔ جس دِن سے روگ لگا۔ اُس سے بھی رہی۔ کئی دن سے عظمت اللہ کی دوا بھی بند ہے۔ رحم کر کے کوئی پڑوسن روٹی، کھچڑی، چاول بھیج دیتی ہے تو کھا لیتے ہیں۔"

زبیدہ: "ہے ہے میں صدقے۔ بیماری اور یہ مصیبت۔ خالہ جی بھی کچھ مدد نہیں کرتیں۔ ایسی چہیتی بہن اور بھانجا بلکہ داماد اِس حالت میں ہوں اور وہ خبر نہ لیں۔ نواسی بھی تو ہے۔ علیمہ خدیجہ کی سسرال تو بھلا غیر ہوئیں۔ اُن پر کوئی افسوس ہی نہیں۔"

آبادی: "آہ بیٹی! اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ میری طرف سے تو بہن کا دِل سخت ہو گیا ہے۔ داماد سے یوں خفا ہو گئیں کہ وہ نواسی کو اُن سے چھین لایا۔ خیر داماد اوّل تو کس کے ہوتے ہیں۔ دُوسرے لڑکیوں کی سسرال یہاں سے دس کوس پر ہے اور وہ خود غریب زمیندار ہیں۔ بے چاریاں میری کیا مدد کر سکتی ہیں؟"

زبیدہ: "خیر خدا کسی سے نہ دلوائے۔ اللہ انہیں تندرستی دے۔ آپ کمائیں آپ کھائیں۔ میرے پاس تین پیسے باقی ہیں۔ دو کے چاول ایک کی مونگ کی دال منگا کر پکائے لیتی ہوں۔ ذرا سا چنے کا آٹا پڑا ہے۔ نمک ڈال کر اس کی روٹیاں پکا لوں گی۔ دونوں بڑے بچوں کو وہ کھلا دوں گی اور تم دونوں کو کھچڑی۔ پھر کا اللہ مالک ہے۔ دوپہر میں دو کپڑے پڑے ہیں۔ سیوں گی۔ تو شام کے لئے پیسے آ جائیں گے۔"

آخر برے وقت میں کام آئی تو زبیدہ۔ اب عظمت اللہ کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ اپنے کئے پر پچھتائے۔ زبیدہ کے بے انتہا قدردان اور تابعدار ہو گئے مگر اب تابعداری کس کام کی جب خود اسی کے محتاج ہو گئے ورنہ جب کسی حالت میں تھے تو دُوسرے کو سکھ دیا۔ مصیبت پڑی تو زبیدہ یاد آئی۔ آہ! یہ دُنیا بری ہے۔ ☆

فصل نہم

وہ رہ کر پاس غیروں کے دِل اپنا شاد کرتے ہیں
یہاں ہم نیم بسمل کی طرح فریاد کرتے ہیں

جب دو مکان ہوئے اور زرّیں جان اُن دنوں بیمار تھی۔ اس لئے ڈپٹی صاحب دوسرے تیسرے بیگم کی طرف آجاتے تھے۔ اور زرّیں جان کی صحت ہونے پر یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ ایک دن بیگم کی طرف رہتے اور ایک دن زرّیں جان کی۔ تنخواہ بھی آدھوں آدھ کردی گئی۔ ڈھائی سو روپے ماہوار بیگم کو دیا جاتا اور ڈھائی سو زرّیں جان کو۔ بیگم نے شروع ہی میں کہا تھا کہ "یہ مجھ سے بڑھ کر رہے گی"۔ آخر وہی ہوا۔ اُوپر کی آمدنی بھی زرّیں ہی کو ملنے لگی۔ تب تو ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ "یہ کنیز بن کر رہے گی۔" لیکن پھر خود ہی اس کا درجہ بڑھاتے گئے۔ دو تین مہینے بعد یہ طریق بھی نہ رہا۔ چوتھے پانچویں اس طرف آنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس میں بھی کمی آئی۔ اب تو آٹھ آٹھ دن بھی نہ آتے تھے۔ بیگم کی طبیعت خراب ہوتی یا بچہ بیمار ہوتا تو اُن کو پروا بھی نہ ہوتی تھی۔ مگر آفریں ہے بیگم کے حوصلے پر کہ اُن پر ذرا رنج ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ کبھی شکایت کی۔ دُنیا میں جس عورت کا کہیں ٹھکانا نہیں ہوتا وہ بھی اس قدر دب کر نہیں رہتی۔ اِن کے تو بفضل خدا آنکھوں پر بٹھانے والے امیر کبیر تین بھائی موجود تھے مگر اس نے سب مصیبتیں برداشت کیں اور گھر نہ چھوڑا۔ زرّیں نئی نئی باتیں بنا کر بیگم کے خلاف ڈپٹی صاحب کو سناتی تھی جس سے اُن کا دل بیگم کی طرف سے بگڑ گیا۔ بہ سبب لحاظ کے وہ بیگم سے شکایت نہ کرتے تھے۔ اِس لئے ان بے چاری کو معلوم بھی نہ ہوتا

تھا کہ مجھ پر کیا کیا بہتان لگائے گئے۔

زرّیں شب و روز اسی کام میں مصروف تھی۔ ایک دن صبح کے وقت زرّیں سنگھار دان کھولے کنگھی کر رہی تھی۔ گو خدا نے نہایت معمولی شکل دی تھی مگر وہ اپنے حسن پر بے حد نازاں تھی۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی اور گول تھیں۔ ناک پتلی مگر چھوٹی تھی۔ لب موٹے نہ تھے تو تعریف کے قابل زیادہ باریک بھی نہ تھے۔ دہن اچھا بڑا تھا اور پیشانی کشادہ نہ تھی۔ ہاں رنگ اچھا صاف تھا اور اب سرخ بھی ہو گیا تھا مگر بیگم سے زیادہ گورا نہ تھا۔ بیگم کو خدا نے قابلِ تعریف حسن دیا تھا اور یہ سرخی سفیدی کی ملاوٹ سے اپنے کو بنائے رکھتی تھی۔ ماتھے اور ٹھوڑی پر ایک ایک خال بھی تھا۔ لباس کو سجاوٹ سے پہننا اور چالاکی و ہوشیاری سے باتیں بنانا۔ بس یہ دو گر تھے جس سے وہ آج ڈپٹن بنی بیٹھی تھی۔ ورنہ محض جاہل تھی۔ اُردو تو کیا قرآن شریف بھی نہ پڑھا تھا۔ خیر جب چوٹی گندھ چکی۔ منہ دُھلا۔ پوڈر ملا اور الماس کو کپڑے نکالنے کا حکم ہوا۔

الماس: ”بیوی جی کون سا جوڑا لاؤں؟“

زرّیں: ”نارنجی قناویز کی شلوار اور آسمانی ریشمی پھول دار قمیص نکال لاؤ۔“

الماس: ”اور واسکٹ اور دوپٹہ؟“

زرّیں: ”گلابی کریب کا دوپٹہ غسل خانے میں کھونٹی پر پڑا ہے وہ لیتی آنا۔ واسکٹ نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہی سبز مخمل کی واسکٹ جو کرسی پر پڑی ہے۔ پہن لوں گی۔ ابھی میلی تو نہیں ہوئی۔ او گل جان! دیکھ تو ڈپٹی صاحب کہاں ہیں؟“

گل جان: ”جی باہر بیٹھے ہیں۔“

زرّیں: ”تو دیکھ تو سہی۔ باہر نہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ بیگم کی طرف گئے ہوئے ہوں گے۔ آج آٹھواں دن ہے اُس طرف گئے۔“

گل جان: ”نہیں بیوی جی! میں ابھی باہر سے آ رہی ہوں۔ کئی آدمی آئے بیٹھے ہیں۔ میں نے چائے تیار کر کے ابھی بھیجی ہے۔“

زرّیں: ”خیر۔ ہاں گل جان! کئی روز سے لڑکا بھی تو نہیں آیا۔ شاید باہر آتا ہو گا۔“

گل جان: ''اے نہیں آیا تو نہ آئے۔ چولہے میں جائے۔ خدا تمہیں اپنا بچہ دے۔
زرّیں: ''گل جان ایسی تو کہاں قسمت۔ جب تک زندہ ہیں۔ کھار ہے ہیں۔ پھر تو سب کچھ کا مالک چھوٹا رحمٰن ہی ہو گا۔''
گل جان: ''اے ہے بیوی ایسا نہ کہو۔ خدا نہ کرے جو وہ مالک ہو۔ اللہ تمہیں بھی بیٹا دے گا۔''

ڈپٹی صاحب آگئے۔ اور گل جان باورچی خانے میں چلی گئی۔

یہاں تو یہ رنگ رلیاں ہیں۔ اب ذرا بیگم کا بھی حال دیکھیں۔

آج صبح سے پڑے پڑے بیگم کو شام ہوگئی۔ جب لڑکا اسکول سے آیا تو اِس خیال سے اُٹھ بیٹھیں کہ وہ رنجیدہ دیکھ کر پریشان نہ ہو۔ اُس کے کپڑے بدلے۔ چاء پلائی اور فارسی کا سبق سنانے کو کہا۔

ننھا رحمٰن: ''اماں جان! مجھے فارسی تو بہت اچھی طرح سے یاد ہے۔ آج سہ ماہی امتحان تھا۔ مجھے فارسی میں سب سے زیادہ نمبر ملے۔ اگر آپ خوشی سے اجازت دیں تو بجائے اِس وقت کے رات کو سنادوں۔ اب تو میرا دل میاں کے پاس جانے کو کرتا ہے کیا آج وہ آئے تھے اگر وہ ہوگئے ہوں تو میں وہیں چلا جاؤں اور جو نہیں آئے تو نہ جاؤں۔''

بیگم: (سرد آہ بھر کر) ''اگر نہیں آئے تو کیوں نہ جاؤں؟''

ننھا رحمٰن: ''اِس لئے کہ شام تک آجائیں گے۔''

بیگم: ''میاں! وہ روز تو نہیں آیا کرتے۔''

ننھا رحمٰن: ''اماں جان اب تو بہت دِن سے میاں نہیں آئے۔ شاید آج ہی آجائیں۔''

بیگم: ''میاں وہ نہیں آئیں گے اگر تمہارا جی چاہتا ہے تو وہیں ہو آؤ لیکن اندر ضرور جانا۔ ورنہ زرّیں جان اُن سے شکایت کردے گی کہ میرے پاس نہیں آتا۔''

ننھا رحمٰن: ''اچھا میں جاتا ہوں۔ میاں سے یہ بھی کہوں گا کہ اتنے دن ہوگئے ہمارے گھر کیوں نہیں آئے؟''

بیگم: ''اور زرّیں سے بھی کہہ دینا کہ اماں کا تم سے ملنے کو دل کرتا ہے کسی دن

فرصت کے وقت ہو جانا۔"

لڑکا تو اُدھر گیا اور بیگم اخبار دیکھنے لگیں اتنے میں چمپا ڈاک لائی۔

چمپا: "بیگم صاحبہ! آگرہ کا کوئی خط ہو تو خیر سلا مجھے بھی سنائیں۔ پہلے خط میں لکھا تھا کہ چھوٹی بیگم کی طبیعت خراب ہے۔"

بیگم نے اُلٹ پلٹ کر خط دیکھے اور لفافہ پہچان کر سب سے پہلے چھوٹی بہن تمکنت آرا بیگم کا خط کھولا۔ لکھا تھا:

رشید بلڈنگ آگرہ،

...... ۱۹۱۲ء

پیاری باجی!

میں حیران ہوں کہ آپ سے کس طرح خط کا جواب لوں۔ دو ہفتے سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ اِس عرصے میں میں نے کئی خط لکھے۔ بھائی جان تو خط کا جواب دیتے ہی نہ تھے۔ پیارے رحمٰن نے بھی انہیں کی اختیار کی۔ میرے دو خطوں کا اُس نے جواب نہیں دیا۔ میری پریشانی اور بے چینی کی کوئی حد نہیں رہی۔ اِس خیال سے اور بھی دِل اُڑا جاتا ہے کہ ضرور آپ کسی سخت فکر و تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ورنہ اپنی تمکنت کو کبھی فکر نہ دیتیں۔ باجی! میں سخت حیران ہوں کہ آپ وہاں بیٹھی کیوں ہیں۔ ہم سب کی جان آدھی ہو رہی ہے آپ کے رنج میں۔

ہم نے اور آپ نے بہتیرا اخفا کیا لیکن ایسی خبر بھی کہیں چھپ سکتی ہے۔ تمام حالات آپ کے ہاں کے بھائیوں کو معلوم ہو گئے ہیں اور وہ سخت پریشان اور رنجیدہ ہو رہے ہیں۔ منجھلے بھائی تو کئی بار تیار ہو چکے ہیں آپ کو لانے کے لئے۔ لیکن بڑے بھائی جان نے روک رکھا ہے صرف آپ کے رنج کے خیال سے وہ کہتے

ہیں کہ "جب تک پردہ پڑا ہے پڑا ہے جس وقت ہم نے خبر لی پھر اچھی طرح لیں گے۔ ہماری بہن کی تو زندگی برباد ہوگئی اُن کو بھی آرام سے نہ چھوڑیں گے"۔ باجی جان! آپ کو معلوم ہے کہ چھوٹا بھائی کس قدر آزاد ہے وہ تو آج یہ کہہ رہا تھا کہ "میں پروا نہیں کرتا ہندوستانی جھوٹی شرم کی۔ بھائی جان اجازت دیں تو میں ابھی باجی جان کے مہروں کی نالش کردوں۔" ہم نے بہت مشکل سے سمجھا کر اُس کو ٹھنڈا کیا۔ ورنہ وہ آج ہی پنڈی جانے کو تیار تھا۔

ہائے باجی! جب میں سوچتی ہوں کہ یہ کیا ہورہا ہے تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ دُنیا سے دل بیزار ہوگیا ہے۔ میں تو اپنے عزیزوں سے بھی اُکتا گئی ہوں۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ مرجاؤں یا کہیں جنگل کو نکل جاؤں۔ سب سے جی بیزار ہے۔

دُنیا مقام رہنے کے قابل تو ہے اگر
بیگانہ ہو نہ اپنا عدو ہو نہ یار ہو
گل ہو نہ برگ خشک ہو بلبل ہو اور نہ زاغ
غم کی نہ ہو خزاں نہ خوشی کی بہار ہو
جوہر نہ ہو نہ عرض نہ کل ہو جزو کل
کون و مکان ہو اور نہ یہ لیل و نہار ہو
حد نہ ہو جسم کی نہ کوئی رُوح کی ہو قید
مجبور ہو نہ کوئی نہ با اختیار ہو
ہو کا ہو عالم اور نہ کچھ ہو سوائے رنج
اور تیر بن کے وہ میرے سینے کے پار ہو

اے ہستی تیری سختیاں کب تک سہے بشر
میں پھیٹ دوں تجھے جو مرا اختیار ہو

پیاری باجی! بتاؤ میں کیا کروں؟ جی چاہتا ہے سر پیٹ لوں۔ آہ اب مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا ہے۔

اچھی باجی! بس اب آجاؤ۔ اپنے اوپر اور ہم سب پر رحم کرو۔ پیارے فضل کو پیار اور بس۔ خدا آپ کا مددگار ہو۔

میں ہوں آپ کی سوختہ دل
"تمکنت"

بیگم اِس خط کو پڑھتی جاتی تھیں اور آنکھوں سے قطراتِ اشک مثلِ گوہرِ آب دار رواں تھے۔ چمپا بھی روئی اور کہا:

چمپا: "بیگم! اب آپ کو چلنا چاہئے۔ یہاں رہ کر کیا کرنا ہے۔ جس کے لئے آپ نے یہ مصیبت برداشت کی۔ وہ بھی نہ ہوا۔ سرکار روز بروز اِس طرف سے زیادہ کشیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ غضب خدا کا آٹھ آٹھ دن گزر جائیں اور وہ گھر میں نہ آئیں۔ آپ ہی خیال کریں۔ پردیس میں سوائے اُن کے اور ہمارا کون ہے۔ جب وہ اِس قدر بے پروا ہو گئے تو بھلا کیا ٹھیک۔ یہ پٹھانی ملک۔ جاڑے کی سنسان راتیں اور یہ تنہائی، آپ نے تو پتھر کا دل کر لیا ہے۔ یہی دیکھو، کہ جس طرف آپ رہتے ہیں۔ اُدھر تین نوکر اور دو چوکیدار ہیں اور ہماری طرف ایک نوکر اور ایک چوکیدار۔ بیگم صاحبہ! اب یہاں کے ظلم سہنے کے قابل نہیں رہے اور اس کی بھی اللہ ہی سے اُمید ہے کہ اِس چنڈال (زرّیں) کے ہوتے سرکار ہمارے ہوں پھر کیوں آنکھوں دیکھے جی جلاتی ہو؟"

بیگم: "آہ چمپا! آخر یہی ہوگا اور کیا ہوگا؟ میں نے ہر چند چاہا کہ زندگی میں یہ گھر نہ چھوٹے۔ بہن بھائی کو ناراض کیا مگر اِس ظالم کی علیحدگی پسند نہ کی لیکن کہاں تک؟ میری قسمت مجھے یہاں سے لے ہی جائے گی اگر کوئی بھائی آگیا تو مجھے چھوڑ کر نہ جائے گا۔"

چمپا: "چھوٹی بیگم کے خط کا جواب ابھی لکھ دیجئے۔ خدا نہ کرے۔ یہ رنج

کہیں اُنہیں بیمار ڈال دے۔"

بیگم: "اب تو نماز مغرب قریب ہے۔ شب میں لکھوں گی۔"

بیگم نے نماز پڑھی مگر کھانا نہ کھایا۔ بچہ وہیں سے کھانا کھا آیا تھا آتے ہی سو گیا۔ شام سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اچھی بارش ہونے لگی۔ جب لڑکا سو گیا۔ تو بیگم خط لکھنے میز پر گئیں۔ چمپا نے لیمپ لا رکھا۔ وہ کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ لیمپ کی تیز روشنی ان پر پڑ رہی تھی۔ بیگم بناوٹ سے تو ہمیشہ سے گریزاں رہتی تھیں۔ اُن کا مزاج بے انتہا سادگی پسند واقع ہوا تھا لیکن اب تو کچھ حد سے زیادہ سادہ رہنے لگی تھیں جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس قدر رزریں کو خوب صورتی کے لئے اوچھے پن کے ساتھ بناوٹ کرکے دیکھتی تھیں۔ اُن کا دل اور بھی نفرت کرتا جاتا تھا۔ اِس وقت وہ آسمانی مریئے کا غرارہ اور سفید مریئے کی قمیض پہنے ہوئے تھیں۔ اور بادامی کشمیری شال۔ کانوں میں صرف زمرد کا ڈر اور ہاتھوں میں ایک ایک کڑا تھا۔ لیکن حسنِ خداداد کے سامنے بناوٹی حسن کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس سادہ حالت میں بھی اُس سجی بنی زیور سے لدی زرزیں سے ہزار درجے خوب صورت معلوم ہو رہی تھیں۔ جب کچھ دیر انہیں اسی طرح بیٹھے گزر گئی۔ تو چمپا نے پھر خط لکھنے کو کہا۔

چمپا: "بیگم صاحبہ! خط لکھ لیجئے اور اگر اِس وقت طبیعت نہیں چاہتی تو آرام کیجئے۔ صبح کو سہی۔ اب تو گیارہ بجنے والے ہوں گے۔"

بیگم: (چونک کر) "ہاں لکھتی ہوں کچھ خیال میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔" پھر لکھنا شروع کیا:

راولپنڈی

......۱۹۱۲ء

میں سوزِ حرماں ہوں گرفتارِ بلا ہوں
گہہ محوِ فغاں ہوں کبھی معروفِ بکا ہوں
معلوم نہیں خود مجھے میں کون ہوں کیا ہوں؟

کچھ بول سکے اب نہیں مقدور زباں کا
افسانہ کہوں کیا دلِ بیتاب و تواں کا؟
کیا ذکر کروں رنج و غم دردِ نہاں کا
ہوتا نہیں کم بخت اثر آہ و فغاں کا
افسوس ہے ہمدرد چھٹا سوختہ جاں کا
کچھ ایسے دیئے چرخِ ستمگار نے چرکے
یک لخت ہوئے قلب و جگر کے کئی ٹکڑے
رونے کے سوا کام نہیں ہے کوئی دن بھر
منظور نظر ہو نہیں سکتا کوئی منظر
تاریک ہے دُنیا مری نظروں میں سراسر
کرتا ہے بہت تنگ مجھے یہ دلِ مضطر
ہے آمد و شد سانس کی چلتا ہوا خنجر
بھرتا نظر آتا نہیں زخمِ دلِ مضطر

تمہاری بدنصیب شکستہ دل
باجی

تمکنت آرا کا خط بند کیا اور دوسرا کاغذ لے کر لکھنے لگیں:

بوقت بارہ بجے شب

وہ تو آرام سے سو رہتے ہیں راتوں کو مدام
یہ نہیں پوچھتے ہے نالہ و شیون کیسا ؟
رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ تمام دُنیا میٹھی نیند سو رہی ہے۔
آہ! مجھے دنیا سے کیا۔ جب میرا عزیز خواب راحت میں ہے اور یہ

خیال بھی نہیں کہ کوئی کس حال میں ہوگا۔آہ!خیال کیوں ہوتا۔

سوئیں جوشب کوچین سے اُن کوکسی کی کیا خبر
ہجر کے مبتلا کے ساتھ دردِ جگر نے کیا کیا؟

ہائے یہ سنسان اندھیری رات ہے اور اکیلے گھر میں وہی بدنصیب جس کا کبھی آپ کو بے انتہا خیال تھا۔مع ننھے بچے کے تنہا پڑی ہے۔کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

شب غم کون ترس کھا کے ہے رونے والا
کبھی رو لیتے ہیں ہم دل کو کبھی دل ہم کو
چین آتا نہیں دم بھر کسی پہلو ہم کو
اتنی تکلیف اب اے درد نہ دے تو ہم کو

ہائے کیسا ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔اُف کس قدر تعجب خیز بات ہے۔آہ!ایک ہفتہ گزر گیا۔آپ کی شکل نہیں دیکھی۔

نہ معلوم ایک بے گناہ پر اس قدر ظلم کیوں روا سمجھا گیا۔اُف میں کس قدر سخت جان ہوں کہ ایسی سختیاں اُٹھا رہی ہوں مگر اب طاقتِ برداشت نہیں۔اے اللہ اگر اُن کو اِس قدر سنگ دِل کر دیا ہے تو مجھے بھی اتنا ہی حوصلہ دے۔

سہتے ہی رہیں اُس ستم ایجاد کے صدمے
فولاد کا یہ دِل ہو تو پتھر کا جگر ہو
نالوں میں نہ تاثیر نہ آہوں میں اثر ہو
کوئی نہ کہے کچھ اُسے خود میری خبر ہو
اتنا گو مرے گریہ و فرقت میں اثر ہو
دُشمن کی بھی آنکھوں سے رواں خونِ جگر ہو
ہوں تیرِ حوادث کا میں ہر وقت نشانہ
مجھ سا نہ زمانے میں کوئی خستہ جگر ہو

میں کہاں تک لکھے جاؤں اور کیوں لکھوں یہ تو شاید پڑھا
بھی نہ جائے گا۔ اب مجھے بس کرنا چاہئے۔ کاش اب مجھے نیند
آجائے جو باقی حصہ رات کا ذرا آسانی سے گزر جائے۔ اے
میرے رنج و خیالات! تھوڑی دیر کو مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ مجھ تنہا کو
بالکل تنہا چھوڑ دو۔

اے ہجومِ غم و اندوہ بس اب رخصت ہو
دلِ ناشاد مرا خوگرِ تنہائی ہے
ظلمتِ شب سے گھٹا جاتا ہے اب دم میرا
یاس وحسرت کی مرے دل پہ گھٹا چھائی ہے

آپ کی مہجور شکستہ دل
بدنصیب ''سلطنت''

اِس خط کو بند کیا اور دروازہ کھول کر باہر کی طرف دیکھنے لگیں۔ بارش نہایت زور
سے برس رہی تھی۔ صحن میں اندھیرا اور سناٹا چھا رہا تھا۔ بجلی کے چمکنے سے کبھی کبھی روشنی
ہو جاتی تھی۔ چمپا فرش پر میز کے قریب بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ بیگم کو کرسی پر نہ دیکھ کر کہا:

چمپا: ''آپ اِس وقت دروازے میں کیوں کھڑی ہیں؟ کیا باہر جانا ہے؟''

بیگم: ''نہیں تو یوں ہی کھڑی ہوگئی۔ دیکھو تو کیسی زور سے بارش ہو رہی ہے۔
بادل کی گرج سے دِل دہلا جاتا ہے۔''

چمپا: ''آپ وہاں کیوں جا کھڑی ہوئیں۔ آؤ اب آرام کرو۔ ایک بجا ہوگا۔
چھوٹے میاں کے پاس لیٹو۔ کہیں بجلی کی کڑک سے جاگ نہ اُٹھیں۔''

فصل دہم

ہم ترے گھر سے جفا کار چلے جاتے ہیں
لے چلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں

بیگم کو ایک سال اِسی طرح گزر گیا۔ ڈپٹی صاحب اِن کی طرف سے بالکل بے خبر ہو گئے۔ تین چار دِن سے بیگم کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ آج تو بخار بہت تیز ہو گیا۔ زکام کی وجہ سے سر میں بھی درد سخت تھا۔ چھ سات دِن سے ڈپٹی صاحب اِدھر نہ آئے تھے۔ جب اِن کی علالت کی اطلاع ملی تو وہ اِدھر آنے لگے۔ ساتھ زرّیں بھی تیار ہو گئیں کہ میں بھی بیگم کو دیکھنے چلتی ہوں۔ شام کے چھ بجے ہوں گے کہ دونوں میاں بیوی آئے۔ بیگم برآمدے میں دُلائی اوڑھے لیٹی تھیں اور گلاب سر دبا رہی تھی۔ ڈپٹی صاحب تو خاموش کھڑے ہو گئے اور زرّیں طبیعت کا حال دریافت کرنے لگیں۔

زرّیں: ''کیوں جی! طبیعت کا کیا حال ہے؟ ہمیں تو ابھی معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ چند آدمیوں کے کھانے کا انتظام کرنا تھا مگر سنتے ہی سب کچھ چھوڑا اور فوراً چلی آئی۔''

بیگم: ''مہربانی تمہاری۔ میں اچھی ہوں۔ ریزش کے سبب بخار ہو گیا''۔

ڈپٹی: ''ڈاکٹر کو بلواوٴں؟''

بیگم: ''کوئی ضرورت نہیں۔ یوں ہی معمولی بخار ہے جاتا رہے گا۔ چمپا نے بنفشہ وغیرہ کا جوشاندہ بنایا ہے۔ وہ پی لوں گی۔''

ڈپٹی: "ہاں ریزش کے لئے وہ بہت مفید ہے۔"

زرّیں: "جی نہیں۔ ڈاکٹر کو بلواؤ۔ بیگم کو بخار تیز ہے۔ جوشاندہ کیا کرے گا؟"

بیگم: "کچھ تیز نہیں۔ ٹھنڈ کا سبب ہے۔ زکام کو آرام ہوا تو بخار بھی اُتر جائے گا۔"

ڈپٹی: "تمہاری مرضی۔ زرّیں تو مجھ سے وہیں کہتی تھیں کہ مس کو بلا کے ساتھ لیتے ہی چلو۔"

بیگم: "خدا انہیں خوش رکھے۔ میں اِس ہمدردی کی شکر گزار ہوں۔"

میاں کو اپنی ہمدردی جتانے کے خیال سے زرّیں بیگم کے پیر دبانے بیٹھ گئی۔ ڈپٹی صاحب کرسی پر بیٹھے اخبار دیکھتے رہے یونہی وقت گزر گیا۔ آٹھ بجے تو چمپا نے کھانے کو پوچھا؟"

زرّیں: (میاں سے) "اِس وقت یہیں کھانا کھالیں۔"

ڈپٹی: "کھا تو لوں مگر اُدھر مہمان جو ہیں۔"

زرّیں: "اوہو اُن کا خیال نہ رہا۔ اچھا آپ اُدھر جائیں۔ اُمید ہے گل جان اور الماس بہت اچھی طرح کھانا کھلادیں گی۔"

میاں تو اُدھر گئے۔ چمپا کھانا لائی۔ بیگم سے تو کچھ بھی نہ کھایا گیا۔ زرّیں نے بھی اپنی فکر مندی ظاہر کرنے کو بہت ہی کم کھایا۔ دس بجے تو ڈپٹی صاحب آئے۔ زرّیں اُس وقت زیور اور لباس تبدیل کرنے کمرے میں گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بیگم کے منہ پر سے دُلائی ہٹائی تو ان کو روتے ہوئے دیکھا۔

ڈپٹی: "کیوں جی! کیا اِس وقت طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

بیگم: (نہایت آہستہ) "نہیں"۔

ڈپٹی: "پھر اِس قدر گھبرا کیوں رہی ہو؟"

بیگم: "آپ نے کیا گھبراہٹ پائی؟"

ڈپٹی: "مجھے تو زیادہ تکلیف میں معلوم ہو رہی ہو"۔

بیگم: "آپ کو اور میری تکلیف معلوم ہوتی ہے؟"

اب ڈپٹی صاحب سے جواب نہ دیا گیا اور فوراً ہی زرّیں کمرے سے نکل آئی اور

میاں سے کہنے لگی:

زرّیں: "اِن کو آج تکلیف ہے۔ اِس واسطے میں آج یہیں رہنا چاہتی ہوں۔"

ڈپٹی: بہت بہتر۔ یہیں دو پلنگ اور بچھوالو۔"

زرّیں: "کام کرنے کو چمپا، گلاب اور میں کافی ہوں گے۔ آپ کی تو کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ وہیں رہتے تو اچھا تھا مکان اکیلا نہ رہتا۔

ڈپٹی: "اچھا وہیں سو رہوں گا۔"

بیگم: "زرّیں میں تمہاری اِس محبت اور ہمدردی کی تہ دل سے شکرگزار ہوں لیکن چونکہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے جس کے لئے رات میں کسی کو بار بار اُٹھنا پڑے۔ میری یہی خواہش ہے کہ تم بھی گھر جا کر آرام کرو جب میری بہت خراب حالت ہوگی تو میں خود تمہیں تکلیف دوں گی اور بلوالوں گی کیوں کہ تمہارے سوا یہاں میرا اور کوئی خبر گیراں نہیں۔ ابھی سے بے وقت تم تکلیف نہ اُٹھاؤ۔"

زرّیں: "جی نہیں تکلیف کیسی؟ میں آپ کی خدمت کرنا موجب فخر سمجھتی ہوں۔ آج تو میں یہیں رہوں گی۔"

ڈپٹی صاحب چلے گئے اور زرّیں رات کو یہیں رہی اور نہ صرف اِس رات رہی۔ بلکہ تین چار دِن گزارے۔ کیوں کہ بیگم کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی جاتی تھی۔ ڈپٹی صاحب بھی دِن کو آتے جاتے تھے لیکن زرّیں کے حکم سے رات کو وہیں سوتے۔ ان کی علالت کی خبر آگرے بھی ہوئی۔ وہ سب تو پہلے ہی سے تیار تھے۔ بیماری سنتے ہی بہن اور بھائی نے رشیدالملک کو اُن کے لینے کے واسطے بھیج دیا۔ شام کے آٹھ بجے رشیدالملک راولپنڈی پہنچے۔ اِس دفعہ اُن کے لینے کو ڈپٹی صاحب اسٹیشن بھی نہ گئے اور بیوی کی بیماری کا عذر کر دیا۔ رشیدالملک کو سالی سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ اسٹیشن سے گھر تک نہایت پریشان حال پہنچے۔ بیگم اس وقت بھی لیٹی ہوئی تھیں۔ زرّیں باورچی خانے میں تھیں اور ڈپٹی صاحب دوسرے مکان میں۔ وہ نہایت گھبرائے ہوئے تیز قدم کمرے میں آئے۔

رشیدالملک: "آداب عرض۔ افسوس اپنے ہاتھوں آپ نے کیا حال بنالیا؟ بس اب تو اپنے اوپر نہیں۔ ہمارے اوپر رحم کرو۔ اور چلو۔"

بیگم: (مسکرا کے) "یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ ملنے کا؟ تم نے آداب کے ساتھ کیا کیا عرض کر ڈالا۔ مزاج پرسی اسی طرح کرتے ہیں؟"

رشید الملک: (بگڑ کر) "باجی جان! آپ کو تو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ آپ کا دماغ صحیح نہیں رہا۔ سچ ہے۔ بہت سی مصیبت میں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔"

بیگم: "خیر میں تو جیسی ہوں ویسی ہوں۔ اِس وقت تو تم پاگل معلوم ہوتے ہو۔ ارے دیوانے! یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ تم عیادت کو آئے ہو یا لڑنے کو؟ پہلے میری حالت دیکھی ہوتی۔ بیوی سے بھی زیادہ جلد باز ہو گئے۔"

رشید الملک: "نہیں جناب میں عیادت کو نہیں آیا لینے کو آیا ہوں۔ اِس دوزخ میں جس کو آپ نے بہشت سمجھ رکھا ہے۔ اگر چند روز بھی اَور رہیں، تو خاتمہ ہو جائے گا۔ میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہرنا چاہتا اور نہ اس ظالم سنگ دِل کو دیکھنا۔ صرف رات یہاں کاٹنا چاہتا ہوں۔ صبح چلنے کا بندوبست کریں اور دوپہر کو روانہ ہو جائیں۔"

بیگم: "خیر وہ بھی دیکھا جائے گا۔ ایسی جلد بازی و تیز مزاجی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ انسانیت کے ساتھ اُن سب سے ملو۔ وہ بھی چار پانچ روز سے میری خدمت کے لئے یہیں ہے۔ شاید باورچی خانے میں کسی کام کو گئی ہے۔ اِدھر آ کر تمہیں سلام کرے گی تو آدمیت سے پیش آنا۔"

رشید الملک: "جی نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تو وہ۔ میں تو اُن کے باپ ڈپٹی صاحب کو بھی سلام نہ کروں۔"

بیگم: "ہائیں ہائیں۔ انسان بنو۔ یہ حالت تھی تو تم اِدھر آئے کیوں؟"

رشید الملک: "آیا ہوں کہ آپ کی بہن مری جاتی ہے۔ اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور مثل دیوانوں کے حالت بنا رکھی ہے۔"

بیگم: "اچھا ہوش سے ایک بات اور سنو۔ میرے لے جانے کے لئے انہیں اِس طریق سے نہ کہنا جس سے میرے بھائیوں کی ناراضی کا پتہ چلے یا یہ ثابت ہو کہ تم مجھے ہمیشہ کے لئے لئے جاتے ہو بلکہ صرف یہ کہنا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے لے جاتا ہوں۔

دُوسرے آگرے میں بہ نسبت یہاں کے علاج بھی اچھا ہو جائے گا۔"

یہ کہہ رہی تھیں کہ زرّیں جان آگئی اور نہایت ادب سے رشید الملک کو سلام کیا۔ جس کے جواب میں رشید الملک نے صرف آنکھیں نیچی کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈپٹی صاحب بھی باہر سے آگئے۔ رشید الملک بھی اپنی ہٹ کے پکے تھے۔ آتا دیکھ کر بھی تعظیماً کرسی سے نہ اُٹھے اور بہن کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اُس طرف جھک گیا گویا انہیں خبر ہی نہیں۔ وہ بھی چونکہ لینے کو اسٹیشن پر نہ گئے تھے۔ اِس لئے اُن سے شرمندہ سے تھے اور ایک بات یہ بھی تھی کہ جو ملازم اسٹیشن پر گیا تھا۔ اُسی سے کہلا بھیجا تھا کہ بوجہ فکرمندی کے اسٹیشن پر نہیں آسکے اور اب جو رشید الملک نے آکر دیکھا تو بیگم کے پاس بھی نہ تھے۔ خیر جوں توں شرمندگی کی حالت میں آہستہ قدم اُٹھاتے ان کے قریب پہنچے۔

ڈپٹی: "اوہو بھائی! تم آپہنچے۔ افسوس میں اسٹیشن پر نہ جا سکا۔"

رشید الملک: "جناب کوئی افسوس نہیں۔ روشن گل (ملازم) کہتا تھا کہ سرکار سخت پریشان ہیں اِس لئے نہیں آئے۔ میں نے بھی نہایت تشویش کی حالت میں راستہ طے کیا۔ خیال تھا کہ آپ یہیں بیٹھے ملیں گے مگر جب میں آیا تو ہمشیرہ بالکل تنہا پڑی تھیں۔ لیمپ بھی گل ہوا پڑا تھا۔ خدا جانے گلاب اور چمپا کہاں مر گئیں۔ انہیں بھی ان کا خیال نہیں رہا۔"

ڈپٹی: "میں ابھی باہر چلا گیا تھا۔ ایک ضروری کام تھا اور خدمت گاریں تو ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ یہ (زرّیں جان) بھی کسی وقت ان کے پاس سے نہیں اُٹھتیں۔"

رشید الملک: "بے شک یہ آپ سب کا احسان اور مہربانی ہے مگر میں تو گلاب کو کہتا ہوں۔ بیمار کی خبر گیری سے زیادہ اور کون سا ضروری کام تھا جو وہ تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔"

زرّیں: "جہاں تک ہو سکتا ہے میں ایک منٹ کو بھی انہیں اکیلا نہیں چھوڑتی۔ میں نے آج کل زیادہ کام کے خیال سے اپنی دونوں نوکرانیوں گل جان و الماس کو بھی یہیں بلا لیا ہے۔"

بیگم: (بات کاٹنے کے لئے) "زرّیں! کھانا منگوا لو۔ اب تو نو بج گئے ہوں گے۔"

ڈپٹی: ''ہاں ہاں کھانا لاؤ۔میاں رشید جلد کھانے کے عادی ہیں۔''
رشیدالملک: ''میں اس وقت کھانا نہ کھاؤں گا۔شام کو چائے پی تھی۔اُسی وقت سے طبیعت پر بوجھ معلوم ہوتا ہے۔''
ڈپٹی: ''کچھ تھوڑا بہت ضرور کھالو۔رات کو بغیر کھائے نہیں سونا چاہئے۔''
رشیدالملک: ''مجھے عادت ہے۔اکثر اسی طرح سو جانے کی۔''
ڈپٹی: ''اچھا دودھ پی لینا۔''
رشیدالملک: ''خیر دیکھا جائے گا۔میں تو پی لوں گا لیکن اِن کی دوا کی بھی کسی کو فکر ہے؟ کس قدر دیر بعد پلائی جاتی ہے اور کتنی دیر ہوئی پلائے ہوئے؟ مجھے آئے ایک گھنٹہ سے زیادہ عرصہ ہوا ہوگا۔اِس اثنا میں تو پلائی نہیں گئی۔یونانی علاج ہے یا ڈاکٹری؟''
ڈپٹی: ''ڈاکٹری علاج ہے میں نے چھ بجے دوا دی تھی پھر شاید انہوں نے دی ہوگی۔''
رشیدالملک: ''باجی جان کس وقت پی تھی؟''
بیگم: ''کچھ یاد نہیں کہ کس وقت پی تھی۔شیشی دیکھ لو۔''
رشیدالملک نے میز سے شیشی اُٹھا کر لیبل دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو دو گھنٹے بعد پلائی جاتی ہے اور شیشی میں چار خوراکیں تھیں جس میں سے دو پلائی گئی تھیں اور دو ابھی باقی تھیں۔
رشیدالملک نے لیبل پڑھا اور ان دونوں میاں بیوی کو فکر ہو گیا کیوں کہ دوا بہت بے توجہی سے دی جا رہی تھی۔
رشیدالملک: ''آپ کہتے ہیں کہ چھ بجے دوا دی تھی اور دو دو گھنٹے بعد دی جاتی ہے تو آٹھ بجے تیسری خوراک دینی چاہئے تھی۔وہ وقت بے پروائی میں گزر گیا۔اب آٹھ بجے کی خوراک دس بجے ملے گی اور دس بجے کی بارہ بجے اور اُس وقت سب سو رہے ہوں گے۔اِس لئے وہ بھی دی جا سکے گی تو گویا چار خوراکوں میں تین ملیں۔وہ بھی بے قاعدہ۔تو اِس طرح کے علاج سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟''
ڈپٹی صاحب خاموش کیا بول سکتے تھے؟ خیر اُسی وقت کھانا آ گیا۔ان کے پاس

ہی بیٹھ کر شرمندہ شکل میاں بیوی نے کچھ کھایا۔ اس وقت کھایا بھلا کیا جاتا یہ بھی خیال تھا کہ رشید الملک تو بوجہ فکر مندی ہی نہیں کھاتا اور ہم کھا رہے ہیں اس کے بعد سونے کا انتظام ہونے لگا۔ زرّیں تو روز یہیں سوتی تھی۔ آج میاں کا بستر بھی یہیں کرایا۔ اس خیال سے کہ رشید الملک یہ سمجھے روز یہیں سوتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب اس تجویز سے بہت خوش ہوئے اور رشید الملک سے دریافت کیا۔

ڈپٹی : ''میاں رشید تم کہاں سوؤ گے؟''

رشید ملک : ''جی کہیں بھی نہیں؟''

ڈپٹی: ''ہائیں یہ کیا؟ باہر نہ جاؤ۔ تمہارے واسطے بھی یہیں پلنگ بچھوا دیا جائے گا۔''

رشید الملک : ''نہیں پلنگ کی تکلیف نہ کریں۔ میں کرسی پر پڑ رہوں گا اگر چارپائی پر لیٹا تو نیند آ جائے گی اور میں بیٹھنا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں خوراکیں دوا کی پلا سکوں۔''

ڈپٹی: ''یہ ٹھیک نہیں۔ تم کل رات بھی نہیں سوئے اور آج بھی بیدار رہے تو خدانخواستہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آخر ہم سب بھی یہاں ہیں۔ باری باری سے اُٹھ کر دوا دیتے رہیں گے۔ آؤ تم میرے پاس ہی لیٹ جاؤ۔''

رشید الملک: ''اچھا لیٹ رہوں گا مگر ابھی تو جی نہیں چاہتا۔ اخبار دیکھنا ہے۔ ۱۲ بجے کی خوراک دے کر اُٹھوں گا۔''

ڈپٹی: ''اچھا کپڑے اُتارو۔ جب سے آئے ہو اسی طرح بیٹھے ہو۔''

رشید الملک: ''کپڑے اُتارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سردی ہے۔''

ڈپٹی: ''بھائی! کوٹ پتلون اُتار دو۔ اور رگ لے لو۔ (بیوی سے) زرّیں بھائی کے واسطے دودھ منگاؤ۔ اور دو رگ لا دو۔''

رشید الملک : ''جناب! اس وقت تو مہربانی کریں۔ دودھ سے میری طبیعت خراب ہو جائے گی اور کپڑے بھی نہیں اُتارتا۔ دِقت ہے۔ رگ کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بالکل گرم ہوں۔''

ڈپٹی: ''بھئی! تم بڑی ضد کرنے لگے ہو۔ اچھا یہ کالر ٹائی ہی کھول دو۔ اس

سے تو گردن کو تکلیف ہوگی۔"

رشید الملک: "ہاں کھول دوں گا۔"

گھڑی دیکھی۔ دس بج گئے تھے۔ بہن کو دوا دی پھر اخبار پڑھنے لگے۔ زریں تو دیوار کی طرف منہ کر کے چارپائی پر لیٹ رہی اور ڈپٹی صاحب بیچارے کو سخت دِقّت کا سامنا ہوا۔ اب تو نہ بیٹھ ہی سکتے تھے اور نہ رشید الملک کو بیٹھا چھوڑ کر انہیں لیٹنا ہی مناسب تھا۔ اُنہوں نے بھی ہاتھ میں کتاب لے لی اور کبھی لیٹے کبھی بیٹھے۔ اِسی طرح بارہ بجا دیئے اور جب رشید الملک بہن کو دوا پلا چکے تو انہوں نے زبردستی پکڑ کر کرسی سے اُٹھالیا اور نہایت اصرار سے لیٹنے کو مجبور کیا۔ خود ہی بوٹ اُتارنے لگے تو رشید الملک نے پاؤں کھینچ لئے اور نیچے لٹکا کر سو گئے۔ ڈپٹی صاحب کو سخت نیند آ رہی تھی۔ زیادہ اصرار نہ کر سکے اور سو گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ سو رہے ہیں۔ تو آہستہ سے پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔ بیگم اس وقت تک جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے ان کو اپنے قریب کر کے نہایت آہستہ سے کہا۔

بیگم: "رشید! تم کو کیا ہو گیا ہے؟ تم تو بچوں سے زیادہ ضد کرنے لگے۔"

رشید الملک: "باجی! آپ کچھ نہ بولیں۔ میرا دِل سخت جل رہا ہے۔ یہی شکر کریں کہ میں خاموش ہوں۔ میں نے سخت ضبط کر رکھا ہے۔ میرا دل اُن کے دیکھنے کو نہیں کرتا۔ پاس کیسے لیٹوں؟"

بیگم: "تم نے مجھے ایک اور سخت رنج دے رکھا ہے۔ کھانا نہیں کھایا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ آہ! میرے گھر تمہاری یہ حالت ہو کہ مسافروں کی طرح بیٹھے ہو۔ ابھی کپڑے بھی نہیں اُترے۔"

رشید الملک: "پیاری باجی! آپ ذرا رنج نہ کریں۔ کھانا نہ کھانے سے مجھے تکلیف نہیں ہوئی بلکہ کھا لینے سے تکلیف ہوتی۔ میرا دِل بالکل بھرا ہوا ہے۔ نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا ہے۔ طبیعت اِس قدر خراب ہے کہ ابھی چل پڑنے کو دِل چاہتا ہے۔"

بیگم: "بھائی! اللہ رکھے ابھی تمہیں بہت عرصہ دُنیا میں رہنا ہے۔ غم و غصّے کو ضبط کرنے اور مصیبت برداشت کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اِس قدر کم حوصلگی اچھی نہیں۔ اچھا مجھے تھوڑا پانی دو۔ حلق خشک ہو گیا۔"

رشید الملک نے بہت جلد دُودھ انگیٹھی پر گرم کر کے پلا دیا اور پھر وہیں بیٹھ گئے۔ یونہی صبح ہوگئی۔ ڈپٹی صاحب اور زرّیں بھی اُٹھ بیٹھے۔ اِس شرمندگی کی وجہ سے مزاج پرسی نہ کر سکے کہ پچھلی رات میں بالکل خبر نہ لی تھی۔ رشید الملک بھی بالکل خاموش رہے جب چائے آئی تو ڈپٹی صاحب نے کہا:

ڈپٹی: ''بھئی! تم نے تو اب تک منہ بھی نہیں دھویا۔ بس اُٹھو۔ چائے ٹھنڈی ہوتی ہے۔''

رشید الملک: ''مجھے منہ دھونے کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ تمام رات بیٹھا ہی رہا ہوں۔ سونے کے بعد منہ دھونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔''

ڈپٹی: ''اچھا تو لو چائے پیو۔''

رشید الملک: ''میں تو ابھی دُودھ پی چکا ہوں۔ ہمشیرہ کو دیا تھا تو اُس وقت مجھے بھی پیاس معلوم ہوئی تھی۔ خیر آپ بتا دیجئے۔ لڑکا کب آئے گا؟ روشن گل کہتا تھا کہ اُس کو کوئی صاحب نوشہرہ لے گئے ہیں۔''

ڈپٹی: ''جی ہاں۔ میرے ایک دوست تین دِن ہوئے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

رشید الملک: ''آج آجائے گا؟ چوں کہ میں جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اِس لئے آج دِن میں اُس کا آجانا ضروری ہے۔''

ڈپٹی: ''وہ ابھی دس بجے آجائے گا اور تم اِس قدر جلد کیسے جاسکتے ہو۔ ذرا اِن کو آرام ہونے دو۔ ایسی حالت میں اِن کو چھوڑ کر کس طرح دِل چاہے گا؟''

رشید الملک: ''چونکہ اِن کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اِسی واسطے میں جانے کی جلدی کرتا ہوں۔ تبدیل آب و ہوا اور تبدیل علاج ان کے لئے مفید ہوگا۔ اِس واسطے جہاں تک جلد ممکن ہو گھر پہنچنا چاہئے تا کہ کمزوری نہ بڑھنے پائے۔''

ڈپٹی: ''کیا تم اِن کو بھی ہمراہ لے جانا چاہتے ہو؟''

رشید الملک: ''جی ہاں میں آیا اِسی واسطے ہوں بلکہ تاکیداً بھیجا گیا ہوں، کالج کھلنے میں صرف چار دِن باقی ہیں۔ میں کسی طرح نہ آسکتا تھا لیکن بھائی حامد علی صاحب نے نہایت اصرار سے مجبور کیا یہاں آنے پر۔ ہمشیرہ کی علالت کی خبر سے وہ سب سخت پریشان

ہیں۔ بھائی صاحب نے بہت تاکید کر دی ہے۔ جلد واپس ہونے کی اور میرے پاس وقت بھی نہیں۔ پرسوں علی گڑھ پہنچنا ہے۔ اِس واسطے میں آج شب میں روانہ ہوں گا۔"

ڈپٹی: "اِس قدر جلدی میرے خیال میں مناسب نہیں۔ یہ بہت کمزور ہیں۔ اگر چند دِن بعد جائیں تو انہیں بھی طاقت آجائے گی اور میں بھی رُخصت کا انتظام کر کے ساتھ چلوں گا۔"

رشید الملک: "جب صحت ہوگئی تو پھر جانے ہی کی کیا ضرورت ہے وہ تو صرف علاج کے واسطے وہاں بلاتے ہیں۔"

ڈپٹی: "پھر اس قدر جلد مجھے رخصت نہ مل سکے گی۔ میں آج کس طرح ساتھ چل سکوں گا۔"

رشید الملک: "آپ کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جو ساتھ ہوں۔"

ڈپٹی: "اچھا تمہاری مرضی۔ جس میں انہیں صحت ہو۔ مجھے وہ منظور ہے۔"

غرض کہ یہی صلاح ٹھہری کہ رات کے ۱۲ بجے آگرے روانہ ہوں۔ دس بجے لڑکا بھی آگیا۔ بیگم بیچاری سے تو اُٹھا ہی نہ جاتا تھا اور اب گھر کی جدائی اور ہمیشہ کی جدائی کے خیال نے تو اور بھی نڈھال کر دیا۔ جس قدر ہو سکا۔ گلاب و چمپا نے اسباب درست کر لیا۔ بہت ہی مختصر سا سامان ساتھ لیا۔ صرف پہننے کے کپڑے اور زیور۔ باقی سب یہیں پر چھوڑا۔

بیگم کو ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہی تھیں کیوں کب پھر یہاں آنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ڈپٹی صاحب کی طرف سے بالکل نا اُمیدی تھی لیکن پھر بھی سوائے نہایت ضروری چیزوں کے اور کوئی چیز اِس خیال سے ساتھ نہ لی کہ زرّیں کہے گی کہ گھر خالی کر گئیں اور دونوں میاں بیوی یہ خیال کریں گے کہ واپس نہ آنے کے لئے گئی ہیں۔

چونکہ رات کے جاگے ہوئے تھے رشید الملک گیارہ بجے سو گئے۔ کھانے کے وقت بہت جگایا مگر نہ اُٹھے اور اِسی طرح شام کی چائے بھی ٹال دی۔ لیٹے لیٹے پنسل کاغذ لے کر بیگم نے کچھ لکھا اور رات کے گیارہ بجے اسٹیشن پر چلیں۔ اُس وقت زرّیں نے ایک اور چالبازی دکھائی۔ سوار ہوتے وقت بیگم سے مل کر خوب روئیں اور جب اُن کی گاڑی روانہ ہوئی تو شکر کا کلمہ پڑھا۔ اب اکیلا گھر تھا اور یہ حکمراں۔ وہ سب اسٹیشن پر پہنچے۔ ڈپٹی

صاحب نے بیگم کو ویٹنگ روم میں صوفے پر لٹایا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔ رشید الملک ٹکٹ لینے باہر گئے۔ اِس وقت بیگم کے دِل کی کیفیت کا اندازہ مشکل تھا۔ حسرت و مایوسی کی گھٹا اِن پر چھا رہی تھی۔ گھر کی جدائی کے صدموں سے دِلِ ناتواں کچلا جا رہا تھا۔ بہت ضبط کرنا چاہتی تھیں مگر نہ ہوسکتا تھا۔ منہ رومال سے ڈھک لیا اور رونے لگیں۔ ڈپٹی صاحب کی بھی اِس وقت عجیب کیفیت تھی۔ بیمار بیوی کو بھیجنے اور خود ساتھ نہ چلنے سے شرمندہ ہو رہے تھے۔ چند منٹ خاموشی کے بعد آخر شرماتے ہوئے خود ہی بولے:

ڈپٹی: ''اِس قدر جلد تمہارا جانا ہوگیا کہ میں ساتھ نہ جاسکا۔ میں سخت پریشان ہوں۔ جاتے ہی اپنی خیریت کا تار بھیجنا اور میں بھی کوشش کرکے بہت جلد پہنچوں گا۔''

بیگم کچھ جواب نہ دینے پائی تھیں کہ رشید الملک نے اطلاع دی کہ گاڑی آگئی ہے۔ چلئے ڈپٹی صاحب نے بیگم کو پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا اور رشید الملک فضل الرحمٰن کو لے کر آبیٹھے۔ چونکہ سیکنڈ کا پورا درجہ لیا تھا گلاب و چھیا بھی یہیں بیٹھیں۔ ٹرین چل پڑی اور ڈپٹی صاحب خدا حافظ کہتے ہوئے اُتر آئے۔ گھر پہنچے تو منشی نے ایک بند لفافہ دیا جس کو وہ باہر ہی پڑھنے لگے:

رُقعہ

رُخصت اے صاحبِ من ہم تو سفر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

آہ! یہ کیا آفت ہے مجھے اپنی زندگی میں اس کے آنے کی اُمید نہ تھی۔ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ سوائے موت کے اور کوئی مجھے اِس گھر سے جدا نہیں کرسکتا مگر آہ میرا خیال غلط نکلا۔ مجھ پر وہ گزری کہ خدا میرے دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ میں گھر سے جاتی ہوں اور کس حالت میں جاتی ہوں اور کس نے بخوشی جانے کی اجازت دے دی ہے؟ اِن خیالات سے دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ میں ایک بار پیشتر

بھی علاج کے لئے آ گرے گئی تھی تو آپ تین ماہ کی رخصت حاصل کر کے میرے ساتھ گئے تھے۔ میرے بھائی لینے آئے تھے اور آپ نے اپنے بغیر مجھے نہ جانے دیا تھا اور آج چھوٹے رشید کے صرف ایک بار کہنے سے آپ نے مجھے اُس کے حوالے کر دیا۔ کیوں نہ کرتے۔ میں ایک بوجھ تھی جو سر سے اُتر گیا۔ آہ مجھے اس وقت موت کیوں نہ آ گئی؟ جس وقت آپ نے مجھ سے بے پروائی اختیار کی۔ اِس ڈیڑھ سال کے عرصے میں جو جو ظلم و ستم مجھ پر ہوئے۔ میں نے نہایت صبر سے برداشت کئے اور آپ کے روبرو حرف شکایت زبان پر نہ لائی مگر افسوس کہ آپ کشیدہ ہی ہوتے گئے، بلا میرا کوئی قصور ثابت کئے۔ مجھے ارمان رہا کہ کبھی تو کچھ کہیں مگر آپ نے ایک دن بھی میری شکایت مجھ سے نہ کی جس سے میں معلوم کر سکتی کہ یہ بات آپ کو ناگوار گزری ہے اور یہ میں بخوبی جانتی ہوں کہ میرے خلاف بہت کچھ آپ کے گوش گزار ہوا ہوگا جس سے آپ کا دل مکدر ہو گیا۔ خیر جس طرح بھی تھا۔ میں ابھی اور گزارتی لیکن بیماری نے فیصلہ کر دیا اور اب اُمید ہے کہ آپ سے رُخصت کے بعد بہت جلد اِسی علالت میں دُنیا ہی سے رخصت ہو جاؤں گی اور میں اسی لئے اس وقت یہ عریضہ لکھ رہی ہوں۔ نہ بیٹھ سکتی ہوں نہ قلم پکڑا جاتا ہے مگر چونکہ آپ سے بات کرنے کا وقت ملنے کی اُمید نہیں۔ اِس لئے چند سطریں لکھنا ضروری سمجھتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں بیمار ہوں اور اِس دفعہ کی علالت میں میرے دِل کا زور کچھ اِس قدر گھٹا ہوا ہے جس سے مجھے اپنے صحت پانے کی اُمید نہیں۔ اس خیال سے نہایت عاجزی سے التجا ہے کہ آپ کے دِل میں میری جانب سے جس قدر بھی رنج اور افسوس ہے للہ مجھ پر رحم کر کے وہ ہٹا دیں اور مجھ بدنصیب کو بالکل بے قصور سمجھیں۔ دُوسرے یہ کہ جب میری موت

کی اطلاع ملے تو صرف دو دن کو آگرے میں چلے آنا۔

تم جنازے پر ہمارے آکے رو لینا ضرور
دشمنوں کو بعد مرنے کے نہ ہنسوانا ہمیں

تاکہ زمانے پر ظاہر نہ ہو کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں اور ایک اِس خیال سے بھی اُس وقت آپ کا ہونا ضروری جانتی ہوں کہ میرے نازوں کے پالے بچے کا بہت برا حال ہوگا۔ اُس کو اِس وقت گھر سے جانے کا بھی بہت رنج ہے ورنہ بچے سفر سے بہت خوش ہوا کرتے ہیں تو جس وقت میں بھی نہ ہوئی اس کا کیا حال ہوگا؟ اگر آپ پہنچ جائیں گے تو وہ ذرا سنبھل جائے گا اور پھر شاید یہ جھگڑا ہو کہ آپ اُس کو اپنے ہمراہ پنڈی لانا چاہیں گے اور اس کے ماموں اپنے پاس رکھنا تو میری یہ خواہش ہے کہ آپ یہ جھگڑا نہ کریں اور اپنے بچے کو "ظہور وارڈ" علی گڑھ میں بھیج دیں۔ بس یہ میری آخری خواہش ہے ورنہ اور تمام تمناؤں اور آرزوؤں کو جو آپ سے وابستہ تھیں عرصے سے دِل میں دفن کر چکی ہوں۔

افسوس دفن ہوگئے ارمان سب مرے
وہ آرزوئے دِل کا بنا ہے مزارِ دل

آہ چھ بج گئے۔

ہوتا ہے دم بدم میں فزوں انتشارِ دل
چھپتی ہے مجھ سے صورت صبر و قرارِ دل

ہائے اِس گھر میں صرف چند گھنٹے کی مہمان ہوں۔

وقتِ رخصت کا مرے جوں جوں قریب آتا ہے
دِل مرا پہلو میں خوں ہو کے بہا جاتا ہے

آپ کی مسافرِ منتظرِ اجل
بدنصیب سلطنت

خط ختم کر کے جیب میں رکھ لیا اور تھوڑی دیر کو سر پکڑ کر وہیں، بیٹھ گئے۔ آخر دس سالہ رفیق تھی کچھ تو خیال ہونا چاہیے تھا مگر کیسا خیال اور کس کی محبت۔ گل جان بلا کر لے گئی۔ اندر جا کر سب بھول گئے۔ بڑی خوشی سے زندگی گزرنے لگی۔ زرّیں نے سب کچھ بھلا دیا۔ بیگم کے بعد تو دن عید رات شب برات ہوگئی آگرے جانا تو کیا۔ کبھی بیگم کے بلانے کا خیال نہ آیا خدا بچے ایسے سنگ دلوں سے۔

فصل یازدہم

کبھی جی چاہتا ہے منہ چھپا کر روئیے پہروں
طبیعت خود بخود ایسی مری مغموم رہتی ہے

آگرے پہنچ کر بیگم کی بیماری نے بہت زور پکڑا۔ دو ماہ سخت بیمار رہیں۔ ان کے بھائیوں نے علاج میں کوئی دقیقہ اُٹھانہ رکھا۔ آگرے میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈاکٹر موجود تھے اور بھائیوں کے دلوں میں بہن کی بے انتہا محبت وقدر لیکن قسمت میں جس قدر تکلیف ہوتی ہے وہ پہنچ کر رہتی ہے۔ باوجود اس قدر علاج کے آٹھ دس ہفتے بیگم نے سخت تکلیف اُٹھائی۔ مگر اس کے بعد سے افاقہ ہونے لگا اور رفتہ رفتہ ایک ماہ میں تندرستوں کی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں لیکن کمزور بہت ہوگئی تھیں۔ مگر آفریں ہے ڈپٹی صاحب کے دِل پر کہ آنا تو آنا خط تک بھی نہ بھیجا۔ یہاں پہنچ کر رشید الملک نے فضل الرحمٰن کی طرف سے تار دے دیا پھر کسی نے کچھ نہ لکھا۔ پنڈی سے بھی فضل الرحمٰن کی طرف تار آئے اور جب جواب نہ گیا تو اُدھر سے بھی خاموشی ہوگئی۔ جب بیگم کی طبیعت کچھ درست ہوگئی تو اُنہوں نے خود دو ایک خط لکھے لیکن جواب نہ پاکر وہ بھی خاموش ہوگئیں۔ بہن بھاوجیں اِن کا دِل بہلانے اور خوش رکھنے کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اکثر اوقات دونوں بھائی اِن کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ باغوں میں سیر کرنے لے جاتے تھے۔ اِن کی بیویاں اکثر سہیلیوں کو ہر وقت گھر میں جمع رکھتی تھیں۔

میاں رشید الملک کا دِل بھی اب علی گڑھ نہ لگتا تھا۔ وہ بھی ایک ایک دو دو دِن کے لئے

بہت جلد جلد آتے رہتے تھے مگر اُس رنجیدہ دِل کو تو خدا ہی خوش کر سکتا تھا۔ تاہم ان سب کو خوش کرنے کے خیال سے وہ ظاہراً خوش رہتی تھیں۔ تمکنت آرا نے تو اپنے گھر رہنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا جس دن سے بہن آئی تھیں۔ وہ بھی یہیں تھیں اور رشید الملک بھی آتے تو یہیں ٹھہرتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے صبح کے چار بجے ہوں گے۔ سب ابھی اپنے اپنے بستروں میں سو رہے تھے۔ تمکنت بھی باجی کے کمرے میں سوتی تھیں۔ یہ تو ابھی نہ اٹھی تھیں لیکن بیگم کی آنکھ کھل گئی تھی اور انہوں نے رسالہ مخزن ہاتھ میں لے لیا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

سلطنت آرا: ''گلاب گلاب۔ دیکھنا کون ہے۔ دروازہ کھولو۔ اب تو دِن ہو گا۔''

آواز: ''جلد کھولئے۔ دِن نہیں۔ میں ہوں۔''

سلطنت آرا: ''ارے رشید آ گئے۔ تمکنت! اُٹھو۔ دروازہ کھولو۔ گلاب تو جاگتی ہی نہیں۔''

آواز: ''خدا کے واسطے جلد کھولئے۔ میں سردی سے کانپ رہا ہوں۔''

اب تو اِن سے نہ لیٹا گیا اور فوراً جا کر دروازہ کھول دیا اور رشید الملک اندر داخل ہوئے اور سلام کے بعد کہا:

رشید الملک: ''دیکھئے باجی! مثل برف کے میرے ہاتھ سرد ہو رہے ہیں حالانکہ اوورکوٹ پہنے ہوں لیکن ایسا ہی تمام جسم سرد ہے۔''

انہوں نے جلدی سے رگ میں لپیٹ کر بھائی کو پلنگ پر بٹھا لیا اور اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کرنے لگیں اور گلاب نے انگیٹھی گرم کی۔ گھر میں ان کے آنے کی اطلاع ہوئی اور مامائیں ناشتہ تیار کرنے لگیں اور چھوٹے بھائی محمود علی تو ان کی خبر سنتے ہی بغیر منہ دھوئے کمبل اوڑھے کمرے سے نکل آئے اور چھوٹی بہن تمکنت آرا کے پاس آ کر لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر میں یکے بعد دیگرے سب ہی جمع ہو گئے اور چائے اسی جگہ پی۔ اثناء گفتگو میں رشید الملک نے کہا:

رشید الملک: ''باجی ایک عرض ہے۔ اگر منظور ہو۔''

محمود علی: ''کہئے۔ منظور ہو گی۔''

رشید الملک: ''آپ سے تو نہیں کہتا۔ باجی کہیں۔''

سلطنت آرا: "کہو تو سہی۔"

رشید الملک: "آپ نے ابھی وہ مکان نہیں دیکھا۔"

سلطنت آرا: "کون سا مکان؟"

رشید الملک: (آہستہ) "تمکنت منزل"۔

سلطنت آرا: "تمکنت منزل کہاں ہے۔ مجھے تو کسی نے نہیں دِکھائی؟ یہ سنا ہے کہ تم نے رشید منزل تعمیر کرائی ہے۔"

رشید الملک: "اُسی کو کہتا ہوں۔ شاید آپ نے تو نہیں دیکھی۔"

سلطنت آرا: "افسوس کہ میں اب تک نہیں دیکھ سکی۔ تین ماہ تو بیماری میں گزر گئے۔ اب جانا ہی چاہتی تھی مگر تمہارا انتظار تھا کہ آجاؤ اور خود ہی دکھاؤ۔ سنا ہے بہت خوشنما عمارت ہے۔"

رشید الملک: "تو آج تشریف لے چلئے نا اور بھابی صاحبان بھی تکلیف کریں۔"

بیگم حامد علی: "بہت اچھا۔ سب چلیں گے۔"

محمود علی: "تو گھر خالی کر جائیں گی۔ ہمارا جی گھبرائے گا۔"

سلطنت آرا: "تم بھی ساتھ چلنا"۔

بیگم محمد علی: "نہیں بھائی ہم نہ جائیں گے۔ کوئی ہماری دعوت تھوڑے ہی ہے۔ ہمیں طفیلیوں میں جانا پسند نہیں۔"

بیگم حامد علی: "کیوں دُلہن! تم دعوت نہیں لے چکیں؟ کوٹھی کے افتتاحی جلسے میں تو تمہیں کارکن تھیں۔ اب باجی جان کی دعوت ہے۔ تمہیں بھی اِس خوشی میں شریک ہونا چاہئے۔"

مسٹر حامد علی: "بھئی ہماری طرف سے اجازت ہے۔ سب کو لے جایئے۔ آگے ہمشیرہ کی رائے۔"

اتنا کہہ کر بڑے بھائی تو چلے گئے۔ اب تو رشید کی زبان کھلی چونکہ وہ بڑے بھائی کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اِس لئے بہت ڈر ڈر کر بول رہے تھے۔ منجھلے بھائی مسٹر محمد علی اِس وقت یہاں موجود نہ تھے اور محمود علی بیچارے کی کسی کو پروا نہ تھی کیوں کہ تمکنت آرا اور

رشید الملک دونوں سے چھوٹا تھا اور باوجود اس کم سنی میں عقل مند و آزاد خیال ہونے کے مزاج میں ذرا بچپن بھی تھا۔

سلطنت آرا: ''میں خوشی سے اسی وقت چلنے کو تیار ہوں۔ اس سے زیادہ میرے لئے اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ اپنے پیارے ننھے بھائی رشید کا اپنا بنایا ہوا مکان دیکھوں۔''

رشید الملک: (افسردگی سے) ''آہ پوری خوشی تو تب ہوتی۔''

اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔ میاں سے یہ سن کر تمکنت آرا آبدیدہ ہو گئیں اور خیال بدلنے کے لئے بیگم محمود علی نے کہا:

بیگم محمود علی: ''ہاں تو بھائی جان مجھے بھی لے چلئے گا؟''

رشید الملک: ''ہاں تمہارا لے جانا تو بہت ضروری ہے چونکہ مکان اکیلا ہے۔ میاں محمود گھر رہیں گے۔''

محمود علی: ''نہیں جناب! میں آپ سب سے پہلے پہنچوں گا۔''

محمود علی نے ایسا ہی کیا۔ فوراً اپنے کمرے میں جا کپڑے پہن اور بائیسکل پر سوار ہو رشید منزل پہنچے۔ پھر رشید الملک نے کہا:

رشید الملک: ''باجی جان! فٹن تیار کراؤں؟''

سلطنت آرا: ''بہت اچھا۔''

بیگم حامد علی: ''تو کیا سب کو اسی وقت لے چلو گے؟''

رشید الملک: ''جی ہاں۔''

بیگم حامد علی: ''میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ باجی جان اور بہن تمکنت اب چلی جاتیں اور ہم سہ پہر کو آتے۔''

تمکنت آرا: ''بھائی جان! میرا ارادہ ہے کہ آج شام کو ایک بڑا کھانا کر دوں۔ اس لئے صبح ہی میرا جانا ضروری ہے کیوں کہ خانساماں وغیرہ میری مرضی کے موافق انتظام نہ کریں گے۔''

بیگم حامد علی: ''اسی لئے تو کہتی ہوں کہ تم ابھی جاؤ اور رات کے کھانے کا

انتظام کرلو۔ دوپہر کا کھانا یہاں سے چلا جائے گا کیوں کہ اِس قدر جلد وہاں پہنچ کر تیار کرنے میں دقت ہوگی۔ نو تو اب بج گئے اگر تمہاری یہی خوشی ہے کہ سب ساتھ چلیں تو بہت بہتر۔ ہم بھی تیار ہیں۔ کھانا پیچھے بی سلطانی بھیج دیں گی۔"

رشید الملک: "بھابی جان اب کھانے وغیرہ کے حکم دینے میں یہیں دیر کریں گی۔ وہیں خانساماں تیار کرلیتا۔"

بیگم حامد علی: مجھے حکم نہیں دینا۔ کھانا پک رہا ہے۔ صرف دلہنوں کو کپڑے بدلنے ہیں۔

تمکنت آرا: "اور آپ نہ بدلیں گی۔"

بیگم حامد علی: "کاہے کے لئے۔ یہی اچھے ہیں (دیورانیوں سے) اُٹھو جلدی۔ دونوں تیار ہو آؤ۔"

تمکنت آرا: "نہیں بھابی جان! آپ بھی کپڑے بدل ڈالیں ورنہ ایک جوڑا ساتھ لے لیں۔ ویسے تو کوئی ضرورت نہ تھی لیکن چند ملنے والیاں شام کو آئیں گی۔ یہ خیال ہے۔"

تمکنت کے کہنے سے تینوں بھاوجوں نے سنگھار کیا اور باجی کا جوڑا چپکے سے نکال کر تمکنت آرا نے ساتھ لے لیا۔ ٹھیک دس بجے یہاں سے روانہ ہو کر گیارہ بجے گاڑیاں رشید منزل پہنچیں کیوں کہ ان کی کوٹھی شہر سے باہر بہت فاصلے پر تھی۔ پھاٹک پر میاں محمود علی کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی زور سے کہا:

محمود: "ویلکم ویلکم۔"

پھر یہ دونوں بھائی اُتروا کر سب کو اندر لے گئے۔ رشید الملک نے تو اپنی باجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سب سے پہلے گول کمرے میں لائے اور آرام کرسی پر بٹھا دیا۔

سلطنت آرا: "میں بیٹھتی نہیں۔ چلو میرے ساتھ اور اپنا ہر ایک کمرہ دکھاؤ۔"

وہ کھڑے ہوگئے اور ساتھ ساتھ پھر کر دکھانے لگے۔ باجی ہر ایک چیز کی تعریف کرتی رہیں۔ بیچ بیچ میں مذاق کرتی اور چھیڑتی بھی جاتی تھیں۔ مثلاً ڈائننگ روم میں پہنچیں تو پوچھا کہ "بھائی! یہ کمرہ کس کام کا ہے؟ اتنی بڑی میز پر کیا کرتے ہیں؟" پھر باتھ روم میں

گئیں تو واش نیبل کو دیکھ کر کہنے لگیں۔ "یہ کیا سامان ہے۔ اتنے بڑے جگ سے کیا کام لیتے ہو؟ دودھ کے لیے تو مناسب نہیں۔" وغیرہ۔ وہ ہنستے جاتے تھے اور نہایت خوشی سے ایسے ہی مذاقیہ جواب دیتے تھے مگر دل اس وقت اِن دونوں میاں بیوی کے نہایت افسردہ تھے۔ ڈپٹی صاحب کا اِس موقع پر موجود نہ ہونا انہیں بری طرح ستا رہا تھا لیکن بہن کے رنج کے خیال سے منہ سے کچھ نہ نکالتے تھے۔ جب ان کا یہ حال تھا تو اُس برباد شدہ کی طبیعت پر جو گزرتی ہوگی اُس کو سوائے خدا کے کون جان سکتا ہے اور یہ تو قدرتی طور پر طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ رنج اور خوشی کے موقع پر اپنا بچھڑا ہوا عزیز بہت یاد آتا ہے۔ خواہ زندہ جدا ہو گیا ہو یا مر کے۔ مگر بیگم نے اس خیال سے ذرا اپنی رنجیدہ حالت ان پر ظاہر نہ ہونے دی کہ ان لوگوں کی خوشی میں کمی آئے گی۔

یہ ابھی دیکھ بھال ہی رہے تھے کہ حامد منزل سے کھانا آگیا اور تمکنت آرا نے خود جا کر پری چہرہ (کنیز) سے میز پر چنوایا۔ سب نے مل کر کھایا۔ اِس کے بعد رات کو کھانے کی بابت مشورہ ہوا۔ بیگم محمود علی نے دعوتی رُقعے لکھے اور کھانے کا انتظام کیا۔ چار بجے کے قریب سب نے منہ ہاتھ دھو کر بال وغیرہ درست کئے اور تمکنت آرا نے بہن کو بھی کپڑے بدلوائے۔ عنابی کمخواب کا غرارہ اور سبز مخمل کی قمیص پہنائی اور سب نے تو باریک دوپٹے اوڑھے مگر کمزوری کے خیال سے اُنہیں سلمہ ستارے کی کام دار شال اُڑھائی۔ اور خود بیگم رشید الملک صاحبہ نے آتشی گلابی رنگ کی بڑی بیش قیمت بنارسی ساڑھی باندھی۔

چھ بجے سے مہمان بیگمات اور لیڈیز آنی شروع ہو گئیں۔ بیگم محمود علی برآمدے میں اِن سب کا استقبال کرتی تھیں اور ڈائننگ روم میں سب جمع ہو گئے۔ چونکہ مسٹر محمود و رشید الملک کو کھانے پر شریک رکھنا تھا۔ اس واسطے غیر بیگمات مدعو نہ کی گئی تھیں۔ بس ہندوستانی بیگمات تو رشتہ دار ہی تھیں۔ باقی پندرہ بیس یورپین لیڈیز تھیں۔ سات بجے سے نو بجے تک کھانا ختم ہوا۔ پھر سب بات چیت کے علاوہ باجے وغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور سب سے پہلے تمکنت آرا سے فرمائش کی گئی۔

بیگم رشید الملک: "مجھے تو آج معاف ہی رکھا جاتا تو مہربانی ہوتی۔"

خورشید طلعت: "نہیں جناب! آج آپ معاف نہ رکھی جاسکیں گی۔"

مس جانسن: "مسز رشید الملک! آپ چونکہ صاحب خانہ ہیں۔ آپ کو اپنے مہمانوں کی ہر طرح کی خاطر کرنا فرض ہے۔"

فلک آرا: "ہاں یہ بھی تو دعوت ہی میں شمار ہوگا۔"

بیگم رشید الملک: "مجھے آپ سب کی خاطر بسر و چشم منظور لیکن مجبور ہوں کہ اس وقت کچھ بھی یاد نہیں۔ میرے عوض میری چھوٹی بھاوج آپ کی فرمائش کو پورا کریں گی۔ دلہن ذرا اٹھو تو۔"

بیگم محمود: "بہت خوب۔ لیکن اس بات کا اقرار کرو کہ بہن مہر طلعت جب نکتہ چینی کریں اور مجھے چھیڑیں تو آپ ان کو روکیں گی کیوں کہ ان کی عادت ہے ایسے موقع پر مجھے چھیڑنے کی۔"

بیگم رشید: "اطمینان رکھو۔ وہ آج کچھ نہ کہیں گی۔"

مہر طلعت: "لیجئے بھابی صاحبہ! میں اپنی زبان بند کیے لیتی ہوں۔"

بیگم محمود اپنی جگہ سے اُٹھ کر باجے پر جا بیٹھیں اور شروع کیا:

بیگم محمود:

درد دل گاہ تو گہ درد جگر ہوتا ہے
تیرا بیمار اِدھر ہے نہ اُدھر ہوتا ہے
دل میں پھر حسرت و ارماں کا گزر ہوتا ہے
تو پھر آباد یہ اُجڑا ہوا گھر ہوتا ہے

مہر طلعت: "سبحان اللہ کیا کہنا۔"

بیگم رشید: (اشارے سے) خاموش۔"

بیگم محمود:

کیجئے بزم میں غیروں سے اشارے نہ حضور
ٹکڑے ٹکڑے انہیں باتوں سے جگر ہوتا ہے

بیگم رشید: "خدا نہ کرے"۔

بیگم محمود: (تمکنت آرا کو دیکھ کر)

دل پریشاں ہے مرا تم جو مخاطب ہو اُدھر
سچ کہا ہے کہ محبت میں اثر ہوتا ہے

بیگم رشید: "برا نہ مانو۔میں کسی سے مخاطب نہیں ہوں۔(پھر مہر طلعت سے نہایت آہستہ) بیچاری کو گھبراہٹ ہے کہ کہیں تم کچھ بول نہ پڑو۔"

بیگم محمود:۔

کون ہے آپ کا شاکی ذرا معلوم کریں
کس کے نالوں سے جہاں زیر و زبر ہوتا ہے
وہ چمکتے ہیں ستارے بھی چراغوں کی طرح
تم سے رخصت کوئی اب خستہ جگر ہوتا ہے

اور اپنی سند تمکنت آرا کو دیکھ کر۔

رخصت اب آپ سے یہ خستہ جگر ہوتا ہے

اِس مصرع کو دُہرا کر فوراً ہی کھڑی ہو گئیں۔

مہر طلعت: "کیا گھر چلنے لگیں؟"

بیگم رشید: "جاتی کہاں ہیں۔ابھی تو آپ کی گوہر افشانی ہوگی۔پھر سب ساتھ ہی چلیں گے۔"

مہر طلعت: "اچھا تو مجھ پر یہ بار پڑتا ہے۔مجھے تو کچھ بھی نہیں سوجھتا کہ کیا کہوں گی؟"

بیگم محمود: "ہم تو آج ضرور سنیں گے۔خواہ کسی کو گالیاں ہی دے ڈالو۔"

مہر طلعت: "اِس وقت سب بڑے ہی موجود ہیں۔مجھ سے ایک آپ ہی چھوٹی ہیں۔اِس کے لئے بھی آپ ہی کو تیار رہنا پڑے گا۔اچھا سنئے"۔

باجے پر۔

کہیں گے آج کیا ہم، تم سنو گے کیا لگی دل کی؟
اجی رہنے دو بس ہم نے کہی، تم نے سنی دل کی

بیگم محمود کی طرف اشارہ کر کے۔

نشانہ تیر مژگاں کا بنایا کس لئے ظالم؟
قصور آخر کوئی دل کا خطا آخر کوئی دل کی
سنا دے ان بتانِ سنگ دل کو داستاں ساری
حقیقت جانتا ہے تو ہی اے دردِ نہاں دل کی

بیگم محمود: "ہاں ہاں سنا دے ہم ضرور سنیں گے۔"

مہر طلعت:

اگر قطع و برید اپنی زبان و لب کی تم چاہو
تو سن لو داستاں تھوڑی بہت اے راز داں دل کی

بیگم محمود: "کہئے کہئے۔ میرا سینہ رازہائے دوستاں کا گنجینہ ہے۔"

مہر طلعت:

نہ کہہ جاؤں کہیں ناگفتنی میں باتوں باتوں میں
نہ کھلواؤ زباں میری نہ پوچھو داستاں دل کی

یہ شعر ختم کیا اور رخصتی ہوئی وہاں سے بیگم رشید کے پاس آبیٹھیں۔

بیگم رشید: "ہم منتظر ہی رہے۔ آپ نے کچھ بھی نہ سنایا۔"

مہر طلعت: "اب آپ کی باری ہے۔ مجھے تو اسی قدر یاد تھا۔"

بیگم رشید: "میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھے آج رہنے دو۔ میرا دل بالکل نہیں چاہتا اور کچھ یاد نہیں۔"

مس ولیم: "بھئی! ہم تو ضرور آپ سے کچھ سنیں گے۔ خواہ رات کتنی ہی آجائے۔"

خورشید طلعت: "بھابی جان! بھلا ہم آپ کو چھوڑ سکتے ہیں؟"

رشید الملک: "صاحبان! آپ ان کو مجبور نہ کریں۔ میں جو حاضر ہوں اور صاحب خانہ کا تابعدار ہونے کی وجہ سے آپ سب کی خاطر کرنا میرا بھی فرض ہے اگر اجازت ہو تو میں بیگم رشید کے عوض آپ کی فرمائش پوری کروں۔"

مس الیگزینڈر: "اوہو۔ بہت شوق سے۔ ہم تو سننا مانگتے ہیں۔ صاحب

خانہ ہوں یا اُن کے فرماں بردار۔"

مہر طلعت: "مگر بھائی جان! باجی صاحبہ کی طرح باریک آواز رکھنا۔ ہم بھاری آواز نہ سنیں گے۔"

رشید الملک: "تمہیں سناتا ہی کون ہے؟ میں تو مس جانسن اور مسٹر بلانشی (مس الیگزنڈر) کی خوشی پوری کرتا ہوں۔"

مہر طلعت: "اچھا تو میں کمرے سے چلی جاؤں یا کانوں پر ہاتھ رکھ لوں؟

رشید الملک نے کہا۔ "جو جی چاہے کرو۔" اور خود اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان سب سے بہت دُور کونے میں جو پیانو رکھا تھا وہاں جا بیٹھے۔

مہر طلعت بیگم رشید الملک کی چچازاد بہن چنچل مزاج لڑکی تھی۔ وہ وہاں بھی اُن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ رشید الملک اس وقت کچھ بہت ہی افسردہ دِل تھے۔

گو مہمانوں کی خوشی کے خیال سے ہنستے بولتے رہے لیکن باجی کے رنج کا کانٹا ان کے دل ہی میں کھٹک رہا تھا۔ مہر کو ہٹا کر بجانا شروع کیا۔ شعر بھی یاد آئے تو یہ۔

گل بھی وہی ہیں موسمِ گل کی بو وہی
ہے شاید بہار کی دل کش ادا وہی
اٹھکھیلیاں وہی ہیں نسیمِ بہار کی
چلتی ہے جھوم جھوم کے بادِ صبا وہی
بلبل ہے اب بھی شاخِ چمن پر ترانہ سنج
قمری کنارِ جُو ہے ترانہ سرا وہی
اب بھی وہی پپیہے کے نالوں میں ہے اثر
اور "پی کہاں" کا نالہ ہے سوزش فزا وہی

مہر طلعت: "یہ کیا رونا لے بیٹھے؟"

خورشید طلعت: "توبہ چپ بھی کرو۔"

بیگم محمود: "جیسا آج کا دن ہو رہا ہے ویسے ہی شعر بھی نکالے ہیں۔ تمہاری سی خوش دِلی کوئی کہاں سے لائے۔"

سلطنت آرا: ”ہاں بھائی! پورا کرو۔ انہیں بکنے دو۔“

رشید الملک:

اُٹھتی جگر میں ہوک ہے کوئل کی کوک سے
نالے وہی ہیں درد بھری ہے صدا وہی
سامان سارے اگلے سے موجود ہیں مگر
دل جس کو ڈھونڈتا ہے نہیں ہے وفا وہی

مکرر

سامان سارے اگلے سے موجود ہیں مگر
دِل جس کو ڈھونڈتا ہے، نہیں ہے وفا وہی

اس شعر پر سب ہی آب دیدہ ہو گئے۔ اور رشید الملک تو دوبارہ ادا کرتے ہی فوراً کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب رات بھی زیادہ آ گئی تھی۔ مہمان رخصت ہوئے۔

چونکہ رشید الملک کو صبح ہی علی گڑھ چلا جانا تھا۔ اس لئے سب ہی حامد منزل آ گئے اور باقی حصہ رات کا رشید الملک نے باجی سے باتیں کر کے گزار دیا اور صبح علی گڑھ روانہ ہوئے۔ سلطنت آرا بیگم ان سب کی بے انتہا خاطر و محبت کے خیال سے دل پر جبر کر کے بولتی چالتی رہتی تھیں مگر دل یہی چاہتا تھا کہ بالکل تنہائی ہو اور دِل کھول کر روتا۔

فصل دوازدہم

ایسی پڑی کہ آپ بھی حیران ہو گئے
اپنے کئے پہ خود ہی پشیمان ہو گئے

صبح کے دس بجے ہوں گے۔ کمرے میں ڈپٹی صاحب پلنگ پر پڑے ہیں۔ ابھی ڈاکٹر صاحب دیکھ کر باہر گئے ہیں۔ اُن کے نکلتے ہی زرّیں جان دُوسرے کمرے سے نکل آئی اور پلنگ کے قریب کرسی کر کے بیٹھ گئی۔ ڈپٹی صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا:

زرّیں جان: ''کیوں میاں جی! آج ڈاکٹر صاحب کیا کہتے تھے؟ زخم کی کیا حالت ہے؟''

ڈپٹی: ''وہی حالت ہے۔ ڈاکٹر بیچارہ خود پریشان ہے۔ دو ماہ ہو گئے۔ کچھ آرام نہیں ہوتا۔ آج وہ کہتے تھے کہ تین ماہ کی رخصت اور حاصل کر کے علاج کے لئے لاہور چلے جاؤ۔ میں حیران ہوں کہ لاہور کس طرح جاؤں؟ گھر کا کیا بندوبست کروں اور روپے کا کیا انتظام ہو۔ کتنا عرصہ ہوا پلنگ پر پڑے۔ اب اِس قدر کہاں سے آئے کہ تمہیں بھی دُوں گھر کے لئے اور علاج کے لئے سینکڑوں روپیہ ماہوار چاہئے۔''

زرّیں جان: ''تمہارا روپیہ کچھ بینک میں جمع نہیں ہے۔ آخر چودہ پندرہ سال سے نوکری کر رہے ہو۔''

ڈپٹی: ''بے شک بینک میں کچھ روپیہ ہے لیکن اُس پر مجھے کچھ اختیار نہیں۔ پہلے میرے پاس جس قدر تھا وہ شادی پر خرچ ہوا۔ اس کے بعد بیگم نے میری دس سالہ

رفاقت کے عرصے میں اخراجات خانگی سے قریب دس ہزار کے پس انداز کیا جو برخوردار فضل الرحمٰن کے نام جمع ہے جس سے مجھے کچھ واسطہ نہیں ہے اور اس عرصے میں کچھ بچ ہی نہ سکا۔ تعجب ہے کہ اب اخراجات خانگی کیوں اس قدر بڑھ گئے ہیں۔ گذشتہ دس سال میں تو بیگم صاحبہ نے دس ہزار بچالیا حالانکہ تب میری تنخواہ بھی کم تھی۔ شروع میں تو ڈھائی سو ہی تھے پھر چار سو ہو گئے تھے اور اب تو پانسو ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس سال تنخواہ بڑھی اُسی سال تم آئیں۔"

زرّیں جان : (چیں بہ جبیں ہو کر) "بے شک تنخواہ تو بڑھی لیکن میرے ہاتھ میں تو پان پان سو صرف دو ہی مہینے آئے۔ پھر آپ کی بیگم صاحبہ تشریف لے آئیں اور تنخواہ آدھی ہو گئی۔"

ڈپٹی: "تنخواہ آدھی ہو گئی تو خرچ بھی تو آدھا ہو گیا تھا اور یہ حساب شاید دس گیارہ ماہ ہی رہا۔ اب سال بھر سے سب کچھ تمہیں ہی ملتا ہے۔ اس عرصے میں آگرے تو میں نے ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا ورنہ پہلے جب وہ وہاں جایا کرتی تھیں تو میں صرف پچاس روپے اپنے گزارے کے لئے رکھ کر باقی اُن کو بھیج دیا کرتا تھا۔ اب تو حیران ہوں کہ کیا ہوتا ہے۔ پورا ہی نہیں پڑتا۔"

زرّیں: (بہت بگڑ کر) "تو اب میں کچھ کر ڈالتی ہوں۔"

ڈپٹی: "مَیں یہ تو نہیں کہتا۔ کوئی بیوی بھی اپنا نقصان کرنا چاہتی ہے؟ لیکن اخراجات خانگی کا پورا کرنا تو واجبی ہوتا ہے۔ آج کل کچھ اخراجات ہی ایسے بڑھ گئے ہیں کہ گزر نہیں ہوتی۔"

زرّیں جان: "میاں جی خدا شاہد ہے اور مجھے آپ ہی کی قسم جو جھوٹ کہوں۔ نہ تو میں بے پروائی سے فضول خرچی کرتی ہوں نہ کچھ بچاتی ہوں اور آپ سے بچا کر کہاں لے جاؤں گی اولاد بھی تو خدا نے نہیں دی جس کے لئے طمع ہو۔ کاش اِس وقت میرے پاس کچھ جمع ہوتا جو نکال کر قدموں پر رکھ دیتی۔"

ڈپٹی: "توبہ۔ توبہ۔ تمہارے بھی کیسے خیالات ہیں۔ بھلا میں تم پر ایسا شبہ کر سکتا ہوں۔ اِسی خیال سے میں نے کہا تھا کہ اگر اس وقت تمہارے پاس کچھ جمع ہوتا تو یہ

حیرانی نہ ہوتی کیوں کہ میری کوئی جائداد تو ہے ہی نہیں جو تھی یہی ملازمت تھی۔ اب کئی مہینے سے بے کار پڑا ہوں اور ابھی نہ معلوم کب تک کام کرنے کے قابل ہوں کیوں کہ زخم کی ردی حالت ہے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کو بھی تشویش ہے اور فوراً سب لاہور جانے کی صلاح دیتے ہیں اگر آگرے والے مجھ سے ناراض نہ ہوتے اور پھر یہ مصیبت پڑتی تو کچھ پرواہ نہ تھی۔ آرام سے دن کٹ جاتے یا خیر بیگم ہی یہاں ہوتیں تو تب بھی اس قدر فکر نہ ہوتی۔ وہ ہر طرح ہماری مدد کرتیں۔ اب تو ان سب سے سخت شرمندہ ہوں۔ کسی سے مدد نہیں مانگ سکتا۔"

زرّیں جان: "اب بھی تم اتنی فکر نہ کرو۔ خدا مالک ہے۔ اللہ وہ وقت نہ لائے کہ ہمیں کسی سے مدد مانگنی پڑے۔ میرا زیور موجود ہے۔ اس کو فروخت کریں۔ تین چار ہزار روپیہ مل ہی جائے گا۔ علاج کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔"

ڈپٹی: "میری زندگی میں خدا وہ وقت نہ لائے کہ تمہارا زیور فروخت ہو۔"

زرّیں جان: (باہر سے آکر) "سرکار تحصیلدار صاحب آئے ہیں۔ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

زرّیں: "تو یہ دیکھنے والے کسی وقت دم ہی نہیں لیتے۔ ایک جاتا ہے ایک آتا ہے۔"

ڈپٹی: "خیر اس وقت تو پردہ کر لو۔ وہ ضرور دیکھیں گے۔"

زرّیں دُوسرے کمرے میں چلی گئیں اور یہاں تحصیلدار صاحب آ گئے۔ بارہ بجے وہ گئے تو بیوی نے آکر ڈپٹی صاحب کو یخنی پلائی۔ چار بجے سے انہیں بخار ہو جایا کرتا تھا جو رات میں کم ہوتا تھا۔ صبح کے چند گھنٹے اچھے گزرتے تھے لیکن زخم کی تکلیف برابر رہتی تھی۔ بیچارے سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے جو روپیہ آتا تھا وہ دس دن میں بیوی کے ہاتھوں اُڑ جاتا تھا۔ اس فکر میں تھے کہ کہیں سے قرض لے کر لاہور جائیں۔ ایک رات کا ذکر ہے۔ جب کہ گیارہ بج چکے تھے۔ زرّیں اور گل جان دُوسرے کمرے میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہی تھیں۔

گل جان: "میں دیر سے یہاں بیٹھی ہوں۔ تم کیا کر رہی تھیں؟"

زرّیں: "ان کا سر دبا رہی تھی۔ جب دیکھ لیا کہ سو گئے تو الماس کو اُن کے پاس بٹھا کر یہاں چلی آئی ہوں۔ ہاں بتاؤ تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تم نے کچھ سوچا بھی؟

روز بروز اُن کی جو حالت ہے۔ وہ تم دیکھ ہی رہی ہو مجھے اُمید نہیں کہ اب یہ جلد اچھے ہوں اور پھر کمانے لگیں۔ ڈاکٹر بھی گھبرا گئے ہیں اور علاج کے لئے ان کا لاہور جانا ٹھہرا ہے۔ سوائے میرے زیور کے اور ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ اب یہی مناسب اور ضروری ہے کہ میں اپنا زیور علاج کے لئے اُن کے حوالے کروں۔ یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ وہ حیران ہوں اور گھر میں زیور رکھا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ مجبور ہو کر وہ مجھ سے زیور مانگ لیں گے تو پھر میں کیا کروں گی۔"

گل جان: (نہایت آہستہ) تو پھر ان کا کام ہی نہ تمام کر دیا جائے۔ بیوی مال سے پیاری تو کوئی چیز نہیں۔"

زرّیں: "اے کاہے کو وہ خود ہی پڑے ہیں، مرے کو اور مار کر کیا لینا ہے۔ پھر کہیں ہم بھی نہ بندھے بندھے پھریں۔ یہاں سے اپنا چھٹکارا ہی نہ کریں؟ یہ تو اب ہونا نہیں کہ ڈپٹی صاحب اچھے ہو کر ویسے ہی کمائیں اور ہمارے لئے کچھ بنائیں۔ پھر کیوں مفت کی مصیبت اُٹھائیں۔ میرے حال پر خدا کی مہربانی تھی کہ چور بھی آئے اور میرا ذرا نقصان نہ ہوا۔ میں نے یہ چاہا تھا کہ چوروں پر لگا دوں گی اور زیور یہیں غائب کر دیا جائے گا مگر ایسا بھی نہ ہو سکا کہ زیور کا صندوقچہ انہیں کے کمرے کی الماری میں تھا اور چوروں کے بھاگنے کے بعد ان کے منشی نے رکھا پایا خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب جو کرنا ہے جلد کرنا چاہئے کیوں کہ وہ سخت لاچار ہیں اور شام میں نے اپنے کانوں سے یہ سنا کہ منشی ان کو صلاح دے رہا تھا کہ "بیوی جی کا زیور لے کر علاج کے لئے لاہور چلو۔ تندرست ہو گئے تو خدا ہزاروں اور دے گا۔" میرے زیور کی اب خیر نہیں۔ بس کوئی ایسی ترکیب کرو کہ ہم دونوں روپوش ہو جائیں الماس کو تو یہیں چھوڑیں گے وہ اپنے گھر چلی جائے گی اور تم میری جان کے ساتھ ہو۔ جہاں سے خود کھاؤں گی۔ تمہیں بھی کھلاؤں گی۔ میرے پاس اِس وقت سات آٹھ ہزار کا اندوختہ ہے۔ پانچ ہزار کا تو زیور ہی ہوگا اور کوئی دو ہزار نقد ہے۔ کچھ ان کے چاندی کے برتن ہیں۔ خیر اِس گھر سے میری قسمت میں اتنا ہی لکھا ہوگا۔ اپنی جان ہے تو جہان ہے۔ ان کے پیچھے تو مجھے دشمن مار ڈالیں گے۔"

گل جان: "توبہ بیوی۔ اب تمہارا یہاں ایک دم کے لئے گزارہ نہیں۔ کیا

ممکن ہے کہ ڈپٹی صاحب کے سالوں کے گھر ہندوستان میں تمہارا گزارہ ہو جائے؟ ہاں یہ ہے کہ چند روز یہاں ٹھہریں تو یہ چار کوڑیاں بھی ہاتھ سے گنواؤں گی اور اس گھر سے نکلنا تو سر پر ہے۔ آج نہیں تو کل۔"

زرّیں جان: "توبہ بھلا میری وہاں گزر کہاں؟ وہی بات ہوگی کہ چلی چلی کہاں چلی۔ سوت کے پیوسال؟ بیگم کے میکے میرا کیا کام۔ وہ تو اگر ڈپٹی صاحب کے بادا بھی زندہ ہوتے تو ان کے بعد میں یہاں گزارہ نہ کرسکتی۔"

گل جان: "بس تو جلدی کرو۔ خدا نہ کرے۔ کہیں ایسا ہی نہ ہو کہ منشی کے کہنے سننے سے وہ زیور لے لیں۔"

زرّیں جان: "ہاں مجھے خود جلدی ہے۔ اچھا تو میں ابھی سب چیزیں دیکھ بھال لوں۔ ایسے میں وہ سو رہے ہیں۔ اٹھو تم بھی اپنا کپڑا لتا دیکھ لو۔"

ناظرین! اس تجویز پر جب عمل درآمد ہوا ہوگا تو بیچارے ڈپٹی صاحب پر کیا گزری ہوگی اور انہیں حالت ناتوانی میں کس قدر حیرانی و پشیمانی اور ہوئی ہوگی۔"

☆

فصل سیزدہم

میری حیات کا گل کاش اب چراغ ہوتا
اِن کاہشوں سے حاصل مجھ کو فراغ ہوتا

بیگم محمود علی: ''نہیں معلوم کیا سبب ہے۔ باجی جان صبح سے سخت پریشان و مغموم ہیں۔ آج خلافِ معمول کمرے سے باہر نہیں آئیں۔''

محمود: (افسردگی سے) ''پریشانی کیسی۔ میں نے اِس وقت ان کو روتے دیکھا ہے۔ میرا دل بہت بے چین ہے۔ مجھ سے وہ کچھ نہ کہتیں اِس لئے کچھ دریافت نہ کیا اور اِدھر آ گیا۔ تم باجی تمکنت کو بلاؤ تو معلوم ہو۔''

بیگم محمود: ''یہ خوب۔ او گلچیرہ! ذرا چھوٹی باجی جان کو بلا لا۔''

محمود علی: ''چلو ہم ہی جو اُن کے کمرے میں چلیں۔ چنانچہ یہ دونوں میاں بیوی تمکنت آرا کے پاس آئے اور یہ ذکر کیا۔

تمکنت آرا: ''میں تو چائے کے بعد سے اُن کے پاس گئی نہیں اور اُس وقت وہ کچھ زیادہ پریشان نہ تھیں۔''

محمود علی: ''چائے پر تو ہنس بول رہی تھیں۔ یہ تو کوئی دس منٹ کا ذکر ہے۔ ابھی چنبیلی نے ڈاک لا کر دی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں۔ اِس وقت کوئی پریشان کن خط آیا ہے۔ آپ ابھی ان کے پاس جائیں اور معلوم کریں۔ چونکہ دونوں بھائی جان گھر پر موجود نہیں اِس لئے مجھے زیادہ تردد ہے۔''

تمکنت آرا: ''لو میں ابھی جاتی ہوں۔'' اور بہن کے کمرے میں آئیں۔ وہ اس وقت حالتِ اضطراب میں ٹہل رہی تھیں اور آنکھوں سے رومال لگا تھا۔ تمکنت یہ نقشہ دیکھ کر بے قرار ہو گئیں اور گھبراہٹ میں کہا:

تمکنت آرا: ''پیاری باجی خدا کے لئے کچھ مجھ سے بھی کہو۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ آپ کا محمود بھی بے چین ہے۔ للہ ہم پر رحم کرو۔''

سلطنت آرا: ''آہ! تمکنت کیا کہوں۔ کاش خدا مجھے اس دن کو دُنیا میں نہ رکھتا وہ بے چارے بے کس و بے بس پڑے ہیں۔''

تمکنت: (گھبرا کر) ''میرے بھائی جان تندرست تو ہیں؟ کئی ماہ سے اُن کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ کیا کوئی خط آیا ہے؟''

سلطنت آرا: ''وہ تکیہ پر منشی کا خط پڑا ہے۔ پڑھ لو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت کیا کروں؟ دونوں بڑے بھائی گھر نہیں ہیں اور محمود بچہ ہے۔ خدا کرے رشید الملک آج ہی الٰہ آباد سے آجائیں تو کچھ کروں۔''

تمکنت نے خط اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔''

خط از راولپنڈی

مورخہ...... ۱۹۲۳ء

بخدمت عالیہ جناب بیگم صاحبہ دام اقبالہا

پس از آداب غلامانہ عرض پرداز ہوں کہ کل سے ہم لوگ ایک سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں نے عرصہ دو ماہ سے خدمت عالیہ میں کوئی عریضہ نہیں لکھا۔ اس خطا کی نہایت ادب سے معافی چاہتا ہوں اور پھر یہاں کے حالات عرض کروں گا۔ آپ کے رنج و فکر کے خیال سے غلام نے سرکار کی تکلیف کا حال اب تک نہ لکھا تھا مگر کل سے ایک اور سخت مصیبت آپڑی ہے اور سرکار اس وقت

بالکل بے بس و ناچار ہیں۔ اِس لئے آپ کو اطلاع دینی نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔ گذشتہ دو ماہ کے حالات مختصر عرضِ خدمت کیے جاتے ہیں۔ یہ تو جناب کو معلوم ہی ہے کہ وہ عورت پنڈی کی تھی اور اُس کے پہلے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور اُس کی والدہ نے پشاور کے کسی میوہ فروش کے گھر اس کی دوبارہ نسبت کردی تھی لیکن اِس کو وہ ناپسند ہوئی اور وہ یہاں سے پوشیدہ طور پر لدھیانے پہنچی اور ہمارے سر پڑی۔ اتفاق کی بات ہم بھی تبدیل ہو کر یہیں آگئے کچھ عرصہ تک معلوم نہ ہوا لیکن حضور کے تشریف لے جانے کے بعد زرّیں کے گھر والوں کو یہ خبر ہوگئی کہ وہ ہمارے گھر میں ہے مگر دَم نہ مار سکے کہ کچھ پیش نہ چلتی تھی۔ آخر کار یہ خبر اُس کے سسرال والوں کو پشاور بھی پہنچ گئی اور وہ زرّیں کو ہمارے گھر سے نکال لینے کے ارادے سے یہاں پہنچے اور موقع کے منتظر رہے کہ سرکار دورے پر جائیں تو وہ اپنا کام کریں۔ دو ماہ کا ذکر ہے کہ سرکار گجر خاں تشریف لے گئے تھے اور سب کو یہ معلوم تھا کہ گھر پر نہیں ہیں۔"

ہماری بدقسمتی یا شامتِ اعمال کہوں کہ وہ تیسرے روز شب میں گجر خاں سے تشریف لائے۔ اُن لوگوں کو یہ خبر نہ ہوئی اور اسی رات کے دو بجے ہمارے یہاں چور پڑے۔ وقت پر سب کی آنکھ کھل گئی اور وہ کئی آدمی آئے تھے۔ کچھ باغیچے کی دیوار پر سے زنان خانے میں گھس گئے اور باقی باہر رہے۔ زرّیں تو بڑی الماری کے پیچھے چھپ گئی اور سرکار نے بندوق اُٹھائی۔ چور بھی ہتھیار لائے تھے۔

سرکار کی بندوق سے ان کے دو آدمی گرے لیکن انہوں نے بھی فیر کیے۔ ایک گولی دُشمنوں (سرکار) کی ران پر لگی اور وہ پلنگ پر گر گئے اس وقت تو ہم سب بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ کل تین آدمی اندر تھے اور میں مع چھ چپراسیوں کے تھے۔ (آپ فکر نہ

کریں۔ سرکار اب اچھے ہیں) ہم نے بھی بندوق اور پستول اُٹھالئے۔ پھر تو ان کا بھاگتے ہوئے پتہ نہ لگا۔ چپراسیوں نے تو ان کا پیچھا کیا اور میں نے سرکار کو سنبھالا۔ اُسی وقت سول سرجن صاحب کو بلایا۔ جنھوں نے اطمینان دلایا کہ انشاءاللہ بہت جلد زخم درست ہو کر ڈپٹی صاحب تندرست ہو جائیں گے۔ سو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ایسا ہی ہوا اور سرکار نے بہت جلد صحت حاصل کی کوئی ایک ہفتہ برابر بخار رہا اور سرجن صاحب دو وقت آ کر دیکھتے رہے۔ پھر بخار میں کمی ہو گئی اور طبیعت بحال رہنے لگی۔ دو ماہ کی رُخصت لے لی تھی۔ اِس عرصے میں بہت ہی صرف ہوا۔ زرّیں اور گل جان کو موقع مل گیا اندھادُھند لوٹنے کا۔ سرکار کے سامنے تو زرّیں ہر وقت روتی رہتی تھی لیکن اندر ہی اندر گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ دو ماہ گزر گئے لیکن زخم میں کچھ خرابی باقی رہی جس کے علاج کے لئے یہاں کے ڈاکٹروں نے لاہور جا کر علاج کرانے کی رائے دی۔ اب گھر میں سوائے زرّیں کے زیور کے ظاہراً ایک پیسہ نہ تھا۔

سرکار عجب پریشان ہوئے کہ کیا کیا جائے کیوں کہ سردست علاج کے لئے تین ماہ کی رخصت اور لی تھی اور علاج کے لئے کافی روپیہ درکار تھا۔ میں نے یہ رائے دی کہ ضرورتِ شدید کے وقت بھی زیور کام نہ آیا تو اور کب آئے گا۔ آپ بیوی کا زیور رہن کر کے کام چلائیں۔ خدا تندرست کر دے گا تو اِس سے زیادہ بن جائے گا۔ نہیں معلوم اس کو بھی یہ کس طرح کھٹک گئی۔ تھی تو ہوشیار اس نے بھی سوچا ہو گا کہ اس وقت میں اپنا زیور علاج کے لئے میاں کو دینا لازمی ہے اور یہ اس کو کسی طرح گوارہ نہ تھا کہ میاں کی صحت کو زیور سے زیادہ عزیز سمجھ کر یہ نقصان اُٹھائے۔ اُدھر یہ بھی سن گن پالی تھی کہ پشاور والے اِس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور اب اُسے گھر

میں آرام سے نہ رہنے دیں گے۔ وہ تو یہ کہہ کر بھی زیور بچا لیتی کہ "چور لے گئے" لیکن میں بھی اُس کے جعل فریب سے بخوبی واقف تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے جاتے ہی میں نے تمام کمرے کی تلاشی لی کہ کچھ نقصان تو نہیں ہوا تو اس کے زیور کا صندوقچہ مقفل الماری میں بدستور رکھا پایا۔ پس اِس سبب سے وہ چوروں پر بھی نہ لگا سکی۔

کل صبح کا ذکر ہے کہ جب سرکار بیدار ہوئے تو اپنا کمرہ خالی پایا نہ بیوی تھیں نہ کوئی ملازمہ۔ سرکار زور زور سے گھنٹی دیتے رہے اور کوئی نہ پہنچا۔ باہر میں متواتر گھنٹی کی آواز سن رہا تھا اور حیران تھا کہ کیا ہوا۔ سب سوتی ہوئی مر گئیں۔ جب سرکار کی گھنٹی بند نہ ہوئی تو میں نے روشن گل کے لڑکے کو جگا کر بھیجا کہ دیکھ اندر کیا معاملہ ہے؟ جب وہ گیا تو سرکار نے کہا کہ "ایک دو آوازیں دے کر غسل خانے وغیرہ بھی دیکھ لو۔ غرض کہ کونہ کونہ دیکھ لیا گیا اور بیوی صاحبہ کا کہیں نشان نہ ملا تو سرکار نے مجھے گھر میں بلایا۔ اِس وقت کی اُن کی حالت میں بیان نہیں کر سکتا۔ مارے غصے کے چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور تمام جسم کانپ رہا تھا۔ مجھ سے فرمایا۔ "منشی جی یہ کیا ہوا۔ یہ تینوں کہاں غرق ہو گئیں۔" بس میں سمجھ گیا کہ روپوش ہو گئیں۔

تب میں نے سرکار کو زریں کی پہلی نسبت اور اُس کے سسرال والوں کی قزاقی کا حال سنایا جو مجھے صرف ایک دن پیشتر یعنی پرسوں ہی اپنے ایک نئے چپراسی کے ذریعے معلوم ہوا تھا جو چند روز ہوئے پشاور سے یہاں آ کر ملازم ہوا ہے اور چونکہ ان لوگوں سے کچھ ان بن ہے......... اس لئے اس نے اُن کے صلاح مشورے مجھ پر ظاہر کئے اور کہا کہ "سرکار کو مطلع کر دو تا کہ وہ گھر کا انتظام رکھیں۔ ایک بار وہ آئے اور زخمی ہو کر گئے۔ زریں پھر بھی ہاتھ نہ لگی۔ ضروری ہے کہ آئندہ موقع پا کر پھر آئیں اور اس سے زیادہ

تکلیف دیں"۔ یہ راز معلوم کر کے تو میں بہت خوش ہوا۔ اب ڈاکو گرفتار کر لئے جائیں گے کیوں کہ دو ماہ سے پولیس تفتیش میں تھی اور ان کا پتہ نہ لگتا تھا۔ نہیں معلوم انہوں نے اپنے دونوں زخمیوں کو کہاں چھپا دیا تھا۔ چپراسی سے جس وقت یہ حالات سنے میں نے فوراً سرکار کو دیکھنے کے کام سے اندر جانا چاہا لیکن زرّیں نے اُس روز شام تک مجھے اندر نہ جانے دیا کہ ہم سے بار بار پردہ نہیں ہو سکتا۔

لکھ کر بھیجنے سے زبانی سنانا میں نے بہتر سمجھا تھا کہ شب میں انہوں نے خود ہی گھر خالی کر دیا۔ (خس کم جہاں پاک) سرکار یہ حالات سن کر ششدر رہ گئے۔ کئی دن سے بخار نہ آیا تھا لیکن اسی وقت سردی لگ کر تپ ہو گئی مگر میں مجبور تھا کہ ان کو سنانا تھا اور صرف اسی وجہ سے آج تک آپ کو ان کی تکلیف کا حال نہ لکھا تھا کہ سخت تکلیف و پریشانی اُٹھائیں گی۔

سرکار نے بھی سخت تاکید کر رکھی تھی کہ "آگرہ ہرگز خبر نہ کر دینا۔ تندرست ہو کر ہم خود خط لکھیں گے۔" اب کل دوپہر جب بخار ذرا کم ہوا تو میں نے اُن سے کہا۔ "آج تو میں ضرور آگرہ آپ کی علالتِ مزاج کی اطلاع دوں گا کیوں کہ بیگم صاحبہ اگرچہ لاکھ آپ سے ناراض ہیں لیکن آپ کی تکلیف کا حال معلوم کر کے مع کسی بھائی کے تشریف لائیں گی اور اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے آپ اس وقت بالکل تنہا ہیں۔ خبر ہونے پر وہ سب آپ کی مدد کریں گے۔ جنابِ عالیہ سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ سن کر سرکار کے آنسو جاری ہو گئے اور اُنہوں نے کانپتی آواز سے فرمایا۔ "اوہ۔ منشی جی! تم کیا کہتے ہو۔ اب میں اِس قابل نہیں رہا کہ ان لوگوں کو منہ دکھا سکوں، میری طرف سے بیگم پر تھوڑا ظلم نہیں ہوا ہے۔ آخر وہ ان کے بھائی ہیں۔ بہن سے زیادہ تو میں عزیز نہیں ہوں۔ وہ میری شکل

نہ دیکھیں گے۔ تم خواہ مخواہ بیچاری بیگم کو میرا حال لکھ کر رنج نہ دو۔ خدا اب میرا خاتمہ ہی کردے تو بہتر ہے۔ اتنی آرزو ہے کہ ایک بار بیگم کے قدموں پر گر کر اپنی خطاؤں کا اقرار کر لیتا مگر چونکہ میری خطائیں نہ بخشی جانے والی، میرے جرم ناقابلِ معافی ہیں۔ اِس لئے میں اِس قابل نہیں کہ اپنے قابلِ فخر بھائیوں اور بیگم کے روبرو ہو سکوں۔ کاش میں موت سے پہلے فرشتہ خصلت بیگم سے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیتا۔ افسوس کہ اب تک میں سخت غلطی میں پڑا رہا اور سمجھتا رہا کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا چونکہ میری دُوسری شادی ان لوگوں کو ناگوار گزری۔ اِس لئے اُن سب نے مجھے چھوڑ دیا لیکن آج اُس بدذات عورت کے چلے جانے سے یہ معلوم ہوا کہ دراصل میں ہی گنہگار ہوں۔ کسی کا بھی کچھ قصور نہیں مگر اب کسی قابل نہیں ہوں اگر بھائیوں سے معافی مانگوں تو وہ سمجھیں گے کہ ہر طرح مجبور و ناچار ہو کر مدد کے لئے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ پس منشی! اب یہی مناسب ہے کہ میں رُوسیاہ گنہگار زمین میں منہ چھپا لوں۔ تم آگرے اطلاع دے کر بیچاری بیگم کو رنجیدہ نہ کرو۔"

بیگم صاحبہ یہ سطور سرکار کی زبانی ہیں۔ انہوں نے تو بہت کچھ کہا تھا مگر میں اِس قدر کہاں لکھ سکتا ہوں اور یاد بھی نہیں رہا۔ غرض کہ مجھے بہت تاکید کی کہ میں آپ کو اطلاع نہ دوں لیکن مجھ سے ایسی سنگ دلی نہیں ہو سکتی کہ یوں گھر کی بربادی ہو اور آپ بے خبر رہیں اور میں نے سرکار سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ "آپ خیال نہ فرمائیں کہ وہ ناراض ہی رہیں گی گو آپ کی طرف سے اُن کے حق میں بہت سختی ہوئی ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایسے وقت میں بیگم کے بھائی آپ کی مدد نہ کریں۔" مگر چونکہ ان کو بے انتہا شرمندگی ہے۔ وہ اِس وقت آپ کو اطلاع دینا نہیں چاہتے جس سے یہ ثابت ہو کہ مدد

مانگنے کی غرض سے خبر دی ہے۔ ان کی صحت کے علاوہ اور پریشانی یہ ہے کہ اس وقت ایک پیسہ گھر میں نہیں جو کچھ بھی تھا وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ ان دو ماہ میں خرچ بھی زیادہ ہوا۔ پانسو روپے تو زرّیں نے گھر کے خرچ اور علاج کے لئے سرکار کی اجازت سے میرے ذریعے قرض منگایا تھا اور آج صبح ایک دکان دار سے یہ معلوم ہوا کہ سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو کر کے گل جان شیطانہ گذشتہ ہفتے پانسو روپے میرے ہی نام پر بیوی کے حکم سے اس سے قرض لے جاتی رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ”تم نے بغیر میرے اتنی بڑی رقم اُس عورت کو کیوں دے دی تو اُس نے جواب دیا کہ وہ رُقعہ لاتی تھی جس کا مضمون تمہاری طرف سے ہوتا تھا اور دستخط بیگم صاحبہ کے چنانچہ میں نے چھ رقعے خود پڑھے۔ جس پر اس بدذات کے ٹیڑھے سیدھے دستخط ثبت تھے۔ کیوں کہ تھوڑے دنوں سے اُس نے بھی پڑھنا شروع کیا تھا۔ میاں کو دورے میں خط لکھنے کی غرض سے۔ میں دو پرچے دیکھ کر حیران ہو گیا لیکن ابھی سرکار سے یہ ذکر نہیں کیا کہ اُن کی پریشانی اور بڑھے گی۔ اس وقت شام ہے اور میں یہ عریضہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ سرکار کے پاس ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا خط لکھنے کے لئے کیوں کہ ویسے سرکار مجھے ایک دَم علیحدہ نہیں ہونے دیتے۔ ہماری بیگم صاحبہ! اب آپ ہی تباہ شدہ گھر کو سنبھال لیں گی اور ہم پر رحم کریں گی یہاں یہ حالت ہے کہ ڈاکٹر رائے دیتے ہیں۔ فوراً لاہور جا کر علاج کرانے کی اور ہمارے پاس کل کے کھانے کو بھی نہیں کیوں کہ تمام روپیہ اسی کے پاس رہتا تھا۔ اب کچھ بھی باقی نہیں۔ خط طویل ہو گیا کیوں کہ میں نے مفصل کرنا ضروری سمجھا۔ سرکار کی طرف سے آپ زیادہ فکر نہ کریں بفضلِ خدا ویسے وہ اچھے ہیں۔ صرف زخم میں کچھ تکلیف

ہے۔جس کے لئے لاہور جانا ٹھہرا ہے مگر روپیہ نہ ہونے سے سردست وہ بھی ناممکن ہے۔تنخواہ ملنے پر کچھ بندوبست کیا جائے گا۔غلام نے تمام حالات عرض کر دیئے۔اب جناب کی رائے میں یہاں کی بہتری کے لئے جو آپ کا حکم ہو کیا جائے۔سرکار آپ کے ویسے ہی فرماں بردار ہیں۔اب یہاں کی دگرگوں حالت کو آپ ہی سنبھالیں گی۔جہاں تک جلد ممکن ہو سکے۔ہمارے حال پر توجہ کیجئے"۔

زیادہ آداب

خاکسار آپ کا تابعدار قدیمی
عظیم الدین

خط پڑھتے ہی تمکنت آرا کا رنگ زرد ہو گیا۔بمشکل تمام کر کے بہن سے کہا:

تمکنت آرا: "افسوس باجی جان! آپ کسی سے کچھ ذکر نہیں کرتی ہیں۔آخر ہم بھی انسان ہیں۔آہ میرے بھائی جان اس مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں!"

سلطنت آرا: "تم سے ذکر کر کے سوا تمہیں بھی رنجیدہ کرنے کے اور کیا بناتی۔محمود بچہ ہے۔وہ غریب کیا کر سکتا ہے۔شام کو بھائی حامد آجائیں گے تو کچھ صلاح ہو گی۔رات ہی رشید آجائیں گے۔"

تمکنت آرا: "اور کچھ نہیں تو اتنا تو ہو سکتا تھا کہ محمود راولپنڈی تار دے دیتے۔"

سلطنت آرا: "پھر اس سے فائدہ؟ ہاں منشی بیچارے کی شامت آجاتی کہ تو نے کیوں اطلاع کی۔صرف چند گھنٹے ہی درمیان رہیں نا۔جس طرح ہو گا۔گزر جائیں گے۔شام کو بھائی حامد انتظام کر ہی لیں گے۔"

تمکنت آرا: "اُف باجی آپا کا حوصلہ۔"

سلطنت آرا: "آخر پھر کیا کروں؟ مر جاؤں؟"

تمکنت آرا سے نہ رہا گیا اور اُس نے تینوں بھاوجوں اور محمود سے بھی یہ کہہ دیا کہ دولہا بھائی راولپنڈی میں علیل ہیں اور وہ عورت نکل گئی ہے۔خدا خدا کر کے شام ہوئی تو

مسٹر حامد آئے اور یہ سب سلطنت آرا بیگم کے کمرے میں جمع ہوئے تو تمکنت آرا نے بڑے بھائی کو منشی عظیم الدین کا خط دیا۔

چونکہ خط پریشان کن تھا اور تھا طویل۔ وہ پڑھتے پڑھتے دق ہو گئے۔ بمشکل ختم کر کے بولے:

مسٹر حامد: ''افسوس آرام کی زندگی بسر کرتے ہوئے بیچارے کس مصیبت میں پھنس گئے۔ خدا رحم کرے۔ مگر منشی بے مغزے کو دیکھو۔ اس نے کتنا دفتر لکھا ہے۔ خیر اب ہمیں اُن کی مدد فوراً کرنی چاہئے۔''

مسٹر محمود: ''خدا اُن پر فضل کرے لیکن ایسے افعال کا اکثر یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ کاش اب بھی سمجھ جائیں اور پشیمانی سے آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر سکیں۔ خدا اُن کو شرمندہ نہ کرے لیکن یہ ایک نظیر ہے۔ ایسے ہی افراد قوم کے سامنے یہ واقعہ عبرت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔''

مسٹر حامد: ''خیر انہوں نے جو کچھ کیا سو کیا لیکن اِس وقت بیچارے قابلِ ہمدردی ہیں اور سوائے ہمارے اُن کا اور کوئی ہمدرد نہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا کریں گے کیوں کہ یہ ہمارا فرض ہے۔ علاج کے لئے اُن کا لاہور جانا تجویز ہوا ہے۔ اِس کے لئے لاہور اور آگرہ ایک سے ہیں اور کل عزیزوں کی موجودگی کے سبب آگرہ لاہور سے بہتر ہے۔ پس ان کو فوراً یہاں بلا لیا جائے۔''

تمکنت: ''بھائی جان صرف خط جانے سے وہ ہرگز نہ آئیں گے۔''

مسٹر حامد: ''میاں محمود اُن کے لینے کو چلے جائیں گے۔''

مسٹر محمود: ''تعمیل حکم سے مجھے انکار نہیں۔ اور میں نے خود بھی جب سے یہ خبر سنی ہے بے چین ہوں لیکن ہم میں سے کسی کا جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ وہ خیال کریں گے کہ میری بیوی کے نکل جانے سے خوش ہو گئے اور یہ موقع جان کر خود ہی بلانے چلے آئے۔''

مسٹر محمد علی: ''مگر ساتھ ہی اِس خیال سے بھی تو خوش ہوں گے کہ باوجود میری اس قدر بے پروائی و قابلِ نفریں حرکات پر ناراض ہونے کے میری مصیبت میں شریک ہو گئے۔''

مسٹر حامد: "جی ہاں حتی الامکان ہمیں ضرور اُن کی مدد کرنی چاہیے کیوں کہ اِس وقت دُنیا میں نہ والد نہ کوئی بھائی نہ اور ہی کوئی ایسا قریبی رشتہ دار ہے جو اُن کا مددگار ہو اور ہم ہی تینوں موجود ہیں اور بفضلِ خدا اس حالت میں ہیں کہ ہر طرح سے امداد کر سکتے ہیں۔"

مسٹر محمود: "تو پھر میں جانے کو تیار ہوں۔ آج ہی رات کو روانہ کر دیجیے۔"

سلطنت آرا: "تم تینوں میں سے کسی کے جانے کی ضرورت نہیں۔ رات ہی میں میاں رشید آ جائیں گے۔"

مسٹر حامد: "وہ تو آج کل الٰہ آباد ہیں۔"

سلطنت: "ہاں مگر آنے والے ہیں امتحان سے فارغ ہو گئے ہیں۔ صبح ہی خط آیا ہے کہ شب میں آگرے پہنچوں گا۔"

مسٹر محمد علی: "بس یہی ٹھیک ہے۔ الٰہ آباد سے آتے ہی انہیں راولپنڈی روانہ کر دیا جائے۔"

مسٹر حامد: "ہاں پھر وہ بیچارا تو ہے ہی۔ ایسے کام اُسی کے سپرد ہیں۔ خدا اُسے ہمیشہ خوش رکھے۔ خدا کا شکر ہے کہ امتحان ایم اے بھی نہایت کامیابی سے ختم کیا۔ اب نتیجے کا انتظار ہے۔ اس کی محنت اور خدا کی مہربانی سے اچھی ہی اُمید ہے۔ افسوس کہ ڈپٹی صاحب پر یہ سال برا چڑھا۔ خیر کوئی بات نہیں خدا انجام بخیر کرے۔"

مسٹر محمود: "اچھا اللہ انہیں بھی سمجھ دے اور پہلے کی طرح اچھے انسان بن جائیں تو ہمیں بھی خوشی ہو۔"

تمکنت آرا: "تمہیں انسانیت کی پڑی ہے۔ خدا میرے بھائی کو جان کی سلامتی میں صحت عطا فرمائے۔"

مسٹر محمد علی: "وہ انسان بنیں یا نہ بنیں۔ خدا انہیں تندرست کر دے۔"

چنانچہ اسی شب رشید الملک بھی آ گئے اور صبح ہی راولپنڈی کو بھیج دیئے گئے۔ مسٹر حامد علی نے دو ہزار روپے اُن کے ساتھ کر دیئے۔ جس سے اُن کا قرضہ وغیرہ ادا کر دیا جائے۔ تیسرے ہی دن میاں رشید الملک مع ڈپٹی صاحب و منشی عظیم الدین اور

دو ملازموں کے آگرے پہنچے اور اُسی دن سے یہاں کے اعلیٰ ڈاکٹروں سے علاج شروع کرادیا گیا۔"

یہی ہمدردی و شرافت اور پوری انسانیت اِسے کہتے ہیں کہ باوجود اس قدر غم و غصے کے پانچوں بہن بھائی سنگ دل ڈپٹی صاحب کے شریک مصیبت ہوگئے۔

یہ شریف بیبیوں ہی کا حوصلہ ہے کہ اِس قدر ظلم و ستم سہ کر بھی ویسی ہی وفادار و جاں نثار رہتی ہیں۔ یہ شوہر پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک شریف و تعلیم یافتہ بی بی سے بڑھ کر دنیا میں مرد کا کوئی ہمدرد نہیں مگر بی بی بھی وہ جو بیوی کہلانے کی اصلی مستحق ہو ورنہ ایسی بیویاں جیسی کہ ڈپٹی صاحب کی دُوسری عورت تھی باعث بربادی ہیں مگر افسوس کہ ہندوستان میں تو اِس قسم کی ناجائز شادیوں کی آندھی چل رہی ہے جس میں کمی نہیں بلکہ طوفان پر ہے مگر کوئی اِس طرف توجہ نہیں کرتا۔ لیڈران اور ریفارمران قوم تو بہتیرے ہیں لیکن اس کے انسداد کی کسی کو فکر نہیں۔ آخر وہ بے بس و بیکس فرقہ بھی اِسی قوم کا ایک حصہ ہے جس پر نہایت بے دردی سے اندھا دُھند ظلم ہو رہا ہے مگر آہ کسی کو پرواہ نہیں۔

اے ہم بے بسوں کی قسمتوں کے مالکو! اللہ اِس طرف بھی توجہ کرو۔ سوچو تو ان مظلوموں میں بھی جان ہے۔ گو دِل و دماغ تو ظلم سہتے سہتے عرصہ سے مر مٹ چکا ہے مگر جان تو ابھی باقی ہے جس طرح حیوانات کو جانور جان کر آزار نہیں دیتے۔ اِسی طرح اِن مظلوم جانداروں پر بھی رحم کرو۔ ترس کرو۔ اور اس بادِ ستم کی روک تھام کی تدبیر کرو جو بادِ صَرصَر کی طرح مرجھائے سکھائے نہیں۔ ہمیں تباہ و برباد کیے ڈالتی ہے۔ اوّل تو ہمیں زور سے رونا ہی نہیں آتا اور روئیں بھی تو نالہ و فریاد کی اجازت ہی نہیں۔

> ہم جو فریاد کریں آپ خفا ہوتے ہیں
> رحم کی جا تمہیں آجاتا ہے غصہ الٹا

ہم پر تو یہ مثل صادق ہے کہ "ظالم مارے اور رونے نہ دے۔" ہمیں یہ تاکید ہے کہ "ہم ظلم کریں، تم سہو۔ ہم ماریں تم نہ روؤ اور نہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤ۔ بس اندر ہی اندر جل جل کر گھٹ گھٹ کر مرجاؤ مگر اُف نہ کرو" نالہ و فریاد کجا۔ ہم تابعدار مظلوم یہ حکم بھی مانتے ہیں اور نالہ و فریاد یعنی اپنی حقوق طلبی کا نام بھی نہیں لیتے بلکہ اس کو خلافِ شرافت سمجھے

ہوئے ہیں۔ جب بہت ہی دم گھٹنے لگتا ہے تو نہایت آہستہ نیچی سی آہ بھر کر صبر کر لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھلا ہم خود کیا کر سکتے ہیں؟ اس لئے نہایت ہی منت و عاجزی کے ساتھ آپ ہی سے صد ہا نہیں ہزار ہا دردمند دلوں کی التجا ہے کہ اے ہمارے سچے ہمدرد بابو۔ حقیقی خیر خواہ بھائیو! خدا کے واسطے ہم پر رحم کر کے سب سے پہلے ہماری خبر لو۔ تب تو ہم بھی ریفارمر کہیں گے۔ ورنہ خواہ کسی قدر اصلاحیں کیوں نہ کرو۔ ہمیں کیا؟ ہماری زندگیاں تو یوں جل جل کر گھٹ گھٹ کر مر مر کر برباد ہو رہی ہیں۔

جلا جب ہم آفتوں میں ہیں
کس طرح تم کو راہبر جانیں
کثرت ازدواج جب ہو دور
تب تمہیں ہم رفارمر جانیں

بنت نذر الباقر
از کوہاٹ ۱۱ر ستمبر ۱۹۱۱ء

☆☆☆

جاں باز

(۱)

بے چاری زبیدہ دو ہفتے سے سخت مشکلات میں پھنسی ہوئی ہے۔ ابھی چھ ماہ ہوئے قمر سے اس کی باقاعدہ نسبت ہو چکی ہے۔ یکم اگست سے اس نے غیر ملکی چیزوں کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اُس نے اپنے قمر کو بھی اس کی فہمائش کی مگر وہ فیشن ایبل جنٹلمین کسی طرح اس کا ہم خیال نہیں ہوتا۔ وہ زبیدہ کے لیے قیمتی قیمتی کپڑا اور زیور لاتا ہے جس کو وہ نہایت نفرت و حقارت سے واپس کر دیتی ہے۔ زبیدہ کو یقین تھا کہ ضرور وہ ایک دن کامیاب ہوگی اور اپنے ہونے والے شوہر کو اپنا ہم خیال بنالے گی کیوں کہ وہ بھی انتہا سے زیادہ اس کو چاہتا تھا مگر افسوس اس کا خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ زبیدہ کی وطن پرستی، زبیدہ کا ایثار، زبیدہ کی اسلامی ہمدردی قسمت کے لئے قاطع محبت ثابت ہوئی۔ کیوں کہ فیشن کے پرستار، مغربیت کے شیدا قوم فروش، دشمن وطن، کو کھدر کی موٹی سی ساڑی میں انگورہ کے لئے چندہ جمع کرتی ہوئی، مصائب اسلام پر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوئی، رات دن وطن پرستی پر لیکچر دیتی ہوئی، زبیدہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ مردوں کو محبت حقیقی تو شاذ ہی ہوا کرتی ہے۔ یہ ظاہری چمک دمک حسن کے شیدائی ہیں۔ اس وقت اس کی منسوبہ زبردست باہمی اختلافات کی وجہ سے اس کے دل سے اتر گئی۔ اوّل تو خیالات ہی کا اختلاف بہت کافی تھا۔ مسٹر قمر الزماں ایم اے کپتان پولس ''امن سبھائیں'' قائم کراتے پھریں اور اُن کی بننے والی ہمدم و غمگسار رفیقہ ''سودیشی'' پرچار کر کے یورپ کی تجارت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ دویم مسٹر قمر زبیدہ کو ہر وقت فیشن ایبل ریشمین باریک نفیس پوشاکوں میں پھرتے ہوئے دیکھنا چاہیں اور وہ موٹی کھدر لپیٹے پھرے جس سے اُن کی نظروں میں اُس کا حسن ماند پڑ گیا بلکہ کھدر کے بادل میں چہرۂ منور دُھندلا سا داغ نظر آنے لگا۔ جس سے یک بیک اُن

کا نمائش پسند، بناوٹ پرست دل ہٹ گیا اور وہ اب کسی دوسری فیشن ایبل میم بنی ہوئی لڑکی پر مائل ہونے لگے۔ نسبت تو اِدھر ہو چکی تھی اور تحفے اُدھر پہنچ رہے تھے!

یہ خبر اُڑتے اُڑتے زبیدہ کے کانوں تک بھی پہنچی۔ اب تک تو وہ قمر کا کشیدہ رہنا اختلاف خیال پر مبنی سمجھتی تھی مگر جیسے ہی یہ سنا کہ مس این احمد سے مراسم پیدا کر رہے ہیں تو گویا اُس پر بجلی گر گئی۔ باوجود مخالفتِ مزاج و خیالات و مقاصد زندگی وہ قمر کو اس وقت تک جان سے زیادہ چاہتی تھی اور اللہ سے رو رو کر دعا کرتی تھی کہ اُس کا دل خدمت اسلام و وطن کی طرف پھیر دے۔ مرد ذرا سے اختلاف پر عورت کا دشمن ہو جاتا ہے لیکن سخت سے سخت ظلم اٹھانے پر بھی عورت کے دل سے مرد کی محبت زائل نہیں ہوتی۔

سردی شروع ہو گئی تھی اور زبیدہ و قمر کی شادی میں صرف ۲ ماہ کا عرصہ باقی تھا۔ وہ حیران تھی کہ کیا ہوگا جو شخص ایک دوسری عورت پر مائل ہے اگر یہ شادی ہو گئی تو میرا کس طرح سے گذر ہو سکے گا اور جو شادی نہ کروں تو بغیر قمر کے زندہ کیوں کر رہوں گی؟

نومبر کی چوتھی تاریخ تھی۔ دن کے ۲ بج چکے تھے آج قمر چاء پر اُن کے ہاں ۶ بجے آنے والا تھا۔ زبیدہ کی بھاوج نے مدعو کیا تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر (کیوں کہ ۱۵ دن سے قمر نے زبیدہ سے بالکل ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا) آج ہی زبیدہ نے بھی آئندہ زندگی کے متعلق قطعی فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی آخر وہ بھی انسان تھی۔ اپنی ذلت محسوس کرتی تھی۔ رشک و حسد کی آگ اُسے بھی جلا رہی تھی مگر آج اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جس وقت قمر سے قطع تعلق کے آخری الفاظ کہوں گی اور سنوں گی تو میری جان یقیناً جسم سے نکل جائے گی۔ مجھ میں اتنی برداشت نہ ہوگی کہ اس وقت زندہ رہ سکوں جب قمر مجھ سے آخری بار جدا ہو کر میرے گھر سے جائے مگر اس خیال سے اُسے تقویت اور طمانیت قلب حاصل ہو رہی تھی کہ مر جاؤں تو بہت اچھا ہوگا۔ جدائی کا صدمہ نہ سہوں گی کیوں کہ برداشت کی طاقت نہیں ہے۔ وہ اپنی لائبریری کے کمرے میں فرش پر سرنگوں بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ بھاوج داخل ہوئی اور اُس کا سر اُٹھا کر کہا۔

صالحہ حسن: ”پیاری بیدی (پیار سے زبیدہ کا بھائی بیدی کہتا تھا) کیا کر رہی ہو۔ اٹھو دیکھو دو بج رہے ہیں۔ ٹھیک تین بجے قمر صاحب آجائیں گے، یہ میلی ساڑی بدل

ڈالو۔ میلی کچیلی عورت بری لگتی ہے اور پھر اس حالت میں کہ وہ تمہارے طرز لباس وسادگی سے سخت ناراض ہیں۔ بے شک تم سادہ کپڑا پہنو، مگر یہ کیا لازمی ہے کہ کھدر ہی لپیٹو۔ اٹھو بنارسی عنابی ساڑی پہن لو اور یہ میرا ترکی ریشمی کوٹ لو۔ خواہ مخواہ وہ بات نہ کرو جس سے تم پر الزام عائد ہو۔"

زبیدہ: "بھابی جان مجھے معاف کریں۔ میرے دل میں اب اتنی طاقت نہیں کہ ان بے وفا، بدعہد کی خوشی کروں۔ اوّل اوّل جب میں نے ایسا کپڑا اختیار کیا تھا تو ڈھاکہ اور بنارس کی ساڑیاں پہنتی تھی وہ کتنی خوبصورت اور قیمتی ہوتی تھیں مگر اس دشمنِ وطن نے اُن کو بھی حقیر سمجھا اور مجھ سے جدا رہے کو کہا تب سے میں نے دیسی کپڑا اختیار کیا ہے۔ اب تو نہ بدلوں گی اور بھابی جان اب کوشش بے کار ہے۔ مجھے بخوبی پتہ چل گیا ہے کہ نجمہ احمد علی کی طرف مائل ہیں اور کسی بہانے مجھ سے قطع تعلق کر کے اُس سے شادی کریں گے اللہ مجھے دنیا سے اٹھالے۔"

اتنا کہا اور بچوں کی طرح زبیدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس قدر روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔ چہرہ غصہ و رنج سے سرخ ہو گیا۔ جسم پر سیاہ بال بکھر رہے تھے اور ملگجی کاسنی کھدر کی ساڑی کا آنچل منہ پر ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ بھاوج نے ہر چند سمجھایا مگر اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ اُس وقت وہ اُس سے جدا ہو رہی تھی جو جھوٹا ثابت ہو کر بے وفائی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اسی حالت میں تین بج گئے اور خادمہ نے مسٹر قمر کا کارڈ لا کر دیا۔

بھاوج: "اوہو وہ آگئے ہیں میں جاتی ہوں اٹھو جلدی سے منہ دھو کر کپڑے بدل ڈالو۔ اِدھر آؤ۔"

یہ کہتی ہوئی مسز حسن کمرے سے نکل گئی اور غریب زبیدہ جو بھاوج کے سہارے سے بیٹھی تھی اسی جگہ گر گئی۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ "وہ آگئے" کے الفاظ نشتر کا کام کر رہے تھے، کون آگئے میرے قمر آج پندرہ دن بعد آئے اور اس طرح کہ مجھے خبر بھی نہ دی اور اب آخری ملاقات کروں گی۔ ان خیالات میں اُس نے آدھا گھنٹہ گزار دیا تو مسز حسن آئیں اور یہ حالت دیکھ کر واپس جا کر مسٹر قمر کو یہیں بلا لائیں۔

آہ! اگر قمر کا دل پہلا سا ہوتا تو اپنی زبیدہ کو اس حالت میں دیکھ کر بے تاب

ہو جاتا مگر اب تو اس پر ایک اور کا اثر تھا تاہم انسان چونکہ فطرتاً رقیق القلب ہوتا ہے اس سنگ دل پر بھی اس کی منسوبہ کی اس قابل رحم حالت کو دیکھ کر بہت اثر ہوا اور وہ ہاتھ کے دستانے اور سر سے ٹوپی دور پھینک وہیں زبیدہ کے پاس بیٹھ گئے۔

اُس وقت زبیدہ اُٹھی تو مگر بدحواس، اس وقت اس کا سر قمر کے ہاتھوں میں تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ مسز حسن یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئیں۔ ''آپ انہیں منائیں میں ذرا چائے منگواؤں۔ پھر تو زبیدہ کے سیماب وار مضطرب دل میں ضبط کا یارانہ رہا اور شدت سے رونے لگی۔ اس لحہ اپنے تمام ظلم و ستم گناہ بدعہدی ایک ایک کر کے قمر کے سامنے آنے لگے! وہ شرم سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ اپنی دوسری محبوبہ کا خیال بالکل دل سے مٹ کر زبیدہ کی سچی وفاداری کا نقشہ جم گیا۔ وہ کچھ بولنا چاہتے تھے مگر زبان میں طاقت گویائی نہ تھی کیوں کہ اسی زبان سے وہ پہلی محبت کو غلط ثابت کر کے نجمہ سے وعدے کر چکے تھے۔ بہت دیر تک زبیدہ یونہی روتی رہی۔ حتیٰ کہ مسز حسن معہ چاء ٹرے کے خادمہ کے ساتھ آ گئیں اور انہوں نے زبیدہ کو زبردستی اُٹھایا وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مسٹر قمر: ''بھائی صاحبہ وہ مجھ سے سخت ناراض ہیں آپ کی کوشش بے سود ہے۔ وہ اب مجھ سے واسطہ نہیں رکھیں گی کیوں کہ وہ نون کوآپریٹر اور میں اس کے خلاف۔''

صالحہ حسن: یہ آپ کا خیال غلط ہے۔ تعلقات دلی میں ان چیزوں کو دخل نہیں۔ دیکھو ہم میاں بیوی میں کتنا بڑا اختلاف ہے۔ وہ اثنا عشری اور میں احمدی مگر اس کا اثر ہماری دنیاوی زندگی پر ذرا بھی نہیں اور اس لحاظ سے وہ سخت نان کوآپریٹر اور میں کوآپریٹروں میں ہوں مگر ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔ اُس کا یہ حال کیوں ہے۔ محض بے رُخی بے توجہی کے رنج سے جس دن سے آپ نے ملنا بند کر دیا ہے، وہ زندگی سے بیزار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آج میں نے آپ کو بلایا۔

مسٹر قمر: ''نہیں بھائی صاحبہ ان کو صرف یہ رنج ہے کہ میں ان کا ہم خیال کیوں نہیں؟

اچھا جاتا ہوں۔ چاء تہا نہ پیوں گا جب مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتی ہیں اور بیٹھنا

مگر کلکٹر صاحب کے ہاں شب کا کھانا ہے، کلب سے واپس ہو کر کپڑے وغیرہ بدلنے میں دیر ہو گی اچھا رخصت۔"

یہ کہتے ہوئے ٹوپی اٹھا کر چل دیئے۔ مسز حسن دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں اور ان کی موٹر ہوا ہو گئی۔

انہیں بھی مولوی حسن صاحب کے آنے کی اطلاع ہوئی اپنے شوہر کو چاء پر بلانے کے لیے ادھر آ گئیں۔

شام کے ۷ بجے زبیدہ کو ہوش آیا اٹھی ہاتھ منہ دھویا اور باہر کے کمرے میں آئی تو چند چیزیں ایسی نظر پڑیں جن کی طرف اس کی نگاہ کے ساتھ سینہ سے دل بھی کھینچ آیا۔ فوراً جھکی اور اٹھا لیں۔ ایک جوڑہ دستانے تھے جو جلدی میں قمر یہیں پڑے بھول گئے تھے، ایک ریشمی رومال تھا اور یہ وہ تھا جس سے زبیدہ کی آنکھیں خشک کی تھیں۔ باوجود اس قدر غم و غصہ کے بیتابانہ اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیں۔ سوچ رہی تھی یہ وہ پیارے دستانے ہیں جن میں میرے قمر کے خوبصورت ہاتھ رہتے ہیں۔ یہ وہ رومال ہے جو ہر وقت سینہ والی جیب میں رہتا ہے اور ابھی اس سے میرے چہرے کو خشک کر رہے تھے۔

ان چیزوں کو دیکھنے میں اس کی نظر فرش پر پڑے ہوئے ایک گلابی لفافہ پر پڑی جو کھلا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھا ہو گا اور جب جلدی میں زبیدہ کا منہ پونچھنے کو رومال نکالا گیا وہ گر گیا اُن کو معلوم نہ ہوا ورنہ اس طرح کبھی نہ چھوڑ جاتے۔

زبیدہ نے لفافہ پر لیڈی ہینڈ رائٹنگ میں قمر کا نام دیکھ کر جلدی سے دھڑکتے دل سے اٹھا لیا اور نکال کر خط پڑھنے لگی۔

احمد منزل، ۴ر نومبر ۲۱ء

آنا ہے تو جلد آؤ کہ سینے سے چل کے اب
آنکھوں میں آ کے ٹھہرا ہے دم انتظار میں

اپنی انجم کے پیارے قمر!!! آج چوں کہ ماما پاپا باہر گئے ہیں گھر اکیلا ہے دل گھبراتا ہے میں نے آپ کو صبح تکلیف دی تھی کہ کھانا یہیں آ کر تناول فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ انتظار کرتے کرتے ۱۲ بج گئے میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ مہربانی سے جلد آ جائیے یا کہلا بھیجئے کہ آج انجم کھانا نہ کھائے۔ چند ضروری باتیں بھی عرض کرنا ہیں۔ شام مس نیشا سے معلوم ہوا آپ کی سسرال میں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کھدر کا جہیز بھی بن رہا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ اگر ایسا ہے تو غریب انجم کو کیوں برباد کیا تھا۔ بہر حال جلد آؤ سخت انتظار ہے۔

آپ کی منتظر
انجم

اس خط کو پڑھتے پڑھتے اُس کے سیاہ حروف کی سیاہی کا یہ اثر ہوا کہ زبیدہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ غم و غصہ و رقابت کچھ نہ تھا بلکہ وہ اُس وقت کھوئی سی گئی اور دنیا اندھیر نظر آنے لگی۔ کمرے کی سفید دیوار سیاہ اور گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہر چند کہ کمرے میں برقی لیمپ روشن تھا مگر وہ تاریکی میں تھی۔ چند ساعت ساکت رہنے کے بعد اس کا دل غیظ و غضب سے تھرّا اُٹھا اور وہ اس ارادہ سے اٹھی کہ یہ رقعہ دکھا کر قمر کو شرمندہ کرے اور اُس سے انتقام لے مگر ساتھ ہی یہ خیال آیا ممکن ہے اس نے یہ رقعہ عمداً گرایا ہو زبیدہ پر نئے تعلقات کا اظہار کرنے کو یہاں چھوڑ دیا ہو اور اب صاف صاف قبول کر لے تو کیا کروں گی؟ مجبور و مایوس ہو کر سو نے پڑ گئی اور اسی طرح رات گزر گئی۔

(۲)

رات کے نو بجے ہیں۔ احمد بلڈنگ کے خوشنما پائیں باغ میں چمکیلا سیاہ اوورکوٹ پہنے گلے میں آسمانی شال لپیٹے قمر کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے مس نجمہ معروف گلگشت ہے۔

قمر: "پیاری انجم یہ کوٹ تو بہت خوبصورت ہے۔ کس درزی سے سلوایا ہے؟"

نجمہ: "ہم نے نہیں سلوایا بلکہ "وائٹ وے کمپنی" سے خریدا ہے۔ ولایت کا سلا ہوا ہے۔"

قمر: تب ہی اللہ مبارک کرے اس کاسنی کوٹ میں یہ گوری گوری گردن اور چمکیلا چہرہ چاند کو ماند کر رہا ہے ہم نے بھی تمہارے لئے آج شام "میتھو لے کمپنی" سے ایک شال خریدا ہے۔ کل شام "قمر لاج" کے ڈنر پر اڑھائیں گے۔"

نجمہ: (ہنس کر) "اور جو ہم بھی سودیشی پہننے کے شوق میں ملک میں نام پانے کی ہوس میں کھدر کے جوڑے سوالیں تو کیا ہو۔"

قمر: "خدا نہ کرے تمہاری کوئی عقل ماری گئی ہے جو ایسا کرو۔"

نجمہ: "دیکھو اگر کرلوں تو اسی طرح مجھے بھی چھوڑ دو جیسے غریب زبیدہ کو چھوڑ دیا۔"

قمر: "ہرگز نہیں مجھے محبت تم سے ہے نہ کہ تمہارے لباس سے۔ کھدر کیا چیتھڑوں میں بھی لپٹ جاؤ تو انجم نہیں چاند ہو چاند۔"

نجمہ: (مسکرا کر) "گویا قمر ہوں قمر۔ پھر میں اور قمر ایک ہو گئے۔"

قمر: "ہاں ڈیر کیا اب بھی دو کا وہم ہے۔ ایک تو ہو ہی گئے۔ تم تارا نہیں میری

آنکھوں میں چاند ہو۔"

نجمہ: "اچھا تو یہ بتاؤ زبیدہ سے کس طرح خلاصی حاصل کرو گے۔"

قمر: "اس طرح کہ میری ترش روئی بے پروائی سے خود ہی بگڑ کر چھوڑ دے گی۔ مگر نجمہ، وہ کمبخت مجھ سے بہت ہی محبت کرتی ہے۔ میرے غم میں گھل گھل کر آدھی نہیں رہی۔ بہر حال بھول جائے گی۔"

نجمہ: (بگڑ کر) "ہم سے زیادہ آپ کو کوئی چاہ سکتا ہے۔"

قمر: "نہیں ڈارلنگ تم سے زیادہ کا ذکر نہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ وہ بھی چاہتی تھی۔"

نجمہ: "اس طرح تو عرصہ لگے گا۔ میری ماما کو شادی کی جلدی پڑی ہوئی ہے۔ کیا کیا جائے؟"

قمر: "تم یہی کہو کہ میں امتحان میں کامیاب ہو جاؤں پھر دیکھا جائے گا۔ اچھا اب چلتا ہوں دس بج چکے ہوں گے ہمشیرہ صاحبہ منتظر ہوں گی دو تین دن کے لئے آئی ہیں مجھے اپنے ہی پاس رکھنا چاہتی ہیں۔"

نجمہ: "ہمشیرہ صاحبہ کا آپ کے رشتہ کے متعلق کیا خیال ہے؟"

قمر: "انہیں میری خوشی سے خوشی ہے مگر ایک بار جب میری پسند کی جگہ منگنی کر چکی ہیں تو اب بلا وجہ انہیں چھوڑ دینا پسند نہیں کرتیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زبیدہ اپنے خاندان اور برادری سے ہیں اور آپ کا گھرانہ نومسلم ہے۔ عورتیں ذرا ذرا سی بات کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ بہر حال جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ مجھے رخصت کردو۔ یہ گلاب میری جگہ اپنے پاس رکھنا۔" قمر نے اپنے فلاور ہول سے سرخ گلاب کا پھول نکال کر نجمہ کو دے دیا اور انجم نے اپنے بالوں میں سے ہلکا گلابی پھول نکال کر قمر کے کاج میں لگا دیا اور دونوں رخصت ہوئے۔

قمر نے احمد بلڈنگ سے نکل کر کمپنی باغ کے اندر سے گذر کر گھر جانے کا ارادہ کیا اس لئے کہ سڑک سڑک جانے میں بہت چکر پڑتا ہے۔ "قمر لاج" سول لائن میں تھیں، اس راستہ سے صرف باغ ہی ان دونوں کوٹھیوں میں حائل تھا۔ وہ اپنے خیالات میں محو بارہ دری سے گذر رہا تھا کہ وہاں گلاب کے درخت کے نیچے کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ رات کے

گیارہ بجے یہاں کون بیٹھا ہے۔ یہ معلوم کرنے کو قمر نے آگے بڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا سیاہ موٹی شال میں لپٹی ہوئی وہی ناکام محبت کشتۂ جفا زبیدہ تھی۔ اس کے آگے ایک سفید ریشمین پھولدار رومال گھاس پر بچھا تھا جس پر کئی خشک پھول پڑے تھے اور وہ اکیلی بڑبڑا رہی تھی؟ انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اب وہ نومسلم یوریشین لیڈی کے دام فریب میں گرفتار ہیں۔ اے پیارے پھولو تم عمر بھر وفاداری کرو گے یا اس کی طرح بے وفا نکلو گے۔"

قمر نے یہ سب الفاظ بخوبی سنے مگر الٹے قدم پیچھے ہٹا اور خاموشی سے دوسری طرف نکل گیا!!

(۳)

ان واقعات کو کئی مہینے ہو چکے۔ کپتان صاحب کی شادی مس نجمہ سے ہوگئی اور اسی سال اُن کے ہاں بچہ ہوا ہے مگر خدا جانے کیوں شادی کے بعد ہی کپتان صاحب کے چہرے پر وہ بشاشت نہ رہی جیسی کہ ایک حسب پسند پری تمثال فیشن ایبل بیوی حاصل کرنے کے بعد ہونی چاہیے تھی۔ خلاف معمول وہ کچھ افسردہ و خاموش رہنے لگے۔ بیوی سے جس قدر دلچسپی شادی سے قبل تھی اُس کی آدھی نہ رہی مگر مسز قمر پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا وہ ہر وقت خوش بشاش ہنس مکھ نظر آتی اور یہ خوشی کچھ مسٹر قمر کے ساتھ ہی وابستہ نہ تھی بلکہ دن بھر اچھے اچھے لباسوں کی تبدیلی، قیمتی جواہرات سے بجنا، تمام دن دعوتوں، پارٹیوں میں پھرنا، شام کو بلا ناغہ تھیٹروں میں جانا یہ سب سامانِ عیش تھا جس سے اس کے دل کی کلی ہر وقت کھلی رہتی تھی۔

کپتان چونکہ پولیس کے افسر تھے اُن کو کم فرصت تھی مگر مسز قمر کو اُس کی ذرا پرواہ نہ تھی۔ نہ اُن کی غیر موجودگی کا کچھ احساس، بلکہ وہ اپنے اور مسٹر قمر کے دوستوں کے ساتھ جو اس کو آنکھوں پر جگہ دیتے تھے نہایت خوش و مطمئن تھی۔ چونکہ معزز سرکاری عہدہ دار کی بیوی تھی یورپین حلقہ میں بھی عزت کی جاتی تھی۔ پس اب اُن کے غرور کا ٹھکانہ نہ تھا۔ کالے لوگ "نیم وحشیوں" سے ملنا سخت دشوار تھا۔ ہندو مسلمانوں میں چند ہی بڑے بڑے رتبے کے لوگ اس قابل سمجھے جاتے تھے جس سے مسز قمر بات کرتی۔ ہاں یورپین پارٹی میں تو ادنیٰ ملازمین ریلوے کی بھی قدر تھی۔ چنانچہ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر گارڈ، یورپین ٹکٹ کلکٹر تک کے ہاں جاتی تھی اور اُن کی دعوت قبول کرنا مسز قمر کے لئے فخر تھا۔ خدا نے رنگ زرد وسفید عنایت کر دیا تھا۔ پس وہ انگریز لیڈیز کے حلقہ میں انگریزی لباس زیب تن کئے زور زور سے قہقہے لگاتی۔ بالکل ایک یوریشین لیڈی معلوم ہوتی اور اسی پر اس کو فخر و ناز تھا۔

گو کپتان صاحب روشن دماغ آزاد خیال جنٹلمین تھے مگر بیوی کی حد سے بڑھتی آزادی اُن کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور رات دن اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے اس کو ذرا روکیں۔ یہی سبب ظاہراً اُن کی پژمردگی کا تھا۔

خدا جانے باہر کسی سے کیا بات سنی کہ ایک دن دفتر سے نہایت رنجیدہ و غضبناک گھر میں آئے دیکھا تو حسبِ معمول میم صاحب "کلب" جا چکی ہیں۔ اگر وہ چار بجے جاتے تب تو ساتھ جاتیں اور جو کسی دن میاں کو دیر ہو جاتی تھی تو پھر وہ اُن کا انتظار نہ کرتیں۔ اس پر بھی جھگڑا ہو چکا تھا۔ کپتان صاحب نے تنہا ریلوے ملازمین کے "کلب" میں جانے کو روکا تھا کیوں کہ یہ اُن کی شان کے شایاں نہ تھا جب کہ پولیس اعلیٰ افسر کی بیوی ہونے پر اُس کو "یورپین کلب" میں لے گیا تھا۔ جہاں سوائے غیر یورپین ڈپٹی کمشنر کی بیوی کے کوئی اور لیڈی نہ لی جاتی تھی تو کم درجہ لوگوں کے "کلب" میں جا کر اپنے شوہر کی عزت گھٹانا سخت قابلِ ملامت امر تھا مگر نجمہ نے شوہر کا کہنا نہ سنا۔ جب ذرا دیر ہوئی اور وہ جھٹ اسٹیشن کے کلب میں پہنچی۔ جہاں چند جنٹلمین اور چند لیڈیز سے اس کو غیر معمولی دلچسپی اور محبت تھی۔ چنانچہ آج جب کہ شادی کو ساتواں مہینہ تھا۔ کپتان صاحب غیظ و غضب میں بھرے ہوئے آئے کہ اچھی طرح اس بے باک عورت کو سرزنش کریں۔

رات کے آٹھ بجے موٹر کار کی آواز آئی مگر کپتان صاحب لیڈی صاحبہ کو اُتروانے برآمدہ تک نہ گئے وہ خود ہی آیا کو کوٹ دیتی ہوئی داخل ڈرائنگ روم ہوئیں اور اُن کے آتے ہی کپتان صاحب کھڑے ہو گئے اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈروم کی طرف چلے۔ آیا سے کہتے گئے کہ بیرے سے کہہ دو "جس وقت تک ہماری گھنٹی کی آواز نہ سنے کھانا ڈائننگ روم میں نہ لایا جائے۔ بیوی حیران تھی کہ کیا بات ہے۔ چہرہ غضبناک ہے اور کوئی خاص کام بھی نہیں اور اب کھانے کا وقت ہے اور وہ بیڈروم میں گھسیٹے لئے جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر بیوی کو اپنے پلنگ پر بٹھا دیا اور خود بھی قریب کی کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگے۔

"نجمہ جو کچھ میں کہوں اس کو ذرا ہوش سے سنو۔ پہلے میرے سوالات کا جواب دو پھر اقرار کرو کہ جس خوشی سے میں نے تمہیں بیاہا تھا جن وعدوں سے تم آئی تھیں ان کو پورا کر سکتی ہو یا نہیں؟"

مسز قمر: (منہ بنا کر) "یا خدا یہ آج کیا معاملہ ہے آپ اس قدر برہم کیوں ہیں؟ کیا کسی معزز لیڈی سے یوں ہی پیش آنا چاہئے۔"

کپتان: "بے شک جب کہ ایک غیر معزز عورت کو خود ہی معزز لیڈی بنایا ہو اور اس میں بننے کی قابلیت نہ ہو تو اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہئے۔ تم اس قابل نہ تھیں کہ ایک ذی رتبہ شوہر پاتیں۔ تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ مجھ پر کس قدر مہربانی کی گئی۔ تم کو اس معزز "کلب" کا ممبر بنایا گیا جس کے لئے سول سرجن گوپی چند کی بیوی ہزار کوشش کر کے ہار گئی اور پھر تمہاری شامتِ اعمال کہ ان ذلیلوں میں جا کر کھلتی ہنستی ہو، جو اس قابل بھی نہیں کہ اُن سے بات کی جائے۔ میں نے ایک بار پہلے بھی روکا تھا کہ ریلوے اسٹیشن والے "کلب" میں نہ جایا کرو مگر تم نے نہ مانا۔ تم سمجھتی ہو مجھ کو کچھ خبر نہیں ہے۔ میں سب سنتا ہوں مگر خون پیتا ہوں کہ باہر خبر نہ ہو۔ ایک تو میں عزت والا ہوں دوسرے میری پہلی معزز سسرال بھی یہیں ہے وہ یہ حالات سن کر کیا کہیں گے مگر تم نے حد کر دی کسی طرح نرمی سے نہ مانیں۔ تمہاری بڑھتی ہوئی آزادی روکنے کو میں نے یہ ترکیب کی خود دعوتوں، پارٹیوں، تماشوں میں جانا چھوڑ دیا کہ اس طرح تم شریفوں کی طرح گھر میں بیٹھو گی مگر تم کو اس کی ذرا پرواہ نہ ہوئی۔ جب شوہر ساتھ نہیں تو تماشے کیسے بلکہ تم پہلے سے بھی زیادہ بیباکی سے باہر رہنے لگیں۔ دن بھر گھر نہیں آتیں۔ ابھی پرسوں ڈاکٹرنی کہہ گئی ہے کہ اب مسز قمر کو ڈانس پر نہ جانے دو نقصان ہو گا مگر تم نے اپنی جان کا بھی خیال نہ کیا۔ آخر تم نے کہاں اور کس سے تربیت پائی ہے۔ میں تو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اچھی تربیت پائی ہوئی لڑکی سمجھتا تھا اور تمہاری وجہ سے میں نے ایک فرشتہ خصال نیکی کی مجسّم تصویر معصوم لڑکی کا دل توڑا۔"

مسز قمر: "یوں کہئے کہ اب پھر وہ یاد آئی ہے۔ تب ہی بلا وجہ مجھ پر بوچھار ہو رہی ہے۔ مجھ سے شادی سے قبل کہہ دیا ہوتا کہ میں پہرے میں رکھوں گا پھر میں اگر پسند کرتی تو بیاہ کرتی یا نہ کرتی۔ اب مجھ سے پابندی نہ ہو گی۔ جس آزادی سے ماں باپ کے ہاں رہتی تھی اسی طرح رہوں گی۔"

مسٹر قمر: (غصہ سے ہاتھ پکڑ کر) "اچھا یہ بات ہے یہ حوصلہ دیکھوں تو کیسے رہو گی؟"

مسز قمر: ''آخر میرا قصور کیا ہے جو اس قدر جامے سے باہر ہو رہے ہو۔''
مسٹر قمر: ''بتاؤں قصور کیا ہے۔ اچھا سنو سچ بتاؤ یہ کمبخت ''ڈیور تھارن گارڈ''
کہاں کا نواب زادہ یا معزز شخص ہے جس کے ہاں تم جاتی ہو اور یہاں تک کہ اس سے ناچ
کی مشق ہوتی ہے۔ میں سن چکا ہوں کہ اس کے ساتھ کئی بار ''بال روم'' بھی جا چکی ہو۔
جہاں وہ ذلیل ترین لوگ ناچتے ہیں۔''
مسز قمر: ''مسٹر ڈیور تھارن کوئی ذلیل شخص نہیں ہے ایک رئیس کا بیٹا ہے اور
مسز ڈیور تو بڑے معزز باپ کی بیٹی ہیں۔
مسٹر قمر: ہاں میں جانتا ہوں لندن کے اخبار فروش کا وہ بیٹا ہے اور مسز ڈیور
بے شک ایک سویلین کی لڑکی ہے مگر وہ بدبخت بھی ماں باپ کی عزت خاک میں ملا کر اس
کمبخت بدطینت جاہل گارڈ کے ساتھ چلی آئی ہے اس سے ملنا کون؟ افسوس کہ تم اس سے
دوستی کرو اور ناچنا چاہو۔ لعنت ہے مسلمانوں کی لڑکی ہو کر یہ ہوس یہ جرأت!!''
مسز قمر: ''مجھے کیا خبر تھی کہ اس نئے آزادی اور روشنی کے زمانہ میں بھی ''بال''
میں جانا محض تماشائی کی طرح آپ کو ناگوار ہو گا۔''
مسٹر قمر: (آنکھیں نکال کر) ''بے شک مجھے ناگوار ہے۔ کتنا ہی آزاد کیوں
نہ ہوں آخر مسلمان ہوں اور پھر بال روم بھی کس قدر ذلیل! اگر تم کو ایسا ہی شوق تھا تو مجھ
سے کہتیں میں ویسر یگل لاج کا ناچ دکھلاتا۔ یہاں گورنمنٹ ہاؤس کے ڈانس میں لے
جاتا لیکن یہ تب ہوتا کہ تم کو صرف ڈانس دیکھنے ہی کا شوق ہوتا۔ یہاں تو ناچنے کا شوق چرایا
ہے اور اس بدمعاش ڈیور سے چھپ چھپ کر سیکھا جا رہا ہے تاکہ ایک روز اس ناپاک
جوڑے کے ساتھ ناچا جائے۔ مسز ڈیور سے آج تک میں نے شیک ہینڈ نہیں کیا۔ اس کمبخت
کی شادی کا مقدمہ اور پکڑ دھکڑی سب میں نے ہی کی تھی آہ! افسوس کہ اُس کو دوست بناؤ
اور ساتھ ناچو!
مسز قمر: (رو کر) ''سب غلط ہے۔ میرے دشمن جوز بیدہ منحوس کے دوست اور
سکھائے ہوئے ہیں وہ آپ کو بھڑ کا رہے ہیں۔ اچھا پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔ وہ بھی سنوں؟''
مسٹر قمر: ''بس بس زبان سنبھالو۔ اس عصمت و عفت کی دیوی معصوم

شریف زادی کو برا نہ کہنا اسی کا عذاب پڑا ہے کہ میری جان میرے ہاتھوں مصیبت میں آ گئی
ہاں میں چاہتا ہوں اور بہ حیثیت تمہارا شوہر ہونے کے یہ حکم دیتا ہوں کہ آج سے تم اس
طرف کا رُخ نہ کرو۔ تمیزوں، جلسوں میں جہاں میں ساتھ نہ ہوں ہرگز نہ جاؤ۔

مسز قمر: "میری صحت خراب ہو جائے گی۔ میں پھر زندہ نہ رہوں گی۔"

مسٹر قمر: "میں صرف تنہا جانے کو روکتا ہوں۔ اپنے ساتھ تم کو ہر جگہ لے
جاؤں گا۔ یہی شریفوں کا دستور ہے، ورنہ میری سخت بدنامی ہوگی۔" "مسز ڈیور" اپنے شوہر
سے ناراض ہوگئی ہے اور اس کی چٹھی میرے نام آئی ہے اگر تم نہ رُکیں تو علی الاعلان تم کو
بدنام کرے گی اور میں سوسائٹی میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اُس نے صاف
صاف لکھا ہے کہ اگر تم اپنی بیوی کو نہ روکو گے تو میں کھلے بندوں بدنام کروں گی۔
للہ میری عزت کا پاس کرو۔ باپ کے وقت یعنی کنوارپن میں تم اس رتبہ کی نہ
تھیں اِن لوگوں سے مل لیں تو خیر کوئی حرج نہ ہوا مگر اب سخت نامناسب ہے اور اگر سمجھانے
سے نہ مانو گی تو پھر دوسری طرح خبر لی جائے گی۔ سمجھ لو۔ چلو اُٹھو۔ کھانا منگاؤ۔

☆

(۴)

علی گڑھ کی زنانہ خلافت کمیٹی کے ایک جلسہ میں زبیدہ کی عالیہ خاتون سے ملاقات ہوئی۔ یہ بی بی ایک معزز خاندان کی تھیں اور ایک ہفتہ سے علی گڑھ آئی ہوئی تھیں۔ زبیدہ اور عالیہ خاتون میں بہنوں کی سی محبت ہوگئی۔ اسی طرح اُن کے بھائی مولوی نور محمد صاحب اور مولوی حسن صاحب میں دوستی ہوگئی۔ مولوی نور محمد ایک عالی خاندان خوش شکل انگلینڈ کا تعلیم یافتہ اور پھر پکا مسلمان، نان کوآپریٹر حسن صاحب کو بہت ہی پسند آیا اور انہوں نے اپنی بیوی سے ذکر کیا کہ اگر زبیدہ شادی پر رضامند ہو جائے تو نور محمد سے بہتر شوہر نہ ملے گا کیوں کہ باتوں باتوں میں پتہ چلا ہے کہ وہ بھی اپنی ہم خیال لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر بھاوج نے جب نند سے ذکر کیا تو انہوں نے بہت بری طرح جواب دیا اور صاف انکار کر دیا کہ میری شادی صرف قمر کے ساتھ ہو سکتی تھی اور اب ناممکن ہے۔

ہفتہ بھر بعد وہ لوگ چلے گئے اور عالیہ خاتون سے وعدہ لے لیا کہ ہم دوسری جگہ دورہ پر جائیں گے تو آپ کو ساتھ چلنا ہوگا۔ چنانچہ دو ماہ بعد اُن کا خط آیا اور زبیدہ مع اپنے بھائی حسن صاحب کے یہاں سے دورہ کے لئے روانہ ہوگئیں۔ دہلی سے سب مل گئے اور بنگلور روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر ایک معزز تاجر سیٹھ جعفر حسن کی کوٹھی پر ٹھہرے۔ مولوی حسن اور مولوی نور محمد کے کمرے تو الگ الگ تھے مگر ان دونوں بیبیوں کا ایک ہی کمرہ تھا۔ ایک بوڑھی خادمہ اُن کی خدمت کو ساتھ تھی۔ یہاں جعفر جی سیٹھ کی بڑی لڑکی مس ریحانہ آج کل چھٹیوں پر آئی ہوئی تھی بہت حسین تھی۔ ایف اے کا امتحان دے کر آئی ہوئی تھی مگر تھی فیشن ایبل، انگریزیت کا زیادہ خیال تھا۔ باپ کھدر پوش تھا مگر بیٹی مس صاحب کیوں کہ انگریزی اسکول میں پڑھتی تھی مگر حسن میں زبیدہ سے دو چند تھی۔ ان لوگوں کے آتے ہی مس ریحانہ

ان دونوں بہنوں کی دوست بن گئی۔ مولوی حسن اپنی حقیقی بہن کی طرح ریحانہ سے بے تکلفی سے ملتے تھے کیوں کہ سیٹھ صاحب کے خاندان سے بہت دوستی تھی مگر مولوی نور محمد صاحب بہت جھجکتے کیوں کہ اب تک کنوارے تھے اور خود بے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے شرم کرتے تھے۔

سیٹھ جعفر صاحب کی لڑکی اب تعلیم سے فارغ ہو کر سن بلوغ کو بھی پہنچ چکی تھی۔ اُن کو اس کی شادی کی فکر تھی، حسن تو بیاہے ہوئے تھے۔ نور محمد پر اُن کا خیال گیا اور کہتے تھے یہ کوئی تیسرا سلسلہ جنبانی کردے تو اسی وقت قول وقرار ہو جائے۔ چنانچہ حسن صاحب جس کو بھتیجا سمجھتے تھے انہوں نے ذکر کیا۔ دن بھر تو یہ لوگ باہر کام پر رہے لیکچر دیئے اور شام کو جب جمع ہوئے تو مزید ار باتیں ہوئیں۔ ایک دن موقع پا کر حسن صاحب نے ذکر کر دیا۔ لڑکی کو وہ دیکھ ہی چکے تھے تاہم حسن نے اپنے چچا کی لڑکی کی بہت خوبیاں بیان کیں وہ خاموشی سے سب سنا کئے اور جب انہوں نے بہت اصرار کیا تو بولے:

مولوی نور محمد: ''مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے اور آپ کی مہربانی ہمدردی کا ممنون ہوں مگر............''

مولوی حسن: ''مگر کیا جب آپ کو میرے خیال سے بھی اتفاق ہے تو پھر پس وپیش کیا؟ ایسی حسین اور اس قدر لائق لڑکی آسانی سے نہ ملے گی۔ رہا یہ کہ وہ اس وقت مس صاحبہ بنی ہوئی ہے اس میں اس کا قصور نہیں۔ یورپین اسکول سے تعلیم پا کر آئی ہے وہ اثر جاتے ہی جاتے جائے گا۔''

جس وقت آپ کی صحبت (مسکرا کر) وتربیت حاصل کی پوری وطن پرست بن جائے گی اس کا خیال نہ کرو۔

نور محمد: ''یہی تو دقت ہے ایک زمانہ کی تعلیم وتربیت کا اثر ایک دم زائل نہیں ہوسکتا۔ بعد کا اختلاف زندگیاں تلخ کردے گا۔ میری رائے ہے کہ (ذرا رک کر) عمر بھر کا رفیق زندگی ہمیشہ ہم خیال تلاش کرنا چاہئے۔''

مولوی حسن: ''صحیح ہے مگر ریحانہ کے خیالات سے مجھے آگاہی ہے وہ شام کو گھنٹوں ہم بھائی بہن سے گفتگو کیا کرتی ہے وہ اپنے طرز لباس سے بھی متنفر ہے اور بہت

جلد دیسی لباس پہننے والی ہے۔ بھائی میرا کہا مانو اور ذرا پس و پیش نہ کرو۔ ورنہ موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ فی زمانہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں عنقا ہیں۔"

مولوی نور محمد: "اچھا مجھے دو ماہ کا وقت دیجیے تا کہ بخوبی سوچ سکوں۔"

مولوی حسن: "۲ ماہ نہیں ۶ سہی مگر اقرار کرلو تا کہ کہیں اور میں سیٹھ صاحب کو اس کا رشتہ کرنے سے روک دوں۔"

مولوی نور محمد: (ہنستے ہوئے) "بھائی اگر اقرار کرلوں تو پھر سوچنا کیا؟ اگر آپ کو اپنی بہن ریحانہ کی شادی بہت جلد کرانی منظور ہے تو میں اپنے ایک اور قابل دوست کو پیش کرسکتا ہوں۔"

مولوی حسن: "ہمیں تو اپنے عزیز بھائی نور محمد کا گھر بسا دیکھنا ہے۔"

مولوی نور محمد: "تو ممکن ہے ذرا دیر کرنے سے آپ کے نور محمد کو اس سے بہتر بی بی مل سکے جس پر اسے فخر ہو ورنہ اس قسم کی یورپین تعلیم یافتہ کرسچن نما مسلمان لڑکیاں تو اس وقت بے تعداد موجود ہیں مگر جس جوہر کا میں متلاشی ہوں وہ کمیاب ہے جس سے کہ مسلمان کی دنیا بہشت ہو جائے۔"

مولوی حسن: "آپ جانیں مگر موقع کھو کر پچھتائیں گے۔ ریحانہ جیسی باحیا سمجھدار لڑکی نہ پائیں گے۔"

مولوی نور محمد: "ممکن ہے اس سے بہتر پاسکوں۔ آخر ایسی جلدی کیا ہے معلوم تو ہو۔"

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حسن صاحب کو سیٹھ صاحب نے بلا بھیجا اور نور محمد اُٹھ کر پائیں باغ میں ٹہلنے لگے۔ وسط باغ میں ایک بارہ دری تھی جس میں اس وقت زبیدہ خاتون قالین پر بیٹھی چرخہ کات رہی تھی اور قریب ہی کرسی پر مس ریحانہ کروشیا کی لیس بنا رہی تھی اور آپس میں باتیں ہو رہی تھیں یہ ٹہلتے ہوئے اُن کے قریب پہنچے۔ ان دونوں کے خیالات کا اندازہ کرنے کو آہستہ قدم اٹھاتے اس بنگلہ کے گرد پھرنے لگے۔

زبیدہ: "بہن یہ لیس کس چیز کی بن رہی ہو۔"

ریحانہ: "پیٹی کوٹ کے لیے۔"

زبیدہ: ''اس کا سوت کون سا ہے؟''

ریحانہ: ''یہ لچھی تو ولایتی ہے مگر آئندہ میں دیسی سوت کی بنایا کروں گی۔ ولایتی کبھی نہ خریدوں گی۔''

زبیدہ: ''بے شک نہ خریدو گی اس کا مجھے بھی یقین ہے کیوں کہ ہمارے چچا سیٹھ صاحب پکے مسلمان سچے محبِ وطن ہیں اور اب آپ اُن کی نگرانی میں آگئی ہیں۔

....

....

زبیدہ: ''تو پھر بے کار محنت سے کیا فائدہ پھینک دیں اس قابلِ نفرت سوت کو۔''

یہ سن کر اثر پذیر ریحانہ نے فوراً لیس اور سوت کی لچھی مع کروشیا کے باہر پھینک دی جو اتفاق سے نور محمد صاحب کے دامن سے لگتی ہوئی دور جا پڑی اور کروشیا کا ہک اُن کے کرتے سے اٹک گیا۔

ریحانہ بے چاری کو کیا خبر تھی کہ اس کا یہ نفرت انگیز سامان مہمان کو جا لگا کیوں کہ سبز پتوں کی بیلوں سے دروازے ڈھکے ہوئے تھے۔ باہر کا حال صاف نظر نہ آسکتا تھا مگر اُن کو سب حال معلوم تھا کیوں کہ وہ اُن کی گفتگو سن چکے تھے۔ گرا ہوا سوت اور لیس کا ٹکڑا اٹھا کر جیب سے ماچس نکال کر انھوں نے یہیں جلا دیا اور کروشیا اپنے دامن سے نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ ریحانہ تو آڑ میں تھی مگر مولوی صاحب کی یہ کارروائی زبیدہ نے دیکھ لی کیوں کہ وہ اُن کے سامنے تھی۔ ہنسی تو آئی مگر روک لی۔''

ریحانہ: ''لیجیے پھینک دیا۔ اگر آپ کہیں گی تو جلا دیا جائے گا۔''

زبیدہ: ''ممکن ہے وہ جل گیا ہو۔''

ریحانہ: ''گھاس پر پڑا ہوگا ہم باہر جائیں گے تو جلا دیں گے۔''

آیا: (باہر سے آکر) ''بی بی صاحب بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔''

''یہ حکم سنتے ہی ریحانہ بی بی دوسرے دروازے سے کوٹھی کی طرف گئیں اور زبیدہ نے چرخہ اٹھا دیا۔ ساڑھی سنبھالتی ہوئی ایک خوبصورت تیلیوں کی ٹوکری میں جو اپنی بنائی ہوئی تھی اس وقت کی کتی ہوئی باریک سوت کی پینڈیاں دھرے ہوئے باہر نکلیں اور اپنے

کمرے کی طرف چلیں راستہ میں آلوچہ کے قریب نور محمد صاحب کھڑے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اُن کو گذرتا ہوا دیکھ کر نظر اُٹھا کر سلام کیا اور کہا ''اس قدر سوت اسی وقت کات ڈالا۔ دکھایئے کتنا باریک ہے۔''

زبیدہ: ''ہاں یہ اسی وقت کاتا ہے۔ دیکھئے خاصا ہے نہ موٹا ہے نہ باریک۔''

نور محمد: ''اوہو آپ نے تو کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ کس قدر باریک ہے۔ اس کا کیا بنائیں گی۔''

زبیدہ: ''یہ ایک تحفہ دینے کو تیار کر رہی ہوں۔ اس زمانہ میں اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔''

نور محمد: ''بے شک یہ گراں قدر تحفہ ہے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سوت سے کیا بنایا جائے گا؟ بہت ہی باریک ہے۔''

زبیدہ: ''شاید آپ متعجب ہوں گے کہ میں نے اپنی بہنوں کے لئے جولاہوں کا کام بھی سیکھ لیا ہے۔ ہم نے احمد آباد سے نیا کرگہ منگایا ہے اور میں نے ایک چھوٹا سا کپڑا بننے کا کارخانہ جاری کیا ہے۔ چنانچہ اپنے کام کرنے والے ملازمین سے میں نے اور بہن کملاپتی نے کپڑا بننا بھی شروع کیا ہے۔ چند تو لئے تیار کئے ہیں۔''

نور محمد: (خوش ہو کر) ''آفرین ہے آفرین ہندیوں کا بیڑا پار ہے جن میں ایسی محب وطن دیویاں پیدا ہو گئیں۔ میں اپنی بہن عالیہ کو بھی چند روز آپ کی شاگردی میں چھوڑ دوں گا تا کہ وہ بھی کچھ سیکھے۔''

زبیدہ: ''بہت خوشی سے میرا فرض ہے اپنی بہنوں کی مدد کرنا۔''

نور محمد: ''آپ نے سیٹھ صاحب کی مس صاحبہ کو بھی نرم کر لیا۔''

زبیدہ: ''ہاں بے چاری بہت اچھی طبیعت کی لڑکی ہے۔ جیسا کہ ہمارا خیال ہے اگر ایسا ہی ممکن ہوا تو میں ریحانہ کو اپنے ہمراہ لے جا کر پوری ہندوستانی لڑکی بنا دوں گی۔''

نور محمد: ''لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہوا جیسا کہ آپ لوگوں کا خیال ہے تو پھر کیا ایک مسلمان لڑکی کو وحدہ پرست لڑکی نہ بنائیں گی۔''

زبیدہ: ''وہ تب بھی کوشش کریں گی مگر نہ اتنی (مسکرا کر) آپ جانتے ہیں

انسان خود غرض ہوتا ہے۔ بہت دیر ہوئی عالیہ خاتون ابھی نہیں آئیں۔"

نور محمد: "ہاں دس بج گئے ہیں میں ابھی جاتا ہوں خود لاؤں گا (جیب سے کروشیا نکال کر) لیجئے یہ آپ کی بہن کی کروشیا ہے۔ لیس تو آپ کی رائے کے مطابق جلادی گئی۔"

زبیدہ: "ہماری بہن ریحانہ بہت اچھی ہے دیکھئے یہ لباس آج ہی جلادیا جائے گا۔ رات اُس نے ہم سے وعدہ کرلیا ہے۔ کل شام یہ کھدر کے کپڑے پہنیں گی۔ میں آج دن بھر میں اس کے لئے کھدر کا جوڑا نفاست سے تیار کروں گی تاکہ پسند کرلے۔"

نور محمد: "خدا آپ کی ہمت میں برکت دے آپ تو فرشتۂ رحمت ہیں ان کم سمجھ ہندوستانی لڑکیوں کے لئے۔"

زبیدہ: "بھائی نور محمد صاحب ہر ایک انسان پر فرائض زندگی عائد ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کسی صورت میں ہوں، اُن کی ادائگی اس پر فرض ہے۔ میری زندگی چونکہ اب بے کار سی ہوتی جاتی ہے اس پر غور کر کے ضرورتِ وقت کے لحاظ سے میں نے بھی اپنی سمجھ کے موافق چند کام اپنے ذمہ لے لئے، خدا اُن میں کامیابی بخشے جو میری محنت ٹھکانے لگے۔ یقیناً آپ دعا کریں گے۔"

نور محمد: "میں آپ کا دل سے قدر دان ہوں کاش ایسی چند بیبیاں اور کمربستہ ہو جائیں تو ہندوستان کو کوئی ضرورت نہیں لیڈروں کی۔ میں ہمیشہ تازندگی آپ کا مددگار رہوں گا مجھے آپ کے خیالات زریں سے دلی اتفاق ہے۔ میں استدعا کرتا ہوں کہ ایسا ہی قومی جوش عالیہ کے دل میں پیدا کردیں۔ اس کا بھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے مگر میں اس کے خیال سے اتفاق نہیں کرتا ہر ایک مسلمان لڑکی کے لئے یہ زندگی آسان نہیں۔"

زبیدہ: "نہیں ہم اپنی بہن عالیہ کا ضرور بیاہ کریں گے آپ اس کی فکر نہ کریں اُن کو آسانی سے نشیب و فراز سمجھا کر سیدھے راستہ پر لے آؤں گی۔"

نور محمد: "اچھا اگر آپ کو کامیابی ہوگئی اور میری عالیہ کے خیالات میں تبدیلی ہوئی تو مجھے ایک بڑی فکر سے نجات ہوگی اس کی وجہ سے میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی زندگی بھی صرف اسی کی خدمت میں صرف کردوں۔"

زبیدہ: ”اچھا آپ معاف کریں بہت وقت آپ کا ضائع ہوا ہے۔ میں اب جاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ تو اپنے کمرے میں گئی اور نور محمد صاحب اپنی بہن کو لینے سر سندر لال صاحب کی کوٹھی پر گئے جہاں وہ آج لکچر دینے گئی ہوئی تھی۔“

☆

(۵)

مسز قمر کی شادی خانہ بربادی کو دو سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ نجمہ بد تربیت نجمہ نے کپتان صاحب کو وہ ناک چنے چبوائے کہ اب وہ اس کی فیشن پرستی اور اپنے کئے پر سخت پشیمان تھے کسی طرح نجمہ اُن کے قابو میں نہ آئی۔ کئی بار مارا، سخت اذیتیں دیں مگر ذرا اثر نہ ہوا۔ اُس نے نہ آزادی میں کمی کی نہ یوریشین لوگوں سے ملنا چھوڑا۔

نو سو روپے ماہوار تنخواہ پندرہ دن میں خرچ کر کے دوکان، دوکان پر قرض کرتی ڈیڑھ سال میں کئی ہزار کا قرض ہو گیا۔ گھر کا چاندی کا سامان ڈائنگ رُوم کی چیزیں۔ ڈرائنگ روم کا سامان سب اندر ہی اندر غائب کرتی گئی آخر ایک دن اُن کی چک بک چرا کر بنگال بینک سے کئی ہزار روپیہ اڑا دیا۔ کمبخت کو جعلی دستخط بنانے میں کمال تھا۔ شوہر کے دستخط بنا کر دس ہزار نکال لئے جس وقت کپتان صاحب کو یہ حالت معلوم ہوئی تو سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ ایسی بدذات بیوی کو علیحدہ کر دیں۔ یہاں اس کمینی بداخلاق عورت کے کیریکٹر کی وجہ سے کپتان صاحب کی کافی بدنامی ہو چکی تھی۔ اس لئے اب لکھنؤ میں رہنا سخت ذلّت تھی۔ نجمہ بدکردار کو طلاق دے کر خود چھ ماہ کی رخصت لے لکھنؤ سے باہر چلے گئے۔ اپنے کئے پر کافی سے زیادہ پشیمان تھے اور اب اُن کا وہ سرکار پرستی اور فیشن پسندی کا بھوت بھی سر سے اتر گیا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ زبیدہ جیسی فرشتہ خصال لڑکی کا ہاتھ سے کھو دینا یاد آیا۔ سخت پچھتائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا اُن کا منہ اس قابل نہ تھا کہ اس معزز خاندان کی طرف پھر رُخ کر سکتے۔ باوجود پولیس افسر ہونے کے اب وہ قومی جلسوں میں بھی شرکت کرنے لگے اور بہبودیِ ملک کے وسائل میں حصہ لینے لگے۔

غرض یہ کہ رخصت کے ایام قمر الزماں صاحب نے ملکی و قومی کاموں میں صرف

کئے اور اب خیال ہوتا جاتا ہے کہ کوئی ذریعہ معاش پیدا کر کے ملازمت بھی ترک کر دیں۔

سردی کا زمانہ تھا الٰہ آباد میں قوم پرستوں کا ایک بڑا جلسہ تھا جس کی شرکت کے لئے لکھنؤ سے یہ قوم کا سچا ہمدرد خاندان الٰہ آباد آیا ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ بیگم حسن صاحب کی گود میں دو ماہ کا لڑکا تھا مگر وہ جوشیلی بی بی یہاں تشریف لائی تھیں اور یہ فیملی یہاں کے معزز رئیس جگدیش پرشاد صاحب کے یہاں فروکش تھی۔

صبح کے آٹھ بجے تھے۔ مہمان اپنے میزبانوں کے ساتھ برآمدے میں جہاں دھوپ پڑ رہی تھی چاء پی رہے تھے۔ رات کے جلسے کی گرما گرم تقریروں کا ذکر تھا۔ مولوی نور محمد صاحب اور اُن کی ہمشیرہ عالیہ بھی موجود تھیں۔

جگدیش پرشاد: ''بھئی رات کا جلسہ خوب کامیاب رہا اچھے اچھے مقرر آ گئے تھے اور چندہ بھی خوب ہوا۔''

زبیدہ کے والد صاحب: ''بھائی اچھی تقریروں کا نتیجہ تھا کہ روپے سے آپ کی جھولی بھر گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم بڈھوں سے اب کچھ نہیں ہوسکتا یہ نوجوان ہی کر رہے ہیں جو کچھ کر رہے ہیں۔ دیکھو رات میری تقریر کا اثر نہ ہوا اور جس وقت وہ جوشیلا جگر بند قوم کھڑا ہوا تو روپے کی بارش ہونے لگی۔''

نور محمد: ''مگر ہم پہچان نہ سکے وہ قابل نوجوان کون تھے۔ بھائی حسن کیا آپ جانتے ہیں؟''

حسن صاحب: ''بھئی مجھے یاد نہیں پڑتا رات سے قبل میں نے کہیں کسی جلسہ میں اس ہمدرد قوم شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔''

نور محمد: ''لباس بھی کچھ مختلف تھا۔ نہ تاں کو آپریٹروں کی کھدر تھی نہ کوئی سوٹ بوٹ ہی معلوم ہوتا تھا۔ ابھی کوئی نیا شخص اس حلقہ میں داخل ہوا ہے۔''

جگدیش پرشاد: (مسکراتے ہوئے) ''واہ آپ لوگوں میں سے کوئی بھی اپنے پرانے عزیز کو نہ پہچان سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک منکر ہستی اپنے گذشتہ افعال و خیال سے تائب ہو کر ہماری طرف راغب ہے۔''

نور محمد: ''اوہو کیا وہ کپتان پولیس مسٹر قمر تھا؟''

بیگم حسن: (حیرت سے) ''مسٹر قمر اور ایسی تقریر ہمیں یقین نہیں آتا۔''

جگدیش: ''ہاں ہاں وہ آپ کا قمر ہی ہے اور وہ دیکھو سامنے والے میرے چھوٹے بنگلے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ پرسوں وہ یہیں میرے پاس ٹھہرا ہوا تھا مگر جب آپ کا تار آیا تو میں نے اس کو علیحدہ ٹھہرا دینا مناسب سمجھا۔''

زبیدہ کے والد: ''اچھا اب یہ چل کھیلا ہے۔ جب پہلی حالت میں ناکامی ہوئی مہذب فیشن ایبل سسرال اور دوستوں نے دشمنی کی تو اس طرف آئے بڑا کافر سیاہ دل کمبخت انسان ہے۔''

جگدیش: ''نہیں نہیں میرے دوست آپ کا خیال غلط ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آپ نے اس کی ذات سے سخت صدمہ اُٹھایا ہے مگر انسان کا دل پلٹتے خیالات بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔''

مولوی حسن: ''ہاں ابا جان ایسا ممکن ہے جب اُن کو اپنے فرقہ سے صدمہ پہنچا تو آخر تعلیم یافتہ سمجھدار انسان ہے۔ اس پر جلد ''حق و باطل'' کا راز کھل گیا۔ اچھا ہے۔ خدا اس کو سچا مسلمان بنائے میں تو بہت خوشی سے اپنے دوست قمر سے ملوں گا۔''

بیگم حسن: ''ضرور جب وہ تائب ہو کر ہماری طرف آئے ہیں تو ہمیں بہت قدر کے ساتھ ان کو لینا چاہئے تا کہ وہ قومی خدمت کریں۔''

جگدیش: ''تجارت کی طرف اُن کا خیال ہو رہا ہے اگر آپ لوگ معاف کر دیں تو بہت جلد ''بزنس'' کرنے لگیں''۔

والدہ: ''خدا ایسا کرے وہ سچا مسلمان ہو جائے مگر یقین نہیں آتا۔''

جگدیش: ''بھاوج صاحبہ خدا میں سب قدرت ہے اور انسانی خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ آپ یقین کریں۔ اب وہ بالکل مسٹر حسن کے ہم خیال ہیں۔''

ہاں تو مسٹر حسن آپ کو اور مسٹر نور محمد کو آج شام کی چاہ پر اُن سے ملاؤں گا۔

بیگم حسن: ''چچا جی کیوں نہ دن کا کھانا ان کو یہیں کھلائیں تا کہ آپس میں مل کر دوپہر کے جلسے الگ الگ نہ رہیں۔''

جگدیش: ''بہت بہتر بلا لوں گا۔ کل سے وہ غریب اکیلا ہے۔''

یہ تمام گفتگو زبیدہ وفا کی پتلی زبیدہ نے دھڑکتے دل اور نہایت استعجاب سے سنی۔ اُس نے اپنی نظریں نیچی کئے چاء کی پیالی پر جمائے رکھیں وہ حیران تھی میرے کان کیا سن رہے ہیں۔ رات کا وہ جادو اثر مقرر جو سیاہ اچکن سفید پاجامہ کھلے سر اسٹیج پر جھوم جھوم کر نہایت جوش سے بول رہا تھا کیا وہ میرا قوم و ملک سے پھرا ہوا قمر تھا۔

دل کو یقین نہ آتا تھا کہ ایک پولیس آفیسر ایسی مؤثر تقریر کرے۔ خواہ مجھ سے وہ کھو گیا مگر کیا اچھا ہو کہ اپنے ملک اپنی قوم کے ہاتھ آجائے۔ اُس کا چہرہ کس قدر دُبلا اور زرد تھا۔ قمر تو موٹا تازہ سرخ و سفید آدمی تھا اور یہ رات والا جوشیلا قوم پر مٹا ہوا انسان بالکل آسمان سے اترا ہوا ایک فرشتہ معلوم دیتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں اب اس کے سامنے نہ ہوں گی۔ آج کھانا اپنے کمرے میں منگوالوں گی۔ چنانچہ چاء کے بعد وہ یہاں سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر ٹہلنے لگی۔ اس کے والد مولوی علی صاحب آج دوپہر کے کھانے میں شریک نہ ہوئے مگر اُن کی بیگم صاحب و بہو بیگم حسن اور مسٹر حسن اور نور محمد میز پر گئے۔ ہاں عالیہ خاتون نے بھی کمرے میں زبیدہ کے ساتھ کھایا۔ جس وقت کھانے کے کمرے سے گھنٹی کی آواز آئی عین اسی لمحہ میں مسٹر قمرالزماں اُن کے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ اس وقت ان کا وہی لباس تھا۔ یعنی سیاہ اچکن سفید پاجامہ اور سر برہنہ مگر ترکی ٹوپی ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ گھنٹی سنتے ہی کھڑے ہوگئے۔ ادھر کپتان صاحب داخل ہوئے، اب ٹوپی انہوں نے سر پر رکھ لی تھی جو بزرگ جگدیش صاحب اور لیڈیز جگدیش رانی صاحبہ اور بیگم علی صاحبہ و بیگم حسن صاحبہ کے سامنے تعظیماً اُتار لی تھی۔ جگدیش صاحب نے ان کو سب بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملوایا۔ باوجود بہت ضابطہ ہونے کے بھی جگدیش صاحب نے دیکھا کہ جس وقت حسن اور قمر نے ہاتھ ملائے دونوں کی آنکھیں پرنم تھیں۔ غیر متوقع بیگم علی صاحبہ کو یہاں پا کر قمرالزماں بہت حیران ہوئے اور نہایت ادب و شرمندگی سے اُن کے قدموں کی طرف جھکے اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے اٹھالیا کہ خدا کا شکر ہے بیٹا آج تم اس مجمع میں نظر آتے ہو جس سے سخت متنفر تھے۔ اس وقت ایک جوشیلے نوجوان کو دیکھنے کے لئے جس نے رات کے جلسے میں قوم سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے میں یہاں ٹھہری رہی۔

قمرالزماں: ''میرے واجب التعظیم بزرگ یہ نالائق اس قابل نہ تھا کہ

آپ کی طرف قدمبوسی بخشیں! مگر اس وقت شفقت بزرگانہ پر خیال کر کے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ خدا کی درگاہ سے بھی گنہگار، ردّ خلائق اب بخشا گیا اگر آپ نے مجھے اپنے سامنے لانے کے قابل سمجھا تو یقیناً خدا نے بھی مجھے بخشا۔"

اس کے بعد یہ پارٹی ڈائننگ روم میں گئی اور کھانا شروع ہوا۔ بیگم حسن صاحب رانی جگدیش صاحبہ کے مہمانوں کو کھانا پیش کر رہی تھیں۔ بیرے اس وقت کمرے میں نہیں رکھے گئے تھے۔ بیگم حسن نے مچھلی کے کباب مسٹر قمر کو دیئے جس کے شکریہ میں انہوں نے صرف "تھینک یو" نہیں کہا بلکہ اپنا سر جھکا دیا اور چکھنے کے بعد کہا، "نہایت لذیذ ہیں کیا آپ نے خود بنائے ہیں۔"

بیگم حسن: "اچھا آپ کو پسند آئے۔"

جگدیش رانی: "ہاں قمر جی خاص آپ کے لئے آج بہو رانی نے پلیٹ تیار کی ہے۔"

جگدیش: "معلوم ہوتا ہے حسن رانی صاحبہ کو یہ یاد آ گیا کہ آپ مچھلی کے کباب ان کے ہاتھ کے بہت پسند کرتے ہیں۔"

قمر الزماں: (احسان مندانہ نگاہوں سے) "بھابی صاحبہ میں اس قابل نہ تھا کہ آپ یہ نوازش کرتیں۔ بے شک میں نے آپ کے تلے ہوئے کباب ہی پسند کئے ہیں۔ آہ! آج یہ چکھتے ہوئے گذرا ہوا زمانہ یاد آ گیا جب کہ میں خوش نصیب تھا۔"

بیگم حسن: (بچشم نم) "بھائی قمر تب خوش نصیب نہ تھے۔ اس لئے کہ آپ کے خیالات آپ کے شایاں نہ رہے تھے۔ ہاں اب خوش نصیب ہیں اور اس حقیقی خوشی میں آج میں نے اس وقت آپ کو کھانے پر بلوایا ہے اور آپ کی مرغوب طبع چیز تیار کی، شکر ہے اس قادر مطلق کا جو آپ کو راہ راست پر لایا۔"

ان الفاظ کا جواب دینے کے لئے قمر کی زبان نے یارانہ دیا انہوں نے اپنی نگاہیں نیچے میز پر گاڑلیں اُن کی آنکھوں سے چند سفید قطرے میز پر گرتے ہوئے سب نے دیکھے۔

☆

(۶)

زبیدہ بہت ہی غمگین خاموش اور افسردہ بیٹھی ہوئی تھی کہ اسے کچھ خیال آیا اور اس نے ماما کو آواز دے کر کہا ذرا جا کر ریحانہ بی بی کا ستار لے آؤ جو کل آیا تھا۔

ستار لے کر نارنگی کے درخت کے نیچے جہاں ہلکی ہلکی دھوپ چھن رہی تھی اپنا کھدر کا رومال بچھا لیا اور وہاں بیٹھ کر اپنی تنہائی و پریشان خیالی دور کرنے کو ستار بجانا شروع کیا چونکہ دل پژمردہ ہو رہا تھا۔ بجائے کسی غمگین چیز کے یہ غزل شروع کی۔

غزل

سوزِ غم سے دلِ مضطر کو جلا ہی دیں گے
ہم تو مٹتے ہیں مگر اس کو مٹا ہی دیں گے

فرق سے تابہ قدم آگ لگا ہی دیں گے
شعلے جب دل سے اُٹھیں گے تو جلا ہی دیں گے

ناوک انداز ترے تیر سے پہنچے ہیں جو زخم
وہ مرے قتل کی محشر میں گواہی دیں گے

ہم نشیں چارہ گروں کی ہیں دوا تک محدود
دردِ دل داغ نہیں ہے کہ مٹا ہی دیں گے

تم خفا ہوتے ہو اچھا نہ کریں گے شکوہ
منہ میں جب تک ہے زباں خیر دعا ہی دیں گے

زبیدہ کے بال اس وقت پشت پر کھلے ہوئے پڑے تھے، ہوا کے جھونکے سے ساڑی کا آنچل بار بار سر سے سرک جاتا تھا اور گھونگر والے بال پیشانی پر گر جاتے تھے۔ وہ

بھی عجیب بے خودی کے عالم میں بیٹھی گا رہی تھی۔ زبیدہ کو موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ اس نے کالج میں "میوزک" پر انعام پائے تھے اور کچھ عرصہ تک سکھانے پر وہاں جاتی رہی تھی۔

پرنسپل صاحبہ کالج اپنی دیگر بنگالی گانا سکھانے والی استانیوں پر اس لڑکی کو ترجیح دیتی تھیں۔ چنانچہ آنریری طور پر اس نے وہاں کام کیا تھا مگر افسوس کہ اس تنہائی میں اس وقت کا سحر کن راگ کوئی سننے والا نہ تھا۔ زبیدہ کی یہ عادت تھی کہ گیت اوروں کے سنانے کے اکیلے میں گانا اور سراپا راگ ہی ہو جانا اسے زیادہ پسند تھا۔ اس وقت جو اشعار ستار پر گائے گو کسی استاد کے نہ تھے مگر اس کے حسب تھے اس لئے زیادہ مؤثر ثابت ہوئے۔ ایک ایک مصرع کو کئی کئی بار دہرایا اور جب کمرے میں سے ٹاٹن ۴ بجنے کی آواز نے اسے چونکا دیا تو فوراً نازک انگلیاں تاروں پر سے اٹھالیں۔ ستار کو زمین پر پھینک اُٹھنے لگی کہ پیچھے سے اچانک کسی آواز نے اُدھر متوجہ کیا۔ کچھ صاف دکھائی تو نہ دیا مگر شعر بخوبی سن لیا ۔

بس یہی نا! وہ خفا ہو کے سزا بھی دیں گے

حالِ دل ہم تو انہیں آج سنا ہی دیں گے

اپنی غزل سے ملتا ہوا شعر سن کر زبیدہ بہت متعجب ہوئی اور کھڑی ہو کر اس طرف دیکھنے لگی۔ ایک درخت پر عشقِ پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی جس کے پیچھے کوئی شخص زمین پر لیٹا گا رہا تھا۔ زبیدہ ذرا اور آگے بڑھی تو دیکھا کہ اسی سفید پاجامہ سیاہ اچکن میں مسٹر قمر بے تکلف گھاس پر دراز ہیں۔ آنکھوں سے اشک رواں ہیں اپنے عزیز قمر کی یہ حالت دیکھ کر دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ خیال کیا کہ بے چارہ خانماں برباد چہیتی بیوی نجمہ کی بے وفائی اور جدائی کے رنج و غم میں پریشان پڑا ہے مگر یہ ابھی سے آکر لیٹ گئے اور تو کوئی بھی سندر لاج سے نہیں لوٹا اور یہ صاحب آکر لیٹ بھی گئے مگر دریافت کرنا گوارا نہ تھا کیوں کہ نجمہ کی شادی سے بھی قبل جب سے وہ قمر سے رخصت ہوئی تھی آج تک پھر نہ ملی تھی۔ تین دن سے وہ یہیں کھانا کھا رہا تھا مگر زبیدہ اپنے کمرے میں کھاتی تھی۔ ریحانہ اور عالیہ بھی وہیں رہتی تھیں۔

ہاں جلسہ کے وقت قمر اس کو یہ قمر کو دیکھتی مگر بالکل بیگانہ وار اس طرح کہ ایک دوسرے پر ثابت نہ ہو کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔ بات کرنے کا موقع کئی سال سے نہ ملا اور نہ زبیدہ کو یہ گوارا تھا کہ ایسے سنگ دل بے وفا شخص سے کبھی عمر بھر مخاطب ہو۔ یہ ہمیں معلوم

نہیں کہ قمر کا اس کی طرف سے کیا خیال تھا اور وہ اس وقت کب سے زمین پر پڑا تھا۔ اُس نے زبیدہ کی دل سوز غزل سنی تھی۔ اُس کا اثر تھا یا اپنی بی بی نجمہ کا ہارمونیم بجانا یاد آ گیا تھا۔ بہرحال کچھ ہو وہ بے حد ملول تھا اور رو رہا تھا۔ زبیدہ جو اس کے قریب بڑھی تو خشک پتوں پر چلنے کی کھڑ کھڑاہٹ سے قمر نے سامنے کو دیکھا خلاف توقع زبیدہ اسی زبیدہ کو اس نے کھڑے پایا جو اس پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتی تھی وہ فوراً سنبھلا اور اٹھا اور جوں ہی کھڑا ہوا زبیدہ وہاں سے تیز قدمی سے چل دی۔ قمر کو کچھ چکر سا آ گیا اور کچھ ایک کیاری کی اکھڑی ہوئی اینٹ سے ٹھوکر لگی۔ وہ دفعتہً وہیں گر گیا۔

زبیدہ اس وقت کسی قدر دور ہو چکی تھی۔ اپنا دل سخت کر چکی تھی مگر گرتے دیکھ کر دشمن کو بھی سنبھال لیا جاتا ہے۔ اب اس سے نہ رہا گیا بسم اللہ کہہ گرتے کو اُٹھانے لگی۔

قمر نے آنکھیں کھول دیں اور اس دغا کی پتلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

اپنے آگے مجھے بے ہوش پڑا رہنے دے
جب ترس آئے گا دامن کی ہوا ہی دیں گے

اس نے نیچی نگاہ کئے قمر کے شانے پکڑ کر اٹھایا اور جب وہ بیٹھ گئے تو خود اسی طرح تیزی سے باغیچہ سے نکل گئی۔ ہال کے برآمدہ میں پہنچی تو مولوی نور محمد صاحب کو دیکھا کہ کھڑے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔

زبیدہ: ''اوہو آپ لوگوں نے تو بہت دیر لگائی اور یہ کیا تماشا ہے کہ ایک ایک کر کے آ رہے ہیں اور سب کہاں ہیں؟''

نور محمد: (مسکرا کر) ہاں ایسا ہی معاملہ ہے وہ سب بھی آ رہے ہیں۔ کیا مسٹر قمر نہیں پہنچے؟''

زبیدہ: ''باغیچہ میں ہوں گے اُدھر ہی جاتے دیکھا ہے۔ آپ ایک ایک کر کے کیوں اٹھ رہے ہیں؟''

نور محمد: ''سب سے پہلے کپتان صاحب چلے آئے کہ سر میں درد ہے۔ ابھی گانا ختم ہوا تھا ریحانہ بی بی ہارمونیم پر بہت ہی اچھا قومی راگ گا رہی تھی۔ اس کے بعد بیرے نے جا کر اطلاع دی کہ آپ نے دن کا کھانا بھی نہیں کھایا اور اب چاء پر ہم سب کا

انتظار کر رہی ہیں۔ چنانچہ جگدیش رانی صاحبہ مع لڑکیوں کے اٹھیں لیکن وہاں چاء آ گئی مجبوراً بیٹھنا پڑا مگر عالیہ خاتون نہ بیٹھیں تو اُن کو کوٹھی پر لانے کو میں اٹھا ہم باہر آ گئے تھے اور سوار ہی ہونے کو تھے کہ مس سندر لال دوڑتی ہوئی آئیں اور عالیہ کو پکڑ کر لے گئیں میں چلا آیا۔ اب کہئے وہ تو سب چاء پی کر آئیں گے آپ کی کیا رائے ہے۔"

زبیدہ: "آپ اور مسٹر قمر چاء پی لیجئے میں نماز عصر کو جاتی ہوں۔"

نور محمد: (گھڑی دیکھ کر) "ابھی عصر کے لئے بہت وقت ہے۔ پانچ بھی نہیں بجے آپ چاء پی سکتی ہیں۔ میں قمر صاحب ہی کے ساتھ پی لوں گا مگر آپ بھی ضرور پی کر نماز کو جائیں۔ تمام دن ہو گیا اگر تنہا کھانا نہیں کھانا تھا تو عالیہ خاتون کو کیوں جانے دیا۔"

زبیدہ: "جائیے جائیے جلدی چاء نوش کریں۔ عصر کا وقت نہ رہے گا۔"

نور محمد: "میں چاء سے پہلے دو رکعت اور ادا کر لوں گا۔ آپ تو پہلے تیار ہوں۔"

زبیدہ: "میں کمرے میں نماز پڑھوں گی وہیں چاء بھیج دینا۔ آپ دونوں یہیں پی لیں۔ اُن کو بلوا بھیجیں یہ کہتی ہوئی زبیدہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔"

(۷)

بارہ بجے رات کا وقت ہے یہ تینوں خاندان یعنی ریحانہ و سیٹھ صاحب بنگلور والے و نور محمد صاحب و عالیہ خاتون اور ہمارے مولوی صاحب معہ بیگم صاحب و بہو بیٹی وغیرہ کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی اسٹیشن پر آگئے تھے۔ چونکہ لکھنؤ اور بنگلور کی ٹرینیں تین اور چار بجے صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہوتی تھیں۔ آدھی رات کو سردی میں اُٹھ کر انہیں بہت دقت و تکلیف ہوتی۔ مولوی علی صاحب کے سیکنڈ کے دو درجے ریزرو تھے اور اسی میں نور محمد اور عالیہ خاتون کے لئے بھی سیٹ تھی کیوں کہ وہ ان ہی کے ساتھ لکھنؤ جا رہے تھے۔ اور سیٹھ صاحب بنگلور والے نے چونکہ درجہ ریزرو نہیں کرایا تھا وہ باپ بیٹی ویٹنگ روم میں ٹھہرے اور اُن کی وجہ سے ان کے دوست علی صاحب بھی اُن ہی کے پاس ایک کوچ پر لیٹ رہے۔ بیگم حسن کے پاس چونکہ چھوٹا بچہ تھا وہ آرام سے اپنے کمپارٹمنٹ میں جا سوئیں۔ حسن صاحب بھی وہیں آ کر سو رہے۔

بیگم علی صاحب کو بھی ان کی تکلیف کے خیال سے مولوی علی خود آ کر دوسرے درجہ میں لٹا گئے۔

اب نور محمد، عالیہ و زبیدہ اور بی ریحانہ کے لیڈیز ویٹنگ روم میں بیٹھے رہے۔ اس عمر میں اپنے آرام کا خیال کہاں ہوتا ہے۔

ریحانہ سے اُن دونوں کو بہت محبت تھی آج وہ ان سے جدا ہو رہی تھی اُن کو اس کے ساتھ ایک ایک گھڑی غنیمت تھی۔ انہوں نے رات یوں ہی ختم کی۔ نور محمد صاحب کبھی یہاں آ جاتے تھے کبھی مردانہ ویٹنگ روم میں جا کر ذرا لیٹ جاتے تھے۔ یہ تینوں بہنیں ایک ہی کاچ پر ایک ہی کمبل میں لپٹی بیٹھی تھیں۔

عالیہ خاتون: ''اب دیکھئے خدا کب ملاتا ہے۔

ریحانہ: ''انشاء اللہ بہت جلدی۔ بہن زبیدہ کی شادی میں۔''

عالیہ: ''وہ تو شادی سے انکار کرتی ہیں۔''

ریحانہ: ''نہیں اب رضامند ہو جائیں گی۔ بیچارا کپتان ان کے لئے قوم پرست ہو گیا ہے اور کیا چاہتی ہیں؟ آج ہی دیکھو کھانے پر کس قدر رنجیدہ و غمگین نظر آتے تھے۔ آخر ان ہی کے جانے کا غم تھا۔''

عالیہ: (زبیدہ سے) ''ہاں بہن میز پر بے حد رنجیدہ تھے آخری دعوت ہے آج تو آپ کو بھی شریک ہونا تھا ہم سے تو انکار نہ کیا گیا۔ جگدیش رانی جی کی بھی خوشی تھی کہ آخری کھانے میں سب شریک ہوں۔ میں دیکھ رہی تھی جس وقت وہ آپ کو کھانا بھجوا رہی تھیں اُن کا منہ بنا ہوا تھا۔''

ریحانہ: ''اجی ان کا منہ تو جیسا بنا تھا بنا تھا۔ غمزدہ چہرہ تو ہمارے بھائی قمر کا تھا۔''

زبیدہ: ''آخر کوئی اور بات بھی؟ یا یہی ایک جگر خراش ذکر رہ گیا ہے۔''

ریحانہ: ''پیاری بہن یہ جگر خراش ہے۔ آہ آپ نے اُن کا وہ نقشہ نہیں دیکھا جس وقت اسٹیشن آنے کو ہم لوگ موٹروں پر سوار ہو رہے تھے۔ وہ سب سے رخصت ہونے کے لئے عجیب حالت میں سر جھکائے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ اوروں سے تو مل گئے مگر میں نے دیکھا اور بہن عالیہ نے اچھی طرح دیکھا جیسے ہی بھائی حسن صاحب نے اُن کا ہاتھ چھوڑ کر موٹر پر قدم رکھا وہ تیزی سے سیڑھیوں پر سے اُتر کر آنکھوں پر رومال رکھتے ہوئے دالان کی طرف چلے گئے۔ ان سے اب الہ آباد میں ٹھہرا نہ جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کل ہی چلے جائیں گے۔''

زبیدہ: (کھڑی ہو کر) ''اچھا دل بھر کر یہی ذکر کر لیں میں ذرا باہر چاندنی میں ٹہلتی ہوں میرے سر میں درد سا ہے۔ زبیدہ کمرے سے نکل کر ڈریسنگ روم کے پیچھے کی طرف جہاں اس وقت چاندنی کھلی پڑی تھی اور سناٹا چھا رہا تھا ٹہلنے لگی گو کسی قدر سردی تھی لیکن اُس نے شملہ کے سیاہ پٹو کا اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ تو پچھلے دروازے سے باہر گئیں اور سامنے کے دروازے سے نور محمد ڈریسنگ روم میں داخل ہوئے۔''

نور محمد: "ایک بج رہا ہے اب تک آپ لوگ نہیں سوئے۔ ہم تو خوب سوئے بنت علی اس وقت باہر کیوں گئیں؟

عالیہ: "اُن کے سر میں درد تھا کہنے لگیں ٹہل آؤں۔"

نور محمد: "اوہو! سردی میں یہ تو ٹھیک نہیں سامنے برآمدے میں ٹہلتی ہوتیں میں بلاتا ہوں۔"

وہ انہیں بلانے گئے اور یہ دونوں لڑکیاں جو نیند میں جھوم رہی تھیں اُسی کمبل میں لپٹ کر بے خبر سو گئیں۔ نور محمد کو ویٹنگ روم کے قریب تو وہ نظر نہ آئیں اور دیکھا کہ کوئی شخص سیاہ کپڑے میں لپٹا ایک ٹم ٹم سے اترا۔ کوچ میں سے ایک بکس، بستر اترواکر دوسرے ویٹنگ روم کی سیڑھیوں پر رکھوا دیا اور کرایہ دے کر اُسے رخصت کیا اور بجائے ویٹنگ روم کے اندر جانے کے خود وہیں ٹہلنا شروع کیا۔ نور محمد مہندی کی باڑھ میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ زبیدہ کا کہیں پتہ نہ تھا مگر اس نئے مسافر کے خیال میں کہ یہ کون ہے اور کہاں کو جائے گا۔ اسباب ویٹنگ روم کے باہر کیوں ڈال دیا؟ نور محمد بھی وہیں ٹہلتے رہے۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ سامنے سے زبیدہ اپنے ویٹنگ روم کی طرف آرہی ہے۔ جیسے ہی وہ باڑھ کے قریب پہنچی وہ سیاہ کمبل پوش مسافر اس کی طرف بڑھا اور جلدی سے قدموں پر گر گیا۔ ایک نامعلوم شخص کو اپنی بہن کے قدموں پر گرتے دیکھ کر بے اختیار نور محمد صاحب ان کی طرف بڑھنے لگے کہ اس شخص کو علیحدہ کریں مگر دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ انہوں نے زبیدہ کی آواز کو پہچان لیا اور پیچھے کو ہٹ گئے ایسے کہ اب وہ دونوں اُن کو نہ دیکھ سکتے تھے اور یہ بخوبی قریب ہی سے باتیں سن سکتے تھے۔

زبیدہ: "خدا کے واسطے قمر اب مجھے اس دنیا میں حیران نہ کرو۔"

قمر: (بمنت) خدا کے واسطے زبیدہ فرشتہ خصلت زبیدہ میں یہ نہیں کہتا کہ "معاف کرو" صرف اتنی عرض ہے کہ آخری رخصت ہولو۔ آخری کلمے سن لو۔"

زبیدہ: (پیروں سے سر اُٹھا کر) "میں اب سے دو سال قبل رخصت ہو چکی ہوں۔ اس دن رخصت ہوئی ہوں جب مجھے بے ہوش پڑا چھوڑ کر "کلب" اور ڈپٹی کمشنر صاحب کے ہاں فوراً چلا جانا ضروری خیال کیا گیا تھا۔ اب بس۔"

قمر: (ہاتھ جوڑ کر) "بیشک بیشک یہ درست اس شخص سے بات کرنا گوارہ نہیں کرسکتیں جس کم بخت نے ایسا ناقابل تلافی گناہ کیا ہو مگر اپنی تمام مہربانی اپنے اسی گذشتہ کرم کا صدقہ چند کلمے سن لو۔"

زبیدہ: (بازو سے سہارا لے کر) "اچھا کہئے کہئے کون سے ضروری کلمات ہیں۔"

قمر: "میری حالت سے آپ کو بخوبی آگاہی ہے۔ مجھے اپنے کیے کا کافی معاوضہ مل گیا۔ میں بدبخت اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ ملازمت سے اب مستعفی ہونا ٹھان لیا۔ اس شیطان نجمہ سے بھی قطعی طور پر علیحدگی اختیار کرلی۔ اب اپنی زندگی کو آپ کی رائے کے مطابق کسی قومی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں۔"

زبیدہ: (مسکرا کر) "میری رائے کی کیا ضرورت ہے اگر آپ کا دل پھر اپنی قوم و مذہب کی طرف آگیا ہے تو فی زمانہ بیسوں قومی کام ہیں کوئی سا اپنے ذمہ لے لیں۔ خلافت کمیٹیوں سے دریافت کریں مگر اس عورت کے ساتھ بدسلوکی سخت گناہ ہے جس نے اپنی عزت و عصمت آپ کی جھوٹی محبت کے دھوکے میں آکے برباد کی۔ میری رائے تو یہ ہے کہ نجمہ کو واپس لائیں اور قومیت کی روح پھونکیں۔ اپنا ہم خیال بنا کر قومی خدمت لیں۔"

قمر: "آپ کا فرمان بجا لیکن وہ اس قدر شیطان خصلت عورت ہے کہ خدا کی پناہ۔ میں نے اسے دھوکہ نہیں دیا بلکہ اس شیطان نے مجھے دھوکہ دیا۔ صرف میری عزت اور دولت حاصل کرنے کو مجھ سے شادی کی اور اپنے تمام شرمناک پہلے تعلقات محبت قائم رکھے وہ خدا کی گنہگار ایک فرشتہ خصال کی گنہگار اور میری ملزمہ قابلِ گردن زدنی ہے۔"

زبیدہ: (ہنس کر) "دیکھو قمر ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالو اور اس تلون مزاجی سے باز آؤ ابھی کل اس سے محبت و ثابت قدمی کے عہد و پیمان تھے اور آج اس کے حق میں یہ کلمات، آپ کو ہندوستان میں کوئی لڑکی نہ دے گا۔

آخر اس طرح خانماں برباد کب تک پھرو گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ نجمہ کو مل کر سمجھاؤ اور اسی سے اپنا گھر آباد کرو کیوں کہ بغیر اس کے آپ پوری عزت و حرمت کی زندگی بسر نہیں کرسکتے اور سوائے نجمہ کے اب کوئی معزز لڑکی آپ کو ملنا بہت دشوار ہے۔ آپ کی تلون مزاجی کا شہرہ عام ہو چکا ہے۔"

قمر: ''یہ صحیح ہے میں اپنی شامت اعمال کی وجہ سے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا (آسمان کو دیکھ کر) آہ! خدا مجھے بخشے۔ میرا پہلا گناہ ناقابلِ عفو ہے مگر نجمہ کے ساتھ جیسا سلوک کیا گیا بخدا وہ اسی کی مستحق تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ سزا کے قابل ہے۔''

زبیدہ: (مسکرا کر) ''اس کی محبت کا یہی جواب ہے؟ افسوس ایک عورت جس نے آپ کی محبت میں اپنی کوئی شے آپ سے عزیز نہ رکھی۔ اس کے حق میں آپ یہ کلمات زبان سے نکالیں گے آپ کے فرقہ والے معاف فرمایئے اکثر سنگدل و ناانصاف ہیں مگر ایسے بھی زیادہ نہیں کہ کل ہی جس کے لئے آپ دنیا و دین فراموش کئے ہوئے تھے آج اس کے سزا دینے کے درپے ہیں ایسا سلوک خلاف انسانیت ہے، غصہ کو جانے دیں۔''

قمر: ''غصہ کیسا؟ میں نے اس درجہ صبر وضبط سے کام لیا کہ دو سال میں میری روح سلب ہو گئی لیکن وہ بدکردار عورت جس کے دھوکہ میں آ کر میں اپنی عقل وخرد کھو چکا تھا شیطان نکلی۔ آپ کے روبرو میں ان حالات کا بیان کرنا خلاف تہذیب خیال کرتا ہوں۔''

زبیدہ: ''مجھے وہ تمام حالات آپ کی شادی سے قبل معلوم تھے۔ بیان کرنا لاحاصل ہے مگر جب اس کو بیوی بنا لیا تو اب نباہنا فرض وواجب ہے۔''

قمر: ''میں کیا کہوں آپ ایسی فرشتہ خصال خاتون کے آگے بیان کرنا شرم ہے مگر آپ مجبور کرتی ہیں تو میں کہتا ہوں۔ اس کمبخت نے اپنے تعلقات ناجائز سے بعد شادی کے بھی احتراز نہ کیا۔ میں نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ میں بدبخت کیفر کردار کو پہنچ چکا ہوں۔ آہ! اب مجھے نجات دلانا اور باقی عمر ملک وقوم کی خدمت میں صرف کرانا صرف معصوم اور فرشتہ خصلت زبیدہ کے اختیارات میں ہے۔''

زبیدہ: (طنزاً ہنس کر) ''کیا خوب جب اس نئے مشغلہ سے دل بھر گیا اس زندگی میں ناکامی ہوئی تو پھر زبیدہ آہ کمبخت وناکام زبیدہ کی طرف پھرے میں اب آپ کو کوئی رائے نہیں دے سکتی۔ ہاں اگر آپ کا دل ان تلخ کامیوں کی وجہ سے اس طرز زندگی سے ہٹ گیا ہے تو بہت خوب۔ خدا نے ایک گمراہ مسلمان کو مسلمان بنا دیا۔ بسم اللہ بہت خوشی سے قومی خدمت کیجئے۔ آپ جیسے جوشیلے وقابل نوجوان کو قوم بہت خوشی سے لے گی اس طبقہ میں آپ کا شاندار استقبال ہو گا۔''

قمر: "بس صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے کے مطابق کوئی کام اختیار کروں اور حتی الامکان آپ کی قومی خدمات میں مدد کروں (نیچے کو سر جھکا کر آہ سرد بھر کر) اب صرف سوائے اس کے میں کمبخت اور کچھ کہنے کی کب جرأت کر سکتا ہوں۔ فی الحقیقت میرا منہ تو اس قابل بھی نہ تھا کہ آپ کو منہ دکھاؤں۔ آپ اس سیاہ رُو سے باتیں کریں۔ معزز بیگم آپ میری اس گفتگو سے کوئی اور بڑھا ہوا ارادہ نہ سمجھیں اس کے قابل تو خدا نے جس خوش نصیب کو پیدا کیا تھا پہنچا دیا۔ میں اس قدر بھی حواس باختہ نہیں ہوں کہ مولوی نور محمد جس کا دل دراصل نورِ محمدؐ سے روشن ہے۔ اسی کی قسمت کا ستارہ بھی روشن ہے اُن کی موجودگی میں اپنے ایسے سیاہ باطن کی روسیاہی ہٹا کر معافی کا خواستگار ہونے کی جسارت کروں۔ معاذ اللہ یہ بدنصیب اب راندۂ درگاہ ہے۔" یہ فقرے کہہ کر قمر زمین پر بیٹھ گئے۔ اُن کا دل سیاہی کے دریا میں ڈوب گیا۔ چاند کی شفاف روشنی میں آنکھیں اندھیری ہو گئیں سر چکرانے لگا سیڑھیوں سے سہارا لیا۔ زبیدہ اُن کی اس تقریر کو استعجاب یا افسوس یا غصے خدا جانے کس حالت میں سن رہی تھی مگر اُن کو ایسی لڑکھڑاتی حالت میں بیٹھا دیکھ کر جھکی اور کہا۔

زبیدہ: "میں آپ کی اس عجیب تقریر و بدظنی کے اظہار کا بخوبی جواب دیتی مگر چونکہ طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے اس قدر سنگ دلی میرے مذہب میں گناہ ہے۔ کہیے کیا حالت ہے؟ سر میں درد ہونے لگا۔ صورت سے آپ بہت بیمار معلوم ہوتے ہیں مگر............"

قمر: (بچشم تر) "کچھ ویسے ہی سر چکرا گیا ہے مجھے کچھ عرصہ سے اختلاج قلب کی شکایت ہو گئی ہے۔"

زبیدہ: "تو اس وقت آپ اسٹیشن پر اسباب لے کر کیوں آئے ہیں اگر روانگی کا ارادہ ہے تو جلدی ویٹنگ روم میں جایئے سردی زیادہ ہے۔ تکلیف بڑھ نہ جائے کہاں جا رہے ہیں۔"

قمر: "جہنم میں مجھ خانماں برباد کا ٹھکانہ اور کہاں ہے۔"

زبیدہ: "پھر مع اسباب کے آدھی رات کو کیوں آئے ہیں؟"

قمر: "یہ تو رہنے دیجیے کہیں چلا جاؤں گا۔ پہلے یہ فرمائیں کہ مجھ گنہگار پر

بدظنی کا گمان کیسے گذرا۔"

زبیدہ: (ہاتھ پکڑ کر) "اچھا یہاں سے اٹھیے۔ ٹھنڈ زیادہ ہے۔ ہمارے ڈیننگ روم میں چلیے وہاں سوائے عالیہ اور ریحانہ کے اور کوئی نہیں۔"

چنانچہ دونوں کمرے میں آئے لڑکیاں بے خبر پڑی سو رہی تھیں۔ نور محمد بھی مصلحتاً باہر ہی رہے۔ زبیدہ نے اُن کو ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود دوسری پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر سکوت کا عالم طاری رہا۔ پھر سر اٹھا کر انہوں نے کہا۔

قمر: "زبیدہ میں عالمِ خواب میں ہوں یا بیداری میں آپ اور اس قدر مہربان؟"

زبیدہ: "آپ اتنی مہربانی کے قابل تو نہیں ہیں مگر تکلیف میں دیکھ کر اٹھا لائی۔ اب بھائی نور محمد صاحب سے کہتی ہوں وہ آپ کو مردانہ کمرے میں لے جائیں گے۔ وہیں ابا جان اور چچا جان سوتے ہیں۔ کہیے تو آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

قمر: (بھائی کا لفظ سن کر متعجب ہوئے اور ذرا رُک کر جواب دیا) "نور محمد صاحب اس وقت کہاں ہیں؟ میں نہیں بتا سکتا۔ ابھی تک کوئی ارادہ نہیں۔ کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آتا۔ جائے ملازمت پر ابھی جانا نہیں ایک ماہ کی رخصت لی ہے وہ ختم ہو لے۔ پھر کہاں جاؤں ابھی اس کا فیصلہ نہیں کیا۔"

زبیدہ: "تو اسباب لے کر کیوں آ گئے۔"

قمر: "آپ سب کے آ جانے کے بعد سناٹا ہو گیا دل نہ لگا۔ نکل کھڑا ہوا آپ مجھ سے مل کر رخصت بھی نہ ہوئی تھیں ایک امید موہوم سی تھی کہ شاید آخری بار رخصت ہو لیں ورنہ کم از کم آخری بار آپ سب کو پھر ایک نظر دیکھ لوں سو امید پوری ہوئی۔ آج کے بعد یہ آوارہ گرد پھر کبھی نظر نہ آئے گا۔ زبیدہ دُعا کرتی رہنا کہ خدا مجھے انسانیت میں اپنے احکام کے اندر ہی رکھے اور اس طرح خاتمہ ہو جس طرح ایک مردِ مسلمان کا ہونا چاہیے۔ کہیں میں اپنی ناکامیوں سے تنگ آ کر اپنے تئیں ہلاک نہ کر دوں نور محمد صاحب کہاں ہیں؟"

زبیدہ: "آپ کو اُن کی کیا فکر ہے کہیں ہوں گے؟"

قمر: "ڈرتا ہوں وہ میرا یہاں ہونا نامناسب خیال کریں گے۔"

زبیدہ: "اُن کو اس کا کیا حق حاصل ہے میری بابت مناسب نامناسب

دیکھا کریں۔"

قمر: (چھت کو دیکھ کر) "آہ اُن کو سب حقوق حاصل ہیں۔وہ مثل عزیز قریب کے آپ کی فیملی میں داخل ہیں۔بے شک وہ خوش نصیب ہیں اس قابل ہیں اُن کو خدا نے یہ رتبہ دیا۔"

زبیدہ: (چیں بجبیں ہوکر) "یہ آپ کیا بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔کیسی حاسدانہ باتیں کر رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے آپ کو اس فیملی کی بہت قدر ہے۔

مانا کہ نورمحمد ایک نیک دل لیڈر قوم ہونے کی وجہ سے ہمارے گھر میں بہت عزیز ہیں مگر نہ ایسا جو آپ کا خیال ہے۔

آپ مہمل الفاظ کو چھوڑ کر صاف صاف کہہ ڈالئے آخر آپ کا اس نیک نفس اور سیدھے مسلمان کی بابت کیا گمان ہے۔"

قمر: (کرسی سے اُٹھ کر) "زبیدہ معاف کرو مجھ سے اس وقت یہاں ٹھہر انہیں جاتا۔آپ کو معلوم ہے صبح سے سخت، دردِ سر کی تکلیف تھی اس وقت کچھ دل گھٹا جاتا ہے۔میں سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں جا کر لیٹوں گا۔برابر والے میں تو آپ کے بزرگ آرام فرما ہیں۔وہاں جانا ٹھیک نہیں۔اچھا خدا حافظ۔"

قمر صاحب نے یہ کہا اور جلدی سے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل گئے۔وہ پیچھے پیچھے گئی اور نورمحمد صاحب وہیں سیڑھیوں پر کھڑے تھے اُن سے کہا جلدی چلے جایئے، مسٹر قمر کی طبیعت بہت خراب ہے سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں لٹا دیں۔

انہوں نے فوراً اس کی خواہش کی تعمیل کی اور زبیدہ اندر آ کر ٹہلنے لگی۔گھڑی دیکھی ڈھائی بجے تھے دونوں لڑکیوں کو جگایا۔ریحانہ کی ٹرین کا وقت قریب تھا اتنے میں سیٹھ صاحب زبیدہ سے رخصت ہونے آگئے اور ان باپ بیٹی نے ان باپ بیٹی یعنی سیٹھ صاحب اور ریحانہ کو سوار کرایا۔پھر خود بھی معہ عالیہ کے اپنے کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھے۔ زبیدہ نورمحمد کے انتظار میں تھی کہ اب آتے ہیں کہ پونے چار بجے وہ آئے اور خاموش بیٹھ گئے۔زبیدہ نے بھی کوئی سوال نہ کیا۔چند منٹ گذرے اور ٹرین چل دی۔ابھی رات باقی تھی۔مولوی علی صاحب بھی اپنی بیگم صاحبہ کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔عالیہ اور زبیدہ

کتاب دیکھنے لگیں۔ تب نور محمد صاحب نے اپنا اخبار رکھ کر عالیہ سے کہا۔

نور محمد: ''عالیہ تمہیں میرا انتظار ہوگا کہ ٹرین کا وقت ہوگیا اور بھائی نہیں آئے۔''

عالیہ: ''جی ہاں میں بار بار دیکھتی تھی آپ کہاں ہیں؟''

نور محمد: ''کپتان صاحب اچانک ہی کہیں کی روانگی کے ارادہ سے آگئے اور طبیعت کچھ خراب ہوگئی۔ میں اُن کو ویٹنگ روم میں لٹانے کو لے گیا تھا وہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے پکڑ رکھا عجیب عجیب بہکی باتیں کیں سمجھ میں نہیں آتا بنتے ہیں یا خدانخواستہ خلل دماغ ہے۔''

زبیدہ: (بے چینی سے) ''طبیعت تو درست تھی۔ مجھے تو سینہ میں درد معلوم ہوتا تھا۔''

نور محمد: (مسکرا کر) ''ہاں اُن کا ہاتھ تو برابر سینہ پر ہی رہا تھا مگر کچھ کہتے نہ تھے۔ میرے بڑے احسان مند ہوئے تھے۔ بے حد شکریہ کا اظہار تھا اور عجیب عجیب باتیں اس وقت موقع نہیں لکھنؤ پہنچ کر عرض کروں گا۔''

زبیدہ: ''وہیں پڑے رہے یا سوار ہوگئے۔''

نور محمد: (ہنس کر) مجھے اس کا علم نہیں انہوں نے زبردستی مجھے کمرے سے نکال دیا کہ گاڑی میں جاؤ۔ نہ معلوم الٰہ آباد میں ہیں یا جلدی سے آکر سوار ہوگئے۔ کچھ نہیں بتایا۔ عجیب انسان ہیں اگر واقعی حالت خراب ہے تو قابلِ رحم ہے۔ آپ کے خاندان کو ان پر ترس کھانا واجب ہے۔''

(۸)

ان دنوں جوشِ جنوں ہے ترے دیوانے کو
طوقِ زنجیر گراں چاہئے پہنانے کو

لکھنؤ پہنچنے کے تیسرے دن مولوی نور محمد صاحب کو مع عالیہ بیگم کے رخصت ہونا تھا۔ شام کا وقت ہے۔ زبیدہ اپنے کمرے میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھیں کہ نور محمد داخل ہوئے وہ اخبار رکھ کر اُن کی طرف مخاطب ہوئیں۔

زبیدہ: "کیسے تشریف لائے۔"

نور محمد: "آج علی گڑھ جا رہا ہوں آپ کو معلوم ہے۔"

زبیدہ: "جی ہاں آپ تو جا رہے ہیں غم یہ ہے کہ میری عالیہ کو بھی لے جائیں گے۔"

نور محمد: "تمہیں میرے جانے کی ذرا پرواہ نہیں سچ کہہ دو زبیدہ ذرا مروّت نہ کرنا۔"

زبیدہ: (مسکراتے ہوئے) "یہ اپنے دل سے پوچھئے اگر آپ کو یہاں سے جانے کا کچھ رنج ہوگا تو رہنے والوں پر بھی اس کا ضرور اثر ہوگا۔"

نور محمد: (قریب کو کرسی کر کے) "بنت علی اگر میں کچھ مفصل عرض کرنا چاہوں تو اس کی اجازت دیں گی۔"

زبیدہ: "فرمایئے؟"

نور محمد: "ہماری ایک عرصہ سے واقفیت بلکہ دوستی ہے۔ اس اثنا میں مَیں بارہا

آیا اور آپ کے ہاں ٹھہرا۔ آپ کے والدین مجھ پر بے انتہا شفقت کرتے ہیں۔ بھائی بھاوج بھی مہربان ہیں لیکن میری بدقسمتی ہے کہ جسے مہربان ہونا چاہیے وہ نامہربان ہے۔ میں اب جا رہا ہوں آپ صاف صاف کہہ دیں کہ مجھ سے خط و کتابت رکھیں گی اور پھر یہاں آنے کی اجازت دیں گی۔"

زبیدہ: "یہ کس طرح ثابت ہوا کہ میں نامہربان ہوں؟ اگر آپ کے دل میں میرا خیال ہے تو مجھے بھی ضرور ہوگا۔ خط و کتابت جیسی تھی ویسی ہی رہے گی اور چونکہ آپ کے اس خاندان سے مخلصانہ تعلقات ہیں اس لئے آنا جانا بھی جاری رہے گا۔ میرا اس میں کیا دخل ہے۔"

نور محمد: "نہیں جی، اگر آپ نے میرا آنا ناپسند کیا تو پھر اس طرف میں اپنی منحوس شکل لے کر کبھی نہ آؤں گا۔"

زبیدہ: "ایسا نہ کہئے گو میرا دل رنج سہتے سہتے سخت ہوگیا ہے تاہم انسان ہوں ہر چہار طرف سے بوچھار نہ ہونی چاہئے۔

نور محمد: "زبیدہ میں نے اپنے خیالات اور جذبات کو اب تک بہت دبائے رکھا ہے۔"

زبیدہ: "مولوی صاحب میں زمانہ کی ستائی دکھیا ہوں اب مجھے ایک نئی مصیبت سے بچائے رکھئے میرا دل صد پارہ اس قابل نہیں رہا۔"

"زبیدہ سے یہ سن کر نور محمد بے قرار ہو گئے اور خوب روئے زبیدہ بھی رونے لگی۔ آدھ گھنٹہ یہی نقشہ رہا کہ آیا آ گئی اور اس نے کہا کہ بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔"

"وہ تو اپنی حالت درست کر کے اُدھر گئیں اور نور محمد اپنے کمرے میں۔ بیگم علی کے پاس ان کی بہو صالحہ حسن بیٹھی تھیں اور زبیدہ کی نسبت گفتگو ہو رہی تھی۔"

صالحہ حسن: "زبیدہ بی بی غور سے سنو والدہ صاحبہ کیا فرماتی ہیں؟"

بیگم علی: "بیٹی تم سمجھ دار ہو بعض اوقات ہمیں مشورہ دیتی ہو۔ اب سن شعور کو پہنچ چکی ہو دوسری زندگی میں قدم رکھنا چاہئے۔ ہم نے تمہاری مرضی کے موافق ایک جگہ رشتہ کیا وہ خدا کو منظور نہ ہوا لیکن اب خدا نے ہم کو اس سے بہتر ایک اور عطا کیا جو ہمہ صفت

موصوف ہونے کے علاوہ دل سے تمہارا قدر دان ہے۔ دیکھو وہ آج جا رہا ہے اور تمہارے ہاتھوں بہت بے دل ہو کر جا رہا ہے۔ اس کو کھو کر پچھتانہ ہوگا اور تمہارے ابا جان کو بھی بے انتہا صدمہ ہوگا۔"

زبیدہ: (نیچی آنکھیں کر کے) "اماں جان جب تبدیل زندگی میں ناپسند کرتی ہوں تو آپ صاحبان مجھے کیوں مجبور کرتی ہیں؟ میں نے اپنے آپ کو قومی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

بیگم علی: "رہنے دے لڑکی قومی خدمت۔ کسی کی بھی ایسی گذری ہے جو تیری گذر جائے گی؟ یورپین لیڈیوں اور ہندوستانی کنواری لڑکیوں میں بہت فرق ہے۔ تمہیں شادی کرنی ہوگی۔"

"زبیدہ یہ آخری حکم سن کر روتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔"

صالحہ حسن: "اماں جان سختی نہ کیجئے نرمی کا اثر ہوگا۔"

بیگم علی: "سختی نرمی سب کر دیکھی وہ کسی طرح قابو میں نہیں آتی۔ نور محمد سا شریف لڑکا خواہ مخواہ برباد ہو رہا ہے۔ دیکھو تم ہی میاں بیوی نے ریحانہ سے شادی کرنے پر کتنا زور دیا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا مجھے تو بیٹی سے زیادہ اُس کی شادی کی فکر ہے۔"

صالحہ حسن: "قمر الزماں بھی تو اب تباہ حال ہو کر کچھ سدھرے سے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے بہن کا خیال بھی اسی طرف ہو گیا ہو۔"

بیگم علی: "توبہ کرو وہ اس قابل نہیں، کیا وہ منظور کر لیں گی کہ نجمہ کی موجودگی میں اس سے شادی کر لیں۔ میاں بیوی کی خفگی کا کیا اعتبار جس نے انہیں کنواری کو چھوڑ کر شادی کر لی وہ ان سے بیاہ کر کے پھر اس سے صلح نہیں کر سکتا۔"

صالحہ حسن: "اماں جان یہ کب ممکن ہے۔ ابا جان اب قمر الزماں کو کبھی منظور نہ کریں گے۔"

حسن: (باہر سے آکر) "صالحہ ادھر آجاؤ۔ دیکھو بھائی نور محمد صاحب بہت رنجیدہ ہو رہے ہیں معلوم کرو کسی نے کچھ کہا تو نہیں۔ میں نے بہت دریافت کیا نہیں بتاتے۔"

بیگم علی: "کسی کو کیا کہنا تھا اسی بدنصیب نے سخت کلامی کی ہوگی۔"

صالحہ میاں کا یہ حکم سن کر نور محمد کے کمرے میں آئیں وہ آرام چوکی پر پڑے منہ پر رومال رکھے رو رہے تھے۔ انہوں نے آکر چہرے سے رومال ہٹایا۔

صالحہ حسن: "بھائی جان کیا بات ہے؟ آپ کے حسن یہاں سے بہت پریشان گئے ہیں سچ سچ کہہ ڈالیے کیا زبیدہ نے کچھ کہا ہے۔"

نور محمد: "کچھ نہیں کوئی کیا کہتا۔ میری قسمت مجھ سے برگشتہ ہوتی جاتی ہے۔"

صالحہ: "تو پھر اتنا رنج کیوں کرتے ہیں؟ نہیں نہ سہی۔ ہم اس سے بدرجہا اچھی دلہن ڈھونڈ دیں گے۔"

نور محمد: بھابی جان اگر زبیدہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب میری شادی نہ ہوگی۔"

صالحہ: "بھائی جان ہوش کی خبر لیجیے جب کوئی ہمیں نہ چاہے تو ہم کیوں اس پر جان دیں۔ یقین کریں کہ وہ قمر کے سوا کسی دوسرے سے شادی نہ کرے گی۔"

نور محمد: "تو للہ اسی سے کروا دیں پھر ہمیں بھی صبر آجائے گا کہ جس کی تھی اسی کو مل گئی۔"

صالحہ: "اس سے تو اب ناممکن ہو چکا خواہ زبیدہ بیگم مر ہی کیوں نہ جائیں۔ ابا جان شادی شدہ شخص کو کبھی بیٹی نہ دیں گے۔"

زبیدہ: (باہر سے آکر) "اچھا اب آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔"

صالحہ: "آپ کے بھائی صاحب نے ہی بھیجا ہے کہ جا کر مولوی صاحب کی خبر لو وہ بہت پریشان حال ہیں۔"

زبیدہ: "کیا بات ہے کیوں پریشان ہیں۔"

صالحہ: (باہر جاتے ہوئے) "یہ اب تم پوچھ لو۔"

زبیدہ: "بھائی کیوں اس قدر برہم ہیں۔ کیا آپ نے میری شکایت کی ہے؟"

نور محمد: "میں اور زبیدہ کی شکایت اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔"

زبیدہ: "مگر ایسا بھی کیا رونا کہ تمام کوٹھی میں شور مچ گیا بھائی جان بیوی کے پاس گھبرائے ہوئے پہنچے۔ آپا میرے پاس سٹپٹائی ہوئی گئی۔ گو میں خود پریشان تھی مگر آپ کا حال سن کر رہا نہ گیا۔ کہئے آخر کس بات سے زیادہ صدمہ پہنچا؟"

نور محمد: ”قصہ یہ عرض کرتا ہوں کوئی بات نہیں۔ صرف یہاں سے جانے کا اور پھر نہ آنے کا رنج خون رُلا رہا ہے۔“

زبیدہ: ”ابھی سے اس قدر کم حوصلہ ہو گئے یہ تو روزِ اوّل ہے۔“

نور محمد: ”آہ! ہمارا تو اوّل بھی اور آخر بھی یہی ہے۔“

زبیدہ: ”آپ کو ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے یہ محبت والفت کے جھگڑے بے کاروں اوباشوں کو زیب دیتے ہیں۔ ہم خدمت گذاران قوم کو یہ خیالات مناسب نہیں۔“

نور محمد:

وہ آنکھ آنکھ ہی نہیں گریاں اگر نہ ہو
سینے میں دل نہیں ہے جو بریاں اگر نہ ہو

زبیدہ: ”تو بس انسان پانی ہو کر بہہ جائے۔“

نور محمد: ”ہاں بہہ بھی جاتے ہیں۔ ہم تو چیز ہی کیا ہیں، بڑے بڑے علماء پیر و دانا اس کوچہ میں قدم رکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ خدا بری گھڑی سے بچائے لیکن وہ آجائے تو انسان مجبور ہے۔“

زبیدہ: ”مولوی صاحب اچھے فلاسفر تھے مگر کچھ دن سے عقل ٹھکانے نہیں رہی۔“

نور محمد:

ان دنوں جوشِ جنوں ہے ترے دیوانے کو
طوق وزنجیر گراں چاہئے پہنانے کو

زبیدہ: ”آہا فلاسفر صاحب شاعر بھی ہو گئے۔“

یہ آخری فقرے سن کر نور محمد کی عجیب حالت ہو گئی۔ کرسی سے کھڑے ہو گئے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ زبیدہ سمجھ گئی کہ نوک جھونک اُن کو بری لگی ہے مگر وہ مجبور تھی اب تو زبان سے جو نکل گیا نکل گیا۔ خود بھی اٹھیں اور اُن کے قریب آکر ٹہلنے لگیں۔

زبیدہ: ”مولوی صاحب کہوں، فلاسفر کہوں یا شاعر کہوں۔ مزاج کیسا ہے یا پھر برہم ہو گئے۔“

نور محمد: ”آپ کو رحم تو نہ آیا کہ ایک اچھا خاصا ذی ہوش انسان جسے زمانہ کا

سفر کہتا تھا وہ آج دیوانہ ہے۔"

زبیدہ: (ہنس کر) "عالموں کی دیوانگی بھی مفید ہوتی ہے۔ دیکھو شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب آزاد مرحوم عالم دیوانگی میں کیا کیا تصنیف کر گئے۔"

نور محمد: "کیا قمر کا بھی اسی طرح مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔"

زبیدہ: "یہ نام نہ لیجئے میرا دل دکھتا ہے۔"

نور محمد: "اب دل کہاں تک دُکھے جائے گا بس صبر کر لیجئے۔"

زبیدہ: "صبر ہی کر لیا اور کیا ہے مگر دل کی کلی مرجھا چکی ہے اس کا کھلنا اب ناممکن ہے۔"

نور محمد: "ایسی سخت پژمردگی میں زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ اپنے لئے نہیں کسی دوسرے کے لئے اس پژمردہ کلی سے شگفتہ کرنے کی کوشش کریں۔"

زبیدہ: "میں تو اس کوشش میں ناکام ہو چکی ہوں (مسکرا کر) اب آپ کر دیکھئے اگر ہمت ہے۔"

نور محمد: "کاش خدا میری زبان میں وہ اثر دیتا جو کسی بے وفا کے تھا۔"

زبیدہ: "مولوی صاحب مجھ سوختہ دل کا خیال کر کے کیوں اپنے پر ارمان دل کو غم آلود کرتے ہیں؟ میری دلی آرزو تو یہ ہے کہ آپ لائق فائق حسین و خوش دل لڑکی ریحانہ سے محبت کر کے اپنا دل شاد گھر آباد کریں۔"

نور محمد: "آہ! زبیدہ اگر آپ اس قدر رنجیدہ و شکستہ دل ہیں تو میں اب کچھ نہ کہوں گا لیکن ریحانہ سے شادی کس طرح ہو سکتی ہے ان میں اور مجھ میں محبت نہیں۔ بغیر محبت کے رفیق زندگی کیسے بنا سکتا ہوں۔"

زبیدہ: "محبت کرنے سے ہو سکتی ہے۔"

نور محمد: (مسکراتے ہوئے) "یہی تو مشکل ہے۔ اپنی کوشش سے نہیں ہو سکتی۔"

زبیدہ: "اچھا میں لکھنؤ میں کوئی جگہ انتخاب کروں شاید یہیں لگ جائے۔"

نور محمد: "آپ کو میری اس قدر فکر کیوں ہے؟"

زبیدہ: "نور محمد صاحب میں زبان سے کہنا فضول سمجھتی ہوں خدا جانتا ہے۔

مجھے آپ حسن صاحب سے کم نہیں ہیں۔ جس طرح میں اُن کی بہتری و بہبودی کی خواہاں ہوں۔ اسی طرح آپ کی یہ میری تمنائے دل ہے کہ میرا خیال دل سے نکال کر کسی اور خوش نصیب کے ساتھ دنیا میں سرسبز و شاداب ہوں۔ یہ میں سچ عرض کر رہی ہوں آپ کی قسم ہے۔"

نور محمد: "یہ صحیح ہے میں اس مخلصانہ ہمدردی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ایک التجا ہے کہ بار بار دوسری جگہ شادی کرنے کی فرمائش نہ کریں۔ صرف اتنی عنایت آخری اور کریں کہ آج اس بدنصیب سے تمام عمر اسی قسم کی مخلصانہ دوستی قائم رکھنے کا عہد کرلیں۔ بس میری زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لئے اسی قدر کافی ہے۔"

یہ سنتے ہی زبیدہ نے سر تسلیم خم کرلیا اور اُن کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لئے جو اس کے گرم گرم اشکوں سے تر ہوگئے۔ چند منٹ بعد اپنے دل کو سنبھال کر زبیدہ نے سر اونچا کر کے جواب دیا۔"

زبیدہ: "میں اس وقت خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ زبیدہ تادم مرگ اپنے اس قدر سچے دوست نور محمد سے صادق و مخلص رہے گی۔"

نور محمد: "بس بس۔ اب مجھے دنیا کی کوئی نعمت نہیں چاہئے۔"

(۹)

مولوی نور محمد صاحب کو لکھنؤ سے گئے ہوئے تیسرا مہینہ ہے۔ قمر الزماں کی اس وقت تک کوئی خبر نہیں کہ الہ آباد اسٹیشن سے جدا ہو کر کہاں گم ہو گئے؟ گو زبیدہ اپنے تئیں قومی خدمات میں مصروف رکھتی تھی لیکن اس کے دل کی حالت وہی جانتا تھا۔ والدین اور بھائی بھاوج بھی اس سے کچھ خوش نہ رہتے تھے کیوں کہ اس نے شادی سے انکار کر کے ان کو سخت رنج دیا تھا۔ ان کو اس حالت میں اپنی بسر کرنی بہت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ علاوہ اس کے دو بھاری صدمات سے دل ڈوبا جا رہا تھا قمر کی جدائی اس پر نور محمد جیسے صادق دوست کی تباہی۔

شام کے سات بجے ہوں گے رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ زبیدہ اپنے کمرہ پر کوئی کتاب دیکھ رہی تھیں کہ چھوکرے نے اس وقت کی ڈاک پیش کی۔ انہوں نے نہایت بے دلی سے خطوط الٹ پلٹ کر دیکھے اور بند کے بند میز پر ڈال دیئے اور روزانہ اخبار کھول کر دیکھنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم سے گھنٹی کی آواز آئی اور وہاں گئیں۔ چند منٹ بعد واپس آئیں تو خیال آیا کہ سونے سے پہلے شام کی ڈاک ہی دیکھ لوں۔ یہ سوچ کر خطوط کھولنے لگیں۔ سرسری نظر سے دیکھ کر میز پر ڈالتی جاتی تھیں لیکن ایک خط کو غور سے دیکھا اور کئی بار پڑھا۔ جس سے اُن کا دل ایک بے اندازہ خوشی سے اچھل پڑا۔ پھر یکا یک غم میں ڈوب گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جس ہاتھ میں خط تھا وہ بھی ان کے دل کی طرح لرز رہا تھا۔ اپنے منتشر خیالات جمع کئے ایک بار پھر پڑھا۔ لکھا تھا:

"کارلٹن ہوٹل" نمبر ۵۔
"نجف روڈ، لکھنؤ"

خبر لے اور مسیحا تو کہاں ہے؟
ترا بیمار بسمل نیم جاں ہے

"قابلِ نفرت"

اور کچھ سوچ کر اُٹھی کوٹ پہنا کچھ روپیہ ساتھ لیا اور اصطبل میں آئی کوچ میں سے فٹن تیار کرائی اور چند منٹ میں "کارلٹن ہوٹل" پہنچ کر کمرہ نمبر ۵ میں داخل ہوئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ کوئی مریض بالکل تنہا پلنگ پر پڑا کراہ رہا ہے۔ سرتاپا سیاہ کمبل اوڑھ رکھا ہے۔ سبز لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی ہے۔ کمرہ میں عجب بے کسی کا عالم ہے۔ یہ نقشہ دیکھ کر زبیدہ کا دل بھر آیا۔ بیتابانہ آگے بڑھ کر سر سے کمبل ہٹایا اور اس مریض ناتواں کے چہرے کو دیکھا۔ کچھ دیر دونوں پر بے ہوشی کا عالم طاری رہا۔ جب خوب رو چکیں تو سنبھل کر بیٹھیں اور مریض کو دیکھا تو غش میں پایا گھبرا گئیں۔ پانی کے چھینٹے دیئے۔ لیونڈر سنگھایا اور اپنے ہاتھ میں ہاتھ لے کر گرم کرنے لگیں۔ چند منٹ بعد مریض کو ہوش آیا اور آنکھیں کھول کر نہایت ضعیف آواز میں بولے۔

مریض: "میں عالم خواب میں ہوں یا بیداری ہے؟"

زبیدہ: "خواب نہیں آپ جاگ رہے ہیں۔ آج شام مجھے آپ کی علالت کی خبر کا خط ملا تھا۔ جو ابھی آدھ گھنٹہ پیشتر میں نے پڑھا اور حاضرِ خدمت ہوگئی۔ یہ تو کہئے آپ کب سے بیمار ہیں اور کیا تکلیف ہے؟"

مریض: ۔

کیا پوچھتا ہے ہم دم اس جسمِ ناتواں کی
رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہئے کہاں کہاں کی

زبیدہ: "آپ لکھنؤ کب تشریف لے آئے؟ اور بیمار کب سے ہیں؟ صرف بخار ہی ہے یا اور کوئی تکلیف بھی ہے؟"

مریض: "بہت دن سے اور تب ہی سے بیمار ہوں۔ امراض کی تو مجھے خبر نہیں کیا کیا ہیں۔ کسی دن بخار ہو جاتا ہے کسی دن اختلاج کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

زبیدہ: ''علاج کس کا ہے؟''

مریض: ''کسی کا بھی نہیں۔''

زبیدہ: ''بالکل بے دوا پڑے ہیں۔''

مریض: ''دوا کیسی۔غذا بھی نہیں۔پرسوں صبح تھوڑا سا دودھ پیا تھا۔کل دن بھر بخار تیز رہا۔کچھ کھا ہی نہ سکا۔آج دن بھر اختلاج کے دو تین دورے پڑے نہ کوئی سنبھالنے والا تھا نہ کوئی غذا دینے والا۔خود ہی درست ہو ہو گیا۔''

مریض: ''تمام ملازم علیحدہ کر دیئے۔صرف ایک میرا عزیز ہے وہ کسی وقت آ کر خبر لے لیتا ہے۔''

زبیدہ: ''عزیز احمد یہیں ہوٹل میں ہے؟''

مریض: ''ہاں یہیں ہے پچھلے برآمدے میں پڑا سو رہا ہوگا۔''

زبیدہ: ''آپ یہ کیا غضب کر رہے ہیں کہ علاج نہیں کرتے۔ڈاکٹر کو لینے ابھی جاتی ہوں۔''

مریض: (ان کا ہاتھ پکڑ کر) ''ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔میری زندگی بالکل بے کار ہے۔اب میں دنیا میں رہنا نہیں چاہتا۔علاج کیوں کیا جائے؟''

زبیدہ: ''یہ تو خودکشی ہوئی۔انسان کتنا ہی آزاد ہو جائے مگر مذہب کا پابند رہنا چاہیے۔''

مریض: ''نہ میں انسان نہ میرا کوئی مذہب۔نہ مجھے اس کی خوشی درکار جس نے مجھے تباہ و برباد کر دیا۔''

زبیدہ: ''توبہ توبہ۔بیماری میں ایسے کفر کے کلمے زبان سے نہ نکالو۔وہ مہربان ہم پر کبھی سختی نہیں کرتا۔ہمیں ہمارے افعال کا عوض ملتا ہے۔میں عزیز احمد کو آپ کے پاس بٹھا کر ڈاکٹر کو لینے جاتی ہوں۔ابھی تو نہیں بجے۔''

مریض: ''میں آپ کو اس وقت نہیں جانے دوں گا اگر ڈاکٹر کو بلانا ہے تو صبح کو دیکھا جائے گا۔طبیب سے زیادہ مسیحا میرے لئے مفید ہے۔''

زبیدہ: ''آپ نے اپنی علالت کی پہلے سے کیوں خبر نہیں دی؟''

مریض: "میں یہ کیوں کر اُمید کر سکتا تھا کہ آپ اس گنہگار کی عیادت کو آنا گوارا کریں گی۔"

زبیدہ: "پھر آج کیوں کر لکھا؟"

مریض: "بخار تو مجھے کئی ہفتے سے ہے لیکن آج دن میں کئی بار اختلاج اس شدت سے ہوا کہ میں نے خیال کیا اب چلا۔ عزیز بھی گھبرا گیا۔ اس نے منیجر ہوٹل کو اطلاع دی اور وہ ڈاکٹر کو لے آئے۔ جو اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں مگر میں نے اُن سے علاج نہیں شروع کرایا۔ اسی وقت اسپرٹ ایمونیا وغیرہ دے کر چلے گئے۔ چونکہ انہوں نے میرے قلب کی حالت نہایت ضعیف بتائی مجھے خیال ہوا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اب آپ کو اطلاع دے دینی چاہئے کہ اگر آ جائیں تو معافی مانگ کر آخری رخصت ہو لوں، خدا کا شکر ہے آپ آ گئیں۔ اب میں اپنی حالت بہتر پاتا ہوں۔ دن میں آنکھ کھولنے کی طاقت نہ تھی۔ اس وقت باتیں کر رہا ہوں اور بالکل تندرست پاتا ہوں۔"

زبیدہ: "خدا جلدی تندرست کر دے۔ آپ لکھنؤ میں کیوں پڑے ہیں وطن کیوں نہیں چلے جاتے؟"

مریض: "وطن جا کر کیا کروں گا؟ یہاں اس امید میں آ پڑا ہوں کہ وقتاً فوقتاً آپ سے ملتا رہوں گا لیکن ان تین ماہ میں دو ہی بار نصیب ہوا۔"

زبیدہ: "اوہو۔ اب میرا خیال آپ کو ہوا اور آج سے پہلے مجھے کہاں دیکھا تھا؟ مجھے تو آپ کہیں نظر نہیں آئے۔"

مریض: "پہلی بار نہ پوچھیں کب اور کس طرح دیکھا تھا؟"

زبیدہ: "اب تو ضرور پوچھوں گی۔"

مریض: "آپ کو الٰہ آباد سے یہاں پہنچے دوسرا دن تھا۔ شام کا وقت تھا۔ سیاہی پھیل چکی تھی میں گومتی کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ وہیں ایک شاندار موٹر کار آ کر ٹھہری اور دو خوش دل خوش نصیب ہاتھ میں ہاتھ دیئے اتر کر وہیں ٹہلنے لگے۔ ہم نے پہچان لیا مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکے کیوں کہ میں درختوں کی آڑ میں ہو رہا تھا۔ بس اس دن سے جو طبیعت بگڑی ہے تو آج تک نہیں سنبھلی۔"

زبیدہ: ''آپ نے اُن خوش نصیبوں کی گفتگو بھی سنی تھی۔''
مریض: ''سنا تو کچھ نہ تھا۔ہاں قابلِ رشک اختلاط باہمی ضرور دیکھا تھا۔''
زبیدہ: ''اس دن کے بعد بھی کبھی اُن دونوں کو اکٹھا دیکھا؟''
مریض: ''پھر کیسے دیکھ سکتا تھا۔جلدی ہی یہ تحقیق ہو گیا کہ وہ یہاں سے تشریف لے گئے۔''
زبیدہ: ''جب اس قدر ارتباط تھا تو وہ اس لمبے عرصہ میں پھر کیوں نہیں آئے۔''
مریض: ''فرصت نہ ملی ہوگی۔''
زبیدہ: ''اُف اس غضب کی بدگمانی۔''
مریض: ''بدگمانی کیسی واقعہ ہے اور اس میں معترض ہونے کا مجاز نہیں خود ناقابل معافی گناہگار ہوں۔''
زبیدہ: ''آپ اپنے دل کے مختار ہیں مگر للہ اس وفادار خادمہ سے ایسی توقع نہ رکھیں یقین کیجئے۔اس دفعہ اس معاملہ کا قطعی فیصلہ کر دیا گیا ہے۔''
مریض: (بہ تبسم) الحمد للہ۔اب تو کبھی وہ مجھ کو آپ کے ساتھ دکھائی نہ دیں گے۔''
زبیدہ: (ہنس کر) ''یہ تو ناممکن ہے۔ان سے مثل رشتہ داروں کے تعلقات ہو گئے ہیں لیکن جو خیالات آپ کے دل میں ہیں وہ ناممکن ہو چکا ہے۔میں آپ کو کچھ کھلانا چاہتی ہوں کہئے یہاں کچھ تیار ہے؟''
مریض: ''ہاں آج منیجر صاحب نے میرے واسطے ساگودانہ تیار کرا کر بھیجا ہے سوپ اور دودھ بھی ہے۔''

یہ سن کر زبیدہ اٹھیں اور چھوٹی میز پلنگ کے قریب کر کے تینوں چیزیں رکھیں اُٹھا کر مریض کو بٹھا دیا اور تھوڑی تھوڑی تینوں چیزیں کھلائیں۔بیماری کی تکلیف اور تین دن کے فاقے سے نڈھال ہو رہے تھے اس وقت کی غذا سے آنکھوں میں روشنی آ گئی ہے۔چراغ میں تیل پڑنے سے بتی روشن ہو جاتی ہے۔اب اُن میں اس قدر طاقت آ گئی کہ برابر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔زبیدہ کو گیارہ بجیں بج گئے۔تب انہوں نے جانے کو کہا۔''

مریض: "ابھی سے؟"

زبیدہ: "مجھے ابھی گھر پہنچ جانا چاہئے۔ صبح ہوتے نوکر چاکر سب جاگ اٹھیں گے۔ میں انشاء اللہ کل شام کے وقت آپ کو دیکھنے پھر آؤں گی اور صبح ہی ڈاکٹر گھوش صاحب آپ کے دیکھنے کو یہاں آئیں گے۔ آپ کو میری قسم علاج میں مخالفت نہیں کرنا۔"

مریض: "زبیدہ بجائے علاج کے اگر زہر کھانے کے لئے اپنی قسم دی ہوتی تو میرے حق میں بہتر ہوتا۔ میں اس فقیرانہ حال میں یہاں ہوٹل میں پڑا رہنے کے لئے کب تک زندہ رہوں۔"

زبیدہ: "ہوٹل میں کیوں رہئے۔ ذرا صحت درست ہو جائے تو کچھ انتظام کریں۔"

مریض: "اب کیا انتظام کروں گا؟ میں نے اپنے تمام لوازمات زندگی برباد کر دیئے۔ ملازمت سے مستعفی ہو گیا۔ تمام جائیداد فروخت کر ڈالی۔ زندگی کے آخری دن پورے کرنے یہاں آپڑا ہوں۔"

زبیدہ: "آپ تو قومی خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟"

مریض: "اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے ہاں آنا جانا مشکل آپ سے ملنا جلنا دشوار۔ تین مہینے یہاں پڑے ہو گئے کیا حاصل ہوا۔"

زبیدہ: "بخدا ہمیں بالکل علم نہ تھا۔ میں اُمید کرتی ہوں آپ کی علالت کی خبر پاکر بھائی حسن ضرور آپ کو دیکھنے آئیں گے۔ آپ بھی کبھی جا سکتے ہیں۔"

مریض: "اگر آپ ملتے رہنے کا وعدہ کریں تو میں یہیں پڑا رہوں گا۔"

زبیدہ: "(کھڑی ہو کر) "انشاء اللہ حتی الامکان ہمیشہ ملتی رہوں گی اور ان دنوں جب تک کہ آپ کی طبیعت خراب ہے روزانہ شام کو آیا کروں گی۔ اچھا اب رخصت ہوتی ہوں۔ خدا حافظ۔"

(۱۰)

شام کے سات بجے ہوں گے۔ کارلٹن ہوٹل کمرہ نمبر ۵ کے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے یہ شعر گنگنانے کی آواز آ رہی ہے۔

آمد نماز شام نیامد نگار من
اے دیدہ پاسباں کہ خوابم حرام شد

عین اسی وقت ایک باریک آواز میں یہ فقرے سنائی دیئے۔

"لیجئے میں حاضر ہو گئی۔"

مردانہ آواز: "بہت دیر لگائی میں تو نا امید ہو چلا تھا۔"

زنانہ آواز: "بادل کی وجہ سے بہت دیر ہو گئی۔ بوندیں پڑنے لگیں تو آج بھابی جان نے روکا کہ آج سیر کو نہ جاؤ۔ مجبوراً اپنے کمرے میں چلی گئی لیکن پھر دل نہ مانا کہ ناحق آپ انتظار کی تکلیف اٹھائیں گے۔ کیا کروں آپ کی کمزور صحت نازک طبیعت نے مجبور کر دیا ہے۔"

مسٹر قمر: "زبیدہ خدا تم کو خوش رکھے۔ پھر کیوں کر نکل سکیں۔"

زبیدہ: "افوہ! آپ کے لئے بہت جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ میں بھابی جان سے یہ کہہ کر آئی ہوں کہ مس موتی لال کا اسی وقت رقعہ آیا ہے۔ کسی ضروری کام کے لئے بلایا ہے۔ کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا میں کھانا وہیں کھا لوں گی۔"

مسٹر قمر: "بہت خوب یہ تو ہمارے دل کی کہی۔ مدت ہوئی ساتھ کھائے ہوئے مل کر کھائیں گے۔"

زبیدہ: "مگر ڈر رہی ہوں بادل گھرا ہوا ہے اگر بارش ہو گئی تو بہت مشکل ہو گی۔"

مسٹر قمر: ”خوف کس بات کا ہے۔ہم پہنچا آئیں گے۔“

زبیدہ: ”میں اس قدر ٹھنڈ میں کبھی آپ کو نہ لے جاؤں گی۔ابھی آپ کمزور ہیں۔کیا آپ ڈائننگ ہال میں کھانے لگے ہیں یا یہیں آتا ہے۔

مسٹر قمر: ”میں ڈائننگ ہال میں نہیں جاتا اور اگر جاتا بھی ہوتا تب بھی آج یہاں ہی منگوایا جاسکتا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ آپ آج کھانا اچھی طرح نہ کھاسکیں گی؟“

زبیدہ: ”وہ کیوں؟ بلکہ آج تو زیادہ خوشی سے کھایا جائے گا۔“

مسٹر قمر: ”خوشی سہی مگر مزہ تو نہ ہوگا۔کہاں آپ کا امیرانہ پر تکلف کھانا۔ کہاں یہ ہوٹل کا سادہ بدمزہ۔

اتنے میں کھانے کے کمرے میں سے گھنٹی کا شور اٹھا اور فوراً ہی ان کا کھانا آگیا دونوں نے بہت خوشی سے کھانے کی میز پر ایک گھنٹہ صرف کردیا۔اب اس کے بعد گھڑی دیکھی تو نو بجے تھے۔زبیدہ گھبراگئی۔برآمدے میں سے نکل کر دیکھا تو بارش ہورہی تھی اور بھی سہم گئی۔“

زبیدہ: ”اب کیا کروں گی۔مینہ بڑے زور سے برس رہا ہے۔بجلی بھی چمک رہی ہے۔“

مسٹر قمر: ”بارش ٹھہر جائے پھر میں پہنچا آؤں گا۔چلو بیٹھیں ان اچھی گھڑیوں کو اس فکر میں ضائع نہ کرو۔“

زبیدہ: ”چلئے۔مگر اب اطمینان نہیں رہا۔“

دونوں کمرے میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔پیروں پر کمبل ڈال لیا۔زبیدہ کے ہاتھ قمر کے ہاتھوں میں تھے اور سر صوفے کے تکیہ پر ٹکادیا تھا۔

مسٹر قمر: ”کیا نیند آگئی؟“

زبیدہ: ”نہیں تو طبیعت کچھ ٹھکانے نہیں رہی۔“

مسٹر قمر: ”آخر کیوں؟ اس قدر پریشانی کیسی؟ آپ کا کمرہ تو اٹھ اٹھ کر دیکھنے سے رہے کہ ابھی آئی ہیں یا نہیں۔نہ کوئی آپ کی تلاش میں موتی ہال جائے گا۔“

زبیدہ: ”میری اماں جان بہت فکر مند ہوں گی بارش بادل سے سہم کر ممکن

ہے کوئی میرے لینے کو چلا آئے۔“

مسٹر قمر: ”آپ کی مس موتی لعل مناسب بات بتادیں گی وہ ہماری دیرینہ محسنہ ہیں۔“

عزیز احمد: (دروازے میں) ”حضور یہ چٹھی موتی ہال سے آئی ہے۔“

بیرے کی آواز سن کر زبیدہ کی تو گویا جان نکل گئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ دل دھڑ کنے لگا۔ مسٹر قمر نے اُٹھ کر چٹھی لے لی۔“

زبیدہ: ”دیکھو وہی ہوا نہ جو میں کہتی تھی۔“

مسٹر قمر: ”پڑھو تو خدا جانے کیا لکھا ہے۔“

زبیدہ پڑھنے لگیں:

موتی ہال

نو بجے شب

ڈیر زبیدہ!

آج کی کارروائی کی آپ نے مجھے کوئی اطلاع نہ دی تھی کہ اس کے مطابق انتظام کیا جاتا۔ ابھی میں کھانے سے فارغ ہو کر سونے کو جارہی تھی کہ میرے کمرے کے سامنے موٹر کار آ کر ٹھہری اور بھائی حسن تشریف لائے میں فوراً برآمدے میں نکل آئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ”بارش بڑھتی جارہی ہے جلدی زبیدہ کو سوار کرادو۔“ میں حیران رہ گئی کچھ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیا کیا جائے۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ آج زبیدہ کو یہیں رکھوں گی اور بھائی گھر پہنچیں اور آپ کو وہاں دیکھیں تو کیسی بری بات ہو۔ غرض کہ میں چکرا گئی کہ بھائی صاحب سے کیا کہوں؟

آخر یہی کہا گیا کہ وہ تو کھانا کھا کر جانے کو تیار ہوئی تھیں

مگر اماں جان نے روک لیا۔ "ایسی سخت بارش میں نہ جانے دوں گی۔" ہم دونوں لیٹ گئیں اور اُن کی آنکھ لگ گئی۔ اب اگر سوتے سے اُٹھ کر بارش میں گئیں تو ٹھنڈ لگ جانے کا خطرہ ہے اگر ایسا ہی ہے تو جس وقت بارش تھمی ہم میں سے کوئی ان کو پہنچا دے گا۔ یہ سن کر وہ بیچارے مجبور ہو گئے اور لاچار واپس تشریف لے گئے۔ اب خدا جانے تم کہاں اور کس حال میں ہو۔ اس کے سوا کیا کر سکتی تھی؟ آپ اگر اس خط کے پہنچنے کے بعد کوٹھی تشریف لے جائیں تو یہی کہہ دینا کہ جیسے ہی میری آنکھ کھلی اُٹھ کر چلی آئی۔" عقل مند بیوی جو کچھ کیا کرو مجھے پہلے سے اطلاع دے دیا کرو۔ کپتان صاحب کی خدمت میں تسلیم۔"

تمہاری صادقہ

سوشیلا

قمر الزماں: "ٹھیک ٹھیک خدا خوش رکھے۔ سوشیلا بائی کو کیسی بات بنانی آتی ہے۔ اب تو آپ ذرا فکر نہ کریں اطمینان سے رات گزار سکتی ہیں۔"

زبیدہ: "اطمینان کیسا میرا تو دل کانپ رہا ہے۔"

مسٹر قمر: (مسکراتے ہوئے) "کانپ نہیں رہا ہے۔ زور زور سے دھڑکنے کی آواز آرہی ہے۔"

زبیدہ: "اب مذاق نہ کرو ہمارا دل پریشان ہو گیا ہے۔"

مسٹر قمر: "ارے خدا خدا کر کے تو یہ وقت ملا ہے کہ ذرا اطمینان سے بیٹھ سکیں گے گھبرائی کیوں جاتی ہو؟ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب بھائی حسن تو آنے سے رہے۔"

زبیدہ: "ہمیں اس وقت آپ کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

مسٹر قمر: "مجھے تو آپ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔"

زبیدہ بہت دنوں میں خدا نے یہ اطمینان کا وقت دیا ہے کیوں خوش نہیں ہوتیں،

کہو تو کوئی کھیل نکالوں۔ شطرنج ڈرافٹ؟

زبیدہ: "مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔"

مسٹر قمر: "اچھا تو سو رہو۔"

زبیدہ: "جب سونا ہی ہے تو گھر جا کر سوؤں۔"

مسٹر قمر: "خوشی تو یہی ہے کہ یونہی بیٹھے رات بھر باتیں کریں۔"

زبیدہ: "دل تو چاہتا ہے مگر کچھ زمانہ کا بھی لحاظ ہے۔"

مسٹر قمر: "زبیدہ اسی شب کو غنیمت جان لو۔ پھر خدا جانے اس زندگی میں ایسی رات میسر ہو یا نہ ہو۔"

زبیدہ: "دو ماہ ہو جائیں گے تقریباً روزانہ ہی آپ سے ملتی ہوں۔"

مسٹر قمر: "ایک دو گھنٹہ کو آجاتی ہیں مگر رات کبھی ایک جگہ بیٹھ کر نہیں گزاری۔"

زبیدہ: "میرے یہاں ٹھہرنے سے فائدہ کچھ نہ ہوگا۔ آپ کی نیند خراب ہوگی میں گھر کے خوف سے لرزاں رہوں گی اور یہاں رہنا مناسب بھی نہیں ہے؟"

مسٹر قمر: "زبیدہ یہی تو میں کہتا ہوں کہ آج تمام رات خوف و خطرات اور پریشانیوں کو دل سے نکال کر اپنے حرماں نصیب قمر کے ساتھ یہ قابلِ قدر گھڑیاں اچھی طرح گذار دو۔ مجھ پر یہ وہ احسان ہوگا جو آج تک کسی پر کوئی نہ کرسکا۔ آپ بہت تکلیف میں بیٹھی ہیں مسہری پر آرام کریں۔ میں قریب ہی آرام چوکی لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پھر آرام سے باتیں ہوں گی۔"

زبیدہ: "نہیں میں بہت آرام سے بیٹھی ہوں۔"

مسٹر قمر: "اچھا تو پھر یہ کرو کہ پیر اوپر کر کے اچھی طرح اس صوفے پر لیٹ جاؤ۔ میں اسی کرسی پر لیٹا جا رہا ہوں۔"

پھر انہوں نے دو کرسیاں صوفے کے برابر جوڑ کر بچھائیں اور شال لے کر لیٹ رہے۔ زبیدہ نے بھی اوپر پیر رکھ کر اچھی طرح کمبل لپیٹ لیا۔ زبیدہ کچھ افسردہ سی تھیں۔"

مسٹر قمر: "آپ نے یہ آہ سرد کس لئے بھری؟"

زبیدہ: "کچھ خیال آ گیا۔"

مسٹر قمر: ”علی گڑھ کا؟“

زبیدہ: ”نہیں تو غریب نجمہ کا۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں ہوگی؟ آپ نے سخت بے دردی کی ہے۔“

مسٹر قمر: ”زبیدہ اس کا نام ہی نہ لو مجھے اپنی گذشتہ زندگی یاد آکر نا قابلِ برداشت صدمہ ہوتا ہے جس کی پاداش میں مَیں یہ مصیبتیں جھیل رہا ہوں اگر وہ کمبخت حائل نہ ہو جاتی تو تم کب کی میری ہو چکی ہوتیں۔“

زبیدہ نے ایک آہ سرد بھری۔

مسٹر قمر: (لیکن افسوس) ”اس وقت یہاں رہنے سے کانپ رہی ہو۔“

زبیدہ: ”اس لئے کہ آپ اس حالت میں نہیں رہے کہ میں باضابطہ آپ کی ہو سکتی لیکن آپ کی تو یہ عادت ہی ہو گئی ہے۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ اس بے چاری کو تو باضابطہ اپنا کر لیا تھا اس کے بھی نہ ہوئے۔“

مسٹر قمر: ”زبیدہ یقین کرو کچھ عرصہ کے لئے مجھ پر جنون کا ایک دورہ پڑا تھا۔ جب وہ جاتا رہا تو آنکھیں کھل گئیں اور اس بدبخت کا کیا یاد کرنا وہ اپنی خوشی کی جگہ مزے اڑا رہی ہوگی۔“

زبیدہ: ”سچ کہہ دو اس کی حرکات پر صرف غصہ ہی ہے یا آپ کے دل سے محبت ہی نکل گئی ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور زبیدہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

مسٹر قمر: ”مجھے اس سر کی قسم ہے جو دین ایمان مال و جان سے زیادہ عزیز ہے کہ اب قمر کے دل میں محبت تو کیا اس سے نفرت کرنے کے لئے بھی جگہ نہیں ہے۔“

زبیدہ: ”پھر وہ محبت کیسی تھی جس کی مدہوشی میں زبیدہ جیسی جاں نثار وفادار کو دل سے ہٹا دیا۔“

مسٹر قمر: ”اگر میں سچ سچ کہہ دوں تو یقین کرو گی؟ ذرا غلط بیانی نہ کروں گا۔ صحیح ماننا۔“

زبیدہ: ”میں نے کب آپ کی بات کو غلط کہا۔“

مسٹر قمر: ''اس زمانہ میں میری عقل ماری گئی تھی۔ نجمہ بری طرح میرے پیچھے پڑی۔ مرد اس بے باکی سے اپنی محبت نہیں جتا سکتا جس بے حیائی اور بے حجابی سے اس بدذات نے اپنی محبت کا جادو مجھ پر ڈالا۔ یہ حالات سن سن کر تم مجھ سے کشیدہ ہوتی گئیں اور موقع کو غنیمت جان کر وہ مجھ سے روزانہ ملتی رہی یہاں تک کہ شادی سے پیشتر ہی وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہوگئی۔ تب اُس نے یہ دھمکی دی کہ یا تو مجھ سے شادی کر دیا جواب دہی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں عدالت میں جا کر نالش کرنے والی ہوں۔ میں پہلے ہی سہم رہا تھا یہ سن کر تو گویا جان نکل گئی۔ اب سوائے اس کے چارہ نہ رہا تھا کہ اس سے شادی کر لوں اور مقدمہ بازی کی ذلت سے بچ کر اپنی پوزیشن رکھوں۔ ان سب واقعات سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ میرے دل سے آپ کی محبت نکل گئی تھی۔ میں آپ کو چاہتا تھا مگر چونکہ فطرتاً مرد بوالہوس ہوتا ہے۔ برائی کی طرف اس کی طبیعت بہت جلدی راغب ہو جاتی ہے میں اس کی طرف جھک گیا۔ ورنہ خدا گواہ ہے مجھے اس کی زیادہ محبت نہ تھی۔ اب جب پھنس گیا تو آپ سے شرمندگی بڑھتی چلی گئی اور میں آپ سب کی طرف منہ نہ کر سکتا تھا جس کی وجہ سے آپ نے یہ سمجھا کہ میرے دل میں آپ کی محبت نہیں رہی۔

زبیدہ خدا شاہد ہے کہ میرا دل ایک منٹ کو بھی تمہارے خیال سے خالی نہیں رہا۔ لیکن میں اس قدر گناہگار اور روسیاہ ہو چکا تھا کہ آپ سے منہ چھپانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ بخدا زبیدہ مجھے اس زندگی میں چند منٹ کو بھی سچی خوشی حاصل نہ ہوتی تھی، ۲۴ گھنٹے میرا ضمیر مجھے لعنت کرتا تھا اور بعد شادی چند ہی ہفتہ میں اس عورت سے اس قدر اکتا گیا تھا کہ وہ مجھے چڑیل معلوم ہونے لگی تھی اور میں اس کی قید سے رہائی چاہتا تھا کیوں کہ بہت جلدی مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھ سے نہیں میرے مال سے محبت کر رہی ہے اور اس لئے مجھ سے شادی کی ہے کہ میرے روپے سے اپنے دوستوں کا پیٹ بھرے۔ چنانچہ میں اس موقعہ کی تلاش میں رہنے لگا کہ اس کا کوئی عیب ظاہر ہو جائے جو میں اس کو علیحدہ کر دوں۔ اس کے بعد کے حالات آپ کو معلوم ہی ہیں کہ کس طرح اور کس بنا پر میں نے اس کو جدا کیا۔''

زبیدہ: ''لیکن یہ تو بہت بری بات ہے کہ وہ آپ کی بیوی ہو کر ایسی خراب زندگی بسر کرے لوگ کیا کہتے ہوں گے؟''

مسٹر قمر: ''اس کا میں کیا انتظام کرسکتا ہوں؟ وہ کسی طرح نہیں سمجھتی۔ کسی طرح نہیں ڈرتی۔''

زبیدہ: ''اس کا یہی انتظام ہوسکتا ہے کہ دل پر جبر کرکے اس کو اپنے گھر میں لے آئیں اور شدید قید میں رکھیں۔''

مسٹر قمر: ''زبیدہ میں زہر کھا سکتا ہوں مگر اس کو نہیں لاسکتا۔''

زبیدہ: ''جبراً ہی سہی اپنی عزت کی حفاظت کرنا فرض ہے۔''

مسٹر قمر: ''اب اس کی وجہ سے میری عزت کہاں باقی ہے۔ ہاں ایک خیال آتا ہے کہ باضابطہ قطع تعلق کرلوں لیکن اسے یہ منظور نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ''میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اگر زبردستی طلاق دیتے ہو تو پورا مہر ادا کرو۔'' کمبخت نے جعل میں پھنسا کر ایک لاکھ روپیہ مہر بندھوا لیا تھا۔ مجھ احمق دیوانے نے بھی خوشی سے منظور کرلیا۔ شادی کے اوّل ہی ہفتہ میں گھر کی قیمتی چیزیں گم کرنا شروع کردیں۔ غرض کہ سال بھر کے اندر اندر تقریباً اس نے چالیس پچاس ہزار روپیہ اور کل قیمتی سامان برباد.......... جو اثاثہ باقی رہ گیا ہے وہ اس کے مہر میں حوالے کردوں۔ تم ہی بتاؤ زبیدہ کہ میں اس بلا سے کس طرح چھٹکارا حاصل کروں۔''

زبیدہ: ''یہ تو بڑی دقت ہے اگر علیحدہ ہی کریں تو ایک لاکھ نہیں پچاس ہزار تقریباً ضرور ہی دینا ہوگا۔ آپ کے پاس اب کس قدر مالیت کی کل جائیداد ہوگی۔''

مسٹر قمر: ''جائیداد کچھ بھی نہیں کچھ زمین اور کوٹھیاں تھیں ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہی وہ سب فروخت کرڈالیں۔ اب کچھ روپیہ بینک میں ہے۔ جس کی آمدنی سے اس فقیرانہ حالت میں بسر کررہا ہوں۔''

زبیدہ: ''آخر کس قدر روپیہ بینک میں ہے؟''

مسٹر قمر: ''کچھ بھی نہیں شاید پچاس ساٹھ ہزار ہوگا اگر آدھے مہر پر بھی وہ راضی ہوجائے تو پھر میرے پاس ایک پیسہ نہ رہے گا اور اب مجھ میں دوبارہ ملازمت کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ آخر جب تک زندہ ہوں مجھے بھی کچھ چاہئے۔''

زبیدہ: ''میری تو یہی رائے ہے کہ آپ ہمت کرکے کوئی کام شروع کردیں

اور وہ روپیہ لگا کر آزادی حاصل کریں۔''

مسٹر قمر: آہ! زبیدہ کس لئے؟ میں آزاد ہو کر بھی کسی کام نہیں آ سکتا پھر کیوں اپنے ٹکڑوں کا سہارا کھو دوں۔''

زبیدہ: ''یہ کتنی بڑی بات ہے کہ آپ اس ذلت و بدنامی سے بچ جائیں گے جو نجمہ کی خراب زندگی سے ابھار ہے ہیں۔''

مسٹر قمر: ''اُونہہ مجھے اس کی بھی اب پرواہ نہیں۔ بے حیائی و بے عزتی مجھ پر ختم ہو چکی ہے۔''

زبیدہ: ''جب آپ بری زندگی سے تائب ہو چکے۔ بدعورت سے علیحدگی اختیار کر لی، پولیس کی ملازمت نہ رہی تو اب جی یہ چاہتا ہے کہ آپ اچھی اور خوشگوار زندگی بسر کریں اور آپ کے لئے یہی دار المحن جنت ہو جائے۔

مسٹر قمر: ''آہ! بغیر حور کے دنیا میرے لئے جنت نہیں ہو سکتی۔''

زبیدہ: ''میں حور بھی تلاش کر دوں گی۔''

مسٹر قمر: ''ایک نوعمر عورت جس کو صورت و شکل کے لحاظ سے پری کہا جا سکتا ہے میری مسرت کا باعث نہ ہو سکی۔ میں اس سے حقیقی راحت نہ پا سکا تو اب دنیا سے حور کی توقع کیسے کر سکتا ہوں؟''

زبیدہ: ''اور اگر میں تلاش کر دوں؟''

مسٹر قمر: ''بے کار ہے۔''

مگر منہ تو یہ کہنے کے قابل نہیں رہا۔ میں سراسر جھوٹا ثابت ہو چکا۔ زبیدہ تم ہی تھیں جو مجھ سے پھر ملنا گوارا کیا، کوئی اور ہوتی تو میرا منہ نہ دیکھتی۔''

زبیدہ: ''ایسا نہ کہئے میرے لئے آپ ہر حال میں یکساں ہیں میں آپ کو اپنا بادشاہ اور اپنے تئیں آپ کی ادنیٰ خادمہ سمجھتی ہوں۔

☆

(۱۱)

نجمہ: "اماں جان میں انتقام لے کر چھوڑوں گی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ رہی ہے۔"

والدہ نجمہ: "کچھ کہو تو سہی تم نے لکھنؤ جا کر کیا دیکھا؟"

نجمہ: "اماں جان کیا کہوں کیا کیا دیکھا۔ نوکری سے علیحدہ ہو کر جب سے لاپتہ ہوئے تھے مجھے یہی خیال تھا کہ ضرور لکھنؤ پہنچے ہوں گے۔ اسی لئے میں نے مسٹر ہمفری کی سالگرہ کے بلاوے پر لکھنؤ جانا منظور کر لیا تھا۔ اتفاق سے ایک دن "کارلٹن ہوٹل" جانا ہو گیا۔ مسٹر ہمفری نے اپنے چند دوستوں کو چاء دی تھی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے وقت مس علی آئی اور دونوں مل کر سیر کو چلے گئے۔ جب ایک دن میں نے یہ واقعہ دیکھ لیا تو پھر اس خیال میں پڑ گئی۔ ہر روز شام کے وقت "کارلٹن ہوٹل" میں جانا شروع کر دیا اور اس لئے کہ پہچانی نہ جاؤں، انگلش ڈریس اور انگریزی ٹوپی میں رہتی تھی۔ اماں جان وہاں تو بڑے مزے ہو رہے ہیں۔ مجھے تو یوں حقارت سے گھر سے نکال دیا اور اس سے دوبارہ محبت کی جا رہی ہے۔ میں نے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا دیکھو تو کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔"

والدہ نجمہ: "بیٹی تم کر ہی کیا سکتی ہو۔ سوائے اس کے کہ مہر کا دعویٰ کر دو۔ اس کا بھی اس نے انتظام کر لیا ہے۔ سنا ہے کہ تمام جائیداد بیچ دی ہے۔ اب تم نالش کر کے بھی کچھ زیادہ وصول نہیں کر سکتیں۔"

نجمہ: "دیکھئے ایسا حیران کروں گی کہ زندگی سے بیزار ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے چند دوستوں کے مشورہ سے ایک تجویز سوچ لی ہے۔"

والدہ نجمہ: "مجھے بھی تو بتاؤ۔ کوئی کام ایسا نہ کر بیٹھنا جو لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

نجمہ: "آپ اطمینان رکھئے ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے گی۔ میرے دوست نہایت ہی عقلمند دُور اندیش ہیں۔ اچھا میں ذرا چھاؤنی تک جاتی ہوں۔ دو تین گھنٹے تک نہ آؤں گی۔ چائے پر میرا انتظار نہ کرنا۔"

یہاں سے اُٹھ کر نجمہ تانگے پر سوار ہوئی اور شہر سے تین چار میل باہر ایک پرانے باغ میں آئی جس میں چند کھنڈرات اور قریب ہی ایک شکستہ قلعہ تھا۔ یہاں سالہا سال سے انسان کا گذر نہ تھا۔ یہ باغ کیا تھا بڑے بڑے گھن دار درختوں کا ایک جنگل تھا۔ درختوں پر اُلو اور بڑے چمگادڑوں کے گھونسلے تھے۔ شکستہ مکانات میں گیدڑ لومڑیاں بڑے بڑے سانپوں کا مسکن تھا۔ نجمہ کا تانگہ جس وقت اس مہیب و خطرناک ویرانے میں پہنچا شام کے پانچ بج رہے تھے۔ گاڑی کی آواز سن کر دو عیسائی دوست قلعہ کے پھاٹک سے نکل کر پیشوائی کو پہنچے۔ کوچ مین کو نجمہ نے دس روپیہ کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔"

نجمہ: "یہ لو اپنا انعام جیسا کہ تمہیں پہلے سمجھایا جا چکا ہے پوری کوشش سے عمل کرنا پھر ہم تمہیں اور انعام دیں گے۔"

کوچمین: "بہت بہتر جو کچھ حضور نے فرمایا ایسا ہی کیا جائے گا۔ جیسے ہی وہ صاحب گاڑی کی تلاش میں باہر آئیں گے میں آگے بڑھ کر عرض کروں گا کہ مجھے آپ کے بھائی منصف صاحب نے بھیجا ہے۔ اُن کی بیگم صاحبہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے اس لئے خود نہیں آسکے۔

ٹھیک ہے نہ؟

نجمہ: "بالکل ٹھیک ہے۔"

"تانگہ والا تو اسٹیشن گیا اور ان تینوں میں باتیں ہونے لگیں۔"

مسٹر فاکس: "آپ نے وہ جگہ دیکھ لی جوان کی قیام گاہ بنائی گئی ہے۔"

نجمہ: "میں کل دیکھ گئی تھی۔ خدا آپ دونوں کی مدد کرے جو میری مدد کر رہے ہیں۔"

مسٹر جوزف: "او ڈیر نجمہ آپ کیا کہتی ہیں کہ ایک مصیبت زدہ لیڈی کی مدد کرنا اور اس کے ظالم شوہر کو سزا دینی ہمارا فرض ہے۔"

فاکس: "ابی سزا کیسی چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گے جو کچھ مانگیں گی انہیں دیتے بن پڑے گا۔"

جوزف: "مگر سنا ہے اُن کے پاس کچھ ہے نہیں جس قدر نجمہ چاہتی ہیں وہ کہاں سے لائیں گے۔"

فاکس: "اُن کے پاس بینک میں بہت کچھ ہے۔"

نجمہ: "بس مہربانی سے آپ دونوں اُن کو اس قدر دق کریں کہ اپنی جان سے بیزار ہو کر اُن کو دیتے بن پڑے۔"

اتنے میں تانگہ آتا نظر آیا نجمہ تو ایک دیوار شکستہ کی آڑ میں ہو گئی۔ فاکس اور جوزف نے آگے بڑھ کر اتروایا۔

مسٹر قمر: "کہئے ہمشیرہ تو اچھی ہیں۔ بھائی بدرالزماں (بہنوئی) یہاں بھی نہیں۔ ان کا مکان کہاں ہے؟ یہاں تو شاید ہسپتال ہو گا۔"

فاکس: "نہیں جی ہسپتال نہیں ہے آپ ابھی دیکھ لیں گے آپ کے بہنوئی صاحب یہیں ہیں۔ شہر کا رہنا اُن کو پسند نہیں اسی قلعہ کے نیچے ایک کوٹھی تھی وہ کرایہ پر لے رکھی ہے۔ چلئے ہمارے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔"

اب یہ دونوں مکار ہمارے نیک دل قمرالزماں صاحب کو درختوں میں لے گئے وہ اپنی پیاری بہن کی فکر میں اس قدر پریشان تھے کہ بلا پس و پیش اُن کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ اس پتلی سی سڑک کے آخر میں چند سیڑھیاں تھیں اُن سے اتر کر یہ تینوں ایک گہری خندق میں پہنچے۔ جہاں کوئی مکان وغیرہ نہ ملنے سے پریشان ہو کر مسٹر قمر نے پوچھا۔

مسٹر قمر: "یہاں تو کوئی مکان وغیرہ نظر نہیں آتا۔ آپ مجھے کہاں لے آئے؟ کیا قلعہ کی خندقوں میں منصف صاحب نے پناہ لی ہے؟"

فاکس: (مسکرا کے) "ابھی آپ کو معلوم ہوا جاتا ہے۔ اُن کا مکان بہت اچھا ہے۔"

یہ سن کر اُن کو کچھ شبہ پیدا ہوا اور گھبرائے۔

جوزف: "چلئے چلئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

مسٹر قمر: "تم دونوں کا منصف صاحب سے کیا تعلق ہے اور وہ خود کیوں نہیں آئے؟"

فاکس: "ہم دونوں اُن کے عزیز دوست ہیں۔ چونکہ مسز بدرالزماں کی طبیعت

بہت خراب ہے۔ اس لیے وہ اسٹیشن پر نہ جاسکے۔ ہمیں کہہ دیا تھا کہ میرے بھائی کو لے آنا۔"

یہ کہتے ہوئے تینوں صاحبان چند ہی قدم آگے جانے پائے تھے کہ مسٹر قمر کا پیر دفعتاً پھسلا اور انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں اُن سے دُور کھڑے ہنس رہے تھے۔ جھک کر دیکھنے لگے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک تختے پر کھڑے تھے جیسے ہی اس جگہ سے ہٹنے کو قدم اُٹھایا پھٹ سے تختہ ہٹ گیا اور وہ نیچے کو دھنستے چلے گئے اوپر سے ایک فرمائشی قہقہہ کی آواز آئی اور تختہ برابر ہوگیا۔ اس وقت پولیس کا لائق اور ہوشیار مشہور سپرنٹنڈنٹ دو جاہل عیار مکاروں کے جال میں پھنس چکا تھا۔ وہ اس اچانک تعجب خیز واقعہ سے سخت حیران ہو رہے تھے۔ اس تاریک تہہ خانے میں جہاں کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ قمر حیران کھڑے سوچ رہے تھے کہ "آخر یہ معاملہ کیا ہے۔" پھر خیال آیا کہ نجمہ کے والد آج کل یہیں تبدیل ہو کر آچکے ہیں ضرور اسی کی کارگذاری ہے اور یہ دونوں شخص بھی اس کے دوست ہوں گے۔ آہ! میری بہن بہنوئی کو کیا خبر کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں؟ آہ! آہ! شام کو جب زبیدہ ہوٹل میں مجھ کو نہ پائے گی تو کیا کہے گی؟ اور جب مدت تک میرا خط نہ پائے گی تو اس گم شدہ کا اس کے دل پر کیا اثر ہوگا؟ کہیں پھر مجھے بے وفا ہی نہ سمجھ لے۔ میں تو اس قید سے بہت خوش ہوں کیوں کہ یہاں میری زندگی بہت جلد ختم ہو جائے گی مگر آہ! اس پر کیا گزرے گی جو اپنی عمر میرے لئے برباد کر چکی ہے اور کہیں میری پیاری قمر آرا (بہن) میری یاد ہی میں نہ ختم ہو جائے۔ یاالٰہی میں بہت خوشی سے اس تاریک گڑھے میں جان دینے کو تیار ہوں تو زبیدہ اور قمر آرا کو صبر دیجیو۔"

بہت دیر تک کھڑے یہی سوچتے رہے پھر جیب سے ماچس نکال کر جلائی اور چاروں طرف دیکھا مگر کوئی دروازہ کوئی کھڑکی نہ پائی۔ ایک کونے میں کچھ تختے کا ڈھیر لگا تھا اس پر بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹہ گذرا ہوگا کہ ایک طرف سے کھٹا کھٹ کی آواز آئی اور ساتھ ہی روشنی نمودار ہوئی۔ سامنے کو دیکھا تو وہی دونوں شخص آگے اور پیچھے ایک حوروش نازنین اپنی طرف آتی نظر آئی۔ قریب آنے پر انہوں نے پہچان لیا کہ وہ "خوبصورت" ان کی جان ڈال کی دشمن نجمہ ہے۔ وہ اس وقت نہایت فاخرہ لباس پہن کر پری بن کر آئی تھی۔ وہ دونوں شیطان صورت انسان پیچھے ٹھہرے رہے اور وہ اپنے مفتوح و مجبور شوہر کے پاس عجیب نازو انداز سے آکر تختوں پر تولیہ بچھا کر بیٹھ گئی۔ خود ہی اُن کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کیا اور بولی۔

نجمہ: ”کہئے کپتان صاحب کیا حالات ہیں؟ مزاج مبارک۔“

مسٹر قمر: ”شکر ہے خدا کا۔ آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

نجمہ: ”شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں میرا فرض ہے آپ کو آرام پہنچانا۔“

مسٹر قمر: ”انشاء اللہ میں بھی اس مہمان نوازی کا معاوضہ دوں گا۔“

نجمہ: ”معاوضہ تو پیچھے دیں گے پہلے میرا حق ادا کیجئے جس کے لئے آپ آج یوں بے دست و پا مقید ہیں۔ کسی کا ستانا ضائع نہیں جاتا۔“

مسٹر قمر: ”نجمہ سنو، تم کو معلوم ہی ہے کہ ایک عرصہ سے میں اپنی جان سے بیزار ہوں مگر چونکہ مسلمان ہوں خودکشی کرتے ڈرتا تھا۔ اب خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے موت کے منہ میں لا ڈالا۔ بس اب اطمینان کے ساتھ بلا گناہ خودکشی کے میری تمنائے دلی پوری ہوئی۔“

نجمہ: ”کپتان صاحب اس خیال خام میں نہ رہے۔ آپ موت کے منہ میں نہیں بیٹھے ہیں بلکہ سخت عذاب جانکنی کی حالت میں ہیں۔“

مسٹر قمر: ”میں اس سے بھی بہت خوش ہوں جو چیز بہت تکلیف اٹھانے کے بعد حاصل ہوتی ہے اس کی بہت قدر ہوتی ہے۔ ہاں تم سے اتنی التجا ہے کہ میری بیمار بہن کی خیریت مجھ تک پہنچا دیا کرو۔ جب تک میں وعدہ کرتا ہوں کہ کچھ ہو جائے تو اس سے بھی اطلاع دے دو۔ میں حشر تک احسان مند رہوں گا۔“

نجمہ: (ہنس کر) اُس کا تو آپ اطمینان رکھے آپ کی ہمشیرہ بالکل خیریت سے ہیں۔ جس تار پر آپ یہاں پہنچے ہیں وہ آپ کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔“

مسٹر قمر: ”کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں میں اپنی بہن کی صحت کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاؤں۔“

نجمہ: ”میں قسمیہ عرض کرتی ہوں کہ وہ بالکل تندرست ہیں چونکہ آپ عرصہ سے آزاد اور لاپتہ تھے آپ کے دیدار کے خواہشمندوں نے اس تدبیر سے آپ کو پا لیا، اب عرض خدمت ہے کہ یا تو نجمہ کو اس کے گھر میں آباد کیا جائے یا قطع تعلق کر کے مقررہ رقم مہر ادا کر دی جائے اور جو دونوں میں سے ایک بھی منظور نہیں تو عمر بھر اسی قید خانہ میں پڑے

سڑا کریں۔آپ کو زندہ رکھنے کے قابل روزانہ غذا مل جایا کرے گی۔"

مسٹر قمر: "اس کی تو مجھے چنداں ضرورت نہیں۔"

نجمہ: "آپ کو یہ عذاب جھیلنا منظور ہے۔میری دونوں خواہشوں میں سے ایک پر بھی غور نہیں کرتے۔"

مسٹر قمر: "ان دونوں میں سے اگر کوئی منظور ہوتی تو آج یہ دن ہی کیوں ہوتا۔تم جیسی "خوبصورت بلا" کے ساتھ ایک لمحہ بھی بسر نہیں کر سکتا اور نہ میرے پاس اس قدر روپیہ ہے کہ پورا مہر ادا کر سکوں۔"

نجمہ: "آپ کے پاس تو بہت سے مکانات زمین اور روپیہ تھا۔"

مسٹر قمر: "وہ سب کچھ میں نے اپنی بہن کے نام لکھ دیا تھا۔اب میرے پاس تمہارے مہر کی چوتھائی بھی باقی نہیں ہے۔

نجمہ: "پھر مجھے اپنے گھر لے چلئے اور دوبارہ کہیں ملازمت کر لیجئے۔غصے خفگیاں ہوا ہی کرتی ہیں اپنی منکوحہ بیوی کو چھوڑ نہیں دیا کرتے۔"

مسٹر قمر: "وہی نہیں چھوڑتے جن کی بیوی بیوی ہو اور جن کی بیوی دشمن جان و مال و آبرو ہو۔تمہارے ہاتھوں میرا فیصلہ ہی ہو جائے تو اپنے کیفر کردار کو پہنچوں۔"

نجمہ: "فیصلہ نہیں کیا جائے گا جب تک میرا مہر ادا نہ کر دیں گے خواہ کتنے ہی سال گزر جائیں آپ یہیں مقید رکھے جائیں گے۔"

مسٹر قمر: "(ہنس کر)" اوہ اس کی تو پرواہ نہیں ہے۔"

نجمہ: "عذاب قبر سے بدتر حالت میں رہیں گے مگر روپیہ نہیں دیں گے؟"

مسٹر قمر: "اتنا روپیہ میرے پاس نہیں ہے اس کے عوض میری جان لے لو تو احسان مند ہوں گا۔"

نجمہ: (کھڑی ہو کر) اچھا تو مزے کرو۔مردے کے لئے تو قبر ہوتی ہے آپ کو زندگی میں پسند ہے یاد رکھیں یہاں سے نکل بھاگنے کا قیامت تک راستہ نہ ملے گا۔البتہ ۲۴ گھنٹے بعد ہمارا ایک آدمی آپ کو کچھ خوراک دے جایا کرے گا۔

☆

(۱۲)

حسبِ معمول دوسرے دن شام کو جب زبیدہ سلطان ''کارلٹن ہوٹل'' آئیں تو عزیز احمد ملازم کپتان صاحب نے اُن کو ایک دستی خط دیا۔ جس کا مضمون یہ تھا:

''کارلٹن ہوٹل''
۸ بجے صبح

میری جان سے عزیز زبیدہ

تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میں اچانک لکھنؤ سے چل دیا۔ ابھی ابھی اعظم گڑھ سے بھائی بدرالزماں صاحب منصف کا تار آیا کہ ''تمہاری بہن سخت بیمار ہیں جلدی آؤ۔''

چنانچہ میں ابھی ۱۲ بجے کی گاڑی سے اعظم گڑھ روانہ ہوتا ہوں خدا حافظ افسوس کہ تم سے نہ مل سکا۔ اگر شام تک تم سے رخصت ہونے کے لئے ٹھہرتا ہوں تو پھر کوئی گاڑی سیدھی اعظم گڑھ نہیں جاتی۔ دُعا کرو خدا میری پیاری قمر آرا کو زندہ سلامت دکھائے اور میں جلدی آ کر تم سے ملوں۔

اپنی زبیدہ کا
پریشان قمر

رقعہ پڑھ کر وہ بہت پریشان ہوگئیں اور چند منٹ بعد اپنی کوٹھی واپس ہوگئیں۔ رات بہت پریشانی میں گذاری۔ دوسرے دن صبح ہی مسٹر قمرالزماں کو دریافت خیریت کے لئے اعظم گڑھ تار دیا لیکن دو دن تک اس کا کوئی جواب نہ ملا تو تیسرے دن بدرالزماں صاحب کے نام ارجنٹ تار دیا۔ جس کا جواب آیا۔

''مسٹر قمرالزماں یہاں اب تک نہیں پہنچے۔''

اس خبر سے زبیدہ پریشان ہوگئیں اور قمر آرا بیگم کے نام اعظم گڑھ مفصل خط لکھا کہ آپ کی بیماری کا تار ملنے پر آج چوتھا روز ہے قمرالزماں صاحب یہاں سے جاچکے ہیں۔ پانچویں دن اُن کو اس خط کا یہ جواب ملا کہ ''میں بالکل تندرست ہوں''۔ یہاں سے میری بیماری کا کوئی تار نہیں دیا گیا۔ نہ بھائی جان یہاں آئے۔

اس تشویشناک خبر نے زبیدہ کے دلِ ناتواں پر بجلی گرادی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ '' آخر یہ کیا ہوگیا۔'' اعظم گڑھ کا تار وہ میرے لفافہ میں ملفوف کر گئے تھے اسے میں پڑھ چکی ہوں پھر یہ کسی ڈشمن کی کارروائی تھی۔ بہن کی بیماری کا تار دے کر بلایا اور کہیں غائب کردیا۔

آخرانہوں نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے ایک خط اعظم گڑھ اور لکھا کہ فوراً اُن کی تلاش کرنی چاہئے اور وہ اعظم گڑھ سے آیا ہوا تار بھی ملفوف کردیا۔ زبیدہ اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور سخت بیمار ہوگئی۔ ایک ہفتہ بری حالت رہی۔ اب اس سے ضبط نہ ہوسکا اور آج سے ڈھائی مہینہ پیشتر کے اپنے اور قمرالزماں کی ملاقاتوں کے کل حالات بیان کردیئے۔

صالحہ حسن نے سب کچھ اپنی ساس اور خسر کو سنادیئے ان کو بھی اس وقت کچھ رحم آگیا۔ کچھ بیماری سے ڈر گئے۔ زبیدہ پر اظہارِ ناراضگی نہ کیا۔

مولوی نور محمد صاحب کو اُن کی بیماری کی خبر پہنچی تو وہ پریشان ہوکر لکھنؤ آگئے صبح کے چھ بجے تھے جس وقت وہ یہاں پہنچے۔ زبیدہ کی بیماری کو آج دسواں دن تھا ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی اور نرس رخصت کردی گئی تھی۔ گھر کے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں

تھے۔ نور محمد گاڑی سے اُتر کر سیدھے زبیدہ کے کمرے میں آئے وہ ابھی مسہری پر تھیں انہوں نے آتے ہی ''سلام علیکم'' کہا اور قریب کی کرسی پر لیٹ گئے۔

رقیق دل زبیدہ اس دفعہ نہایت محبت سے پیش آئیں۔ انہوں نے بیٹھتے ہی زرد و ناتواں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ زبیدہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جس کا مولوی صاحب کے دل پر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی اشکبار ہو گئے۔

نور محمد: ''یک لخت آپ کی طبیعت کیوں بگڑ گئی۔''

زبیدہ: ''خدا کا شکر ہے آپ آگئے میں تو آپ کی منتظر تھی۔ ابھی تمام حالات آپ کو سناتی ہوں۔''

نور محمد: ''مجھے بہت دیر سے اطلاع پہنچی ورنہ اس سے پہلے حاضر ہوتا۔''

زبیدہ: ''ایک ہفتہ میری حالت خراب رہی اس درمیان میں کسی نے نہ لکھا ہوگا۔ میں تو اُن ہی دنوں چاہتی تھی کہ آپ آجاتے تو میرے دل کو کچھ تقویت ہو جاتی۔''

نور محمد: ''آپ نے خود کہہ کر تار دلوا دیا ہوتا مجھے تو پرسوں صبح کا لکھا ہوا خط کل ملا ہے اسی وقت روانہ ہو گیا۔''

زبیدہ: ''میرا ارادہ ہوا تھا کہ اپنی نرس سے تار دلوا دوں لیکن پھر یہی خیال آیا کہ گھر میں سے ضرور اطلاع دی ہوگی۔ اب تو بفضلِ خدا میں بہت اچھی ہوں۔ اُن دنوں آپ دیکھتے تو گھبرا جاتے۔''

نور محمد: ''کاش مجھے خبر ہو جاتی تو نرسنگ کا فخر خود حاصل کرتا۔''

زبیدہ: (مسکرا کر) ''اچھا تو میں پھر بیمار ہو جاؤں کہ آپ کی نرسنگ کا لطف حاصل ہو؟''

نور محمد: ''خدا نہ کرے۔''

زبیدہ: ''مولوی صاحب آپ کے مل جانے کی خوشی میں میں شکایت کرنی بھول گئی۔ مجھے تو بہت صدمہ تھا کہ آپ نے پورے چھ ماہ کا لمبا عرصہ گزار دیا اور آپ نے اس طرف رُخ نہیں کیا۔ بڑے محبت کے دعوے تھے۔ کیا دوستی اور بھائیوں کی محبت اسی کو کہتے ہیں۔''

نور محمد: "یہ تو ذکر ہی نہ چھیڑو۔ آپ کی طبیعت ان دنوں نازک ہو رہی ہے۔ میری زبان سے کوئی رنج دہ لفظ نہ نکل جائے اگر میں نہیں آیا تو یہاں سے بھی مجھے کس نے یاد کیا۔"

زبیدہ: "یاد تو بہت کیا لیکن اسی خیال سے نہیں بلایا گیا کہ آپ کے ضبط کی آزمائش تھی۔"

نور محمد: "خیر کوئی بلاتا یا نہ بلاتا میں ضرور آتا لیکن عمداً دل پر جبر کیے رہا کہ یہاں کا خیال دل سے کم ہو جائے کہ علالت کی خبر ملی جس نے استقلال کھو دیا۔"

اس کے بعد زبیدہ نے اپنی پہلی ملاقات اُن کی علالت اعظم گڑھ اور خط و کتابت کے سب حالات بیان کر دیئے اور پوچھا کہ "بتایئے اب کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ زندہ ہوں گے۔"

نور محمد: "خدا کے فضل سے اُمیدوار رہنا چاہیے یقیناً وہ زندہ ہوں گے اور کون دُشمن تھا جس نے پھانسا یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں یہ جعلی تار اور اُن کو بلا کر کہیں پھنسانا ان کی بیوی نجمہ اور اس کے بدمعاش دوستوں کا کام ہے۔"

"خیر اس قدر مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُن کو نجمہ نے ہلاک نہیں کرایا بلکہ کسی صورت سے اپنی گرفت میں کر رکھا ہے۔ ابھی آپ نے کہا نہ کہ وہ حق مہر طلب کر رہی ہے۔ پس وہی وصول کرنے کو تنگ کر رہی ہوگی۔"

زبیدہ: "لیکن اگر وہ زندہ ہیں تو مجھے خط کیوں نہیں لکھتے؟"

نور محمد: "اس کے قبضے میں رہ کر خط لکھنا دشوار ہوگا اگر وہ لکھتے ہوں گے تب بھی تلف ہو جاتے ہوں گے۔ آپ اپنی طبیعت سنبھالیئے۔ پھر میں چل کر تلاش کروں گا۔"

زبیدہ: "(دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر) خدا اجر نیک دے میں تا حشر احسان مند رہوں گی اگر آپ نے میری خاطر سے اُن کا پتہ لگا لیا۔"

نور محمد: "احسان مندی کی کوئی وجہ نہیں اگر میری جان بھی آپ کے کام آ جائے تو دریغ نہ کروں خدا آپ کو خوش رکھے۔"

زبیدہ: "خدا نہ کرے میری جان آپ دونوں صادق دوستوں پر قربان ہو۔"

نور محمد: ''دوست تو ایک ہی ہے دوسرا اس سے بھی زیادہ۔''

زبیدہ: ''نہیں فی الحال تو دونوں یکساں ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ان کے ساتھ ذرا بے تکلفی زیادہ ہے۔''

نور محمد: ''اور ذرا محبت بھی زیادہ ہے۔''

زبیدہ: ''آپ سے فرشتہ خصال انسان سے بھی کچھ کم نہیں ہے۔''

نور محمد: ''اُن کے پاس روپیہ تو اس قدر ہے نہیں کہ نجمہ کا مہر ادا کر دیں اور صلح کر لینے کی بھی اب تجدید عشق و محبت کے عہد میں اُن سے اُمید نہیں تو پھر یہی کرنا چاہئے کہ ہم روپیہ لگا کر انہیں نجمہ سے چھڑا لیں؟''

زبیدہ: ''روپیہ کی تو پھر دیکھی جائے گی سر دست تو ان کا سراغ لگانا ہے کہ وہ کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں؟''

نور محمد: ''آپ جو حکم دیں میں تعمیل کو حاضر ہوں۔''

زبیدہ: ''کوئی مشہور سراغ رساں مقرر کیجئے۔''

نور محمد: ''فی الحال تو میں کسی سراغ رساں سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل نجمہ کا کہاں قیام ہے؟''

زبیدہ: ''اعظم گڑھ تھوڑے عرصہ سے اس کے والد وہاں تبدیل ہو گئے ہیں۔''

نور محمد: (خوش ہو کر) ''اوہو۔ وہ بھی اعظم گڑھ ہی ہے۔ اب تو یہ معاملہ ذرا بھی پیچیدہ نہیں رہا۔ انشاء اللہ میں بہت جلدی اُن کا پتہ لگا لوں گا۔ اس کمبخت کو جب ہی تو کامیابی ہو گئی۔ دونوں کا ایک ہی مقام تھا۔ بہن کے نام سے تار دے کر بلا لیا۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ذرا اُٹھنا بیٹھنا پھرنا شروع کر دیں تو میں اطمینان سے جا کر آپ کے گرفتار کو چھڑا لاؤں۔''

زبیدہ: ''میں بالکل اچھی ہوں کل برآمدے میں نکل کر بیٹھی تھی۔ اعظم گڑھ میں آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گی خود ساتھ چلوں گی۔''

نور محمد: ''اوّل تو آپ کمزور ہیں دوسرے ایسے خطرناک موقع پر آپ کا ساتھ ہونا ٹھیک نہیں مجھے آپ کی فکر لگی رہے گی تو اچھی طرح کام نہیں کر سکوں گا۔''

زبیدہ: ''آپ کو میری فکر نہیں کرنا پڑے گی۔ میں نہایت محفوظ مقام یعنی اُن کی ہمشیرہ قمر آرا بیگم کے گھر ٹھہر جاؤں گی بلکہ آپ کو بھی وہیں قیام کرنا ہوگا۔''

نور محمد: ''اس وقت بہت سی مشکلات کا سامنا ہے آپ صبر سے کام لے کر یہیں رہیے۔ جب ذرا کامیابی کی صورت نظر آئے گی۔ میں آپ کو بلا لوں گا۔ اخراجات کی طرف سے بھی اطمینان رکھئے ڈیڑھ لاکھ روپیہ میرے قبضہ میں ہے والد صاحب قبلہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے جس قدر ضرورت ہوگی اس میں سے صرف کیا جائے گا۔ اچھا چائے پلوایئے تین وقت سے فاقہ ہے۔''

(۱۳)

فیرینہ: ''کہیے پھر اس پارسی نوجوان سے ملاقات کی کیا ٹھہری؟''

نجمہ: ''ملاقات کیسی اس کی تو جان پر بن رہی ہے۔ آج پانچواں روز ہے میری اس کی ملاقات کو مگر وہ دیوانہ ہو رہا ہے۔''

فیرینہ: ''یہ تو بتاؤ آپ کو بھی اس سے محبت ہے یا اس غریب ہی کو دیوانہ بنا دیا ہے۔''

نجمہ: ''دل سے دل کو راہ ہوتی ہے جب وہ اس قدر مجھ پر جان دے رہا ہے تو میں کیوں نہ چاہوں گی؟''

فیرینہ: ''پیاری نجمہ مجھے آپ کی محبت کا کچھ اعتبار نہیں۔''

نجمہ: ''وہ کیوں؟ میں نے جس کو چاہا اس پر جان فدا کی۔''

فیرینہ: ''مگر کپتان صاحب سے بہت بے وفائی کر چکی ہو۔''

نجمہ: ''فیرینہ اصل پوچھو تو مسٹر قمر سے مجھے کوئی دلی محبت نہ تھی۔ میں نے تو محض اُن کی پوزیشن سے شادی کی تھی لیکن مسٹر ہمفری کو جو بچپن سے چاہا تو آج تک اُن پر جان دیتی ہوں۔ یہاں اعظم گڑھ آنے پر مسٹر فاکس سے دوستی ہو گئی۔ میں نے تو اُن کی طرف اتنی توجہ نہ کی مگر وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں تو میں کیسے بے رُخی کرتی۔ محبت سے محبت کرنی پڑتی ہے۔''

فیرینہ: (ہنس کر) ''اب کہو ان نئے دل کے بادشاہ سے کیسا سلوک کرو گی؟''

نجمہ: ''آہ فیرینہ کچھ نہ پوچھو اس کمبخت نے تو میرے دل پر بجلی گرا دی۔ جب تک میں اس کو دیکھ نہ لوں مجھے چین نہیں پڑتا۔ پانچ ہی دن میں اس نے

میرے دل پر قبضہ کرلیا۔ تم تو دیکھ ہی چکی ہو کس غضب کا حسین ہے۔"

فیرینہ: (مسکرا کے) "اور غضب کا دولتمند بھی تو ہے۔"

نجمہ: پیاری فیرینہ مجھے تو اس کی دلکش صورت اور بے انتہا محبت نے مدہوش کر دیا ہے سچ کہتی ہوں میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم ہی بتاؤ کیا تدبیر کی جائے۔"

فیرینہ: "آپ تو کہتی ہیں وہ شادی کرنے کو تیار ہے۔"

نجمہ: "میرا پیارا پیسٹن جی تو تیار ہے مگر میں گرفتار ہوں۔"

فیرینہ: "آپ کپتان صاحب سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں۔"

نجمہ: "اگر میں طلاق مانگتی ہوں تو مہر معاف کرنا پڑتا ہے اور وہ خود طلاق دیتے نہیں کہ مہر ادا کرنا پڑتا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میں کیسے آزادی حاصل کروں جو اپنے پیارے پیسٹن جی کی ہو جاؤں۔"

فیرینہ: "اب آپ کو مہر کی کیا پرواہ ہے۔ کروڑپتی تاجر آپ پر عاشق ہوا ہے۔"

نجمہ: "تو تمہاری رائے ہے کہ مہر معاف کر کے طلاق لے لی جائے۔"

فیرینہ: "بے شک جب کہ ایک لاکھ چھوڑ کر کروڑوں کی مالک ہو جائیں گی تو اس کی کیا پرواہ ہے مگر آپ کے پاپا تو مسلمان ہو گئے ہیں۔ پارسی سے شادی کس طرح جائز ہو گی؟"

نجمہ: "فیرینہ میرا پیسٹن مسلمان ہونے کو تیار ہے۔"

فیرینہ: "بس تو بسم اللہ کر کے پہلے شوہر سے آزادی حاصل کر لو پھر پیسٹن ہی پیسٹن ہے۔"

نجمہ: "اپنے بادشاہ پیسٹن کی بیوی بن کر مجھے روپیہ کی کیا پرواہ رہے گی مگر میں تو ذرا اس سنگ دل جفا کار کو تنگ کرنا چاہتی تھی یوں تو وہ کھلے بندوں ایسی بہاریں کرے گا۔"

فیرینہ: "اوہ! اب تمہیں اس کی کیا پرواہ ہے جب اس سے زیادہ چاہنے والا مل گیا تو خاک ڈالو اُس پر۔"

نجمہ: "آج میں پیسٹن جی سے شادی کا اقرار کر لوں۔"

فیرینہ: "ضرور ضرور وہ کہیں بمبئی واپس نہ چلے جائیں۔"

نجمہ: ''یہی تو ان کا اصرار ہے کہ میں اقرار کرلوں اور وہ منگنی کی انگشتری پہنا جائیں۔ بعد میں میں اپنے پہلے شوہر سے طلاق لے لوں اور وہ سامان تیار کر کے آجائیں اور شادی ہو جائے۔ ان چند ہی ملاقاتوں میں تین ہزار کے تحائف مجھے دے چکے ہیں مگر فیرینہ ایک بڑی دقت درپیش ہے۔ میرے دونوں جاں نثار دوست میرے دشمن ہو جائیں گے۔ میں دیکھتی ہوں اُن کی نظریں ابھی سے بدل رہی ہیں کیوں کہ مجھے ڈاک بنگلہ آتے جاتے دیکھتے ہیں۔ کل تو وہ یہیں بیٹھے تھے کہ مسٹر فاکس وجوزف آگئے۔ میں بہت گھبرا گئی۔''

یہی باتیں تھیں کہ فراٹے بھرتی مسٹر پیسٹن جی کی موٹر آکر ٹھہری۔ فیرینہ کو یہیں بیٹھا چھوڑ کر اس طرف دوڑی گئی اور دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

پیسٹن جی: ''پیاری نجمہ میں ایک سخت ضروری امر کا فیصلہ کرنے آیا ہوں۔''

نجمہ: ''کہیے؟''

پیسٹن جی: ''نجمہ میں تمہاری جدائی میں مرا جاتا ہوں۔ میں بمبئی جا کر تمہارے بغیر زندہ نہ رہوں گا۔ للہ کوئی تدبیر بتاؤ میں کیا کروں۔''

نجمہ: (گلے میں بانہیں ڈال کر) ''میرے پیسٹن جی میں خود اپنی کیفیت کیا بتاؤں مگر ایسی جلدی نہیں کرسکتی کیوں کہ ابھی ایک دوسرے کے نکاح میں ہوں۔''

پیسٹن جی: ''آخر پھر اس کمبخت نکاح کے پھندے سے کس طرح رہائی ہوگی اگر کچھ روپیہ چاہیے تو کہو۔ ہزاروں نہیں لاکھوں نثار کرنے کو تیار ہوں۔ کیا تمہارا پہلا شوہر کچھ روپیہ لے کر طلاق دے گا اگر ایسا ہو تو جس قدر چاہو چیک لکھے دیتا ہوں۔''

نجمہ: ''میں اس سے دریافت کرلوں پھر آپ کو جواب دوں گی میں چاہتی ہوں کہ آپ کا روپیہ بھی خرچ نہ ہو اور اس ظالم سے رہائی بھی حاصل کرلوں؟''

پیسٹن جی: ''او میری پیاری، میری پری نجمہ روپیہ کی ذرا پروا نہ کرو۔ روپیہ تمہارا صدقہ ہے روپیہ کی کمی نہیں ہے۔ تمہارا پیسٹن جی اس وقت دو کروڑ کا مالک ہے۔ اور والد صاحب کا کروڑوں علیحدہ ہے جو بعد اُن کے مجھ ہی کو ملنے والا ہے۔''

نجمہ: ''بہت اچھا اسی ہفتہ میں اُن سے قطع تعلق کرتی ہوں۔''

پیسٹن جی: ''خدا خوش رکھے اور جلدی نجمہ پیسٹن جی کہلاؤ۔ چلو شام کا وقت

ہے ذرا سیر کر آئیں کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا۔"

چنانچہ دونوں کار پر سوار ہو گئے جس وقت اُن کی موٹر ہوا کی مانند اُڑی جا رہی تھی۔ یہیں باغیچہ میں ایک کونے میں کھڑے دونوں دوست یہ باتیں کر رہے تھے۔

فاکس: "دیکھا دوست یہ کس غضب کی عورت نکلی۔ بخدا میں اس کو دل و جان سے چاہتا تھا۔"

جوزف: "میں اس سفید بلا کے ہتھکنڈوں کو شروع ہی سے سمجھ رہا تھا مگر آپ اس کی محبت کے فریب میں آگئے۔"

فاکس: "خیر وہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا وہ ہم سے ہٹ گئی ہے تو ہم بھی اُس پر لعنت بھیجتے ہیں مگر یہ تو کہو اس کے سخت جرم میں جو ہم نے شرکت کی ہے اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔"

جوزف: "اوہ! اس کی پرواہ نہیں اگر وہ چالاک ہے تو ہم بھی ہوشیار ہیں۔ دیکھتے جاؤ ایسی چال چلوں گا کہ اسی کمبخت کو مجرم سمجھا جائے گا اور ہم دونوں پر کوئی شبہ بھی نہ کر سکے گا۔"

فاکس: "کمبخت ہے بڑی قسمت کی دھنی پہلے ایک کپتان پولیس کو گرفتار کیا تھا۔ اب ایک کروڑ پتی تاجر کو دام فریب میں پھانس لیا۔"

جوزف: "یار پوری وہاں بھی نہیں پڑے گی خواہ شادی بھی کر لے مگر حالات کھلنے پر وہ بھی نفرت کرنے لگے گا۔ اچھا چلو اب یہاں کیوں وقت ضائع کریں جس جفا کار سے ملنے آئے تھے۔ وہ تو آپ کے رقیب کے ساتھ ہوا ہو گئی۔"

یہاں سے یہ دونوں اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے اور وہاں سے قریب دس بجے کے مسٹر جوزف ڈاک بنگلہ آئے۔ ابھی ابھی کھانا کھا کر نجمہ گھر روانہ ہوئی تھی اور مسٹر چیسٹن جی جوزف کے انتظار میں ٹہل رہے تھے کہ وہ بائیسکل سے اُترے تو وہ اُسے کمرے میں لے آئے۔

چیسٹن جی: "بتائیے کیا کیا تجاویز ہیں۔"

جوزف: "سب معاملہ درست ہے۔ ابھی مجھ کو مس فیرینہ نے اطلاع دی ہے نجمہ مہر معاف کر کے مسٹر قمر سے طلاق لینے کو تیار ہے کیوں کہ آپ کا کروڑوں روپیہ نظر آ رہا ہے۔"

پیسٹن جی: ''ایسی تدبیر کرو کہ جلدی طلاق ہو جائے کیوں کہ ہمیں یہاں سے جلدی جانا ہے۔''

جوزف: ''جلدی فیصلہ ہوا جاتا ہے میری چچازاد بہن فرینہ اُس کی بہت ہی بے تکلف اور عزیز دوست ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ جس طرح بنے نجمہ کو فوراً طلاق لے لینے پر آمادہ کرو۔ چنانچہ اس کی رائے کا بہت اثر ہوا۔ نجمہ آج کل میں طلاق لینے والی ہے۔''

پیسٹن جی: ''خدا تمہاری مدد کرے حتی الامکان ہم بھی تمہیں خوش کریں گے۔ ہم نے اس روز تم کو پانچ ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لو ایک ہزار اس وقت دیا جاتا ہے۔ باقی انعام پورا فیصلہ ہونے پر دے دیا جائے گا۔''

جوزف: ''آپ کی مہربانی اب رخصت ہوتا ہوں کل نہیں تو پرسوں ضرور قطعی فیصلہ ہو جانے کی خوشخبری لے کر حاضر ہوں گا۔''

دوسرے دن صبح ہی نجمہ اپنے والد صاحب اور مسٹر جوزف کو ساتھ لے کر تہہ خانے میں مسٹر کے پاس پہنچی۔ طلاق نامہ کا کاغذ بھی اپنے ہمراہ لائی۔ مسٹر قمر بہت حیران ہوئے کہ آج یہ دن میں اتنے آدمیوں کے ہمراہ کیسے آئی۔ تیز لیمپوں کی روشنی سے یہ تنگ و تاریک تہہ خانہ منور ہو گیا۔ ایک کمبل بچھایا گیا اور تینوں بیٹھ گئے۔ قریب ہی ایک پرانی دری پر ضعیف و ناتواں غمزدہ قمر الزماں لیٹے ہوئے تھے۔ جو اُن کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھے۔

جوزف: ''حضور کپتان صاحب کیا حالات ہیں؟''

مسٹر قمر: ''شکر ہے خدا کا اور آپ سب کا۔ جوں جوں طاقت گھٹتی ہے ضعف بڑھتا جاتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ اب ابدی آرام گاہ کے قریب پہنچ گیا ہوں چند ہی روز میں آپ کو دانہ پانی دینے کے لئے یہاں آنے کی تکلیف سے نجات مل جائے گی۔''

نجمہ کے پاپا: ''نہیں بیٹا آج ہم تم کو رہا کرتے ہیں۔ افسوس کہ مجھ کو علم نہ تھا کہ اس بے عقل لڑکی نے تم پر یہ ظلم کیا ہے مجھے تو یہ خبر رات ہی کو ملی ہے۔ بے شک اس لڑکی کے ہاتھوں آپ کو تکلیف پہنچی ہے لیکن اُمید ہے اپنے کریمانہ اخلاق سے معاف کر کے اپنی اور مجھ بوڑھے کی عزت پر حرف نہ آنے دو گے اور ہمیشہ کے لئے یہ بلا آپ سے علیحدہ

ہو جائے گی۔ میں یہ انتظام کر کے آیا ہوں کہ اسی وقت اس کو باقاعدہ طلاق دے دیں۔ لیجئے یہ کاغذ حاضر ہے میں اور مسٹر جوزف گواہ ہیں۔"

مسٹر قمر: "میرے پاس اس قدر روپیہ نہیں ہے کہ آپ کی بیٹی کا مہر ادا کر سکوں۔"

پاپا: "اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے اس کم سمجھ کو رضامند کر لیا ہے وہ اب اپنا مہر معاف کرنے کو تیار ہے۔ بول نجمہ راضی ہے؟"

نجمہ: "پیارے پاپا جب آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں، کپتان صاحب نے مجھ پر وہ ظلم کیا ہے کہ اس آسانی سے میں ان کو قیامت تک معاف نہ کرتی مگر آپ کے حکم سے مجبور ہوں۔"

پاپا: "اچھا لکھو اس کاغذ پر اور دستخط کر کے کپتان صاحب کے حوالے کرو۔"

مسٹر قمر: "میری طرف سے آپ کی بیٹی کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ میرے خیال میں اس طلاق کی تو کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر کہیں اور اُن کی شادی کرنے کی تجویز ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں۔"

پاپا: "بیٹے آپ بفضل خدا سمجھ دار ہیں یہ کمبخت جوان ہے اور میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس قابل تو یہ رہی نہیں کہ آپ کا گھر آباد کرے۔ پس مناسب ہے کہ آپ اس کو قطعی آزادی دے دیں اور میں کسی اور جگہ اس کو دفع کر دوں۔"

مسٹر قمر: "بہت ٹھیک۔"

پاپا: "لیکن پیارے بیٹے اتنی مہربانی اور کرو کہ اس بات کا مجھ بوڑھے کے سامنے اقرار کر لو کہ رہائی کے بعد اس احمق لڑکی کی اس ظالمانہ حماقت کا کسی کے سامنے ذکر نہ کرو گے۔؟"

مسٹر قمر: "اگر آپ کو میری بات کی سچائی کا یقین ہے تو قسم کھلوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس چند ہفتہ کی سرگذشت کے متعلق کسی سے ایک حرف نہ کہوں گا۔"

نجمہ: پاپا جان یوں مجھے اعتبار نہیں کل کو ہی یہ پولیس کے حوالے کر دیں تو کیا

کرلوں گی۔ آج ان کو یہیں رہنے دیں۔ کل اپنے ساتھ ہم قرآن شریف لائیں گے اور اس پر ہاتھ رکھوا کر رہا کریں گے۔"

مسٹر قمر: "بہت بہتر مجھے کوئی جلدی نہیں۔ تم ہر طرح اپنا اطمینان کرلو۔"

جوزف: "میں اسی وقت باہر جا کر کہیں سے آپ کا قرآن لے آؤں؟"

نجمہ: "یہاں جنگل میں قرآن شریف کہاں مل سکتا ہے۔ جلدی کیا ہے؟ کل اسی وقت آئیں گے۔"

پاپا: "اچھا طلاق نامہ تو مکمل کرلو۔"

نجمہ اور قمر الزماں صاحب نے لکھنا شروع کیا اس کے باپ اور جوزف گواہ ہوئے۔ ایک کاپی مسٹر نے لی۔ ایک نجمہ نے۔ اور کل قرآن لے کر آنے کا وعدہ کر کے تینوں کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی یہ باہر نکلنے کے لئے راستہ کے قریب پہنچے انسپکٹر صاحب مع کئی کانسٹیبلوں اور منصف بدر الزماں کے تہہ خانے میں اتر آئے۔ ان تینوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں حواس گم ہو گئے اور نجمہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی کانسٹیبلوں نے جوزف اور نجمہ کے والد کو ہتھکڑیاں پہنادیں اور گرفتار کرلیا۔ نجمہ چوں کہ بے ہوش تھی اس کو بلا ہتھکڑی کے اٹھا کر باہر لائے لیکن دو کانسٹبل اُس کی حفاظت کو تعینات کر دیئے گئے۔

منصف صاحب آگے بڑھ کر اپنے پیارے چچازاد بھائی اور عزیز سالے قمر الزماں سے بے تابانہ لپٹ گئے۔ انسپکٹر صاحب پولیس نے اُن سے مصافحہ کیا اور جلدی سے باہر لے آئے۔ یہاں موٹر تیار تھی۔ تینوں اس پر سوار ہو کر عدالت پہنچے اور نجمہ کو ہوش آنے پر کانسٹبل تینوں کو قیدیوں کی صورت کشاں کشاں عدالت میں لے آئے۔ دونوں طرف کے اظہار لئے گئے۔ چار گھنٹے یہاں صرف ہوئے۔ کچہری برخاست ہوئی اور منصف صاحب مع اپنے بھائی کے گھر آئے۔ آج کی کاروائی اور بھائی کی رہائی کا اُن کو علم نہ تھا۔ قمر آرا بیگم نہایت بے قراری کے ساتھ برآمدے میں ٹہل رہی تھیں کہ موٹر کار نظر آئی۔ دو رکعت نماز ادا کر کے وہیں سجدۂ شکر میں جھک گئیں۔ اس کے بعد بھائی سے ملیں۔ ان سے اپنے بھائی کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ نہایت دُبلے زرد نحیف ہو رہے تھے۔ نہایت لطیف وعمدہ کھانے میز پر چنے تھے وہ جلدی سے بھائی کو کھانے کے کمرے میں لائیں مگر

انہوں نے منہ ہاتھ دھویا نہ کھانا کھایا سب سے پہلے زبیدہ کو خط لکھا۔

''میں زندہ سلامت قید خانہ سے چھوٹ کر بہن کے پاس آ گیا ہوں۔ منصف صاحب صبح ہی تار دے چکے ہیں۔''

خط کے بعد منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور کھانے پر بیٹھے لیکن منصف صاحب موجود نہ تھے۔ وہ چند منٹ بعد مردانہ کمرے سے نور محمد صاحب کا ہاتھ پکڑے مسکراتے ہوئے نکل آئے اور مولوی صاحب کا اپنی بیوی سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

بدر الزماں: ''مسز بدر میں امید کرتا ہوں۔ آپ آج میرے عزیز دوست اور اپنے پیارے بھائی کے قابل قدر محسن مسٹر نور محمد سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ (سالے سے) بھائی جان آپ حیران ہو جائیں گے، جب حقیقت کا انکشاف ہوگا اگر مسٹر نور محمد کے دل میں آپ کی خداداد محبت و ہمدردی پیدا نہ ہو جاتی اور یہ بلا امداد پولیس خود ہی سراغ رسانی نہ کرتے تو آج قمر اپنا پیارا بھائی نہ پا سکتیں۔''

مسٹر قمر: (تعجب سے) ''اچھا آپ نے مجھے قید سے نکلوایا ہے؟''

نور محمد: ''خدا کی مہربانی تھی میں کس قابل ہوں۔''

مسٹر قمر: ''آپ کو میری حالت کی اطلاع کس نے دی؟''

نور محمد: ''زبیدہ علی بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ میں انہیں دیکھنے لکھنؤ آیا تو انہوں نے مجھ سے آپ کا مفصل ذکر کیا۔''

بیگم بدر: ''اُن ہی بے چاری نے ہم کو بھی اطلاع کی تھی مگر ہم تو حیران تھے کہ کیا کریں؟ بھائی جان کی تلاش کر منصف صاحب چھٹی لینے والے تھے کہ خدا نے ایک فرشتہ رحمت کو بھائی نور محمد صاحب کی شکل میں یہاں بھیج دیا۔ یہ اسٹیشن سے یہاں آئے تو منصف صاحب نے کوئی ہوشیار سراغ رساں مقرر کرنے کی تجویز کی۔ لیکن قابل و روشن دماغ بھائی پروفیسر نور محمد صاحب نے منع کیا کہ چھوٹا سا راز ہے ہم خود ہی تحقیق کر لیں گے۔''

مسٹر قمر: (حیرت سے) ''آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں ایک خندق میں مقید ہوں؟''

نور محمد: ''آپ کے خسر صاحب کا نام تو میں جانتا ہی تھا۔ منصف صاحب

سے مل کر جو میں نکلا تو سیدھا اُن کی کوٹھی پہنچا اور صاحب خانہ سے ملا۔"

بدرالزماں: "یہ بھی تو بتایئے کہ کیا کہہ کر کس لباس میں ملے۔"

نور محمد: (ہنستے ہوئے) "لباس کے متعلق تو لکھنؤ پہنچ کر بتایا جائے گا کہ کیا کیا۔ صاحب خانہ سے یہ کہا کہ "میں بیرسٹر ہوں اور یہاں ایک مقدمہ کی پیروی میں آیا ہوں آپ کا نام نامی سنا تھا ملاقات کو چلا آیا کسی سے شناسائی نہیں تنہا گھبراتا رہتا ہوں۔" اُن کے پاس اس وقت دو نوجوان دیسی کرسچین مسٹر فاکس اور مسٹر جوزف بھی بیٹھے تھے۔ اُن سے بھی ملاقات ہوئی۔ پھر نہایت مہربانی سے اپنی حسین وجمیل صاحبزادی سے ملایا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ نہایت مہربانی و بے تکلفی سے پیش آئیں، چائے پلوائی اور جب میں چلنے لگا تو سوار کرنے موٹر تک آئیں چونکہ مجھے اُن کے گھر کی بھیدی ملازمہ خاص سے بڑے کام لینے تھے اُن کی آیا کو جس نے چاء پیش کی پانچ روپیہ انعام دیئے۔"

مسٹر قمر: "اوہ پانچ؟ ایک ہی کافی تھا۔"

منصف: "بھائی جان ایک پانچ کیسے؟ آپ تو اس وقت تک کئی ہزار خرچ کر چکے ہیں۔ قریب تین ہزار کے تو تحائف ہی پیش کیے ہیں۔ نجمہ صاحبہ کو جن جن لوگوں کی مدد سے سراغ ملا ہے اُن کو ہزاروں انعام میں دے ڈالے۔"

نور محمد: "یہ چھوٹے آدمی اسی طرح قابو میں آتے ہیں۔ ان پانچ روپوں کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے ہی دن بی آیا نے اپنی بیگم صاحبہ کے تمام رازہائے پوشیدہ سے مجھے آگاہ کر دیا۔ پچاس روپیہ اس دن اُن کی نذر کیا گیا۔ مجھ کو یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ یہی مسٹر جوزف جو آج زیرِ حراست ہیں نجمہ کے شریک کار ہیں۔ بس پھر میں نے اُن کو ایسی ترکیب سے اپنا بنایا کہ دوسرے روز شام کو میں ان کے دردولت پر حاضر ہوا۔"

یہ صاحب یعنی مسٹر جوزف پچاس روپیہ ماہوار پر ریلوے اسٹاف میں ملازم ہیں اسٹیشن پر چند بابوؤں کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ خیر ہم پہنچے تو مسٹر جوزف صاحب بہادر نے ہمیں اسٹیشن ماسٹر صاحب کی کوٹھی کے برآمدے میں بٹھایا اور اُن کے ہی ہاں سے چاء منگوائی۔ معلوم ہوتا ہے صاحب بہادر اسٹیشن ماسٹر کے منہ چڑھے ہیں۔ بعد چاء کے ہم انہیں اپنی کار پر سیر کو لے گئے۔ بہت محبت و بے تکلفانہ باتیں

ہو رہی تھیں میں نے اُن سے کہا ''دوست نجمہ سے شادی کرادو تو عمر بھر احسان مند رہوں گا۔'' یہ سن کر وہ بولے کہ ''شادی تو بہت آسانی سے ہوسکتی ہے اگر اُن کے پہلے شوہر سے طلاق ہو جائے۔'' پھر میں نے کہا ''مسٹر فاکس سے بھی تو کچھ بے تکلفانہ محبت معلوم ہوتی ہے۔'' تو جوزف نے کہا ''ہاں وہ نجمہ پر عاشق ضرور ہیں مگر وہ اس سے شادی نہیں کرسکتیں کیوں کہ وہ صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار آمدنی رکھتا ہے۔'' پھر میں نے پوچھا ''طلاق کس طرح دلوائی جاسکتی ہے۔'' تب اس نے بتایا کہ ''یا تو ان کا مہر ادا کیا جائے یا کسی صورت سے نجمہ معاف کردے تو طلاق بہت جلدی ہوسکتی ہے۔'' ہم تو ایک لاکھ روپیہ دے کر بھی طلاق دلوانے کو تیار تھے کیوں کہ جوزف کے ہمراہ ایک روز میں وہ مقام دیکھ آیا تھا جہاں آپ کو رکھا گیا تھا۔ آپ کی تکلیف کے خیال سے مجھے ایک ایک منٹ گراں گزر رہا تھا مگر لالچ بری بلا ہے جب میں نے پانچ ہزار روپیہ انعام دینے کا وعدہ کیا تو جوزف نے کہا کہ ''میں ایک ایسی چال چلوں گا کہ آپ کا ایک لاکھ روپیہ بھی بچ جائے گا طلاق بھی ہو جائے گی۔''

چنانچہ اس نے اپنی چچازاد بہن کے ذریعہ جو نجمہ کی بہت دوست ہے اُن کو طلاق لینے پر رضامند کیا اور خود بھی یہی رائے دی کہ ''فوراً طلاق لے لو'' پس اُسے کامیابی ہوئی اور نجمہ مہر معاف کرنے کو تیار ہوگئی۔''

مسٹر قمر: ''کیا آپ نے جوزف کی معرفت نجمہ کو شادی کا پیغام پہنچا دیا تھا؟''

نور محمد: ''اوہ یہ نہ پوچھو ایک افسانہ ہے لکھنؤ چل کر سنا دیں گے۔''

منصف: ''کچھ مختصر سا بتایئے۔''

نور محمد: ''میں اس ہفتہ میں کئی بار نجمہ سے ملا اور خود باقاعدہ کورٹ شپ کی گرمجوشی ابتدا کی۔''

منصف: ''بھائی جان یہ ایک افسانۂ عشق و محبت ہے یقیناً مسز بدر کے سامنے دہرانا مولوی صاحب مناسب نہیں خیال کرتے ورنہ عجیب مزیدار قصہ تھا۔''

نور محمد: ''خیر کچھ بھی تھا میں نے وہ کام کرلیا جو آج تک نہ کیا تھا۔ بے انتہا محبت و دولت کا یقین دلا کر انہیں آپ سے قطع تعلق کرنے پر آمادہ کرلیا۔ یہ آپ بار بار

آنکھوں کو کیوں ملتے ہیں کیا کچھ تکلیف ہے؟''

بیگم بدر: ''ہاں میں بھی دیکھتی ہوں برابر بھائی جان کے ہاتھ آنکھوں پر ہے۔''

مسٹر قمر: ''میری آنکھوں کو روشنی بہت بری معلوم ہوتی ہے جیسے بجلی چمک رہی ہے۔''

منصف: ''ایک عرصہ تک تنگ و تاریک جگہ رہے ہیں۔ آج پہلے دن سورج کی روشنی ناگوار معلوم ہونی ضروری ہے۔''

نور محمد: ''آیا دروازے بند کر کے پردے برابر کر دو، چلئے بہن آج ہی شب کو لکھنؤ روانہ ہوں۔''

بیگم بدر: ''میں بالکل تیار ہوں۔''

☆

(۱۴)

''کارلٹن ہوٹل لکھنؤ''

صالحہ حسن: ''چلئے نا بہن یہاں ہوٹل میں کیوں پڑی ہیں جب گھر موجود ہے۔''

بیگم بدر: ''اس طرح میں اُٹھ کر نہ جاؤں گی۔ جب ہماری خوشی پوری کر دینے کا آپ لوگ پختہ اقرار کرلیں گے پھر ہم وہیں جا رہیں گے۔''

صالحہ حسن: ''بہن یہ ایسے معاملات ایک دو دن کے نہیں ہوا کرتے وہ تو بھی والدین تھے کہ پھر رضامند ہوگئے ورنہ آپ کے بھائی کی طرف سے کچھ کمی نہیں ہوئی تھی۔ اب جو لڑکی مرنے کو پڑ گئیں تو مجبور ہو کر وہ کچھ نیم راضی ہو چلے ہیں۔ ورنہ زبیدہ کی نسبت ان ہی مولوی نور محمد صاحب سے ہو رہی تھی۔''

بیگم بدر: ''ارے مولوی بھائی جان سے بہت محبت کرتے ہیں اور بڑی کوشش سے میرے بھائی جان کو چھڑا کر لائے ہیں۔ کیا دنیا میں اس قدر نیک دل فرشتہ انسان بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔ تعجب ہے اپنی منسوبہ کے پہلے منگیتر کو مصیبت سے رہائی دلوائی، یہ انسان کا کام نہیں۔''

صالحہ حسن: ''بے شک یہ فرشتہ ہے دس بارہ ہزار روپیہ وہاں خرچ کر آیا ہے۔ اب سنو۔ میرے خسر صاحب کو قسم سے دوبارہ رشتہ کرنے پر رضامند کر لینا بھی نور محمد ہی کا کام ہے۔ اس بے چارے نے ہاتھ جوڑ کر نہایت منتوں سے اُن کا دل نرم کیا ہے۔ کاش میرے کوئی بیٹی ہوتی تو میں اس نور کے پتلے کو اپنا داماد بنانے کا فخر حاصل کرتی۔''

بیگم بدر: ''کاش میرے کوئی چھوٹی بہن ہوتی تو میں اس فرشتہ کو اپنا بہنوئی بنانے کی عزت حاصل کر لیتی۔ اب بھی مجھے وہ قریبی رشتہ داروں سے زیادہ عزیز ہیں جس

روز وہ میرے بھائی جان کو مصیبت سے رہائی دلا کر گھر لائے تھے بدرالزماں صاحب نے اُن سے میرا پردہ اٹھادیا تھا کہ ایسے محسن بھائی سے غیریت نہیں برتنی چاہئے۔ چنانچہ اس وقت کا کھانا ہم سب نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ میں حیرت میں گم ہوئی جاتی ہوں۔ اللہ اللہ قرونِ اولیٰ کا زمانہ یاد آ گیا۔ سچا مسلمان ہے۔"

صالحہ حسن: "بہن آپ کا ہوٹل میں رہنا سخت شاق ہے۔ بھائی قمر یہاں نہیں، آپ اٹھ چلیں نسبت ہونے پردہ بھی آ جائیں گے۔"

دروازہ کھلا اور مولوی نور محمد صاحب مع زبیدہ سلطان کے داخل ہوئے تو بدر نے دونوں کو اُٹھ کر لیا۔

زبیدہ سلطان: "اوہو بھائی جان تو یہاں بیٹھی ہیں۔ آپ کی وہاں تلاش ہو رہی ہے۔"

صالحہ حسن: "تلاش کون کر رہا ہے؟ امی جان نے خود ہی تو بہن قمر کے لینے کو مجھے بھیجا ہے لیکن یہ مانتی نہیں۔"

بیگم بدر: (کھڑی ہو کر) "اچھا اچھا چلئے۔ میں خود جا کر خالہ جان کو سمجھادوں گی کہ ابھی چند روز بعد ہم دونوں بہن بھائی یہیں آ کر رہیں گے۔"

اور دونوں صالحہ کی موٹر کار پر سوار ہو گئیں اور قمر آرا یہ کہتی گئیں کہ "آپ دونوں ٹھہریئے بھائی جان آتے ہوں گے۔"

نور محمد: "کہئے کیا رائے ہے اپنے قمر کے انتظار میں ٹھہریں گی یا چلتی ہیں۔"

زبیدہ سلطان: "پہلے نہ تھی اب تو ہوں۔ میرے اچھے مولوی صاحب میں سچ عرض کرتی ہوں جو آپ کہیں ماننے کو تیار ہوں۔ آپ کے احسان بے پایاں کے عوض کہ آپ نے اپنی جان و مال لٹا کر قمر کی جان بچائی اگر آپ کو میرے خون کی ضرورت ہو تو دینے میں عذر نہ ہوگا۔"

نور محمد: (مسکرا کر) "خون کی تو نہیں البتہ دل کی سخت ضرورت ہے۔"

زبیدہ سلطان: "ہاں اگر میرے قابو میں میرے اختیار میں ہوتا تو آپ یقین کریں آپ کے قدموں میں نثار کردینے میں عذر نہ تھا اور اب بھی میرا جسم تو نہیں لیکن

روح آپ پر نثار ہے۔"

نور محمد: (سر اٹھا کر) "میں تو یوں ہی چھیڑتا تھا خدا تمہارا دل و جان و جسم سب قمر کو مبارک کرے۔ میں نے اس وقت تک جان توڑ کر یہ کوشش کی ہے اب انشاء اللہ اس میں کامیابی ہو گی۔ خدا کا شکر ہے مولانا علی صاحب رضامند ہو چکے ہیں۔"

زبیدہ: (بچشم پر آب) "اوّل تو مجھے اس کا یقین نہیں کہ ابا جان قمر کو منظور کریں گے۔ دوسرے اب مجھے کچھ اس رشتہ کی خوشی بھی نہ رہی۔"

نور محمد: "وہ کیوں؟ خدا خدا کر کے تو یہ دن آیا ہے اور اس کا تو یقین کرو کہ اب قمر منظور ہو جائیں گے کیوں کہ آج دوپہر مجھ میں اور مولانا علی میں جو گفتگو ہوئی اس کا ماحصل یہ ہے۔ جب میں نے بہت زور سے قمر صاحب کی سفارش کی تو مولانا نے فرمایا کہ بیٹے میں تم سے ایسی بے مروتی اور تمہاری حق تلفی نہیں کر سکتا اور جب کہ اپنی جان و مال لڑا کر اس شخص کو چھڑا کر لائے ہو تو مجھ سے ایسی محسن کشی کبھی نہیں ہو سکتی کہ اس کو خاندان میں داخل کر کے تمہیں علیحدہ کر دوں۔

یہ کہتے وقت مولانا صاحب سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ آبدیدہ ہو گئے پھر تو مجھے بھی ضبط کا یارا نہ رہا اور دونوں باپ بیٹے خوب روئے۔ تاہم کچھ منٹ بعد میں نے اُن کو اچھی طرح یقین دلا دیا کہ میں اپنی بہن زبیدہ کو نہایت خوشی سے قمر کو دیتا ہوں اور آپ کو یہ رشتہ کرنے پر مجبور کرتا ہوں اور اگر آپ قمر سے میری بہن کی شادی نہ کریں گے تو میں بھی نہ کروں گا اور اس کی عمریں یوں ہی برباد ہوں گی۔ یہ سن کر میرے محترم مولانا خاموش ہو گئے اور میں نے فوراً ہی نیچے آ کر والدہ صاحبہ مکرمہ سے کہہ دیا کہ" وہ بہت جلد عقد کا سامان کریں۔ اب تم کسی وہم میں نہ پڑو۔ انشاء اللہ بہت جلدی اپنے محبت کرنے والے بھائیوں حسن اور نور محمد کے ہاتھوں قمر کو سونپ دی جاؤ گی۔"

یہ الفاظ سن کر روتی ہوئی زبیدہ نے اپنے محسن نور محمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ چند منٹ ہوئے قمر آ گئے تھے اور اندر اپنا ہی ذکر سن کر پردے کے پیچھے ہو رہے تھے اور نور محمد کی تمام گفتگو بخوبی سن لی تھی۔ ان دونوں نیک نیت پاکباز چاہنے والوں کی حالت کا اُن کے دل پر یہ اثر ہوا تھا کہ وہ بھی پس پردہ کھڑے رو رہے تھے۔ تقریباً

بیس منٹ اسی طرح گذر گئے پھر نور محمد نے اپنی طبیعت سنبھال کر اور زبیدہ کو اٹھ کر کہا۔

نور محمد: ''پیاری بہن دیکھو کہیں قمر نہ آجائے خدا جانے وہ ہماری اس محبت کو کس نظر سے دیکھے گا۔ اب تم اس کی ہو۔''

زبیدہ: ''بھائی ایسا خیال ہی نہ کریں۔ میرا قمر نہایت وسیع خیال اور عالی حوصلہ ہے۔''

مسٹر قمر: (پردہ ہٹا کر) ''السلام علیکم''۔

نور محمد: (کھڑے ہو کر) ''وعلیکم السلام۔ کہاں تشریف رکھتے تھے۔ یہاں گھنٹہ بھر سے انتظار ہے۔''

مسٹر قمر: ''اعظم گڑھ ایک بہت بڑا تار دینا تھا۔ اس لئے خود ہی ٹیلیگراف آفس چلا گیا تھا۔ زبیدہ آپ ذرا یہیں بیٹھیں میں علیحدگی میں مسٹر نور محمد سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اور دونوں پارٹیشن کے اس طرف دوسرے کمرے میں آگئے۔ قمر الزماں نے مولوی صاحب کے پیروں پر سر رکھ کر یوں کہا۔

''میرے پیارے، میرے سچے محسن میری ایک عرض منظور کرو تو سر قدموں سے اٹھاؤں گا ورنہ یہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دوں گا۔''

نور محمد: (اُن کا سر سینے سے لگا کر) ''میرے محترم بھائی للہ ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالیں۔ کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

مسٹر قمر: (روبرو بیٹھ کر) ''پہلے اقرار کریں کہ میرا کہنا مان لیں گے۔ آپ نے چودہ پندرہ ہزار روپیہ میرے مقدمہ میں صرف کر دیا۔ میں نے وہ ادا کرنا چاہا مگر آپ نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ خیر میں چپ ہو گیا۔ آپ روپے والے ہیں اور میں غریب ،دولت مندوں سے ناداروں کو فائدہ ہی پہنچا کرتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ اسی طرح اگر میری دوسری خواہش بھی پوری نہ کی تو کہنا ہی بیکار ہوگا۔''

نور محمد: ''پیارے قمر گو آپ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے ہیں لیکن ماشاء اللہ رشتہ میں اب میرے چھوٹے بہنوئی بننے والے ہیں۔ بخدا مثل حسن کے زبیدہ کو اپنی حقیقی

بہن سمجھتا ہوں پس اگر اس کام میں میرا کچھ روپیہ لگ گیا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ بتایئے آپ کی دوسری خواہش کیا ہے؟"

مسٹر قمر: "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کر رہا ہوں کہ زبیدہ سلطان سے حسب قرار داد سابق آپ شادی کر لیں میں نہایت خوشی سے اجازت دیتا ہوں۔ میں گناہگار روسیاہ اس قابل نہیں رہا کہ وہ جنت ارضی کی حور میرے سپرد کی جائے۔ میں تو اب اسی لائق ہوں کہ نجمہ جیسی چڑیلیں مجھے میرے کیفر کردار کو پہنچا دیا کریں۔ میں نہایت خوشی سے اس شادی میں شریک ہو کر زبیدہ کو آپ کے ساتھ رخصت کرنے کو تیار ہوں۔"

نور محمد: "کپتان صاحب آپ یہ خیال ہی دل میں نہ لائیں۔ زبیدہ میری حقیقی بہن ہے۔ جب ایک بار میں اس کو بہن کہہ چکا ہوں تو دوسرا خیال محال ہے۔ میں آپ کو صرف اسی خیال سے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر چھڑا کر لایا ہوں۔ اب میں سچ سچ کہے دیتا ہوں کہ آپ کی منسوبہ آپ کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ آپ کی جدائی میں مردوں سے بدتر ہو گئی تھی۔ یوں وہ قدر کرے لیکن اس کے دل میں میری رتی بھر محبت نہیں ہے تو ایسے شخص سے اس کی شادی کر دینا دونوں پر ظلم ہوگا۔ چنانچہ یہی وجہ بیان کر کے میں نے مولانا علی کے سامنے صاف صاف شادی سے انکار کر دیا ہے۔ مسٹر قمر آخر میں بھی تو انسان کا دل رکھتا ہوں اور اس دل میں احساسات و جذبات کیا مجھے یہ خواہش نہیں ہو سکتی کہ جس عورت کو میں چاہتا ہوں اور جو عورت مجھ سے محبت کرے وہی میری رفیق زندگی بنے۔"

مسٹر قمر: "اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میں زیادہ زور نہیں دے سکتا۔ کاش میری کوئی غیر شادی شدہ حقیقی بہن ہوتی تو ایسے پیارے فرشتہ خصال دوست کی کنیزی میں پیش کرتا۔ اب تو میں آپ کے احسانات کا بدلہ تو کیا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

نور محمد: "میری محبت کا بدلہ آپ محبت سے دے سکتے ہیں جس کی مجھے سب سے زیادہ قدر ہوگی اور وہ یوں کہ جس طرح بہن زبیدہ مجھ سے مثل حسن کے بے حد محبت کرتی ہیں آپ بھی مجھ کو حسن ہی خیال کریں۔ آپ کی بہن قمر آرا بیگم کے ساتھ بھی میرے برادرانہ تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ بس اب مجھے محض ایک دوست ہی نہ سمجھا جائے بلکہ ایک عزیز۔"

مولوی صاحب کی یہ استدعا سنتے ہی مسٹر قمر بیتابانہ اُٹھ کر ان کے گلے سے لپٹ

گئے اور فرطِ محبت سے بے اختیار ہو کر دونوں رونے لگے۔

"زبیدہ پارٹیشن کے اس طرف سے ان کو دیکھ رہی اور ان کی تمام گفتگو سن رہی تھی جب اُن کو کئی منٹ گذر گئے تو اس سے نہ دیکھا گیا ادھر آئی اور دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

زبیدہ: "چاء ٹھنڈی ہو رہی ہے چونکہ دوپہر کا کھانا نہیں کھایا مجھ کو بہت جلدی ہے چلئے۔" "چلئے"۔ دونوں علیحدہ ہو گئے رومال سے آنکھیں خشک کیں اور اُن کے ساتھ چاء کے لئے دوسرے کمرے میں آ بیٹھے۔ زبیدہ سلطان نے ان کے خیالات بدلنے اور دل بہلانے کو یہ ذکر نکالا۔"

زبیدہ: (مسکرا کر) "مولوی صاحب آج پانچواں روز ہے آپ کو یہاں پہنچے۔ اسی دن آپ نے اعظم گڑھ کے حالات سنانے کا وعدہ کیا تھا جو آج تک پورا نہ ہوا۔"

نور محمد: "حرف بحرف تو سنا چکا ہوں اب باقی کیا رہ گیا؟"

زبیدہ: "اور سب تو سنا چکے ہیں مگر تبدیل ہیئت کر کے اپنے اور نجمہ کے تعلقات کی بابت ابھی کچھ نہیں سنایا۔"

نور محمد: "وہ حالات اب تک پوشیدہ رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ بھائی قمر تو رقابت سے جلنے لگیں گے اور آپ اپنے بھائی پر بدظنی کریں گی۔"

مسٹر قمر: (مسکراتے ہوئے) "نہیں ہم رقابت سے نہیں جلیں گے بلکہ وہ ہماری طرف سے پیارے نور محمد کو نذر ہے۔"

زبیدہ: "غیر شادی شدہ بھائی پر میں بدظنی کیوں کرنے لگی تھی؟ آخر تو آپ کو کسی نہ کسی لڑکی سے اپنی خوشی سے شادی ضرور کرنی ہے۔"

نور محمد: "اچھا تو دونوں باحوصلہ ہو کر سننے کے لئے تیار رہیں۔ ہم نے پہلی ہی ملاقات میں اس پر محبت پاش نظریں ڈالیں۔"

زبیدہ: "مولوی صاحبان کی جھکی ہوئی نظروں میں یہ قابلیت بھی ہوتی ہے؟"

نور محمد: "ضرور تا پیدا کر لی جاتی ہے مگر وہ چیز ہی ایسی تھی کہ ہمارے عقل مند بلند حوصلہ بھائی قمر بھی عقل و ہوش کھو بیٹھے تھے۔ خیر ملاقاتیں ہوئیں تعلقات بڑھے ایک دوسرے کا خیال رہنے لگا۔ ہمارے رقیب مسٹر فاکس بے آگ جلنے لگے۔ جوزف کو تو ملا ہی

لیا تھا۔ پس اس ملکۂ حسن کی بارگاہ میں مضطربانہ یہ عرض کی گئی کہ اب تیرے بغیر زندگی محال ہے کوئی تدبیر ہو کہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں۔"

زبیدہ: "اوہو آپ تو چھپے رستم نکلے مگر اس کھدر کی عبا و قبا کی تو سخت ذلت ہوئی۔ اس یورپین لباس والی لیڈی کو کھدر کا جبہ شریف پہننے والا ملا کیوں کر پسند آ گیا۔"

نور محمد: "نہیں جناب اس دربار انگریزی میں کھدر کی کہاں گذر ہماری پری مثال بھاوج کا نیا دوست ایک پارسی نوجوان "مسٹر پیسٹن جی" تھا۔ ایک ہفتہ تک کھدر سے سخت پرہیز رہا بلکہ اعظم گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر ہی بجائے مولوی کے "پیسٹن جی" اُترے تھے۔"

مسٹر قمر: "واہ رے میرے مسٹر "شرلاک" کمال کر دیا۔ میں پولیس کا تجربہ کار ملازم ہونے پر بھی اس خوبصورتی سے سراغ رسانی نہیں کر سکتا۔ آفرین صد آفرین۔"

زبیدہ: "یہ کام انجام دینے میں صرف ان کی سراغ رسانی ہی قابل تعریف نہیں بلکہ ان کا ایک اور پوشیدہ جوہر بھی ظاہر ہو گیا۔"

مسٹر قمر: "یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہر ایک نوجوان کی فطرتی قابلیت ہے۔"

زبیدہ: "یہ صحیح لیکن اس آسانی سے ایک چالاک عورت کو دامِ فریب میں پھنسا لینا معمولی آدمی کا کام نہیں۔ بڑی قابلیت کی ضرورت ہے۔"

مسٹر قمر: "مگر اس کام کو محض قابلیت پر ہی کیوں محمول کرتے ہو؟ وہ پرکالۂ آفت بہت جلد پتھر سے پتھر دلوں کو بھی تسخیر کر لینے کی قابلیت رکھتی ہے۔"

زبیدہ: "بہن قمر آرا اس وقت نہ ہوئیں بڑا لطف آتا۔ ذرا اپنے فرشتہ سیرت بھائی کے کمالات دیکھتیں۔"

نور محمد: "یہ افسانہ اُن کے آگے بیان کرنے کے قابل نہیں کیوں کہ وہ میری بہن ہیں اور پہلی بار بچاری پردے سے نکل کر میرے سامنے آئی ہیں۔"

زبیدہ: "وہ تو قابلِ احترام بہن ہوئیں اور میں تو شروع ہی سے بے پردہ آزاد ہوں ہر قسم کی گفتگو آزادانہ میرے سامنے جائز ہے۔"

مسٹر قمر: "یہ آپ کی زیادتی ہے خود ہی تو کرید کرید کر اصرار کر کے بیان

کروایا اور اب شکایت کرتی ہو۔"

نور محمد: "علاوہ اس کے ان سے میری جس قدر دیرینہ بے تکلفی ہے قمر آرا بیگم سے نہیں ہے دویم وہ محض بہن ہے اور یہ بھاوج بھی (گھڑی دیکھ کر) سات بجنے والے ہیں میں تو گھر چلتا ہوں۔ آپ چلیں گی یا ٹھہرتی ہیں؟"

زبیدہ: (بگڑ کر) "اب کس لئے ٹھہروں گی وقت ہی کیا ہے؟"

نور محمد: (مسکرا کر) "شاید بھائی قمر روکنا چاہتے ہوں۔"

مسٹر قمر: "میں ان کو روک کر کیا کروں گا؟ اگر کسی نے کہا ہوتا تو شاید ساتھ ہی چلا چلتا۔"

زبیدہ: "اس وقت وہاں چل کر ہی آپ کیا کریں گے؟"

نور محمد: "میرا خود دل نہیں چاہتا آپ کو چھوڑ کر جانے کو مگر مجبوری ہے۔ جس وقت تک آپ کے رشتہ کا فیصلہ نہ ہولے زیادہ بے تکلفی مناسب نہیں ہے۔ ان دنوں میں زبیدہ کا بھی یہاں آنا ٹھیک نہیں مگر میں بہن قمر آرا کے ملانے کے نام سے لے آیا ہوں۔"

زبیدہ: (کھڑی ہو کر) "چلئے بھی رات ہو گئی ہے۔"

یہ دونوں مسٹر قمر سے رخصت ہو کر موٹر کار پر سوار ہو گئے۔ زبیدہ خاموش رہیں تو مولوی صاحب نے چھیڑا۔

نور محمد: "عارضی جدائی کا اس قدر رنج نہ کرو انشاء اللہ جلد ملنے والی ہو۔"

زبیدہ: "مولوی صاحب رہنے دیجئے اس قدر بھی مذاق کیا؟"

نور محمد: "ارے میں نے کون سا ناواجب مذاق کیا۔ جب آپس میں بے تکلفی ہوتی ہے تو بات منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔"

زبیدہ: "ایسی بے تکلفی کیا؟"

نور محمد: "او ہو زبیدہ تم تو بگڑتی چلی جاتی ہو میں تو مذاق سمجھ رہا تھا۔"

زبیدہ: "مذاق اور بے تکلفی کا بھی کوئی موقع اور وقت ہوتا ہے۔"

نور محمد: "افسوس مجھے اتنی شناخت نہیں۔ یہاں کچھ بزرگوں کا مجمع نہ تھا کوئی غیر دوست نہ تھا کہ جس کا مجھے لحاظ کرنا پڑتا۔ آخر میں اس قسم کی گفتگو نہ کرتا تو کیا کرتا۔ محض

تمہاری خوشی کے لئے میں جبراً اپنے تئیں خوش بناتا ہوں ورنہ میرے دل کا حال خدا جانتا ہے۔ تم خیال کر سکتی ہو کہ میں ان دنوں جیسا کہ ظاہر ہے کیا دل میں بھی ایسا ہی خوش ہوں؟ اگر آپ کو میری شرکت ناگوار ہے تو بخدا میں آج ہی یہاں سے کالا منہ کر جاؤں گا۔ خدا جانتا ہے آج کل میں یہاں صرف اس لئے ٹھہرا ہوا ہوں کہ آپ کے برافروختہ خاندان کو قمرالزماں کی طرف راغب کر کے اس کی درخواست منظور کرا دوں اور آپ کو چونکہ بہت عرصہ سے اس کا خیال ہے۔ میں یہاں ہوں گا تو ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''آپ خیال کر سکتی ہیں کہ آپ کی شادی میں شرکت کی میں تاب رکھتا ہوں؟ مگر دل پر جبر کر کے صرف اس لئے ٹھہر گیا ہوں کہ جب آپ کو بہن کہا ہے تو بھائی حسن کی طرح اپنے ہاتھوں سے رخصت کر دوں۔ میرے دل کا خیال کر کے مولانا علی اور والدہ صاحبہ مکرمہ نے ایک لفظ شادی میں شریک ہونے کو نہیں کہا۔ لیکن مسز حسن کا اصرار ہے اور وہ بھی اس لئے کہ والدین تو اس شادی کے انتظام میں کوئی حصہ نہ لیں گے۔ میں رہ جاؤں تو اُن کی مدد کروں۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر میں یہاں وہ دن دیکھنے کے لئے پڑا ہوں جس کے خیال کی بھی میرے دل میں تاب نہیں۔ کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ اس شادی کے بعد میں ہندوستان ہی میں رہ کر تم سے تھوڑی سی بے تکلف ملاقات کے سہارے زندگی گزار دوں گا۔ ہرگز نہیں تم خیر سے اپنے گھر سدھارو اور یہ بدنصیب ہندوستان سے کہیں باہر چلا جائے گا۔ افسوس میری بے پایاں محبت کا تمہاری طرف سے یہ قابلِ قدر بدلہ ملا۔ اف تمہارے خوش کرنے کو میں نے کیسے کیسے گناہ کئے۔ ایک منکوحہ عورت سے بناوٹی جھوٹی محبت کی۔ اپنی شرمیلی اور پُر جھجک طبیعت پر جبر کر کے اس بے حیا عورت سے نامناسب گفتگو کرنا اس کا مجھ ایسے پاکباز شخص سے بے تکلفانہ پیش آنا۔ آہ۔ آہ! میں نے کیسے کیسے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔ خدایا مجھے معاف کر جتنی دیر میں اس کے پاس بیٹھتا تھا میرا دل اور ایمان لرزتا رہتا تھا۔ تم یقین نہ کرو گی کیوں کہ میں بھی مرد ہوں مگر خدا تو جانتا ہے کہ گھر آ کر یعنی ڈاک بنگلہ جہاں چیسٹن جی کم بخت ٹھہرا تھا میں گھنٹوں سجدے میں پڑ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا تھا۔ مجھے اس بے حیا مکارہ کی صورت سے جس کی نگاہ میں عصمت کی کوئی وقعت نہ تھی سخت نفرت تھی۔ دلی کراہیت سے اس کے پاس وقت گذارتا تھا۔ جب اس کی بے حجابیاں

بڑھنے لگیں تو میں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ "ابھی تم ایک دوسرے کی منکوحہ ہو۔ جس وقت تک قطع تعلق نہ ہو جائے زیادہ بے تکلفی جائز نہیں۔" تب اس کمبخت نے جلدی سے طلاق لی۔ زبیدہ یہ سب کچھ میں نے کیوں کیا۔ میری ہی زبان سے کہلوانا چاہتی ہو۔ انہوں نے اتنی لمبی تقریر کی مگر زبیدہ کے منہ سے اس کے جواب میں ایک لفظ نہ نکلا تو انہوں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا اور گھبرا گئے۔ وہ ان کے آگے سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔ شکر ہے کہ قریب ہی بنگالی ڈاکٹر کی کوٹھی تھی۔ فوراً کار روک کر زبیدہ کو ہاتھوں میں اُٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ زبیدہ کو اکثر غشی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کو کچھ تعجب نہ ہوا۔ ہوش آنے پر دونوں گھر روانہ ہوئے۔

(۱۵)

مولوی نور محمد صاحب مسز قمر اور بیگم بدر کو پہنچے ایک ہفتہ گذر چکا ہے آئندہ جمعہ کو زبیدہ کی شادی قرار پائی ہے مگر مولوی نور محمد صاحب دو دن سے علیل ہیں آج ذرا بخار میں کمی ہے اور وہ اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔ مولانا علی، حسن و بیگم حسن بے حد اصرار سے روک رہے ہیں مگر وہ نہیں مانتے۔ سہ پہر کی چاء لے کر زبیدہ خود ہی ان کے کمرے میں آئی تو قالین پر پڑے تھے۔ بستر بند حاضر رکھا تھا۔ زبیدہ کے آتے ہی اُٹھ بیٹھے۔

''طبیعت کیسی ہے بھائی جان؟ آپ فرش پر کیوں لیٹ گئے۔ ابھی تو بخار اُترا ہے۔ ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ لیجئے میں چاء یہیں لے آئی میرے ساتھ تو پی لیں۔'' چاء کی ٹرے قریب رکھتے ہوئے وہیں بیٹھ کر زبیدہ نے کہا:

''اوہ شکریہ بہن۔ اتنی تکلیف کیوں کی۔ میرا جی اس وقت چاء کو نہ چاہتا تھا ورنہ خود حاضر ہوتا۔ اب میں اچھا ہوں اور بخار نہیں ہے۔ اجازت دو کہ شام کی ٹرین سے چلا جاؤں؟''

''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میں نہ جانے دوں گی۔ زبردستی کی تو خود بھی ساتھ چلوں گی۔'' زبیدہ نے اُن کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بہت اصرار سے کہا۔

''اچھا چاء تو بناؤ اب پی ہی لوں خدا جانے آئندہ ملاقات بھی ہو یا نہ ہو۔'' یہ کہہ کر مولوی صاحب نے باہر کی طرف رُخ کر لیا اور خاموش ہو گئے لیکن زبیدہ نے دیکھ لیا کہ وہ چشم پرآب تھے۔ انہوں نے جلدی سے چاء بنا کر پیش کی اور بسکٹ اٹھا کر دیا۔ ''لیجئے چاء اور تھوڑا سا کھا بھی لیجئے کیوں کہ آج شب کا کھانا دیر سے ملے گا۔''

''کیوں دیر کی کیا وجہ ہے اور میں تو ۷ بجے جانا چاہتا ہوں۔'' مولوی صاحب

نے پیالی لیتے ہوئے کہا۔

”آپ کسی طرح نہیں جا سکتے۔ میرے عزیز بھائی میں نہ جانے دوں گی۔ میری سب خوشیاں کرتے ہیں یہ بھی کریں۔“ بچوں کی طرح بہت اصرار سے زبیدہ نے کہا۔

”آخر کیوں اس قدر ضرورت کیا ہے۔ کیا اپنی شادی کی خوشی دکھانا چاہتی ہو بخدا میں دل سے خوش ہوں شادی کا موجب میں ہی ہوں ورنہ نہ ہوتی مگر شرکت کی تاب نہیں۔ صحت خراب ہوگئی ہے پھر بیمار ہوگیا تو تقریب کا لطف کرکرا ہوگا۔ اس لئے اچھی زبیدہ اب جانے بھی دو۔ قسمت میں ہوا تو پھر ملیں گے ورنہ آج ختم۔“ بہت مایوسی سے آخری فقرہ کہہ کر چپ ہوگئے اور اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ زبیدہ پر بھی بہت اثر ہوا اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ گھبرا کر کھڑی ہوگئیں اور اُن کے قریب جا کر کہنے لگیں۔ بھائی جان آپ ایسی باتیں نہ کریں میں زندگی بھر مثل بھائی حسن کے آپ سے ملوں گی۔ آپ نہ آیا کریں گے میں جایا کروں گی۔ خدا نہ کرے کہ یہ سچی محبت کا رشتہ ختم ہو میں تازیست آپ کی ہوں آپ شادی میں شریک نہ ہو اس کی ضرورت نہیں لیکن ابھی شادی میں سات دن باقی ہیں۔ آپ تین چار دن اور ٹھہر جائیں میری اور سب کی خوشی ہے۔ کمزوری بھی رفع ہو جائے گی۔ پھر چلے جائیے۔“

مولوی صاحب نے جواب دیا: ”اس وقت جانا اور چار دن بعد جانا یکساں ہے۔ تب بھی آپ سب کو رنج ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرا دل گرا جاتا ہے۔ کمزوری محسوس ہو رہی ہے اس لئے جانا بہتر ہے۔ ہاں آج کھانا کیوں دیر سے ملے گا؟ کیا تقرر تاریخ کی خوشی میں کپتان صاحب کی دعوت ہے۔ کچھ اور لوگ بھی مدعو کئے گئے ہیں؟ میری حالت شرکت ڈنر کی نہیں پھر تو میرا جانا بہت ہی ضروری ہے۔“

یہ سن کر زبیدہ نے کہا: ”نہیں کسی کی دعوت نہیں۔ نہ کپتان صاحب بلائے گئے مگر ابھی تار ملا ہے سر جعفری معہ مس جعفر جی آ رہے ہیں اُن کی ٹرین کا انتظار کرنا ہوگا۔“

”وہ کیوں آ رہے ہیں؟ شرکت شادی کے لئے؟ ایک ہفتہ قبل تو بہت زیادہ ہے؟“ نور محمد صاحب نے سوال کیا تو زبیدہ نے بتایا: ”ہاں زیادہ تو ضرور ہے مگر ان کے ہمارے ایسے تعلقات ہیں کہ ریحانہ بہت پہلے سے انہیں لا رہی ہیں۔“

مولوی صاحب نے گھڑی دیکھی تو چھ بج رہے تھے کہنے لگے: "اب صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔ مجھ کو جانا چاہئے بزرگوں کو سلام کر آؤں۔ مسٹر و مسز حسن کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں آپ سے بہت ناخوش ہیں نہ ملیں گے۔ کہیں باہر چلے گئے، اور اماں ابا جان نے بھی مجھ سے کہہ دیا تھا جب چاء لا رہی تھی کہ زبیدہ نور محمد صاحب سے کہہ دینا کہ اگر ایسی ہی ضد ہے اور بستر تک تیار ہو گیا اور ہمارا کہنا نہ مانا تو اب ہمیں سلام کرنے نہ آئیں اور غالباً وہ بھی ڈرائیو کو چلے گئے ہوں گے۔ ان حالات میں سب سے بغیر ملے اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو بسم اللہ مگر میں ساتھ جاؤں گی۔" یہ کہہ کر زبیدہ نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اتنا کچھ سن کر وہ بہت پریشان ہوئے۔ فرش پر بیٹھ گئے۔ "اچھا بستر کھلواؤ میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ بزرگوں کو بلا سلام کئے نہ جاؤں گا مگر مجھ کو کھانے پر نہ بلایا جائے۔ میں مہمانوں سے آج نہ مل سکوں گا۔"

زبیدہ نے جواب دیا۔ "طبیعت ٹھیک نہیں تو سوپ وغیرہ یہیں منگا لوں گی۔" اس کے بعد زبیدہ نے خود بستر لگا کر بھائی کو لٹا دیا اور یہ کہہ کر چلی گئیں کہ "میں ابھی پھر آتی ہوں۔ اماں جان اور بھابی باہر گئی ہیں ذرا گھر کا حال دیکھ لوں۔ میں یا بھابی صاحبہ کوئی نہ کوئی آپ کے لئے کھانا لے کر آئے گا۔"

تھوڑی دیر بعد مسٹر و مسز حسن آئے اور اُن کو لیٹا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ زبیدہ نے سب کیفیت بیان کر دی کہ کس طرح روکا ہے۔ دونوں چند منٹ باتیں کرتے اور سر جعفر جی کو لینے اسٹیشن جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اس درمیان میں کہ وہ لوگ آئیں۔ زبیدہ دو تین بار ان کے پاس ہو گئیں۔ ایک بار بیگم و مولانا علی بھی دیکھ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اچانک دروازہ کھلا پردہ اٹھا اور زبیدہ مع ایک حسین و جمیل لڑکی کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ پہلے تو اُن کو مسز قمر کا شبہ ہوا۔ پھر خیال کیا کہ لباس بدل کر مس حسن آئی ہوں گی مگر جیسے ہی وہ قریب پہنچیں پہچان لیا کہ وہ نو وارد حسین لڑکی مس جعفر جی تھیں جو اسٹیشن سے ڈنر کے لئے تیار ہو کر آئی تھیں۔ نہایت خوبصورت و چمکیلی آتشی گلابی بنارسی ساڑی، بڑی سی سفید موتی کی مالا پہنے تھیں۔ چونکہ قومی جلسوں اور علی منزل میں مولوی صاحب سے بارہا ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ ریحانہ سے بہت بے تکلفی مثل عزیزوں کے

تھی۔ اب آتے ہی ان کی علالت کی خبر سنی تو فوراً یہ ادھر آ گئیں یا زبیدہ لے آئیں۔ وہ پہچان کر پلنگ پر سے اُٹھ بیٹھے اور چونکہ کپڑے پورے نہ پہنے تھے کمبل میں لپٹ کے انہوں نے آتے ہی مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا اور کہا "اوہو مولوی صاحب یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔" پھر زبیدہ بولیں "بھائی جان آپ کی طبیعت ناساز سن کر ہمیں فوراً ہی چلی آئیں ورنہ میں پہلے اطلاع دیئے آ رہی تھی۔"

"اطلاع کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ مولوی صاحب ہمارے لئے کوئی غیر تو ہیں نہیں ہاں اب ہو جائیں گے کہ بھابی قمر صاحبہ پھر آ گئیں۔" ریحانہ نے کہا۔ "خدا نہ کرے کیوں غیر ہو جاتے۔ اب اور بھی اپنے بن جائیں گے۔" زبیدہ نے جواب دیا۔ دونوں سے سن کر مولوی صاحب نے فرمایا "غیریت کا خیال نہیں اطلاع ہو جاتی تو میں اچکن وغیرہ پہن کر کم از کم دروازہ پر تو آ جاتا۔ خیر آپ مثل میری چھوٹی بہن کے ہیں۔ عالیہ ہر حالت میں آ جاتی ہیں۔"

"اجی ہاں ہمیں یہ سن کر کہ آپ لکھنؤ ہیں اور اسٹیشن پر تشریف نہیں لائے بہت حیرت ہوئی مگر ناسازیٔ طبیعت کا حال سن کر فکر ہو گئی اور میں جلدی سے آ گئی۔ کہئے کیا حال ہے؟ سنا ہے ہمارے آنے کی خبر پا کر آپ آج بھاگے جا رہے تھے؟ یہ صحیح ہے؟" ریحانہ نے مولوی صاحب سے کہا اور کرسی جو پلنگ کے قریب پڑی تھی اس پر بیٹھ گئی۔ زبیدہ ابھی کھڑی تھی۔ مولوی صاحب کو ان کی بے تکلفی پر تعجب ہوا۔ پھر اُن کے سوال کا جواب یوں دیا۔ "آپ کی تشریف آوری کی خبر نہ تھی میں پرسوں سے جا رہا تھا مگر بخار ہو گیا دو دن ٹھہر گیا۔ آج انہوں نے جبراً روکا ہے۔ ابھی ابھی سنا ہے کہ آپ تشریف لا رہی ہیں۔ خیر جبراً رُو کے گئے تو اتنا ہوا کہ ہم نے دیکھ لیا۔ ورنہ خدا جانے کہاں اور کب ملتے۔" زبیدہ نے ریحانہ سے کہا: "آپ یہیں ٹھہریں میں بھائی کے لئے کھانا لے آؤں۔ ان کو ڈنر سے پہلے کھلا دیں۔ پھر بہت دیر ہو جائے گی۔ جس وقت ہم کھانے سے فارغ ہوں گے۔" ریحانہ کو بٹھا کر زبیدہ چلی گئی تو نور محمد صاحب نے کہا۔

"آپ بھی تشریف لے جایئے وہاں انتظار ہوگا۔ میرا کھانا آ جائے گا۔ مسز حسن آپ کی منتظر ہوں گی اور اب کھانے کا وقت بھی ہے۔"

"مجھ کو اس وقت ادھر مسز حسن صاحب نے ہی بھیجا ہے کہ میں کام میں ہوں تم اُن کے پاس بیٹھو کھانے کی گھنٹی کی آواز آنے پر میں جاؤں گی اور جی تو یہی چاہتا ہے یہیں آپ کے ساتھ کھالوں، وہاں جانا اس وقت دشوار سا ہے۔ آپ کیا مجھے اپنے ساتھ کھلائیں گے؟" ریحانہ نے مستفسرانہ نگاہوں سے مولوی صاحب کو دیکھتے ہوئے یہ سوال کیا۔ وہ اس وقت اپنے بڑے بڑے موتیوں کی لمبی مالا سے کھیل رہی تھی۔ جو بجلی کی روشنی میں خوب چمک رہی تھی۔ بھڑکیلی سرخ ساڑی میں وہ بالکل "لال پری" معلوم ہو رہی تھی مگر مولوی صاحب پر اس کی بے تکلفی پر دلکشی یا دل آویزی کا کچھ زیادہ اثر نہ تھا بلکہ اس بے تکلفی پر بہت حیرت میں تھے۔ دو منٹ ٹھہر کر جواب دیا:

"آپ کی اس عنایت کا شکریہ کہ مجھ ایسے بیمار کا اس قدر خیال کر رہی ہیں مگر آپ کا کھانا وہیں مناسب ہے۔"

ریحانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوہ مناسب نامناسب کا ذرا خیال نہ فرمائیں۔ یہ گھر مثل اپنے گھر کے ہے۔ میرے والد صاحب آپ کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ وہ ابھی آئیں گے۔ لمبے سفر سے تھک گئے تھے غسل کرنے چلے گئے۔" اتنے میں ملازمہ نرگس کھانا لائی اور وہیں چھوٹی میز پر چن دیا۔ سوڈا اور سادا پانی مس ریحانہ کے قریب تپائی پر رکھ کر کہا: "آپ دے دیجئے میں جاتی ہوں کام ہے۔" ریحانہ نے نہایت ہمدردی اور اصرار کے ساتھ مولوی صاحب کو کھانا کھلایا وہ ہر چند انکار کر رہے تھے مگر زبردستی سوپ کے بعد تھوڑی سی ابلی ہوئی مچھلی ٹوسٹ سبزی اور ذرا سی پڈنگ کھلا ہی دی بلکہ خود بھی پڈنگ میں شریک ہو گئی۔ وہ بہت ہی حیرت زدہ تھے۔ آج کے سلوک سے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ ان بے چارے کو کیا خبر تھی کہ وہ آج اسی کاروائی کے لئے روکے گئے ہیں کہ کسی طرح ان کو مس جعفر جی کی طرف مائل کر دیا جائے۔ لڑکی ریحانہ شرمیلی تھی لیکن اس وقت مسز حسن نے خوب سمجھا کر بھیجا تھا۔ کھانے کے بعد مولوی صاحب نے کہا۔ "آپ کی گھنٹی کی آواز تو آئی نہیں مگر آپ کو اب جانا چاہئے۔ زبیدہ خود کہیں بیٹھ رہیں اور آپ کو تکلیف دی۔" اُن کی زبان سے بار بار "جائیے" سن کر ریحانہ کچھ ناخوش سی ہو گئیں۔ انہیں اچھی طرح سبق پڑھا دیا گیا تھا لیکن مولوی صاحب کی طرف سے کچھ اپنی قدردانی و شکر گذاری نظر نہ آئی تو

بددلی سے کھڑی ہوگئیں اور بلا کچھ کہے سنے خاموشی سے کمرے سے چلی گئیں۔ جوں ہی وہ گئیں زبیدہ نے داخل ہوکر کہا۔ "معاف کریں مجھ کو دیر لگ گئی آپ کو کھانا تو ریحانہ نے کھلا دیا ہوگا؟" مولوی صاحب نے بہت چیں بہ جبیں ہوکر جواب دیا: "جی ہاں کھلا دیا مگر اُن کو اتنی دیر یہاں قید کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں خود کھا لیتا۔ آج کی کارروائی میری سمجھ میں نہ آئی۔ ریحانہ میرے ساتھ کبھی اس قدر بے تکلف نہ ہوئی تھیں۔ آج کیا معاملہ ہے میں بہت حیران ہوں۔"

"ریحانہ کتنی اچھی ہے میرا کہنا مانا اور بیٹھ گئی۔ کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ ویسے وہ ہمیشہ آپ کو عزیز رکھتی ہے۔" زبیدہ نے جواب دیا۔ "خیر میں تو سب ہی کا عزیز ہوں مگر آئندہ میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا جائے۔ ریحانہ میرے کمرے میں نہ آئے میں ڈرائنگ روم میں روز مل لیا کروں گا۔" زبیدہ ان سے ایسے الفاظ سن کر اپنی ناکامی پر بہت رنجیدہ ہوئی فوراً ہی کھانے کی گھنٹی کی آواز آئی اور وہ چلی گئیں، برآمدہ میں سرنگوں بیٹھی ریحانہ پر نظر پڑی۔ زبیدہ نے پوچھا کہ "اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔" تو ریحانہ سے ضبط نہ ہوسکا اور روتے ہوئے جواب دیا۔ "اپنے اوپر غصہ آرہا ہے کہ کیوں بھائی جان کا اور آپ کا کہنا مان لیتی ہوں وہ ہمیشہ سے مجھے اسی طرح ذلیل کرتے ہیں اپنی نظروں میں ان کے دل میں میری ذرا عزت و محبت نہیں۔ اب میں اُن سے کبھی نہ ملوں گی۔ یہاں پہنچتے ہی آپ نے مجھے یہ رنج دیا۔"

(۱۶)

وقت گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ زبیدہ کی شادی کو دو سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں یہ میاں بیوی نور محمد صاحب سے نہ مل سکے۔ کیوں کہ وہ سیاحت کے لئے جاپان چلے گئے تھے۔ شاید ڈیڑھ سال بعد واپس آئے تو سنا کہ بہت بیمار ہیں مسٹر و مسز قمر انہیں دیکھنے کے لئے اُن کے گھر گئے مگر نہ مل سکے۔ وہ کسی سینی ٹوریم میں جا چکے تھے۔ عالیہ سے یہ معلوم ہو کر کہ انہیں تپ دق ہے ان دونوں کو بہت افسوس ہوا ان سے زیادہ لکھنؤ علی منزل میں سب کو غم تھا۔ مگر انسان مجبور ہے۔ کپتان قمر صاحب کو پندرہ دن کی چھٹیاں تھیں چونکہ زبیدہ کی طبیعت کچھ عرصہ سے مضمحل سی رہنے لگی تھی وہ ان کو تفریح کے لئے نینی تال لے گئے تھے وہاں پہنچتے پر معلوم ہوا صالحہ حسن کی بہن یعنی زبیدہ کے بھائی کی سالی علیل ہو کر بھوانی "سینی ٹوریم" آ گئی ہے وہ انہیں دیکھنے کو دو دن کے لئے بھوانی آئیں۔ قمر صاحب نینی تال ہی رہے کہ اُن کو گورنر کے ہاں ایک ڈنر میں شریک ہونا تھا۔ زبیدہ شام کو بھوانی پہنچیں شب بھر اپنی بھاوج کی بہن کے کاٹج میں مہمان رہیں۔ ان کو دو ماہ سے ملیریا بخار آ رہا تھا۔ احتیاطاً تشخیص کے لئے آ گئی تھیں۔ دوسرے دن صبح کو انہوں نے زبیدہ کو تمام "سینی ٹوریم" دکھایا۔ واپس آ کے کھانا کھا کے دونوں لیٹ رہیں۔ کیوں کہ صالحہ کی بہن عالیہ کو تین گھنٹہ آرام کرنا تھا مگر تین گھنٹہ مسلسل زبیدہ سے خالی نہ لیٹا گیا۔ کچھ تو طبیعت پریشان تھی اور کچھ اپنے بھائی نور محمد کے خیال سے کہ وہ بھی ایک ایسا ہی مریض ہے اور کسی سینی ٹوریم میں یوں ہی پڑا ہو گا دل بے چین تھا۔ گرد و پیش کے مریضوں سے اُن کو بہت ہمدردی تھی۔ ہر طرف کاٹجوں میں ایسے ہی مریض نظر آ رہے تھے وہ اٹھ بیٹھیں اور داہنی جانب کے کاٹج والی مریضہ کے پاس بیٹھ کر باتیں کیں پھر اُٹھ کر جنرل وارڈ کے مریضوں کو دیکھتی ہوئی صحن باغ

سے گذر کر اس لمبی اور سنسان خاموش سڑک پر جا نکلیں جہاں اچھے مریضوں کو ٹہلنے کی اجازت تھی۔ بنچ پڑے ہوئے تھے شام اور صبح کو یہاں مریض چہل قدمی کیا کرتے ہیں۔ وہ بڑھتی چلی گئیں سناٹے کا مقام دوپہر کا وقت ٹھنڈی ہلکی ہوا میں اس جگہ تنہا ٹہلنا ان کو بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔ کوئی تین فرلانگ چلی ہوں گی کہ سڑک کے کنارے بنچ کے قریب زمین پر پہاڑ کے دامن میں جہاں سبز گھاس پھیل رہی تھی اُن کو کوئی مریض پڑا نظر آیا۔ خدا جانے مرد ہے کہ عورت اسی خیال میں وہ ذرا اور آگے بڑھیں دیکھا کہ سفید کھدر کی چادر لپیٹے کوئی نحیف وزار زرد چہرہ گھاس پر پڑا ہے جس کے سر کے لمبے لمبے بال پیشانی پر بکھر رہے ہیں۔ سفید و زردی مائل چہرہ پھاٹک کی طرف ہے اور آنکھیں بند۔ اس نقشہ سے دل بہت ہولا ہمت کر کے آگے بڑھ کر دیکھا۔ شکل پہچانی نظر آئی تو اور جھکیں بالکل اپنے بھائی مولوی نور محمد کی صورت پائی بے چینی سے قریب ہو کر بیٹھ گئیں۔ مریض کی آنکھیں بند تھیں۔ انہوں نے نہ معلوم کس خیال سے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ دل دھڑکتا اور ہاتھ لرزتا ہوا اس سرد پیشانی پر پڑا۔ ایک دم گھبرا گئیں۔ اُن کا ہاتھ چھوتا تھا کہ مریض نے آنکھیں کھول دیں۔ تین منٹ دونوں سکتے کے عالم میں رہے۔ پہچان کر بھی یقین نہ آتا تھا۔ حیران تھے۔ آخر پسینہ سے تر بتر ہو کر نوجوان مریض اُٹھ بیٹھا اور بولا:

"یہ کیا ہے میں اس وقت سو گیا تھا خواب دیکھ رہا ہوں یا واقعی عالیہ کی اطلاع دینے سے تم آ گئی ہو؟ بہت ہی اچھا ہوا اگر آ گئیں۔ میں بس بلانا ہی چاہتا تھا مگر ہمت نہ تھی۔" آواز جھرجھرا گئی اور وہ پھر لیٹ گئے۔ زبیدہ نے بہت ضبط سے کام لے کر اپنے اُمڈے ہوئے آنسوؤں کو روکا کہ مریض پر برا اثر نہ پڑے اور اُن کا سر زمین سے اُٹھایا۔ اور رنج وغم کی آواز میں کہا کہ نہیں میرے عزیز بھائی خواب نہیں ہے۔ میں ہوں آپ کی خادمہ زبیدہ۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے اس نے مجھے ملا دیا۔ میں بہت دن سے بے چین تھی۔"

"قمر صاحب بھی تو ہمراہ ہوں گے وہ کہاں ہیں؟" نور محمد نے کہا۔

"وہ بھوالی نہیں آئے نہ میں آپ کو دیکھنے آئی بلکہ ایک اور عزیزہ کو دیکھنے آئی تھی کہ اتفاق سے آپ کو دیکھا۔ میری دُعا اللہ نے قبول کی۔ میں بہت بے چین تھی آپ کے لئے۔" یہ کہہ کر زبیدہ نے بھائی کے سینے پر سر رکھ دیا۔ نور محمد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور

سانس بھی تیزی سے چلنے لگا تو اس کی کمزوری سے گھبرا کر وہ الگ ہوگئی اور کہا ”بھائی جان آپ کا کمرہ کہاں ہے علیحدہ کاٹج ہے یا یورپین وارڈ میں ہیں، چلئے میں گھر چلوں وہاں باتیں کریں گے۔ میں بہت دن تک ٹھہروں گی۔ جب آپ تندرست ہو جائیں گے تو ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

نور محمد نے یہ سن کر مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”بہن بہت دن تک تو ہم اس دنیا میں بھی نہ رہیں گے۔ ٹھہر کر کیا کرو گی۔ میں اب چند گھنٹوں کا مہمان ہوں خدا کا شکر ہے کہ آخری بار تم کو دیکھ لیا اور عزیزوں کی بھی خیریت سناؤ۔ میرے پیارے بھائی حسن اور اُن کی بیوی کیسی ہیں؟ والدین کیسے ہیں میری عالیہ کی کیا حالت تھی اس نے لکھا تھا کہ آپ آگئی تھیں۔“

زبیدہ نے کہا: ”سب آپ کے لئے بہت پریشان ہیں۔ اللہ آپ کو جلدی صحت دے ٹمپریچر اب کتنا رہتا ہے۔ ویسے تو آپ کی حالت اچھی نظر آتی ہے خدا کے فضل سے زیادہ دُبلے نہیں ہیں۔ یہاں کے علاج سے جلدی صحت ہوگی۔“

نور محمد پھر جلدی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور زبیدہ کے شانے سے ٹیک لگا کر کہا۔ ٹمپریچر نے بھی اب ساتھ چھوڑ دیا۔ کمبخت سورہا اب تو حرارت بھی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مایوس ہیں۔ میں کمزور زیادہ ہوں مرض چھوٹ گیا ہے ڈاکٹر صاحب نے کہہ دیا ہے کہ چاہو تو گھر چلے جاؤ مگر گرمی زیادہ ہے اس لئے عالیہ اجازت نہیں دیتی کہ جاؤں۔ ابھی مجھ کو دیکھ کر گئی ہے۔ ایک ہفتہ ہوا مجھ کو ہلنے تک کی اجازت نہیں تھی مگر آج چوری سے اُٹھ کر یہاں آپڑا۔ میرا کچھ خیال ہو رہا تھا کہ آج میرا آخری دن ہے اس لئے میدان میں آگیا کہ آسمان کے نیچے اپنے خدا کے سامنے تنہائی میں اس جہان سے رخصت ہو جاؤں، وہاں کمرے میں بہت سے مریضوں کے سامنے مرنا نہیں چاہتا۔ چلنے سے بے ہوشی سی ہوگئی تھی۔ آپ آئیں تو ہوش ہوا ہے۔ اب شاید ایک دن اور جی لوں۔“

زبیدہ کے دل پر اس تقریر کا بہت اثر ہوا۔ قریب تھا کہ وہ گر جائے مگر بھائی کے خیال سے دل کو سنبھالا۔ اُن کو اپنے زانو پر لٹا لیا اور قریب ہی سے ایک گلاب کا شاداب پھول توڑ کر دیتے ہوئے کہا ”بھائی جان دیکھئے یہ کیسا خوش رنگ پھول ہے ہمارے گلاب

ایسے نہیں ہوتے۔" نورمحمد نے زبیدہ کے ہاتھ سے گلاب لے کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ان کے گرم گرم قطراتِ اشک اُس کے ہاتھ پر گرے زبیدہ یہ میری وصیت ہے کہ یہ گلاب میرے کفن میں رکھ دیا جائے میرے سینے پر۔ تم کو قسم ہے میری یہ آرزو پوری کرنا غالباً تمہارے سامنے ہی میرا انجام بخیر ہو۔"

☆☆☆

ثُریّا

ایک دلچسپ معاشرتی ناول

(نذر سجاد حیدر صاحب کے قلم سے)

پہلا باب

آج پہلو میں ہمارے دلِ ناشاد نہیں
کس کو دے آئے کہاں بھول اٹھے یاد نہیں

پریم لاج لکھنؤ

سر چندر لال مکر جی کی عالی شان کوٹھی ''پریم لاج'' آج پھول پتے اور کاغذ کی جھنڈیوں سے خوب سج رہی تھی۔ کیوں کہ شب میں بمبئی میل سے سر مکر جی کا اکلوتا بیٹا سندر لال جی بیرسٹری پاس کر کے انگلینڈ سے واپس آیا تھا۔ اس خوشی میں مکر جی نے تمام رؤسائے شہر کو ڈنر دیا تھا اور بیرسٹر صاحب کے دوستوں کو پارٹی دی تھی۔

تین بجے سے مہمان آنے شروع ہو گئے۔ جن میں نوجوان گریجویٹ اور اسکول کالجوں کی طالب علم لڑکیاں بھی تھیں۔ کیوں کہ مس موہنی چندر لال نے اس خوشی میں اپنی سہیلیوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ سب سے پہلے اُن کی پیاری سہیلی مس ثریا جمیل احمد طالب علم تھا برن کالج اُن کی امداد کو آ گئی تھیں اور دونوں نے مل کر پارٹی کے لئے اپنے ہاتھ سے پکوان تلا تھا۔ جس طرح مس ثریا موہنی کی عزیز سہیلی تھیں۔ ایسے ہی نواب کیوان قدر بہادر (نواب سلیمان قدر صاحب کا اکلوتا صاحبزادہ اور سندر لال مکر جی میں بے حد محبت تھی۔ سندر لال تو ایف اے پاس کر کے انگلینڈ چلے گئے اور نواب زادہ صاحب یہیں ''کیننگ

کالج‘‘ میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہ بھی دو ہی بجے سے آ گئے اور چمن میں چاروں دوستوں نے مل کر سامان سجایا۔ ہم اس قصے کو اس وقت سے شروع کرتے ہیں جب کہ دونوں بہنیں ثریا، موہنی انگیٹھیوں پر پکوان تل رہی تھیں اور ان کا نو وارد صاحب بہادر بھائی سندر لال جی بھی ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا کہ ملازم نے ایک کارڈ پیش کیا۔

سندر لال: اگر آپ کو کچھ اعتراض نہ ہو تو میں اپنے عزیز بھائی کیوان قدر کو بھی یہیں بلا لوں چاروں مل کر کام کریں۔

مس ثریا: بھائی جان اُن سے میں پہلے کبھی ملی نہیں۔ اس لئے اس حالت میں ملنا مناسب نہیں۔ میں میدہ لئے جاتی ہوں۔ علیحدہ بیٹھ کر کھجوریں بناؤں گی۔ آپ ان کو بلا لیں۔

سندر لال: یہ ٹھیک نہیں میں ہی چلا جاتا ہوں۔

چنانچہ وہ دونوں باغیچہ میں جا بیٹھے۔ ان دونوں نے یہاں کا کام ختم کر کے ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور پرستان کی پریاں بن کر باغ میں آ گئیں۔ مس موہنی اگرچہ حسینوں میں نہ تھیں تاہم سانولی سلونی دلکش نقش و نگار، ذہین چہرہ، موزوں قد، سڈول جسم، نشیلی و رسیلی آنکھیں، فیروزی ریشمی ساڑی میں خاص دلکش معلوم ہو رہی تھیں۔ زیورات میں صرف ایک ایک جڑاؤ چوڑی اور چند انگوٹھیاں، گلے میں موتیوں کی دو لڑیں اور کان میں یاقوت کے چھوٹے چھوٹے آویزے اتنے ہی ---- سادے سے بناؤ پر مس ٹکر جی من موہنی بن رہی تھیں۔ ان کی دوسری سہیلی ثریا واقعی حور وش نازنین تھی۔ اس کا بے انتہا سرخ و سفید رنگ نہایت دلکش نقش و نگار۔ چاند سا گول چہرہ۔ گول گول جسم سرو قد، عمر کا سب سے بہترین یعنی چودھواں سال۔ ثریا نے اس وقت غضب کا سنگھار کیا۔ آتشیں گلابی ساڑی پہنی جس پر سنہری کارچوبی بیل ٹکی تھی۔ ہاتھ کان میں اور گلے میں جواہر نگار دوہرا دوہرا زیور پہنا یعنی ہاتھوں میں موتیوں کی جڑی چوڑیاں۔ اُن کے آگے ڈائمنڈ کٹ کڑے۔ نیلم اور زمرد کی دو دو انگشتریاں۔ گلے میں ایک ہلال نما الماس مرصع نیکلس اور اس سے نیچے سنہری زنجیر کا ہار جس میں زمرد کے انگور نما کٹے ہوئے ٹکڑے لٹک رہے تھے، سر پر پیشانی کے قریب ایک چاند بالوں میں لگا ہوا تھا۔ جس پر سفید نگ جڑے تھے اور سر کے پچھلے حصے یعنی بالوں کے جوڑے کے گرد موتیوں کی مالا لپیٹی گئی تھی اور اس زیبائش سے ثریا کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔

جب دونوں باغ میں پہنچیں تو مس ٹکر جی نے بعض مہمانوں سے تعارف کرایا اور اسی سلسلہ میں نواب کیوان قدر صاحب سے بھی انٹروڈیوس ہوا۔

مس موہنی: بھائی جان یہ ہیں میری عزیز دوست مس جمیل احمد صاحبہ۔ ''تھابرن کالج فرسٹ ایئر'' میں تعلیم پا رہی ہیں۔

(ثریا سے) بہن یہی ہیں وہ نواب صاحب بھائی جان، جن کو بھائی سندر لال کام کرنے کو اندر بلانا چاہتے تھے۔ ہمارا ان سے عزیزوں کی طرح میل جول ہے۔ میں تو بھائی سندر لال جی اور کیوان قدر کو یکساں خیال کرتی ہوں۔

کیوان قدر: (بہ تبسم) مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔ خدا کا شکر ہے اب مسلمان لڑکیاں بھی اعلیٰ تعلیم پانے لگی ہیں۔

مس موہنی: (ہنس کر) اگر جلدی سے شادی نہ ہوگئی۔ ہم ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم میں یہی رکاوٹ ہو جاتی ہے کہ جلدی سے شادی کر دی جاتی ہے۔

کیوان قدر: ان کے تو والد بفضلِ خدا روشن خیال ہوں گے۔

سندر لال: والدین ان کے انتقال کر چکے ہیں۔ سرپرستوں میں صرف ایک دادی صاحبہ ہیں۔ اس وقت تو ان کا یہی ارادہ ہے کہ بی اے تک پڑھائیں۔ لیکن عموماً یہی ہوتا ہے کہ شادی تعلیم میں ہارج ہوتی ہے۔

کیوان قدر: اگر خود لڑکی کو تعلیم کا شوق ہو تو کوئی امر ہارج و مانع نہیں ہو سکتا۔

ثریا: اس وقت تک تو یہی ارادہ ہے آئندہ جو خدا کی مرضی ہو۔

ناظرین اس تازہ ملاقات سے نواب کیوان قدر کی حالت کچھ سے کچھ ہو رہی تھی۔ مس موہنی کو وہ بچپن سے دیکھ رہے تھے اور وہ اس ہندو لڑکی کو مثل حقیقی بہن کے چاہتے تھے مگر اس وقت ثریا نے ان کے ہوش کھو دیئے۔ جیسے ہی وہ ان کی منہ بولی بہن موہنی کے ساتھ برآمدے سے نیچے اترتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ ان کی آنکھوں میں چکاچوند ہو کر دل پر بجلی سی گر گئی مگر انہوں نے اپنے کو سنبھالا اور سنجیدہ صورت بنا کر گفتگو شروع کی وہ اپنے دل کی اس حالت سے خود حیران تھے۔ کیوں کہ آج تک پچیسواں سال شروع ہو چکا اور بیسیوں حسین لڑکیاں نظر سے گذر چکی تھیں لیکن ان پر کبھی کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ تین بج گئے اور یہ باغیچہ نوجوان

مہمانوں سے بھر گیا۔ یہ چاروں میزبان سب کو چائے مٹھائی وغیرہ پیش کر رہے تھے مگر نواب صاحب کی عجیب حالت تھی جس کو موہنی بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ وہ کچھ مدہوش سے تھے۔ نظریں تو ثریا کے چہرہ پر جمی تھیں اور ہر ایک چیز بار بار اسی کو دیتے تھے جو متبسم۔ "تھینک یو تھینک یو" کر کر کے لیتی اور دوسروں کو پیش کرتی۔ کیوں کہ وہ خود بطور میزبان خاطر تواضع میں مصروف تھی اور نواب صاحب چاہتے تھے کہ کسی طرح جلدی سے ثریا کہیں بیٹھ کر کھانا شروع کر دے اور میں دیتا جاؤں۔ مگر اس سادہ لوح لڑکی کو کیا خبر تھی کہ میری سحر کار صورت نے کسی کے دل پر کیا اثر کیا ہے۔ گو اس وقت کالج میں تعلیم پا رہی تھی مگر حسن و عشق کی پیچیدہ راہوں سے بالکل ناواقف تھی۔ اس کو اس وقت تک یہی معلوم تھا کہ دنیا میں پڑھنا، بزرگوں اور دوستوں کا ادب کرنا، چند کھیل کھیلنا اور ستار بجالینا ہی لوازمات زندگی ہیں۔ مگر ہماری اٹھارہ سالہ سمجھ دار موہنی نواب صاحب کی حالت کا خوب اندازہ کر رہی تھی کہ میری پیاری بھولی بھالی ثریا کے اسیر زلف ہو گئے ہیں۔ اُس کو کھلانے پلانے میں ایک گھنٹہ گذر گیا۔ اور فارغ ہو کر یہ تین بہن بھائی ایک طرف بیٹھ کر چائے پینے لگے اور سندر لال نے نواب صاحب کو بھی وہیں بلا لیا۔ اب تو سندر لال نے بھی سمجھ لیا کہ کیوان قدر اس حالت میں نہیں ہیں جس میں کہ گھر سے آئے تھے مگر یہ معلوم نہ کر سکے تھے کہ کیوں۔ کیوان قدر آ گئے مگر حواس باختہ پریشان سے چائے پیالی میں ڈال رہے تھے اور آنکھیں اور ہی طرف لگی تھیں۔ یہاں تک کہ ساری چائے دانی خالی ہو گئی اور پیالی سے اُبل اُبل کر تمام میز پر جا، گر گئی۔ مٹھائی اور کیک کے پلیٹ تر ہو گئے لیکن اس بیہوش کو خبر نہ ہوئی۔ تب تو سندر لال سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ موہنی اور ثریا بھی ہنسنے لگیں۔ سندر لال کے بڑے قہقہے نے ان کو چونکا دیا۔ دیکھا تو میز کی سب چیزیں تر تھیں۔ خوبصورت ریشمی میز پوش چائے سے خراب ہو چکا تھا۔ بہت ہی شرمندہ ہوئے۔ موہنی نے ثریا کی چٹکی لی مگر وہ بھولی لڑکی کچھ سمجھ نہ سکی۔

سندر لال: کیوں بھئی کس بیہوشی میں ہو۔ میں نے تو آپ کو ایسا کبھی نہیں دیکھا؟

موہنی: آپ نے اب غور کیا میں تو بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ کسی گہری فکر میں ہیں۔

سندر لال: (ہنس کر) فکر کوئی نہیں ہم سمجھ گئے جو بات ہے۔

نواب صاحب: کیا بات؟ افسوس یہ ہے کہ میری نظر دوسری طرف تھی۔ بیچاری

موہنی کا محنت سے بنایا ہوا "میبل کلا تھ" غارت ہو گیا۔ اس نقصان کی تلافی ناممکن ہے۔

سندرلال: نا بھئی ہم نہ مانیں گے جب تک بوجھ نہ لیں گے۔

کیوان قدر: آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ کیوں نہ کریں۔ آخر ابھی انگلینڈ سے آرہے ہو جو کچھ وہاں کے دلفریب مجمعوں میں اپنے اوپر گزر چکا ہے۔ وہ ظاہر کر رہے ہیں۔

سندرلال: ارے بھائی اگر یوں حواس کھوئے ہوتے تو آج یہاں بیٹھا ہوتا اور آ بھی جاتا تو ان سب سے اچھی ایک موم کی گڑیا یا چینی کی پتلی میری ہم نشین رونق جلسہ ہوتی۔

موہنی: واہ بھائی جان۔ آپ نے اس وقت ہمارے دلوں کو سخت صدمہ دیا۔ کیا یورپ کا گورا بے نمک رنگ ہندوستانی حسنِ ملیح سے زیادہ دلفریب ہوتا ہے؟ صرف گورے گورے شلجم سے پھیکے پھیکے زرد تھے سے چہرے ہمیں تو اچھے نہیں لگتے۔

نواب صاحب: ہمارے ہندوستانی لوگ بھی بہت صاف رنگ ہوتے ہیں۔

موہنی: (ثریا کو دیکھ کر) کیوں نہیں۔ یہی دیکھو اس وقت مس جمیل احمد اور وہ سامنے والی انگریز لڑکی مس ولیم کے رنگوں میں کچھ فرق ہے؟

نواب صاحب: یہی تو میں نے کہا۔

سندرلال: یہ درست ہے۔ بعض بعض ہندی قومیں بہت صاف رنگ ہیں جیسے ہم میں کشمیری پنڈت۔ مسلمانوں میں مغل ایرانی کشمیری وغیرہ۔ ہماری بہن ثریا بھی افغان نسل سے ہیں۔ ان کے جد امجد نے کابل سے یہاں آکر میرٹھ میں سکونت اختیار کی تھی اس لئے ثریا سرخ و سفید ہیں۔

موہنی: ایک سبب اور بھی ہے۔ ثریا کی والدہ مرحومہ بھی گوری نسل سے تھیں یعنی ایرانی۔ میرٹھ میں ایک ایرانی گھر مل گیا۔ خوبصورت لڑکی دیکھ کر افغان گھر میں پسند کر لی گئی۔ دیکھئے جو سرخی مس جمیل احمد کے چہرے پر ہے وہ ولیم کے نہیں۔

سندرلال: یہ صحیح ہے کہ علاوہ یورپ کے دیگر ملکوں میں بھی اعلیٰ درجہ کا حسن پایا جاتا ہے۔ لیکن پھر اتنا ہم ہندی نوجوانوں کو جو دیوانہ بنا رہا ہے وہ یورپ ہی کا حسن سحرکار ہے۔ بقول موہنی جن کے شلجم نما چہروں کو دیکھ کر ہم ہندوستانی گلاب نما صورتیں بھلا دیتے ہیں اسی لئے تو میں یورپین لیڈی نہیں لایا۔

ایک آواز: ارے یارو ہیں بیٹھ رہے ہم نے تو ابھی دل بھر کے آپ کی شکل بھی نہیں دیکھی۔

دوسری آواز: صاحب بہادر ہیں نہ صاحب۔ کالا لوگ میں اب دل کیوں کر لگے۔

دوستوں کی آواز پر سندر لال اٹھ گئے۔

ایک طرف گانا شروع ہو گیا جس میں بیشتر مہمان دلچسپی لینے لگے۔

بنگالی لیڈی سرلا دیوی چٹرجی امریکہ سے ڈاکٹری پاس کر کے آئی تھیں گانے لگیں۔

ثریا: ہارمونیم پر تو آپ گائیں گی؟

موہنی: اور ستار آپ کو بجانا ہو گا۔

نواب صاحب: اچھا! آپ ستار بجانا جانتی ہیں۔ یہ موسیقی کی ایک قابلِ قدر چیز ہے۔

موہنی: جی ہاں میری ثریا بہت اچھا ستار جانتی ہیں۔

راج کماری: (ان کے قریب آ کر) چلئے اس طرف دیکھئے نہ۔ سب ناراض ہو رہی ہیں کہ علیحدہ جا بیٹھیں۔ ستار نکال رکھا ہے۔ مس ثریا کا انتظار ہے۔

اب تو مجبوراً تینوں کو اٹھنا پڑا۔ مجمع میں آئیں اور باری باری گانا شروع ہوا۔ سرلا دیوی کے بعد مسٹر سندر لال نے پیانو پر ایک انگریزی گیت گایا۔ ان کے بعد مس موہنی نے ہارمونیم پر بنگالی اور ہندی گیت گائے پھر مس ثریا نے ستار پر یہ غزل گائی۔

کہاں تک ضربت تیغ حوادث قلب بسمل پر
غضب ہے کوہ غم کا ٹوٹنا ٹوٹے ہوئے دل پر

سندر لال: واہ واہ ثریا بہن ستار خوب بجاتی ہیں۔ میں نے آج ہی پہلی بار سنا ہے۔

کیوان قدر: اتنی سی عمر میں یہ کمال۔

سندر لال: اٹھئے نواب صاحب اب آپ کی باری ہے۔

کیوان قدر: بھئی ستار پر تو اب ہم نہ گائیں گے۔ مس جمیل احمد جیسی جانئے

والی کے سامنے شرمندہ ہوتا ہے۔

موہنی: تو شاگردی کر لیجئے میری ثریا اُستاد ہو جائے گی۔

ثریا: آپ کیوں آج مجھے بنانے پر کمر بستہ ہوگئی ہیں۔ مجھ غریب کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔

کیوان قدر: معاف کریں مس جمیل احمد صاحب۔ بہن موہنی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ستار اس قدر اچھا نہیں بجا سکتا۔ ماشاء اللہ آپ کو خوب مہارت ہے۔ میں ہارمونیم پر سناتا ہوں (اور شروع کیا)۔

ہم ان بتوں کے طالب دیدار کیوں ہوئے!
کافر بنے خدا کے گنہ گار کیوں ہوئے؟

ثریا: (کھڑی ہوکر) بہن اب شام ہوگئی۔ دادی صاحبہ منتظر ہوں گی۔ مجھے اجازت دیجئے۔

سندر لال: واہ بہن ابھی سے۔ ڈنر میں شریک نہ ہوگی؟

ثریا: نہیں بھائی جان دادی اماں کی طبیعت ناساز ہے۔ مجھ کو جانے دیجئے۔

موہنی: برائے مہربانی ذرا تکلیف کر کے میری بہن کو اُن کے گھر پہنچادیں۔ چونکہ ان کی دادی صاحبہ ثریا کا تنہا آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔ ہمیشہ میں یا کبھی اماں جان پہنچایا کرتی ہیں۔ اس وقت دونوں کو ہم اپنے مہمانوں میں موجود رہنا ہے۔ آپ بھی مثل سندر لال جی کے ہمارے بھائی ہیں۔ اتنا کام کردیں۔

کیوان: (کھڑے ہوکر) بسر و چشم۔

ثریا: نواب صاحب کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ میری اپنی آیا کو بھیج دیجئے۔

نواب: مس صاحبہ مجھے ذرا تکلیف نہ ہوگی۔ اپنی بہن موہنی کا کام عین راحت ہے اور مجھ کو بھی تو ابھی گھر جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔ اس کے بعد ڈنر پر آؤنگا۔ آپ کا دولت خانہ راستہ ہی میں ہے۔

سندر لال: ثریا جی کیوان قدر کو مثل سندر کے بھائی سمجھو اگر میں نہیں جاسکتا

تو یہ پہنچا دیں گے۔

بھائی کے کہنے سے یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے ان کی اپنی موٹر گاڑیاں رُکی ہوں گی۔ خاموش تیوری پر بل ڈالے نواب صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ پھاٹک پر موٹر موجود تھا۔ دونوں سوار ہو گئے۔ وہ یونہیں خاموش بیٹھی رہی تو نہایت ادب سے کیوان قدر نے کہا:

نواب: کیا آپ مجھ سے کچھ ناراض ہیں؟

ثریا: میں ناچیز کسی سے ناراض کیوں ہوتی جو جس کا جی چاہے کہہ لے۔

نواب: لیکن میں نے تو کچھ نہیں کہا؟

ثریا: میں کب کہتی ہوں کہ آپ نے کچھ فرمایا؟

نواب: تو پھر ایسی خاموش کیوں ہیں۔ بخدا میرا دل اس خیال سے لرزا جاتا ہے کہ آپ مجھ سے ناخوش ہیں۔

ثریا: (مسکرا کر) تو اس میں لرزنے کی کون سی بات ہے۔ آپ رتبہ میں میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔

نواب: بے شک آپ کے بھائی سندر کے برابر ہوں مگر کاش مجھ سے ایسی بے تکلفی روا رکھی جائے جیسی سندر لال سے ہے۔

ثریا: بھائی جان آئندہ میں آپ کو سندر کے برابر سمجھوں گی۔ آج تو پہلی ہی ملاقات ہے۔

کیوان قدر: میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آئندہ مجھے اپنا سمجھیں گی۔ وہ لیجئے امین آباد آ گیا۔

ثریا: میں آپ کی ان عنایات کا شکریہ ادا کرنے کو الفاظ نہیں پاتی ہوں۔

اتنا کہنے پائی تھی کہ اس کے مکان پر پہنچ کر موٹر کار ٹھہر گئی۔ موٹر کی تیز حرکت بند ہوتے ہی نواب صاحب کے دل کی حرکت اسی قدر تیز ہو گئی اور گھبرا کر کہا۔

نواب: ارے مکان آ گیا یہ تو اچھا نہ ہوا۔

ثریا: (ہنستے ہوئے) اوہو۔ اچھا نہ ہوا۔ میری دادی اماں سے پوچھئے اچھا ہوا کہ برا۔

نواب: کہیے اب کب مل سکیں گی؟

ثریا: اگر کل آپ بھی تشریف لے گئے تو "پریم لاج" میں ملاقات ہوگی۔

نواب: کس وقت؟ میں ضرور حاضر ہوں گا؟

ثریا: کل پانچ بجے کالج ٹائم کے بعد۔

نواب: بہت بہتر میں چائے پر وہاں پہنچ جاؤں گا۔

ثریا: (سلام کر کے) اب رخصت۔

نواب: کیا مجھے اوپر لے جا کر دادی صاحبہ کے سلام کو پیش نہ کریں گی؟

ثریا: آج مناسب نہیں۔ اس وقت میں ان سے آپ کی ملاقات اور پھر یہاں تک پہنچانے کی مہربانی کا ذکر کروں گی اور ان کی اجازت حاصل کر کے پھر کسی دن ملاقات کرا دونگی۔

نواب: مجھے شرف حضوری بخشنے میں انہیں تامل تو نہ ہوگا؟

ثریا: وہ بے پردہ تو نہیں ہیں لیکن چند خاص خاص معززین سے مل لیتی ہیں۔

نواب: کاش میں بھی اُن ہی خوش نصیب لوگوں میں داخل کرلیا جاؤں جو آپ کو مثل عزیزوں کے ہیں۔

ثریا: ضرور ضرور یقیناً کل ہی میں آپ کو اپنے ساتھ لا کر دادی اماں کے پیش کر دونگی۔

نواب: خدا خوش رکھے اور کیوان پر مہربان۔

اس کے بعد دونوں نے ہاتھ ملائے۔ وہ زینہ پر چڑھ گئی اور یہ موٹر پر روانہ ہوئے۔ چند منٹ بعد اپنے محل پر پہنچے۔ دل کی عجیب کیفیت تھی۔ ان کو موٹر کا ٹھہرنا معلوم بھی نہ ہوا۔ شوفر کے کہنے پر کہ "حضور کہیں اور تشریف لے جائیں گے؟" وہ چونک کر اُترے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں صوفے پر جا پڑے۔

آج پہلو میں ہمارے دلِ ناشاد نہیں
کس کو دے آئے کہاں بھول اُٹھے یاد نہیں

☆

دوسرا باب

بے اعتدالیوں سے سبک آج ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے

حسبِ وعدہ نواب صاحب چار بجے "پریم لاج" پہنچ گئے۔ اب ان کا سندرلال کی پر مذاق گفتگو میں دل نہیں لگتا تھا۔ برآمدے میں بیٹھے تھے اور آنکھیں سڑک کی طرف لگی تھیں جو کوئی گاڑی گزرتی بے اختیار کھڑے ہو جاتے تھے۔ دو تین بار ان کی یہی حالت دیکھ کر سندرلال نے دریافت کیا کہ "کس کا اس بے قراری سے انتظار ہے۔"

انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ: "ایک دوست نے آپ کے یہاں ملنے کا وعدہ کیا ہے۔"

خدا خدا کر کے ساڑھے پانچ پر مس جمیل احمد کا تانگہ نظر آیا۔ جونہی کوٹھی کے پھاٹک میں تانگہ داخل ہوا۔ سندرلال بہن کے اُتروانے کو آگے بڑھے یا دوسری گاڑیوں کی آواز سن کر پائے شوق کو قرار نہ تھا یا وہ اُتر کر قریب آگئیں اور وہ اپنی جگہ سے نہ اُٹھ سکے۔ اتنے میں کمرے سے موہنی بھی نکل آئیں۔ آج وہ زکام کے باعث کالج نہ گئی تھیں۔ ثریا کے لئے چائے منگوانے لگیں تو انہوں نے کہا:

ثریا: بہن چائے نہ منگوایئے۔ دیر ہو جائے گی۔ آج دادی صاحبہ نے نواب صاحب کو بلایا ہے چائے وہیں پئیں گے۔

سندرلال: بہن جی وہاں پہنچتے پہنچتے چھ بج جائیں گے۔ چائے کا وقت نہیں

رہے گا۔

نواب: کوئی بات نہیں اگر بیگم صاحب کی خوشی ہے اور انہوں نے چائے پر بلایا ہے تو وہیں پہنچی چاہیے۔

سندر لال: اُٹھو پھر جلدی چلو رات ہوئی جاتی ہے۔ موہنی آپ تو نہیں چلیں گی ٹھنڈ کا وقت ہے۔

موہنی: ہاں ثریا مجھے اس وقت معاف کرو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔

موہنی کمرے میں چلی گئیں اور یہ تینوں سندر لال کی موٹر کار پر سوار ہو کر امین آباد آئے پہلے ہم اس مکان کا مختصر نقشہ بتاتے ہیں۔ ''اکبر اینڈ کو'' کی شاندار دکان کی چھت پر یہ چھوٹا سا خوشنما مکان بنا تھا۔ زینہ کا دروازہ درمیانی گیلری کے دو طرفہ دو دو دروازے چاروں کمروں کے نظر آتے تھے۔ سامنے کے رُخ یعنی بازار کی طرف جو دو کمرے تھے، ان میں ایک ڈائننگ روم اور ڈرائنگ روم بنائے گئے تھے۔ ان دونوں کمروں کے آگے پتلا سا برآمدہ تھا۔ جس میں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی گول میز پڑی رہتی تھی۔ اندرونی برآمدے میں ایک تخت پڑا تھا جس پر ہر وقت سفید سوزنی اور گاؤ تکیہ لگا رہتا تھا اور بڑی بیگم یعنی دادی صاحبہ کا زیادہ وقت اسی پر گذرتا تھا۔ سامنے اسٹول پر منقش چمکدار پاندان رکھا تھا۔

ایک چھوٹی سی تپائی پر چھوٹا سا پیچوان دھرا تھا۔ جس کی چلم اور منہال نقرئی تھی۔ آدھے حصہ برآمدہ میں چھوٹی گول میز (جس پر کشمیری کام کا ٹیبل کلاتھ تھا) کے گرد چند کرسیاں رکھی تھیں۔ یہاں ثریا کی نشست رہتی تھی۔ باقی کمروں کو چھوڑ کر جو ضروری سامان سے بخوبی آراستہ تھے۔ ہم اس وقت صرف آرائش ڈرائنگ روم کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں ایک بڑے ایرانی قالین کا فرش تھا۔ جس پر خوبصورت کریٹون کا سیٹ عجب بہار دے رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو صوفوں اور چار لیڈی چیئر کے حلقے میں خوبصورت سیپ کے بیل بوٹے دار میز تھی اور نقرئی گلدان میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ مہک رہا تھا۔ چاروں کونوں میں چھوٹی میزوں پر چھوٹی چھوٹی مختلف چیزیں مثلاً سمندری گھونگے بڑی بڑی سیپیاں، سنگ مرمر کے کھلونے، تصویروں کا البم وغیرہ چنے تھے۔ برآمدے کی طرف کے دونوں دروازوں کے بیچ میں دیوار کے ساتھ ''لیڈیز رائٹنگ ٹیبل'' لگی تھی۔ انگیٹھی پر اپنے مرحوم ممبران

خاندان دوستوں کے فوٹو سنہرے فریموں میں جگمگا رہے تھے اور چند بلوری پھولدان کلاک اور نقرئی کھلونے سجے تھے۔ دیواروں پر ''واٹر کلر'' اور ''آئل پینٹنگ'' بڑی بڑی تصاویر ٹنگی تھیں جن میں دریاؤں پہاڑوں سبز میدانوں باغیچوں کا سین کھینچا گیا تھا اور یہ سب نتیجہ تھا ثریا جبین کے آرٹسٹک نازک ہاتھوں کا۔ انگیٹھی کے کپڑے پر جو مخمل کا تھا ثریا ہی کے ہاتھ کا کارچوب تھا۔ سیاہ کپڑے پر روپہلی سلمہ ستارے کا کام بجلی کی طرح چمک رہا تھا۔ غرضیکہ اس کمرے کی آرائش کا ایک بڑا حصہ اس سلیقہ شعار لڑکی کی ہنرمندی کا نمونہ تھا۔ دروازوں کے پاس چینی کے گملوں میں پام کے درخت لگے تھے اور دروازوں کی محرابوں پر شیر، ریچھ، ہرن کے سر آویزاں تھے اور دیواروں پر شکارگاہوں، بازاروں، شاندار پرانی عمارتوں کی تصاویر لگائی گئی تھیں۔ فرش پر چند چیتے، ریچھ، شیر کی کھالیں بچھی تھیں ایک میز پر گھنٹی اور وزٹنگ کارڈ کیس رکھا تھا۔ زینہ کے در پر موٹا سبز باناتی پردہ پڑا تھا۔ اور اس پر صندلی ریشم سے کتا بنایا گیا تھا جو بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نئے آنے والے کو دم اُٹھا کر، پنجے بڑھا کر منہ کھولے ہوئے بھونک رہا ہے۔ یہ دربان کتا بھی ثریا کی تیز فہمی کا نمونہ تھا۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ پہلے ثریا پیچھے وہ دونوں اوپر آئے۔ نواب صاحب کا خیال تھا کہ معمولی چھوٹا سا ہندوستانی طرز کا مکان ہوگا۔ ایک کمرہ میں نشست کے لئے چند کرسیاں پڑی ہوں گی مگر جیسے ہی گیلری میں داخل ہوئے اس کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئے اور آگے بڑھے تو ڈرائنگ روم کی چمک دمک نے متعجب کر دیا کہ ایک امیر آدمی بھی جو خوش مذاق نہ ہو اس غریب لڑکی کا سا کمرہ نہیں آراستہ کر سکتا۔ کمرے میں صوفے پر دادی صاحبہ متمکن تھیں۔ آپ ریشمی ساڑی، یہ ۴۵ سالہ ادھیڑ عورت اپنی تندرستی رنگ و روغن کی تازگی کی وجہ سے تیس سالہ عورت معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ تینوں کمرے میں آئے تو نواب صاحب کے لئے کھڑی ہوگئیں۔ پوتی نے اُن سے تعارف کرایا اور سب بیٹھ گئے۔ ابھی پانچ منٹ نہ گزرے تھے کہ چاندی کے ''ٹی سیٹ'' میں آیا چائے لے کر حاضر ہوئی۔

بڑی بیگم: آپ کو تو بہت ہی دیر ہوگئی۔ چائے کا وقت نہیں رہا۔ تاہم ایک ایک پیالہ پی لیں۔ رسم پوری ہو جائے۔

سندر لال: اماں جی میں ابھی تک بھوکا ہوں۔ خوب کھاؤں گا۔ تین سال

بعد آپ کی بنائی ہوئی لذیذ چیزیں ملی ہیں۔

نواب صاحب: میں نے ابھی چائے نہیں پی۔

بڑی بیگم: آپ کیک بسکٹ وغیرہ ہی پسند کرتے ہیں یا گھر کی بنی بیسنی و میٹھی سلونی چیزیں بھی کھالیتے ہیں۔

نواب صاحب: جی ہاں یہی چیزیں مجھے زیادہ پسند ہیں۔ کیک وغیرہ کا میں شائق نہیں۔

اس وقت ثریا جبین اپنے نازک ہاتھوں سے چائے بنا کر تقسیم کر رہی تھیں اور آپا کیک مٹھائی وغیرہ پیش کر رہی تھی۔ نواب صاحب کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُن کی ثریا کا مکان، اُسی کے مہمان، وادی کی خدمت میں باریابی، کھلے جاتے تھے۔ چائے نوشی کے بعد اُٹھ کر دونوں کے کمرے کی ہر ایک چیز دیکھی اور ثریا جبین کی تصویر کشی کی بے انتہا تعریف کی۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی ہوئی اور آپا نے دریافت کر کے مسٹر سندر لال کو اطلاع دی کہ ''ان کو کوئی دوست سول ملٹری ہوٹل میں بلا رہے ہیں۔'' چنانچہ وہ یہاں سے ٹیلیفون پر گئے اور پھر آ کر نواب صاحب سے کہا۔

سندر لال: لیجیے ہم تو چلے مسٹر یوسف نے سول ملٹری ہوٹل میں اس وقت کھانے پر بلایا ہے۔

نواب: بدتمیز یہ کھانے پر بلانے کا کیا موقعہ ہے؟ آٹھ بجے ہیں دن میں اطلاع کیوں نہ دی۔

سندر لال: دراصل بھائی کھانے کے لئے اس وقت نہیں بلایا۔ ایک ضروری مشورہ کے لئے بلایا ہے۔ چونکہ آپس میں بے تکلفی ہے۔ کھانے کا وقت قریب ہے۔ اس لئے کہہ دیا کہ کھانا بھی یہیں کھا لیجیے۔ کہو چلتے ہو؟

نواب: (ثریا کو دیکھ کر) بیگم صاحبہ ابھی نماز پڑھ کر تشریف نہیں لائیں؟ انہیں سلام کر کے جانا مناسب ہے۔

سندر لال: تو بھئی تم سلام کرتے رہو۔ مجھے جلدی ہے۔ میں ہوٹل پہنچتے ہی ''موٹر'' واپس کر دوں گا۔

یہ کہتے ہوئے دونوں سے ہاتھ ملا کر تیزی سے نیچے اُتر گئے۔

بڑی بیگم نماز مغرب کے لئے دوسرے کمرے میں جا چکی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں صرف نواب صاحب و ثریا جبین رہ گئے تو انہوں نے کہا۔

نواب: میری معزز میزبان آپ نے چائے پلائی۔ بہت اچھی چیزیں کھلائیں۔ میں آپ سے اس وقت ایک تحفہ مانگتا ہوں۔ مرحمت فرمائیں گی؟

مس جمیل: حتی الامکان انکار نہ کروں گی۔

نواب: پہلے وعدہ کرلیں تب ہم سوال کریں گے۔

بھولی ثریا اس قدر ڈرتی کیوں ہو۔ میں کوئی ایسی چیز نہیں طلب کر رہا ہوں جو آپ نہ دے سکیں۔

ثریا: پھر فرمایئے۔

نواب: (کھڑے ہو کر) یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے اگر مرحمت ہو تو اپنے کمرے کے لئے لے جاؤں۔

ثریا: اوہو یہ بہت بڑی چیز نکالی اور یہ تو کچھ اچھی بھی نہیں۔ ان سب میں سے کوئی بہترین پسند کیجیے۔

نواب: آہ آپ نہیں جانتیں۔ یہی بہترین ہے۔ اس کا رنگ و روغن ہی قابلِ تعریف نہیں بلکہ آپ کا شاعرانہ تخیل قابلِ داد ہے۔ سچ کہیے آپ نے کسی تصویر کی نقل کی ہے۔ یا خیالی نقشہ ہے؟

ثریا: (مسکراتے ہوئے) جیسا آپ خیال فرمائیں۔

نواب: نہیں ثریا تمہیں ہماری قسم سچ کہہ دو۔

ثریا: میں نے نقل کسی کی نہیں کی۔ دو مہینہ کا ذکر ہے۔ ایک شب آپا نے مجھ کو کہانی سنائی تھی کہ "ایک شہزادہ کسی حسین مالن سے محبت (آنکھیں نیچے کر کے) کرنے لگا تھا۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اُس نے گھر سے نکال دیا۔ وہ بے چارا دن بھر مارا مارا پھر کر شام کے قریب کہیں دور جنگل میں جا نکلا اور حق حیران ایک کٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ پیروں میں جو کانٹے چبھ گئے تھے۔ ان سے خون بہہ رہا تھا کہ کہیں سے

تلاش میں ماری ماری پھرتی وہ مالن لڑکی بھی وہاں آنکلی۔شہزادے کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی جیسے کہ آپ تصویر میں ملاحظہ فرمارہے ہیں اور شہزادے کے پیروں سے کانٹے نکالنے لگی۔"

یہ کہانی یہیں تک سننے پائی تھی کہ مجھے نیند آگئی۔دوسرے دن صبح میں نے یہ تصویر بنالی۔

نواب: سبحان اللہ۔اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ، خدا میری نظر بد سے بچائے۔یوں تو ہر ایک ہنر میں طاق ہو لیکن ستار بجانے اور تصویر کشی میں ابھی سے کمال کر دیا ہے۔یہ کہتے ہوئے نواب صاحب نے جیب سے دو اشرفیاں نکال کر اُن چھوٹے چھوٹے گورے گورے نازک ہاتھوں پر صدقہ کر کے فرش پر ڈال دیں۔اب تو ثریا اپنی اس قدر تعریف سے شرما گئیں اور کرسی پر کھڑے ہو کر وہ سنہری فریم کی دلکش تصویر اتار کر اخبار میں لپیٹی اور نواب صاحب کے پیش کی۔

نواب: بہت بہت مہربانی مگر آج کے بعد میں ایک تصویر اور طلب کروں گا۔

ثریا: ابھی پسند کر لیجئے۔میں اُتارے دیتی ہوں۔

نواب: ابھی نہیں۔اس کا وقت آنے دو اگر آج خواہش کروں گا تو کبھی پوری نہ ہوگی۔اچھا یہ تو بتایئے غریب خانہ میں کب تشریف لائیں گی۔میں نے اپنی بہنوں سے بھی ذکر کر دیا ہے۔

ثریا: میں دادی جان سے ذکر کر لوں جس دن وہ اجازت دیں گی بہن موہنی کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

اتنے میں پردہ اُٹھا اور بڑی بیگم صاحب تشریف لائیں۔

نواب: (کھڑے ہو کر) میں آپ کے ہی سلام کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

چنانچہ آداب کر کے رخصت ہوئے۔ثریا جبیں دروازہ تک آئیں۔یہاں شیک ہینڈ ہوا اس وقت نواب صاحب نے پوچھا کہ اس کی کب ملاقات ہوگی؟

ثریا: (ترش روئی سے) میں نہیں بتا سکتی۔غالباً جلدی نہیں ملوں گی۔

نواب: (پریشان ہو کر) کیوں؟ کچھ ناراض ہو گئیں۔خدا کے لئے بتا دو مجھے سخت فکر ہے۔

ثریا: نہیں ناراض کیوں ہوتی؟ مگر روز روز ملنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتی۔

نواب: ثریا جبین میرے دو ڈھائی گھنٹہ زندگی کے کیسے خوشگوار گذرے۔ للہ اب چلتے وقت اس قدر رنج نہ دو کہ تمام رات اسی فکر میں بے چین رہوں۔

ثریا: بھائی جان آپ میرے بزرگ ہیں آپ کو چھوٹی بہن کے ساتھ یہ طرز کلام زیبا نہیں۔ اچھا سوار ہوں۔ ''خدا حافظ۔'' اور گیلری کا دروازہ بند کر کے اپنے بیڈروم میں آ کر فرش پر لیٹ رہی۔ ڈائننگ روم سے گھنٹی کی آواز آئی تب بھی نہ اُٹھی تو بلانے کے لئے آیا آئی۔ اس سے کہہ دیا کہ ''میں نے چائے دیر سے پی ہے۔ بہت کچھ کھالیا ہے۔ اب کھانا نہ کھاؤں گی۔''

یہ سن کر آیا نے لباس شب خوابی پہنا کر مسہری پر لٹا دیا۔ آج پہلا دن تھا کہ ثریا کے خیالات پریشان ہو کر اُسے بے چین کر رہے تھے اور اُسے اپنے ہی اُوپر غصہ آ رہا تھا کہ مشکوک کیریکٹر کے نواب کو اپنے یہاں کیوں لائی اور بے تکلفی کیوں برتی۔ میں نے تو مثل بھائی سندرلال کے سمجھا تھا۔ یہ تو خراب آدمی نکلا۔ اوّل مجھ پر اشرفیاں تصدق کیں تو میں نے ہنرمندی کی قدردانی پر محمول کیا۔ پھر اپنی قسم دی اور چلتے وقت تو غضب ہی کیا۔ مصافحہ کرتے وقت میرا ہاتھ دبایا۔ ایک غیر لڑکی کے ساتھ زیبا تھا؟ میں اب نہ ملوں گی۔ مشکل یہ ہے کہ پریم لاج جانا ہی پڑے گا اور وہاں یہ ضرور ہوں گے۔ خیر میں موہنی سے کہہ دوں گی کہ اب میرا آپ کے ہاں روز روز آنا مناسب نہیں۔ اوہو میں اب سمجھی۔ کل شام ''پریم لاج'' کی پارٹی میں ان کا جو مذاق بنایا جا رہا تھا۔ وہ بھی میرے ہی متعلق تھا۔ ان حالات کی خبر دادی اماں کو ہو جائے تو میرا کیا حشر کریں۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔ ورنہ موہنی سے کہتی کہ یہ کیسے اچھے بھائی بنائے ہیں۔ بڑی دقت یہ ہے کہ بھائی سندرلال جی سے اُن کی بڑی دوستی ہے۔ میں نواب کو بالکل اپنی شکل نہ دکھاؤں۔ یہ ناممکن ہوگا۔ نواب لوگ اچھے تو نہیں سنے لیکن اغن صاحب تو نہایت نیک آدمی ہیں۔ خدا بچائے کیوان قدر تو اچھا شخص نہیں۔ تصویر پسند کی تو وہ جس میں مرد عورت تھی حالانکہ اور دیکھنے والوں نے میری سمندر اور پہاڑ والی تصویر کو سب میں بہترین قرار دیا ہے۔ ''خدا سمجھے۔'' انہی خیالات میں سوگئی۔

☆

تیسرا باب

کیوان قدر اور ثریا کی دوسری ملاقات کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ پھر وہ نہ ملی لیکن اس شب ثریا کو ناراض چھوڑ کر جاتے ہی نواب صاحب کو بخار ہو گیا اور وہ کئی دن گھر سے نہ نکل سکے۔ سندر لال روزانہ وہیں جا کر دیکھتے رہے۔ موہنی بھی گئی اور ان کی حالت دیکھ کر ثریا سے آ کر کہا کہ "چل کر مزاج پرسی کر آؤ۔ وہ تمہاری خفگی سے بہت پریشان ہیں۔" مگر وہ حیادار لڑکی نہ گئی چونکہ نواب صاحب ثریا کو بیحد چاہنے لگے تھے۔ اُن کی سختی اور خفگی کا دل پر بہت اثر تھا۔ اتنی ہمت نہ پڑتی تھی کہ امین آباد آ کر دیکھتے۔ تاہم اب وہ اپنی دلی کیفیت موہنی بہن سے نہ چھپا سکے کیوں کہ کوئی ہمدرد نہ ہونے سے دل گھٹا جاتا تھا۔ ایک دن وہ حالت بخار ہی میں اس ارادے سے کہ موہنی کو ہمراز بنائیں "پریم لاج" آئے۔

اتوار کا دن تھا موہنی گھر میں تھی۔ صبح ہی آٹھ بجے وہ آ گئے اور چند منٹ مسز مکرجی صاحبہ کے پاس ٹھہر سیدھے موہنی کی طرف چلے گئے۔ وہ برآمدے میں بیٹھی کروشیا سے لیس بنا رہی تھی۔ بھائی کو آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی، ملی اور آرام کرسی پر بٹھایا۔

نواب صاحب: آپ کا کچھ حرج تو نہیں ہوا؟

موہنی: بھائی جان۔ ہرج کیسا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ آج نویں دن آپ تشریف لائے ہیں۔ کہیے اب بخار تو نہیں؟

نواب صاحب: بخار تو اس وقت بھی ہے مگر میں قید میں پڑا پڑا گھبرا کر چلا آیا۔ سندر کہاں ہیں؟

موہنی: وہ حضرت گنج گئے ہیں۔ آپ کی طرف بھی جائیں گے۔

نواب صاحب: بہن میں آج آپ کو اپنی افسوسناک حالت سے آگاہ کر کے مدد لینا چاہتا ہوں۔ یا کم از کم اپنا ہمراز بنا کر درد دل کہہ ڈالوں گا کہ کچھ تسکین ہو۔

موہنی: میں ہر طرح اپنے بھائی کی مدد کو موجود ہوں۔ خدا آپ کو صحت دے۔ مجھے کسی امر میں عذر نہیں۔

نواب صاحب: خدا خوش رکھے۔ موہنی آپ عقل مند ہیں۔ دُنیا کے ہر ایک معاملے سے آگاہ ہیں۔ بفضلِ خدا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میری تمام مصیبت کی تم ذمہ دار ہو۔

موہنی: میں! میرا قصور بتاؤ اور مجھے سزا دو۔

نواب صاحب: میں کیا سزا دوں گا خود ہی گنہگار ہوں۔ میں ایک ہفتہ سے سخت تکلیف میں ہوں۔ کاش مجھے موت آجائے کہ یہ عذاب نہ جھیلوں۔ آہ بہن مجھے کیا ہو گیا میں کیسا اچھا تھا۔ کیسی بے لاگ زندگی بسر کر رہا تھا۔ آپ نے چائے کی دعوت پر بلا کر مجھے مصیبت میں پھنسا دیا۔

موہنی: کیسی مصیبت! آخر مجھے بھی تو معلوم ہو۔ شاید ثریا نے آپ پر ستم ڈھایا۔ آخر بھائی سندر لال بھی یورپ سے آہی گئے اور یہاں آکر ثریا سے بھی ملے مگر وہ تو ہم دونوں کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں دونوں طرف سے مجرم ٹھہرائی گئی۔ اُدھر مس جمیل احمد مجھ سے خفا ہیں کہ "تم نے ایسے شخص سے میری ملاقات کیوں کرادی جو بن بیاہی لڑکیوں سے ملنے کے قابل نہیں ہے۔"

نواب صاحب: (شرمندگی سے) بے شک بے شک میں ہرگز اس قابل نہ تھا۔ میں اپنے قابلِ ملامت بلکہ سزاوار لعنت دل و دماغ کی کمزوریوں سے خود سخت شرمندہ ہو رہا ہوں۔ خدا مجھے انسان بنائے۔

موہنی: (متاثر ہو کر) مگر آپ مجھ سے امداد کیا چاہتے ہیں؟

نواب صاحب: صرف اس قدر کہ اس معصوم دل فرشتہ خصلت لڑکی سے میرا گناہ معاف کرا دیں۔ میری وجہ سے اُسے تکلیف پہنچی حالانکہ میں نے کوئی نامناسب لفظ تک زبان سے نہیں نکالا۔ تاہم وہ میرے خیالات کو سمجھ گئی۔ بس مجھے معاف کرانے ان کی خفگی کے خیال سے میرا دل پسا جاتا ہے۔ میں اب تعلیم، سیر، تماشے، دوست سب کچھ

چھوڑ کرنا شاد زندگی خانہ نشین ہو کر بسر کر ڈالونگا۔

موہنی: میں ثریا سے کہوں گی اور آپ اس قدر بیدل کیوں ہوئے جاتے ہیں؟ ممکن ہے خدا بہتر کرے۔ آپ خود ہی ان سے معافی مانگ لیں۔ وہ نرم دل لڑکی ہے۔

نواب صاحب: آہ مجھ سیاہ بخت سے اب وہ عمر بھر نہ ملیں گی۔

موہنی: اتنا تو ہو سکتا ہے کہ اپنے ہاں آپ کی اُن سے ملاقات ہو جائے۔ وہ ایسی کج خلق نہیں ہیں کہ ملاقات سے انکار کر دیں۔ آج تو وہ یہیں مچھلی پکا رہی ہیں۔ پاپا جی کو اُن کے ہاتھ کی مچھلی بہت مرغوب ہے۔

موہنی اندر گئیں اور چند منٹ بعد آ کر کہا کہ وہ یہاں تو نہیں آتیں آپ ہی اندر تشریف لے چلیں۔

نواب صاحب: مجھ سے اس قدر جرأت نہ ہو سکے گی جب وہ اس جگہ آنا پسند نہیں کرتیں تو میرا وہاں جانا کب گوارا کریں گی؟

موہنی: اٹھئے تو میں جو ساتھ ہوں گی پھر وہ غصہ کا اظہار نہ کر سکیں گی۔

ان کے اصرار سے نواب صاحب موہنی کے ساتھ ساتھ کمرے میں گئے۔ ثریا جبیں سادے سفید لباس میں کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ نواب صاحب کو دیکھ کر تعظیماً کھڑی ہو گئیں سلام کیا مگر شیک ہینڈ کو ہاتھ نہ بڑھایا۔ نواب صاحب اُس رات کا واقعہ یاد کر کے دل میں سخت نادم ہوئے اور آنکھیں نیچی کئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ تینوں خاموش رہے۔ موہنی ان دونوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ آخر اسی نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

موہنی: دیکھو ثریا ایک ہفتہ کے بخار میں بھائی جان کس قدر دُبلے اور زرد ہو گئے ہیں۔

ثریا: اچھا۔ ایک ہفتہ برابر بخار رہا؟ بھائی سندر لال جی سے آپ کی ناسازی طبیعت کا حال معلوم ہوا تھا مگر اس قدر تکلیف کی خبر نہ تھی۔

موہنی: ورنہ آپ عیادت کو جاتیں؟

ثریا: ممکن تھا اگر اس سے پیشتر محل والیوں سے ملاقات ہو چکی ہوتی۔

موہنی: محل والیوں سے آپ کو کیا؟ ان سے تو ملاقات تھی۔

ثریا: یہ ٹھیک ہے۔ بشرطیکہ بھائی صاحب لکھنؤ کے نواب صاحب نہ ہوتے۔ ہم لوگ ذرا نواب صاحبان سے خائف رہتے ہیں۔

نواب: (آہستہ) آپ کیوں ناحق کسی کی تعریف کسی کی برائی کر کے فضول گوئی میں وقت ضائع کرنا چاہتی ہیں۔ بہن مجھ سے اب بیٹھا نہیں جاتا۔ سر میں سخت درد ہے اور ضعف معلوم ہوتا ہے۔ میں چچی جی کی طرف لیٹتا ہوں۔ تھوڑے سکون کے بعد گھر چلا جاؤں گا۔

موہنی: (کھڑے ہو کر) نہیں نہیں ادھر جانے کی تکلیف نہ کیجئے۔ میں یہیں صوفے پر کشن رکھے دیتی ہوں۔ آپ آرام کیجئے۔ ہم دونوں بیٹھی ہیں۔ باتیں ہوں گی۔

اور بہت اصرار سے کیوان قدر کو وہیں صوفے پر لٹا لیا۔ اُن کے سر میں درد زیادہ ہو گیا تھا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ موہنی نے اور ینٹل بام نکال کر پیشانی پر مالش کی۔ اب تو ثریا جبین کا دل بھی پسیجا اور سمجھیں کہ ان کی زیادتی تکلیف کا باعث میری ہی سخت کلامی ہوئی ہے مگر اس کی تلافی کیوں کر ہو۔

وہ اپنی سنگ دلی پر پشیمان سی ہو گئیں۔ موہنی مالش کر رہی تھیں۔ خود بھی جا کھڑی ہوئیں اور دریافت کیا کہ بخار زیادہ تو نہیں ہو گیا؟

موہنی: (موہنی اس نرمی کو غنیمت سمجھ کر) ہاں کچھ گرم تو زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ابھی ٹمپریچر لیتی ہوں۔ آپ ذرا اُن کے اور ینٹل بام ملیں۔ میں تھرمامیٹر لے آؤں۔

موہنی کا یہ حکم بجالانا ثریا کے لئے سخت مشکل تھا لیکن ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے ایسی سنگ دلی بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی بیمار آدمی کی مدد نہ کرے۔ طوعاً و کرہاً ہاتھ بڑھا کر دو انگلیوں سے روغن ملنے لگی اور موہنی دوسرے کمرہ سے تھرمامیٹر لینے چلی گئی۔ ہمارے نواب صاحب کے لئے یہ کس قدر تعجب خیز امر تھا کہ وہی نازنین جو ابھی چند منٹ پہلے پتھر کی پتلی معلوم ہو رہی تھی۔ اب مہر کی دیوی بن گئی وہی دست نگارین جو مصافحہ کے لئے نہیں دیا گیا تھا۔ اس وقت مالش کر رہا تھا۔ جونہی انہیں محسوس ہوا کہ موہنی کا محبت بھرا ہاتھ اُٹھ کر اس کی جگہ برف سے سفید نرم و نازک دو انگلیاں پھر رہی ہیں۔ اُس ہاتھ کا پیشانی سے

چھوتا تھا کہ اس بیمار محبت کے تمام جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی اور سنسنی پیدا ہو کر پسینہ پسینہ ہو گئے۔ نیم وا آنکھوں سے اوپر کو دیکھا تو ثریا نے کہا۔

ثریا: دردِ سر میں کچھ کمی ہے؟

نواب: جی!

ثریا: ماشاء اللہ طبیعت کچھ بحال معلوم ہوتی ہے۔

نواب: آپ کی توجہ کا شکریہ۔

ثریا: خدا کا شکر ہے اب آپ کی طبیعت درست ہے۔

اور سر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ کرسی پر بیٹھ گئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور کہا۔

نواب: مس جمیل احمد صاحبہ، میری زبان میں آج آپ سے ہم کلامی کی طاقت نہ تھی لیکن آپ کی اس وقت کی کمال مہربانی و رحم دلی کی بنا پر اس گناہ کار کو لب کشائی کی ہمت ہو گئی۔ آپ کو معلوم ہو کہ میری صحت بہت خراب ہو چکی ہے۔ جس سے میرا دل اور حوصلہ ٹوٹ گیا ہے۔ کالج جانا اور دوستوں سے ملنا اب دشوار ہے۔ اس بیماری میں ایک آرزو تھی تو یہ کہ ایک بار صرف ایک بار آپ کے قدموں میں حاضر ہو کر آپ سے معافی مانگ سکوں۔ سو شکر ہے پاک پروردگار کا کہ جس نے آج وہ موقعہ دیا (دونوں ہاتھ جوڑ کر بچشم نم) ثریا للہ میری تقصیر معاف کرو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ سے خوش ہو جاؤ اور ملا کرو۔ نہیں میں بدبخت اس قابل کہاں۔ میری آرزو صرف اسی قدر ہے کہ اس رات وقت رخصت جو آپ برہم ہو گئی تھیں وہ غصہ دل سے ہٹا دیں۔

ثریا کے دل کی عجیب حالت تھی۔ کیوان قدر کے متعلق اُس روز جو رائے قائم کی تھی آج وہ اس کو غلط معلوم ہو رہی تھی۔ صبح وہ موہنی کے پاس برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ نواب صاحب آتے ہوئے نظر آئے تو اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور پردے کے پیچھے کھڑی دیکھتی رہی۔ نواب صاحب نے اس کے متعلق جو تقریر موہنی سے کی تھی۔ وہ اس نے بخوبی سنی تھی جس سے ان کی نیک نیتی اور پاک محبت کا پتہ چلتا تھا۔ اُس کے بعد اُن کی یہ حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اب جو انہوں نے بخار کی حالت میں اس منت سے معافی مانگی تو آخر نرم دل لڑکی تھی کہاں تک سنگدلی سے کام لیتی۔ ان کو روتے دیکھ کر اس کا بھی دل

بھر آیا۔اُن کے دونوں ہاتھ علیحدہ کر کے کہا۔

ثریا: آپ کیوں مجھے گناہگار کرتے ہیں۔میں آپ سے بہت چھوٹی ہوں۔

نواب: چھوٹی سی ثریا۔چھوٹی نہیں۔اب تو مجھ سے بہت بڑی ہو۔میں تم سے اسی قدر لرزاں ہوں جیسے ایک ادنیٰ خادم ایک پر جلال بارعب ملکہ سے۔اب میری آپ سے یہ آخری التجا ہے کہ مجھ کو یقین دلا دیں کہ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔

ثریا: نواب صاحب آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔میں بالکل ناراض نہیں ہوں۔خفا ہونے کی آخر کوئی وجہ بھی؟ جب آپ مجھ غریب پر اس قدر مہربان ہیں تو یہ ممکن ہے کہ میں کشیدہ رہوں؟ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو بیماری کے دنوں میں میری طرف سے ایسا خیال قائم کر کے صدمہ پہنچا۔

نواب: میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ آپ مجھ سے خفا نہ تھیں۔ممکن ہے اب نہ ہی ہوں؟

ثریا: میں سچ عرض کرتی ہوں۔یقین کیجئے کہ اگر اس وقت کچھ رنجیدہ تھی بھی تو اب نہیں ہوں۔آپ اپنی صحت کا خیال کیجئے۔آپ کو تو انگلینڈ جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے ابھی سے کالج چھوڑ دیا تو کیا ہوگا؟

نواب: مس صاحبہ میرے دل کی عجیب کیفیت ہے۔مختصر یہ کہ اس حالت میں مجھ سے اب دنیا کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔دل بیٹھا جاتا ہے۔

ثریا: یہی تو کہتی ہوں کہ اپنی حالت کو سنبھال کر صحت درست کیجئے۔آپ کو ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔

سندر لال: (کمرے میں داخل ہو کر) ارے آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ہم وہاں ہو آئے۔

نواب: طبیعت سخت گھبرا گئی تھی نکل آیا۔تھوڑا ابخار اور دردِ سر موجود ہے۔

ثریا: کوئی آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا۔بہن موہنی تھرما میٹر لینے گئی ہیں ابھی تک واپس نہیں آئیں۔

سندر لال: اوہ بہن توڑ ڈالو تھرما میٹروں کم بختوں کو۔اب ہم ٹمپریچر نہ لیں

گے۔ دس دن ہو گئے منٹ منٹ پر بخار دیکھا جاتا ہے۔ خواہ مخواہ وہم ہوتا ہے۔ میں آج اسی ارادے سے گیا تھا مگر وہ خود ہی آ گئے۔ اب ہم انہیں شہر نہ جانے دیں گے۔ یقیناً دریا کا کنارہ صحت بخش ثابت ہوگا۔ میں جناب چچا نواب صاحب سے کہہ آیا ہوں۔ اٹھو ثریا کھانا یہیں منگواؤ۔ آج سے ان کا پرہیز وغیرہ کچھ نہیں۔

ثریا جبیں گئیں دیکھا کہ موہنی مچھلی کے کباب بنا رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ تھرمامیٹر کا صرف بہانہ تھا۔ غرض یہ تھی کہ تنہائی میں ثریا مالش کریں تو نواب صاحب ان کی نرمی سے ہمت کر کے معافی مانگنے کی جسارت کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دو بہنیں کھانا لے کر کمرے میں آئیں دس بجے تھے۔ سندرلال، نواب صاحب اور لڑکیوں نے اسی جگہ کھانا کھایا۔ مسٹر و مسز مکرجی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ۱۲ بجے تک چاروں اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر لڑکیاں چلی گئیں اور سندرلال بھی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ قریب دو بجے کے موہنی نے ثریا کو اپنے کمرے سے کوئی چیز لانے کے لئے زبردستی بھیجا۔ وہ نہیں جانا چاہتی تھی مگر انہوں نے بہت مجبور کیا تو یہ کہہ کر گئی کہ "آپ کا سا جھوٹا کام ہرگز نہ کروں گی جیسے صبح تھرمامیٹر کو آپ گئی تھیں۔ اب مجھے بھیج رہی ہیں تو بہت اچھا وہیں بیٹھ رہوں گی۔" کمرے میں آئی خیال تھا کہ نواب صاحب سو گئے ہوں گے لیکن ان کو نیند کہاں۔ ایک کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے ثریا کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔

ثریا: آپ سوئے نہیں؟ مجھ کو بہن موہنی نے آپ کو دیکھنے کے لئے بھیجا ہے۔

نواب: ہم خوش ہوئے تھے کہ اپنے ہی خیال سے دیکھنے کو آئی ہیں تاہم اس تکلیف کا شکر گذار ہوں۔

ثریا: میں غلط نہ کہوں گی۔ آئی انہیں کی زبردستی سے ہوں۔ ورنہ یہ وقت میرے یہاں آنے کا نہ تھا۔ ۴ بجے ضرور آتی۔ کہئے صبح سے تو طبیعت اچھی ہے؟

نواب: بہت اچھی۔ اگر سندرلال نے مجھے ایک ہفتہ یہاں رکھلیا تو یقیناً بالکل تندرست ہو جاؤں گا۔ بشرط..........رک گئے۔

ثریا: بشرط کیا؟

نواب: خفا نہ ہو تو کہہ دوں؟

ثریا: کہہ ڈالئے۔اب خفا ہو کر کیا کروں گی۔آپ بے حد رقیق القلب ہیں۔اور میں آپ کو روزِ اوّل سے اپنا عزیز سمجھ چکی ہوں۔

نواب: آہ ثریا۔اپنے نیم مردہ سچے قدردان کو زندہ کر دیا۔اللہ خوش رکھے آپ کو کہ آپ اس ناچیز کو........

ثریا: نواب صاحب اصلیت یہ ہے میں آج سچ عرض کئے دیتی ہوں۔یہ زمانہ بہت خراب جعل ساز دروغ گو ہے۔اس پر خیال کرتے ہوئے فوراً ہی نئی نئی شناسائی میں کسی شخص پر کسی طرح سچائی کا یقین کیا جا سکتا ہے؟ میری گذشتہ سختی یا خفگی اسی خیال پر مبنی تھی۔لیکن ذرا آپ سے واقفیت بڑھی۔موہنی نے آپ کے اعلیٰ کیریکٹر کا حال سنایا۔میں نے آپ کو ایسا رقیق القلب پایا تو اب گویا اطمینان ہو گیا ہے۔تاہم پھر بھی کہتی ہوں کہ کس قدر جلدی آپ مجھ سے ایسے برتاؤ کی خواہش نہ کریں جیسا کہ وہ دیرینہ دوستوں میں ممکن ہے ایک۔دوئم یہ کہ میرا اور آپ کا یہ زمانہ نہایت نازک ہے۔میں ہندوستانی بن بیاہی لڑکی ہوں اور آپ بھی غیر شادی شدہ اگر آپ کی شادی ہو چکی ہوتی تو آپ کی میری دوستی چنداں قابلِ اعتراض نہ ہوتی۔اب تو آپ کو ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھنا چاہئے۔اگر ایسا کریں گے تو یقیناً ہماری دوستی یا بہن بھائی کا اعلیٰ درجہ کا تعلق خوبی سے نبھ سکے گا ورنہ یہ لکھنؤ ہے زندگی دشوار ہو جائے گی۔

نواب صاحب: آپ کا فرمانا بجا۔میں ایک ایک لفظ کی قدر کرتا ہوں۔بیشک زمانہ بہت برا گذر رہا ہے لیکن ثریا اس میں بعض نیک لوگ بھی موجود ہیں۔آپ یقین کریں کہ مجھ میں اور بہت سے عیوب ہوں گے۔لیکن آپ کا یہ گنہ گار کیوان ایک سچا صاف دل راست گو شخص ہے۔ابھی نہ سہی مگر آئندہ آپ پر ثابت ہو جائے گا کہ کیوان قدر کیسا صادق الاقرار ہے اور جن خطرات کا آپ نے اشارہ کیا ہے۔انشاء اللہ آپ سے زیادہ مجھے اس کا خیال رہے گا۔اسی سے اندازہ کر لیں کہ آپ کی خفگی اور محض اسی وجہ سے اپنی بیماری کا اپنے نہایت بے تکلف دوست یعنی آپ کے عزیز بھائی سندر لال تک سے ذکر نہیں کیا۔ہاں عزیز بہن موہنی سے ضرور کہا ہے وہ بھی اس لئے کہ موہنی روزِ اوّل سے میری وارفتگیِ دل کو پہچان گئی ہے۔

ثریا: لیکن آپ کی اس دن کی حالتِ خود رفتگی تو کچھ دانشمندانہ نہ تھی۔ آئندہ خدا خیر کرے۔

نواب صاحب: یہ درست ہے۔ اُس دن بخدا میں بیہوش ہوا جاتا تھا۔ تاہم اس دیوانگی میں باوجود پیارے سندر لال کے اصرار کے یہ تو ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ میری دگرگوں حالت کا سبب کیا ہے۔ ثریا جبیں اس قدر دیوانگی میں بھی اتنا ہوش رکھنا قابلِ تعریف نہیں ہے؟

ثریا: (مسکراتے ہوئے) مجھ کو توان معاملات سے ذرا واقفیت نہیں ہے۔ میں اس قسم کی حرکات یعنی بیہوش ہونا، بیمار ہو جانا، گھر سے نکل کر جنگل کی راہ لینا، کسی انسان کی مثل معبود کے پرستش کرنا۔

''بڑھا بھی لیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لئے''

کا مصداق خیال کرتی ہوں۔

نواب صاحب: ثریا تمہاری اس تقریر کا ایک ایک لفظ میرے دل میں اُتر گیا۔ بھولی لڑکی بیشک ایک حد تک تمہارا خیال صحیح ہے لیکن انہی خیالات کی بنا پر کسی سچے قدردان کی جاں نثاری کو غلط نہ سمجھ لینا چاہئے۔

ثریا: وہ تو میں نے پہلے ہی عرض کر دیا نہ کہ بعض کمزور دل رقیق القلب انسان ضبط کی طاقت نہ رکھتے ہوں گے۔

نواب صاحب: خیر غنیمت ہے۔ کمزوری دل پر ہی محمول کیا۔ جعلساز، فریب کار، کاذب سمجھ لیا گیا ہوتا تو کوئی کیا کر لیتا؟

ثریا: (بھولے پن سے) اصل میں مَیں ابھی ناتجربہ کار ہوں۔ آج سے پیشتر کبھی اس مضمون پر بحث نہیں ہوئی۔

نواب صاحب: (ہنس کر) اچھا ذرا ٹھہرو۔ جس وقت تجربہ کار ہو جاؤ گی تو خود ہی یقین آجائے گا پھر ہم بوجھ لیں گے۔

ثریا: (اپنی سادگی پر جھینپ کر) خدا نہ کرے میں ایسے بیہودہ تجربے کیوں حاصل کروں کیا آپ کی میرے حق میں یہی دعا ہے۔

نواب صاحب: دعا تو نہیں مگر تھوڑی سی آرزو ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ پھر آپ وفادار جان نثاروں کو جھوٹا نہ خیال کریں۔

ثریا: لیجیے میں جاتی ہوں۔ اب ان باتوں سے تھک گئی۔

چوتھا باب

سر مکر جی اور سندر لال کے اصرار سے نواب صاحب نے ایک ہفتہ "پریم لاج" میں گذارا اور وہاں کی صحت بخش ہوا نے واقعی کیوان قدر کو تندرست بنادیا۔ مسٹر اور مسز مکر جی کی شفقتیں۔ سندر لال اور اُن کی بہنوں کی پر لطف صحبتیں سب کے ساتھ شیریں۔ یہ دلچسپ زمانہ خواب شیریں کی طرح گذر گیا۔ آج وہ "پریم لاج" میں صرف ایک شب کے مہمان تھے صبح چار کے بعد یہاں سے رخصت تھی۔ گذشتہ آٹھ دن تک تو یہ معمول رہا کہ ہماری ثریا حسب معمول روزانہ کالج سے یہیں آجاتیں اور شب کا کھانا کھا کر گیارہ بجے گھر آجاتیں۔ اس عرصہ کی جلد جلد ملاقاتوں نے کیوان قدر اور ثریا میں بے تکلفی بڑھادی تھی۔ وہ اُس سے بے انتہا محبت کرتے تھے تو ثریا بھی ان کی دل سے قدر دان ہوگئی تھی۔ آج سندر لال کی طرف سے رخصتی ڈنر تھا کیوں کہ نواب صاحب نے غسلِ صحت کیا تھا۔ اسی لئے موہنی نے ثریا جبین کی دادی صاحبہ سے شب کو یہاں رکھنے کی اجازت لے لی تھی۔

آج کیوان قدر نے اعلیٰ درجہ کا ریشمی سوٹ پہنا تھا جو اس خوبصورت نوجوان کو بہت زیب دے رہا تھا۔ ڈنر بہت پر تکلف تھا۔ مہمانوں اور کھانے کی جھنجھٹ کو چھوڑ کر ہم وہاں سے قصہ بیان کرتے ہیں۔ جب کہ مہمانوں کو رخصت کرکے یہ چاروں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دونوں بہنوں نے بھی بھائی کے غسلِ صحت کی خوشی میں پر تکلف ساڑیاں پہنی ہوئی تھیں اور سندر لال نے بالکل اپنے دوست کے سوٹ کے ہم رنگ سوٹ زیب تن کیا تھا۔

سندر لال: خدا میری نظر سے بچائے آج تو میرا کیوان گلاب سے زیادہ خوش رنگ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ صدقہ کرنا چاہئے۔ (اور جیب سے گھڑی نکال کر ان

کے سر پر تصدق کر کے میز پر رکھ دی۔)

کیوان قدر: ارے! ایسا غضب نہ کرو۔ اتنی خوبصورت گھڑی ہم میں سے کسی کو نہ دی جائے گی۔ چچی جان کافی صدقہ دے چکی ہیں۔

سندر لال: پیارے کیوان۔ اس پھول سے مکھڑے کے سامنے گھڑی کی کیا حقیقت ہے اور جیب میں اس کے سوا کچھ اور نہ تھا (ہنس کر) یہ کیسی بہنیں ہیں دونوں نے بھائی پر ایک پیسہ صدقے نہ کیا۔

موہنی: (یاقوت کی قیمتی انگوٹھی اُتار کر) لیجئے میرے پاس بھی اس وقت یہی ہے اور سندر لال کی طرح کیوان پر صدقے کر کے گھڑی کے پاس ڈال دی۔ نواب صاحب نے جلدی سے اُٹھا کر پہن لی اور کہا۔

کیوان قدر: پھینکتی کیوں ہیں؟ یہ رہے گی یادگار غسل صحت میرے پاس۔

سندر لال: اللہ اس صدقے کی تو اتنی قدر اور ہماری گھڑی وہیں پڑی بھنک رہی ہے۔

کیوان قدر: پھر آپ میں اور بہن میں کچھ فرق بھی ہے۔

سندر لال: بہن ثریا آپ بھی کچھ قربان کیجئے دیکھتی ہو۔ موہنی کی انگوٹھی کو کیا عزت دی گئی؟

ثریا: مجھ غریب کے پاس اس قدر جواہرات کہاں ہیں جس روز نواب صاحب غریب خانہ تشریف لے جائیں گے تو دادی جان صدقہ اُتار دیں گی۔

موہنی: وہ تو دیں گی ماش تیل اور پیسوں کا صدقہ لیکن وہ لوگ جو بھائی جان کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور اپنی جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کر سکتے۔ کم از کم اتنا ہی کریں کہ اپنی کوئی اچھی چیز تصدق کر دیں۔ آپ کو ضرور کچھ صدقہ دینا چاہئے۔

سندر لال: (انگڑائی لے کر) بھئی اب تو نیند آ رہی ہے۔ سونا چاہئے۔ آپ بھی آرام کریں۔

کیوان قدر: ہاں رات زیادہ ہو گئی۔ ایک بج چکا ہے۔

سندر لال اپنے کمرۂ خواب میں گئے۔ موہنی بھی کھڑی ہو گئیں اور ثریا سے کہا۔

"میں بھی چلتی ہوں۔ آپ بھی بھائی پر کچھ صدقہ کردیں اور چلی آئیں۔"

یہ کہتی ہوئی سوہنی چلی گئیں اور ثریا بھی اٹھیں۔

کیوان قدر: (ہاتھ پکڑ کر) ہیں ہیں ابھی سے چلیں۔ آپ اپنی کوئی چیز خراب نہ کیجئے مگر دو ایک ضروری باتیں تو سن لیجئے۔

ثریا: تصدق کرنے کو تو میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ باتوں کا اب وقت نہیں رہا۔ بس جانے دیجئے۔

کیوان قدر: بے شک وقت زیادہ گذر چکا ہے۔ لیکن رات اپنی ہے۔ ڈر کس کا ہے۔

ثریا: کھانا ہوا، باتیں ہوئیں، صدقے ہوئے، اب باقی کون سی بات رہ گئی ہے؟

کیوان قدر: آپ صدقے کا نام بار بار نہ لیجئے۔ مجھے رنج ہوتا ہے۔

ثریا: (مسکرا کر) وہ کیوں؟

کیوان قدر: اس خیال سے کہ جن دوستوں کو میں عزیز تھا انہوں نے اپنی اچھی اچھی قیمتی چیزیں نثار کردیں۔

ثریا: یوں کہئے کہ جن کو آپ بہت حسین معلوم ہو رہے تھے۔ ان ہی کے دل بے قابو ہو گئے اور چیزیں ابل پڑیں۔

کیوان قدر: درست ہے۔ جن کو اچھا معلوم ہوا انہوں نے ایسا کیا۔ جس کی نظروں میں خار ہوں وہ ایک دمڑی بھی کیوں خراب کرے۔

ثریا: نواب صاحب جو چیزیں وہ دونوں نثار کر گئے ہیں آپ کے تصدق کے لئے بے حقیقت ہیں اگر اس ناچیز نے کوئی شے نثار کی تو وہ ایسی ہوگی جو کوئی نہ کر سکے۔ ان روح پرور الفاظ کا کیوان پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ چند منٹ خاموش رہ گئے۔ پھر ثریا کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لئے۔ وہ جو چند منٹ سے کھڑی تھی، قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

کیوان قدر: ثریا۔ میری تمام زندگی میں سب سے اچھی گھڑیاں یہ ہیں اگر میرا اختیار ہو تو اپنی تمام بقیہ عمر ان لمحوں پر قربان کردوں۔ مجھے یہ امید ہو سکتی تھی کہ ثریا کی زبان سے یہ جاں بخش کلمات سن سکوں گا۔ آپ تو بھلا کیا تصدق کریں گی۔ میں آپ پر

نہیں، آپ کے ان الفاظ پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہوں۔ "کہو منظور ہے!" ثریا نے شرما کر نگاہیں نیچی کرلیں اور خاموش رہی۔

کیوان قدر: (اس کی طرف جھک کر) کیا نہیں منظور؟ یا الخاموشی نیم رضا سمجھ لوں؟

ثریا: آپ بہت ظریف الطبع ہیں۔ میں غریب اس شاعری کو کیا سمجھوں؟ اب آپ آرام کیجیے طبیعت کمزور ہے۔ کسلمند نہ ہو جائیے۔

کیوان قدر: کمزور نہیں۔ اب میں پورا تندرست ہوں۔ یہ ایک نہیں ایسی ایسی ہزار راتیں بیٹھا رہوں تو ذرا تکان نہ ہو۔ پیاری ثریا کیا اتنی اجازت دیتی ہو کہ میں آپ کو میری ثریا کہہ کر مخاطب کیا کروں؟

ثریا: میں ابھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔

کیوان قدر: اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں۔

(اور اپنی کرسی سے اُٹھ کر اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر)

کیوان قدر: لو ثریا۔

"قتل کر ڈالو مجھے یا جرم الفت بخش دو"

میں آج اپنے دل کی کیفیت بلا کم و کاست بیان کر کے رہوں گا۔ میں نے اب تک اپنے دل پر بہت جبر کر کے ضبط کیا لیکن اب ناممکن ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ شروع سے اس وقت تک ہماری ملاقات کو تین ہفتے گزر چکے ہیں۔ گو میں ذرا آزادانہ گفتگو کر لیتا تھا لیکن میں نے کبھی کوئی ایسا لفظ زبان سے نہیں نکالا جس سے یہ ظاہر ہو کہ مجھے آپ سے محبت ہے لیکن اس وقت صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کو چاہتا ہوں۔ دیوانہ وار چاہتا ہوں۔ آپ اگر بے رُخی کریں گی تو یقیناً گھل گھل کر مر جاؤں گا۔ مرنے دو میں یہ بھی نہیں کہتا ضرور ہی مجھے جلا لو مگر ہاں یہ اچھی طرح ذہن نشین کر دینا چاہتا ہوں کہ میں جس قدر آپ سے محبت کرتا ہوں وہ محبت ہی نہیں رہی بلکہ جنون کے درجہ کو پہنچ چکی ہے۔

ثریا: (زمین پر بیٹھ کر) میرے مہربان۔ میرے قابل پرستش کیوان میں اقرار کرتی ہوں کہ تمام عمر آپ کی وفادار دوست بن کر رہوں گی اگر زمانے نے مخالفت نہ

کی۔ کیوں کہ میری آئندہ زندگی میرے بس کی نہ ہوگی۔

کیوان قدر: آپ کے بس کی کیوں نہ ہوگی؟ آپ کی دادی بفضلِ خدا روشن خیال ہیں اور آپ بھی اعلیٰ تعلیم پارہی ہیں پھر اختیار کس کا ہوسکتا ہے؟

ثریا: میرے حالات آپ کو نہیں معلوم۔ اب جب کہ آپ نے واضح طور سے اپنے خیالات مجھ پر ظاہر کردیے ہیں تو مجھے بھی سب کچھ کہہ دینا چاہئے۔ اُس روز میں نے آپ سے ذکر کیا تھا نہ کہ نواب اغن صاحب اور ڈپٹی کلکٹر محمد حسین صاحب سے ہمارے عزیزانہ مراسم ہیں چنانچہ نواب اغن کے صاحبزادے قمرالزماں صاحب بی اے اور ڈپٹی صاحب کی طرف سے میرے لئے خواستگاری ہے۔ دادی جان نے ابھی یہ کہہ دیا ہے کہ جس وقت تک ثریا بی اے میں کامیاب نہ ہوجائے، شادی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہ چار سالہ میعاد سن کر ڈپٹی صاحب نے تو خاموشی اختیار کرلی لیکن نواب صاحب نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ اُن کو یہ شرط بھی منظور ہے اور چار سال تک انتظار کرنے کو تیار ہیں۔ اسی وجہ سے ڈرتی ہوں کہ ممکن ہے میری زندگی اُن ہی سے وابستہ ہو تو پھر میری خودمختاری نہ رہے گی۔

کیوان قدر: (پریشان ہوکر) آہ ثریا۔ یہ کیا جگر پاش خبر سنائی؟ کمبخت قمرالزماں مجھ سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوجائے گا اور اُس مردود محمد حسین کو تو میں اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ وہ آپ کے بوٹ کا تسمہ بھی کھولے۔ ثریا جبیں یہ آزادی کا زمانہ ہے۔ آپ روشن خیال ہیں۔ آپ کی شادی خلاف مرضی نہیں کی جاسکتی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ قمرالزماں۔ خوش نصیب قمرالزماں سے خوش ہوں اگر ایسا ہے تو للہ مجھ کو اسی وقت آگاہ کردیں تاکہ میں ایک دوسرے کی امانت خیال کرکے آپ کی طرف نظر بھی نہ ڈالوں۔ ثریا میں ایک شریف اور نیک دل انسان ہوں اگر معلوم ہوجائے کہ ثریا کے دل میں قمر کی قدر و محبت ہے تو خدا شاہد ہے کہ جان دے دوں گا مگر آپ سے پھر کچھ نہ کہوں گا۔ جس رُخ زیبا کا دیکھ لینا ہی میری زندگی ہے۔ بخدا اسے عمر بھر نہ دیکھوں گا۔

ثریا: نواب صاحب مجھے آپ ایسے شریف الطبع انسان سے اس بدظنی کی اُمید نہ تھی۔ خیر حسن ظن کو بھی مشکور ہوں اور تمام عمر وفاداری کا وعدہ کرتی ہوں۔

کیوان قدر: توبہ توبہ۔ میں آپ کی نسبت اور بدگمانی سے کام لوں۔ صرف

خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ آپ کو وہ جگہ پسند ہو اگر نہیں تو پیاری ثریا صاف صاف کہہ دو کہ قمر الزمان کا خیال تک بھی میرے دل میں نہیں ہے۔

ثریا: نواب صاحب۔ آپ نے خدا جانے میری بابت کیا خیال اپنے دل میں قائم کر لیا ہے۔ سچ عرض کرتی ہوں میں نے کبھی ان دونوں سے زیادہ گفتگو بھی نہیں کی اگر میرے دل میں قدر و عزت ہے تو کیوان قدر کی۔

ثریا کے منہ سے یہ جانفزا الفاظ سن کر نواب صاحب نے سرِ نیاز ان کے قدموں پر جھکا دیا۔ ثریا نے فوراً دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر کہا۔

ثریا: آپ مجھے بار بار کیوں گناہگار کرتے ہیں جب آپ سے اس قدر بے تکلفی کی گفتگو ہو چکی تو اب یہ ثریا ہمیشہ کے لئے آپ کی ہوگی۔

یہ کہتے ہی فوراً کھڑی ہوگئی۔ ساتھ ہی نواب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے روک کر کہا۔

کیوان قدر: میری اپنی ثریا۔ خدا ہمیشہ میری رکھے۔ آہ آپ نے جاں نثار کیوان کو مرنے سے بچا لیا۔ کہاں چلیں۔ ایسی جلدی کیا ہے۔

ثریا: اب سونا بھی چاہئے رات ختم ہوئی جاتی ہے۔

کیوان قدر: یہی تو غم ہے کہ آخری شب بھی ختم ہوتی ہے پھر کہاں اتنا وقت اور اتنی تنہائی میسر ہوگی؟ خدا خوش رکھے بہن موہنی کو جس کی بدولت یہ وقت نصیب ہوا ہے۔ کیا آپ کو نیند آرہی ہے؟

ثریا: جی ہاں، بہت دیر سے۔ آپ ناخوش نہ ہو جائیں اس خیال سے ٹھہری ہیں۔

کیوان قدر:

میری تو کچھ نہیں ہوئی دیدار سے مگر
اللہ کے سپرد مری جان جائیے

اتنا بتاتی جائیے کہ اب کب دیکھ سکوں گا؟

ثریا: (مصافحہ کو ہاتھ بڑھا کر) حتی الامکان روز روز۔

کیوان قدر: ہم شیک ہینڈ نہ کریں گے۔ آہ اسی پر مورد عتاب ہوا تھا۔ وہ

دن یاد ہے مر مر کے بچا ہوں۔

ثریا: (سر جھکا کر) معاف کیجیے گذشتہ باتوں کو جانے دیجیے۔

کیوان قدر: (ثریا کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر) بہت اچھا۔ لیکن صبح ذرا سویرے اُٹھنا۔ مجھ کو صبح بہت ہی جلدی محل جانا ہے۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی مگر چائے میرے ساتھ پینا۔

☆

پانچواں باب

دوستی کا ہو زمانے میں بھروسہ کس پر
تو نے اب چھوڑ دیا اوبتِ شیدا کس پر

کیوان محل

آج نواب سلیمان قدر بہادر کے ہاں صاحبزادے کے غسلِ صحت کا جلسہ ہے۔ صدقہ و مبارک باد لے کر رشتہ دار و ملنے والی بیگمات آ رہی ہیں۔ ڈھول پر ڈھول ٹوٹ رہے ہیں ڈومنیاں گا رہی ہیں۔ تمام محل میں خوشی کی چہل پہل ہے۔ آج دسویں روز صبح ہی صبح خدا کے فضل سے صاحبزادہ صاحب بنگر گنج سے گھر تشریف لائے ہیں۔ ان کی اپنی بہن صاحبزادی روشن آرا بیگم اور ماموں زاد خالہ زاد کئی بہنیں جمع ہیں اور تجویز ہے کہ آج شام کی دعوت میں مس موہنی کے ساتھ مس جمیل احمد کو بھی بلایا جائے گا۔ تمام دن خوشی و انبساط میں گزرا شام کو روشن آرا بیگم اور اُن کی خالہ زاد بہن سلطنت آرا بیگم نے نہایت پر تکلف لباس پہنا اور وسط باغ کی بارہ دری میں مع سب بہنوں اور سہیلیوں کے اُن دونوں کا انتظار کرنے لگیں۔ سات بجے شام کے دونوں بہنوں کو سندر لال پہنچا گئے۔ محل میں اپنی بہنوں کے پاس کیوان قدر لائے۔ آج وہ ہندوستانی لباس میں تھے۔ آڑا چست پاجامہ، گلابی ریشمی شیروانی، سر پر نہایت بیش قیمت سنہرے کام کی ٹوپی جو اس شہزادے کے سر پر تاج معلوم ہوتی تھی۔ ثریا جبین نے آج ان کو پہلی بار اس شان سے دیکھا۔ سوٹ سے زیادہ یہ لباس

خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ کیوان قدر نے اپنی بہنوں سے تعارف کرایا۔ ان سب پری جمال لڑکیوں میں سلطنت آرا بیگم کیوان قدر کی خالہ زاد بہن حسن میں نمبر اول تھی۔ خدا جانے کیوں ہمارا حسن پرست ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ وہ نمبر دویم حسینہ یعنی ثریا جبین پر فریفتہ تھا جس کا ابھی ان میں سے کسی کو علم نہ تھا۔ موہنی کا تو محل میں برسوں سے آنا جانا تھا۔ سب سے خوب واقف تھی مگر ثریا آج پہلی مرتبہ محل میں آئی تھی۔ آتے ہی سب اس سے بڑی محبت سے ملیں۔ کیوان قدر بھی یہیں بیٹھ گئے۔ ثریا جبین کی نگاہیں ان کے چمکدار لباس پر جمی تھیں۔

روشن آرا: ہمیں آپ سے ملنے کا جس دن سے بھائی جان نے ذکر کیا ہے بے انتہا شوق تھا۔ خدا خدا کر کے آج پورا ہوا ہے۔

ثریا: جی ہاں مجھ کو بھی بہت اشتیاق تھا جو خدا نے آج اس مبارک تقریب پر پورا کیا۔

سلطنت آرا: (موہنی سے) آپ میں اور ان میں تو کئی سال سے بہناپا ہے۔ آپ نے ہم سے کیوں اب تک چھپائے رکھا ہے؟

موہنی: یہاں آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ آج اس تقریب کی خوشی میں مدعو کی گئیں تو آنا ہو گیا۔

کیوان قدر: آپ لوگ تو کہیں تشریف لے جاتی نہیں۔ دوسروں سے کیوں کر متوقع رہتی ہیں۔

سلطنت آرا: ہم لوگ چونکہ جاہل ہیں۔ رسومات قدیم کے پابند ہیں۔ یہ تو بفضل خدا اعلیٰ تعلیم یافتہ و آزاد ہیں۔ اسی لحاظ سے میں نے کہہ دیا۔

اس کے بعد آپس میں باتیں ہوتی رہیں اور کیوان قدر کے اشارہ سے موہنی نے ثریا کی والدہ سے کیوان قدر اور ثریا کی شادی کا تذکرہ کیا۔ لیکن یہ شادی چونکہ ایک پرائیویٹ شادی کی حیثیت رکھتی تھی۔ ثریا کی والدہ نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان دونوں واقعات کو کئی دن ہو گئے مگر کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔

☆

چھٹا باب

سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

بڑی بیگم: لڑکی میں نے تمہیں بہت سمجھایا۔ تیری عقل ماری گئی ہے۔ ایسی خوار ہوگی کہ یاد کرو گی۔ آج سے چھ ماہ پیشتر جب کہ تو اس زمانہ ساز نواب زادے سے ملی تھی۔ میں نے بتا دیا تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی تو نے اس قدر ہیروں پر تماز پڑھنے والے آدمیوں کو ٹھکرایا ہے۔ عالیجاہ نوب زادے نے کرنہ لی شادی۔ محبت تو بہت جتا رہے ہیں مگر بیاہ کرتے دل لرزتا ہے۔

ثریا: اماں جان وہ خود مختار نہیں ہیں۔ والدین ان کی نہیں سنتے۔

بڑی بیگم: بس یہی تو فرق ہے اغن صاحب اور سلیمان قدر میں۔ وہ اپنے جیسی مال و دولت کے خواہاں ہیں۔ ہم غریبوں کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ اب بھی سمجھ جاؤ کچھ نہیں بگڑا اور ان کی طرف سے تو مایوسی ہی ہے۔ میں نے رات ہی کیوان قدر سے کہہ دیا تھا کہ اگر ثریا سے محبت ہے تو اپنے والدین کی سرپرستی میں بیاہ کر لے جاؤ۔ تو اس نے جواب دیا کہ "یہ امکان سے باہر ہے" تو میں بھی آخر شریف خاندان کی نام لیوا ہوں۔ مجھے یہ کسی طرح منظور نہیں ہے کہ خفیہ تعلقات محبت قائم رکھ کر چوروں کی طرح آ کر تم سے ملا کرے۔ میں اب اغن صاحب کو زبان دے دوں گی اور رسم منسوبیت ادا کر دی جائے گی۔

آیا: حضور چھوٹے نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں

بٹھا دیا ہے۔

بڑی بیگم: چلو میرے ساتھ قمر سے مل لو۔

حکم حاکم مرگ مفاجات۔ جس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی ملاقات کو جانا پڑا۔ نواب قمر الزماں بھی شکیل نوجوان تھا اور آزاد خیال تعلیم کا شوقین۔ اس وقت علی گڑھ کالج ایم اے میں تعلیم پا رہا تھا۔ سوٹ ہیٹ پہنتا تھا۔ دادی پوتی کو آتا دیکھ کر تعظیما نگاہیں نیچی کئے کھڑا ہو گیا۔ بڑی بیگم کو آداب بجالایا۔ اور ثریا کو اشارہ سے سلام کیا۔

بڑی بیگم: کہو اچھے رہے۔ اب کے تو بہت دن بعد لکھنؤ آئے؟

قمر الزماں: جی ہاں اب کے تین ماہ بعد گھر آنا ہوا ہے۔ اس درمیان میں کوئی تعطیل نہ تھی۔ کہئے آپ کا مزاج اچھا ہے۔ اب تو دردوں کی شکایت نہیں؟

بڑی بیگم: خدا کے فضل سے اب تو اچھی ہوں۔ تمہارے امتحان میں کتنے دن باقی ہیں؟

قمر الزماں: دو ماہ۔

بڑی بیگم: تمہارے ابا جان کی رائے ہے کہ اس ہفتہ میں تمہارا عقد کر دیا جائے اور بعد امتحان رخصت ہو جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

قمر الزماں: جو جناب کی رائے مبارک۔

بڑی بیگم: ثریا جبین بھی امتحان کی تیاری میں ہیں۔ تم ان کی بھی رائے لے لو۔ یہ اچھا ہے ہمیں تو تم دونوں کی خوشی مد نظر ہے۔ میں نماز ظہر کو جاتی ہوں۔ تم آپس میں فیصلہ کر لو۔''

جب وہ چلی گئیں تو قمر الزماں اپنی کرسی ثریا کے قریب کر کے بیٹھے۔

قمر الزماں: بہت خاموش اور پریشان سی ہیں۔ طبیعت تو اچھی ہے؟

ثریا: اچھی ہوں۔ ایک سخت مشکل میں مبتلا ہوں جس کا آپ سے ذکر کئے بغیر چارہ نہیں۔ آج کہے دیتی ہوں۔ گو دو سال سے ہماری شادی کی بات چیت ہو رہی ہے جو آپ کے اور میرے خلاف طبع نہ تھی لیکن ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کچھ محبت بھی نہ تھی۔ ہے نا ٹھیک! جواب دیجئے۔

قمر الزماں: آپ اپنی نسبت تو کہہ سکتی ہیں لیکن دوسرے کے دل کی آپ کو کیا خبر؟

ثریا: مجھ کو خبر کیوں نہیں ہو سکتی؟ اگر آپ کے دل میں میری محبت ہوتی تو مجھ سے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟

قمر الزماں: افسوس کہ میں دھوکے میں رہا۔ اس خیال سے کہ ایک ہندوستانی لڑکی اپنے ساتھ اظہارِ محبت کی بے باکی ناپسند کرے گی۔ ورنہ خدا علیم ہے۔ میرے دل میں آپ کی جس قدر محبت ہے۔ اچھا یہ تو کہئے کہ ابھی دادی صاحبہ جو فرما گئی ہیں آپ کو ان کی رائے سے اتفاق ہے یا بعد امتحانات ملتوی رکھا جائے۔

ثریا: میں ابھی شادی کے خلاف ہوں جس وقت تک اپنی تعلیم مکمل نہ کرلوں۔

قمر الزماں: یعنی چار سال بعد؟

ثریا: چار سال کیسے۔ نو دس سال۔ کیوں کہ بی اے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوں گی۔ پانچ چھ سال اُس کے لئے درکار ہیں۔

قمر الزماں: شادی آپ کے اس ارادے میں مانع نہیں ہو سکتی بلکہ مجھے نہایت خوشی ہوگی دونوں مل کر تحصیلِ علم کریں گے۔ پھر آپ کو لکھنؤ میں ڈاکٹری پڑھنے کی کوئی مجبوری نہ ہوگی۔ انشاءاللہ دونوں یورپ روانہ ہو جائیں گے۔

ثریا: نہیں جناب خدا آپ کا مال و دولت آپ کو مبارک کرے۔ میں غریب اپنے تھوڑے پیسوں میں لکھنؤ ہی میں ڈاکٹری پڑھ لوں گی۔ آپ کسی اور جگہ اپنی فکر کیجئے۔ میری وجہ سے اپنے دس سال ضائع نہ کیجئے۔

قمر الزماں: ثریا جبین دس سال کیا چیز ہیں اگر آپ دائمی رفاقت کا پختہ اقرار کریں تو آپ کا قمر عمر عزیز کے بیس سال کھو دینے کو تیار ہے۔

ثریا: میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ سچ سچ کہہ دوں میرا عمر بھر شادی کرنے کا ارادہ نہیں۔ ڈاکٹری پاس کر کے ملازمت کروں گی۔

قمر الزماں: اگر آپ کا ملازمت کا ارادہ ہے تو میں مانع نہیں ہوں گا۔

ثریا: مجھے شادی سے نفرت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ کو آپ سے محبت نہیں۔
پردہ اُٹھا کر اچانک بلا اطلاع کیوان قدر داخل ہوئے۔ دونوں نے اُٹھ کر ہاتھ

ملائے اور تینوں بیٹھ گئے۔

قمرالزمان: بہت اچھے وقت تشریف لائے۔ ہمیں بھی نیاز حاصل ہو گیا۔ پچھلی مرتبہ تین ماہ قبل جب میں علی گڑھ سے آیا تھا تو تین بار "کیوان محل" گیا۔ لیکن بدقسمتی سے آپ سے نہ مل سکا۔

کیوان قدر: اتفاق کی بات ہے کہ میں گھر پر نہ ہوتا تھا۔ ابھی میں "پریم لاج" سے آ رہا ہوں سندر لال سے معلوم ہوا کہ آپ علی گڑھ سے آئے ہوئے ہیں اور غالباً اُس وقت یہیں ملیں گے۔ کیوں ثریا آپ اس وقت بہت زرد ہو رہی ہیں طبیعت تو ٹھیک ہے۔

ثریا: اچھی ہوں۔ صبح سے کچھ سر میں درد ہے۔

کیوان قدر: تو آپ بیٹھی کیوں ہیں؟ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہیں۔

یہ حکم ملتے ہی ثریا فوراً یہاں سے اپنے بیڈروم کو چلی گئیں۔ وہ دونوں یہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ بڑی بیگم برآمدے میں تخت پر نماز کے بعد بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ آیا نے اطلاع دی کہ "ڈپٹی محمد حسین صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور ڈرائنگ روم میں نواب کیوان قدر بھی تشریف فرما ہیں۔"

یہ سن کر انہوں نے ڈپٹی صاحب کو یہیں بلا کر تخت کے پاس کرسی پر بٹھالیا۔

بڑی بیگم: کہو بیٹا کیسے آئے۔ اب تو مدت ہوئی ادھر کو منہ بھی نہیں کرتے۔

ڈپٹی صاحب: بیگم صاحب سچ عرض کردوں جس دن سے مجھے مایوس کردیا گیا ہے۔ میری ہمت پست ہو گئی ہے اس طرف آنے کو دل نہیں چاہتا۔

بڑی بیگم: بیٹا تم جانتے ہو آج کل کی تعلیم یافتہ اولاد کس قدر خودسر اور آزاد ہوئی ہے علی ہذا القیاس تم بھی اپنے کنبہ کی لڑکیاں چھوڑ کر غیر خاندان میں رشتہ کرنا چاہتے ہو۔

ڈپٹی صاحب: میری محترمہ آپ بجا ارشاد فرما رہی ہیں میں بھی مجبور ہوں کہ اور کہیں طبیعت راغب نہیں ہوتی۔ میں نے سنا ہے کہ قمرالزمان علی گڑھ سے تشریف لائے ہوئے ہیں اور شادی کی تجویز ہے۔ کیا یہ خبر صحیح ہے؟

بڑی بیگم: ہاں یہ خیال ہے لیکن لڑکی ابھی منظور نہیں کرتی۔

ڈپٹی صاحب: کیا وہ قمرالزمان سے بھی راضی نہیں ہیں؟

بڑی بیگم: کیا بتاؤں میں تو سخت حیران ہوں۔ آج کل کی لڑکیوں کے دماغ ہی آسمان پر ہیں۔

ڈپٹی صاحب: میں آج اسی خیال سے حاضر ہوا تھا کہ یہ معلوم کرلوں کہ مس صاحبہ کے خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں اور اس شادی کی خبر صحیح ہے یا غلط؟

بڑی بیگم: تم خود ثریا سے مل کر اس کی رائے معلوم کرسکتے ہو۔ ممکن ہے اس کے خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہو۔ میں تھوڑا ڈرائنگ روم میں جاؤں گی۔ نواب کیوان قدر سے ملنا ہے۔ آیا مس صاحبہ سے عرض کرو کہ "ڈپٹی صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کو بیوی صاحبہ برآمدے میں بلاتی ہیں۔"

ثریا: میری طبیعت اس وقت بہت خراب ہے۔ زیادہ بیٹھ نہ سکوں گی۔ کہیے کیا کام ہے؟

ڈپٹی صاحب: سخت تکلیف آپ کی صورت سے ظاہر ہے۔ چہرہ بالکل زرد ہو رہا ہے۔ افسوس کہ بے وقت آپ کو تکلیف دی گئی۔ چند منٹ کو تخت پر لیٹ جائیے۔

ثریا: آپ اپنا مطلب بیاں کیجیے۔ میری فکر نہ کیجیے۔

ڈپٹی صاحب: میرا مطلب کیا ہوتا! بہت دن سے خیریت معلوم نہیں ہوئی تھی۔ چلا آیا۔ دوسرے ایک تھوڑی سی اُمید یہ بھی تھی کہ ممکن ہے آج مجھ سے خوشی سے مل لیں کیوں کہ سنتا ہوں کہ آپ یہاں سے رخصت ہونے والی ہیں آخری سلام کو حاضر ہو گیا۔ دیکھیے مس صاحبہ مجھ سے اس قدر سختی سے پیش نہ آئیے۔ آپ ہمیشہ کو جدا ہونے والی ہیں۔ یہی ملاقات تمام عمر کو یادگار رہے گی۔

ثریا: (نرمی سے) ڈپٹی صاحب اپنی دانست میں تو میں نے اس وقت کوئی سخت کلامی نہیں کی چونکہ طبیعت خراب ہے۔ ضروری بات جلدی سن لینا چاہتی تھی لیکن آپ اگر اس خیال سے آئے ہیں کہ مجھ سے آخری بار مل لیں تو چند منٹ بیٹھوں گی۔

ڈپٹی صاحب: اس کمال عنایت کا عمر بھر مشکور رہوں گا۔ کیا میں یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ بہت جلدی نئی زندگی اختیار کرنے والی ہیں؟

ثریا: (مسکرا کر) یہ افواہ تو میں نے بھی سنی ہے۔

ڈپٹی صاحب: (افسردگی سے) صرف افواہ ہی ہے یا کچھ اصلیت بھی ہے؟
یہ تو آپ ہی بتا سکتی ہیں۔

ثریا: (ہنس کر) محض افواہ ہی ہے۔ میرا تو وہی ارادہ ہے جو آپ کو مدت سے معلوم ہے۔ اب اس میں یہ اور زیادتی ہوئی ہے کہ بی اے کے بعد ڈاکٹری پڑھوں گی جس کے لیے تو دس سال کی مدت درکار ہے۔ اس عرصہ میں مجھے کوئی طاقت پابند زنجیر نہیں کر سکتی۔

ڈپٹی صاحب: (بشاشت سے) یہ خبر نہایت مسرت بخش ہے۔ خدا آپ کو اپنے اچھے ارادوں میں کامیاب کرے۔

یہ سُن کر ثریا جبیں بے اختیار ہنسنے لگیں۔

ڈپٹی صاحب: آپ کو کس بات پر اس قدر ہنسی آئی؟

ثریا: آپ کے ان فقروں پر کہ میری شادی کے بجائے ڈاکٹری کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب: یہ حقیقت ہے۔

ثریا: کیوں؟

ڈپٹی صاحب: اس لئے کہ کسی اور کے اختیار میں ہو کر پابند ہو جائیں گی اور زمانہ طالب علمی میں اور اس کے بعد بھی کامل آزاد رہیں گی تو اُمید رکھ سکتا ہوں کہ کبھی کبھی شرف ملاقات بخشا کریں گی۔

ثریا: اگر آپ مجھ سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں تو میں ہر حالت میں نباہ سکوں گی۔

یہی ذکر تھا کہ کیوان قدر صاحب کمرے سے نکل آئے۔ ڈپٹی صاحب اُٹھ کر ملے اور دونوں بیٹھ گئے۔

کیوان قدر: ثریا جبین کپڑے بدل لو۔ موہنی کے کچھ دوست اس وقت چائے پر آئیں گے، مجھے تمہارے لینے کو بھیجا ہے۔

یہ سنتے ہی ثریا کمرے میں چلی گئی اور پندرہ منٹ بعد تیار ہو کر باہر آ گئی۔

کیوان قدر: بہت دیر لگا دی؟

ثریا: امّاں جان سے اجازت لینے گئی تھی۔

کیوان قدر: میں اُن سے اجازت لے کر آیا تھا۔ چلو دیر ہوتی ہے۔

یہ دونوں معہ محمد حسین کے نیچے آئے۔ ڈپٹی صاحب دونوں سے مل کر اپنی فٹن پر سوار ہو گئے اور یہ دونوں موٹر کار پر "پریم لاج" روانہ ہو گئے۔ یہاں چائے وغیرہ کچھ نہ تھی انہیں ایک مشورہ کرنا تھا۔ موٹر سے اُتر کر چچا چچی سے ملتے ہوئے۔ دونوں موہنی کے میٹنگ روم میں آئے ثریا پریشان صورت تباہ حال تھی۔ کیوان قدر کا بھی برا حال تھا جو وہاں اپنے کو سنبھالے ہوئے تھے۔ موٹر میں اُن کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ ثریا کے شانے پر سر رکھے یہاں تک آئے تھے۔ موہنی کے کمرے میں پہنچتے ہی ٹوپی اور کوٹ اُتار کر پھینک دیا اور فرش پر گر گئے۔ ثریا گھبرا گئی۔ اُس نے دیکھا پسینہ میں تر بتر تھے اور تیزی سے دل دھڑک رہا تھا۔ فوراً اسپرٹ ایمونیا کے چند قطرے پانی میں ملا کر زبردستی پلا دیئے اور آہستہ آہستہ رومال سے ہوا دینے لگی۔

کیوان قدر: (ناتواں آواز میں) رہنے دو ثریا۔ اب مجھے سنبھالنے کی تدبیریں بیکار ہیں۔ تمہارے ہاں کے سب حالات سندر اور موہنی سے سن چکا ہوں، میں تو اب تمہاری طرف جانا بیکار سمجھتا تھا لیکن سندر اور موہنی نے زبردستی بھیجا۔ کاش نہ جاتا تو بہتر تھا۔ آہ میری آنکھوں نے وہاں کیا کیا دیکھا۔ یہ دونوں صاحبان ایک دم کیوں تشریف لائے؟ کیا فتح و شکست کے لئے مقابلہ کرنا تھا۔

ثریا: (بہ تبسّم) آپ اس قدر گھبرائے کیوں جاتے ہیں۔ اُن دونوں کو تو شکست ہی رہی۔ فاتح تو آپ ہی رہے جو مجھے میدانِ جنگ سے نکال لائے۔

کیوان قدر: ثریا مذاق نہ کرو۔ میری جان پر بن رہی ہے۔

ثریا: پیارے کیوان انہیں میں نے تو نہیں بلایا تھا۔ دادی امّاں کی جو کچھ تجاویز ہیں آپ کو معلوم ہی ہیں۔ بہت سی دور اندیشیوں سے انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ قمر الزمان سے عقد کر دیا جائے۔ وہ بھی اس لئے کہ آپ کسی طرح شادی کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

کیوان قدر: ان کی شرط میں کس طرح پوری کر سکتا ہوں، والدین میرے بس کے نہیں۔ میں خود مختار جاگیردار نہیں۔ ایک طالب علم کیا کر سکتا ہے؟

ثریا: پھر مجبوروں معذوروں کی طرح صبر کر لیں۔

کیوان قدر: (آنکھیں بند کر کے) مجبور ہی ہو کر پڑا ہوں۔ آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔

ثریا: پھر مجھے لائے کس لئے؟

کیوان قدر: میں نہیں لایا۔ آپ کے بہن بھائی نے بلایا ہے۔

ثریا: اچھا بہن بھائی کو بلاتی ہوں۔

اور خود جا کر سندر اور موہنی کو بلا لائی۔ وہ ان کو اس طرح فرش پر بے حال پڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ سندر بھی وہیں بیٹھ گئے۔ کیوان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اُن کی چشم تر کو چوم کر کہا۔

سندر: پیارے کیوان۔ ہائے یہ کیا حال بنا لیا ہے۔ سندر قربان ہو جائے؟

کیوان: (گلے میں باہیں ڈال کر) میرے سندر اب مجھے مر جانے دو۔

سندر: (رو کر) ثریا اور میں؟

کیوان: خدا آپ دونوں کو اس دہر میں سرسبز کرے گا۔

سندر: آخر ایسی جلدی ہمت کیوں ہار بیٹھے؟

کیوان: اب باقی ہی کیا رہا ہے؟

سندر: اور جاتا ہی کیا رہا ہے؟ ثریا آپ کے پاس ہے۔ وہ دونوں ہاتھ جھاڑ کر چلتے ہوئے۔

کیوان: سندر اب مجھ سے مذاق نہ کرو۔ میرے دل ناتوان میں تاب نہیں۔ جاؤ اپنی بہن کی شادی کے سامان کرو۔

سندر: بہت خوب ابھی لیجیے مگر پہلے آپ اٹھ کر اپنی حالت تو درست کیجیے۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تو بدل لیجیے۔ میں اور موہنی ابھی یہی مشورہ کر رہے تھے۔

کیوان: جایئے خدا مبارک کرے۔ آپ حقیقی سالے ہوں گے منتظم نہیں۔ میں کس لئے کپڑے بدلوں۔ اپنی جان ثریا کے رخصت کرنے کو۔

یہ کہتے کہتے آنکھیں بند کر لیں۔ موہنی اور سندر نے جھک کر دیکھا تو بیہوش تھے۔

سندر لال کا دل ڈھل گیا اور وہ وہاں سے اُٹھ کر برآمدے میں جا پڑے۔ موہنی ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔ ثریا قریب ہی دروازہ سے لگی رو رہی تھیں۔ موہنی نے سندر کی جگہ بٹھا کر کیوان کا سر اُن کے زانو پر رکھ دیا ثریا نے اپنا معطر رومال سنگھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں ان کو ہوش آ گیا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو ثریا زانو پر سر لئے بیٹھی ہے اور موہنی پنکھا کر رہی ہے۔

کیوان: ثریا کتنی دیر کے لئے مجھ پر یہ عنایت ہے۔ اب تم ایک غیر کی ہونے والی ہو۔

موہنی: بھائی جان کیسی نادانوں کی سی باتیں کر رہے ہیں جب تک ہم دونوں زندہ ہیں ثریا کو کوئی آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ اُن دونوں نامرادوں کو جواب صاف دے دیا گیا ہے۔ ثریا بتاتی نہیں جو چپ بیٹھی بیٹھی ان کی حالت خراب کر رہی ہو۔

ثریا: بہن جب جان بوجھ کر یہ اپنی جان کے دُشمن بنے ہیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آج سے چھ ماہ پیشتر میں اُن سے حلفیہ اقرار کر چکی ہوں کہ ثریا تا قیامت آپ کی ہے۔ دنیا والے کچھ ہی تجاویز کیا کریں مگر یہ کسی کی سنتے سمجھتے تو ہیں نہیں۔ بیکار اپنی جان ہلکان کیے لیتے ہیں۔

موہنی: بھائی جان خدا کے واسطے اپنے ہوش بجا کیجئے اور ہماری تجویز سنئے۔ ہم نے کیا کیا انتظام کیے ہیں۔ جس سے آپ کی مشکل آج ہی آسان ہوگی۔

یہ سن کر کیوان قدر اُٹھ بیٹھے اور سندر لال اندر آ گئے۔

کیوان قدر: کہئے کیا تجویز ہے۔ میں تو اب بالکل مایوس و نا اُمید ہوں مانا کہ ثریا دل سے میری ہے مگر دادی صاحبہ سخت غضبناک ہو رہی ہیں۔ ہر چند میں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ابھی ثریا بہت ہی کم عمر ہے۔ کچھ عرصہ اس کو بغیر شادی کے رہنے دیں لیکن وہ اس قدر جلد شادی کرنے پر تلی ہیں کہ اگر میرے والدین شادی پر رضامند نہیں ہوتے تو وہ کسی اور ہی کے ساتھ سہی مگر شادی کر کے چھوڑیں گی۔

سندر لال: پیارے کیوان۔ ایک حد تک خالہ جان (یعنی ثریا کی دادی) بھی حق بجانب ہیں۔ قمر الزمان کا والد اُن کے پیروں پر گر کر یہ رشتہ مانگ رہا ہے۔ ادھر سے آپ

کی محبت کا اُن کو علم ہے۔اس پر آپ اور آپ کے والدین باقاعدہ شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتے تو وہ کس طرح آپ کی ناجائز خواہش پوری کرنے کے لیے لڑکی کو کنواری بٹھا کر ایک اچھا رشتہ ہاتھ سے کھودیں اور آپ کی طرف سے شادی کا امکان ہی نہیں ہے۔

کیوان قدر: امکان کیوں نہیں؟ سندرلال تم جانتے ہو ابھی اسٹوڈنٹ لائف میں ہوں تمام تعلقہ داری کے مختار بڑے نواب صاحب ہیں۔ بینک میں اس قدر کافی روپیہ نہیں کہ ہم دونوں کچھ عرصہ زندگی بسر کر سکیں۔ انہیں حالات پر کئی روز برابر غور کرکے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ابھی والدین کو ضد ہے، کچھ عرصہ خاموشی اختیار کی جائے۔ اس مدت میں ہم دونوں تعلیم سے فارغ ہو جائیں گے اور یقین ہے کہ اس وقت تک والدین بھی رضامند ہو جائیں گے کیوں کہ میں ان کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ ان کے اپنے بقاء نسل کے لئے مجبوراً میری رائے کے مطابق شادی کرنی پڑے گی۔ یہی سب حالات دادی صاحب کے گوش گذار کیے تھے مگر ان کو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ چنانچہ انہوں نے آخری فیصلہ کرکے کہ "اگر تم والدین کی رضامندی سے شادی نہیں کر سکتے تو اُمیدوار بھی نہ رہو۔" قمر کو بذریعہ تار علی گڑھ سے بلا کر پرسوں عقد کر دیا جائے گا۔ بہن موہنی دادی صاحبہ کی بے دردی و بے رحمی دیکھو کہ میرے روبرو قمر صاحب سے یہ تجویز بیان کی۔ آپ لوگ کس طرح کہتے ہیں کہ اُن کو جواب دے دیا گیا؟

سندرلال: یہ سب سہی لیکن آپ کے یہ دونوں جاں نثار سندر اور موہنی زندہ ہیں۔ ثریا کو آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ چلئے برآمدے میں بیٹھیں وہاں آپ کو وہ تجویز سناؤں گا جو ہم دونوں نے آپ کی کامیابی کے لئے سوچی ہے اور اس پر آج ہی عمل کیا جائے گا صرف آپ کو تیار کرنا ہے۔ یہاں موہنی ثریا سے ذکر کرکے اس تجویز پر عمل کرنے کو آمادہ کر لیں گی۔

اب ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا تجویز تھی جو اُن دونوں نے اُن دونوں سے بیان کی۔ جس پر کیوان قدر تو سندرلال کے بے حد سمجھانے سے آمادہ ہو گئے لیکن ثریا جبین کسی طرح نہیں مانتی تھی اور برابر روئے جاتی تھی۔ اس کی ضد پر موہنی نے دونوں بھائیوں کو بھی یہیں پر بلا لیا۔ اور تینوں نے مل کر کامل دو گھنٹہ تک سمجھایا۔ تب وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد چاروں نے کپڑے بدلے اور موٹر کار پر سوار ہو گئے۔

☆

ساتواں باب

اُمید دوستی تھی ہمیں جس حبیب سے
وہ بھی بدل گئے ہیں ہمارے نصیب سے

نواب کیوان قدر صاحب بہادر اور ثریا جبین کی محبت کو سوا سال کا عرصہ گذر چکا ہے ابتدائی چھ ماہ تو اُمید وبیم کے تھے مگر یہ نو مہینے ان دونوں نے نہایت مسرت وانبساط سے گذارے کیوں کہ ثریا نے دو سال تک کے لئے شادی سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ ڈپٹی صاحب اور قمر الزمان مایوس ہو چکے تھے۔ اب کیوان قدر صاحب آزادانہ آتے جاتے اور ثریا سے بے تکلفانہ ملاقاتیں کرتے تھے۔ مجبوراً بڑی بیگم صاحب ان ہی سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی تھیں مگر اب سخت مشکل یہ درپیش تھی کہ بڑے نواب صاحب اپنی بھانجی سلطنت آرا بیگم سے شادی کرنے پر تیار تھے۔ ہر چند کیوان نے بے انتہا مخالفت کی، اس صدمے میں بیمار بھی ہو گئے لیکن کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اپنی شادی کی خبریں وہ ثریا کو سناتے رہتے تھے اور ساتھ ہی اپنی بے بسی و مجبوری بھی لیکن آج کی خبر نہایت ہی جگر پاش تھی کیوں کہ وہ مایوں بٹھائے جانے والے تھے۔ صبح وہ مس موہنی کے گھر ثریا سے ملے مگر اس اندوہناک خبر کے بیان کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

حسب معمول جب چھ بجے شام کے ثریا کے ہاں آئے تو بتایا کہ "تمہارے حرمان نصیب پر کیا کیا گذر گئی"۔ وہ ان دنوں نہایت مغموم و پریشان رہتی تھی۔ کچھ تو اپنی حالت خراب، کچھ اپنے جان سے زیادہ عزیز کیوان قدر کے چھین لیے جانے کی خبریں۔

دادی صاحبہ کی طرف سے ہر وقت لعن طعن، جان سے بیزار ہو رہی تھی۔ شادی کی خبر سن کر بڑی بیگم نے کیوان قدر سے ملنا اور بولنا ترک کر دیا تھا۔ وہ شرمندہ شکل آن کر سیدھے ثریا کے کمرے میں چلے جاتے تھے کیوں کہ وہ اب ان کا سلام بھی نہ لیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ اُدھر ہی چلے گئے۔ ثریا فرش پر پڑی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ نواب صاحب یہ نقشہ دیکھ کر بے قرار ہو کے وہیں بیٹھ گئے۔

نواب: پیاری ثریا اس قدر رنج نہ کرو میں مر تو نہیں گیا یہ مصیبت کے دن بھی جلدی کٹ جائیں گے پھر خوشی ہی خوشی ہوگی۔

ثریا: (ہچکی لے کر) آہ اب خوشی کہاں اور میں بدنصیب کہاں؟

نواب: ایسا نہ کہو۔ خدا نہ کرے تم بدنصیب نہ ہو۔ زندگی میں بڑی بڑی مصیبتیں بھی انسانوں پر ہی آجاتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ ہمارے یہ دن بھی کٹ جائیں گے۔

ثریا: کہئے آج کی تازہ خبر کیا ہے؟

نواب: کیا کہوں؟ ان باتوں کا ذکر نہ کرو۔ تمہیں اس حالت میں رنج نہیں کرنا چاہئے۔

ثریا: مجھے تو کچھ اُبٹنے کی خوشبو آرہی ہے۔

نواب: ہاں آج سہ پہر مانجھے کی رسم ادا کر دی گئی ہے۔

ثریا: (گلے میں باہیں ڈال کر) آہا آج میرے کیوان مایوں بٹھائے گئے ہیں۔ تھوڑا سا اُبٹنا ہمارے لیے بھی لے آئے ہوتے۔ اس رسم میں میں بھی شریک ہو جاتی۔

نواب: ہمیں ان لغویات کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری رسمیں آسمان پر ہو چکی ہیں۔

بڑی بیگم: (اندر آکر) او نابکار بے حیا ننگ خاندان لڑکی اس درجہ کو پہنچ گئی۔ اب بھی تجھ کو غیرت نہیں آتی۔ اب تیرا اس شیطان نفس نواب زادہ سے کیا مطلب ہے جس ظالم نے ایک شریف خاندان کی عزت و آبرو خاک میں ملا دی۔ تجھے زندہ در گور کر دیا کمبخت تین مہینے سے کالج کی طرف رخ نہیں کر سکی۔ تجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کا ارمان خاک میں مل گیا میں لکھنؤ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اب بھی تو اِس جلاد سے ملنا نہیں

چھوڑتی۔ میں نے بہت صبر کیا تیری بے عزتی کی حد ہو چکی۔ بس اس وقت میں حکم دیتی ہوں کہ یہ جفاکار نواب زادہ آج کے بعد سے اس زینہ پر قدم نہ رکھنے پائے۔

نواب: (قدموں پر گر کے) اس بدنصیب کے حق میں جو کچھ فرمائیں بجا ہے۔ لیکن اپنی نیک دل پاک باز ثریا کے لئے کوئی سخت کلمہ زبان سے نہ نکالیے۔ میری ثریا نے شرعاً و قانوناً کوئی ناجائز کام نہیں کیا۔ رہی میری شادی وہ بھی میری حد درجہ کی مجبوری و بے اختیاری کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ میں نے تو قبلہ والد صاحب سے یہاں تک کہہ ڈالا کہ "میں ثریا جبین سے عقد کر چکا ہوں۔ اب آپ کو میری وہی بیوی رخصت کرا کر لانی ہوگی" لیکن وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوتے، مجبور بھی ہیں کیا کریں۔ بچپن سے سلطنت آرا مجھ سے نامزد ہے۔ دو لاکھ کی جائداد کی وہ تنہا مالک ہے۔ آپ سوچ سکتی ہیں ایسے رشتے کہاں چھوڑے جا سکتے ہیں اور آپ کے عزیز بھائی جناب اغن صاحب نے یہ غضب کیا کہ میرے والد صاحب کے سامنے ثریا جبیں پر شرمناک اتہام لگائے تاہم ان سب واقعات کے ہوتے بھی ثریا کا کچھ نہیں بگڑا۔ میرا یہ شادی کا ہفتہ ختم ہو جائے۔ پھر انشاء اللہ میں ان کو لے جاؤں گا۔

بڑی بیگم: (غضبناک ہو کر) بکو مت بے ایمان اغن بیچارے سے ہمیشہ کے لئے مجھے شرمندہ کرا دیا۔ ابھی بھی چین نہیں اگر آج کو یہ کمبخت ان کی بہو بننا منظور کرتی تو یہ ذلت و رسوائی کیوں اُٹھانا پڑتی۔ سلیمان قدر کا کچھ قصور نہیں۔ بدباطن تیرا کیا دھرا ہے۔ ان کو نکاح میں شریک کیا تھا۔ وہ کس طرح اس بدکردار لڑکی کو اپنی بہو بنا کر گھر لے جانا گوارہ کریں۔ روزِ اوّل سے میں یہی چلا رہی تھی کہ سلیمان قدر کبھی یہاں رشتہ کرنے پر رضامند نہ ہوں گے۔ اس بدبخت نے اپنے کو اور مجھے ذلیل کرانا تھا کرا لیا۔ اب "لے جاؤں گا" جو کہتے ہو یہ کس بوتے پر؟ محل میں تو اُسے گھسنے نہ دیا جائے گا۔ علیحدہ رکھنے کی تم میں قدرت نہیں۔ ابھی ان کے دست نگر طالب علم ہو۔

نواب: میں اب یہاں نہیں پڑھوں گا یا تو انگلستان جاؤں گا اور ثریا میرے ہمراہ رہیں گی اور اگر بہ سبب ناراضگی والد صاحب نے مجھے انگلینڈ نہ بھیجا تو پھر یہیں بسر اوقات کی کوئی صورت نکالوں گا۔ بہرحال ثریا کے لئے اگر اعلیٰ پیمانہ پر نہیں تو متوسط درجہ کی زندگی بسر کرنے کا سامان مہیا کر سکوں گا۔

بڑی بیگم: بس بس رہنے دو ان لن ترانیوں کو پہلے جو کچھ کہتے تھے وہ کر دکھایا۔ اب جو کہہ رہے ہو یہ کروگے۔ بری گھڑی تھی وہ جب میں نے وطن سے قدم نکالا اور لکھنؤ کو گھر بنایا۔ اس نابنجار کو کالج میں داخل کیا۔ آہ مخالفین تعلیم و آزادی کو کس قدر نہیں اڑانے کا موقعہ ملا۔ میرے نصیب اگر اس قدر بدقسمت نہ ہوتی تو دونوں وارث دنیا سے بے وقت کیوں اُٹھ جاتے۔ کیا اس کے دادا اور والد مرحوم کی زندگی میں تم اتنی ہمت کر سکتے تھے کہ ایک شریف کم سن ناسمجھ لڑکی کو یوں برباد کرتے؟ بس اُٹھو اور ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔

ثریا: (آہستہ نواب سے) آپ اس وقت تشریف لے جایئے دادی اماں بجا فرما رہی ہیں۔ ہماری طرف سے ان کو بے انتہا صدمہ پہنچا ہے۔ آہ! وہ ہمیں معاف نہیں کر سکتیں اور نہ خدا معاف کرے گا۔

نواب: (کھڑے ہو کر) لو میں چلا جاتا ہوں لیکن یہ خیال نہ کرو کہ خدا بھی معاف نہ کرے گا ہم نے خدا کا ذرا بھی گناہ نہیں کیا اگر کچھ ملزم ہیں تو سوسائٹی کے جاہلانہ رسم و رواج کے۔ ہمیں شرعاً و قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ اپنی پسند و محبت سے اپنے عمر بھر کے رفیق کا انتخاب کریں۔ والدین یا کوئی دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔

بڑی بیگم: (غصہ سے تھرا کر) او کم بخت تمہیں قانوناً بھی حق حاصل نہیں ہے۔ لڑکی ابھی نابالغ ہے۔ میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں کیا ورنہ تمہیں ناکوں چنے چبوا دیتی۔ یہ تمام خفیہ کارروائیاں اور اس کو یہیں ڈال کر دوسری شادی رچانا معلوم ہو جاتا مگر میں تو ہندوستانی رسم و رواج کی پابند ہوں اپنے لیے مقدمہ بازی سے مر جانا بہتر سمجھتی ہوں۔

یہ کہتی ہوئی اس کمرے سے نکل گئیں۔

ثریا: خدا نہ کرے جو ان کو یہ خیال آئے جو میرے کیوان پر ایک اور سخت مصیبت آئے۔

کیوان: پیاری ثریا تمہارا سنگ دل کیوان اب تمام مصائب کے جھیلنے کو تیار ہے۔ یہ آج کل جو مجھ پر گذر رہی ہے، کچھ کم ہے؟ تم یہاں میرے لئے تڑپ تڑپ کر دن گذار دو اور میں شادی رچاؤں۔"

☆

آٹھواں باب

اپنوں کو جس کے واسطے بیگانہ کردیا
قسمت یہ اپنی ہائے وہ اپنا نہیں ہوا

رات کے ۸ بج رہے تھے۔ نومبر کا مہینہ ہے۔ اب خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ سب سیر کو آنے والے چھ بجے تک باغ سے رخصت ہو گئے تھے مگر نا معلوم یہ کون مصیبت زدہ لڑکی تھی جو اس وقت اس سردی میں ایک شال اوڑھے اپنے جسم کو چھپائے یہاں سنگ مرمر بارہ دری کے برآمدہ میں زمین پر بیٹھی تھی۔ سوائے چاند کی ہلکی روشنی کے اس کے پاس کوئی لالٹین وغیرہ بھی نہ تھی۔

جب لوگ جا چکے اور گاڑی موٹر کا سلسلہ بھی بند ہو گیا تو چوکیدار باغ بھی سونے کو جانے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ٹمٹماتی سی لالٹین تھی۔ وہ جب بارہ دری کے آگے گذرا تو اس کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹکا مگر وہ کچھ نہ بولی اور وہ چلا گیا۔ اس طرح بیٹھے ہوئے اس دبلی پتلی نازک اندام لڑکی کو دو گھنٹے گذر گئے۔ وہ کچھ بیمار سی معلوم ہوتی تھی مگر یہاں سے نہ ہلی۔ قریب ۱۰ بجے کے ایک سفید ساڑھی پہنے سانولی سی عورت ہاتھ میں لالٹین لیے اس کے قریب پہنچی اور کہنے لگی۔

عورت: ہائے میں صدقہ گئی میری بیگم آدھی رات ہونے آئی اب تک یہیں بیٹھی ہیں وہ ہو کر چلے گئے تو آپ گھر کیوں نہ گئیں؟

بیمار لڑکی: اچھا کیا سوسن (اس کا نام) تم آ گئیں وہ ہو کر کہاں گئے ابھی آئے

ہی نہیں انتظار ہی میں تو بیٹھی ہوں۔ میں اب سردی سے کانپنے لگی ہوں مگر چونکہ آخری ملاقات اور آخری فیصلہ ہے۔ اس وجہ سے ٹھہری ہوئی ہوں۔ آج کے بعد سوسن میں اُن کو عمر بھر بھی نہ دیکھوں گی۔

سوسن: آپ کو یہی غم لگا ہوا ہے۔ ان کو پرواہ بھی نہیں ہے۔ اس وقت انہیں کے کوٹھی کے آگے سے گذر کر آئی ہوں۔ باجے بج رہے ہیں۔ آتش بازی و ناچ کے ساتھ ابھی ساچق آئی ہے۔ کل اس وقت بارات کو نکاح ہوگا۔ آپ اپنی جان گھلا دیں گی بس اب چلیئے وہ آچکے۔

لڑکی: رو کر۔ ذرا اور ٹھہر جا شاید آجائیں۔ آہ سوسن جس کا عمر بھر کا ساتھ تھا جس کے لئے دادی صاحب کو سخت ناراض کیا وہ بھی اپنا نہ ہوا۔ ہائے ایسا بے وفا ایسا عہد شکن نکلا۔ مجھے کسی کا نہ رکھا اور میں دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کی نہ رہی۔ اور رونے لگی۔

خادمہ سوسن ہر چند سمجھاتی تھی مگر یہ غم زدہ جگر فگار لڑکی ہچکیوں پر رو رہی تھی کہ اتنے میں سامنے کے پھاٹک سے کچھ روشنی نمودار ہوئی اور دیکھتے دیکھتے چند سیکنڈ میں ایک شاندار موٹر کار ان کے قریب سیڑھیوں پر آ ٹھہرا اور وہ نواب صاحب اتر کر ان کے پاس آئے جن کا انتظار تھا۔ فاختئی فلالین کا سوٹ پہنے تھے اور ہاتھ پر اوورکوٹ اُٹھائے۔ "اوہو معاف کرنا معاف، مجھے بہت ہی دیر ہوگئی سات کی بجائے دس بجے پہنچا۔ آپ نے سردی سے بہت تکلیف اُٹھائی۔ کیا کروں شام سے جو والد صاحب پکڑ کر بیٹھے تو دس بج گئے۔ اچھا یہاں سے اُٹھو" یہ کہتے ہوئے زبردستی ہاتھوں سے اس نحیف و زار لڑکی کو اٹھایا۔

لڑکی: اُٹھ کر کہاں جاؤں؟ صرف آخری بار دیکھنے کو یہاں ٹھہر رہی تھی۔ بس دیکھ لیا اب میں گھر جاؤں گی۔ آپ بھی رخصت ہوں۔

جنٹلمین: نہیں میری پیاری اس قدر ناراض نہ ہو۔ مجھے مجبور سمجھ کر معاف کر۔ خدا نہ کرے کہ آخری بار ہو۔ انشاء اللہ بہت جلد ملوں گا۔ صرف چند دن کی جدائی ہے۔ چلو اس وقت حضرت گنج "ویلریو" کے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ چائے پینا تاکہ سردی کچھ تو رفع ہو۔

لڑکی: بس اب مجھے چائے وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس قدر آپ

کی مہربانی کی میرا آخری سلام لو مگر یہ یاد رکھنا کہ دنیا میں کسی بے گناہ لڑکی سے سخت دغا کیا ہے۔ دھوکہ دیا ہے اس جرم کی سزا ایک دن ضرور ملے گی اور اگر آپ کی حد سے سوا محبت دل میں نہ ہو جس نے کہ مجھے دیوانہ بنا کر دین و دنیا سے کھو دیا تو میں ہی کانی مزا چکھا سکتی ہوں۔ آہ میں کہیں کی نہ رہی۔

جنٹلمین: (ہاتھ جوڑ کر) میری جان سے زیادہ عزیز میری جان کے مالک مجھ سے اس قدر بدظن نہ ہو۔ بے شک میری شادی ہو رہی ہے جو حد درجہ کا تم پر ظلم ہے مگر دیکھتی ہو کس قدر مجبور ہوں۔ جہاں تک ہو سکا انکار کیا۔ یہاں تک کہہ دیا کہ میری شادی ہو چکی ہے مگر کسی کو پرواہ نہیں۔ تمہیں معلوم ہے میں اس وقت بیدست و پا ہوں۔ ابھی طالب علم ہوں۔ جاگیر وغیرہ، والدین کے ہاتھ میں ہے۔ شادی سے انکار کرنے پر وہ ناحق کیے دیتے ہیں اور پرسوں کا ہی ذکر ہے کہ اپنے بھتیجے کے نام لکھے دیتے تھے۔ وہ تو جب میں نے عقد کی حامی بھر لی تو نرم ہوئے۔ تم ہی سوچو میں ان کا اکیلا بیٹا ہوں اور بفضلِ خدا ۳، ۴ لاکھ کی جاگیر ہے اگر وہ ہاتھ سے جاتی رہے تو پھر یہ تمہارا خادم تمہاری خدمت کے قابل نہ رہے گا۔ تم کو کس طرح آرام پہنچائے گا۔ ان تمام امور پر غور کر کے ٹھانی ہے کہ کر دیں شادی۔ یہ تمہارے حق میں بری نہیں بلکہ اس بدنصیب کے حق میں بری ہوگی جو دلہن بن کر آ رہی ہے کیوں کہ مجھے اس سے ذرا محبت نہیں ہو سکتی۔ یہ وقت نکل جائے پھر ہم تم ہی ہوں گے۔ لو اٹھو ''ویلریو'' کے چلو جو تم کو چائے پلاؤں۔ گرم جگہ بٹھاؤں یہاں تو برف پڑتی معلوم ہوتی ہے۔

لڑکی: خیر میں ان باتوں میں آنے والی اب نہیں۔ بہت دھوکا کھالیا۔ یہ سبز باغ کسی اور کو دکھائیں۔ افسوس تو صرف یہ ہے کہ میری حالت بدل گئی۔ کاش میں دادی صاحبہ کا کہنا مانتی اور اس درجہ تک بے شرم و بے وقوف نہ بنتی کہ اب کسی کو منہ دکھانا مشکل ہے۔ دادی اماں کہتی ہیں۔ ''کنوئیں میں ڈوب جا۔ میرے پاس تجھ ایسی بے شرم لڑکی کا ٹھکانا نہیں ہے۔'' اُدھر تعلیم کا کیسا حرج ہوا وہ کس شوق سے مجھ کو پڑھا رہی تھیں۔ آپ کی بدولت آج چار ماہ سے اپنی منحوس شکل لے کر کالج بھی نہیں جا سکی۔

جنٹلمین: تم ان کی خفگی کا اس حالت میں ذرا رنج نہ کرو۔ لو یہ ''پاس بک'' اس میں ۵ ہزار روپیہ ہے۔ جس وقت جس قدر ضرورت ہو منگا لیا کرنا اگر دادی صاحبہ ہاں رکھنا پسند

نہیں کرتیں تو فوراً تم آگرہ چلی جاؤ۔ وہاں کی لیڈی ڈاکٹر مس براؤن میری دوست ہے۔ میں اُن کو لکھ دوں گا تو وہ بہت آرام سے مثل ماں کے تمہاری خدمت کریں گی۔ میری شادی کے جھگھٹ اور میری کم فرصتی کے دن بھی گذر جائیں گے اور تم بخیر و خوبی اس بوجھ سے سبک دوش ہو جاؤ گی۔ بس بعد غسل صحت آنا پھر میں اچھی طرح بزور تم کو محل میں لے جاؤں گا۔

یہ تقریر سن کر مضمحل ناتواں لڑکی سے کھڑا نہ ہوا گیا وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ چہرہ زرد تھا اور سانس تیز تیز آ رہا تھا۔ جنٹلمین گھبرا گیا۔ گود میں اُٹھا کر اندر لے جا کر زمین پر اپنا اوورکوٹ بچھایا اور اس پر اُسے لٹا دیا۔ سوسن خادمہ یہ حالت دیکھ کر رونے لگی۔ بہت دیر اس مریضہ لڑکی کی یہی حالت رہی اور جب ذرا طاقت آئی تو جنٹلمین کے ہاتھوں میں نکل کر اُٹھ بیٹھی۔

لڑکی: آہ خدا نے اس ذلت کو پیدا کیا تھا اور زندہ رکھا۔ بے شک آپ نواب ہیں اور میں غریب یتیم لڑکی مگر ایسی ذلت ہرگز نہ سہوں گی کہ مثل ذلیل ترین عورت کے آپ سے خرچ کے لئے پیسے لے لوں اور جب بچہ پیدا ہو جائے تو مثل صاحب اولاد کنیزوں کے محل میں داخل ہونے کے قابل سمجھی جاؤں۔ بس بس اب مجھ سے کلام نہ کرنا۔ میرا آپ کا کوئی تعلق نہیں اور جو ہے اس کو خدا سمجھ لے گا۔ بوجہ اپنی کم عمری کم سمجھی و نادانی کے اس قدر ذلت اُٹھائی۔ آپ کی بدمعاشی کو محبت جانا۔ اب بس آج کے بعد آج میرا کبھی منہ نہ دیکھیں گے۔

یہ کہتی ہوئی اُٹھی اور تیز قدمی سے شال سنبھالتی پھاٹک کی طرف چلی۔ پیچھے پیچھے سوسن بھی ہوئی۔ جنٹلمین اسی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا اور عمداً بھی نہ اٹھا کہ غصہ میں ہے اس وقت نہ مانے گی جب وہ دونوں پھاٹک سے نکل چکی ہوں گی تب انہوں نے اُٹھ کر موٹر پر قدم رکھا اور روانہ ہوا۔ ڈرائیور اس وقت نہ تھا خود ہی چلائی۔

چونکہ وہ امین آباد جا رہی تھیں اور نواب صاحب کو شہر جانا تھا۔ رستہ ایک ہی تھا وہ دیکھتے جاتے تھے کہ جس سڑک پر اُن کی مصیبت زدہ دلربا جا رہی تھی اسی پر آہستہ آہستہ ان کا موٹر۔ آخر تھوڑی دور حضرت گنج پہنچ کر لڑکی تھک کر "وایٹ وے" کے برآمدے میں بیٹھ گئی۔ اس وقت ٹھیک ۱۲ بج رہے تھے۔ تمام بازار خاموش و سنسان تھا۔ ہاں پہرہ دار گورہ سنتری گھوم رہا تھا اب تو ان سے نہ رہا گیا اور اُتر کر زبردستی اسکو مع خادمہ کے موٹر پر بیٹھا لیا اور کچھ نہ کہا۔

پندرہ منٹ میں موٹر کار امین آباد پہنچی اور مکان کے نیچے رُکی۔ کیونکہ وہ اُتری اور آخری بار اپنے جانیوالے کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ جن سے اسوقت گرم گرم قطروں کی بارش ہورہی تھی۔ نواب صاحب بھی بیقرار ہو کر اُتر آئے۔ اور اسے گلے سے لگالیا سوسن غریب بھی چشم نم یہ پر حسرت نظارہ دیکھ رہی تھی کہ دونوں عاشق ومعشوق یا میاں بیوی ایک مدت کے لیے یا ہمیشہ کو ایک دوسرے سے جُدا ہورہے ہیں۔ فرقِ مراتب ان دونوں کا باعث جدائی ہوا ہے۔ وہ ایک عالیجاہ نواب کا لڑکا ہے اور یہ غریب یتیم لاوارث لڑکی جس کو دادی نے پرورش کیا ہے ورنہ آج یہی نہ محلوں کی زینت ہوتی۔ غرضیکہ اس وقت نواب صاحب کو بھی ضبط کا یارا نہ رہا اور مثل بچے کے وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اوپر جانا چاہتے تھے مگر دادی اماں کے خوف سے ہمت نہ ہوئی۔

آخر مجبور سوسن کے حوالہ کر کے اپنی دل وجان کی مالک لڑکی کو زینہ پر چڑھا دیا اور خود لوٹ کر موٹر پر روانہ ہوئے۔

آئیں شک نہیں کہ اس نواب زادہ کو اس یتیم بچی کے ساتھ حد سے زیادہ محبت تھی صرف دو سال کی دوستی میں وہ اس کو جان سے زیادہ چاہنے لگا تھا مگر مجبور تھا کہ اگر اس کے سوا دوسری نواب زادی (والد کی بھتیجی سے شادی نہ کرتا تو چار لاکھ کی جائداد چچازاد بھائی کو دیدی جاتی دھمکی تھی اور اصل یہ ہے کہ نواب سلیمان قدر صاحب تھے بھی خبطی اگر ضد وغصہ میں ایسا کر بھی بیٹھتے تو کوئی عجب نہ تھا۔ اس وقت اس بیچارے کی عجیب حالت تھی۔ کل شب کو خالہ زاد سے بیاہا جانا تھا اور اس وقت کا اپنی محبوبہ کا غم وغصہ دیکھ آیا تھا۔ اس کو اپنا جاہ د جلال سب ہیچ معلوم ہونے لگا اور عذاب جان۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک غریب لڑکا ہوتا تو بہتر تھا کہ اس غریب لڑکی کو آسانی سے بیاہ لیتا۔ خیر یہ گئے اپنے گھر اب ذرا اوپر کا حال دیکھیں۔ جیسے ہی مع سوسن کے لڑکی اوپر گئی وہ لحاف میں بیٹھی ہوئی آگ کی طرح برس پڑیں۔ او بے غیرت تو پھر آ گئی اری میں نے تو جانا تھا کہ مرگئی ہوگی۔ ۱۲ بجے ہیں یہ کس شریف زادی کے باہر پھرنے کا وقت ہے۔ مگر شریف ہو تب تو خدا جانے۔ تیری ماں کون بلا تھی۔ آہ تو نے بڑھاپے میں مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ مل آئیں خصم سے؟ مبارک بادشادی دے دی؟ کل جانا اور سوت کو رونمائی میں یہ بیٹا اپنا جوا ٹھائے پھر رہی ہے۔

سوسن: بیگم صاحب اب کچھ نہ کہیے اُن کی زندگی کا کیا بھروسہ ہے اب تک غش آ چکے ہیں جو اللہ کو منظور تھا ہوا۔ اب صبر کرلو۔

بیگم: میں تو صبح ہی جاتی ہوں اپنے بھتیجے کے پاس اور تم چاہو میرے ساتھ چلو چاہو اس کے ساتھ کالا منہ کرو مگر یہ مکان خالی کرنا ہوگا۔ یہاں پلّا پیدا نہ ہونے پائے گا کہ لوگ کہیں بیگم صاحب کے نواسہ ہوا، بیاہ ہوتا تو کسی نے نہ دیکھا اور نواسہ سب دیکھیں۔ بس صبح کی گاڑی پر لکھنؤ سے دفع ہو جاؤ۔

سوسن: بیگم صاحب نواں مہینہ ختم ہے پورے دنوں کہاں جائیں؟

بیگم: جہاں سینگ سمائیں خصم نے کہیں ٹھکانہ نہیں بنادیا؟ اور میں کیا جانوں جہنم میں جائیں۔ میرے مکان سے نکل جائیں۔ میں ایسی بے عزت نہیں ہوں کہ تو اب پر دعویٰ کروں نان ونفقہ یا حق مہر کا۔ بس ہوگیا جو ہوگیا۔ اس کا قصور ہے۔ ''اس کا کچھ قصور نہیں ہے۔''

جس شب کا اوپر ذکر ہے اس کے بعد سے وہ بیگم صاحب دیوتی امین آباد کے اس مکان میں پھر نہ دیکھی گئیں۔ تیسرے دن شادی کے رسومات سے فارغ ہو کر نواب صاحب امین آباد آئے۔ مکان خالی ملا۔ منیجر پرنس ہوٹل سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پرسوں صبح ۹ بجے کے ٹرین پر جانا کہتی تھی۔ خادمہ اور اسی وقت سے وہ بیگمات یہاں سے چلی گئیں۔ یہ خبر نواب زادہ کے قلب مضطر پر بجلی کی طرح گری۔ ان کی نظروں میں زمین و آسمان گھومنے لگا۔ سر میں ایک چکر سا آگیا اور تھوڑی دیر کو بالکل خاموش ہوگئے۔ اسی وقت ان بیگم صاحبہ کا باورچی جس کو وہ علیحدہ کرگئی تھیں ان کے پاس آیا اور ایک لفافہ دیا۔ انہوں نے خط جیب میں رکھ کر باورچی سے کہا۔

نواب صاحب: کہو خانساماں جی تمہاری بیگم صاحب کہاں تشریف لے گئی ہیں؟

خانساماں: حضور کچھ معلوم نہیں ہے۔ مجھ کو پرسوں صبح اچانک معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ معہ صاحبزادی صاحب وسوسن کے میل ٹرین سے تشریف لے جائیں گی اور مجھے حساب کر کے یہیں چھوڑ دیا گیا۔ یہ چٹھی صاحبزادی صاحبہ نے دی تھی اگر آپ یہاں

تشریف لائیں تو پیش خدمت کردوں ورنہ ڈاک میں ڈال دوں۔

اس سے یہ پختہ خبر سن کر نواب صاحب نے پانچ روپیہ باورچی کو انعام دیئے اور لفافہ کھولتے ہوئے اپنی فٹن پر سوار ہوگئے کوچبین نے دریافت کیا کہ کہاں جائیں گے مگر انہوں نے نہ سنا نہ کچھ جواب دیا۔ اب وہ غریب حیران تھا کہ کدھر کو چلے۔ دوبارہ پوچھنے پر بھی جب جواب نہ ملا تو وہ کوٹھی پر گاڑی لے چلا۔ انہوں نے بیٹھتے ہی پڑھنا شروع کیا۔

مضمون خط

امین آباد پارک

جناب والا

آج یہ عاجزہ پورے ۲ سال ایک ماہ بعد آپ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتی ہے۔ آہ یہ خبر نہ تھی کہ جس کو نہ صرف چاہا بلکہ جائز طریق سے دل و جان کا مالک بنالیا ہے اسی طرح ایسے وقت میں عالم بے بسی و بے کسی میں ہمیشہ کو چھوڑنا ہوگا۔ میرا اس وقت سوائے آپ کے یا ذاتِ خدا کے اور کوئی وارث حقیقی نہیں ہے۔ دادی صاحبہ سخت ناراض ہیں۔ آج سے مجھے چھوڑ کر اپنے بھتیجے کے پاس جارہی ہیں اور میں خدا کے سہارے پر اسٹیشن جاکر کسی نامعلوم جگہ کا ٹکٹ لینے کو ہوں۔ مجھے آپ کی محبت کا پاس ہے ورنہ اس ظلم کا مزا چکھا سکتی ہوں۔ اچھا خوش رہو آباد رہو۔ ممکن ہے میری زندگی کا عنقریب خاتمہ ہو اور میرے ساتھ ہی اس بدقسمت لاوارث روح کا بھی۔ کاش آپ کو میرا خیال نہ ہوتا مگر اپنے بچے کا تو ہوتا۔ خدا جانے کس حالتِ بیکسی میں یہ بدنصیب دنیا میں آئے گا اور پھر دنیا سے جائے گا۔ آہ بے وفا یاد رکھنا میرا ابر باد کرنا رنگ لائے گا۔ میں تو اب

بے آس نامراد ناکام آرزو مایوس تمنا ہوں۔ بس مرنے کی اور اُمید ہے ۔

منعقد ہو جس کی مرنے پر مراد
نامرادی اس کی دیکھا چاہئے

لیجئے رخصت خدا حافظ

ناچیز ....

یہ خط پڑھتے جاتے تھے اور بیوی کیسی بیوی معشوقہ ومحبوبہ۔ بیوی کی بے کسی پر دل بھرا آتا تھا آنکھوں میں اندھیرا چھار ہا تھا۔ وہ اس وقت کپڑے پھاڑ کر فنش سے کود پڑے اور بیوی کی تلاش کرنے کو تیار تھے مگر کچھ پتہ نہ تھا کہاں ڈھونڈیں جب گاڑی کوٹھی جا کر ٹھہر گئی تو اس عالم بے خودی میں اُتر پڑے دیکھا تو گھر تھا۔

کچھ دن ان کو اپنی محبوبہ کی گم شدگی وجدائی کا سخت صدمہ رہا۔ یہاں تک کہ نئی بیوی سے بولنا دشوار تھا۔

شادی کے پہلے ہی ہفتہ خرابی صحت کا عذر کر کے دہلی چلے گئے۔ ایک ماہ وہاں لگا دیا۔ پھر والدہ صاحب کا غشی گیا تو آئے۔ سال بھر یونہی گذارا۔ اس کے بعد ایم اے میں کامیاب ہوتے ہی لکھنؤ سے نکلنے کی یہ تدبیر کی کہ اسی سال سول سروس کے لئے روانہ انگلینڈ ہو گئے۔

نواں باب

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

وزیر باغ پشاور

جمعرات کا دن، سہ پہر کا وقت ہے۔ آج یہاں بینڈ ہے۔ علاوہ فوجی گوروں کے مجمع کے بہت سے ہندو مسلمان جنٹلمین لیڈیاں اور خواتین بھی تماشائی ہیں۔ ایک طرف سفید برقعوں کا جھنڈ نظر آتا ہے تو دوسری طرف رنگ برنگ کی لنگیوں اور ساڑیوں میں ہندو بی بیاں چل پھر رہی ہیں۔ ایک درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھی چند ٹیچرز لیڈیاں باتیں کر رہی ہیں۔

مس جیکب: کہیے مسز پشاور میں دل لگ گیا؟

زہرہ: ہاں لگ ہی گیا بسر جو کرنی ہوئی۔ تیسرا مہینہ گذر رہا ہے۔

مسز گوپال: پشاور بہت اچھی جگہ ہے۔ یقیناً آپ کے اپنے شہر سے بھی خوبصورت ہوگا۔

زہرہ: (کھڑی ہو کر) ہاں ہوگا میں نے کبھی مقابلہ نہیں کیا۔ میں ذرا اس طرف کو ٹہلتی ہوں۔

زہرہ ملگجی سی فاختئی ساڑھی پہنے تھی اور انگریزی وضع کے بال بنے تھے وہ باغ کے

ایک تنہا گوشے میں آ کر ٹہلنے لگی۔ گلاب کا پھول ہاتھ میں تھا کہ اچانک اُس کو کوئی صورت آشنا جنٹلمین انار کے درختوں سے نکل کر اپنی طرف آتا نظر آیا جس نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بیتابانہ دوڑ کر ہاتھ پکڑ لئے۔

زہرہ: ہیں آپ یہاں کہاں؟

جنٹلمین: عرصہ کے بعد خدا کو آپ سے ملانا تھا جو اِدھر چلا آیا۔ کہئے اچھی تو ہیں؟ پھوپھی صاحبہ بھی یہیں ہونگیں۔

زہرہ: خدا کا شکر ہے۔ اچھی ہوں۔ آہ آپ کی پھوپھی صاحبہ ایک سال ہو جائے گا مجھے تنہا کر گئیں۔

جنٹلمین: (بچشم نم) ہائے کیا وہ انتقال کر گئیں۔ مجھ سے کس قدر محبت کرتی تھیں۔ آہ اس پر آشوب زمانہ میں آپ بالکل اکیلی رہ گئیں۔ یہ المناک واقعہ کس جگہ گذرا میرٹھ تو میں اور والد صاحب اس سال میں کئی بار گئے مگر آپ کا پتہ نہ پایا۔

زہرہ: اُن کا انتقال کلکتہ میں ہوا۔ جب کہ میں اس بے وفا کی کشتۂ تیغ جفا ہو کر مع دادی صاحبہ کے لکھنؤ سے کلکتہ چلی گئی تھی۔ بتایئے آپ یہاں کیسے آئے؟

جنٹلمین: یونہی آوارہ گردی کو۔ ایم اے کا امتحان دے کر گھر چلا گیا تھا۔ نتیجہ کے انتظار میں وہیں ٹھہرا رہا پچھلے ہفتہ نتیجہ شائع ہو گیا۔ خیر کامیابی پر والد صاحب شادی کی تیاری میں مصروف ہوئے۔ میرا ابھی اس طرف مطلق خیال نہیں تھا۔ گھر میں بھی دل نہیں لگا۔ پشاور دیکھنے کی اجازت لے کر یہاں آ گیا۔ آپ نے یہاں سکونت اختیار کر لی ہیں؟

زہرہ: دو تین ماہ سے یہیں ہوں خالی بیٹھے بیٹھے دیوانی ہوئی جاتی تھی۔ زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی مشغلہ چاہئے تھا۔ یہاں کے زنانہ مشن ہائی اسکول میں ٹیچری کر لی ہے۔

جنٹلمین: (تاسف سے) آہ۔ آپ کی قسمت نے بھی کیا کیا پلٹے کھائے ہیں۔ ایک روز خود کالج کی طالب علم تھیں۔ ڈاکٹری کے ارادے تھے۔ آج مشن اسکول کی ملازمت کر رہی ہو۔ اسکول ہی میں رہتی ہو یا علیحدہ مکان ملا ہے۔

زہرہ: چند ہفتہ تو اسکول ہی میں رہی اب علیحدہ کوٹھی میں اٹھ آئی ہوں۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس مس جیکسن صاحبہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے

مکان میں دو کمرے ایک غسل خانہ دے دیا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات مجھے کہنے کی جرأت تو نہیں ہوسکتی۔ لیکن آپ کی گذشتہ عنایت پر خیال کرتے ہوئے یہ عرض کرتی ہوں کہ کل شام کی چائے اور شب کا کھانا غریب خانہ پر نوش کر کے عزت بخشیں۔

جنٹلمین: (بہ تبسم) بہت خوشی سے ثریا جبیں یہ مغائرت کے الفاظ زبان سے نہ نکالو۔ میں آپ کا ویسا ہی خیر خواہ ہوں۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں اگر آپ کی ہیڈ مسٹریس صاحبہ معترض نہ ہوں اور آپ کو بھی تکلیف نہ ہو تو آپ کے ہاں اُٹھ آنے کو تیار ہوں۔

زہرہ: اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کیا خوشی ہوسکتی ہے کہ میں اپنے کسی معزز عزیز کو غریب خانہ پر ٹھہرانے کی عزت حاصل کروں۔

جنٹلمین: اچھا تو میں کل حاضر ہو جاؤں گا کوٹھی کا پتہ بتا دیجئے۔

زہرہ: نمبر ۴ کرزن روڈ متصل زنانہ مشن ہائی اسکول۔

جنٹلمین: (گھڑی دیکھ کر) اوہو چھ بج رہے ہیں۔ ورنہ اسی وقت آپ کے ساتھ جا کر کوٹھی دیکھ لیتا۔

زہرہ: (خوش ہو کر) چلئے اسی وقت تشریف لے چلیں۔

جنٹلمین: مس جیکسن کو مرا اس وقت کا جانا ناگوار نہ ہو؟

زہرہ: اوّل تو ان کو میرے کسی عزیز کا آنا ناگوار ہی نہیں ہوتا دوسرے وہ موجود نہیں ہیں۔ طبیعت درست نہ تھی دو ہفتے کی چھٹی لے کر وہ مری تشریف لے گئی ہیں۔ فٹن بھی موجود ہے۔ مس صاحبہ کی اجازت سے اُن کی گاڑی ہر وقت اپنے کام میں لا سکتی ہوں۔ اس وقت میرے ساتھ دو ٹیچرز اور بھی جانے والی ہیں مگر میں اُن کو یہ کہہ کر کہ میرے ایک عزیز ساتھ ہیں کرایہ کے ٹانگہ پر بٹھا دوں گی۔

اس گفتگو کے بعد زہرہ نے ادھر آ کر مس جیکب و مسز گوپال سے کہہ دیا کہ "اتفاقیہ مجھے اپنے کزن یہاں مل گئے ان کو اپنے ساتھ کوٹھی پر لے جانا ہے۔ مہربانی سے آپ ٹانگہ پر اسکول چلی جائیں۔ اور خود معہ اُس معزز جنٹلمین کے اپنی کوٹھی "روز کاٹج" آئی ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود خانساماں سے دریافت کیا کہ "اس وقت کیا کیا پکا ہے۔"

خانساماں: حضور کری بھات ہے سبزی ہے اور پڈنگ۔

زہرہ: اس وقت ہمارے ایک بھائی نواب صاحب آگئے ہیں۔ کھانا یہیں کھائیں گے جلدی سے کچھ اور تیار کرلو۔

خانساماں: حضور مرغی موجود ہے۔ چکن روسٹ بنائے لیتا ہوں اور سوپ ہو جائے گا اور صبح کے لیے مچھلی رکھی تھی وہ بھی تیار کر لی جائے گی۔

زہرہ: بہت ٹھیک بہت ٹھیک جلدی تیار کرلو۔ آٹھ بجنے والے ہیں۔ خود ڈرائنگ روم میں آئیں وہ منتظر تھے۔

جنٹلمین: مس جیکسن تو موجود نہیں گھر ہمارا اپنا ہے۔

زہرہ: وہ ہوتیں تب بھی ہمارا ہی تھا۔ مس جیکسن ایک نوجوان خوش طبع محبت کرنیوالی لیڈی ہے۔ مجھے بے انتہا چاہتی ہے۔ آہ پیاری موہنی کے بعد مجھ سے اسی نے محبت کی ہے۔ ہم دونوں مثل حقیقی بہنوں کے رہتی ہیں، کوئی حساب کتاب اور تفریق نہیں ہے۔ کاش وہ آج یہاں ہوتیں تو آپ سے مل کر بہت خوش ہوتیں۔

جنٹلمین: خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کی خوش گذرانی کا یہ سبب بنا دیا۔ کہیے کبھی وطن والے بھی یاد آتے ہیں؟ سندر موہنی تو آپ کو بہت یاد کیا کرتے ہیں۔

زہرہ: آہ وطن کا نام ہی نہ لیں میرے دل کے زخم ہرے ہوتے ہیں۔

جنٹلمین: بے شک آپ کو بہت صدمے پہنچے۔ جس کی وجہ زیادہ تر آپ کی نادانی تھی۔ بہت ہی کم سن تھیں۔ اس عمر میں اچھے برے کی تمیز نہیں ہو سکتی۔

زہرہ: درست۔ اب دھکے کھا کر تجربہ کار ہو گئی ہوں؟

کھانے کے کمرے سے گھنٹی کی آواز آئی اور دونوں وہاں چلے گئے اور اس سے فارغ ہو کر قریب نو بجے کے دونوں زہرہ کے سٹنگ روم میں آبیٹھے۔

جنٹلمین: یہ کمرہ بھی خوب آراستہ ہے یہ تصاویر آپ کی ہی بنائی ہیں؟

زہرہ: فرصت کے وقت کبھی کچھ بنا لیتی ہوں۔ ''پریم لاج'' اور اپنے گھر کے تو کچھ حالات سنائیں۔ سندر اور موہنی کی شادیاں ہوئیں یا نہیں؟

جنٹلمین: مسٹر سندر لال کی شادی بنارس کے بیرسٹر مسٹر مادھو لال کی لڑکی راجکماری بی اے سے تین ماہ گذرے ہو گئی ہے اور آپ کی پیاری موہنی جی ایک انجینئر سے

جو تازہ ولایت سے آئے ہیں آج کل کورٹ شپ کر رہے ہیں۔ میرے ہاں کے حالات اُن کی آپ کو کیا فکر ہے؟ ایمان سے کہنا کہ اس برس دن میں کبھی میرا خیال بھی آیا تھا؟

زہرہ: کیوں نہیں۔ میں آوارہ وطن تو سب کو ہی یاد کرتی ہوں۔ بتایئے آپ کے دوست ڈپٹی محمد حسین صاحب کہاں اور کس حال میں ہیں؟

جنٹلمین: اوخوش نصیب محمد حسین تیری بھی یاد ہے۔

زہرہ: ہاں جی کیوں نہیں۔ اپنے مہربان بھی کہیں بھلائے جاسکتے ہیں؟

جنٹلمین: (سنجیدگی سے) اچھا یہ تو ہوئے مذاق۔ اب میں چند ضروری باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں اگر آپ مجھ سے بتانے کی تکلیف گوارہ کریں۔

زہرہ: فرمایئے۔

جنٹلمین: (کرسی قریب کرکے) پہلے تو سن لیں دہاں کے ضروری حالات۔ آپ کے مہربان ڈپٹی صاحب نے لکھنؤ ہی میں تب ہی شادی کرلی تھی۔ اب خیر سے بال بچہ ہونے والا ہے۔ آپ کے سب سے زیادہ چاہنے والے مہربان نواب کیوان قدر کی شادی تو آپ کے سامنے ہی ہوچکی تھی۔ اس کے بعد وہ سخت بیمار ہوگئے۔ جب ذرا آرام ہوا تو آپ کی تلاش کو معہ سندرلال کے نکلے، تمام ہندوستان چھان مارا جب کہیں پتہ نہ پایا تو مایوس ہوکر ہندوستان چھوڑ دیا۔ سنا تھا کہ بیوی سے ان بن رہتی ہے کہ کچھ عرصہ ہوا بغرض تعلیم انگلستان جاچکے ہیں اب آپ میرے سوالات کا صحیح جواب دیجئے۔

زہرہ: فرمایئے تو۔

جنٹلمین: لکھنؤ سے آپ کی گم شدگی کے بعد جب میں لکھنؤ آیا تو آپ کی نسبت طرح طرح افواہیں سنیں اُن کی کیا اصلیت ہے؟

زہرہ: بے شک آپ نے اس بدبخت کی بابت بہت بری بری خبریں سنی ہوں گی۔ اب تفصیل وار بیان کریں تو میں بتاسکوں کہ کہاں تک صحیح ہے اور کس قدر غلط۔

جنٹلمین: پیاری بہن میں کس طرح بیان کروں کہ میں نے کیا کیا سنا ہے۔ بخدا مجھے یقین نہیں آتا خدا نہ کرے وہ خبریں سچی ہوں۔

زہرہ: (بہن کہنے سے خوش ہوکر) اگر سچ ہوئیں تو پھر آپ مجھ سے ملنا اور

میرے یہاں آکر ٹھہرنا گوارا کریں گے یا نہیں؟ حالات سن کر اگر آپ نے مجھے اس قابل نہ سمجھا تو پھر میں کیا کروں گی؟ مدت کے بعد ہاتھ آکر پھر مجھ سے چھوٹ جائیں گے۔

جنٹلمین: آہ ثریا جب مجھے کھو چکیں تو آج میری قدر ہو رہی ہے۔ آپ مجھے حالات بتا دیں میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا۔ دیکھو میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلا آیا اگر میرا دل پہلا سا نہ ہوتا تو یوں راستہ چلتے تمہارے ساتھ چلا آتا؟ اب وہ وقت گذر چکا ہے ان باتوں کا ذکر ہی کیا؟ میں یہی خدا کا شکر کرتا ہوں کہ زندگی میں دوبارہ آپ کو دیکھ لیا۔ اب اگر آپ کے کام آسکوں آپ کی کوئی مدد کر سکوں تو زیادہ خوشی ہو۔ خدا کرے آپ کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا ہو۔

زہرہ: اور میرے دل میں آپ کی طرف سے کدورت کب تھی؟

جنٹلمین: یہ تو نہ کہئے کدورت اس وقت تھی جب کہ آپ نے مجھے اور میرے دل کو پیروں سے مسل ڈالا تھا۔

زہرہ: آہ۔ میں احمق تھی۔ وہ وقت بھول نہیں پاتی جب کہ اس ظالم بے درد کے فریب میں آئی۔ آہ میں نے نہ صرف اپنے تئیں برباد کیا بلکہ اپنی ماں سے زیادہ چاہنے والی دادی کی جان لی۔ آپ جیسے نیک دل۔ سچے ہمدرد کو رنج پہنچایا۔ آہ میں اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکی ہوں۔

اور اُن کے سامنے سر جھکا دیا۔ ثریا جبین کی اس نرمی و پشیمانی نے خاص اثر کیا۔ انہوں نے ثریا کا جھکا ہوا سر اپنے ہاتھوں پر رکھ لیا۔ اس کی مصیبت اور آوارہ گردی پر ان کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

جنٹلمین: پیاری ثریا اگر مجھ سے کوئی خدمت لے سکتی ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں۔

ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر اپنی کرسی سے اُٹھ کر فرش پر اُن کے قدموں میں بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔

زہرہ: میرے قابل پرستش قمر میں خوش نصیب ہوتی اگر ان قدموں پر فدا ہو جاتی مگر آہ۔ یہ بدبخت اب اس قابل نہیں رہی کہ اس منحوس منہ سے آپ کا نام لے

سکوں یا آپ کو چھو بھی سکوں خدمت گذاری تو کجا۔

جنٹلمین: ہائیں۔ ہائیں ثریا یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ جو کچھ میں نے لکھنؤ میں سنا ہے وہ سچ ہے؟

زہرہ: ہاں ہاں سب سچ ہے۔

جنٹلمین: افسوس۔ کیوان قدر اتنا ظالم نکلا۔ وہ کم بخت تو تعلیم یافتہ سمجھ دار تھا۔ خیر جو کچھ آپ کی قسمت میں لکھا تھا وہ ملا، گذشتہ صدمات ونقصانات کو بھلا دو۔ میری طرف سے کسی قسم کا کوئی وہم دل میں نہ لاؤ۔ میں آپ کا ویسا ہی قدر وعزت کرنے والا ثابت ہوں گا۔ میں فوراً اپنے والد صاحب کو تمام حالات بتا کر اپنا ہم خیال بنالوں گا مگر میں نے تو........ کچھ اور بھی سنا تھا۔

یہ سن کر زہرہ قمر الزمان صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈروم میں لائی اور ایک چھوٹی سی مسہری کا پردہ اٹھایا۔ قمر الزماں نے جھک کر دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت سرخ وسفید موٹا تازہ سنہری بالوں والا بچہ سو رہا ہے۔ اب تو قمر الزماں صاحب کا رنگ زرد، چہرہ فق ہو گیا ان کی نظروں میں اس کمرے کا در و دیوار گھومنے لگا۔ ہر چند اپنے حواس جمع کرنا چاہتے تھے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور عقل گم تھی۔ تاہم وہ بچہ اس قدر خوبصورت اور اس کے ماموں زاد بھائی کیوان قدر کا ہمشکل تھا کہ باوجود اس قدر غم وغصہ اور حیرت کے انہوں نے جھک کر بچہ کو خوب پیار کیا۔ ثریا اس وقت مثل تصویر ساکت کھڑی تھی۔ وہ جب اچھی طرح بچہ کو پیار کر چکے تو مسہری کا پردہ ڈال کر ثریا کے قریب آئے اور اس کا سر اپنے سینہ سے لگا کر کہا۔

قمر الزمان: اے بیکس لڑکی خدا تیرا گناہ معاف کرے۔ میری نادان ثریا میرا دل بالکل تیری طرف سے صاف ہے۔ تم کم سن بچہ تھیں۔ خدا سمجھے گا۔ اس ظالم بے درد سیاہ کو جس نے کئی زندگیاں برباد کیں۔ بیدرد نے مجھ سے چھین کر یوں منجدھار میں چھوڑا میں آج تک خانہ ویران پھر رہا ہوں۔ میری پیاری پھوپھی کو یہ غم دنیا سے لے گیا۔ غریب بے زبان لڑکی سلطنت آرا بیگم کو بھی حقیقی خوشی نہ نصیب ہونے پائی۔ سب سے بڑھ کر اس معصوم روح پر یہ ظلم کہ وہ بن باپ کا ہو کر عمر بھر شرمائے گا۔ اچھا پیاری ثریا اب صبر۔ تمہارا یہ

قدرشناس اب بھی وفادار ہے۔

زہرہ: خدا آپ کو دین و دنیا کی نعمتیں بخشے آدمی نہیں فرشتہ ہو، آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو میری ناپاک شکل دیکھنی ہرگز گوارا نہ کرتا۔ دراصل آپ کو میری محبت ہے؟ محبت ہی میں انسان اندھا ہو کر یوں عقل کھو دیتا ہے۔ ورنہ میں منہ لگانے کے قابل نہیں رہی۔

قمر: آہ ثریا۔ آج پوچھتی ہو کہ ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' آہ اسی محبت نے آج تک مجھے یوں خانہ ویران پھرایا ہے۔ اس وقت کے شادی کا سامان تیار ہے۔ میں گھر سے نکل آیا ہوں مگر یہ وعدہ پیمائی کام آئی۔ مجھے اپنا گوہر گم گشتہ مل گیا۔

زہرہ: توبہ کیجئے۔ اس نابکار کو گوہر کہتے ہیں۔ اب تو یہ کنکر پتھر سے بدتر ہے۔

قمر: دنیا کے لئے ہوگی مگر جس کو اس کے بغیر دنیا اندھیری تھی اس کے لئے تو اب بھی چمکتا تارا ہے۔ افسوس کہ میرے والد صاحب کے خیال آپ کی طرف سے بدل چکے ہیں تاہم میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا۔

زہرہ: نواب صاحب اب مجھ سے خوش ہو چکے۔ وہ اب میری شکل دیکھنے کے روادار نہ ہوں گے۔ کیا انہیں یہ منظور ہوگا کہ میں اس بچے کو گود میں لے کر اُن کے سامنے ہوں۔

قمر: یہ درست لیکن میں ابا جان کو سمجھاؤں گا کہ اس نازک وقت میں ایک لاوارث مصیبت زدہ لڑکی کی سرپرستی کرنی چاہئے اور ایک معصوم بن باپ کے بچے کی پرورش جو کہ ہمارا ہی خون ہے۔

زہرہ: اب میں نے آپ کی سچی محبت کا ثبوت پالیا۔ کیوان قدر کو تو مرا کسی سے بات کرنا گوارا نہ تھا اور آپ میری ایسی ایسی کمزوریاں دیکھ کر جو قابل گردن زدنی ہیں، معاف کرتے ہیں مگر آہ میرے پیارے قمر میں اب اس قابل بھی نہیں۔

اس کے بعد نہایت آہستہ آہستہ قمر سے کچھ باتیں کیں جو سنتے سنتے قمر کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔

قمرالزماں: پیاری بہن میرے دل پر ایک بوجھ تھا جو تم نے فوراً ہلکا کر دیا۔ خدا اس پیارے بچے کو عمر نوح عطا کرے۔ اچھا تو چلو میری شادی کی شرکت کے لئے تو

لکھنؤ چلو۔

زہرہ: بڑی خوشی سے اس مبارک تقریب کی شرکت کے لئے چلنے کو تیار ہوں مگر لکھنؤ کے رُخ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

قمر: تو ہمارا بھی بغیر آپ کے شادی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

زہرہ: (ہنس کر) اگر اس طرح نہیں تو اسی طرح سہی ثریا شریک ضرور ہو۔ اچھا اس شرط پر چلتی ہوں کہ سہرا مجھ ہی سے بندھوائیں گے۔ بہن صاحبہ رفعت آرا بیگم تو اعتراض نہ کریں گی کہ ان کی موجودگی میں مَیں کون سہرا باندھنے والی ہوگئی۔ اچھا یہ بھی فیصلہ کرلیں سہرا بندھائی کیا دیجئے گا۔

قمر: جو آپ طلب کریں۔

زہرہ: میں کیا جانتی ہوں کہ آپ کیا خوشی سے دے سکتے ہیں؟

قمر: ثریا اب میں کچھ نہیں دے سکتا۔ خدا تمہیں دنیا میں شاد و آباد کرے اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے مل جانے کا حال انگلینڈ لکھ دوں۔

زہرہ: نہیں نہیں خدا کے لئے ایسا نہ کر بیٹھنا۔ میں آپ کو قسم دیتی ہوں کہ اس ملاقات کا حال سواء میرے اور آپ کے کسی تیسرے پر ظاہر نہ ہو۔ دیکھئے میں یہاں اپنا نام بدل کر کام کر رہی ہوں میں نے اپنا نام زہرہ بتایا ہے اور وطن کلکتہ۔ یہ لوگ مجھے کوئی بنگالی مسلمان لڑکی سمجھتے ہیں۔

قمر: تمہاری خوشی لیکن سندرا اور موہنی کو ضرور سنانا چاہتا تھا۔

زہرہ: ان دونوں سے مجھے کوئی اچھی اُمید نہیں۔ آہ ان ہی دونوں نے مجھے اس درجہ کو پہنچایا۔

قمر: مذاق سے نہیں کہتا چلوگی شادی میں۔

زہرہ: میری دلی خوشی ہے کہ آپ کی شادی میں شریک ہوں اپنے ہاتھ سے کام کروں اگر کوئی اعتراض نہ کرے تو سہرا باندھوں۔

قمر: بس تو ذرا ہمت کرلو سارے لکھنؤ نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ اس گھر کی طرف رُخ نہ کرنا جس میں سلطنت آرا جیسی دشمن موجود ہے۔

زہرہ: سلطنت بیچاری کا کیا قصور ہے۔ میری اپنی قسمت خراب ہے۔

قمر: یہاں اسکول سے تمہیں کیا ملتا ہے؟

زہرہ: کچھ ملتا ہوگا آپ گھڑی تو دیکھیں کیا وقت ہے؟

قمر: ہونا کیا ایک بجنے والا ہے۔

زہرہ: اوہو آپ کو تو نیند آئی ہوگی؟

قمر: یہ کہو کہ اب ہمیں نیند آئی ہے۔ اُٹھ جاؤ۔ اچھا اُٹھا جاتا ہوں۔ پہلے میرے اتنے سے سوال کا جواب دے دو کہ یہاں سے کیا ملتا ہے؟

زہرہ: میں تو آنریری کام کر رہی ہوں۔

قمر: آپ کے پاس اس قدر اندوختہ باقی ہے کہ اپنی اور بچے کی بسر اوقات کر سکیں؟

زہرہ: خدا کا فضل ہے گذارا ہوئے ہی جاتا ہے۔

قمر: میں نے یہ بھی سنا تھا کہ وقت رخصت کیوان قدر نے آپ کو دس ہزار روپیہ دیا تھا۔

زہرہ: ہاں دیے تو تھے مگر میں نے واپس کر دیا تھا۔

قمر: آپ کو معلوم ہے؟ میرے والد قبلہ اغن صاحب کیوان قدر کی والدہ صاحبہ کے ماموں زاد بھائی ہوتے ہیں۔ اس رشتہ سے کیوان میرا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ پس میرا فرض ہے کہ جس وقت تک وہ ناخدا ترس انگلستان سے واپس آ کر اپنے بچے کی خبر گیری کرے میں بحیثیت اُس کا چچا ہونے کے اس کی پرورش اپنے ذمہ لوں۔

زہرہ: (ہنس کر) آپ کو اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کا بھتیجا ہے لیتے جایئے بیگم صاحب بھی آنے والی ہیں خوب پرورش ہو جائے گی۔

قمر: یہ تو باتیں ہیں آپ اپنا بچہ کب کسی کو دینے والی ہیں۔ خیر میں سو روپیہ ماہوار اُس کی شیر خوارگی کے اخراجات کے لیے اُسی کے نام بھیجتا رہوں گا۔

زہرہ: آپ کی مہربانی۔ میں فی الحال یہاں سے کہیں اور جانے والی ہوں۔ جب وہاں پہنچ کر اپنا پتہ دوں گی تب بھیجنا شروع کر دینا۔ اب بہت رات آئی ہے۔ آپ

آرام فرمائیں۔

قمر: (مسکراتے ہوئے) اپنے گیسٹ روم میں جگہ دیں گی یا آدھی رات میں جانے کا حکم ہے۔

زہرہ: بھائی جان آپ کا اپنا گھر ہے جیسی آپ کی رائے۔

قمر: (کھڑے ہو کر) لو جاتا ہی ہوں۔

زہرہ: ٹھہریئے گاڑی تیار کرادوں۔ آیا جاؤ کو چین سے کہو جلدی فٹن تیار کرے۔ آپ کا پشاور میں کب تک قیام ہے؟

قمر: مجھے دس دن کی اجازت ملی تھی۔ چار دن ہوئے یہاں آئے چار دن آنے جانے کے سفر میں لگیں گے۔ دو دن یہاں اور ہوں۔

زہرہ: کل بچے کی سالگرہ ہے۔ آپ ضرور تشریف لائیں ایک معمولی سی پارٹی ہو گی۔

قمر: میں کل دس بجے تک یہیں اُٹھ آؤنگا۔ صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ ہی گذر جائیں۔

زہرہ: مہربانی۔ مجھے بے انتہا خوشی ہو گی کہ اس عاجزہ کو آپ نے یہ افتخار بخشا۔

آیا نے اطلاع دی کہ "فٹن تیار ہے۔" زہرہ اپنے معزز مہمان کو سوار کرآئیں۔ دوسرے دن دس بجے نواب صاحب معہ اسباب کے "روز کاٹج" تشریف لے آئے۔ ۴ بجے سالگرہ کی خوشی میں "ٹی پارٹی" تھی۔ ہندو مسلمان عیسائی ملا کر سب بیس پچیس خواتین تھیں۔ ایک میز پر ننھے بچے کے تحائف جمع تھے جو اُن کی دوست لیڈیز لائی تھیں۔ سب سے زیادہ اور قیمتی چیزیں اُس کے چچا نواب قمر الزمان صاحب کی طرف سے تھیں۔ کچھ کپڑے، سوٹ، ٹوپیاں، کھلونے ملا کر کوئی دو سو روپیہ کا سامان تھا۔ ایک میز صرف انہی کے تحفوں سے بھری تھی۔ دو گھنٹہ نہایت خوشی سے کھانے پینے، باجے، گانے میں گذر گئے۔ چھ بجے سب مہمان رخصت ہو گئیں۔ بچہ بھی اپنے چچا کی گود میں سو گیا اور وہ دونوں سٹنگ روم میں آبیٹھیں۔ بجلی کی روشنی سے کمرہ بقعہ نور ہو رہا تھا۔ ثریا جبین اس وقت کاسنی چمکدار ریشمی ساڑی میں پری معلوم ہو رہی تھیں۔ زیورات میں سے صرف گلے میں ایک سنہری زنجیر اور ہاتھ میں ایک

انگشتری تھی۔قمرالزمان نے اپنی جیب میں سے دو مخملی کیس نکال کر میز پر کھولے۔ایک میں سے یاقوت اور موتی کا گلوبند نکلا اور دوسرے میں سے دو اسپرنگ دار جڑاؤ پوڑیاں جب قمرالزمان وہ چوڑیاں ثریا کے نازک ہاتھوں میں پہنانے لگے تو وہ بولیں۔

زہرہ: اوہو آپ نے اس قدر تکلیف کیوں کی یہ تو بے موقعہ ہے۔

قمر: واہ بے موقعہ کیوں ہوتا،ہم ہندوستانی ہیں میرے ہاں کا تو یہی دستور ہے کہ جب بچے کی سالگرہ، بسم اللہ ہو یا کوئی خوشی کی تقریب ہو تو اس کی ماں کو بھی تحفے دیے جاتے ہیں۔

زہرہ: اس قدر قیمتی؟

قمر: یہ اپنی اپنی حیثیت پر منحصر ہے۔کیا میں اس حقیر تحفہ کے لائق بھی نہیں۔

اس کے بعد انہوں نے وہ سرخ جگمگاتا گلوبند اپنے ہاتھ سے ثریا جبین کے باندھا اور ایک نیچی سی آہ سرد بھر کر خاموش ہو رہے۔

زہرہ: میں اُسی کو زیادہ سمجھ رہی تھی آپ نے ایک اور چیز نکالی۔

قمر: ثریا یہ تو بہت عرصہ سے تمہاری امانت میرے پاس رکھی تھی۔خدا کا شکر ہے آج آپ کے سپرد کردی۔

زہرہ: میری امانت کیسی؟

قمر: ثریا یہ دریافت کر کے اس خوشی کے وقت میں کسی المناک وقت کی یاد نہ دلاؤ۔

زہرہ: نہیں میں ضرور پوچھوں گی۔

قمر: ضرور سنو گی؟ اچھا تمہیں یاد ہے آج سے شاید تین سال قبل جب کہ تمہیں کسی کے فریب محبت نے تباہ نہیں کیا تھا۔میں علی گڑھ سے آیا ہوا تھا ایک دن شام کے وقت آپ کے ہاں آپ کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔میری شفیق پھوپھی صاحبہ بھی موجود تھیں کہ ایک جوہری آنکلا اور اُس نے زیورات دکھانے شروع کیے۔آپ نے چند انگوٹھیاں اور بروچ پسند کیے۔جو پھوپھی جان نے خرید دیے تھے پھر آپ نے ایک گلوبند دیکھ کر بہت ہی پسند کیا اور قیمت دریافت کی۔جوہری نے تین ہزار بتائی۔پھوپھی صاحبہ ڈیڑھ ہزار لگاتی تھیں۔جوہری منظور نہیں کرتا تھا۔آپ کو بے انتہا پسند آیا تھا۔خیر۔گلوبند واپس کر دیا گیا اور

جوہری اُٹھ گیا۔ چلتے وقت میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے ہاں بھی جایئے۔ چنانچہ دوسرے دن وہ گیا اور میں نے یہ گلوبند خرید کر رکھ لیا۔

زہرہ: کس قیمت پر؟

قمر: آہ ثریا قیمت پوچھتی ہو یہ نہیں پوچھتیں کہ کس اُمید پر؟

زہرہ: پیارے بھائی یہ کیا پوچھوں میں سخت شرمندہ ہوں اور یہ ندامت میری جان لے گی جیسے کہ سخت غموں نے میری دادی کی۔

قمر: (بچشم تر) خدا نہ کرے۔ جانے دو اس ذکر ہی کو۔

زہرہ: اس وقت سفر میں یہ آپ کے پاس کیسے تھا۔ اب تو اس کی حق دار بھی آ رہی تھی اُسی خوش نصیب کو پہنا دیتے۔

قمر: ساتھ تو اسی لیے لایا کہ اب اس امانت دل سوز کے علیحدہ کرنے کا وقت آ گیا تھا کہ اسلامیہ کالج پشاور کے چندے میں دے دوں گا۔ وہ خدا کارساز و کریم ہے کو کسی طرح اور کسی وقت میں سہی اُس نے جس کا تھا اُس کو پہنچا دیا۔

زہرہ: (روتے ہوئے) آہ اس گلوبند کی تو بڑی دل سوز ہسٹری نکلی کاش اس طرح اس وقت میں نہ پہنایا ہوتا۔ ہائے آپ کی حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی اور خاموشی نے مجھ کم سمجھ کو تباہ کر ڈالا۔ میں کمبخت اِس خاموش محبت کو کس طرح سمجھ سکتی تھی۔ کاش کبھی تو کچھ منہ سے بھی نکالا ہوتا۔

قمر: ۔ جو رکھتے عشق صادق ہیں وہ کب فریاد کرتے ہیں؟ ثریا پیاری جو بادل زور سے گرجا کرتے ہیں وہی برسا نہیں کرتے۔ اچھا خیر ہو گیا جو ہو گیا، یہی قسمت کا لکھا تھا (ثریا کی انگلی سے انگشتری اُتارتے ہوئے) یہ بچہ کی سالگرہ کی یادگار میں تم ہم کو نشانی دے دو۔

زہرہ: یہ انگوٹھی اور انگوٹھی والی آپ پر تصدق ہو جائے۔ اگر میری ہوتی تو عذر نہ تھا۔ یہ اسی جفا کار بدعہد میرے قاتل کی نشانی ہے۔

قمر: (گلے کی زنجیر چھو کر) اچھا یہی چین مرحمت ہو۔ میری گھڑی اس میں رہے گی اور یہ گلو گیر رہے گی۔

زہرہ: یہ بھی اسی بے وفا کی دی ہوئی ہے۔

قمر: اس میں گھڑی ہے؟

زہرہ: (چھوٹی سی تصویر دکھا کر) نہیں یہ جلاد کی شبیہ ہے۔

قمر: او وفادار لڑکی آفرین ہے اب میں آپ سے کوئی چیز نشانی نہ مانگوں گا۔ ثابت ہوگیا کہ آپ کی ہر ایک چیز اُسی ہی خوش نصیب کی ہے۔

زہرہ: افسوس آج میں اس قدر نادار ہوں کہ آپ کی ذرا سی خواہش پوری نہیں کرسکتی۔

قمر: واقعی ثریا اب تمہارے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ دل و جان اور ایمان سب کچھ تو وہ لے گیا۔

زہرہ: خیال تو باقی ہے۔

قمر: تصور تو اُسی کا ہے۔

زہرہ: اب کسی کا تصور نہیں زندگی کے دن پورے کرنے ہیں۔

اس دفعہ دو دن ٹھہر کر قمرالزمان واپس لکھنؤ گئے اور اسی ہفتہ میں ان کی شادی ہوگئی۔ انہوں نے کئی خط ثریا کے نام بھیجے لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ سو روپیہ بچے کے نام بھیجا تو واپس آ گیا۔ شادی کے دو مہینہ بعد خود پشاور پہنچے۔ مس جیکسن صاحب ملیں۔ افسوس اس نے یہ اندوہناک خبر سنی کہ ''تین ہفتہ گذرے زہرہ بیگم کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ایک ہفتہ بعد اُن کا خط آیا تھا کہ اُن کے بچے نے انتقال کیا۔ ہم اسی رنج میں تھے کہ پرسوں ایک ڈاکٹر کی طرف سے یہ تار ملا کہ ''بعارضہ پلیگ زہرہ نے بھی انتقال کیا۔'' اتنا کہہ مس جیکسن نے وہ تار لا کر قمرالزمان کے ہاتھ میں دے دیا۔ مس صاحب تو تین دن سے رو رہی تھیں۔ آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اس وقت قمر نے تار دیکھا اور اُن کی بھی آنکھوں سے دریا اُبل پڑا۔ دونوں صادق دوست خوب روئے۔

دسواں باب

پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

باتھویل لاج شملہ

اگست کی درمیانی تاریخیں ہیں۔ شملہ پر برسات کا زور ہے۔ آٹھ آٹھ دن سورج نظر نہیں آتا۔ آج کہیں خدا خدا کر کے دن کے دس بجے بادل پھٹا اور دھوپ نکلی تو لوگوں کی عید ہوگئی۔ یورپین لیڈیاں اور بچے جو ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا گھروں میں مقید تھے۔ بے تحاشا نکل پڑے۔ آج مال پر عجیب رونق و چہل پہل تھی۔ دوکاندار بھی بشاش نظر آتے تھے۔ شکار کے شوقین بندوقیں اٹھا جنگلوں کو چلے گئے۔ پنجابی عورتیں جن میں زیادہ تر متوسط درجہ کی ہندو ہی تھیں شلواریں پہنے سلیپر گھسیٹتی ہوئی بازار میں سیریں کرتی نظر آنے لگیں۔ اس وقت ہم ناظرین کو مشوبرے کی طرف ایک سرسبز پہاڑی کا دلکش منظر دکھاتے ہیں۔ یہاں ایک سبز تختہ گھاس پر جہاں سنہری سنہری دھوپ عجیب بہار دے رہی ہے پھول کھلے ہوئے، ہوا کے ہلکے جھونکوں سے جھوم رہے ہیں۔ ایک آڑو کے درخت کے نیچے اپنا رگ بچھائے ایک یورپین حسین لیڈی بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہے۔ قریب ہی اس کی ریشمی چھتری رومال اور بٹوا پڑا ہے۔ وہ مطالعہ اخبار میں اس قدر محو ہے کہ اپنے گردوپیش کی کچھ خبر

نہیں۔ اسی وقت اوپر کی پہاڑی سے سوٹ ہیٹ پہنے بندوق اٹھائے ایک جنٹلمین اترا۔ خدا جانے تھکا ہوا تھا یا اس ملکۂ حسن کو دیکھنا مدنظر تھا وہیں بندوق رکھ دی اور چند قدم کے فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ رومال سے پسینہ خشک کیا۔ عینک اتار کر صاف کی اور سگرٹ سلگا کر پینے لگے مگر اس مجسمہ حسن نزاکت کو ذرا محسوس نہ ہوا کہ کوئی رہ گذر محو نظارہ ہے۔ قریباً ایک گھنٹہ یونہی گذر گیا۔ ہمارے حسن پرست نوجوان شکاری کو یہاں بیٹھے اور نظریں بچا بچا کر صنعت خدا کا نظارہ کرتے آخر دل کو اس پر بھی تسکین نہ ہوئی، اب اس پیکر دلکش سے واقفیت کرنی چاہی تو بلا تکلف اٹھ کر اخبار طلب کیا کہ چونکہ آج صبح چھ بجے سے میں شکار کو نکلا ہوا ہوں آج کا تازہ پرچہ نہیں دیکھا مہربانی سے مجھے دے سکتی ہیں؟ گو وہ لیڈی کچھ مغرور معلوم ہوتی تھی مگر ایک معزز جنٹلمین کا سوال رد نہ کر سکی اور اخبار دے دیا۔ خود ایک چھوٹی سنہری مجلد کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ یہاں اخبار میں دل کس کا لگتا تھا کاغذ کی آڑ میں سے نگاہیں تو اس تصویر پر جمی تھیں۔ چند ہی منٹ بعد پھر کہا۔

شکاری جنٹلمین: اس پرچہ کا ایک لیڈنگ آرٹیکل مجھے بہت پسند ہے۔ اس کو آرام سے گھر پہنچ کر پڑھوں گا۔ کیا مہربانی سے آپ اتنی اجازت دے سکتی ہیں کہ اخبار گھر لے جاؤں اور پڑھنے کے بعد شام تک آپ کو پہنچا دوں؟ مہربانی سے اپنے جائے قیام کا پتہ لکھوا دیجئے۔ (اور جیب سے پاکٹ بک نکال لی)۔

لیڈی: (ترش روئی سے) اگر آپ اخبار لے جانا چاہتے ہیں تو لے جائیے اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں، میں پڑھ چکی ہوں۔ اور کھڑی ہوگئی۔ چھوٹا سا خوبصورت رگ تہہ کر کے ہاتھ میں لے لیا۔ چھتری لگائی اور نیچے کی سڑک پر چل دی۔ اتفاق سے جلدی میں اپنا رومال یہیں پڑا بھول گئی جو ہمارے حواس باختہ جنٹلمین نے بصد شکر اُٹھا لیا کہ ہم کلامی کا ایک اور ذریعہ ملا اور تیز قدمی سے اس کے پیچھے جا کر نہایت ادب سے پیش کرتے ہوئے پھر کہا: ”آپ یہ بھول آئی تھیں لیجئے اور مہربانی سے اپنی کوٹھی کا پتہ بتا دیجئے کہ اخبار واپس کر سکوں۔“

لیڈی: (شکریہ ادا کر کے) مجھے اخبار کی تو کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر آپ میرے مکان کا پتہ معلوم کرنا ہی چاہتے ہیں تو بتائے دیتی ہوں میں ”نرسنگ ہوم“

میں رہتی ہوں۔

جنٹلمین: (خوشی سے اُچھل کر) اچھا نرسنگ ہوم تو ہمارے بہت ہی قریب ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا "باتھویل لاج" میرا مکان ہے۔ اچھا ہوا آپ سے شناسائی ہوگئی۔ مجھے ایک قابل نرس کی ضرورت ہے۔ آپ کی مدد سے اچھی ملے گی۔

لیڈی: میری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کسی وقت "نرسنگ ہوم" تشریف لاکر لیڈی سپرنٹنڈنٹ مس برنٹ سے ملئے وہ حسبِ پسند نرس دے دیں گی۔

جنٹلمین: بہت اچھا تو آج ہی چار بجے آؤں گا۔ آپ کی تو مس برنٹ سے دوستی ہوگی۔ آپ ہی تعارف کرادینا۔

لیڈی: دوستی کیا وہ ہماری افسر ہیں۔ میں نے انہیں کے ہاں نرسنگ سیکھی ہے۔

جنٹلمین: (دل خوشی سے لبریز ہوگیا) بہت خوب بہت خوب۔ اس خبر سے اور بھی خوشی ہوئی۔ اچھا میں چار بجے حاضر ہوں گا۔

چنانچہ اسے قرار دلاتے کے بعد صاحب بہادر خوب اعلیٰ سا سوٹ پہن کر ٹھیک چار بجے نرسنگ ہوم پہنچے، کارڈ بھیجا اور اس حسین نرس کی توسط سے بوڑھی مس برنٹ سے ملے اور باتوں باتوں میں یہ پتہ چلا کر کہ ان کی مطلوبہ منظور نظر نرس بھی کسی اچھی نوکری کی متلاشی ہے اور مس برنٹ صاحبہ کو اس کا بہت خیال ہے۔ انہوں نے دوسو روپیہ ماہوار پر وہی لیڈی پسند کی اور پہلی تاریخ سے کام پر حاضر ہونا طے پایا۔ آج سے ابھی بارہ دن باقی تھے کیوں کہ اگست کی اٹھارویں تھی مگر صاحب بہادر کو یہ بارہ روز کاٹنے بارہ برس تھے۔ صاحب بہادر خود حیران تھے کہ میرے دل کو کیا ہوگیا ہے، مجھے تو اب حسن وعشق سے سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ بے شک وہ حسین ہے لیکن میری بیوی سے زیادہ نہیں۔ اس وقت تک ایک سے ایک زیادہ حسین میری نظر سے گذر چکی ہیں مگر کبھی دل پر اثر نہیں ہوا۔ پری وش ان یورپ نے کس کس طرح مجھ پر جادو ڈالے مگر میں کسی کی سحر طرازی میں نہ پھنسا۔ یہ اب مجھے کیا ہوگیا اس مغرور عورت نے تو میری طرف توجہ بھی نہیں کیمگر میرا دل ہے کہ اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ میرا دل تو مردہ ہو چکا تھا آج میں پھر اس کوچۂ عشق ومحبت کی طرف گامزن ہوں۔ میرے اللہ مجھے اس مصیبتِ عظیم سے بچاؤ مگر اب تو بچنا ناممکن ہوگا کیوں

کہ وہ میرے گھر میں رہے گی۔ اُف! کس قدر مصیبت کا سامنا ہوگا۔ میری بیوی کی موجودگی میں وہ اسی گھر میں رہے گی بیچاری بیوی پر کیا گذرے گی۔ خیر کچھ بھی ہو اس کے بغیر زندگی دُشوار ہے۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے گھر آئے، چھ بج چکے تھے۔ اس شاندار کوٹھی یا تھویل لاج کے شیشے کے برآمدے میں مخملی آرام کرسی پر ان کی حوروش بیگم بیٹھی ان کا انتظار کررہی تھیں۔ سامنے کا دریچہ کھلا تھا۔ جہاں سے وہ اپنے بچوں کو ٹینس کورٹ میں کھیلتے دیکھ رہی تھیں کہ صاحب بہادر تیز رفتار سے اندر آئے ٹوپی اتار کر پھینکی اور چھوٹی کرسی قریب کر کے بیٹھ گئے اور کہا۔

صاحب بہادر: لوجی آج یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ تمہارے بچوں کے لئے ہم نے گورنس منتخب کرلی اور خوبی یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی نرس بھی ہے، ایف اے تک تعلیم پائی ہے۔

بیگم: یورپین ہے یا دیسی؟

صاحب بہادر: ابھی کچھ معلوم نہیں رنگ تو بہت صاف ہے غالباً یورپین ہی ہوگی۔

بیگم: گر یورپین نہیں یوریشین ہی ہوگی۔ عمر کیا ہے؟

صاحب بہادر: میرے خیال میں تو مشکل سے پچیس سال کی ہوگی۔ آپ دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ ایسی حسین بیگم کی پیشِ خدمت بھی حسین ہی ہونی چاہئے تھی مگر ہیں ذرا آن بان کی، خودداری سے رہیں گی۔ اوّل تو انہوں نے یہ وعدہ لے لیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے ملنے جایا کریں گی اور ان کے چند دوست گھر پر بھی آیا کریں گی اور یہ کہ اتوار کا دن اور رات گذارنے کے لیے ان کا ایک کم عمر بھانجہ ہے وہ اسکول سے آکر یہاں ہمارے ہاں رہا کرے گا۔ ہم نے سب منظور کیا ہے۔ تمہاری اچھی مصاحب ہوگی۔ کمبخت اُردو میں بھی خاصی قابلیت رکھتی ہے لکھتا پڑھنا بخوبی کرسکتی ہے۔

بیگم: کس دن سے کام پر حاضر ہوگی۔

صاحب بہادر: یکم ستمبر سے آجائے گی مگر ہم کہہ آئے ہیں کہ اتوار آئندہ کو آپ کی ملاقات کو آئے گی۔

یہ ڈیڑھ ہفتہ صاحب بہادر نے بڑی مشکل سے گذارا دو تین بار اس درمیان میں اس سے جا کر مل آئے۔ آہ بیگم کو کیسا دھوکہ دیا جا رہا تھا۔ یہی ہے مردوں کی انسانیت و محبت آفرین ہے۔ اس ہمت و حوصلہ پر بمشکل یہ تمام دن ختم ہوئے اور یکم ستمبر سے وہ لیڈی صاحبہ باتھویل لاج میں رونق افروز ہو گئیں۔

بیگم صاحبہ نے بڑی خوشی سے اُن کو لیا اور نہایت محبت و قدر سے رکھا۔ صاحب بہادر تو بے انتہا مہربان تھے۔ بیڈروم ڈریسنگ روم باتھ روم ایک شیشہ کا پورا برآمدہ ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ صاحب بہادر کی خاص نظرِ عنایت اور مناسبت سے زیادہ بے تکلفی پر بھی اس نیک ظن بیگم نے ذرا شک وشبہ دل میں نہ آنے دیا کیوں کہ وہ اپنے شوہر کو فرشتہ خصلت انسان سمجھتی تھیں مگر وہ لیڈی ہی متعجب تھیں کہ صاحب کی اس قدر مہربانی کیسی لیکن وہ اس قدر از خود رفتہ ہوئے تھے کہ ذرا کسی مناسب نامناسب امر کا خیال نہ رہا تھا۔ بعض اوقات ان کی زیادہ خاطر داری سے وہ غیور لیڈی دق ہو کر برہم ہو جاتی تھی مگر یہاں وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اتار دے۔

لیجئے ہم ناظرین کی دلچسپی کو ایک دن صبح سے رات کے بارہ بجے تک کا صاحب بہادر کے انصبات اوقات لکھتے ہیں۔

مس جولیا کو یہاں رہتے دو ہفتے گذر چکے ہیں۔ بچے ان سے خوب مانوس ہو گئے ہیں۔ اُن سے زیادہ ان کا باپ مس صاحبہ کا گرویدہ تھا۔ تمام ''باتھویل لاج'' پر جولیا کی حکومت تھی تاہم بعض اوقات وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر رو لیا کرتی تھی جس سے ان کا بڑا لڑکا بہت پریشان ہو جاتا تھا۔ اس درمیان میں دو اتوار اُن کو مس صاحبہ کا بھانجا ٹامس بھی یہاں رہ گیا تھا۔ اُس سے بھی صاحب بہادر کو بہت انسیت ہو گئی تھی۔ مثل اپنے بچوں کے چاہنے لگے تھے۔ مس جولیا جس قدر اپنی قدر و محبت سے ناخوش ہوتی تھی اسی قدر صاحب بہادر کے بچے کے ساتھ محبت سے بے حد شکر گذار تھی۔

آدھا ستمبر بھی گذر گیا ہے۔ بارشوں میں ذرا کمی ہو گئی تھی۔ اکثر سورج نظر آ جاتا تھا۔ آج بھی ایک روشن چمکیلا دن تھا۔ صبح چار ہی بجے صاحب بہادر اپنے بیڈروم سے نکل آئے اور برآمدہ میں ٹہلنے لگے۔ ۵ بجے تو مس جولیا تیار ہو کر ''میٹنی کورٹ'' ٹہلنے کو

آ گئیں۔ جیسے ہی ان کی نظر پڑی پہنچے۔ وہ اس وقت آبی ریشمی فراک اور اوور کوٹ میں تھیں۔ اپنے آقائے نامدار کو آتا دیکھ کر سلام کے لئے بڑھی۔ ''شیک ہینڈ'' ہوا اور صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک بنچ پر لے بیٹھے چونکہ وہ رات کے شبنم سے تر تھا انہوں نے اپنا ریشمی رومال بچھایا اور جولیا سے بیٹھنے کو کہا۔ اس پر وہ ذرا تیور بدل کر بولیں۔

مس جولیا: حضور والا آپ کیا کر رہے ہیں۔ اپنی ایک ادنیٰ ملازمہ کے لیے اس قدر تکلیف زیبا نہیں یہ تو برابر والوں کے لیے ہے۔ آپ اپنے لئے رومال بچھا لیں میں اسی طرح بیٹھ جاؤں گی۔

صاحب بہادر: مس جولیا آپ اپنے کو ادنیٰ کہہ کہہ کر میرا دل نہ دکھائیں۔ بخدا میرے دل میں آپ کی اسی قدر عزت ہے جیسی کہ ایک ہم رتبہ لیڈی کی ہونی چاہئے۔ آہ میرے دو ہفتے کے برتاؤ سے ابھی آپ کو اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ میں آپ کو کس نظر سے دیکھتا ہوں اور بیگم صاحب کس قدر عزت کرتی ہیں۔

جولیا: میں بیگم صاحب کی کمال مہربانی کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں مگر جناب کے اس درجہ عنایات بعض اوقات مجھے سخت تکلیف دے کر نادم کرتی ہیں۔ میں اس موقعہ کی تلاش میں تھی کہ ایک وقت یہ عرض کر سکوں کہ آپ مجھ پر اس قدر مہربانی و محبت کا اظہار نہ کریں۔ یہ نامناسب ہے۔ میں ایک کم عمر لاوارث عورت ہوں جو آپ کے قدموں میں آ پڑی ہوں۔ یہی سمجھ کر کہ ایک معزز گھر میں بسر کر لینا چند دن دُشوار نہ ہوگا مگر آپ کی حد سے بڑھی ہوئی عنایت نامناسب بے تکلفی ناجائز ہے۔ میں یہ کہنے والی تھی کہ آپ رات کے آٹھ بجے کے بعد میرے کمرے میں تشریف نہ لایا کریں گو اپنے بچوں ہی کے دیکھنے کو سہی مگر یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ بیگم صاحب اور بچوں کی انائیں بخوبی نگرانی کر رہی ہیں۔ آیائیں خدمت کو کافی ہیں، آپ یہ زحمت نہ اُٹھائیں۔

صاحب بہادر: (سر جھکا کر) بے شک آپ کا فرمانا بجا ہے مگر میرا گھر میں کوئی بدظن شکی نہیں ہے جس کا خوف ہو۔ بیگم صاحب سمجھدار ہیں اور ان کو مجھ پر کامل بھروسہ ہے۔

جولیا: (مسکرا کر) اُن کو تو کامل بھروسہ ہے مگر آپ کو بھی اپنے اوپر کامل اختیار رکھنا لازمی ہے۔ کم از کم میرے خیال سے۔

صاحب بہادر: (منت سے) عقلمند جولیا میری حالت کا اندازہ کر کے آپ کو مجھ پر اس قدر غصہ زیبا نہیں۔ کہنے کو تو اتنا کہہ دیا مگر مارے خوف کے بیٹھ نہ سکے اور یہاں سے اٹھ کر دور کو ٹہلنے لگے۔ چھ بج گئے تھے اور دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ مس جولیا اپنے کمرے کو چلی گئیں۔ صاحب بہادر بھی ڈرائنگ روم کو گئے۔ سات بجے چائے کے لئے سب (پہلے دستور تھا کہ صبح کی چائے سب اپنے اپنے کمرے میں پیتے تھے مگر اب کوئی آٹھ دن سے صاحب بہادر کی خواہش سے صبح کی چائے بھی یکجا پی جاتی تھی۔) جمع ہوئے۔ یہاں ایک گھنٹہ سے زیادہ لگ گیا۔ آخر صاحب کو نہ اٹھتا دیکھ کر بیگم صاحب اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے بعد گورنس بھی چل دی اور بچے ہواخوری کو گئے۔ مجبور صاحب بہادر بھی دفتر میں جا بیٹھے۔ دس بجے حاضری پر جمع ہوئے۔ وہاں ڈیڑھ گھنٹہ لگا دیا۔ اس کے بعد صاحب مس صاحب کے کمرے میں آئے۔ بارہ بج رہے تھے وہ لیس بنا رہی تھیں۔

صاحب: مس جولیا کوئی ہرج تو نہیں ہم آ گئے (اور بیٹھ گئے)

جولیا: ہرج تو کچھ نہیں مگر صاحب یہ وقت آنے کا بھی نہیں۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔

صاحب: (مسکراتے ہوئے) اگر تکلیف نہ ہو تو یہیں آرام چوکی پر یا صوفے پر آرام کیجئے۔ ہم بھی بیٹھیں گے۔ ابھی بیگم صاحب بھی آتی ہیں۔ چونکہ آپ تنہائی میں میرا بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔ اس وجہ سے بیگم صاحب بھی آئیں گی۔

جولیا: کیا آپ نے ان سے صبح کی گفتگو کہہ دی۔

صاحب بہادر: نہیں تو مگر اتنا ضرور کہا کہ چلو بچوں میں ضرور بیٹھیں۔ انہوں نے منظور کر لیا۔ آج کیا دن ہے ٹامی کب آئے گا۔

جولیا: آج جمعہ ہے پرسوں اتوار ہوگا۔

صاحب: جولیا خدا جانے کیا سبب وہ بچہ ہمیں بالکل اپنے بچوں کے برابر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ بخدا آپ کی خوشامد کو نہیں کہتے۔ ہے بھی بہت خوبصورت۔ ایسی موڈرن شکلیں کم ہوتی ہیں۔

جولیا: وہ بالکل اپنے باپ کی تصویر ہے۔ میری بہن کچھ اس قدر حسین نہ تھی۔ جیسی میں ہوں ایسی وہ تھی مگر ٹامس کا والد بہت ہی خوش شکل شخص تھا۔

صاحب: آپ بہت حسین نہیں۔

جولیا: بدشکل بھی نہیں ہوں حسین بھی نہیں۔ اصل میں حسین ایسی شکلیں کہلاتی جیسی حضور بیگم صاحب۔

صاحب: بے شک بیگم صاحب بھی ہزاروں میں ایک ہیں مگر جولیا تم میں دل کشی و ادائے دل فریبی ان سے بھی سوا ہے۔

جولیا: (منہ پھیر کر) بیگم صاحب ابھی نہیں آئیں۔ چلئے ان کی طرف بیٹھیں۔

صاحب: خفا ہو گئیں۔ دیکھو اس قدر سختی روا نہ رکھو۔ میں آپ کے خوف کے مارے ایک لفظ بھی زبان سے ایسا نہیں نکال سکتا جس کے لئے مجبور ہوں اور جو زبان پر آ آ کر رک جاتے ہیں پھر بھی آپ ناراض ہیں۔ خدا کے لئے ذرا سی بے تکلفی کی اجازت دیں۔ کم از کم اس قدر کہ میں اظہار دل کر سکوں۔

جولیا: (کھڑی ہو کر) حضور والا کسی غریب بیکس عورت کو اپنے زیر سایہ رکھ کر اس قدر ذلیل کرنا مناسب نہیں۔ رحم واجب ہے۔

صاحب: (بچشم نم اٹھ کر اس کے ہاتھ پکڑے) دیکھو جولیا مجھے آپ نے جیسا آوارہ مزاج بدنیت خیال کیا ہے بخدا میں ایسا نہیں ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کرو مجھے ایک شریف نیک نیت انسان سمجھو مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھ کو آپ سے از حد محبت ہے اور خدا جانے کیوں میں اپنے اختیار سے باہر ہو چکا ہوں۔ تاہم میں شریف ہوں سمجھدار ہوں مجھ پر اعتماد کرو۔ وہ بیگم صاحب آ رہی ہیں (دونوں الگ الگ بیٹھ گئے)۔

جولیا: بیگم صاحب کے سامنے مجھ سے انگریزی میں گفتگو نہ کیا کرو۔ ان کو کچھ شبہ ہو سکتا ہے۔ میں بخوبی اُردو جانتی ہوں۔

صاحب: "بہت خوب"۔

بیگم آ گئیں تھوڑی دیر سب بیٹھے تاش کھیلتے رہے پھر اپنے اپنے کمروں میں گئے۔ ۴ بجے سہ پہر کے پھر چائے کے لیے بیگم صاحب کے ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے اور ایک

گھنٹہ وہاں گذر گیا۔ اس کے بعد حسبِ معمول گورنس معہ بچوں اور آیاؤں کے سیر کو گئیں اور صاحب بہادر بھی پھرنے چلنے چلے گئے۔ شام کے سات بجے سب واپس آئے کھانا کھایا۔ ۹ بجے تک ڈرائنگ روم میں شطرنج کھیلی گئی اور ساڑھے نو پھر بیگم صاحبہ بیڈروم میں تشریف لے گئیں۔ محفل درہم و برہم ہوگئی۔ صاحب کا تو اختیار ہوتا تو رات یونہی گذار دیتے مگر مجبوراً اٹھنا پڑا۔ یہاں سے اُٹھ کر بھی وہ گورنس کی طرف جایا کرتے تھے مگر آج رو کے گئے تھے نہ جا سکے۔ دوسرے دن لکھنؤ سے بیگم صاحب کے لینے کو ایک عزیز آ گیا۔ وہاں ان کی بھانجی کے بسم اللہ کی رسم بہت شاندار طریق سے ہونے والی تھی مگر چونکہ لکھنؤ میں گرمی تھی صاحب نے بچوں اور گورنس کو نہ جانے دیا۔ حالانکہ گورنس کا اصرار تھا لکھنؤ کے سیر کرنے کو اور تقریب بسم اللہ دیکھنے کے لئے، مگر نامنظور ہوا۔ اب کیا تھا۔ بیگم کا ذرا سا خوف تھا وہ بھی نہ رہا۔ صاحب بہادر کھل کھیلے۔ جولیا بیچاری پر عجب مشکل بنی تھی۔ اس کا ہمیں علم نہیں کہ وہ صاحب ذیشان کے اس قدر اظہار عشق سے دل میں خوش تھی یا ناخوش۔ بہر حال ظاہراً بہت ہی ناپسند کرتی تھی۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ بیگم صاحبہ اس پر حد درجہ مہربان تھیں اور وہ سمجھتی تھی کہ اس محبت کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ صاحب اس سے شادی کسی طرح نہ کر سکیں گے تو پھر ناجائز محبت بڑھانے سے فائدہ۔

غرض کہ بیگم صاحب کا جانا اس کے لیے مصیبت کا سامنا تھا۔ بارہ بجے کی ٹرین سے بیگم صاحبہ روانہ ہوئیں، چار بجے کے قریب صاحب بہادر کو بخار آ گیا۔ آج مینہ میں بھیگے زیادہ تھے کمرے میں لیٹ رہے۔ چار بجے چاء اپنے ہی کمرے میں منگوائی۔ آیا نے گورنس صاحبہ کو ناسازیِ طبیعت کی خبر دی تو وہ دریافت حال کو ان کے کمرے میں آئی۔ صاحب کو اس وقت پلنگ میں پایا۔ آنکھیں بند تھیں اور لحاف اوڑھا ہوا۔

جولیا: کیا جناب کو حرارت ہوگئی؟ ابھی آیا سے معلوم ہوا ہے۔ میں اس انتظار میں تھی کہ چاء کے لئے حضور طلب کریں گے۔

صاحب: آپ نے کیوں مزاج پرسی کی تکلیف گوارا کی۔ جب آپ میری صحبت پسند نہیں کرتیں تو میں کیوں دق کروں۔ افسوس یہ ہے کہ آج بیگم کے جانے کے بعد طبیعت خراب ہوئی۔ میری تیمارداری کون کرے گا۔ آپ کو مناسب نامناسب سے

ضرورت نہیں۔

گورنس: حضور یہ تو میرا فرض ہے بیگم صاحبہ موجود ہوتیں تب بھی نرسنگ آپ کی خادمہ نرس ہی کرتی اور اب بھی حاضر ہے (جیب سے تھرمامیٹر نکال کر) لیجئے یہ لگالیں ٹمپریچر کا پتہ لگے تو کچھ کروں۔

صاحب بہادر: (بے پرواہی سے) ابھی رہنے دو بخار خود ہی اتر جائے گا۔ آپ کا اس کمرے میں آنا مناسب نہیں۔

جولیا: جناب اس وقت تو میرا فرض عین ہے یہاں پر حاضر رہنا۔ ناراض نہ ہوئیے میرا دل سخت فکرمند ہے۔ خدا آپ کو صحت دے۔

صاحب: آپ کو اور میری فکر۔

نرس: کیا میں حضور کے خیال میں اس قدر نمک حرام ہوں کہ تکلیف کے وقت فکر نہ ہوگی اور پلنگ کے قریب کرسی کر کے بیٹھ گئیں۔ اُن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

صاحب: کاش میری بیماری زیادہ طول کھینچے تاکہ اس سنگدل کی طرف سے ایسی نوازش ہو۔ مشکور ہوں۔

جولیا: (بچشم تر) آہ میں اپنے سچے اور بے لوث دل کا حال کسی طرح بھی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری سچی وفاداری کا آپ کو اس وقت یقین آئے گا جب اگر خدا نے چاہا تو میں آپ کی اور آپ کے بیوی بچوں کی خدمت میں تمام عمر اس گھر میں بسر کر کے ختم ہو جاؤں گی۔ ابھی منہ سے کہنا فضول ہے۔

صاحب: (نرس کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر) خدا ایسا ہی کرے کہ آپ کی میری عمریں یکجا بسر ہوں مگر ذرا نرمی سے کام لیں۔ اس قدر سختی اور بے رحمی سے میں مرا جاتا ہوں بخدا میرا دل خون ہوا جاتا ہے۔

نرس: آخر کیا نرمی کروں؟ (رو کر) میرے مہربان آقا میں کس طرح پیش آؤں؟

(صاحب اٹھ کر نرس کا سر سینہ سے لگاتے ہوئے) میری جان سے عزیز جولیا بس اسی قدر صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ چند گھنٹے مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کر لیا کرو میرے بعض محبت کے الفاظ سے برہم نہ ہوا کرو۔ مجھے سچا اور نیک نیت چاہنے والا سمجھ کر

غیریت کا برتاؤ نہ کرو۔ ممکن ہے اتنی عنایت سے میرا دل سکون پالے اور میں اس دیوانگی سے بچوں آج کل میرے حواس بجا نہیں ہیں۔ جولیا۔ تم کو نہیں معلوم میں نے اوّل ہی نظر میں اس پہاڑی پر جہاں اخبار پڑھا تھا اپنا دل آپ کے قدموں پر نثار کر دیا۔ آہ مجھ میں تم سے غیریت رکھ کر زندہ رہنے کی تاب نہیں ہے للہ مجھ پر رحم کرو۔

جولیا: حضور میں آپ کی تابعدار خدمت گذار ہوں۔ آپ کی اس قدر محبت کی تہہ دل سے قدر دان و شکر گذار ہوں مگر ذرا حالات جانبین پر بھی غور کریں۔ آپ شادی شدہ صاحبِ اولاد ہیں۔ میں ایک لاوارث جوان عورت ہوں۔ جب ہماری دائمی رفاقت ہر صورت ناممکن ہے تو پھر آپ کی بے تکلفی بڑھانی سراسر غلطی ہوگی۔ پس انہی اسباب پر غور کر کے میں آپ سے احتراز کرتی رہی۔

صاحب بہادر: یہ سب درست مگر میں اپنے بے اختیار دل کو کس طرح سمجھاؤں۔ ذرا مجھ کو اس بات کا یقین ہو لے کہ آپ کو بھی میری محبت اور میرا خیال ہے تو میں آپ کو اپنی دردناک داستان ایک دن سناؤں گا تو پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ میں کس قدر حسرت نصیب شخص ہوں۔ میں نے تو دنیا ہی ترک کر دی ہوتی اگر میرے سر پر ان چند اہم فرائض کا بارِ گراں نہ دھر دیا گیا ہوتا تاہم میں عشق و محبت کی راہوں سے بہت دور ہو گیا تھا۔ آہ شامتِ اعمال یا شاید خوش نصیبی ہو جائے کہ اُس روز اپنی محبوبہ گم شدہ کی نظر پڑ گئی اور ہوش و حواس پھر کھو بیٹھا۔

جولیا: کیا آپ کی کوئی معشوقہ میری ہی ہم شبیہہ تھی؟

صاحب بہادر: پیاری جولیا یہ قصہ طولانی ہے۔ کسی وقت سناؤں گا۔

(اور آنکھیں بند کر کے تکیہ پر سر رکھ لیا) جولیا نے ٹمپریچر لیا تو حرارت سو ڈگری سے بھی کم نکلی۔ اس نے فوراً کونین کھلا دی۔ اب ۶ بج رہے تھے۔ بادل بھی گھر آیا تھا جس سے کمرے میں تاریکی پھیل گئی تھی۔ جولیا نے لیمپ روشن کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

گیارھواں باب

راہ پر لائے التجا کرکے
کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

ہمارے صاحب بہادر مراد آباد میں ڈپٹی کمشنر ہیں۔ تین ماہ کی رخصت گذارنے شملہ تشریف لائے تھے ۳۰ ستمبر کو ان کی رخصت ختم ہونے والی تھی اور یہ واپس جارہے تھے۔ بیگم صاحبہ تو پہلے ہی جاچکی تھیں گورنس اور بچے ان کے ساتھ جارہے تھے۔ دوپہر کی گاڑی سے روانہ ہوکر شام کو کالکا پہنچے اور ایک دن یہاں کے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ تمام ملازمین اور آیائیں اسی شب روانہ کردی گئیں۔ صرف آپ اور گورنس تینوں بچے کی اتنا ٹھہر گئے۔ ۹ بجنے سے پہلے ملے، کھانے سے فارغ ہوکر بچوں کو سلادیا اور دونوں باغیچہ میں آبیٹھے۔ بہت دن بعد آسمان نظر آیا اور کھلا میدان۔ چاندنی پھیل رہی تھی قریب ہی گلاب اور چنبیلی کے تختے کھلے ہوئے تھے۔ جن کی خوشبو سے معطر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے سفر کی تکان سے کسلمند طبیعتوں کے لئے فرحت بخش تھے۔ حسین مس جولیا سفید ریشمی ڈریس میں پری معلوم ہوتی تھی اور ان کے گورے گورے برہنہ سینہ پر سفید موتیوں کا ست لڑا عجب بہار دے رہا تھا۔ صاحب بہادر نے بھی کالکا پہنچتے ہی گرم کپڑے اتار کر بادامی سلک کا سوٹ پہن لیا تھا۔ سیاہ بال پیشانی پر چمک رہے تھے۔ گو ان کی عمر کا یہ پینتیسواں سال گذر رہا تھا مگر اس وقت پچیس برس کے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ دونوں ایک ہی بنچ پر کشن لگائے بیٹھے تھے۔ مس صاحبہ گلاب کے پھولوں سے کھیل رہی تھیں۔ صاحب بہادر نے کہا ”اس

وقت تو کچھ گانا سننے کو دل چاہتا ہے۔" جولیا نے ایک انگریزی گیت گایا اور پھر صاحب سے خواہش کی" آپ ہمیں کوئی اُردو غزل سنائیں۔" ان کو موسیقی میں کمال حاصل تھا اور وہ راگ کے بے انتہا شوقین تھے اور اسی لیے وہ سفر میں بھی وائلن اور چھوٹا ہارمونیم ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گھنٹی بجائی خدمت گار حاضر ہوا اور چھوٹا ہارمونیم منگا کر گانا شروع کیا۔

شب فرقت میں یاد اس بے خبر کی بار بار آئی
بھولانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی
الٰہی رنگ یہ کب تک رہے گا ہجر جاناں میں
جو روز بے دلی گذرا تو شامِ انتظار آئی
(دوبارہ گورنس کی طرف دیکھ کر)
الٰہی رنگ یہ کب تک رہے گا ہجر جاناں میں
جو روز بے دلی گذرا تو شامِ انتظار آئی
تری محفل میں ہم آئے مگر بحالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے
ہوس نے کامِ جاں پایا تمنا شرمسار آئی

باجہ بند کیا اور کھڑے ہو کر ٹہلنے لگے۔ جولیا وفادار جولیا بھی ساتھ کھڑی ہو گئی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر پھرنے لگی۔ دیکھا کہ مہربان آقا اس وقت بہت مضطرب الحال ہے۔ بار بار رومال سے آنکھیں خشک کر رہا ہے۔ اس کی بھی اُسے خبر نہیں کہ وہ میرے ساتھ ٹہل رہی ہے دل بہلانے کے لئے گفتگو شروع کر دی۔

جولیا: آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ یہ وقت تو بہت ہی خوش گوار فرحت بخش ہے۔ دیکھئے چاند کی روشنی کیسی صاف شفاف کھلی ہے جو عرصہ سے ہم نے نہ دیکھی تھی۔ اس اچھے وقت سے لطف اُٹھانا چاہئے۔ پھر خدا جانے اتنا خوش منظر موقعہ کب ہاتھ آئے۔

صاحب: ہاں ہاں میں دیکھ رہا ہوں بے شک آج چاندنی خوب نکھری ہوئی

پھیلی ہے، اچھا چلو کمرے میں۔

جولیا: کیا آپ آرام فرمائیں گے؟ ابھی تو ۱۱ ہی بجے ہیں۔ جو تمام تمام رات جاگ کر گذارنے کا عادی ہو، اسے ابھی سے کیا جلدی۔

صاحب: نہیں کمرے میں بیٹھیں گے اور اب ہم تم سے کوئی اُردو گانا سنیں گے۔ اُس دن میں نے دیکھا آپ بیگم صاحبہ کو ہارمونیم پر غالب کی فارسی غزل سنا رہی تھیں۔ میں تو اُردو ہی سمجھتا تھا آپ نے تو فارسی میں بھی خوب قابلیت حاصل کی ہے۔

جولیا: اچھا چلئے۔ میں حاضر ہوں مگر کمرے میں تو گرمی ہوگی پنکھے کی ہوا سے بھی وہ راحت حاصل نہیں ہو سکتی جو اس جگہ کی قدرتی ٹھنڈ ہے۔

صاحب: "اچھا یہیں سہی۔"

(دونوں کرسیوں پر آبیٹھے اور گورنس صاحبہ نے یہ غزل باجہ پر گائی ۔

کیسے چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں
دل کی تپش کو کیا کروں سوزِ جگر کو کیا کروں
ان کی جھلک دکھا تو دی دل کی ہوس مٹا تو دی
پر یہ کہوں کہ شوق کی بار دگر کو کیا کروں

(یہ مصرعہ سن کر غمگین دل صاحب نے اپنی محبت شعار گورنس کے زانو پر سر رکھ دیا)

حال میر تھا جب دگر تب نہ ہوئی تمہیں خبر
بعد مرے ہوا اثر اب میں اثر کو کیا کروں
غم کا نہ دل میں ہو گذر وصل کی شب ہو یوں بسر
سب یہ قبول ہے مگر خوف سحر کو کیا کروں

صاحب: (سر اُٹھا کر) پیاری جولیا آپ کا یہ خوف ہی تو میری جان لے گا۔ بس اب مجھ سے زیادہ صبر نہیں ہو سکتا۔ بیگم کو لکھنؤ سے نہیں بلایا جائے گا۔ آپ سے میں اس وقت ہمیشہ کی رفاقت کا اقرار کرا کر چھوڑوں گا اور مرادآباد پہنچ کر انشاءاللہ باقاعدہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں گے۔ جولیا نے یہ سن کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور خاموش ہوگئی۔

صاحب: (اُن کا سر اُٹھا کر) کیوں کیا کچھ تامل ہے؟ یقین جانو اگر تم نے اس وقت مجھ سے بے وفائی کی تو میں زندہ نہ رہوں گا۔

کب تک تری جدائی کے صدمے اُٹھائے دل
ہر روز کے ستم کی کہاں تاب لائے دل

جولیا: (ہاتھ جوڑ کر) میرے سب سے زیادہ پیارے کلکٹر صاحب اگر آپ میری جان طلب کریں تو حاضر ہے لیکن ایسی مہربان اور قابل بیگم صاحبہ پر مجھ سے یہ ظلم نہ ہوگا۔ سخت نمک حرامی ہے اور آپ بھی گناہگار ٹھہریں گے کیوں کہ آپ کی بیوی حسین، تعلیم یافتہ اور صاحب اولاد بھی ہے۔ کسی طرح آپ کو دوسری شادی کی ضرورت نہیں۔

صاحب: اب ان باتوں کو نہ سوچو تمہیں معلوم ہے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شادی سے قبل مجھے ایک اور سے محبت تھی بلکہ وہ بیوی بھی بن چکی تھی۔ یہ شادی میری زبردستی کی گئی میں نے اپنے دل پر جبر کرکے اپنی ادائیگی فرض کے خیال سے اس بیگم کو خوش رکھا لیکن میرا دل دس سال ہو جائیں گے اُس دن سے آج تک اپنی ثریا ہی کے خیال میں محو ہے۔ یہ دس سالہ جدائی کا زمانہ میں نے نہایت غم والم سے بسر کیا ہے۔ اس کی یاد ایک منٹ کو میرے دل سے نہیں ہٹتی۔

جولیا: (مسکراتے ہوئے) یہ عجیب دل ہے کہ جس میں ثریا کی تصویر بھی ٹنگی ہوئی ہے اور اب اس خادمہ کے لئے بھی جگہ نکل آئی۔

صاحب: ہاں اس پر تو میں خود بھی متحیر ہوں مگر پھر یہی سمجھتا ہوں کہ تم ان کی ہم شکل ہو یہی باعث کشش ہے؟

جولیا: کیا میری شکل دراصل آپ کی ثریا سے ملتی ہے؟

صاحب: بالکل بالکل فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کو اب پچیسواں سال ہے اور پیاری ثریا جس وقت مجھ سے جدا ہوئی تھی پندرھویں برس میں تھیں۔ بس میں خیال کرتا ہوں کہ جس وقت آپ بھی اس عمر کی ہوں گی بالکل ویسی ہی ہوں گی۔

جولیا: اوہو پندرھویں ہی سال وہ ایک بچہ کی ماں بننے والی تھی؟

صاحب: ہاں جولیا۔ ہماری محبت تو چودھویں سال سے شروع ہوگئی تھی جب

کہ وہ انٹرنس کا امتحان دے چکی تھی۔ پندرھویں سال ہم نے شادی بھی کر لی ہندوستانی لڑکی جلدی جوان ہوتی ہے۔

جولیا: کلکٹر صاحب فرض کیجیے اگر آپ کی ثریا زندہ ہو اور کہیں سے آجائے تو آپ اصل سے محبت کریں گے یا نقل سے؟

صاحب: جولیا برا نہ ماننا میں سچ کہے دیتا ہوں اگر میری ثریا کہیں سے زندہ مل جائے تو پھر مجھے اصل کے آگے نقل کا کیا کرنا ہے۔

جولیا: آفرین ہے کلکٹر صاحب میں دل سے قدر دان ہوں آپ کی اس حقیقی و صادق محبت کی اگر اس وقت آپ میری رواداری کو اُن سے زیادہ میری محبت بتاتے تو مجھے خوشی نہ ہوتی مگر اس صداقت و ثابت قدمی نے مجھے آپ کا پہلے سے زیادہ فریفتہ و جاں نثار بنا دیا۔ اچھا میں آپ کے ہی قدموں میں گذار دینے کا وعدہ کرتی ہوں مگر اس سے بیگم کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے۔

صاحب: تو کیا آپ ظاہراً شادی پر آمادہ نہیں ہیں اور خفیہ تعلقات محبت قائم رکھیں گی؟

جولیا: میں ہر طرح آپ کی تابع فرمان ہوں لیکن شادی نہ کروں گی اس سے بیگم کو بہت رنج پہنچے گا۔

صاحب: آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں آپ ایسی پاک باز نیک دل لیڈی سے یہ کیوں کر توقع کروں؟

جولیا: میرے ان الفاظ کا مطلب خدا جانے آپ کیا سمجھے۔ میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ایک بے انتہا چاہنے والی خادمہ کی طرح ایک حد تک بے تکلف رہوں گی۔ گو زمانہ اتنے پر بھی لعنت کرے گا لیکن میں آپ ایسے سچے چاہنے والے قدر دان کے لیے سب کچھ برداشت کر لوں گی مگر بیگم ایسی اچھی بیوی کی موجودگی میں بیوی نہ بنوں گی اور آپ کو اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ صاحب اولاد بھی ہیں۔

صاحب: لیکن یہ تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کے بیگم لکھنؤ سے نہ بلائی جائیں گی انہیں خوش رکھنے کی اب مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ انہیں یہاں آپ کی موجودگی میں

بلا کر زیادہ رنج دینا ہے اور زمانہ کی بدگمانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تا کہ پھر آزادانہ آپ کے ساتھ رہ سکوں۔

جولیا: (کچھ سوچ کر) بہت اچھا جیسی آپ کی رائے ہو میں تیار ہوں۔

صاحب: (گلے میں باہیں ڈال کر) خدا خوش رکھے میری جولیا مجھے زندہ کر لیا۔ بس اب مراد آباد پہنچتے ہی میرے دل کی ملکہ جو گورنس کی حیثیت میں ہے میرے گھر کی بھی ملکہ بن کر اب حکمران ہوگی۔ اس قول و قرار کے بعد دونوں اپنے اپنے بیڈ روم میں گئے۔

بارہواں باب

دلِ بیتاب نے آخر کو نہ پیچھا چھوڑا
بعد مدت کے انہیں ڈھونڈ نکالا کیسا

کلکٹر صاحب کو مراد آباد آئے دوسرا ہفتہ ہے مس جولیا ان کی گورنس چار روز کی چھٹی لے کر آگرہ گئی ہوئی ہے کیوں کہ جمعہ آئندہ کو ان کی شادی قرار پائی ہے۔ انہیں کچھ اپنا سامان کرنا ہے۔

رات کے نو بجے ہیں کلکٹر صاحب کھانا کھا چکے ہیں اور لائبریری کے سامنے والے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے اخبار دیکھ رہے ہیں کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ اسٹیشن سے گاڑی آئی ہے اور کوئی آپ کی رشتہ دار بیگم تشریف لائی ہیں۔

کلکٹر صاحب: اوہو! کیا بیگم صاحبہ تو نہیں تشریف لائیں؟

خدمت گار: نہیں حضور یہ تو کوئی بمبئی سے آرہی ہیں۔ ساتھ ایک صاجزادے بھی ہیں۔

کلکٹر صاحب: ان کے ساتھ کوئی عزیز یا ملازم بھی ہے؟

خدمت گار: حضور ایک آیا ہے جس نے گاڑی سے اُتر کر مجھ سے کہا کہ ”کلکٹر صاحب کو اطلاع کردو کہ بیگم صاحب کو اتروالیں۔“

یہ سن کر صاحب بہادر گاڑی کے پاس تشریف لائے۔ آیا نے دروازہ کھولا تو پہلے خوبصورت لڑکے نے جو ریشمی اچکن اور سنہری کامدار ٹوپی پہن رہا تھا گاڑی سے اتر کر

نہایت ادب سے سلام کیا۔ اس کے بعد ایک پری جمال نازنین جو پارسی لباس میں تھی گاڑی سے باہر آئی اور کلکٹر صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"مجھے آپ کے یہاں تشریف لانے سے بے انتہا خوشی ہوئی لیکن افسوس کہ میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ مہربانی سے خود ہی انٹروڈیوس ہوں۔"

نازنین: "اندر تشریف لے چلئے میں سب عرض کیے دیتی ہوں۔"

چنانچہ کلکٹر صاحب اپنی مہمان کو ڈرائنگ روم میں لائے۔ آیا نے برقی پنکھا چلا دیا۔

کلکٹر صاحب: اچھا تو کھانا منگایا جائے آپ منہ ہاتھ دھو لیجیے۔

نازنین: مہربانی۔ ہم کھانا کھا چکے ہیں مہربانی سے کوئی جگہ بتا دیجئے کہ میں آسمان قدر کو سلا دوں۔"

کلکٹر صاحب نے اپنے بچوں کا بیڈ روم بتا دیا۔ آسمان قدر وہاں سلا دیا گیا اور آیا پاس بٹھا دی اور خود ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ وہ اس وقت سرخ چمکیلی ریشمی ساڑی پہنے تھیں اور سفید پھولدار بلاؤز۔ بس بجلی کی روشنی میں اُن کا سرخ و سفید چہرہ مثل ماہتاب کے چمک رہا تھا۔ گلے میں بجائے ہار کے گھڑی کی سنہری زنجیر لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں صرف ایک ہی شادی کی انگشتری تھی۔ کلکٹر صاحب اُن کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے: "کیا بات ہے اس میں بھی میری ثریا کی جھلک ہے۔" یہ نازنین اُن کی نظروں میں ایسی سمائی کہ اس وقت گورنس کا تصور بھی جاتا رہا وہ سرتاپا استعجاب تھے اور سامنے ہم شکل ثریا مثل تصویر خاموش بیٹھی تھی۔ آخر ان سے زیادہ انتظار نہ ہو سکا۔

کلکٹر صاحب: اب فرمایئے آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں؟

نازنین: پہلے تو میں اس کی معافی چاہتی ہوں کہ آپ کے آرام کے وقت میں خلل انداز ہو کر تکلیف دی۔

کلکٹر صاحب: اوہو تکلیف کیسی عین راحت ہے۔ آپ کی آیا میرے ملازم سے کہتی تھی کہ آپ میری رشتہ دار ہیں۔ خدا کے لئے جلدی بتا دیجئے کہ آپ لکھنؤ سے تشریف لا رہی ہیں۔ میرے سب رشتہ دار تو وہیں ہیں۔

نازنین: آہ یہ نہ پوچھئے کہ میرا آپ سے کیا رشتہ ہے۔

کلکٹر صاحب: (کھڑے ہو کر)۔

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

نازنین: (صاحب بہادر قریب ہی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر)۔

دل بے تاب نے آخر کو نہ پیچھا چھوڑا
بعد مدت کے انہیں ڈھونڈ نکالا کیسا؟

کلکٹر صاحب: یاالٰہی میں کہاں ہوں اور کیا دیکھ رہا ہوں میری نظریں مجھے دھوکہ نہیں دے رہیں۔ معزز بیگم خدارا جلدی بتایئے آپ میری کون ہیں؟

نازنین:۔

کیا پوچھتے ہو کون ہوں آفت رسیدہ ہوں
میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں

کلکٹر صاحب: بیگم صاحب میری ایک رشتہ دار لیڈی بالکل آپ کی ہم شکل تھی۔ آہ وہ دنیا سے نہ اُٹھ چکی ہوتی تو میں یہی خیال کرتا کہ وہی میرے پیش نظر ہے۔

نازنین: (ہنس کر) ممکن ہے وہی ہو۔

کلکٹر صاحب: آہ ایسے نصیب کہاں تھے۔ دس سال ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی ہے۔ مگر للہ آپ مجھے زیادہ خلجان میں نہ رکھئے۔ میرا دم گھٹا جاتا ہے۔

نازنین:۔

سرگذشت بلا کشاں نہ سنو
نہ سنو میری داستاں نہ سنو

کلکٹر صاحب: (کرسی پر بیٹھ کر) بیان کیجئے کیا مجھ سے کوئی خدمت لینا چاہتی ہیں، میرے متعلق کچھ کام ہے تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔

نازنین: میرا قصہ غم طولانی ہے۔ اب رات زیادہ آگئی ہے۔ آپ کو تکلیف ہو گی انشاء اللہ صبح بیان کروں گی۔

کلکٹر صاحب: آپ نے اس قدر اُلجھن میں ڈال دیا ہے کہ کس کمبخت کو

نیند آئے گی۔ بخدا میں جب تک آپ کے حالات سے آگاہ نہ ہو جاؤں، ایک منٹ چین نہیں پا سکتا۔

نازنین: اس ہمدردی کا خدا آپ کو اجر نیک دے گا کہ میری وجہ سے اس قدر پریشان ہو رہے ہیں۔ مجھے تھوڑا پانی منگا دیجئے۔

کلکٹر صاحب: ۱۲ بجے ہوں گے پانی اس وقت نہ پیجئے چاء منگواتا ہوں۔

نازنین: مہربانی میں چاء نہیں پی سکتی مجھے اختلاج قلب کا عارضہ ہے۔ اس وقت بھی دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔

کلکٹر صاحب خود اُٹھے اور کھانے کے کمرے سے لیمونیڈ کا گلاس لا کر پیش کیا۔ انہوں نے "تھینک یو" کہتے ہوئے لے لیا اور نہایت نزاکت سے ایک ایک گھونٹ پینے لگیں۔ اور کہا:

نازنین:۔

بعد مدت کے ہمیں اُن سے ملا آبِ حیات
خوش نصیبی کی ہے بات

کلکٹر صاحب: تسلیم۔ مگر اس سے قبل تو مجھے یاد نہیں پڑتا۔

نازنین: آہ۔ سب بھول گئے! کیوں؟

"نہ بھولتے جب زندہ کو مردہ سمجھ لیا"

یہ الفاظ سنتے ہی کلکٹر صاحب گھبرا کر کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نازنین کے سامنے دوزانو بیٹھ کر کہا: "اے ہوشربا نازنین! میں سخت مضطرب ہوں رحم کر اور مجھ حرماں نصیب کو اپنی اصلیت سے جلد آگاہ کر دے۔ میں رات بھر نہ سوؤں گا نہ سونے دوں گا۔"

نازنین نے کلکٹر صاحب کو اپنے قدموں سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا اور یوں اپنی داستانِ الم سنانے لگی۔

نازنین: سنئے کلکٹر صاحب آپ تو سمجھ ہی چکے ہیں کہ آپ سے امداد کی طالب ہوں۔ آہ حضور میرے ساتھ سخت ظلم کیا گیا۔ میری شادی بچپن میں ہی ایک بڑے تعلقدار کے بیٹے سے ہوگئی تھی چونکہ میں غریب گھر کی لڑکی تھی میرے خسر نے ایک اور

تعلقدار کی لڑکی سے اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر لی اور میرے ان ہی تاریخوں میں یہی لڑکا آسمان قدر پیدا ہونے والا تھا۔ آہ کلکٹر صاحب غور کیجئے میرے اوپر کس قدر سختی روا رکھی گئی اور تو اور میرے چاہنے والے شوہر ہی نے اس نازک وقت میں مجھے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ خیر میں وطن سے بہت دور چلی گئی اور وہیں یہ بچہ پیدا ہوا۔ خوبی قسمت کے دو ہی مہینہ بعد میری دادی صاحبہ نے انتقال کیا اور اب میں اس مصیبت بھری دنیا میں تنہا رہ گئی کیوں کہ وہی ایک میری سرپرست و خبر گیراں تھیں۔

ان کا یہ قصۂ غم کلکٹر صاحب نے نہایت خاموشی سے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ بچہ کی پیدائش پر بے اختیار رونے لگے تو نازنین نے کہا "میں نہ کہتی تھی کہ اس وقت آپ سے نہ سنا جائے گا۔ ناحق میں نے آپ کو رنج دیا۔"

کلکٹر صاحب: کہئے کہئے اگر آپ خاموش ہو گئیں تو مجھے اس سے بھی زیادہ رنج ہوگا۔ مجھ کو تو یہ حالات بھی اپنا ہی افسانہ پر غم معلوم ہوتا ہے۔ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے۔ میرے حواس گم ہیں اور میں دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔ کیا واقعی میری ثریا زندہ ہے اور اس وقت وہی میرے سامنے ہے تو مجھے اتنی عقل دے کہ پہچان سکوں۔

نازنین: اچھا تو پھر سنئے۔ دادی صاحبہ کے انتقال کے بعد میری نظروں میں دُنیا اندھیری تھی۔ ایک پندرہ سالہ کم سن ناسمجھ لڑکی کا یوں تنہا رہ جانا کس قدر پر خطر تھا۔ آہ نہ پوچھیں مجھ پر کیا کیا گذری۔

"کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری"

سرکار عالی آپ بیڈ روم میں تشریف لے جا کر آرام کریں۔ اب صبح کو۔

کلکٹر صاحب: ہرگز نہیں۔ جس وقت تک مجھ کو پوری آگاہی نہ ہو جائے گی۔ یہاں سے نہ اُٹھوں گا۔ کہے جایئے۔

نازنین: سرکار یہ دس سالہ مصیبت ہے۔ اس کے بیان کرنے کو دس ماہ نہیں تو کم سے کم دس ہفتہ تو ضرور چاہئے۔

مختصر یہ کہ آج کے دن تک میں آوارہ وطن شہر بہ شہر گھومتی رہی۔ کئی اسکولوں میں کام کیا اور اپنے بچہ کو یورپین اسکول میں داخل کر دیا۔ آپ صبح کو دیکھئے وہ کتنی اچھی انگریزی بولتا

ہے۔اس وقت تک تو تمام مصائب برداشت کرتی رہی لیکن اب آپ کی یہ دل سے بھلائی ہوئی وفاشعار ثریا اپنے میں دربدری کی طاقت نہیں پاتی جب کہ بفضلِ خدا اس کا امیر کبیر ذی اقتدار وارثِ حقیقی بااختیار ہے تو کیا یہاں اس عاجزہ اور اس کے بچے کو ٹھکانا نہ ملے گا۔

اپنی ثریا سے یہ دردناک تقریر سن کر نواب کیوان قدر بہادر اس کے قدموں پر گر کر اپنے گناہ معاف کرانے کو کرسی سے اُٹھے لیکن دل میں طاقت نہ رہی اور بیہوش ہو کر وہیں فرش پر گر گئے۔

دس سال سے وہ اپنی جان و دل کی مالک ثریا کو مردہ سمجھ چکے تھے۔آج اچانک اس نعمت غیر مترقبہ کا پالینا ان کے لئے شادیٔ مرگ نہ ہو تو تعجب ہے۔

نواب صاحب کا یوں لڑکھڑا کر اُس کے آگے گر جانا ثریا ایسی وفا کی پتلی جاں نثار بیوی کے لئے کچھ کم نہ تھا۔اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔کمرے کے در و دیوار سیاہ اور گھومتے ہوئے نظر آئے سر چکرایا اور وہ بھی وہیں گرنے کو تھی مگر اپنے جان سے عزیز سرتاج کے سنبھالنے کو حواس بجا رکھے اور کانپتے ہاتھوں ان کا سر اُٹھا کر کشن پر رکھا۔خود پانی لائی اور لیونڈر چھڑکا اور پھر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھ گئی۔نواب صاحب کو ہوش آچکا تھا لیکن ابھی بالکل خاموش تھے اور نظریں ثریا کے چہرے پر جمی تھیں۔ آدھا گھنٹہ اسی طرح گذر گیا۔آخر ثریا اٹھیں اور نواب صاحب کو برآمدے میں لائیں۔ مسہری پر لٹا دیا اور کرسی قریب کر کے بیٹھ گئیں تو وہ بولے۔

نواب صاحب: ثریا تم زندہ ہو اور میں بھی زندہ ہوں یا میں بھی مر چکا ہوں اور دوسرے عالم میں اپنی ثریا سے ملاقات ہوئی ہے۔

ثریا: نہیں نواب صاحب ہم دونوں اسی عالم میں ہیں اور میں دس سال سے آپ کی جدائی کی سخت مصیبت جھیلتی ہوئی زندہ چلی آرہی ہوں اور اسی دن کے انتظار میں جیتی رہی جو آج پالیا۔یقیناً اب میری مصیبت ختم ہو چکی ہے اگر نواب بیگم صاحب نے اجازت دی تو میں اسی کوٹھی میں اُن کی خدمت میں بسر کرلوں گی اور نہیں تو آؤٹ ہاؤسز میں ایک کوٹھری دے دینا۔مجھے زیادہ تر آپ کو تکلیف دینے اور یہاں آنے کی یہ ضرورت ہوئی کہ بفضلِ خدا آپ کا بچہ اب سمجھدار ہو گیا ہے۔پچھلے ساتویں ہی سال سے اُس نے یہ سوال

مجھ سے شروع کر دیا تھا کہ "اماں جان بتایئے میرا باپ کون ہے اور کہاں ہے۔" علاوہ اس کے اب تک کے اخراجات تو میں ٹیچری کر کے پورے کرتی رہی اور چوتھے ہی برس سے آسمان قدر کو انگلش اسکول میں داخل کر دیا تھا لیکن بفضلِ خدا اب اس کی تعلیم کے اخراجات بڑھتے جاتے ہیں اور سیانا ہو جانے سے وہ ہر طرح کی فکر کرنے لگا ہے۔ اپنے ان دوستوں کو دیکھ کر جن کے باپ سروں پر ہیں۔ مائیں اپنے گھروں میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتی ہیں، کڑھتا ہے۔ اس کا یہ رنج دور کرنے کو آج سے دو ماہ پیشتر میں نے اپنا تمام و کمال قصہ سنا دیا تھا اور اسی وجہ سے اس کو یہاں لائی۔ اب آپ کی امانت آپ کے حوالے ہے۔

نواب صاحب: آہ میری ذرا سی کم حوصلگی کی وجہ سے تم دونوں نے کس قدر تکلیف اُٹھائی اگر میں اس وقت اپنی کم عمری اور طالب علمی کی وجہ سے والدین سے نہ ڈر جاتا تو میرا عزیز بچہ کیوں یہ مصیبتیں اٹھاتا۔ اچھا میری پیاری ثریا تم اور میرا پیارا آسمان قدر دونوں مجھے معاف کرو اور اس کی تلافی اب میں یہی کر سکتا ہوں کہ ان تینوں بچوں کو لکھنؤ اُن کی ماں کے پاس پہنچوا دوں گا اور پھر عمر بھر نہ بلاؤں گا۔

ثریا: توبہ توبہ ایسا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ وہ سب پہلے حق دار اور ہم ان کے بعد۔ ان چاروں بچوں کی خدمت میں خود کروں گی۔

ناظرین بچوں کی خدمت کے لفظ پر فوراً نواب صاحب کو اپنی دوسری معشوقہ گورنس کا خیال آ کر سخت اُلجھن و بے چینی شروع ہو گئی جس سے گفتگو جاری رکھنا مشکل ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ثریا بھی انہیں سوتا سمجھ کر اپنے بچے کے پاس جا کر سو رہی دراصل نواب صاحب سو نہیں گئے تھے۔ اُن کو اس مشکل نے گھیرا تھا کہ آج سے تیسرے روز گورنس سے شادی ہونی مقرر ہے اگر وہ گورنس کے محبت کو یکدم دل سے نکال دیں تب بھی اس قدر بے مروّتی کس طرح کر سکیں گے کہ جس عورت پر عاشق ہو کر شادی کر رہے تھے اس کو جواب صاف دے کر ہمیشہ کے لئے جدا کر دیں۔ اس ششں و پنج میں اس قدر غلطاں ہوئے کہ دس سالہ جدائی کے بعد ملی ہوئی محبوبہ پاس سے اٹھ گئی اور ان کو معلوم بھی نہ ہوا کبھی یہ ارادہ کرتے تھے کہ صبح ہی اپنی اور گورنس کی محبت کا افسانہ ثریا کے گوش گذار کر کے اُن سے ہی رائے لوں کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ پھر یہ سوچتے کہ نہیں یہ مناسب نہیں وہ کہے

گی میرے بعد اس نے ایک اور کو چاہا یہ کیسی وفاداری تھی۔ کیا یوں کیا جائے کہ اگر گورنس کو خط لکھ دوں کہ میری اصلی مالکہ ثریا جبیں آ گئی ہے۔ اب وہ ادھر نہ آئے ورنہ آنکھیں چار ہوئیں تو تختی نہ کی جائے گی۔ خیر دیکھا جائے گا۔ اسی سوچ میں میری سالہا سال کی بچھڑی ہوئی بیوی یہاں سے چلی گئی اور میں نے نہ روکا۔ چنانچہ یہاں سے اُٹھ کر بچوں کے کمرے پہنچے اور سب سے پہلے اپنے بڑے بیٹے آسمان قدر کے پاس لیٹ کر اسے سینہ سے لپٹا لیا اور بہت دیر روتے رہے۔ قریب ۲ بجے کے یہاں سے اٹھے، دیکھا کہ مہ جبیں ثریا وہیں صوفے پر سفید نائیٹگون پہنے جس پر سیاہ بال کھلے پڑے تھے۔ محوِ خواب ہے۔ خود بھی وہیں فرش پر آ بیٹھے اور اس کے لانبے لانبے سیاہ ریشمی بالوں کو ہاتھوں میں لے کر کھیلنے لگے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ثریا جبین کی آنکھ کھلی۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تو وہ اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئے۔

باب تیرہواں

ہم معتقدِ دعویٰ باطل نہیں ہوتے
سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

شادی کے پورے دس برس بعد بیچاری ثریا جبیں کو آج اپنا گھر نصیب ہوا۔ یہ تین دن اس گھر میں اس نے اسی طرح گذارے گویا آج ہی نئی دلہن بن کر آئی ہے نواب کیوان قدر صاحب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ روز دن عید رات شب برات کی طرح تھے۔ لیکن تیسرے روز نواب صاحب کی گھبراہٹ اور پریشانی کی کوئی حد نہ رہی کیوں کہ آج ہی گورنس شادی کے لئے آنے کو تھی مگر خدا نے ان کی بات رکھ لی کیوں کہ آج ہی رات کی گاڑی سے ثریا جبین اپنا سامان لینے واپس گھر گئیں اور صاحب زادہ آسمان قدر کو یہیں چھوڑا۔ وہ رات میں روانہ ہوئیں اور صبح نو بجے مس جولیا گورنس آ پہنچیں۔ لیکن خلاف توقع نواب صاحب کو ششدر و حیران کسی گہری فکر میں مبتلا پا کر پریشان ہوگئیں۔ شادی کی گھڑی قریب آرہی تھی اور نواب صاحب بالکل تیار نہ تھے۔ گورنس متحیر تھی کہ "یہ کیا معاملہ ہے" آخر ان سے نہ رہا گیا اور ان کے پاس دریافت حال کو گئیں۔ وہ میز پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

جولیا: کلکٹر صاحب آپ کس پریشانی میں مبتلا ہیں؟ آپ کو اس قدر فکر مند دیکھ کر میرا دل گھبرایا جاتا ہے۔ آج تو ہماری شادی ہے۔ آپ کو خوش ہونا چاہئے تھا۔

کلکٹر: (سر اٹھا کر) ہاں جولیا میں بے حد پریشان ہوں اور تم سے شرمندہ کیوں کہ میں اب شادی نہیں کرسکتا۔ آج چوتھا روز ہے کہ میری ثریا جبیں مع اپنے دس سالہ

لڑکے کے زندہ حیات مجھ کو مل گئیں۔ اب تم خیال کر سکتی ہو۔ ان کی موجودگی میں کسی دوسری عورت کو میں بیوی نہیں بنا سکتا۔ بڑی بیگم صاحبہ سے بھی ہمیشہ کے لئے جدائی ہے۔

جولیا: اوہو! اتنی بڑی نعمت خدا نے آپ کو عطا کر دی اور مجھ کو اب تک نہ بتایا۔ میں کوئی جلنے والی تو نہ تھی۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ خدا نے آپ کی دنیا جنت کر دی۔ خدا مبارک کرے۔

لیجئے اب آپ کو خدا نے اصل دے دی نقل کی ضرورت نہ رہی۔ یہ کہتے کہتے کرسی سے کھڑی ہوگئی اور اپنے بے انتہا چاہنے والے نواب کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور آخری رخصت چاہی۔

اب تو نواب صاحب کا دل بھر آیا کھڑے ہو گئے۔ وہ اس وقت چشم پر آب تھے، دل تو چاہتا تھا کہ اپنی بدعہدی اور بے رخی کے عوض رو رو کر اُس سے معافی مانگیں، اس کے قدموں میں اپنے تئیں ڈال دیں مگر ایسا کرنا بھی ثریا جبیں کا گناہ خیال کرتے تھے۔ اٹھے اس سے لپٹ کر کھڑے ہوئے پھر جھجکے، رکے اور علیحدہ ہو گئے۔ عقلمند جولیا ان کی حالت کا اندازہ کر رہی تھی خود ہی الگ ہوگئی اور آخری سلام کر کے کمرے سے نکل گئی جس وقت کلکٹر صاحب ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔ خلاف معمول وہ میز پر نہ تھیں۔ بلوائی گئیں تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں۔ تمام کوٹھی دیکھ ڈالی مگر اُن کا پتہ نہ تھا پھر تو کلکٹر صاحب بہت گھبرائے خود اُن کے کمرے میں تشریف لے گئے ادھر اُدھر دیکھنے سے میز پر ایک بند لفافہ ملا جلدی سے کھول لیا، ایک خط اور حسین جولیا کی تصویر نکلی جسے جیب میں رکھ لیا اور خط پڑھنے لگے۔

مضمون

ہم تیرے گھر سے جفاکار چلے جاتے ہیں
آہ چلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں

کلکٹر صاحب۔ آپ کو یاد ہوگا جس روز آپ نے پہلے دن شملہ میں مجھ سے اظہار محبت کیا تھا۔ میں نے یہی تمام نشیب و فراز سمجھا دیئے

تھے۔ آپ کی پہلی معشوقہ ثریا کے مل جانے کا تو وہم وگمان بھی نہ تھا۔
لیکن بیگم صاحب ہی کی موجودگی میں میں نے اپنے ساتھ تعلقات
محبت قائم کر کے اس میں کامیابی ناممکن بتائی تھی مگر آہ آپ نے ایک
نہ مانی اور مجھ غریب بدنصیب عورت کو برباد کر ڈالا۔ ایک عورت کا
نرم ونازک دل توڑ ڈالنا آپ کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں۔

ان کے نزدیک میرے دل کی حقیقت کیا تھی
ایک مٹی کا کھلونا تھا گرا ٹوٹ گیا

بدقسمت

جولیا

پڑھتے پڑھتے اِن کا سر چکرا گیا۔ شملہ کی تمام بے تکلف ملاقاتوں کا نقشہ آنکھوں کے آگے کھنچ گیا۔ اس وقت ان کا ضمیر انہیں ہزار لعنت ملامت کر رہا تھا۔ کھانا بھی نہ کھایا اور اسی کمرے میں گورنس کی آرام کرسی پر پڑ کر تمام دن گذار دیا اور اس وقت اُٹھے جب شام کے ساتھ بجے والی ٹرین سے معہ سامان کے چھوٹی بیگم صاحبہ ثریا جبیں تشریف لے آئیں۔ آٹھ بجے سب نے کھانا کھایا۔ آہ کمبخت جولیا کی کرسی خالی تھی جس کو دیکھ کر کیوان قدر کے دل سے اک آہ نکل جاتی تھی جس کو روکنے کی وہ بہت کوشش کرتے تھے۔ فوراً ہی کسی بچہ سے بات کرنے لگتے۔ کبھی کوئی پلیٹ تعریف کے ساتھ بیگم کو پیش کرتے مگر وہ عقلمند قیافہ شناس بیگم اپنے شوہر کی حالت کا نمونہ بخوبی اندازہ کر رہی تھی۔ ان کے خوش کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ بعد کھانا کھانے کے ہارمونیم لے بیٹھیں۔ مغموم وخاموش شوہر قریب ہی ایک کرسی پر سرنگوں بیٹھے تھے۔ بیوی نے باجہ پر گانا شروع کیا۔

یہاں دل میں خیال اور ہے وہاں مدِ نظر اور
ہے حال طبیعت کا اِدھر اور اُدھر اور
ظالم میں سمجھتا ہوں لگاوٹ کی یہ باتیں
ہے قہر نگاہ اور محبت کی نظر اور

کلکٹر سمجھ گئے کہ اس وقت کی میری بے پرواہی اور خاموشی پر بیگم نے یہ شعر سنائے ہیں، فوراً گویا چونک پڑے باجہ بند کرادیا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑے کھڑے ہو گئے اور باغیچہ میں ٹہلنے لگے۔ اب وہ تو خاموش تھیں اور یہ اُن کے خوش کرنے اور بلانے کی کوشش میں تھے۔ ایک گلاب کا پھول توڑ کر بیوی کے رُخ تاباں سے ملا کر کہا۔

کلکٹر صاحب: (مسکرا کر) اونہہ! گلاب بھی اپنی خوش رنگی پر کیا نازاں ہے۔

ہے اس سے زادہ گل رخسار ہمارا

ثریا: گلاب کی خوشبو نے آپ کو پوری طرح بیدار کر دیا۔ کرسی پر تو گویا سو رہے تھے۔

کلکٹر صاحب: ثریا اس مدہوشی کا بھی ایک سبب ہے جس کو میں تم سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا آؤ کہ سناؤں۔

دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور اس روز سے جب کہ جولیا کو پہلے روز پہاڑی پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اُس دن سے آج صبح تک کا اپنا افسانہ محبت سب سنا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس سے اس وجہ سے محبت تھی کہ تمہاری ہم شکل تھی ورنہ اس دس سال میں ایک سے ایک زیادہ حسین ملا کبھی نظر بھی نہ ڈالی۔

اور پھر جیب سے جولیا کا آخری خط اور تصویر نکال کر دکھائی۔

ثریا: کلکٹر صاحب اُف اُف۔ آپ نہایت سنگ دل ہیں جب اُس سے اس قدر محبت جتا کر اپنا دیوانہ بنالیا تھا تو یہ ظلم نہ کرنا تھا۔ کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ آپ ایک دوسری کی اسیر زُلف ہیں تو کبھی ادھر کا رُخ کر کے اس کی تمناؤں کا خون نہ کرتی آپ کا دل بھی پہلی محبت کی طرح اس سے خوب لگ گیا تھا گو بیگم بیچاری پر ظلم ہوتا مگر آپ دونوں کی خوب گذرتی۔

نواب: ثریا۔ ایسے جگر خراش الفاظ زبان سے نہ نکالو۔ بخدا تمہاری ہی یاد میں تمہاری تصویر کو چاہا تھا اور اس سے یہ کہہ دیا تھا اگر اصل مل گئی تو نقل بیکار ہو جائے گی۔ اب خدا نے مجھے گوہر مقصود دے دیا تو اب کسی کی کیا پرواہ ہے۔

ثریا: یہ سب صحیح مگر اس کو بھی گھر میں رہنے دینا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ شادی

خود ہی نہ کرتی۔ اسی طرح بچوں کی گورنس رہتی۔

نواب صاحب: اوہو۔ یہ سخت مصیبت ہوتی میرے لئے عذاب دوزخ سے بڑھ کر ہو جاتا اگر ایک ہفتہ یہی صورت رہتی تو آپ کا کیوان مر جاتا۔

ثریا: بفضل خدا میں اتنی بھی تنگ دل نہیں۔ آپ کی اس دس سالہ جدائی نے مجھے بہت باحوصلہ کر دیا ہے۔ میں اس کو بھی تھوڑا سا خوش ہو لینے دیا کرتی۔ ہفتہ میں ایک روز اُس کی طرف بھیج دیا کرتی۔

نواب: توبہ توبہ استغفراللہ یہ مجھ سے ناممکن تھا۔

حور پہ آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

آہ جولیا کی تو حقیقت کیا تھی اب تو یہاں بیگم کی بھی گذر مشکل ہے۔

ثریا: توبہ کیجئے توبہ اس قدر گناہوں پر کمر بستہ نہ ہو جائے اگر بیگم کا یہاں گذر نہ ہوگا تو میں بھی نہ رہ سکوں گی۔ آپ کو جلدی بیگم کو لانا ہوگا۔

نواب: بس اب اس قدر زبردستی نہ کرو۔ والدین کی زبردستی نے مجھ کو اس قدر مشکلوں میں ڈالا۔ اب ایسے حکم نہ دیں کہ بقیہ زندگی جو مجھ کو خوش گوار نظر آ رہی ہے بدمزہ ہو جائے۔ میرا ایک دل ہے اور ایک وقت میں ایک سے ہی محبت کر سکتا ہوں۔ زبانی جمع خرچ کا قائل نہیں ہوں۔

ہم معتقد دعویٰ باطل نہیں ہوتے
سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

چلو ثریا نیند آتی ہے۔

خدا نے جیسی بگڑی ہوئی ثریا کی بنائی۔

گورنس کمبخت کا کچھ پتہ نہ لگا کہ کہاں گم ہو گئی۔ ثریا بیگم کو یہاں رہتے ایک مہینہ ہو گیا اور انہوں نے شوہر کو بیحد مجبور کیا۔ بیگم صاحب کو بلانے کے لئے مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور صاف کہہ دیا کہ "مجھ میں اس قدر حوصلہ نہیں کہ دو بیویاں ایک وقت رکھ سکوں، ان کے بغیر بسر کر سکتا ہوں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

خبر کبھی چھپی نہیں رہتی۔ مراد آباد سے لکھنؤ دور ہی کتنا تھا۔ ان کے ہی پرانے

داروغہ فرحت علی نے نواب صاحب کو لکھنؤ لکھ دیا کہ چھوٹے نواب صاحب کی پہلی بیوی مع صاحبزادے صاحب کے آگئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بیٹے کو خط لکھا کہ " آکر اپنی بیگم کو لے جاؤ" اس کا جو جواب کلکٹر صاحب نے والد صاحب کو لکھا وہ نذر ناظرین ہے۔

خط

جناب قبلہ وکعبہ۔ بس از آداب عرض ہے کہ جناب کا والا نامہ صادر ہو کر باعثِ افتخار ہوا۔ حضور نے مجھے طلب کیا ہے کہ لکھنؤ پہنچ کر آپ کی بڑی بہو کو لے آؤں۔ قبلۂ من سنئے۔ آپ کو علم ہے کہ اس زبردستی کی شادی سے قبل میں اپنی حسبِ پسند عقد کر چکا تھا جس کو بوجہ ایک متوسط خاندان کی لڑکی ہونے کے آپ نے اپنی بہو نہیں مانا تھا۔ جن دنوں میری شادی تھی انہی تاریخوں میری پہلی بیگم کے بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ آہ مجھ سے کس قدر ظلم ہوا کہ میری شادی اور اُس کی طرف سے بے توجہی کی وجہ سے وہ لکھنؤ سے اپنے وطن چلی گئیں اور اس غم وغصہ میں دس سال تک مجھے خبر نہ دی کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ تاہم اُس کی یاد اور محبت میرے دل سے نہ نکلی تھی جس طرح بھی بن پڑا جناب کے خوف وخیال سے ان دوسری بیگم صاحبہ سے بادلِ نخواستہ زندگی کے دس سال گذارے۔ خوش نصیبی سے اب مجھ کو معلوم ہوا کہ میری بیوی اور دس سالہ بچہ بقیدِ حیات ہے۔ چنانچہ میں اُن کو لے آیا۔ خدا کے فضل سے اس وقت آپ کے تین پوتے ہیں۔ ثریا جبیں اپنے ہمراہ دس سالہ بچہ لائی ہیں جو ماشاء اللہ پڑھ رہا ہے اور خوب ذہین و ہوشیار ہے۔ اس کی والدہ کا اصرار ہے کہ " بیگم کو ضرور بلایا جائے میں اُن کے ساتھ چھوٹی بہنوں کی طرح رہوں گی۔ " مگر میں گھر کو دوزخ نہیں بنانا چاہتا۔ حضور جانتے ہیں کہ مجھ کو سلطنت آرا بیگم (بیوی) سے ذرا محبت ومؤانست نہیں ہے۔ اس صورت میں اُن سے کیسے نباہ کر سکتا ہوں جب کہ میری دل وجان کی

مالک مجھے مل گئی ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ میرے دلی حالت کا اندازہ کر کے اس میری بے ادبی کو معاف فرمائیں گے اور آئندہ اپنے پوتوں کی شادیوں کے وقت احتیاط سے کام لیں گے اور ان کی شادیاں ان کی مرضی کے موافق کریں گے۔ بخدمت جناب والدہ صاحبہ معظمہ آداب عرض الاداب۔

خاکسار

آپ کا کیوان قدر

یہ خط لکھ کر بیوی کو سنایا وہ ہاتھ سے چھین کر چاک کرنے لگیں لیکن اُن کے ہاتھ سے چھین کر باہر لے گئے اور پوسٹ کرا دیا۔ اس خط کے پہنچنے پر بڑے نواب صاحب نے اپنے تینوں پوتی پوتوں کو لکھنؤ بلوا لیا اور ایک ہزار ماہوار جو ان تینوں کے اخراجات کو بھیجتے تھے بند کر لیا۔ اپنے تمام پرانے ملازمین داروغہ فرحت علی منشی فیاض بیگ کیوان قدر کی انا فہیمن روانہ کر دیں۔ محلدار ظہوری خانم اور تینوں بچوں کی انائیں واپس بلا لی گئیں۔ اب اس کوٹھی میں صرف میاں بیوی ایک بچہ رہ گئے اور ملازمین میں ایک آیا ایک بیرا۔ ایک بٹلر ایک خدمت گار ایک خانساماں ایک مشعلچی چوکیدار اور مالی مہتر کل نو آدمی باقی رہ گئے۔ اب ان کی گنی چنی کلکٹری کی تنخواہ تھی اور تمام اخراجات۔ مگر بیگم تھی عقلمند اعلیٰ تعلیم یافتہ اس تھوڑی سی رقم میں کل اخراجات زندگی پورے کر لیتی تھیں، جائیداد سے امداد لینے کی کچھ ضرورت نہ رہی تھی۔

بچوں کو لکھنؤ گئے چوتھا روز تھا۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ آج تیسرے روز کلکٹر صاحب دورے سے واپس آئے۔ اور سیدھے بیگم کے کمرے میں پہنچے تو وہاں کا نقشہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ بیگم صاحب کی مسہری پر گورنس جولیا سو رہی تھیں۔ یہاں سے نکل کر تمام کمروں میں دیکھ ڈالا بیگم کا پتہ نہ ملا، دل دھل گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کو یہ خیال گذرا کہ گورنس کے اچانک آنے سے بیگم غصہ سے پھر روپوش ہو گئی ہیں۔ پھر اٹھے اور دریافت حال کو گورنس کے پاس آئے۔ وہ اب اخبار دیکھ رہی تھیں۔ ان کو آتا دیکھ کر اُٹھ بیٹھیں۔

کلکٹر صاحب: کہئے اب آپ کس طرح تشریف لائیں؟ مجھ سے بغیر کہے سنے بلا اجازت یہاں سے چل دی تھیں اور آج بلا اطلاع آ گئیں، ہرا بنا بنایا گھر برباد کیا۔ بیگم صاحب پھر کہیں چلی گئیں۔

ناظرین کلکٹر صاحب سے یہ غضبناک الفاظ سن کر گورنس ہنستی ہوئی اٹھیں اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

جولیا: پیارے کیوان آپ کی ثریا نے اس دس سالہ زمانہ گردش میں ایکٹ کرنے میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ میں ذرا اور آپ کو حیران رکھتی لیکن آپ زیادہ رنجیدہ ہو گئے اس لئے راز افشاں کرتی ہوں۔

کلکٹر: (گلے سے ہاتھ نکال کر) جلدی کہو کیا معاملہ ہے۔ میں تو دیوانہ ہو جاؤں گا۔

گورنس: اگر یہ گورنس ہی آپ کی ثریا ثابت ہو جائے تو کیا انعام دیں گے؟

کلکٹر: دیکھو جولیا زیادہ مذاق نہ کرو۔ بتاؤ بیگم صاحب کہاں ہیں؟"

یہ سنتے ہی جولیا نے سامنے والی الماری سے بنارسی ساڑی نکال کر کلکٹر صاحب کے سامنے کھڑے اپنا فراک اتار کر ساڑی باندھ لی اور پھر آ کر اُن سے لپٹ گئی۔

کلکٹر: (جھنجلا کر) جولیا کیا کر رہی ہو۔ یہ وقت مذاق کا نہیں ہے۔ جلد بیگم کا پتہ دو تا کہ میں تلاش کروں۔

گورنس: (کرسی پر بیٹھ کر) نواب صاحب جان بخشی ہو تو سچ سچ عرض کر دوں۔

نواب صاحب: کم بخت عورت کہتی کیوں نہیں۔ کیا انہیں کوئی تکلیف پہنچائی ہے تب ہی ان کے کپڑوں ان کے کمروں پر قابض ہو بیٹھی۔

جولیا: (کھل کھلا کے ہنس کر) ذرا ٹھنڈے دل سے میری عرض سن لیں پھر ناراض ہونا۔

کلکٹر صاحب: کہو کہو۔

گورنس: کیوان قدر یقین کریں۔ آپ کی ثریا بہت ہی مصیبت زدہ ہے۔

آہ میں ہی بے حیا تھی جو زندہ رہی۔ میں نے اپنے گذشتہ حالات یہاں تک سنائے تھے کہ اسکول میں ٹیچری کر کے بچے کی پرورش کی لیکن اتنا پوشیدہ رکھا تھا کہ علاوہ ٹیچری میں نے نرسنگ اور مِڈوائفری بھی سیکھی۔ چونکہ بچے کو شملہ کے یورپین اسکول میں پڑھانا تھا، میں نے خیال کیا کہ اپنی زندگی بیکار کیوں کھوؤں۔ خود بھی نرسنگ ہوم میں داخل ہوگئی۔ ابھی کام سیکھ ہی چکی تھی کہ خوش نصیبی سے اپنے بادشاہ کی نظر پڑ گئی۔ چنانچہ یہاں آئی اور اپنے بچوں کی خدمت گاری کی۔ بیگم کی مصاحبت کی جس کے عوض میں اُن سے تنخواہ لی۔ لوگوں نے بدظنیاں کیں پھر قسمت نے پلٹا کھایا اور آپ کی منظورِ نظر ہوئی۔ خوش نصیبی دیکھو کہ آقا ہی عاشق ہوگیا، شملہ سے مرادآباد آئی۔ یہاں شادی کی ٹھہری۔ اب میں نے سوچا کہ اس ملازمت کی ذلت تو خیر گورنس کے بھیس میں برداشت کرلی لیکن اب ایک خادمہ کا بیگم بن جانا میری تحقیر کا باعث ہوگا۔ آپ کے پرانے ملازمین تو میری ذرا بھی عزت نہ کریں گے۔ میری آئندہ اولاد ایک کرشانی کے پیٹ سے ہونے کی وجہ سے غلاموں سے بدتر سمجھی جائے گی اور بیچارے آسمان قدر کو تو مردود بھانجہ سمجھ کر اندر آنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ ان ہی تمام امور پر غور کر کے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب اپنی اصلیت ظاہر کردوں مگر یہ پریشانی تھی کہ کس طرح پردہ اُٹھاؤں۔ آخر میں نے یہ سوچا کہ جولیا اپنی شادی کا سامان کرنے کے لئے رخصت ہوجائے۔ اور آپ کی بچھڑی ہوئی ثریا جبین مع اپنے بچے کے آپہنچے۔ چنانچہ میں آپ سے آگرہ جانے کی اجازت لے کر چار بجے رخصت ہوئی اور یہیں ڈاک بنگلہ میں جا ٹھہری۔ انگریزی ڈریس اتار کر ساڑی پہنی اور ٹھیک نو بجے کوئی رشتہ دار بیگم بن کر آپہنچی۔ گورنس کے بھانجے ثانی اور آسمان قدر کو دو ثابت کرنے کے لئے اُسے دیسی لباس پہنالائی۔ بعد تھوڑے سے تحیر کے آپ کو یقین آگیا کہ یہ ناخواندہ مہمان آپ ہی کی ثریا ہے تو زندگی کے دو تین دن پرلطف گزرے۔ پھر مجھے یہ فکر سوار ہوئی کہ گورنس صاحبہ شادی کے لئے آرہی تھیں تو میں اسباب لانے کے بہانے یہاں سے رخصت ہوئی اور ڈاک بنگلہ میں جاکے وہی گورنس کا لباس پہن کر حاضرِ خدمت ہوگئی۔ میں اس وقت آپ کی سچی محبت کی آزمائش کو گورنس بنی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ ثریا کے مل جانے پر آپ اپنی دوسری محبوبہ کو رکھیں گے یا علیحدہ کردیں گے۔ میری خوش نصیبی کے آپ نے نہایت ترش روئی سے

جولیا کو جواب صاف دے دیا۔ پس گورنس چلدی اور آپ کی ثریا جبین سامان لے کر آ گئی پھر یہ فکر ہوا کہ آپ کے دل پر گورنس سے بیوفائی کرنے کا رنج ہوگا۔ لہٰذا اب یہ پردہ بھی اٹھا دینا چاہئے تا کہ آپ کو یہ معلوم کر کے کہ گورنس بھی میں ہی تھی اپنی وعدہ خلافی کا تاسف جاتا رہے۔ آج میں نے پھر جولیا کا بہروپ بھرا۔ کیوں کہ ویسے اگر میں بتاتی کہ گورنس بھی میں ہی تھی۔ آپ مشکل سے یقین کرتے۔ کہئے کیسی زبردست ایکٹریس ہوں۔

نواب صاحب یہ لمبی تقریر نہایت تعجب سے خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ حیران تھے کہ یہ کس بلا کی عورت نکلی۔ اس خوبی سے گورنس بنی رہی کہ ہمیں ذرا شبہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے اتنی لمبی تقریر سنی اور ایک لفظ نہ بولے۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد اُٹھ کر سینے سے لگالیا۔

جیسی خدا نے ثریا جبین کی پھیری۔ کل کی پھیرے۔ دس سال کی سخت مصیبت جھیل کر آج اپنے راجہ کی رانی بنی بیٹھی ہیں۔ اب ان دونوں کو اپنے دوست یاد آئے۔ ثریا جبین نے اپنے شوہر سے کہا کہ برخوردار آسمان قدر کی دسویں سالگرہ پر ان سب کو جمع کیا جائے۔

ثریا جبین نے نواب صاحب سے یہ بھی ذکر کر دیا تھا کہ جب میں پشاور میں تھی اور معلمہ گیری کر رہی تھی۔ ننھا ایک سال کا تھا تو اتفاقیہ قمرالزمان مل گئے تھے۔ اس وقت انہوں نے بہت مدد کی تھی۔ پھر اس خیال سے کہ میرا حال ظاہر ہو گیا۔ پشاور سے کلکتہ چلی گئی اور مس جیکسن کو اپنی موت کا تار دے دیا تھا جس سے قمرالزمان کو میرے مرنے کا یقین آ جائے۔

یہ سن کر نواب صاحب کو بجائے رقابت کی جلن کے ان سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے قمرالزمان اور ان کی بیگم صاحبہ کو مدعو کر کے مدت کی بچھڑی ثریا جبیں سے ملایا۔ وہ ان کو زندہ پا کر حیران رہ گئے۔ چند دن بعد سالگرہ پر مسٹر اور مسز مکرجی مسٹر اور مسز سندر لال، من موہنی اور ان کے صاحب ستیش چندر ایم اے اور ان تینوں کے تین تین چار چار بچے لکھنؤ سے مرادآباد آئے۔ آج اس گھر پر بے انتہا مسرت برس رہی تھی۔ سب دوست شاداب و فرحان تھے۔

کلکٹر صاحب بہادر نے پہلی بیگم صاحبہ کی طرح ثریا جبین بیگم کا پردہ بالکل نہیں کرایا تھا۔ وہ مثل یورپین لیڈیوں کے سوسائٹی میں داخل تھیں۔ بیگم قمرالزمان صاحبہ بھی سندر لال، ستیش چندر، کلکٹر صاحب اور مکرجی کے سامنے ہوتی تھیں۔ بیگم قمرالزمان نہایت

حسین اور تھابرن کالج لکھنؤ کی تعلیم یافتہ تھیں۔ انہوں نے اپنی حسن ولیاقت کی کشش خداداد سے اپنے خاموش وافسردہ دل شوہر کو اپنا والہ وشیدا بنالیا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ثریا جبین سے نزہت آرا بیگم قمر الزمان زیادہ حسین تھیں اس وقت کہ وہ دولڑکوں کی ماں بن چکی تھیں۔ ابھی نوعمر دوشیزہ معلوم ہوتی تھیں۔

ایک ہفتہ یہ لوگ یہاں ٹھہر کر واپس لکھنؤ گئے۔ قمر الزمان جیسے پہلے آئے تھے۔ ویسے ہی دوروز بعد روانہ ہوئے۔ دوپہر تھی۔ کھانا کھا کر کلکٹر صاحب تو کسی ضرورت کو دفتر چلے گئے اور یہ تینوں ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد مسٹر ومسز قمر الزمان رخصت ہونے والے تھے۔ ثریا اور نزہت آرا نے آپس میں نشانیوں کا تبادلہ کیا۔ علاوہ اس کے بیگم کیوان قدر نے چھوٹی دیورانی بیگم قدر کو ایک بیش قیمت ساڑی سے جوڑا ابھی دیا۔ اور اسی وقت قمر الزمان کو ایک خوبصورت بیش قیمت انگشتری پہنائی۔

قمر الزمان: یہ کیسی؟

بیگم کیوان: آپ کو سلامی بھی دینی تھی۔ نزہت آرا میری کلاس فیلو بہن ہیں۔

بیگم قمر: اور یہ بھی تو بھائی ہیں۔

قمر: آپ کو بھی تو بھاوج بنا کر بری کا جوڑا اور رونمائی میں زیور دیا ہے۔ ہاں انگوٹھی کچھ بے موقعہ سی ہے۔

بیگم کیوان: بے موقعہ نہیں ہے۔ بچے کی سالگرہ کی یادگار ہے۔ ہم دونوں نے نشانیاں بدلی ہیں۔ آپ کو اس تقریب کی یادداشت کے لئے یہ "نشانی" ہے۔

قمر: (مسکرا کر) "اچھا اچھا"۔ سمجھ گیا اپنے پیارے بھتیجے کی پہلی سالگرہ کی نشانی رکھوں گا۔

☆☆☆

(۱)

اس سال چونکہ گرمی شدت کی پڑ رہی ہے۔ اس لئے بجائے مئی اور جون کے پہاڑوں پر آخر اپریل ہی سے غیر معمولی رونق اور چہل پہل ہو گئی اور متمول خاندان شروع سیزن سے اوپر چلے آئے ہیں۔ چنانچہ کانپور کے ایک مسلمان رئیس اعظم کے تینوں صاحبزادوں نے کیملس بیک روڈ مسوری پر تین کوٹھیاں پاس پاس لی ہیں جن میں دو تو کافی بڑی اور شاندار ہیں اور ایک ذرا چھوٹی ہے۔ پہلی بڑی کوٹھی ''روز ولا'' میں بڑے بھائی مرزا صاحب مع اپنے ملازمین ٹھاٹھ کے ساتھ فروکش ہیں جن کے زنانخانے میں بہت سی انائیں، مامائیں وغیرہ چلتی پھرتی شور مچاتی پان چبا چبا کر برآمدوں اور باغیچے کی روشوں پر گلکاریاں کرتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح مردانہ حصے میں بھی متعدد ملازم بھرے ہیں۔ سامنے کے برآمدے میں سلطان مرزا صاحب آرام کرسی پر متمکن ہیں اور نقرئی پیچوان لگا ہے۔ چاندی کے خاصدان میں گلوریاں رکھی ہیں جو ہر پانچ منٹ کے بعد اُٹھا کر منہ میں رکھ لی جاتی ہیں۔ قریب ہی چوکیوں پر دو چار احباب ابھی صبح کی ہواخوری سے واپس آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ نواب سلطان مرزا صاحب کا حکم ہوا کہ ناشتہ یہیں لایا جائے۔ اسی برآمدے میں نواب صاحب کی مسہری بھی لگی ہے، آٹھ بجنے والے ہوں گے، باوجود بے شمار ملازمین کے ابھی تک نشست کے برآمدہ میں سے پلنگ بستر نہیں اٹھایا گیا۔ نواب صاحب نے ابھی منہ بھی نہیں دھویا، اسی طرح ''روز ولا'' کے حصے میں (جہاں تین طرف قناتیں لگا کر پردے دار صحن بنایا گیا ہے) ابھی بھی صبح کے آثار بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ بیگم سلطان مرزا صاحبہ ابھی غالباً محوِ خواب ہیں۔ برابر کے کمرہ میں چاروں بچے اُٹھ گئے ہیں اور اپنے اپنے پلنگوں پر شور و غل کر رہے ہیں۔ کوئی انا کو بلا رہا ہے، کوئی ناشتہ مانگ رہا ہے۔ ہر ایک بچہ پر

ایک ایک ملازمہ مقرر ہے۔ لیکن یہ چاروں اسی لباس میں ہیں جو کل دن بھر پہنے ہوئے تھے۔ پلنگوں ہی پر اُن کو ناشتہ دے دیا گیا۔ بستروں پر دودھ پوریاں خوب گرا کر بچوں نے ناشتہ کیا۔ نو بج گئے تو بیگم صاحبہ نے انگڑائی لے کر گلشن کو آواز دی جو فوراً لوٹا اور سیلانچی لے کر آئی اور انہوں نے اُٹھ کر منہ میں دبا ہوا پان تھوکا اور منہ دھویا۔

''اری کیا وقت ہوگا؟''

''بیگم صاحب! نو کب کے بج چکے۔ سرکار کو ناشتہ بھیج دیا گیا۔'' گلشن نے جواب دیا۔

''آج ہم بہت دیر تک سوتے رہے کسی کمبخت نے اٹھا ہی دیا ہوتا۔'' بیگم صاحبہ نے فرمایا۔

گلشن بولی: ''سرکار ڈر کے مارے ہم تو جگا نہیں سکے۔ بہت صبح چھ سے پہلے منجھلے سرکار اپنی بیگم صاحب کے ساتھ ہوا خوری کرتے ہوئے آپ کو سلام کے لئے آئے تھے۔ آپ کو سوتا دیکھ کر چلے گئے۔''

قریب ہی تخت پر ناشتہ چنتی ہوئی دوسری ملازمہ نرگس نے کہا: ''اری کمبخت! تجھے خبر ہی نہیں؟ منجھلے سرکار ہی نہیں چھوٹے سرکار بھی تو آئے تھے دونوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب بیگم صاحب کو آرام میں دیکھا تو چپکے چپکے وہ بھی واپس چلے گئے۔ وہ شاید شکار کو جا رہے تھے۔ ساتھ بندوقیں بھی تھیں۔''

گلشن نے جھلا کر جواب دیا: ''آئیں بڑی بچاری صبح صبح دوسروں کو کمبخت کہنے والی! میں تو منہ ہی دھو رہی تھی جب گھوڑوں کی آواز آئی تھی۔''

''تم دونوں کم بختیں ہو! اور وہ مغلانی جو میرے کمرے میں سوتی ہے! اس کو بھی ہوش نہ ہوا۔ میرے دیر تک سونے کا پہلے ہی سسرال میں مذاق بنا رہتا ہے۔ آج میرے چاروں دیور دیورانیاں دن چڑھے تک سوتا دیکھ گئے۔ مردار! جلدی سے آکر مجھے نہ جگا دیا۔''

اس چخ چخ کے بعد بیگم صاحب تخت پر تشریف لائیں۔ تبدیلی لباس کی تو ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ کل دن کے پہنے ہوئے نفیس ریشمی جوڑے ہی میں رات آرام فرمایا تھا۔ قیمتی سبز اطلس کا غرارہ اُودی ریشمی قمیص اور زرد جارجٹ کا مدانی کا دوپٹہ پہنے

تھیں۔ پونے دس بجے خدا خدا کر کے ناشتہ شروع کیا گیا۔ اس کے بعد مغلانیوں سے بات چیت کی، بیٹھے بیٹھے تھک گئیں تو وہیں تخت پر لیٹ گئیں۔ تقریباً دو بجے مغلانی نے باہر نواب صاحب کو کھانا بھجوادیا اور بیگم صاحبہ کے سامنے اسی تخت پر خاصہ چنا گیا۔ اس کے بعد سرکار گھر میں تشریف لائے۔ کچھ دیر یہاں بیٹھے بچوں کو بلا کر دیکھا۔ بڑا چھ سالہ لڑکا کیچڑ میں لت پت ہاتھ میں آم لئے جس کے رس سے چہرہ لپا پتا تھا روتا ہوا آیا اور ابا جان سے شکایت کی۔

"ہمیں آپا نے دھکا دے کر جھولے سے گرادیا۔ آپ آپا ثریا کو بلا کر ماریئے۔ یہ کہا اور نواب صاحب کے سفید براق کپڑوں پر چڑھ بیٹھا۔"

"اتنے میں صاحبزادی ثریا بھائی کو گالیاں دیتی آئیں، جن کا ڈھیلے پائینچوں کا ریشمی پاجامہ کیچڑ میں بھرا ہوا تھا۔ دوپٹہ پیچھے سے گھسٹتی ہوئی آرہی تھیں اور ایک پیر کی جوتی غائب تھی۔ ریشمی کپڑوں پر آم کا رس اور پان کی پیکیں پڑی ہوئی تھیں جس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بھیا نے ہم پر تھوکا ہے اور آم مل دیئے ہیں۔"

"نواب صاحب نے اُن کو سمجھانے کے بعد چھوٹے بچوں کو بلوایا۔"

"چار سالہ لڑکی رقیہ صرف ایک کرتے میں دونوں ہاتھوں میں مٹھائی لئے پہنچی اور سب سے چھوٹا دودھ پیتا بچہ اپنی انا کی گود میں لایا گیا۔ نواب صاحب نے انا سے اپنی گود میں لے لیا اور ذرا برہم ہو کر بولے۔"

"دیکھو انا معلوم ہوتا ہے صبح سے ننھے کا منہ نہیں دھویا گیا اور کپڑے بھی کتنے گندے ہو گئے ہیں۔ کیا تم نے پرسوں سے نہیں بدلے۔"

انا نے جواب دیا: "سرکار! آج ذرا بدلی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ کے خیال سے نہیں دھویا اور بچوں کے کپڑوں کا کیا ہے، ادھر بدلو اُدھر میلے۔"

"ننھے میاں تو مٹی میں نہیں کھیلتے، ان کے کپڑے کیسے گندے ہو گئے؟ یہ کہو کہ تم سے کام نہیں کیا جاتا۔ آرام طلب ہو گئے ہو سب کے سب۔ دیکھو ان تینوں کی کیا گت بن رہی ہے کہاں ہیں اُن کی مامائیں، حاضر کرو۔ بیگم! تم ذرا اپنی اولاد کی طرف توجہ نہیں کرتیں۔ دن ختم ہو گیا لیکن اُن کا غسل ہوا اور نہ کپڑے بدلے گئے۔"

"صبح سے تو سرد ہوا چل رہی ہے بادل گھرا ہے۔ ایسی سردی میں بھلا بیمار ڈالنا ہے؟ ماماٸیں کم بختیں سب کی سب نمک حرام ہیں۔ منہ دُھلا کر کپڑے بدل دینا بھی انہیں دشوار ہے۔" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

یہ سن کر نواب صاحب بولے: "نوکروں سے کام لینا تو تمہارا کام ہے بے پرواہی میں تو سب ہی بگڑ جاتے ہیں۔ دیکھتی ہو احسان اور سلیمان کے بچے کتنے صاف ستھرے رہتے ہیں۔ خواہ کیسی ہی بارش ہو ان کو روزانہ غسل کرایا جاتا ہے۔ ان کی آیائیں بھی کیسی کام کرنے والی ہیں۔ احسان کے گھر میں تو پانچ بچوں پر صرف دو آیا ہیں۔ یہاں ایک بچہ پر دو دو لگا رکھی ہیں پھر بھی اُن کا منہ تک نہیں دھویا جا سکتا۔ اپنی دونوں دیورانیوں سے سبق لو وہ کتنا کام کرتی ہیں۔ خصوصاً احسان کی بیوی تو صبح سے شام تک اپنے گھر کے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ حالانکہ اُن کی آمدنی ہم سے کم ہے مگر اُن کا گھر ہم سے زیادہ شاندار نظر آتا ہے۔ تم تو دس بجے پلنگ سے اُٹھتی ہو۔ وہ اس وقت دنیا بھر کے کام سے فارغ ہو جاتی ہیں۔"

بیگم نے شوہر کی بات کاٹ کر غصہ سے کہا "خدا نہ کرے کہ میں دیورانیوں سے سبق لوں اور اُن کے نقشِ قدم پر چلوں، کسی شریف گھر کی بہو بیٹی اُن جیسی نہ ہو جب تک یہ دونوں اپنی نوکریوں پر تھے اور ہم سنا کرتے تھے کہ اُن کی بیویاں پردہ نہیں کرتیں تو ہم کو یقین نہ آتا تھا۔ اس سال پہاڑ پر آ کر آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا۔ میرا یوں بے پردہ پھرانا تو آپ کو ہرگز گوارا نہ ہو گا جب کہ ہمارے گھر کی جوان باندی لونڈیاں بھی باہر نہیں نکلتیں۔"

نواب صاحب نے بیوی کی تقریر سن کر جواب دیا۔ "بیگم میں نے یہ کب کہا کہ ان دونوں کی بے پردگی مجھ کو پسند ہے۔ میں تو اُن کی قابلیت کا انتظام خانہ داری اور پرورش اور تربیت اولاد کا معترف ہوں۔"

بیگم نے طنزیہ کہا: "بہت خوب! کیا انتظام خانہ داری ہے! سلیمان کی دُلہن کو سوائے رات کے چند گھنٹوں کے گھر پر کوئی دیکھتا ہے؟ بچے نرس اور آیاؤں کے سپرد، گھر نوکروں کے ہاتھ میں، دعوتیں اور پارٹیاں ہوٹلوں میں ہوتی ہیں جن پر دُگنا خرچ ہو۔ میم صاحب تو کلب اور ناچ گھروں کی رونق ہیں۔ چھ سات سو تنخواہ ہے اور یہ ٹھاٹھ! دوکان دوکان کے قرضدار ہو رہے ہیں آتے ہی، ابھی تو میم صاحبہ کو تین مہینے اور رہنا ہے۔ سلیمان

کی چھٹی ختم ہو رہی ہے۔ وہ تو چلے جائیں گے پھر تنہائی میں اور بھی رنگ رلیاں منایا کریں گی۔ دوست تو بہت بن گئے ہیں۔"

"سلیمان کی بیوی کی میں نے کب تعریف کی، وہ تو کم علم اور فیشن کی پتلی ہے۔ ذکر تو احسان کی دلہن کا تھا جو مسز سلیمان سے کہیں زیادہ قابل گریجویٹ ہے۔ اس کے شوہر کی آمدنی سلیمان سے دوگنی ہے لیکن وہ امورِ خانہ داری پر کس قدر اپنا وقت صرف کرتی ہیں۔ سبحان اللہ اس کی آزادی اور بے پردگی بھی ہمارے سر آنکھوں پر۔ یہ ہے اعلیٰ تعلیم کا اچھا نمونہ۔ سلیمان کی میم صاحبہ کوئی تعلیم یافتہ نہیں۔ انہوں نے انٹرنس بھی پاس نہیں کیا۔ کچھ عرصہ مشن اسکول میں رہ کر معمولی انگریزی بول چال سیکھ لی ہے مگر خیر ایک طرف تو ہو گئی۔ وہ کلب گھروں کی رونق ہے، سوسائٹی کی جان ہے۔ اس نئی طرز کو اختیار کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے گھروں میں ڈنر پارٹیوں میں مدعو کی جاتی ہے۔ تم اپنی کہو اس دنیا میں نہ اس دنیا میں۔ خانہ داری سے بالکل بے تعلق۔ بچوں سے بے پروا، چوبیس گھنٹوں میں سے سولہ گھنٹے نیند کی نذر باقی فضول باتوں میں، چھالیہ کترنے اور پان کھانے میں صرف کر دیتی ہو۔ روزانہ گودام سے کس قدر جنس باورچی خانہ میں جاتی ہے۔ اس کا تمہیں علم نہیں ملازمہ عورتیں گھر لوٹ رہی ہیں۔"

نواب صاحب یہ تقریر کر کے اخبار دیکھنے لگے اور بیگم صاحبہ نے یہ سب سن لینے کے بعد برہم ہو کر یوں جواب دیا۔

"ہم سے تو وہ جھنجھٹ سر نہیں کیا جا سکتا جو کبھی نہیں کیا۔ اس سال بھاوجوں کو دیکھ کر آپ کو بھی نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہوا ہے۔ ہم سے نہ دونوں وقت آٹا دال تلوایا جائے، نہ آدھے درجن بچے نہلوائے جائیں، یہ شوق تھا آپ بھی کسی ایسی عورت سے شادی کر لیتے۔"

اتنے میں ماما ناشتہ لے آئی۔ سرکار نے چائے پی اور خاموشی کے ساتھ باہر چلے گئے۔

(۲)

ماہِ اگست آدھا گزر چکا ہے۔ ہفتوں جھڑی لگی رہتی ہے مگر آج کی صبح بہت دن بعد چمکیلا سورج نظر آیا ہے۔ مسٹر سالومن (سلیمان مرزا) سلیپنگ سوٹ اور ڈریسنگ گون میں اپنے بیڈروم کے آگے والے برآمدے میں کھڑے آسمان کو دیکھ رہے ہیں۔ مطلع صاف اور موسم خوش گوار دیکھ کر فوراً بیڈروم میں آئے۔ مسہری کا پردہ اٹھا مسز سالومن کو بیدار کرنے لگے۔

''صوفیا اٹھو (اُن کا نام صفیہ تھا) اٹھو جلدی کرو آج دن بہت اچھا ہے۔ سورج نکل رہا ہے۔ چلو باہر چلیں۔ مسٹر و مسز پرکاش کو ساتھ لے کر کہیں سیر کر آئیں۔''

صوفیا آنکھیں ملتی ہوئی بستر سے اٹھیں، وہ اس وقت سبز ریشمی سلیپنگ گون پہنے ہوئے تھیں۔ تراشے ہوئے سنہرے بال چہرہ پر بکھر رہے تھے۔ وہ باتھ روم جانے کو تھیں کہ باہر سے زور سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور بوٹوں کی کھٹ پٹ کے ساتھ ہی یہ آواز ''دونوں جلد باہر نکلو ورنہ ہم بیڈروم میں آتے ہیں'' اور فوراً ہی دروازہ کھول کر آنے والے سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ بیڈروم اور ڈرائنگ روم کا درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ مسز سالومن (صوفیہ) نے جلدی سے پھولدار ڈریسنگ گون اٹھا کر پہن لیا اور سگریٹ سلگاتی ہوئی اپنے بے تکلف دوستوں میں چلی آئیں، سالومن بھی ساتھ تھے۔ آنے والے اصحاب چھ تھے، تین لیڈیز اور تین جنٹلمین۔ دو بیاہے جوڑے مسٹر و مسز پرکاش۔ مسٹر و مسز ہر مزا اور ایک بن بیاہا جوڑا مسٹر کامران اور مس نجمہ۔ سب بیٹھ گئے تو مسز سالومن نے بیرے کو چائے یہیں لانے کا حکم دیا۔

''نہیں جی ہم اس وقت چائے اس گھٹے ہوئے کمرے میں نہ پئیں گے۔ آٹھ

دن سے روز صبح کمروں ہی میں بند ہیں۔ اس وقت مسز پرکاش نے چائے کا تھوڑا سا سامان آگے بھیج دیا ہے اور ہم آپ دونوں نیند کے ماروں کو جگا کر ساتھ لینے آئے ہیں۔''

بیرا چائے لے کر حاضر ہوا۔ پرکاش نے کہا۔

''ایک ایک پیالہ چائے آپ سب یہیں پی لیجیے اور باہر چل کر پئیں گے۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔''

مسز سالومن اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئیں اور اُن کی پیاری سہیلی مس نجمہ نے چائے بنا کر سب کو دی۔ اُن کے بننے والے شوہر مسٹر کامران نے اُن کی مدد کی۔ مسٹر سالومن بھی کپڑے بدلنے چلے گئے، اس وقت مسز ہرمزجی کچھ خاموش تھیں۔ پرکاش نے اُن کو چھیڑا۔

''مسز ہرمز! آج کیا لڑ کر آئی ہو؟ بالکل چپ ہو؟''

''اُن کا اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ زبردستی جگا کر لائی گئی ہیں۔ اس رنج میں چپ ہیں۔'' ہرمز نے بتایا۔

پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا: ''مسز ہرمز آپ جلدی جگائے جانے کا افسوس نہ کریں۔ ہم آپ کو وہاں پہنچ کر سونے کی جگہ بتا دیں گے۔ باقی نیند وہیں پوری کر لیجیے گا۔''

اس پر سب ہنسنے لگے۔

''یکا یک جگا دینے سے میرے سر میں درد ہو جاتا ہے اور ہرمز صاحب ہمیشہ مجھے یہی تکلیف دیا کرتے ہیں، ہم کہیں نہ جائیں گے! نجمہ چلو ہمارے ساتھ۔ گھر پر ہی رہیں گے۔'' فیروزہ ہرمزجی نے کہا۔

یہ سنتے ہی کامران گھبرا کر نجمہ کی شکل دیکھنے لگے کہ وہ کہیں چھوڑ کر فیروزہ کے ساتھ نہ چل دے۔

''ہرگز نہیں، نجمہ کیسے جا سکتی ہیں۔ یہ دونوں تو ہماری حراست میں ہیں۔ آپ ایسے دُکھ دینے والے شوہر ہرمز کو یہاں سے نکال دیں۔ فوراً آپ کا دردِ سر جاتا رہے گا۔'' پرکاش نے ہنستے ہوئے کہا۔

اب مسز سالومن بھی تیار ہو کر آ گئیں اور اُن کے پیچھے پیچھے مسٹر سالومن سگار کا

دھواں اُڑاتے کمرے سے برآمد ہوئے اور آٹھوں کھڑے ہوئے جس طرف پکنک کا سامان جا چکا تھا۔ مسٹر و مسز پرکاش کے ساتھ چل دیئے۔

بیڈروم ڈریسنگ روم اور ڈرائنگ روم کے سب کمرے کھلے پڑے تھے۔ یہاں تک کہ ڈریسنگ روم میں دونوں کے کپڑوں کی الماریوں تک کو بند نہ کیا گیا تھا۔ کیوں کہ انہیں جانے کی جلدی تھی۔ آیا اور بیرا کمرے میں داخل ہوئے، بیرے نے پہلے چائے کا سامان اٹھایا انڈے، توسٹ، مکھن اور تھوڑے پھل جو بچے تھے آپس میں دونوں نے تقسیم کئے اور تین کیلے اور دو بسکٹ ایک پلیٹ میں رکھ کر میم صاحب کے دکھانے کو الماری میں رکھ دیئے کہ اسی قدر باقی بچا تھا۔ آیا نے الماریاں بند کیں، کمرے درست کئے اور ایک چھوٹی سی سونے کی انگوٹھی جو غسل خانہ کی میز پر میم صاحب بھول گئی تھیں اٹھا کر جیب میں رکھ لی یہ سوچ کر اگر میم صاحب کو یاد بھی آئی تو کہہ دوں گی کہ آپ پکنک میں کہیں انگلی سے گرا آئی ہوں گی۔ گھر میں کھو جاتی تو مل جاتی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ہمیشہ اُن کی انگوٹھیاں، کان کے بندے، قیمتی ریشمی رومال، باہر سیر سپاٹوں میں گر جایا کرتے ہیں جس کی انہیں کبھی پرواہ نہیں ہوتی۔ بچوں کے اٹھنے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ دوسری آیا نے اُن کو اٹھا کر تیار کیا۔ ناشتہ دیا اور گاڑیوں میں بٹھا کر دونوں بچوں کو ہوا خوری کے لئے لے گئیں۔

خانساماں بازار سے گوشت ترکاری لے کر واپس آیا تو حسب معمول معلوم ہوا کہ میم صاحب باہر تشریف لے گئی ہیں۔ وہ نہ کبھی سودا دیکھتی تھیں اور نہ کبھی پکنے کا حکم دیتی تھیں جو اس کے جی میں آتا پکا دیتا تھا۔ جنس کے گودام کی کنجی بھی اس کے پاس ہی رہتی تھی۔ دونوں میاں بیوی کا کھانا وہ بھی انگریزی اور آدھ سیر تین پاؤ گھی روزانہ خرچ خانساماں لکھواتا تھا اور چربی سے سب کچھ تیار کرتا تھا۔

جب ایک بج چکا اور بوندا باندی شروع ہو گئی تو بارش کے خوف سے یہ پارٹی واپس آئی۔ سب سے پہلے کوٹھی مسٹر سالومن کی تھی باقی تینوں کے گھر دور تھے چنانچہ یہی لازم تھا کہ سب کو دوپہر کا کھانا کھلا کر آگے روانہ کیا جائے۔ چنانچہ مسز سالومن تو مہمانوں کو لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں اور مسٹر سالومن سیدھے خانساماں کے پاس کچن میں گئے۔ ان کی پریشان صورت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ مہمان ساتھ لائے ہیں۔

"جلدی بتاؤ خانساماں کتنا کھانا دے سکتے ہو۔؟ ہمارے ساتھ چھ صاحب لوگ اور ہیں اور تم نے دو کا تیار کیا ہوگا۔"

"حضور! ابھی دیتا ہوں۔ بریک فاسٹ بھی تیار ہے اور لنچ بھی۔ میم صاحب نے بریک فاسٹ کو منع نہیں کیا تھا اس لئے وہ بھی میں نے تیار کر رکھا ہے۔"

"بس بس بہت خوب!"

وہ تو کمرے میں چلے گئے اور خانساماں اور بیرے نے ایک آدھ چیز اور بڑھا کر کھانا میز پر بھیجا۔ چھری کانٹوں کی دھیمی دھیمی آواز کے ساتھ کھانے کے کمرے میں قہقہوں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ نجمہ بے چاری کو اس وقت سب تنگ کر رہے تھے۔ کیوں کہ اس کو ڈانس نہیں آتا تھا اور مسز سالومن اور مسز پرکاش اس کی ماہر بلکہ اُستاد تھیں۔ لنچ ختم کرکے جب ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھے تو اس وقت اپنی شرمندگی مٹانے کو مس نجمہ کونے میں رکھے ہوئے پیانو پر جا بیٹھی۔ ان کا پیانو کے پردوں پر ہاتھ رکھنا تھا کہ مسز پرکاش بے تابی سے کھڑی ہوگئیں۔ ان کو دیکھ کر مسٹر سالومن بھی اٹھے اور دونوں نے ڈرائنگ روم کے اگلے برآمدے میں آکر ڈانس شروع کر دیا۔ تب مسٹر پرکاش نے ملتجی نگاہوں سے صاحب خانہ مسز سالومن کی طرف دیکھا اور کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ مسز سالومن بھی ان کے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئیں اور چاروں ڈانس میں مشغول ہوگئے۔

کامران بھی ڈانس بہت اچھا جانتے تھے مگر اس وقت اُن کی طبیعت کچھ مکدر رہی تھی کیوں کہ ان چاروں نے اُن کی نجمہ کو ناچنا نہ جاننے پر بہت کچھ بنایا تھا۔ مس نجمہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہر موسیقی اور آرٹسٹ بھی تھیں لیکن اُن کے والدین نے اُن کو ہندوستانی یا انگریزی ناچ سیکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کمی کی وجہ سے بعض اوقات نئی سوسائٹی میں ان کو اپنی اس ناقابلیت پر جھینپنا پڑتا تھا جس کا مسٹر کامران کو بہت افسوس تھا کیوں کہ جلد ہی وہ اُن کی بیوی بننے والی تھیں۔ اب رات دن ان کی یہ فرمائش تھی کہ نجمہ جلدی سے ڈانس سیکھ لیں۔ چنانچہ وہ خود پیانو بجانے لگے اور مس نجمہ کو باہر بھیجا کہ ان کے دوستوں سے ناچ سیکھے جب مس نجمہ برآمدے میں آئیں تو مسٹر سالومن ہی اُن کے اُستاد بنے۔ اسی طرح اکثر اپنے اپنے گھروں پر اُن کو یہ دوست ڈانس سکھایا کرتے تھے۔

چار بج گئے اور چائے آ گئی، اس کے بعد سب باہر نکل گئے، گو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی مگر اس کی پرواہ کسے تھی پہلے "تگ" گئے اور وہاں سے چھ بجے سینما میں۔ وہاں سے آٹھ بجے سوائے ہوٹل میں جانا تھا۔ مسٹر و مسز پرکاش نے کھانے اور ناچ کی دعوت دی تھی لیکن بہت معذرت کے ساتھ مسٹر کامران و مس نجمہ اُن سے جدا ہو گئے تھے ورنہ بے چاری نجمہ کی دھجیاں اُڑاتے جب وہ نہ گئیں تو تنہا مسٹر کامران کو دعوت میں جانا گوارا نہ ہوا اور وہ دونوں ایک ڈبل رکشا کر کے گھر چلے مس نجمہ کو ان کے چچا کی کوٹھی "وائٹ ہاؤس" میں کلہری پہنچنا تھا۔ ان کو کچھ افسردہ دیکھ کر نجمہ نے پوچھا۔

"کامران! آپ اس وقت غیر معمولی خاموش ہیں۔ میرے ساتھ تو آپ کا وقت بہت ہی ہنسی خوشی گزرا کرتا ہے۔"

کچھ نہیں نجمہ! اُن کے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے کامران نے جواب دیا۔

"بہت دیر سے اسی فکر میں ہوں کہ خدا کرے جلدی سے آپ کو ڈانس کرنا آ جائے تو یہ دوست جو ہر وقت ہمیں چھیڑا کرتے ہیں، اس سے نجات ملے۔ اپنی اپنی بیویوں پر سب کو فخر ہے حالانکہ ان سب میں ایک بھی گریجویٹ نہیں سوائے میری نجمہ کے۔ نہ کوئی ایسا اچھا پیانو اور ستار بجا سکتی ہے نہ کسی کو اچھا گانا آتا ہے۔

"اچھے کامران! میری اس نا قابلیت پر آپ اتنا افسوس نہ کریں۔ میں آپ کو ابھی تھوڑے عرصہ میں یہ بھی سیکھ کر دکھا دوں گی۔ ذرا چچا جان نیچے چلے جائیں، وہ کل ہی کہہ رہے تھے کہ اسی ہفتہ میں لاہور واپس چلے جائیں گے پھر میں بہت سا وقت اس پر صرف کر سکوں گی۔ ابھی تو مجھ کو دس بجے شب تک ضرور گھر پہنچنا ہوتا ہے، ان کے بعد چچی جان زیادہ روک ٹوک نہ کریں گی۔"

مسٹر کامران نے اپنی منگیتر کو اس کے گھر پہنچایا اور خود اپنی جائے قیام پر جا کر آرام کیا اور قریب چار بجے صبح ہوتے ہوئے وہ خوش باش پارٹی یعنی مسٹر پرکاش کے آج شب کے مہمان تمام رات ڈنر، ڈانس اور برج وغیرہ میں بسر کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹے، آج چونکہ زیادہ تھکی تھیں اس لئے مسز سالومن دن کے دس بجے تک سوئیں، اُن کی بوڑھی آیا بہت تنگ ہو کر بڑبڑاتی رہی۔

"ہم یہ نوکری چھوڑ دیں گے ہمیں روپے تو ملتے ہیں لیکن جان نکل جاتی ہے۔

ایک دن میم صاحب گھر نہیں ٹکتیں۔ گارہ بجے بارہ بجے آنا تو ہر روز ہی کا کام ہے لیکن ہفتہ میں دو تین راتیں ضرور باہر گزارتی ہیں۔ نہ بچوں کی خبر نہ گھر کا ہوش! آخر ان کی دونوں جٹھانیاں بھی تو ہیں۔ بڑی بیگم صاحب کا تو کیا کہنا! فرشتہ ہیں۔ منجھلی دلہن باہر ناچ رنگ دعوت میں آتی جاتی ہیں اور گھر کے انتظام اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے انگریز گورنس بھی موجود ہے پھر بھی جب جاؤ انہیں کچھ نہ کچھ کام ہی کرتے دیکھو۔ وہ بھی تو آخر بہت پڑھی ہوئی ہیں ولایت بھی دیکھ آئی ہیں۔"

"میں خود تنگ آ گئی ہوں، مہینے بند سے میں کام چھوڑ دوں گی، صرف بچوں کا ہی تو نہیں، سارے گھر کا کام ہم دونوں پر پڑا ہے۔ خانساماں بھی جواب دے رہا ہے۔" دوسری آیا بولی۔

یہ سن کر بوڑھی آیا نے کہا۔ "اے وہ دُکھیا کیسے نہ چھوڑے، ہر روز بے خبر دسیوں آدمی حاضری اور کھانے پر ساتھ لئے چلے آتے ہیں۔ کمی پڑے تو ناراض ہوں، زیادہ پکار کھے تو مشکل جس گھر کا میاں بیوی رات دن باہر رہے گا، اُس گھر کا کیا حال ہوگا۔

(۳)

ابھی پانچ نہیں بجے، احسان مرزا صاحب اپنے بیڈروم میں محوِ خواب ہیں۔ اس بیڈروم کا سارا فرنیچر ہلکے سبز رنگ کا ہے اسی کے مطابق بیگم احسان مرزا نے پردے اور اپنی مسہریوں کا رنگ بھی سبز ہی رکھا ہے۔ مسہری کے قریب نماز کے لئے جو چھوٹی سی چوکی بچھی ہے اس پر سبز مخملی قالین اور سبز ہی جانماز ہے ڈرائنگ روم کے کلاک نے پانچ بجائے۔ بیگم احسان مرزا اپنی مسہری سے باہر نکل آئیں۔ دھانی سلیپنگ سوٹ پر سبز ڈریسنگ گون پہن کر غسل خانے گئیں وضو کیا اور نماز پڑھی اور قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں کہ آیا ''بیڈٹی'' لے کر حاضر ہوئی۔ احسان مرزا نے تو وہیں لیٹے لیٹے پیالی منہ کو لگالی اور بیگم صاحبہ نے تلاوت ختم کر کے وہیں چوکی پر چائے پی لی۔ اس کے بعد برابر والے کمرہ میں جس کا دروازہ اُن کے کمرہ میں کھلتا تھا اور جہاں اُن کے چاروں بچے سوتے تھے، گئیں بچوں کو دیکھا، آیا فوراً کھڑی ہوگئی۔ ساتھ کے ڈریسنگ روم سے بچوں کی انگریزی نرس مس جولیا بھی نکل آئی۔ انہوں نے چھوٹے بچے کی خیریت دریافت کی جس کو کل شام تھوڑا زکام ہوگیا تھا۔

نرس نے بتایا ''اب چھوٹا بے بی بالکل ٹھیک ہے اس کی ناک میں ''مستول'' ڈال کر گرم کپڑے پہنا دیے تھے۔

''کچھ ٹمپریچر تو نہیں ہوا؟'' بیگم صاحبہ نے پوچھا اور پھر خود جھک کر رضائی ہٹا کر بچے کا جسم دیکھنے لگیں۔

''نرس! آج ان کو احتیاطاً غسل نہ کراؤ موسم ٹھنڈا ہے اور دیکھو بڑے دونوں بچوں کو بھی آیا سے اپنے سامنے غسل کرانا۔ کیوں کہ مجھے آج فرصت نہ ہوگی۔ ہمیں ابھی

تھوڑی دیر میں چند دوستوں کے ساتھ پکنک پر جاتا ہے۔

یہ ہدایات دے کر بیگم صاحبہ اپنے ڈریسنگ روم میں آئیں۔ لباس تبدیل کیا۔ گو یہ بھی اوّل درجہ کی فیشن ایبل لیڈی تھیں لیکن انہوں نے بال نہیں کٹوائے تھے۔ دس پندرہ منٹ میں انہوں نے اپنے گھنگھریالے بال بنائے۔ عنابی ریشمی ساڑی پہنی لباس بدل کر برآمدے میں آئیں جس کے ایک کونے میں گودام کی کوٹھری تھی۔ آیا نے قفل کھولا اور جنس تول کر خانساماں کو دی۔ بیگم صاحبہ نے اُن کے کھانے کے متعلق خانساماں کو حکم دیا۔

"حضور بریک فاسٹ تیار نہ ہو گا؟"

"نہیں ہم اس وقت مسٹر و مسز ایڈورڈ کے ساتھ پکنک کو جا رہے ہیں، صبح کی چائے اور بریک فاسٹ ان ہی کے ساتھ باہر ہو گا، لنچ تیار رکھنا۔"

"خانساماں سلام کر کے چلا گیا تو انہوں نے بچوں کی آیا کو بلا کر پوچھا" سب بچوں کو ناشتہ کرا دیا؟ ابھی کوئی سو رہا ہے؟"

"حضور! چھوٹا بے بی ابھی سو رہے ہیں۔"

"آج اُن کو ذرا دیر سے باہر نکالنا۔ ہم باہر جا رہے ہیں، دونوں چھوٹوں کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ آج اتوار ہے۔ مس صاحب (نرس) گرجے جائیں گی تم آیا لوگ سب حاضر رہنا۔"

اتنے میں صاحب بھی تیار ہو چکے تھے دونوں روانہ ہو گئے اور ٹھیک ایک بجے واپس آئے۔ صاحب نے کپڑے تبدیل کئے۔ بیگم صاحبہ سیدھی نرسری میں آئیں۔ بچوں کو دیکھا تھوڑی دیر وہاں بیٹھی رہیں۔ اُن سے بات چیت کی۔ دونوں بڑی لڑکیوں کو جن کی عمر بھی سات اور آٹھ سال کی تھیں، آج شام کو سینما میں ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا۔

آیا خبر لائی کہ چار صاحب لوگ آئے ہیں۔ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ سن کر وہ فوراً ڈریسنگ روم میں گئیں، لباس تبدیل کیا اور ڈرائنگ روم میں آئیں۔

"اوہو! آپ کہاں سے آ گئے۔ کوئی خط نہ خبر۔" بیگم نے کہا۔

"جناب ہم کوئی آپ کے مہمان بن کر نہیں آئے ہیں۔ آپ سے لنچ نہیں مانگ رہے ہیں، بے خبر آئے ہیں تو آنے دیجئے!" نوجوان مہمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہم ان کو کھانا کھلا کر لائی ہیں۔" آنے والی بیگم بولیں۔

اتنے میں کھانے کے کمرے سے گھنٹی کی آواز آئی۔ دونوں میاں بیوی کھڑے ہو گئے۔

"اچھا کھائیے نہیں چل کر میز پر ہمارے ساتھ بیٹھئے تو وہیں باتیں کرتے رہیں گے۔ ہم کئی میل چل کر آئے ہیں، بھوک لگ رہی ہے۔"

احسان مرزا یہ کہتے ہوئے مع اپنے چاروں دوستوں کے ڈائننگ روم میں آئے، ان دونوں نے کھانا کھایا اور اُن چاروں نے تاش شروع کیا۔ دو گھنٹے یوں ہی گزر گئے۔ یہاں تو ناچ ہو رہا تھا۔ بیگم احسان مرزا نماز ظہر کے لئے اپنے کمرے میں آ گئیں۔ ساڑھے چار بجے شام کا لباس تبدیل کر کے بچوں کو دیکھنے گئیں۔ دونوں بڑی لڑکیاں کتاب میں تصویریں چپکا رہی تھیں۔ تین سالہ بچہ فرش پر بیٹھا لکڑی کے رنگین ٹکڑوں کو جوڑ کر کچھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نرس موجود تھی۔ سب سے چھوٹا ایک سالہ بچہ پالنے میں پڑا ہنس رہا تھا اور آیا جھلا رہی تھی۔ بیگم صاحبہ نے اسے جھولے سے اٹھا کر گود میں لے لیا اور لئے ہوئے باہر کے شیشے والے برآمدے (گلیزورانڈے) میں آ گئیں۔ موٹا تازہ نہایت خوبصورت سنہرے بالوں کا بچہ سب کو بہت ہی پیارا لگا۔ ان کی دوست بیگم حامد نے اُٹھ کر ان کی گود سے لے لیا۔ ان سے اس نوجوان نے چھین لیا جو آج ہی آئے تھے۔ بیرا چائے لے آیا۔

یہ لوگ چائے پی رہے تھے کہ اُن کی دوست اندرا اور ان کی دیورانی کی سہیلی مس نجمہ آ گئیں۔ یہ دونوں ناکتخدا لڑکیاں تھیں اور مس نجمہ کی نسبت اس نوجوان سے ہو کر چھوٹ چکی تھی جو آج دوپہر سے یہاں مہمان ہے۔ اُن کے داخل ہوتے ہی مسٹر جمیل کی کچھ عجیب کیفیت ہو گئی اور انہوں نے اخبار اُٹھا کر دیکھنا شروع کیا اور نجمہ بھی سب کو سلام کر کے اور جمیل سے نظر بچا کر ایک طرف کو بیٹھ گئی۔ چائے وہ دونوں پی کر آئی تھیں۔ بیگم احسان کے بچہ کو لے کر نجمہ اس سے کھیلنے لگیں۔ ان سب کو نجمہ و جمیل کی نسبت چھوٹ جانے کا بہت افسوس تھا۔ جمیل بھی اس لڑکی کو پسند کرتے تھے مگر ایک رسومِ قدیم کے پابند خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والد کو کالج کی پڑھی بے پردہ لڑکی بہو بنانی پسند نہ تھی۔ کیا عجب اتفاق ہے کہ جس لڑکی کو آزاد خیال کہہ کے ناپسند کیا گیا تھا اب اس کو کامران سا آزاد شوہر ملا ہے۔

ان کے آنے سے کچھ خاموشی سی چھا گئی۔ مسٹر جمیل کے دوست یعنی بیگم حامد کے بھائی قمر جو اپنے دوست کی دلی کیفیت سے متاثر ہو رہے تھے کھڑے ہو گئے اور کہا۔

''جمیل! اٹھو آج اسکیٹنگ کے لئے نہ چلو گے آپا جان اگر آپ کو اور بیٹھنا ہے تو ہم دونوں چلتے ہیں۔ پانچ بج چکے۔ مسٹر و مسز حامد بھی کھڑے ہو گئے۔

بیگم احسان مرزا نے کہا اور بغیر اجازت یہ سب کے سب کیسے کھڑے ہو گئے آپ سب میں سے کوئی ہرگز نہیں جانے پائے گا۔ مسٹر جمیل کلکتے سے نہ جانے کب کے آئے ہوئے ہیں اور آپ انہیں چھپائے بیٹھے رہے، اب ہمارے ہاتھ لگے ہیں تو نہ جانے پائیں گے۔''

یہ سن کر مسٹر قمر نے جواب دیا'' آج صبح ہی تو پہنچے ہیں۔ انہوں نے فوراً آپ کو یاد کیا تھا اور ہم لے کر حاضر ہو گئے۔ اچھا تو ہم پھر بھی آجائیں گے۔ بیٹھے بیٹھے چھ گھنٹے ہو گئے۔ ذرا ٹہل آئیں پھر آجائیں گے۔

''نہیں بھئی، اب یہاں سے کوئی نہیں جا سکتا۔ آج ہمیں اپنی دونوں بچیوں کو سنیما لے جانا ہے۔ جب کوئی اخلاقی اور مذاقیہ فلم آجاتی ہے تو میں ان کو ضرور دکھا دیتی ہوں۔ وہ چاروں اور نجمہ اور اندرا بھی اس وقت ہمارے ساتھ چل کر پہلا شو دیکھ آئیں۔'' بیگم احسان مرزا نے کہا۔

''ہم کو تو دن میں کچھ لطف نہیں آتا۔'' مسٹر قمر بولے۔

''یہ ٹھیک ہے مگر بچوں کو اسی وقت دکھایا جا سکتا ہے۔ رات کے شو میں اُن کی نیند خراب ہوتی ہے۔'' احسان مرزا نے کہا۔

مس اندرا کھڑی ہو گئیں اور بیگم احسان سے جانے کی اجازت طلب کی۔ ''بیگم صاحب مجھ کو اور نجمہ کو تو سنیما کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہے۔ ہم کو تو معاف ہی کریں۔''

''ہاں سنا جاتا ہے مس نجمہ صاحبہ کو سنیما کا تو نہیں لیکن اب ڈانس کا زیادہ شوق پیدا ہو گیا ہے۔'' مسٹر قمر نے کہا۔

''پیدا نہیں ہو گیا ہے۔ جبراً پیدا کیا جا رہا ہے۔ اب جس فضا میں ان کو زندگی گزارنی ہو گی اس کے لئے اپنے کو بنانا چاہئے نا؟''

کرسی پر ہاتھ ٹیک کر کھڑی ہوئی اندرا نے اپنے چہرے سے بال ہٹا کر جو ہوا کے جھونکے سے بکھر گئے تھے۔ قمر کو جواب دیا۔

"کاش یہی خیال ایک سال قبل پیدا ہو جاتا اور آئندہ زندگی کے مطابق کچھ تبدیلی کر لی جاتی۔" مسٹر حامد نے کہا۔

"اس میں کچھ ان بے چاری کا دخل نہ تھا۔ ان کے والدین نے ہی نجمہ کی آئندہ زندگی پردے میں گزارنی پسند نہ کی۔ آج کل کی کوئی تعلیم یافتہ لڑکی یہ مصیبت برداشت کرنے کو تیار نہ ہوگی۔" اندرا نے مسٹر حامد سے کہا۔

"یہ درست! لیکن ان کے والدین کو غالباً یہ امر بھی ناپسند نہ ہوگا کہ ان کی بیٹی ڈاکٹر پرکاش اور مسٹر سلیمان کی شاگردی کرے۔ آخر یہ بھی تو چچا جان سے پوشیدہ ہی ہوتا ہے مگر چونکہ معاشرت جدید کا سب سے دلچسپ مشغلہ ہے، بس نجمہ نے اپنے ہونے والے شوہر کی خوشی کے لئے اختیار کیا اور شریف مسلمانوں کی قدیم طرزِ معاشرت سے خوف زدہ ہوگئیں۔ اتنا نہ سوچا کہ آخر جمیل احمد تو اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہے اور اُن کو اس کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوتی نہ کہ ان کے والدین کے ساتھ۔" مسٹر حامد نے کہا۔

نجمہ کی اس وقت عجب حالت تھی۔ ان کی نظریں زمین میں گڑی تھیں۔ جمیل تو یہاں سے اُٹھ کر ٹہل رہے تھے۔ دروازہ کا پردہ ہٹا اور بیگم احسان مرزا کی دونوں پھول سی خوبصورت بچیاں رعنا اور ریحانہ سفید ریشمی فراکوں میں اچھلتی کودتی باہر آئیں اور ممی سے کہا۔

"چھ بجنے والے ہیں امی چلئے کہیں کھیل شروع نہ ہو جائے۔"

"ابھی چلتے ہیں دس منٹ ٹھہرو۔ میں عصر کی نماز پڑھ کر ابھی آئی۔ وہ دیکھو نجمہ خالہ بیٹھی ہیں ان سے باتیں کرو۔"

یہ کہہ کر بیگم احسان مرزا نماز پڑھنے کے لئے اندر چلی گئیں اور پھر سب اُن کے ساتھ سنیما کے لئے روانہ ہوگئے، ساڑھے آٹھ کے قریب واپس آئے۔

مسٹر و مسز حامد، اُن کے بھائی مسٹر قمر اور ان کے دوست جمیل چاروں کو آج شب کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے اور بیگم احسان اندر آئیں، پہلے اپنے بچوں کو دیکھا وہ دونوں سو چکے تھے۔ رعنا اور ریحانہ کو نرس کے سپرد کیا۔ آیا نے انہیں کھانا

کھلا کر سلا دیا۔ بیگم احسان خود باورچی خانہ پہنچیں، انگریزی اور ہندوستانی کھانوں کا رنگ دیکھا، خوشبوئیں سونگھیں، پڈنگ پر بیرے نے جو آئیسنگ کی تھی اس کو ناپسند کیا اور یہ رائے دی کہ سرخ اور سبز رنگ سے اس پر گلاب کے پھول بنادو تو کچھ عیب چھپ جائے گا۔ ہم نے تم کو تین بجے حکم دے دیا تھا۔ کافی وقت تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کام کر سکتے تھے۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سب کھانے پر جمع ہوگئے۔ دس بجے یہاں سے اٹھے۔ ڈرائنگ روم میں آئے۔ ریڈیو کے گانے تو شام سے سن رہے تھے اس وقت مسز جمیل نے بیگم احسان سے پیانو کی فرمائش کی۔ انہوں نے پیانو اور بیگم حامد نے ستار بجا کر سنایا۔

(۴)

دن کے دو بجے ہوں گے۔ مینہ خوب برس کر ابھی تھما تھا۔ مسٹر قمر اور ان کے دوست جمیل ٹہلنے کو گھر سے دو تین میل نکل آئے تھے۔ یہاں ایک سرسبز پہاڑی پر دونوں بیٹھ گئے۔ جمیل کی طبیعت کچھ سست اور مضمحل سی ہو رہی تھی، وہ بیٹھتے ہی گھاس پر لیٹ گئے تو مسٹر قمر نے اُن کا سر اُٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور کہا:

"جمیل میں نے تم کو کس قدر سمجھایا لیکن تم پر ذرا اثر نہ ہوا۔ مسوری آئے تمہیں ایک ہفتہ ہو گیا بجائے طبیعت بشاش ہونے کے پژمردہ ہوئے جاتے ہو۔ عقل ماری گئی ہے۔ جس کے لئے تم پریشان اور زندگی سے بیزار ہو رہے ہو۔ وہ کتنی شاداں و فرحاں ہے اور اس کی بے مروتی اور بے پروا ہی کو دیکھو کہ تمہارے سامنے ایک دوسرے شخص کے ساتھ کس طرح پھرتی ہے۔ پرسوں رات تم نے دیکھا۔ سنیما میں کامران کے ساتھ کس طرح بیٹھی تھی۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ پہچانا اور پرواہ نہ کی۔"

یہ سن کر جمیل نے جو آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ قمر کی طرف دیکھ کر کہا: "تب ہی تو میں کہتا ہوں کہ مجھے مسوری سے چلا جانے دو۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں بجائے طبیعت بحال ہونے کے زیادہ خراب ہی ہوتی جائے گی۔ پیارے قمر! میں سب جانتا ہوں لیکن دل ہی تو ہے کسی طرح نہیں سمجھتا۔ مجھے زیادہ رنج یہ ہے کہ کیسی اچھی اور شریف لڑکی اپنے بھولے پن کی وجہ سے ایک شراب خوار اور بدکردار کے پھندے میں پھنس گئی اور نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جب شادی ہو گئی پھر کچھ نہ ہو سکے گا اور ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائے گی۔"

قمر ہنس کر بولے: "کیا خوب! اب آپ کو یہ فکر ہے اپنے سے چھن جانے کا غم نہیں بلکہ اس کی آئندہ بربادی کا افسوس ہے۔ ارے عقل مند! جب اس نے تم سے بیوفائی

کی۔تم جیسے شریف، نیک اور محبت کرنے والے شخص کو چھوڑ کر ایک آوارہ انسان سے منسوب ہوگئی تو جہنم میں جائے۔اپنے کئے کی سزا پائے بلکہ تم کو خوش ہونا چاہئے کہ تم سے جدا ہو کر شاد نہ رہ سکے گی۔''

یہ الفاظ سن کر جمیل ایک دم اُٹھ بیٹھے اور چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا:''ایسا ہی خیال کروں تو یہ میری انتہائی خودغرضی ہے جس کو میں گناہ سمجھتا ہوں اگر نجمہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوگئی تو ہو جائے لیکن میری دلی تمنا ہے کہ وہ اس دنیا میں شاد و آباد رہے، افسوس اپنی ناسمجھی یا غلط فہمی کی وجہ سے وہ ایک برے شخص کا ساتھ دینے کو تیار ہوگئی۔لیکن خدا اس کی مدد کرے اور کامران کو نیک راستہ دکھائے کہ وہ اس لڑکی کو خوش رکھ سکے۔چلئے چار بج چکے ہیں بیگم حامد چائے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔''

قمر بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں گھر کی طرف چلے۔لائبریری بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک دوکان کے سامنے ایک ڈبل سیٹ کا رکشا کھڑا نظر آیا۔قمر نے رفتار دھیمی کر دی پھر تو مسٹر جمیل کی بھی نظریں اٹھیں۔کیا دیکھتے ہیں کہ اس دوکان کی سیڑھیوں پر نجمہ اور کامران کھڑے کسی شخص سے باتیں کر رہے ہیں۔کامران کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا چھوٹا سا بنڈل اور نجمہ کی چھتری ہے۔کامران تو اس شخص سے باتوں میں اس قدر مصروف تھے کہ ان کی طرف دیکھا تک نہیں لیکن نجمہ جیسے ہی سیڑھیوں سے اتر کر رکشا کی طرف آ رہی تھیں ان کی نگاہ قمر اور جمیل پر پڑی۔فوراً آنکھیں نیچی کئے رکشا میں بیٹھ گئی۔بے چارہ جمیل اس منظر کی تاب نہ لاسکا اور قمر کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر تیز قدمی سے آگے کو چل دیا۔دو تین منٹ بعد کامران بھی رکشا میں سوار ہوگئے اور نہ معلوم ان کی رکشا کدھر کو چل دی۔جمیل چند قدم چل کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ان کے بعد قمر بھی آپہنچے اور کہا:

''دیکھا اس بے وفا لڑکی کے لئے ابھی دعائیں مانگ رہے تھے؟!ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی اور کس بے حجابی سے اس کے ساتھ گھوم رہی ہے۔''

''اس بے باکی کا موجب کامران ہے نہ کہ وہ،اپنے خیالات کے مطابق اس کو زندگی بسر کرنا ہے جس کی یہ ابتدا ہے۔یہ تو ہم ہی کم حوصلہ تھے کہ اپنے دلی خیالات و جذبات کا اس کے سامنے اظہار نہ کر سکے اور خاندانی رسم و رواج کے پابند رہے جس کا نجمہ

پر اچھا اثر نہ ہوا۔ خیر وہ کامران کے لئے تھی اس کو مل گئی۔ چلئے گھر چلیں۔ کہتے ہوئے جمیل کھڑے ہو گئے۔

قمر نے مسکرا کر کہا: ”کہیں راستہ میں وہ رکشا پھر نہ مل جائے اور پھر آپ کو کہیں بیٹھنا پڑے۔“

مسز سالومن اپنے ڈرائنگ روم میں صوفے پر نیم دراز تھیں۔ آج مسٹر سالومن تنہا کہیں گئے تھے۔ جہاں یہ نہ جا سکتی تھیں۔ اخبار پڑھتے پڑھتے ان کی آنکھ لگ گئی کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا، جس کے کھٹکے سے وہ جاگ گئیں اور دیکھا کہ سامنے پریشان خاطر نجمہ کھڑی ہیں۔ بہت سادہ لباس ہے۔ بال چہرے پر بکھرے رنگ زرد ہو رہا ہے۔ ان کے اُٹھتے ہی وہ آنکھوں پر رومال رکھ کر روتی ہوئی اُن سے لپٹ گئیں اور کہا:

”دیکھو صوفیا میں تباہ ہو گئی۔ ہائے میں برباد ہو گئی۔“

”کیا ہوا؟ پیاری نجمہ! کچھ کہو تو۔ آج ایسی کیا گزری جس سے تم اس قدر بے حال ہو؟ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ کامران کا چال چلن کچھ دن سے خراب ہے۔ میں اور مسٹر سالومن اکثر سوچا کرتے ہیں کہ تمہارا رشتہ اس آوارہ شخص سے نہ ہونے دیں لیکن آج تو تم عجیب حالت میں ہو۔ مفصل کہو میں بے چین ہوں۔ ہائے اللہ اتنا نہ روؤ۔ میرا دل ہلا جاتا ہے۔“

صوفیا نے یہ کہہ کر اپنے رومال سے نجمہ کے آنسو خشک کئے اور کرسی پر اسے بٹھایا تو اس نے کہنا شروع کیا:

”کیا بتاؤں، پیاری صوفیا! میں تو حیران ہوں، میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ یہ آخر کامران کو کیا ہو گیا۔ یہ تو بہت اچھا نظر آتا تھا۔ سب کی رائے سے میں نے اس کی رفاقت قبول کر لی چند ہی دن میں یہ کیا ہو گیا۔ اس اینگلو انڈین لڑکی پر وہ جان دینے لگا۔ شروع کی ملاقاتوں کا حال تو میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ وہ یہ کہہ کر مجھے دھوکہ دیتا رہا کہ وہ میرے ایک دوست کی منگیتر ہے لیکن آج مجھ پر سب حال کھل گیا اور میں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس کو میری ذرہ برابر پرواہ نہیں ہے اور وہ اس کی طرف مائل ہے۔ یہ تو آپ جانتی ہیں کہ وہ کس قدر شراب پیتا ہے۔ شروع شروع میں جب میں نے اس پر اعتراض کیا تو بھائی سالومن نے کہہ دیا تھا کہ کبھی کبھی تھوڑی سی پی لینا کچھ برا نہیں۔ میں خاموش ہو رہی لیکن اس ماہ میں

تو اس نے اندھیر کر دیا۔ میں نے ایک دن اس کے کمرے میں جا کر ماہوار حساب دیکھا تو پندرہ دن کا شراب کا بل تین سو روپے کا تھا اور ہر وقت مجھ سے بچ بچ کر ڈورس سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اب صبح کی سنئے، چند دن سے میرا تو دل بے حد پریشان اور بے چین رہتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں بہت گھبرائی کیوں کہ وہ تین دن سے میری طرف نہیں آئے تھے۔ میں خود ہی ان کے ہوٹل میں پہنچ گئی۔ ڈرائنگ روم کھلا تھا۔ اندر داخل ہوئی۔ ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں پردے سے کان لگا کر سننے لگی۔ آپ کو کیا بتاؤں؟ میں نے کیا کیا سنا اور کیا کیا دیکھا! آپ بھی عورت ہیں سوچئے، میرا ہونے والا شوہر ایک دوسری لڑکی کے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہے۔ سامنے چھوٹی سی میز پر ایک بوتل دو گلاس رکھے ہیں، دونوں کے ہاتھوں میں سگریٹ ہیں اور کامران ڈورس کے سنہرے گھونگریالے بالوں پر اپنی انگلیوں کو الجھا کر کھیل رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے:

”ڈورس تم گھبراؤ نہیں؟ میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گا۔ تم جانتی ہو ہم مسلمان ہیں۔ ہم ایک سے چار تک شادیاں کر سکتے ہیں۔ اب جہاں میری شادی ہو رہی ہے۔ وہ جگہ میں چھوڑ نہیں سکتا۔ کر لینے دو۔ تمہارا کیا حرج ہے۔ کچھ عرصہ بعد تم سے بھی کر لوں گا۔“

یہ سن کر ڈورس صاحبہ جواب دیتی ہیں کہ ”ہاں میں جانتی ہوں کہ آپ دوسری شادی تو کر سکتے ہیں لیکن مجھے یہ گوارا نہیں کہ تمہاری دوسری بیوی بھی ہو۔ ابھی کوئی نکاح تو ہو ہی نہیں گیا۔ آپ اس منگنی کو توڑ سکتے ہیں اگر نجمہ سے محبت ہے تو مجھ کو چھوڑ دیجئے۔“

وہ بولا: ”ڈورس یہ بہت مشکل ہے۔ میں تم سے انتہائی محبت کروں گا اور تم کو ہمیشہ ساتھ رکھوں گا لیکن نجمہ کو چھوڑنا آسان نہیں ہے۔ وہ ایک بڑے اور معزز گھرانے کی لڑکی ہے اور میرے نہایت معزز دوستوں نے بیچ میں پڑ کر یہ رشتہ کرایا ہے۔ اس کے علاوہ نجمہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ میرا کہنا مانتی ہے۔ اس نے چند دن میں ڈانس کرنا سیکھ لیا۔ میں دو دن نہیں ملتا تو بے چین ہو جاتی ہے۔ آج تیسرا دن ہے کہ تم نے مجھے اس کی طرف نہیں جانے دیا۔ وہ بہت پریشان ہو گی۔ میں اُسے کیا منہ دکھاؤں گا۔ یہی سوچا ہے کہ بیماری کا عذر کیا جائے گا۔“

کامران سے یہ سن کر ڈورس نے کہا: ”ہمیں کسی طرح یہ پسند نہیں، میں چاہتی

ہوں کہ آپ کسی دوسرے کی شکل نہ دیکھئے یا تو مجھے صبر کر کے نجمہ سے شادی کر لیں اور یا نجمہ سے قطعِ تعلق کریں۔"

"میں سردست نجمہ سے تو قطع تعلق نہیں کر سکتا۔ یہ سیزن ختم ہونے پر میری شادی ہونے والی ہے۔ ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اپنے ڈورس کو بھی بیاہ لاؤں گا۔ اس وقت کوئی میرا کچھ نہیں کر سکتا۔"

یہ کہتے وقت نجمہ کی آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے اور اس نے حواس بجا کر کے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ سن کر مجھ میں کھڑے رہنے کی تاب نہ رہی۔ اپنی آئندہ تباہی کے خیال سے میں چکرا کر وہیں گر گئی اور چند منٹ بعد میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ وہ ظالم بد باطن شخص میرے سرہانے بیٹھا ہے، میں فوراً اٹھ بیٹھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا:

"تمہیں اختیار ہے۔ مجھے معاف نہ کرنا لیکن سن لو کہ اصلیت کیا ہے۔"

میں نے جھلا کر کہا: "بس بس اب میں کچھ سننا نہیں چاہتی" اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ "آج کے بعد میں آپ کی شکل تک نہ دیکھوں گی، بالکل قطع تعلق۔ آزادی کے ساتھ ڈورس سے شادی کیجئے۔ میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا گناہ کیا جو اس کیریکٹر کے انسان سے اچھی توقعات پر زندگی بھر کے ساتھ کا تہیہ کر لیا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میں نے تین چار ماہ بڑی مہذبانہ لیکن بڑی غیر شریفانہ زندگی گزاری۔ بس مجھے جانے دو اور بے خوف ایک ڈورس ہی نہیں دس بیس کم عقل لڑکیوں کو دھوکا دے کر تباہ کرو۔ میں ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ اس کمرے سے نکلی۔ وہ زینے تک میرے پیچھے دوڑا۔ میں نے ہوٹل کے پھاٹک پر رکشا لیا اور روتی پیٹتی اپنے کئے پر پشیمان ہوتی سیدھی آپ کے پاس پہنچی۔ بتاؤ بہن! اس کے سوا مجھ کو اس وقت اور کیا کرنا چاہئے تھا؟

"تم نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا۔ اب اس کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ ہم اس کی اچھی طرح خبر لے کر ہمیشہ کے لئے دوستی چھوڑ دیں گے اور تمہارے لئے اور اچھے سے اچھا دولہا تلاش کریں گے۔" مسز سالومن نے جواب دیا۔

''بس جناب میں بھر پائی۔ اب دولہا نہیں چاہئے۔ کافی بدنام ہوئی۔ ایک قدیم شریف گھرانے کی لڑکی ناچ گھروں میں گئی۔ غیر شخص کے ساتھ آزادانہ گھومتی پھری مگر خدا جانتا ہے۔ میں نے اس کو اپنی آئندہ زندگی کا مالک سمجھ کر ایسا کیا۔ کچھ تفریح کی غرض سے نہیں۔ میرا خدا معاف کرے۔ یہ مجھ پر صبر پڑا ہے۔ آہ اس فرشتہ خصال انسان کا جس کو چھوڑ کر اپنے فیشن ایبل دوستوں کے کہے میں آکر اپنے کو برباد کرلیا۔'' یہ کہتے ہوئے نجمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا۔ پھر مسز سالومن بولیں:

''نجمہ پیاری اتنا رنج نہ کرو، ایسے واقعات دنیا میں روز ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ایک لڑکی کی کئی کئی نسبتیں ہو کر چھوٹ جاتی ہیں۔ ہاں سنو مجھے یاد آیا۔ آج کل سنا ہے کئی مہینے سے تمہارا پہلا منگیتر جمیل بھی تو یہیں ہے۔ کئی دن ہوئے ہماری منجھلی بھابی کے ہاں ڈنر پر ہم سے بھی ملا تھا اور لو پرسوں رات ہی تو جب ہم اور تم سینما میں بیٹھے تھے تو وہ بھی مسز حامد کے بھائی کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ واقعی وہ بہت شریف انسان ہے۔ اس کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت رنجیدہ اور مغموم رہتا ہے۔ ایک روز مسز حامد صاحبہ بھابی جان سے ذکر بھی کررہی تھیں کہ ہم نے کئی لڑکیاں مسوری پر جمیل کو دکھائیں لیکن وہ کسی طرح شادی پر رضامند نہیں ہوتا۔ واقعی اس کو اب تک تمہارا خیال ہے۔''

''آہ اس کا تو ذکر ہی نہ کرو۔ میری بدنصیبی تھی۔ مجھے دنیا میں ذلیل وخوار ہونا تھا جو میں نے اس انسان نہیں فرشتہ کا ساتھ چھوڑا تھا۔ مجھے اس کی سزا دنیا میں مل گئی اور ملے گی۔'' ''میرے سر میں بہت درد ہے میں آپ کے پلنگ پر جا کر لیٹتی ہوں۔ کھڑے ہو کر نجمہ نے کہا اور بیڈ روم میں چلی گئی۔ اس کے پیچھے مسز سالومن بھی اُٹھ گئیں۔

(۵)

شام ہو چکی تھی۔ آج گھر میں سناٹا تھا۔ مسٹر و مسز حامد مع اپنے بھائی قمر کے ایک جگہ ڈنر پر جا چکے تھے۔ بے چارہ جمیل تنہا گھر پر رہ گیا تھا۔ کمرے میں پڑے پڑے اکتا گیا تو باہر آ کر مسز حامد کے چھوٹے سے خوبصورت باغیچے میں پتھر کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی پھیل چکی تھی۔ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوا چل رہی تھی۔ اس وقت ایک عجیب سماں تھا۔ بالکل تنہائی اور رات کی اداسی اور ایک اکیلا شخص یہاں اپنے خیالات میں مستغرق بیٹھا تھا۔ گھر کے لوگ دعوت میں تھے۔ سب ملازمین بھی کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ انہوں نے اس وقت سلیپنگ سوٹ پر ایک گرم سوئٹر کوٹ پہن رکھا تھا۔ بال بے ترتیب پیشانی پر بکھر رہے تھے۔ وہ بنچ پر کہنی ٹیکے اپنے ہاتھ پر سر رکھے ہوئے نیچے دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی کسی کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ پھاٹک کی طرف سے سیاہ اوور کوٹ پہنے باغیچے کی طرف ایک عورت آتی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید مسز حامد کی کوئی ملنے والی ہوں گی۔ جب قریب آئیں گی اُن سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ چند سیکنڈ میں یہ کہتی ہوئی وہ عورت بالکل اُن کے قریب آ گئی۔

"معاف کیجیے مسٹر قمر! میں ذرا بے وقت آئی ہوں۔ ہمشیرہ کہاں ہیں؟ میرا خیال تھا اس وقت وہ بھی یہیں ہوں گی کیوں کہ اکثر شام کو وہ باغیچے میں ملا کرتی ہیں۔"

یہ آواز سن کر جمیل چونک پڑے۔ آنے والی کی طرف دیکھا اور ایک دم کھڑے ہو گئے مگر اس وقت اُن کی عجیب حالت تھی۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

دو تین منٹ تک جب آنے والی لڑکی کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ بھی حیران سی ہو گئی۔ کبھی چاروں طرف دیکھتی تھی، اور کبھی اُن کی طرف۔ پھر کہا:

''کیا مسٹر اور مسز حامد گھر پر نہیں ہیں؟''

جمیل نے بڑی ہمت سے کام لے کر کہا''جی نہیں وہ لوگ آج کہیں ڈنر پر گئے ہیں۔''

''آپ ڈنر پر تشریف نہیں لے گئے؟''

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔''

''اچھا آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟ بالکل تنہائی میں آپ نے کیسے وقت گزارا؟''لڑکی نے کہا۔

''میں تنہائی سے نہیں گھبراتا۔ میری تو زندگی ہی تنہائی میں بسر ہو رہی ہے اور آئندہ ہوگی۔ کہیے آپ اس وقت کیسے تشریف لائیں؟ آپ تو مدت سے اس طرف نہیں آئی تھیں؟''

''جمیل صاحب میں بھی ایک ہفتہ سے بیمار ہوں۔ اس وقت چونکہ کوٹھی سے یہاں تک پیدل آنا ہوا۔ اس لئے بہت تھک گئی ہوں۔ کیا میں تھوڑی دیر کے لئے یہاں بیٹھ جاؤں؟ ذرا تکان کم ہو جائے تو واپس چلی جاؤں گی۔''

جمیل نے کہا:''ضرور ضرور آپ تشریف رکھیں، میں اندر سے کشن لے آؤں، یہ بنچ پتھر کا ہے۔''

''نہیں نہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ یہی ٹھیک ہے۔''یہ کہہ وہ بنچ پر بیٹھ گئیں۔''

''میں بھی کئی ماہ سے تندرست نہیں۔ آج تو دن میں بخار بھی تھا۔''یہ کہہ کر جمیل وہیں بنچ کے پاس گھاس پر بیٹھ گئے۔''

''اُن کو گھاس پر بیٹھا دیکھ کر وہ بھی اُٹھ کر وہیں گھاس پر بیٹھ گئیں۔''

''اس وقت یہاں بیٹھنا بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ کیسی مخملی گھاس ہے لیکن آپ کو آج ٹمپریچر رہا ہے تو یہاں ٹھنڈ میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔''لڑکی نے کہا۔

جمیل نے جواب دیا:''اوہ! میں اتنی احتیاط نہیں کرتا لیکن آپ کا رات کے وقت گھاس پر بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ اٹھئے پھر بنچ پر ہی بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں جمیل صاحب یہاں بہت اچھا ہے، میں اپنا کوٹ اتار دیتی ہوں۔ آپ گھاس پر بچھا لیں تو ٹھنڈک کم ہو جائے گی۔''یہ کہہ کر انہوں نے اپنا اوور کوٹ گھاس پر

بچھادیا اور بہت اصرار سے جمیل کو اس پر بٹھادیا۔ خود وہ عنابی جارجٹ کی ساڑی پہنے تھیں جو سبز گھاس پر بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ جمیل اس وقت بہت حیران تھے کہ اس قدر مہربانی سے کیوں پیش آ رہی ہے۔ آخر انہوں نے سوال کیا:

"نجمہ صاحبہ! میں حیران ہوں کہ آج کیا دیکھ رہا ہوں، کیا یہاں بیچ پر میری آنکھ تو نہیں لگ گئی۔ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں؟ یا عالم بیداری ہے؟ تین ماہ سے میرا قیام مسوری میں ہے۔ اس عرصہ میں بارہا آپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہیں مسز حامد کے یہاں دو ملاقاتیں ہوئیں لیکن آپ نے مجھے کبھی سلام کرنے یا بات کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ آج آپ کی تبدیلی مزاج سے سخت متعجب ہو رہا ہوں۔ کیا میں اس کا سبب دریافت کر سکتا ہوں؟ آج کی یہ غیر معمولی عنایت کیسی؟ کیا آپ مسوری سے جا رہی ہیں جو آخری ملاقات کا موقعہ دیا؟ اور اس وقت آپ تنہا کیوں ہیں۔ وہ خوش نصیب کامران کہاں ہیں؟"

جمیل کے ان سولات پر نجمہ مصیبت زدہ نجمہ سرنگوں ہو گئیں اور ایک ہاتھ پر سر ٹیک کر زمین کی طرف جھکالیا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو جمیل اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے سامنے آبیٹھے اور پھر کہا:

"شاید آپ کو میرے سوالات گراں گزرے۔ معاف کریں۔ تھوڑا وقت ہے اور غالباً یہ آخری ملاقات ہے؟"

نجمہ خاموش رہی تو جمیل نے کہا: "غالباً آپ کو نیند آ رہی ہے چلئے میں آپ کو آپ کی کوٹھی تک پہنچادوں۔"

یہ سن کر نجمہ نے پہلے اپنے رومال سے اپنی آنکھوں اور چہرہ کو پونچھا اور سر اٹھایا۔ جمیل کی طرف عجیب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر جواب دیا:

"جمیل صاحب! نہ مجھ کو نیند آ رہی ہے اور نہ ابھی گھر جانا چاہتی ہوں، مجھے تو بہت کچھ آپ سے بیان کرنا تھا لیکن اب تابِ گویائی نہیں۔ اچھا پھر کسی دن سہی، ہاں آپ کے سوالات کا جواب کیا عرض کروں۔ میں اس وقت اس طرف کیوں کر چلی آئی۔ میں خود حیران ہوں۔ دل کچھ پریشان سا تھا۔ میرا خیال تھا تھوڑی دیر مسز حامد سے باتیں کر کے واپس آ کر سو رہوں گی۔ یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ آپ اب تک یہاں تشریف رکھتے ہوں گے

مگر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اس عرصہ میں بارہا آپ کو دیکھا تھا لیکن بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ آج بھی اگر گھر کے لوگ ہوتے تو غالباً میں آپ سے بات نہ کر سکتی۔ میں ابھی مسوری سے نہیں جا رہی لیکن ایک بار آپ سے ملنا ضرور چاہتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج موقعہ مل گیا۔ میرے تنہا آنے کی بابت آپ کیا پوچھتے ہیں؟ آپ کے خیال میں اس وقت جن کو میرے ساتھ ہونا تھا، وہ کئی دن سے مجھ سے نہیں ملے۔ میرا خیال ہے آج کل وہ مسوری میں نہیں۔ کسی ضرورت کی وجہ سے شاید وہ دہرہ دون گئے ہوئے ہیں۔ سچ کہئے جمیل صاحب! آپ تو مجھ سے بہت ناخوش ہوں گے؟ دراصل میں اس قابل بھی نہیں کہ آپ مجھ سے بات چیت بھی کریں۔ نہ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہمیشہ مجھ سے دوستانہ تعلقات رکھ کر ملتے رہیں۔ بس میری تو ہر طرح زبان بند ہے۔''

جمیل بولے ''نجمہ! میں بالکل تم سے ناخوش نہیں بلکہ میں اکثر اوقات تمہاری آئندہ زندگی کے لئے دُعا کیا کرتا ہوں۔ میں ہمیشہ یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم خوش ہو۔''

نجمہ نے مسکرا کر کہا: ''صرف سننا چاہتے ہیں۔ دیکھنا نہیں چاہتے؟ ہاں دیکھنا ذرا مشکل ہے۔''

نجمہ نے پھر یہی الفاظ دہرائے: ''ہاں بالکل درست ہے، دیکھنا بہت مشکل ہے۔'' اچھا کہئے آج کے بعد پھر کب مل سکیں گے۔''

نہایت افسردگی کے ساتھ جمیل نے جواب دیا۔ ''کیا بتاؤں؟ دل تو چاہتا ہے کہ بارہا ملا جائے لیکن حالات کے مطابق ہمیں ایک دوسرے سے ملنا نہیں چاہئے اور خصوصاً کامران کی بغیر اجازت اُن کی غیر موجودگی میں تو بالکل ہی درست نہیں۔''

نجمہ یہ سن کر پریشان ہو گئیں اور چلنے کے لئے اٹھیں۔ جمیل بھی کھڑے ہو گئے اور دونوں پھاٹک تک آئے تو نجمہ کہنے لگیں:

''اچھا جمیل صاحب! آپ اس کا تو خیال نہ کریں کہ مجھے اُن کے بغیر اجازت آپ سے نہ ملنا چاہئے۔ میں اپنے پہلے رشتہ داروں یا دوستوں کو ان کی وجہ سے چھوڑ نہیں سکتی اور نہ انہوں نے مجھے منع کیا ہے۔ اچھا کل آپ شام کو مسز سانومن کے یہاں تشریف لائیے۔ میں بھی وہیں آ جاؤں گی۔''

"نہیں نجمہ میں کامران کے پیچھے چھپ چھپ کر تم سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ چلو تم کو کوٹھی تک پہنچادوں۔ نو بج رہے ہیں۔ تنہا جانا ٹھیک نہیں"

آج مسز سالومن نے مسز قمر اور مسز جمیل کو چائے پر بلایا ہے اور اپنی پیاری سہیلی نجمہ کو مدعو کیا ہے۔ مسٹر سالومن اس چائے پر موجود نہیں تھے۔ وہ دو تین دن سے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ بارش تو آج صبح سے نہیں ہوئی۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ مسز سالومن نے اپنے باغیچے میں چائے کا بندوبست کیا تھا۔ جب چائے ختم ہوگئی تو چاروں نے بیڈمنٹن شروع کیا۔ اور سب تو خوش تھے لیکن جمیل ذرا خاموش اور فکرمند نظر آرہے تھے۔ شام ہوتے ہی ٹھنڈ معلوم ہونے لگی۔ نجمہ نے اپنا چھوٹا کوٹ پہن لیا۔ صوفیہ سب کو ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔

"اب تو رات ہوگئی۔ بیگم صاحب اب تو اجازت ہے۔" قمر نے صاحبِ خانہ سے کہا۔

"ابھی سے؟ وقت ہی کیا گزرا ہے۔ شاید سات بجے ہوں گے۔ گانا باجہ تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ سنا ہے جمیل صاحب بہت اچھا وائلن بجاتے ہیں۔ ہمیں سنائیں گے؟" مسز سالومن نے کہا۔

"اب تو مدت سے نہیں بجایا۔ بھول گیا۔" جمیل نے جواب دیا۔

"اچھا تو آپ جمیل صاحب کو بٹھائیے مجھے یہیں قریب تھوڑا سا کام ہے۔ آدھ گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔ پھر دونوں چلیں گے۔" یہ کہہ کر قمر صاحب چلے گئے۔

مسز سالومن بولیں: "جمیل صاحب شاید آپ کی عادت ہی ایسی ہو۔ مجھے آپ سے ملاقات کا کم موقعہ ملا ہے لیکن اس وقت غیر معمولی افسردہ اور خاموش ہیں کیوں نجمہ ہے نا میرا خیال درست۔"

"میں نے کچھ غور نہیں کیا۔ اُن کی طبیعت تو سنا ہے کئی دن سے ٹھیک نہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"آپ کا خیال صحیح ہے۔ اس مرتبہ مسوری کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں آئی۔ جانا چاہتا ہوں تو قمر صاحب ہلنے نہیں دیتے۔ حیران ہوں کہ کیا کروں۔" جمیل نے جواب دیا۔

"میم صاحب! ذرا دو منٹ کو چلئے۔ بابا لوگ نے بہت دق کیا ہے۔ آپس میں

مار پیٹ ہو رہی ہے۔ سنی صاحب نے چھوٹی بے بی کو مارا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے گر گئی ہیں۔" آیا بہت گھبرائی ہوئی آئی اور یہ خبر دی جس کو سن کر میم صاحب بچوں کی طرف گئیں۔

نجمہ نیچی نگاہیں کیے خاموش بیٹھی تھیں۔ چند منٹ کمرے میں سکوت رہا۔ پھر جمیل ہی بولے: "میری تو صحت ٹھیک نہیں اس وجہ سے میں بشاش نہیں ہوں لیکن آپ کیوں اس قدر افسردہ ہیں؟ کامران صاحب کی طبیعت تو درست ہے؟ پرسوں شام انہیں بہت تکلیف پہنچی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" نجمہ نے پوچھا۔

جمیل نے جواب دیا: "اتفاق کی بات پرسوں شام جدھر وہ ٹہلنے گئے تھے اسی طرف میں بھی جا نکلا۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ وہ تیز قدم اٹھائے جا رہے تھے کہ اُن کا پیر ایک پتھر پر پڑا جس سے غالباً موچ آ گئی اور وہ سنبھل نہ سکے اور گر گئے۔ میرے سوا کوئی شخص نہ تھا جو ان کو سنبھالتا۔ یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ وہاں میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے اُن کو اٹھایا اور بوٹ اتار کر پاؤں دبایا اور اپنے رومال سے کس کر باندھ دیا اور جب ان کی تکلیف ذرا کم ہوئی تو ان کو وہاں چھوڑ کر بہت دور سے رکشا لایا اور ان کو بٹھا کر ان کی جائے قیام کو روانہ کیا۔"

"کیا آپ اُن کو پہچانتے ہیں؟ یا ایک راہ گیر سمجھ کر ترس کھایا۔" نجمہ نے پوچھا۔

"نہیں جناب! میں اُن کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" جمیل نے جواب دیا۔

"کیا انہوں نے آپ کو پہچان لیا؟ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کو نہ جانتے ہوں گے۔" نجمہ نے کہا۔

جمیل بولے: "وہ بھلا مجھ گمنام کو کیوں جاننے لگے۔ چلتے وقت میرا نام پوچھا اور شکریہ کا اظہار کیا۔"

یہ سن کر نجمہ نے مسکرا کر کہا۔ "سچ کہیے آپ کو اتنی ہمدردی اُن سے کیوں ہو گئی؟"

"اس لیے کہ آپ کی زندگی ان سے وابستہ ہے۔"

نجمہ نے سر جھکا کر ازراہِ تشکر کہا: "دلی شکریہ، احسان مند ہوں کہ آپ نے میری وجہ سے ایک مخمور گناہ گار شخص سے اس قدر ہمدردی کی۔"

جمیل نے کہا: "ان کا مخمور ہونا تو کچھ برا نہیں۔ لیکن آپ نے بیچارہ کو گناہگار کیوں بتا دیا؟"

جمیل صاحب! "ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب کوئی بات حد سے سوا ہو جائے۔ پھر ناموزوں اور تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی اس عادت سے پریشان ہیں۔ اچھا کہیے اب آپ مسوری کتنے دن اور ہیں۔"

"میں تو ہر وقت پا بر کاب ہوں، لیکن خدا جانے کیا سبب ہے کہ مسوری سے نکلنا مشکل ہو گیا اور یہاں کچھ خوش بھی نہیں۔"

"آپ یہاں سے کلکتہ ہی جائیں گے؟"

"ہاں جانا تو گھر ہی چاہیے۔ بہت دن ہو گئے آئے ہوئے۔ والدہ پریشان ہوں گی۔"

"اچھا ہم بھی چند دن کے لیے کلکتہ کی سیر کو آئیں گے۔ آپ تو اپنے گھر کیا ہی ٹھہرائیں گے۔ کہیں ہوٹل میں رہنا ہوگا؟"

"ہمارا گھر اس قابل کہاں کہ آپ ٹھہر سکیں۔ غالباً آپ دونوں ہی جائیں اور کامران ضرور ہوٹل میں ٹھہریں گے؟"

"جی نہیں! میں تنہا آؤں گی۔ میں آپ ہی کے ہاں ٹھہرتی لیکن آپ کی والدہ مجھ جیسی آزاد خود سر لڑکی کو پسند نہ کریں گی۔ خیر آپ سے ملاقات تو ضرور ہوگی؟"

"قمر نے بہت دیر لگا دی۔ اب مجھ کو چلنا چاہیے۔ مسز سالومن بھی گھر کے کسی کام میں لگ گئیں۔ میرا یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں۔"

جمیل سے یہ سن کر نجمہ صوفے سے اُٹھیں اور ان کے قریب والی کرسی پر یہ کہتی ہوئی آ بیٹھیں۔ "نہیں آپ ابھی نہیں جا سکتے، اس مکان پر آپ مناسب نامناسب کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔ یہ میری بے تکلف سہیلی کا گھر ہے مجھے آپ سے بہت کچھ عرض کرنا ہے۔"

"بے شک آپ کا بے تکلف گھر ہے۔ لیکن میرے لئے یہ سب نازیبا ہے کہ کامران کے دوستوں کے گھر گھنٹوں بیٹھا رہوں۔"

"اب کامران کی حرکتوں کی وجہ سے اُن سے کوئی زیادہ خوش نہیں ہے۔ مسز

سالومن تو ان کو بہت ناپسند کرنے لگی ہیں۔ ان ہی لوگوں کے غلط انتخاب کی وجہ سے میری زندگی برباد ہوئی۔ خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں نے اپنے کیے کی سزا پالی۔ عمر بھر کے لئے تباہ ہوگئی۔"

"اس قدر نا امید اور پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ خدا بہتر کرے گا۔ ان کی عادتیں سنبھل جائیں گی۔" برآمدے سے آواز آئی۔ "جمیل چلو بہت دیر ہوگئی۔" پردہ اٹھا اور مسز سالومن بھی یہ کہتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ "معاف کیجئے مجھے بہت دیر ہوگئی۔ میری لڑکی پھسل کر جو گر گئی تھی اسے بہت چوٹ آئی۔ اسے بہلا کر اور کھانا کھلوا کر آئی ہوں۔ آپ تو کھڑے ہی ہوگئے۔"

"اب اجازت دیجئے قمر آگئے ہیں۔ وہ باہر بلا رہے ہیں۔" یہ دونوں بھی ساتھ آئیں اور باہر آکر اُن دونوں کو رخصت کیا۔ پھر کمرے میں آکر یہ باتیں ہوئیں۔

"کہو نجمہ۔ بے چارے جمیل سے کیا کیا باتیں کیں۔"

کوئی خاص بات نہیں اصل یہ ہے۔ مسز جمیل فرشتہ ہے خدا خوش رکھے۔ نجمہ نے جواب دیا۔

"کچھ بات دوبارہ بنتی نظر آتی ہے؟ وہ رضامند ہو سکتا ہے۔ مسز سالومن نے پوچھا۔

"توبہ کیجئے، نہ اب میں اس قابل نہ وہ قبول کر سکیں گے۔ مجھ کو جس طرح آزادانہ اس بدکردار کے ساتھ گھومتے دیکھا ہے۔ کوئی شریف غیرت مند شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ خطاؤں کو معاف کردے اور آئندہ مجھ سے دوستی اور ہمدردی رکھے۔ بس میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اچھا اب میں بھی جاؤں۔ بہت دیر ہوگئی۔"

یہ سن کر مسز سالومن بہت نا امید ہوئیں اور افسردگی و مایوسی سے کہا۔

"افسوس کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس ملاقات کا۔ میرا خیال تھا کہ تم اس کو درست کرلوگی۔ پھر ہم اس جگہ اسی سیزن میں کامران کمبخت کو دکھا دیتے کہ اگر تم ایک ذلیل اینگلو انڈین لڑکی کو لے کر مغرور ہو تو ہم نے بھی تم سے بہتر شخص پالیا۔ اچھا پیاری نجمہ کھانا تو

کھالو۔ پھر میں خود تم کو چل کر پہنچاؤں گی۔"

مسٹر قمر و جمیل اُن کی کوٹھی سے تھوڑی دور نکل آئے تو یہ گفتگو ہوئی۔

"جمیل آج کل کیا بات ہے۔ پھر تجدید تعلقات ہو رہی ہے۔ مسز سالومن بھی نہ تھیں۔ تنہائی میں کیا کیا باتیں ہوئیں؟ تم سے نجمہ کیوں ملنے لگیں۔ مسز سالومن نے کیوں بلایا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پیارے قمر! حیران ہوں، یکبارگی اس کے خیالات میں کیوں تبدیلی ہوگئی۔"

"ہاں۔ اور سنو!" قمر نے بات کاٹ کر کہا۔ اُس وقت جو میں بازار گیا تو عجب معاملہ دیکھا۔ بلیرڈ کی میز پر کامران ایک جوان یورپین لڑکی سے بے تکلف باتیں کر رہا تھا۔ اس کا دوسری عورت سے ملنا نجمہ کا تمہاری طرف راغب ہونا عجیب معاملہ ہے۔ ممکن ہے اس لڑکی سے ملتے دیکھ کر نجمہ کے دل پر چوٹ لگی ہو۔ اچھا تو ہے اگر یہ نسبت چھوٹ جائے۔

یہی ذکر کرتے ہوئے دونوں دوست گھر پہنچ گئے۔

(۷)

"قمر! کیا جمیل صاحب کی شادی ہوگئی؟" بیگم حامد نے اپنے بھائی سے یہ سوال کیا۔ جب کہ وہ اخبار کے مطالعہ میں محو تھے۔ کچھ جواب نہ ملنے پر انہوں نے دوبارہ پوچھا تو قمر نے جیب سے ایک خط نکال کر بہن کو دے دیا جو یہ تھا:

"پیارے قمر"

غالباً تم کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آخر کار میں والدین کا ایک ہی بیٹا ہونے کے جرم میں باوجود سخت مخالفت، ضد اور کسی قدر بے ادبی کے پابند سلاسل تاہل کر دیا گیا مگر بے حد رنجیدہ ہوں کہ بدعہد اور بے وفا خیال کیا جاؤں گا۔ گذشتہ ہفتہ کو عقد ہوا ہے۔ رسم رخصتی آئندہ ماہ میں قرار پائی ہے۔ امید ہے کہ آخر نومبر تک آپ لوگ بھی مسوری سے اتر آئیں گے۔ اب تو بہت سردی ہوگی۔

میری طرف سے جناب باجی بیگم حامد صاحب سے عرض کرنا کہ تمہارے ساتھ وہ دونوں اس رسم بے کار میں شریک ہو کر عزت بخشیں۔ غالباً ۲۲ر دسمبر تاریخ گرفتاری ہے۔ تم ضرور سوال کرو گے کہ کہاں شادی ہو رہی ہے۔ سنو میرے چچا کی بیٹی ہے۔ دیکھی بھالی ہے۔ کہتے ہیں کہ حسین ہے اور پرائیویٹ میٹرک پاس ہے۔ پردہ کی بھی پابند ہے۔ خدا میرے ساتھ خوش رکھے۔ بہت فکر مند ہوں۔ میں تو یوں گرفتار کیا گیا کہ میرے والدین کی قطع نسل نہ

ہو مگر وہ بے چاری بے گناہ ایک ایسے شخص کے ساتھ وابستہ کردی گئی
جس کو اس سے ذرا بھی محبت نہیں۔ اللہ یہ بیڑا پار کرے۔ دعا کرو۔"

تمہارا
جمیل

بیگم حامد نے اس خط کو دو تین بار پڑھا اور بہت دیر سر پکڑ کر کسی سوچ میں پڑ گئیں۔ اب بھائی اخبار ختم کر چکے تھے۔ بہن سے بولے:

"باجی جان! یہ شادی کیسی ہوئی؟ شادی یا بربادی؟"

"میں خود ہی سوچ رہی ہوں۔ رات مجھے تمہارے اور جمیل کے دوست رتن لال نے سینما میں یہ کہا کہ "مبارک ہو، وہ وحشی بھی اب انسان بن جائے گا۔" تم نے بتایا ہی نہ تھا۔" بیگم حامد نے جواب دیا۔

"آج صبح ہی تو یہ خط ملا ہے رتن لال کے پاس پہلے آگیا ہوگا۔"

قمر نے کہا۔

"نجمہ آج کل کہاں ہیں، وہ اپنے ہونے والے شوہر سے بہت ناخوش تھی۔ تمہیں کہیں ملی ہے؟" بیگم حامد نے سوال کیا۔

یہی تو غضب ہوگیا۔ باجی جان رات ہی سنا گیا ہے۔ کامران کمبخت نے اس کرسچن لڑکی سے شادی کرلی۔ نجمہ سے قطع ہوگیا۔ ابھی نکاح تو ہوا ہی نہ تھا۔ نجمہ کئی روز سے نظر نہیں آئی۔ غالباً مسوری میں نہیں ہے۔ بے چارہ جمیل شادی کر کے شادی سے بیزار رہے گا اور وہ ناسمجھ لڑکی خدا جانے کیا کیا مصیبتیں اٹھائے گی۔"

یہ سن کر بیگم حامد نے بہت افسوس سے کہا۔ "کاش ابھی جمیل کا رشتہ نہ ہوتا اگر جمیل کو علم ہو جاتا کہ نجمہ کا بیاہ کامران سے نہ ہوگا تو وہ ہرگز نہ کرتا۔ والدین کو منت وسماجت سے رضامند کر لیتا۔ آہ غریب بھولی نجمہ! خودسری اور فیشن پرستی کا کیسا برا نتیجہ پایا۔ مسٹر و مسز سالومن نے اس کو تباہ کیا۔ اب کیا کرے گی۔ اپنے گھر والوں سے بھی شرمندہ اور دنیا میں بھی بدنام۔ حسب پسند رشتہ کا انتخاب کرنا لڑکی لڑکے کا اس باب میں خودمختار ہونا لازمی ہے

مگر ایک حد تک کامران کو وہ خود نہ جانتی تھی۔ بیگی کے کہنے میں جمیل ایسا فرشتہ خصال انسان ہاتھوں سے کھویا اور پریشان ہوئی۔"

قمر نے کہا" باجی! اب تو ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جمیل کا نکاح ہو گیا۔ جمیل کے دل میں اس لڑکی کی محبت دے کہ زندگی خوشگوار گزرے۔"

☆

(۸)

شکیل منزل کلکتہ کے پائیں باغ میں آج کوئی پردہ پارٹی تھی۔ شام کے سات بجے تک سب مہمان بیبیاں اور لڑکیاں رخصت ہو گئیں، اور صاحب خانہ کی حسین و جمیل لڑکی شکیل آرا بیگم تنہا رہ گئیں تو انہوں نے باوجود سخت سردی کے اسی جگہ نماز مغرب ادا کی اور اس کے بعد سرخ شال اوڑھ کر باغیچہ کے ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئیں۔ ہاتھ میں خط تھا جس کو صحنِ باغ کے لیمپ کے آگے کئی بار پڑھ چکی تھیں۔ وہ اس وقت کسی گہرے سوچ میں بیٹھی تھیں کہ قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا سامنے سے اُن کا چچازاد بھائی جمیل آرہا ہے جس سے وہ اب پردہ کرتی تھیں۔ جمیل صاحب بہت تیز آرہے تھے۔ جلدی سے آگے بڑھے اور شکیل آرا کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ شکیلہ نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور رومال سے منہ چھپالیا مگر جمیل صاحب نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ کر رومال ہٹا دیا اور خود وہیں زمین پر اُن کے سامنے بیٹھ گئے اور کہا۔

"شکیلہ! تم پڑھی لکھی لڑکی ہو؟ ہم جیسے قریبی رشتہ داروں میں پردہ کیسا؟ اور اب تو ہم میں پردہ بہت ہی نامناسب ہے۔ ٹھیک طرح بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو۔"

"یہ سن کر لڑکی نے سر اونچا کیا اور شرماتے ہوئے جواب دیا۔" یہ سب صحیح ہے لیکن جب بزرگوں کا حکم ہے تو اس کے خلاف نہیں کرنا چاہئے۔ ابھی کوئی آ گیا تو کیا ہوگا۔"

جمیل بولا" آجائے، مجھے پرواہ نہیں۔ میں اس وقت اس لئے آیا ہوں کہ تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ سنا ہے تم بہت مغموم رہتی ہو جس دن سے عقد ہوا ہے۔ ہر وقت روتی ہو۔ یہ حالات سن کر میں بدنصیب سخت پریشان ہوں۔ صرف اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ رنج و غم افسردگی آخر کیوں؟ تمہیں میرے حالاتِ زندگی معلوم ہیں پہلے رشتہ

سے بھی باخبر ہو۔ مجھ کو اس سے بے حد محبت تھی۔ اس کی بھی راز دار ہو۔ آخر میری "بنت عم" ہو (یہ لفظ "بنتِ عم" جمیل نے ذرا مسکرا کر کہا جس پر وہ ہنس پڑیں) تاہم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارا ہمدرد ہے۔ اس پر بھی رشتہ تمہیں ناپسند تھا تو پندرہ روز قبل والدین سے کہلوا دیا ہوتا۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ بجائے رونے کے زندگی ہنس کر گزارنا چاہئے تھا۔ شکیل آرا تم جس سے وابستہ کی گئیں وہ اس قدر برا نہیں ہے۔"

اپنے ہونے والے شوہر سے یہ باتیں سن کر شکیلہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ یہ تو تھے ہی شکستہ دل انہوں نے بھی ساتھ دیا۔ پندرہ منٹ تک خاموش دونوں روتے رہے۔ شکیلہ اب بنچ سے اُٹھ کر اُن کے قریب گھاس پر آ بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت سرخ جارجٹ کی ساڑی اور سرخ دوشالہ میں لال پری معلوم ہو رہی تھی۔ کانوں میں یاقوت مرصع کے بہت بڑے بڑے آویزے گلابی رخساروں پر لٹک رہے تھے۔ وہ روتے روتے بے حال ہوتی جاتی تھی۔ جمیل صاحب کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بچوں کی طرح چمکارتے بہلاتے مگر شکیلہ سے صبر نہ ہوتا تھا آخر وہ اس کو یہاں سے اُٹھا کر بارہ دری میں لے گئے اور کوچ پر لٹا دیا۔ جب ذرا حواس بجا ہوئے تو پھر اس سے یہی سوال کیا۔

"شکیلہ تمہارا جمیل اس قدر تو غالباً برا نہیں کہ تم اُس سے بیاہی جانے سے اس قدر پریشان ہو۔ بتاؤ جو چاہتی ہو۔ میں کرنے کو تیار ہوں اگر میرے بجائے کسی اور سے رشتہ چاہتی تھیں تو وہ بھی بتا دو۔ میں ہر طرح تمہارا خادم ہوں، ہمدرد ہوں، مددگار ہوں گو نکاح نے ہم دونوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تاہم ہم دونوں مسلمان ہیں۔"

جمیل کے اس آخری فقرے پر شکیلہ پھر بے تاب ہو کر رونے لگی۔ بہت دیر بعد کچھ سنبھلی تو سیدھی بیٹھ کر جمیل کے قدموں کی طرف جھک کر کہا۔

"میں آپ کی بنت عم نہیں، اب ہمدردی کا دعویٰ نہیں ہے، شکیلہ آپ کی ادنیٰ کنیز ہے۔ مگر افسوس کہ آپ کے دل میں میری طرف سے بہت برے خیالات ہیں۔ آہ! میں آپ کے اس حسنِ ظن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ للہ یہ خیال دل سے نکال دیں۔"

جمیل نے پوچھا: "کیا خیال۔ شکیلہ صاف کہو کون سا خیال؟"

"یہ کہ میں آپ کے سوا کسی اور کی قدر کرتی ہوں۔ آپ مجھ کو پسند نہ کریں۔ مجھ

سے محبت نہ کریں مگر میں تمام عمر پرستار کنیز ہوں۔"

جمیل نے کہا" یہ خیال تو میرے دل میں یوں آئے کہ سنا جاتا ہے کہ تم نکاح کے دن سے برابر رو رہی ہو۔ کیا یہ غلط ہے؟"

شکیلہ نے کہا" غلط نہیں درست ہے مگر آپ غلط سمجھے ہیں۔ مجھ کو رنج یہ ہے کہ آپ اپنی پہلی قابلِ قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ حسین منسوبہ کے رنج میں مبتلا ہیں اور شادی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے والدین زبردستی گرفتار کر رہے ہیں۔ اس حالت میں میری گزر کیسے ہوگی؟ میں نجمہ کے برابر قابل نہیں، حسین نہیں، مجھ سے ان کو محبت نہیں، ورنہ خدا جانتا ہے کہ ایسا قابل، نیک "ابن عم" جسے ملے وہ ناشکری کرے؟ مگر آپ کی قسمت پر افسوس ہے اور اس خیال میں مری جاتی ہوں۔ خدا کرے میری خدمت ومحبت واطاعت آپ کو پسند آجائے اور آپ کا کچھ غم غلط ہو۔"

شکیلہ کے یہ خیال سن کر جمیل کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کہا۔

" بھول جاؤ میرے گذشتہ حالات کو اور دعا کرو کہ میں بھی بھول جاؤں، میں اب تمہارا ہوں جیسا کچھ بھی ہوں۔ تم خوشی سے قبول کرو۔ اللہ مجھ کو توفیق دے کہ تم کو خوش رکھ سکوں۔"

(۹)

مسٹر جمیل اپنی لائبریری کے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ اس وقت کچھ پریشان سے تھے کہ ملازم نے صبح کی ڈاک پیش کی جس میں دو اخبار اور ایک لوکل خط تھا۔ کلکتہ کی مہر اور نشان خط سے پہچان نہ سکے کہ کس کا خط ہے۔ اُلٹ پلٹ کر کھولا۔ لکھا تھا۔

جمیل صاحب!

"میں تین ماہ سے یہاں قیام پذیر ہوں مگر آپ کو اب تک نہیں دیکھ سکی۔ یہاں کے مسلم گرلز ہائی اسکول میں ٹیچر ہوگئی ہوں۔ باہر بہت کم نکلتی ہوں۔ ارادہ تھا حاضر ہو کر نیاز حاصل کروں مگر ہمت نہیں پڑتی، دس ہفتے گو گزر گئے لیکن اس ہفتہ سے میں بیمار ہوگئی۔ غالباً ملیریا ہے۔ سخت تکلیف میں ہوں۔ بے چاری پرنسپل صاحب بہت مہربان ہیں۔ خبر گیری کرتی ہیں مگر پھر پردیس ہے۔ تنہائی اور علالت۔ کیا اُمید کر سکتی ہوں کہ کسی وقت تشریف لا کر اس بدنصیب غریب الوطن مریضہ کو دیکھ جائیں گے۔

دعا گو

نجمہ

خط پڑھ کر وہ اور بھی پریشان ہوگئے۔ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کیا کریں۔ اب وہ خودمختار جمیل نہیں بلکہ عقد کے بعد سے وہ اپنے آپ کو کسی کا پابند سمجھنے لگے تھے اور نجمہ کا خیال بھی بھلانا چاہتے تھے مگر علالت کی خبر سے گھبرا گئے اور اس خط کے ساتھ یہ رقعہ لکھ کر ملفوف کر کے ملازم چھو کرے کے ہاتھ "شکیل منزل" اپنی بیوی کے پاس بھیج دیا۔

ڈیر شکیلہ!

ابھی یہ خط ڈاک سے ملا ہے۔ اس سے قبل تمہیں معلوم ہے کہ میں اتنی خبر بھی نہ رکھتا تھا کہ نجمہ کہاں ہے؟ خیال تھا کہ شادی ہوگئی ہے مگر اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کلکتہ میں ملازمت کر رہی ہے۔ خدا جانے کیا سبب ہے؟ چونکہ پردیس ہے۔ اس بے چاری کی خبر لینی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ضرور ہمدردی ہوگی۔ کسی وقت جا کر دیکھ آؤ اور مناسب امداد کرو۔"

تمہارا
جمیل

۱۵ منٹ بعد اس کا جواب لڑکا لایا:

جمیل صاحب!

آپ کا ارشاد بسر و چشم منظور، میں جانے کو تیار ہوں مگر میرا تنہا جانا ٹھیک نہیں۔ وہ کیا جانیں کہ کون ہیں اور بتادوں کہ وہ ہوں تو اور غریب کو صدمہ ہوگا۔ پہلے آپ آج تنہا جا کر دیکھ آئیں اور میرا ذکر کریں۔ پھر کسی دن کوئی موقعہ نکال کر مجھ کو لے چلیں۔ آپ سے یہ رسمی پردہ نہ حائل ہوتا تو آسانی تھی۔ اب تو میرا جانا وقت طلب ہے۔"

آپ کی
شکیلہ

اس رقعہ کا جواب جمیل نے یہ لکھا اور فوراً لڑکے کے ہاتھ بھیج دیا:

ڈیر شکیلہ!

میں تنہا نہیں جاؤں گا۔ تمہارا ساتھ جانا لازمی ہے۔ ابھی تم چچا جان سے "گرلز ہائی اسکول" جانے کی اجازت لے کر وہاں پہنچو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ تم کو ساتھ لے کر نجمہ کے گھر چلوں گا۔"

تمہارا
جمیل

یہ پڑھ کر فرمانبردار بیوی فوراً کھڑی ہوگئی۔ کپڑے بدلے اور والدہ صاحبہ سے زنانہ اسکول جانے اور پرنسپل صاحبہ سے ملنے کی اجازت لے کر کار پر روانہ ہوگئی۔ احتیاطاً ڈرائیور کو بھی نہ لیا کہ جمیل کا ساتھ لینا ظاہر ہو جائے گا۔ خود ڈرائیوری کر سکتی تھی۔ آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچی۔ جمیل پریشان حال اسکول کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ چوکیدار سے نئی لیڈی ٹیچر کا مکان معلوم کر چکے تھے کار پہنچتے ہی سوار ہو گئے۔ شکیلہ اس وقت پری معلوم ہو رہی تھی، دھانی جارجٹ کی ساڑی پہنے تھی جو بہت ہی کھل رہی تھی۔ جمیل گو متفکر تھے مگر تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

"غریب نجمہ کہے گی کہ جمیل آج اپنے ساتھ یہ سبز پری کہاں سے لے آئے۔ شکیلہ اس وقت تم واقعی پری لگتی ہو۔ کہو تو کہہ دوں کہ میری نکاحی مگر بن بیاہی بیوی ہے یہ پری۔ یا ابھی ظاہر نہ کریں کیا رائے ہے؟"

شکیلہ نے جواب دیا "آپ کی ذرہ نوازی ہے یا حسن ظن کہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں، مگر میرا خیال ہے کہ ابھی ظاہر نہ کریں۔

نجمہ کو صدمہ ضرور ہوگا۔ صرف چچازاد بتائیں تو بہتر ہے ورنہ وہ تکلف کریں گی۔"

"بہت ٹھیک" جمیل صاحب نے کہا اور کالج کے ایک برآمدے میں دونوں اتر گئے۔ وہیں آیا کھڑی تھی جو اندر لے گئی۔ چھوٹے سے خوش سلیقہ ڈرائنگ روم سے گزر کر یہ دونوں بیڈ روم میں پہنچے جہاں مسہری پر نجمہ نحیف و زار بیمار لیٹی تھی۔ یقین نہ آتا تھا کہ ایک ہفتہ میں یہ حالت ہوگئی گلابی چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ سفید نائٹ گون پہنے آسمانی ریشمی شال میں لپٹی پڑی تھی۔ ان کے داخل ہوتے ہی اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی مگر دونوں نے منع کر دیا اور لٹا دیا۔ آیا نے قریب دو کرسیاں رکھ دیں اور وہ دونوں بیٹھ گئے۔ مریضہ اس اجنبی سبز پری کو دیکھ کر حیرت میں تھی اور شکیلہ اس بیماری میں بھی اُس کے حسین چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد جمیل نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا:

"آپ کو کلکتہ آئے اتنی مدت گزر گئی اور ہمیں اب خبر کی۔"

"میں اگر سخت بیمار نہ ہوتی تو شاید اب بھی خبر نہ کرسکتی۔ یہاں فرصت کم ملتی ہے اور میں جانا پسند بھی نہیں کرتی۔" نجمہ نے یہ جواب دے کر شکیلہ کی طرف دیکھا جس کو جمیل سمجھ گئے اور کہنے لگے۔

"شکریہ اب بھی اطلاع دینے کا۔ آپ شاید متعجب ہوں گی کہ یہ میرے ہمراہ کون ہے؟ کیوں کہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ میرے چچا شکیل صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ میں نے ذکر کیا کہ آپ علیل ہیں اور میں دیکھنے کو جارہا ہوں تو یہ بھی ازراہِ ہمدردی اور شوق ملاقات آگئیں۔ امید ہے کہ آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی اور یہ وقتاً فوقتاً آپ کے پاس آتی رہیں گی اور بہت محبت کرنے والی دوست ثابت ہوں گی۔"

"بہت بہت شکریہ بہن میں آپ کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئی۔ کلکتہ میں میرا کوئی بھی دوست نہیں ہے۔" نجمہ نے شکیلہ کی طرف دیکھ کر یہ کہا۔

شکیلہ نے جواب دیا "مدت گذری ان سے آپ کا ذکر سنا تھا۔ آج یہ خوشخبری ملی کہ آپ کلکتہ تشریف رکھتی ہیں تو میں بھی دوڑی آئی۔ خدا آپ کو جلد صحت دے کیا تکلیف ہے؟

"مجھ کو کئی روز بخار آیا۔ کل سے تو نہیں ہے۔ کچھ معدے کی شکایت تھی کمزوری بہت ہوگئی۔ پرنسپل صاحب تو اپنی کوٹھی لے جانے کے لیے مصر تھیں مگر میں نہیں گئی۔"

"اچھا اب آپ میرے ساتھ چلئے اور اس گھر کو اپنے عزیزوں کا گھر خیال کریں۔ آخر مسٹر جمیل سے پرانی ملاقات ہے۔ تکلف نہ کرنا چاہئے۔ اس حالت میں تنہا نہ رہیں۔"

"بہت مشکور ہوں اس محبت کی۔ اب اچھی ہوجاؤں گی۔ آپ بھی کبھی یہیں تشریف لے آیا کریں۔" نجمہ نے جواب دیا۔

دو گھنٹے بیٹھنے کے بعد یہ دونوں رخصت ہوئے۔ نجمہ کو فکر ہوگئی کہ یہ حسین لڑکی کون تھی؟ اور کیوں آئی۔ جمیل نے کیا کیا بتادیا ہوگا؟

اس ملاقات کے دوسرے دن جمیل صاحب کو نجمہ کا ایک اور خط ملا جس میں لکھا تھا:

ڈیر جمیل!

"آپ کے تشریف لانے کا شکریہ ادا کرنے سے

قاصر ہوں اور ساتھ ہی سبز پری کے لانے کا دل پر خاص اثر ہے۔
اب استدعا ہے کہ ایک گھنٹہ کو تنہا تشریف لایئے۔ کچھ عرض کرنا ہے۔
جو دوسرے کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔"

بدبخت
نجمہ

اس خط کو پڑھ کر جمیل حیران ہو گئے کہ کیا کریں۔ وہ تنہا نجمہ کے پاس جانا بہت نامناسب خیال کرنے لگے تھے، اس حالت میں کہ وہ کامران کی منسوبہ ہے اور خود شکیلہ سے عقد کر چکے ہیں مگر بیمار نجمہ کی خواہش کو بھی ٹالنا ناممکن تھا۔ مغرب کے وقت خط ملا۔ بہت دیر سوچا۔ کبھی خیال کرتے کہ یہ بھی شکیلہ کو دکھا دیں۔ پھر سوچتے کہ وہ کچھ برا خیال نہ کرے۔ آخر خط کو چاک کر کے پھینک دیا اور خود نجمہ سے ملنے کے لئے چلے گئے۔ وہ اس وقت بھی پلنگ پر تھی اور بخار بھی تھا۔ آیا اُن کو اندر لے گئی۔ انہوں نے جاتے ہی نجمہ کی نبض دیکھی ہاتھ گرم تھا گھبرا گئے۔

"اوہو نجمہ! اس وقت بخار ہے کیا سبب؟ کل تو نہ تھا۔ آپ نے کہا تھا اب اچھی ہوں یہ کیا ہو گیا؟"

"خدا جانے کل جیسے ہی آپ تشریف لے گئے سردی معلوم ہو کر بخار ہو گیا اور اب تک ہے۔ خیر ہونے دو یہ تو اب رہے گا۔ بیٹھو کچھ باتیں کرنی ہیں۔" نجمہ نے جواب دیا۔

وہ کرسی قریب کر کے اس پر بیٹھنے لگے مگر نجمہ نے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

"کہئے میں حاضر ہوں۔ علاج کس کا ہے۔ میں کوئی اور ڈاکٹر لاؤں۔ آخر بخار کیوں نہیں جاتا؟" جمیل صاحب نے کہا۔

"عزیز جمیل چھوڑ دو ان خیالات کو۔ کیا ہوں گے ڈاکٹر۔ میرا دنیا میں اب کوئی ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی تھی ملاقات ہو گئی۔ دیکھ لیا بس اب کوئی فکر نہیں۔"

نجمہ سے یہ سن کر جمیل کا دل بھر آیا وہ دوسری طرف دیکھنے لگے۔ "مسٹر کامران لہاں ہیں؟ آپ تنہا کیوں ہیں۔ اُن کو بلا لینا چاہئے، پتہ بتائیں میں تار دے دوں۔"

نجمہ نے جواب دیا: "اب مجھے اس بدکردار شخص سے کوئی واسطہ نہیں، اس کی

شادی بھی ہوگئی۔ میں نے زندگی کے دن گزارنے کو یہاں کام کرنا شروع کردیا مگر کلکتہ میں کیوں ملازمت کی؟ یہ آپ نے نہ پوچھا؟"

جمیل جو چشم پر آب تھے بہت ہمت کر کے کہنے لگے "کیا پوچھوں؟" کیا دریافت کروں؟ جب کہ میں خود جانتا ہوں کہ کلکتہ کو اپنے قیام کے لئے کیوں پسند کیا؟ آہ! نجمہ وقت گزر گیا۔ غضب کیا کمبخت کامران نے کیوں شادی کرلی؟ خیر کچھ نہ سوچو اپنی صحت سنبھالو۔ ہم سب یہاں حتی الامکان آپ کی مدد کو تیار ہیں۔ میں آپ کا وہی ہمدردانہ خادم اور جاں نثار بھائی ہوں۔ نجمہ! آج سے ہم دوست نہیں بلکہ مثل حقیقی بہن بھائی کے ہیں۔ کہو مجھ کو بھائی بنانا پسند ہے۔ دل سے بھائی بناؤ گی؟"

یہ کہہ کر جمیل نے اپنا سر جھکا دیا۔ نجمہ گو نہایت کمزور تھی مگر اٹھی اور اپنا سر اُن کے شانہ پر ڈالا۔ آنکھوں سے گرم گرم اشک رواں تھے۔ جمیل خود بھی رو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد نجمہ نے کہا:

"بھائی۔ بھائی تو بڑی نعمت ہے۔ یہ بدنصیب اس قابل کہاں کہ ایسے فرشتہ خصال انسان کو بھائی کہہ سکے بہن جمیل صاحب! مجھ کو اپنی بدبخت کنیز خیال کریں تو فخر کروں۔ بہن بننے کے قابل کہاں رہی ہوں۔"

خدا جانے جمیل نے ان کے الفاظ کنیز کہنے سے کیا سمجھا کہ فوراً کھڑے ہوگئے اور رومال سے آنکھیں پونچھ کر کہنے لگے:

"نجمہ ایسی باتیں نہ کرو۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس وقت سے تادمِ زیست تمہیں اپنی حقیقی بہن تصور کروں گا اور یہ خیال میرا آج کا نہیں۔ اُس دن سے ہے جب کہ آپ کو کامران کے ساتھ دیکھا تھا۔ بس تم بھی مجھ کو اپنا بھائی جانو اور بے تکلف خدمت لو۔ اپنی ضروریات بیان کرو اگر میری جان کام آئے تو عذر نہیں۔"

یہ کہہ کر جمیل پھر نجمہ کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ بھی پھر اُٹھ بیٹھیں اور اُن کے کاندھے پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ تب انہوں نے بٹھا کر لٹا دیا اور انگور کے دانے جو قریب رکھے تھے منہ میں دیئے۔

چند منٹ کے بعد نجمہ نے کہا: "میں آپ کی محبت و ہمدردی کا شکریہ ادا نہ کرسکوں

گی اگر ایسی بدقسمت لڑکی کو بہن بنانے کی عزت دیتے ہیں تو اس سے بڑھ کر میرے لئے کوئی خوشی نہیں۔ہاں یہ تو بتایئے کہ کل وہ لڑکی آپ کے ساتھ کون تھی؟ بھائی سچ سچ کہنا مجھ کو شبہ ہوتا ہے۔وہ تو کوئی منظور نظر لڑکی تھی۔بتا دو؟''

جمیل نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: ''شبہ درست ہے مگر وہ منظور نظر نہیں بلکہ منکوحہ لڑکی تھی۔آپ کو پسند آئی۔سچ بتانا۔ہم نے تو بہن کامران کا ذرا برا نہ مانا تھا۔خوشی سے ملتے تھے۔''

اُن سے منکوحہ سن کر نجمہ کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا اور پھر سیاہ پڑ گیا۔پسینہ پسینہ ہو گئی۔دس منٹ کو آنکھیں بند کر لیں۔جمیل گھبرا گئے۔دیکھا تو ہاتھ بالکل سرد تھے۔انہوں نے سوچا کہ برا کیا۔بیمار کو ایسی خبر دینی دل پر برا اثر ہو گا۔اب کیا کریں؟ کچھ سوچ کر مسکرا کر کہنے لگے۔

''نجمہ نجمہ کیا ہے؟ سو گئیں ہم نے تو مذاق کیا تھا۔اس قدر برا لگ گیا۔کہو تو کیا سچ جانا؟''

مذاق کا لفظ سن کر نجمہ نے پھر آنکھیں کھولیں اور کہا: ''بھائی جمیل! اگر مذاق ہے تو خدا کرے جلد صحیح ہو جائے۔برا نہیں لگا۔کسی بہن کو اپنے بھائی کی منسوبہ بری نہیں لگتی۔کہئے چچازاد بہن تھی یا منگیتر تھی؟''

جمیل نے ٹالنے کو ہنس کر کہا: ''کچھ نہیں پھر بتائیں گے۔اب دوا پی لو۔اب تو ہم بھائی بہن ہیں نا؟ کوئی وجہ نہیں برا معلوم ہونے کی اور نجمہ ہم نے تو بڑی خوشی سے کامران کو دیکھا اور ملتے رہے۔''

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کار کی آواز آئی۔جمیل کھڑے ہو گئے۔آپا شکیلہ کو لئے کمرے میں داخل ہوئی۔نجمہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔شکیلہ جمیل کو یہاں دیکھ کر حیران رہ گئی یا تو کل تنہا نہ آتے تھے یا آج پہلے ہی سے موجود ہیں۔!!

''سلام علیکم کہئے بہن کیسا مزاج ہے؟ میرا کل سے دل پڑا تھا۔آخر اس وقت ابا جان سے اجازت لے کر آ گئی۔''

جمیل کو دیکھ کر ''آپ کس وقت تشریف لائے۔وہاں آپ کی تلاش ہو رہی

ہے۔ بھائی جان سینما میں لے جانے کے لئے آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" سلام کے بعد یہ سب کچھ کہہ کر شکیلہ نجمہ کے پاس مسہری پر بیٹھ گئی۔

"ان کو آج بہت بخار ہے۔ مجھ کو پرنسپل صاحب نے بتایا تو میں اِدھر آ گیا۔ اچھا ہوا آپ آ گئیں۔ ان کا دل بہلے گا۔ ابھی وقت ہے میں جاؤں بھائی جان کے پاس؟

شکیلہ نے جواب دیا" اب کہاں وقت ہے بھائی جان گئے ہوں گے۔ بیٹھئے اب ہم اور آپ ساتھ چلیں گے۔"

جمیل بھی کرسی پر بیٹھ گئے مگر اس وقت ان کی عجیب حالت تھی۔ شکیلہ سے بغیر کہے آنے کی وجہ سے شرمندگی تھی۔ نجمہ کی تکلیف کا خیال تھا۔ دو گھنٹے دونوں بیٹھے رہے۔ ان کا بخار تیز تھا۔ آخر نو بجے چلنے لگے باہر آئے تو شکیلہ نے کہا:

"بہن نجمہ صاحبہ کو بہت تکلیف ہے۔ تمہارات کو نہ چھوڑنا چاہئے۔"

بخدا میں تو رہ جاتی مگر اماں جان اجازت نہ دیں گی۔ ہاں آپ ٹھہر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ آج یہیں رہیں۔ میں واپس جاؤں۔"

شکیلہ سے یہ سن کر جمیل صاحب نے عجیب نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، ایسی تیز نظر سے دیکھا کہ آخر انہوں نے نگاہیں نیچی کر لیں اور خاموش کھڑی رہیں۔

پھر جمیل نے کہا:" شکیلہ کیا کہہ رہی ہو۔ مجھ کو بے وقوف بنا رہی ہو؟ یا خود بچہ بنتی ہو، میں یہاں شب کو کیوں ٹھہروں اور اگر ضرورت سمجھوں رہنے کی تو رہ سکتا ہوں۔ آپ کو اجازت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت کتنی ہی تعلیم یافتہ ہو آخر عورت ہے۔ کمزور دل، کم ہمت، کم حوصلہ، مگر مجھ جیسے شخص کی شریکِ زندگی کو بڑی ہمت اور حوصلہ سے کام لینا چاہئے۔" یہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شکیلہ بھی جا بیٹھیں مگر عجب حالت تھی۔

☆

(۱۰)

بیگم خلیل صاحب یعنی والدہ جمیل نمازِ مغرب کے بعد ابھی تخت پر ہی بیٹھی تھیں کہ اپنے بیٹے جمیل کو وہیں طلب کیا۔ وہ مسکراتے ہوئے آئے اور ان کے قریب تخت پر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"کیا بات ہے؟ آج آپ نے نماز پڑھتے ہی یاد فرمایا۔"

انہوں نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا۔ "ہاں ایسی ہی بات ہے۔ میں شام سے بہت پریشان ہوں۔ تمہاری نسبت ایسی خبر سنی ہے جس کی مجھ کو امید نہ تھی۔ پہلے جو کچھ ہوا سو ہوا۔ تم نے سعادت مندی سے والدین کا حکم مانا اور چچا زاد سے رشتہ کر لیا لیکن اب کچھ دن سے میں شکیلہ کو بہت پریشان سنتی تھی۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کبھی کبھی اس سے مل لیتے ہو۔ خیر آزادی کا زمانہ ہے مگر آج شام میں نے یہ خبر سنی ہے کہ تمہاری پہلی منگیتر نجمہ یہاں آئی ہوئی ہے اور تم برابر اس سے ملنے جاتے ہو۔ حیرت اور افسوس ہے تم جیسا نیک اور سمجھدار لڑکا نکاح ہو جانے کے بعد اس سے ملنا جائز رکھے اور اس کی بھی منگنی یا شادی ہو چکی ہے۔ صاف صاف کہو کیا معاملہ ہے؟"

اُن سے یہ تقریر سن کر جمیل سکتے میں رہ گئے۔ سر جھکا لیا اور خموشی کے ساتھ تخت سے اٹھ کر نیچے فرش پر دوزانو بیٹھے، پھر والدہ کے قدموں کے پاس تخت پر سر رکھ دیا اور جواب دیا:

"جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا بجا اور درست ہے۔ بے شک میں ضرورت کے لئے کبھی کبھی شکیلہ کے سامنے چلا جاتا ہوں۔ کیوں کہ وہ چچا اور خالہ کی بیٹی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ غریب نجمہ یہاں آئی ہوئی ہے اور میں بھی دو تین بار وہاں گیا بلکہ پہلی دفعہ تو شکیلہ بھی

میرے ہمراہ تھیں۔ اسی خیال سے کہ میرا تنہا جانا مناسب نہیں شکیلہ کو ساتھ لے گیا تھا۔ اماں جان آپ یقین فرمائیں۔ نجمہ سخت بیمار ہے صرف اس کی خبر گیری کے لئے میں گیا کیوں کہ وہ پردیس میں ہے ورنہ ہرگز نہ جاتا اور میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ اس کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کرادیں اور شکیلہ و شکیل حسن کبھی کبھی جا کر دیکھ لیا کریں تو میں ہرگز نہ جاؤں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ وہ بیمار ہے اور اس کی خبر گیری کرنا ہمارا فرض ہے لیکن تمہارے چچا بلکہ خود شکیلہ وغیرہ کو ہمارا اس سے ملنا جلنا سخت ناگوار ہوگا اور یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔"

والدہ سے یہ سن کر جمیل کھڑے ہوگئے اور بولے۔ "یہ تو بڑی دقت ہے۔ میرا دخل نہ رہے لیکن اگر آپ کی طرف سے اس مریضہ کی امداد ہو تو چچا جان و خالہ جان کا کیا حرج ہے۔ یہ مجھے کسی طرح گوارا نہیں کہ ہمارے شہر میں وہ لاوارث اور بیمار پڑی ہو اور ہم کچھ مدد نہ کریں۔ یہ انسانی ہمدردی ہے۔ شکیلہ پڑھی لکھی سمجھدار ہے۔ آپ کو کوئی برا خیال دل میں لانا گناہ سمجھنا چاہئے۔ رہے چچا و خالہ جان ان بے چاروں کو تو معلوم بھی نہیں ہو سکتا اگر شکیلہ احتیاط سے کام لیں۔ خود حوصلہ مندی سے اس کی خبر گیری کریں۔ وہ میرے خیالات سے بخوبی واقف ہیں۔ میں نجمہ سے ملنا نہیں چاہتا مگر جب تک وہ بیمار ہے فرض سمجھ کر مدد کرنا انسانیت ہے۔"

یہ کہہ کر جمیل باہر چلے گئے اور ملازم لڑکے کو بلا کر معلوم کیا کہ شکیلہ اس وقت کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ اپنے اوپر والے کمرے میں نماز کے تخت پر سو رہی ہیں۔

یہ سن کر جمیل باغیچہ والے زینے سے اوپر گئے۔ دیکھا کمرے میں ہلکی سی روشنی ہو رہی ہے اور واقعی شکیلہ چہرہ پر آنچل ڈالے تخت پر لیٹی ہے مگر چونکہ یہ سونے کا وقت نہ تھا، جمیل تخت کے قریب بیٹھ گئے اور آنچل اٹھا کر کہا:

"اوہو! نماز میں نیند آگئی۔ اس وقت کا سونا کیسے اور یہ تو لیٹنے کی جگہ بھی نہیں ہے"۔

منہ پر سے آنچل ہٹتے ہی شکیلہ فوراً اٹھ بیٹھی اور وہاں سے دونوں کرسیوں پر جا بیٹھے۔ وہ بالکل خاموش تھی اور افسردہ چند منٹ بعد جمیل ہی بولے۔

شکیلہ اس وقت والدہ صاحبہ نے مجھے بلایا اور خوب ڈانٹا، میری اس حرکت پر کہ

میں نجمہ کے ہاں کیوں جاتا ہوں۔ان کو یہ خبر کس نے پہنچائی سچ کہو؟
شکیلہ نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔صرف اشکبار آنکھوں سے جمیل کی طرف دکھا اور نگاہیں نیچی کر لیں۔پھر جمیل نے کہا۔
شکیلہ تم کو یہ زیبا نہ تھا۔تم میری شریک زندگی وشریک رنج وراحت ہو۔علاوہ اس کے محبت کرنے والی وفادار ہمدرد بھی ہو،میری اس وقت کی سخت مشکلات پر نظر کرنی تھی۔ بخدا اگر نجمہ بیمار نہ ہوتی تو میں ہرگز نہ جاتا اور پھر بھی تمہاری اجازت سے بلکہ تم کو ساتھ لے کر گیا۔دوسرے دن چپکے سے اپنا چور پکڑنے وہاں پہنچیں اور دراصل یہ گنہگار وہاں موجود تھا۔تمہارا خیال درست نکلا مگر اللہ جانتا ہے کہ میں اپنی خوشی سے تنہا وہاں نہیں گیا تھا ۔بلکہ نجمہ نے اکیلا ہی بلایا تھا۔یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پہلے دن وہ لڑکی آپ کے ساتھ کون تھی۔اس کو شبہ ہوا تھا کہ تم میری ہونے والی بیوی ہو۔بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟
یہ سن کر شکیلہ سے خاموش نہ رہا گیا اور کرسی سے اٹھ کر جمیل کے سامنے کھڑی ہو کر کہنے لگی۔
''جمیل صاحب! اس ناچیز کی نسبت آپ نے جس حسن ظن سے کام لیا اس کی میں مشکور ہوں۔آج تک میرے دل سے وہی رنج وافسوس کم نہیں ہوا تھا جو اس دن وہاں سے چلتے وقت آپ نے میرے کہنے کے غلط معنی سمجھے۔واللہ میں نے سادے دل اور سچی نیت سے عرض کیا تھا کہ اس شب ان کو بہت تکلیف تھی۔آپ وہاں ٹھہر جائیں اگر میں رہ سکتی تو تنہا چھوڑ کر ہرگز نہ آتی۔اس ہمدردی کا یہ انعام ملا جو کچھ آپ نے سمجھا۔خالہ جان پر ان واقعات کا اظہار نہیں کیا۔ہوا یہ کہ شکیل بھائی جان کو کسی طرح یہ علم ہو گیا کہ نجمہ یہاں آئی ہوئی ہے اور ہم دونوں وہاں جاتے ہیں۔پہلے انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔جب میں نے اقبال جرم سے احتراز کیا تو انھوں نے خود تحقیقات کی،ان کے گھر پہونچ کر ملازم سے پتہ لگا لیا اور خالہ جان کے آگے سب کچھ بیان کر دیا اور یہ آج ہی کا واقعہ ہے۔بغیر معلوم کیے آپ نے سب الزام میرے سر لگا دیے۔افسوس کاش میں نے آپ کا حکم نہ مانا ہوتا تو بزرگوں کا عتاب نہ سہنا پڑتا۔خیر جو مرضی مالک کی۔سہیں گے۔''
شکیلہ کی یہ تقریر جمیل صاحب نے خاموشی سے سنی ندامت وتاسف کے ساتھ وہ

بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور نہایت لجاجت سے کہنے لگے:

"بے حد شرمندہ ہوں۔ معاف کر دو۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں ہو سکا کہ شریر شکیل کو سب علم ہے اور اس نے اماں جان سے کہہ دیا۔ خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ چلو کل صبح ہم دونوں نجمہ کو دیکھ آئیں۔"

"نہیں جناب مجھ میں آپ کا غصہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ پھر بزرگوں کی خفگی علیحدہ۔ آپ خوشی سے اکیلے جائیے۔ جب تک بیمار ہیں ہمیں اعتراض نہ ہوگا (ہنس کر) ہاں جب وہ تندرست ہو جائیں گی تب ہم نگرانی کو ساتھ چلا کریں گے۔"

جمیل نے جواب دیا۔ "جب ان کو صحت ہو جائے گی، تب مجھے جانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی اور غالباً وہ یہاں سے چلی جائے گی۔"

"اچھا تو آپ نے میری بابت ان کو بتا دیا۔"

جمیل نے کہا: "ہاں بتانا پڑا۔" "کب تک چھپا سکتا تھا اور نہ اس کی ضرورت۔ آخر انہوں نے بھی تو مجھ کو چھوڑ کر رشتہ منظور کر لیا تھا۔ میں کیوں اپنی بیوی کو چھپاؤں؟"

اتنے میں نیچے سے ملازمہ آئی اور کہا: "کھانا تیار ہے اور بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔"

جمیل صاحب بھی اپنے گھر چلے آئے۔ کمرے میں پہنچے تو میز پر نجمہ کا خط رکھا دیکھا۔ ابھی کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ اندر سے کھانے کی طلبی ہوئی، بیچارے بند ہی لفافہ جیب میں رکھ کر کھانے پر چلے گئے اور جب فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئے، گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔ فوراً لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگے۔

ڈیر جمیل!

دو دن سے آپ تشریف نہیں لائے۔ خدا جانے کیا سبب ہے۔ شاید بیگم صاحبہ نے منع کر دیا ہوگا۔ کل تو میری حالت بہتر رہی لیکن آج طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ڈاکٹر تو دوبارہ آیا مگر تیماردار کوئی نہیں۔ افسوس پیاری خوبصورت شکیلہ بھی نہ آئیں۔ کیا آپ لوگ تنگ آ گئے ہیں، ایک مریضہ کے پاس آتے آتے۔ دل چاہتا ہے کہ آپ دونوں میرے پاس آیا کریں مگر خدا جانے کیوں یہ چاہتی ہوں

کہ دونوں ساتھ نہ آدیں بلکہ الگ الگ، ایک وقت آپ اور
دوسرے وقت وہ۔ شاید میری یہ خواہش ناگوار ہو مگر کیا کروں
مجبور ہوں۔ دل تو یہی چاہتا ہے تھوڑی سی فرصت ہو تو چند منٹ کو
ہو جائیں۔"

خاکسار آپ کی بہن
نجمہ

یہ خط پڑھ کر صحت کی زیادہ خرابی کی خبر سے پریشان ہو کر انہوں نے اسی وقت جانے کا ارادہ کر لیا۔ بیوی کی طرف سے اجازت مل ہی چکی تھی۔ باہر نکلے۔ خود ہی کار نکالی اور گرلز اسکول روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھ برآمدے میں دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ آیا ایک طرف کوچ پر پڑی سو رہی تھی۔ انہوں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ ہاتھ رکھتے ہی کواڑ کھل گئے، اندر بھی ہلکی روشنی تھی اور بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ سبز بلب روشن تھا۔ اس وقت جب کہ گیارہ بجنے والے تھے دیکھا کہ نجمہ اپنی مسہری پر بیٹھی ہوئی ہیں اور ہاتھ میں پانی کا گلاس ہے۔ اس وقت جیشاد یکھ کر تیز قدمی سے کمرے میں آئے اور پوچھا:

"کیا حال ہے نجمہ؟ نجمہ آدھی رات کے وقت جاگ رہی ہو اور تنہا! آیا کو کیوں باہر بٹھا دیا ہے؟ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔"

نجمہ نے شال لپیٹ کر جواب دیا۔ "میں کسی کی منتظر تھی جمیل صاحب۔"

"اس وقت آپ کو کیسے امید ہو سکتی تھی۔ کسی کے آنے کی؟" نجمہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر جمیل نے کہا۔

"ہاں وقت تو نہ تھا، مگر کچھ دل کہہ رہا تھا کہ کوئی آ رہا ہے۔ آج تین وقت کی دوا بھی نہ پی تھی۔ اس وقت سر میں درد زیادہ ہو گیا تو دوا پینے کے لئے اُٹھ بیٹھی تھی بلکہ ابھی پینے نہ پائی تھی کہ آپ تشریف لے آئے۔ اپنے ہاتھ سے پلا دیجئے۔"

"جمیل صاحب نے شیشی نکال کر اُن کو پلا دی اور کرسی مسہری کے قریب کر کے بیٹھ گئے۔"

"آج ٹمپریچر کتنا رہا۔"

"دن بھر تو رہا چڑھتا رہا۔ اس وقت تو بالکل نہیں اور اگر آپ اور شکیلہ بیگم رات اور دن میرے پاس رہا کریں تو بخار کمبخت بالکل ہی نہ آئے۔"

"یہ تو نہ کہیے اگر شکیلہ رہیں تو غالباً بخار اور زیادہ ہو جائے۔ وہ آ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے ساتھ نہیں لایا۔ جمیل صاحب نے اُن کو چھیڑنے کو کہا۔"

"اگر آپ کا خیال ہے تو ضرور درست ہوگا۔ اچھا ہوا کہ نہیں لائے۔" اور ہنسنے لگیں۔

برآمدے سے کسی کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ جمیل فوراً اُٹھ کر باہر آئے۔ دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان نہایت عمدہ سوٹ پہنے منہ میں سگار دبائے کھڑا ہے اور اپنی چھڑی سے آیا کو جگا رہا ہے۔ جمیل کو اندر سے آتا دیکھ کر اس نوجوان نے سوال کیا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ کیا آپ میری مریضہ مس صاحبہ کے رشتہ دار ہیں۔"

جمیل صاحب نے جواب دیا۔ "آپ کا اس سوال سے مطلب؟ آپ اس وقت بارہ بجے شب کے کیوں تشریف لائے ہیں اور اس بے چاری سوتی کو کیوں جگا رہے ہیں؟"

"جناب کو معلوم ہونا چاہیے۔ مس نجمہ لیڈی ٹیچر مسلم گرلز اسکول میری مریضہ ہیں اور چونکہ وہ یہاں بالکل اکیلی ہیں جس دن اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے، بحکم پرنسپل صاحبہ گرلز اسکول علاوہ دن کے شب کو بھی ایک بار ان کو دیکھنا پڑتا ہے۔ کل میں ذرا مصروف رہا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے دن بھر دوا نہیں پی۔ کیا اس وقت وہ جاگ رہی ہیں؟ میں اُن کو دیکھنا چاہتا ہوں؟"

"چلیے وہ جاگتی ہیں۔" دونوں نجمہ کے کمرے میں آئے۔ نجمہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ دوا کی شیشی اُٹھا کر دیکھی اور جمیل سے کہا "وہ سو گئیں اب تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ میں چلتا ہوں۔ آپ کیا یہیں ٹھہریں گے؟ اب ان کو دوا کے لئے جگائیے نہیں۔"

ڈاکٹر کو جمیل نے جواب دیا۔ "آپ کو میری کیا فکر ہے؟ کہیں ٹھہرا ہوں آپ تشریف لے جائیے۔"

یہ سخت الفاظ سن کر ڈاکٹر نے جمیل کو بہت تیز نظر سے دیکھا اور کمرے سے باہر

ہوگیا۔اس کے جاتے ہی جمیل نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کرلیا اور آتے ہی نجمہ سے کہا ''نجمہ تم نے جان کر آنکھیں بند کرلی تھیں یا واقعی سوگئی تھیں بتاؤ تو یہ اس قدر مہربان ڈاکٹر کیسے ہیں جو آدھی رات کے وقت آپ کو دیکھنے آتے ہیں؟''

ڈاکٹر کے جاتے ہی نجمہ نے آنکھیں کھول دیں۔اُٹھ کر بیٹھ گئی اور جمیل کو اپنے قریب بٹھا کر کہنے لگی میں نے آج اس لئے آپ کو بلایا تھا کہ اس ہفتہ کی بیماری اور علاج کے حالات آپ کو بتانے تھے۔شاید اس کا کوئی مناسب انتظام کرسکیں۔مشکل یہ آن پڑی ہے کہ یہ ڈاکٹر ہماری پرنسپل صاحبہ کا خالہ زاد بھائی ہے اور بلا فیس میرا علاج کررہا ہے۔ان کو ہٹا کر آپ دوسرا ڈاکٹر مقرر کرسکتے ہیں مگر پرنسپل صاحبہ کو بہت ناگوار گزرے گا۔چند دن سے میں بہت پریشان ہوں۔شاید اس ڈاکٹر کی وجہ سے مجھ کو کلکتہ سے چلا جانا پڑے۔''

''کیوں آخر یہ ڈاکٹر بے چارہ آپ کو ناپسند کیوں ہے جب بغیر خرچ کے علاج اور تیمارداری ہورہی ہے تو آپ کیوں مخالفت کرتی ہیں۔'' جمیل نے دریافت کیا تو نجمہ نے جواب دیا۔

''مجھ کو اس ڈاکٹر کا علاج پسند نہیں۔صبح سے رات تک دس بار آتا ہے۔اس کے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔میں بالکل تنہا رہتی ہوں اس لئے پسند نہیں کرتی۔''

یہ سن کر جمیل نے کہا:''نجمہ میں اس نوجوان کو بالکل نہیں جانتا کہ کیسا اور کن خیالات کا انسان ہے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگر پرنسپل صاحب کا عزیز ہے تو نہایت ہی اعلیٰ خاندان شخص ہے اور میرا خیال ہے کہ پرنسپل صاحبہ کی رائے بھی شامل ہے یا بظاہر یہ شخص شریف معلوم ہوتا ہے۔میرا اس وقت یہاں موجود رہنا اس کو سخت ناگوار گزرا۔''

نجمہ نے سوال کیا:''اور آپ کو بھی ان کا یہاں آنا اس وقت کچھ ناگوار معلوم ہوا یا نہیں؟'' جمیل نے ہنستے ہوئے کہا:''اوہو یہاں تو بڑا حوصلہ مند دل وجگر ہے۔مسوری پر دیکھا تھا۔مسٹر کامران سے میں کیسی اچھی طرح ملتا تھا۔یہ ڈاکٹر ہے۔میرا خیال ہے۔آپ کو اس سے زیادہ گھبرانا نہیں چاہئے۔''

نجمہ نے بگڑ کر کہا:''اچھا تو میں اسی لئے ہوگئی کہ کبھی کامران کبھی ڈاکٹر۔دھو کے دے دے کر میری زندگی کو تباہ کریں۔جب آپ نے مجھے بہن بنایا ہے تو بھائیوں کی طرح

میری نگرانی اور بہتری کی کوشش کرنی چاہئے۔“

”نجمہ تم یقین کرو کہ میں زندگی بھر تمہارا خادم بھائی ثابت ہوں گا جس قسم کی مدد تم چاہو کرنے کو تیار ہوں۔ یہ تو میں نے یوں ہی چھیڑنے کو کہہ دیا تھا لیکن یہ ضرور کہوں گا یہ ڈاکٹر مجھے اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے اگر تم اجازت دو تو میں اس کی پریکٹس اور حالات کی تحقیقات کروں۔ میرے لئے وہ بڑی خوشی کا دن ہوگا جب میں اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے کسی اچھے شخص کے سپرد کردوں کیوں کہ یہ تو اب لازمی ہے۔“

یہ سن کر نجمہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کرلیں اور چند منٹ کے بعد جمیل سے پانی لے کر پیا۔ پھر کہا:

”بھائی جان ابھی تو کلکتہ میں میرا ہونا آپ پر کچھ بار نہیں نہ مجھے اپنے گھر اٹھا کر لے گئے نہ میری تیمارداری کی۔ ابھی سے اس قدر کیوں گھبرا گئے کہ جو ڈاکٹر میرے علاج کو آیا، اسی کے حوالے کرنے لگے مجھے تھوڑی طاقت آجائے تو کلکتہ سے چلی جاؤں گی۔ مجھ بدنصیب کے ماں باپ زندہ نہیں، چچا چچی ناراض ہوگئے۔ میرا دنیا میں اب کوئی نہیں ہے۔ میں کلکتہ اسی خیال سے آگئی تھی کہ ملازمت کرکے بسر کرلوں گی اور ایک قلبی طمانیت وتقویت رہے گی اور آپ صادق و ہمدرد دوست کی طرح مجھ سے تعلقات رکھیں گے آپ نے اس سے بھی زیادہ عزت دی اور محبت کی کہ اس عاجز کو بہن بنانے کا فخر بخشا لیکن اب پرانے خیال کے باپ بھائی کی طرح مجھے رخصت کرنے لگے۔ یہ مجھے کسی طرح منظور نہیں۔ جائیے رات زیادہ آگئی۔“

نجمہ کے یہ فقرے جمیل صاحب پر عجیب اثر کر رہے تھے۔ وہ نہایت افسردہ اور غمگین نظر آنے لگے۔ کھڑے ہوئے اور کمرے میں ٹہلنے لگے پھر قریب آکر نجمہ کی طرف جھکے اور کہا: ”اچھی نجمہ مجھ بے بس انسان سے ناراض نہ ہو۔ آہ! تم بہت بے وقت کلکتہ آئیں اور نہ مجھ کو تمہارے حالات کی خبر ملی کہ کامران نے شادی کرلی۔ والدین کی بے انتہا سختی وزبردستی سے میرا یہاں عقد ہوگیا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ تم سے ملنے کو آنا بھی گوارا نہیں کرسکتا، تم بالکل بے وارث ہو۔ اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ زندگی امن کے ساتھ بسر کرنے کے لئے تم بھی شادی کرلو۔ دیکھو تنہا رہنا کتنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر کا آنا ہی تم کو پسند

نہیں۔ اچھا معاف کرو غصہ نہ کرو اگر آپ نے ارادہ کرلیا ہے کہ ایسی حالت میں زندگی بسر کریں گی تو آپ کی مرضی خدا حافظ و مددگار ہو۔ میں نے انہی مشکلات پر نظر رکھتے ہوئے یہ رائے دی تھی۔ نجمہ یہ شادیاں کیا ہیں، دنیا میں پرامن زندگی بسر کرنے کے لئے ایک معاشرتی فرض ہے جس کو انسان خوشی ناخوشی سے ادا کرتا ہے۔ بس اس سے زیادہ میرے خیال میں تو شادی کی کچھ حقیقت نہیں، والدین کا حکم ماننے کے لئے میں نے بھی یہ فرض ادا کیا۔ اسی طرح چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس زندگی میں قدم رکھ کر بے فکر ہو جائیں۔ دن گزرے چلے جاتے اور ایک دن خاتمہ ہو جاتا ہے۔"

نجمہ یہ سن کر بستر پر اُٹھ بیٹھی اور اُن کو جواب دیا:

"جمیل صاحب آپ مجھ کو شریف لڑکی خیال کریں یا بدترین میں اپنے خیالات اس وقت آپ کے سامنے صاف صاف بیان کئے دیتی ہوں۔ ہمارے آپس کے تعلقات کو دو سال کا عرصہ گزرا مگر چونکہ ہم میں بے تکلفی نہیں ہونے پائی تھی۔ اس وجہ سے ایک کو دوسرے کے خیالات سے واقفیت نہ تھی۔ اتنی ہی تھی کہ ایک نے دوسرے کی شکل دیکھی تعلیم یافتہ دیکھے بس آزاد لوگوں نے مجھ کو چچا اور چچی کو بنایا بہکایا کہ آپ کا گھرانہ رسومِ قدیم کا پابند ہے۔ میری زندگی وہاں مشکل سے گزرے گی۔ رشتہ ٹوٹ گیا مگر فوراً ہی آپ کی خوبیاں مجھ پر ظاہر ہوتی گئیں اور یہاں تک کہ گرمیوں میں مسوری پر آپ سے ملاقات نصیب ہوئی تو مجھ پر عجیب ہی اثر ہوا۔ اُس وقت اگر کامران سے شادی ہو جاتی تو وہیں گزر جاتی مگر وہ بہت جلد مجھ کو چھوڑ کر کسی اور طرف مائل ہو گیا اور مجھ سے علیحدگی ہو گئی۔ اب تو ناممکن ہے کہ میں پھر اس زندگی میں قدم رکھنے کا ارادہ کروں۔ اپنی بدقسمتی سے ایک فرشتہ کا ساتھ چھوڑ کر شیطان سے رشتہ جوڑا تھا۔ اس کی سزا پائی۔"

جمیل نے کہا: "مگر جب کہ وہ فرشتہ بھی کسی اور سے رشتہ جوڑ چکا تھا تو اب اس کے خیال میں آپ کیوں دنیاوی مصائب کا مقابلہ کریں۔ آج کل تو میں وقت نکال کر تھوڑی دیر کو آ بھی جاتا ہوں لیکن اب دو تین دن تک نہ آسکوں گا کہ شکیلہ بیگم پرسوں میرے گھر لائی جا رہی ہیں۔"

نجمہ یہ سن کر پلنگ سے کھڑی ہو گئیں اور نہایت خوشی کے اظہار کے ساتھ کہنے لگی

"ارے ایسی جلدی یوں کہو کہ پرسوں شادی ہو رہی ہے۔ میں ضرور شریک ہوں گی۔ پرسوں تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔"

جمیل نے انہیں پلنگ پر بٹھا کر کہا: "آپ نے یہ کیا غضب کیا کمزوری میں یکا یک کھڑی ہو گئیں آپ وہاں جا کر کیا کریں گی۔ میرے خیال میں تو فضول تکلیف ہو گی۔"

نہیں ہم ضرور جائیں گے۔ جیسے بنے اس کا انتظام کیجئے ورنہ میں اپنی پرنسپل صاحبہ کے ساتھ آجاؤں گی۔ امید ہے کہ شکیلہ برا نہ مانیں گی۔"

"اچھا پوچھوں گا کہ کیا کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں تو نہ جانا بہتر تھا۔ دو بج رہے ہیں، میں اجازت چاہتا ہوں۔"

نجمہ جمیل کو رخصت کرنے شال لپیٹ کر پھر کھڑی ہو گئیں اور ان کے منع کرنے پر بھی دروازہ تک آئیں اور کہنے لگیں: "جمیل صاحب کیا میں آج آپ کو آخری دفعہ رخصت کر رہی ہوں غالباً اب آپ نہ آسکیں گے۔"

جمیل اس وقت بہت ہی رنجیدہ و مغموم ہو رہے تھے۔ "میں کل ہی حاضر ہوں گا" ۔کہا اور دوسری طرف منہ پھیر کر تیزی سے دروازے سے نکل گئے۔ نجمہ کمرے میں آئیں۔ میز ہی پر گر گئیں۔ کچھ دیر خاموش پڑی رہیں اور پھر اٹھ کر میز پر سے کاغذ لے کر لکھنے لگیں۔

"جناب ڈاکٹر صاحب! تسلیم

میں اطلاعاً لکھتی ہوں کہ میں اب بالکل تندرست ہوں اور کلکتہ سے بہت جلد جانے والی ہوں، آپ نے میرے علاج اور تیمارداری میں جس قدر تکلیف اٹھائی۔ اس کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ کل سے آپ میرے لئے دوائیں بھیجنی بند کر دیں اور خود بھی تشریف لانے کی زحمت گوارا نہ کریں۔"

خاکسار

نجمہ

☆

(۱۲)

تین بج چکے تھے مگر نجمہ کو نیند نہیں آئی۔ جمیل صاحب کی شادی، پرنسپل صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے رنج کا بھی کچھ خیال، ایک دم اپنا کلکتہ سے چلنے کا بندوبست کرنا۔ اُن ہی خیالات کی اُلجھن میں صبح ہوگئی۔ جب آیا کمرے میں آئی تو سب سے پہلا کام اس کو یہ بتایا کہ خط ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر بھجوادے۔ دوا کی شیشیاں وغیرہ میز سے اٹھوادی گئیں۔ آیا نے میز پر چاء لاکر رکھی۔ وہ ابھی بستر ہی پر تھیں اور چائے نہیں پی تھی کہ کار کی آواز آئی اور تین منٹ بعد دیکھا کہ جمیل صاحب ان کی مسہری کے پاس کھڑے تھے۔ دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھیں، وہ بھی کرسی قریب کرکے بیٹھ گئے اور خود ہی چائے بنانے لگے۔

"میں اس وقت نماز پڑھتے ہی بغیر چائے پئے چلا آیا ہوں۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے ابھی نہیں پی۔ اب دونوں پئیں گے۔"

نجمہ نے کہا "آپ بہت ہی سویرے آگئے ہیں۔ ایک بجے تو گھر پہنچے ہوں گے کیا سوئے ہوں گے؟"

"کون سویا ہے؟ دو گھنٹے کتاب دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر نماز پڑھی اور حاضر ہوگیا چونکہ آپ نے رات آخری دفعہ رخصت کردیا اس لئے بہت جلد آگیا۔"

نجمہ نے کہا: "مجھے تو اب بالکل اُمید نہ تھی کیوں کہ آج ہی تو شادی کی رسوم شروع ہوجائیں گی۔ ایسی حالت میں کہاں نکل سکیں گے۔ اسی خیال سے آخری بار رخصت کیا تھا۔ آہ اب آپ کا یہاں آنا بالکل نامناسب ہوگا۔ میں تو رات ایک منٹ بھی نہیں سو سکی، اس وقت ناشتہ کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن جب آپ تشریف لے آئے اور اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلا رہے ہیں، اب تو مجھ کو کئی وقت کے لئے کھالینا چاہئے۔ پھر خدا جانے

ایسا موقع زندگی میں کبھی نصیب بھی ہو یا نہ ہو۔ آپا کچھ پھل اور نمکین چیزیں جو تم نے کل بنائی تھیں لے آؤ۔"

"جمیل بولے۔ آپ ایسا خیال کیوں کرتی ہیں۔ آئندہ سے ہم دونوں آیا کریں گے۔ شکیلہ اچھے خیالات کی لڑکی ہے۔ وہ کوئی رکاوٹ یا اعتراض نہ کریں گی۔ صرف تین دن مصروفیت کے ہیں۔ اس کے بعد آزادی ہوگی۔"

"آزادی ہوگی؟ تو ہمیں کیا؟ میں تو ہمیشہ کے لئے آپ سے رخصت ہو رہی ہوں۔ اب جلد کلکتہ چھوڑ دوں گی۔"

آپا نے ڈاکٹر صاحب کا کارڈ پیش کیا جس کو دیکھتے ہی نجمہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جمیل نے کارڈ پر نظر ڈالی اور کہا۔

"آنے دیجئے ڈاکٹر ہے۔ آپ کو دیکھنا ضروری ہے۔ مجھ کو اب جانا چاہئے کیوں کہ تھوڑی دیر میں سب مہمان آ جائیں گے اور رسم مانجھا ادا ہونے والی ہے۔"

یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ نجمہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہوئیں اور پھر ان سے کہا:

"خدا مبارک کرے میرا دل وہیں لگا رہے گا۔ برائے خدا آپ مجھے کل شادی میں ضرور شریک کریں۔"

جمیل نے جواب دیا: "آپ کو اس قدر کیوں اصرار ہے۔ وہاں جا کر کیا کریں گی؟ کیا دراصل آپ کو کچھ خوشی ہوگی؟"

نجمہ نے کہا" ہاں ایک عجیب قسم کا اثر ہوگا جو زندگی میں پھر کبھی نہ ہو سکے گا۔ میں آپ کو نوشہ بنا ہوا دیکھ لوں گی۔ گویا اپنے ہاتھوں سے ایک اور کے سپرد کر دوں گی۔"

یہ کہہ کر نجمہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جمیل صاحب پر بھی بہت اثر ہوا۔ اس بدنصیب لڑکی کی پشیمانی اور ناکامی کا۔ وہ بھی افسردہ ہو گئے اور کہنے لگے۔

"کیا تمہاری زندگی کا نصب العین یہی ہے کہ کبھی میرے سامنے اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر کے مجھ کو دکھاؤ اور کبھی مجھے کسی کے حوالے کر کے دیکھو۔ آہ کیا ہمت کیا حوصلہ ہے۔ واللہ میں وہی نقشہ تو نہیں دکھانا چاہتا۔ اچھا تین دن کے لئے رخصت۔"

یہ کہہ کر ایک دم جمیل کمرے سے باہر ہو گئے۔ برآمدے میں اجازت کے منتظر ڈاکٹر صاحب کھڑے تھے انہوں نے دیکھتے ہی سلام کیا اور اندر جانے کو کہہ کر اپنی کار پر سوار ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نجمہ کے کمرے میں آئے۔ وہ غسل خانے جا چکی تھیں۔ دس منٹ بعد کپڑے بدل کر باہر آئیں اور ڈاکٹر صاحب کو بیٹھنے کو کہا اور خود ہی گفتگو شروع کر دی:

"دیکھئے ڈاکٹر صاحب اب بالکل اچھی ہوں۔ حرارت بھی نہیں۔ خوب کھاتی ہوں۔ آپ کی عنایتوں کی بہت ہی مشکور ہوں۔ آپ نے نہ صرف ڈاکٹر کے بلکہ نرس اور عزیزوں کے فرائض بھی ادا کیے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا: "میں تو اس وقت گھبرا گیا، آپ نے یہ اچانک چلنے کا ارادہ کیسے کر لیا۔ ابھی تو آپ بہت کمزور ہیں۔ بغیر ڈاکٹر کی اجازت کے آپ سفر نہیں کر سکتیں۔"

"ڈاکٹر صاحب جلد ہی مجھے سفر کرنا لازمی ہے۔ آپ کو اجازت تو دینی ہی ہو گی۔"

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا: "اس حالت میں کوئی مریض تنہا سفر نہیں کر سکتا۔ آپ کو ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ رکھنا ہو گا۔"

نجمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "ڈاکٹر کا تو ساتھ رہنا مشکل ہے۔ آپ کی رائے ہے تو کسی نرس کو لے جاؤں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا: "کچھ مشکل نہیں، نرس سے زیادہ ڈاکٹر کا ہمراہ لے جانا آسان ہے کیوں کہ وہ آپ کا خادم ہے۔"

نجمہ نے ذرا سنجیدگی سے جواب دیا: "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ جو مجھ کو عمر بھر یاد رہے گی مگر اب تو ڈاکٹر ہم میں جدائی ہی ہے۔ خدا آپ کو شادمان رکھے۔"

ڈاکٹر نہایت افسردگی سے بولے: "اگر ہمیشہ کی جدائی ہے تو نجمہ شمشاد کو شادمانی کہاں؟ فی الحال آپ کو یہاں سے جانا نہیں چاہیے۔ میری بچی خدمات کا کیا اتنا بھی صلہ نہیں ملے گا؟"

"ضرور آپ کا حکم سر آنکھوں پر میں چار دن کے لئے ٹھہر جاؤں گی لیکن ڈاکٹر جانا ضرور ہے۔"

ڈاکٹر شمشاد نے کہا: "یہ تو آپ کے اختیار میں ہے اگر آپ پسند کریں تو ہمیشہ کلکتہ میں رہ سکتی ہیں۔ کل ہی باجی پرنسپل صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ میں دو سال کے لئے انگلینڈ جانا چاہتی ہوں اور اپنی جگہ مس نجمہ کو مقرر کرا دوں گی۔ کیا آپ کو یہ پسند نہیں؟"

نجمہ نے جواب دیا: "میرا ارادہ ملازمت کا نہیں، میرے بزرگ واپس بلا رہے ہیں۔"

شمشاد صاحب نے کہا: "یہ تو اور بھی اچھا ہے اگر ملازمت نہیں تو آپ کو دوسری زندگی شروع کرنی ہوگی۔" "ہمیں تو آپ کے حالات سے آگاہی نہیں۔ ہاں کیا دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ صاحب جو ابھی تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے کوئی رشتہ دار ہیں؟"

نجمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "جی نہیں ان صاحب سے رشتہ تو کوئی نہیں میرے دیرینہ دوست اور آپ کی طرح مہربان ہیں۔ آپ ان کو نہیں جانتے یہ یہاں کے ایک بڑے نامور تاجر سیٹھ خلیل احمد صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ وہ تو آپ کی ہمشیرہ پرنسپل صاحبہ سے خوب واقف ہیں بلکہ اُن کے خاندان کی لڑکیاں پرنسپل صاحبہ کی شاگرد ہیں۔ مسٹر جمیل خود بیرسٹر ہیں۔"

یہ سن کر ڈاکٹر حیران سے ہو گئے اور چند منٹ کی خاموشی کے بعد کہا: "اچھا آئی سی! یہ بیرسٹر جمیل تھے۔ نام تو سنا ہے لیکن ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ مجھ کو انگلینڈ سے آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر پھر کسی اور گہرے سوچ میں پڑ گئے۔ نجمہ اُن کی حالت بخوبی سمجھ رہی تھی، اب اُن کو دھوکے میں رکھنا مناسب نہ سمجھ کر کہا "کیوں ڈاکٹر صاحب آپ تو کسی سوچ میں پڑ گئے۔ کیا آپ کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ آج جمیل صاحب کی شادی ہے۔ پرنسپل صاحبہ مدعو ہیں۔"

جمیل کی شادی سن کر ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر خوشی سے سرخی دوڑ گئی جو ابھی نہایت افسردہ تھے بشاش نظر آنے لگے اور خوشی سے بولے:

"اچھا آج ہی بیرسٹر صاحب کی شادی ہے۔ ہمشیرہ صاحبہ نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ آپ کو شاید وہ شادی کا بلاوا دینے آئے تھے؟"

جی ہاں مگر میں نے یہ جواب دے دیا ہے کہ ''اگر ڈاکٹر صاحب نے اجازت دے دی تو آؤں گی۔''

''اور کلکتہ سے جانے کی کس نے اجازت دی؟ شادی میں جانے کی اجازت کی ضرورت ہوئی اور کلکتہ سے جانے کا خود ہی فیصلہ کر لیا۔''

پھر ایک کار کے آ کر ٹھہرنے کی آواز آئی اور آیا نے خبر دی کہ کوئی بیگم صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔ یہ سن کر نجمہ کھڑی ہو گئیں۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھے رہے۔ انہوں نے بیڈروم کا دروازہ بند کر دیا اور ڈرائنگ روم میں آ کر انہیں اتروایا اور دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''ارے آج آپ کیسے تشریف لے آئیں۔ آج ہی تو مانجا ہے۔ آپ کو نکلنے کا موقع کیسے مل گیا۔''

شکیلہ بیگم نے جواب دیا: ''آج میرا آنا ناممکن تھا مگر میں صرف اس خیال سے ہزار مشکلیں اٹھا کر آئی ہوں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں ہی اپنی شادی میں شریک کرنے کے لئے بلاؤں گی۔ کل آپ کس وقت تشریف لائیں گی؟ میں ابھی پرنسپل صاحبہ سے کہتی جاؤں گی کہ وہ آپ کو اپنے ہمراہ لے آئیں۔ اب تو آپ بالکل اچھی ہیں؟''

نجمہ نے کہا: ''اس خلوص و محبت کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ رسم مایوں بیٹھنا بھی دیکھنا چاہتی تھی اگر کوئی بلاتا۔''

شکیلہ نے کہا: ''اس کے لئے میں جمیل صاحب سے کہلوا دوں گی اگر وہ کسی ترکیب سے بلوا سکیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کو شادی میں شریک کرنا چاہتے نہیں۔ غالباً اس وجہ سے کہ اُن کی والدہ صاحبہ سے آپ کا تعارف نہیں ہے اور میں اُن کی مرضی کے خلاف کچھ کرتی ہوئی ڈرتی ہوں۔ اچھا بہن اب مجھے اجازت دیجئے بہت جلدی ہے۔''

اس کی محبت کا نجمہ پر خاص اثر ہوا اور وہ شکیلہ سے لپٹ گئیں اور کہا۔

''پیاری شکیلہ خدا تمہیں یہ شادی مبارک کرے اور تا زندگی شادکام رہو۔ یہ میری دلی خواہش ہے۔''

اس وقت شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جھک کر اپنا سر نجمہ کے سینہ سے لگا دیا اور روتے ہوئے کہا:

"پیاری بہن آپ دعا کریں کہ میری آئندہ زندگی شوہر کی رضامندی میں بسر ہو ، میں آپ کو ہمیشہ اپنی حقیقی بہن سمجھوں گی۔"

نجمہ نے شکیلہ کا سر اپنے سینہ سے لگا کر اس کی آنکھوں کو چوم کر رومال سے خشک کیا اور کہا: "میری اچھی شکیلہ مجھ کو آج سے نہ صرف اپنی بہن بلکہ اپنے شوہر جمیل کی بھی حقیقی بہن سمجھنا۔ پھر میرا بڑا حق ہو جائے گا۔ امید ہے مجھے نند بنالو گی۔"

شکیلہ نے سر اُٹھا کر جواب دیا: "ضرور ضرور مجھ کو معلوم ہے۔ جمیل صاحب نے مجھ سے بیان کر دیا تھا جس دن انہوں نے آپ کو بہن کہا تھا بلکہ ہم نے تو انہیں چھیڑا تھا کہ عورتیں دوپٹہ بدل کر بہن بنا کرتی ہیں۔ آپ بھی بہن نجمہ سے کوئی چیز بدلنے کی رسم ادا کریں۔ اس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ جب آپ آجائیں گی تو وہ رسم ادا کرنا۔ اچھا خدا حافظ۔"

نجمہ نے خود جا کر شکیلہ کو سوار کرایا۔

(۱۳)

آج دونوں بھائیوں سیٹھ شکیل و سیٹھ جمیل کی عالی شان کوٹھیاں شکیل منزل خلیل منزل بڑے اعلیٰ پیمانہ پر آراستہ کی گئی ہیں۔ دونوں دروازوں پر کل سے نوبت رکھی گئی ہے۔ زنان خانے سے گانے اور بجانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ اندر باہر مہمان جمع ہیں۔ آج میاں جمیل کی بارات کا دن ہے۔ خدا نے ان کو حقیقی بہن نہیں دی تھی۔ آج رسومِ شادی ادا کرنے کے لئے یعنی بہن کے فرائض انجام دینے کو بیگم خلیل احمد صاحبہ نے اپنی ایک رشتہ کی بھانجی کو بلا لیا ہے جن کا نام جمیلہ بیگم ہے۔ اس لڑکی کی بھی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ وہ خود شرمائی ہوئی دلہن ہے اور نہایت حسین لڑکی ہے۔ اس کی والدہ جو خلیل احمد صاحب کی چچازاد بہن ہے چاہتی تھی کہ جمیل کا رشتہ جمیلہ سے ہو جائے، مگر نہ ہو سکا۔ آج جمیلہ بیگم جمیل کی بہن بن کر آئی تھیں۔ نوشہ کو جمیلہ سے کچھ محبت نہ تھی مگر وہ اس کو پسند بہت کرتے تھے۔ حسین اور ذہین اور مشن کالج کی ایف اے پاس تھیں۔ جب یہاں رشتہ نہ ہو سکا تو جمیلہ کی والدہ نے کنبہ سے باہر شادی کر دی۔

دن تو اسی شور و شر میں گزر گیا۔ دولہا بنانے کا وقت آیا۔ مغرب کے وقت غسل کر کے جمیل میاں زنان خانہ میں آئے۔ یہاں بہت سی بیبیاں جمع تھیں۔ درمیان میں شرمائے ہوئے جمیل کھڑے تھے اتنے میں خبر آئی کہ مسلم اسکول کی پرنسپل صاحبہ مع اپنی چند استانیوں کے شکیل منزل میں شرکت شادی کو آئی ہیں اور اس وقت سہرا بندھائی کی رسم دیکھنا چاہتی ہیں۔ بیگم خلیل احمد صاحب نے اجازت دے دی کہ بلائی جائیں۔ یہ سن کر جمیل صاحب کی عجب کیفیت ہوگئی۔ اب انہیں یہاں کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ گویا پیر لرز گئے اور دل دھڑکنے لگا۔ وہ بے اختیار یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے مگر مجبور تھے کہ قدم اٹھانا ناممکن

تھا۔ دس منٹ بعد مس شریف پرنسپل گرلز اسکول اور اُن کے برابر ان کی اسسٹنٹ ٹیچر مس الفریڈ تھیں مگر نجمہ کا لباس اس وقت سب سے زیادہ قیمتی اور بھڑ کدار تھا اور ہاتھ کان گلے میں زیورات پہن رکھے تھے جیسے ہی وہ سامنے آئیں جمیل نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

سیٹھ صاحب کی کوئی بہن نہ تھی اس لئے دولہا کی بہن جمیلہ سہرا لے کر آگے بڑھیں پہلے وہ سات سہاگنوں کے سر سے چھوایا گیا۔ پھر نوشہ کے سر سے باندھ دیا۔ اس وقت پرنسپل اور نجمہ دولہا کے قریب کھڑی ہوگئیں۔ بیگم صاحب نے جڑاؤ کڑوں کی جوڑی سہرا بندھائی کا نیگ جمیلہ کو دیا اور سیٹھ خلیل احمد صاحب نے ایک رومال میں بندھے ہوئے دوسو روپے جمیلہ کے شوہر مسٹر رفیق کو بہنوئی کا حق دیا۔ رفیق صاحب دولہا کے ایک طرف کھڑے تھے اور شکیل حسن دوسری طرف۔

جمیلہ نے سر اٹھا کر آہستہ سے نوشہ سے کہا: ”یہ کڑوں کی جوڑی تو خالہ جان نے دی ہے۔ ابھی آپ سے تو سہرا بندھائی میں بہت کچھ لینا ہے۔ آپ تو بالکل ہمارے اختیار سے باہر نکلے جاتے ہیں کچھ وصول ہو جائے۔“

دولہا نہایت آہستہ سے بولے: ”آپ کے اختیار سے اب بالکل باہر ہوں اور اب دینے کے لئے میرے پاس کیا رکھا ہے؟ دیکھو جمیلہ یہ سرخ ساڑی پہنے جو پرنسپل کے برابر ایک لڑکی کھڑی ہے، یہ میرے ایک دوست کی بہن اور مثل تمہارے میری بہن ہے جو کچھ تم کو ملے اس میں سے اُن کو بھی حصہ ملے اور ذرا ان کی خاطر داری کرنا۔ اماں جان ان کو نہیں جانتیں۔“

بہن بھائی میں باتیں ہوتی دیکھ کر بیگم خلیل احمد نے کہا: ”بی بی صرف کڑوں سے کچھ خوش نہیں ہوئیں۔ بھائی سے بھی کچھ مانگ رہی ہیں دے دو نامیاں جو کچھ یہ مانگتی ہیں، تمہاری یہ ایک ہی تو بہن ہے۔“

فوراً جمیلہ نے کہا: ”خالہ جان بھائی جان کی یہ ایک بہن اور آئی ہیں، یہ ان کے ایک دوست کی ہمشیرہ ہیں، ان کا بھی تو حصہ نکلے گا۔ ہمارے پاس تو ایک ہی کڑا رہ گیا۔“
یہ کہہ کر وہ مس نجمہ کو اپنے ساتھ والدۂ نوشہ کے پاس لائیں اور انہوں نے شفقت سے اپنے پاس بٹھالیا۔

"میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ میاں جمیل نے کبھی ذکر کیا۔" والدۂ نوشہ نے کہا۔

نجمہ سلام کر کے ادب سے بیٹھ گئیں اور اُن کو بتایا: "میرے بھائی قمر بھائی جمیل صاحب کے گہرے دوست ہیں، اس سال گرمیوں میں مسوری پر ان سے ملی تھی۔ آج کل یہاں آئی ہوئی تھی تو پرنسپل صاحب کے ساتھ شادی میں آ گئی۔"

وہ بولیں: "اچھا کیا بیٹی۔ اب تم رہو جب تک شادی ختم ہو۔ دولہا کی ایک سے دو بہنیں ہو گئیں۔ قمر بھی تو آج ہی آئے ہیں۔ اس وقت ان کو اندر آنا ضروری تھا مگر پردے کی وجہ سے بے چارے نہ آ سکے۔"

دولہا سجایا جا چکا تو مرد باہر گئے، پردے والی بیبیاں ہٹ گئیں۔ شکیل حسن قمر کو اندر لے آئے۔ نوشہ تخت پر والدہ کے پاس بیٹھے تھے۔ سنہری جامہ اور اس لباس پر لمبا پھولوں کا سہرا پڑا تھا جس کو تھوڑا سا چہرے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ان کے بالکل سامنے نجمہ بیٹھی تھی اور جمیلہ دولہا کے بازو پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ قمر کو آتا دیکھ کر جمیلہ نے پردہ کر لیا۔ والدۂ جمیل ہمیشہ سے قمر کے سامنے ہوتی تھیں۔ قمر نے آتے ہی اُن کو سلام کیا پھر جیب سے کیمرا نکال کر دولہا اور نجمہ کی تصویر لی۔ اس کے بعد جمیل کو کھڑا کر کے دوسری تصویر لی اور کہنے لگے: "کل دلہن دولہا کی ایک جگہ تصویر کھینچیں گے۔"

باہر سے خبر آئی کہ سمدھن بیگمات سوار ہو جائیں، بارات تیار ہے۔ نوشہ کا انتظار ہے۔ دولہا کی والدہ سوار ہونے کے لئے تشریف لے گئیں۔ تب قمر نے کہا: "یہاں تو عجیب عجیب رسوم ہیں اور بڑی دلچسپی کا سماں ہے۔ کاش میں دو دن پہلے آیا ہوتا۔ بہن نجمہ آپ خوب شادی میں شریک ہوئیں۔ مسوری سے اس طرح آئیں کہ کسی کو علم نہ ہو سکا کہ کہاں گئیں۔ آ کر کام بھی شروع کیا تو کلکتہ میں۔"

نوشہ نے کہا: "قمر تم بہت شریر ہو آخر وقت تک نشتر لگائے جاتے ہو۔ اچھا سنو! اب تم ان کے بھائی ہو، اماں جان نے ان کو کبھی نہیں دیکھا اور یہ اپنی زبردستی سے شریک ہوئی ہیں۔ تو میں نے یہی کہہ دیا ہے کہ قمر کی ہمشیرہ ہیں۔ تمہیں ان کا خیال رہے۔"

"بہت خوب جناب! کیا یہ بھی بارات کے ساتھ چلیں گی؟"

تینوں اٹھے باہر آئے اور بارات روانہ ہوئی۔ نجمہ تو نوشہ کی ہمشیرہ بن کر بارات کے ساتھ گئیں اور پرنسپل صاحبہ مع اُستانیوں کے دُلہن کی طرف چلی گئیں گشت لگا کر نو بجے کے قریب بارات شکیل منزل پہنچی۔ کھانے کے بعد تمام رات ناچ ہوتا رہا۔ نجمہ آج شب یہیں رہیں۔ مس شریفہ اور دوسری استانیاں کھانا کھا کر چلی گئیں۔ صبح ہوتے ہی دولہا اندر بلائے گئے۔ رسوم کے لئے دونوں بہنیں جمیلہ و نجمہ اُن کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ جمیل کچھ بہت ہی خاموش اور افسردہ تھے۔ جب اُن سے کوئی رسم کرائی جاتی تو بڑی دقت سے ادا کرتے کبھی کہتے۔ ''کیا جاہلانہ باتیں ہیں۔'' کبھی کہتے ''میرا تماشہ بنایا گیا ہے فضول واہیات رسوم میں میرا وقت خراب کیا جا رہا ہے۔'' ان کی جوتی چھپائی گئی پھر دلہن کو کوئی بی بی گود میں اٹھا کر لائیں اور جہیز کے چھپر کھٹ پر بٹھایا گیا اور نوشہ کو اُن کے مقابل بٹھایا اور ان دونوں کے اوپر سرخ دوشالہ ڈال دیا گیا اور اندر ایک آئینہ اور قرآن شریف رکھ کر رسم آرسی مصحف ادا کی گئی۔

جمیلہ نے جھک کر دولہا سے کہا: ''بھائی جان آپ پہلے سورۂ اخلاص پڑھیں اور پھر آئینہ میں بھابی جان کا منہ دیکھ لیں۔''

دولہا میاں نے آہستہ سے جواب دیا: ''دُلہن کا منہ دیکھا ہوا ہے۔''

اس وقت کی رسوم دیکھنے کے لئے قمر بھی یہاں آنے کے لئے بے چین تھے۔ آخر شکیل حسن نے کہا: ''میں سب پردہ دار بیگمات سے عرض کرتا ہوں اوّل تو دستور ہے کہ شادی کے دن دولہا اور شہبالوں سے پردہ نہیں کیا جاتا اور کسی کو اعتراض ہو تو پس پردہ تشریف لے جائیں۔ ہمارا عزیز دوست قمر جو بھائی جمیل کا شہبالہ ہے اندر آ رہا ہے۔''

یہ آواز سن کر چند بن بیاہی لڑکیاں تو ہٹ گئیں باقی سب موجود رہیں اور مسٹر قمر اندر آ گئے۔ دلہن اٹھا کر پہنچا دی گئی تھی۔

وہ آرسی مصحف کی تصویر لینے اندر آئے۔ خواتین نے دیکھا کہ وہ دولہا کا شہبالہ ہو کر سوٹ بوٹ پہنے ہے اور سر پر کچھ نہیں کسی، نے اعتراض کیا کہ ''آج یہ لباس مناسب نہیں۔ یہ ایسے پکے انگریز ہیں کہ دوست کی شادی میں بھی اچکن پاجامہ نہیں پہنا۔ ان کو تو آج سر پر پگڑی یا ٹوپی پہن کر سہرا باندھنا چاہیے تھا۔''

شکیل حسن نے سب کو جواب دیا کہ "ان بے چارے کے پاس اچکن نہیں ہے کہاں سے پہنتے۔ آپ سہرا دے دیجئے ہم ان کے منہ پر لٹکا دیں گے۔"

دُلہن کی والدہ نے کہا: "شکیل میاں اعتراض بجا ہے۔ تم ابھی اپنی کوئی اچکن پہنادو اور ترکی یا ایرانی ٹوپی دے دو۔" یہ سن کر جمیلہ بولیں: "معاف کیجئے مجھ کو بھی کچھ خیال نہ رہا۔ شادی میں اچکن پہننا بھی ضروری ہے ورنہ تیار کرلی جاتی۔"

بزرگ بیبیوں کے کہنے پر بھی "پردہ کرلو" جمیلہ یہاں سے نہ اٹھیں۔ انہوں نے شکیل سے کہا: "بھائی جان آپ قمر صاحب کا صرف کوٹ اتروا دیں۔ پتلون اور پاجامہ میں کوئی فرق نہیں۔ قمیص پر تو سہرا اچھا معلوم ہوگا۔"

قمر گو پردہ والی بیبیوں میں نظریں نیچی کئے ہوئے تھے مگر بار باران کی نگاہیں دولہا کی بہنوں نجمہ و جمیلہ کی طرف اٹھی جاتی تھیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ دونوں نوشہ کے بہت قریب پہلو میں بیٹھی تھیں۔ نجمہ تو ان کی پرانی واقف کار تھیں۔ جمیلہ کو خدا نے ایسی بے مثال شکل دی تھی کہ اس مجمع میں ایک بھی ایسی نہ تھی۔ "دولہا کی بہن کی یہ رائے سن کر کہ قمر کا کوٹ اتروا دیا جائے۔" قمر صاحب نے فوراً کوٹ اُتار کر نیچے فرش پر ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر جمیلہ نے اپنے اور نجمہ کے گلے سے پھولوں کے ہار جو بہت سے ان دونوں کو پہنائے گئے تھے اتار کر شکیل حسن کو دیئے کہ یہ شہبالے کے سر پر باندھ دیجئے۔ شکیل نے ان چھ سات ہاروں کو لڑیاں بنا کر ان کے سر سے لپیٹ دیا۔ کچھ پھولوں سے پگڑی بن گئی اور چند لڑیاں چہرے پر بہت ہی اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر شکیل حسن نے والدۂ جمیل سے سہرہ بندھائی طلب کی تو انہوں نے نہایت خوشی سے پانچ اشرفیاں دیں۔ یہ دیکھ کر جمیلہ نے کہا۔

"کیا خوب خالہ جان تجویز میری، ہار میں نے اپنے دیئے۔ نیگ کے حقدار شکیل ہوگئے۔ لایئے یہ اشرفیاں ہمارا حق ہے۔"

یہ سن کر قمر نے کہا: "جو باندھے سہرا بندھائی اسی کا حق ہوتا ہے۔ آپ نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اشرفیاں کیسے مانگتی ہیں۔"

جمیل نے اپنا سہرا ہٹا کر جمیلہ سے کہا۔ "بہن تم خود جا کر ان ہاروں کو اُن کے سر سے اُتار کر اپنے ہاتھ سے دوبارہ باندھ دو اور پھر اماں جان سے مانگو۔"

''بھائی کی اجازت پر جمیلہ اٹھیں اور اپنے ہاروں کو قمر کے سر سے اتار کر باقاعدہ سہرا بنایا۔ اپنے گلے سے ایک پتلی سی سنہری زنجیر نکال کر اس میں ان کڑیوں کو باندھ دیا اور سات بیبیوں کے سروں سے چھوا کر قمر کے سر پر اسی طریقہ سے لپیٹا کہ پھولوں کی پگڑی بن گئی۔ کچھ لڑیاں لٹکتی رہیں۔''

انہوں نے جھک کر جمیلہ کو سلام کیا۔ جمیلہ شکیل حسن کے ہاتھ سے اشرفیاں چھینے لگیں۔ شکیل نہ دیتے تھے۔ قمر نے آہستہ سے کہا۔

''بہن آپ مسٹر شکیل سے نہ چھینئے۔ یہ حق تو آپ کو مجھ سے لینا چاہئے۔''

''ضرور آپ سے بھی لیا جائے گا۔ جس وقت بھائی جمیل سے لیں گے۔''

یہ باتیں ہوتی دیکھ کر والدہ جمیل نے اپنے گلے سے جڑاؤ چکلودی اتار کر جمیلہ کی طرف پھینک دی۔ وہ اٹھ کر جمیلہ نے خالہ جان کو سلام کیا۔ باہر سے نوشہ کی طلبی ہوئی۔ وہ تینوں چلے گئے۔ نجمہ خاموش بیٹھی یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے کبھی ایسی رسوم نہ دیکھی تھیں۔ دل میں کہہ رہی تھیں کہ گو جاہلانہ باتیں ہیں مگر ہیں دلچسپ۔ دن بھر یہاں اس طرح گزرا۔ ناچ گانا پھر جہیز نکالا گیا۔ نجمہ چند گھنٹوں کی اجازت لے کر اپنے گھر چلی گئیں اور باہر آ کر جمیل نوشہ بھی قمر کو لے کر مجمع سے اٹھے اور شکیل حسن کے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر دیا کہ دوسرے مہمان اور نوجوان دوست انہیں تنگ کرنے کو کمرے میں نہ آ سکیں۔ وہ بہت تھک گئے تھے اور سہرا وغیرہ اتار کر میز پر رکھ دیا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ قمر بھی وہیں بیٹھ گئے مگر اُن کے سر پر وہ سہرا ابھی تک لپٹا ہوا تھا۔

''آج تم بہت تھک گئے ہو، شادی کرنا کوئی آسان کام نہیں۔'' قمر نے کہا۔

''ہاں پیارے قمر میری بری حالت ہے اگر اور باہر بیٹھا رہتا تو ضرور گر جاتا۔'' نوشہ نے کہا۔

پھر قمر نے سوال کیا: ''یہ تو بتائیں آپ نے غریب نجمہ کو یہ روح فرسا منظر دکھانے کو کیوں بلایا؟ اب جب کہ اس کے دل پر اتنا اثر ہے کہ وہ بے چاری محض آپ کے لئے کلکتہ آ پڑی ہے۔ یہ نقشہ دیکھنا کس حوصلہ کا کام ہے۔''

جمیل نے کہا: ''آہ قمر! کچھ نہ پوچھو، میں نے بہت روکا تھا مگر وہ ضد کر کے خود

بخود آ گئیں۔ خدا اس بیچاری کو ہمت دے۔"

"اچھا یہ بھی بتا دیجئے یہ بیگم صاحبہ جمیلہ کون ہیں؟ آپ کی تو کوئی بہن تھی نہیں۔ کیا ان رسوم کے لئے کسی غیر کو بہن بنا لیا گیا ہے۔ بے چاری کتنی اچھی لڑکی ہے۔"

قمر تم کیا کیا پوچھو گے اور میں کیا بتاؤں۔ یہ لڑکی بھی مثل نجمہ کے بلکہ اس سے پیشتر بچپن سے مجھ سے منسوب تھی۔

قمر نے بات کاٹ کر کہا: "ارے ظالم اتم نے اس کو بھی پسند نہ کیا جو نجمہ کو چاہا۔"

"سنو پھر اعتراض کرنا" جمیل نے کہا: "جمیلہ کوئی غیر نہیں بلکہ اماں جان کی خالہ زاد بہن کی لڑکی ہے۔ عمر میں مجھ سے چھ سات سال چھوٹی ہے۔ وہ جب پیدا ہوئی تو خالہ جان نے اس کو میرے نام کی کر دیا۔ اسی لئے اس کا نام جمیلہ رکھا گیا۔ وہ میری اماں جان کی بہو مشہور ہو گئی۔ چونکہ وہ سنہرے بالوں والی چینی کی گڑیا مجھ کو بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خاندان کے رواج کے خلاف اس کو اعلیٰ تعلیم بھی دی گئی کیوں کہ خالو جان بہت آزاد خیال ہیں۔ پہلے کانونیٹ سے سینئر کیمبرج پاس کیا اور پھر مشن کالج سے الیف اے۔ وہ جب دوسرے سال میں تھیں کہ میرے چچا جان و حقیقی خالہ جان کے ہاں شکیلہ پیدا ہو گئیں اور اب وہ میری مالک قرار دی گئیں۔ تاہم میری اور جمیلہ کی بات چلتی رہی۔ اتفاق سے دو سال قبل میں بدنصیب نجمہ سے ملا اور ایک دم اس سے بہت ہی انسیت ہو گئی۔ گھر میں یہ جھگڑا پڑا ہوا تھا۔ والدین پریشان تھے کہ جمیلہ سے کریں یا شکیلہ سے۔"

قمر نے پھر درمیان میں سوال کیا: "سچ کہو کہ نجمہ سے قبل آپ کو جمیلہ زیادہ پسند تھی یا شکیلہ؟ اور جب نجمہ سے نہ ہو سکا تو پھر تم نے جمیلہ سے ہی شادی کیوں نہ کی؟"

"قمر تم بات پوری نہیں ہونے دیتے اور سوال کر دیتے ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ کو جمیلہ بہت پسند تھی۔ انگریزی اسکول کی تعلیم کی وجہ سے انگریزی نہایت اچھی بول سکتی تھیں اور مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں مگر بدقسمتی سے شکیلہ کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکیں کیوں کہ اوّل تو شکیلہ حقیقی خالہ کی بیٹی اور پھر "بنت عم" میری وارثِ حقیقی سمجھی گئی۔ میں چونکہ ایک ہی بیٹا ہوں۔ والدین کو ناخوش کرنا نہیں چاہتا۔ بے چاری جمیلہ یوں بھی فیل ہو گئی کہ وہ ذرا آزاد تعلیم یافتہ تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں جب اس نے سینئر کیمبرج کا امتحان دیا اس

کے بال فیشن ایبل کٹے ہوئے تھے اور اس کا پردہ بھی نہیں کرایا گیا تھا۔ جب خالہ جان کو جواب دے دیا گیا کہ اُن کی لڑکی سے میری شادی نہیں ہو سکتی تو میں صبر کر کے مسوری چلا گیا۔ اس کے بعد کے حالات تمہیں معلوم ہیں۔ نجمہ کے بعد لازمی تھا کہ شکیلہ سے رشتہ ہوتا اور ہو گیا۔"

قمر نے یہ پردرد کہانی سن کر کہا: "آفرین ہے میرے دوست ایسی فرمانبرداری و سعادت مندی تو اس زمانہ کی لڑکیوں سے بھی نہ ہو گی۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ مسز جمیل کی شکل و صورت سیرت و تعلیم کیسی ہے؟"

جمیل آنکھیں بند کئے لیٹے تھے گویا چونک کر بولے۔

"خدا کا شکر ہے۔ سب کچھ اچھا ہے۔ شکل نجمہ اور جمیلہ کے درمیان میں ہے یعنی جمیلہ نمبر اوّل اور شکیلہ دوم، نجمہ سوئم، تعلیم انٹرنس تک ہے۔ مس شریف نے گھر پر پڑھایا ہے۔ ایک یورپین لیڈی مقرر کر کے انگریزی بولنا سکھایا گیا ہے۔ مزاج نہایت اچھا ہے۔ اب تک ایک ہندوستانی بیوی کی طرح میری فرمانبردار ہے۔ یہاں تک کہ نجمہ سے خوشی سے ملتی ہے اور مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ اللہ بیڑا پار کرے گا۔"

قمر نے کہا: "خوش نصیب ہو بگڑ بگڑ کر پھر سنبھل گئے۔ نجمہ تو خیر، جمیلہ بیشک بے نظیر لڑکی ہے۔ کیا وہ اب تک پردہ نہیں کرتی۔ میرے سامنے کیوں کر ہو گئی۔"

"اب تو پردے میں ہے، شادی کے دن ایسا ہی پردہ ہوا کرتا ہے۔ بزرگ بیبیوں نے تو حکم دیا تھا کہ یہاں سے اٹھ جاؤ مگر وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔ اس لئے تمہارے سامنے ہو گئی۔"

زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ معلوم ہوا کہ گیارہ بج گئے اور کھانے کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ کھانے کے بعد رخصتی کا سامان ہوا اور پانچ بجے دُلہن کو لے کر بارات گھر پہنچی۔ دُلہن اتاری گئی رسموں کے لئے دولہا اندر بلائے گئے۔ اس وقت وہ تنہا آئے۔ شکیل، رفیق، و قمر وغیرہ میں سے کوئی ساتھ نہ تھا۔ سب سے پہلے دُلہن کے آنچل پر نوشہ کو دو رکعت نماز پڑھوائی گئی پھر کھیر چٹائی کی رسم ادا ہوئی۔ اس کے بعد رونمائی ہوئی۔ پہلے خسر سیٹھ صاحب نے منہ دیکھا اور ایک ہزار روپے کی گنیاں دیں۔ ساس صاحبہ نے قیمتی چندن

ہار پہنایا اور رشتہ دار بیبیوں نے منہ دیکھ کر حسب حیثیت رونمائی دی۔ دولہا کی دونوں بہنوں سے کہا گیا کہ "تم دونوں بھی منہ دیکھو اور کچھ دو۔"

نجمہ نے یہ سن کر اپنے بٹوے میں سے ایک سنہری زنجیر نکالی جس کے بیچ میں ایک پان نما چھوٹی سی جگنی پڑی تھی جس پر ایک بڑا سا ہیرا جڑا تھا اور دلہن کے گلے میں پہنادی۔ پھر سب نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا:

"میرے پاس اس وقت ایسی چیز موجود نہیں ہے جو بھابی جان کو رونمائی میں پیش کروں اور نہ مجھ کو یہ پسند کہ دکھاوا کیا جائے۔ میں مجمع میں نہیں بلکہ اندر جا کر جو کچھ دے سکی پیش کروں گی۔"

سب ہنسنے لگیں اور نجمہ کے خوبصورت تحفہ کی سب نے تعریف کی۔ نہ معلوم کیوں نوشہ کی نظریں جس وقت سے کہ وہ زنجیر نکالی اور پہنائی گئی تھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ سوائے نجمہ کے اور کوئی اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ تین گھنٹہ میں منہ دکھائی ختم ہوئی اور دلہن کو اس کے کمرے میں لے گئے نجمہ رخصت ہو گئیں۔ اب رات ہو گئی تھی۔ کھانے کے لئے دولہا دلہن کمرے میں بلوائے گئے سب لڑکیاں وہاں سے ہٹادی گئیں۔ پانچ سات خادمائیں دلہن کے گرد و پیش تھیں۔ جمیلہ نے اُن کو بھی کمرے سے نکال دیا اور خود دولہا کو لینے باہر آئیں۔ وہ برآمدے میں ایک کرسی کے سہارے کھڑے تھے۔ وہ کل کا لباس اور پھول وغیرہ اس وقت نہیں لادے ہوئے تھے۔ تہہ بند پاجامہ اور کریم رنگ کی ریشمی قمیص پہن رکھی تھی۔ پیروں میں وہ ہی سنہری کامدار جوتا تھا۔ اس حالت میں بہت اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ جمیلہ قریب آئیں اور اندر چلنے کو کہا تو وہ بولے:

"پہلے اپنا آنچل تو میرے سر پر ڈال دو پھر اندر لے چلو۔"

"اب تمام عمر میرے آنچل کے زیر سایہ چلا کریں گے؟ وہ تو صرف کل کے لئے تھا۔ چونکہ خالہ جان کے اپنے کوئی بیٹی نہ تھی۔ انہوں نے اس ضرورت کے لئے مجھ کو آپ کی بہن بنادیا۔ بھائی جان وہ تو اسی دن ضروری ہوتا ہے کہ جب دولہا سسرال جائے تو بہن کا آنچل سر پر ہو۔" جمیلہ نے جوب دیا۔

جمیل نے ان کا آنچل اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا اور کہا: "جمیلہ ان

سب بدتمیزی کی رسوم میں سے مجھ کوتو ایک یہی رسم دل سے پسند آئی ہے، جی چاہتا ہے عمر بھر تمہارے اس خوبصورت جھلملاتے آنچل کے زیر سایہ چلا کروں۔ کہو کیا رائے ہے؟ کیا تم اپنے رفیق کو چھوڑ کر یعنی کچھ دن تو ان سے علیحدہ ہو کر ہمارے ساتھ رہو گی؟''

''بھائی جان! میرا اپنا دل یہی چاہتا ہے کہ تازندگی آپ سے جدا نہ ہوں مگر آپ نے تو رفیق صاحب کے حوالہ کر دیا اور جس کی وجہ سے مجھ کو چھوڑا وہ بھی نہ ملی۔''

''تم نے یہ کیا کہا جمیلہ! تم کو کسی وجہ سے نہیں چھوڑا، تم اتنی اچھی لڑکی ہو کہ جو دیکھتا ہے تعریف کرتا ہے۔ میرا دوست قمر تو کل سے تمہاری تعریفیں کر رہا ہے اور تم نے اپنی زنجیر اس کو دے کر حیران کر دیا ہے۔ وہ اب اس فکر میں ہے کہ تم کو کیا دے۔''

جمیلہ نے کہا: ''ہاں بھائی جان قمر صاحب بہت اچھے نوجوان ہیں۔ گو کم دیکھا ہے مگر میرا خیال ہے کہ بہت نیک شریف اور خوش اخلاق ہیں چلئے اندر دیر ہو گئی۔ بھابی جان منتظر ہیں۔''

''چلو ہاں ایک بات سن لو، کل شام تم کو سب گھر والوں سے پوشیدہ نجمہ کے ہاں چائے پر چلنا ہے۔''

''شکیلہ کو بھی لے جانا مگر کل ناممکن ہے کیوں کہ ولیمہ ہے وہ کہاں نکل سکیں گی۔''

پھر دونوں کمرے میں آئے اور جمیلہ نے جمیل کو دلہن کے سامنے بٹھا کر اُن کا گھونگھٹ اٹھا کر کہا:

''لیجئے بھائی جان! یہ سب سے اعلیٰ سب سے بیش قیمت چیز میں آپ کو رونمائی میں دیتی ہوں۔ کہئے کسی کا تحفہ بھی اس کے برابر ہے؟''

دُلہن آہستہ سے بولیں: ''بے شک یہ چیز دنیا کی کل چیزوں سے بیش قیمت ہے مگر یہ نعمت تو مجھ کو اپنی خاص رحمت سے خدا نے عطا کی ہے۔ آپ کا کوئی احسان نہیں۔''

جمیلہ نے جواب دیا: ''ایسی ناشکری و احسان فراموشی نہ کیجئے۔ یہ چیز میں نے نہیں دی ہے بلکہ میرے علاوہ ایک اور کا بھی احسان ہے۔''

یہ سن کر دلہن مسکرائیں اور جمیلہ کو اپنے قریب کھینچ کر چھیڑنے کو کہا: ''بڑی احسان کرنے والی۔ جب ایک چیز تم سے چھین لی گئی تو تم مجبور ہو گئیں۔ اپنی خوشی سے

دینے والی کب تھیں۔"

جمیلہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئیں اور یہ کہتی ہوئی۔ "یہ چیز ہی ایسی نہ تھی کہ کوئی خوشی سے کسی کو دے سکے۔ اچھا دو دوسے چھین کر لینے والی خدا مبارک کرے۔ دروازہ سے نکل گئیں۔

یہ دونوں صاف گوئی پر ہنسنے لگے۔ پھر دلہن نے جمیل سے پوچھا: "اس وقت نجمہ کہاں ہیں۔ کچھ دیر سے وہ نظر نہیں آ رہی ہیں۔ کسی سے دریافت بھی نہ کر سکی۔ افسوس آج ان دونوں کے دلوں میں کیا خیالات ہوں گے؟"

جمیل نے جواب دیا: "رونمائی کے بعد ہی وہ چلی گئیں۔ شکیلہ اب تم اپنے خوشگوار زمانے میں ان دونوں کا خیال نہ کرو اور اس جمیلہ کو تم بچپن سے جانتی ہو۔ ہمیشہ سے تمہیں چھیڑتی آئی ہیں۔ شکیلہ دو دن کی تکلیف سے میں بہت تھک گیا ہوں۔ خدا کے لئے اب کوئی رسم نہ ہونے پائے۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں میرا دوست قمر کل رات کو چلا جائے گا۔ اس کے جانے سے پہلے تمہیں ان سے ضرور مل لینا چاہئے۔"

"جو آپ کی رائے ہو۔ میں تیار ہوں مگر کل چوتھی ہے، کیسے فرصت ملے گی۔ پرسوں ولیمہ ہے۔ آپ قمر صاحب کو اس کی شرکت کے لئے روک رکھئے۔ اس دن موقع دیکھ کر بلوا دیجئے۔" دلہن نے جواب دیا۔

کھانا آ گیا مگر جمیل نے کھانے سے انکار کیا دلہن نے بھی تنہا نہ کھایا اور وہ یوں ہی مسند پر ہی لیٹے اور سو گئے۔ دلہن ڈریسنگ روم میں تبدیل لباس کے لئے گئیں جہاں ان کی خادمہ موجود تھی۔

(۱۴)

دوسرے دن صبح کو ولیمہ تھا۔ مہمانوں سے اسی طرح گھر بھرا ہوا تھا۔ گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں دو بجے کھانا کھایا جا چکا تو قمر صاحب اسی وقت مس نجمہ کے ہاں چلے گئے تھے۔ چائے کے مہمان تو چار بجے آنے والے تھے مگر وہ کچھ دیر پہلے سے آ گئے کیونکہ وہاں مجمع میں تنگ آ گئے تھے اور جمیل کل سے زیادہ زنانخانہ میں وقت گذارتے تھے۔ بیچاری نجمہ ان کے آنے سے خوش ہو گئیں۔ ایک گھنٹہ بیٹھی باتیں کرتی رہیں اور ساڑھے تین بجے وہ تیار ہونے اور چائے کے انتظام کے لئے ان کے پاس سے اٹھ گئیں۔ وہ اخبار دیکھنے لگے کہ کسی کار کے آنے کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر باہر آئے دیکھا کہ اکیلی جمیلہ اتر رہی ہیں۔ انھوں نے سوال کیا:

"آپ تنہا ہیں اور جمیل کہاں ہیں۔ آپ دونوں کو ساتھ آنا تھا جمیل کہتے کہ وہ آپ کو ہمراہ لائیں گے بیگم جمیل کا نکلنا آج ناممکن ہے۔ جمیلہ نے کہا میں کھانا کھاتے ہی تھوڑی دیر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ وہاں سے سیدھی ادھر آ گئی۔ اگر خلیل منزل میں چلی جاتی تو پھر نکلنا ناممکن ہو جاتا کیوں کچھ بُرا ہوا (گھڑی دیکھ کر) ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ میں صرف تیس منٹ پہلے آ گئی۔ نجمہ بہن سے شادی میں دو تین دن برابر ملتے رہنے سے کافی بے تکلفی ہو چکی ہے۔ آپ بھی تو بہت پہلے تشریف لے آئے ہیں۔"

دونوں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تو قمر نے کہا: "آپ کا ذرا پہلے تشریف لے آنا بہت ہی اچھا ہوا۔ وہاں کل سے جمیل تو ملتے ہی نہیں نجمہ سے کچھ دیر باتیں کرنے کو ادھر چلا آیا۔ آج شب کو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

جمیلہ نے کہا: "قمر صاحب آخر آپ کو جانے کی اس قدر کیوں جلدی پڑی ہے؟

اب تو شادی ختم ہوگئی۔ چند دن کلکتہ کی سیر کیجئے۔"

"دل تو یہاں سے جانے کو بالکل نہیں چاہتا لیکن جانا ہے۔ آج گیا یا کل۔ سیر کا مجھ کو شوق نہیں۔ جمیل اب ہر وقت اندر رہیں گے اور کسی سے میری دوستی نہیں۔ کس لئے ٹھہروں؟"

جمیلہ نے کہا: "یہ درست ہے کہ جمیل اب ہاتھ نہ آئیں گے لیکن ہم تو چاہتے ہیں کہ جب اتنی دور سے آپ تشریف لائے ہیں تو چند دن ٹھہریے۔"

"چند دن نہیں میں تو چند ماہ ٹھہرنے کو تیار ہوں مگر پھر وہی سوال کہ باہر تنہا پڑا پڑا کیا کروں۔ سب کا مجھ سے پردہ ہے۔ خدا جانے آپ نے کیوں ایک نامحرم کے سامنے ہونا گوارہ کرلیا؟ مگر وہ بھی اسی وقت کے لئے تھا یا اتفاق سے آج یہاں ملاقات ہوگئی مگر اس میں شک نہیں کہ آپ کے خلوص وعنایت کا میرے دل پر خاص اثر ہے لیکن آپ سے ملنا تو یہاں ناممکن ہے۔ آپ کو یاد ہے اس دن اس اجنبی مسافر کو اپنے قابل قدر گلے کے ہاروں سے سہرا باندھا تھا اور رسماً مجھے بھی کچھ دینا تھا جس کا اب تک موقع ہی نہ ملا۔ میرے پاس تو وہ پھول اور آپ کی قیمتی سنہری زنجیر ہمیشہ قابل قدر و قابل فخر یادگار رہے گی"۔ اور اپنی قیمتی قمیص کا کالر ہٹا کر دکھایا کہ وہ زنجیر اس وقت بھی گلے میں تھی۔ یہ دیکھ کر جمیلہ نے کہا۔ "مجھ کو بہت خوشی ہے کہ اللہ نے میرے ایک سے دو بھائی کردئے۔ آپ کو نہیں معلوم جمیل بھائی جان سے مجھ کو بے حد محبت ہے اور ان کے عزیز دوست ہونے کی وجہ سے آپ بھی میرے عزیز بھائی ہوگئے ہیں۔ آپ نے اس حقیر زنجیر کو اس وقت تک گلے میں ڈال رکھا ہے ۔ بہت خوشی ہوئی۔ بھائی جان شاید آپ نہ جانتے ہوں گے، مجھ بدنصیب کا کوئی حقیقی بھائی نہیں ہے۔ سوائے بھائی جمیل کے۔"

قمر نے کہا: "وہ بھی زمانے کی زبردستیوں نے بھائی بنادیا ہے۔"

اچھا آپ کو ہمارے سب حالات معلوم ہیں، بھائی جمیل آپ سے کیا چھپاتے جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا خدا نے مجھے ایک اور قابلِ فخر بھائی عطا کیا اللہ جانتا ہے دل نہیں گوارا کرتا کہ آپ یہاں سے جائیں۔"

قمر نے کہا: "اچھا نہ جائیں گے۔ مجھ کو بے حد خوشی ہے کہ میرے جان سے زیادہ

عزیز دوست جمیل کی عزیز بہن مجھ ناچیز کو اپنا عزیز خیال کرے۔ کہیے آج کل آپ کا کیا شغل ہے؟ کالج تو چھوڑ دیا ہے۔ کیا بی اے کا ارادہ نہیں؟ غالباً پردے کی وجہ سے۔"

اتنے میں مس نجمہ معہ چائے کے سامان کے آ گئیں۔ آیا نے سب چیزیں میزوں پر چُن دیں۔ قمر اور جمیلہ نے بھی ان کی مدد کی۔ اب جمیل بھی آ گئے۔ قمر نے خوب چھیڑا اور مذاق کیا کہ بیوی کی وجہ سے دیر سے پہنچے۔ جمیلہ نے کہا: "اسی خیال سے میں تنہا آ گئی تھی کہ بھائی جان آج دیر سے آئیں گے۔"

جمیل بولے "بہت ہی اچھا کیا۔ تم کچھ دیر قمر سے مل لیں۔ یہ بچارے رات کو جا رہے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے تھے۔ جو خلیل منزل میں ناممکن تھا۔ اس وقت میں شکیلہ کو لانا چاہتا تھا کہ قمر سے ملانا ضروری ہے مگر نہ لا سکا۔ میرے کمرے سے نکلتے ہی لڑکیاں آ گئیں مجبوراً چلا آیا۔"

جمیلہ نے کہا: "ہاں بھائی شکیلہ بھابی جان اگر نہ مل سکیں تو پردہ ہی رہ جائے گا۔"

"نہیں جی ان کو ضرور ملایا جائے گا۔ خواہ اسٹیشن پر ہی لے جانا پڑے وہ بھی ان سے مل کر امید ہے بہت خوش ہوں گی، جمیلہ تم کو بھی قمر پسند آئے۔"

جمیلہ نے جواب دیا: "بھائی جان بھلا پسند کیوں نہ آئے، وہ چیز ہی ایسی ہیں کہ ہر کوئی پسند کرے۔"

جمیلہ کی زبان سے یہ سن کر قمر بہت خوش اور حیران ہوئے کہ اس صفائی سے ایک لڑکی نے ایسا کہہ دیا۔ پھر جمیل نے کہا: "مگر معلوم ہوتا ہے ہماری نجمہ بہن کو قمر کچھ پسند نہیں آئے؟"

نجمہ بولیں: "میں نے ان کو پہلی بار تو دیکھا نہیں کہ پرکھوں کئی سال کی پرانی واقفیت ہے۔"

قمر نے کہا: "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ جس قدر وہ مجھ کو پسند ہیں اسی قدر میں بھی ان کو پسند ہوں گا۔"

قمر کے یہ سخت الفاظ جمیل کو بہت ناگوار گزرے کہ نجمہ کے متعلق قمر کو ایسا نہ کہنا چاہئے تھا۔ نجمہ کو صدمہ ہوا ہوگا لیکن سمجھ دار نجمہ نے اَن سُنی کر دی اور سب سے کہا "اب

چائے شروع کر دینی چاہئے۔ مجھے پرنسپل صاحبہ کا انتظار تھا۔ نہ معلوم کیوں دیر ہوئی۔"
یہ کہہ رہی تھیں کہ کار کی آواز آئی۔ نجمہ اور جمیلہ اتر وانے گئیں دیکھا کہ گاڑی میں پرنسپل اور تین اور اُستانیوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب بھی موجود ہیں۔ نجمہ نے جمیلہ سے آہستہ سے کہا:

"بی بی کوئی ہرج تو نہیں، پرنسپل صاحبہ کے بھائی شمشاد بھی ہیں۔ آپ کچھ گہرا پردہ تو نہیں کرتیں مگر ہاں مسٹر جمیل کو تو یہ نا گوار ہو گا؟"

جمیلہ نے جواب دیا: "اُونہہ کوئی بات نہیں۔ میرا بھائی آزاد خیال ہے۔ صرف یہ کیجئے کہ میرا ان سے تعارف نہ کرایئے۔ بس اتنا ہی پردہ کافی ہے۔"

وہ لوگ تو اتر کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے اور چائے تقسیم ہوئی۔ قمر صاحب اور دو ٹیچرز مس کملا و مس گھوش سب کو چیزیں پاس کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمشاد اس وقت اس نئی اور حسین لڑکی کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے اور تعجب یہ تھا کہ نجمہ نے ایسی اچھی مہمان سے ملوایا کیوں نہیں جو بات کرنے کا موقعہ ملتا۔ بے اختیار ان کی نگاہیں بار بار جمیلہ کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ قمر صاحب کو بھی ڈاکٹر نے بہت پسند کیا۔ پہلی ملاقات میں بہت دوستی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا کہ بیگم جمیل صاحب اس پارٹی میں کیوں نہیں آئیں۔ اُن کی بہن نے بتا دیا کہ نئی دُلہن ایسی جلدی نہیں نکل سکتیں۔ ڈاکٹر شمشاد گو بظاہر خوش نظر آ رہے تھے مگر دل میں پژمردہ تھے کہ نجمہ جلدی یہاں سے جانے والی ہیں۔ بہت اچھی طرح یہ وقت گزرا۔ چائے کے بعد اس پارٹی کی تصویر لینے کی تجویز ہوئی اور سب باہر آئے۔ مس کملا نے تصویر کھینچی۔ جمیلہ نے اس گروپ میں شرکت سے انکار کیا لیکن جمیل کے کہنے سے شریک ہو گئی۔ اب مغرب کا وقت ہو چلا تھا سب مہمان رخصت ہونے لگے لیکن جمیل جمیلہ اور قمر ٹھیر گئے تو قمر نے جمیل سے کہا۔

"جب آپ نے اس گروپ میں بہن کو شامل ہونے کی اجازت دے دی تو کیا اتنی مہربانی اور نہ کریں گے کہ باجی جان مسز حامد کے دکھانے کو میں ان کا بھی فوٹو لے لوں۔"
جمیل نے جواب دیا۔ "ارے اس وقت اندھیرے میں اب کیا فوٹو لوگے گھر چل کر تمہیں انکی ایک تازہ تصویر جو اسی ہفتہ میں لی گئی ہے دے دی جائے گی۔"

یہ لوگ ہنس بول رہے تھے لیکن نجمہ بہت خاموش اور افسردہ ہو رہی تھیں ۔ اسی وقت قمر نے اپنی جیب سے ایک خوبصورت مخملی کیس نکال کر اس میں سے ایک سنہری قیمتی چوڑی نکالی جس میں ہلال نما چھوٹی سی گھڑی جڑی تھی اور جمیلہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو یاد ہوگا آپ نے سہرا باندھا تھا تو میرے پاس اس کا حق دینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ کیا امید کر سکتا ہوں کہ آپ اس کو قبول کر کے مشکور کریں گی؟''

یہ دیکھ کر جمیل بہت خوش ہوئے اور کہا: ''اوہو آپ اس قدر ادب کے ساتھ اپنی بزرگوار ہمشیرہ مکرمہ کی خدمت میں یہ حقیر تحفہ کیوں پیش کر رہے ہیں۔ ارے بھائی! وہ چھوٹی بہن ہے تم خود ان کے ہاتھ میں پہنا دو۔''

ان سے اجازت لے کر قمر نے اپنے ہاتھ سے وہ چوڑی جمیلہ کو پہنا دی اور انہوں نے جھک کر سلام کیا۔ پھر یہ لوگ نجمہ سے رخصت ہونے لگے۔ جمیلہ اور قمر کو نجمہ نے مل کر پہلے سوار کرا دیا۔ ان کے بعد جمیل سے شیک ہینڈ کیا۔ یہ اس لمحہ بہت ہی غمگین و چشم پر آب تھیں۔ جمیل نہیں سمجھ سکتے کہ اس وقت اس قدر مغموم کیوں ہیں۔ جب اسی طرح کھڑے کھڑے دس منٹ گزر گئے تو جمیل نے کہا۔ ''آپ اس قدر رنجیدہ نہ ہوں میں صبح ہی پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ دیکھو وہ گاڑی میں قمر و جمیلہ میرے منتظر ہیں۔''

جمیل سے یہ سن کر نجمہ بے اختیار رونے لگیں ۔ ان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور ان کا ہاتھ چھوڑ کر تیز قدمی سے جا کر کمرے میں صوفہ پر جا پڑیں، جمیل نے یہ حالت دیکھ لی۔ قمر سے کہا: ''ٹھیرو میں ابھی پانچ منٹ میں آیا'' اور پھر اندر آئے دیکھا کہ وہ بری حالت میں صوفہ پر پڑی سسکیوں سے رو رہی ہیں۔ یہ نقشہ دیکھ کر وہ بھی بے چین ہو گئے۔ انہیں اٹھایا، اپنے رومال سے آنکھیں اور چہرہ خشک کیا اور کہنے لگے:

''نجمہ اتنا رنج نہ کرو مجھ سے گھر جایا نہ جائے گا اور آپ جانتی ہیں ان دنوں میرا بیوی کی خدمت میں حاضر رہنا کس قدر ضروری ہے۔ کل شام رونمائی کے بعد فوراً ہی جب آپ چلی آئی تھیں۔ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں کہ مجھ کو کس قدر تکلیف پہنچی تھی مگر حوصلہ سے کام لے کر میں نے اور رسمیں ادا کیں اور دلہن کے کمرے میں گیا۔ اس پر یہ ثابت نہ ہونے دیا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ شریر جمیلہ تو وہیں موجود تھی۔ اس سے صبر نہ ہو سکا اور شکیلہ

سے کہہ دیا کہ "ہم دونوں سے چھین کر یہ نوشتہ تم نے پایا ہے۔ ہماری شکر گزار ہو۔"

نجمہ نے کہا: "جمیلہ خوش نصیب ہے وہ آپ کی رشتہ دار ہے اور ہر وقت آپ کو دیکھ سکتی ہے۔ جمیل صاحب مجھ کو تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اس وقت آپ مجھ سے آخری بار رخصت ہو رہے ہیں۔ اب میں پھر آپ کو نہ دیکھوں گی، اچھا جایئے خدا حافظ۔"

یہ کہتی ہوئی نجمہ ان کے سامنے ہی بیڈروم میں چلی گئیں اور جمیل بھی چشم پر آب باہر نکل آئے۔ گاڑی میں ان کا انتظار تھا مگر ان کی حالت دیکھ کر وہ دونوں افسردہ ہو گئے۔ جمیلہ کی گاڑی تھی اور اسی کو ڈرائیو کرنا تھا۔ ان کے سوار ہوتے ہی اس نے گاڑی سٹارٹ کی۔ کار چلی تو قمر نے جمیل سے دریافت کیا۔ "بہت دیر لگا دی کیا وجہ تھی؟"

"قمر وہ تو روتے روتے اپنی جان کھو رہی ہیں۔ میں کیسا سنگدل ہوں کہ اس حالت میں اکیلی چھوڑ کر جا رہا ہوں مگر کیوں جا رہا ہوں یہ بھی جانتے ہو؟ اپنا فرض ادا کرنے جو خدا کی طرف سے نہیں بلکہ سماج کی طرف سے مجھ پر عاید کیا گیا ہے۔ میں سماج کی تو پرواہ نہ کرتا مجھ کو صرف والدین اور اس بے بس لڑکی کا خیال ہے جو جبراً میرے سر چپکائی گئی ہے۔ کیا اب بھی میں اتر جاؤں تم جمیلہ کو گھر پہنچا دینا۔"

یہ کہہ کر جمیل نے اپنا سر اٹھایا اور قمر سے کہا: "قمر تم کو آج ضرور جانا ہے۔ مجھ کو اپنی بیوی سے تمہیں ملوانا ہے۔ چلو جمیلہ تیز چلاؤ تاکہ جلدی پہنچ جائیں۔ بارہ بجے کی ٹرین سے قمر جا رہے ہیں۔"

جمیلہ نے کہا: "اچھا بھائی جان تیز چلتی ہوں کیا میں بھی خلیل منزل ہی اتروں ذرا ان دیور بھاوج کی ملاقات دیکھ لوں۔"

جمیل نے جواب دیا: "ضرور اور تم اس وقت کہاں جاؤ گی۔ وہیں اترو کھانا بھی ہمارے اور قمر کے ساتھ کھاؤ گی۔"

جمیلہ اس کے لئے تیار ہو گئیں کہ قمر ان کے ساتھ کھانا کھائیں۔

☆

(۱۵)

جمیلہ جمیل اور قمر تینوں نجمہ سے رخصت ہو کر خلیل منزل پہنچے، دلہن یہاں ان کی منتظر تھیں۔ قمر کو زنانخانہ میں لا کر نئی دلہن سے ملوانا جمیل کے لئے سخت دشوار تھا۔ خاندان کے بزرگ کسی غیر کے سامنے دلہن کا ہونا ناپسند کرتے مگر جمیل کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ انکا جان سے زیادہ عزیز دوست بغیر ان کی بیوی کو دیکھے چلا جائے۔ اس انتظام کے لئے جمیل اور جمیلہ دلہن کے کمرے میں آئے، جمیلہ نے آتے ہی رشتہ دار لڑکیوں اور خادماؤں کو کمرے سے باہر بھیج دیا کہ اب دولہا دلہن کھانا کھائیں گے اور پھر جمیل سے کہا:

"بھائی جان قمر بھائی کو آپ غسل خانہ سے لے آئیں۔ اتنے میں کھانا منگاتی ہوں لیکن یہ تو بتایئے کھانا اس وقت میز کرسی پر تو ہو نہیں سکتا۔"

"بہن جمیلہ اس کی ضرورت نہیں جس طرح ہم روز کھاتے ہیں اسی طرح ہوگا۔ دلہن کے آگے چنوا دو۔" جمیل نے جواب دیا اور قمر کو لانے باہر چلے گئے تو جمیلہ نے بھاوج سے کہا:

"دیکھئے بھابی جانی خود بھی بھائی جان سوٹ پہنے ہوئے ہیں اور قمر صاحب بھی دونوں زمین پر بیٹھ کر کس طرح کھا سکیں گے؟"

دلہن نے کہا: "ہوگی تو دقت ہی لیکن جیسی ان کی رائے۔"

جمیلہ نے سر سے پیر تک دلہن کے زیورات ولباس پر نظر ڈال کر کہا: "بھابی جان آپ کی سجاوٹ میں بھی بھائی جان کی رائے شامل ہے یا صرف آپ کی اپنی ہی؟ میرے خیال میں اگر آپ اس وقت کوئی خوبصورت ساڑی پہنتیں تو بہت اچھا تھا۔"

"میں اپنی رائے سے کچھ نہیں کرتی۔ وہ چلتے وقت کہہ گئے تھے کہ قمر صاحب سے

ملنے کیلئے تم اسی حالت میں رہنا۔ایک ہندوستانی دُلہن اس خاص لباس میں ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ساڑی تو روزمرہ کی چیز ہے۔اسی لئے دیکھو میں نے کتنا زیور لاد لیا ہے۔جھومر بھی لگالیا ہے اور تو اور پیروں کو دیکھو پازیب، چھاگل، رام جھول اور لچھے چاروں چیزیں بھری ہیں۔" اور اپنے پیر جو بڑے بھاری پائنچے میں چھپے ہوئے تھے نکال کر جمیلہ کو دکھائے۔واقعی ان کے چھوٹے چھوٹے اور گورے پاؤں جن میں شادی کی مہندی لگی ہوئی تھی۔ جگمگاتے سنہری جڑاؤ زیورات میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ دُلہن اس وقت چوتھی کا جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ سبز کمخواب کا بھاری پاجامہ اور سرخ جارجٹ کا بھاری کامدار چوبی جال کا دوپٹہ تھا جو تیز برقی روشنی میں آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہا تھا۔اس پر پھولوں سے دُلہن سجائی گئی تھی اور قیمتی سنہری مسند پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے عجیب انداز شاہانہ و ادائے دلفریبانہ سے متمکن تھیں۔ جمیلہ کو اسوقت وہ بہت ہی خوبصورت و دلکش معلوم ہوئیں اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے:" خدا بُری نظر سے بچائے بھابی جان تو اس وقت یہاں کی مخلوق ہی نہیں بلکہ پرستان سے آئی ہوئی پریوں کی ملکہ معلوم ہو رہی ہیں۔ جب ہی تو دولہا میاں نے یہ لباس رکھا۔" بٹوے میں سے نکال کر مٹھی بھر روپے ان پر تصدق کر دئے۔

جمیلہ سے اس قدر اپنی تعریف سن کر دُلہن نے کہا:" بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے جمیلہ بیگم کوئی کتنا ہی بنے سجے تم جیسا حسین نہیں بن سکتا۔"

جنسی مذاق ہو رہا تھا اتنے میں کھانا چنا جا چکا تھا۔ڈرائینگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا جمیلہ سمجھ گئیں اور پردہ اٹھا کر دونوں بھائیوں کو کمرے میں لائیں۔دُلہن اور جمیلہ کے علاوہ اس وقت صرف ایک خادمہ نسترن پانی پلانے کے لئے کمرے میں تھی۔ جو دُلہن کی انا کی بیٹی اور خواص' خاص تھی جس وقت وہ دونوں کمرے میں آئے دُلہن نیچی نظر کئے اسی طرح بیٹھی رہیں۔چونکہ فرش کی نشست تھی وہ دونوں دُلہن کے قریب جھکے جمیل نے دُلہن سے کہا:

" یہ ہیں میرے عزیز از جان دوست مسٹر قمر۔آپ دُلہن ہونے کی وجہ سے فضول شرم نہ کریں۔ان کو کھانا کھلائیں اور خوب باتیں کریں کیونکہ یہ ابھی تین گھنٹے بعد کلکتہ سے چلے جائیں گے اور پھر کہیں آئندہ گرمی میں کسی پہاڑ پر ملیں گے۔پھر دونوں دستر خوان کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔" دُلہن نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اس قدر واپسی کی کیوں جلدی ہے۔ دو ایک روز اور قیام کرتے۔''

قمر بولے: ''میرا تو جانے کو جی نہیں چاہتا مگر جلد جانا ضروری ہے۔''

''ہم تو اصرار کر کر کے تھک گئے یہ نہیں مانتے، اب دیکھنا ہے کہ آپ کے کہنے کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔'' جمیل نے کہا۔

اس پر دلہن بولیں: ''میرا ابھی کیا اثر ہوگا پہلی ہی تو ملاقات ہے۔''

جمیلہ نے کہا: ''بھابی جان پہلی ملاقات کا تو ضرور اثر ہوتا ہے کیونکہ غیرت ہوتی ہے، تکلف و لحاظ کی وجہ سے کہنا پڑتا ہے۔''

جمیل نے کہا: ''جمیلہ کا خیال بالکل درست ہے۔ قمر تم کو تکلف اور لحاظ کا بھی خیال رہے۔''

قمر نے سنجیدگی سے کہا: ''بے شک زندگی میں آج تک میں نے ایسی تصویر کبھی نہ دیکھی تھی اور میرے لئے شادی کا یہ دلکش لباس بھی عجیب چیز ہے۔ بہت سی شادیاں دیکھیں اور دلہنیں بھی مگر اسی روز کے لباس میں۔ مسز جمیل تو مجھ کو اس وقت زمین پر رہنے والی نہیں بلکہ کوئی آسمانی مخلوق دکھائی دے رہی ہیں۔ واللہ شادی کے لئے یہی لباس موزوں ہے۔''

جمیل بولے: ''اسی لئے محض تمہارے دکھانے کو میں نے ان سے کہا تھا کہ شادی کا جوڑا پہنیں۔ شکر ہے تم میری بیوی سے مل کر خوش ہوئے۔ جمیلہ تو تمہیں اپنا عزیز بھائی بنا چکی یہ ذرا شرمائیں گی۔ تمہارے سامنے نہیں بتائیں گی بعد میں پوچھوں گا۔ یقین ہے یہ بھی تم سے مل کر خوش ہوئی ہوں گی۔''

پیچھے بتایا تو ہمیں کیا۔ اس وقت معلوم ہو جائے تو خوشی بھی ہو۔ ہمیں تو ایک اور بڑا خوف ہے کہ مسز جمیل ہم کو اپنا مخلص عزیز بھی خیال کریں گی یا نہیں کیونکہ میری آپ کی پرانی دوستی ہے اور میں راز دار رہا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے قمر نے دلہن کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا جس کو وہ سمجھ گئیں اور جمیل نے کہا: ''وہ ایسی بدگمان نہیں ہیں۔'' پھر دلہن نے قمر کی طرف شرمگیں نگاہوں سے دیکھا اور جواب دیا۔

''قمر صاحب میں جمیل صاحب کے کل رشتہ داروں اور دوستوں سے نہایت خلوص سے ملتی ہوں اور یہ ہی خیال کرتی ہوں کہ وہ بھی مجھ سے خلوص ہی سے پیش آ رہے

ہیں اور مجھ کو تو گزشتہ زمانہ کا خیال ہی نہیں کرنا چاہئے۔ جمیل صاحب کے ماضی سے میرا کوئی تعلق نہیں میں تو حال کو جانتی ہوں۔ دیکھتی ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ بہت اچھا پاتی ہوں۔''

نئی دلہن کے یہ خیالات معلوم کر کے قمر کو بہت خوشی ہوئی اور وہ جمیل سے مخاطب ہو کر بولے۔

جمیل تم خوش نصیب ہو جس کو خدا نے ایسی سمجھدار رفیق حیات دی۔ خدا مبارک کرے۔ شاید گیارہ بجنے والے ہوں گے۔ اب ہمیں کھانا اور باتیں ختم کرنا چاہئیں۔ ٹرین کا وقت قریب ہے۔

اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں پر رومال پھیلا کر ڈبیہ رکھی اور ذرا آگے بڑھ کر دلہن کو پیش کر کے کہا۔

''گو یہ ناچیز تحفہ اس قابل نہیں کہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے لیکن امید ہے کہ میری خوشی کے خیال سے آپ اس کو قبول کر کے مجھے مشکور کریں گی۔''

جمیل نے جلدی سے وہ مخملی ڈبیہ اٹھا کر کھولی اور ایک ہیرے کی سہ رنگی انگشتری نکال کر قمر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''اوہو کس نخرے اور تکلف سے تحفہ دے رہے ہیں۔ انگوٹھی خود ہی پہنا دیتے۔''

اور خود بیوی کا ہاتھ قمر کی طرف بڑھا دیا تو انہوں نے نہایت ادب کے ساتھ نیچی نظروں سے بھاوج کی انگلی میں ڈال دی اور یہ کہہ کر'' امید ہے میری محترم بھاوج اس خاکسار کو بھی یاد کر لیا کریں گی؟ کھڑے ہو گئے۔ جمیل اور جمیلہ بھی اُٹھے۔'' ہاں اسی لئے تو انگوٹھی دی گئی ہے کہ وہ یاد کیا کریں۔'' جمیل نے ہنس کر کہا تھا۔''

''جمیل تم نے جمیلہ کا فوٹو باجی جان کے دکھانے کے لئے دینے کو کہا تھا'

میز سے البم اٹھا کر دو تصویریں نکال لیں ایک تو مسز جمیل کی تھی جو تنہا ایک باغیچہ میں کھڑی تھیں اور قریب کی جھاڑی سے گلاب کا پھول توڑ رہی تھیں۔ دوسری میں جمیلہ ایک خوبصورت نوجوان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اس کو دیکھ کر قمر حیران ہوئے اور جمیل سے پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ تم نے نہیں دیکھا۔ مسٹر رفیق آئی سی ایس وہ جمیلہ کے شوہر ہیں وہ پرسوں صرف چند منٹ کے لئے شرکت شادی کے لئے آئے تھے۔ بہت ضروری کام تھا اسی روز

واپس ہو گئے۔ہاں یاد کیا میں تم کو ان سے نہ ملوا سکا۔

یہ سن کر قمر ششدر رہ گئے۔وہ اس وقت تک جمیلہ کو ناکتخدا لڑکی سمجھتے ہوئے تھے۔کیونکہ ان کے زمانہ قیام میں جمیلہ کے شوہر کا ذکر ہی نہیں آیا تھا۔نہ معلوم کیوں ان کو شادی کا حال معلوم کر کے کچھ خوشی نہ ہوئی۔ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور کچھ افسردگی سی چھا گئی۔جمیلہ برابر ان کی طرف دیکھ رہی تھی اور ان کی بدلی ہوئی حالت کو پہچان رہی تھی کیونکہ اس کو اول ملاقات سے شبہ ہو گیا تھا کہ قمر ان کو کنواری لڑکی خیال کر رہے ہیں۔جمیل کا خیال دوسری طرف تھا۔وہ اپنی بیوی کے قریب بیٹھ کر کچھ سرگوشی کر رہے تھے۔انکی بیوی جو اپنی دستکاری کی چیزیں جہیز میں لائی تھیں،وہ اس میں سے چند چیزیں قمر کو تحفہ دینا چاہتی تھیں اور جمیل سے مشورہ کرنے کے بعد نسترن سے الماری میں سے وہ چیزیں نکلوا رہی تھیں۔قمر نے دونوں فوٹو رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لئے۔جمیلہ کی دی ہوئی سنہری زنجیر جو دو دن سے اُن کے پاس تھی،سب کی نظر بچا کر ہاتھ میں لی اور نیچی نظریں کیے ہوئے جمیلہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

''لیجئے بہن یہ آپ کی زنجیر ہے۔میں واپس کرنا بھول گیا تھا۔اب اگر یاد نہ آتا تو میرے ساتھ ہی چلی جاتی۔دلی شکریہ آپ سب صاحبان کا۔اب میں رخصت ہوتا ہوں یہ کہہ کر اپنا رخ دیوار کی طرف کر لیا۔جمیل اور شکیلہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ تحائف ایک سوٹ کیس میں بند کر کے نسترن سے کہا۔اس کو باہر بھیج دو،قمر صاحب کے ساتھ جائے گا۔

قمر نے دونوں بیگمات کو سلام کیا اور باہر چلے گئے۔جمیل بھی ان کے ساتھ اسٹیشن تک گئے اور سوار کرا کے واپس ہوئے۔قمر سوار ہوتے ہی اپنے بستر پر لیٹ گئے ......

.....کیسی بڑی غلطی ہوئی میں نے جمیلہ کو کیوں کنواری لڑکی سمجھا،خدا معاف کرے اس کی شادی سے لاعلم تھا۔میں تو یہ ارادہ کر رہا تھا کہ گھر پہنچ کر باجی جان سے جمیل کے نام خواستگاری کا خط لکھواؤں گا۔اسی الجھن میں ان کو نیند آ گئی۔گاڑی تیز رفتاری سے کلکتہ چھوڑ رہی تھی اور ہر لحظہ وہ اس مقام سے دور ہوتے جاتے تھے جس کو چھوڑنے کا ان کو بے حد رنج تھا۔

جمیل جب اُن کو روانہ کر کے اسٹیشن سے نکلے تو خیال آیا کہ شام نجمہ بہت رنجیدہ و پریشان تھی اور میں نے یہ وقت بیوی کیساتھ کس دلچسپی سے گزارا۔کالج راستہ میں ہی تو ہے ذرا

دیکھتا چلوں کہ اب کس حال میں ہے۔ یہ ارادہ کر کے وہ نجمہ کے مکان پر اُترے دیکھا کہ بالکل اندھیرا ہے۔ حیران ہوئے۔ اپنی ٹارچ جیب سے نکالی۔ برآمدے میں جا کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھل گیا۔ اندر داخل ہوئے۔ وہاں بھی بالکل اندھیرا تھا۔ بیڈ روم میں آئے۔ مسہری اپنی جگہ پر موجود تھی مگر اس پر بستر وغیرہ کچھ نہ تھا۔ تمام کمرے پر نظر ڈالی سوائے فرنیچر کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ یہ بہت گھبرائے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چار گھنٹہ کے اندر اندر یہ کیا ہو گیا۔ اگر نجمہ زیادہ بیمار ہو گئیں اور ڈاکٹر انھیں اپنے گھر یا ہسپتال لے گئے ہیں تو ان کا اسباب تو ہوتا۔ چاروں کمروں میں پھر کر دیکھا کوئی چیز ان کو نظر نہ آئی۔ بہت پریشان ہو کر چند منٹ کیلئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ رات زیادہ آ گئی تھی اور وقت ایسا نہ تھا کہ وہ پرنسپل صاحبہ سے کچھ دریافت کر سکتے، ڈاکٹر کا گھر بھی نہ جانتے تھے، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مجبوراً اٹھ کر گھر روانہ ہو گئے مگر نجمہ کی اچانک گمشدگی کا ذکر ابھی بیوی سے نہ کیا۔ رات بھر بہت فکر مند رہے اور صبح چھ بجے ہی گھر سے باہر نکل گئے اور کچھ دیر بعد پرنسپل صاحب کی کوٹھی پہنچے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ "دو دن قبل وہ استعفےٰ دے چکی تھیں۔ کل شام جب ہم پارٹی سے واپس آئے تو تھوڑی دیر بعد ان کا خط ملا کہ گھر سے ایک ضروری تار بھی ملا ہے اور میں بہت جلد کلکتہ چھوڑ رہی ہوں۔"

یہ سن کر وہ کچھ دیر وہیں خاموش بیٹھے رہے۔ مس شریفہ نے چائے منگوائی مگر ان سے نہ پی گئی۔ رکھ دی تھی کہ یہ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ آخر انہوں نے ......

"مسٹر جمیل نجمہ بیگم کیا آپ کی کوئی عزیز تھیں۔ بہت ہی اچھی لڑکی تھیں مگر نہ معلوم وہ ہر وقت کیوں مغموم رہتی تھیں۔ ہم نے تو چاہا کہ انکی زندگی کو خوشگوار بنا دیا جائے مگر ان کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ میرا ارادہ انگلینڈ جانے کا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ان کو اپنی جگہ مقرر کرا جاؤں۔ انہوں نے یہ بھی نہ مانا۔ مجھ کو یہ لڑکی بے حد پسند تھی۔"

جمیل کچھ کہنا چاہتے تھے مگر آواز ان کے گلے میں رک رہی تھی، بمشکل اتنا کہا اور کھڑے ہو گئے۔

"وہ میری کوئی رشتہ دار نہ تھیں مگر اپنی خوبیوں کی وجہ سے مجھ کو بہت عزیز تھیں۔" سلام کیا اور روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچے مگر بہت پریشان رہے۔ آج کسی بات میں دل نہ لگا۔ اپنے باہر کے

کمرے میں بیٹھے تھے کہ صبح کو ڈاک ملی، ایک ہی خط تھا۔ نجمہ کا ہینڈ رائیٹنگ دیکھ کر جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔

بھائی جمیل تسلیم!

ابھی ابھی آپ مجھ سے رخصت ہو کر گئے ہیں۔ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ اسی وقت دنیا سے رخصت ہو جاؤں لیکن یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ خدا سے ڈرتی ہوں۔ اچھا اب کلکتہ سے رخصت ہوتی ہوں۔ اب یہاں رہنا بہت ہی نامناسب ہے۔ میں یہاں رہی تو آپ ضرور کبھی کبھی آیا کریں گے جو اب بالکل نامناسب ہے۔ موجودہ حالات پر غور کرنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انسان ہی کو سب سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ میں تیاری کر رہی ہوں اور دس بجے کی ٹرین سے کلکتہ سے روانہ ہو رہی ہوں۔

"اللہ آپ کو شاد و آباد رکھے۔ خدا حافظ۔"

آپ کی بہن

نجمہ

اس خط کو پڑھ کر ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سر پکڑے خاموش بیٹھے رہے۔ اس حالت میں وہ گھر میں جانا نہ چاہتے تھے۔ قمر بھی جا چکے تھے۔ کوئی اُن کا ہمراز نہ تھا جس سے بیان کر کے کچھ تسکین حاصل کرتے۔ آخر جمیلہ کا خیال آیا اور خط لئے ہوئے اس کی کوٹھی یعنی خالہ جان کے گھر آئے اور سیدھے جمیلہ کے کمرے میں پہنچے۔ وہ رات ایک بجے ان کے گھر سے آئی تھیں۔ شوہر کا خط ملا تھا اس کو پڑھ رہی تھیں کہ جمیل صاحب پہنچے اور جاتے ہی ان کی آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ رات کا سب واقعہ سنایا اور نجمہ کا خط بھی دے دیا۔ یہ ہی لڑکی اب ان کے اس رنج میں غمخوار و ہمدرد تھی۔ خط پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بہت دیر تک دونوں یہ حسرت ناک ذکر کرتے رہے۔ جمیلہ نے چائے منگوا کر پلائی اور وہ بہت دیر بعد گھر گئے۔

☆

(۱۶)

مسز سالومن اپنے ڈرائنگ روم میں اپنے آئینہ کے سامنے کھڑی بالو میں برش کررہی تھیں کہ مسٹر سالومن ہاتھ میں تار لئے کمرے میں داخل ہوئے اور بیوی کو تار دے کر کہا۔

"دیکھو صوفیہ بڑے بھائی جان نے کل ہی ہم کو لکھنؤ بلایا ہے۔"

"آخر گوہر تاج کا رشتہ کلکتہ کے سیٹھ شکیل صاحب کے ہاں قرار پا گیا اور وہ لوگ منگنی کی رسم ادا کرنے لکھنؤ آرہے ہیں۔"

"صرف منگنی اتنی سی بات کے لئے ہمیں لکھنؤ بلایا گیا ہے۔ کتنا روپیہ سفر خرچ میں لگ جائے گا۔ شادی بھی تو جلدی ہی ہوگی۔ اس وقت چلنا چاہئے۔" بیگم نے جواب دیا۔

"نہیں صوفیہ ہمیں اس تقریب میں شامل ہونا لازمی ہے۔ بھائی جان کے ہاں یہ پہلی شادی ہے۔ منجھلے بھائی اور بھابی پہنچ چکی ہیں اور اچھا ہے ذرا تفریح رہے گی۔ مدّت ہوئی وطن گئے۔ کلکتہ والے سیٹھ خاندان سے ملاقات ہو جائے گی۔" سالومن نے بیوی سے کہا۔

یہ سن کر وہ بولیں: "غالباً یہ وہی خاندان ہے جن کا ایک لڑکا پانچ سال گزرے مسوری پر ہم سے ملا تھا۔ مجھے نام اس وقت یاد نہیں آتا۔ وہی جن کا ایک افسانہ تھا۔ ہم نے ان کی منگیتر مس نجمہ کی نسبت مسٹر کامران سے کروادی تھی اور اس نے نجمہ کو چھوڑ کر ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔"

ہاں ہاں وہی جمیل بے چارہ جس کی نجمہ کو ہم نے چھنوا دیا تھا۔ اسی جمیل کے چچا زاد بھائی سے ہماری گوہر تاج کی نسبت ہو رہی ہے۔ بڑے امیر کبیر تاجر ہیں، ہماری بھابی جان تو اس رشتہ کے خلاف تھیں کہ وہ نواب نہیں ہیں۔ انہیں لڑکی دینا ہماری شان کے خلاف ہے لیکن بھائی جان نے سمجھا کر اور دولت کا لالچ دیکر رضامند کر لیا۔ شکیل ان کا ایک ہی لڑکا ہے اور ایک لڑکی جس کی شادی جمیل سے ہوگئی ہے۔

صوفیہ نے تعجب سے کہا: "ارے جمیل نے شادی کر لی۔ دو سال تک تو وہ بہت ہی غمگین رہتے تھے۔"

"تم تو بھول جاتی ہو شاید تین سال ہوئے ہوں گے کہ جمیل نے ہمیں اپنی شادی کا بلاوا بھیجا تھا۔ میں تو اس وقت بھی شادی کی شرکت کو تیار ہو گیا تھا۔ کلکتہ کی سیر ہی ہو جاتی مگر تم نے روکا تھا کہ بہت صرف ہوگا۔ صوفیہ روپیہ کی کمی کی وجہ سے بہت سی خوشیوں شادی وغیرہ کی تفریحوں سے ہم محروم رہ جاتے ہیں ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ ایسے کاموں کے لئے کچھ پس انداز ہو سکے۔ اس وقت ہم کو نو سو روپیہ ماہوار ملتے ہیں اور ضرورت کے وقت بھائی جان سے بھی منگوا لیتے ہیں پھر بھی بے فکری سے بسر نہیں ہو سکتی۔"

صوفیہ برش میز پر زور سے پھینک کر یہ کہتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

"ہم سے اس سے بہتر انتظام نہیں ہو سکتا۔ آئندہ ماہ سے آپ خود کیجئے۔ مجھ کو ایک جگہ مسٹر ہیرالال کے ساتھ ایک ڈرامہ کی تیاری کے لئے جانا ہے وہ آتے ہوں گے میں زیادہ بحث نہیں کر سکتی۔

(۱۷)

نواب بیگم سلطان مرزا آج اپنی بڑی صاحبزادی کی منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے منا رہی ہیں۔ ان کے سب عزیز جمع ہیں۔ عالی شان کوٹھی اور ''قصر سلطان'' کے قریب ہی کلائنڈ روڈ پر دو کوٹھیاں اور مہمانوں کے لئے آراستہ کی گئی ہیں۔ ایک میں کلکتہ والے ٹھیرائے گئے ہیں اور دوسری میں اپنے دونوں بھائی احسان مرزا و سلیمان مرزا اتارے گئے ہیں۔ اور بیگم صاحبہ کے اپنے عزیز بھاوجیں بہنیں قصر سلطان ہی میں ٹھیرائی گئی ہیں۔ آج شب کو بڑی دعوت ہے جس میں علاوہ ان مہمانوں کے جو دور دور سے آئے ہیں، لکھنؤ کے عزیز نواب اور بڑے بڑے عہدیدار کوئی پانچ سو کے قریب مدعو کئے گئے ہیں۔ اندر اور باہر ناچ گانے کا انتظام ہے۔ نواب بیگم صاحبہ اپنی عزیز بیگمات کے درمیان بیٹھی آہستہ آہستہ بھاوج سے کچھ باتیں کر رہی ہیں کہ ان کی دونوں دیورانیاں چھوٹی چھوٹی ریشمی پھولدار چھتریاں لگائے آتی نظر آئیں۔

''وہ دیکھو میمیں آرہی ہیں۔'' بیگم صاحبہ کی بھاوج نے کہا۔

''اوہو بالکل بے پردہ کھلے منہ، باہر اتنے تو مہمان بھرے پڑے ہیں۔ تعجب ہے ان کی ہمت کیسے پڑی اور قدم کیسے اٹھا۔ ہم تو یہ سنا کرتے تھے کہ پہاڑوں پر جا کر پردہ نہیں کرتیں لیکن کانپور اور لکھنؤ آکر بے باکی کبھی نہیں کی۔'' بیگم صاحبہ کی بڑی بہن نواب جہانگیر قدر نے یہ اعتراض کیا۔

''اب زمانہ آزادی کا ہے۔ جب تک خسر زندہ رہے آکر پردہ کرلیا کرتی تھیں جس دن سے ان کا انتقال ہوا ہے بالکل آزاد ہوگئیں۔'' بیگم سلطان مرزا نے ان دونوں کو جواب دیا۔

"بہن خسر دنیا سے اٹھ گئے مگر خدا رکھے جیٹھ بھی خسر ہی سمجھے جاتے ہیں ان کا ذرا خوف نہیں۔"

اتنے میں وہ قریب آ گئیں اور سب کو سلام کر کے وہیں تخت کے کنارے پر بیٹھ گئیں اور دونوں کے پیر فرش پر تھے۔ اس پر بھی اعتراض ہوئے۔ کسی نے کہا کہ کرسیاں منگا دو ان کو تخت پر بیٹھنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔ چھوٹی دلہن یعنی مسز سلیمان (سالوسن) کے بال انگریزی وضع سے تراشے ہوئے تھے اور چونکہ ساڑی کا آنچل سر پر نہ تھا۔ سب بیگمات ان کے بالوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

"آپ دونوں نے بہت دیر لگا دی۔ کیا کر رہی تھیں۔؟ یہ سب بیگمات خصوصاً میری بھابی جان اور بہنیں بہت یاد کر رہی تھیں۔ مدت کے بعد آپ دونوں کا وطن آنا ہوا ہے۔" بیگم سلطان مرزا نے دیورانیوں سے کہا۔

"بھابی جان دوپہر کے کھانے کے بعد میں لیٹ گئی تھی۔ وقت کا پتہ نہ چلا چار بج گئے تو اٹھ کر حاضر ہو گئی۔ تمام رات گاڑی میں نیند نہیں آئی طبیعت کسل مند تھی۔ میرا دل خود یہیں پڑا تھا۔ صبح تھوڑی دیر آپ کو دیکھ سکی تھی اگر ہم لوگوں کو بھی یہیں ٹھیرایا گیا ہوتا تو بہتر تھا۔" بیگم احسن مرزا نے جواب دیا۔

پھر بیگم سلیمان بولیں: "ہم کو آپ معاف کریں گی۔ گیارہ بجے اسٹیشن سے آئے معلوم ہوا کہ ہم کو دوسری کوٹھی میں اتارا جائیگا۔ وہیں نیچے کھانا مل گیا۔ تھوڑی دیر آرام کیا۔ ابھی اٹھنے نہ پائے تھے کہ منجھلی بھابی نے یہاں آنے کو کہا۔ پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آ گئے۔"

"آپ دونوں کو یہیں اتارا جاتا مگر ہم لوگوں کو دقت ہوتی۔ پردہ کی وجہ سے نواب صاحب نے کہ دونوں بھائیوں کو کوٹھی میں ٹھیرانا چاہئے تاکہ انکے دوستوں کو ملنے میں آسانی ہو۔" بیگم سلطان مرزا نے کہا۔

"بالکل ٹھیک آپ کو بھی آرام رہا اور ہم لوگوں کے لئے بھی ایسا ہی اچھا ہے۔ صاحب کے بہت سے دوست جو ہمارے منتظر تھے۔ ہر وقت آئیں گے۔ ایک صاحب جو آپ کے سمدھی کے بھتیجے ہیں وہ ہمارے بھی بہت پرانے ملنے والے ہیں۔ ہمارے آتے ہی آ گئے تھے۔ ان کی قیامگاہ شاید قریب ہی ہے۔ اس خیال سے ہم لوگوں کا علیحدہ رہنا ہی

بہتر ہے۔'' بیگم سلیمان نے کہا۔

اس پر بیگم احسان مرزا بولیں: ''صرف اتنے کے لئے ہم لوگوں کو الگ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ ہم دونوں آپ کے پاس قصر ہی میں ٹھیرتیں اور وہ دونوں بھائی باہر مردانے میں ٹھیر جاتے، وہاں ان کے دوست ہر وقت آ سکتے تھے۔''

بیگم سلیمان پھر بولیں: ''واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے دوست ہم دونوں سے بھی تو ملیں گے۔ بار بار ہم کو جانا پڑتا۔''

دیورانی سے یہ فقرے سن کر بیگم احسان مرزا کچھ چیں بہ جبیں ہو کر بولیں: ''اس وقت ہمیں ان کے دوستوں سے ملاقات کی ضرورت نہ تھی۔ ہم تو چار دن کے لئے وطن آئے ہیں۔ گھر میں رہ کر بھائی جان اور سب رشتہ دار بیگمات سے ملنا ہے۔ دوستوں سے ملنا تو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ عزیز کبھی کبھی ملتے ہیں۔''

اپنی منجھلی دیورانی کے یہ خیالات سن کر نواب بیگم سلطان بہت خوش ہوئیں اور جواب دیا: ''بہت اچھا احسان دلہن اگر تمہیں میرے پاس رہ کر عزیزوں سے ملنے کی زیادہ خوشی ہے تو آج شب کو یہیں آرام کرنا۔ تمہارے بچے اور بستر وہاں سے منگوا لیتے ہیں اور میاں احسان مرزا وہیں رہیں گے۔''

''بھابی جان مجھ کو تو مہربانی سے اسی جگہ رہنے دیں کیونکہ مجھ کو اپنے اور صاحب کے دوستوں سے ملنا بھی اسی قدر لازمی ہے جس قدر کہ عزیزوں سے۔ آج آپ کی دعوت اور جلسہ ختم ہو جاتے تو کل دن بھر اور آدھی رات تک کے لئے ہم دونوں کو باہر کھانے اور چائے کے لئے آنا جانا پڑے گا۔ اس لئے وہیں سے آسانی رہے گی۔''

''میں نے تمہارا نام تو لیا نہیں تمہیں خدا مبارک کرے دوستوں سے ملنا جلنا چونکہ منجھلی دلہن نے میرے ساتھ رہنا چاہا تو ان کا سامان گھر میں منگا لینے کو کہا ہے۔'' نواب بیگم نے کہا۔

''آپ کو جب اس قدر دوستوں کا خیال ہے تو اس وقت بھی آپ کا یہاں آ جانا مناسب نہ تھا کیونکہ سلیمان میاں کے دوست تو ابھی آ گئے ہوں گے اور آپ کے مسوری کے بہت عزیز دوست مسٹر جمیل تو منتظر ہی ہونگے کیونکہ جس وقت ہم اس طرف آنے کو باہر نکلیں

جمیل صاحب ہمارے باغیچہ میں سلیمان میاں کے پاس کھڑے تھے۔" بیگم مرزا نے کہا۔

ان سے یہ سنکر نواب بیگم مسکرا کر بولیں۔" ابھی تو بہت وقت ہے۔ چھ بھی نہیں بجے۔ کھانا کہیں آٹھ بجے ہوگا۔ سلیمان دُلہن وہاں جا سکتی ہیں۔"

بڑی جٹھانی سے یہ طنزیہ فقرے سن کر با حوصلہ میم صاحب مسز سالومن فوراً کھڑی ہو گئیں اور چھتری اٹھا یہ کہتی ہوئی باہر کو چل دیں۔

"بہت اچھا اگر کھانے میں بہت دیر ہے تو یہاں اکیلے بیٹھنے سے کیا فائدہ۔ گانے بجانے سے ہمیں اتنا شوق نہیں۔ ذرا کلکتہ والوں سے مل لیں۔ آٹھ بجے آ جائیں گے۔"

جب یہ میم صاحب باہر چلی گئیں تو سب بیگمات خوب ہنسیں۔ ان کی اس بے باکی اور بدلحاظی پر منجھلی دلہن کا اسباب دوسری کوٹھی سے قصر میں آ گیا اور اوپر کی منزل میں دو کمرے ان کیلئے درست کر دیے گئے۔

(۱۸)

"آپ کیسے آ گئیں ۔ بہت مہمان جمع ہیں۔ اب کلکتہ والی بیگمات بھی رسم ادا کرنے اور کھانے کے لئے اندر جانے والی ہیں۔"

سلیمان مرزا نے بیوی سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔

"آ ہی گئے ابھی کھانے میں ڈھائی گھنٹے کی دیر ہے۔ وہاں خالی بیٹھ کر غیر دلچسپ محفل میں کیا کیا جاتا۔ بھونڈے مزاج، جاہلانہ گفتگو میں وقت گزارنا دشوار تھا۔

ہم کو شوق تھا مسز جمیل کو دیکھنے کا۔ مسٹر جمیل بلوائیے۔ اُن کو جلد دکھا دیجئے۔ ہم رات کو مجمع میں اُن سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ پہلے تنہائی میں اچھی طرح دیکھ لیں اور سنا ہے آپ کے دو بچے بھی ہیں۔ کیا ساتھ لائے ہیں۔ ان کو بھی دکھایئے۔"

جمیل نے جواب دیا: "وہ تو ابھی یہیں تھیں بلکہ چا بھی نہیں پی ہے۔ آپ کے صاحب نے ہم دونوں کو چاء کے لئے بلوایا تھا مگر افسوس آپ کو نہ پا کر فوراً ہی واپس چلی گئیں۔ آپ جانتی ہیں ہمارا گھر پابند پردہ ہے۔ بار بار ان کا بزرگوں میں سے نکل کر آنا دشوار ہے۔"

"چلئے ہم وہیں چلیں۔" مسز سالومن نے کہا اور یہ تینوں اس کوٹھی کے باغیچہ سے نکل کر دوسری کوٹھی کے باغ میں سے ہوتے ہوئے پیچھے کی طرف سے جمیل صاحب کے کمرے کے قریب پہنچے اور ڈریسنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے آپا نے کہا: "کون ہے؟" اور دروازہ کھول کر دیکھا۔ آگے جمیل صاحب کھڑے تھے اور ان کے پیچھے مسٹر و مسز سالومن۔ اس نے جمیل سے آہستہ سے کہا۔

"بیگم صاحبہ لباس تبدیل کر رہی ہیں۔ سمدھیانے جانے کے لئے۔" یہ سُنکر جمیل

فوراً اندر آئے اور بیوی سے کہا۔

"جلدی کرو مسز سالومن تم سے ملنے آئی ہیں۔ باہر کھڑی ہیں۔ بہت ہی اچھا ہوا اس وقت تمہارا لباس سادہ تھا۔ ان اچھے کپڑوں میں میم صاحب تم کو دیکھیں گی تو اپنے حسن کا غرور بھول جائیں گی، انھیں حضرت نے نجمہ کو مجھ سے چھڑایا تھا۔ آج دیکھ لیں گی کہ اس سے بہتر اور بدر جہاں بہتر بیوی خدا نے مجھ کو دی۔ جلدی چلو اپنے بیڈروم میں دروازہ بند کر کے بیٹھو۔ میں ان دونوں کو لاتا ہوں۔ ہاں جمیلہ کو بھی بلا لینا۔"

"آپ مجھے اس قدر بنایئے نہیں۔ پانچ سال کی بیاہی، دو بچوں کی ماں، میں بھلا اُن سے زیادہ کیا حسین ہو سکتی ہوں۔"

"وہ اگر پانچ سال کی بیاہی حسین نہیں رہ سکتی تو بارہ سال کی بیاہی اور سات بچوں کی ماں کی کیا حالت ہوگی۔"

بیگم جمیل اپنے کمرے میں آئیں جمیلہ کو بلوایا اور دروازے بند کر دئے۔ وہ تینوں بھی آگئے۔ جمیل نے اپنی بیوی اور بہن جمیلہ کو ان دونوں سے ملوایا۔ وہ دونوں میاں بیوی ان بے مثال حسن کے مجسموں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خوبصورت عورتیں انہوں نے سینکڑوں دیکھی تھی لیکن ایسی شکلیں کبھی خواب میں بھی نہ آئی تھیں۔ یہ دونوں نند بھاوج اس وقت سرخ ساڑیاں اور سفید بروکیڈ کے ملبوس پہنے ہوئے تھیں۔ ساڑیوں پر سفید ستاروں کا کام جگمگا رہا تھا اور الماس مرصع زیور برقی روشنی میں چمک کر دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہے تھے۔ مسز سالومن جو اپنے خیال میں دنیا کی حسینوں کی سردار تھیں، اس وقت ان کو دیکھ کر ان کے ہوش گم ہو گئے اور کچھ افسردہ سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ نجمہ کی ان کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہ تھی۔

"ہم تو وہیں حاضر ہوئے تھے مگر آپ تشریف نہ رکھتی تھیں۔" شکیلہ بیگم نے مسز سالومن سے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے اس وقت منجھلی بھابی ہم کو قصر سلطان لے گئی تھیں اور یہ علم بھی نہ تھا کہ مسٹر سالومن نے آپ کو بھی بلایا ہے۔ آپ کو دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ ایک مدت سے ملنے کی آرزو تھی۔"

مسٹر سالومن نے کہا: "آپ کو تو مسٹر جمیل کی بیوی ہونے کی وجہ سے آرزو تھی

لیکن مجھ کو یہ دیکھنے کی تمنا تھی کہ نجمہ کو کھو کر انہوں نے کیسی بیوی پائی۔ ہم کو افسوس ہوا کرتا تھا ان کی محرومی اور مایوسی پر خیال کر کے لیکن آج بے انتہا خوشی ہوئی کہ جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا اگر ایسی کامیابی ہو جائے تو کیا کہنا۔"

سالومن صاحب سے یہ سنکر جمیل صاحب نے کہا: "اس کامیابی میں بڑا حصہ چونکہ آپ دونوں کی کوشش کا ہے، میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک اس کا کہ میری بیوی سے مل کر آپ خوش ہوئے۔ دوسرا یہ کہ مسز سالومن صاحبہ اپنی عزیز دوست نجمہ کو ایک پُرانے خیال کے نالائق طالب علم سے چھڑا کر ایک قابل شخص کے سپرد نہ کر دیتیں تو آج یہ نعمت مجھ کو میسر نہ آتی۔"

اس پر سالومن نے قہقہہ لگایا۔ مسز سالومن بھی کھسانی ہنسی ہنسنے لگیں۔ پھر بیگم صاحب نے کہا۔

"آپ کی وہ دوست اب کہاں ہیں؟ پانچ سال گزرے ہم لوگوں کو کچھ خبر نہیں۔"

مسٹر سالومن نے جواب دیا: "ہمیں بھی پتہ نہیں۔ اس سال کلکتہ جانا سُنا تھا۔ جب سے گم ہیں۔ کچھ خبر نہیں بیچاری بدنصیب لڑکی۔"

جمیل صاحب جو ابھی خوش نظر آ رہے تھے۔ نجمہ کا ذکر سُن کر خاموش اور افسردہ ہو گئے۔ بیوی پر اپنی یہ کیفیت ظاہر کرنی نہیں چاہتے تھے۔ اٹھ کر باہر چلے گئے اور اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لائے۔ لڑکی کی عمر ۴ سال اور لڑکا تین سال کا تھا۔ دونوں بچے بہت خوبصورت تھے۔ دونوں میاں بیوی نے ان کو گودوں میں بٹھالیا۔ جمیلہ بیگم اس وقت بالکل خاموش تھیں کیونکہ ان دونوں سے پہلی ملاقات تھی۔ مسز سالومن اپنی فطری رشک وحسد کی کج خلقی برتنے پر مجبور کرتی تھی۔ جمیلہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں بات کرنی تو درکنار۔

مسٹر سالومن نے دریافت کیا: "جمیل صاحب آپ کی ہمشیرہ صاحبہ بھی کلکتہ سے تشریف لا رہی ہیں؟ ان کے صاحب تو آپ نے بتایا تھا کہ جبل پور میں ڈپٹی کمشنر ہیں؟"

"جی ہاں وہ جبل پور ہیں، جمیلہ بیگم آج کل کلکتہ آئی ہوئی تھیں۔ ہم اس تقریب کی شرکت کے لئے ساتھ لے آئے۔" جمیل نے جواب دیا۔

مسٹر سالومن نے جمیلہ سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ کو لکھنؤ تشریف لانے کا غالباً

یہ پہلا اتفاق ہے؟"

"جی ہاں اب بھی میری صحت کچھ درست نہ تھی مگر بھائی جان اور بھابی صاحبہ کے اصرار سے چلی آئی۔"

مسٹر سالومن کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر کہا: "آپ لوگوں کو لکھنؤ کی اچھی طرح سیر کرنی چاہیے۔ یہ مقام تاریخی مقام ہونے کی وجہ سے اور بہت کچھ تبدیلیاں ہو جانے پر بھی پرانی شان رکھتا ہے۔ کل صبح آپ کو سیر کرائی جائے گی۔" سالومن صاحب کا دونوں بہن بھائی نے شکریہ ادا کیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ جمیل نے اٹھ کر دیکھا تو شکیل صاحب تھے۔ ان کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ مسز سالومن صاحب سے تعارف کرایا اور بتایا کہ انھیں صاحب کی نسبت کی یہ دھوم دھام ہے۔

(۱۹)

صدیق صاحب کلکٹر مجسٹریٹ کی کوٹھی میں ایک کار داخل ہوئی اور برآمدے کے سامنے روک کر ملازم ڈرائیور نے دریافت کیا کہ صدیق صاحب ہیں؟ میں نے اندر اطلاع کی۔ پانچ منٹ بعد بیگم صدیق باہر آئیں اور آنے والوں کو اترنے کے لئے کہا۔

"ہمیں اس وقت بہت جلدی ہے اتر نہیں سکتے چند جگہ اور بھی جانا ہے۔ آپ سے یہ کہنے کو آئے ہیں کہ آج شب کو آپ دونوں کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"

دعوت کا پیغام سُن کر بیگم صدیق نے جواب دیا: "بہت اچھا بسر وچشم دونوں حاضر ہو جائیں گے۔"

کار واپس گئی اور کلکٹر صاحب تشریف لے آئے اور بیگم سے کہا۔ جلدی تیار ہو جاؤ ابھی مسٹر شنکر کے ہاں "بریک فسٹ" پر چلنا ہے۔ میں آرہا تھا کہ وہ کوٹھی کے قریب ملے جو ہم سے یہ کہنے کو آرہے تھے کہ ہم بریک فسٹ میں ان کے ہاں شریک ہوں۔ ان کے ایک دوست انجنیر صاحب یہاں تبدیل ہو کر آئے ہیں۔ اُن کو شنکر نے بلایا ہے۔ ہمیں بھی ملانا چاہتا ہے۔ نو بجے ہیں۔ دس بجے پہنچ جانا چاہئے۔

"ایسی ہی خبر میں آپ کو دینے والی تھی۔ ابھی مسٹر د مسز فاروقی ہمیں ڈنر کے لئے آج ہی رات کو کہنے آئے تھے۔" بیگم صدیق نے کہا۔

صدیق صاحب بولے۔ "میرا خیال ہے کہ ان ہی انجنیر صاحب کو فاروقی بھی ڈنر دے رہے ہیں اور چونکہ کل ہی انجنیر صاحب کو دو چار دن کے لئے واپس جانا ہے اس لئے جلدی جلدی ان دونوں نے کھانا کھلا دیا۔ بات یہ ہے کہ شنکر کہتے تھے کہ وہ انجنیر اُن کا کلاس فیلو ہے اور غالباً فاروقی کا بھی پُرانا دوست ہوگا۔ اچھا ہے ہمارے حلقہ احباب میں

ایک دوست کا اضافہ ہو گیا۔ خدا کرے ہمارے مطلب کا نکلے۔"

اس گفتگو کے بعد دونوں جانے کے لئے تیار ہوئے۔ بیگم صاحب نے اس وقت ہلکی فیروزی جارجٹ کی ساڑی پہنی اور فیروزے کا روپہلی زیور جو بجائے سونے کے چاندی کا تھا۔ جب وہ اپنے ڈریسنگ روم سے تیار ہو کر نکلیں تو دروازہ پر میاں منتظر ہی کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور یوں کہنے لگے۔ "جمیلہ یوں تو ہر وقت ہی اچھی لگتی ہو لیکن بعض بعض وقت لاثانی حسن کی ملکہ نظر آتی ہو۔"

بیوی نے مسکرا کر شوہر کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "ہمیں اس قدر بنایا نہ کیجئے۔ آپ خود اتنے خوبصورت ہیں کہ اس شہر میں کیا تمام دنیا میں آپ کا ثانی کوئی نہیں۔ آپ کی آنکھیں ایسی خوبصورت ہیں کہ ان میں میری شکل اچھی طرح نظر آتی ہے۔"

دونوں باہر آئے۔ شوفر کو پیچھے بٹھایا۔ خود دونوں آگے بیٹھے اور بیگم صاحب نے کار چلائی۔ ٹھیک دس بجے شنکر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ یہاں انتظار تھا۔ صاحب خانہ کھڑے تھے۔ اتروا کر ڈرائنگ روم میں لے گئے اور اپنے نئے مہمان دوست سے تعارف کرایا۔

اس وقت کچھ زیادہ مہمان نہ تھے۔ دو صاحب خانہ میاں بیوی۔ مسٹر مسز صدیقی اور انجنیر کل پانچ تھے۔ انجنیر صاحب نے مسز صدیقی کو ذرا غور سے دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ وہ ان سے کبھی پہلے بھی مل چکے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مسز صدیقی نے بھی ان کو پہچان لیا ہے مگر اس وقت پہلی جان پہچان کا ذکر نہ آیا۔ ایک گھنٹہ میں کھانا ختم ہوا۔ تھوڑی دیر لوگ ٹھیرے پھر رخصت ہو گئے اور رات کو ساڑھے سات بجے سب لوگ سول سرجن فاروقی کے ہاں جمع ہو گئے اور ڈنر پر جنٹلمین اور لیڈیز بیس تھے۔ انجینئر صاحب سب کے بعد آئے۔ کلکٹر صاحب کو پہلی ہی ملاقات میں مسٹر انجینئر صاحب بہت پسند آئے۔ اس وقت وہ ان کے بے چینی سے منتظر تھے، جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے کلکٹر صاحب اٹھ کر ملے اور کہا۔

"آپ نے تو بہت ہی دیر لگا دی۔ ہم لوگ بے صبری سے منتظر تھے اگر ذرا اور نہ آتے تو لینے کو پہنچتے۔"

کپتان شنکر بولے: "آپ تو اس قدر جلد ان کے گردیدہ ہو گئے۔ ایک ہی ملاقات کے بعد بے چین رہنے لگے اگر یہ حالت ہے تو چند روز میں ہمیں کون پوچھے گا۔"

انجینئر صاحب نے کہا: ''کپتان صاحب آپ کو کیوں رشک ہونے لگا، آپ کو تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ آپ کے ایک نووارد دوست کو آپ کے احباب نے پسند کیا۔''

مسز صدیقی بولیں: ''مسز شنکر کو رشک ہونے کی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ انجینئر صاحب ہمارے پرانے عزیز دوست ہیں۔ ہمارے لئے وہ نئے یوں خیال کیے جانے لگے کہ انہوں نے اپنے یہاں آنے کی ہم کو اطلاع نہیں دی تھی۔ یہاں کے ''انسپیکشن ہوس'' میں ٹھہر گئے اور آپ کے ذریعہ ملاقات ہوئی۔''

کیپٹن شنکر نے کہا: ''اچھا یہ آپ کے پرانے دوست ہیں۔ آج ہی صبح ملاقات ہوئی۔ کلکٹر صاحب سب کو چھوڑ کر ان ہی کے ہو گئے۔ بیگم صاحب ان سے بھی زیادہ نکلیں۔ پرانی دوستی بتاتی ہیں۔''

مسز شنکر نے کہا: ''آخر اس میں برائی کیا ہے؟ آپ کو کلکٹر صاحب اور انجینئر صاحب میں محبت ہو جانے سے کیوں جلن پیدا ہو گئی۔ مسز صدیقی کی بات کیوں غلط مانتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی پہلے سے ملاقات ہو۔''

یہ سنکر بیگم صدیقی بولیں: ''مسز شنکر آپ کا خیال درست ہے۔ میں انجینئر صاحب کو بچپن سے جانتی ہوں۔ میرے بھائی اُن کے بہت پرانے دوست ہیں بلکہ ہمارے دونوں خاندانوں میں عزیزوں کے سے تعلقات ہیں۔''

کیپٹن شنکر کہنے لگے: ''ہاں ہاں معلوم ہو گیا۔ انجینئر صاحب آپ کے بھائی ہیں۔ تب ہی تو بے چارے نے بہن کے پاس ٹھہرنا تو در کنار اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔''

مسز صدیقی نے جواب دیا کہ: ''بہن کو اطلاع نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ ان کو یہ علم نہ تھا کہ میں آج کل یہاں ہوں اور صدیقی صاحب سے انکی ملاقات نہ تھی۔''

یہ ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈرائنگ روم سے گھنٹی کی آواز آنے پر سب کھڑے ہو گئے۔ یہ لوگ مع صاحب خانہ کے نو جوڑے تھے اور بے چارہ انجینئر اکیلا اور ایک پارسی لڑکی مس نوشابہ غیر شادی شدہ تھی۔ ڈنر پر اس نئے زمانہ میں بہت ہی نوق البھڑک لباس پہنا جاتا ہے۔ شادی وغیرہ کی تقریبوں میں آج کل خواتین اچھے کپڑے نہیں پہنتیں جیسے ڈنر کے موقع پر۔ چنانچہ اس وقت بھی سب لیڈیز خوبصورت اور چمکدار لباس میں تھیں لیکن

تین ساڑیاں بہت جگمگا رہی تھیں۔ مسز شنکر کی سبز بنارسی ساڑی تھی اور مس نوشابہ زرد جارجٹ کی سفید کامدار ساڑی پہنے تھیں اور سب سے اچھی جھم جھماتی سیاہ بنارسی ساڑی جس پر سنہرا جال بنا تھا اور موتیوں کی باڑ لگی تھی۔ حسین وجمیل بیگم صدیقی کی نہایت دلکش اور مناسب وقت پوشاک تھی اور بجائے جڑاؤ زیورات کے انہوں نے صرف سنہری زیور پہن رکھا تھا اور وہ زیور بھی ایک خاص قسم کا بنوایا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی زنجیر دار چوڑیاں جن میں سنہری پتیاں لٹک رہی تھیں کانوں میں لمبے لمبے جھالے۔ گلے میں نوشا ہار جس کی ہر زنجیر میں نازک نازک سنہری پتیاں لرز رہی تھیں اس ہار کی ایک لڑی ان کے گلے سے لپٹی تھی اور نویں لڑی اتنی لانبی تھی کہ جب وہ کھڑی ہوئیں تو گھٹنوں تک لٹک گئی تھی۔ اس مجمع میں یوں تو سب کا لباس اچھا تھا لیکن جو حسن خداداد اور جاذب نظر دل فریب لباس بیگم صدیقی کا تھا وہ کسی کو نصیب نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب کی نظریں ان پر بار بار پڑ رہی تھیں۔ سادہ دل بھولی لڑکی نوشابہ مسز صدیقی پر نثار ہو رہی تھی۔ اپنی جگہ چھوڑ کر مسز صدیقی کے پاس صوفہ پر آ بیٹھی تھی۔ وہ خود بھی حسین تھی مگر ان کو دیکھ کر اب یہ تمنا تھی کہ مجھ کو بھی خدا نے بیگم صدیقی کا سا دلکش حسن دیا ہوتا۔ آج اس کو اپنی خوبصورت ساڑی بری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ میں بھی سیاہ ساڑی پہن کر کیوں نہ آئی۔ سب ڈرائنگ روم میں آئے۔ اتفاق سے بیگم صدیقی کے ایک طرف انجینئر صاحب کی کرسی تھی اور دوسری طرف مس نوشابہ کی۔ قاعدہ کے موافق بیگم صدیقی کو باری باری دونوں سے باتیں کرنا پڑیں مگر انجینئر صاحب بہت خاموش تھے۔ کیپٹن صاحب اپنی عادت کے مطابق ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ پورے دو گھنٹے میز پر صرف کیے گئے اور جب خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا سب ڈرائنگ روم میں آئے تو کافی　　آپس میں ایک دوسرے سے گانے کی فرمائش کی گئیں۔ ان سب لیڈیز میں سب سے اچھی گانے والی مسز شنکر ہی تھیں۔ ان کے بعد صاحب خانہ بیگم فاروقی اور بیگم صدیقی بھی گانا جانتی تھیں۔ چھوٹی نوشابہ علاوہ وائلن اور پیانو کے ڈانس بھی کر سکتی تھیں اور ان مہمانوں میں ایک لیڈی مسز موہن لال بھی انگریزی ناچ کی ماہر تھیں۔ سب کے کہنے سے اور اپنے مہمانوں کی خاطر بیگم فاروقی نے پیانو پر گانا شروع کیا۔ انہیں دلچسپیوں میں رات کے بارہ بج گئے اور کمرے کے گھنٹے سے ٹن ٹن کی

آواز آئی تو یک بار سب کھڑے ہو گئے۔ صدیقی نے انجینئر صاحب سے کہا۔

''کل تو آپ جا ہی رہے ہیں واپس آ کر انسپکشن ہاؤس میں نہ ٹھیریے جب تک کوٹھی تلاش ہو آپ ہمارے ساتھ رہیں۔ بہت افسوس ہے کہ آپ نے اپنے یہاں آنے کی اپنی بہن کو اطلاع نہ دی۔ مجھ کو تو ابھی علم ہوا کہ آپ بھائی جمیل کے بہت عزیز دوست ہیں۔''

شوہر سے یہ سنکر بیگم صدیقی نے بھی ان سے کہا: ''ہاں بھائی جان آپ نے بڑا غضب کیا۔ ہمارے یہاں ہوتے ہوئے آپ ڈاک بنگلے میں ٹھیرے۔ لوگوں کے ہاں دعوتیں ہو رہی ہیں اور ہم شرمندہ ہو کر غیروں کی طرح شریک ہو رہی ہیں۔ اب کے آپ کو غریب خانہ پر قیام کرنا ہوگا۔ کس وقت کی ٹرین سے یہاں پہنچیں گے ابھی بتاتے جائیے۔ میں اسٹیشن پر استقبال کو حاضر ہوں گی۔''

ان دونوں کی طرف سے اس قدر محبت اور قدر دانی کے اظہار نے انجینئر صاحب پر بہت اثر کیا۔ ان کو الفاظ نہیں ملتے تھے جن میں شکریہ ادا کریں، چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے۔

''میں آپ دونوں کی از حد مہربانی و محبت کا شکریہ لفظوں میں ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ دوبارہ جبل پور پہنچنے سے پیشتر آپ کو اطلاع دے سکوں۔''

(۲۰)

دس بارہ دن گزر گئے کلکٹر صاحب کی طرف سے کوئی خبر نہ ملی۔ وہ صرف ایک ہفتہ کو گئے تھے۔ چار دن اور گزر گئے۔ ۴ بجے تھے۔ بیگم صدیقی تنہائی میں افسردہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر دورے پر تھے۔ شام کی چاء پی کر وہ گھر سے نکلیں۔ ارادہ کیا کہ اپنی کسی ملنے والی کو لے کر سینما چلیں۔ اتفاق کی بات راستے میں انسپکشن ہاؤس پڑتا تھا۔ اس کے آگے سے جب ان کی کار گزری تو خیال آیا کہ اتر کر معلوم کریں۔ شاید انجینئر صاحب آگئے ہوں اور تکلف کی وجہ سے یہاں قیام کیا ہو۔ احاطہ کے اندر کار لے گئیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ سامنے ہی ٹینس کورٹ کے قریب انجینئر صاحب ٹہل رہے ہیں۔ صرف قمیص پہن رکھی ہے۔ کوٹ نہیں۔ بال بھی پیشانی پر بکھر رہے ہیں۔ اس وقت تک برش نہیں کیا۔ بیگم صدیقی فوراً گاڑی سے اتر کر ان کے قریب آ گئیں۔ سلام کیا اور کہنے لگیں۔

"بھائی جان آپ جبل پور پہنچ گئے اور مثل سابق پھر اطلاع نہ کی؟ آخر آپ ہم سے کیوں بچتے ہیں۔ جب انتظار کی حد نہ رہی تو آخر تلاش میں نکلی۔"

انجینئر صاحب نے جواب دیا: "میں نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ ابھی سوچ رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کہ آپ تشریف لے آئیں۔ میں حیران ہوں کہ آپ دونوں مجھ ناچیز سے اس قدر محبت کیوں کرتے ہیں۔ کلکٹر صاحب نے تو اب سے قبل کبھی دیکھا بھی نہیں۔"

بیگم صدیقی بولیں: "سچ کہئے آپ جبل پور کب پہنچے؟ آپ کا ہمارے ہاں آنے کا ارادہ تھا؟ اگر میں نہ آجاتی تو آپ مدتوں چھپے رہتے۔"

یہ سنکر انجینئر صاحب شرمندہ سے ہو گئے۔ نگاہیں نیچے کو جھک گئیں اور چند سکنڈ

کی خاموشی کے بعد بولے: "مسز صدیقی میں بُرا آدمی ہوں۔ واقعی میں اس قابل ہوں کہ دونوں میری شکل نہ دیکھیں۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ میں چار دن سے یہاں آیا ہوا ہوں اور چونکہ آپ کے پاس نہیں گیا۔ اس لئے ابھی کسی دوست سے بھی نہیں ملا۔ آپ یقین کریں اسٹیشن سے یہاں پہنچا اور یہاں سے آفس کے لئے نکلتا ہوں۔ آج دل بہت بے چین تھا۔ سب دوستوں سے ملنے کے لئے لیکن یہ ہی سوچ رہا تھا کہ پہلے آپ کے پاس حاضر ہو آؤں پھر کسی سے ملوں۔ آپ دیکھ رہی ہیں میں کس حالت میں ہوں۔ آفس سے آ کر کوٹ اتارا ٹائی کھولی اور چاء پی۔ اس وقت اسی سوچ میں تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

بیگم صدیقی نے کہا: "معلوم ہو گیا آپ کو ہم لوگوں سے ملنا منظور نہیں اگر آپ کی بجائے میرے بھائی جان ہوتے تو ان سے ایسا ممکن نہ تھا؟ پہلی بار جب ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے ہمیشہ کے لئے بہن بنا لیا تھا آج یہ بیگانگی ہے کہ آپ بیٹھنے کو بھی نہیں کہتے۔"

"اوہو غلطی ہوئی معاف کریں۔ آپ کے آنے کی خوشی اور اپنی شرمندگی میں محو ہو گیا کہ یہ خیال ہی نہ آیا چلئے ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کہاں ہیں؟"

"مجھے دیکھ کر آپ تو کچھ پریشان سے ہو گئے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کا خیال بہت جلدی آ گیا؟ وہ ایک ہفتہ سے دورے پر ہیں اور مقام ایسا خراب تھا کہ میں ہمراہ نہ جا سکی۔"

یہ کہہ کر بیگم صدیقی پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئیں۔ انجینئر صاحب نے ڈرائنگ روم میں چلنے کیلئے کہا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ باغیچے کی طرف سے ہلکی ہلکی معطر ہوا چل رہی تھی۔ میٹھے مٹر کے خوبصورت رنگ برنگ کی نازک پھولوں کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ بیگم صدیقی باہر کھڑے کھڑے تھک گئی تھیں۔ آتے ہی صوفہ پر بیٹھ گئیں اور چھوٹی کرسی پر انجینئر صاحب بھی بیٹھ گئے اور ان سے پوچھا: "شربت منگوایا جائے یا چاء۔ اس وقت کچھ تو پینا چاہئے۔"

بیگم صدیقی نے جواب دیا: "بھائی جان شربت اور چاء سے کیا ہوگا۔ جب آپ ہم لوگوں کو بھول گئے۔ پہلی بار بے خبر آئے اور دوسروں کے ہاں ٹھیرے۔ اب کے آ کر خانہ نشین رہے۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ عمر بھر مجھ کو اپنی حقیقی بہن سمجھیں گے۔ ایک بار بھائی جان کے ساتھ جب آپ انگلینڈ روانہ ہو رہے تھے۔ میں رخصت کرنے کے لئے بمبئی

جانے کو بالکل تیار تھی لیکن میرے شوہر کی طبیعت خراب ہوگئی اور نہ جا سکی۔ اب خدا نے ایسا موقعہ دیا تھا کہ ہم مثل عزیزوں کے ملتے مگر آپ بہت ہی غیریت سے پیش آئے۔ مجھ کو یہ فکر ہے میرے شوہر کیا خیال کرینگے کہ یہ بیوی کا کیسا بھائی ہے۔ نہ معلوم وہ کیوں آپ سے محبت کرنے لگے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ آپ کے آنے کی وہ گھڑیاں گن رہے تھے اور بے تابی سے منتظر تھے۔ آپ کے ٹیلی گرام کا انتظار تھا۔ کہتے تھے۔ "دونوں چلیں گے۔ اسٹیشن سے لائیں گے۔ کہیں کوئی اور دوست نہ لے جائے۔" ان کی اس کیفیت پر میں بھی حیران تھی۔ آپ کی کشش نے علاوہ میرے بھائی کے ان کو بھی اس قدر جلد پروانہ بنالیا کہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

بیگم صدیقی کی یہ تقریر سنکر انجینئر صاحب پر عجیب اثر ہوا خاموش ہو کر سرنگوں ہو گئے۔ پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر قالین پر بیٹھ گئے۔ صدیقی بیگم کے سامنے اور شرمساری سے کہنے لگے۔

"بہن میں اس سے بھی بدتر ہوں جیسا آپ خیال کر رہی ہیں بے شک میں نے بڑا قابل ملامت رویہ اختیار کیا اور عمداً کیا غلطی سے نہیں۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ کیوں؟ واللہ میں نہ بتا سکوں گا۔ اچھا اب اپنی رائے اور ارادے کو تبدیل کرتا ہوں۔ آج کے بعد سے ایک خادم اور تابعدار بھائی کی طرح ملوں گا۔ خوش ہو جاؤ میری اچھی بہن۔"

انجینئر صاحب کے ان فقروں کو سن کر بیگم صدیقی بھی صوفہ سے اٹھ کر نیچے بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

"بہت بہت شکریہ اس کا مگر بھائی غیریت کے طریقے آپ نے جان کے اختیار کئے تھے اور اب حکم ہے کہ وجہ نہ پوچھو۔ نہیں بھئی بتایئے۔"

"جب بڑا بھائی نیچے بیٹھا تھا تو میں کیسے اوپر بیٹھ سکتی تھی۔ آپ بھی اٹھئے صوفہ پر بیٹھ کر بتایئے۔ خواہ آپ کو کسی قدر تکلیف کیوں نہ ہو۔ آپ جس طرح بھائی جان سے اپنی کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے مجھ سے بھی نہ چھپائیں۔ آپ نے پانچ سال برابر انگلینڈ کے زمانہ قیام کے حالات ذرہ ذرہ بھائی جان کو لکھے ہیں اور بہن سے ذرا ذرا سی بات چھپاتے ہیں۔"

"بے شک میں آپ دونوں بہن بھائیوں سے چھپانا نہیں چاہتا۔ غالباً میرے

خط وہ آپ کو دکھاتے ہوں گے جن سے میرے وہاں کے حالات بھی آپ کو معلوم ہوں گے لیکن عزیز بہن وہ بات ایسی نہیں ہے جس کو زبان پر لانا نہیں چاہتا۔ جانے دو۔ ہاں غصہ اور رنج کی وجہ سے آپ کا منہ خشک ہو رہا ہے۔ کچھ پھل کھا لیں۔"

وہ خود ہی اٹھ کر چلے گئے اور دوسرے کمرے سے ایک چاندی کی خوبصورت پلیٹ میں ناگپور کے بڑے بڑے اور شیریں سنترے رکھ کر لائے اور خود ہی چھیل کر اُن کو دیئے۔

"بھائی جان آپ کے گھر کا اور آپ کے ہاتھ کا پانی تک حرام ہے۔ جب تک وہ بات نہ بتائیں گے۔"

بے چارے انجینئر مجبور ہو گئے اور کہا: "میرا خیال تھا کہ آپ بڑی ہو کر بہت سمجھدار اور پختہ کار ہو گئی ہیں مگر نہیں آپ تو ابھی بچہ ہیں جس بات کو آپ نے بڑا اہم معاملہ سمجھا ہے وہ اتنی نہیں ہے لیکن سوائے میرے یا میرے خدا کے کسی تیسرے پر ظاہر نہیں ہوئی اس لئے میں چاہتا تھا کہ میرے ہی سینہ میں ہمیشہ دفن رہے مگر آپ اصرار کر رہی ہیں لیکن نتیجہ کچھ اچھا نہ ہوگا۔ آپ کی نظروں میں میری وہ قدر و منزلت نہ رہے گی۔ جواب تک ہے اور یقیناً پھر آپ مجھ سے اس خلوص کے ساتھ ملنا پسند نہ کریں گی۔"

انجینئر صاحب کے یہ فقرے سن کر بیگم کچھ گھبرا گئیں اور کہنے لگیں: "میرے اچھے بھائی جان جلد بتایئے خدا نہ کرے کہ ایسی بات ہو جس کا ہمارا تعلقات پر برا اثر پڑے۔"

انہوں نے دیکھا کہ بیگم صدیقی پریشان ہیں تو ان کی کیفیت بدلنے کے خیال سے ہنسنے لگے اور کہا: "آپ تو گھبرا گئیں اس قدر پریشان نہ ہوں۔ ایسی بہت بری بات نہیں ہے چونکہ میں اپنے دوست جمیل سے اور آپ سے خلوص کا تعلق رکھتا ہوں اور بے حد عزت کرتا ہوں اس وجہ سے زبان پر لانا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر آپ کے بے حد اصرار اور اس قدر گھبراہٹ سے مجبور ہو کر عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ اچھا سنو! اور اس کے بعد میری شکل بھی دیکھنی گوارا نہ کرو ... آپ کو یاد ہے آج سے سات سال قبل پیارے جمیل کی شادی میں جب میں کلکتہ گیا اور آپ سے ملا۔ آپ نے کس خلوص سے بالکل بہن کی طرح اپنے گلے کی زنجیر اتار کر سہرا پہنایا اور اس کے بعد دو تین ملاقاتیں اور ہوئیں۔ میں نہیں بتا سکتا۔ میرے دل پر کیا اثر ہوا تھا۔ بخدا آپ یقین کریں مجھ کو یہ علم نہ تھا کہ آپ کی شادی

ہو چکی ہے۔ میں بار بار آپ سے ملنا چاہتا تھا اور دو دن انہیں خیالات کی الجھن میں بسر کیے۔ آپ مجھ سے بہت بے تکلفی اور خلوص سے پیش آ رہی تھیں جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اور حیرت بھی کہ ایک لڑکی اس طرح کیسے مل رہی ہے؟ میری حیرانی کی وقت رخصت انتہا نہ رہی۔ جب آپ دونوں کی تصویر دیکھ کر جمیل نے یہ بتایا کہ تمہاری حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ اس وقت جو کچھ میرے دل پر گذری میں ہی جانتا ہوں۔ اپنی سخت غلطی پر پشیمانی اور افسوس ہے۔ یہ حالت تھی کہ مجھ سے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ خدا جانے کس طرح ہمت کر کے میں نے آپ کی وہ زنجیر واپس دی۔ اسکے بعد کلکتہ سے واپس چلا اور یہ ارادہ کر لیا کہ اب کبھی آپ سے نہ ملوں گا۔ دیکھئے میں نے کس قدر سنگدلی سے کام لیا۔ ہندوستان میں دو سال تک آپ کے کئی خطوط آئے اور میں نے جواب تک نہ دیا۔ میں اپنے اسی عہد پر اب تک قائم تھا۔ جمیل نے لکھ دیا تھا کہ تم یہاں ہو اور مجھ کو تمہارے گھر ٹھیرنا چاہئے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ محض اس لئے کہ میں اپنے دل کو کلکتہ والے خیالی جرم کی سزا دینا چاہتا تھا کیونکہ میں اب اپنے کو قابل نہیں سمجھتا تھا کہ آپ سے مل سکوں چونکہ مسٹر رفیق مجھ کو نہیں جانتے تھے۔ اس وجہ سے مجھے امید تھی کہ شاید میں بیگانہ وار جبل پور میں قیام کر سکوں۔ بہن جمیلہ اب تمہیں اختیار ہے میرے حق میں جو فیصلہ کر دیں۔ میں اس قابل ہوں کہ آج کے بعد میری شکل نہ دیکھو۔''

یہ کہہ کر انجینئر صاحب نے سر جھکا لیا۔ ان کی امید کے خلاف جمیلہ نے یہ کہا۔

''میرے بھائی یہ تو کوئی بات نہ نکلی جس کو آپ نے اسقدر اہمیت دے رکھی تھی۔ آپ اپنے کو کیوں برا خیال کرتے ہیں۔ ایسے نیک خیال آج کل کے نوجوانوں میں ہونے ناممکن ہیں۔ مجھے اپنے بھائی جمیل کی قسم جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں کہ آپ کے یہ خیالات معلوم کر کے میرے دل میں آپ کی عزت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ کو میرے حالات سے واقفیت نہ تھی تو غلط فہمی بے جا نہیں خیال کی جا سکتی اور دیکھئے میرے آپکے خلوص دلی کے تعلقات کا یہ قدرتی اثر ہے کہ میرے شوہر کو بھی آپ سے دلی محبت ہو گئی ہے۔ چلئے کلکتہ کے ان دنوں کو ہمیشہ کے لئے بھول جایئے اور ہم دونوں سے اچھے تعلقات قائم کیجئے۔ کہئے انگلینڈ سے تو خالی ہاتھ آ گئے۔ وطن پہنچ کر باجی جان حامد بیگم نے ضرور کہیں

رشتہ کر دیا ہوگا۔ اب جلدی سے شادی کر کے بھابی جان کو لے آیئے تاکہ آپ کی زندگی بھی پُر بہار ہو جائے اور ہمیں بھی ایک اچھی بھاوج اور دوست ملے۔''

''واقعی جمیلہ آپ نیک خاتون ہیں جواب بھی میرے متعلق آپ کی رائے اچھی ہے میں اپنی شادی کے متعلق پھر کسی دن گفتگو کروں گا۔ بیگم حامد کو تو بہت جلدی ہے لیکن میں ہی تیار نہیں۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ اعتراض نہ ہو تو کھانا اس وقت یہیں کھا لو۔''

''میں خوشی سے تیار ہوں کھانا منگوایئے۔ اس شب بھائی جان کے ولیمہ والے دن رات کو آپ نے اوّل اور آخری کھانا ہمارے ساتھ کھایا تھا۔ آج سات سال بعد پھر وہ دن نصیب ہو رہا ہے۔''

''دیکھو بہن جمیلہ تم نے ابھی کہا تھا کہ کلکتہ کے تین دن کو بھلا دو اور خود ہی وہ یاد دلا رہی ہو۔ بس اب وہ ذکر ہمارے درمیان کبھی نہ آنا چاہئے۔ میں نے سات سالہ مدّت میں بہت کوشش کی کہ وہ وقت زندگانی کا وہ اہم ترین وقت ہمیشہ کے لئے بھول جاؤں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس وقت آپ سے مل کر پھر وہ وقت یاد کر کے نادم ہوں۔ کہنا نہ چاہتا تھا مگر آپ نے نہ مانا۔''

بیرے نے اطلاع دی کہ کھانا میز پر ہے اور دونوں چلے گئے۔

(۲۱)

دوسرے دن صبح کو انجینئر صاحب آفس گئے اور شام کو واپس آکر کپڑے تبدیل کئے چائے پی اور ڈپٹی کمشنر مسٹر رفیق صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ آج شب کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کے لئے بیگم رفیق نے ان کو بلایا تھا۔ پُر بہار شام تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ بیگم صاحب اس وقت اپنے باغیچہ میں مہمان کی منتظر ہیں۔ وہ آگئے ہیں لان پر سبز قالین بچھا کر کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ دونوں بیٹھ گئے۔ مختلف ذکر ہوتے رہے۔ مسٹر رفیق کی غیر موجودگی کا دونوں کو افسوس تھا۔ صاحب خانہ نے بتایا کہ کھانے پر انہوں نے اپنی ایک اور دوست کو بھی بلایا ہے۔ جن سے پہلے قمر صاحب نہ ملے تھے انہوں نے کہا۔

"ان کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں اور وہ مس صاحبہ ہیں۔ تکلّف رہے گا۔"

بیگم نے کہا کہ "کوئی تکلّف نہیں وہ میری عزیز سہیلی ہیں۔"

ان کی شادی کا بہت تذکرہ رہا۔ بیگم رفیق زور دے رہی تھیں کہ جلدی شادی کر لیں وہ مانتے نظر نہ آتے تھے۔

"میں اسی موسم بہار میں اپنے بھائی کا گھر آباد کرنا چاہتی ہوں اگر باجی حامد بیگم نے کوئی لڑکی انتخاب نہیں کی تو میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔" بیگم رفیق نے کہا۔

"آخر آپ کو اس قدر جلدی اور شوق کیوں ہے؟ مجھ کو تو ذرا شوق نہیں خدا جانے کیوں۔ میں خود بھی اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں مگر طبیعت اِدھر نہیں آتی"۔

"باجی جان نے میرے آتے ہی کھانے پر سینما میں پر کئی لڑکیاں دکھائیں ملائیں۔ خوبصورت اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر میں رضامند نہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا انگلینڈ میں رہ کر

بالکل اس کوچہ سے الگ رہا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا یورپین کرسچین لیڈی تمہارے لئے مناسب نہ ہوتی یہاں ناپسند کی جاتی اور بعد چندے آپ کو بھی مشکلات کا سامنا ہوتا مگر ہاں یہاں اب کر لینی واجبی ہے۔" بیگم رفیق نے کہا۔

انھوں نے جواب دیا: "کیا کروں بہن آپ ہی کوئی تدبیر کریں۔ مجھ کو انگلینڈ میں، فرانس میں، مسلمان قابل لڑکیاں بھی ملیں جو ہندوستان، ٹرکی اور مصر وغیرہ سے تعلیم کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ ان کی طرف سے بہت کوششیں بھی ہوئیں۔ میں تو تمام حال جمیل کو لکھتا رہا ہوں مگر کسی کا جادو مجھ پر نہ چل سکا۔ غالباً آپ کو یقین نہ آئے گا کیونکہ آخر میں بھی انسان ہوں فرشتہ تو نہیں۔ ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی میرے ساتھ ہی یہاں واپس آئی۔ حیدرآباد کی تھی اور ڈاکٹری پڑھ کر واپس آ رہی تھی۔ بڑے گھرانے کی تھی۔ اس کے اچھے برتاؤ پر مجھ کو بھی اچھی طرح ماننا پڑتا۔ جہاز تک خوب روتی رہی۔ بمبئی پہنچ کر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ اپنے والدین سے خواستگاری کا خط بھجوا دیجئے۔ القصہ میں نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ میرا عقد ہو چکا ہے خاندان ہی میں تب وہ بہت بگڑیں کہ "پہلے سے کیوں نہ بتایا۔" میں نے کس قدر سنگدلی کا جواب دیا ہے کہ "مجھ کو کیا علم تھا کہ آپ مجھ سے اس ارادے سے مل رہی ہیں۔" میں کتنا برا آدمی ہوں۔"

یہ سن کر بیگم رفیق بولیں: "شکل کیسی تھی کیا خوبصورت نہ تھیں۔"

نہیں بہت خوبصورت تصویر آپ کو دکھاؤں گا۔ ایرانی ماں کی بیٹی تھی۔ سرخ سفید رنگ، دلکش چہرہ مگر یہاں تو اثر ہی نہیں۔"

یہی ذکر تھا کہ کار آ کر رکی اور بیگم صاحبہ کی دوست مس احمد اتریں۔ بیگم صاحبہ جا کر لائیں۔ انجینئر صاحب سے ملاقات کرائی۔ یہ لڑکی بھی بے حد حسین بیس سال کی تھی ابھی زیر تعلیم تھی۔ آجکل ایسٹر کی چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھی۔ اس کے والد احمد کریم صاحب جبل پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ دبلی، پتلی، لانبی۔ اسوقت چوڑے سنہرے بارڈر کی فیروزی پھولدار جارجٹ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ زیور فیروزہ کا تھا۔ ایک غیر نوجوان کو دیکھ کر شرما گئی اور ایک طرف کو بیٹھ گئی۔ بیگم رفیق دونوں کی آپس میں باتیں

کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز پر تینوں ڈرائنگ روم میں گئے۔ درمیان میں مس احمد کو بٹھایا گیا اور اِدھر اُدھر خود دونوں بیٹھے۔ قمر صاحب سمجھ رہے تھے کہ جمیلہ مجھ پر اثر ڈالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک گھنٹہ میز پر لگا۔ پھر مس احمد سے انہوں نے ستار بجوایا۔ واقعی اس وقت قمر صاحب پر ستار کا خاص اثر ہوا۔ لڑکی کو اس میں کمال حاصل تھا، اسکا قمر کو قائل ہونا پڑا۔

گھنٹہ نے گیارہ بجائے تو گھنٹہ کی آواز سنتے ہی مس احمد کھڑی ہو گئیں اور بیگم رفیق سے کہا۔

"بہت رات آ گئی اب ہمیں بھجوا دیجئے۔ اماں جان ناراض ہوں گی۔"

"ابھی لو میرے ہاں آنے سے بیگم احمد صاحب ناراض نہیں ہوتیں۔ ہم خود چل کر تمہیں پہنچا آئیں گے۔ چلئے بھائی جان! آپ دونوں کو ٹھکانے کر دوں"۔ بیگم رفیق نے جواب دیا۔

"اس وقت آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا ڈرائیور مس صاحبہ کو پہنچا دے گا۔ میری گاڑی موجود ہے۔" کھڑے ہو کر مسٹر قمر نے کہا۔

"انجینئر صاحب مس صاحبہ رات کے وقت تنہا نہیں جا سکتیں آپ ان کو پہنچا آئیں تو مہربانی ہوگی۔"

بیگم صدیقی سے یہ سُن کر مس احمد بولیں۔ "نہیں انجینئر صاحب کو بھی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں اور آپ بھی آرام کریں آیا میرے ساتھ ہے۔"

"ایسا تو نہ ہوگا کہ آدھی رات کے وقت آپ کو نوکروں کے ساتھ کر دوں۔ چلئے بھائی صاحب آپ ہی کی کار میں ہم تینوں چلتے ہیں۔ پہلے ان کو اتار دیا جائے گا پھر آپ کو پہنچا کر میں واپس آ جاؤں گی۔"

انجینئر صاحب نے کہا۔ "آپ کو تنہا کیسے آنے دیا جائے گا؟ میں پھر پہنچانے آؤں گا۔ رات اسی میں ختم ہو جائیگی۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ مس صاحبہ کو پہنچا دیں اور میں رخصت ہوتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

مگر بیگم رفیق نے نہ مانا اور تینوں مسٹر قمر کی کار پر سوار ہوئے۔ پہلے مس احمد کو اتارا

پھر انسپکشن ہاؤس پہنچے لیکن مسز قمر کسی طرح نہ اترے وہ نہیں چاہتے تھے کہ بہن تنہا گھر جائے۔ پھر ڈپٹی کمشنر صاحب بنگلہ پر ان کو پہنچانے آئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے ڈاک بنگلہ سے اٹھ آنے پر اصرار کیا تو مسز قمر نے جواب دیا۔

''اب تو میرے یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوٹھی مل گئی ہے۔ وہیں جانا چاہئے۔ میرا ارادہ ہے کہ کل ڈاک بنگلہ سے اٹھ جاؤں۔''

بیگم رفیق نے کہا: ''آپ کو یہاں آنا ہی منظور نہیں۔ اچھا آپ کی خوشی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی کوٹھی درست کردوں بنگلہ کا نمبر اور سڑک کا نام بتائیے جس وقت آپ کا سامان وہاں پہنچ جائے میں جا کر ٹھیک ٹھاک کردوں۔ بلکہ اپنے ساتھ مس احمد کو بھی لیتی آؤں گی۔ یہ لڑکی مکان کی آراستگی کا خاص سلیقہ رکھتی ہے۔ آپ انکے ہاں کال کرنے تو گئے ہوں گے۔ دیکھا ڈرائنگ روم کتنا اچھا ہے۔ میں تو کمروں کی آرائش میں اس کی رائے لیا کرتی ہوں۔''

انجینئر صاحب یہ سن کر ہنسنے لگے اور کہا: ''جمیلہ تم بڑی تو ہوگئی ہو مگر بچپن کی شرارتیں ابھی باقی ہیں۔ میں خوب سمجھتا ہوں یہ ڈنر اسی غرض سے ہوا اور اب وہ میرا مکان سجانے جائیں گی۔ آپ تو بہن ہیں، آپ کا فرض ہے بیوی کے بھائی کی مدد کریں اور اُن کا کیا تعلق؟''

''ان کا؟ ان کا یہ تعلق کہ شاید میری دعا سے وہ اس کوٹھی کی مالک ہی ہو جائیں کیوں بھائی آپ کی کیا رائے ہے۔''

''میری رائے میں ان کی شکل وصورت علمی قابلیت اور سب سے بڑھ کر شرم وحیا بہت ہی پسندیدہ اور قابل تعریف ہے۔''

''بس بس اب کیا تھا کام بن گیا۔ رفیق صاحب آجائیں تو ابھی منگنی کی رسم دھوم دھام سے ادا کی جائیگی۔''

بیگم رفیق سے یہ سن کر قمر صاحب بہت ہنسے اور کہا: ''کیا خوب کسی لڑکی کی تعریف کرنے کے یہ معنی ہوا کرتے ہیں جو آپ نے سمجھے۔ جمیلہ بیگم وہ دن بہت دور ہے جس کا آپ خواب دیکھ رہی ہیں۔ اچھا شکریہ پھر کسی دن ملیں گے۔ اب رخصت کیجئے۔''

"ارے کس دن؟ میں تو کل مکان آراستہ کرنے جانا چاہتی ہوں اور آپ کسی دن پر ٹال رہے ہیں۔ بھائی جان آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ مجھ سے ملنا کیوں پسند نہیں کرتے۔"

"جمیلہ ایسا خیال بھی نہ کرو کہ میں اور تم سے ملنا نہ چاہوں۔ میرا خیال ہے کہ شاید میں کل مکان میں نہ جا سکوں کیونکہ اس کے کمروں کے اندر جو رنگ تھا وہ پسند نہ آیا۔ اس کا پالش بدلوایا جا رہا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ باہر آئے بیگم رفیق اندر آ گئیں۔ آج شام کی مصروفیت میں دن کی آخری ڈاک نہ دیکھی تھی۔ خطوط کھولے۔ جمیل صاحب کا خط سب سے پہلے پڑھا۔

کلکتہ

پیاری بہن جمیلہ!

بہت بہت دعائیں۔ تمہارا خط ملا بہت اچھا ہوا کہ میرا جان سے پیارا قمر تمہارے پاس پہنچ گیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس نے غیریت سے کام لیا اور بجائے تمہارے ہاں ٹھیرنے کے کہیں اور اترا۔ معلوم ہوتا ہے رفیق صاحب سے ناواقفیت کی وجہ سے اس نے ایسا کیا۔ اب کے جو واپس آئیں تو تم اپنے گھر ٹھیراؤ۔ جمیلہ یہ بہت ہی اچھا شخص ہے اگر پانچ سال یورپ میں رہنے کا کچھ اثر نہ ہوا ہو تو تم جلدی اس کی شادی کرا دو۔ اپنے دھندوں سے ذرا فراغت حاصل کر لوں تو جبل پور پہنچوں۔ تم دونوں وہاں جمع ہو گئے ہو میرا دل اب یہاں بالکل نہیں لگتا۔ تمہاری بھابی سلام کہتی ہیں۔

دعا گو تمہارا بھائی
جمیل

(۲۲)

انجینئر قمر کو جبل پور آئے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔یوں تو یہاں کے بہت سے معزز خاندانوں سے دوستانہ مراسم قائم ہو چکے ہیں لیکن سب سے زیادہ ان کے قدردان اور محبت کرنے والے دوست کلکٹر صاحب ہی ہیں۔ان کے علاوہ قمر صاحب کے افیسر جناب احسان مرزا صاحب جوان کے آنے کے بعد یہاں تبدیل ہو کر آئے ہیں۔قمر سے بہت محبت کرتے ہیں اور یہ کلکٹر صاحب کی بیگم صاحبہ کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ بیگم احسان مرزا اور ان کے بچے ان کو مثل ایک عزیز کے سمجھتے ہیں مگر باوجود اس قدر محبت کے قمر صاحب اس فیملی سے کچھ زیادہ بے تکلفی واپنائیت سے پیش نہیں آتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ قمر صاحب ناشتہ کر کے آفس جانے کو تیار تھے کہ کلکٹر صاحب آپہنچے اور کہنے لگے:" میں اس وقت ایک بہت ضروری بات تم سے کہنے کے لئے آفس جاتا ہوا آیا ہوں۔آج بڑے انجینئر صاحب کی بڑی صاحبزادی کی سالگرہ ہے۔ایٹ ہوم اور ڈنر کی اطلاع تو تم کو ہو گئی ہو گی مگر یہ شاید معلوم نہ ہو گا کہ یہ سب سے بڑی صاحبزادی کی سالگرہ کیلئے ہو رہا ہے۔آپ کی ہمشیرہ نے کہا ہے کہ سالگرہ کیلئے کوئی تحفہ بھی تم کو ضرور لے جانا چاہئے۔اس کا بندوبست شام سے پہلے ہو جائے۔" یہ تو بڑا سخت حکم ہے۔ہمشیرہ صاحبہ تو مجھ سے ناراض ہیں۔میں جاتا ہوں تو بات نہیں کرتیں۔آج یہ حکم کیسے ہوا؟"

قمر نے مسکرا کر جواب دیا تو کلکٹر صاحب نے کہا:" تمہاری حرکتوں سے ناراض تو ضرور ہیں لیکن آخر پھر بہن ہیں۔آج سب دوستوں کی طرف سے تحائف آئیں گے اور تم خالی ہاتھ جاؤ گے تو تمہاری بہن کو بہت شرم آئے گی۔"

"ان کے خیال کا شکریہ مگر یہ تو بتائیے کہ اتنے تھوڑے وقت میں میں کیا کر سکتا

ہوں؟ یہاں ایک پارسی جوہری کی دکان تو ضرور ہے مگر مجھ کو انتخاب کا سلیقہ نہیں۔ اب آفس کا وقت ہو چکا ہے اور چار بجے واپس آ کر "ایٹ ہوم" میں جانا ہے اگر بہن ناراض نہ ہوتیں تو یہ کام دو تین دن پہلے ہو جاتا۔"

"تم اسی وقت پانچ منٹ کے لئے ان سے ملنے جاؤ وہ یہ مشکل حل کر دیں گی۔"

یہ کہہ کر وہ کورٹ روانہ ہو گئے اور انجینئر صاحب تیز رفتاری کے ساتھ کلکٹر صاحب کی کوٹھی پر آئے۔ ان کی بہن جمیلہ بیگم اپنے ڈریسنگ روم میں زیورات کی الماری کھولے کھڑی تھیں اور قریب ہی چاندی کی چیزوں کی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔ جوں ہی آیا نے اطلاع دی کہ انجینئر صاحب آئے ہیں۔ فوراً انہیں بلوا لیا گیا۔ وہ ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور سلام کے بعد کہنے لگے: "اوہو جب یہاں یہ سب کچھ موجود ہے تو اب فیروز جی اینڈ سنز کے ہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

جمیلہ بیگم نے جواب دیا: "ہم دونوں فیروز جی کے ہاں ہو آئے ہیں۔ وہاں کوئی چیز اس قابل نظر نہ آئی کہ لے لی جاتی۔ رفیق صاحب کو آپ کی طرف بھیج دیا تھا مگر میں یہی سوچ کر خود یہاں دیکھنے لگی کہ جبل پور میں اچھا تحفہ مہیا نہ کر سکیں گے۔ شاید ان چیزوں میں سے کوئی چیز غیر استعمالی اس قابل نظر آ جائے تو آپ کی رائے سے انتخاب کر لی جائے۔"

یہ سن کر قمر صاحب ذرا آگے بڑھے اور مسکرا کر کہا: "آپ مجھ سے بہت ناراض تھیں پھر بھی میرا اس قدر خیال ہے۔ اس انتخاب میں میری رائے کس قابل ہو گی۔ یہ قابلیت تو آپ ہی کو حاصل ہے۔"

"نہیں آپ کی رائے اس انتخاب میں ضروری ہے اور آپ اس میں خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ آج سے سات سال قبل جب کہ طالب علم تھے۔ بھائی جان کی شادی کے وقت مجھ کو سہرا بندھائی اور بھابی جان کو رونمائی میں کیسی اچھی چیزیں دی تھیں۔"

"پھر ناراض تو نہ ہو جائیں گی، کہہ دوں، وہ اپنی خوشی کا کام تھا اور یہ آپ کی جو چاہیں آپ پسند کر کے میری طرف سے دیدیں۔ آفس کا وقت ہو چکا ہے مجھے جلدی جانا ہے۔"

ان سے یہ سن کر جمیلہ بیگم چیں بہ جبیں ہو کر بولیں۔

"کیوں وہ انتخاب تحائف آپ کی خوشی کا کیوں تھا اور یہ کیوں نہیں؟ وہ بھی دوست کی شادی کا وقت تھا اور یہ بھی ایک دوست کی خوشی کی تقریب ہے۔ آپ کی خوشی اس میں بھی شامل ہونی چاہئے۔"

انہوں نے جواب دیا: "جمیلہ معاف کریں یہ میرے دوست نہیں ہیں بلکہ افسر ہیں۔ نہ ان سے بے تکلفی نہ ہم عمری اور وہ دوسرا معاملہ بھی جس کی آپ کوشش کر رہی ہیں دلی خواہش کا نہیں۔ اس حالت میں میں معذور ہوں گا۔ باقی پھر۔"

یہ کہہ کر قمر صاحب چلے گئے اور حسب معمول بہن کار تک ان کو رخصت کرنے نہیں آئیں۔ ان کے جانے کے بعد پریشان ہو کر وہیں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئیں اور اپنی انا سے کہنے لگیں۔

"انا جی بند کر دو الماریوں کو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کیا جائے بھائی قمر کسی طرح قابو میں نہیں آتے۔ میری چار ماہ کی کوششوں کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ الماریوں کو قفل لگا کر اپنی بھاری ریشمی ساڑی کو سنبھالتے ہوئے وہیں قالین پر انکے قریب بیٹھ گئیں اور جیب سے بٹوا نکال کر ڈلی تمبا کو کھایا اور آنکھیں اوپر کو چڑھا کر بولیں: "یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔ آپ نے تو لڑکی سے بھی ذکر کر دیا ہے وہ سب لوگ اس رشتہ سے بہت خوش ہیں اور قمر صاحب سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اللہ ہماری بات رکھ لے۔"

"خیر کچھ بھی ہو قمر صاحب کو یہ رشتہ منظور کرنا پڑے گا اور اگر یہ نہیں کریں گے تو میں اور بھائی جان عمر بھر ان کی شکل نہ دیکھیں گے۔ میرے کہنے اور تعریف کرنے سے اس بے چاری معصوم بچی کو ان کا خاص خیال پیدا ہو گیا اگر اس وقت اس کا کہیں اور سے رشتہ آ جائے تو یقیناً وہ انکار کر دے۔ اٹھارہ سال کی بھولی اور نیک بچی دیکھو تا شکل کتنی اچھی ہے۔ جبل پور میں تو اس کے حُسن کی دُھوم ہے۔ قمر بھائی کمبخت ہیں جو نخرے کر رہے ہیں۔ اس سے بہتر بیوی ان کو دنیا میں نہ ملے گی۔ یہ کم سنی اور بی اے کی تیاری کر رہی ہے۔

بیگم اپنے دل کا غبار انا کے آگے نکال رہی تھیں کہ کھانے کے کمرے سے گھنٹی کی آواز آئی۔ جا کر کھانا کھا کر اور اسی الجھن میں مبتلا رہیں۔ پھر قمر صاحب کو دفتر میں ٹیلیفون سے کہا کہ وہ آج آفس سے جلدی آ جائیں۔ چنانچہ وہ تین ہی بجے یہاں پہنچ گئے۔

کار واپس کردی کہ ڈرائیور ان کے ایٹ ہوم کی تیاری کے لئے ان کا سوٹ اور بوٹ لے آئے۔ جمیلہ بیگم سٹنگ روم میں ان کی منتظر تھیں۔ وہ کچھ پریشان صورت داخل ہوئے اور قریب کی کرسی پر بیٹھ گئے تو فوراً ہی انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"بھائی جان آج ہماری دوستی یا رشتہ داری کا آخری فیصلہ ہے۔ چھ ماہ سے میں آپ کو شادی کی ترغیب دے رہی ہوں خاص کر جب سے کہ نواب احسان مرزا صاحب تبدیل ہو کر جبل پور آئے ہیں۔ ان کی حسین و قابل صاجزادی کو آپ سے ملوایا۔ زندگی میں آخر آپ کو شادی کرنا ہے تو کیوں نہ اسی وقت کر کے اپنی حقیقی بہن حامد بیگم سے زیادہ بنائی ہوئی بہن جمیلہ کو شاد کردیں۔ جلد بولیں کیا رائے ہے۔"

"آج شادی تو نہیں ہو رہی اُن کی تو سالگرہ ہے۔ ابھی تو سالگرہ کے تحفہ کی بحث تھی کیا آج ہی وہ لوگ شادی کرنے کو تیار ہیں؟" قمر صاحب نے سوال کیا۔

"دیکھئے بھائی جان ان کی اور میری اسقدر توہین نہ کیجئے۔ آج شادی کیسی؟ مگر آپ کے طرز عمل سے یہ پایا جاتا ہے کہ آپ جو ہم چاہتے ہیں وہ نہیں چاہتے۔ آج تو سالگرہ ہے مگر شادی کا فیصلہ بھی آج ہی ہونا چاہئے یا اپنی ناپسندیدگی کی کوئی وجہ بیان کریں۔ لڑکی خوبصورت نہیں یا قابل نہیں یا آپ کی قدر دان نہیں۔"

یہ سُن کر قمر ہنس کر بولے:" خاکسار کو اس سے کب انکار ہے اور میرے دل میں بھی اس کی قدر ہے لیکن محبت نہیں۔ اگر آپ اس بات کو پسند کرتی ہیں جس کو میں ذرا نہیں چاہتا اسے عمر بھر کا ساتھی بنالوں تو آپ کی مرضی میں اس پر بھی تیار ہوں لیکن یہ سوچ لیں کہ اس بے چاری بے گناہ نواب زادی پر کتنا شدید ظلم ہوگا اور کیا آپ کو یہ گوارا ہوگا۔"

جمیلہ نے ذرا تیز نظروں سے دیکھ کر کہا:" ظلم کیوں ہوگا؟ جب آپ اُس کو چاہنے لگیں گے۔ یہ تنہائی کی افسردہ زندگی مسرت و شادمانی سے بدل جائے گی۔ ایک خوبصورت اور قابل لڑکی آپ کی بیوی نہیں بنے گی بلکہ ایک حور آپ کی رفاقت اور خدمت کو میسر ہوگی اگر آپ کو خود بخود بے اختیار اس سے محبت نہیں ہوئی ہے تو کوشش سے پیدا کرنی چاہئے۔"

"میری بھولی بہن محبت کوشش سے نہیں ہوا کرتی آپ یہ نہیں جانتیں؟"

"میں سب جانتی ہوں مگر زندگی میں ہر قسم کے واقعات پیش آجاتے ہیں۔اسی کے مطابق انسان کو اپنی زندگی میں آسائش پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔آپ تو بہت محبت کرنے والا دل رکھتے ہیں۔اپنے دوست جمیل اور مجھ منہ بولی بہن سے کس قدر خلوص ہے اس کے علاوہ کسی اور سے اگر محبت کرنا چاہیں تو اس میں بھی کامیابی ہوسکتی ہے۔"

"یہ ہی تو مشکل ہے۔ان تین کے علاوہ قمر اب کسی اور کو چاہ ہی نہیں سکتا۔"

"آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔غور کریں جب تین پر آپ قربان ہیں وہ تینوں ہی آپکے علاوہ اور تین عزیزوں کو بھی دل وجان سے چاہتے ہیں۔ہم دونوں بہن بھائیوں کو چھوڑیں آپ کی بہن حامد بیگم اپنے عزیز از جان بھائی قمر کے بعد اپنے بچوں اور شوہر سے بھی از حد محبت کرتی ہیں۔دنیا کا دستور ہی یہ ہے اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنا ہوگا۔اب نہیں کچھ مدت بعد سہی۔لیکن اگر اس وقت مان لیں گے تو آپ کی اس سچی چاہنے والی بہن کی دلی تمنا برآئے گی اور وہ عمر بھر احسان مند رہے گی۔آپ آج ہی سالگرہ کا تحفہ اپنے ہاتھ سے پیش کریں اور ذرا نرمی سے ملیں جیسا کہ آجکل لیڈیز سے ملنے کا طریقہ ہے۔وہ آپ کی بے رخی اور بے پروائی کی شاکی ہے۔"

یہ تقریر سن کر قمر صاحب ہاتھ جوڑ کر بہن کے آگے کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے بہن جمیلہ جو حکم دو میں بسر وچشم بجالانے کو تیار ہوں لیکن للہ مجھ کو اس امر پر مجبور نہ کرو کہ میں ایک بھولی بھالی فرشتہ خصلت لڑکی کو دھوکا دوں۔وہ کتنی حسین ذہین قابل اور دلکش لڑکی ہے مگر ایک دوست کی حیثیت سے بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔میں کہہ چکا ہوں کہ وہ دلکش ہے مگر میرے لئے نہیں۔میں اس کی دلکشی سے آگاہ اور قدر دان ہوں مگر اس نظر سے نہیں جو آپ کی فرمائش ہے اور یہ بالکل مجبوری ہے اگر اس حالت میں شادی ہوگئی تو یہ ہم پر سخت ظلم ہوگا اور اس جنت ارضی کی حور کی زندگی برباد ہوگی۔آپ شاید سب کو جمیل ہی سا دل رکھنے والا خیال کرتی ہیں۔وہ دنیا کا ایک نرالا شخص ہے کہ ایک نہیں دو دو بار ناکام آرزو ہوکر بھی اس قدر باہمت رہا کہ شکیلہ بیگم کو خوش کر سکا اور کوئی تو ایسا نہیں ہوسکتا جس لڑکی سے محبت نہ ہو اس کو خوش رکھنا ناممکن ہے۔"

"بھائی صاحب ذرا سی کوشش اور دل پر جبر کرنے سے ہر ایک نوجوان جمیل بن

سکتا ہے۔"

قمر نے کہا: "اور ہر ایک لڑکی جمیلہ۔"

"یہ تو اپنی کوشش پر منحصر ہے۔ کچھ اپنے فرائض کا خیال کچھ دوسرے کی خوشی خاطر و خدمت کا لحاظ اور ہر وقت کی رفاقت محبت ہو ہی جاتی ہے۔ یہ ہی دیکھو کلکٹر صاحب کو شادی سے قبل نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ صرف بھائی جان کی شناسائی تھی۔ دنیا کی نظروں میں خوبصورت اور شریف نوجوان تھا۔ آئی سی ایس تھا۔ جب یہ سب خوبیاں مجھ پر ظاہر کی گئیں۔ پہلے ان کی تصویر دکھائی گئی۔ پھر بھائی جان کی کوشش سے ملاقات کرا دی گئی سچ عرض کرتی ہوں کہ اس وقت تک مجھ پر کوئی اثر نہ تھا لیکن سمجھ لیا کہ زندگی کا یہ فرض ضرور ادا کرنا ہے۔ یہ اچھا شخص ہے۔ میرے چاہنے والے بھائی جان کی یہ دلی خوشی ہے میں نے منظور کر لیا۔ اس وقت مجھے کچھ خیال بھی نہ تھا مگر اب آپ دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ جمیل بھائی میرے بیحد چاہنے والے بھائی بھی مجھ کو اسقدر نہیں چاہتے جس قدر کہ وہ چاہتے ہیں۔ پھر اس کا یہ اثر ہے کہ میں بھی ان کی جاں نثار اور پرستار بیوی ہوں۔ بھائی ہندوستانی شادیاں اسی طرح ہوتی ہیں پہلے شادی پھر محبت اور یہ کامیاب شادیاں ہیں اور جو لوگ پہلے محبت پھر شادی کرتے ہیں وہ ناکامیاب رہتے ہیں۔"

"خدا کرے آپ کے اس لکچر کا میرے دل پر اچھا اثر ہو۔ جمیلہ میں کوشش کروں گا لیکن کامیابی کی امید نہیں۔ میرے دل نے مجھے سخت دھوکہ دیا تھا۔ میں بڑا گنہگار ہوں اور اس کی سزا میں زندگی میں ہی بھگتنا چاہتا تھا اور وہ اسی صورت میں ہو سکتی تھی کہ میں تمام عمر ناشاد و نامراد رہوں۔ یقین کرو میرے دل میں مدت سے کوئی خوشی کوئی آرزو نہیں اسی وجہ سے میں غیر جنس کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آ سکتا۔"

"یہ سب صحیح ہے مگر یہ شادی کا مرحلہ بھی ہمارا مذہبی فرض ہے۔ اس کے علاوہ ایک وقت یہ آ پڑی ہے کہ وقتاً فوقتاً میں آپ کا ذکر اس لڑکی سے کر کے آپ کی کافی قدر و محبت اس کے دل میں پیدا کر چکی ہوں۔ وہ یہاں تک تیار ہے کہ اگر آپ سے بہتر بھی کوئی رشتہ آئے تو وہ نامنظور کر دے۔ اب تو بھائی جان میری لاج رکھ لو۔"

"آہ جمیلہ غضب کا امتحان لے رہی ہو۔ یہ کیا غضب کیا کہ اس پر بھی اپنا خیال

ظاہر کردیا؟ اچھا خدا میری مدد کرے۔"

ان کو کچھ نرم دیکھ کر جمیلہ نے کہا: "آپ کا ذکر ہی نہیں بلکہ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ میں تمہاری شادی اپنے بھائی سے کروں گی اور وہ اس تجویز سے بہت خوش ہے۔"

"غضب کردیا بغیر میری رائے لئے آپ نے سب کچھ طے کرلیا۔ اب میں مجبور ہوں۔"

"بھائی مجھ کو آپ کی محبت پر اس قدر اعتماد تھا تب تو ایسا کیا۔ مجھ کو یقین تھا کہ آپ یہ بارگراں اپنے سر لیں گے اور مجھ کو ان لوگوں سے شرمندہ نہ کریں گے۔"

"جمیلہ اگر بجائے اس کے تم مجھ کو بھاڑ میں گر جانے یا دریا میں کود جانے کا حکم دیتیں تو بخدا وہ میرے لئے آسان تھا لیکن اب تو ہو گیا جو گیا۔ اچھا اب مجھ کو سبق دیجئے کہ میں اس لڑکی سے کس طرح پیش آؤں جن خیالات کا اظہار مجھ کو اس وقت کرنا چاہئے اس کی مجھ میں قابلیت نہیں۔"

"بھائی جان ایسا سبق مجھ سے آپ لینا چاہتے ہیں؟ خود برسوں یورپ میں رہ آئے اور زمانہ طالب علمی سے نئی سوسائٹی میں رہتے ہیں۔"

"یہ صحیح ہے لیکن مجھ کو اس وقت تک ایسا موقع کبھی پیش نہیں آیا اور آپ کو استاد اسلئے بنانا چاہتا ہوں کہ آپ ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں اور جمیل وشکیلہ کی شادی کے حالات سے واقف ہیں۔ آپ جو کچھ بتائیں گی۔ اس سے کامیابی کی امید ہے۔"

یہ سُن کر جمیلہ اٹھیں اور دوسرے کمرے سے ایک چھوٹا سا مخملی کیس لے آئیں جس میں ایک بڑے سے یاقوت کی انگوٹھی رکھی تھی۔ یہ قیمتی چوکور تھا اور اسکے چاروں کونوں پر چار بیج موتی جڑے تھے۔ اس کی قیمت پانچ سو روپے سے کم نہ تھی۔ وہ قمر صاحب کو دکھا کر کہنے لگیں۔

"لیجئے میری سمجھ میں تو سالگرہ کے اس پہلے تحفہ کیلئے یہ ہی مناسب ہے۔ یوں تو کچھ اور بھی دیا جاسکتا تھا لیکن اس وقت آپ کا انگشتری پہنانا بامعنی ہوگا۔ سالگرہ، منگنی، شادی، یہ ایک ہی تحفہ تینوں کام بنائے گا۔ آپ یقین کریں یہ میری شادی کی یا کبھی پہنی ہوئی نہیں ہے۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں ہم دونوں بمبئی گئے تھے وہاں میں نے خریدی تھی۔"

قمر صاحب انگوٹھی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ بہت تعریف کی اور دبی زبان سے کہا۔

"یہ بہت ہی اچھی ہے۔ آپ اپنی پسند اور شوق کی چیز دوسرے کو دے رہی ہیں اچھا اس کی قیمت کیا ہو گی؟"

"بے شک یہ میری پسند کی چیز ہے مگر کس کو دے رہی ہوں؟ اپنے بہت ہی عزیز بھائی کی قابل قدر بیوی کو۔ قیمت کی فکر نہ کریں وہ آپ سے لے لی جائے گی۔"

"یہ تو بتایئے میں ان کے حضور میں پیش کس طرح کروں۔ تحائف کی میز پر رکھدی جائے تو بہتر ہے۔"

"یہ آپ کو بتا دیا جائے گا کہ کس طرح پیش کریں۔ اب اٹھیے جانے کا وقت قریب ہے لیجئے کلکٹر صاحب بھی آ گئے۔ ہم تیار ہوتے جاتے ہیں۔ آپ بھی گیسٹ روم کے باتھ روم میں جایئے۔ وہ آج خالی ہے اور آپ کا لباس خدمت گار نے وہیں رکھ دیا ہے۔"

☆

(۲۳)

شام کے پانچ بج چکے ہیں۔ بڑے انجینئر صاحب نواب احسان مرزا کی کوٹھی کا وسیع باغ مہمانوں سے بھرا ہے۔ سبز مخملی لان پر جا بجا خوبصورت قالین ڈال کر میز کرسیاں لگائی گئی ہیں۔ میزوں پر چاندی کا سامان جگمگا رہا ہے۔ گلدستوں میں خوشنما پھول بہار دے رہے ہیں۔ صاف ستھرے باسلیقہ خدمت گار چائے تقسیم کر رہے ہیں۔ مہمان اپنے اپنے دوستوں کی ٹولیاں بنا کر بیٹھے ہیں۔ نواب اور بیگم احسان مرزا صاحب اپنی سہیلیوں کے حلقے میں ایک طرف کو بیٹھی ہیں۔ قریب ہی میز پر وہ تحائف رکھے ہیں جو ان کے اور ان کے والدین کے دوست لائے ہیں۔ مس مرزا صاحبہ اس وقت قیمتی بنارسی ساڑی پہنے ہوئے ہیں جو سالگرہ کے تحفہ میں ان کی اماں جان نے دی ہے اور اسکے ساتھ یاقوت کا جڑاؤ زیور اس لال پری کے گرد سبز، زرد، گلابی، فیروزی مختلف رنگ کی ساڑیاں پہنے ان کی سہیلیاں جمع ہیں۔ یہ سب لڑکیاں اپنا اپنا تحفہ ان کو دکھا کر اسی میز پر رکھ دیتی تھی اور جو انگوٹھی چھلا یا بروچ وغیرہ لائی ہے۔ اس نے ان کو پہنا دیا ہے۔ سب تو آ گئے لیکن مس صاحبہ کی عزیز چچی جمیلہ بیگم اور کلکٹر صاحب اور اسسٹنٹ انجینئر قمر صاحب نہیں پہنچے جن کے لئے ان کی نظریں متلاشی ہیں۔ سوا پانچ بجے کے قریب وہ تینوں آئے۔ ایک ہی کار سے اترے اور سیدھے نواب بیگم کی طرف چلے گئے۔ چاء پی، تھوڑی دیر بیٹھے۔ پھر تینوں مس صاحبہ کے حلقے میں آئے اور ان کے قریب صوفہ پر بیٹھ گئے اور جمیلہ نے ایک زنجیر جس میں سرخ جگنی لٹک رہی تھی اپنے ہاتھ سے مس مرزا کے گلے میں پہنا دی۔ انہوں نے نہایت ادب کے ساتھ مسکراتے ہوئے سلام کر کے شکریہ ادا کیا۔ پھر جمیلہ بیگم نے کہا۔

”شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم میری بھانجی اور بھتیجی ہو۔ ہاں میرے بھائی قمر

صاحب بھی آپ کے لئے کچھ لائے ہیں۔ لاؤ ہاتھ۔" اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "آپ ہی پہنا دیجئے۔"

انہوں نے بمشکل جیب سے ڈبیہ نکال کر کھولی اور خود پہنانے کی ہمت نہ ہوئی انگوٹھی جمیلہ کے ہاتھ میں دے دی۔ اُن کو بہت غصہ آیا کہ کس قدر سمجھا بجھا کر لائی تھی کہ اپنے ہاتھ سے پہنانا مگر قمر نے نہ مانا۔ جب جمیلہ نے ان کے ہاتھ سے انگوٹھی نہ لی تو کلکٹر صاحب نے خود لے کر مس صاحب کو پہنا دی۔ جمیلہ کچھ خاموش سی ہو کر یہاں سے اٹھ گئیں اور دوسرے احباب کے حلقہ میں جا بیٹھیں۔ عقل مند نواب زادی نے سب کچھ سمجھ لیا اور شکریہ کے بعد قمر سے مخاطب ہو کر بولیں۔"

"قمر صاحب آپ کو اس قدر تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی کوئی معمولی سی چیز لے آتے۔ یہ تو ایک رسم ہے۔ چار پھولوں سے بھی اسی قدر حاصل ہو جاتی ہے۔ جس قدر کہ چار سو یا چار ہزار کی قیمتی چیز سے۔"

قمر صاحب کو تو جواب نہ سوجھا اور کلکٹر صاحب نے ہنس کر کہا۔

"بی بی یہ کوئی ایسی بیش قیمت چیز نہیں ہے۔ گو قمر صاحب ابھی نواب صاحب کے اسسٹنٹ ہیں لیکن گھر کے رئیس ہیں۔ اتنی چھوٹی موٹی چیز ان کیلئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ کو خوشی سے ان کا تحفہ قبول کرنا چاہئے۔"

"بے شک میں شکر گزار ہوں جس قدر خوشی سے انہوں نے دیا ہے اسی قدر خوشی سے میں نے قبول کیا اور چونکہ اس میں آپ کی اور میری چچی کی خوشی بھی شامل ہے میں بہت قدر کے ساتھ ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی۔"

اب رات کی سیاہی پھیل چکی تھی، باغ کے برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے اور پارٹی کے مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ کلکٹر اور قمر صاحب بھی یہاں سے اٹھ کر نواب صاحب کی طرف چلے گئے۔ سالگرہ والی کی سہیلیاں بھی اُٹھ کر چلی گئیں اور وہ باغیچہ کے ایک خاموش کونے میں گلاب کے تختے کے قریب ٹہلنے لگیں۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ آج کے تحفے سرخ انگوٹھی کی بابت کہ کس طریقہ سے قمر نے انگو دی تھی وہ حیران تھی کہ یہ کس طبیعت کا نوجوان ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کا اور ہی خیال ہے۔ میرے والدین بھی رضامند معلوم ہوتے ہیں

اور خود انکا یہ حال ہے کہ کسی وقت مجھ سے نرمی سے گفتگو نہیں کرتے۔ مجھ سے اب برداشت نہ ہوگا۔ میں چچی جمیلہ سے صاف صاف کہدوں گی کہ آپ یہ خیال چھوڑ دیں۔ قمر کا مزاج مجھ کو پسند نہیں۔ یہ انہی خیالات میں محو تھی۔ کل مہمان جا چکے تھے۔ جمیلہ بیگم اور ان کے شوہر آٹھ بجے ڈنر پر آنے کے لئے لباس تبدیل کرنے گھر جانے لگے تو قمر صاحب بھی اُن کے ساتھ اٹھے اور تینوں کار تک آئے جیسے ہی انہوں نے گاڑی میں قدم رکھا۔

جمیلہ نے کہا: ''آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے۔ آج آپ نے اس قدر رنج پہنچایا ہے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نادان بچی بیوقوف ہے۔ آپ کے اس روکھے پن کو نہیں سمجھتی۔ میں بہت شرمندہ ہوئی اور وہ بھی سخت پریشان ہے۔ وہ دیکھو باغ کے اس پرلے کونے میں تنہا ٹہل رہی ہے۔''

بیوی سے یہ سن کر رفیق صاحب بولے۔ ''ہاں بھئی اس کو بہت ناگوار گزرا وہ کس طرح کہہ رہی تھی کہ ایسی بیش قیمت چیزوں سے چار پھول بہتر ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی کہا کہ چونکہ اس میں آپ دونوں کی خوشی ہے اس لئے میں اس انگوٹھی کو اپنے پاس رکھوں گی مگر یہ نہیں کہا کہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھوں گی۔ آپ نے خود اس کے ایک ایک لفظ کے معنی سمجھے ہونگے؟ اب مناسب یہ ہی ہے کہ کچھ دیر یہاں ٹھہر کر اس سے ملو اور منت خوشامد کر کے رضامند کرو آپ کو ڈنر کے لئے سوٹ تبدیل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا ہم انتظام کرتے ہیں کہ یہاں سے جاتے ہی ایک آدمی کو آپ کی کوٹھی بھیج دیں گے۔ وہ آپ کے کھانے کا سوٹ یہاں پہنچادے گا اور یہاں ہی گیسٹ روم میں تبدیل کر لینا۔ اس کا بندوبست ہم کر دیں گے۔''

''آپ کا حکم بسر و چشم منظور مگر بھائی جان جبریہ شادی تو ہوتی سنی ہے مگر جبراً عشق کرتے کبھی نہیں سنا۔ یہ مجھ کو سخت سزا دی جا رہی ہے۔ بہت اچھا آپ چھوڑ جائیں۔''

یہ کہہ کر کار سے الگ کھڑے ہو گئے اور وہ دونوں میاں بیوی فوراً روانہ ہو گئے۔

اب یہ سوچ رہے تھے کہ مس نواب مرزا کے سامنے کیسے جائیں اور کس طرح سلسلہ گفتگو شروع کریں۔ نوجوان تھے سمجھدار تھے لیکن جب دل میں کچھ نہ تھا تو ایک بھولی لڑکی کو دھوکا دینا نہ چاہتے تھے اور جمیل و جمیلہ سے دوستی بھی رکھنا ضروری تھی۔ جمیل کا کلکتہ سے اصرار تھا

کہ یہاں ہی شادی کرو اور جمیلہ نے یہ آخری فیصلہ سنا دیا تھا کہ اگر شادی نہ کرو گے تو ہم تم سے نہ ملیں گے۔ مجبوراً اس گوشۂ چمن کی طرف چلے جہاں وہ ٹہل رہی تھی۔ قریب پہنچ گئے لیکن وہ اپنے خیالات میں اسقدر محو تھی کہ اس کو پتہ نہ چلا۔ وہ تھک کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ قریب ہی دو تین کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ چونکہ پھولوں کا ذکر وہ شام سُن چکے تھے خوشرنگ گلاب کی چند کلیاں جو آدھی کھلی آدھی بند تھیں توڑ کر اپنے ہاتھ میں لیتے آئے تھے۔ دو تین منٹ خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "مس صاحب آپ کسی گہرے سوچ میں معلوم ہوتی ہیں۔ میں اسقدر قریب آ گیا۔ آپ کو آہٹ بھی معلوم نہ ہوئی؟"

ان کی آواز سے انھوں نے سر اونچا کر کے ان کی طرف دیکھا اور چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "پارٹی کے سب مہمان رخصت ہو گئے۔ آپ ابھی تک یہاں موجود ہیں؟"

"جی میں اس لئے ٹھیر گیا کہ اس وقت آپ مجھ سے ناخوش معلوم ہوتی تھیں۔"

"آپ کو میری خوشی اور ناخوشی کا اندازہ کیونکر ہوا؟ جیسی ہمیشہ ہوتی تھی ویسی ہی ہوں اور جیسی بھی ہوں آپ کی بلا سے۔"

"اجازت ہو بیٹھ کر عرض کروں؟"

"ضرور تشریف رکھئے۔ مجھے تو آپ کے اس وقت ادھر آنے پر اس قدر تعجب ہوا کہ بٹھانا بھول گئی۔ کیونکہ آج تک یہ نوازش مجھ پر کبھی نہ ہوئی۔ غالباً چچی صاحبہ نے بھیجا ہوگا۔"

"مجھ کو آج تک یہ علم ہی نہ ہوا تھا کہ آپ مجھ سے ناخوش ہیں۔ آج ہی شام کو شبہ ہوا اسی وقت سے دل پریشان ہے کیونکہ آج آپ کی سالگرہ کا دن ہے۔ آپ کو ہر طرح سے خوش ہونا چاہئے۔ وہ دونوں کھانے کے کپڑے پہننے چلے گئے اور میں آپ سے معافی مانگنے کے لئے ٹھیر گیا۔ میں منت سے عرض کرتا ہوں کہ میری جو بات ناگوار گزری ہو اس کو معاف کر دیں۔ کیونکہ آج خوشی کا دن ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میرا تحفہ ناچیز بھی پسند نہیں۔ نہ ابھی آپ نے پھولوں کا نام لیا تھا لیجئے یہ چند کلیاں گلاب کی جو آپ کے اس وقت کے لباس اور زیورات کے ہمرنگ ہیں۔ اس وقت میری طرف سے سالگرہ کے تحفہ میں قبول کریں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے وہ پھول ان کی طرف بڑھائے تو وہ بولیں۔

"ہاں ہاں خوبصورت وخوش رنگ پھول قبول کیوں نہ ہوتے مگر اپنی عادت کے موافق کسی دوسرے سے دلوادیں۔افسوس یہاں کوئی ہے نہیں میں اپنی آیا کو بلالوں؟"

یہ سن کر قمر صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور ہمت کر کے ذرا آگے بڑھے وہ پھول پیش کئے اور کہا۔

"آپ ناراض نہ ہوا کریں چونکہ آپ بھی ایک ایسے خاندان سے ہیں جو ابتک پابند پردہ ہیں اور میں بھی آج کل کے نوجوانوں کی طرح بے باک و بے جھجک نہیں ہوں اور آپ کا کچھ رعب ایسا طاری ہے کہ دم نہیں مار سکتا۔گو آپ مجھ سے بہت چھوٹی ہیں مگر ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں۔خدا جانے کیوں؟ شاید اس لئے کہ آپ عالی قدر نواب ہیں اور میں غریب۔"

قمر کی ان باتوں کا نواب زادی پر خاص اثر ہوا اور یہ جواب دیا۔

"آپ کے شریفانہ برتاؤ کی میں دل سے قدر دان ہوں۔آج کل کے بے جھجک نوجوانوں سے میں ملنا بھی پسند نہیں کرتی۔یہاں کے بہت سے لوگ میرے شاکی ہیں۔آپ دیکھتے میں میرے دوستوں میں یہاں کی چند لڑکیاں ہیں اور چند مردوں سے عزیزانہ امراسم ہیں وہ صرف چچا ڈپٹی کمشنر صاحب یا سول سرجن صاحب اور آپ۔"

"اچھا یہ خاکسار بھی عزیزوں کے برابر خیال کیا جاتا ہے؟ کوئی ڈپٹی کمشنر ہے کوئی سول سرجن ہے اور یہ ناچیز تو آپ کا ادنیٰ خادم اور نواب صاحب کا خدمت گزار اسسٹنٹ ہے۔اس کو اگر عزیزوں کا درجہ دیا جائے تو زہے نصیب۔"

"انجینئر صاحب اسقدر انکسار کی ضرورت نہیں۔چند دن کو آپ اُن کے اسسٹنٹ ہیں۔بہت جلدی عہدے میں برابر ہو جائیں گے۔اس بات کا دل میں خیال ہی نہ لایئے۔ہاں آپ کی طبیعت میں اس زمانہ کے خلاف کسی قدر خشکی اور سرد مہری پائی جاتی ہے جس کو یہاں کی لیڈیز نے نوٹ کیا ہے اور . . . . آپ سے گھبراتی ہیں۔"

"اوروں سے مجھے مطلب نہیں، لیڈیز اور گرلز مجھ کو جیسا جی چاہے سمجھا کریں۔صرف آپ میری طرف سے اپنا خیال بدل ڈالیں۔آپ مجھ کو ایک ہندوستانی شریف اور شرمیلا خیال کر کے میری کوتاہیوں کو معاف کرتی رہیں ویسے میں آپ کا دل سے قدر کرنے

والا، بلکہ آپ کی بے مثال خوبیوں کا مداح ہوں۔ میرے حالات اور میرے خیالات آپ کو میری بہن جمیلہ کے ذریعے معلوم ہو چکے ہوں گے۔"

پھر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"وہ ناچیز انگوٹھی آپ کی انگلی میں نہیں ہے؟"

"وہ انگوٹھی آپ نے میری انگلی میں ڈالی ہی کب تھی؟"

"مس مرزا آپ جانتی ہیں اپنے ہاتھ سے کسی کو انگوٹھی پہنانا ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ آپ کے خیالات سے ناواقفیت کی حالت میں اپنے ہاتھ سے نہیں پہنا سکتا تھا اگر آپ اس کو پسند کرتی ہیں تو میں حاضر ہوں لائیے وہ انگوٹھی میں اب پہنا دوں مگر یہ خیال رہے کہ اسوقت کی پہنی ہوئی عمر بھر اس نازک انگلی سے نکالی نہ جائے گی، کہیے منظور ہے؟"

اس کے جواب میں نواب زادی سے کچھ نہ بولا گیا۔ شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا تو خاموشی کے ساتھ اپنے رومال کے کونے سے بندھی ہوئی وہ سرخ انگوٹھی کھول کر قمر کو دے دی اور وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر گھاس پر دوزانو بیٹھ گئے اور ان کی انگلی میں پہنا دی اور پھر کہنے لگے۔

"امید کرتا ہوں کہ اس وقت کے بعد سے ہم دونوں میں اچھے تعلقات انشاءاللہ قائم رہیں گے۔ جبل پور کی آزاد بے باک لڑکیاں آپ کو کسی قدر میری جانب سے بدظن کرنے کی کوشش کریں گی۔ امید ہے اب آپ پر کچھ اثر نہ ہوگا کیونکہ آپ جانتی ہیں کہ میں پرانی طرز کا انسان ہونے کی وجہ سے اس زمانہ کی نمائشی باتوں کے اظہار سے قاصر ہوں۔ میں تو اپنے دل کو اب مطمئن پاتا ہوں۔ کہیے آپ کو بھی اس خاکسار پر کچھ اعتماد ہوا؟ وقت بہت گزر گیا ہے۔ کھانے پر جانے کی تیاری کرنا ہے۔ کچھ تو بولیے اور میری فروگزاشتوں یا نادانستہ خطاؤں کو معاف کیجیے۔

یہ کہہ کر قمر صاحب زمین سے کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی کرسی سے اٹھیں اور کہا۔

"آپ کو تو لباس تبدیل کرنا ہے کوٹھی جائیں گے؟"

"ہاں ابھی یہ کام بھی درپیش ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ مس صاحبہ میں بہت خوش ہوا اس وقت آپ سے مل کر۔ میں ایسی ہی شرمیلی طبیعت کا متلاشی تھا۔ جیسی خدا نے عطا کی۔

آج کل کی آزاد لڑکیوں سے بہت گھبراتا ہوں۔ ان مغرب زدہ طبیعتوں سے خدا بچائے۔ اب کھانے پر چلیں گے۔"

یہ کہہ کر رخصت ہوئے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں اور قمر گیسٹ روم میں آئے سوچ رہے تھے کہ آج سے پابند ہو گئے۔ گو پہلے بھی آزاد نہ تھے مگر گرفتار بھی نہ تھے۔ خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ اس پری وش لڑکی کی میرے دل میں بے پایاں محبت دے۔ دھوکہ سے کام نہ چلے گا۔ اس سے بہت خوش تھے کہ اس کے دل میں ان کی محبت تھی۔ اب یہ قصہ جیلہ کو سنانا تھا۔ وہ دونوں آ گئے۔ کھانے پر سب جمع ہوئے۔ دو گھنٹے وہاں صرف ہوئے اس کے بعد یہ تینوں گھر آئے۔ رفیق صاحب نے خفیہ ملاقات کے حالات سننے کے لئے قمر صاحب کو بھی اتار لیا۔ تینوں ڈرائنگ روم میں آئے۔ دونوں بے تاب تھے سننے کے لئے۔ انہوں نے لفظ بہ لفظ اپنی اور اس کی گفتگو سنا دی۔ انگوٹھی اپنے ہاتھ سے پہنانے اور عمر بھر نہ اتارنے کا وعدہ لینے کا حال سنکر جیلہ خوش ہو گئیں اور قمر سے بات چیت شروع کر دی۔

رفیق صاحب نے کہا "ہو سمجھ دار اور بڑے شریر بھی۔ ایک لفظ زبان سے محبت کا نہ نکالا اور شرافت ہی شرافت میں کام بنا لیا۔ وہ غریب بھولی بچی تمہاری شرارت کو کیا جانے خوش ہو گئی۔"

"واہ بھائی جان میری نیکی اور عقل مندی کو آپ نے شرارت سمجھا۔ شکریہ اگر اب بھی عام بے لگام بد اخلاق نوجوانوں کی طرح ایک معزز شریف زادی سے نادلانہ گفتگو کرتا تو آپ اس کو پسند کرتے؟ اب جو نیکی اور سچائی سے کام لیا تو شرارت خیال کی گئی مگر وہ اس طرز عمل سے بہت خوش ہوئی ہیں۔ آپ دیکھئے وہ بہت نیک اور سنجیدہ مزاج لڑکی ہے۔ مردوں سے بہت کم ملتی ہے۔"

"یہ سب کچھ تو ہوا اتنا بتائیے کہ اس نئے خیال اور اس کی ملاقات کا آپ کے پتھر دل پر بھی کچھ اثر ہوا؟ وہ تو اس قدر حسین اور اچھی لڑکی ہے کہ ایک ہی نظر میں دیکھنے والوں کا کام تمام کر دینے کی قابلیت رکھتی ہے۔ آپ تو ایک عرصے سے مل رہے ہیں۔ اب اس کے ساتھ محبت کرنی چاہئے۔ تم کیسے انسان ہو؟ کیا یورپ میں کسی سے محبت اور اس

سے وعدہ کر آئے ہو؟"

اب جمیلہ بیگم بولیں: "رفتہ رفتہ سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اب انشاء اللہ اس کو اپنی چیز سمجھ کر جلدی ہی محبت ہو جائے گی۔ ہم مشرق والوں کا قدیم شریفانہ دستور یہ ہی ہے۔ شادی پہلے ہوتی ہے محبت بعد میں۔ آپ کا اپنا کیا ہوا تھا۔ ہماری محبت بھی تو شادی کے بعد ہی پیدا ہوئی۔"

رفیق صاحب نے جواب دیا: "یہ نہ کہیے ہم تو اس پہلی ملاقات میں ہی دیوانے ہو گئے تھے۔ جو بے چارے جمیل بھائی نے بہت مشکل سے سینما میں کرائی تھی۔ لوگ تماشہ دیکھ رہے تھے اور ہم تمہیں۔"

بیوی بولیں: "آپ کو ہو گئی ہوگی۔ ہم پر اس ملاقات کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ ہاں بیاہ کے بعد آپ کے اچھے سلوک کا اثر ہوا۔ بس پھر تو بڑھتی چلی گئی۔"

رفیق صاحب نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ پھر بھی ہو گئی اگر مجھ سے کسی طرح بھی محبت نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ کیونکہ ہم سے زیادہ چاہنے والا آپ کا بھائی جمیل تھا اگر ان کے خیال میں تمہارا دل مجھ سے نہ ملتا تو ہم دونوں کے لئے قیامت تھی۔"

یہ سن کر جمیلہ نے ہنس کر کہا: "آپ کی یہ طنز ہمیشہ رہتی ہے۔ کیوں جی! شادی ہو جانے کے بعد مجھ کو کیا حق تھا کہ بھائی جمیل کا خیال اپنے دل میں رکھتی؟ اب جس کو دے دی گئی، اس کی ہو گئی اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔"

شوہر نے کہا: "جی ہاں ہوتا ہے اگر شادی کے قبل لڑکا یا لڑکی کسی اور سے محبت کرتے ہوں اور شادی دوسری جگہ ہو جائے تو دونوں کی زندگی عذاب ہوتی ہے۔ شریف اور نیک میاں بیوی تو رو دھو کر بسر کر لیتے ہیں اور بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے خلاف بزرگوں کا حکم نہیں مانتیں اور اپنے چاہنے والوں کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔ ان لڑکے اور لڑکیوں سے جو کچھ سرزد ہوتا رہتا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ معزز خاندانوں کی عزت برباد ہوتی ہے۔ شادی ہمیشہ لڑکے اور لڑکی کی مرضی سے ہونی چاہئے۔"

جمیلہ نے کہا: "درست ہے کہ لڑکے لڑکی کی رائے سے رشتہ کرنا ضروری ہے لیکن بعض ایسی دقتیں پیش آتی ہیں کہ ان کے خلاف بھی کرنا پڑ جاتا ہے ورنہ عام طور پر اس زمانہ

میں لڑکیوں کی رائے کا خیال بہت رکھا جاتا ہے مگر لڑکے لڑکیوں کو بھی چاہئے کہ اپنے خاندانی حالات اور والدین کی مجبوریوں کا خیال کر کے اپنے میں قوت برداشت پیدا کریں۔دلوں پر جبر کرنا سیکھیں۔والدین کی ضد اور ان کے مقابلہ پر نہ تیار ہو جائیں اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ بچپن سے ان کی تربیت ہی کی جائے اور ان حالات میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا اثر بہت کام آتا ہے۔انسان کے لئے اپنی پسند کی ایک چیز کو چھوڑ کر صبر کر لینا بہت آسان ہے اگر اس کی اخلاقی حالت بہتر ہو۔اس آزادی کے زمانہ میں جبکہ پردہ اٹھ چکا ہے یا اٹھتا جا رہا ہے لڑکیاں اعلیٰ تعلیم پا کر خود دار اور خود مختار ہو رہی ہیں۔اپنے خلاف ذرا سی بات برداشت نہیں کر سکتیں،وہ جو کچھ بھی کر بیٹھیں کوئی روک نہیں کر سکتا مگر والدین کی بے پرواہیوں سے ان میں یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ ناول پڑھتی ہیں۔سینما دیکھتی ہیں۔ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں مل کر ڈرامے کرتے ہیں۔ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے جو ہم روزانہ دیکھتے اور سنتے ہیں اور یہ سب واقعات نتیجہ ہیں اس کے کہ ہماری اخلاقی حالت بہت کمزور ہے اور یہ کمزوری مذہبی تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے لاحق ہے اور جن گھروں میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں کبھی کوئی بدمزگی و بدامنی پیدا نہیں ہوتی۔ہمارے ہی قدیم طرز کے گھرانے کو دیکھئے جمیل بھائی جان نجمہ کو جان سے زیادہ چاہتے تھے اور ان کے بغیر زندگی محال تھی مگر ان کو کافی طور سے مذہبی تعلیم دی گئی تھی۔ان میں اخلاقی قوت زبردست موجود تھی۔سب کچھ صبر سے برداشت کر گئے اور کس خوبی سے کیا کہ اپنی بیوی کو ایسا خوش رکھا کہ گویا نجمہ ہی مل گئی ہے اگر ہماری قوم ایسے نوجوان پیدا کرے تو تمام اخلاقی گناہ نابود ہو جائیں۔قمر بھائی بھی انہیں کے ہم خیال اور بچپن کے چاہنے والے دوست ہیں۔ان کو اُن کے نقش قدم پر چل کر اپنی اور ایک پر ارمان ہستی کی زندگی کو خوش حال اور پر امن بنانا چاہئے۔خواہ آپ یورپ میں کسی سے محبت کر آئے ہیں یا ہندوستان میں کسی پر جان دیتے ہیں۔اب ان واقعات کو بالکل بھلا کر نئی زندگی شروع کر دینی چاہئے اور ہمارا شکر گزار ہو جانا چاہئے کہ ہم نے ان کو نیک راہ پر لگایا۔"

یہ تقریر سن کر رفیق صاحب نے اپنی بیوی کو چھیڑنے کے لئے کہا:" بالکل درست بیگم صاحبہ آپ کا ایک ایک لفظ قیمتی اور قابل عمل ہے۔خدا ہماری قوم میں ایسی ہی

دھارمک دیویاں پیدا کرے اگر آپ ان خیالات کی نہ ہوتیں تو میری زندگی کیوں کر جنت میں گزرتی؟ لڑکوں میں جمیل اور لڑکیوں میں جمیلہ قابل تقلید مثال ہیں (ہنس کر) اگر جمیلہ اپنے بھائی جمیل کو نہ بھولتیں تو مجھ کمبخت کی جگہ دل میں نہ ہو سکتی۔ پیارے قمر تم بھی بھول جاؤ جس کی یاد دل میں رکھتے ہو۔ اس خانے میں بیوی کو جگہ دو۔"

جمیلہ بگڑ کر بولیں: "آپ ہمیشہ ہم کو بھائی جمیل کا طعنہ دیے جاتے ہیں۔ اب کیا بڑھاپے تک یہ عادت نہ جائے گی۔ ہم صبر کر کے بھائی جمیل سے ملنا بھی چھوڑ دیں گے اور اگر حکم ہو تو بھائی قمر سے بھی نہ ملیں۔"

"بیگم ان دونوں سے ملنا کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ تم شاید برداشت کر لو مگر میں تو ان دونوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

قمر صاحب خاموش پہلے وہ لکچر اور پھر میاں بیوی کی چھیڑ خانی سن رہے تھے۔ آخر گھڑی دیکھی گیارہ بج چکے تھے۔ اٹھے اور دونوں کی طرف دیکھ کر بولے۔

"یہ عاجز گنہگار آپ دونوں کا تہ دل سے شکر گزار ہے کہ آپ نے خاص کوششوں سے اس کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا۔ بس اب میں کسی کا بھی نہیں سوائے بیوی کے۔ دین بیوی۔ ایمان بیوی۔ میری مالک و مختار بیوی۔ وہ اگر حکم دے تو آپ صاحبان سے بھی نہیں مل سکتا۔" یہ کہہ کر اپنی کوٹھی روانہ ہو گئے۔

(۲۴)

جمیل صاحب کی شادی کو آٹھ نو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ اب چار پانچ بچوں کے باپ ہیں۔ بڑا لڑکا اور ایک لڑکی سکول میں پڑھتے ہیں اور ان سے چھوٹے دو بچوں کو گورنس گھر پر پڑھاتی ہے۔

آتے جاڑے اکتوبر کا مہینہ تھا کہ ان کو بیگم حامد صاحب یعنی ہمشیرۂ قمر کا خط ملا، انہوں نے جمیل کو اپنی بڑی لڑکی کی شادی میں پشاور بلایا تھا۔ ان کو جانا لازمی تھا کیونکہ جمیل قمر کی بہن کو اپنی حقیقی بہن سمجھتے تھے۔ جانا تو ان کی بیوی شکیلہ بیگم کو بھی ضروری تھا مگر ان ہی دنوں ان کے ہاں چھٹا بچہ ہونے والا تھا، وہ نہ جاسکیں اور جمیل صاحب تنہا روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پہنچے گاڑی تیار تھی۔ ملازم نے بستر بچھا رکھا تھا۔ اپنا درجہ ان کو بالکل خالی ملا لیکن برتھ پر کسی کا معمولی سا بستر ایک دری بجائے تکیہ کے ایک سیاہ رنگ کا کشن اور ایک کمبل پڑا تھا جس سے ان کو خیال ہوا کہ کوئی مسافر اپنی کسی ضرورت کے لئے اسٹیشن پر اتر گیا ہوگا۔ انہوں نے اپنے کپڑے بدلے اور اخبار لے کر لیٹ گئے۔ غسل خانہ کا دروازہ کھلا اور ایک ہندو سادھنی گیروا ساڑی لپیٹے برآمد ہوئی۔ دروازے کے کھٹکے نے ان کو اس طرف متوجہ کر دیا۔ یہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ تیسرا تو کوئی ہے نہیں رات بھر اس سادھنی کا ساتھ رہے گا۔ ٹرین کلکتہ کا اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔ کسی اور کے آنے کی امید نہ تھی۔ وہ سادھنی غسل خانہ سے ہاتھ دھو کر نکلی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ایک چھوٹی سی ٹوکری نکالی۔ اپنے سامنے ایک نیپکن بچھایا اور کچھ چیزیں نکال کر کھانا شروع کیں۔ اخبار پڑھنے میں کبھی کبھی ان کی نظر اس طرف اٹھ جاتی تھی۔ کھانا ختم کر کے وہ بھی اپنا کمبل بچھا کر لیٹ گئیں اور لانبے لانبے بال برتھ سے لٹک گئے دو گھنٹے تک دونوں پڑھتے رہے اور جب نیند آئی تو وہ چاہتے تھے کہ اب روشنی

نہ رہے لیکن غیریت اور تکلف کی وجہ سے ایک دوسرے سے کہہ نہ سکتے تھے۔ آخر ہمت کر کے جمیل صاحب اٹھے اور ان سے اجازت مانگی۔

''آپ بھی اب پڑھنا ختم کر چکی ہیں اگر اجازت دیں تو میں سبز بلب روشن کر دوں۔''

انھوں نے جواب دیا: ''ضرور کر دیجئے۔'' اور دوسری طرف کروٹ لیکر سو گئیں۔''

گاڑی اپنی تیز رفتاری سے چلتی رہی اور اتفاق کہ رات بھر کوئی تیسرا شخص سوار نہ ہوا۔ صبح کے وقت دو میاں بیوی اور ایک بچہ آئے اور درمیانی برتھ پر ایک گھنٹہ قیام کر کے قریب ہی کہیں اتر گئے لیکن پہلے دونوں مسافر سوتے رہے اور صبح سات بجے جب ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر پہنچی اور کھڑی ہوگئی تو وہ اٹھیں اور غسل خانہ جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ اتنے میں ڈائننگ کار کا بیرا چائے کی کشتیاں لے کر داخل ہوا۔ اب جمیل صاحب بھی اٹھ بیٹھے۔ اُن کا اپنا ملازم بشیر بھی آ گیا۔ اس نے بستر لپیٹا اور جمیل صاحب نے چاء پی، وہ بھی آ گئیں اور چائے پینے لگیں اور کئی بار غور سے جمیل صاحب کی طرف دیکھا۔ سادھنی کو ایسا خیال ہو رہا تھا کہ وہ پہلے بھی مل چکی ہیں اور تھوڑی دیر بعد چائے ختم کر کے وہ غسل خانے گئے اور پورے کپڑے پہن کر آ کے بیٹھے تو انھوں نے پہچان لیا کہ ان کو اس سفر سے پہلے بھی میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ بار بار ان کی نظر بچا کر اس طرف دیکھ لیتی تھیں لیکن ان کی اس طرف کچھ توجہ نہ تھی۔ کسی اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری اور ڈائننگ کار کا بیرا اپنے برتن اور پیسے لینے آیا۔ تب انھوں نے سادھنی کی طرف دیکھا وہ اپنا اٹاچی کیس کھول کر اسکا بل ادا کر رہی تھیں۔ کیس کے حروف پر جمیل صاحب کی نظر پڑی۔ مس این سلیم لکھا دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ نو سال کی مدت گزری اس کا نام سننا اور لکھا ہوا دیکھنا ان کے لئے ناممکن ہو چکا تھا کہ وہ اس دنیا سے گزر گئی ہے اور اگر زندہ ہے تو کسی دوسرے ملک میں چلی گئی ہے مگر اسوقت اس ہندو گیروا لباس اور کھلے بالوں والی جوگن کے بکس پر اپنی بچھڑی ہوئی نجمہ کا نام لکھا دیکھ کر جمیل بے حد حیران ہوئے۔ یہ تو انھیں کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا کہ یہ سادھنی نجمہ ہے۔ اس کے بال انگریزی فیشن کے تراشے ہوئے تھے اور اس جوگن کے لانبے کھلے پڑے تھے۔ نجمہ کا سرُخ وسفید رنگ تھا اور نہایت دُبلی پتلی۔ یہ جوگن زرد گداز جسم اور معمولی گورے رنگ کی

تھی۔ جس میں سرخی نام کو نہ تھی۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ خاتون نجمہ کی کوئی ہندو دوست ہے اور اس کا کیس اس کے پاس ہے جو شاید کبھی نجمہ نے دیا ہوگا یا یہ کوئی اور این سلیم ہیں مگر نام مسلمان کا اور روپ ہندو کا اور وہ بہت الجھن میں پڑ گئے۔ بہر حال انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب اس عجیب لیڈی سے سلسلہ گفتگو شروع کر کے یہ راز معلوم کرنا چاہئے۔ شاید کچھ نجمہ کا پتہ لگ سکے۔ گو یہ مسلمان جوگن بھی بہت حسین ہے مگر نجمہ کہاں؟ بیرا جمیل صاحب سے بھی چائے کی قیمت لے کر چلا گیا اور گاڑی بدستور چلنے لگی اور وہ اخبار اٹھا کر پڑھنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد جمیل صاحب نے ان سے اخبار مانگا اور بیس منٹ دیکھ کر شکریہ کے ساتھ ان کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

"کیا میں آپ سے یہ دریافت کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں؟"

سادھنی نے اپنے چہرے سے بال ہٹا کر جواب دیا۔

"جانا تو بہت دور ہے لیکن فی الحال تو لاہور کا ارادہ ہے۔ وہاں سے کراچی۔"

جمیل فوراً بولے۔ "کراچی، آپ کا دولت خانہ کراچی میں ہے؟"

"جی نہیں کراچی سے جہاز پر سوار ہونا ہے۔ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"میں پشاور جا رہا ہوں۔ ایک دوست کی بھانجی کی شادی میں۔"

"آپ کراچی سے کدھر روانہ ہوں گی؟"

"شاید بغداد۔ وہاں میرے بچا رتن سنگھ جی تجارت کرتے ہیں۔"

یہ سن کر جمیل صاحب کو پورا یقین ہو گیا کہ یہ نجمہ کی کوئی ہندو دوست ہے۔ اب سوال رہ گیا اٹاچی کیس کا۔ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ خواہ نامناسب ہو وہ پوچھ کر رہیں گے اور اس کام کے لیئے وہ ذرا تیار ہوئے لیڈی کی طرف رُخ کر بیٹھے۔ سگار منہ سے نکال کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور ان سے کہا۔

"میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے میری اس جسارت کو بھی معاف کریں گی۔ آپ کا یہ اٹاچی کیس جس وقت سے میں نے دیکھا عجیب شش و پنج میں مبتلا ہوں کیا یہ بکس آپ کی کسی مسلمان دوست کا ہے؟"

"آپ کا مطلب؟"

"میں نے تو اسی لئے پہلے ہی آپ سے معافی چاہی ہے۔ مطلب بھی عرض کئے دیتا ہوں۔ یہ نام جو اس بکس پر لکھا ہے مجھ کو ایک گھنٹہ سے پریشان کر رہا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ بکس آپ کا نہیں ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے پاس کس طرح پہنچا؟ میری ایک عزیز کا نام این سلیم تھا۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ آپ کی بھی دوست ہوں۔"

سادھنی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ مس نجمہ سلیم میری نہایت عزیز دوست تھیں اور کلاس فیلو بھی۔ آہ عرصہ گزرا وہ جدا ہو گئیں اور خدا جانے اب کہاں ہیں۔ یہ کیس انہیں کی نشانی تا زندگی میرے دم کے ساتھ ہے، میں نے تو ان کا نام بھی اس پر سے نہیں مٹایا۔ جی نہیں چاہتا کہ اس نام کو مٹا کر اپنا نام لکھوا لوں۔ آپ کا بھی ان سے کوئی رشتہ تھا؟"

"جی ہاں وہ میری نہایت عزیز دوست تھیں اور بہن بھی۔ افسوس کہ آپ سے بھی بے چاری کا کچھ پتہ نہ چلا۔ معاف کریں میں نے آپ کو تکلیف دی لیکن مجھ کو بہت خوشی ہوئی ہے کہ نجمہ کی ایک عزیز دوست سے سفر میں ملاقات ہو گئی۔"

گھڑی دیکھی دس بج رہے تھے۔ بریک فسٹ کا وقت ہو گیا۔ جمیل صاحب نے ان سے کہا کہ وہ بریک فسٹ ان کے ساتھ کھائیں۔ انھوں نے منظور کر لیا۔ اس وقت دونوں ڈائننگ روم کار میں نہیں گئے ناشتہ یہیں منگا لیا۔ اس وقت سے یہ دونوں آپس میں خوب دوست ہو گئے۔ لنچ کے لئے دونوں ڈائننگ روم کار میں گئے۔ جب وہاں سے لوٹے تو ان کے درجہ میں دو تین مسافر آ چکے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اپنے اپنے برتھ پر کتاب لے کر لیٹ گئے۔ جب شام کے قریب بیرا چائے لے کر آیا تو اٹھے۔ چونکہ درمیانی سیٹوں پر اور لوگ بیٹھے تھے۔ ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ اب رات ہو چلی تھی اور ڈنر کا وقت قریب تھا۔ ان نئے مسافروں میں ایک نوجوان اور دو نوعمر فیشن ایبل لڑکیاں تھیں۔ ڈنر پر جانے کے لئے ان تینوں نے خوب تیاری کی۔ دونوں لڑکیوں نے سنہری چمکیلی ساڑیاں بدلیں۔ لیکن ہماری مردہ دل سادھنی صاحبہ نے بکھرے ہوئے بالوں میں کنگھی

تک نہ کی۔ وہ تینوں اتر کر ڈائننگ کار کی طرف چلے گئے۔ تب جمیل صاحب اٹھے اور جوگن کے قریب آ کر کہا۔

''کیا آپ اس وقت ڈائننگ کار نہ چلیں گی؟ کھانا یہیں منگا لیا جائے۔''

''چلئے۔ جیسی آپ کی رائے۔ میں چلنے کو بھی تیار ہوں۔''

جمیل نے کہا۔ ''مگر آپ نے ابھی کچھ تیاری تو کی نہیں۔ ڈائننگ کار میں بھی کیا اسی حالت میں چلیں گی؟''

جوگن ہنسی اور جمیل کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ''میری کیا حالت ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی فیشن پرستی بہت پسند ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں جو ابھی چوتھی کی دلہن کی طرح سج کر مردوں میں کھانا کھانے گئیں۔ غالباً ان کو دیکھ کر آپ نے مجھ سے یہ سوال کیا۔''

اُن سے یہ سن کر جمیل جو ان کے قریب کھڑے تھے بیٹھ گئے۔ ''نہیں میرا ایسا خیال ہرگز نہیں۔ میں اس قدر بناوٹ کو پسند نہیں کرتا لیکن ایسا بھی تو نہیں ہو سکتا کہ آپ بغیر بال بنائے ہوئے ڈنر پر جائیں اور غالباً یہ جوگیا لباس بھی جو سفر کی وجہ سے زیادہ صاف نہیں رہا ہے۔ آپ کو تبدیل کرنا پڑے گا۔''

''مجھ کو ان باتوں کی چنداں پرواہ نہیں۔ میری یہ حالت سالہا سال سے ہے اور امید ہے آخر وقت تک تبدیل نہ ہوگی۔''

پھر بیرا آیا اور کہا کہ اگر آپ ڈائننگ کار میں نہیں چلتے تو ڈنر یہاں ہی لایا جائے چونکہ گفتگو اس طرح کی تھی جس سے جوگن کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے حکم دے دیا کہ دونوں کا کھانا یہیں لے آؤ۔ چنانچہ کھانا آ گیا اور سلسلہ گفتگو جاری رہا۔ سادھنی نے بتایا کہ وہ بھی ایک غمزدہ عورت ہے۔ وہ بھی نجمہ کی طرح حسرت نصیب ہے۔ جمیل صاحب کو اس سے بہت ہمدردی ہوگئی۔ انھوں نے کہا۔

''مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے مگر آپ کب تک یہ زندگی بسر کریں گی۔ جب وہ ظالم بے درد اپنی شادی کر کے شاد آباد ہو گیا تو آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھائیں۔''

''آپ نے کیا تکلیف دیکھی ہے بشروع شروع جبکہ میرے شوہر نے دوسری شادی کر لی مجھ پر کوہِ غم گرا تھا، بالکل پاگل ہوگئی مدتوں سادھوؤں کی کٹیوں میں زندگی

گزاری بالکل۔ دنیا سے تعلق چھوڑ دیا تھا۔ اب تو پھر دنیا میں آ گئی ہوں لیکن جسکے نام کی جوگن بن چکی بن چکی اور اسی حالت میں دنیا سے اس کے نام پر گزر جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر کھڑکی کی طرف رُخ کر لیا۔ وہ تینوں خوش دل لوگ بھی کھانا کھا کر واپس آ گئے اور تاش کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ دونوں اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور وہ لوگ دس بجے کے قریب اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر اتر گئے۔

جمیل گو لیٹ گئے تھے مگر اس جوگن کی داستان غم سن کر بھلا نیند کہاں آ سکتی تھی۔ دل میں سوچ رہے تھے کہ ان کے حالات قریب قریب نجمہ کے سے ہیں۔ اس غریب کو میری طرف سے رنج پہنچا۔ کامران نے شادی کر لی۔ وہ صدمہ اٹھایا۔ اس کے شوہر نے دوسری شادی کر کے ایسی وفادار بیوی کو تباہ کر دیا۔ نیند نہ آئی اور وہ اٹھ بیٹھے۔ سوچا کہ اب سب باتیں ہوئیں، ہم دونوں بے تکلف دوست بن گئے لیکن ایک دوسرے کے نام سے ناواقف ہیں اگر وہ سو رہی ہیں تو صبح ورنہ ابھی نام معلوم کیا جائے گا۔ انہوں نے دیکھا وہ اٹھیں اور صراحی سے پانی نکال کر پیا تو فوراً بولے۔

"کیا آپ کو نیند آ گئی تھی۔ ان لوگوں نے کس قدر شور مچا رکھا تھا میں تو ایک منٹ نہیں سو سکا۔"

"میں بھی نہیں سوئی اور شام ذکر ہی کچھ ایسا نکل آیا تھا کہ طبیعت پریشان ہو گئی۔"

"مجھ کو خود افسوس ہے کہ ایسی باتیں کیوں ہوئیں مگر آپ کی حالت دیکھ کر سفر دوست ہونے کی حیثیت سے آپ کے حالاتِ زندگی سے کچھ واقفیت حاصل کرنی ضروری تھی مگر افسوس ہے کہ باوجود ہمدرد دوست بن جانے کے ہم دونوں ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے۔ اب تو یہ غیریت کا پردہ بھی اٹھ جانا چاہئے۔"

یہ کہتے ہوئے جمیل صاحب اپنے بستر سے اٹھ کر درمیانی سیٹ پر ساتھی کے قریب جا بیٹھے۔ تب انھوں نے جواب دیا۔

"میرے ہمدرد دوست آپ اس بدنصیب کا نام معلوم کر کے کیا کریں گے؟ جبکہ آج کے بعد پھر کبھی ملنا ہی نہیں۔"

"کیوں نہیں خدا پھر کبھی ملاقات کا موقعہ دے گا۔ مجھے آپ سے زیادہ

خصوصیت یوں ہے کہ آپ میری عزیز بہن نجمہ کی چاہنے والی دوست ہیں۔ آپ نے اب تک میرا نام دریافت نہیں کیا۔ میں خود ہی عرض کئے دیتا ہوں۔ اس خاکسار کو جمیل کہتے ہیں۔ خدا کے لئے اب آپ بھی اخفانہ کریں۔"

وہ شال لپیٹ کر اچھی طرح بیٹھ گئیں۔ کمبل جو پیچھے رکھا تھا اور تکیہ ہٹادیا اور کہا۔

"مسٹر جمیل اس سیاہ بخت کو تارا کہتے ہیں اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس سفر میں خدا نے ایک اچھے ہمدرد رحم دل انسان سے ملادیا مگر افسوس یہ ہے کہ دوبارہ نہ ملوں گی۔ شاید ہم دونوں میں دوستی اور ہمدردی کا سبب بے چاری نجمہ کا خیال ہے جو ہم دونوں کو بہت ہی عزیز تھی۔"

"بالکل درست ہے اسی کے خیال اور محبت کی کشش ہے جو ہمارے دلوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا رہی ہے اور قریب سے دیکھنے کے بعد تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نجمہ کی بڑی بہن ہیں کیونکہ شکل میں بہت کچھ نجمہ سے مشابہت ہے۔"

"ہاں ہم کو دیکھنے والے یہی خیال کرتے تھے کہ نجمہ میری بہن ہے بلکہ اسکول اور کالج میں تو تارا اور نجمہ سگی بہن سمجھی جاتی تھیں۔ اس وقت میرے بھی ایسے لمبے بال نہ تھے۔ بلکہ نجمہ کی طرح میں بھی بال ترشواتی تھی۔"

جمیل نے کہا: "آپ بار بار یہ فرماتی ہیں کہ اب ہم دوبارہ نہ ملیں گے۔ یہ کیوں؟ اگر آپ پسند کریں تو میں ہمیشہ مل سکتا ہوں۔ اس ملاقات کا میرے دل پر اتنا گہرا اثر ہے کہ مدت العمر نہیں مٹ سکتا اگر ہندوستان سے باہر آپ نہ جارہی ہوتیں تو پشاور سے واپسی میں آپ کے پاس ٹھہر سکتا اور زہے نصیب میرے گھر کبھی آپ کلکتہ تشریف لائیں۔"

"میرا بھی جی چاہتا ہے کہ پھر ملوں لیکن اس وقت تو میں آپ کے کلکتہ سے بہت دور سمندر پار جارہی ہوں۔"

جمیل کو باتیں کرنے میں ایسا معلوم ہورہا تھا کہ تارا دیوی جی یکا یک کچھ گھبرا گئیں اور ایسی کہ اپنی پریشانی کو چھپانے کے لئے ان سے کہا کہ "رات زیادہ آگئی ہے آپ آرام کریں۔"

مگر وہ اٹھنا نہ چاہتے تھے۔ ان سے یہ کہہ دیا کہ "آپ لیٹ جایئے میں اخبار

دیکھتا ہوں۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ تو اپنی سیٹ پر جاتے ہی نہیں۔ آخر کچھ دیر سوچ کر وہ اٹھیں اور غسل خانے گئیں جمیل اپنے برتھ پر آ کر لیٹ گئے۔ تارا غسل خانے سے آ کر لیٹ گئیں اور شاید سو گئیں۔ مگر یہ نہ سوئے۔ دو گھنٹے تک کتاب دیکھتے رہے۔ پھر خیال آیا کہ روشنی بہت تیز ہے۔ تارا دیوی جی کو ناگوار ہوگی کھڑے ہو گئے اور سوئچ دبانے ان کی طرف گئے، دیکھا کہ وہ بے ہوش سو رہی ہیں اور ان کے گلے میں ایک سیاہ ڈوری جو زنجیر کی طرح پہنی ہوئی تھی کیونکہ وہ کروٹ سے لیٹی تھی نیچے لٹک رہی ہے اور اس میں ایک تصویر ہے۔ ان کی نگاہ تصویر پر پڑی۔ اس کیطرف جھکے پھر کچھ خیال آیا تو ہٹ گئے لیکن بے اختیار چاہتے تھے کہ اس تصویر کو اچھی طرح دیکھ لوں اس میں کوئی برائی نہیں اگر تارا دیوی کی آنکھ کھل گئی تو کچھ ہرج نہیں۔ تصویر دیکھنے میں کیا بُرائی ہے۔ تارا کے شوہر کی ہوگی جس کے لئے وہ دیوانی ہے اور تارک الدنیا ہوگئی ہے۔ ذرا جھکے اور تصویر کا فریم آہستہ سے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگے۔ وہ فوٹو بالکل ان کو اپنی شبیہ معلوم ہوا۔ بہت حیران ہوئے الٹ پلٹ کر دیکھا واقعی جمیل کی تصویر تھی۔ وہیں نیچے بیٹھ گئے۔ کیا اتفاق ہے۔ تارا کا شوہر میری شکل، ذرا فرق نہیں کیا بات ہے؟ یہ تارا کہیں نجمہ ہی تو نہیں۔ مجھ کو دھوکا دے رہی ہے۔ ضرور ضرور نجمہ ہے۔ مجھ سے بچ کر چھپ کر علیحدہ ہو جانے کے لئے یہ ترکیب ہے۔ شکل بھی نجمہ سے ملتی جلتی ہے۔ ذرا موٹی ہے اور رنگ مدھم ہے، بال بہت بڑے ہیں۔ یا اللہ کیا معمہ ہے۔ پانچ منٹ دیکھ کر جمیل نے فریم کھولا تصویر نکل آئی۔ ایک انچ کا سائز تھا۔ کھڑے ہو کر بلب کے قریب دیکھنے لگے کہ شاید اس پر تارا کے شوہر کا نام لکھا ہو تو شک رفع ہو جائے۔ جوں ہی اس کی پشت پر نظر پڑی۔

"اوہ میں پاگل ہو گیا۔ سخت دھوکا دیا۔"

کہتے ہوئے اسی برتھ پر نجمہ کے پیروں کے قریب بیٹھ گئے مگر یقین نہ آتا تھا کہ یہ نجمہ ہے لیکن تصویر پر اپنا نام اور تاریخ اور کلکتہ لکھا تھا۔ آج سے نو سال قبل کا سنہ اور تاریخ تھی۔ اٹھے اور بے اختیار مدہوش سوتی ہوئی تارا کے سینوں سے چمٹ گئے اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور خوب روئی۔ بہت دیر تک یہ حالت رہی۔ جمیل صاحب خود بے حال ہو رہے تھے۔ لیکن جب اپنی حسرت نصیب جوگن کی بہت حالت خراب دیکھی تو لٹا دیا۔ صراحی سے

پانی لے کر پلایا اور خود اس کے قریب بیٹھ کر کہنے لگے۔

"نجمہ عرصہ دراز کے بعد اتفاقیہ ملاقات ہوگئی تو تم نے اس قدر چھپانے کی کوشش کی کہ سارا سفر ختم ہو جاتا اور مجھ کو وہم وگمان بھی نہ ہوتا کہ یہ خستہ حال جوگن میری ہی نجمہ ہے۔"

"چھپانا کیسا۔ آپ کو پہچانتے ہی میرا ارادہ دوسرے درجہ میں چلے جانے کا تھا۔ لیکن انسان اور پھر نسوانی کمزوری کہ اپنے نو سالہ بچھڑے ہوئے جان سے زیادہ عزیز کو چھوڑ کر یہاں سے نہ جا سکی اور جو کچھ آپ نے کہا مانتی چلی گئی۔ کل سے آپ ہی کی مہمان ہوں۔ یہاں بھی ساتھ کھایا اور ڈائننگ کار تک چلی گئی ورنہ کوئی عورت کسی ہم سفر اجنبی کے ساتھ اس قدر بے تکلف نہیں ہو سکتی۔ آپ بھی دل میں کیا کہتے ہوں گے کہ بناوٹی سادھنی ہے۔ دراصل کوئی بے حد آزاد اور بے باک عورت ہے۔"

جمیل نے جواب دیا: "ہرگز نہیں میں تو دنیا سے بے لاگ خدا پرست دیوی سمجھ رہا تھا کیونکہ ایسے لوگوں کو دنیا کی اونچ نیچ اچھے برے کی پرواہ نہیں رہتی مگر کمال ہے نجمہ مجھ سے تو ہرگز اتنا صبر نہ ہو سکتا لیکن اب جب کہ خدا نے ہمیں زندگی میں پھر ملا دیا ہے۔ تو اب عمر بھر جدا نہ ہونا چاہیے۔"

یہ سن کر نجمہ ہنسیں اور کہنے لگیں: "اسی لئے جمیل صاحب اسی خیال سے میں اپنے کو ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی کہ جب ہماری تقریباً نصف سے زیادہ زندگیاں ختم ہو چکی ہیں اور وہ جوش وخروش وشدت محبت کا زمانہ تڑپ تڑپ کر گزار دیا ہے تو اب آخر وقت میں جب کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے صبر کر چکے ہیں، ساتھ رہنے کا خیال بھی کرنا بے کار اور ناممکن ہے۔ کہئے آپ کے کتنے بچے ہیں۔ اب تو شکیلہ بیگم بالکل اطمینان سے ہوں گی، سالہا سال گزر گئے۔ بدبخت نجمہ ان کی دنیا سے نابود ہو چکی ہے۔"

مگر جمیل صاحب خاموش سنتے رہے۔ پھر جواب دیا: "یہ سب درست لیکن نجمہ ہمارے تعلقات وقتی نہ تھے۔ تم نے تو اپنی زندگی تباہ کر دی، ایک منٹ کے لئے بھی تمہیں نہ بھول سکا۔ میری ہستی ایک مشین ہے جو اپنا کام کر رہی ہے۔ گو میں اپنے کل فرائض زندگی ادا کر رہا ہوں اور دنیا کی نظروں میں خوش حال ہوں۔ بیوی بھی مجھ سے خوش ہے۔ پانچ بچے موجود ہیں اور چھٹا ان ہی دنوں دنیا میں آنے والا ہے اور تمہارا جمیل خاصا خوش نصیب کہا

جا سکتا ہے مگر جو دل پر گزرتی ہے وہ سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ میں تو سمجھ چکا تھا کہ تم زندہ ہی نہیں ہو لیکن جب اسی دنیا میں مصیبت کی گھڑیاں گزار رہی ہوں تو کیوں نہ ایک جگہ رہیں کہ کبھی کبھی مل لیا کریں۔ چلو پھر کلکتہ وہاں کسی گاؤں میں کٹیا بنالو۔ قریب ہوگی تو ایک دوسرے کو دیکھ لیا کریں گے۔"

"اچھا دیکھا جائیگا۔ اس وقت تو میں ایک ضروری کام سے ہندوستان سے باہر جا رہی ہوں۔"

"نہیں جناب اب آپ کو بالکل تنہا نہیں چھوڑا جائے گا کہ پھر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں۔ میں برابر آپ کے ساتھ رہوں گا۔ چلو میرے ساتھ پشاور چلو۔ مسز حامد بہت خوش ہوں گی۔ وہ ہمارے کل حالات سے واقف ہیں۔ وہ نجمہ کو ایک رنگین تیتری مسوری پر دیکھ چکی ہیں۔ اب اس جوگن کو بھی دیکھ لیں۔"

نجمہ نے جواب دیا: "میں پشاور تو نہ جاؤں گی۔ اس وقت تو لاہور اتر جانے دیں، ایک نہایت ضروری کام ہے۔ ہاں واپسی میں جو دن اور تاریخ بتائیں میں آپ کو لاہور اسٹیشن پر مل جاؤں گی۔"

"نجمہ میں تمہارے کہنے کا یقین کیسے کروں پھر مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہو۔ کلکتہ سے کیسے غائب ہوئی تھیں۔ اب کس طرح جوگن تارا بنی رہیں۔ مجھے یقین نہیں۔ اچھا میں شادی میں نہیں جاتا۔ میں لاہور ہی اتر جاؤں گا۔ جہاں تم ٹھیروگی وہاں مجھے بھی ٹھیرا لینا۔ اس کے بعد جہاں جاؤ گی میں ساتھ جاؤں گا۔ جب تم اپنے کاموں سے فراغت پالوگی تب کلکتہ چلیں گے۔" ان کا یہ ارادہ سن کر نجمہ ہنسیں اور کہا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ شعر سنکر جمیل کی شرمسار آنکھیں نیچے جھک گئیں اور وہ عرق ندامت سے تر ہو گئے۔ دس پندرہ منٹ تک خاموش رہے۔ اس کے بعد منفعل نگاہوں سے نجمہ کو دیکھ کر کہا لیکن اگر مقتول میں کچھ جان باقی رہ جائے تو گنہگار قاتل کچھ نہ کچھ تلافی کر سکتا ہے۔ اتنے میں ڈائننگ کار کا بیرا چائے لے کر آ گیا۔ دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ ٹرین ایک اسٹیشن پر

رکی ہوئی تھی تب ان کو معلوم ہوا کہ صبح ہو گئی ہے دونوں نے چائے پی۔ جمیل نے ٹکڑا لے کر مکھن لگا کر نجمہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''دیوی جی آپ نے دنیا تیاگ دی اور جوگن کا لباس اختیار کیا لیکن ابھی تک حج کا خیال نہ آیا؟ جو ہر ایک زمانے کے ستائے ہوئے مسلمانوں کو سب سے پہلے سوجھتا ہے۔''

''آپ کو کیا معلوم کہ آپ کی یہ گہنگار جوگن دو بار فریضہ حج ادا کر چکی ہے۔ علاوہ اس کے ممالک اسلامی کی سیاحت بھی کر چکی ہے اور زندگی کا مشغلہ ہی کیا تھا؟ جمیل صاحب آٹھ سال میں ہندوستان سے باہر رہی ہوں۔ اسی سال واپس آئی تھی۔ چچا جان بہت بیمار تھے ان کو دیکھنے اور اپنی جائداد فروخت کرنے کے لئے۔ یہاں پہنچے ابھی سال بھر نہیں گزرا کہ آپ کی زیارت نصیب ہو گئی۔''

جمیل نے کہا: ''بہت ہی اچھا ہوا آپ کو اپنے مرشد کی زیارت نصیب ہو گئی اور اس بے چارے کو بھی اپنی دیوی مل گئی۔ اب آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں لاہور اترتا ہوں۔ مسز حامد کو تار دے دوں گا کہ میری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ شادی میں شریک نہیں ہو سکتا۔''

''نہیں نہیں۔ ایسا ہرگز نہ کریں آپ شادی میں جائیں میں لاہور چھ دن رہوں گی اور جس دن آپ کا تار ملے گا اسٹیشن پر حاضر ہو جاؤں گی۔ میں بھی اب خانہ بدوش زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ چلئے کچھ دن کے لئے کلکتہ ہی چل کر رہوں گی۔''

جمیل اس وعدہ سے بہت خوش ہوئے۔ لاہور تک کا سفر خوشگوار رہا۔ برابر باتیں ہی ہوتی رہیں۔ غریب نجمہ بھی بہت خوش تھی کہ زندگی میں جمیل کو ایکبار اور دیکھ لیا۔ جمیل سے اس کے بچوں کی تصویر لے کر دیکھی جو وہ بیگم حامد کو دینے کیلئے لے جا رہے تھے۔ نجمہ نے لے کر واپس نہ دی۔ جمیل نے ہر چند چاہا کہ لاہور اتر کر ان کی جائے قیام دیکھ لے مگر نجمہ نے لاہور اترنے کی کسی طرح اجازت نہ دی۔ جمیل کے بے حد اصرار پر انہوں نے پختہ یقین دلا دیا کہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر مل جاؤں گی۔ ان دونوں کا سارا دن اسی طرح باتوں میں کٹا اور ٹرین کی دوسری رات بھی بیٹھ کر بسر کی، جب گاڑی امرتسر پہنچی تو جمیل صاحب بہت بے چین ہو گئے کہ اب لاہور قریب ہے۔ نجمہ جانتی تھی کہ لاہور کے بعد ان سے چاء نہ پی جائے

گی۔اس لئے خود کہا کہ "چائے یہیں منگوا لینی چاہئے۔" مگر انھوں نے جواب دیا کہ "آپ لاہور اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر پی لیجئے۔ میں تو اس وقت نہ پیوں گا۔بالکل جی نہیں چاہتا۔" ان کا ملازم آ گیا اس نے بستر وغیرہ درست کیا اور ان کے حکم سے نجمہ کا سامان بھی ٹھیک کر دیا۔ بستر ابھی تک نہ بندھ سکا کہ وہ اپنے کمبل پر بیٹھی تھیں۔بشیر ملازم کے جانے کے بعد جمیل صاحب درمیانی سیٹ سے اٹھ کر نجمہ کے پاس بیٹھ گئے اور بہت ہی غمگین لہجہ میں کہا۔

"نجمہ اب ہماری یکجائی کا صرف ایک گھنٹہ باقی ہے گو آپ وعدہ کر رہی ہیں کہ آج سے چھٹے دن ضرور مجھ سے اسٹیشن لاہور پر ملیں گی لیکن مجھ کو کچھ امید نہیں کہ ایسا ہوگا۔ اب پھر ہمیشہ کی جدائی کے خیال سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ میں تو شادی کی شرکت بھی چھوڑنے کو تیار تھا اگر آپ اجازت دیتیں۔"

نجمہ نے جو خود سر جھکائے ہوئے غمگین بیٹھی تھی جواب دیا۔

"آپ ناحق مجھ پر بدگمانی کرتے ہیں۔میری بات کا یقین نہیں آتا۔آہ! آپ کو اس کا اقرار جھوٹا معلوم ہوتا ہے جس نے اپنی زندگی آپ کے نام پر قربان کر دی۔میری تو خود دلی آرزو ہے کہ عمر کا آخری حصہ آپ کے قدموں میں نہیں تو آپ کے قریب بسر ہو جائے۔"

یہ کہہ کر رونے لگی۔جمیل بھی بے حد رنجیدہ و پریشان تھے۔وقت گزر رہا تھا،گاڑی تیز رفتاری سے لاہور پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ دونوں چاہتے تھے کہ ٹرین ابھی لاہور سے کوسوں دور رہے تو اچھا ہے۔جمیل صاحب نے کھڑکی سے دیکھا تو لاہور کی بڑی بڑی عمارتیں نظر آنی شروع ہو گئی تھیں جن کو دیکھتے ہی وہ بے چینی سے کھڑے ہو گئے اور کہا۔

"اٹھو نجمہ لاہور پہنچ گئے۔میں تمہارا بستر باندھ دوں۔"

نجمہ اٹھیں رومال سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔بکھرے ہوئے بال چہرے سے ہٹائے اور گھبرا کر باہر کی طرف دیکھا۔واقعی لاہور تھا۔گاڑی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی اسٹیشن پر پہنچ رہی تھی۔

جمیل صاحب نے بے چاری جوگن کا بستر جو صرف ایک کمبل دری اور ایک کشن تھا،تینوں چیزیں لپیٹ دیں۔ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی ٹھہر گئی۔بشیر ملازم آ گیا تھا۔اس

نے نجمہ کا سامان قلی کو دیا۔ وہ دونوں بھی نیچے اترے اور نجمہ کے منع کرنے پر وہ ان کو سوار کرانے اسٹیشن سے باہر آئے، ایک ٹیکسی کی اور ان کو بٹھا دیا اور نجمہ سے کہا کہ "اب شوفر کو بتا دیجئے کہ کہاں لے جائے؟"

نجمہ نے شوفر سے کہا کہ "نسبت روڈ چلو۔" پھر جمیل سے۔

"خدا کے سپرد اب آپ جائیے ٹرین نہ چھوٹ جائے۔"

جمیل صاحب کار سے باہر کھڑکی کے قریب کھڑے تھے اور نجمہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ نجمہ سے یہ سن کر کہ "اب آپ جائیے" ایک بار پھر کہا۔

"میں اس وقت ٹھیر جاؤں اور رات کی ٹرین سے چلا جاؤں۔ بشیر کے ساتھ سامان اسی ٹرین سے جانے دیا جائے۔"

"جمیل صاحب آپ کو میری قسم فوراً جائیے ٹرین چل دے گی۔ پانچویں دن اسی جگہ ملیں گے۔"

یہ سنتے ہی وہ فوراً گاڑی سے علٰحدہ ہو گئے اور دوسری طرف منہ پھیر کر تیز قدموں سے چل دیئے۔

(۲۵)

خلیل منزل میں چوتھے پوتے کے عقیقے کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ بہت سے مہمان جمع ہیں۔ حسب معمول ناچ رنگ دعوت کا اعلیٰ پیمانہ پر انتظام ہے۔ بڑے سیٹھ صاحب باہر کمرے میں اپنے بیٹے جمیل سے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ ملازم نے ایک تار پیش کیا جس کو پڑھ کر وہ کہنے لگے۔

''لو جبل پور سے جمیلہ رفیق اور تمہارے دوست قمر مع اپنی بیوی کے آج دوپہر کو پہنچیں گے۔''

یہ خوش خبری سن کر جمیل کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔ جلدی سے تار اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور خود ایک نظر دیکھ کر کہا۔

''قمر صاحب نے تو لکھا تھا کہ مجھے چھٹی نہیں ملتی مگر جمیلہ کی کوشش کامیاب ہوئی۔ وہ دونوں میاں بیوی کو ساتھ لا رہی ہے۔'' پھر ایک کرسی پر قریب بیٹھ گئے اور باپ سے کہا۔

''میں اس وقت یہ عرض کرنے کو حاضر ہوا تھا کہ آپ نے شاید اس طرف توجہ نہیں فرمائی ہمارے منیجر صاحب نے بے ضرورت ٹائی پسٹ لڑکیاں بھر لی ہیں۔ پہلے کچھ کم تھیں کہ اس ہفتہ میں انھوں نے تین کا اور اضافہ کر لیا ہے۔'' بیٹے کا یہ اعتراض سن کر سیٹھ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔

''تمہارا خیال درست ہے۔ ان لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے لیکن میں نے منیجر کو منع نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ چند کمسن شوخ اور شریر کرسچن لڑکیوں کو علیحدہ کر دیا جائے اور ان کی جگہ جو نئی تین مقرر کی گئی ہیں۔ ان کو رکھا جائے جس دن منیجر صاحب نے ان کو پیش کیا تھا، میں نے غور سے دیکھا معلوم ہوتا ہے یہ تینوں شریف اور سنجیدہ ہوں گی اور کتنی اچھی

بات ہے کہ یہ تینوں ہندو اور مسلمان ہیں۔ عمریں بھی ان کی ان شریر لڑکیوں سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ دو تو بنگالی ہیں۔ ایک پنجاب یا فرنٹیر کی ہے۔ میرے آفس میں جو لڑکی اینتھل کام کرتی ہے۔ اس کی چلبلاہٹ مجھ کو سخت ناگوار ہے۔ اس کو آج ہی علیٰحدہ کر دیا جائے گا۔ ایک تو وہاں کام کرے گی اگر ضرورت ہو تو ایک کو تم اپنے آفس میں رکھ لو اور اینگلو انڈین دو لڑکیاں اور علیٰحدہ کی جانے والی ہیں۔ ایک ان کی جگہ منیجر کے آفس میں کام کرے گی۔ کیا تم نے ان تینوں نئی مقرر شدہ لیڈیز کو نہیں دیکھا۔

''میں نے صرف ایک کو دیکھا ہے۔ سیاہ رنگ مس گھوش جس کا نام ہے عمر بھی چالیس کے قریب ہوگی۔ دو ابھی نہیں دیکھیں۔ مس گھوش منیجر آفس میں کام کر رہی تھی۔''

سیٹھ صاحب بولے۔ ''اچھا جاؤ ان تینوں نئی لیڈیز کو دیکھو۔ ان سے بات چیت کر کے ان کی قابلیت کا اندازہ کرو۔ ان میں سے سنا ہے ایک بی اے ہے۔ میں موجودہ چھوکریوں کو علیٰحدہ کرنا چاہتا ہوں اور ان کی جگہ شریف اور تعلیم یافتہ عورتیں تلاش کر کے مقرر کی جائینگی۔ خواہ تنخواہوں میں اضافہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ جب تعلیم یافتہ آئینگی تو وہ زیادہ ہی لے گی۔ ان کم بختوں نے آفت مچا رکھی ہے ہر وقت آئینہ ہاتھ میں ہے۔ پوڈر اور بال درست کرتی رہتی ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا ان تینوں کے چہروں پر پوڈر نہ تھا۔''

جمیل نے یہ سن کر دل میں کہا۔ اوّل تو ان کی عمریں زیادہ بتاتے ہیں۔ اس پر رنگ سیاہ بھلا وہ پوڈر کیا لگاتیں۔ پھر سیٹھ صاحب کو سلام کر کے کام دیکھنے چلے گئے۔ دل خوشی سے اچھل رہا تھا کہ آج ان کے عزیز از جان دوست قمر اور بہن جمیلہ آ رہے ہیں۔ یہاں سے وہ سیدھے منیجر کے آفس میں آئے اور تینوں نئی مقرر شدہ عورتیں بلوائی گئیں۔ پردہ ہٹا اور وہ داخل ہوئیں۔ تینوں کی سفید سوتی ساڑیاں تھیں۔ دو کے رنگ سانولے تھے اور ایک کا سفید۔ ان دونوں مس گھوش و مسز بوس کی عمریں چالیس کے قریب تھیں اور تیسری بتیس تینتیس سال کی معلوم ہو رہی تھی۔ تینوں کے چہرے باوقار نظر آ رہے تھے اور گفتگو سے بھی جمیل صاحب نے اندازہ کیا کہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان سے مل کر جمیل صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ انہیں اسی طرح بٹھائے رکھیں۔ وہ بھی تنگ آ چکے تھے اُن پہلی کم علم شوخ اور شریر لڑکیوں سے۔ انھوں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اپنے آفس میں بھی ان ہی میں سے

ایک کو لے جائیں گے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہو گیا کہ مس گھوش بی اے ہیں اور مسز بوس بھی بی اے تک پڑھی ہیں اور ایک سکول میں ٹیچری بھی کر چکی ہیں اور تیسری مسلمان مس خان ایم اے ہیں۔ ان کو بہت افسوس ہوا کہ ایسی قابل بیبیاں اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر ایسے چھوٹے چھوٹے کاموں کو قبول کر رہی ہیں اور انھوں نے ارادہ کر لیا کہ میں ان کو بہت جلدی ترقی دونگا۔ انھوں نے منیجر کو قریب بلا کر آہستہ سے کہا کہ۔

"ان تینوں میں سے جن صاحبہ کو سیٹھ صاحب نے حکم دیا ہو ان کے آفس میں بھیج دیا جائے۔ باقی یہیں رہیں۔ وہ تمہارے اور ہمارے کام کر لیں گی۔"

منیجر نے کہا: "بہت سی لڑکیاں برخاست کر دی گئی ہیں۔ ان کے جانے سے دفتر کا کام رُکا پڑا ہے۔ آپ جلدی فیصلہ فرما دیجئے کہ یہاں کس سے کام لیا جائے؟"

"یہ کل بتا دیا جائے گا۔ آج دونوں سے یہیں کام لیا جائے۔ ہمیں اسٹیشن جانا ہے۔ جبل پور سے مہمان آ رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ ان کے اٹھتے ہی وہ تینوں بھی کھڑی ہو گئیں۔ بیرسٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے انھیں بیٹھنے کو کہا اور کمرے سے چلے گئے۔

اب منیجر نے مس گھوش صاحبہ بی اے کو بڑے سیٹھ صاحب کے آفس میں بھیج دیا اور باقی دونوں کو اپنے ہاں کام پر لگا دیا اور خود بھی اپنی میز پر چلے گئے۔ تب ان دونوں نے آہستہ آہستہ آپس میں باتیں شروع کیں۔

مسز بوس نے کہا: "خدا جانے ہماری قسمتوں کا کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ منیجر صاحب کی خدمت میں کون رہے گی اور بیرسٹر صاحب کے آفس میں کون جائیگی۔"

مسز خان نے جواب دیا: "اگر منیجر صاحب نے مذہبی خیال سے کام لیا تو آپ کو اپنے ہاں رکھ لینگے اور مجھ کو روانہ کر دیں گے۔"

اس پر مسز بوس نے مسکرا کر کہا: "اور اگر معیار انتخاب صورت ہے تو آپ کو ہرگز نہ جانے دیں گے۔"

مس خان بولیں: "وہ! میں بڑی حسین ہوں کہ تیس سال سے تو عمر اوپر آ گئی۔ بہر حال میں نوجوان بیرسٹر کی خدمت میں جانا بھی نہیں چاہتی۔ یہ بڑا آفس ہے کئی عورتیں

اور لڑکیاں کام کر رہی ہیں۔ یہاں کوئی ہرج نہیں مگر بہن سنا گیا ہے کہ بیرسٹر نہایت شریف نوجوان ہیں اور پھر ان کی شادی ہو چکی ہے۔ آج ان کے بچے کی پیدائش کی خوشی ہے۔ سنا ہے بڑی دھوم دھام ہے۔ میں تو اس تقریب کو دیکھنا چاہتی تھی۔ ابھی ہم نئے ہیں اور ان کے محل میں آنا جانا بھی نہیں ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔"

مسز بوس نے کہا: "ہاں انتظامات تو بڑے ہیں۔ کل شام کو ہم ادھر سے گزرے تھے۔ ان کا شاندار محل پھول پتی سے خوب سجایا گیا ہے اور روشنی کا بھی بہت انتظام ہے لیکن ہم لوگ ابھی نہ جا سکیں گے۔"

پھر بولیں: "ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ بیرسٹر صاحب کے بچوں کی گورنس مسز پال میری بہت دوست ہیں۔ آج اگر مسز پال سے ملاقات ممکن ہو سکے تو وہ ہم تینوں کو اپنی دوست بنا کر لے جا سکتی ہیں۔"

کوئی دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ پھر ایک کار آ کر رکی اور بیرسٹر صاحب آفس میں تشریف لائے اور منیجر سے کہا۔

"ہمارے پاس چند مہمان آ رہے ہیں، ہمیں دو چار روز بالکل فرصت نہ ہوگی، آپ خود ہی منتخب کر کے ایک ٹائی پسٹ لیڈی کو میرے آفس میں بھیج دیں۔"

منیجر نے مودبانہ جواب دیا۔ "حضور اس کا فیصلہ تو آپ ہی کریں تو بہتر ہے۔ خود اس طرف تشریف لے جائیے اور وہ دونوں کام کر رہی ہیں۔ تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد جو زیادہ قابلیت سے کام کرتی نظر آئے اس کو ادھر بھیج دیں۔ یہ سن کر ہمت کر کے جمیل صاحب اس کونے والی میز کی طرف آئے۔ جہاں وہ کام کر رہی تھیں۔ اب بڑی مشکل درپیش تھی۔ نہ معلوم کیوں وہ مس خان کو اپنے آفس میں رکھنا چاہتے تھے مگر چونکہ وہ ان دونوں سے عمر میں بھی کم تھیں۔ اسلئے اپنی زبان سے کچھ کہنا اچھا نہ لگتا تھا۔ بہت کوشش کی کہ مرضی کے مطابق کہہ دوں مگر نہ ہو سکا اور اس کا فیصلہ انھوں نے ان ہی دونوں عورتوں پر چھوڑا۔ چند منٹ خاموش ان کا کام دیکھتے رہے پھر کہا۔

ہمارے آفس میں بھی ضرورت ہے۔ آپ دونوں میں سے کسی ایک کو اس طرف کام کرنا چاہئے۔ یہ حکم سن کر مس خان تو اس طرح نظریں مشین پر جمائے ہوئے کام میں

معروف رہیں لیکن پختہ کار مسز بوس نے جواب دیا۔
"جس کے لئے جناب کا حکم ہو وہ اس آفس میں پہنچ جائے۔"
بیرسٹر صاحب نے کہا۔" اس کا فیصلہ آپ لوگ خود کر سکتی ہیں۔ میرے آفس میں صرف ایک کو کام کرنا ہوتا ہے۔ یہاں کا کام بہت زیادہ ہے لیکن کرنے والیاں بھی کئی ہیں جو جس کام کو پسند کریں وہ اپنے ذمہ لے لیں۔ یہ سنکر بھی مس خان اسی طرح خاموش رہیں اور مسز بوس نے اپنی ساتھن کی طرف دیکھ کر کہا۔
"مس خان آپ مجھ سے زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہیں۔ میرے خیال میں بیرسٹر صاحب کے آفس میں آپ کا جانا مناسب ہے۔ میری مدد کو تو اور یہاں کئی لڑکیاں موجود ہیں۔"
مسز بوس کا یہ فیصلہ سن کر جمیل صاحب بہت خوش ہوئے اور" تھینک یو" کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے کیونکہ انہیں اسٹیشن جانا تھا۔ ان کے جانے کے بعد بوڑھا منیجر فوراً ان لوگوں کی طرف آیا اور گھبراہٹ سے دریافت کیا۔
"بیرسٹر صاحب کیا حکم دے گئے؟"
مسز خان نے سر اٹھا کر فوراً جواب دیا:" ان بے چارے نے کچھ نہیں کہا۔ مسز بوس صاحبہ نے اپنے لئے یہیں رہنا پسند کیا ہے اور مجھ کو ادھر کو دھکیلا ہے۔"
یہ سن کر منیجر صاحب کچھ مسکرائے اور کہا:" چلو اچھا ہوا جو کچھ ہوا مسز بوس صاحبہ سمجھدار ہیں اور اپنی اسسٹنٹ لڑکیوں سے بڑی بھی۔ ان لوگوں کو خوب قابو میں رکھیں گی۔"
اب منیجر کے حکم سے مس خان جمیل صاحب کے آفس میں پہنچا دی گئیں۔ گو جمیل صاحب بہت مصروف تھے اور خوش بھی کیونکہ جمیلہ اور قمران کے پاس تھے اور نہ صرف اکیلے قمر بلکہ ان کی حسین اور جمیل بیوی بھی۔ تاہم خدا جانے ایسی کیا کشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان سب کی نظروں سے بچ کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے آفس آئے۔ دیکھا کہ مس خان اپنے کام میں مصروف ہے۔ اس کی میز کے قریب آ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔
"مس خان چار بج چکے آپ ابھی تک مصروف ہیں۔ کام ختم کیجئے اس قدر محنت کی تو آپ گھبرا جائیں گی اور بے چاری مسز بوس پر غصہ آئے گا کہ انہوں نے یہاں کیوں

بھیج دیا۔"

مس خان نے نگاہیں نیچی کئے جواب دیا:" کچھ زیادہ کام نہیں دفتروں میں پانچ اور چھ بجے تک کرنا پڑتا ہے۔ میں تو مسز بوس کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایسی خاموش جگہ بھیج دیا۔ تنہائی میں جو مجھ کو بے حد پسند ہے۔ یہاں بڑے آرام سے کام کروں گی۔ وہ تو ایک میدان حشر ہے۔ بہت سے کلرک، مشینوں کی کھٹا کھٹ، میں تو پاگل ہو جاتی۔"

مگر اسوقت تو آپ نے کچھ نہ کہا۔ جب کہ فیصلہ آپ دونوں ہی پر چھوڑ دیا تھا؟"

"اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ مالک کے حکم پر منحصر تھا۔ اب بھی اگر ادھر بھیج دیا جائے تو انکار نہیں۔"

بڑی ہمت سے جمیل صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کا جواب دیا:" اب تو یہ ناممکن ہے جب تک آپ پسند کریں، یہ آفس آپ کا اپنا ہے۔"

جمیل صاحب نے گھڑی دیکھی سوا چار ہو چکے تھے۔ ان کو خیال آیا کہ جمیلہ اور قمر چاء کا انتظار کر رہے ہونگے لیکن مس خان کا نام تک معلوم نہ تھا کچھ دیر ٹھہر کر کہا۔

"آپ کلکتہ کی رہنے والی ہیں یا کہیں باہر سے تشریف لائی ہیں؟"

"مجھ کو کلکتہ آئے تھوڑے ہی دن ہوئے۔ میرا وطن تو کبھی پشاور تھا۔ والدین کا انتقال ہو گیا جس طرح ہو سکا حالت یتیمی میں میں نے کالج کی تعلیم پوری کی اور ٹیوشن کر کے ایم اے کیا۔ کئی جگہ سکولوں میں ٹیچری بھی کی۔ آج کل خالی تھی اپنی ایک دوست کے پاس کلکتہ آئی ہوئی تھی کہ اخبار میں آپ کے منیجر صاحب کا ایک اشتہار دیکھا اور قسمت مجھے آپ کی خدمت میں لے آئی۔"

"خدا آپکا مددگار ہو۔ ہم لوگوں کو آپ اپنا سچا ہمدرد خیال فرمائیں۔ اچھا اب تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ مہمان میرے منتظر ہوں گے۔ انشاء اللہ کل پھر ملاقات ہو گی۔"

کھڑے ہو گئے۔ مس خان بھی کھڑی ہوئیں اور کہا:" سنا ہے آج محل میں کوئی بڑی تقریب ہے جس کی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر تیاریاں ہیں۔"

"جی ہاں بہت سے مہمان جمع ہیں۔ کیا آپ بھی اس تقریب میں شریک ہو کر خوش ہوں گی۔"

"بہت خوش ہوں گی اگر میں اس قابل خیال کی جاؤں۔"

بڑے شوق سے ابھی چلئے میرے ہمراہ میں اپنی عزیز بہن بھاوجوں سے ملاؤں گا لیکن ابھی آپ تیار نہیں ہیں۔"

"مجھ کو تیاری کی تو چنداں پرواہ نہیں ہے مگر ہاں آج جلسہ ہے وہاں ایسی حالت میں جانا مناسب نہ ہوگا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ گھر جا کر تیار ہو کر حاضر ہو جاؤں۔"

"اچھی بات ہے میں چلتا ہوں۔ دوسری کار آپ کے لئے باہر موجود رہے گی آپ اس پر آ جایئے اور بجائے خلیل منزل کے بڑے پھاٹک سے داخل ہونے کے آپ باغیچے کے پھاٹک سے داخل ہوں جہاں میرے نام کا بورڈ لگا ہے وہاں ہم چند لوگ ہوں گے اور میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ پہلے آپ میری بیوی اور بہنوں سے مل لیں گی پھر وہی رات کو اپنے ہمراہ محل میں لے جائیں گی۔"

یہ کہہ کر جمیل صاحب روانہ ہو گئے۔

☆

(۲۶)

مس خان اپنی قیام گاہ مسلم ہوٹل میں آ گئیں۔ نمبر ۳ کمرے میں رہتی تھیں اور نمبر ۴ میں ایک پشاوری خاتون ٹھہری ہوئی تھیں جن کی جوان لڑکیوں سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ انہوں نے آتے ہی اپنی سہیلی شیریں سلطان سے ان کا ایک اعلیٰ درجہ کا پشاوری لباس کا جوڑا لیا۔ دھانی کمخواب کی قمیص اور شلوار تھی اور پیازی رنگ کی جارجٹ کا ستاروں بھرا دوپٹہ جس پر بنارسی چوڑی بیل ٹکی تھی۔ وہ لے کر پہنا۔ سر کے بالوں کی حسب معمول دو چوٹیاں گوندھ کر سامنے سینے پر دو سیاہ ناگنیں لہرانے کو چھوڑ دیں جن کے سرے پر دھانی رنگ کا ربن خوبصورتی سے بندھا ہوا تھا جو بالکل حیرت یہ ہے "سانپ زمرد نگل گیا۔" کے مصداق تھا آدھے گھنٹہ کے اندر اندر آراستہ ہو کر جمیل صاحب کے خوش نما باغ پہنچیں۔ ان کے کان اسی طرف لگ رہے تھے جیسے ہارن کی آواز آئی۔ چاء کی پیالی ہاتھ سے رکھ کر ان کو اتروانے باہر آئے لیکن ایک عجیب صورت دیکھ کر گھبرا گئے۔ تب مس خان نے کہا۔

"آپ اسقدر جلد بھول جاتے ہیں۔ میں ہوں آپ کی خادمہ جس کو آپ نے ابھی تیار ہو کر آنے کا حکم دیا تھا۔"

جمیل ہنس کر بولے:"اوہ! مس خان معاف کیجئے میں بالکل نہیں پہچان سکا۔ ہم نے مس خان کو رخصت کیا تھا اور اس وقت ایک کابلی شہزادی کو پایا۔ چلئے اندر سب ہمہ تن شوق ہیں۔"

پھر دونوں گیلری سے ہوتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے اور جمیلہ اور ان کے شوہر قمر صاحب اور ان کی بیوی اور اپنی بیوی سے زیادہ اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ تینوں ساڑیاں پہنے ہوئے تھیں جو معمولی چیز ہو گئی ہے مگر حسین مس خان اس نئے اور خوبصورت

لباس میں پری معلوم ہو رہی تھیں۔ اس وقت کی اس چھوٹی سی پارٹی میں جاذب نظر غریب مس خان ہی تھی۔ بیگمات مل کر بہت خوش ہوئیں۔ قمر صاحب کبھی مس خان کی طرف اور کبھی اپنے دوست جمیل کے بشاش چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے کہ جمیل تو ہمیشہ کے افسردہ خاطر ہیں اور اب نجمہ کی ریل کی ملاقات کے بعد سے تو بہت ہی غمگین رہنے لگے تھے۔ آج یہ کیا بات ہے کہ اس قدر خوش نظر آ رہے ہیں اور ٹائپسٹ لیڈی کی طرف خاص توجہ کیوں ہے؟ جمیلہ اور شکیلہ بیگم بھی اس بات کو نوٹ کر رہی تھیں۔ ایک گھنٹہ بعد چاء ختم ہوئی اور مس خان ان تینوں بیگمات کے ساتھ اندر محل میں گئیں اور کمشنر رفیق احمد صاحب کار پر کہیں باہر چلے گئے۔ تب قمر جمیل کا ہاتھ پکڑ کر باغیچے میں آئے اور ٹہلتے ہوئے یہ گفتگو ہوئی۔

جمیل نے کہا: ''آخر تم بدظن کیوں ہو گئے ہو۔ کہیں میری بیوی کو بھی شک میں نہ ڈال دو۔''

''دوست میں بدظن نہیں ہوں تم ہی ایمان سے کہہ دو کہ مس خان کی طرف تمہاری خاص توجہ نہیں ہے؟ وہ تمہارے دل یا نظروں کو اچھی نہیں لگتی؟''

''قمر تم سے آج تک کوئی بات نہیں چھپائی۔ ابھی دیکھو اس حسرت نصیب نجمہ سے ملاقات ہوگئی تھی وہ بھی جبل پور پہنچ کر بیان کر دی تھی۔ تمہارا یہ خیال بالکل درست ہے کہ مجھ کو پہلی ہی ملاقات کے وقت سے مس خان بہت پسند آئیں نہ معلوم کیوں؟ میرا دل چاہتا ہے کہ اس سے بار بار ملوں اور باتیں کیے جاؤں یہ ضرور ہے کہ وہ خاندانی ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز ہے اور اسی وجہ سے میں آج اس کو گھر میں لے آیا۔ ورنہ ہماری ٹائپسٹ لڑکیاں آج تک محل میں نہیں گھسنے پائیں۔''

پھر وہ قمر کو لے کر ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئے اور کہا: ''پیارے قمر تم جانتے ہو کہ میں کچھ بُرے خیالات کا انسان نہیں لیکن میں خود حیران ہوں کہ اس وقت پینتیس سال کی عمر ہوئی جو سمجھ داری کا زمانہ ہے اور میں نے کم سنی میں بھی سوائے نجمہ کے کسی سے محبت نہیں کی۔ لیکن آج صبح سے دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ تم دیکھتے ہو میری بیوی سے زیادہ حسین نہیں عمر میں اس سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ پھر مجھے یہ کیا ہو گیا ہے۔''

قمر نے ہنستے ہوئے کہا: "کہئے کیسا پہچانا اور میرا خیال ہے کہ آپ کی بیوی بھی بھانپ گئی ہیں۔ جمیل تم نے اور غضب کیا۔ یہ بڑی نادانی ہے ایسی حالت میں تم کو اس سے بچنا چاہئے نہ کہ اپنے آفس ہی میں اس کا تقرر کر لیا۔ اب تو وہ ہر وقت پیش نظر رہ کر اور دیوانہ بنائیں گی۔"

یہ سن کر جمیل نے جواب دیا: "میرے قمر میں نے تو خود کچھ بھی نہیں کیا۔ اشتہار پر تین لیڈیاں آئیں۔ قبلہ ابّا جان اور منیجر نے ان تینوں کو کام تقسیم کر دیا۔ یہ میرے حصہ میں آئیں۔ اب مجھ کو یہ اچھی لگتی ہیں اس کا کیا علاج ہے۔"

"یہ سب صحیح لیکن یہ بھی سوچا کہ اس کے ساتھ کس قدر تم بے وفائی کر رہے ہو جو تمہارے نام پر قربان ہو گئی۔ ابھی تازہ چوٹ غم جدائی کی کھا چکے ہو۔ اس قدر جلد بھول گئے؟"

یہ سنکر جمیل آبدیدہ ہو گئے۔ قمر کے بازو پر سر رکھ دیا۔ پھر قمر نے کہا۔

"پیارے جمیل اپنے کو سنبھالو ماشاءاللہ آدھے درجن کے باپ ہو۔ تمہاری بیوی کی زندگی بھی عذاب ہو جائے گی کیونکہ اس عورت کا ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا ہرگز گوارا نہ ہوگا۔"

جمیل پھر درست ہو کر بیٹھے اور جواب دیا: "مجھ کو خود یہ خیال ہے۔ ابھی تین ماہ سے میں نجمہ کی جدائی میں زندگی سے بیزار ہو رہا تھا اور آج صبح سے اپنے دل میں ایک خوشی محسوس کر رہا ہوں لیکن قمر تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ مجھ کو یہ عورت بھی نجمہ نظر آتی ہے۔ شاید کچھ ہم شکل ہی ہو لیکن میں اس کا اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونا گوارا نہیں کر سکتا اور ایک ہی دن میں یہ سب کچھ ہو گیا تم نے دیکھا کہ میں تم سب کو چار ہی بجے چھوڑ کر آفس چلا گیا تھا۔ وہاں سے پھر اس کو چھوڑ کر آنا مشکل تھا تو یہ ترکیب کی کہ اس کو بھی محل کی تقریب میں شریک کیا جائے۔"

قمر بولے: "تمہارا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اس میں نجمہ کی جھلک ضرور ہے۔ میں بھی اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ آنکھیں بالکل نجمہ کی ہیں۔ جسم ذرا بھاری ہے اور اسوقت تو "میک آپ" کے بعد اس کا رنگ بھی نجمہ کا سا ہو رہا تھا۔ شاید یہ ہی وجہ کشش ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو۔ ابھی نئی نئی بات ہے۔ جلد زخم بھر جائے گا۔ اس عورت کو فوراً علیحدہ کر دو۔ اپنے آفس سے ہی نہیں بلکہ نوکری سے بھی برطرف کر دو۔ ورنہ جمیل بڑی مصیبت کا

سامنا ہوگا جس کو تم اور تمہاری بیوی برداشت نہ کرسکیں گے۔"

جمیل نے جواب دیا: "قمر یہ تو ناممکن ہے کہ اس بیکس کو ملازمت سے علیحدہ کردوں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی اور آفس میں بھیج دیا جائے اور میں ملنا چھوڑ دوں۔"

یہ گفتگو ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ باہر سے کھانے کا بلاوا آیا اور یہ دونوں کھڑے ہوگئے اور قمر بولے۔

"جمیل کھانے کے بعد ناچ گانا بھی ضرور ہوگا لیکن ہم اس میں شریک نہ ہوں گے۔"

"اچھا قمر سلطانہ سے چند گھنٹے بھی علیحدہ نہیں رہ سکتے۔"

"نہیں بھائی ہم کو اس آئی ہوئی آفت کے ٹالنے کی تدبیریں سوچنا ہیں۔"

"خیر کچھ سوچنا مگر مجھ کو اتنی اجازت دے دینا کہ اس وقت اس کو میں خود ہوٹل تک پہنچا آؤں۔"

"ہرگز نہیں! رواداری کی دو تین ملاقاتوں میں تو یہ حالت ہوگئی۔ تم اب اس کی شکل مت دیکھو۔ اب تو ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ نجمہ کا غم تم بھول جاؤ اور اسی لئے ہم چاروں جبل پور سے یہاں آئے ہیں کہ تمہیں خوش کرسکیں لیکن یہ نیا شگوفہ کھلا۔ یہ حالت دیکھ کر تو پھر یہی جی چاہتا ہے کہ تم اسی غم میں مبتلا رہو تا کہ اس نئی آفت سے بچو۔"

جمیل نے جواب دیا: "میں نے تمہارا کہنا ہمیشہ مانا اور اب بھی اس کی کوشش کروں گا۔ ابھی تو مقرر ہوئی ہے۔ بے گناہ علیحدہ کرنا ظلم ہے۔ ہاں اپنے آفس سے اس کی میز ہٹوا کر دوسری جگہ ان کا دفتر بنادیا جائے گا۔ قمر اطمینان رکھو تمہارا جمیل بہت متحمل ہے اور طبیعت میں بہت ضبط ہے۔ یہ بھی خدا جانے کیا سبب ہے؟ تم بھی تو کہتے ہو کہ آنکھیں نجمہ جیسی ہیں۔ وہ جب باتیں کرتی ہیں تو نجمہ کا سا انداز گفتگو نظر آتا ہے۔ محض اسی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ مس خان مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتی رہیں۔ اچھا تمہارا حکم سر آنکھوں پر جہاں تک ہوسکا اس سے علیحدہ رہوں گا۔"

یہ ہی باتیں کرتے ہوئے دونوں دوست کھانے پر پہنچ گئے۔

بقول قمر صاحب شکیلہ بیگم بھی تھوڑی دیر میں یہ اندازہ لگا چکی تھیں کہ انکا نیک دل شوہر مس خان کو زیدہ پسند کررہا ہے۔ وہ چیز ہی اچھی تھی۔ ان تینوں کو بھی پسند آئی۔ یہ لوگ

اپنے ساتھ ایک نیا نمونہ لے کر بیگمات کے پاس پہنچیں۔ علاوہ نوجوان مہمان بیویوں کے شکیلہ کی والدہ اور ساس صاحبہ نے بھی مس خان کو پسند کیا اور اپنے ساتھ کھانے پر بٹھایا۔

کھانے کے بعد بارہ بجے رات تک میراثیوں کا ناچ گانا ہوتا رہا لیکن یہ چاروں اکتا گئیں اور شکیلہ بیگم کے ساتھ ان کی باغیچہ والی چھوٹی کوٹھی میں آئیں۔ جہاں قمر اور جمیل کو ڈرائنگ روم میں باتیں کرتے پایا۔ کمشنر صاحب اپنے بیڈروم میں جا چکے تھے۔ ان چاروں کو دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔ جمیلہ نے کہا۔

''ارے آپ لوگ اب تک جاگ رہے ہیں؟''

قمر نے جواب دیا: ''ہم تو اٹھ بھی آئے۔ باہر تو ابھی ناچ ہو رہا ہے۔ آپ فکر نہ کریں آپ کے صاحب بہادر دو گھنٹے گزرے وہاں سے اٹھ آئے۔ اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ آپ بھی تشریف لے جائیے۔''

شوہر سے یہ سن کر بیگم قمر نے کہا: ''ایسا ہی چاہئے۔ چوبیس گھنٹے بیٹھے رہنے اور باتیں کرنے کا صحت پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوتا۔''

جمیل بولے: ''قمر سلطانہ آپ ناراض نہ ہوں یہ قصور میرا ہے۔ بیچارے قمر کا نہیں۔ ایک ہفتہ میں جبل پور رہا تب بھی آپ کو تکلیف ہوئی۔ میں نے قمر کو آدھی رات تک جگایا۔ آج تو ابھی پہلا ہی دن ہے۔''

پھر مس خان نے کہا: ''بیگم صاحبہ رات زیادہ آ گئی ہے۔ اب مجھ کو اجازت ملنی چاہئے۔''

شکیلہ بیگم نے ان سے کہا ''بہت اچھا۔'' اور شوہر کو دیکھ کر کہا: ''آپ ذرا کار منگا کر مس خان کو روانہ کر دیں۔''

بیوی سے یہ سنتے ہی بے اختیار انھوں نے قمر کو دیکھا۔ وہ فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔ مس خان سب سے رخصت ہوئیں اور قمر کے ساتھ کار تک آئیں۔ تب انھوں نے کہا: ''ڈرائیور گھر کا پرانا ملازم ہے اگر آپ کو ضرورت معلوم ہو تو کوئی آیا ساتھ کر دی جائے۔''

''آپ کی مہربانی اگر کوئی عورت ہو تو اچھا تھا۔''

قمر صاحب نے فوراً ہی ایک ملازمہ کو گاڑی میں بٹھا دیا۔ یہ واپس آئے قمر

سلطانہ چونکہ اپنے بیڈروم میں جا چکی تھیں۔ناچار وہ بھی چلے گئے اور جمیل نے جمیلہ کو بھیج دیا اور بیوی سے کہا: ”اب ہمیں بھی سونا چاہئے۔“

بیوی ان کے چھیڑنے کو بولیں: ”ہاں قمر ہیں نہ جمیلہ اب تو مجبوراً سونا ہی پڑے گا۔“

یہ کہہ کر ہنستی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئیں تو جمیل نے کہا: ”خدا کا شکر ہے میری بیوی قمر سلطانہ کی طرح تنگ دل نہیں۔“

”خیر یہ تو مذاق تھا۔مس خان کی بابت تو بتایئے یہ اتنی قابل کسی اچھے گھرانے کی خاتون اس چھوٹے سے کام پر کس طرح آمادہ ہو گئیں؟ اس کو تو اسکولوں میں بہت اچھی جگہ مل سکتی تھی۔اچھی شکل ہے۔اب تک شادی کیوں نہ ہوئی یہ معمہ میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔“

میں خود حیران ہوں۔کم بخت ایم اے ہے۔خوش شکل ہے جوان ہے۔شادی کیوں نہیں کرتی؟ اسکولوں میں تو کہتی ہے کام کر چکی ہوں۔اسی خیال سے میں نے اس کو آپ سے ملایا کہ دو چار ملاقاتوں میں اس کے حالات معلوم کر لیں۔بظاہر تو شریف معلوم ہوتی ہے۔“

”شریف تو خیر ہوگی۔خوبصورت ہے۔دلکش ہے۔کہیں دفتر میں گڑبڑ نہ ہو جائے۔ابھی اس دن چچا جان فرما رہے تھے کہ ”ہمارے چند ٹائی پسٹ لڑکیاں بہت خراب آ گئی ہیں، منیجر صاحب مقرر کرتے وقت اس کا خیال نہیں کرتے اگر یہ کام ہماری دُلہن کے ہاتھ میں ہو تو بہت اچھی قسم کی لڑکیاں انتخاب کی جائیں۔“

”چچا جان تو ان لڑکیوں ہی کو ناپسند کر رہے ہیں جن کی معمولی شکلیں ہیں اور کم علم ہیں۔یہ مس خان صاحبہ تو سب کی سردار ہیں۔خدا خیر ہی کرے۔“

”ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔نہیں معلوم وہ کس قسم کی عورت ہے؟ مگر اطمینان اس وجہ سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ضرور سمجھ سے کام لے گی۔کبھی کبھی تم یہاں اسے بلا لیا کرنا۔اس سے اس کی حالت کا اندازہ ہوتا رہے گا۔اس کے علاوہ دو اور تعلیم یافتہ اور شریف ہندو لیڈیاں بھی مقرر ہوئی ہیں۔تم ان کو بلوا کر دیکھنا۔“

”تو آج آپ اُن دونوں کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

”بات یہ ہے کہ وہ دونوں ہندو ہیں اور یہ مسلمان۔وہ دونوں اپنا کام ختم کر کے

جا چکی تھیں اور شام جب میں آفس گیا تو یہ اس وقت تک اپنا کام کر رہی تھی اور چونکہ مسلمان ہے اس کو ہمارے رسم و رواج سے دلچسپی ہے اس نے خود خواہش ظاہر کی کہ آج کی تقریب میں اس کو شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔

تم چاروں کو دکھانے کے خیال سے بلا لی گئی۔ اب اگر تم پسند کرو گی تو آتی جاتی رہے گی۔ اب سونا چاہئے۔ ایک بج گیا ہے۔"

(۲۷)

قمر صاحب کے بے حد سمجھانے کے اثر سے بڑے ضبط اور حوصلہ سے کام لے کر ایک ہفتہ تک جمیل صاحب مس خان سے نہ ملے۔ وہ تو انہی کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ وہاں جاتے تو روزانہ ہی ملنا پڑتا۔ اس وجہ سے وہ آٹھ دن تک اپنے آفس نہ گئے۔ کورٹ جاتے اور ضروری کاغذات آفس سے منگا کر دیکھ لیتے۔ آخر کہاں تک۔ کام بھی رکا ہوا تھا اور اتنے دن بعد اس کے دیکھنے کیلئے بھی بے چین تھے۔ ایک دن صبح آٹھ بجے ہی آفس آ بیٹھے۔ دس بجے کے قریب مس خان آفس میں داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ بجائے اپنی میز پر کونے کی طرف جانے کے سیدھی آقا کی طرف آئیں اور سلام کیا۔ وہ بھی فوراً کھڑے ہو گئے اور مزاج پوچھا۔

''میں تو اچھی ہوں، صرف دو دن ہلکا سا بخار آ گیا تھا۔ پھر بھی حاضر ہوتی رہی۔ آپ فرمائیے مدت سے آفس میں تشریف نہیں لائے۔ صرف اوّل روز جب کہ میرا اس جگہ تقرر ہوا ہے۔ آپ شام کو تشریف لائے تھے۔ وہی دن شاید تقریب کا روز تھا۔''

''ہاں میں چند روز سے دفتر تو نہیں آ سکا۔ آپ بھی تو پھر کسی روز بیگم صاحب کے پاس نہیں آئیں؟''

''ارادہ ہوا کہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے تشریف نہ لانے کا سبب معلوم کروں لیکن کچھ ہمت نہ پڑی۔ بیرسٹر صاحب! میں غریب یہاں بالکل نووارد اجنبی ہوں۔ آپ ہی کے سہارے زندگی ہے۔ جب آپ نے ہی اس قدر بے پرواہی اختیار کر لی تو میری بسر اوقات ناممکن ہو جائیگی۔''

یہ کہہ کر مس خان نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ بیرسٹر صاحب اس کی چشم پُر آب کو دیکھ

کر بے چین ہو گئے۔ خود بھی بیٹھ گئے اور مس خان کو بھی اپنی نزدیک والی کرسی پر بٹھالیا۔ دس پندرہ منٹ تک دونوں خاموش رہے۔ پھر ایک لمبا سانس لیکر انھوں نے کہا۔

''مس خان معاف کر دو۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا اور اب بھی ایسا نہ ہوتا لیکن ایک مجبوری سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ آپ کو معلوم نہیں مجھ کو خود اس ہفتہ میں بہت سخت تکلیف برداشت کرنی پڑی لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ میرے لئے ایسا کرنا ناممکن ہے۔ بے شک یہاں آپ کا کوئی نہیں لیکن آپ اس کو محسوس نہ کریں مجھ کو اپنا حقیقی ہمدرد تصور کریں۔ کسی قسم کے تکلف وغیریت سے کام نہ لیں۔ آپ وہاں ہوٹل میں ٹھیری ہیں۔ مجھ کو یہ بھی بہت ناگوار ہے۔ وہاں گھر کی سی آرائش نہیں ہو سکتی۔ کچھ کمرے منیجر صاحب کے آفس کے ساتھ خالی ہیں اگر آپ پسند کریں تو وہاں آجائیں۔ پہلے بھی وہاں چند خواتین رہ چکی ہیں۔ آپ کو دکھایا جائے گا۔ کمروں کے ساتھ غسل خانے، برآمدے اور چھوٹا سا باغیچہ ہے۔''

''مہربانی وعنایت کی شکر گزار ہوں لیکن منیجر صاحب کے قریب رہنے سے کیا فائدہ اگر اس آفس کے ساتھ کوئی کمرہ ہوتا تو بات تھی۔''

بیرسٹر صاحب نے یہ سن کر مسکراتے ہوئے کہا: ''اس کے ساتھ بھی ہے۔ دو کمرے اور ایک غسل خانہ اس کے اوپر خالی ہیں لیکن یہ ہی خیال ہے کہ اس جگہ آپ کا قیام لوگوں کی نگاہوں میں نامناسب تو نہ ہوگا؟''

''یہ تو آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میں ہر طرح تیار ہوں۔ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، ہاں بیگم صاحبہ سے اجازت لے لینی چاہئے۔''

ان دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بیگم صاحب کے بھائی شکیل احمد اچانک دفتر میں داخل ہوئے اور ایک دم اُن کے قریب آکر کھڑے ہو گئے جن کو دیکھ کر جمیل صاحب کچھ گھبرا گئے۔ خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مس خان سے ایک فائل کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''اس میں جو کاغذات اوپر رکھے ہیں۔ ان کو ٹائپ کر کے کلرک کو دے دیجئے۔ آج ہی شام کو ڈاک سے جائیں گے۔''

پھر شکیل صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''کہیے بیگم صاحبہ کو لکھنو پہونچا آئے۔ دو دن کے لئے گئے تھے۔ دو ہفتے تک ٹھیرے رہے؟''

شکیل صاحب بہنوئی کو مس خان سے باتیں کرتے دیکھ کر کچھ ناخوش سے ہو گئے تھے ویسا ہی جواب دیا۔

"جی ہاں زیادہ ہی ٹھیرنا پڑا اور چاہیے بھی تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میرے لئے یہاں کیا دلچسپی باقی تھی جو واپس آنے کی جلدی کی جاتی۔"

اس طنز آمیز جواب کا مطلب دونوں سمجھ گئے۔ مس خان تو فوراً ہی میز سے فائل اٹھا کر اپنی میز پر چلی گئیں اور جمیل صاحب اور شکیل صاحب بیٹھ گئے۔

(۲۸)

مس خان کو بیرسٹر صاحب کے آفس میں کام کرتے ہوئے دو تین مہینے ہو گئے ہیں اور وہ کبھی کبھی بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھی ہو آتی ہیں لیکن بیگم صاحبہ کو اپنے شوہر کے دفتر میں ان کا کام کرنا سخت ناگوار ہے کیونکہ وہ دیکھتی ہیں کہ اُن کا شوہر آج سے دس سال قبل اس قدر نجمہ کا خیال نہیں کرتا تھا جیسا کہ اس وقت مس خان کا گرویدہ نظر آ رہا ہے۔ کسی کسی دن رات کے بارہ بجے تک مس خان کے ساتھ سینما وغیرہ سے واپس آتا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی تدبیر کریں جو اس بلا سے نجات حاصل کریں۔

ایک دن شام کے وقت جب کہ یہ دونوں اپنے باغیچہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے آفس سے ایک خط آیا اور جمیل صاحب فوراً اُٹھ کر دفتر چلے گئے۔ وہاں کار پر مس خان اُن کی منتظر تھیں۔ یہ بھی سوار ہوئے اور سمندر کی طرف کار روانہ ہو گئی۔ وہاں پہونچکر ایک سنسان کنارے کی طرف اترے جو آدمیوں کی چہل پہل سے دور تھا۔ وہاں کوئی بچ بھی نہ تھا۔ پانی کے کچھ قریب ہی دو پتھر پڑے تھے۔ ان پر دونوں بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے مغرب کی طرف اودے اودے بادلوں میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ پیچھے کی طرف سمندر کی لہریں کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس جگہ نہ کوئی درخت تھا نہ شام کے بسیرا لینے والے پرندوں کی آواز بالکل خاموشی طاری تھی۔ جمیل صاحب نے سگار سلگایا اور مس خان نے سگرٹ پھر دونوں میں سلسلہ گفتگو شروع ہوا۔

''مس خان یہ مقام کیسا پرسکون ہے مگر سنسان۔''

بیرسٹر صاحب یہاں سناٹا ضرور ہے مگر آپ کی خادمہ کی ناشاد زندگی سے زیادہ سنسان تو نہیں؟ آہ! میرا دل اس سے زیادہ ویران ہے۔ تین ماہ آپ کی خدمت میں بخوبی گزر گئے مگر اب یہاں بسر نا ممکن معلوم ہوتی ہے۔

کیوں مس خان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ ''دیکھئے مجھ کو کس قدر تیز بخار ہے۔ میں بڑی ہمت سے آپ کو لے کر یہاں آئی ہوں۔''

جیب سے ایک لفافہ نکال کر جمیل صاحب کو دیا جس کو پڑھتے پڑھتے ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ لکھا تھا۔''

خلیل منزل کلکتہ

اُو بدکردار عورت!

ہم نے تجھ کو نیک اور شریف مسلمان خاتون خیال کر کے اپنے آفس میں جگہ دی مگر افسوس تو اس زمانہ کی بدترین عورت ثابت ہوئی تجھ سے بدرجہا بہتر ہیں وہ دونوں ہندو لیڈیاں جو تیرے ساتھ ہی مقرر کی گئی تھیں۔ وہ فرشتہ ہیں اور تو شیطان ہے۔ بس اب خیریت اسی میں ہے کہ کل صبح ہمارے آفس میں نہ آؤ بلکہ کلکتہ ہی سے چلی جاؤ تو بہتر ہے۔ تیری تنخواہ کے سو روپے سفر خرچ کیلئے اور زیادہ دیا جاتا ہے۔ میرے گھر بھر پر احسان ہوگا اگر تم کلکتہ سے چلی جاؤ۔ کئی مہینوں سے ہم لوگوں کی زندگی تلخ ہو رہی ہے۔ بس اب رحم کرو اور ایک رہتے بستے خوش حال خاندان کو برباد نہ کرو۔''

سیٹھ خلیل احمد

جمیل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ حروف نظر نہ آتے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی اس درجہ پریشان حالی کو دیکھ کر

مس خان بھی بے چین ہوگئی اور بے تابانہ رونے لگی۔ جمیل کی اس وقت عجب حالت تھی۔ وہ جوان تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ بیرسٹر تھے۔ مگر خودسر ومختار نہ تھے۔ اپنے باپ کے سعادت مند اور فرمانبردار بیٹے تھے۔ سیٹھ صاحب کی خلاف مرضی کچھ نہ کر سکتے تھے اور مس خان سے ہمدردی یا دوستی یا محبت تو سراسر گناہ تھا۔ بیوی کا گناہ۔ سماج کا گناہ۔ گو ان کا دل مطمئن تھا کہ وہ خدا کے گنہگار نہ تھے۔ تاہم سماج کا گناہ ناقابل معافی ہوتا ہے۔ خدا تو اپنے گنہگار کو معاف بھی کر دیتا ہے مگر اس وقت ان میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ والد صاحب کے خلاف اس ٹائی پسٹ لیڈی کو اپنے آفس میں رکھ سکیں مگر اس قدر ذلت کے ساتھ اس کو علیحدہ کر دینا بھی شاق تھا۔ کچھ دیر بے بس و بے اختیار روتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کی سیاہی چھا گئی۔ سمندر کی سیاہ خوفناک موجوں کی آواز سے وحشت اڑنے لگی۔ تب جمیل نے کہا۔

''اس قدر رنج نہ کرو۔ قسمت میں جو لکھا تھا وہ ہو رہا ہے۔ کاش تم یہاں ملازم نہ ہوتیں یا میں ہی تم سے نہ ملتا۔ میں بہت سمجھ دار باحوصلہ مند ضابطہ دل رکھتا تھا۔ ابتدائے زندگی میں ایک سخت صدمہ اٹھا چکا تھا۔ وہ ایک ناقابل برداشت ٹریجڈی تھی مگر میں باحوصلہ رہا۔ اب بھی خدا مجھے ہمت دے، مس خان خدا جانے تمہاری حسن سیرت نے مجھ پر کیسا اثر کیا۔ میں کیسا بیوفا نکلا۔ اپنی جان سے عزیز نجمہ کو بھول گیا۔ تمہاری صورت میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ طرز گفتگو بالکل اسی کا ہے۔ شاید یہی وجہ کشش تھی۔ بہر حال میں اپنے ہوش وعقل کھو بیٹھا تم معاف کرنا۔''

ان سے یہ تقریر مس خان خاموشی کے ساتھ سنتی رہی مگر آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ پھر ان کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''میرے آقا! آپ کے قدموں کو چھوڑ کر اب کہاں جا سکتی ہوں۔ میں نے سفر خرچ کے سو روپے بھی کلرک کے ہاتھ واپس کر دیے ہیں، اب آپ ہی بتائیے کہاں چلی جاؤں۔ میں یہ ہی کر سکتا ہوں کہ تم کو مضافات کلکتہ میں کسی جگہ بھیج دوں اس وقت تو تم کسی ہوٹل میں رات گزار لو۔ میں ساتھ چلتا ہوں اور کل کسی قریب کے گاؤں میں انتظام کر دیا جائے گا۔''

یہ سن کر مس خان اپنے آقا کے قدموں پر جھکی مگر انھوں نے اٹھالیا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں وہاں کسی چھوٹے اسکول میں ٹیچری کر کے گزر کر لوں گی۔"

"نہیں ٹیچری کی کوئی ضرورت نہیں میں اپنی ذاتی کمائی یعنی پریکٹس کی آمدنی سے تم کو دو سو روپے یا جس قدر بھی ضرورت ہوگی بھیج دیا کروں گا۔ خود بھی جا کر دیکھتا رہوں گا۔ چلو رات ہوگئی۔ اب کسی ہوٹل میں چلنا چاہیے مگر آپ کا سامان؟"

"میرا سامان آج دن کو میری اس کابلی دوست مس شیریں کے ہاں جا چکا ہے۔ یہ چٹھی مجھے صبح ہی مل گئی تھی۔ آج دن بھر آپ آفس میں نہیں آئے تھے اس لئے میں نے اس وقت تکلیف دی۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

(۲۹)

شکیل احمد کے بڑے لڑکے شکیل احمد کی بسم اللہ کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی جارہی ہے۔ شکیل احمد صاحب کے سب سُسر ال والے یعنی خسر نواب سلطان مرزا صاحب مع اپنی بیوی بچوں کے لکھنؤ سے اوران کے چھوٹے بھائی نواب سلیمان مرزا صاحب (سالومن) بریلی سے اور منجھلے بھائی نواب احسان مرزا صاحب انجینئر جبل پور سے شرکت کیلئے آئے ہوئے تھے اوران تینوں خاندانوں کو سیٹھ خلیل احمد صاحب نے اپنے تعمیر عالیشان محل قصر خلیل کے مختلف حصوں میں ٹھیرایا ہے۔ نواب سلطان صاحب کی بیوی بیٹیاں تو پردہ دار حصہ میں ٹھیرائی گئی ہیں اور دونوں چھوٹے بھائی احسان صاحب سالومن صاحب قصر کے اس فیشن ایبل حصہ میں قیام پذیر ہیں جہاں پردہ کا انتظام نہیں تھا مسز سالومن کی عمر اب چالیس کے قریب تھی لیکن ان میم صاحبہ کے فیشن اور انگریزیت میں کچھ کمی نہیں آئی تھی۔ ان کی لڑکیاں بھی قریب قریب جوان تھیں۔ ایک لڑکی اور لڑکا برائے تعلیم انگلستان گئے ہوئے تھے۔ دونوں بڑے بھائیوں کی اولاد تو کب کی جوان ہو چکی تھی۔ انجینئر صاحب کی بڑی صاحبزادی کی شادی قمر الزماں صاحب اسسٹنٹ انجینئر سے ہو چکی تھی۔ چونکہ ان ہی دنوں انکے بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اس وجہ سے وہ اس تقریب میں شامل نہ ہوسکی تھیں اور اس دفعہ قمر صاحب بھی نہیں آئے تھے لیکن انجینئر صاحب احسان مرزا کی بیگم صاحبہ مع اپنے چار چھوٹے بچوں اور سولہ سالہ منجھلی صاحبزادی زرّیں کے تشریف لائی تھیں۔ مس زرّیں آٹھ سال کی عمر میں برائے تعلیم وتربیت یورپ بھیج دی گئی تھیں اور آٹھ سال بعد ابھی گزشتہ ماہ انگلینڈ سے واپس آئی تھیں اردو وہ بالکل نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ قصر خلیل میں وہ ایک تماشہ بنی ہوئی تھیں جس وقت زنانہ حصہ میں بیگمات کے پاس جاتیں تو لڑکیاں گھیر لیتیں۔ گو ان کی بڑی بہن مسز قمر بھی بڑی حسین اور جمیل لڑکی تھیں اور تعلیم یافتہ بی اے

کردوں اور اس کے متعلق میں تم سے گفتگو کرنے والا تھا کہ مہمان آ گئے اور آج تم بیمار ہو۔"

یہ سن کر مس خان نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر جواب دیا۔"میرے آقا یہ تو ناممکن ہے میرے، اور آپ کے دونوں کے امکان سے باہر ہے۔ میں اگر آپ کے ہاں ملازمت میں لگی رہتی۔ جہاں ہر وقت آپ کے پاس رہنے کا شرف حاصل تھا تو چندے اچھی گزر جاتی۔ اس حالت میں ایک تو ہر وقت آپ کی خدمت کی عزت حاصل ہوتی۔ دوسرے اس خیال سے قلبی اطمینان رہتا کہ اپنی محنت کی اجرت پر زندگی بسر کر رہی ہوں لیکن مجھ بدنصیب کی قسمت میں یہ بھی کیوں ہوتا؟ آپ کی رحم دلی اور غریب پروری کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں نہایت ذلت کے ساتھ آپ کی خدمت سے ہٹا دی گئی۔ اب جس حالت میں یہاں بسر کر رہی ہوں۔ میرے لئے سوہان روح ہے۔ میرا ضمیر مجھ پر ملامت بلکہ لعنت کر رہا ہے کہ میں آپ کی کوئی رشتہ دار نہیں، آہ خدمت گار بھی نہ رہی اور آپ مجھ پر اس قدر عنایت کر رہے ہیں۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ اس رنج وغم کے اثر سے میرا دل گھٹ رہا ہے۔ میری ردّی حالت کو دیکھ کر آپ نے کئی بار دریافت کیا لیکن میں کچھ عرض نہ کر سکی۔ میں نے بارہا یہ ارادہ کیا کہ بلا اطلاع خاموشی کے ساتھ چلی جاؤں لیکن دل میں اتنی ہمت بھی نہ تھی۔ مجھ میں اس خیال کے بھی برداشت کی طاقت نہ رہی کہ آپ کے قدموں سے علیٰحدہ ہوں۔ ہفتہ میں دو ایک بار تشریف لے آتے ہیں۔ وہی وقت میری زندگی میں شمار ہوتا اور صرف اسی کیلئے زندہ ہوں اگر یہ بھی نہ رہے گا تو کیونکر جیوں گی؟ یہ خیالات ہیں جو مجھ کو قدم نہیں اٹھانے دیتے لیکن اب مجھ میں بالکل طاقت نہ رہی۔ امید کرتی ہوں کہ بہت جلد آپ کے قدموں پر نثار ہونے کی دائمی مسرت حاصل ہوگی۔"

مس خان کی یہ مایوسانہ تقریر سنکر جمیل صاحب بہت غمگین ہوئے۔ ان کا بھی دل اور آنکھیں بھر آئیں۔ نو دس ماہ کا زمانہ گزرا مس خان سے ملتے ہوئے لیکن اس وقت کے سوا ہمیشہ اس بدنصیب عورت سے جوان کیلئے بے انتہا جاذبیت رکھتی تھی وہ ذرا ہٹ کر کچھ دور بیٹھا کرتے تھے۔ سوائے شیک ہینڈ کے کبھی اس کے ہاتھ تک نہ چھوتے تھے لیکن آج پہلا دن اور پہلا وقت تھا کہ مس خان نے بخار کی پریشان حالت میں جو خوفناک تنہائی سے گھبرائی ہوئی تھی جمیل صاحب کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگی لیکن فوراً ہی انھوں نے ہاتھ علیٰحدہ کر لیا تھا مگر اب اس کے یہ خیالات معلوم کر کے بہت متاثر ہوئے۔ وہ

اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی جس سے بخار اور تیز ہو گیا۔
جمیل اپنی کرسی سے اٹھے اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کو بستر پر لٹا دیا۔ اپنے رومال سے اس کا چہرہ خشک کیا اور ان رنج دہ خیالات کو بہلانے کیلئے دوسرا ذکر شروع کر دیا۔

"مس خان سنئے ہمارے ہاں کل بڑا بھاری جلسہ ہے۔ شکیل کے بچہ کی رسم بسم اللہ ادا ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس خوشی میں شریک ہوں۔ ابھی ڈاکٹر آ کر دوا دیتا ہے۔ کل صبح تک بخار اتر جائے گا۔ کل شام کو میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ ساڑی پہن کر چلنا۔ ان لوگوں نے تم کو ہمیشہ سلوار میں دیکھا ہے۔ رات کا وقت ہو گا۔ کوئی پہچان نہ سکے گا۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ آپ مدت سے کلکتہ سے کہیں دور چلی گئی ہیں۔"

"اب مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے گو دلی تمنا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ آج ہی صبح کے اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی کہ نواب زادی زرّیں احسان نے جو ابھی ابھی انگلینڈ سے آئی ہیں کسی کلب گھر میں اچھی تقریر کی ہے۔ میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتی تھی۔"

"ہاں یہ بچی بہت ہی قابل اور عجیب دلفریب لڑکی ہے۔ قصر خلیل میں اس کی وجہ سے ہر وقت مجمع رہتا ہے۔ تم اس کی بڑی بہن سے مل چکی ہو جو میرے بچے کے عقیقے کی تقریب پر اپنے شوہر قمر صاحب کے ہمراہ آئی تھیں۔ قمر میرا بہت عزیز دوست ہے۔"

مس خان نے کہا: "وہ بھی بہت حسین اور قابل تھیں۔ یہ ان سے بھی زیادہ ہے تو کیا ہو گی۔"

"مس خان یہ بچی تو کچھ چیز ہی اور ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ میری لڑکیوں میں سے بھی کوئی ایسی نکل آتی مگر کہاں؟ ابا جان قبلہ بن بیاہی لڑکی کو انگلینڈ جانے کی اجازت ہی نہ دیں گے۔ لو ڈاکٹر صاحب آ گئے دوا پیو اور اچھی ہو جاؤ کہ کل وہاں چل سکو۔"

باورچی نے آ کر خبر دی اور ڈاکٹر صاحب اندر آئے۔ مریضہ کو دیکھا اور نسخہ لکھا۔ اور باورچی کو دوا لانے کیلئے ہمراہ لے کر چلے گئے تو جمیل صاحب نے کہا۔

"دو تین دن میں تم بالکل اچھی ہو جاؤ گی۔ ہر وقت کے سوچنے اور بُرے خیالات کی الجھن کا یہ نتیجہ ہوا۔ آپ کو مشغول رہنا چاہئے۔ میں اسی ہفتہ میں یہاں کی دیہاتی لڑکیوں کے لئے ایک پرائمری سکول کھولنے والا ہوں۔ آپ کے بہلنے کیلئے یہ اچھا

مشغلہ ہوگا۔تنہا اور بے کار انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔میں ابھی دو تین گھنٹہ یہاں بیٹھوں گا۔ دیکھ لینا تمہارا بخار بھی کم ہو جائے گا۔"

یہ سن کر مس خان کے زرد چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انھوں نے کہا۔

"اگر میری صحت درست ہوگئی تو بسرو چشم میں یہ خدمت انجام دونگی اور اس وقت آپ کچھ دیر اور میرے پاس بیٹھے رہیں گے تو یقیناً میرا بخار اتر جائے گا میری بیماری آپ کے قدموں سے علیحدگی ہے۔اگر میں اس آفس میں ہمیشہ کیلئے ٹائپ کیا کرتی تو سو سال تک صحت منداور زندہ رہ سکتی۔"

انھوں نے مسکراتے ہوئے اس کا یہ جواب دیا:"اچھا آپ کو میرے آفس میں ٹائپ کرنا اس قدر پسند ہے؟تو دوبارہ اس کے لئے کوئی ترکیب نکالی جائے گی۔جلدی اچھی ہو جاؤ۔"

"آج آپ کے ہاں مہمان جمع ہیں کہیں آپ کی تلاش نہ ہو۔"

"ہوا کرے آج تمہارا بخار اتار کر ہی جانا ہے۔"

"نو بجنے والے ہوں گے۔کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔آپ کو یہاں ٹھہرنے سے بہت تکلیف ہوگی۔"

"ہاں وقت تو ہو گیا ہے۔تم اس وقت میرے ساتھ کھانا تو نہیں کھا سکتیں گر اپنے ہاتھ کی کوئی چیز رکھی ہو تو کھلا دو۔"

مس خان نے کہا:"جی ہاں کل میں نے آپ کیلئے گاجر کا حلوا بنایا تھا۔اجازت دیں تو میں خود اٹھ کر لے آؤں۔"

"ہر گز نہیں۔ماما کو بلاتا ہوں وہ لے آئے گی۔"

گھنٹی بجائی گئی اور بڑھیا ملازمہ باورچی خانہ سے نکل آئی اور مس صاحبہ سے پوچھ کر اسی وقت نکال لائی۔

اس وقت مس خان نہایت خوش تھیں۔بخار جلدی جلدی بتدریج بلادوا کے اتر رہا تھا۔

☆

(۳۰)

شکیل صاحب کے صاحبزادے کی بسم اللہ کی تقریب پر ان کے سسرال والے تینوں نواب صاحبان کلکتہ آئے اور قصر خلیل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سیٹھ صاحبان نے ان کو بہت اصرار سے دو تین ہفتہ تک روک لیا تھا۔ ان کو خوب کلکتہ کی سیر کرائی۔ روز دعوتیں جلسے اور پارٹیاں رہتی تھیں۔ خصوصاً منجھلے نواب انجینئر صاحب کی حسین وجمیل اور قابل صاحبزادی کی شہرت کلکتہ بھر میں ایسی ہو گئی تھی کہ بڑے بڑے معزز تعلیم یافتہ آزاد خیال لوگوں کا ان کے ہاں مجمع رہتا تھا۔ شکیلہ بیگم جمیل اس موقعہ پر بھی بہت خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے منجھلے شوہر کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ کبھی نجمہ کے تھے۔ پھر بیوی کو چاہنے لگے۔ اور اب سمجھداری کی عمر میں آ کر ایک ذلیل ثانی پست عورت کے پردانہ ہو رہی ہے۔ اور یہ نواب زادی تو سب سے بہتر ہے۔ یورپ کی تعلیم وتربیت پھر ان دونوں سے کہیں زیادہ حسین وکمسن! خدا ہی خیر کرے مگر تھوڑے ہی دن کے بعد انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کے شوہر نے اس لڑکی کی طرف توجہ نہیں کی لیکن وہ ان کے اس طریق عمل سے ضرور پریشان تھیں کہ باوجود گھر پر اس قدر مہمانداری اور دلچسپیوں کے جمیل صاحب تیسرے چوتھے دن تین چار گھنٹے کے لئے غائب ہو جاتے ہیں۔ نہ دفتر میں ملتے ہیں۔ نہ کورٹ میں ہوتے ہیں اور نہ کسی دوست کے گھر۔ جب سے مس خان علیحدہ کی گئی ہے۔ وہ کچھ کھوئے اور پریشان سے رہتے ہیں۔ ان کو یہ شبہ ہو رہا تھا کہ مس خان کلکتہ سے باہر نہیں گئی۔ ضرور یہیں کہیں رہتی ہوگی اور اسی کے پاس یہ جاتے ہوں گے۔ ایک دن دوپہر کو بہت افسردہ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ شکیلہ بیگم صوفہ پر لیٹی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔

"بیگم ہم شکار کو جا رہے ہیں۔ تین چار دن کے لئے۔ یہاں سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ میں میرے ایک دوست کا گاؤں ہے اور وہیں ایک بڑی شکار گاہ ہے۔ ممکن ہے جلدی واپس آ جائیں چار دن کا خیال ہے۔"

یہ سن کر بیگم صاحب نے حواب دیا: "ہم لوگ بھی ساتھ چلتے تو اچھا تھا۔ ان دوستوں سے کہئے کہ وہ اپنی بیویوں کو بھی لے چلیں۔"

"یہ پارٹی ایسی نہیں ہے کہ لیڈیز کو ساتھ رکھا جائے۔ چند پرانے خیال کے پابند پردہ احباب بھی ہیں۔ وہاں سے واپس آ جاؤں تو ہم سب اپنے گاؤں میں شکار کو چلنے کا انتظام کریں گے۔ اس نواب فیملی کو بھی لے چلیں گے۔ میں تو ان لوگوں کی موجودگی سے تنگ آ گیا۔ ہر وقت جمگھٹا رہتا ہے۔ کلکتہ سے باہر چلے جائیں گے تو کچھ سکون ملے گا۔"

بیگم بولیں: "اس دفعہ تو نواب صاحبان کے ساتھ چیز ہی ایسی ہے جس کی کشش لوگوں کو جمع رکھتی ہے۔"

"ہوگی۔ ہمیں تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ وہ کیا تمام خاندان ہی حسین ہے۔ مگر یورپ کی ملمع کاری تو مجھ کو ناپسند ہے۔ نسوانیت اور ہندوستانیت کا تو پتہ نہیں وہ لڑکی ایک تعلیم یافتہ وشائستہ نوعمر لڑکا معلوم ہوتی ہے۔ خیر ان سب کو ہم اپنی شکار گاہ میں لے چلیں گے۔ وہاں یہ بھیڑ نہ ہوگی۔ ہاں تو ہم لوگ کل صبح چار بجے روانہ ہو رہے ہیں۔"

(۳۱)

صبح سویرے ہی شاید پانچ بجے ہوں گے کہ جمیل صاحب کی کار اس دیہاتی کچے مکان کے دروازے پر آ کر رکی۔ ایک پریشان صورت خادمہ اندر سے نکل کر آئی اور کہا۔

''آج تو مس صاحب کی طبیعت بہت ہی خراب ہے۔ تین دن سے آپ تشریف نہیں لائے۔ بخار تو پہلے ہی سے تھا۔ رات سے بہت تکلیف ہے۔''

یہ سن کر وہ بہت پریشان ہو گئے۔ قدم جلد جلد اٹھا کر کمرے تک پہنچے۔ دیکھا کہ وہ خاموش لیٹی تھیں۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا مگر آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھیں پلنگ کے قریب پہنچ کر کہنے لگے۔

''مس خان آپ تو بہت بیمار معلوم ہوتی تھیں۔ کیا تکلیف ہے؟ ابھی ڈاکٹر آتا ہے۔''

ان کی شکل دیکھتے ہی اس بیکس و ناچار سخت بیمار عورت کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اس نے آنکھ کے اشارہ سے جمیل صاحب سے اپنے پاس بیٹھ جانے کو کہا لیکن جمیل صاحب بیٹھے نہیں اور پانچ منٹ کیلئے باہر آئے اور ڈرائیور سے کہا کہ ''فوراً شہر جا کر ڈاکٹر صاحب اور ایک نرس کو لے آئے۔''

پھر آ کر بیمار کے پاس اسی پلنگ پر بیٹھ گئے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نبض دیکھنے لگے۔ مریضہ بہت کمزور تھی۔ اس وقت اُن کے آنے کا کچھ الٹا اثر ہوا۔ حرکتِ قلب تیز ہو گئی اور تمام جسم پسینہ سے تر ہو گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جمیل صاحب گھبرا گئے اور انار کا عرق قریب رکھا تھا۔ اس کے دو چمچے پلائے اور اپنے رومال سے چہرے کا پسینہ خشک کیا۔ اس کے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر گرم کرتے رہے اور

کوئی دس منٹ بعد جھک کر کہا۔

''مس خان کچھ تو کہو کیا تکلیف ہے؟ ابھی ڈاکٹر آتا ہے۔ تھوڑی دیر میں طاقت آ جائے گی۔ وہ کوئی دوا یا انجکشن دے دے گا۔ میں آج رات کو یہیں رہوں گا۔ ایک نرس بھی بلائی گئی ہے۔ جب تک بیمار ہو ہر وقت تمہاری خدمت میں رہے گی۔ مس خان آہستہ دو تین لفظ تو کہو۔ مجھ سے ناراض ہو بے شک میں تین دن نہیں آ سکا لیکن مجھ کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ تمہارا اس دن کا تھوڑا سا بخار اس قدر تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ میں تو روز ڈاکٹر کو بھیجتا رہا۔ اس کمبخت نے بھی تمہاری اس حالت کی خبر نہ دی۔ میری غلطی کو معاف کر دو۔ میں ایسا ہی مجبور تھا کہ نہ آ سکا۔ اب خوش ہو جاؤ۔ خدارا آنکھیں کھولو اور مجھ سے کچھ کہو۔''

جمیل صاحب سے یہ باتیں سن کر مریضہ نے کچھ آنکھیں کھولیں۔ ان کی طرف دیکھا فوراً ہی دونوں آنکھوں سے دو قطرے نکل کر زرد رخساروں پر ڈھلک آئے۔ لبوں کو کچھ جنبش ہوئی مگر الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ یہ حالت دیکھ کر جمیل صاحب کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھیں فوراً بند ہو گئیں۔ جمیل نے جھک کر دیکھا نیلگوں لبوں پر اب بھی ہلکی سی کپکپی نظر آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ مریضہ کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر طاقت گویائی جواب دے چکی تھی۔ آہ! اس وقت کیا دیکھ رہے تھے۔ ایک نہایت ہی عزیز چیز ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ان کو سخت افسوس یہ تھا کہ آخری وقت وہ ایک بات بھی نہ کر سکی۔ خدا جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کا جسم بالکل سرد ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ ٹھیک کر کے اوپر اچھی طرح کمبل لپیٹ دیا اور بہت گھبرائے اور ڈاکٹر کے منتظر تھے۔ چند منٹ بعد وہ آ پہنچے اور نہایت تیزی سے پلنگ کے قریب آیا۔ جھک کر مریضہ کو دیکھنا شروع کیا۔

جمیل صاحب کی عجیب حالت تھی۔ ڈاکٹر کی مایوسی کو پہچان کر جمیل صاحب کمرے سے باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر پندرہ منٹ اچھی طرح دیکھ کر مریضہ کو سر تا پا چادر اڑھا کر نہایت افسردہ حالت میں باہر آیا۔ نرس حیران صورت دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ جمیل صاحب نے حیرت بھری نگاہ سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے خموشی کے ساتھ آنکھیں نیچی کر لیں۔ وہ فوراً دوڑ کر اندر آئے اور اس کے قریب گر گئے۔ نرس اور ڈاکٹر نے دوڑ کر سنبھالا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ان کی حالت کچھ درست ہوئی۔ ہوش میں آئے لیکن جو

اس بجانہ تھے۔ ڈاکٹر سے کہا: ”مجھ کو مریضہ سے باتیں کر لینے دو۔“

ڈاکٹر نے جواب دیا: ”ذرا ٹھہریئے۔ مریضہ کو اچھی طرح ہوش آ جائے وہ خود ہی باتیں کریں گی۔ میں آپ کو اور مریضہ کو اپنے ساتھ ہسپتال لے چلتا ہوں وہاں ٹھیک علاج ہوگا۔“

چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے جمیل صاحب کو پکڑ کر کار میں بٹھایا اور یہ کہہ دیا کہ ”ابھی ہسپتال کی گاڑی پر نرس مریضہ کو لے کر آتی ہے پہلے آپ چلیں۔“

جمیل صاحب کو اس وقت بخار تھا۔ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ گاڑی میں آنکھیں بند کئے ڈاکٹر کے سہارے بیٹھے رہے۔ ہسپتال پہنچ کر ڈاکٹر نے ان کو لٹا دیا۔ اب ان کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں اور مس خان کہاں۔ ایک دوسرے ڈاکٹر اور نرس کو ان کی خبر گیری پر مقرر کر کے ڈاکٹر خود پھر اسی گاؤں گیا۔ آہ وہ بے کس و لاوارث لاش ابھی اسی طرح پڑی تھی۔ اس کی خادمہ اسباب سمیٹتی باندھتی پھر رہی تھی اور وہ نرس برآمدہ میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ یہ ڈاکٹر چونکہ مسلمان تھے۔ ایک دو مسلمان ہسپتال سے ساتھ لیتے آئے تھے جن کے ذریعہ قریب کی مسجد میں اطلاع کرائی۔ چند آدمی اور دو عورتیں آ گئیں۔ غریب پردیسی عورت کا غسل کفن ہوا۔ ڈاکٹر صاحب خود موجود رہے اور جنازہ قریب کے دیہاتی قبرستان روانہ کر دیا۔ پھر کمرے کو قفل لگا کر کنجی خود لے لی اور اس خادمہ سے کہہ دیا کہ ”جب تک بیرسٹر صاحب تندرست ہو کر یہاں آئیں۔ تم اسی جگہ موجود رہو۔“ خادمہ نے ایک مقفل بکس ڈاکٹر صاحب کے حوالہ کیا کہ یہ نواب صاحب کو دے دو اور ایک بند لفافہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

”یہ چٹھی مس صاحبہ نے لیٹ لیٹ کر بڑی مشکل سے تین چار گھنٹہ میں لکھی تھی اور کہہ دیا تھا کہ میرے مرنے کے بعد بیرسٹر صاحب کو دے دینا اور اگر میں زندہ رہی اور اچھی ہو گئی تو پھر مجھ کو واپس کر دینا۔“

”تقدیر کا لکھا وہ اچھی نہ ہو سکیں۔ اب یہ چٹھی میں آپ کو دیتی ہوں جب بیرسٹر صاحب اچھے ہو جائیں تو ان کو دے دیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے وہ خط جیب میں رکھ لیا اور وہ چھوٹا بکس گاڑی میں رکھوا دیا۔

ایک چوکیدار تو پہلے سے مقرر تھا۔ ایک اپنا آدمی ڈاکٹر صاحب نے اس مکان کی حفاظت کے لئے یہاں اور چھوڑ دیا اور نرس کو لے کر روانہ ہو گئے۔ تین چار دن جمیل صاحب کی طبیعت بہت خراب رہی اور وہ ہسپتال ہی میں ٹھیرے رہے۔ وہ جلدی اس کی قبر پر جانا چاہتے تھے۔ مگر ڈاکٹر نے اجازت نہ دی۔ گھر سے وہ شکار کیلئے چار دن کی اجازت لے کر آئے تھے اور آج پانچواں دن تھا۔ گھر پہنچنا ضروری تھا۔ ڈاکٹر سے رخصت ہونے لگے۔ اس نے مرحومہ کا وہ صندوقچہ اور بند لفافہ ان کے سپرد کیا اور یہ تاکید کردی کہ اس خط کو آپ اپنے گھر جا کر پڑھیں۔ راستے میں ہرگز نہ کھولیں۔ انہوں نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل تو کیا کہ خط راستہ میں نہ کھولا۔ مگر دوسری بات نہ مانی۔ جواں مرگ ٹائی پسٹ خاتون مس خان مرحومہ کی قبر دیکھے بغیر قصر خلیل نہ جا سکے۔ ہسپتال سے نکل کر سیدھے اس کچے خستہ حال دیہاتی قبرستان پہنچے۔ کار سڑک پر رکی اور خود شکستہ قبروں میں تازہ قبر تلاش کرنے لگے مگر نہ پہچان سکے کہ اس غریب الوطن کی قبر کون سی ہے۔ مجبور پھر اس کے مکان پر آئے جہاں دو چوکی دار پیپل کے درخت کے نیچے حقہ پیتے نظر آئے۔ جو ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مکان کے اندر داخل ہوئے۔ آنکھوں سے بے اختیار اشک رواں تھے۔ وہ بوڑھی خادمہ برآمدہ میں بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھی۔ آگے پاندان کھلا پڑا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی روتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے کنجی خادمہ کو دی۔ اس نے دروازہ کھولا اور وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ سب سامان اسی طرح پڑا تھا۔ دواؤں کی شیشیاں، پلنگ، کتابیں وغیرہ وغیرہ بیرسٹر صاحب کو اب تاب نہ رہی۔ اسی پلنگ پر لیٹ گئے اور بہت دیر تک روتے رہے۔ پھر خادمہ سے کچھ باتیں ہوئیں۔ ان سے پوچھتے رہے کہ آخری رات مس صاحب نے کیا باتیں کیں۔ اس نے سب حال سنا دیا۔ اس نے بتایا۔ ''مس صاحبہ کو تو شاید معلوم ہو گیا تھا کہ اب دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ بار بار دروازہ کی طرف دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں کہ خدا کرے میری زندگی میں بیرسٹر صاحب آ جائیں اور مجھ کو یہ خط لکھ کر دے گئی ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ میرے مرنے کے بعد ان کو دینا۔ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو دیا ہوگا۔''

اس کے بعد بیرسٹر صاحب اٹھے۔ مرحومہ کی کتابیں اور اس کی چھوٹی چھوٹی خاص خاص چیزیں۔ مثلاً کنگھی، آئینہ، فونٹن پین، صابن، وغیرہ اس کے اٹیچی کیس میں رکھ

کر اپنی گاڑی میں رکھوا دیں اور کپڑوں کا بکس خیرات کرنے کو کہہ دیا۔ باقی چیزیں برتن باورچی خانہ کا سامان سب اس خادمہ کو بخش دیا اور اس چوکیدار کو لے کر قبرستان آئے۔ ایک تازہ قبر جس پر ایک کیکر کے درخت کا سایہ تھا۔ چوکیدار نے بتائی۔ بہت دیر بیٹھے وہاں بھی روتے رہے۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ شوفر نے آ کر یہاں سے اٹھایا اور گھر لے گیا۔

(۳۲)

جمیل صاحب گھر پہنچے تو سب لوگ چشم براہ تھے۔ پہلے والدین اور والدہ کے پاس گئے۔ وہ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے تو انہوں نے کہہ دیا۔

"کچھ گرمی تھی۔ کچھ تکان۔ شکارگاہ میں مجھ کو دو روز بخار رہا۔ اسی وجہ سے واپسی میں دیر ہوگئی۔"

اس کے بعد بیوی کی طرف آئے۔ وہ ان کے آنے کی خبر سن چکی تھیں۔ برآمدہ میں ہی ٹہل رہی تھی۔ ان کی ایسی کمزور اور پریشان حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ان سے بھی وہی کہا جو والدین سے کہہ آئے تھے۔ کمرے میں آ کر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بیوی سے کچھ باتیں کیں۔ پھر آنکھیں بند کرلیں، شاید سو گئے۔ اُن کی بیوی کو اب نواب بیگم سلطان صاحبہ نے بلا بھیجا۔ وہ شوہر کو سوتا سمجھ کر اُدھر چلی گئیں۔ جمیل صاحب وہ صندوقچہ اور اٹیچی کیس تو باہر کے کمرے میں رکھوا آئے تھے لیکن اس کا آخری خط جیب میں تھا۔ جب بیوی یہاں سے چلی گئیں تو کمرے میں چاروں طرف نظر ڈال کر کہ کوئی ہے تو نہیں خط کھولا۔ مضمون یہ تھا:

منحصر ہو جس کی مرنے پر مراد
نامرادی اس کی دیکھا چاہئے

میرے مالک!

آج تین دن گزر گئے آپ تشریف نہیں لائے۔ آپکو بھی کیا معلوم کہ میری کیا حالت ہے۔

ہلکا ہلکا بخار تو بہت دن سے تھا بلکہ اس گاؤں میں آنے سے پہلے بھی جبکہ میں آفس میں کام کیا کرتی تھی، روز شام کو حرارت ہو جایا کرتی تھی۔ ادھر دو تین ہفتہ سے طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی مگر میں نے آپ پر ظاہر نہیں کیا۔ اس ہفتہ میں بخار بہت تیز رہا۔ مہمان داری کی وجہ سے دن میں آپ دو ہی بار تشریف لائے۔ ان تین چار دن میں میری حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ آج کا دن بہت ہی تکلیف میں گزرا۔ بہت دن سے ڈاکٹر مجھ کو کبھی ملیریا کبھی معیادی بخار خیال کرتا رہا لیکن کل صبح جو آ کر سینہ کا معائنہ کیا تو بتایا کہ میرے دونوں پھیپھڑے بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد سے مجھے سانس میں کچھ تکلیف معلوم ہونے لگی۔ کھانسی اور بخار بھی بڑھ گیا۔ ایک رات اور ایک دن شدید تکلیف اور بے چینی میں گزرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ میرا آخری وقت قریب ہے اور خدا کا شکر ہے کہ آپ کے زیر سایہ ہوں گو بہت دور ہوں۔ اللہ کرے فرصت ہو جائے اور آپ جلد آ سکیں۔ آج شام سے تو مجھ سے بات بھی نہیں کی جاتی۔ بے حد کمزوری ہے۔ ڈاکٹر تو کل صبح آئیں گے۔ خدا آپ کو جلدی لے آئے۔ میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہونے سے قبل آپ کو دیکھ سکیں۔ اب ذرا میری یعنی اپنی خادمہ مس خان کی اصلیت سے بھی واقف ہو جائیں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ اب سے کچھ عرصہ پیشتر جب کہ خوش نصیبی سے آپ کی ہمسفری میسر آ گئی تھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ کلکتہ آ کر رہو کبھی کبھی تو مل لیا

کریں گے، مجھے آپ کی یہ تجویز بہت پسند آئی تھی
اور اسی وقت یہ ارادہ کرلیا تھا کہ بقیہ زندگی آپ کے
قدموں میں بسر کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں نے
اپنے کیے کی کافی سے زیادہ سزا پالی میری عقل نہ ماری
جاتی تو آج میرا یہ حشر کیوں ہوتا۔ میں کلکتہ آئی اور مس
خان کے روپ میں آپ کے ہاں ملازمت کی مگر آہ میں
بدنصیب اس قابل بھی نہ تھی کہ ملازمت کی حیثیت میں
ہی آپ کی خدمت میں رہ جاتی۔ شاید نجمہ کی ہم شکل
ہونے کی وجہ سے آپ نے مجھ سے ہمدردی کی اور وہاں
سے بھی نکالی گئی۔ اب کئی ماہ سے یہاں جنگل میں پڑی
آپ کی مہربانی پر زندگی بسر کررہی ہوں لیکن یہ غم مجھ کو
گھن کی طرح کھا رہا ہے کہ ایک اجنبی عورت پر کیوں اس
قدر مہربانی کررہے ہیں جو سراسر ناجائز ہے۔ آپنے
یہاں ایک اسکول کھول کر مجھے معلّمہ مقرر کرنے کا خیال
ظاہر کیا تھا جس سے مجھ کو دلی خوشی، طمانیت حاصل ہوئی
تھی کہ اسکول کھل گیا تو محنت کی اجرت پر زندگی گزار
دوں گی لیکن بیماری نے زور پکڑ لیا اور میں اس قابل بھی
نہ رہی۔ آپکو ضرور افسوس ہوگا کہ زندگی میں میں نے
نجمہ ہونا کیوں چھپایا مگر میں مجبور تھی اور مصلحتاً ایسا کیا گیا
لیکن اس بھیس میں بھی کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ آفس کی
ملازمہ ایک غیر عورت پر آپ کا مہربان ہونا ویسا ہی سمجھا
گیا جیسا کہ نجمہ کی صورت میں ہوتا۔ اچھا مرے آقا!
میں اب رخصت ہوتی ہوں۔ ہاتھ کانپ رہا ہے پنسل
گری جاتی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے چار گھنٹے میں یہ خط ختم

کیا ہے۔اب سانس پھول گئی۔خدا حافظ جس وقت یہ
عریضہ آپ کے ہاتھ میں پہنچے گا۔آپکی بدنصیب نجمہ دنیا
میں نہ ہوگی۔"

آپ کی جاںنثار
نجمہ

اس خط کو پڑھ کر جمیل حیران رہ گئے۔اُنکا سر چکرانے لگا۔آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ایک دم اٹھ بیٹھے۔منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"نجمہ!ہائے نجمہ!!اس حالت میں رہ کر دنیا سے اٹھ گئی۔"

پھر کھڑا نہ ہوا گیا فرش پر لیٹ گئے۔بیوی بھی آ گئیں دیکھا کہ وہ آنکھیں بند کئے زمین پر پڑے ہیں۔قریب ہی پنسل سے لکھا ہوا ایک کاغذ پڑا تھا۔شکیلہ نے اٹھا کر پڑھ لیا۔حیران ہو گئی۔گھبرا کر شوہر کی طرف جھکی۔ہاتھ لگایا تو ان کو تیز بخار چڑھا تھا۔گھبرا گئی اور ڈاکٹر کو بلایا اور ایک تار جبل پور انجینئر قمر صاحب کو دے دیا گیا کہ "جمیل بیمار ہیں جلد آ جاؤ۔"

شکیلہ کا تار پہنچتے ہی قمر صاحب پریشان ہو کر اپنی بیوی کو نرسوں پر چھوڑ کر جو ابھی زچگی میں تھیں اور چلہ نہیں نہائی تھیں۔فوراً کلکتہ روانہ ہو گئے۔وہاں پہنچ کر دیکھا کہ جمیل صاحب بیمار ہیں۔بخار تو اتر چکا تھا مگر قلبی صدمہ کی وجہ سے بے حد کمزور تھے۔قمر صاحب کے ساس خسر سالی وغیرہ سب یہیں تھے مگر وہ سارا وقت جمیل صاحب کے ساتھ گزارتے تھے۔وہ نجمہ مرحومہ کا ہی ذکر کرنا چاہتے تھے لیکن یہ بہلا بہلا کر دوسری باتیں کرتے رہتے تھے شکیلہ سخت پریشان تھیں۔قبرستان کا کئی میل کا فاصلہ تھا مگر روزانہ جمیل قبرستان جاتے قمر وہاں بھی ساتھ جاتے تھے۔جمیل دُبلے اور زرد ہو گئے تھے۔قمر سے کہا کہ۔

"میں خدا کے خوف سے ڈرتا ہوں ورنہ خودکشی کر لیتا۔آہ! وہ مجھ پر قربان ہو گئی اور میں زندہ رہوں۔آہ!میں خوشگوار زندگی بسر کروں اور وہ تنہائی میں میری جدائی کے رنج میں مر جائے۔"

قمر مسوری کا کامران سے نسبت کا واقعہ یاد دلاتے تو کہتے کہ اس وقت تک اس کو

یہ علم نہ تھا کہ میرے دل میں اس کی کس قدر محبت ہے۔ میری خاموشی سے اس نے بے پرواہ سمجھ کر کامران سے رشتہ کرنا گوارا کیا مگر جیسے ہی مجھ سے ملی اور میری حالت سے دلی کیفیت کا اندازہ کیا۔ فوراً کامران کو چھوڑ دیا۔

قمر صاحب آٹھ دن کی چھٹی لائے تھے۔ آٹھ دن کی اور منگائی اور ان کو پھر سے دنیا میں لگانا چاہا مگر وہ پوری طرح صبر نہیں کر سکتے تھے۔ بیوی نے بھی خط پڑھ لیا تھا اور انہوں نے خود بھی بتا دیا کہ "اس وقت مجھے سخت صدمہ ہے بجائے غصہ کے مجھ پر رحم کرو۔"
ایک دن شام کے وقت جب کہ جمیل صاحب والدین کے پاس گئے ہوئے تھے۔ شکیلہ (بھائی کی بیماری اور نجمہ کی موت کی خبر دے کر قمر صاحب نے جمیلہ کو بھی بلا لیا تھا) اور قمر صاحب باغ میں گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ "بھائی قمر آپ کی رخصت تو پھر قریب ختم ہے۔ ان کی حالت ابھی درست نہیں کیا ہوگا۔"

شکیلہ نے کہا "میں بھی اسی فکر میں ہوں۔ جمیلہ بیگم کے تو وہ بس کے ہیں نہیں۔ میں پھر بھی کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ قمر نے کہا۔

شکیلہ نے پھر مسکرا کر جمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا: "ہونا تو چاہئے تھا۔" جمیلہ بھی قمر سے کچھ کم نہ تھیں "مگر شادی کے بعد علیحدہ رہ کر جمیلہ کو بھائی کا اس قدر خیال نہیں رہا۔"

"بھابی جان ایسا نہ کہئے۔ بھائی جمیل پر اب بھی میری جان قربان ہے۔ علیحدہ رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی بلکہ تشنگی اور بڑھتی ہے مگر صرف آپ کے خیال سے میں نے بھائی سے ملنا کم کر دیا کہ کہیں آپ مجھ سے بھی ناخوش ہو جائیں کیونکہ بیوی چاہتی ہے بعد شادی شوہر سوائے میرے کسی کا نہ رہے۔ حقیقی بہنیں ناگوار ہوتی ہیں تو رشتہ کی تو الگ رہیں۔"

یہ سنتے ہی قمر صاحب نے مسکرا کر کہا: "نہ صرف خالہ زاد بہن کا رشتہ بلکہ ایک اور رشتہ کا بھی خیال تھا۔"

اس پر شکیلہ بیگم ذرا جھلا کر بولیں: "قمر صاحب ایسا کہنا آپ کو مناسب نہیں ہے۔ ابتدائی زندگی سے آپ واقف ہیں۔ جمیل صاحب کی جس دن سے مجھ سے نسبت ہوئی ہے میں نے جس قدر ہمت اور حوصلہ سے کام لیا ہے۔ اس کی کوئی اور مثال آپ دے سکتے ہیں؟ شادی کے وقت نجمہ صاحبہ موجود تھیں اور میں بخوشی ان سے ملتی تھی۔ میرا تو ایسا

دل ہی نہیں اور جمیل کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھا۔ ٹائی پسٹ لیڈی پردہ پروانہ دار رہے۔ میں نے یہ بھی برداشت کرلیا۔ اب اپنی جان کھو رہے ہیں۔ میں دم بخود ہوں۔ کچھ نہیں کہتی۔ جو اصلی سوت تھی۔ اس کو تو میں نے بارہ سال برداشت کیا۔ وہ الگ ہوتی تب بھی وہ رات دن سرد آہیں بھرا کرتے، بہت ہی محبت بھری ساعتوں میں جبکہ وہ مجھ پر بھی نثار ہوا کرتے تھے، کسی کے خیال کے آتے ہی گم ہوکر آہ کرلیتے تھے۔ ان کی اس کیفیت سے بیوی کے دل پر کیا اثر ہوتا ہوگا؟ ذرا اور بیویاں اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں؟ مگر میں خاموش رہی اور ہوں لیکن اب میرا پیمانہ صبر سے لبریز نظر آتا ہے۔ مری ہوئی کے اوپر جان دے کر وہ ایک ایسی ہستی کو تباہ کررہے ہیں جس کی زندگی کا انحصار ان کے صرف ان کے رحم پر ہے۔'' یہ تقریر کرکے شکیلہ خاموش ہوگئی۔

چاند نکل آیا۔ شب کی سیاہی پھیلنے لگی۔ شکیلہ نے اپنا رُخ کھجور کے درخت کی طرف کرلیا جس میں سے جھانکتا ہوا چاند نظر آرہا تھا۔ قمر صاحب خود رقیق القلب اور پژمردہ طبیعت انسان تھے۔ ان کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ ایک نظر جمیلہ بہن کی طرف دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ جمیلہ ایسی تیز طبیعت کو کہاں صبر تھا اس نے فوراً بھاوج کو جواب دیا۔

''بھابی جان اس وقت آپ کا برسنا مجھ غریب پر تو بے جا ہے۔ اپنے شوہر کو سنائیے۔ میں کہہ سکتی ہوں اور نہ قمر صاحب، کوئی یہ تقریر بیان کرکے اُنکے زخموں پر نمک چھڑک سکتے ہے۔ آپ خود ہی کہہ دیں۔ رہا یہ کہ بیویاں اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں اس کی کسی کو ضرورت نہیں ہے جس پر جیسی گزرتی ہے، برداشت کرلیتا ہے۔ بہت سی بیویاں ایسی بھی ہیں جو اپنے پہلے منگیتروں کو نہیں بھولتیں اور بے مرضی بیاہ دی جاتی ہیں۔ وہ شوہر بھی تو ایسی ایسی سرد آہیں برداشت کرتے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ جمیل میرے تو بھائی ہیں۔ بے شک وہ مجھ کو جان سے اور شاید آپ سے زیادہ چاہتے ہوں کیونکہ میں اکلوتی بہن ہوں۔ بہت سے شوہر اپنی منگیتر کو نہ بھولنے والی بیوی کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔''

جمیلہ کا یہ طنز آمیز اور سخت جواب سن کر شکیلہ یہاں سے خاموش کھڑی ہوگئیں اور رومال سے آنکھیں پونچھتی ہوئی کمرے کی طرف گئیں۔ قمر صاحب قریب ہی کھڑے

مسکرا رہے تھے۔ جمیلہ کے پاس آ کر کہا۔

"غضب کیا جمیلہ بہن۔ تمہیں ایسا سخت جواب نہ دینا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟ وہ تو مجھ سے جلتی ہیں۔ میں تو بھائی کو نہ چھوڑوں گی (ذرا مسکرا کر) وہ تو حقیقی بھائی ہیں۔ میں نے تو اپنے بنائے ہوئے بھائی کو بھی نہ چھوڑا۔ گو وہ بھاگا بھاگا پھرا۔"

قمر یہ سنکر ہنس پڑے اور کہا: "جمیلہ عجیب انسان ہو۔ دیکھو وہ بھائی اپنی بیوی کو چھوڑ کر جمیل کیلئے آ گیا"

"جمیل چیز ہی ایسی ہے مگر بہن بھی پیچھے ہی آ گئی۔" جمیلہ نے جواب دیا۔

قمر نے کہا: "میں جمیل صاحب کو جبل پور ساتھ لے جاؤں گا۔ یہاں وہ سنبھل نہ سکیں گے شکیلہ بھی بچی ہیں اور وہ بھی۔ مگر بہن تم اس قدر تلخی سے بھاوج سے گفتگو نہ کیا کرو۔ بہت بری بات ہے۔"

جمیلہ بولیں: "تو وہ کیوں جلتی ہیں۔ بھائی جمیل ہمارے ہیں اور ہم ان کے۔"

☆

(۳۳)

جمیلہ اور قمر باتیں کر رہے تھے کہ کھانے کا بلاوا آ گیا اور دونوں کو اٹھنا پڑا۔ جمیل صاحب اس وقت کھانے پر نہ تھے۔ محل بھر میں تلاش کیا گیا کہیں نہ ملے۔ شکیلہ بیگم سمجھ گئیں کہ قبرستان گئے ہیں۔ قمر صاحب کا بھی یہی خیال تھا مگر شکیلہ کے خیال سے گھر پر ہی رہے۔ ان کے پیچھے نہ گئے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ شکیلہ اس وقت بہت ہی مغموم تھیں۔ ان سے کھانا بھی نہ کھایا گیا اور سب سے پہلے اٹھ گئیں۔ جمیلہ حسب معمول سب سے ہنس بول کر کھانا کھا رہی تھیں۔ قمر چند منٹ بعد وہاں سے اٹھ کر باغیچہ میں چلے آئے۔ وہاں دیکھا کہ بچاری شکیلہ بیگم ایک پتھر کے بنچ پر پریشان بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہ بھی وہیں آ کر قریب بیٹھ گئے اور کہا۔

"بھابی جان! آپ اسقدر پریشان نہ ہوں۔ جمیل پر ابھی تازہ صدمہ ہے اور زیادہ ہے۔ رفتہ رفتہ کم ہو جائیگا اور پھر بھول جائیں گے۔ یہی دیکھئے ان کی جدائی میں شروع میں کس قدر غمگین رہے لیکن آخر بھول گئے۔"

یہ سن کر غمزدہ شکیلہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ شب ماہتاب تھی۔ قمر صاحب اس بے بس خاتون کی حالت دیکھ کر خود بھی بے چین ہو گئے۔

اس وقت صحن چمن کا عجیب پر کیف عالم تھا۔ شفاف چاندنی پھیل رہی تھی اور گلاب کے قریب پتھر پر دونوں بیٹھے تھے۔ قریب ہی بیلے کے پھول مہک رہے تھے۔ کمرے سے گانے کی سریلی آوازیں آ رہی تھیں۔ قمر صاحب کی سالی جی دھیمے سر کے ساتھ گا رہی تھی مگر ان دونوں کے پژمردہ دلوں پر کچھ اثر تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد قمر صاحب بولے۔

"للہ بھابی جان آپ اپنے کو ہلکان نہ کریں۔ چند دن میں آپ کے جمیل بھائی

ٹھیک ہو جائیں گے۔"

شکیلہ نے ان کی آواز سنکر اپنا جھکا ہوا سر اُوپر کو اٹھایا اور چہرے پر سے بکھرے ہوئے بال ہٹا کر رومال سے منہ پوچھتے ہوئے کہا۔

"قمر بھائی! اس وقت تک میں نے بہت ہی حوصلہ اور صبر سے کام لیا اور میں بھی کمزور دل کی عورت ہوں۔ اب برداشت سے باہر ہے۔ اس وجہ سے اور زیادہ پریشانی ہے کہ ان کی صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ جدائی میں بے چین رہے۔ وہ مجبوری تھی لیکن اب جو مری ہوئی کے لئے جان کھو رہے ہیں، یہ ہم لوگوں پر کس قدر ظلم ہے۔"

"یہی سوچ کر میں چند روز کے لئے جمیل کو اپنے ہمراہ جبل پور لے جاؤں گا وہاں پہنچ کر وہ بہت جلد بھول جائیں گے۔"

شکیلہ نے کہا: "آپ کو معلوم ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہیں۔ وہ پہنچے قبرستان اور آپ کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ تنہائی میں وہاں اُن کی کیا حالت ہوگی؟ کاش مجھ کو بھی ساتھ لے جایا کریں۔"

قمر صاحب نے کہا: "میں جانتا ہوں۔ وہ وہیں ہیں۔ روز میں ہمراہ جاتا تھا اور جلد واپس لے آتا تھا۔ آج وہ تنہا اسلئے گئے ہیں کہ اچھی طرح دل کھول کر رولیں۔ میں نے جمیل سے یہ بھی کہا تھا کہ اپنی بیوی کو ساتھ لے جایا کرو تو جلدی واپس آجایا کرو گے۔ اس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ بیوی بدنصیب یہیں کافی رنجیدہ ہے۔ اور قبر پر لے جا کر زیادہ بے چین کروں۔ بھابی جان ابھی نئی بات ہے۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ اس قدر غم نہ کریں۔ میں نے نجمہ کے معاملہ میں جس قدر جمیل کو سمجھایا ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے کیونکہ میں شروع ہی سے اس رشتہ کے خلاف تھا۔ نجمہ گو حسین تھی اعلیٰ تعیلم یافتہ تھی اور جمیل اس کو بہت پسند کرتے تھے مگر نہ معلوم کیوں وہ لڑکی مجھ کو جمیل کے لئے پسند نہ تھی۔ جمیل ایسے عالی خاندان شخص کے لئے نجمہ کا معمولی درجہ کا گھرانا کچھ موزوں بھی نہ تھا۔ اس کے والدین تو تھے ہی نہیں۔ ایک چچا تھے جن سے میں مسوری پر ملا تھا۔ انہیں کے ساتھ وہ مسوری آیا کرتی تھی۔ وہیں جمیل سے ملاقات ہوئی۔ جب رشتہ کا خیال ہوا تو اس کے چچا نے تحقیقات کی۔ کلکتہ سے پتہ چلا کہ آپ کے خاندان میں سخت پردہ ہے تو وہ

آزاد لڑکی ڈر گئی اور اُن کا خیال چھوڑ دیا۔ دوسرے سال جو مسوری آئی تو انکی طرف رخ نہ کیا بلکہ ایک اور اینگلو انڈین نما نوجوان کامران نامی شخص کے ساتھ گھومتی نظر آئی۔ اس سال بھی جمیل میرے پاس مسوری پہنچے اور سب تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کامران کو ڈانس کا بہت شوق تھا۔ اسی وجہ سے وہ میری بیوی کے چھوٹے چچا مسٹر و مسز سالومن کے بہت عزیز دوست تھے۔ انہوں نے نجمہ کا رشتہ کامران سے تجویز کیا۔ اب نجمہ نے بھی ڈانس سیکھ لیا اور اسی سال جمیل کا دل اس کی طرف سے ہٹانے کے لئے میں نے کئی بار ناچ گھروں میں اور ہوٹلوں میں نجمہ کو ناچتے ہوئے انھیں دکھایا۔ بہت رنجیدہ ہوتے تھے مگر اس کا خیال دل سے نہیں نکال سکتے تھے آخر کامران کے حالات نجمہ کو جلد ہی معلوم ہوگئے۔ وہ ایک بڑا بدکردار شخص تھا۔ اس کا دل کامران کی طرف سے بُرا ہوگیا۔ فوراً ہی نسبت چھوٹ گئی۔ اب نجمہ کی آنکھیں کھلیں اور حواس بجا ہوئے، اس فرشتہ خصال نوجوان کی قدر معلوم ہوئی۔ پھر تو ان کی کنیز ہوگئی۔ سیزن ختم ہو رہا تھا۔ ہم سب لوگ مسوری سے چلے آئے کلکتہ پہنچ کر آپ سے شادی ہوگئی۔ واللہ بھابی جان یہ سن کر مجھ کو بے حد خوشی ہوئی کہ جمیل کا رشتہ اپنے گھر میں ہوگیا اور بیوی نجمہ سے کہیں زیادہ اچھی ملی مگر وہ آپ کی شادی کے وقت گھر پر یہاں موجود تھی۔"

بات کاٹ کر شکیلہ بولیں ——

"وہ شادی کے خیال سے آئی تھی مگر یہاں شادی ہو رہی تھی۔ کاش میں نے اسی وقت انکار کر دیا ہوتا تو جمیل صاحب کی اور میری زندگی برباد نہ ہوتی مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ کچھ جمیل صاحب بہت نرم دلی سے پیش آئے۔ کچھ نا سمجھی تھی۔ یہ خیال ہوا کہ ایسی شادیاں بھی اکثر کامیاب ہو جاتی ہیں۔ لڑکے بعد شادی اپنی پہلی دوستیوں اور محبتوں کو بھول جاتے ہیں اور بڑی وجہ میری خاموشی کی یہ بھی تھی کہ میں قدیم رسم و رواج کے خاندان کی پردہ نشین لڑکی تھی۔ بزرگوں کا خوف طاری تھا کہ جب ایک مختار لڑکا دل پر جبر کر کے بزرگوں کی خوشی کے خیال سے خاموش ہوگیا ہے تو میری کیا ہستی ہے۔ غرض جو ہونا تھا ہو کر رہا اور ہم دونوں کی زندگی بدمزہ اور دوبھر ہوگئی۔"

قمر نے جواب دیا: "ایسا نہ کہیے بھابی صاحبہ خدا نہ کرے کے آپ دونوں

میں بدمزگی ہو۔ جمیل عجیب وغریب انسان ہے، سب کچھ برداشت کرکے اس نے آپ کو کس قدر خوش رکھا۔ نجمہ علیحدہ علیحدہ ہوکر پھر کسی نہ کسی صورت میں مل جاتی تھی اوراب کے تو یہیں جمیل کے قدموں میں جان دینے کو آئی تھی۔ بھابی جان میں صحیح عرض کرتا ہوں۔ ہمیشہ میں اس کے خلاف رہا مگر اس کی حسرتناک موت کے بعد یہ مان لینا پڑا کہ دراصل ستی ہوجانے والی ہندی عورتوں میں سے تھی خدا جمیل کو زندہ رکھے، وہ شوہر پرست عورت پروانہ داران پر نثار ہوگئی۔ کامران کو چھوڑتے ہی اس نے اُن کو اپنا مالک قرار دے لیا تھا۔ گو شادی نہ ہوسکی تھی مگر وہ اپنے کو جمیل کی کنیز خیال کرتی تھی۔ آہ! بہت ہی نیک اور شریف عورت تھی۔ آپ اس کی طرف سے دل میں کوئی بُرا خیال نہ قائم کریں۔ ذرا بھی شبہ نہ کیجیے۔ وہ آخروقت تک ایک اور جمیل سے بیگانہ وار الگ رہی۔ جمیل مجھ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھتے۔ اُن کو تو اس کے آخری خط سے جو ہم سب نے پڑھا یہ علم ہوا ہے کہ وہ بدنصیب نجمہ تھی اُف کس قدر ہمت اور حوصلہ سے کام لیا۔ اس کا کمال عالی ظرفی ہے۔ کسی طرح ثابت نہ ہونے دیا کہ وہ نجمہ تھی۔ یہ سب کچھ صرف آپ کے خیال سے اس نے برداشت کیا کہ اگر نجمہ ہونا ظاہر ہوگیا تو آپ کو بے حد رنج ہوگا اور جمیل بھی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ خیر اب وہ رنج والم بھری دنیا سے اٹھ گئی، خدا اس کی مغفرت کرے۔ آپ بھی اس کے حق میں دعا کریں۔"

قمر صاحب کی یہ تقریر سن کر شکیلہ نے کہا۔

"بھائی قمر جو کچھ آپ نے فرمایا یہ سب درست ہے۔ وہ ضرور ایک نیک دل عورت تھی اور محبت پرست بھی لیکن اس نے اپنی زندگی میں مصیبتیں اٹھائیں اور دنیا سے ناشاد و نامراد گئی۔ اس بربادی میں کچھ تو اس کو اپنے کیئے کا پھل ملا اور کچھ اس کے چچا کی بے پرواہی اور بُری تربیت کا اثر تھا۔ قدیم طرز کی پابندیوں کی تو میں بھی حامی نہیں لیکن اسقدر آزادی کو بھی میں لڑکیوں کے لئے پسند نہیں کرتی ۔ کم سنی میں وہ بہت ناسمجھ ہوتی ہیں۔ کالجوں کی تعلیم بے پردگی اور بے حد آزادی فطرتاً انسان کو اپنی دلچسپیوں کے لئے ایسا ماحول بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میری یہ رائے نہیں کہ لڑکیوں کو سخت پردے میں بٹھایا جائے یا اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا جائے مگر اس امر کا خاص خیال رکھنا لازمی ہے کہ لڑکے لڑکیوں کو مذہبی

تعلیمی اور اچھی تربیت سب سے پہلے دی جائے۔ آپ کے جمیل کیوں اس قدر نیک اور خدا ترس ہیں؟ اسی لئے کہ بچپن ہی میں ان کو خدا اور اس کے احکام سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ بہت چھوٹی عمر میں وہ اور بھائی شکیل اس بات پر مجبور کئے جاتے تھے کہ وہ ایک وقت کی بھی نماز قضا نہ کریں۔ دونوں چار چار سال کے انگریزی اسکولوں میں داخل کر دیئے گئے تھے۔ گھر پر انگریز گورنسیں ان کو یورپی تربیت دینے کو مقرر تھیں۔ ساتھ ہی پانچویں سال سے ملاجی قرآن شریف کے لئے مقرر ہو گئے تھے اور اسی طرح بتدریج عمر کے ساتھ ان کی مذہبی تعلیم کیلئے بڑے عالم دین ملازم رکھے گئے تھے۔ اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ آپ کے جمیل صاحب رحم دل۔ فرض شناس اور خدا پرست ہیں۔ یورپ ہو آئے مگر اُن کے خیالات میں تزلزل نہ ہوا۔ برخلاف اس کے مرحومہ نجمہ بالکل مذہبی تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ وہ خود مجھ سے تعجب کے ساتھ کہتی تھیں کہ آپ کے یہاں کا بچہ بچہ نماز کا پابند ہے! میرے والدین کا تو انتقال بھی ہو چکا تھا۔ چچا، چچی نے پرورش کیا۔ نہ وہ خود مذہب کے پابند تھے۔ نہ مجھ کو کچھ بتایا۔ نماز تک چچی نے نہیں سکھائی۔ بی اے کر لینے کے بعد نماز کی کتاب منگا کر اس نے خود سیکھی چونکہ عادت نہیں پڑھنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ مرحومہ انگریزی بورڈنگ کی تربیت یافتہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ شائستہ مگر خدا کا خوف۔ ذرا ذرا سے کام میں مذہبی احکام کا جس قدر خیال ہم کم علموں کو رہتا ہے ان کو نہ تھا۔ ورنہ وہ ایسی بے باک فیشن پرست ہو کر اپنے کو تباہ نہ کرتیں۔ جائز ہونا جائز آزادی کو اپنا حق سمجھ کر جو چاہا سو کیا۔ صرف پردے کے خوف سے جمیل سے نیک نہاد شخص کو چھوڑ کر ایک آوارہ منش شخص سے ملتی رہیں اور اس سے نہ نباہی۔ پھر حقیر و ذلیل ہو کر جمیل کے قدموں پر آ کر گریں اگر لڑکیوں کو آزادی دی جائے تو اس کے یہی نتیجے ہوں گے۔ نجمہ نے اپنی زندگی حد سے زیادہ آزادی کی ہوس میں اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی اگر جمیل سچے مسلمان اور فرض شناس و رحم دل انسان نہ ہوتے تو ضرور ان سے بھی شادی کر لیتے اور میں زندہ در گور ہو جاتی۔ ان بے چارے نے قلبی و روحانی تکالیف برداشت کیں مگر اس سے دوسرا نکاح نہ کیا۔ قمر بھائی! آپ ضرور مجھ کو ایک پرانے خیال کی جاہل دقیانوسی عورت کہیں گے۔ یہ صحیح ہے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اس زمانہ میں لڑکیوں کو مغربی تعلیم تربیت کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم دینی بے حد ضروری ہے۔ ورنہ بہت

ہی برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اس اندھادھند تقلید مغرب فیشن پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی آزادی کی بدولت ایک معزز شریف مسلمان گھرانے کی لڑکی کیا کیا مصائب برداشت کر کے کس طرح ایک غیر شخص کے گھر آ کر کس بری طرح ناکام و ناشاد اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ کیا یہ اس کے اپنے کردار کا پھل اور اس کے چچا، چچی کی غفلت کا نتیجہ نہ تھا؟ کاش اس کے دل میں خدا کا خوف اور رسول ﷺ کی محبت ہوتی مذہب کا پاس ہوتا۔ ناموس خاندان کا خیال ہوتا اور وہ اپنے چچا کے ہاتھوں کسی کے سپرد ہو کر بے مزہ ہی سہی مگر عزت اور شرافت کی زندگی گزار دیتی۔"

قمر صاحب نے خاموشی سے یہ تقریر سنی۔ ان کے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ آبدیدہ ہو گئے۔ دونوں وہاں سے اٹھ کر روش پر ٹہلنے لگے۔ شب کے دس بج رہے تھے کہ جمیل صاحب اُن کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ قبرستان سے آ رہے تھے۔ خوف زدہ تھے اور اپنے دل میں بیوی کے مجرم۔

مذہب اور عشق

پہلا باب

تاج محل ہوٹل کی سمندر کی جانب والی تیسری منزل کی کھڑکی پر تین آدمی کھڑے دوربین کے ذریعے باری باری سے پی اینڈ او کمپنی کے جہاز ایس ایس ملوجہ کو دیکھ رہے ہیں۔ جو انگلستان سے آرہا ہے اور اپالو بندر کی گودی میں آنے کا منتظر کھڑا ہے۔

یہ تینوں لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر اور لیڈر سر ستیش چندر مکرجی، لیڈی مکرجی اور اُن کے صاحب زادے مسٹر ہریش چندر بیرسٹر ایٹ لا ہیں۔

ہریش چندر: بابوجی وہ دیکھئے جہاز کے چھت پر اپنی سیدھ میں سوشیلا جی بھی کھڑی دوربین سے ہم لوگوں کو دیکھ رہی ہیں۔

سوشیلا بائی سر مکرجی کی صاحبزادی ہیں۔ جو پانچ ہی سال کی عمر میں تعلیم و تربیت کی غرض سے انگلینڈ بھیج دی گئی تھیں۔ اب تیرہ سال کے بعد وہاں سے فارغ ہو کر آرہی ہیں۔ اُن کے والدین اور بھائی ان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ہر سال انگلینڈ جا کر اُن سے ملتے رہتے ہیں۔ اب وہ آرہی ہیں تو ان کے خیر مقدم کے لئے بمبئی تشریف لائے ہیں۔

آٹھ بجے ستیش چندر مع لیڈی مکرجی و مسٹر ہریش چندر ہوٹل سے نکل کر بندرگاہ پر تشریف لائے۔ جہاز گودی میں لگ رہا تھا۔ چار پانچ منٹ کے بعد سر مکرجی کے قلبی دوست سر لقمان جی و لیڈی لقمان جی اور اُن کی صاحبزادی رتن بائی اور سر لقمان کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر شبیر بھی تشریف لائے۔

ٹکٹ کے لئے گئے تھے۔ جہاز کے کھڑے ہوتے ہی سب لوگ اس کے ڈیک کے اوپر گئے۔ سوشیلا بائی کی آنکھیں فرطِ انبساط سے اشک آلود ہو گئیں۔ وہ سب سے پہلے

اپنی ماں سے اس کے بعد باپ سے پھر لیڈی لقمان اور سر لقمان وغیرہ سے ملیں۔

لیڈی لقمان: کیوں بیٹی جہاز میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

سوشیلا بائی: اور تو کچھ نہیں ریڈسی کی گرمی اور طوفانی موسم نے بہت ستایا۔ تین دن تک جہاز میں رولنگ رہا جس سے سارے مسافر بیمار ہو گئے۔

لیڈی لقمان: یہی وجہ ہے کہ آپ مضمحل نظر آ رہی ہیں۔

سر لقمان جی: (سر مکر جی کو مخاطب کرتے ہوئے) آپ خواہ مخواہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب سوشیلا بائی کے ساتھ غریب خانہ پر ہی تشریف لے چلیں۔

رتن بائی: ہاں میں بہن سوشیلا کو تو سیدھے اپنے گھر لے جاؤں گی۔

سب لوگ سر لقمان جی کی عالیشان کوٹھی میں پہنچ گئے۔ کمرے کے سارے پنکھے کھول دیئے گئے۔ پھر بھی سوشیلا بائی نے شکایت کی کہ یہاں گرمی بہت زیادہ ہے۔

لیڈی لقمان جی: (لیڈی مکر جی کو مخاطب کرتے ہوئے) لڑکی سمندر کی گرمی اور طوفان سے ماندہ ہو رہی ہے۔ یہاں بھی گرمی ہے اور لکھنؤ میں یہاں سے بھی زیادہ ہوگی۔ اسے براہِ راست شملہ روانہ کر دیجئے۔

لیڈی مکر جی: جی ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں اور ہریش چندر سے کہہ دیا ہے کہ شملہ تار دے دیں کہ کوٹھی صاف کر دی جائے۔

لیڈی لقمان جی: پیاری سوشیلا تو بہت عرصہ بعد واپس آئی۔ آپ نے تو اس کو بہت ہی کم سنی میں انگلینڈ چھوڑا تھا۔

لیڈی مکر جی: ہاں میری بچی صرف پانچ برس کی تھی جب میں نے اس کو وہاں چھوڑا تھا اور اب پورے پندرہ سال بعد واپس آئی ہے۔

سر چندر گھوش: مگر اس پندرہ سال کے عرصہ میں ہم دونوں اس کے دیکھنے کو کم از کم سات آٹھ بار لندن جا چکے ہوں گے اور برخوردار ہریش چندر تو آٹھ سال اس کے پاس ہی رہے گو اس طریق سے سوشیلا تعلیم و تربیت تو اچھی حاصل کر سکی ہے مگر اتنی کمی رہ گئی کہ اپنی ہندوستانی زبانوں سے بالکل ناواقف رہ گئی۔ وہ تو بنگلہ بھی تھوڑی بہت اس وجہ سے سمجھ سکتی ہے کہ بھائی کے ساتھ بولنے کا تھوڑا اتفاق رہا اور اب عرصہ سے ہمارا قیام بجائے

کلکتہ کے لکھنؤ میں ہے۔ جہاں اس کو ہندی زبان کی سخت ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ اب وہ اس کو سکھانا ہوگی۔

لیڈی لقمان: آپ نے اس امر کا پہلے سے کچھ خیال نہ رکھا۔ ہمیں اپنی مذہبی تعلیم اور مادری زبان کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہئے۔ دیکھئے میری رتنی جب انگلینڈ روانہ کی گئی تو ۱۲ سال کی تھی۔ اپنی زبان میں مذہبی تعلیم بخوبی حاصل کر چکی تھی۔ پھر بھی میں نے اتنا اور کیا کہ جب اس کو انگلینڈ چھوڑا تو اپنے ایک بوڑھے مذہبی عالم کو مذہبی تعلیم مکمل کرانے کے لئے اُن کے ساتھ کئی سال وہاں رکھا گذشتہ سال جب وہ واپس آئی ہے ہم یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ وہ اپنی مذہبی زبانوں میں بخوبی مہارت رکھتی تھی اور پیاری سوشیلا سوائے انگریزی کے ہم سے اپنی کسی ملکی زبان میں بات ہی نہیں کر سکتی۔

جس وقت یہ اپنے وطن اور عزیزوں میں پہنچے گی تو آپ پر دیکھنا کس قدر اعتراض ہوں گے اور وہ سب بجا ہوں گے۔

سر چندر جی: اوہ مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں اگر میں اپنے ملکی بھائیوں اور لکھنؤ کی برادری کے کہنے سننے کی پرواہ کرتا تو پندرہ سال وہاں رکھ کر تعلیم نہ دلوا سکتا۔

لیڈی گھوش: میری لڑکی ذہین ہے۔ بہت جلدی ہندوستانی زبان سیکھ جائے گی۔ پھر مذہبی کتابیں خود ہی دیکھ لے گی۔

سوشیلا: ابا جان آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

رتن بائی: (ایک قسم کا حلوہ پیش کر کے) چچا جان یہ حلوا تھوڑا لیجئے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے جس کو سب بہت پسند کرتے ہیں۔

لیڈی لقمان: ہاں میری رتنی یہ حلوہ بہت اعلیٰ قسم کا بنانا جانتی ہے جس نے چکھا بے حد تعریف کی۔ غالباً آپ بھی پسند کریں گے۔

سر چندر: (حلوا چکھ کر) بے شک بہت لذیذ ہے بیٹی تم نے یہ بنانے کی ترکیب کس سے سیکھی؟

رتن بائی: چچا جان سیکھی تو لندن میں تھی مگر ایک ہندی رانی سے جن کو مٹھائیوں کی نمائش میں وہاں اس حلوے پر تمغہ مل چکا تھا۔

سر چندر: دراصل یہ مٹھائی اسی قابل ہے اب تم سے گھر میں اوروں نے بھی سیکھ لی ہوگی؟ بیٹی تم جلدی سے اپنی بہن سوشیلا کو بھی سکھادو۔ تاکہ وہ لکھنؤ پہنچ کر سب کو بنا کر کھلائیں۔

رتن بائی: بہت خوشی سے اگر میری بہن سیکھنا چاہیں گی تو میں کل ہی کو بتادوں گی اور ہمارے ہاں تو صرف مسٹر شبیر نے بڑے اصرار سے مجھ سے سیکھ لی ہے۔ اماں جان نے اس طرف خیال ہی نہیں کیا۔

مسٹر شبیر: جناب میں نے بھی گھر کے ہی خیال سے سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ گذشتہ کرسمس پر جب میں گھر گیا تو اپنی دونوں بہنوں کو بتا آیا۔

سوشیلا: آپ کی بہنوں نے کہاں تعلیم پائی ہے۔

مسٹر شبیر: میری بڑی ہمشیرہ کی جلدی شادی ہوگئی۔ اس وجہ سے وہ کچھ حاصل نہ کر سکیں۔ چھوٹی ابھی ایک گرل اسکول میں پڑھتی ہیں۔ اس کے بعد کالج بھیجنے کا ارادہ ہے۔

لیڈی لقمان: وہ بہت اچھی لڑکیاں ہیں۔ میں ان کو یہاں بلا کر دیکھ چکی ہوں۔ کبھی موقع ہوا تو تم بھی مل کر بہت خوش ہوگی۔ خوبی اخلاق میں اپنے بھائی کا نمونہ ہیں۔

سوشیلا: (رومال سے چہرہ کا پسینہ خشک کرتے ہوئے) یہاں گرمی معلوم ہوتی ہے۔ ذرا باہر جانا چاہتی ہوں۔ رتن بائی چائے تو ہو چکی۔ چلئے ذرا باہر ٹہلیں۔

لیڈی لقمان: ہاں بیٹی اس بیچاری کو تو بہت گرمی معلوم ہوتی ہوگی ابھی کیسے ٹھنڈے مقام سے آرہی ہے تم موٹر کرا کے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ذرا پھیرا لاؤ۔ چھ بجنے والے ہیں۔ سات تک واپس آجانا۔ کیوں کہ مہمان آنے شروع ہو جائیں گے اور وہ ان کو ہی ڈھونڈیں گے۔

سوشیلا: چچی جان میں لمبے سفر سے اس قدر تھکی ہوئی ہوں کہ اس وقت سواری پر یا پیدل کہیں جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ صرف آپ کے پائیں باغ میں ذرا ٹہلوں گی۔

سر لقمان: اچھا بیٹی رتنی تم اپنی بہن کو یہیں ذرا باغ میں ٹہلا لاؤ۔

☆

دُوسرا باب

چندر کٹی شملہ

ماہ اگست آدھا گزر چکا ہے۔ یہاں موسم برسات عالم شباب پر ہے رات دن میں شاید ہی کوئی گھڑی ایسی گذرتی ہو جس میں بارش نہ ہوتی ہو۔ کئی کئی دن سورج نظر نہیں آتا۔ دو ہفتے ہوئے سر جتیش چندر مکرجی اپنی لائق بیٹی سوشیلا کو بمبئی سے یہاں لائے ہیں مگر مسلسل بارشوں کی وجہ سے وہ اب تک پوری طرح شملہ کی سیر نہیں کر سکیں۔ دوسرے تیسرے اپنی چھوٹی بہن کوشلیا بائی سے تو مل آتی ہیں جو یہاں کے یورپین اسکول میں تعلیم پا رہی ہیں۔

لیکن اپنی نند سے ملنے کے شوق میں چار دن سے مسز ہریش چندر بھی یہاں آئی ہوئی ہیں۔ سوشیلا کا زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گذرتا ہے۔ ان کی آپس میں نند بھاوج تو کیا بہنوں سے بھی زیادہ محبت ہے۔ کیوں مسز ہریش چندر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ آزاد خیال خاتون ہیں اور اپنی شادی کے بعد ایک بار لندن جا کر نند سے مل چکی ہیں۔ جس وقت کا ذکر ہے دو پہر کا ایک بج چکا تھا۔ لیڈی دتیش چندر اپنی آرام گاہ میں تھے اور یہ دونوں نند بھاوجیں جنوبی گلاس برانڈے میں کرسیوں پر بیٹھی تھیں اور مسز ہریش چندر کا خوبصورت بچہ جگدیش چندر ان کے پاؤں میں فرش پر کھیل رہا ہے جس کو دیکھ دیکھ کر ان کے دل کھلے جاتے ہیں۔ وہیں فرش پر جگدیش کی گورنس بیٹھی ہوئی کروشیا سے لیس بنا رہی ہے۔ تو اس وقت بھی بوندا باندی ہو رہی ہے مگر انہوں نے اوپر کی تمام کھڑکیاں سامنے کا منظر نظر آنے

کے لئے کھول رکھی ہیں۔ جہاں سرسبز پہاڑی پر بادل جھک رہے ہیں۔ سردی کی وجہ سے مسز ہریش چندر نے گرم ساڑی پر بھی گرم شال اوڑھ رکھی ہے لیکن سوشیلا معمولی ریشمی ساڑی میں ہیں۔ ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ کھڑکیوں کے تمام دروازے کھل گئے۔ جس کے زور کے کھٹاکے سے ڈر کر ننھا جگدیش ماں کے پیروں سے چمٹ گیا تو انہوں نے اٹھا کر سینہ سے لگالیا اور مس روزی دروازے بند کرنے لگی۔

مسز ہریش: مس روزی دیکھو جگدیش کو سردی ہو جائے گی۔ اس کو سمور کا کوٹ پہنا دو (اور نند سے) پیاری سوشیلا جی آپ بھی اپنا اوور کوٹ پہن لیجئے۔

سوشیلا: مجھے تو کچھ ایسی غیر معمولی ٹھنڈ نہیں معلوم ہو رہی ہے۔ اتنے میں درمیانی بڑا دروازہ کھلا اور بارانی کوٹ پہنے اور چھتری لگائے کوشلیا کمرے میں داخل ہوئی اور ہنستے ہوئے بہن اور بھاوج سے ہاتھ ملایا۔

مسز ہریش: اوہو کوشلیا پانی اور تیز ہوا میں تم کیوں نکلیں۔ دیکھو ہاتھ برف سے ہو رہے ہیں۔

کوشلیا بائی: بھابی جان۔ آخر پانی کا کہاں تک خیال کروں۔ وہ تو تھمتا ہی نہیں۔ آدھے دن کی چھٹی تھی وہ کیوں ضائع کرتی۔

سوشیلا: ہاں ہاں تم نے بہت اچھا کیا جو آگئیں۔ پانی سے کیا ڈرنا بھابی جان تو بوڑھیوں کی طرح سردی سے کانپتی جاتی ہیں۔

کوشلیا: نہیں سردی تو اس وقت واقعی بہت ہے۔ کیوں کہ آدھے گھنٹہ سے ہوا مسلسل تیز چل رہی ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ کوئی رکشا یا ڈانڈی مل جائے تو لے لوں مگر اسکول سے یہاں تک راستہ میں کوئی سواری نہ ملی اور میں شرابور ہو گئی۔

مسز ہریش: (ذرا غصہ سے) مس روزی دیکھو مس صاحب کے کپڑوں میں سے کس قدر پانی ٹپک رہا ہے۔ تمام قالین بھیگ گیا۔ تم ان کے کپڑے نہیں اتارتیں۔

روزی نے فوراً اٹھ کر برساتی اور کوٹ وغیرہ اتارا بوٹ کھولے اور دوسرے کمرے سے اوور کوٹ وغیرہ لینے چلی گئی۔ بھاوج نے جلدی سے اپنی شال میں لپیٹ لیا۔

کوشلیا: بھابی جان اس قدر مہربانی اور محبت کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ

نے تو مجھے خوب گرم کر دیا۔

مسز ہریش: خیر شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں یہ تو مرا فرض تھا۔ اب ایک ضروری بات سنو۔ سوشیلا جی آپ بھی ذرا کتاب بند کر کے ہماری طرف متوجہ ہوں۔

مسز ہریش: (خاصدان سے گلوری دے کر) بھائی ہمیں تو من موہن ناتھ نے بہت ہی تنگ کر رکھا ہے۔ ادھر مسٹر بی چندر بوس الگ جان کھا رہے ہیں جس دن میں شملہ روانہ ہو رہی تھی۔ وہ لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ تمہارے بھائی جان نے مجھ سے تاکید کر دی ہے۔ اب تمہارے انتخاب پر منظور کیا جائے گا۔

کوشلیا: (مسکرا کر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے) اوہو! بھابی جان میری ابھی کیا جلدی پڑی ہے پہلے مسز سوشیلا جی کی تو فکر کیجئے وہ مجھ سے تین سال بڑی ہیں۔

مسز ہریش: ہاں ان کی بھی کی جائے گی لیکن تمہارا معاملہ درپیش ہے۔ اسے جلدی یکسو کر لینا لازمی ہے۔ اس زمانہ میں اچھے بر بڑی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ اس وقت وہ دونوں نہایت تابعداری اور انکسار سے تمہارے خواست گار ہیں۔ پھر انہیں کوئی اور نہ اچک لے۔ تمہارے بھائی جان کی رائے ہے کہ تمہاری منگنی کی رسم کر لی جائے اور پھر سوشیلا بائی کا بھی انتظام کر کے دونوں شادیاں ساتھ کی جائیں۔

سوشیلا: (تعجب سے) اوہو ابھی سے میری شادی کی فکریں بھی ہونے لگیں یہ جانتی تو میں ابھی نہ آتی۔

مسز ہریش: ہاں سوشیلا جی اب آپ دونوں کی شادیوں کی بہت فکر ہے۔ آپ تعلیم سے بھی فارغ ہو چکیں اور شادی کی عمر بھی آ گئی ہے کوشلیا بھی جلد ہی کالج چھوڑنے والی ہیں۔ ان کے جو دو جگہ سے پیام آ رہے ہیں۔ وہ دونوں بہت معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے ہیں۔

من موہن ناتھ تو لکھنؤ کے ایک رئیس زادے ہیں جو وہیں کیننگ کالج میں تعلیم پا رہے ہیں اور اسی سال بی اے کا امتحان دیں گے نہایت نیک چلن خوبصورت نوجوان ہے اور ہماری کوشلیا کی بہت قدر و محبت کرتا ہے۔ مگر اتنی کمی ہے کہ وہ بنگالی نہیں لکھنؤ کے کشمیری پنڈت خاندان سے ہے۔ تاہم ہمارے آزاد خیال گھر والوں کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہے اور دوسرے

مسٹر پین چندر بوس انگلینڈ کے تعلیم یافتہ ایگزیکٹو انجینئر ہیں اور ہمارے ہم وطن کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ کوشلیا بائی سے ان کی بھی ملاقات ہے اور وہ بھی اس کو پسند کرتے ہیں۔

سوشیلا: تو گھر والے مسٹر بوس ہی کو ترجیح دیتے ہوں گے۔؟

مسز ہریش: ہاں یہ تو ظاہر ہے وہ اپنے ہم وطن ہونے کے علاوہ اس وقت ایک ہزار تنخواہ پا رہے ہیں اور بیچارا من موہن ناتھ ہنوز طفل مکتب ہے دیکھئے۔ اس سال بی اے میں کامیاب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ تاہم ان کے والدین اور بھائی کو ان کی رائے اور پسند کا زیادہ خیال ہے۔

سوشیلا: یہ بہت اچھی بات ہے۔ بتایئے کوشلیا جی کیا صلاحیں ہیں۔

کوشلیا: میں کیا بتا سکتی ہوں جب کہ میرے والدین، بھائی جان اور آپ دونوں سب ہی مجھ سے بڑے اور سمجھ دار ہیں۔

مسز ہریش: (مسکرا کر) یہ درست لیکن پیاری کوشلیا بات یہ ہے کہ من موہن تم سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ کہیں اسے نامنظور کرنا تمہاری طبیعت کے خلاف نہ ہو۔

کوشلیا: مگر انجینئر صاحب بھی تو بہت مہربانی فرماتے ہیں جو آپ سب کو منظور ہو مجھے اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔

سوشیلا: بھابی جان آپ مذاق کر رہی ہیں۔ یا درحقیقت من موہن ناتھ اس کو بہت چاہتا ہے؟

مسز ہریش: (سنجیدگی سے) سوشیلا جی میں مذاق نہیں کرتی۔ آپ گھر چل کر خود دیکھ لیں گی۔ من موہن ناتھ اس کے نام پر دیوانہ ہے۔ یہ تو دس مہینے یہاں خاصی خوش رہتی ہے اور وہ بے چارہ یہ زمانہ نہایت بے چینی سے گذارتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سے پڑھا لکھا بھی نہیں جاتا۔ صرف اسی کے خیال سے تیاری کر رہا ہے۔ جب یہ سرمائی تعطیل میں دو ماہ کے لئے لکھنؤ جاتی ہے تو وہ دو مہینے تقریباً ہماری ہی کوٹھی پر گذارتا ہے۔ یہ صرف کوشلیا کی لیاقت ہے کہ اس کی اس قدر محبت کے باوجود یہ ہماری خوشی پر دوسرے کو ترجیح دینے کو تیار ہے۔

سوشیلا: جب یہ حالت ہے تو پھر اس بچارے کو دکھ دینا ظلم ہے جو یقیناً کوشلیا

کو بھی نا گوار گذرے گا۔

کوشلیا: نہیں سسٹر اس کا تو آپ لوگ ذرا بھی خیال نہ کیجئے انجینئر صاحب اپنے ہم وطن انگلینڈ کے تعلیم یافتہ اور ایک معزز عہدے پر ممتاز ہونے کی وجہ سے اگر میرے بزرگوں کو منظور ہوں تو مجھے کسی طرح نامنظور نہیں ہو سکتے۔ بچارا من موہن کہیں اور شادی کر کے بھول بھال جائے گا۔

مسز ہریش: مشکل تو یہی ہے کہ وہ کہیں اور شادی ہی نہیں کرے گا۔ اس وقت تو سچے دل سے یہی ظاہر کر رہا ہے کہ "اگر کوشلیا سے رشتہ نہ ہوا تو عمر بھر کنوارا رہوں گا" سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو اس کی حالت پر بہت رحم آتا ہے۔ یوں تو جو سب کی رائے ہوگی وہی ہوگا مگر من موہن کی محبت کی قدر کرنی چاہئے۔

سوشیلا جی آپ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔ ہمارے گھر میں وہ اسی طرح رہتا ہے جیسے گھر کا بچہ۔ میں ان دونوں کے فوٹو بھی دکھاؤں گی۔ شاید میرے ساتھ ہوں۔

سوشیلا: اگر یہ حالات ہیں تو کوشلیا کو ضرور من موہن ناتھ ہی کو ترجیح دینی چاہئے۔ رہا یہ کہ وہ انجینئر صاحب سے کم علم ہے تو بی اے پاس کر لینے کے بعد انگلینڈ بھیجا جا سکتا ہے۔

کوشلیا: سسٹر آپ گھر تو چلئے دونوں سے ملاقات کیجئے پھر فیصلہ کیا جائے گا۔ بھابی جان چائے منگوائے گھنٹہ بھر باتوں میں ہی گذر گیا۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔

مسز ہریش: ہاں ابھی لو۔ میرا خیال تھا کہ شاید پتا اور ماتا جی کے ساتھ پیو گی۔ کیونکہ دو بجے وہ بھی چائے پر آجاتے ہیں۔

کوشلیا: ان کے ساتھ پھر سہی اس وقت صرف چائے منگوائیں۔ ایک ایک پیالہ پی کر ذرا گرم ہو جائیں۔

مسز ہریش چندر نے گھنٹی بجائی۔ آیا آئی۔ اسے چائے لانے کا حکم دیا۔ پندرہ دن اسی طرح ہنسی خوشی گذر گئے۔ اب بارشوں میں بھی کچھ کمی آچلی تھی۔ اور یہ دونوں نند بھاوجیں اکثر اوقات باہر گذارا کرتی تھیں۔

☆

تیسرا باب

ستمبر شروع ہو چکا ہے۔ اس ماہ میں شملہ پر غضب کی بہار آتی ہے۔ اوّل تو بارش میں کمی ہو جانے سے سرسبز پہاڑیاں اپنا نکھار اور گل ہائے رنگارنگ اپنی بہار دکھانے لگے ہیں۔ دوسرے لیجسلیٹو اسمبلی برساتی اجلاس کی وجہ سے تمام معزز روٗسا اور ممبران کونسل آف اسٹیٹ ملک کے ہر گوشہ سے سمٹ کر شملہ آ گئے ہیں۔ ہائی کورٹ میں تعطیل ہو جانے سے بیرسٹر جج وغیرہ بھی یہ مہینہ پہاڑ ہی پر بسر کر سکتے ہیں اور کوئی دوسرا مقام شملہ کی ان دنوں کی رونق اور چہل پہل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آج کل سر مکرجی کی خوش نما بلڈنگ "چندر کنج" میں بھی خوب رونق ہے کیوں کہ سوشیلا کے بھائی مسٹر ہریش چندر مکرجی بیرسٹر ایٹ لا بھی اپنے عزیزوں کے ساتھ لکھنؤ سے آ گئے ہیں اور سر لقمان جی بھی کونسل کی شرکت کے لئے یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیڈی صاحبہ تو ان کے ساتھ ہیں لیکن مس رتن بائی کو بمبئی چھوڑ آئے ہیں اور اپنے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر شبیر اور دیگر مصاحبین کو ہوٹل میں ٹھہرا رکھا ہے۔

ایک دن موسم خوش گوار دیکھ کر جب کہ چمکدار آفتاب کی شفاف دھوپ نے شملہ کو منور کر رکھا تھا۔ مسٹر و مسز ہریش چند سب کو پکنک کے لئے لے گئے۔ اور لیڈی گھوش نے از راہِ مہربانی مسٹر شبیر کو بھی ساتھ لے لیا۔

شہر سے باہر کوئی پانچ میل کے فاصلہ پر پھولوں سے لدی ہوئی ایک پُر فضا گھاٹی قیام کے لئے منتخب کی گئی۔ زمین کی خاصی بڑی ہموار سطح پر دو چھوٹے چھوٹے خیمے نصب کئے گئے۔ ایک میں نشست کا سامان کیا گیا۔ دوسرے میں کھانے کا آج چونکہ اتوار تھا۔ کوشلیا بائی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ خیموں کے آگے ایک دری پر کرسیاں ڈال کر سب بزرگ متمکن تھے

اور ان سے ذرا فاصلہ پر نیچے کی طرف ایک کھڈ کے قریب کوشلیا بائی نے ایک قالین بچھا کر اپنے نوجوان دوستوں کے بے تکلفانہ نشست بنائی تھی۔ صبح آٹھ بجے سے پہلے پہلے یہ پارٹی یہاں پہنچ گئی تھی۔ کھانے کی کچھ چیزیں یہیں تیار کرنے کا سامان لڑکیاں ساتھ لائی تھیں۔ مسز ہریش چندر خاص طور پر کھانا پکانے کی بہت شوقین تھیں۔ اس لئے ایسے موقعوں پر خانساماں کو بھی ساتھ نہ لیا کرتی تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے انہوں نے مل کر چائے خود تیار کی۔ اس کے بعد کھانا پکانے کے انتظام میں لگ گئیں۔ سر مکرجی نے فرمایا کہ جو چیز جس کو اعلیٰ درجہ کی بنانی آتی ہے آج وہ اپنے ہاتھ سے تیار کرے۔

چنانچہ اس وقت کی چیزیں بنانی اس طرح پر تقسیم ہوئی "کملا دیوی" اور "شانتی بائی" (لیڈی گھوش کی دونوں بھتیجیاں) نے سبزی کی تین تین قسم کی بھوجیاں بنانی اپنے ذمہ لیں کیوں کہ یہ دونوں ترکاریاں بہت اچھی بنانا جانتی تھیں اور مسز شام نرائن (سر مکرجی کی بھانجی) نے گوشت کے دو قسم کے کباب بنائے۔ مسز ہریش چندر نے مچھلی اور پراٹھے تلے جس میں مسٹر ہریش چندر نے بھی مدد دی اور وہیں بیٹھے رہے۔ ان کو دیکھ کر مسٹر شام نرائن بھی اپنی بیوی کے چولہے کے پاس بیٹھ کر آلو وغیرہ چھیلنے لگے۔ کوشلیا بائی نے اپنی دو کلاس فیلو یورپین لڑکیوں کے ساتھ چند انگریزی مٹھائیاں تیار کیں۔ یہ سب تو باورچی خانہ کے کام میں شریک ہو گئے بچارے مسٹر شبیر تنہا ایک طرف اخبار ہاتھ میں لئے ٹہل رہے تھے۔ ان کو اس طرح خاموش سا دیکھ کر سر ستیش مکرجی نے کہا:

"بھئی شبیر تم کیوں اپنے دوستوں سے الگ الگ ہو ادھر آؤ۔ ان سب کے باورچی خانہ میں شریک ہو۔ تم کو تو ایک ایسی اچھی چیز بنانا آتی ہے جس کو ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔ سوشیلا کدھر ہیں۔ وہ بھی اس جمگھٹ میں نہیں نظر آتی معلوم ہوتا ہے اس کو کھان پان سے رغبت نہیں۔"

مسٹر شبیر: جناب وہ سب مصروف ہیں۔ میں اخبار دیکھنے لگا تھا۔

مسٹر ہریش چندر: (وہاں سے اُٹھ کر) اوہو معاف کرنا۔ شبیر میں مسز ہریش کو آگ جلا کر دینے میں ایسا لگ گیا کہ آپ کا خیال ہی نہ رہا۔ آیئے ادھر اپنی بھاوج کا ہاتھ بٹایئے۔ اباجان کیا فرما رہے ہیں۔ کیا آپ بھی کچھ بنانا جانتے ہیں؟

مسٹر شبیر: (مسکراتے ہوئے ان کے پاس آکر) بھائی جب آپ مدہوش سے ہوکر چولہا جھونکنے میں مصروف ہوں گے تو میں پھر اور کیا کرتا۔ وہ دیکھیے مسز شام نرائن کو بھی کچھ خبر نہیں۔ کس محویت میں سبزی بنا رہے ہیں، مجھے خوف ہے کہیں انگلیاں نہ تراش لیں۔

مسز شام نرائن کا چولہا چونکہ ان کے قریب ہی تھا۔ انہوں نے سن لیا۔ اور شام نرائن ہنستے ہوئے ان کے پاس آگئے اور کہا۔

شام نرائن: ارے بھئی تم ابھی اس بے ہوشی کو کیا جانو ۔

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

ہریش چندر: ہاں شبیر اب تو بے اختیار دل چاہتا ہے کہ آپ بھی بیاہے ہوئے ہوں اور معہ بیوی کے ہم سب میں آیا کریں تو پھر آپ بھی یہیں دھونی فرمائے بیٹھے ہوں کیوں الگ الگ پھریں۔ والدین نہ سننے پائیں اِس وجہ سے یہ گفتگو ان دوستوں میں نہایت آہستہ ہوئی۔ سوشیلا کو اب تک یہاں نہ پاکر پھر والدہ نے کہا۔

لیڈی گھوش: ارے تم سب میں میری سوشیلا نظر نہیں آتی۔ وہ کہاں بیٹھی ہے؟

ہریش چندر: (بیوی سے) ہاں چندر رانی سوشیلا کہاں ہے؟ آج انہوں نے کچھ نہیں بنایا۔ کوشلیا، سوشیلا کو تو بلاؤ۔

کوشلیا بائی: وہ اس طرف نشست گاہ میں اخبار دیکھ رہی ہیں کسی کو بھیج کر بلا لیجیے۔

ہریش چندر: (شام نرائن سے) جانا بھئی ذرا سوشیلا کو بلا لانا۔

شام نرائن: چندر جی میری حالت جانے کے قابل نہیں ہے۔ دیکھیے ہاتھ خراب ہو رہے ہیں۔ کوٹ اتارے ہوں۔ ایسی وحشیانہ صورت میں سوشیلا جی کے پاس جانا مناسب نہیں۔ وہ بات بات پر ٹوک دیتی ہیں۔ مسٹر شبیر ذرا آپ تکلیف کرکے جائیے وہ سامنے نیچے کی طرف اتر جائیں۔ وہیں ہوں گی۔ اُن کو بلا لائیے" یہ سن کر مسٹر شبیر ادھر گئے۔ دیکھا کہ سوشیلا بائی عجب محویت کے عالم میں قالین پر بے تکلفانہ کشن کے سہارے لیٹی ہوئی اخبار پڑھ رہی ہیں۔ ساڑی کا آنچل سر سے سرک کر زمین پر پھیلا ہوا ہے اور کوٹ جو اترا ہوا قریب ہی رکھا ہے۔ اس پر ایک کہنی ٹکی ہے۔ ان کو اس بے تکلفانہ حالت میں دیکھ کر مسٹر شبیر

کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ قریب ہو کر سوشیلا کو چلنے کو کہیں۔ کچھ دیر کھڑے یہی سوچتے رہے۔ ''کیا کرنا چاہئے۔'' آخر ہمت کر کے چند قدم اور بڑھے اور بغیر ان کی طرف رُخ کئے کہا۔

مسٹر شبیر: مس صاحب آپ کو سر چندر ستیش جی یاد فرماتے ہیں۔ یہ آواز سن کر سوشیلا فوراً سنبھل کر اٹھ بیٹھی۔ دیکھا تو وہ بجائے ان کی طرف متوجہ ہونے کے آڑو کے درخت کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔

سوشیلا بائی: (گھڑی دیکھ کر) اوہو ۱۱ بج گئے۔ مجھے اخبار دیکھنے میں بالکل معلوم نہیں ہوا۔ ان سب نے تو کھانا بھی تیار کر لیا ہوگا؟

مسٹر شبیر: (ادھر مڑ کر) جی ہاں سب چیزیں تیار ہیں۔ سر چندر جی نے مجھ سے اسی حلوے کی فرمائش کی ہے اور آپ کے وہاں موجود نہ ہونے پر افسوس کر رہے ہیں۔

سوشیلا بائی: اچھا وہ چاہتے تھے کہ میں بھی کچھ بناؤں تو صبح سے فرما دیتے گو مجھے اس کام میں نہ دلچسپی نہ خاص مہارت تاہم ان کی خوشی کو کچھ کر دیتی۔

مسٹر شبیر: لیکن آپ تو وہاں تھیں ہی نہیں۔ وہ کہتے کس طرح چائے کے بعد سے جو آپ اس طرف آئے ہیں تو سب کی نظریں ڈھونڈ رہی ہیں۔

سوشیلا: میں وہاں آتی کس کے پاس میری عزیز رتن بائی تو ہے ہی نہیں۔ سیٹھ صاحب نے کیا غضب کیا ہے کہ انہیں وہیں چھوڑ آئے ان کے بغیر تو آپ کا بھی دل نہ لگتا ہوگا؟

مسٹر شبیر: گذشتہ سال تو انہوں نے پورے چھ ماہ شملہ پر ہی گذارے تھے کیوں کہ صحت کمزور تھی۔ اس دفعہ چونکہ سیٹھ صاحب صرف تین ہفتہ کے لئے آئے ہیں۔ خدا جانے انہوں نے کیوں ساتھ آنے کا خیال نہ کیا۔

سوشیلا: بہر حال کچھ بھی ہو۔ ان کے نہ آنے سے مجھے بہت افسوس ہوا۔

مسٹر شبیر: اچھا چلئے وہ سب منتظر ہوں گے۔

یہ سن کر کھڑی ہو گئیں اور باتیں کرتی ہوئی ادھر آئیں۔

لیڈی گھوش: بیٹی تم کیا کر رہی تھیں۔ دیکھو یہاں بہنوں بھاوجوں نے کیا کیا کر لیا۔ تم نے خود تیار کرنا تو درکنار کسی کو مدد بھی نہ دی۔

سوشیلا بائی: ماتا جی معاف کیجئے میں اخبارات پڑھنے میں ایسی محو ہوئی کہ یہ

یاد ہی نہ رہا کہ آج کھانا خود ہی پکانا ہے۔

لیڈی لقمان جی: آج باورچی خانہ کا کام کرنا کچھ فرض تو نہ تھا۔ صرف ان لوگوں کی اپنی خوشی تھی۔ تم بھی شریک ہوتیں تو رونق دوبالا ہوتی۔ شبیر کیا تم نے نہیں سنا۔ ابھی ستیش کیا فرمائش کر رہے تھے۔ تم بھی جلدی سے تھوڑا سا حلوا تیار کر دو۔ ہرلیش چندر جی مدد کریں گے۔

مسز شبیر: مجھے یہ خیال رہا کہ شاید اس کا سامان اس وقت ساتھ نہ ہو کیوں کہ چند چیزیں اس میں ایسی پڑتی ہیں جو ہر وقت موجود نہیں ہوتی۔

سوشیلا بائی: آپ بتایئے تو کیا کیا چاہئے۔ ممکن ہے موجود ہوں میں بھائی جان سے دریافت کرتی ہوں۔

یہ سن کر مسز شبیر نے جیب سے پاکٹ بک نکالی اور حلوے کے اجزاء کی فہرست لکھ کر سوشیلا کو دی جس کو لے کر مسز ہرلیش چندر کے پاس گئیں۔ معلوم ہوا کہ جو پندرہ بیس چیزیں انہوں نے لکھی تھیں۔ اس کے اجزاء میں سے سوا پستہ، بادام، شکر، زعفران، روغن وغیرہ کے اور کچھ نہ تھا۔ اس وجہ سے اس وقت وہ حلوہ بننا ملتوی ہو گیا۔ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ کوشلیا بائی اور اس کی یوروپین سہیلیوں نے میز پر چنا اور سب نے مل کر بہت تعریف کے ساتھ کھایا قریب ایک بجے کے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھے۔ تو شکار کے لئے قریب کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ ان سب لڑکیوں میں صرف سوشیلا بائی شکار کھیلنا جانتی تھیں۔ وہی اپنے باپ چچا اور بھائیوں کے ساتھ بندوق اٹھائے شکارگاہ میں پھرتی رہیں۔ لیکن ان کے نازک ہاتھوں کے تھک جانے کے خیال سے بار بار ہرلیش چندر، شام نرائن اور مسٹر شبیر ان سے بندوق لے لیتے تھے۔

کوشلیا بائی بھی اپنی یوروپین سہیلیوں کے ساتھ ان شکاریوں کے ہمراہ رہیں۔ چونکہ مسز شام نرائن کی صحت اوپر چڑھنے کے قابل نہ تھی۔ اس لئے مسز ہرلیش چندر اور اُن کی دونوں ماموں زاد نندیں نیچے ہی رہ گئی تھیں اور اپنے چھوٹے سے ہارمونیم اور ستار سے دل بہلا رہی تھیں۔ لیڈی گھوش اور لیڈی لقمان جی خیمہ میں آرام کرنے چلی گئی تھیں۔ شکاری پارٹی ان سے دو تین میل کے فاصلہ پر اوپر چڑھ گئی تھی سوشیلا نے اپنے پسند کے کئی چھوٹے پرندے شکار کئے اور پھر قاز کی تلاش میں اپنے باپ بھائیوں سے دور نکل گئیں مگر خالی ہاتھ اپنی بندوق یہیں بھول گئی تھیں جب وہاں پہنچیں اور کچھ شکار نظر پڑا تو بہت زدر

سے کہا "پاپا! پاپا بندوق بھیج دو۔"

دور سے یہ بیٹی کی آواز سن کر سر لکمی جی نے اِدھر اُدھر دیکھا تو نہ ہریش چندر ہی تھے، نہ شام نرائن کیوں کہ وہ دونوں ہی شکار کی تلاش میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ اب لقمان جی نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ جدھر سے یہ آواز آرہی ہے۔ بندوق لے کر بیٹی کے پاس خود ہی پہنچے کہ اتنے میں کھڈ کی طرف سے ہاتھ میں کبوتر لئے ہوئے مسٹر شبیر آتے ہوئے نظر پڑے تو انہوں نے کہا:

سر لقمان جی: مسٹر شبیر یہ بندوق سوشیلا بائی کو پہنچا دو وہ سامنے والی چوٹی پر مانگ رہی ہیں۔

مسٹر شبیر نے بندوق اٹھائی اور ادھر روانہ ہو گئے۔ سوشیلا منتظر تھیں۔ ان کو بندوق اُٹھائے آتے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

سوشیلا بائی: مسٹر شبیر آپ نے کیوں تکلیف کی کسی ملازم کے ہاتھ بھیج دیتے۔

مسٹر شبیر: اوہ۔ کوئی تکلیف نہیں بلکہ باعثِ فخر و مسرت ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوتی ہے کہ ایک ہندوستانی لیڈی اس فن میں ایسا کمال رکھتی ہے۔ یہ سب سر ستیش کی روشن دماغی کا نتیجہ ہے۔

سوشیلا بائی: (خوش ہو کر) اچھا آپ کے خیال میں میں اچھا شکار کھیلتی ہوں؟ بتایئے جس قدر میں نے آج شکار کیا ہے۔ ان سب میں سے آپ کو کون سا پرند پسند ہے۔ وہی رات کو آپ کے لئے تیار کرایا جائے۔

مسٹر شبیر: میں اس کمال عنایت کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ کو اس ناچیز کی خاطر کا اس قدر خیال ہے۔ میرے پیارے دوست ہریش چندر نے بھی اصرار کے ساتھ کہا ہے کہ میرا رات کا کھانا بھی آپ کے ہی ہاں ہو تا کہ میں شکار کھا سکوں مگر مجھے آج شب ہوٹل میں کھانا چاہئے تھا کیوں کہ میں کل سے ایک دوست کو مدعو کر چکا ہوں کہ آج شب کو کھانا میرے ساتھ کھائیں۔

سوشیلا بائی: واہ پھر تو کھانے کا کچھ لطف نہ آئے گا۔ شکار کا مزہ تو جب ہے کہ کھانے کے وقت سب شکاری موجود ہوں۔ آپ اپنے مہمان کو بھی کیوں نہ ہمارے ہاں

بلوا لیجئے۔ تنہا کھانے میں آپ کو کیا لطف آئے گا۔

مسٹر شبیر: (شکریہ ادا کرتے ہوئے) ہاں یہی ہریش چندر کی رائے ہے۔ اچھا گھر چل کر دیکھا جائے گا۔

سوشیلا: (درختوں کی طرف دیکھ کر) اوہو باتوں میں ہمارا شکار ہی جاتا رہا۔ اس سامنے والی چوٹی اور ان خندقوں میں بہت سے پرندے تھے۔ اسی لئے میں نے بندوق منگوائی تھی۔ چلئے اور آگے بڑھ کر دیکھیں۔

مسٹر شبیر: (ذرا ٹھٹک کر) مگر نیچے جو میرا انتظار ہوگا؟

سوشیلا بائی: اس کی کچھ پرواہ نہ کیجئے۔ میں ابا جان اور چچا جان سے کہہ دوں گی کہ میں نے مسٹر شبیر کو اپنی مدد کے لئے روک لیا تھا۔

مسٹر شبیر: اچھا چلئے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد مس سوشیلا نے کئی پرندے شکار کئے اور پھر دونوں نیچے آئے۔ یہاں ان کے باپ چچا اور بھائی بہن منتظر تھے۔ کیوں کہ اب چار بجنے والے تھے اور سب نیچے جانے کو تیار تھے۔ ان کے پہنچتے ہی سب قیام گاہ پر واپس آئے۔ یہاں ان سب نے چائے پی اور گھر کی طرف واپس ہوئے۔ جب ہوٹل کے پاس سے گذرے تو مسٹر شبیر ان سے جدا ہونے لگے مگر مسٹر ہریش چندر نے باصرار ان کو روکنا چاہا لیکن وہ ایک گھنٹہ کے وعدہ پر ان سے جدا ہو کر اپنے ہوٹل چلے گئے۔ اپنے دوست کو اپنی غیر حاضری کی اطلاع دے کر واپس آویں گے اور کھانا ان کے ساتھ کھائیں گے۔

جب وہ ہوٹل پہنچے تو ان کا کمرہ بند تھا اور بیرا برآمدے میں منتظر کھڑا تھا جس نے اپنے آقا کو دیکھ کر قریب ہو کے آہستہ سے کہا۔

بیرا: حضور ابھی رکشا پر مس نوازبائی تشریف لائی تھیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضور پکنک کو تشریف لے گئے ہیں تو وہ آٹھ بجے کھانے پر آنے کو کہہ گئی ہیں۔

مسٹر شبیر: اچھا فوراً نیچے سے ایک رکشا تو لے لو۔

چند منٹ میں رکشا تیار ہو کر آ گیا اور مسٹر شبیر اپنا اوورکوٹ پہن کر سوار ہو کر "الیگزنڈرہ ہوٹل" پہنچے اور کمرہ نمبر ۱۳ میں اپنا وزٹنگ کارڈ بھیجنے پر بلا لئے گئے۔ جہاں

حسینہ و جمیلہ مس نواز بائی قد آدم آئینہ کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ قدم اس کے پیچھے جا کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا جس سے وہ اُچھل پڑی اور مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ تو بے اختیار ہنسنے لگی۔

مسٹر شبیر: پیاری دلنواز میں اس وقت نہایت منت کے ساتھ آپ سے ایک وعدہ خلافی کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ کل میں نے کس قدر اصرار سے اپنے ہاں کھانا کھانے پر راضی کیا تھا مگر اس وقت میرے آقا سر لقمان جی اور ان کے معزز دوست کا تمام خاندان نہایت اصرار سے اپنے ہاں کھانا کھانے پر مجبور کر رہے ہیں جس کو میں کسی طرح ٹال نہیں سکتا۔ وہ لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ اپنے دوست کو بھی یہیں بلا لو۔ اس لئے میں مجبور ہوں۔ تم یہاں کھانا کھا لو۔ میں جا رہا ہوں۔ (اس کے لباس کی طرف دیکھ کر) او ہو تم نے اس وقت کھانے کی کیا ڈریس پہنی ہے۔ اچھا کل اس وقت پھر یہی جوڑا پہننا۔

نواز بائی: (افسردگی سے) مگر اب کل میں آپ کے ہاں نہ آسکوں گی اگر آپ کو ساتھ کھانا ہے تو یہیں تشریف لائیے گا۔

مسٹر شبیر: ہاں ہاں میری دلنواز میں خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔

نواز بائی: اگر آپ کے پاس ڈبل سیٹ کار کشا ہو تو میں آپ کے ساتھ "چندرکٹی" تک چلوں گی۔ ذرا اچھا وقت گذرے گا۔ پھر اسی رکشا پر میں واپس آجاؤں گی۔

مسٹر شبیر: اگرچہ دل تو یہی چاہتا ہے مگر نواز بائی یہ کچھ مناسب نہیں ممکن ہے کوئی پہچان لے کیوں کہ ابھی شام ہی ہے اور برقی روشنی............

نواز بائی: (غمگین لہجہ میں) اچھا خدا کے سپرد جایئے۔

اور اپنے سینہ سے گلاب کا پھول نکال کر مسٹر شبیر کے کوٹ کے فلاور ہول میں لگا دیا۔

مسٹر شبیر: (شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں دبا کر) یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ کھانے کے وقت بات ہوگی۔ مگر تمہاری خوشبو اس پھول کے ذریعہ مجھے پہنچتی رہے گی۔ شیک ہینڈ کرتے ہوئے تیز قدمی سے کمرے سے باہر ہو گئے۔

☆

چوتھا باب

دل تیری طلب میں رہے بیتاب کہاں تک
اے بے خبر اے دشمنِ احباب کہاں تک

صبح کے نو بج چکے ہیں۔

لکھنؤ کے بڑے اسٹیشن چار باغ پر پنجاب کلکتہ میل کا انتظار ہے چونکہ اس وقت کی میل ٹرین سے سر چندر جی گھوش مع فیملی کے تشریف لانے والے ہیں۔اس لئے اُن کے استقبال کے لئے ان کے صاحبزادے مسٹر ہریش چندر مع اپنے دوست منموہن ناتھ کے اسٹیشن پر موجود ہیں۔ یہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے منہ میں سگار لئے ٹرین کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے کہ پہلے گھنٹی کی آواز اور پھر ڈاک گاڑی کے تیز انجن کے شور نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور دونوں نہایت مضطرب دلوں اور منتظر آنکھوں سے اس طرف دیکھنے لگے۔ابھی ٹرین ٹھہرنے بھی نہ پائی تھی کہ دونوں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے قریب پہنچ گئے۔گاڑی ٹھہرتے ہی دروازہ کھلا اور سر چندر جی لیڈی چندر کا ہاتھ پکڑے ہوئے برآمد ہوئے۔پھر سوشیلا بائی اور مسز ہریش چندر اتریں۔ان کے بعد مس روزی ننھے جگدیش کو اٹھائے ہوئے باہر آئی تو من موہن ناتھ نے فوراً جگدیش کو لے لیا اور سب اسٹیشن سے باہر آئے۔یعنی ہریش چندر جی اور سوشیلا بائی ایک موٹر میں سوار ہوئے اور ہریش چندر، منموہن ناتھ و مسز ہریش چندر اور روزی دوسری میں۔چند منٹ میں یہ لوگ اپنی عالی شان کوٹھی ''چندر لاج'' واقع بٹلر روڈ میں پہنچ گئے۔وہاں چائے تیار تھی۔باہر ہلکی ہلکی دھوپ میں

بیٹھ کر سب نے پی۔ کیوں کہ نومبر شروع ہو چکا تھا اور اب خاصی ٹھنڈ تھی۔ مسز ہریش چندر نے منوہن ناتھ کو بھی اپنے ساتھ ہی چائے پلائی اور سوشیلا بائی سے ملایا۔ وہ بھی قابل اور خوبصورت نوجوان منوہن ناتھ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں تھوڑی دیر بعد وہ تو کالج چلے گئے اور خدمت گار چھوکرے نے سنہری پلیٹ میں اس وقت کی ڈاک پیش کی۔ اپنے نام کے خطوط دیکھنے کے بعد ایک چٹھی ہریش چندر نے سر کرجی کو دیتے ہوئے کہا:

ہریش چندر: یہ تو میں آپ کو پہلے ہی اطلاع دے چکا ہوں کہ چند ہفتے ہوئے مسٹر شبیر کو بمبئی سے بلا کر یہیں پریکٹس شروع کرا دی ہے اور اپنے ہاں ہی رکھا ہے۔ کچھ روز تو انہوں نے خوشی سے گذارے مگر ایک ہفتہ سے مصر ہو رہے ہیں کہ مجھے علیحدہ مکان لینے دو۔

بیٹے سے یہ سن کر سر چندر جی نے وہ خط پڑھنا شروع کیا۔

خط

الٰہ آباد

ڈیر ہریش چندر جی

میں جس کام کو یہاں آیا تھا آپ کی دعا اور خدا کی مہربانی سے کامیاب ہوا مگر اب اس شرط پر لکھنؤ آسکتا ہوں کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔ ورنہ یہیں ایک جھونپڑا کرایہ پر لے کر ڈیرا ڈال لوں گا۔ ہر چند میں آپ کی محبت و عنایت کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک قسم کی پابند اور غلامی کی زندگی سے نکال کر آزادی کی زندگی دلائی لیکن اس کی شکر گذاری میں یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں ہر وقت آپ کی فیملی کو تکلیف دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کے شملہ سے آنے سے پیشتر مجھے بالکل آزاد کر دیا جائے تو حاضر خدمت ہو جاؤں۔"

تمہارا شبیر

سر مکرجی: اونہہ۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ انہیں بکنے دو۔ ہم الگ نہ ہونے دیں گے۔

لیڈی مکرجی: پیارے ہریش یہ تو تم نے بہت اچھا کیا کہ شبیر کو بلا کر یہاں وکالت شروع کرادی۔ ایسا قابل ایسا روشن دماغ اور بیرسٹر ہو کر اور یہ پابندی کی نوکری گو تنخواہ معقول سہی کیوں کہ شروع شروع میں بیرسٹر اتنا نہیں کما سکتے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کی کوشش سے وہ اس سے کئی گنا زیادہ روپیہ پیدا کر کے ناموری حاصل کر سکتا ہے۔

سر مکرجی: اس کا تو خود لقمان جی کو بہت افسوس تھا اور وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کہیں کوئی موقعہ ہاتھ آئے تو اس کی بہتری کی تدبیر کی جائے۔

ہریش چندر: ابا جان مجھے تو مسٹر شبیر کی یہ ملازمت قطعی ناپسند تھی اور جب انہوں نے منظور کی تھی تو میں نے بہت مخالفت کی تھی مگر وہ ہندوستان پہنچے تو ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر بار کا تمام بوجھ ان کے ہی سر پڑ گیا۔ روپیہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے خیال کیا کہ اب بیرسٹری شروع کی جائے تو ابتداً توں نقصان رہے گا اور لقمان جی معقول مشاہرہ دینے کو تیار ہیں۔ پس بیچارے گرفتار ہو گئے مگر مجھے یہ سخت ناگوار رہا کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کا قیمتی دماغ صرف پانچ سو روپیہ ماہوار میں بک گیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی ملاقات کا موقعہ ہوتا تھا جس کا یہ اثر ہوا کہ گذشتہ ستمبر میں جب شملہ پر میں ان سے ملا تو یہ وعدہ لے لیا کہ اسی اکتوبر میں لکھنؤ آ کر میرے ساتھ بیرسٹری شروع کر دیں۔

مسز ہریش چندر: ہم سب کو یہ انتظام بہت ہی پسند آیا۔ آپ نے اچھا کیا دراصل ایسے قابل آدمی کے لئے وہ غلامی تھی لیکن اب ان کو علیحدہ نہیں ہونے دینا چاہئے جب تک ان کا کام اچھی طرح نہ چلنے لگے۔ بیچارے کوٹھی کا کرایہ دیں گے یا گھر بھیجیں گے یا اپنا خرچ چلائیں گے۔

سوشیلا بائی: مگر وہ تو یہ لکھ رہے ہیں کہ علیحدہ کر دینے کے اقرار پر لکھنؤ آؤں گا۔

سر مکرجی: اوہ یہ کوئی بات نہیں ہے ہم ان کو بلا لیں گے۔

ہریش چندر: پھر فرمایئے اس خط کا کیا جواب لکھا جائے۔

سر مکرجی: لکھ دو کہ "یہاں ایک ضروری کیس ہے۔ فوراً پہنچو۔ باقی فیصلے زبانی

ہوں گے۔ ہاں یہ بھی لکھ دو کہ مس میو لکھنؤ آنے والی ہیں اور تم سے ملنے کی مشتاق ہیں۔"

اب ۱۱ بج رہے تھے۔ سب اُٹھ کر کمروں میں گئے۔ اس ذکر کے تیسرے دن مسٹر شبیر الٰہ آباد سے واپس آ گئے۔ گھر بھر کے اصرار سے کچھ عرصہ اور "چندر محل" میں رہنے پر مجبور ہوئے اور اس سوشیلا بائی نے ان سے اُردو پڑھنا شروع کر دیا۔

مس میو جو ایک امریکن خاتون ہیں ہندوستان کی سیاحت اور یہاں کی معاشرتی کیفیت دیکھنے کے لئے آئی ہوئی ہیں۔ کل لکھنؤ پہنچی ہیں اور چند دنوں میں فروکش ہیں۔ بمبئی میں سر لقمان جی سے شبیر صاحب کی قابلیت کی بہت تعریف سن چکی تھیں یہاں سر کر جی نے بھی ان سے شبیر صاحب کی لیاقت اور وسعت مطالعہ کا تذکرہ کیا۔ اس لئے مس میو نے اپنے وہ تمام مسودات شبیر صاحب کو مطالعہ کے لئے دیئے ہیں جو انہوں نے ہندوستان کی سیاحت میں یہاں کی معاشرت اور رسم و رواج کے متعلق مرتب کیا ہے۔ شبیر صاحب اپنے کمرہ میں بیٹھے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ سوشیلا جی آتی ہیں۔

سوشیلا جی: استاد جی یہ کیا پھیلائے بیٹھے ہیں۔

شبیر صاحب: یہ مس میو کے مسودے ہیں۔ جس میں انہوں نے ہندوستان کے سینکڑوں واقعات اور رسم و رواج کی کیفیت جمع کر کے یہاں کی معاشرت پر روشنی ڈالی ہے۔

سوشیلا جی: کیا میں بھی دیکھ سکتی ہوں؟

شبیر صاحب: شوق سے مگر مس صاحبہ کل ہی تشریف لے جانے والی ہیں اگر آپ دیکھنا چاہتی ہیں تو آج ہی دیکھ لیں۔

سوشیلا جی وہیں بیٹھ کر ورق الٹ پلٹ کرنے لگیں اور کچھ دیر مطالعہ کرنے کے بعد بولیں کہ استاد جی "یہ تو بڑی دلچسپ چیز ہے۔"

شبیر صاحب: ہاں واقعات کے لحاظ سے دلچسپ ہے مگر جب اس پر غور کیا جائے کہ ہمارا ملک کس قدر جہالت میں پھنسا ہوا ہے اور ہماری سوسائٹی کی اخلاقی حالت کیسی گری ہوئی ہے تو بے حد صدمہ ہوتا ہے۔

سوشیلا جی: آپ نے یہ سرحد والا واقعہ پڑھا ہے۔

شبیر صاحب: ابھی پورا تو نہیں پڑھا ہے۔ شروع کا تھوڑا سا دیکھا ہے۔ یہ

سرحد کی خصوصیت نہیں بلکہ سارے ملک میں یہی وبا پھیلی ہوئی ہے ہر باپ اپنی لڑکی کی فلاح و بہبود پر اپنے نفع کو مقدم سمجھتا ہے اور ان کی اس حرص و آز کی وجہ سے روزانہ سینکڑوں لڑکیاں زندہ در گور ہو جاتی ہیں۔

سوشیلا: اب تو دیر ہو رہی ہے ٹینس کا وقت ہو گیا ہے۔ بھابی جی آپ کا اور میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ یہ حصہ مجھے دے دیجئے تو رات کو دیکھ لوں گی۔

شبیر صاحب اور سوشیلا دونوں ٹینس میں چلے گئے۔

ٹینس سے فارغ ہو کر شبیر صاحب مس سوشیلا کے ساتھ تھوڑی دیر دالان پر ٹہلتے رہے پھر ایک بنچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

شبیر صاحب: آپ تو شہسواری، شکار اور ٹینس وغیرہ ہر فن میں ہندوستانی مردوں سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔

سوشیلا: (انفعال اور اپنی تعریف پر فطری مسرت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ) مگر آپ ٹینس تو مجھ سے بھی اچھا کھیلتے ہیں۔

شبیر صاحب: یہ محض آپ کا حسن ظن ہے۔ ورنہ میں تو چندر رانی جتنا بھی کھیلنا نہیں جانتا اور شہسواری سے تو بالکل نابلد ہوں۔

سوشیلا: پھر بھی آپ چاہیں تو ہم عورتوں سے ہر چیز میں سبقت لے جا سکتے ہیں۔

شبیر صاحب: یہ نہ کہئے تاریخ شاہد ہے کہ بہت سی عورتیں ہر میدان میں مردوں سے گویا سبقت لے گئی ہیں۔ عربی تمدن کے عروج کے زمانہ میں بعض عورتیں شہسواری، تیراندازی، نیزہ بازی شمشیر افگنی وغیرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ یہاں بھی مغلیہ سلطنت کے عہد میں بہت سی ایسی خواتین گزری ہیں کہ شجاعت اور بہادری میں تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سوشیلا: مگر ہندو روایات میں عورتوں کی شجاعت کے مقابلہ میں ان کی محبت اور وفاداری کی داستانیں بہت زیادہ ہیں۔

شبیر صاحب: یہ ہندوستانی عورت کا ایک ایسا وصف ہے جس میں دنیا کی کسی قوم کی عورت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور یہ وصف اب تک ہندوستانی عورتوں میں

موجود ہے۔

سوشیلا: (مسرت کے جذبہ کو چھپاتے ہوئے) غنیمت ہے کہ آپ جیسے سخت لوگ بھی اس کے قائل ہیں۔

شبیر صاحب: اچھا! کیا میں سخت ہوں۔ میں تو اپنے کو نرم اور خصوصاً صنف نازک کے ساتھ پیش آنے میں بہت ہی نرم سمجھتا ہوں۔

سوشیلا: نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ سخت ہیں بلکہ میرا خیال ہے۔ مسلمان عام طور پر ذرا سخت دل ہوتے ہیں۔

شبیر صاحب: کوئی سخت دل تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلمان تو وہی ہے جو نرم دل ہو۔ بانی اسلام صلعم اس قدر نرم دل تھے کہ کسی عورت کو ذرا سی تکلیف میں دیکھتے تو آپ کی آنکھیں اشک آلودہ ہو جاتیں اور اپنے پیرووں کو ہمیشہ عورت کے ساتھ محبت اور حسنِ سلوک کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔

سوشیلا: پھر تو مجھے آپ کے مذہب اور اس کے بانی (صلعم) کی سوانح حیات کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ میں مذہب اور مذہبی کتابوں سے اس لئے گھبرایا کرتی ہوں کہ ہندو مذہب کے دیوتاؤں اور دیویوں کے متعلق عجیب عجیب فحش اور ناپاک روایتیں مشہور ہیں۔ ان کو سن کر میں خیال کرتی ہوں کہ جس مذہب کے بانیوں کی اخلاقی حالت اس قدر بُری ہو وہ مذہب کہاں تک اچھا ہوگا۔

شبیر صاحب: مگر یہ روایتیں اپنی اصل حالت پر نہیں ہیں۔ ابتداء زمانہ سے ان میں بہت سی تحریفیں ہو چکی ہیں۔ ورنہ ابتداءِ وقت کے لحاظ سے ان باتوں سے بہت اچھا کام لیا جاتا تھا۔

سوشیلا: بہر حال کچھ تو اصلیت بھی ہوگی۔ بغیر بنیاد کے تو کوئی عمارت نہیں کھڑی ہو سکتی۔ مس میو کے مسودات ہی دیکھئے کس قدر افسوسناک واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔

شبیر صاحب: آج آپ انہیں دیکھنا بھی تو چاہتی تھیں۔ وہ کل چلی جائیں گی۔ دیکھنا ہے تو چلئے دیر ہو رہی ہے۔

دونوں کوٹھی میں آئے اور مس سوشیلا اپنے کمرہ میں جانے کے بجائے شبیر صاحب ہی کے کمرہ میں بیٹھ کر مسودے دیکھنے لگیں۔

سوشیلا: وہ سرحد والی کہانی کدھر گئی۔

شبیر صاحب: (مسودہ اپنے رخ کی طرف کرتے ہوئے) لائیے میں نکال دوں۔(ڈھونڈ کر) یہ ہے۔

سوشیلا: اُستاد جی تکلیف نہ ہو تو آپ ہی پڑھ کر سنا دیجئے۔

شبیر صاحب: تکلیف تو کوئی نہیں ہوگی مگر آپ خود پڑھیں تو زیادہ لطف آتا۔

سوشیلا: نہیں آپ ہی سنائیے۔ یہی بہتر ہوگا جو شک وشبہ ہوگا اس کو پوچھنے میں مجھے آسانی ہوگی۔

شبیر صاحب: اس میں شک وشبہ کی کون سی گنجائش ہے۔ یہ تو ایک واقعہ ہے جو میں نے قلمبند کر دیا ہے۔

سوشیلا: آپ پڑھئے تو سہی۔ میں نے اُس وقت آخر کا تھوڑا سا حصہ دیکھا تھا اور میرے دل میں بہت سے سوال پیدا ہو رہے ہیں۔

شبیر صاحب: خیر پڑھتا ہوں۔

شبیر صاحب مسودہ کو پھر اپنے رُخ کر کے پڑھنا شروع کرتے ہیں۔

''محمود ابدالی ایک بزرگ گزرے ہیں۔ انہیں بنی نوع انسان سے جو الفت تھی اس کی بنا پر ہمیشہ دنیا کی بھلائی میں مشغول رہتے تھے اور ہمیشہ خدا سے دعا مانگا کرتے تھے کہ وہ گمراہوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ایک بار آپ افغانستان میں تھے تو آپ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں خدا کو یاد کرنے والوں کی بڑی کمی ہے اور وہاں کے باشندے انسانیت اور اخلاق سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں وہ جنوبی سرحد پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوئے اور وہیں سرحد پر چند روز کسی اطمینان کی جگہ میں بیٹھ کر خدا کی عبادت اور ہندوستان والوں کی فلاح و بہبود کے لئے دعا مانگنے کے مقصد سے ایک بلند پہاڑی کی چوٹی منتخب کی جب آپ کو وہاں عبادت کرتے ہوئے کچھ زمانہ گزر گیا اور عبادت کی اس پہاڑی سے برکات کا نزول ہونے لگا تو اطراف ملک سے فرزندانِ اسلام

کھنچ کھنچ کر یہاں آنے لگے اور بہت سے اسی پہاڑی کے دامن میں آباد ہو گئے۔ چند ہی دنوں میں اس آبادی نے چھوٹے سے شہر کی صورت اختیار کر لی اور اُس کا نام "اسلام پور" پڑ گیا۔ اسلامی حکومت کے عہد میں یہ اسلامی شہر بہت مالدار خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے ادھر کسی بنئے نے توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی مگر جب انگریزوں کی حکومت کا زمانہ آیا اور اسلام پور کی مالی حالت کمزور ہونے لگی تو ہندوستان کے سود خوار بنیوں کی حریص نگاہیں اسلام پور پر پڑنے لگیں اور وہ ایک ایک کر کے اسلام پور پہنچنے لگے۔ مسلمان جن کے مذہب کی رو سے سود اور بغیر محنت کے روپیہ سے روپیہ پیدا کرنا حرام ہے اور جو سودی کاروبار کرنے والوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ بنیوں کو اپنے اسلامی شہر میں داخل ہونے دینے کے روادار نہ تھے مگر بنئے جو خرگوش کی طرح ڈرپوک ہونے کے باوجود گیدڑ سے بھی زیادہ چالباز اور لومڑی سے بھی زیادہ چاپلوس ہوتے ہیں چپکے چپکے جنوب سے آ کر اس شہر میں آباد ہونے لگے۔"

سوشیلا: تو کیا مسلمان سود کو برا سمجھتے ہیں۔

شبیر صاحب: صرف برا ہی نہیں بلکہ قطعی طور پر حرام اور سود خوار کو پکا حرام خور۔

سوشیلا: مگر اس کے بغیر تو دنیا کا کاروبار چلنا مشکل ہے۔

شبیر صاحب: لیکن مسلمان اپنے عروج کے زمانہ میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کی کمی کے باوجود اس کے بغیر ہی دنیا کے کاروبار کو اس طرح چلا کر دکھا چکے ہیں کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آپ ہی غور کیجئے بغیر محنت مشقت کے صرف اس کے عوض میں کہ روپیہ اپنے پاس بیکار نہ پڑا رکھا اور ایک ضرورت مند کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے دے دیا۔ صرف اصل ہی نہیں بلکہ اُس سے کئی گنا زیادہ وصول کرنا اور اس کی محنت مشقت کی کمائی کو یوں ہضم کر جانا ظلم اور خلاف انسانیت ہے یا نہیں۔

سوشیلا: ہے تو واقعی بہت بڑا ظلم مگر کیا ہندو مذہب نے اپنے پیروؤں کو سود لینے کی اجازت دے رکھی ہے؟

شبیر صاحب: منو شاستر جو ہندو مذہب کے قوانین کی معتبر ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس کی اجازت ہے اگرچہ اس کی شرح بہت کم ہے۔

سوشیلا: شرح کی کمی سے کیا ہوتا ہے۔ بحث تو اصول سے ہے۔ گویا ہندو مذہب اصولاً اس کو ظلم نہیں سمجھتا۔ اچھا آگے پڑھیے۔

شبیر صاحب آگے پڑھنا شروع کرتے ہیں۔

"ایک روز رات کو اسلام پور کی سرائے میں بابورام نامی ایک نو وارد بنیا پہنچا اور وہیں قیام کر کے اپنا سودی کاروبار پھیلانے کی غرض سے سرحدی قبائل میں پھرنے لگا۔ سرائے والے ہمیشہ اسے دق کیا کرتے اور اکثر رات کو اسے پٹوں سے پکڑ کچھوے کی طرح سرائے میں گھسیٹتے پھرتے اور خوب قہقہے لگاتے مگر بابورام کو اس قسم کی شرمناک ایذائیں برسوں اس لئے ناگوار نہیں گزریں کہ انہیں کے ذریعے اس کی چاندی ہوتی ہے۔

بابورام کو کبھی کبھی خیال ہوتا کہ اس کی جائیداد کا کوئی وارث نہیں ہے مگر اسلام پور سے سو میل کے فاصلہ تک مناسب گوت کی کوئی کم عمر لڑکی موجود نہ تھی اور بیوی کی تلاش میں اس سے زیادہ دور جانے سے بابورام کی ممسک مزاجی اور نجاست مانع تھی۔ وہ اپنی حریص اور لالچ بھری روح کی تسکین یہ کہہ کر لیتا تھا کہ کسی کو اپنا دھرم بیٹا بنالوں گا ابھی بہتیرا وقت پڑا ہے۔ سستا بھی رہے گا۔

بابورام کی لڑکی نرملا جس کی ماں اس کی پیدائش ہی کے وقت مر چکی تھی۔ اپنی عمر کی بارہویں منزل طے کر رہی تھی۔ اس نے اپنی گیارہ سال کی عمر اپنی افیمی سی بوڑھی پھوپھی سروجنی کے زیر سایہ اپنے مکان کی اندھیری کوٹھریوں اور مختصر سے صحن کی چار دیواری میں گزارا تھا۔ اس لئے وہ باہر کی دنیا سے بالکل ناواقف تھی۔ اسے تعلیم بھی دی گئی تھی تو صرف اتنی کہ ذات پات کی پابندیاں کیا ہیں اور گھرانے کی دیوتا ننھی ننھی خوفناک مورتیوں کو کیوں کر خوش رکھا جا سکتا ہے اور ان کے انتقام سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔"

سوشیلا: بے جان مورتیوں کے انتقام سے ڈرنا اور ان کی خوشنودی کے لئے ان کی عبادت کرنا کس قدر لغو ہے جو مذہب اس لغویت کا حکم دیتا ہے اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

شبیر صاحب: اس کو مذہب کہنا ہی غلط ہے مگر ہندو دھرم میں بھی ابتداً مورتی پوجا کا اس قدر رواج نہ تھا اور جو تھوڑا بہت تھا بھی وہ اس وقت کی غیر ترقی یافتہ ذہنیت کے

لئے بے حد مفید تھا مگر اب اس ترقی کے زمانہ میں کوئی عقلمند آدمی ان بے جان مورتیوں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ نرملا میں بھی فطرتاً یہی روح کار فرما تھی۔

(شبیر صاحب آگے پڑھنے لگے)

"اس تاریک فضا میں پرورش پانے کے باوجود نرملا کی طفلانہ جرأت اور اس کی بلند فطرت اُسے رہ رہ کر ان مورتیوں کی بغاوت پر آمادہ کرتی رہتی تھی اور اس کی بوڑھی پھوپھی اس کی باتوں پر اکثر جھلاتی اور آنسو بہاتی رہتی۔ ایک دن نرملا نے اپنی پھوپھی سے کہا کہ مجھے یہ مورتیاں بڑی بدشکل اور گھناؤنی معلوم ہوتی ہیں میں ان کی پوجا نہیں کروں گی۔ تم مجھے اُن کے عالیشان مکان (مندر) میں لے گئی تھیں تو یہ وہاں اور بھی بری اور بدشکل دکھائی پڑتی تھیں اور اُن کا گھر بھی گندہ اور ہمارے گھر سے بھی زیادہ غلیظ تھا۔ حنیفن کہتی تھی کہ وہ جس ایک خدا کی پوجا کرتی ہے اس کا گھر بڑا صاف ستھرا ہے۔ وہاں ایسی کوئی مورتی بھی نہیں جو لڑکیوں کو گھور گھور کر ڈرائے یا ان سے بھول کر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اُن سے انتقام لے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے دھرم میں............

سروجنی بے اختیار ہو کر بولی۔ چپ! بدزبان کہیں کی۔ دیوتاؤں نے سن لیا تو تمہاری کیا دشا بنائیں گے۔ دیکھوں اب وہ لنگڑی مسلی چڑیل ایندھن دینے کے بہانے تیرا دھرم بھرشٹ کرنے کو اب یہاں کیسے آتی ہے۔

جب تک تیرا پتی تجھے اپنے گھر نہ لے جائے میں تو تجھے وہی باتیں سکھاؤں گی جو تیری جیسی شریف کنیاؤں کو معلوم ہونی چاہئیں اور تجھے اُن مورتیوں کی پوجا کرنی ہی ہوگی ورنہ دیوتا خفا ہو جائیں گے تو تیری جوانی کے ساتھ تیری ساری عمر برباد ہو جائے گی۔

سروجنی جو اپنے دھرم اور گھر کی آن پر جان دیتی تھی۔ ساری رات اسی ادھیڑ بن میں کروٹیں لیتی رہی کہ نرملا نے بارہویں سال میں قدم رکھ دیا مگر اب تک اس کا پتی کوئی نہیں ہے۔ صبح اُٹھتے ہی بابو رام سے کہا کہ تو نے لڑکی کا بر ڈھونڈنے میں اتنی دیر کر کے دیوتاؤں کو ناراض کر دیا ہے اور وہ لڑکی کو تباہی کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ لڑکی ایشور کی کرپا سے سو میں ایک ہے اور اس دیس میں لڑکوں کی نسبت سے لڑکیوں کی بہت کمی ہے۔ رام نہ کریں کہیں کوئی بات نہ ہو جائے۔

بابورام نے کوئی جواب نہ دیا اور بازار چلا گیا۔ وہ راستہ سے گزر رہا تھا کہ اُس نے ایک ہندو کو دوسرے سے یہ باتیں کرتے سنا کہ "بابورام کی بیٹی کانی ہے یا اسے کوڑھ ہو گیا ہے کہ بارہ سال کی ہو گئی مگر اُس نے اب تک اس کا بر نہ تلاش کیا؟ چندے اور وہ بن بیاہی رہی تو رام داس کو برادری سے چھانٹ دیا جائے گا۔ دھن دولت کی پروا کوئی نہ کرے گا۔ اس کا قرض اتارنے کو ہمیں روز خون پانی ایک کرنا پڑتا ہے۔ یہ موقع آئے تو ایک بار دل کھول کر ہم بھی اس پر ہنس لیں گے۔

بابورام نے راہ چلتوں کی یہ گفتگو سنی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کبھی بیٹی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا مگر آج گھر پر آیا تو اس پر ملامتوں اور طعنوں کی جھاڑ باندھ دی غصہ سے لال پیلا ہو کر بولا کہ "تو پیدا ہی کیوں ہوئی تھی تُو تو مجھے روگ بن کر لگ گئی ہے۔ تیرا بیاہ کر کے خرچ سے میرا ناس ہو جائے گا۔ پتہ ہے کئی ہندو کنیاؤں نے باپ کو اسی خرچ کے بارے بچانے کے لئے اپنی جان تک دے دی ہے۔ نرملا جس کی فطرت میں بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بولی "تو میرے بیاہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

بابورام: لو اور سنو۔ ضرورت اس لئے ہے کہ دیوتاؤں کا حکم یہی ہے اگر نہ کروں تو اس جنم میں ہنسی اُڑے اور اگلے جنم میں نرک میں جلوں۔

نرملا: مسلمان لڑکیوں کی شادی تو اتنی جلدی نہیں ہوتی۔ ان کے دیوتا کیوں ان پر اتنے مہربان ہیں اور وہ کیوں نہیں ناراض ہوتے۔

بابورام: (چلا کر بولا) چپ رہ پاپن۔

یہ کہہ کر بابورام بوکھلایا ہوا اس کے سامنے سے ہٹ گیا اور دوسرے کمرے میں بیٹھ کر صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اس کے نکتہ رس دماغ نے جلد ہی اس گتھی کو سلجھا لیا۔ کیشپ دت جوہری رنڈوا بھی تھا اور گوت کے لحاظ سے بھی شادی کے لئے مناسب تھا۔ بابورام نے سوچا کہ اس کی عمر ساٹھ سال کی ہے۔ وجع مفاصل (گٹھیا) اور دمہ کے کہنہ امراض میں مبتلا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں لڑھک جائے گا اور لڑکی بیوہ ہو جائے گی۔ اُس کا خیال شادی کا ہو تو اُس کو کنیا کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنی پڑے اور ہے بھی بہت امیر۔

ایک جرب زبان نائی کے ذریعے سودا ہو گیا۔ کیشپ دت سے بیٹی کے بدلے

تین ہزار روپیہ ہاتھ آجائے گا۔ بابورام رات سونے کے لئے اپنی کھری چارپائی پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ دیوتا بڑے کارساز ہیں۔"

مس سوشیلا کے چہرے سے بہت دیر سے اندرونی جذبات کے تلاطم کا اظہار ہو رہا تھا۔ شبیر صاحب پڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تو ان سے ضبط نہ ہوسکا اور بول پڑیں۔

سوشیلا: لعنت ہو اس حریص ذہنیت پر۔ میں تو بچپن ہی سے یورپ میں رہنے کی وجہ سے اس مذہب کے حالات اور اس مذہب کی لڑکیوں کی مظلومیت سے بالکل ناواقف تھی۔ اُستاد جی آپ ان باتوں سے واقف ہو کر بھی مذہب مذہب پکارتے رہتے ہیں؟ اف اف ظلم کی حد ہوگئی۔

سوشیلا جی کا چہرہ نفرت وحقارت کے جذبات سے تمتما رہا تھا اور بجلی کی روشنی میں ان پر ایک خاص کیفیت اس قدر نمایاں نظر آرہی تھی کہ شبیر صاحب نے مسودہ سے نظر ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تو مبہوت سے رہ گئے۔ سوشیلا بے چین ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولیں۔

"اگر اسی کا نام مذہب ہے تو خدا کرے اس کا بیڑا جلد غرق ہو اور ہندوستان کی معصوم لڑکیوں کو قسم قسم کے عذاب سے نجات ملے۔"

شبیر صاحب: دراصل مذہب اس کا نام نہیں ہے مگر آج کل کے لوگوں نے اصل مذہب ترک کر کے اسی رسم ورواج کا نام مذہب رکھ لیا ہے تو اس میں مذہب کا کیا قصور ہے۔

سوشیلا: بہرحال اب تو یہی مذہب سمجھا جاتا ہے اور یہ محض رسم ورواج بھی ہو تو ان کا مذہب کیا ہے اور جب اس کے ذریعے ایسے ایسے خوفناک رسم کی بھی اصلاح نہیں ہوسکتی تو آخر وہ کس مرض کی دوا ہے۔ (سوشیلا بائی کا طرزِ تکلم اور غصہ سے ان کے چہرے کی گلگونی ظاہر کر رہی تھی کہ بس چلے اور وہ بنیا دھرم کو اس وقت مجسم حالت میں پالیں تو بھوکی شیرنی کی طرح اس کا گلا دبوچ کر اس کا خون چوس لیں گی۔)

شبیر صاحب: (سوشیلا کی حالت کا اندازہ کر کے اور اُس کے حسین چہرے کی ارغوانیت سے متاثر ہو کر) بیٹھئے تو سہی۔ آگے ابھی ایک دوسرے مذہب کا بھی تذکرہ آرہا ہے۔

سوشیلا: (بیٹھتے ہوئے) اجی مذہب کا نام ہی برا ہے۔ میں کسی مذہب سے بھلائی کی اُمید نہیں رکھتی۔

شبیر صاحب: ممکن ہے آپ کو یہ خیال بدلنا پڑے اور ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے پنڈتوں سے دریافت کریں تو ہندو دھرم میں بھی کچھ خوبیاں نظر آنے لگیں۔

سوشیلا: اُستاد جی ان کا تو نام ہی نہ لیجئے۔ آگے سنایئے کہ بیچاری نرملا پر کیا بیتی۔

شبیر صاحب پھر سنانے لگے۔

"چند دن کے بعد بابو رام نے نرملا کو اس نفع بخش سودے کی خبر دی اور نہایت حریصانہ انداز میں ہنس ہنس کر بتایا کہ کیشپ دت بڑا اچھا بر ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ اس کی جواہرات کی بہت بڑی دکان ہے۔ بہت روپے جمع کر لئے ہیں۔ تجھ سے شادی کرنے کو تیار ہے۔ تجھے اچھے سے اچھے جواہرات سے لاد دوں گا۔

معصوم نرملا چپ چاپ سن رہی تھی۔ اس کے ننھے ننھے نازک ہونٹ فرط حیرت کھلے ہوئے تھے۔ وہ بولی۔ ایسے ٹھاٹھ کا دولہا اور اتنے قیمتی جواہرات سب کچھ میرے لئے!

باپ کھل کھلا کر ہنس پڑا اور خلاف عادت بیٹی سے لاڈ کر کے بولا۔ ہاں میری منو اُس کا سب کچھ تیرے ہی لئے ہوگا۔"

سوشیلا: ہائے کھوسٹ شیطان۔ نرملا غریب کو یہ نہیں بتایا کہ اس کا ٹھاٹھ کا بر ساٹھ کا ہے اور قبر میں صرف پیر ہی نہیں لٹکا رکھے ہیں بلکہ اپنے پورے جسم سے قبر کے کنارے آ لگا ہے۔

شبیر صاحب نے سوشیلا کی آواز میں تغیر محسوس کر کے سر اٹھایا تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور ان کی صورت سراپا درد و غم کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

شبیر صاحب: اوہو آپ کا قلب بے حد نازک ہے اور آپ بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔

سوشیلا: نہیں۔ بلکہ مجھے بدقسمت نرملا کی داستان سن کر اپنی بدقسمتی یاد آ رہی ہے کیوں کہ اسی غریب کی طرح میری شادی بھی ایک ایسے شخص سے لگائی جا رہی ہے جس کو نہ میں چاہتی ہوں نہ چاہ سکتی ہوں اور نہ چاہنے کی تاب ہے۔

شبیر صاحب: مگر آپ کے بزرگ تو خدا کے فضل سے اتنے روشن خیال ہیں کہ اس ملک میں اتنی روشن خیالی ملنی مشکل ہے اور انہوں نے آپ دونوں بہنوں کو اپنا رفیق زندگی منتخب کرنے میں کامل آزادی دے رکھی ہے۔

سوشیلا: ہاں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اور وہ اتنی روشن خیالی کے باوجود اب تک رسم ورواج کی لغویتوں اور گوت کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔

شبیر صاحب: شاید ایسا ہی ہو۔

شبیر صاحب اس موضوع پر زیادہ گفتگو کرنی مناسب نہیں سمجھتے تھے علاوہ بریں کھانے کی آخری گھنٹی بھی بج چکی تھی۔ بولے:

کھانے کی گھنٹی ہو چکی ہے۔ انتظار ہو رہا ہوگا چلئے ڈائننگ روم چلیں۔

سوشیلا: میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کھانے کو میری طبیعت نہیں چاہتی۔ آپ جائیے میں تب تک یہیں بیٹھتی ہوں۔

شبیر صاحب: آپ تو خواہ مخواہ اس قدر فکر میں پڑ گئیں۔ اچھا آپ کو پہلے ہی یہ بتا دیتا ہوں کہ نرملا کی شادی اس کھوسٹ بڈھے سے نہیں ہو سکی بلکہ اسے ایک فرشتہ رحمت نے اس مصیبت سے بچا لیا۔

سوشیلا: (یکبارگی بے حد مسرور ہو کر) اچھا وہ تو بڑی خوش قسمت نکلی کہ ایک حریص اور کم ظرف باپ کی حرص وآز کا شکار نہ بن سکی۔ (مگر فوراً ہی مغموم ہو کر) لیکن نہ معلوم میرے لئے بھی کوئی رحمت کا فرشتہ ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

شبیر صاحب: آپ تو بلاوجہ کڑھ رہی ہیں۔ آپ کے والدین اور بھائی سبھی آپ کی رضامندی کو ترجیح دیں گے۔

سوشیلا: زیادہ افسوس تو اسی کا ہے کہ آپ اب تک بے خبر ہیں۔ خیر چلئے کھانے پر میں بھی حاضری دے ہی دوں۔

سر ککر جی اور لیڈی ککر جی آج کسی دوست کے ہاں پارٹی میں گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے میز پر صرف مسٹر چندر چندر رانی مس میو اور سوشیلا بائی بیٹھی تھیں۔

مسز شبیر اور سوشیلا پہنچیں تو چندر رانی نے کہا۔

ہم بہت دیر سے آپ کے منتظر تھے۔

شبیر صاحب: ذرا مس صاحب کے مسودات دیکھ رہا تھا اور توجہ ادھر ہی بٹی ہوئی تھی اس لئے کچھ دیر ہو گئی۔

چندر رانی: (کھانا شروع کرتے ہوئے) مسٹر شبیر اس وقت کون سا واقعہ پڑھ رہے تھے جس نے آپ کو اپنی طرف اس قدر متوجہ کر رکھا تھا۔

شبیر صاحب: وہی نرملا والی کہانی پڑھ رہا تھا۔

مسٹر ہریش چندر: بھئی وہ تو بہت دلچسپ واقعہ ہے۔ نرملا نے مورتیوں کو چپت رسید کر کے اور انہیں الٹا کھڑا کر کے خوب ہی دل کا بخار نکالا۔

چندر رانی: مگر اُس نے یہ اچھا نہیں کیا کہ اس نے ایک غیر مذہب والے کے آغوش میں پناہ لی۔

مس میو: (حیرت سے اُن کی طرف دیکھ کر) اس قدر روشن خیالی کے بعد آپ بھی اس کو برا سمجھتی ہیں؟ پھر اس کے مقابلہ میں کیا یہ بہتر ہوتا کہ اس معصوم لڑکی کی زندگی برباد ہو جاتی۔

چندر رانی: مگر اس کے باپ کو کس قدر صدمہ ہوا ہوگا اور کتنی ذلت برداشت کرنی پڑی ہوگی۔

مس میو: تو اس میں غریب نرملا کا کیا قصور اس کی پست فطرت اور اس کی لاانتہا حرص کی سزا اس سے بھی زیادہ سخت ہونی چاہئے تھی۔

مسٹر چندر: (مس میو کی معنی خیز حیرت اور چندر رانی کی سادگی کو محسوس کر کے) مس صاحب چندر رانی کے پتاجی اُن سے بہت محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں اس لئے یہ ہر باپ کو ویسا ہی شفیق اور اولاد کے لئے قابلِ احترام سمجھتی ہیں۔

مس میو: مگر انہیں تو نرملا کے تبدیل مذہب پر بھی اعتراض ہے۔ حالانکہ اسلام بہر حال ہندو دھرم سے تو اچھا ہے (سوشیلا بائی کی نظر بے اختیار مس میو کی طرف اُٹھ گئی اور وہ اپنی غزالی آنکھوں سے گھور گھور کر انہیں دیکھنے لگیں۔ ان کا رہ رہ کر کرسی پر پہلو

بدلنا پتہ دے رہا تھا کہ مس میو کے کسی جملہ نے ان کے باطن پر کوئی خاص اثر ڈالا ہے)

مسٹر چندر: نہیں مذہب وذہب کی یہ چنداں قائل نہیں ہیں۔

چندر رانی: (بات کاٹ کر) لیکن کم سے کم یہ تو غور طلب امر ہے کہ اسلام ہندو دھرم سے بہتر ہے۔

مسٹر چندر: مذہب اسلام ہو یا ہندو دھرم مذہب ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک دنیا کے لئے دونوں ہی غیر ضروری اور غیر مفید ہیں۔

مسٹر شبیر: یہ بھی غور طلب ہے اور میرے نزدیک مذہب دنیا کے لئے ایک لازمی چیز ہے اور انسان کی فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے کہ وہ مذہب کے حقیقی منشا کے مطابق عمل کرے۔ آپ نہ تسلیم کریں مگر کم سے کم اسلام کے متعلق تو میرا یہی اعتقاد ہے۔

مسٹر چندر: (ہنس کر) لیجئے مذہبی صاحب بول اُٹھے۔ بھئی تم جیسے مُلا دنیا کو لے ڈوبیں گے۔

مسٹر شبیر: یہ بھی غور طلب ہے۔

مس میو: خوب آپ لوگوں کی ہر بات غور طلب ہے۔

مسٹر شبیر: (اس طعن کو محسوس کرتے ہوئے) جی ہاں یہ سب مغربی تہذیب اور مغرب کی ملحدانہ تعلیم کی برکت ہے۔

مسٹر ہریش چندر: بھئی جو کچھ بھی کہو مگر ایک دن ہندوستان پر مغربی تہذیب غالب آ کر رہے گی اور مذہب یہاں سے کبھی نہ کبھی ہمیشہ کے لئے جلاوطن ہو کر رہے گا۔

مسٹر شبیر: مگر میں کہتا ہوں کہ یورپ دھریت کی جس لعنت میں مبتلا ہے۔ اس کا مداوا مذہب کے سوا اور کسی سے نہیں ہو سکتا اور وہ دن بہت قریب ہے کہ مشرق کی روحانیت اس کی رہنمائی کرے گی اور وہ مذہب کی روشنی میں حقیقی عروج کی راہ پر گامزن ہوگا۔

مسٹر چندر: شاید ایسا ہی ہو مگر ابھی تو یہی نظر آ رہا ہے کہ دنیا کے موجودہ مادی دور کا بے پناہ سیلاب مذہب اور آپ جیسے مذہب اور روحانیت کے شیدائیوں کو بہا لے جائے گا۔

مس میو: مگر اسلام کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ ہر آب و ہوا اور ہر دور کے مناسب ثابت ہوتا ہے۔ افریقہ کے وحشی اور امریکہ کے مہذب یکساں طور پر اس کے

پیرو بن سکتے ہیں۔

مسٹر شبیر صاحب: جی ہاں دیکھئے۔ یہ مذہب کی ہمہ گیری سے واقف ہی نہیں ہیں۔

انہیں باتوں میں سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے اور اپنے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔

شبیر صاحب اپنے کمرہ میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ سوشیلا بائی بھی وہیں پہنچیں۔

سوشیلا: سن لئے نہ آپ نے بھابھی جی کے خیالات۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ روشن خیال ہیں اور میں آزاد ہوں۔

شبیر صاحب: (جو اس موضوع پر گفتگو کرنے سے گھبراتے تھے) جی ہاں مگر یہ تو محض میز پر کی باتیں تھیں۔

سوشیلا: نہیں اُستاد جی آپ ابھی واقف نہیں ہیں۔ یہی ان کے دلی جذبات ہیں۔ خیر وہ کہانی تو ختم کیجئے۔

شبیر صاحب: اب اس وقت آپ کا یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ مسودہ لے جائیے اپنے کمرہ میں پڑھ لیجئے گا۔

سوشیلا: نہیں میں تو آپ ہی سے سنوں گی۔ آپ ابھی سے اس قدر ڈرنے لگے۔

شبیر صاحب: (چوکنا ہو کر) اس "ابھی سے" کا کیا مطلب۔ کیا ڈرنے کا کوئی خاص وقت آنے والا ہے؟ اور میں تو صرف آپ کی پوزیشن کا خیال کر کے کہہ رہا تھا۔

سوشیلا: اگر آپ ڈرتے نہیں ہیں تو ڈرنے کا وقت کیوں کر آ سکتا ہے۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ آپ مطمئن رہئے اور شروع کیجئے۔

شبیر صاحب کو مس سوشیلا کے الفاظ عجیب سے معلوم ہوئے اور وہ اندرونی خلجان میں مبتلا ہو گئے مگر اب زیادہ سوال و جواب کا موقعہ بھی نہ تھا۔ ناچار انہوں نے بقیہ کہانی سنانی شروع کی۔

"بابو رام کو تیسرے چوتھے تقاضہ کے لئے قرب و جوار میں جانا پڑا تھا۔ بیٹی کو خوشخبری دے کر وہ شہر سے باہر چلا گیا۔ نرملا جو اشتیاق کے مارے بیتاب ہو رہی تھی۔ اس کے جاتے

ہی اپنی پھوپھی کے گرد ہو گئی کہ چلو آج بازار کی سیر کو چلیں۔
سروجنی: نہ نہ تیرا باپ سن پائے گا بہت ناراض ہوگا۔
نرملا: میں منہ پر ساڑی کا آنچل ڈال لوں گی اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چلوں گی کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ کون ہے۔ دن بھی بڑا اچھا ہے۔ خوب مزے کی سیر ہوگی۔
سروجنی کا جی تو نہ چاہتا تھا مگر نرملا کی دل جوئی کے خیال سے راضی ہو گئی۔
بازار میں نرملا نے جوہریوں کی دکانیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیکھنی شروع کیں۔ ہر دوکان پر پوچھتی کہ یہ کس کی دوکان ہے اور سروجنی جس کے نزدیک یہ بازار ہی ساری دنیا تھا۔ ٹھیک ٹھیک جواب دیتی جاتی۔ آخر ایک بہت بڑی شاندار دوکان کے سامنے سروجنی نے بتایا کہ یہی تیرے ہونے والے پتی کی دوکان ہے وہ دیکھ سامنے خزانے کے بیچ میں کیشپ دت کس شان سے بیٹھا ہے۔''
سوشیلا بائی جو غور سے سن رہی تھیں اور اس قدر متاثر نظر آرہی تھیں کہ گویا آپ بیتی سن رہی ہیں۔ نفرت کے لہجے میں بولیں:
چڑیل کہیں کی۔ یہ شان اس قدر بھا گئی تھی تو کیشپ دت کو خود اپنا پتی کیوں نہیں بنا لیتی تھی۔
شبیر صاحب: (سوشیلا بائی کی بات پر بے اختیار ہنس کر) آپ کیوں اس قدر جل رہی ہیں۔ سروجنی بے چاری چاہتی بھی تو کیسے کر سکتی تھی۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ کٹر ہندو بیوہ کی شادی گوارا نہیں کرتے۔
سوشیلا: یہ دھرم کیا ہے کہ اس کی ایک ایک بات ظالمانہ ہے خیر آگے سنائیے نرملا کو اپنا ٹھاٹھ کا بر پسند آیا کہ نہیں۔
''نرملا نے ساڑی کا پلو اپنے چہرے کے قریب کر لیا اور شرماتی ہوئی اس کی تہوں میں سے جھانکنے لگی۔
جو کچھ نظر آیا اسے دیکھ کر اس کا دل جم کر رہ گیا اور اس کی روح گھٹنے لگی۔ ایک دبلا پتلا، لمبی لمبی ہڈیوں کا ڈھچر بڈھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سروجنی کا لہنگا پکڑ کر کھینچا اور ہانپتی ہوئی بولی:

"یہ۔ یہ۔ یہ ہے وہ؟"

سروجنی: اور کیا؟

نرملا: مجھے اس کو دے ڈالیں گے۔ ہائے ہائے کیوں؟

سروجنی: اس لئے کہ دیوتاؤں کا حکم یہی ہے۔

نرملا: ان کا حکم یہی ہے تو میں نہیں مانتی۔ میں اُن کی لونڈی نہیں ہوں۔

یہ سن کر سروجنی سچ مچ سہم گئی اور چلا کر بولی۔

"ارے اس پاپ پر مار ڈالیں گے تجھے دیوتا!

نرملا: (سسکیاں بھرتے ہوئے) بلا سے مار ڈالیں۔

یہ کہہ کر نرملا سروجنی کا ساتھ چھوڑ کر بھاگی۔ بازار میں سے بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کا دماغ نازک تھا۔ صدمہ نے اسے پاگل سا بنا دیا تھا۔ منہ ڈھکا ہوا تھا اسے معلوم نہ تھا کہ کہاں جا رہی ہے۔ بھاگتی بھاگتی سڑک پر سے ہٹ گئی تھی۔ اسی بے خبری کی حالت میں محمود ابدالی" کی مسجد کے سامنے تالاب کی سیڑھیوں پر پہنچ گئی۔ وہ اپنے آپے میں نہیں تھی اور سیڑھیوں پر گرنے ہی لگی تھی کہ ایک مضبوط بازو نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا سر چکرا کر اس شخص کے شانے سے جا لگا۔ ساڑی کا آنچل سر سے سرک چکا تھا۔ ذرا دیر اسی طرح پڑی ہانپتی اور آنکھیں اوپر کئے اس شخص کا چہرہ تکتی رہی۔ ایسا چہرہ اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ شخص کسی سرحدی قبیلے کا خوبصورت سا تنومند نوجوان تھا۔ دیکھتے دیکھتے گویا اس کی روحانی خلش دور ہو گئی۔ اُس نے لڑکھڑاتی زبان میں پوچھا "کیا تم کرشن بھگوان ہو؟"

اجنبی شخص قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "نہیں میں شیر علی خاں کا فرزند محمد خاں ہوں اور اس شہر میں اجنبی ہوں۔"

اب وہ اس کے چہرہ پر ٹکٹکی باندھے ہوئی تھی۔ "تم مسلمان ہو؟ (سامنے مسجد کی طرف اشارہ کر کے) یہ تمہارے دیوتاؤں کا گھر ہے؟"

محمد خاں کو پھر ہنسی آ گئی۔ "نہیں یہ خدا کا گھر ہے اور وہ اکیلا ہے۔"

لڑکی نے جھک کر پرنام کیا اور پھر اُٹھ کر بھاگ گئی۔ نوجوان کھڑا اسے بھاگتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔"

سوشیلا: (جس پر آخری واقعہ سن کر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا) ہائے بدنصیب اسے آزادی مل گئی تھی۔ اس کی بھی قدر نہ کی اور پھر انہیں ظالموں میں چلی گئی جو اسے زندہ دفن کر دینے کو تیار ہیں۔

شبیر صاحب: سنئے تو وہ کس لئے گئی ہے۔

"سروجنی بازار بازار نرملا کو ڈھونڈتی ہوئی ہانپتے کانپتے گھر پہنچی تو دیکھا کہ نرملا کوٹھری میں مردوں کی طرح بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ سروجنی نے اطمینان کا سانس لیا اور نرملا کو چارپائی سے گھسیٹ کر زمین پر پٹخ دیا۔ لڑکی گم سم فرش پر بیٹھی سامنے اس طرح دیکھ رہی تھی گویا اسے جسمانی تکلیف کا کوئی احساس ہی نہیں ہے اور گالیوں اور دھمکیوں کا بے اثر طوفان اس کے سر پر سے گزرتا جا رہا ہے۔ سروجنی کو کیا معلوم تھا کہ اس کی نظر کے سامنے ایک ایسی تصویر ہے جسے وہ آنکھوں سے اوجھل کرنا نہیں چاہتی۔ آخر وہ نرملا کے اس انوکھے طریقۂ جواب سے عاجز آ گئی اور بڑبڑاتی ہوئی دوسری کوٹھری میں جا کر دوپہر گزارنے کو لیٹ رہی۔

سروجنی تھک چکی تھی۔ جلد ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ خراٹے لینے لگی۔ نرملا چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں گھر کے مندر میں داخل ہو گئی۔ وہاں کی ساری مورتیوں کو اپنی ساڑی کے آنچل میں جمع کیا اور انہیں لے کر صحن میں آئی۔ پھر باری باری سے ان کو ہاتھ میں لے کر ہر ایک کو تھپڑ مارنے لگی۔"

سوشیلا: (زور سے ہنس کر) شاباش خوب کیا۔

شبیر صاحب بغیر رُکے ہوئے پڑھتے جا رہے تھے اور سوشیلا جن کے جذبات میں طوفان خیز طلاطم بپا تھا۔ کبھی ہنستی تھیں کبھی غمگین ہو جاتی تھیں اور کبھی فکر میں پڑ جاتی تھیں۔

"جب نرملا نے تمام مورتیوں کو سر کے بل ایک قطار میں کھڑا کیا اور صف باندھ چلی تو ان کے سامنے دوزانو ہو کر بولی۔

میں تمہاری لونڈی نہیں ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ سنتی ہو؟ مجھے تم سے نفرت ہے سمجھیں؟ میں تمہارا حکم نہیں مانتی۔ لو مجھے مارنا ہے تو مار لو۔ مرنا قبول ہے مگر میں اس کھوسٹ بڈھے کے ہاں نہیں جاؤں گی۔ یہ کہتے ہوئے اس کا دل بھر آیا اور وہ اُٹھ کر گھر کے پچھلے دروازے کی طرف بھاگی۔ تالہ کھولا اور گلیوں میں غائب ہو گئی۔

اس نے ہر طرف دیکھ کر محمود ابدالی" کی مسجد کا گنبد تلاش کر لیا اور چند ہی منٹ میں ان چوڑی چکنی سیڑھیوں تک پہنچ گئی جہاں وہ صبح گرتے گرتے بچی تھی۔ وہ ہانپتی کانپتی تالاب کے پاس سے گزری اور سیڑھیاں طے کر کے مسجد میں داخل ہوئی۔ اندر مسجد کا وسیع اور خوش نما صحن اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ ہوا کے جھونکے آزادانہ آ جا رہے تھے۔ مسجد کی دلآویز کشادگی اس کی عظمت اور آرائش بے اختیار بنا رہی تھیں اور اس کی بے تاب روح کو تسلی دے رہی تھیں۔ پہلو میں سے کسی نے کہا۔ صبح والی ننھی بلبل تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ نرملا مڑی تو اس نے دیکھا کہ اسے وہی آنکھیں پھر تک رہی تھیں جو اس کے چشمِ تصور میں بہت دیر سے جلوہ گر تھیں۔ نوجوان کو دیکھ کر فرطِ حیرت و مسرت سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ اس نے جواب دیا۔

"مہاراج میں آپ کے خدا کو ڈھونڈنے آئی ہوں۔ شاید وہ میری آتما کو قبول کر لے اور ان ظالموں سے بچا دے جو ننھی لڑکیوں کو مردہ جیسے خوفناک بڈھوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔"

نوجوان نے مسکرا کر کہا وہ ضرور قبول کر لے گا۔ میرے ساتھ آؤ یہ کہہ کر وہ اس کا ننھا سا ہاتھ تھامے اسے اندر مسجد میں لے گیا۔"

سوشیلا: شکر ہے کہ اس کی قسمت نے یاوری کی اور ایک ہی دن کی تکالیف میں نرملا کی دلی مراد بر آئی اور ان پڑھ ہونے کے باوجود اس کو ہندو دھرم کے قیود سے نجات مل گئی۔ دیکھئے میری بدنصیبی کیا گل کھلاتی ہے۔ سوشیلا آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رک گئی۔

شبیر صاحب سوشیلا کی کیفیت دیکھ کر سخت حیرت میں تھے مگر انجان سے بنے رہے اور بظاہر ادھر توجہ نہ کر کے کہانی سنانے میں مشغول رہے۔

"بابو رام اپنے سفر سے واپس آیا تو گھر پہنچنے سے پہلے شہر ہی میں اپنی بیٹی کے غائب ہو جانے کی خبر سنی راستے میں بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہوئے۔ گھر پہنچا تو اس کے دروازے پر اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ ہر شخص قیاس آرائیوں میں مصروف تھا۔" لیکن آخر گئی کہاں" ایک تسلی دینے والا بولا" تو نے اسے اتنے عرصہ کنوارا رکھا کہ اس نے غیرت کے مارے کنوئیں میں گر کر خودکشی کر لی۔ دوسرے نے کہا۔ تجھ سے اس کی شادی نہ ہو سکی اور وہ بارہ برس کی جوان ہو گئی۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اندر ہی اندر کوڑھ تھا اور اس

نے شرم کے مارے خودکشی کرلی ہے۔"

سروجنی غریب ڈر کے مارے بازار کا ذکر زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ بابورام اس کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ اس نے بے بس ہو کر کہا "نہ جانے مجھ سے کون سا پاپ ہوا کہ مجھ پر کنیا کا باپ بننے کی لعنت آ پڑی۔ میں بڑا ابھاگا ہوں میں نے اسے پیدا کرتے ہی کیوں نہ مار ڈالا۔ گیارہ برس کئی مہینے بغیر بدلہ اتارے میرے گھر سے کھاتی رہی اور اب مجھ پر یہ ظلم توڑ گئی کہ میرے پورے تین ہزار روپے کا نقصان کر دیا۔ تم کو معلوم نہیں ہے۔ تم جھوٹے ہو۔ اس کو کوڑھ نہیں تھا۔ وہ تندرست تھی اور بڑی خوبصورت تھی۔ تین ہزار روپے پر اس کا سودا ہو چکا تھا۔ یہ سن کر سب ہنس پڑے اوروں کو ہنستا دیکھ کر نرملا کا باپ گویا پاگل ہو گیا۔ اچھا ہنستے ہو ہنس لو مگر یاد رکھو کہ تم میں سے ہر ایک کو اس ہنسی کا مول ادا کرنا پڑے گا۔ میں سمجھ گیا تمہیں میں سے کسی نے میری لڑکی کو اڑا لیا ہے میں اس بدمعاش کے بچے کے پیچھے پولیس لگا دوں گا۔ (منہ سے کف نکل رہا تھا آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں) پھر جہاں پولیس اپنا کام کرے گی۔ وہاں میں اپنا کام کروں گا۔ میں جانتا ہوں طریقے۔ مجھے آتے ہیں ڈھنگ۔ مجھ میں بڑے بڑے گن ہیں۔"

اسی طرح دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن صبح کے وقت بابورام اس فرش پر بہی کھاتہ کھولے بیٹھا تھا۔ تو یکلخت دروازے سے روشنی سامنے آنے لگی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ ایک لحیم شحیم شخص جس نے پوستین کا کوٹ پہن رکھا تھا اور بغل میں بندوق دبا رکھی تھی سامنے کھڑا ہے بڑا تنومند حنائی داڑھی۔ چیل سی ناک اور انداز میں کوئی ایسی بات جسے دیکھ کر یکلخت بابورام کی ہڈیوں کی تمام توانائی غائب ہو گئی۔

قوت و طاقت کے اس مجسم نمونہ نے عجیب شانِ بے نیازی سے کہا:

"او بوڑھے پاپی۔ میں مشہور آفریدی سردار شیر علی خاں کی طرف سے آیا ہوں۔ اب اس کے الفاظ کان کھول کر سن لے۔ کیوں کہ وہ اپنا کوئی لفظ دہرایا نہیں کرتا۔ بندوق لئے بغل میں پرمعنی انداز میں حرکت کی اور بابورام کانپ کر بولا۔ "فرماؤ سرکار"!

شیر علی خان کا یہ پیغام ہے کہ جو بچی تیری تھی اب تیری نہیں رہی۔ اس نے تجھے اور تیرے بتوں کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ اب شیر علی خاں کے لڑکے محمد خاں کی

منگیتر ہے۔ شادی سے پہلے وہ ابھی عرصہ تک گھرانے کی عورتوں میں علیحدہ رکھی جائے گی اور جب مکمل عورت بن جائے گی اس وقت ان کا نکاح ہوگا کیوں کہ ہم آفریدی چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد کی اولاد ہماری مانند ہو۔ وہ نامرد بچے نہ ہوں بلکہ پورے مرد ہوں۔''

''رام داس اگر یہ سب باتیں سن کر تو صبر نہیں کرسکتا تو پھر آجا۔ اپنے ساتھ اپنے تمام حوالی موالی بھی جمع کرلا اور لڑکی کو ہم سے چھین لے جا۔ اپنے برج دار قلعہ میں ہم صرف سو مسلح مرد رہتے ہیں لیکن یاد رکھ کہ تجھ جیسی بھیڑوں کا شکار کرنے کے لئے ہماری عورتیں کافی ہیں۔ سمجھ گیا یا ابھی تیری کھوپڑی میں انتظام اور قانون کا کچھ جنون باقی ہے۔''

رام داس نے نظر اٹھا کر اجنبی کو دیکھا پھر اوندھے منہ گر پڑا اور اجنبی کے پیروں کو چھو کر بولا مہاراج میں تابعدار ہوں اور جان کی امان چاہتا ہوں لڑکی آپ کی نذر ہے۔''

شبیر صاحب اپنی انتہائی متانت کے باوجود رام داس کی کیفیت پڑھ کر ہنس پڑے۔ سوشیلا بائی جو کہانی سن سن کر بے چین ہو رہی تھیں انہیں بھی ہنسی آگئی اور اندرونی جذبات کو چھپاتے ہوئے بولیں کہ واقعی مسلمان بڑے بہادر ہوتے ہیں۔

شبیر صاحب: اور بنیوں کی بزدلی بھی ضرب المثل ہے۔

سوشیلا: ظالم اور اخلاقی مجرم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔

شبیر صاحب: (مسودے کو بند کرتے ہوئے) ہمارے ملک پر خدا ہی رحم کرے۔

سوشیلا: کیوں کہانی ختم ہوگئی؟

شبیر صاحب: تو آپ اور کیا چاہتی ہیں (مسکرا کر) کیا آپ کی تمنا ہے کہ نرملا پھر کیشپ دت کو مل جاتی۔

سوشیلا: توبہ آپ بھی کیا سمجھتے ہیں۔ آپ کو میرے جذبات کا علم نہیں ہے؟ میں تو اپنے بزرگوں تک کو جو اتنے روشن خیال ہیں اپنے معاملہ میں درندہ ہی سمجھتی ہوں۔ جناب عالی آپ مذہب اسلام کی حقیقت سے مجھے بھی آگاہ کریں۔

شبیر صاحب: اور جو کہیں آپ کو یہ مذہب پسند آگیا؟

سوشیلا: تو پھر کیا ہوگا۔

شبیر صاحب: یہی کہ میں بدنام ہوں گا اور بھائی چندر کو منہ دکھانے کے

قائل نہ رہوں گا۔

سوشیلا: تو کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کی رو و رعایت میں ایک جویائے اسلام کی اسلام کی طرف رہنمائی نہ کی جائے۔

شبیر صاحب: (لاجواب سے ہوکر) کیا واقعی آپ اصول اسلام سے واقف ہونا چاہتی ہیں۔

سوشیلا: ہاں ہاں واقعی کہہ رہی ہوں کہ مجھے مایوسیوں کی تاریکی میں اب اسلام ہی کی روشنی کچھ کچھ نظر آرہی ہے۔

شبیر صاحب: اچھا دیکھا جائے گا مگر آپ کے لئے یہ راہ بڑی خطرناک ہے۔

سوشیلا: جب نرملا نے جو گھر کی چاردیواری سے کبھی باہر نہ نکلی تھی۔ ان خطروں کی پرواہ نہ کی تو میں ان سے کیوں ڈروں۔ میں تو بالکل آزاد ہوں اور اب تک کسی مذہب کی قائل نہیں ہوں اور اسی لئے اسلام سے واقفیت حاصل کرنی چاہتی ہوں کہ واقعی ہر مذہب لغو ہے یا میرا خیال غلط ہے۔

شبیر صاحب: بہت بہتر میں کبھی کبھی اسلام کی باتیں آپ کو سنایا کروں گا۔

سوشیلا: سب سے پہلے بانئ اسلام کی زندگی کے حالات سنایئے۔

شبیر صاحب: بہتر یہی سہی۔

سوشیلا: تو پھر کب۔

شبیر صاحب: کبھی سنا دوں گا۔

سوشیلا: نہیں کبھی کی سہی نہیں۔ کچھ تو ابھی سنایئے۔

شبیر صاحب: (حیرت میں پڑکر) ابھی اخبر بھی ہے کیا وقت ہو چکا ہے۔

سوشیلا: خیر صبح سنا دیجئے گا۔

شبیر صاحب: اتنی جلدی کیا ہے۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا۔

سوشیلا: آپ تو بھاگنے ہی کی فکر میں ہیں۔ الٰہ آباد سے کیا لکھ بھیجا تھا۔

شبیر صاحب: اچھا جناب کل ہی سنا دوں گا۔

سوشیلا: میں کل اُردو کا سبق نہیں پڑھوں گی۔ اس وقت آپ کو اپنے رسول

(صلعم) کی سوانح حیات سنانی ہوگی۔

شبیر صاحب: کہہ تو دیا کہ بہت خوب۔

سوشیلا بائی شبیر صاحب کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرہ میں چلی گئیں۔ وہاں جاکر آدھے گھنٹے تک ٹہلتی رہیں۔ ان کے چہرے سے عجیب انتشاری کیفیت ٹپک رہی تھی۔ اس کے بعد شب خوابی کا لباس بدلا اور سونے کے لئے لیٹ گئیں مگر زملا کی کہانی اور اسلام کے تذکرہ نے ان کے دل پر کچھ اس طرح اثر کیا تھا کہ وہ گھنٹوں بستر پر بھی انہیں خیالات میں کروٹیں بدلتی رہیں اور کہیں تین بجے کے بعد انہیں نیند آئی۔

پانچواں باب

صبح ناشتے سے فارغ ہوکر سوشیلا بائی اُردو پڑھنے کے لئے حسبِ معمول شبیر صاحب کے کمرے میں پہنچیں۔ آتے ہی کہا کہ آپ کو رات کا وعدہ یاد ہے یا نہیں۔

شبیر صاحب: جی ہاں یاد ہے مگر آپ کو اس قدر جلدی کیوں ہے؟

سوشیلا: اس لئے کہ مجھے بہت جلد فیصلہ کرنا ہے۔

شبیر صاحب: کس بات کا؟

سوشیلا: (جو اس سوال سے کچھ گھبرا سی گئی تھیں سنبھل کر) اس کا کہ مذہب انسان کے لئے ضروری ہے یا غیر ضروری۔

شبیر صاحب: مگر اس میں اسلام کی کیا خصوصیت ہے یہ تو الگ ہی ایک بحث طلب بات ہوگی۔

سوشیلا بائی شبیر صاحب کے جواب سے اور بھی پریشان ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر بات زبان تک آکر رُک جاتی ہے۔ آخر بولیں۔

ان باتوں سے آپ کو کیا مطلب آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اب اپنے رسول (ﷺ) کے حالات سنا کر اپنا وعدہ پورا کیجئے۔

شبیر صاحب: بہت اچھا صاحب سنئے! مگر یہ کیوں نہ کروں کہ آپ کو کتاب دے دوں اور آپ پڑھ لیں۔

سوشیلا: نہیں آپ سنائیے۔ میں خود پڑھوں گی تو میرے شبہات کا جواب کون دے گا۔

شبیر صاحب: آپ نشان کرتی جائیں اور بعد کو مجھ سے پوچھ لیں۔

سوشیلا: (لاجواب ہو کر) آپ اپنے مذہب کے سلسلے میں تھوڑا سا وقت دینے سے اتنا گھبراتے ہیں!

شبیر صاحب: خدانخواستہ میں گھبرانے کیوں لگا۔ لیجئے سنئے اچھا آپ جانتی ہیں کہ دنیا میں ایک ملک کا نام عرب ہے۔

سوشیلا: ہاں میں جانتی ہوں جغرافیہ میں میں نے پڑھا تھا مگر اس کے حالات سے ناواقف ہوں۔

شبیر صاحب: قدیم زمانے میں اس ملک کے باشندے بھی ہندوؤں کی طرح بت پوجتے تھے۔ کوئی ایسی برائی نہ تھی جو ان میں موجود نہ ہو۔ عورتوں پر ظلم کرنے اور بچیوں کو زندہ دفن کر دینے میں وہ خاص شہرت رکھتے تھے۔ اس ملک میں ایک شہر ہے جس کا نام مکہ ہے۔ اس شہر میں عرب کا سب سے شریف خاندان بستا تھا مگر وہ بھی بت پرست بلکہ بت پرستوں کا رہنما تھا۔

کسی زمانہ میں خدا کے ایک پیغمبر گزرے ہیں جن کا نام ابراہیم (علیہ السلام) تھا اور جن کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر خدا کی عبادت کے لئے عرب کے اس شہر میں ایک گھر بنایا تھا جو بیت اللہ یعنی خدا کے گھر کے نام سے مشہور ہے۔

سوشیلا: یہ وہی شہر ہے نہ جہاں مسلمان حج کرنے جاتے ہیں۔

شبیر صاحب: جی ہاں۔ وہی ہے۔

سوشیلا: میں نے تو خدا کے اس گھر کا نقشہ بھی دیکھا ہے۔ گذشتہ دنوں ترکوں اور عرب والوں میں لڑائی ہوئی تھی تو لندن کے اخبارات میں وہاں کی بہت سی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔

شبیر صاحب: خوب آپ تو بیت اللہ شریف سے اچھی طرح واقف ہیں مگر بانیِ اسلام کے دنیا میں تشریف لانے کے وقت یہ گھر خدا کا گھر باقی نہ رہا تھا بلکہ وہاں کے باشندوں نے اس میں سینکڑوں بت رکھ چھوڑے تھے اور یہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا بت خانہ تصور کیا جاتا تھا۔

سوشیلا: سومناتھ سے بھی بڑا؟

شبیر صاحب: اس میں کئی سومناتھ سما سکتے تھے۔ اس میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے اور صرف عرب یا مکہ ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گی تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں یعنی اب سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال پہلے عرب کے اس مشہور شہر مکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے لڑکے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل اور وہاں کے سب سے معزز خاندان قریش کے سب سے معزز گھرانے بنو ہاشم میں ایک لڑکا (ﷺ) پیدا ہوا۔ جو (ﷺ) پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو چکا تھا۔ اُس کا نام محمد (ﷺ) رکھا گیا یہ لڑکا ابھی بچہ ہی تھا کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا اور ایک یتیم پر جس قدر مصائب و شدائد گزر سکتے ہیں سب اس پر گذرے اچھی تربیت اور نگہداشت کا موقع میسر نہ تھا۔ پرورش ان لوگوں میں ہو رہی تھی جن کو کسی جرم سے روکنے کے واسطے کوئی حکومت کوئی قانون یا کوئی آسمانی شریعت موجود نہ تھی مگر قدرت نے اس چھوٹے سے یتیم بچہ کی طبیعت اس قدر پاکیزہ بنائی تھی کہ طبعی طور پر بچپن ہی میں تمام برائیوں سے نفرت ہو گئی۔ عرب میں عیاشی کے لوازمات کی کمی نہ تھی مگر آپ ترغیب و تحریص کے باوجود بداخلاقی کے اس سمندر سے اپنا دامن بچا کر نکل گئے اور اپنی جوانی تجارتی کاروبار میں گزاری جس وقت انہوں نے نبوت اور خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا ان کی عمر کا بہترین حصہ گزر چکا تھا۔ چالیسواں سال تھا۔ ان سے معمر اور ان کے ہم عمر دونوں قسم کے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اپنے مخالفین کے سامنے اپنے بچپن اور اپنی جوانی کی زندگی کو بے عیب اور بے داغ زندگی کی صورت میں پیش کیا اور چیلنج دیا کہ "میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ (جو عام طور پر خطرناک ہوتا ہے) تمہارے درمیان گزارا ہے۔ ذرا اس کو گہری نگاہ سے دیکھو کیا تم میں سے کوئی ہے جو اس کو داغ دار اور بدنما ثابت کر سکے۔ اس چیلنج پر ان کے بڑے سے بڑے مخالف بھی ناکام رہے۔ ابوجہل جو آپ کا بہت سخت دشمن بن گیا تھا وہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا کہ "ہم محمد (ﷺ) پر جھوٹ بولنے کا الزام نہیں لگا سکتے بلکہ اس کے خدا کے کلام کو جھٹلاتے ہیں۔"

سوشیلا: واہ خوب منطق تھی۔

شبیر صاحب: مخالفت انسان کو عقل کا اندھا بنا دیتی ہے۔ صرف ابوجہل ہی

نہیں بلکہ خاندانِ قریش نے متفقہ طور پر گواہی دی کہ "محمد (ﷺ) کو ہم نے جھوٹ بولتے کبھی نہیں سنا۔" اِن کے چچا جنہیں اِن کی نگرانی اور پرورش کا کافی موقعہ ملا تھا۔ انہوں نے بھی شہادت دی کہ "میں نے محمد (ﷺ) کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔ نہ کسی سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا نہ یہ جاہلیت کے کام کرتے کبھی نظر آئے۔"

عرب والوں نے اِن کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی اور دلچسپ سے دلچسپ چیزیں پیش کیں کہ "انہیں قبول کر لیجئے اور اس نئے دین کی اشاعت سے باز آیئے اور ہمارے بتوں کی توہین نہ کیجئے مگر آپ نے کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تو عرب والوں نے آپ کو قسم قسم کی اذیتیں دینی شروع کیں مگر آپ نے اس کی بھی پرواہ نہ کی اور اپنے خدا کے آخری دین کی اشاعت میں لگے رہے۔ آپ سختی کا جواب ہمیشہ نرمی سے دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے خدا نے آپ ﷺ کو حکم دیا تھا کہ تم لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف بلاتے ہوئے ہوش مندانہ اور حکیمانہ کلام کرو جو مدلل معقول اور لوگوں کے ضمیر کو متوجہ کرنے والا ہو اور جب لوگ تمہارا حکیمانہ کلام سن کر تمہاری طرف مائل اور متوجہ ہوں تو ان کو بہتر سے بہتر پند و نصائح کرو جس سے ان کے دِل متاثر ہوں اور جب ان کے دلوں پر اثر ہو اور وہ تم سے کوئی بات دریافت کرنا چاہیں تو ان کو بہترین پیرایہ میں سمجھاؤ تا کہ ان کو نفرت نہ ہو۔" اسی طرح تبلیغ کا اثر ہوا ابتداً ریگستان عرب کے ایک ایک ذرہ نے مخالفت کی تھی مگر چند ہی دنوں میں اسی سرزمین سے آپ (ﷺ) کے ہزاروں جاں نثار پیدا ہو گئے۔ جب مخالف جماعت نے دیکھا کہ آپ (ﷺ) کے حق و صداقت کی دو دھاری تلوار ہر قسم کی مخالفت کو خاموشی کے ساتھ کاٹتی چلی جا رہی ہے اور آپ (ﷺ) کا جتھا بڑھتا جا رہا ہے تو انہوں نے آپ (ﷺ) کو قتل کر دینے کی سازش کی مگر خدا نے آپ (ﷺ) کو بچا لیا اور آپ (ﷺ) مکہ چھوڑ کر عرب کے ایک دوسرے شہر میں چلے گئے جو اب مدینہ منورہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد آپ (ﷺ) نے اسلام کی تبلیغ کی رفتار کو اور بھی تیز کر دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ مخالفت بھی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ مکہ والوں نے آپ سے جنگ کرنے کی ٹھانی اور کئی بار چڑھائی کی مگر آپ (ﷺ) نے ہر بار انتہائی شجاعت اور کمال سپہ گری کا ثبوت دیا۔ آخر ایک دن وہ آیا کہ مکہ بغیر جنگ کے آپ (ﷺ) کے قبضہ میں آ گیا اور سارا عرب آپ کے زیر نگیں ہو گیا۔

☆

چھٹا باب

خندۂ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا ہے
تم بھی ہنستے ہو میرے حال پہ رونا ہے یہی

سورج غروب ہو رہا ہے۔ دریائے گومتی کے کنارے خوبصورت گھوڑوں پر حسین مس کوشلیا بائی اور اس کا سچا چاہنے والا خوش رو نوجوان من موہن ناتھ جی ہوا خوری کے لئے آئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر من موہن ناتھ گھوڑے سے اُترے۔ پہلے اپنا اور پھر کوشلیا بائی کا گھوڑا درخت سے باندھ دیا اور خود دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر دریا کے کنارے چہل قدمی کرنے لگے۔ اس چھیلے نوجوان نے اس وقت سیاہی مائل بھورا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور کوشلیا بائی صندلی گرم ساڑی میں تھیں اور ہاتھ میں اوورکوٹ لئے ہوئے تھیں۔ جنوری کے گلابی جاڑے دریا کے کنارے سرد ہوا چل رہی تھی۔

من موہن: کوشیا جی ٹھنڈ زیادہ ہے۔ لایئے میں آپ کو کوٹ پہنا دوں۔

کوشلیا: من موہن جی! چونکہ میں ابھی شملہ سے آئی ہوں۔ یہاں کی ٹھنڈ ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی۔

من موہن: پیاری کوشلیا آج کیا مبارک و اطمینان بخش دن تھا کہ جس نے تمہارے نیم مردہ من موہن میں جان ڈال دی۔ دراصل میری کامیابی محبت شعار مہربان بھابی جان کی شفقت و عنایات کا نتیجہ ہے۔

کوشلیا: (شرگیں لہجہ میں) واقعی آپ کو بہت ہی خوشی ہوئی؟ میرے خیال

میں تو کوئی ایسی بڑی کامیابی نہیں ہے۔

من موہن: کوشلیا جی بڑی کامیابی کیسے نہیں۔ مجھ کمبخت کو اس خوش نصیبی کی اُمید کہاں تھی جب کہ مجھ سے زیادہ قابل مجھ سے زیادہ ذی رتبہ ایک اور شخص بھی خواست گار تھا اور پھر ایک بڑی کمی آپ کے جاں نثار میں یہ تھی کہ وہ خاکِ بنگالہ سے نہ تھا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اُس نے آج تمام فکروں اور پریشانیوں کو ختم کر کے حقیقی خوشی اور دوامی راحت کا منور چہرہ دکھایا۔ اب دیکھئے انجینئر صاحب کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔

کوشلیا: موہن جی رتبہ کی تو نہ کہئے۔ خدا نہ کرے آپ کسی سے کم نہیں۔ ہاں خاکِ بنگالہ کی عظمت چونکہ دلوں میں زیادہ جاگزیں ہے۔ اس کا ذرا خیال تھا مگر میرے والدین بفضلِ خدا روشن خیال ہیں۔

من موہن: کیا آپ کو اُمید ہے کہ مس سوشیلا جی انجینئر صاحب کو منظور کرلیں گی۔ بظاہر تو ان میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

کوشلیا: ہاں تجویز یہ ہے کہ ان کو یہاں بلایا جاوے اور سسٹر خود ملاقات کر کے ان کے مزاج و عادات معلوم کرلیں تو نسبت کا خیال ظاہر کیا جاوے (من موہن کے منہ کی طرف دیکھ کر) من موہن جی اس وقت آپ کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہو رہا ہے؟

من موہن: (کوشلیا کو پر مسرت نگاہوں سے دیکھ کر) یہ زرد زرد آج بھی سرخ نہ ہوتا لیکن آپ کچھ آج بھی زیادہ بشاش نظر نہیں آتیں؟

کوشلیا: (جھجکتی ہوئی سینہ سے سر لگا کر) آپ اپنی کوشلیا کے متعلق ایسا سخت خیال رکھتے ہیں۔ میرے من موہن جی آج سے مجھ میں اتنی ہمت آگئی ہے کہ آپ کے قیامِ انگلستان کے زمانہ میں میں بھی یہاں ڈاکٹری پڑھ سکوں گی۔

من موہن: کاش کہ میرے ساتھ ڈاکٹری کے لئے آپ بھی انگلینڈ ہی روانہ کر دی جائیں۔ آؤ! ذرا یہاں گھاس پر بیٹھ جائیں۔

کوشلیا: اندھیرا ہو چلا ہے۔ اب گھر چلنا چاہئے۔

من موہن: اچھا مگر مجھے کھانا نہیں کھلانا۔

کوشلیا: (ہنس کر) آپ کو ہماری مچھلی بھات بہت پسند ہے اچھا بھائی جان کو

کہہ دوں گی۔ وہ آپ کو روک لیں گی مگر آپ پھاٹک کے قریب گھوڑا نہ روک لینا بلکہ اُن سے رخصت ہونے کے لئے اُسی طرح اندر چلے چلنا۔

یہ دونوں گھر روانہ ہوئے۔ راستہ میں مسز ہریش چندر سکندر باغ سے واپس آتی ہوئی مل گئیں۔ انہوں نے ان دونوں کو اتار کر فٹن میں بٹھالیا اور گھوڑے اپنے سائیسوں کے سپرد کردیے۔

اب "چندر محل" میں چلئے۔

مس سوشیلا بائی اپنے سٹنگ روم میں نہایت افسردہ خاطر بیٹھی ہیں اور ان کے سامنے ایک خط کھلا پڑا ہے۔

خط

نہایت قابلِ احترام میری قدردان مس صاحبہ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

گذشتہ پندرہ بیس روز کے عرصہ میں آپ کے متعدد شکایتی رقعے ملے جس کا مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ اسی غور و خوض میں رہا کہ کیا عرض کیا جائے۔ علاوہ ان رقعوں کے چند بار آپ مجھے زبانی بھی بے پرواہ، سنگ دل، بے مروت، جفا شعار وغیرہ کے خطاب عنایت فرما چکی ہیں معزز مس صاحبہ میں اس وقت کچھ عرض کروں تو اُس کو میری بے پرواہی اور سنگ دلی پر محمول نہ کیجیے۔ بلکہ اپنے اور اس خاکسار کے فرقِ مراتب اور تفاوتِ حالات پر محمول کر کے اِسے نہایت ضروری اور مناسب وقت تصور کیجیے۔ ازراہِ ذرہ نوازی آپ مجھ پر از حد مہربان ہیں اور آپ کا دل مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اِس کا شکریہ ادا کرنے سے میں ہر طرح قاصر ہوں۔ بس اِس ناچیز کی یہی التجا ہے کہ آپ اس کے خیال کو دل سے ہٹا دیں اور کسی اور مشغلہ میں اپنے آپ کو لگا کر بہلنے کی کوشش کریں۔ دیکھیے!

آپ کی چھوٹی بہن کوشلیا کیسی پر مسرت زندگی بسر کر رہی ہے۔ آپ بھی اپنے خاندان کے خیالات کے موافق اپنی زندگی کو پر امن بنا کر دنیا کی دلچسپیوں میں مصروف ہوں۔ کیوں کہ جس خیال نے آج کل آپ کو جان کاہ اُلجھن میں پھنسا رکھا ہے۔ وہ سراسر نامناسب و آپ کی آئندہ زندگی کے لئے بے حد نقصان دہ ہے اور جس کمبخت پر آپ اس قدر مہربان ہیں۔ اُس کے لئے بھی سخت ضرر رساں ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میری یہ ضروری و قابل عمل عرض داشت مؤثر ثابت ہوگی اور آپ اس کے بعد غم و اندوہ سے نکل کر خوشی اور مسرت کی دنیا میں قدم رکھیں گی۔"

والسلام

سوشیلا بائی نے اس خط کو پڑھا اور بچشم نم کئی بار پڑھا۔ پھر تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور ٹہلنے لگیں۔ دل میں سوچ رہی تھیں کہ:

"یا خدا! اب میں کیا کروں؟ اس کے دل میں کس طرح دل ڈال دوں آہ۔ اس کے پتھر جیسے دل پر میری محبت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم بڑی سنگ دل اور جابر ہے مگر آخر اپنے دل کا کیا علاج کروں۔ یہ بھی تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ جب بغیر دیکھے بے چین ہو جاتی ہوں تو دل سے اس کا خیال نکال کر کیسے جی سکتی ہوں آہ! سوشیلا۔ کاش تو نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ خوش نصیب کوشلیا اس گھر کی رونق کے لئے کافی تھی۔ ہائے کیسی خوش قسمت ہے جس کو چاہا اُسی کو پایا۔ میرے لئے انجینئر صاحب بلائے جا رہے ہیں۔ یا اللہ! میں انہیں کیوں کر چاہوں گی۔ میرے دل پر تو یہ ترک قبضہ کئے ہوئے ہے میرے دل کا مالک تو یہ سنگ دل ہو چکا ہے۔ اچھا اب میں شبیر کو لکھنا چھوڑ دوں گی اور زبانی قسمت آزمائی کروں گی۔ شاید اس کا کچھ اثر ہو میرے دل نے مجھے اس قدر مجبور کر دیا ہے کہ اب شرم و حیا اور غرور نسوانی سے کام لینا میرے لئے زہر ہوگا۔ میں مری جاتی ہوں۔ میں اپنی کل کیفیاتِ دل واضح طور پر حرف بحرف اس کے سامنے بیان کر دوں گی۔"

آیا: (باہر سے آکر) حضور سرکار جی اور سرکار رانی جی آج کہیں دعوت پر تشریف لے گئے ہیں اور چندر رانی جی نے اِس وقت کے کھانے کا بندوبست فرش پر کیا ہے۔ جہاں شبیر صاحب ستار سنائیں گے وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔

سوشیلا: (رومال سے آنکھیں خشک کر کے بال سنبھال کر) کیا بیرسٹر صاحب آگئے ستار شروع ہو گیا؟

آیا: جی ہاں! وہ تو کب کے آچکے ہیں۔ ستار لئے بیٹھے ہیں۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔

سوشیلا: اچھا چلو کہہ دو۔ آتی ہیں۔

اس وقت اِس رنجیدہ دل غمگین صورت لڑکی پر اِس خبر نے ایسا کیا کہ شگفتگی آگئی۔ وہ صبح سے اس وقت تک موٹے گرم ڈریسنگ گون میں تھیں۔ لباس تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں گئیں۔ لیمپ روشن کیا۔ الماری کھول فیروزی گرم ساڑی اور اسی رنگ کی بلاؤس نکال کر پہنی اور سفید پھول دار شال ساتھ لی۔ پھر سیف کھول کر چھوٹے موتی کی دولڑی نکال کر گلے میں ڈالی اور ہلال نما الماس مرصع بروچ بائیں جانب سر پر لگایا۔ ہاتھوں میں دو تین انگشتریاں پہنیں اور بوٹ پہن کر بھاوج کے سٹنگ روم میں آئیں۔ جہاں قالین کے فرش پر یہ سب ان کے لئے منتظر تھے۔

اس وقت یہ کمرہ پرستان بن رہا تھا۔ وسط میں گاؤ تکیہ سے لگی چندر رانی متمکن تھیں۔ یوں تو بلحاظ حسنِ صورت مسز ہریش چندر سینکڑوں نہیں ہزاروں میں ایک تھیں مگر اُن کو افزائشِ حسن یعنی انتخاب لباس و زیورات کا خاص ملکہ حاصل تھا جس میں اُن کی عام شہرت تھی اور دیگر حسینائیں لکھنؤ اُن کی تقلید کرتی تھیں۔ اس وقت آتشی سرخ ریشمی ساڑی اور سفید ریشمی بلاؤس زیب تن تھی جس پر چھوٹے چھوٹے کارچوبی پھول تیز برقی روشنی میں چمک چمک کر اُن کے حسنِ جہاں سوز کو دوبالا کر رہے تھے۔ سر پر جوڑے کے گرد سفید بڑے موتی کا ہار لپٹا ہوا تھا۔ مانگ پر پیشانی کے قریب سفید جڑاؤ بیر بندی جس کی لڑیاں زلف پیچاں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ کانوں میں نیلم و الماس کے آویزے تھے۔ گلے میں موتی کی ستلڑی اور سنہری زنجیر تھی۔ نرم و نازک بلوریں کلائی میں سفید جڑاؤ چوڑیاں۔

غرضیکہ چندر رانی کا حسن دلآویز غضب ڈھا رہا تھا۔ وہ کچھ ایسی دلفریب ادا سے بیٹھی تھیں کہ جس پر نہ صرف ہریش چندر بلکہ کل دیکھنے والوں کی نگاہیں لوٹ ہو رہی تھیں۔ ان کے دائیں بائیں دونوں نندیں تھیں اور سامنے تینوں نوجوان دوست تھے ہریش چندر جی، سیّد شبیر اور من موہن ناتھ جی راجہ ہریش چندر جی نے اپنی رانی کے لباس کی مناسبت کے لئے خود بھی ہندوستانی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ سر پر سفید ریشمی صافہ بندھا ہوا تھا جس کی سنہری جھالر جھلملا رہی تھی لیکن مسٹر شبیر گو زمین میں بیٹھے تھے مگر پورے انگلش ڈریس میں تھے۔ سیاہ گرم سوٹ میں اُن کا سرخ و سفید رنگ اور بھی نکھر رہا تھا۔ اونچے سخت کالر اور ریشمی سخت ٹائی میں ہیرے کی پن چمک رہی تھی۔ ترکی ٹوپی اتری ہوئی فرش پر پڑی تھی۔ ان کی اس دلکش شانِ سجاوٹ پر ہریش چندر فدا ہو ہی رہے تھے۔ نہ پوچھو غریب بے بس سوشیلا کی حالت کہ اُس کے دل پر کیا گذر رہی تھی کیوں کہ اُس کے لئے اِن کو نظر بھر کر دیکھنا بھی نامناسب تھا۔ اِسی طرح وہ بھی لیڈیز کی طرف سے نگاہیں نیچی کئے اپنے دوستوں کی طرف متوجہ تھے۔ ابھی کھانے میں کچھ دیر تھی۔ اِس لئے چندر رانی جی سے فرمائش ہوئی۔

سیّد شبیر: (مسز ہریش چندر سے) کھانے میں تو ابھی دیر ہے۔ جب تک آپ ہی کچھ تکلیف کیجئے۔

اور پیچھے سے ستار اُٹھا کر پیش کیا۔

چندر رانی: (مسکراتے ہوئے ستار لے کر) کیا کہوں اس وقت تو کچھ سوجھتا نہیں خیر فرمایئے اُردو ہو یا ہندی؟

ہریش چندر: نہیں جی! اُردو ہو۔ اب تو سوشیلا جی بھی بخوبی سمجھ لیتی ہیں۔

چندر رانی: (ہریش چندر کو دیکھ کر)

تیری چتون کے شہیدوں میں یہ ناشاد بھی ہے
او مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے
آشیاں باندھ چکے ہم تو کھلا یہ عقدہ
باغباں جو ہے چمن میں وہی صیاد بھی ہے

غم عالم کو غم عشق بھلا دیتا ہے!
جو گرفتار محبت ہے وہی آزاد بھی ہے
ہم تو مرتے ہیں اسی انداز ستم پر ظالم
کہ وہی پیار کی چتون وہی بیداد بھی ہے

سید شبیر: (ہریش چندر سے) بالکل بجا آپ کے اس پیار اور بیداد کو میں بھی جانتا ہوں۔

ہریش چندر: (مسکرا کر) بیداد کی تو آپ ہی دونوں کا شیوہ ہے۔ مجھے خواہ مخواہ الزام دیتے ہو۔

سندری خادمہ: رانی جی! کھانا تیار ہے۔ یہیں لایا جائے؟

چندر رانی: ہاں ہاں؟ یہیں لاؤ!

ستار ایک طرف رکھ دیا اور اسی جگہ پیتل کی سینیوں میں ہندوانی طرز کا پروسا ہوا کھانا رکھا گیا۔ ہر ایک کے آگے علیحدہ علیحدہ طباق تھے لیکن ہریش چندر و سید شبیر نے ایک ہی طباق میں کھایا، کھانا ایک گھنٹہ میں ختم ہو گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد ستار شبیر صاحب کے سامنے پیش ہوا وہ اُس کو الٹ پلٹ کر کہنے لگا کیا کہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہریش چندر: اُردو کے کسی اچھے ادیب کا کلام اور کیا؟

شبیر صاحب: (آہستہ سے) بھائی کسی ادیب کا؟ صرف آپ اور چندر رانی جی ہی ہوتیں تو مجھے کوئی تکلف نہ تھا لیکن اس وقت چونکہ دونوں ہمشیرگان بھی موجود ہیں۔ مجھ سے کام لینا مناسب ہے تو کیا مولانا حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں نکالوں؟

ہریش چندر: اونہہ اتنا بھی کیا۔ دونوں لڑکیاں ماشاء اللہ جوان اور سمجھدار ہیں۔ غالب یا حسرت کے کلام سے کچھ انتخاب کر لو۔

شبیر صاحب:

ہر حال میں ناشادی دل یاد رہے گی
پابندیٔ حرماں بھی خدا داد رہے گی

غرضیکہ چندر رانی کا حسن دلآویز غضب ڈھارہا تھا۔ وہ کچھ ایسی دلفریب ادا سے بیٹھی تھیں کہ جس پر نہ صرف ہریش چندر بلکہ کل دیکھنے والوں کی نگاہیں لوٹ ہورہی تھیں۔ ان کے دائیں بائیں دونوں نندیں تھیں اور سامنے تینوں نوجوان دوست تھے ہریش چندر جی، سیّد شبیر اور من موہن ناتھ جی راجہ ہریش چندر جی نے اپنی رانی کے لباس کی مناسبت کے لئے خود بھی ہندوستانی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ سر پر سفید ریشمی صافہ بندھا ہوا تھا جس کی سنہری جھالر جھلملا رہی تھی لیکن مسٹر شبیر گو زمین میں بیٹھے تھے مگر پورے انگلش ڈریس میں تھے۔ سیاہ گرم سوٹ میں اُن کا سرخ و سفید رنگ اور بھی نکھر رہا تھا۔ اونچے سخت کالر اور ریشمی سخت ٹائی میں ہیرے کی پن چمک رہی تھی۔ ترکی ٹوپی اتری ہوئی فرش پر پڑی تھی۔ اِن کی اس دلکش شان سجاوٹ پر ہریش چندر فدا ہو ہی رہے تھے۔ نہ پوچھو غریب بے بس سوشیلا کی حالت کہ اُس کے دل پر کیا گذر رہی تھی کیوں کہ اُس کے لئے اِن کو نظر بھر کر دیکھنا بھی نامناسب تھا۔ اِسی طرح وہ بھی لیڈیز کی طرف سے نگاہیں نیچی کئے اپنے دوستوں کی طرف متوجہ تھے۔ ابھی کھانے میں کچھ دیر تھی۔ اِس لئے چندر رانی جی سے فرمائش ہوئی۔

سیّد شبیر: (مسز ہریش چندر سے) کھانے میں تو ابھی دیر ہے۔ جب تک آپ ہی کچھ تکلیف کیجئے۔

اور پیچھے سے ستار اُٹھا کر پیش کیا۔

چندر رانی: (مسکراتے ہوئے ستار لے کر) کیا کہوں اس وقت تو کچھ سوجھتا نہیں خیر فرمایئے اُردو ہو یا ہندی؟

ہریش چندر: نہیں جی! اُردو ہو۔ اب تو سوشیلا جی بھی بخوبی سمجھ لیتی ہیں۔

چندر رانی: (ہریش چندر کو دیکھ کر)۔

تیری چتون کے شہیدوں میں یہ ناشاد بھی ہے
او مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے
آشیاں باندھ چکے ہم تو کھلا یہ عقدہ
باغباں جو ہے چمن میں وہی صیاد بھی ہے

غمِ عالم کو غمِ عشق بھلا دیتا ہے!
جو گرفتار محبت رہے وہی آزاد بھی ہے
ہم تو مرتے ہیں اس اندازِ ستم پر ظالم
کہ وہی پیار کی چتون وہی بیداد بھی ہے

سیّد شبیر: (ہریش چندر سے) بالکل بجا آپ کے اس پیار اور بیداد کو میں بھی جانتا ہوں۔

ہریش چندر: (مسکرا کر) بیداد بھی تو آپ ہی دونوں کا شیوہ ہے۔ مجھے خواہ مخواہ الزام دیتے ہو۔

سندری خادمہ: رانی جی! کھانا تیار ہے۔ یہیں لایا جائے؟

چندر رانی: ہاں ہاں؟ یہیں لاؤ!

ستار ایک طرف رکھ دیا اور اسی جگہ چتل کی سینیوں میں ہندوانی طرز کے ہتے سے پروسا ہوا کھانا رکھا گیا۔ ہر ایک کے آگے علیحدہ علیحدہ طباق تھے لیکن ہریش چندر و سیّد شبیر نے ایک ہی طباق میں کھایا، کھانا ایک گھنٹہ میں ختم ہو گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد ستار شبیر صاحب کے سامنے پیش ہوا وہ اُس کو الٹ پلٹ کر کہنے لگا کیا کہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہریش چندر: اُردو کے کسی اچھے ادیب کا کلام اور کیا؟

شبیر صاحب: (آہستہ سے) بھائی کس ادیب کا؟ صرف آپ اور چندر رانی جی ہی ہوتیں تو مجھے کوئی تکلف نہ تھا لیکن اس وقت چونکہ دونوں ہمشیرگان بھی موجود ہیں۔ مجھ سے کام لینا مناسب ہے تو کیا مولانا حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں نکالوں؟

ہریش چندر: اونہہ اتنا بھی کیا۔ دونوں لڑکیاں ماشاء اللہ جوان اور سمجھدار ہیں۔ غالب یا حسرت کے کلام سے کچھ انتخاب کر لو۔

شبیر صاحب:

ہر حال میں ناشادیٔ دل یاد رہے گی
پابندیٔ حرمان بھی خدا داد رہے گی

بیکار ڈراتے ہیں مجھے قید ستم سے
واں روح وفا اور بھی آزاد رہے گی
گھبرا کے کہا روح نے زندانِ جسد میں
کب تک ابھی اس قید کی میعاد رہے گی

اِن کو ستار بجانے میں کمال حاصل تھا۔ اس پر رات کی خاموشی اور اِن کے چاہنے والے قدر دانوں کی موجودگی نے کچھ عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ ہریش چندر تو نثار ہو رہے تھے۔ من موہن ناتھ اور چندر رانی بھی ایسی سحرکار موسیقی سے مدہوش تھیں اور بیچاری سوشیلا کی تو دل اور آنکھیں بھر آئی تھیں۔

چندر رانی: واہ واہ سیّد شبیر صاحب اس وقت تو قابلِ انعام کام کیا۔ کہئے کہئے کیا لیں گے؟

ہریش چندر: ہمارے دل جیسی قیمتی شے کو تسخیر کر چکے اور کیا لیں گے۔

چندر رانی: نہیں ابھی ہم کچھ اور بھی دیں گے۔

شبیر صاحب: (تسلیم کر کے) آپ سب کی پہلے ہی مہربانیاں اس قدر ہیں کہ اب میں زیادہ بارِ احسان اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔

چندر رانی: نہیں جناب ابھی ایک بڑا احسان تو اور اٹھانا ہوگا۔ میں آج ہی ایزبلا تھابرن کالج گئی تھی۔ بس تڑپ کر چلی آئی ہوں۔

ہریش چندر: بھائی ہم سے سنو۔ کالج گارڈن میں ایک بہت عمدہ خوش رنگ پھول ہے۔ جس پر یہ فدا ہیں اور چاہتی ہیں کہ وہاں سے توڑ کر آپ کے سینہ پر لگا دیں۔

شبیر صاحب: نہیں جناب مجھ سیدھے سادے جفاکش انسان کے مزاج و دماغ میں اس قدر رنگینی کہاں کہ خوش رنگ گلوں کی مہک برداشت کر کے ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ بس معاف کیجئے۔

ہریش چندر: اچھا اچھا کچھ اور کہئے:

شبیر صاحب:۔

گر وفاداری عشاق کا غوغا ہے یہی
جان سے ہم بھی گذر جائیں گے سوچا ہے یہی

ہریش چندر: خدا نہ کرے۔

شبیر صاحب:۔

ہم بھی ہوں درپئے انکار تو کچھ دُور نہیں
کہ ترے جور نمایاں کا تقاضا ہے یہی
خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا ہے
تم بھی ہنستے ہو میرے حال پہ رونا ہے یہی
اس قدر جلد جو پیمانِ وفا توڑ دیا ہے
آپ ہی کہئے بھلا آپ کو زیبا ہے یہی

(ستار رکھ کر) اچھا اب سونا چاہئے۔ رات زیادہ آ گئی ہے۔ چندر رانی مجھے کوس رہی ہے۔

چندر رانی: کوسنا تو کیا بھائی۔ میں تو دعائیں دے رہی ہوں آپ تھک گئے ہیں تو بہت اچھا اُٹھئے۔

محفل برخاست ہوئی۔ من موہن ناتھ اِن سے رخصت ہو کر گولہ گنج روانہ ہوئے۔ شبیر صاحب اور دونوں لڑکیاں اپنے اپنے کمرے میں گئیں اور راجہ رانی اپنی آرام گاہ میں چل دیئے۔

ساتواں باب

انہیں افسانہ دل روتے روتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

امین آباد پارک کے قریب سر چٹرجی کی فیملی ڈاکٹر مسز ڈیوڈ نے ان کی امداد سے اپنا پرائیویٹ میڈیکل ہال کھولا ہے۔ یہ یوریشین لیڈی سر مکرجی کی پرانی ڈاکٹر ہیں جن پر سوشیلا بائی جی بھی خاص طور پر مہربان ہیں اور ان کی بہت دوستی ہوگئی ہے۔

ایک روز سہ پہر کا ذکر ہے۔ مس سوشیلا جی آج کسی خاص ضرورت کو مسز ڈیوڈ کے گھر آئیں اور شبیر صاحب کو بلانے کی خاطر یہ رقعہ لکھوایا۔

رقعہ

ڈیوڈ میڈیکل ہال،
امین آباد پارک

جناب بیرسٹر صاحب!

آج اپنے ایک ضروری کام کے لئے آپ کو تکلیف دیتی ہوں۔ مہربانی فرما کر چند منٹ کے لئے تشریف لا کر مشکور کیجئے۔

والسلام

خاکسار رونیشیا ڈیوڈ

یہ رقعہ پہنچتے ہی شبیر صاحب آ گئے اور ڈاکٹر صاحبہ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

مسز ڈیوڈ: میں اِس مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہوں اگر آپ نے چائے نہ پی ہو تو یہیں منگالی جائے۔ مس سوشیلا بائی جی بھی اس وقت یہاں موجود ہیں۔

شبیر صاحب: چائے میں پی کر آیا ہوں۔ وہ کام کہئے جس کے لئے بلایا ہے؟ مجھے ایک اور جگہ بھی جانا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر: (اُن کے قریب ہو کر آہستہ سے) دراصل میرا کوئی ذاتی کام نہیں ہے۔ سوشیلا جی آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں اور دراصل انہیں نے آپ کو میری معرفت ملوایا ہے۔

شبیر صاحب: (اِدھر اُدھر دروازوں کی طرف دیکھ کر) مگر مسز ڈیوڈ یہ طریق ملاقات تو کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا اگر خدانخواستہ کہیں "چندر محل" میں اس بات کی اطلاع ہوگئی تو آپ کے میرے اور خود مس صاحبہ کے لئے کس قدر ذلت کا باعث ہوگی۔ انسان کو ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔

لیڈی ڈاکٹر: یہ سب درست مگر آپ کو اس نرم و نازک دل لڑکی کا بھی کچھ خیال چاہئے جو آپ کے نام پر اپنی جان فدا کر رہی ہے۔ آپ کی بے التفاتی اور بے پرواہی کے رنج میں گھلی جا رہی ہے۔ اس کا کھانا پینا سب چھوٹ گیا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی صحت کا خیال کر کے ذرا نرمی اختیار کیجئے۔

شبیر صاحب: میں سخت مشکل میں پھنسا ہوں۔ اِس معاملہ نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ آپ دیکھتی ہیں "چندر محل" والے مجھ پر کس قدر مہربان ہیں۔ اِس کا عوض مجھے بھی دینا چاہئے۔

سوشیلا بائی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار لڑکی ہیں۔ اُن کو میں تمام نشیب و فراز بارہا سمجھا چکا ہوں۔ تعجب ہے۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا حالانکہ مجھ سے زیادہ اس امر میں اِن کو جھجک اور لحاظ لازمی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر: آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں عشق

انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ اچھا اب تو آپ آہی گئے ہیں اُن سے مل کر زبانی سمجھا دیجئے۔

شبیر صاحب: مجھے سخت مجبور کیا جارہا ہے۔ جس بات پر میرا کانشنس ملامت کر رہا ہے۔ میں اِسے کس طرح اختیار کروں اور پھر ہریش چندر کو کیسے منہ دکھاؤں۔

لیڈی ڈاکٹر: میں بھی تو یہی کہتی ہوں کہ یہ سب اُن کو سمجھا دیجئے۔ اچھا میں اُن کو بلاتی ہوں۔

یہ کہتی ہوئی اُٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ بیچارے شبیر گھبراہٹ میں اُٹھ کر ٹہلنے لگے کہ کمرے سے آواز آئی۔

"بیرسٹر صاحب! بیرسٹر صاحب ذرا اندر آیئے۔ دیکھئے ان کو کیا ہو گیا۔"

یہ آواز سن کر وہ اور حیران و پریشان ہو گئے۔ مجبوراً اس کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ بے حال سوشیلا فرش پر پڑی ہے۔ چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ بند آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ دل دھڑک رہا ہے۔ سانس تیز ہو گئی ہے۔ مسز ڈیوڈ کا ایک ہاتھ اُن کے قلب پر ہے دوسرا نبض پر۔ وہ یہ نقشہ دیکھ کر سٹ پٹا گئے اور وہیں بیٹھ کر بولے۔

شبیر صاحب: آخر ان کو ہوا کیا۔ کیا طبیعت کچھ خراب تھی؟

لیڈی ڈاکٹر: کچھ نہیں جب آئی تھیں۔ بالکل تندرست تھیں۔ بات یہ ہے کہ غمگین رہتے رہتے بالکل کمزور ہو گئی ہیں۔ غذا بالکل گھٹ گئی ہے۔ اِس وقت نہ معلوم کس وجہ سے غش کی حالت ہو گئی۔ نبض نہایت کمزور ہے۔ آپ ذرا ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کیجئے۔ میں طاقت کی دوا لے آؤں۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر تو اِدھر گئیں۔ انہوں نے اُٹھ کر کرسی سے شال اٹھا کر سوشیلا پر ڈال دی تو انہوں نے آنکھیں کھول کر اُن کی طرف دیکھا اور پھر ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔ دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اُس کی آواز شبیر تک پہنچ رہی تھی جس سے وہ بہت گھبرائے اور قریب ہو کر کہنے لگے۔

شبیر صاحب: کیوں سوشیلا جی اس قدر روتی کیوں ہو؟ ذرا دل کو سنبھالو اور دیکھو بالکل سرد ہو رہی ہو۔ یہ تو ہسٹریا کی سی حالت ہے۔ آپ کو اس وقت اس قدر سخت تکلیف پہنچنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب دوا لے آئیں اور سوشیلا کو پلائی۔

شبیر صاحب: زمین سخت اور ٹھنڈی ہے۔ ان کو یہاں سے اٹھانا چاہئے۔

لیڈی ڈاکٹر: (کھڑی ہو کر) ہاں ضرور آپ اِن کو اِس صوفے پر لٹا دیجئے ابھی ابھی شفا خانہ میں ایک زچہ آگئی ہے جس کا وقت بہت قریب ہے۔ میں ذرا اُس کو دیکھ لوں۔ جب تک ان کی حالت اِس قابل نہ ہو کہ یہ گاڑی میں بیٹھ کر جا سکیں۔ آپ یہیں رہیں۔ جب طبیعت سنبھل جائے تو "چندر محل" لے جائیں۔ میرا انتظار نہ کریں۔ خدا جانے میں کب تک فارغ ہوں۔

اب تو ایک بیمار اور بیمار بھی کون ہریش چندر جیسے محسن دوست کی بہن اور اِس حالت تنہائی میں جتلائے تکلیف۔ اب خبر گیری و تیمارداری اِن کا فرض تھا۔ اُس کی طرف جھک کر کہا۔

شبیر صاحب: سوشیلا جی ذرا تکلیف کر کے اِس قریب والے صوفے پر لیٹ جائیے۔ آپ آخر یہاں کب تک رہیں گی۔ ذرا طبیعت سنبھل جائے۔ تو گھر چلئے۔

یہ آواز سن کر سوشیلا آنکھیں کھول کر اُٹھ بیٹھیں شبیر صاحب اپنے سہارے سے اُٹھا کر صوفے پر لے آئے اور شال لپیٹ دی خود دوسری کرسی قریب کھینچ کر بیٹھ گئے اور اِن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کرنے لگے جس کو سوشیلا سخت سنگ دل سمجھے ہوئے تھی اُس کی طرف سے اتنی ہی مہربانی و التفات کا اظہار دیکھ کر وہ بے قرار ہو گئی اور اِن کے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ کر بے اختیار پھر رونے لگی۔

شبیر صاحب: نہیں نہیں سوشیلا یہ کیا ہے۔ ذرا تو ہمت سے کام لے اپنے تئیں سنبھالو۔ کچھ منہ سے تو کہو۔ آخر کیا تکلیف ہے جس سے آپ کی حالت بگڑتی ہی چلی جا رہی ہے۔

سوشیلا: (ذرا سنبھل کر) کیا کہوں آپ نے مجھے مار ڈالا۔ پھر پوچھتے ہیں کیا تکلیف ہے۔

شبیر صاحب: نہیں خدانخواستہ میری طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟ بیان کیجئے تا کہ تلافی کر سکوں۔

سوشیلا: آہ! کوئی ایک بات ہو تو کہوں۔

شبیر صاحب: خیر یوں تو انسان پر تقصیر ہے۔ میری بہت سی باتیں آپ پر گراں گذرتی ہونگی لیکن میں تو اس وقت کی بابت پوچھتا ہوں کہ یکایک آپ کو یہ تکلیف کیوں پہنچی؟

سوشیلا: کچھ نہیں۔ اُس وقت کی آپ کی سخت اور پر حقارت تقریر جو آپ نے لیڈی ڈاکٹر سے کی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکی اور میں اپنے دل کو بوجھ ہلکا کرنے کو یہاں پڑ رہی تھی کہ ذرا ہمت آجائے تو گھر چلوں۔ اتنے میں مسز ڈیوڈ آگئیں اور انہوں نے شور مچا دیا۔

شبیر صاحب: اوہو! ان تمام شدید تکلیفوں کا میں ہی باعث تھا۔ للہ معذور و مجبور سمجھ کر مجھے معاف کر دو مگر جہاں تک خیال کرتا ہوں میں نے کوئی بے ادبی کا کلمہ تو نہیں کہا۔

سوشیلا: میرے معزز شبیر ___ مجھے سارا رنج یہ تھا اور دل کو بے حد صدمہ اسی کا پہنچا کہ آپ نے لیڈی ڈاکٹر کے سامنے میری سخت توہین و تحقیر کی۔ یوں تو میری قسمت اور میرا دل ہی مجھے ذلیل کر رہے ہیں۔ آپ جو کچھ کہتے یا نصیحت کرتے خود کر لیتے کیوں کہ میں آپ کی شاگرد ہوں۔ ایک تیسرے شخص کے سامنے یوں ذلیل نہ کرتے۔ آہ! میرے دل میں جس کی سب سے زیادہ عزت و قدر رہو۔ اُس کے دل میں مَیں ایسی ذلیل۔

شبیر صاحب: (نادم ہو کر) سچ عرض کرتا ہوں کہ اس تقریر سے میرا یہ مدعا نہ تھا جو آپ نے خیال کیا۔ اب تو آپ ایسا سمجھ کر اتنی تکلیف اٹھا چکی ہیں اگر میں کسی طرح معافی مانگنے کی کوشش کروں تو کیا یہ ممکن ہے کہ معاف کر دیا جاؤں اور آپ کا خیال بدل سکے۔

سوشیلا: ہاں ایک طرح۔

شبیر صاحب: وہ کس طرح؟ جلد کہیے۔

سوشیلا: یوں کہ اِس بیدردی سے اپنی قربان ہونے والی کا دل نہ توڑو۔ خواہ زمانہ پلٹ جائے۔ زمین و آسمان دشمن ہو جائیں۔ کسی کی کچھ پرواہ نہ کر کے میری سچی محبت کا جواب محبت سے دو۔ ورنہ آپ کو قسم ہے اپنے پروردگار کی اپنے ہاتھ سے میرا گلا گھونٹ دو۔ یہ کہتے ہوئے پھر رو کر شبیر صاحب کی گود میں سر رکھ دیا۔

ہم نے اِن کے سامنے اوّل تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا ، دل رکھ دیا ، سر رکھ دیا

اس وقت پختہ دماغ، دور اندیش اور مضبوط دل بیرسٹر صاحب بھی بے اختیار ہو گئے۔ اپنی کرسی سے اُٹھ کر اِن کے پاس صوفے پر جا بیٹھے اور سوشیلا کا جھکا ہوا سر اُٹھا کر اپنے سینہ سے لگالیا۔ اور تقریباً ۲۰ منٹ تک دونوں ساکت رہے۔ خود تو دونوں مثل تصویر کے خاموش تھے مگر اُن کے دل سیماب وار تڑپ رہے تھے۔ تاثراتِ عشق میں عجب طاقت ہے۔ بشرطیکہ عشق صادق ہو۔ ایسے بے پرواہ و بے لاگ سمجھ دار شخص کا دل ایک دم متاثر ہو گیا کہ یاد ہی نہ رہا کہ جو شخص ابھی ابھی باہر والے کمرے میں کیا کیا نصیحتیں کر رہا تھا۔ اس وقت اس محبت کی دیوی پر بے سمجھے سوچے جاں نثار کرنے کو تیار ہے۔ سوشیلا بھی پھر تیسری بار اتنا روئیں کہ اِن کی قمیص آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ آخر بیرسٹر صاحب نے ہی ہمت کر کے سوشیلا کا سر اٹھایا اور اپنے رومال سے ان کے آنسو خشک کرتے ہوئے سمجھانے لگے۔

شبیر صاحب: میری دل و جان کی مالک سوشیلا خدا کو حاضر و ناظر جان کر میں اس وقت تم سے اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے آپ کو کوئی رنج نہیں پہنچے گا۔ مجھے اپنا ادنیٰ تابعدار اور جاں نثار تصور کرو۔ افسوس کہ میری طرف سے تمہیں بے حد رنج پہنچا۔ میری نازک دل محبوبہ میری گذشتہ کوتاہیوں کو معاف کردو۔

سوشیلا: (شبیر کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر) میں اِن روح پرور اور جان بخش الفاظ کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتی۔ بس اگر مجھے زندہ رکھنا ہے تو مجھ پر نظرِ محبت رکھو۔

شبیر صاحب: (سوشیلا کے نرم و نازک ہاتھ کو چوم کر) انشاء اللہ یہ خاکسار ہمیشہ سچا خادم و وفادار ثابت ہوگا۔ آپ مطمئن رہیں اچھا تو اب آپ میں اتنی ہمت ہے کہ فٹن تک چل سکیں؟

سوشیلا: (کھڑی ہو کر) ہاں! چلئے اب مجھ میں ضرور اتنی طاقت ہے۔

شبیر صاحب: (مسکراتے ہوئے) ''او ہو۔ خدا خوش رکھے۔''

کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے دونوں باہر آئے۔ احاطہ کے اندر ہی فٹن موجود تھی۔

کو چین کو بلایا اور روانہ ہو گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ بہت تیز فٹن لائی گئی۔ شبیر صاحب نے باغیچہ کی طرف سوشیلا بائی کو اتارا۔ اور وہ اپنے ڈریسنگ روم کے پہلو والے دروازے سے اپنے کمرے میں داخل ہو گئیں مگر آج شام کی سخت تکلیف اٹھانے کے بعد وہ اس قدر کمزور ہو گئیں تھیں کہ کھانے پر نہ جا سکیں۔ دردِ سر کا عذر کر دیا مگر نہ صرف دردِ سر، انہیں اس وقت بخار بھی ہو گیا تھا۔

آٹھواں باب

سر بھی حاضر ہے جو ارشاد ہو مرجانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

سوشیلا کے کھانے پر نہ آنے اور دردِ سر کی خبر سن کر بیرسٹر صاحب دل میں بہت متفکر ہو گئے کیوں کہ ان کو بہت کمزور حالت میں چھوڑا تھا جب ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے میں آئے۔ تو دس بج چکے تھے۔ اپنے بیمار کی فکر نے لیٹنے نہ دیا اور آیا سے سوشیلا کی کیفیت دریافت کرنے کے خیال سے پھر باہر آئے اور اِن کے کمرے کے برآمدے میں جا کر گھنٹی بجائی۔ اندر سے آیا نکلی۔

سیّد شبیر: کہو مس صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟ آج وہ کھانے پر تشریف نہیں لے گئیں۔

آیا: حضور ان کو بخار ہو گیا ہے۔ میں سر دبا رہی تھی۔

سیّد شبیر: کیا وہ جاگتی ہیں یا آنکھ لگ گئی؟

آیا: نہیں حضور ابھی جاگتی ہیں۔ سر میں درد بہت ہے۔

شبیر صاحب: کیا بیڈروم میں ہیں؟

آیا: نہیں ابھی اِسی کمرے میں کوچ پر ہیں۔ ذرا درد کم ہو تو کپڑے تبدیل کرا کے بیڈروم میں لے جاؤں۔

شبیر صاحب: اچھا اِن سے اجازت لو کہ میں ان کے دیکھنے کو

اندر آسکتا ہوں؟

آیا اندر واپس گئی اور فوراً ہی آکر انہیں اندر چلنے کو کہا۔ وہ اندر آئے تو سوشیلا کو شال میں لپٹے ہوئے کوچ پر پڑے پایا۔ آیا نے کوچ کے قریب ایک کرسی رکھ دی اور انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

شبیر صاحب: (نبض پر ہاتھ رکھ کر) اوہو بخار ہو گیا اور اس کی کسی کو خبر ہی نہ دی۔ فوراً مسز ڈیوڈ کو بلا لیا ہوتا۔

سوشیلا: ڈاکٹر کی ابھی ضرورت نہیں۔ معمولی حرارت ہو گئی ہے رات بھر میں جاتی رہے گی۔

شبیر صاحب: آیا یہاں کوئی تھرمامیٹر ہے۔ لاؤ تو ذرا دیکھیں۔

سوشیلا: آیا ابھی دیکھ چکی ہے۔ کوئی پندرہ منٹ ہوئے۔ ایک سو ایک تھا میں نے فیور مکسچر کا ایک ڈوز لے لیا ہے۔

شبیر صاحب: آپ کا دل بہت کمزور اور ذی حس واقعہ ہوا ہے معمولی سی بات کا اتنا رنج اٹھایا کہ خاصی بیمار ہو گئیں۔

سوشیلا: (اُن کو کچھ جواب نہ دے کر آیا سے مخاطب ہوئیں) آیا جاؤ کھانا کھا آؤ۔ ابھی بیرسٹر صاحب یہاں بیٹھے ہیں۔ (سیّد شبیر سے) پیارے شبیر۔ آپ کے خیال میں جو بات معمولی تھی اس میں میری زندگی اور موت کا سوال پوشیدہ تھا۔

سیّد شبیر: میری ملکہ بس اب اس بات کو ہمیشہ کے لئے بھلا کر مجھے مشکور احسان کرو۔

سوشیلا: (بیٹھ کر) میں نے بالکل بھلا دیا جب ہی تو اب خوش ہوں۔

شبیر صاحب: آپ کو لیٹے رہنا چاہئے اور زیادہ گفتگو بھی مضر ہو گی۔

سوشیلا: نہیں آپ سے باتوں میں لگ کر میری تکلیف بہت کم ہو گئی ہے۔ دردِ سر تو گویا جاتا ہی رہا۔ آیا دو گھنٹہ سے دبا رہی تھی اور کچھ کمی نہ ہوئی تھی۔

شبیر صاحب: عزیز سوشیلا آخر آپ کیوں مجھے اس قدر چاہتی ہیں میں اپنے میں کوئی ایسی خاص خوبی نہیں پاتا۔ اسی لئے اکثر گھنٹوں اِس پر غور کیا کرتا ہوں۔

سوشیلا: میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ اس کا کیا سبب ہے۔ آپ میں کوئی مقناطیسی کشش ہے کہ جس سے میرا دل بے اختیار کھنچا جاتا ہے۔ ورنہ جو کچھ آپ وقتاً فوقتاً سمجھاتے رہتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ میں خود جانتی ہوں۔ آپ کی دیوانہ وار محبت نے میرے ہوش و حواس کھو رکھے ہیں مگر اس حالت میں بھی ہر آنے والی بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں لیکن آپ کا خیال دل سے نکالنا ناممکن بلکہ محال ہے۔

شبیر صاحب: (سر جھکا کر) میں اس معصوم دل کی سچی محبت کے عوض میں اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ بس اور کیا کہوں۔

سوشیلا: خدا نہ کرے کہ میں جان لوں۔ ہاں اگر کچھ اور دیں۔

شبیر صاحب: جان سے زیادہ قیمتی چیز انسان کے پاس اور کیا ہو سکتی ہے۔

سر بھی حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

سوشیلا: اللہ نہ کرے۔ یہ بار بار کیا کہہ رہے ہیں میں نے تو جو چیز نذر کی ہے۔ اُس کے عوض میں بھی وہی چیز چاہتی ہوں۔

شبیر صاحب: (زیر لب مسکراتے ہوئے) مجھے یاد نہیں پڑتا آپ کون سی چیز عنایت کر چکی ہیں؟

سوشیلا: (ادائے شرگیں سے)۔

دل لے کے مرا آپ تو انجان ہو گئے
ہم دے کے اپنے ہاتھوں پشیمان ہو گئے

شبیر صاحب اپنی سچی چاہنے والی کی زبان سے یہ شعر سن کر ایسے متاثر و مسرور ہوئے کہ کرسی سے اُٹھ کر کوچ کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور کہا۔

شبیر صاحب: قربان اس تحفہ کے چونکہ میں اِس قابل نہ تھا۔ اس لئے نہ سمجھ سکا اگر مجھ سے بھی اِس کی طلب ہے تو۔

حاضر ہیں ہم تو دینے کو دل بلکہ جان تک

یہ سنتے ہی سوشیلا بھی کوچ سے اُٹھ کر ان کے پاس زمین پر آ بیٹھی تو شبیر صاحب

نے اِن کا ہاتھ اپنے دل پر رکھ کر کہا۔

شبیر صاحب: دیکھئے یہاں اب کچھ بھی نہیں لیکن ذرا حفاظت سے رکھنا۔ آئندہ بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہے۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

اِن کی حالت کو پہچان کر سوشیلا نے سینہ سے لگا کر کہا۔ آپ اِن خطرات کی ذرا پرواہ نہ کریں۔ میں آپ کی ہوں۔ آپ میرے رہیں۔ سارے مرحلے طے ہو جائیں گے۔

شبیر صاحب: آہ سوشیلا یہ محبت ہم دونوں کو تباہ کر دے گی۔ میں دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ یہی سوچ کر میں کسی قدر بچ رہا تھا۔ ورنہ کیا میں انسان نہ تھا۔ میرے پہلو میں دل نہ تھا جس کو آپ پتھر کہہ رہی تھیں۔ میں نے پتھر بن کر ضبط اور تحمل سے کام لیا لیکن بیکار۔ آخر تمہاری محبت کی بے پناہ کشش سے مغلوب ہونا پڑا۔

سوشیلا: یہ میری خوش نصیبی ہے خدا آپ کے دل میں میری محبت پیدا کر دے۔ تو پھر کسی خوف و خطر کی پرواہ نہ رہے۔ اس وقت تو آپ یہ سمجھ لیں کہ ہم دونوں تاریک کنوئیں میں گر رہے ہیں یا جلتی ہوئی آگ میں کود رہے ہیں۔

شبیر صاحب: بس اب تو یہی سمجھ لیا ہے۔ اس کے سوا اب چارہ ہی کیا ہے اوہو میں باتوں میں ایسا مصروف ہوا کہ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ آپ بخار کی حالت میں زمین پر بیٹھی ہیں۔

سوشیلا: آپ فرش پر ہیں تو میں اوپر کس طرح بیٹھ سکتی ہوں۔

شبیر صاحب: ارے ہم خاک نشینوں کا کیا کہنا جہاں بیٹھ رہے بیٹھ رہے۔ کہیں سردی سے آپ کی تکلیف زیادہ نہ ہو جائے۔ اب آپ کو بیڈ روم میں جانا چاہئے۔ اب میں بھی جاؤں۔

سوشیلا: آپ مجھ سے ایسا سوال کرتے ہیں جس کا جواب آپ کے دل خواہ میں نہیں دے سکتی۔

شبیر صاحب: تو کیا اِسی طرح بیٹھے ہوئے رات گذار دوں؟ واللہ! میں تیار ہوں اگر آپ کو آرام دے سکوں مگر آپ کا اس طرح زمین پر بیٹھنا مجھے گوارا نہیں۔

سوشیلا: مجھے اِس سے بڑھ کر اور کیا آرام ہو سکتا ہے کہ آپ میرے پاس رہیں۔

شبیر صاحب: (گھڑی دیکھ کر) ۱۱ بج گئے۔ آپا آتی ہو گی۔ مجھے رخصت کیجئے۔ (شبیر صاحب اتنا کہہ کر کھڑے ہو گئے) سوشیلا بھی ساتھ ہی کھڑی ہو گئیں۔

شبیر صاحب: یہ تو بتائیے کچھ دودھ وغیرہ بھی پی لیا ہے کہ نہیں؟

سوشیلا: ابھی تو کچھ نہیں پیا۔

شبیر صاحب: یہ سخت غلطی ہے۔ آپ کو دودھ یا تھوڑا سا سوپ ضرور پی لینا چاہئے تھا۔ اچھا میں لاتا ہوں۔

سوشیلا: آپ تکلیف نہ کیجئے۔ آپا آتی ہو گی۔ اُس سے منگوا لیا جائے گا۔ آپ اب آرام کیجئے۔

شبیر صاحب: مگر جب تک آپا آئے آپ اکیلی رہیں گی؟ میں چندر رانی کی آپا کو بھیج دوں؟

سوشیلا: اُس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری آپا آتی ہو گی۔

شبیر صاحب: (ہاتھ ملا کر) اچھا خدا حافظ میں جاتا ہوں۔

سوشیلا: اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا ٹھہریئے۔ میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔

شبیر صاحب: (ٹھہر کر) مگر آپ بیٹھ جایئے۔ کمزوری میں اتنی دیر کھڑا رہنا تکلیف دے گا۔

سوشیلا: آپ کو یاد ہو گا وہ اُس رات جب آپ ستار بجا رہے تھے۔

شبیر صاحب: جی۔

سوشیلا: بائی اور بھابی جان تھابرن کالج کے پھول کا کیا معمہ کہہ رہے تھے۔

شبیر صاحب: (ہنس کر) وہ آپ نے نہیں سمجھا۔ تھابرن کالج میں کسی رئیس مسلمان کی لڑکی ایف اے کلاس میں پڑھ رہی ہے شاید اُس کا نام بھی پھول ہی ہے اور وہ بہت حسین بھی ہے۔ بس چندر رانی جی اِس بات پر زور دے رہی ہیں کہ میں وہاں شادی کر لوں۔

سوشیلا نے یہ سنتے ہی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے اور لپٹ کر کہنے لگیں:

''میرے پیارے کیا آپ بھی اُسے چاہتے ہیں؟''

شبیر صاحب: (سر سینہ سے لگا کر) ابھی سے اس قدر بدگمانی نہ کرو میں نے تو اُسے دیکھا بھی نہیں۔ وہی دیکھ دیکھ کر آتی ہیں اور لوٹ ہو رہی ہیں۔

یہ کہتے ہوئے انہوں نے جھک کر دیکھا تو سوشیلا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور آنسو جاری تھے۔ یہ حالت دیکھی تو اُسے لے کر کوچ پر بیٹھ گئے اور کہا:

"ہائیں ہائیں یہ کیا۔ اس وقت تو میں نے کوئی سخت بات نہیں کہی کیا میرے کمرے سے جانے کا رنج ہے؟"

سوشیلا: (سسکیاں لے کر) مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ گویا آپ کو مجھ سے چھینے لیتا ہے اور آپ بھی اس سے محبت کرتے ہیں جب ہی تو مجھ سے ہٹ رہے ہیں۔

شبیر صاحب: میری بھولی سوشیلا ایسے ایسے فضول شبہوں میں پڑ کر اپنا دل نہ بگاڑو۔ آپ ہی کی قسم ہے۔ میں نے آج تک اُس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ اور اب تو تمہارا اسیر محبت اس قابل ہی نہیں رہا۔

سوشیلا: تو آپ سچ کہتے ہیں۔ آپ کے دل میں اُس کی ذرا بھی محبت نہیں؟

شبیر صاحب: ہائے ظالم محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ جب کہ میں نے اُسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔ یقین کرو جو دل آج سے سوشیلا کا ہو چکا اِس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی۔ اچھا اب آرام سے سوؤ اور میری طرف سے مطمئن رہو۔

کھڑے ہو کر شیک ہینڈ کیا اور کمرے سے باہر آئے وہ اپنے درد سر اور بخار کو تو بھول ہی گئی تھیں۔ اب تنہائی میں آج کی باتوں پر غور کرنے لگیں۔ اتنے میں آیا آ گئی اور اُس نے یہاں سے اٹھا کر لباس تبدیل کر کے مسہری پر لٹا دیا۔

☆

نواں باب

یاں دل میں خیال اور وہاں مدِّ نظر اور
ہے حال طبیعت کا اِدھر اور اُدھر اور

دن کے دس بجے ہیں۔ سر مکرجی اپنی لائبریری میں بیٹھے لیڈی مکرجی سے گفتگو کر رہے ہیں۔

سر مکرجی: کہیے رانو جی پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟ آج کئی دن ہو گئے انجینئر صاحب کو ٹھہرے ہوئے۔ اب وہ جانا چاہتے ہیں انہیں کوئی اطمینان بخش جواب دے دیا جائے تو وہ روانہ ہوں۔

لیڈی مکرجی: تحقیقی طور پر مجھے ابھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ چندر رانی کو بلواتی ہوں۔ اُن سے معلوم ہو سکے گا۔

گھنٹی بجائی۔ آیا حاضر ہوئی تو اُن کے بلانے کا حکم دیا۔ چند منٹ میں وہ جگدیش کو گود میں اٹھائے حاضر ہوئیں۔ سر مکرجی نے عزیز از جان پوتے کو فوراً اپنی گود میں لے لیا۔

لیڈی مکرجی: چندر رانی جی! تم لوگوں نے بہن چندرے حق میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ اب وہ جانے والے ہیں؟

چندر رانی: بھابی جی کیا عرض کروں ابھی سوشیلا جی نے کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ اُن سے شام بھی یہ بحث تھی۔ یہی جواب دیا کہ "ایسی جلدی نہیں ہونی چاہیے۔ ابھی کچھ دن اور بھی مجھے اِس معاملہ میں غور کرنے کا موقعہ دو۔ فی الحال آپ اُن کو رخصت کر دیجیے۔ بعد

میں خط لکھ دیا جائے گا۔"

یہاں تو یہ ذکر تھا اب ذرا اُدھر کی سنیں۔ روشن خیال والدین نے مس سوشیلا کو یہ اجازت دے رکھی تھی کہ انجینئر صاحب سے تنہائی میں مل جل کر اُن کے مزاج و عادات سے واقفیت حاصل کر لیں۔ چنانچہ اِس ہفتہ کے قیام لکھنؤ میں وہ کئی بار سوشیلا سے مل کر وہ بات چیت کر چکے تھے۔ اب رخصت ختم تھی اور کل روانہ ہونا تھا۔ اس لئے صبح کی چائے کے بعد پائیں باغ کی چھوٹی بارہ دری میں آخری ملاقات کے لئے سوشیلا کے پاس آئے۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھی "پائنیر" پڑھ رہی تھیں۔

انجینئر صاحب: سوشیلا جی میری چھٹی ختم ہوگئی۔ اب مجھے واپس ہونا ہے اگر تسلی بخش جواب مل جاتا تو نہایت اطمینان سے روانہ ہوتا۔

سوشیلا: (اخبار رکھ کر) آپ تو اِس قدر جلدی سے کام لے رہے ہیں گویا کوئی بازار کا سودا ہے کہ کھڑے کھڑے چکا لیا جائے۔

انجینئر صاحب: توبہ توبہ ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ جس قدر بھی دیر سے کام لیں۔ میں انتظار کے لئے تیار ہوں لیکن صرف اطمینانِ قلب کے لئے منظوری کا اقرار چاہتا ہوں۔

سوشیلا: مگر اب کی بار اس قدر بے اطمینانی کیوں ہے۔ آخر کوشلیا کے ساتھ دو سال سلسلۂ جنبانی رہی اور اب ایک ہی ہفتہ میں سب کچھ طے کرنا چاہتے ہیں۔

انجینئر صاحب: مس صاحبہ اُس کے وجوہ یہ تھے کہ اوّل تو وہ بہت ہی کم سن طالبِ علم تھیں۔ دوسرے میرے علاوہ اُن کا ایک اور بھی خواستگار تھا۔ اب صورت دوسری ہے۔ میں پانچ سال سے برسرِ کار ہوں اور بفضلِ خدا آپ بھی فارغ التحصیل ہو چکی ہیں۔ زیادہ دیر لگانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

سوشیلا: آپ کا خیال درست ہے مگر میں بھی تو کوئی لمبا عرصہ مقرر نہیں کر رہی ہوں۔ آپ سے خط و کتابت رہے گی۔ آپ کو میری زبان و قلم یکساں سمجھنی چاہیے۔

انجینئر صاحب: (اظہارِ تشکر میں سر جھکا کر) بہت بہتر میں ہر طرح آپ کا تابعِ فرمان ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ ایسٹر کی تعطیل میں پھر طلب کیا جاؤں گا۔

اور مصافحہ کرتے ہوئے یہاں سے چلے گئے۔

سوشیلا نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

آج ہی ۴ بجے شام کی چائے پر چندر رانی جی نے اپنی ایک دوست کو مدعو کیا تھا۔ لان پر نشست کا انتظام تھا۔ چندر رانی نے اس دوست کے لانے کو اپنی فٹن اور آیا بھیج دی تھی۔ ٹھیک ۴ بجے وہ آپہنچیں تو کوشلیا بائی اتروا لائیں یہ آنے والی مہمان نہایت سرخ و سفید رنگ کی اٹھارہ سالہ حسین و جمیل نازک اندام لڑکی تھی۔ جو اس وقت ریشمی گلابی ساڑی بلاؤس میں مثل گلاب کے کھل رہی تھی جب کوشلیا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے پہنچیں تو یہ دونوں نند اور بھاوجیں چندر رانی و سوشیلا جی کھڑی ہوگئیں۔

چندر رانی: (مہمان کا ہاتھ تھام کر سوشیلا کے ہاتھ میں دے کر)

سوشیلا جی یہ میری نہایت عزیز دوست گلناز مس عالم جان مرحوم رئیس پشاور ہیں اور یہاں تھابرن کالج میں تعلیم پا رہی ہیں (اور گلناز سے) یہ میری بڑی نند سوشیلا بائی جی ہیں۔ جن کا ہم ذکر کیا کرتے تھے۔ افسوس کہ میں اب تک انہیں آپ سے نہ ملا سکی تھی۔

خدا جانے بھاوج کے ان تعارفی الفاظ میں کیا اثر تھا کہ سوشیلا کا دل بے چین ہوگیا اور اُن میں کھڑے رہنے کی ہمت نہ رہی۔ جلدی سے بیٹھ گئیں۔ چند نقرئی کشتیوں میں آیا چائے، پھل، مٹھائی وغیرہ لائی اور چھوٹی گول میزوں پر چن دیا اور مس روزی نے چائے بنا کر چاروں کے سامنے پیش کی۔ ان کا یہ وقت نہایت ہنسی خوشی تفریح اور مذاق میں گذرا۔ جب مسٹر ہریش چندر شام کی واک کو جاتے ہوئے ادھر سے گذرے تو چند منٹ کے لئے یہاں ٹھہر گئے۔ گلناز سلطانہ سے علیک سلیک ہوئی جو ان کی دھرم بہن بن چکی تھی۔

ہریش چندر: بہن جی آپ بہت دنوں بعد تشریف لائیں؟ غالباً سوشیلا جی سے آج ہی ملاقات ہوئی ہے۔

گلناز: ہاں بھائی جی کچھ ایسے اتفاقات رہے کہ میں اب تک نہ آسکی۔ میں اپنی قابل اور ملنسار بہن سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

ہریش چندر: (گلناز سے فارسی میں) امید کرتا ہوں۔ آپ میری اور چندر رانی کی خواہش کو منظور کر کے ہمارے عزیز بھائی سید شبیر صاحب سے بھی آج ایک سرسری ملاقات کرلیں گی۔ میں ان کو بھیجتا ہوں۔

گلناز: (فارسی میں نگاہ نیچی کیے) بھائی جان آپ کے حکم سے مجھے انحراف نہیں لیکن ابھی ایسی جلدی کیا ہے۔

ہریش چندر: نہیں نہیں ہماری رائے میں آپ دونوں کو بہت جلد کم از کم صورت آشنا ہو جانا چاہیے۔ اچھا تیار ہو رہئے۔ میں گیا اور وہ آئے۔

یہ کہتے ہوئے چلے گئے اور اِن کے دس ہی منٹ بعد مسٹر شبیر آ پہنچے مگر جونہی ان کی نظر ایک غیر لڑکی پر پڑی وہیں ٹھٹک گئے۔

چندر رانی: آیئے آیئے! کوئی غیر نہیں ہماری بہن مس عالم جان ہیں۔

یہ کہہ کر کھڑی ہو گئیں اور ان دونوں کا تعارف کرایا۔ گلناز نے نظریں نیچی کیے نہایت شرمگیں ادا سے سلام علیک کا جواب دیا اور بیٹھ گئیں۔ شبیر صاحب اس سرسبز لان پر مثل گلاب کے کھلی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئے۔ سوشیلا کے خیال سے اُسی قدر رنجیدہ کیوں کہ وہ نہایت افسردہ حالت میں خاموش بیٹھی تھی۔ شبیر صاحب انہیں بار بار دیکھ لیتے تھے۔

چندر رانی: (شبیر سے) بیٹھ جایئے۔ مس جان کی جائیداد کا ایک مقدمہ ہے۔ اُس کی بابت میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔

شبیر صاحب: مسٹر ہریش بھی تو بیرسٹر ہیں۔ ان کو سمجھا دینا تھا۔

چندر رانی: پہلے اُن سے کہا گیا تھا لیکن انہوں نے آپ کے سپرد کیا ہے۔

شبیر صاحب: اچھا پھر کسی وقت فرصت میں سنایئے۔ اب میں ایک کام کو جا رہا ہوں۔

چندر رانی: (ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے) آپ کو ابھی سننا پڑے گا۔ یہ بھی ضروری کام ہے اور اس وقت مس جان صاحبہ موجود ہیں۔ جو خود بیان کر سکیں گی۔ مجھے تو تمام تفصیل معلوم نہیں۔

شبیر صاحب: (مجبور ہو کر) فرمایئے؟

چندر رانی: یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اِن کے والد سردار عالم جان صاحب گلناز کو نہایت خورد سال چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے اور جب یہ ۴ سال کی ہوئیں تو والدہ بھی گذر گئیں۔ ان کے دوسرے دو بھائی رشتہ دار کابل میں تھے۔ صرف ایک چھوٹے چچا سردار

خانم جان اِن کے وارث رہ گئے۔ جو اپنے بھائی کے ساتھ کابل سے آئے تھے۔ پشاور میں سرکار انگریزی سے دونوں بھائیوں کو چار سو ماہوار کی جائیداد ملی تھی۔ سردار عالم جان بہت روشن خیال بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کو پنڈی مشن کالج میں بی اے تک تعلیم دلوائی اور اُس کے بعد وکالت کے لئے لاء کالج الٰہ آباد میں داخل کرادیا۔ جہاں سے ایل ایل بی کرنے کے بعد ہندوستانی دوستوں کی رائے سے اپنی پریکٹس کے لئے لکھنؤ پہنچے اور مع ننھی یتیم بھتیجی کے وہاں رہنے لگے۔ اِن کی قسمت دیکھو۔ والدین کا سایہ سر پر نہ رہا تھا۔ جب محبت سے پرورش کرنے والی چچی بھی زندہ نہ رہیں تو شفیق چچا نے ماں کی طرح پالا اور جب اِن کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو تھابرن کالج میں داخل کردیا اور پھر ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ یہ مجھے یاد نہیں اس وقت اِن کی کیا عمر تھی۔ بہن گلناز بتایئے جب آپ کے چچا کا انتقال ہوا تو آپ کی کیا عمر تھی۔

گلناز: (نیچی آواز میں) میں اس وقت ۱۲ سال کی تھی۔

چندر رانی: ہاں یہ ۱۲ برس کی تھیں۔ شبیر صاحب! اِن کے چچا مرحوم اور ہمارے سرکار جی میں بہت دوستی تھی۔ چنانچہ انتقال کے وقت سردار صاحب اپنی پیاری بھتیجی کو اِن کے سپرد کر گئے اور جائیداد کا یہ انتظام کیا کہ جب تک لڑکی تعلیم پائے۔ اُس کا اور کالج کا خرچ ماہوار سرکار جی کے ذریعہ پرنسپل کالج کو مل جایا کرے اور جب گلناز سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو جائیداد پر اختیار حاصل کریں۔ یہ سب حالات صحیح ہیں کیوں گلناز میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟

گلناز: (نہایت آہستہ سے) نہیں بالکل ٹھیک ہے۔

سیّد شبیر: (رانی سے) یہ تفصیل جس قدر آپ نے بیان کی۔ معقول انتظام ہے۔ اب کس نے رخنہ اندازی کی ہے کہ مقدمہ کی نوبت پہنچی؟

چندر رانی: گلناز اب باقی آپ سنادیں۔

گلناز: بھابی جان آپ ہی سنادیں۔

چندر رانی: بھائی جان اب یہ جھگڑا درپیش ہے کہ اِن کے چچا کے ساتھ کابل سے ایک نمک حرام ملازم شیر دل خاں بھی آگیا تھا۔

جس کو سردار مرحوم مثل عزیزوں کے رکھتے تھے اور عزت کرتے تھے مگر ان کے انتقال سے چند سال پیشتر وہ واپس چلا گیا۔ اب چھ ماہ ہوئے کہ پھر کابل سے آیا ہوا ہے اور یہ غلط بیانی کر کے جائیداد کا دعویدار بن گیا ہے کہ وہ سرداران مرحوم کا سوتیلا بھائی ہے جو اُن کے والد کی کنیز کے بطن سے تھا۔ لہٰذا اب اپنے بھائیوں کے بعد جائیداد اور لڑکی کا جائز وارث ہے۔ ابھی تک تو پشاور ہی میں بیٹھا جھگڑے کرتا رہا لیکن پرسوں سرکار جی کو چٹھی ملی ہے کہ وہ لکھنؤ آنے والا ہے۔ اِس خبر سے مس جان بہت پریشان ہیں۔

شبیر صاحب: اِس قدر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ جھگڑا بہت کرے گا (اُٹھ کر) اچھا رات کو آپ کے بیرسٹر صاحب سے ذکر کر کے مشورہ کیا جائے گا۔ اب اجازت دیجئے۔

چندر رانی: بہت اچھا جائیے لیکن اتنا بتاتے جائیے کہ اب آپ کہاں جائیں گے؟ کھانے پر زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

شبیر صاحب: (گھڑی دیکھ کر) اب چھ بج چکے ہیں۔ مجھے ساڑھے پانچ بجے ایک کام کے لئے جانا تھا۔ اب اُس کا وقت تو جاتا رہا۔ یہیں گومتی پر ذرا ٹہل کر واپس آتا ہوں۔

ان کے جانے کے بعد چند منٹ بعد مس جان نے بھی رخصت چاہی۔

چندر رانی: (کھڑی ہو کر) ہاں اب شام ہوگئی ہے۔ سوشیلا جی یہاں سردی ہے۔ آپ دونوں بھی اندر جائیں۔ میں انہیں کالج پہنچا آؤں۔

ان دونوں سے مس جان عالم رخصت ہو کر پھاٹک تک آئیں جہاں فٹن تیار کھڑی تھی۔ دونوں سوار ہوئیں۔ چندر رانی نے کوچمین کو گومتی کی طرف جانے کا حکم دیا اور فٹن روانہ ہوئی۔

گلناز: بھابی جان اب رات ہوئی جاتی ہے۔ دریا پر دیر لگے گی۔ مجھے کالج ہی پہنچا دیتیں تو اچھا تھا۔ زیادہ دیر لگنے سے ٹیچرس اعتراض کرتی ہیں۔

چندر رانی: کوئی بات نہیں۔ میں نے تمہارے بلانے کی چٹھی میں پرنسپل صاحبہ کو لکھ کر آٹھ بجے تک کی اجازت لے لی ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ بیرسٹر صاحب کچھ پسند

بھی آئے۔ تم نے تو اچھی طرح صورت بھی نہیں دیکھی۔ زمین میں نظریں گاڑے بیٹھی رہیں۔ ایسی بھی کیا شرم۔ اب جلد تم دونوں ہمیشہ کو ایک دوسرے کے رفیق بننے والے ہو تو صرف ہماری ہی رائے پر کامل اطمینان نہ کرلینا چاہئے آپس میں بھی ایک دوسرے کے صورت شکل عادات مزاج خیالات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے دیکھو۔ میری دونوں نندوں کو اِس معاملہ میں کتنی آزادی دی گئی ہے۔ من موہن ناتھ جی پورے دو سال تک ہمارے ہاں آتے جاتے رہے ہیں تب کہیں بات پختہ ہوئی ہے اور اب مسٹر چمن چندر جی کو بھی سوشیلا جی سے ملاقاتوں کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اِسی طرح تم بھی تعلیم یافتہ روشن خیال ہو۔ ہر ایک معاملہ میں خود سوچ سمجھ سکتی ہو۔

گلناز: کیا کوشلیا جی کی منگنی کی رسم ادا کردی گئی؟

چندر رانی: اجی بہن پیاری گلناز ایسا ہوسکتا ہے کہ چھوٹی بہن کی منگنی ہوجائے اور منجھلی کو خبر نہ ہو۔ ابھی صرف اقرار کرلیا گیا ہے اور یہ ارادہ ہے کہ ایسٹر پر سوشیلا جی کی شادی اور کوشلیا جی کی منگنی کردی جائے کیوں کہ پھر اگر اِس سال بی اے میں کامیاب ہوجائے تو من موہن کو ولایت بھیجا جائے اور اِسی ایسٹر پر منجھلی بہن کی شادی بھی تجویز ہوئی ہے۔ کیوں تیار ہو نہ؟

گلناز: بھابی جان۔ آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگیں۔ کیا معلوم میں اِس سال پاس بھی ہوں کہ نہیں۔

چندر رانی: اونہہ اب پاس واس ہوتی رہو گی۔ کہاں تک کالج میں رہوگی۔ ۱۳ برس ہوگئے۔ بس اب شادی کرلو اور اپنے بیرسٹر شوہر کے ذریعے جائیداد حاصل کرکے چین کرو۔

گلناز: جائیداد کا کیا ہے۔ وہ تو بیرسٹر بھائی کے ذریعہ بھی مل جائے گی۔

چندر رانی: میری پھول وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ اُس کو اب تنہا نہ چھوڑنا چاہئے۔

گاڑی دریا پر پہنچ گئی اور کوچمین نے دریافت کیا "یہیں روک لی جائے یا آگے چلنے کا حکم ہے۔" چندر رانی یہ سنتے ہی گلناز کو گاڑی میں ٹھہرنے کے لئے کہہ کر خود باہر آئیں

اور سائیس سے کہا کہ "دیکھو بیرسٹر سید شبیر صاحب یہیں کہیں ٹہل رہے ہوں گے۔ انہیں بلا لاؤ۔" خود منتظر رہیں۔ چند منٹ میں وہ بھی آ گئے۔

چندر رانی: لیجئے ہم بھی آ پہنچے۔

شبیر صاحب: میں تیار ہوں۔ چلئے کیا کھانے کا وقت ہو گیا۔

چندر رانی: نہیں ابھی تو سات ہی ہوں گے۔ ایک اور کام ہے آپ ذرا تکلیف کر کے مشکور کیجئے۔

شبیر صاحب: فرمایئے حاضر ہوں۔

چندر رانی: آپ ذرا مس جان کو کالج تک پہنچا آئیں۔ میں یہیں سے گھر واپس ہوتی ہوں۔

شبیر صاحب: بھابی جان یہ خدمت تو بڑی کٹھن اور نامناسب ہے۔ اول تو انہی کو یہ ناپسند ہو گا اور پھر کالج تک میرا جانا ٹھیک نہیں۔

چندر رانی: میں نے سب کچھ غور کر لیا ہے۔ اپریل میں ہم آپ دونوں کو ہمیشہ کے لئے ملا دینا چاہتے ہیں۔ اس سے قبل صرف چند ہفتہ کا وقفہ ہے۔ اس عرصہ میں آپ دونوں کو آپس میں کچھ واقفیت حاصل کر لینی ضروری ہے، آپ بسم اللہ کر کے سوار ہو جائیں راستہ میں ان سے معمولی گفتگو کرتے چلیں اور وہاں پہنچ کر پھاٹک سے باہر انہیں اتار دیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ رات کو آٹھ نو بجے بیرسٹر صاحب پہنچا آئے ہیں۔ کیوں کہ وہ ان کے بھائی ہیں۔ کوئی معترض نہیں ہو سکتا۔

شبیر صاحب: مگر یہ حرکت کرتے ہوئے میرا دل لرزتا ہے۔

چندر رانی: (ان کو فٹن کے قریب کھینچ کر) سوار ہو جایئے! دل لرزتا ہے!"

شبیر کو گاڑی کے اندر کر کے خود کھڑکی سے کہا "گلناز مجھے آپ کے بھائی نے بلا بھیجا ہے۔ جلدی کوٹھی جا رہی ہوں۔ بیرسٹر صاحب آپ کو پہنچا آئیں گے۔

کھڑکی بند کر کے کوچبین کو کالج لے جانے کا حکم دیا اور خود ایک سائیس کو ساتھ لے کر پیدل کوٹھی واپس ہوئیں۔ شبیر صاحب گاڑی میں داخل ہو کر کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ادھر گلناز کو بھی عجب وقت کا سامنا تھا۔ مسلمان باحیا لڑکی اور ایک غیر شخص سے پہلی

سی ملاقات میں تنہائی کی یکجائی اور پھر اسی سے منسوبیت کی تجویز، ان کے گاڑی میں داخل ہوتے ہی وہ شرم سے عرق عرق ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر سر نیچے کو جھکا لیا۔ چند منٹ اسی حالت میں گذر گئے تو شبیر صاحب نے کہا۔

شبیر صاحب: آپ تو بہت تکلیف میں بیٹھی ہیں اگر میری وجہ سے یہ تکلیف ہے تو میں باہر کوچ بکس پر جا بیٹھتا ہوں۔

گلناز: (اتنی نیچی آواز سے کہ وہ بمشکل سن سکے) مجھے کوئی تکلیف نہیں۔

شبیر صاحب: تو سر اونچا کر کے اچھی طرح بیٹھ جائیے۔ آپ کی اس تکلیف سے مجھے سخت تکلیف ہے اگر آپ کی اس قدر شرم سے آگاہ ہوتا تو بھابی جان کا کہنا نہ مانتا۔ اب یا تو آپ آرام سے بیٹھیں نہیں تو میں اتر جاتا ہوں۔

گلناز: (سر اونچا کر کے) میں خاصی بیٹھی ہوں۔ آپ کچھ خیال نہ کیجئے۔ فٹن کی دو کھڑکیاں کھلی تھیں اور گاڑی حضرت گنج پہنچ گئی تھی جہاں کی تیز برقی روشنی سے گاڑی میں اُجالا ہو گیا تھا جس سے گلناز کا چاند سا چمکتا ہوا چہرہ بخوبی نظر آنے لگا تھا۔ گو ان کے شرم ولحاظ اور اپنی پاکیزہ طبیعت کی وجہ سے شبیر صاحب اس مہوش کے چہرہ کو ٹکٹکی باندھ کر نہ دیکھ سکتے تھے لیکن حسن میں بذاتِ خود ایسی مقناطیسی کشش ہے کہ انسان تو کیا حیوان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس وقت اپنی پرشوق نگاہیں ہر چند وہ اس کی طرف سے ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنا چاہتے تھے مگر گلناز کا چاند سا چہرہ خواہ مخواہ اُن کی نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا اور نہ صرف نگاہیں بلکہ اُن کا دل گلناز کی طرف کھنچا جاتا تھا اور وہ خود بھی متعجب ہو رہے تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے کہ باوجود یہ کہ سوشیلا جاں نثار کر رہی ہے مگر دل کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اب کالج پہنچ کر یہ اتار دی جائے گی تو پھر میں کیا کروں گا۔ گویا میری ہونے والی ہے اور ہو سکتی ہے لیکن میں پہلے سے گرفتار کر لیا گیا ہوں۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ یہ عجیب دلکش بھول ہے۔ چندر رانی بھی کیسی مہربان خاتون ہے۔ مجھے کیسی نعمت عطا کر رہی ہے مگر آہ! میں اس کے قابل نہیں رہا (پھر یکایک چونک کر)

شبیر صاحب: غالباً ہم حضرت گنج سے نکل آئے۔ کس قدر تاریک رات ہے۔ راستہ دکھائی دینا محال ہے۔ آپ کا کالج مشن روڈ پر ہے یا لال باغ روڈ پر؟

گلناز: یہ کوچبین واقف ہے۔ ہمیشہ یہی آتا ہے۔

شبیر صاحب: پر آج "چندر محل" بہت عرصہ میں تشریف لائی تھیں۔ اب کہئے کب ملاقات ہو سکے گی؟

گلناز: ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔

شبیر صاحب: ایسا تو نہ کہئے۔ دل کو تکلیف ہوتی ہے۔

گلناز: خاموش۔

شبیر صاحب: یہ خاموشی کیسی؟ کیا میرا کوئی لفظ ناگوار گذرا؟

گلناز: بالکل نہیں۔

اب گاڑی کالج کے پھاٹک پر پہنچ گئی اور سائیس نے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ پہلے مسٹر شبیر باہر نکل آئے پھر وہ اترنے لگیں تو انہوں نے ہاتھ کا سہارا دے کر اتار لیا اور اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے رہے۔ گلناز نے رخصتی سلام کیا اور ہاتھ چھڑا کر پھاٹک میں داخل ہو گئیں۔ جاتے ہوئے اُن کا لونڈر میں بسا ہوا ریشمی رومال سڑک پر گر گیا جو سیّد شبیر نے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور سوار ہو گئے۔

☆

دسواں باب

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا جان تو گیا

چندر رانی: (آہستہ سے) کہو کہو کیا کہتی ہو؟

سندری خادمہ: رانی جی کیا کہوں۔ زبان لڑکھڑاتی ہے۔ یوں تو بہت دنوں سے میں دیکھ رہی ہوں۔ پر کل تو غضب ہو گیا۔ (رانی کے کان کے قریب منہ کر کے) رات کے کوئی ۱۱ بجے ہوں گے۔ میں کسی ضرورت کو بغیہ میں جانکلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بارہ دری میں ایک بنچ پر یہ مسلمان بیرسٹر سوشیلا جی کو گود میں لیئے بیٹھے تھے۔ اِن کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ بہت دیر لئے بیٹھے رہے۔ باتیں انگریزی میں تھیں۔ میں کچھ سمجھ نہ سکی۔

چندر رانی: تم اِس کا کچھ کسی سے ذکر نہ کرو۔ اپنی زبان بند رکھو ہم جلدی انتظام کرلیں گے۔ جاؤ۔ دیکھو تو اس وقت سوشیلا جی جاگ رہی ہیں یا سو گئیں۔ میں اِن سے ملنا چاہتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں سندری واپس آئی۔ میں دیکھ آئی۔ اُن کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے پڑے ہیں۔ نہ بیٹھنے والے کمرے میں ہیں نہ سونے کے۔

چندر رانی: اچھا جاؤ۔ تم بھی سو رہو۔

سندری کو علیحدہ کر کے چندر رانی نہایت پریشانی کے عالم میں باہر نکل آئیں۔ جوتی اتار دی اور نہایت آہستہ قدم رکھتی شبیر صاحب کے کمروں کی طرف گئیں۔ سوشیلا بائی کی سنئے آج شام گلناز کا آنا اور شبیر کا ملایا جانا اِن کے لئے قہر تھا۔ جب چندر رانی اور گلناز

سوار ہو گئیں تو وہ اپنے کمرے میں آکر فرش پر گر گئیں اور بہت دیر تک روتی رہیں۔ آٹھ بجے کوشلیا کے اصرار سے بادل ناخواستہ بڑی ہمت سے کام لے کر کھانے پر گئیں تو وہاں اُس وقت مسز شبیر کو بھی افسردہ اور خاموش ہی پایا جس سے اِن کی دلی اُلجھنوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ بات کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا اور اپنے کمرے میں آکر آرام کرسی پر پڑ رہیں لیکن قرار کہاں تھا۔ گلناز کے خیال سے سینہ میں آگ لگ رہی تھی جس سے بے چین ہو کر کروٹیں بدلتی تھیں۔ کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتیں، کبھی یہ دیکھنے کو برآمدے میں نکل جاتیں کہ نوکر چاکر ابھی چل پھر رہے ہیں یا سو گئے۔ آخر گھڑی دیکھی تو دس بج چکے تھے۔ بوٹ اتار کر ربڑ سول سلیپر پہنا اور شبیر صاحب کے برآمدہ میں پہنچیں۔ ہوا کے لئے انہوں نے دروازے کھول رکھے تھے۔ کمرے کی روشنی گل کر کے سبز لیمپ روشن کر رکھا تھا اور خود "سلیپنگ سوٹ" میں ٹہل رہے تھے۔ سوشیلا بائی بیتابانہ کمرے میں داخل ہوئیں اور اِن کا ہاتھ پکڑ کر فرش پر بٹھا لیا اور خود بھی بیٹھ گئیں۔ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل، پھولے ہوئے سانس، بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر سید شبیر گھبرا کر کہنے لگے۔

شبیر صاحب: کیا ہے۔ خیر تو ہے۔ آپ تو بہت ہی پریشان حالت میں بے دھڑک چلی آئیں؟

سوشیلا: شبیر جی کیا کہوں۔ شام سے میری حالت بری ہو رہی ہے جو روح فرسا نقشہ دیکھ چکی ہوں۔ اس کے خیال سے دل پھٹا جاتا ہے۔ یہ کیا تجویزیں ہیں۔ مجھے مفصل بتاؤ۔ کیا بھابھی جان آپ کی شادی کرنے لگی ہیں۔ وہ لڑکی آج کیوں بلوائی گئی اور آپ کو کس لئے ملوایا گیا؟ ہائے کیا میرے شبیر اب اُس کے ہونے والے ہیں؟

شبیر صاحب: سوشیلا جی! ذرا سنبھلو یوں دیوانہ وار بے قرار نہ ہو۔ ابھی تو نہ شادی ہے اور نہ میں کسی کا، ذرا سوچو رات کا وقت بالکل تنہائی دروازے کھلے ہوئے ہیں اور تم یوں بے جھجک چلی آئیں اگر خدانخواستہ کوئی دیکھ لے تو کیا ہو؟

سوشیلا: میں آپ سے ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے اِن خطرات کی ذرا پروا نہیں۔ میں اپنی جان پر کھیلنے کو تیار ہوں کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہو گا۔ میں خیال کرتی ہوں۔ میری حالت سے بھابھی جان کچھ مشتبہ سی ہو رہی ہیں لیکن مجھے کچھ فکر نہیں۔ کیوں کہ میں خود

انہیں اپنی کیفیت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔

شبیر صاحب: ہر گز نہیں۔ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ ان بیچاری کو سخت صدمہ ہوگا۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔ گھر میں کیا تجویزیں ہو رہی ہیں۔ چمن چندر جی کو بلوایا گیا ہے۔ سوشیلا جی یہ دنیا چندروزہ ہے زندگی ناپائیدار ہے۔ خوش رہے تب کیا، ناخوش رہے تب کیا۔ انسان کو اس جہاں سے بہت جلد گذر جانا ہے۔ ایک معزز شریف کی لڑکی کی عزت و شرافت اسی میں ہے کہ والدین کے خیال کے مطابق راضی برضا ہو جائے۔ چمن چندر نہایت شریف اور قابل ہر طرح سے موزوں نوجوان ہیں۔ پس مجھ کم بخت کو مردہ سمجھ کر صبر کرلو۔

سوشیلا: آخر کیوں میں اپنے تئیں زندہ در گور کرلوں۔ اس دنیا میں پھر بار بار نہیں آنا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کوشلیا اپنے حسب دلخواہ شوہر پائے اور میں جس کو بالکل نہ چاہوں اُس سے جکڑ دی جاؤں؟

شبیر صاحب: تمہارے اور کوشلیا کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس نے اپنے ہم قوم، ہم مذہب کو چاہا اور تم ایک غیر قوم، غیر مذہب ناپاک شخص سے محبت کر رہی ہو جس کا انجام نہایت خراب ہونے والا ہے۔

سوشیلا: افسوس! آپ ایسے روشن خیال تعلیم یافتہ نوجوان اور ایسے تاریک خیالات، قوم کیا اور مذہب کیا۔ یہ فرقہ بندی تو جہلا کی من گھڑت ہے۔ کوئی بڑا فلاسفر کسی مذہب کا پابند نہیں پایا گیا۔ مجھے تو اِن باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ سچ کہتی ہوں۔ اس باب میں میرے خیالات بہت وسیع ہیں۔ میرے خیال میں دنیا کے کل انسان جو اولادِ آدم ہیں۔ ایک قوم ہیں۔ کیوں کہ ایک خون سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ اختلافاتِ مذاہب اور تفرقہ اندازی کم سمجھ، جاہل اور بد نصیب لوگوں کی ایجاد ہے۔ خدا کا اِس میں کوئی دخل نہیں۔ نہ اُس کی طرف سے دنیا میں کوئی دین اُتارا گیا۔ مذہب صرف ان غرض پرست لوگوں کی ایجاد ہے جو جاہلوں کو دھوکہ دے کر اپنی پوجا کرانا چاہتے ہیں۔ شبیر صاحب یقین جانئے کہ مذہب کے لغو اور مہمل نام پر ہمیں ہمارے ارادوں سے کوئی نہیں روک سکتا۔

شبیر صاحب: سوشیلا جی! برا نہ مانئے۔ میں اصولی حیثیت سے مذہب کا صرف قائل ہی نہیں بلکہ اپنے مذہب کا سختی کے ساتھ پابند ہوں۔ اس لئے آپ کے علم و فضل

کے قلبی اعترافات کے باوجود آپ کی اِس وقت کی تقریر اور آپ کے خیالات سے مجھے بے حد رنج ہوا۔ مگر آپ مجبور ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کے والدین کی ذرا سی غفلت اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے۔ کاش انہوں نے آپ کو کم سنی میں یورپ بھیج دیا تھا تو کم سے کم یہ تو کرتے کہ آپ کو صرف وہاں کے دہریوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑ دیتے اور وہاں کی ملحدانہ تعلیم کے ساتھ آپ کی مذہبی تعلیم کا بھی کوئی انتظام کرتے۔ آپ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی مذہب سے اس قدر بے گانہ ہیں کہ خدا کی ہستی سے بھی انکار کر بیٹھیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

سوشیلا: (مسکرا کر) ہاں! میں بسا اوقات اِس الجھن میں بھی پڑ جایا کرتی ہوں کہ حقیقت میں خدائی بھی کوئی چیز ہے یا یہ نظامِ عالم خود بخود ہی مرتب ہوتا چلا گیا۔

شبیر صاحب: بیشک سرچندر جی نے جلدی بلالیا۔ پانچ سال اور وہاں رہنے دیتے تو پھر آپ کو اس پر بھی غور فرمانے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ اچھا اب آپ اتنا ہی کیجئے کہ اپنے مذہب سے واقفیت ہی حاصل کرنے کے خیال سے چند مذہبی کتابیں پڑھ ڈالئے۔ دیکھئے تو مذہب کی بنیادیں کہاں تک مضبوط ہیں۔

سوشیلا: اونہہ میں فضول بکواس پڑھنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کروں؟ استاد جی یہ مذہب تو ایک ڈھکوسلہ ہے۔ اہلِ دانش کبھی اِس کے پابند نہیں ہو سکتے۔ آپ ہی غور کریں۔ پتھر کی مورتوں اور خیالی دیوی دیوتاؤں کا پوجنا اور اُن سے مرادیں مانگنی، آگ، پانی، سورج کو خدا گردانا۔ پیپل کے درخت کے آگے سر جھکانا کیا کتنے جاہلانہ افعال ہیں۔ لعنت ہے۔ اُس مذہب پر جو ہمیں روشنی سے ہٹا کر تاریکی میں لے جائے۔

شبیر: (افسردگی سے) اِسی لئے تو میری یہ رائے ہے کہ آپ اپنے عالمانِ دین کی اچھی کتابوں کا مطالعہ کر کے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بھی پابندِ مذہب ہونے کے باوجود دیوی، دیوتا، آگ، پانی، پتھر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے اور اِن چیزوں کے پوجنے کے متعلق اِن کا بھی وہی خیال ہے جو آپ کا ہے۔

سوشیلا: خیر میں آپ کے کہنے سے اِن کتابوں کے مطالعہ میں اپنا کچھ وقت برباد کروں گی مگر شبیر صاحب مجھے یقین نہیں آتا کہ کتابی مذاہب اس عملی مذہب سے جداگانہ ہے جس پر آج ہندو دھرم کے سارے پیرو چل رہے ہیں۔ آپ کے فرمانے کے

مطابق اگر مذہب کی بنیادیں بے حد مضبوط اور استوار ہیں تو پھر مذہب کے پجاریوں کی اخلاقی حالت آج ایسی گری ہوئی کیوں ہے۔

شبیر صاحب: مگر اس میں مذہب کا کیا قصور ہے۔ آپ اگر مذہبی حیثیت سے کسی معاملہ میں کمزور ثابت ہوں تو اس کے ذمہ دار آپ کے والدین ہیں نہ کہ مذہب۔ اسی طرح مذہب کے پجاریوں میں کوئی کمزوری نظر آئے تو یہ اُن کی تربیت کا قصور اور مذہب سے کامل واقف نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس سے مذہب کی شان پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔

سوشیلا: جو کچھ بھی فرمایئے مگر میرا عقیدہ ہے مذہب نے آج تک دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ خصوصیت کے ساتھ ہندو دھرم کی لغویات تو سن سن کر اور دیکھ دیکھ کر میں مذہب سے اس قدر بیزار ہوگئی ہوں کہ اب کتابیں پڑھ پڑھ کر ان لغویات سے اور بھی اپنا دماغ خراب کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔

شبیر صاحب: پھر وہی بات آپ سوسائٹی کی تمام برائیاں مذہب کے سر کیوں تھوپ رہی ہیں۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان ساری خرابیوں کی اصل وجہ یہی ہے کہ مذہب کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔

سوشیلا: ہوسکتا ہے کہ یہی ہو مگر میں مذہب سے ناواقف ہونے کے باوجود اتنا ضرور جانتی ہوں کہ دنیا کے کسی مذہب نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور ہر مذہب عورت کو مردوں کی کنیز قرار دیتا ہے اور جن لوگوں میں جتنی مذہبیت ہے اُن میں عورت اُسی قدر ذلیل ہے۔

شبیر: یہ محض آپ کا خیال ہے۔ ہندو دھرم میں عورتیں دیویوں کا مرتبہ رکھتی ہیں اور اسلام کا تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ اُس نے تو عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق عطا کئے ہیں۔

سوشیلا: شاید یہی ہو مگر مشاہدہ سراسر اس کے خلاف ہو رہا ہے۔

شبیر: یہ صرف اس لئے کہ آپ نے تاریخِ مذاہب کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ورنہ مشاہدہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور خصوصاً مذہب اسلام عورتوں کے لئے رحمت ہے۔

بانیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے عورتیں ہر ملک میں غلام اور لونڈیوں

کی طرح تھیں۔ کسی قوم کی عورت کو ایسی آزادی نہ تھی کہ وہ اُسے بطور حق کے استعمال کر سکے۔ وہ اپنی جائیداد کی مالک نہ تھی۔ اُس کا خاوند اُس کی جائیداد کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ اُسے اپنے باپ کے مال میں سے کوئی حصہ نہ دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے خاوند کے مال کی بھی وارث نہ سمجھی جاتی تھی۔ اُسے کسی حالت میں بھی اپنے خاوند سے جدا ہونے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ خود اُسے خواہ کسی قدر تکلیف ہو۔ خاوند اگر اُس کو چھوڑ دے اور اُس سے سلوک نہ رکھے یا کہیں بھاگ جائے تو اُس کے حقوق کی حفاظت کا کوئی قانون مقرر نہ تھا۔ اُس کا فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو اور اپنے آپ کو لے کر بیٹھی رہے اور محنت مزدوری کر کے اپنے آپ کو بھی پالے اور بچوں کو بھی پالے۔ خاوند کا اختیار سمجھا جاتا تھا کہ وہ ناراض ہو کر اُسے مار پیٹ لے اور وہ اُس کے خلاف آواز نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ خاوند فوت ہو جاتا تھا تو بعض ملکوں میں وہ خاوند کے رشتہ داروں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ بعض خاوند بیویوں کو فروخت کر دیتے تھے یا جوئے اور شرطوں میں ہار دیتے تھے اور وہ بالکل اپنے اختیارات کے دائرے میں سمجھے جاتے تھے۔ عورت کا بچوں پر کوئی اختیار نہ سمجھا جاتا تھا۔ عورت گھر کے معاملہ میں کوئی اختیار نہ رکھتی تھی۔

سوشیلا: تو یوں کہئے کہ عورت انسان ہی نہ سمجھی جاتی تھی بلکہ گائے بیل کی طرح صرف مردوں کی خدمت اور اُن کے بچوں کی پرورش کا ذریعہ خیال کی جاتی تھی۔

شبیر: بلکہ اِس سے بھی بدتر۔ خاوند اِس پر خواہ جس قدر ظلم کرے وہ اِس سے جدا نہ ہو سکتی تھی یا جن قوموں میں جدا ہو سکتی تھی ایسی شرائط پر کہ بہت سی شریف عورتیں اس جدائی پر موت کو ترجیح دیتی تھیں۔ مثلاً جدائی کی یہ شرط تھی کہ خاوند یا عورت کی بدکاری ثابت کی جائے اور پھر اُس کے ساتھ ظلم بھی ثابت کیا جائے اور اُس سے بڑھ کر ظلم یہ تھا کہ بہت سی صورتوں میں جب عورت کا خاوند کے ساتھ رہنا ناممکن ہوتا تو اُسے کامل طور پر جدا کرنے کی بجائے صرف علیحدہ کرنے کا حق دیا جاتا تھا۔ خاوند کے مرنے کے بعد عورت کا زبردستی خاوند کے کسی رشتہ دار کے ساتھ نکاح کر دیا جاتا تھا یا قیمت لے کر کسی شخص کے ہاتھ بیچ دیا جاتا تھا بلکہ بعض اوقات خود خاوند اپنی عورتوں کو بیچ ڈالتے تھے۔ پانڈوں جیسے عظیم الشان شہزادے اپنی بیوی کو جوئے میں ہار جاتے تھے اور ملک کے قانون کے سامنے دروپدی جیسی شریف شہزادی اُف نہ کر سکی تھی۔

سوشیلا: (شبیر کے گلے میں بانہیں ڈال کر) پیارے پہلے زمانے کے مرد بڑے ہی ظالم تھے مگر آج کل بھی ایسے مردوں کی کمی نہیں ہے۔ دیکھو تم کس قدر سخت دل واقع ہوئے ہو اور میرے جذباتِ محبت کو کس حقارت سے ٹھکراتے رہے ہو اگر تمہارے مذہب نے عورتوں کے جذبات کی کچھ وقعت کی ہے تو کیا تم اس پر عمل نہیں کرتے؟۔

شبیر: (آہِ سرد کھینچ کر) افسوس! تمہیں کیا معلوم ہے کہ میں تمہارے جذبات کا احترام نہیں کرتا مگر ہمارے مذہب نے اس سے بھی تو روکا ہے کہ اپنے محسنوں کے ساتھ خیانت کی جائے اور دوسروں کی رسوائی کا باعث بن کر اسلام کو رسوا کیا جائے۔

سوشیلا: (گلے سے بانہیں نکال کر پُرنم آنکھوں سے) آپ نے پھر وہی باتیں شروع کیں۔ کہتی تو ہوں کہ مجھے زہر دے دیجئے یا میرا گلا گھونٹ دیجئے۔ مذہب کی آڑ پکڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ آپ اس لڑکی سے محبت کرنے لگے ہیں۔

(سوشیلا زار و قطار رونے لگتی ہیں)

شبیر صاحب: (اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) ہائیں ہائیں آپ تو بات بات پر رونے لگتی ہیں۔ میں نے بھلا کب کہا کہ میں گلناز سے محبت کرتا ہوں جب ہی تو میں کہتا ہوں کہ آپ میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور آپ مجھ سے ملنے کی تمنا نہ کرتیں۔

سوشیلا: آپ مذہب کو لئے پھرتے ہیں۔ مذہب نے ہم بدنصیبوں کے لئے کیا کیا ہے جو باتیں آپ نے بیان فرمائی ہیں وہ پہلے زمانے کی طرح اب بھی ہیں۔ اب بھی ہندوستان میں کوئی لڑکی اپنی پسند کے مطابق اپنے شوہر کا انتخاب نہیں کر سکتی ورنہ مجھ پر یہ مصیبت کیوں پڑتی۔

شبیر صاحب: نہیں نہیں! مذہب اسلام نے تو عورتوں کو بہت سے حقوق دیئے ہیں اور انہیں قریب قریب مردوں کے مساوی کر دیا ہے۔ یورپ میں آپ اس معاملہ میں جو آزادی عورتوں کے حقوق اور اُن کے جذبات کے احترام کی جو کیفیت دیکھ آئی ہیں۔ وہ بڑی حد تک اسلام ہی کی ممنون ہے۔

سوشیلا: (پھر شبیر صاحب کے گلے میں بانہیں ڈال کر) اچھا شبیر جی یہ بھی سنا ہی دیجئے کہ آپ کے مذہب نے ہم غریبوں کو کیا کیا حقوق عطا کئے ہیں؟

شبیر صاحب: اب گیارہ بج گئے جا کر آرام کیجئے پھر سنادوں گا۔
سوشیلا: ۱۱ بج گئے تو کیا ہو گیا میں جس بات کے لئے آئی تھی وہ تو رہ ہی گئی اور مذہبی بحث نے اتنا وقت لے لیا۔
شبیر صاحب: کہئے وہ کیا تھی؟
سوشیلا: یہی کہ میں یہ معلوم کرنے آئی ہوں۔ وہ لڑکی کیوں آئی تھی کیا آپ مجھے بھلا کر اُس سے محبت کرنے لگیں گے اگر ایسا ہے تو میں زہر کھالوں گی۔
شبیر صاحب: میں تو کہہ چکا۔ آپ یقین ہی نہیں کرتیں۔ ابھی میری شادی دادی کا کچھ ذکر نہیں مگر ہاں آپ کو شادی ضرور کر لینا چاہئے۔
سوشیلا: یہ کیسی محبت ہے کہ میں تو آپ کی شادی کا خیال بھی برداشت نہیں کر سکتی اور آپ مجھے تاکید فرماتے ہیں۔ شبیر صاحب اگر میں نے شادی کر لی تو آپ سے کس طرح مل سکوں گی اور یہ محبت کیوں کر نبھ سکے گی میں صرف اسی لئے ٹال رہی ہوں۔
شبیر صاحب: کیوں نہیں نبھ سکے گی۔ دیکھو چندر رانی جی اور چھوٹی کوشلیا جی مجھ سے کس قدر محبت کرتی اور ملتی جلتی ہیں۔ آپ بھی جب شادی ہو کر کلکتہ چلی جائیں گی تو میں وہیں آن کر ملا کروں گا۔ میرا تو گھر ہی وہیں ہے۔
سوشیلا: مگر میرے دل میں تو آپ کی محبت اس قدر سما گئی ہے کہ میں دوسرے کو جگہ ہی نہیں دے سکتی۔
شبیر صاحب: اُس بیچارے سے محبت نہ سہی صرف دستورِ زمانہ کے موافق با قاعدہ اور پر امن زندگی بسر کرنے کے لئے شادی کر لو۔ بہت سی شادیاں ایسی بھی ہو جاتی ہیں۔
سوشیلا: لیکن میں تو آپ کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ دوسرے سے شادی کر کے جدائی لازمی ہو گی۔ میں تو بھابی جان سے کہہ دینے والی ہوں کہ میری شادی کی فکر نہ کی جائے میں اسی طرح زندگی گذاروں گی اور کیا ہی اچھا ہو کہ آپ بھی کبھی شادی نہ کریں تو مجھے یہ اطمینان رہے کہ شبیر کا دل میرا ہی ہے اور اُس میں میری محبت ہے۔
(اُن کے گلے میں باہیں ڈال کر) میرے شبیر سچ بتا دو۔ اُس شام والی لڑکی کی شکل آپ کو پسند تو نہیں آ گئی ہے کیوں کہ وہ خوش شکل ہے خصوصاً رنگ تو قابلِ تعریف ہے۔

شبیر صاحب: (مسکرا کر) سوشیلا جی تم بہت ہی بھولی ہو۔ میں کب کہتا ہوں کہ اُس کی شکل اچھی ہے۔ تم تو بیٹھی تھیں۔ میں نے اُس طرف توجہ سے دیکھا بھی نہیں۔ اس قدر بدگمان نہ ہو جاؤ۔ اب آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔

یہ سن کر سوشیلا جی مجبوراً کھڑی ہو گئیں اور وہ برآمدے تک انہیں رخصت کرنے آئے مگر جیسے ہی اِن کے برآمدے کو طے کر کے سوشیلا جی ڈرائنگ روم کے سامنے پہنچیں اچانک چندر رانی نے اِن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

چندر رانی: سوشیلا جی آپ اِس وقت کہاں سے آرہی ہیں؟

سوشیلا: بھابی جان آپ اِس وقت یہاں کہاں؟

چندر رانی: شام ڈرائنگ روم میں تمہارے بھائی اپنی گھڑی بھول گئے تھے۔ وہ لینے آئی ہوں۔

سوشیلا: کیا اِس وقت آپ اور بھائی جان جاگ رہے تھے؟

چندر رانی: ہاں آپ کی شادیوں کا ذکر نکل آیا تھا۔ کچھ دیر انجینئر صاحب بھی بیٹھے رہے۔ اس میں دیر لگ گئی۔ تمہارے ہاتھ سرد ہو رہے ہیں۔ کیا کہیں باہر سے آئی ہو؟

سوشیلا: بھابی جان نہ معلوم کیوں میں گھنٹوں پلنگ پر پڑی رہی مگر نیند نہ آئی تو اُٹھ کر لان پر ٹہلنے چلی گئی تھی۔

چندر رانی: دیکھو۔ وہ تمہارے مالک و مختار ہیں جو چاہیں۔ کل انجینئر صاحب جا رہے ہیں۔ اُن کی روانگی سے پیشتر تم ایک بار اور مل لو۔ سرکار جی اور سرکار رانی نے یہ فیصلہ کر کے اِن سے اقرار کر لیا ہے کہ ماہ آئندہ میں شادی کریں گے۔ چنانچہ ایسٹر کی چھٹیوں میں انجینئر صاحب شادی کے لئے آجائیں گے۔

سوشیلا: (برہم ہو کر) بھابی جان شادی میری اور فیصلہ کرنے والے کوئی اور۔ آپ اپنے ساس خسر سے کہہ دیں میری رائے بغیر ایسی جلدی شادی نہیں کر سکتے۔

چندر رانی: (اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) سوشیلا ایسی سرتابی نہیں ہیں گے کریں گے۔ اس قدر خود سر نہ بنو۔

☆

گیارہواں باب

ماہ جون آدھا گذر چکا ہے لیکن ابھی تک پانی کا ایک چھینٹا بھی نہ پڑنے سے گرمی کی شدت نے لکھنؤ کو دوزخ بنا رکھا ہے۔ خوش نصیب دولت مند تو کب کے پہاڑوں پر جا چکے ہیں۔ اُن ہی میں ہماری معزز لیڈی چندر و سر چندر بھی تھے جو شروع اپریل سے شملہ پر براج رہے تھے لیکن چندر رانی جی اپنے شوہر کی تنہائی کے خیال سے یہیں ہیں۔ ننھے جگدیش کو معہ مس روزی کے شملہ بھیج دیا ہے مگر سوشیلا جی شبیر کی جدائی برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے لکھنؤ میں شدید گرمی میں تکلیف اٹھا رہی ہیں اور اِن کا پہاڑ پر نہ جانا والدین و بھائی بھاوج کو بہت ناگوار ہے لیکن وہ اِن دنوں کچھ اس طرح خود مختاری پر آمادہ ہیں کہ کسی کی نہیں سنتیں۔ اب بھاوج سے بھی بہت ان بن رہنے لگی ہے۔ کئی کئی دن بات چیت تک نہیں ہوتی جس کا ہریش چندر جی کو بہت رنج ہے۔

اِس وقت بارہ بجے ہوں گے۔ یہ چاروں کھانا کھا رہے ہیں۔ گو ڈرائنگ روم کو خس کی ٹٹیوں نے تاریک بنا رکھا ہے اور چار برقی پنکھے بھی تیزی سے رواں ہیں۔ اِس پر بھی ان لوگوں کو گرمی کی شکایت ہے۔ رانی چندر بار بار رومال سے پسینہ خشک کر رہی ہیں۔

ہریش چندر: چندر رانی اب تو گرمی بھونے ڈالتی ہے۔ میں تو بھلا مجبور ہوں۔ آپ خواہ مخواہ اپنی جان ہلاک کرتی ہیں کیوں نہیں شملہ چلی جاتیں؟

چندر رانی: اِسی انتظار میں رہی کہ ایک آدھ بارش ہو گئی تو یہ شدت نہ رہے گی۔ مگر چار پانچ روز سے تو جان ہی نکلی جاتی ہے۔

ہریش چندر: میں تاکیداً کہتا ہوں کہ آپ آج ہی سامانِ سفر درست کر کے

کل کی ڈاک سے شملہ روانہ ہو جائیں۔

چندر رانی: چندر جی اس حالت میں میں کس طرح روانہ ہو سکتی ہوں جب کہ سوشیلا جی یہاں موجود ہیں۔ اُن کو تنہا چھوڑ جانا ٹھیک نہیں۔

ہریش چندر: وہ کیوں یہاں رہیں۔ دونوں کو جانا چاہیے۔

سوشیلا بائی: بھابی جان میری تنہائی کا کیوں اس قدر خیال ہے جب کہ بھائی جان بھی موجود ہیں۔ میں کوئی بچہ تو نہیں۔ وہی تو ہوں جس کو کم سنی میں پندرہ سال بالکل اکیلا یورپ میں چھوڑے رکھا کیا اب بھائی کی موجودگی میں بھی مَیں گھر پر نہیں رہ سکتی؟

ہریش چندر: (ذرا برہم ہو کر) مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہیں یہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اتنی عمر تمہاری ٹھنڈے ملک میں گذری گذشتہ سال جب یہاں پہنچیں تو والد صاحب سیدھے شملہ لے گئے اور اب یہ پہلا سال گرمی کا تم دوزخ میں گذار رہی ہو اگر چندر رانی یہاں رہتی ہیں تو محض میری وجہ سے اور اس پر بھی ایک سیزن میں کئی کئی بار شملہ ہو آیا کرتی ہیں۔ میں آج یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟

سوشیلا جی: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) بھائی جان اگر میں نے چند روز اپنے وطن اور عزیزوں میں رہنا چاہا تو یہ کوئی گناہ نہ تھا جو آپ کو اس قدر ناگوار گذرا۔ بھابی جان کو میری وجہ سے گرمی میں رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں اپنے گھر پر اکیلی بھی رہ سکتی ہوں۔

چندر رانی: سوشیلا جی آپ کو بچپن میں ایک لمبے عرصہ تک تنہا یورپ میں رکھنا تعلیم کے لئے نہایت ضروری تھا اور اب آپ کا یہاں تنہا رہنا بالکل بیکار اور نامناسب ہے۔

ہریش چندر: خیر یہ بحث بیکار ہے تم کو کل اپنی بھاوج کے ساتھ جانا ہو گا۔

یہ حکم دیتے ہوئے ہریش چندر جی باہر چلے گئے۔ اب کھانا بھی ختم ہو چکا تھا۔ اِن کے جاتے ہی شبیر صاحب بھی اُٹھ گئے۔ آیا اور خدمتگار نے میز صاف کی۔ سوشیلا جی روتی ہوئی باہر جانے لگیں تو بھاوج نے روک کر بٹھالیا۔

سوشیلا بائی: بھابی جان آپ لوگ میری سخت ذلت کرنے لگے ہیں۔ ایک ذرا سی بات پر بھائی جان نے ایک غیر شخص کے سامنے میرے ساتھ کیسی سخت کلامی کی۔ اِن کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ اِس زمانہ میں کوئی کسی پر سختی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ میں تو

ہندوستانی ادب و لحاظ کی وجہ سے سب کچھ سہتی ہوں اگر نہ سہوں تو کسی کو مجھ پر بیجا تشدد کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیا آپ لوگ پرانے ہندوؤں کی روایات کو تازہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک آزاد خیال تعلیم یافتہ لڑکی یہ سختی برداشت نہ کر سکے گی۔

چندرر رانی: سوشیلا بائی سنو تمہیں ایک اُتم دیوی بنانے کے لئے اعلیٰ تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ بدنصیب بوڑھے نے ہزاروں روپیہ خرچ کر ڈالا جو کوئی بیٹے پر نہیں کر سکتا مگر افسوس کہ اِس کا نتیجہ اِن کو نہایت بد ملا۔ ہماری سیاہ بختیوں سے آگاہ ہو کر زمانہ تمہاری تعلیم یورپ پر اعتراض کرے گا مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہماری بیٹیاں ہندوستانی لڑکیاں اب تعلیم کے لئے یورپ بھیجی جا رہی ہیں اگر تمہیں بھی بھیجا گیا تو یہ ہمارے بدقسمت بوڑھے باپ کا کوئی گناہ نہ تھا۔ مجھے تمہاری کل حرکات معلوم ہیں اور تمہارے ایسے ایسے شرمناک فعل بچشم خود دیکھ چکی ہوں کہ خدا ہمارے گھر کی خادمہ سے بھی نہ کرائے لیکن ایشور کی قسم ہے کہ میں نے تمہارے بھائی جان سے ذرا بھی نہیں کہا۔ اس پر تمہیں یہ شکایت ہے کہ ہم تمہاری ذلت کر رہے ہیں۔ بدبخت لڑکی ذلت ہم کر رہے ہیں یا خود تیرا دیوانہ دل کر رہا ہے۔ اِس وقت تک تم پر ذرا بھی بیجا سختی نہیں کی گئی بلکہ تم نے ہی اپنی قابلِ ملامت ضد اور ہٹ دھرمی سے سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ولایت سے آتے ہی تمہاری زندگی کو زیادہ پُر بہار اور خوشگوار بنانے کے لئے شادی کی تجویز کی گئی اور وہ کس طریق سے؟ مثل یورپ کے انتخابِ شوہر میں تمہیں کامل آزادی دے دی گئی اور ایک نہایت قابل روشن خیال نامور اعلیٰ تعلیم یافتہ معزز عہدہ پر ممتاز خاندانی نیک چلن شریف نوجوان تمہارے لئے تجویز کیا گیا مگر اِن تمام شفقتوں مہربانیوں کے عوض تم نے وقت پر شادی سے انکار کر کے نہ صرف رنج دیا بلکہ شرمندہ کیا۔ اب ماں باپ اور بھائی جو تم سے کبیدہ خاطر ہیں اِس کی یہی وجہ ہے۔ اس پر والدین کے ہمراہ تمہارا شملہ نہ جانا سخت قابلِ ملامت ہے۔ بتاؤ تو آخر یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟

سوشیلا بائی: (ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے) بھابی جان جو کچھ آپ نے فرمایا بجا سہی لیکن جب آپ اس کمبخت ننگ خاندان کی دلی کیفیات سے بخوبی واقف ہیں تو پھر میرا کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ پس بجائے اس تنبیہ و ادب کے مجھے پھانسی دے دیں یا قتل

کرادیں تو مناسب ہے کیوں کہ میں اپنے دیوانے دل سے بالکل مجبور ہو کر جان پر کھیل رہی ہوں اور اچھی طرح یقین دلاتی ہوں کہ میں اپنا دل اور جان اور ایمان شبیر کے نام پر قربان کر چکی ہوں اور اُس کے بغیر میری زندگی ناممکن ہے۔ بھابھی جان خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے اگر میں اس کو دو گھنٹہ تک نہیں دیکھتی تو دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے اور اِس میں اُس کا ذرا قصور نہیں کیوں کہ شروع سے اب تک وہ مجھے سمجھا رہا ہے۔ اُس کو میری کچھ ایسی محبت نہیں ہے مگر میرا بے شرم دل ہے کہ قابو سے باہر ہو کر اس پر فدا ہو جاتا ہے۔ سوائے اس پر قربان ہو جانے کے میں دنیا کے کسی کام کی نہیں رہی ہوں۔ اِس حالت میں آپ ہی بتایئے کہ میں کیا کروں؟ بجز اِس کے کہ زہر کھا کر اُس پر اور آپ سب کی عزت پر نثار ہو جاؤں۔

یہ فقرے ختم کر کے اٹھی اور بھاوج کے قدموں پر سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گو چندر رانی ایک عرصہ سے اُس کی حرکات پر اُس کا خون پینے کو بیٹھی تھی مگر اس وقت کی مجنونانہ حالت اور بے اختیاری پر رحم کھا کے خاموش ہو گئیں اور سوشیلا کو پیروں سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا مگر سوشیلا بہت دیر تک سسکیاں لے کر روتی رہی۔ پھر خود ہی اٹھ کر چندر رانی نے ایک گلاس سرد پانی بنا کر نند کو پلایا۔ اتنے میں سندری نے آ کر اطلاع دی کہ بیرسٹر صاحب بلا رہے ہیں۔

یہ سنتے ہی چندر رانی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد سوشیلا بھی یہاں سے اٹھیں اور اپنے کمرے میں جا کر ایسی پڑیں کہ شام تک نہ اٹھیں۔

ساڑھے پانچ بجے چندر رانی ڈریس ہو کر باہر آئیں۔ موٹر تیار کروائی اور سید شبیر کو بلا کر بناری باغ روانہ ہوئیں چونکہ اس وقت شوفر کو نہیں لیا تھا۔ شبیر صاحب نے موٹر ڈرائیو کیا۔ چند منٹ میں موٹر کار باغ پہنچا اور یہ دونوں اُتر کر بارہ دری کے سامنے........ ہشت پہلو کیاری کے قریب والی بنچ پر بیٹھ گئے۔

شبیر صاحب: بیرسٹر صاحب آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے۔

چندر رانی: وہ گلناز کو لینے تھا برن کالج گئے ہیں۔ کالج میں چھٹیاں ہیں۔ آج وہ یہیں رہیں گی۔ مسٹر شبیر ہم لوگوں سے ایک سخت غلطی ہوئی جس کا خمیازہ بھی ہم ہی کو بھگتنا ہو گا۔ آپ کو ایک پختہ دماغ سمجھدار شریف طبیعت معزز جنٹلمین سمجھ کر ایک عالی خاندان اعلیٰ

تعلیم یافتہ صاحبِ جائیداد حسین لڑکی رفاقت کے لئے تجویز کیا اور نہ صرف تجویز کیا بلکہ جانبین کو آپس میں ملوا دیا۔ آج اس بات کو چار ماہ کا عرصہ گذر چکا ہے کہ وہ آپ سے نام زد ہے اور آپ سے کئی ملاقاتیں کرائی جا چکی ہیں لیکن افسوس صد افسوس آپ کی اس قابلِ نفرین لغزش کے باعث آپ کے محسن بزرگ اور عزیز دوست پر تو جو کچھ گذرے گی، وہ گذرے ہی گی۔ مجھ کو خواہ مخواہ گلناز کے آگے سخت شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ خیر مجھے تو صرف شرمندگی ہی ہوگی۔ اُس معصوم دل لڑکی کو نا قابلِ برداشت صدمہ بھی ہوگا کیوں کہ آپ کو اپنا بننے والا شوہر سمجھ کر وہ کئی بار مل چکی ہے جو ایک شریف لڑکی کے لئے بہت بڑی بات ہے کاش مٹ جاتی وہ گھڑی جب میں نے یہ تجویز کی۔

چندر رانی کی حقارت آمیز تقریر مسٹر شبیر نے دھڑکتے دل اور پرنم آنکھوں سے سنی اور اپنی جگہ سے اُٹھے اور دست بستہ زمین پر رانی کے قدموں میں بیٹھ گئے اور عرض کی۔

مسٹر شبیر: میری اچھی محسنہ میری مخدومہ جو کچھ آپ نے فرمایا۔ اس سیاہ بخت گنہگار کے حق میں سب بجا ہے اگر دنیا میں کوئی ایسا بد نصیب مجرم بھی ہے کہ جو اپنی بریت میں زبان بھی نہ ہلا سکے تو وہ میں ہوں۔ آہ مٹ گیا ہوتا۔ وہ روزِ بد جب کہ اِس پُر امن گھرانے میں میں نے قدم رکھا اور سب کی.......... اذیّت کا باعث ہوا........ اب سوا اِس کے چارہ نہیں کہ میں کہیں ڈوب مروں مگر میری معزز رانی صاحب میں خدا کو حاضر وناظر سمجھ کر عرض کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں ..... بڑی حد تک میں بے قصور ہوں۔ آپ یقین نہ کریں گی اور کوئی بھی نہیں کرسکتا مگر خدا علیم ہے کہ اوّل روز سے آج تک جس قدر میرے امکان میں تھا۔ سمجھا چکا ہوں لیکن ذرا اثر نہیں ہوتا بلکہ میری علیحدگی ونصیحت انہیں خودکشی پر آمادہ کرتی ہے۔ کسی سے میری شادی تو کیا۔ اُس کا خیال بھی اُسے دیوانہ بنا دیتا ہے آہ! میں بے طرح گرفتار کیا گیا ہوں۔ دین و دنیا سے کھو دیا گیا ہوں ورنہ آپ خیال کرسکتی ہیں کہ قابلِ قدر نعمت گلناز ایسی فرشتہ خصلت لڑکی کا میں قدر دان نہیں لیکن کیا کیا جائے جب گلناز کے نام سے جان پر بن جاتی ہے۔ اب آپ ہی فرمایئے میں کس طرح ایک خون اپنے سر لے لوں؟ رانی صاحب میں تو سخت مصیبت میں مبتلا ہوں اور زندگی سے بیزار ہو رہا ہوں۔

یہ سلسلہ کلام یہیں تک پہنچنے پایا تھا کہ مسٹر ہریش چندر کی فٹن کی گھڑگھڑاہٹ سن کر شبیر کھڑے ہوگئے تو وہ اور رانی چندر گاڑی تک جاکر ان دونوں کو اتروا کر لائے۔ کچھ دیر چاروں یہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا اور نتھری ہوئی چاند کی چاندنی پھیل رہی تھی۔ اپنی رانی کا ہاتھ ہاتھ میں لئے ہریش چندر اٹھے اور بارہ دری کی دوسری طرف جاکر گلگشت کرنے لگے۔ یہاں گلناز تو بنچ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور شبیر صاحب قریب ہی ٹہل رہے تھے۔ پھر ایک خوش رنگ گلاب کا پھول توڑ کر گلناز کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

مسٹر شبیر: میں اپنے سچے گل گلاب کی افزائش حسن کو یہ پھول پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں اور اپنی ٹائی پن نکال کر وہ پھول گلناز کے سر پر لگادیا۔

گلناز: (شرماتے ہوئے) اِس عنایت کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

مسٹر شبیر: اونہہ۔ اس کا کیا شکریہ۔ وہ کسی قابل بھی ہے۔ میرا پھول اس سے کہیں زیادہ خوش رنگ ہے۔ ہاں آج شب کو آپ یہیں تشریف رکھیں گی؟

گلناز: جی ہاں۔ کالج تو آج کل بند ہے۔ آج صبح بھابی جان نے پرنسپل صاحبہ کو لکھا تھا کہ وہ شملہ جارہی ہیں مجھے آج رات اور کل دن کو یہاں رہنے کی اجازت ملے۔

شبیر صاحب: چندر رانی جی سے سن چکا ہوں کہ آپ پیانو بجانے میں قابلِ تعریف مہارت رکھتی ہیں۔ کیا میں امید کرسکتا ہوں کہ آج شام کچھ سنائیں گی؟

گلناز: بسر و چشم مگر ہم نے بھی کسی کے ستار کا بہت شہرہ سنا ہے۔

شبیر صاحب: بدل و جاں

اتنے میں ہریش چندر آگئے اور انہیں اپنی اس تجویز کی اطلاع دی کہ گرمی کی وجہ سے ابھی گھر جانے کو طبیعت نہیں چاہتی یہیں کھانا منگوالیا گیا ہے۔ دیکھو کیسی اچھی اور ہلکی ہلکی چاندنی کھلی ہوئی ہے آپ کی بھابی پیچھے کی طرف نشست کا انتظام کرارہی ہیں اور اس وقت تک کی ٹھنڈک کا جب ہی لطف حاصل ہوگا کہ کوئی دلچسپ شغل بھی ہو۔ چنانچہ چھوٹا ہارمونیم اور ستار بھی منگوا بھیجا ہے۔ بہن گلناز کو ستار سنوایا جائے گا۔

ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ وہیں لے گئے۔ جہاں چندر رانی گھر سے قالین منگوا کر فرش بچھوا چکی تھیں۔ آیا کھانا چن رہی تھی۔ چاروں نے مل کر نہایت خوشی سے کھانا

کھایا اور پان تقسیم ہوئے۔

ہریش چندر: (ستار کی طرف اشارہ کرکے) لیجئے۔ جناب یہ حاضر ہے اور ہم ہمہ تن گوش۔

شبیر صاحب: بہت بہتر مگر بسم اللہ کسی اور کو کرنی چاہئے۔

ہریش چندر: رانی چندر سن رہی ہو۔ کردیجئے بسم اللہ۔

چندر رانی: اس وقت کچھ طبیعت نہیں چاہتی۔

ہریش چندر: اچھا مسٹر شبیر آپ ہی شروع کیجئے۔ ہم اپنی بہن سے شروع کرادیتے مگر وہ ستار نہیں جانتی ہیں۔ اُن کو تو پیانو پر کمال حاصل ہے اور وہ یہاں آ نہیں سکتا۔

چندر رانی: بہن گلناز ہارمونیم بھی خاصہ بجالیتی ہیں۔

ہریش چندر: مگر پہلے یہ ستار تو سنادیں۔

شبیر صاحب: (ستار اُٹھا کر)

قصۂ درد کہوں شوق کا افسانہ کہوں
دل ہو قابو میں تو اُس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں
خود ہے اقرار جنہیں اپنی ستم گاری کا
پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں
آپ بیٹھیں تو سہی آکے میرے پاس کبھی
کہ میں فرصت میں حدیثِ دلِ دیوانہ کہوں

ہریش چندر: (آہستہ سے) ضرور ضرور موقعہ ہے کہہ ڈالنے کا۔

مسٹر شبیر: (ستار رکھ کر) لیجئے میں تو فرض ادا کرچکا۔

ہریش چندر: (ہارمونیم اپنے سامنے کھینچ کر) لایئے ہم بھی اپنا فرض ادا کردیں۔

عشق میں صبر وسکوں اے دلِ ناکام کہاں
اُس دلِ آرام کی خواہش ہے تو آرام کہاں
پند ناصح وہ سنے خوفِ ملامت ہو جسے

پاسِ ناموس کہاں عاشقِ بدنام کہاں
ترکِ آداب کا عشاق سے بیجا ہے گلا
جب نہ ہو موردِ الزام تو الزام کہاں
حسرت زار ہے اور کشمکشِ یاس و امید
اب وہ بالیدگی شوق کا ہنگام کہاں

مسٹر شبیر: (ہریش چندر کے قریب ہو کر) ستار تو سنوا چکے۔ اب ہارمونیم بھی سنوا دیجئے۔

ہریش چندر: (گلناز کو ہارمونیم دیتے ہوئے) یہ لیجئے۔ آپ بھی کچھ تکلیف کریں۔

گلناز: بھائی جان مجھ کو تعمیل حکم سے انکار نہیں لیکن آپ جانتے ہیں۔ میں نے ہارمونیم ابھی سیکھنا شروع کیا ہے۔ زیادہ پریکٹس نہیں۔

ہریش چندر: آپ لوگوں کا نہ جاننا بھی ہمارے جاننے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ آپ جانتی ہیں رانی چندر نے تھوڑے ہی عرصے سے ہارمونیم شروع کیا ہے مگر کیسا اچھا بجا لیتی ہیں۔

مسٹر شبیر: اصل تو یہ ہے کہ ہم لوگ اِس فن میں خواہ کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں۔ موٹی موٹی انگلیوں اور پھٹے ہوئے گلے سے وہ سحر کاری نہیں کر سکتے جو اس صنف نازک کا حصہ ہے۔

ہریش چندر: (ہنس کر) بے شک ان باریک تاروں کو چھیڑ کر ایک عالم کو زیر و زبر کرنے کے لئے کچھ دستِ نازک ہی موزوں ہیں۔

مسٹر شبیر: ہماری رائے میں موسیقی و جنس لطیف ایک ہی چیز ہے سخت کرخت مرد کا اس میں حصہ لینا بیجا مداخلت ہے۔

ہریش چندر: ہاں بہن گلناز کچھ تھوڑا سا۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کریں کہ ابھی سیکھ رہی ہیں۔ ہم سے اب بھی بہتر ہیں۔

گلناز: (نہایت شرمگیں ادا سے ہارمونیم لے کر) ۔

میں ہوں تصویرِ غم، حسرت بھری ہے داستاں میری
کلیجہ چھیدتی ہے تیر بن بن کر فغاں میری

ہریش چندر: آہ! درست کہہ رہی ہے۔

گلناز:

قفس میں "ہائے گل" کہہ کر جوائے صیاد میں تڑپوں
سمجھ لینا چلی ہے روح سوئے بوستاں میری
سناؤں گلشنِ عالم میں کس کو داستاں غم کی
نہ بلبل ہم نوا میری نہ قمری ہم زباں میری
وفورِ اشک میں آنکھوں سے اِک طوفانِ غم اٹھا
چلی منجدھار میں اب کشتیِ عمرِ رواں میری

چندر رانی: (آہِ سرد بھر کر) بیشک درست ہے۔

گلناز:

تمناؤں کا دل میں خون ہے اور دل کا آنکھوں میں
بیاں کن سرخیوں سے ہو رہی ہے داستاں میری
نہ دل قابو میں ہے میرا نہ بس میں ہے زباں میری
معاف اے ضبط اب معذور ہے تابِ بیاں میری

یہ شعر ختم کر کے گلناز نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے سر جھکا لیا۔ ان کی اِس دردناک غزل کا سامعین پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ سب کے دل بھر آئے۔ ہریش چندر تو یہاں سے دور جا کر ایک متاثرانہ حالت میں ٹہلنے لگے اور رانی چندر نے گلناز کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور مسٹر شبیر تو اس قدر متاثر ہوئے کہ ضبط نہ کر سکے اور ان کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک یہاں یہی کیفیت طاری رہی۔ پھر گاڑی کا حکم دینے کو رانی چندر بھی دوسری طرف چلی گئیں تو شبیر گلناز کے قریب ہو بیٹھے اور اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگے۔

مسٹر شبیر: آہ! گلناز اس وقت تو آپ نے اپنے کشتۂ محبت کو مار ہی ڈالا مگر

اُس صدمہ سے جو اِس وقت میرے دل کو پہنچا۔ یہ رنج زیادہ ہے کہ آپ خود بھی بے حد متاثر ہو رہی ہیں مگر آپ کو اس قدر رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔ دنیا میں انسان کو بڑے بڑے مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ میری گلناز میں اگر آپ کے تفکرات کے کم کرنے میں مدد کر سکوں اور میری جان بھی کام آئے تو دریغ نہیں۔

گلناز: میرے سچے محسن میں آپ کی مہربانی و ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ میری جائیداد کے متعلق جس قدر آپ نے تکلیف اُٹھائی اور امداد کی۔ اِس کا اجر خدا دے گا میں بدنصیب تو شکریہ کے قابل بھی نہیں۔

مسٹر شبیر: آپ یہ غیریت کے فقرے کہہ کر مجھے کیوں شرمندہ کر کے رنج دیتی ہیں۔ میں نہ آپ کے شکریہ کا مستحق ہوں اور نہ اِس کی ضرورت۔ ہاں آپ اجر کی جو دعائیں دیتی ہیں اُسے خدا قبول کرے۔ اس صورت میں کہ مجھ بلبلِ ناشاد کو گل سے ملادے۔ یہ اجر خدا دے۔

گلناز: (متبسم ہو کر) آپ تو شاعری فرمانے لگے۔

مسٹر شبیر: شاعری نہیں۔ آرزوئے دلی ہے۔ دعا کیجئے۔ خدا مجھے آپ کی خدمت نصیب کرے۔

گلناز: (خاصدان سے ایک بیڑا اٹھا کر) یہ لیجئے۔ آپ پان کھائیے بہت دیر ہوئی۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر شبیر نے اِن ہی کے ہاتھ سے بیڑا منہ میں لے لیا اور گلناز اِن کی اس حرکت سے شرما گئیں۔

مسٹر شبیر: (مسکراتے ہوئے)۔

گل رُخ نے اپنے ہاتھ سے بیڑا کھلا دیا
وہ خوش رہے سدا کہ مجھے سرخرو کیا

گلناز: بس شاعری رہنے دیجئے۔ مجھ میں تو سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں۔ اب چل کر دیکھئے اگر فٹن تیار ہو گئی ہے تو ہمیں بھی چلنا چاہئے۔

مسٹر شبیر: اب چلنا محال ہے۔ یہ مقام ایسا ٹھنڈا وقت اور گل و بلبل کی یکجائی

پھر کب میسر ہوگی۔

یہ شب جو اسی طرح گذر جائے تو اچھا!

گلناز: اچھا آپ یہیں آرام کیجئے۔ میں تو جاتی ہوں۔ بھائی بھابی منتظر ہوں گے۔

مسٹر شبیر: آپ بھی کس قدر بھولی ہیں۔ وہ منتظر ہوں گے یا ہمیں یہاں دیر لگنے سے خوش۔ یہ پرفضا وقت اور صحنِ چمن چاندنی رات ان کا یہاں سے اٹھنے کو دل چاہتا ہوگا؟

گلناز: (کھڑی ہوکر) خیر اُن کا جی نہ چاہے، مجھے تو کوٹھی جانا چاہئے۔

اِن کے اٹھتے ہی شبیر صاحب بھی کھڑے ہوگئے اور کہا۔ آپ کو تو بہت ہی جلدی ہے۔ آہ! گلناز خدا جانے۔ اب جلدی مل سکیں گے کہ نہیں۔ خواہ مخواہ بھائی بھاوج کا خیال کرتی ہو۔ انہیں اس وقت یہاں سے جانا ہی ناگوار ہوگا۔ بھلا کمروں میں ایسی ٹھنڈ کہاں۔ اچھا بتائیے! آپ بھی اس باغ کی آج کی قابلِ قدر ملاقات کی کوئی یادگار پاس رکھنا چاہتی ہیں۔

گلناز: (اپنے سر کے پھول کی طرف اشارہ کرکے) اس سے زیادہ قیمتی یادگار کیا ہوگی؟

مسٹر شبیر: (گلناز کی زلف کو چھو کر) اِس سے زیادہ قدر تو اُس کی کرنی چاہئے جو میرے پہلو سے نکل کر اِس میں اُلجھ گیا ہے مگر اِس کا عوض آج کی یادگار میں مجھے بھی تو کچھ ملنا چاہئے۔

گلناز: آپ کو تو تمام شاعری آج ہی ختم کرنی ہے۔ ہمیں دیر ہوتی ہے۔

مسٹر شبیر: ہائے اللہ! میرے کل جذباتِ دل اور سچے الفاظ کو شاعری پر محمول کیا جارہا ہے۔ (گلناز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) ہم نہیں جانے دیں گے جب تک اِن دونوں چیزوں کا بدلہ نہ لے لیں گے۔

گلناز: آپ تو بہت سنجیدہ معلوم ہوا کرتے تھے۔ آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھ کو تو کچھ شبہ ہوتا ہے۔

مسٹر شبیر: کھانا تو آپ کے ساتھ ہی کھایا ہے۔ پھر شبہ کیسا؟
گلناز: مگر حالت تو کچھ اور ہے۔
مسٹر شبیر: اس کی وجہ یہ ہے ع

بے ہوش کردیا ئے الفت نے آپ کی

گلناز: بس بیرسٹر صاحب اب چلنا چاہیئے۔
مسٹر شبیر: عرض تو کر چکا ہوں کہ اپنے ناچیز نذرانہ کا بدل لئے بغیر نہ ٹلوں گا۔
گلناز: اس وقت میرے پاس کیا رکھا ہے۔
مسٹر شبیر: آپ کے پاس سب کچھ رکھا ہے۔ کہتے نہیں کہ بچہ کا بہلانا اور منگتے فقیر کا ٹالنا کیا مشکل ہے۔
گلناز: (سادگی سے) اچھا بتایئے! میں کیا دے دوں؟ میرے ساتھ تو اس وقت کوئی اچھا سا رومال بھی نہیں۔ آپ ضد نہ کریں۔ میں کالج سے بھیج دوں گی۔

گلناز کے سینہ پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھولوں کا ہلال بنا ٹنک رہا تھا۔ انہوں نے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

مسٹر شبیر: کیا یہ عنایت کرسکتی ہیں؟ گل کی طرف سے گلشن کی یادگار میں کچھ پھول ہی مناسب ہیں۔
گلناز: (اپنے سینہ سے پھول علیحدہ کر کے) لیجئے مگر یہ تو مرجھا چکے ہیں۔
مسٹر شبیر: "ان کمھلائے ہوئے پھولوں کی مہک بھی میری روح کی تازگی کا باعث ہوگی مگر آتی مہربانی اور ہو کہ............" اور خاموش ہو گئے۔ وہ پھول دے رہی تھیں مگر یہ لینے کو ہاتھ نہ بڑھاتے تھے۔ اِن کی اِس نئی شرافت اور پاسِ ادب سے گلناز بہت خوش ہوئیں اور نظر نیچی کئے ہوئے ذرا آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے اِن کے کوٹ کے فلاور ہول میں لگا دیا۔ جس کے شکریہ میں اِن سے کچھ الفاظ نہ بن پڑے اور گلناز کے سامنے سر جھکا دیا۔
گلناز: میرے اچھے بیرسٹر صاحب! اب یہاں سے چلو۔
مسٹر شبیر: (شیک ہینڈ کے لئے ہاتھ بڑھا کر) بہت اچھا۔ آپ ذرا یہیں

ٹھہریں۔ میں گاڑی وغیرہ دیکھ لوں۔ تو چلنا۔

یہ کہہ کر سیدھے فٹن کی طرف گئے۔ دیکھا کہ گھوڑے جتے ہوئے تیار کھڑے ہیں۔ سائیس گھاس پر پڑے سو رہے ہیں اور کوچبین اونگھ رہا ہے۔ انہوں نے پہلے گاڑی کی گھنٹی زور سے بجائی اور پھر یہ کہتے ہوئے اُس طرف چلے جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔

ارے بھئی کیا سو گئے۔ ایک بج چکا ہے۔ آیا خدمت گار وغیرہ سب چلے گئے۔ سائیس پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ غریب گھوڑے کس جرم کی پاداش میں جکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ گلناز سخت پریشان ہیں۔

چندر رانی: (بنچ سے کھڑی ہو کر) میں نے فٹن تیار کرائی تھی مگر اِن کی آنکھ لگ گئی تو مجبور رہ گئی۔ اب اِن کو اٹھا لو تو چلو۔

ہریش چندر وہیں بنچ کے تکیہ کے سہارے پاؤں لٹکائے سو رہے تھے۔ شبیر صاحب نے قریب ہو کر جگایا تو گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔

ہریش چندر: کیا زیادہ رات آ گئی؟ بھائی ٹھنڈی ہوا پا کر میں بے ہوش ہو گیا۔ اب وہی کمرہ اور گرم ہوا ہو گی۔

مسٹر شبیر: ابھی کچھ زیادہ رات تو نہیں آئی۔ صرف ایک بجا ہے۔

ہریش چندر: او ہو ایک بج گیا۔ چندر رانی آپ نے مجھے کیوں سونے دیا۔

چندر رانی: گاڑی تو مدت سے تیار کھڑی ہے۔ آپ کی تکلیف کے خیال سے جگانے کو جی نہ چاہا۔ اے ہے میری گلناز اکیلی ہو گی۔ چلئے اب سوار ہوں۔

یہ دونوں تو فٹن کے پاس گئے۔ چندر رانی انہیں لینے ادھر آئیں مگر اُن کو وہاں نہ پایا تو پھر گاڑی کے پاس آئیں اور اِن دونوں کو بتایا یہ سن کر کوچبین نے کہا۔

حضور وہ آیا کے ساتھ کوٹھی تشریف لے گئی ہیں۔

یہ سن کر تینوں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ گلناز و سوشیلا بائی لان پر ٹہل رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر چندر رانی تو یہاں ٹھہر گئیں اور وہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

چندر رانی: (گلناز سے) او ہو آپ پیدل ہی چلی آئیں؟

گلناز: جی اور کیا کرتی۔ آپ تو خدا جانے سو رہیں یا کہیں چلی گئی تھیں۔ میں تنہا بیٹھے بیٹھے پریشان ہو گئی۔ وہ تو یہ اچھا ہوا کہ آیا سامان وغیرہ لینے پہنچ گئی جو میں آسکی۔ یہاں ابھی سسٹر سوشیلا جی ٹہل رہی تھیں۔ میں بھی رُک گئی۔

چندر رانی: (مسکرا کر) بہن جی معاف کرو۔ بے شک غلطی ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اچھی ٹھنڈک مل جانے سے آپ کے بھائی جان سو گئے۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ نیند آرہی ہے۔ آپ بھی آرام کریں۔ (اور چلی گئیں)

سوشیلا جی: ہاں تو پھر اکیلی بیٹھی رہیں۔ بہت پریشان ہوئی ہوں گی؟

گلناز: کچھ زیادہ دیر تو نہیں۔ ۱۲ بجے تک تو باجے ہی بجتے رہے اس کے بعد یہ لوگ علیحدہ ہو گئے تھے۔

سوشیلا: اور شبیر صاحب وہ تو آپ کے ساتھ ہوں گے۔

گلناز: (شرم آلود لہجے میں) ہاں تھوڑی دیر وہ میرے پاس بیٹھے رہے مگر پھر میں انہیں چھوڑ کر چلی آئی۔

سوشیلا: مس گلناز ہم نے سنا ہے کہ آپ کے مذہب کی رو سے کسی عورت کو غیر مرد کے سامنے ہونے کی اجازت نہیں ہے کیا یہ واقعہ ہے اور آپ کیا اِن صحبتوں میں صرف اس لئے شریک ہوتی ہیں کہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے میری طرح آپ بھی مذہب کو ایک لغو اور جاہلوں کے دل بہلانے کا سامان خیال کرتی ہیں۔

گلناز: نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ تعلیم نے تو میرے نزدیک مذہب کی اہمیت اور بڑھادی ہے اور دین کے معاملہ میں اور بھی کٹر ہو گئی ہوں۔ باقی پردہ تو اسلام نے اپنی پیرو خواتین کو اِس قسم کے جنگلی پردہ کا کوئی حکم نہیں دیا ہے جو آج کل عام طور پر ہندوستان میں نظر آرہا ہے۔ قرآن شریف میں جو خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے کہ عورتیں زندگی بھر کے لیے گھر کی چار دیواری میں قید کر دی جائیں بلکہ اسلامی پردہ صرف اُس کا نام ہے کہ غیر لوگوں کے سامنے چہرہ، ہتھیلی اور پیروں کے سوا پورا جسم ڈھکا رہے اور اسلام کی بیٹیوں میں یورپ کی طرح عریانی کا مرض نہ سرایت کرے۔

سوشیلا: مگر یہ جو سڑکوں پر سر سے پیر تک برقعوں میں لپٹی ہوئی عورتیں نظر آتی

ہیں۔ یہ مسلمان ہی تو ہیں۔

گلناز: ہاں کہنے کو تو مسلمان ہی ہیں مگر اُن کی ہر حرکت کا نام اسلام تو نہیں ہو سکتا۔ یوں تو آج کل قوانینِ اسلام کا ہر ہر جملہ خوابِ پریشان بن کر رہ گیا ہے مگر ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ پردہ کے جتنے معانی اور مفہوم وضع کیے گئے، اُن کی گنتی کے لئے ایک ڈکشنری کی ضرورت ہے۔

سوشیلا: اوہو۔ آپ تو پردہ کی مخالفت میں مس میو سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔

گلناز: جی نہیں۔ پردہ کی مخالفت میں نہ کہیے بلکہ مروجہ پردہ کی مخالفت میں فرمایئے۔ اچھا یہ مس میو کون ہیں۔

سوشیلا: مس میو ایک امریکن خاتون ہیں جو ہندوستان کی سیاحت اور یہاں کی معاشرت کے مطالعہ کے لئے تشریف لائی ہیں اور آج کل یہیں ہماری کوٹھی میں مقیم ہیں۔ آفرین ہے اُن کی ہمت اور تلاش پر۔ ہندوستانی معاشرت اور ہندو سوسائٹی کے متعلق ایسے ایسے واقعات جمع کیے ہیں کہ آدمی پڑھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ انہوں نے شبیر صاحب کو اپنے مسودات پڑھنے کے لئے دیئے تھے۔ بعض بعض مقامات سے انہیں میں نے بھی پڑھا ہے۔ خصوصاً سرحد کا ایک واقعہ پڑھ کر میرے دل سے ہندو سوسائٹی کی رہی سہی عزت بھی نکل گئی۔

گلناز: مجھے بھی تو سنایئے کہ واقعہ کیا تھا۔

سوشیلا: اچھا وہ پھر سناؤں گی۔ تم پردہ کے متعلق کیا کہہ رہی تھیں۔ ہیں یہ کہ لوگوں نے اس کے بیسیوں معنی خود گھڑے ہیں۔ ورنہ اسلام میں پردہ کوئی چیز نہیں۔

گلناز: جی نہیں میں یہ نہیں کہتی کہ اسلام میں پردہ کوئی چیز نہیں بلکہ یہ کہتی ہوں کہ اسلامی پردہ میں چہرہ اور ہاتھ پیر چھپانا داخل نہیں ہے۔ علاوہ بریں پردہ کا جو مقصد ہے۔ اُس میں مرد اور عورت دونوں کو شریک کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں عورتوں کو منہ چھپانے پر زور دینے کی بجائے آنکھیں نیچی رکھنے اور اپنے اوپر شرم و حیا کی کیفیت طاری رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اور اُن کے ساتھ ہی بلکہ اُن سے پہلے مردوں کو بھی اسی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے مگر آج اِن باتوں کا کس کو خیال ہے۔ اب تو سارا زور اس پر ہے کہ عورتیں

گھر کی چار دیواری میں بند رہیں یا باہر نکلیں تو سر سے پیر تک کفن نما لفافے میں لپٹی لپٹائی۔ اس کی وجہ سے صحت خواہ کتنی ہی برباد ہو اور اخلاق چاہے کتنے ہی خراب ہوں۔ شریعت کے حکم کے مطابق منہ کھول کر چلنا پھرنا اور کھلی ہوا میں سانس لینا اس جنگی پردہ کے حامیوں کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

سوشیلا: خوب۔ تم تو خاص لکچرار بھی ہو۔ اچھا ذرا پردہ کے موجودہ معانی کی جس ڈکشنری کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ اِن میں سے چند مجھے بھی تو سناؤ۔

گلناز: مجھے سب تو یاد نہیں مگر جو یاد رہ گئے ہیں سناتی ہوں۔

پردے کے معنی ہیں عورتوں کا مردوں سے چھپنا اور چھپ کر بیٹھ رہنا۔ پردے کے معنی ہیں اپنے گھر کی چار دیواری کا پورا پورا استعمال۔ پردے کے معنی ہیں چھپ چھپ کے دیکھنا اور دیکھ دیکھ کر چھپنا۔ پردے کے معنی ہیں عورت کا گھر میں بیٹھ کر مرد کا انتظار کرنا اور کئے جانا اور جب وہ آئے تو اُس کی تعریف کرنے یا اُس سے خوف کھا جانے کو اپنا سب سے بڑا فرض جاننا۔ پردے کے معنی ہیں ایک ایسی خلوت جس میں شوہر اور بیوی کا زبردستی ایک دوسرے سے واسطہ پڑے اور جس میں اُن کی خوبیوں کے سوا باقی سب قوتوں پر روشنی پڑے اور جہاں وہ مزے سے بلا شرکت غیرے اور بے مداخلت ایک دوسرے سے جی کھول کر لڑ سکیں اور لڑتے رہیں۔ پردے کے معنی ہیں گرمیوں کی تپتی دھوپ، سردیوں کے کڑکڑاتے جاڑے اور برسات کی موسلا دھار بارش اور آندھیوں کی آنکھیں اور گلا خراب کر دینے والی گرد سے بچاؤ کا فائدہ خاص عورت کی ذات کو پہنچنا۔ پردے کے معنی ہیں عورت کی ایک قابلِ تعریف کوشش کہ وہ خدا کی نقل اتارے (خود چھپ کے بیٹھ رہے) اور اپنی قدرتوں کو صرف انسان کے ذریعہ سے دنیا پر ظاہر کرے۔ پردے کے معنی ہیں ایک نیم زندہ ہستی کا ایک جیتا جاگتا کفن پہن کر تھوڑی دیر کے لئے منظرِ عام پر آنا۔ پردے کے معنی ہیں اپنی گلی بازار یا گاؤں یا شہر یا اپنی برادری یا جان پہچان کے لوگوں کو اپنا آپ دکھانے کے قابل نہ سمجھ کر اِن سے حجاب کرنا اور باقی ساری دنیا کو معزز سمجھ کر اُن کے آگے ظاہر ہوتے رہنا۔ پردے کے معنی ہیں میدانوں میں شریعت پر عمل کرنا اور پہاڑوں پر اُسے غیر ضروری خیال کرنا۔ پردے کے معنی ہیں ہر پردہ پسند مرد کا اپنی نیکی اور دوسرے کی برائی کا

اشتہار خاموشی کی زبان میں اپنی کاتبہ کے ہاتھوں لکھوا کر خدا کی راہ میں تقسیم کرنا۔ پردے کے معنی ہیں برٹش گورنمنٹ کو طعنہ دینا کہ تم نے ابھی ملک میں پورا امن وامان قائم نہیں کیا۔

یہ ہیں پردے کے چند معانی جو ایک سو ایک معانی میں سے مجھے اِس وقت یاد ہیں۔

سوشیلا: گلناز تم تو بڑی لسان ہو اور پردہ کے خوب خوب معنی وضع کر رکھے ہیں۔

گلناز: بہن! پردے میں ایک دو خرابیاں ہوں تو بیان کی جائیں۔ اِس میں تو برائی ہی برائی ہے۔ ہندو دھرم کے متعلق تو مجھے تفصیلی علم نہیں کہ اِس میں پردے کی کیا حیثیت ہے مگر جہاں تک اسلام کے متعلق جانتی ہوں۔ قرآن پاک میں کہیں اِس کی صراحت نہیں ہے کہ اپنے منہ کو چھپائے رکھو یا چھپکلی کی طرح گھر کی چار دیواری سے چمٹی رہو اگر ایسا ہوتا تو عربی تمدن کے عروج کے زمانے میں مجمع عام میں تقریریں کرنے والی اور لڑائیوں میں نیزہ سنبھالنے والی عورتوں کا ذکر تاریخ میں ملحوظ نہ ہوتا۔ اصلیت یہ ہے کہ ہندوستانی پردہ ہندوستان کی ہی پیداوار ہے جو یہاں کے عجیب وغریب حالات میں پیدا ہوا اور جسے اب دنیا کے نئے حالات بدلنے اور توڑنے پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔

پردہ اس وقت ضروری تھا جب ملک میں افراتفری تھی۔ جب آئے دن یہاں ایک ہلڑ مچا رہتا تھا۔ جب سوسائٹی میں لوگوں کو اس قدر فراغت حاصل تھی کہ وہ صرف اپنے حیوانی جذبات میں مصروف رہتے تھے مگر اب حالات بدل گئے ہیں اور آج ہزاروں مصروفیتیں نکل آئی ہیں۔ آج سوائے نکمے آدمیوں کے کوئی مرد عورت کو دیکھ کر یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ ایک عورت ہے اور میں ایک مرد بلکہ اُسے دنیا کے اور لاکھوں کاموں سے واسطہ پڑتا ہے اور نری دل لگی کے لئے وقت نہیں ملتا۔

سوشیلا: میں مذہب سے تو واقف نہیں ہوں مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ پردہ ایک قطعی غیر فطری دستور ہے۔ فطرت کا مدعا ہے کہ مرد عورت دونوں باہر پھریں۔ انسان کے سوا اور کوئی حیوان نہیں جس نے اپنی مادہ کو پردے کی مصیبت میں پھنسا رکھا ہو۔

گلناز: بے شک مادہ اکثر بچے جننے اور پالنے میں مصروف رہتی ہے لیکن

جب کبھی اُسے اِن باتوں سے فرصت ملتی ہے تو وہ بھی جنگل میں یا کھیتوں میں ہوا اور روشنی سے لطف اُٹھانے کے لئے باہر نکلتی ہے۔

سوشیلا: مگر ہندوستان میں یہ بیماری آخر سرایت کیسے کر گئی۔

گلناز: بہن جی ابتداً جس وقت اِس کا دستور ہوا تھا تو یہ بیماری نہ تھی بلکہ یہ اُس وقت کی بیماری کا بہترین علاج تھا۔ اِس کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ جنگ و جدل کے وقت نوعِ انسان کے کمزور حصّہ کی حفاظت کی جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے زمانہ میں پردے کے دستور نے انسانیت کی نہایت مفید خدمت انجام دی لیکن ہر اچھی چیز کا ایک وقت اور ایک مناسب موقع ہوتا ہے۔ وقت کٹ جانے اور موقع گذر جانے پر مفید چیز بھی بے فائدہ بلکہ بسا اوقات نہایت ضرر رساں ہو جاتی ہے۔ آپ نے اپنے صوبہ کے ہیلتھ افسر کی نئی رپورٹ تو پڑھی ہوگی۔ دیکھئے یو پی میں ۵۶ فی صدی عورتوں کے مرنے کی اِس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہاں پردہ کا دستور بہت زیادہ ہے۔ اس تعداد میں ۴۰ فیصدی مسلمان عورتوں کی موت ہے۔ جن میں سے ۲۷ فیصدی مسلمان عورتیں دق و سل سے مرتی ہیں۔ ہیلتھ افسر نے بھی اپنی تحقیقات کی بنا پر یہی لکھا ہے کہ عورتوں کی تعداد اموات کی زیادتی کی وجہ صرف پردہ کا دستور ہے۔

پردہ دراصل ایک عارضی بیماری کا عارضی علاج تھا لیکن مریض اچھا ہو جانے پر بھی دوا کے استعمال پر اصرار کرے تو اس کا سوائے اِس کے اور کچھ علاج نہیں کہ اُس کے دماغ کا علاج شروع کیا جائے۔

سوشیلا: اچھا تو آپ شبیر صاحب سے اِس لئے ملتی ہیں کہ اُن کے مذہبی دماغ کا علاج کریں۔

گلناز: (جھینپ کر) آپ پھر اپنے موضوع پر آ گئیں۔ وہ اگر مذہبی جذبہ رکھتے ہیں تو اُن کا جذبہ قابلِ احترام ہے۔ میں تو خود نہیں آئی تھی بلکہ بھائی جی بلانے گئے تھے اور انہیں نے پرنسپل صاحبہ سے آج رات کی رخصت لے لی ہے۔ اوہو اب بہت دیر ہو چکی۔ اب سونے چلنا چاہئے۔ ہاں مگر آپ نے وہ مس میو والی کہانی تو سنائی ہی نہیں۔

سوشیلا: اب رات بہت گذر چکی ہے۔ پھر کبھی سن لینا۔ اچھا گلناز یہ تو بتاؤ۔

تمہاری شادی کیوں رک گئی۔ پچھلے دنوں تو بہت گرم خبر تھی؟

گلناز: آپ کی بھی تو رُک گئی۔ وقت آئے گا تو ہو جائے گی۔

سوشیلا: میں نے خود روکی ہے۔ ابھی ذرا آزاد رہنا چاہتی ہوں۔

گلناز: میری یوں رُکی کہ جائیداد کا جھگڑا پڑ رہا ہے۔

☆

بارھواں باب

سر مکرجی: چندر رانی جی وہ خود سر لڑکی نرمی سے قابو آنے والی نہیں ہے۔ ہم نے اُسے جس قدر آزادی دی۔ رعایت کی۔ اُس کا نتیجہ بہت بد ملا۔ بس اب یہی تجویز ہے کہ کرسمس پر زبردستی اُس کی شادی کر دی جائے۔

ہریش چندر: کاش یہ زبردستی آپ پہلے کرتے تو ہمیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

چندر رانی: سرکار جی! وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوتیں۔ آپ شادی کس کی کریں گے۔ شادی کے نام سے وہ جان دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

لیڈی مکرجی: دے دے جان، ہمیں اُس کی کچھ پرواہ نہیں۔ ایسی ننگ خاندان کا دنیا سے اُٹھ جانا ہی بہتر ہے۔

سر مکرجی: سر راجندر ناتھ پال کے لڑکے کی شادی میں پرسوں ہمیں مدراس روانہ ہونا ہے۔ تم تقرر تاریخ کی کلکتہ اطلاع دے دو کیوں کہ مجھے باہر ایک ماہ سے زیادہ عرصہ لگ جائے گا۔ اِس لئے کل سامان آپ ہی تینوں کو کرنا ہے۔ تمہاری بھابی جی اور چندر رانی جی ایک ہفتہ میں واپس آجائیں گی۔

چندر رانی: سرکار جی میں آپ کے ہمراہ نہ جاسکوں گی۔ کیوں کہ سوشیلا جی کسی طرح مدراس جانے کو تیار نہیں ہوتیں۔ اُن کو تنہا کیسے چھوڑا جائے۔

سر مکرجی: اچھی بات ہے۔ صرف تمہاری بھابی جی ہو آئیں گی۔

اِس قرارداد کے تیسرے روز لیڈی و سر مکرجی کو مدراس جانا تھا لیکن اُن سے ایک

دن قبل مسٹر شبیر نے اپنے گھر کلکتہ جانے کے لئے تین ہفتہ کی اجازت مانگ لی۔ سوشیلا کو بھی آج بھاوج کے ذریعہ تاریخ شادی کی اطلاع مل گئی۔ ادھر یہ سنا کہ تین ہفتہ کے لئے سیّد شبیر بھی گھر جائیں گے تو وہ گھبرائی ہوئی مسٹر ڈیوڈ کے ہاں پہنچی اور وہیں مسٹر شبیر بھی بلائے گئے اور دونوں مسز ڈیوڈ کے "ڈرائنگ روم" کے دروازے بند کر کے مشورہ کرنے لگے۔

سوشیلا بائی: اِس وقت آپ کا چلا جانا مجھ پر سخت ظلم ہے۔ دیکھتے ہو ماں باپ، بھائی بھاوج سب گھر میرا دشمنِ جان ہو رہے ہیں۔ چھ ہفتہ بعد تاریخ شادی مقرر ہو چکی ہے تو آپ مجھے ہرن چندر کے لئے چھوڑے جاتے ہیں۔

مسٹر شبیر: آخر میں کیا کروں۔ اب جب کہ تمہارے والدین کو بھی سب حال معلوم ہو چکا ہے۔ میں انہیں منہ نہیں دکھا سکتا۔ وہ مدراس تشریف لے جاتے ہیں۔ اِن کی غیر موجودگی میں جب کہ تم بھی اُن کے ساتھ نہیں جاتی ہو۔ میرا یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

سوشیلا بائی: (گلے میں بانہیں ڈال کر) تو میرے پیارے کیوں نہیں مجھے بھی ساتھ لے چلتے۔ اِس صورت میں تمام جھگڑے آج ہی ختم ہو جائیں گے۔

شبیر صاحب: توبہ توبہ اتنا حوصلہ نہ کرو۔ اپنے ذی شان والدین کی عزت کا پاس لازمی ہے۔ اس قدر گھبراتی کیوں ہو۔ میں انشاء اللہ جلدی واپس آجاؤں گا۔

سوشیلا: (روتی ہوئی) میں یہ تین ہفتہ کس طرح گذاروں گی؟ محض آپ کے لئے میں نے شرکت شادی سے قطعی انکار کر دیا اور آپ بھی نہ رہے۔

مسٹر شبیر: ذرا صبر سے کام لو۔ میں جلدی آجاؤں گا؟

سوشیلا: اور جو وہاں آپ کے گھر والوں نے آپ کی شادی ٹھہرا دی نسبت ہو ہی چکی ہے۔

مسٹر شبیر: نہیں میری شادی ابھی دور ہے اور گھر والے کس طرح کر سکتے ہیں لڑکی تو یہیں ہے۔

سوشیلا: پیارے شبیر کل نو بجے آپ روانہ ہو جائیں گے۔ ہائے اُس وقت میں کیا کروں گی؟

مسٹر شبیر: سوشیلا جی! ہمت سے رہو۔

مسز ڈیوڈ نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سوشیلا نے اندر بلا لیا۔

لیڈی ڈاکٹر: چندر محل سے موٹر کار آیا ہے۔ آپ کو بہت جلد بلوایا گیا ہے۔

مسٹر شبیر: خدا خیر کرے۔ جایئے میں بھی کچہری جاتا ہوں۔

سوشیلا: اتنا تو بتاتے جایئے کہ اب آخری ملاقات کب اور کس جگہ کریں گے۔ کیوں کہ اب صرف ایک ہی رات باقی ہے۔

مسٹر شبیر: ابھی سے میں کیا بتا سکتا ہوں۔ گھر چل کر دیکھا جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ کچہری گئے اور سوشیلا بائی موٹر پر چندر محل روانہ ہوئیں۔

مسٹر شبیر کو کلکتہ گئے ایک ہفتہ گزر گیا سوشیلا کی حالت اُن کی جدائی میں دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔ کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا ہے۔ روز و شب کمرے میں پڑی روتی رہتی ہیں۔ اس حالت میں چندر رانی کبھی پیار و محبت میں سمجھاتی کبھی غصہ و خفگی سے دھمکاتی ہیں مگر اُن پر ایک اثر نہیں ہوتا۔ غم و غصہ اور بھوک کی تکلیف اُٹھاتے اُٹھاتے آج اُن کو بخار ہو گیا ہے۔ بھاوج اس وقت بھی پاس بیٹھی ہوئی سر دبا رہی ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر بھی موجود ہیں۔

چندر رانی: مسز ڈیوڈ آپ کا تو ان پر بہت اثر ہے۔ دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے۔ سمجھاتی نہیں ہو اگر بخار ٹھہر گیا تو کیا ہوگا؟

لیڈی ڈاکٹر: آپ نہیں جانتیں میں تو رات دن سمجھاتی رہتی ہوں (ہنسکر) مگر جس پر عشق کا بھوت سوار ہو وہ نہیں سمجھا کرتا۔ رانی جی بات تو بہت بڑی ہے جو ہم زبان سے نکالتے ڈرتے ہیں مگر ان کی جان رکھنی بھی فرض ہے۔ میری تو یہی رائے ہے کہ جب بیرسٹر صاحب بغیر اُن کی زندگی ناممکن ثابت ہو چکی ہے تو پھر کیوں نہیں دونوں کو ملا دیا جاتا۔ گو آپ کے خاندان کے خلاف ہوگا لیکن اس زمانہ میں اختلاف مذاہب کی چنداں پرواہ نہیں کی جاتی یہی دیکھئے کلکتہ کی بیٹو بر ہمو لڑکیاں مسلمانوں عیسائیوں سے شادیاں کر رہی ہیں۔ خدا کے فضل سے آپ کا گھرانہ تو بہت تعلیم یافتہ و آزاد خیال ہے۔

اس یوریشین لیڈی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر چندر رانی کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا اور جھلا کر کہا۔

چندر رانی: مہربانی سے آپ اپنی یہ قابلِ قدر اور قابلِ عمل رائے اپنے مہربان و محسن بزرگوں سرکار جی و سرکار رانی صاحبان سے عرض کرنا ہمیں کیا اختیار ہے۔

سوشیلا: ڈیر مسز ڈیوڈ میں اب خود یہی سوچ رہی ہوں کیوں کہ میں کسی طرح اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور یہ لوگ ایک دوسرے شخص کے حوالے کر رہے ہیں۔ مجھے اب کسی کی کچھ پرواہ نہیں جو دل میں ٹھان لی ہے۔ وہ کر کے رہوں گی اگر میرے ساتھ زیادہ زور و ظلم کیا جائے گا یہ نہ سمجھو کہ خاموشی کے ساتھ زہر کھا کر سب کو خوش کر جاؤں گی بلکہ بذریعہ عدالت اپنے حقوق حاصل کر کے رہوں گی۔ میں ایک آزاد خیال انسان ہوں کسی مذہب سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پس اس حالت میں مجھ پر کسی کو کچھ اختیار نہیں ہے۔ میں سنِ بلوغ کو پہنچ چکی ہوں۔ اپنی بھلائی برائی کی خود تمیز رکھتی ہوں۔ پس اب ہائی کورٹ سے میرا فیصلہ ہوگا۔ سوشیلا کی یہ بے جا گانہ تقریر سن کر چندر رانی کے حیرت سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ فوراً یہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

مسز ڈیوڈ: (آہستہ سے) شاباش میری باہمت دوست ان ظالموں کو اسی طرح دبانا چاہئے۔ بس اب تم وہی کرو جو میں بتا چکی ہوں اور خدا کے واسطے اپنے دل کو سنبھالو یوں بخار آنا اچھا نہیں۔

سوشیلا: مگر مشکل تو یہ ہے کہ ان پر بھی پورا اختیار نہیں اگر آپ کی تجویز انہوں نے منظور نہ کی تو کیا ہوگا؟

لیڈی ڈاکٹر: اوہ یہ کوئی بڑی بات نہیں اس کی بھی ایک تدبیر بتا دوں گی۔ پہلے تم بلا تو لو۔

سوشیلا: تو آپ ہی میری بیماری کا تار دے دیجئے۔ چنانچہ آج ہی مسز ڈیوڈ نے مسٹر شبیر کے نام کلکتہ تار دے دیا کہ "سوشیلا سخت بیمار ہے فوراً پہنچو" اس تار کے تیسرے دن مسٹر شبیر لکھنؤ آ گئے۔ درحقیقت میں سوشیلا کو سخت بیمار پایا مگر ان کے آ جانے سے وہ دن بدن صحت حاصل کر کے ایک ہفتہ میں بالکل تندرست ہو گئی اور ایک دن شام کے وقت جب کہ مسٹر و مسز چندر کہیں سیر کو گئے ہوئے تھے موقعہ پا کر سوشیلا نے مسٹر شبیر سے یہ گفتگو کی۔

سوشیلا: مجھ سے محبت نہ سہی لیکن اگر آپ کو میری زندگی منظور ہے تو میری

تجویز پر عمل کرو۔

مسٹر شبیر: پیاری سوشیلا ذرا تو سوچو اگر ہم نے اس تجویز پر عمل کیا تو ایک قہر ہو جائے گا۔ تمہارے ذی عزت والدین اور بھائی کے لئے قیامت ہو گی۔ تمہاری بوڑھی والدہ ضرور مر جائیں گی اور میں بھی دنیا میں رہنے کے قابل تو نہ رہوں گا۔ ہندو اور مسلمان اس فعل پر لعنت کریں گے اور خدا جانے ہم دونوں کا کیا حشر ہو گا؟

سوشیلا: میں ہزار بار کہہ چکی کہ ان باتوں کی مجھے ذرا پرواہ نہیں انسانی ہمت کے سامنے تمام مشکلات آسان ہیں۔

یہ رسم و رواج کی جھوٹی شرم و عزت جہالت کی پابندیاں ہیں اور جب میں نے مذہب ہی تبدیل کر لیا تو پھر کسی کا کیا زور۔ میری بیسیوں تعلیم یافتہ بنگالی بہنیں برہمو اور کرسچین ہو رہی ہیں۔ میرا مسلمان ہو جانا چنداں معیوب نہ ہو گا۔

مسٹر شبیر: مگر میں تو ان تمام مشکلات کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ ویسے میں اقرار کرتا ہوں کہ عمر بھر کو میں آپ کا سچا دوست رہوں گا اور انشاء اللہ وفادار ثابت ہوں گا۔

سوشیلا: مجھے ایسی دوستی کی ضرورت نہیں۔ میں یہ تہیہ کر چکی ہوں کہ آپ کے قدموں میں آپ کی خادمہ بن کر زندگی بسر کروں گی۔ میں کسی اور سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی۔

مسٹر شبیر: اور کچھ نہیں تو اسی پر غور کرو کہ تم جیسی امیر زادی کی ایک کم حیثیت غریب کے ساتھ بسر ہونی مشکل ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں کوئی جائیداد وغیرہ نہیں رکھتا۔ صرف قلم اور دماغ میرا ذریعہ معاش ہے یا اب سال بھر سے ہریش چندر جی کی مہربانی سے یہاں وکالت کر رہا ہوں جو ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ نہ کوٹھی نہ موٹر نہ گاڑی نہ نوکر۔ آپ ہی کے گھر پڑا ہوں۔ ایسے بے سرو سامان خانہ بدوش کے ساتھ آپ کس طرح گزارہ کر سکیں گی؟

سوشیلا: میرے دل کے بادشاہ شبیر جی آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کے یہ الفاظ میرے دل پر چوٹ لگاتے ہیں۔ بفضلِ خدا آپ تو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ معزز و نامور اہل قلم قانون دان لیڈر قوم ہیں لیکن اگر خدانخواستہ کچھ بھی نہ ہوتے تب بھی آپ کی یہ بچی

وفادار ذرا پرواہ نہ کرتی۔ بس آپ اب اور کچھ نہ پوچھئے اور جلد مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا کر لیجئے تاکہ اس دوزخ سے نکلوں۔ مجھے اپنی موجودہ زندگی اور ان بنگالی بابوؤں سے سخت نفرت ہے۔ آپ نے اس دن رات کو فرمایا تھا کہ آپ کے مذہب نے عورتوں کو بہت سے حقوق عطا کئے ہیں مگر کیا یہ حق نہیں دیا ہے کہ جس سے انہیں محبت ہو اسی سے شادی کر سکیں؟

شبیر صاحب: ہاں یہ حق بھی انہیں دیا ہے مگر آخر اس پر بھی تو غور کرو کہ تم کہیں خودکشی تو نہیں کر رہی ہو۔

سوشیلا: اگر یہ خودکشی ہے تو میں بھی اس کے لئے بخوشی تیار ہوں بلکہ اس خودکشی میں میری زندگی پنہاں ہے۔ اچھا اپنے وعدہ کے مطابق آج یہ بھی بیان فرما دیجئے کہ اسلام نے عورتوں کو کیا کیا حقوق عطا کئے ہیں تاکہ میں اس کا بھی اندازہ کر سکوں کہ آپ کے مذہب کی رو سے میں کوئی اخلاق سے گری ہوئی بات کر رہی ہوں یا آپ صرف ان بنگالی بابوؤں کے خیال سے پس و پیش کر رہے ہیں۔

شبیر صاحب: اس وقت اس کا کون سا موقعہ ہے۔ پھر کبھی بیان کروں گا یا کوئی کتاب لا دوں گا خود ہی دیکھ لینا۔

سوشیلا: جی نہیں۔ میں تو اسی وقت فیصلہ کرا لینا چاہتی ہوں اور اس سے بھی واقف ہو جانا چاہتی ہوں کہ میرے جذبات آپ کے مذہب کے خلاف تو نہیں ہیں۔

شبیر صاحب: بالکل نہیں۔ اسلام نے ہر مرد و عورت کو سنِ بلوغ تک پہنچنے کے بعد اس کا کامل اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنا رفیق زندگی بنائیں۔ بانی اسلام صلعم نے فرمایا تھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے عورتوں کے حقوق کی نگہداشت خاص طور پر سپرد فرمائی ہے۔ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ مرد اور عورت بلحاظ انسانیت برابر ہیں۔ اسلام میں شادی ایک پاک اور مقدس عہد ہے۔ جسے بے تکلفی کے بعد توڑنا نہایت معیوب ہے۔ ہاں جب مرد اور عورت کی طبیعت میں خطرناک اختلاف ثابت ہو یا مذہبی، جسمانی، مالی، تمدنی، مغاہمت کی خلیج حائل ہو تو وہ اس معاہدہ کو باطل کر سکتے ہیں۔ اسلام کا یہ قانون اس قدر فطری اور ضروری ہے کہ جو قومیں پہلے اس کو موجب فساد اور خاندان کی بربادی کا ذریعہ بتاتی تھیں اب وہ بھی اپنے قوانین اسی کے مطابق بنانے پر مجبور

ہوتی جارہی ہیں۔

انگریزی قانون جو طلاق اور خلع کے لئے کسی ایک فریق کی خواہش اور ساتھ ہی ظلم اور مارپیٹ کو لازمی قرار دیتا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں بدل دیا گیا اور صرف بدکاری بھی طلاق اور خلع کا موجب کرلی گئی۔

نیوزی لینڈ میں ۱۹۱۲ء میں فیصلہ کیا گیا کہ سات سالہ پاگل کی بیوی کا نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے اور ۱۹۲۵ء میں فیصلہ ہوا کہ خاوند یا بیوی اگر ایک دوسرے کے حق کو ادا نہ کریں تو طلاق یا خلع ہوسکتا۔

اور تین سال تک خبر نہ لینے پر دوسرا نکاح جائز قرار دیا گیا۔ آسٹریلیا کی ریاست کوئنز رلینڈ میں پانچ سالہ جنون کو وجہ طلاق تسلیم کرلیا گیا ہے۔ تسمانیا میں ۱۹۱۹ء میں قانون پاس ہوا کہ بدکاری کی چار سال تک خبر نہ لینا، بدمستی اور تین سال تک عدم توجہی، قید، مارپیٹ اور جنون کو وجہ طلاق قرار دیا گیا ہے۔ علاقہ وکٹوریہ میں ۱۹۲۳ء میں قانون بنا کہ خاوند اگر تین سال خبر نہ لے، بدکاری کرے۔ خرچ نہ دے یا سختی کرے، قید، مارپیٹ یا عورت کی طرف سے بدکاری یا جنون یا سختی کا ظہور ہو تو طلاق اور خلع ہوسکتا ہے۔ اسلام نے عورت کو اس کے مال کا مالک تسلیم کیا تھا مگر اب تک یورپ میں کوئی عورت اپنی دولت کی مالک نہیں تسلیم کی جاتی تھی مگر اب اٹلی میں قانون بنایا گیا ہے کہ عورت اپنے مال کی مالک ہوگی۔ پرتگال میں ۱۹۱۰ء میں، ناروے میں ۱۹۰۹ء میں، سویڈن میں ۱۹۲۰ء میں اور سوئزرلینڈ میں ۱۹۱۱ء میں ایسے قوانین پاس کردیئے گئے جن سے طلاق اور خلع کی اجازت ہوگئی ہے۔ امریکہ میں بھی اب عملاً اسلامی طریقہ پر اصلاح شروع ہوگئی ہے اور جج عورت کے احساسات کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ عورتوں کو ووٹ کے حقوق بھی دیئے جارہے ہیں اور ان سے قومی امور میں مشورہ لینے کے لئے بھی راہیں کھولی جارہی ہیں لیکن یہ سب باتیں بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے پورے تیرہ سو سال بعد ہورہی ہیں اور ابھی بہت کچھ ہونی باقی ہیں لیکن وہ زمانہ دور نہیں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کو دنیا ان معاملات میں بھی کامل طور پر قبول کرے گی جس طرح اس نے اور میں قبول کیا ہے اور آپ کا جہاد عورتوں کی آزادی کے متعلق اپنے پورے اثرات اور نتائج ظاہر کرے گا۔

سوشیلا: (شبیر صاحب کے گلے میں بانہیں حائل کر کے) پیارے شبیر جب آپ کا مذہب عورت کے احساسات اور جذبات کا احترام کرتا ہے اور اسے اپنا رفیق زندگی منتخب کرنے میں آزادی دے رکھی ہے تو تم مجھ پر کیوں قیود عائد کر رہے ہو جب اسلام نے بڑے بڑے فلاسفروں کے نظریئے پلٹ دیئے اور جس عورت کو وہ شیطان کا آلہ اور فتنہ و فساد کا باعث خیال کرتے تھے۔ اسے اسلام نے سوسائٹی کا ایک رکن بتایا ہے تو پھر تم مجھ سے کیوں گریز کر رہے ہو اور اس پر کیوں مجبور کرتے ہو کہ میں اس شخص سے شادی کر دوں جس کو میں دیکھنا گوارا نہیں کرتی اور ان لوگوں میں ہوں جو کہنے کو روشن خیال ہیں مگر مجھے اپنے رسم و رواج کے دیوتا پر قربان کر دینا چاہتے ہیں۔ (شبیر کے سینہ سے لپٹ کر) پیارے تمہارے مذہب کے بانی (علیہ السّلام) نے عورتوں کے حقوق کی نگہداشت اور انہیں جانوروں کی زندگی اور رسم و رواج پر قربانی سے بچانے کا اعلان کیا تھا۔ پیارے تم ان کی پیروی کا دم بھرتے ہو اور ان کے سچے نام لیوا ہو۔ اپنی جان کے صدقے میں مجھے ان درندوں سے آزاد کراؤ۔ میں مذہب سے نفرت کرتی تھی مگر اب اسلام کی آغوش میں پناہ لینا چاہتی ہوں۔ میں اسلام کی سچی پیرو اور وفادار خادمہ ثابت ہوں گی۔ بولو! بولو! مجھے اس جہنم سے نکال کر اپنی آغوشِ محبت میں جگہ دینے کو تیار ہو یا نہیں؟ ورنہ میں زہر کھالوں گی یا گلے میں پھندا ڈال کر مر جاؤں گی۔ سوشیلا رونے لگتی ہیں۔

شبیر صاحب: (سوشیلا کا سر اپنے سینہ سے چمٹا کر) پیاری اسلام کی آغوش ہر شخص کے لئے کھلی ہوئی ہے اور تمہارا خادم بھی تمہاری ہر خدمت کو اپنی سرفرازی سمجھتا ہے مگر گلشنِ اسلام میں عشق و محبت کے راستے سے داخل ہونا چنداں مستحسن نہیں۔

سوشیلا: (نہایت متانت سے) مجھے خود اس کا احساس ہے اور خدا گواہ ہے کہ میں آپ کی آغوش اور اسلام کی آغوش دونوں کو جداگانہ حیثیت دیتی ہوں۔ پیارے! شاید تمہیں خبر نہ ہو مگر تم نے بے خبری ہی میں اپولو بندر پر کیوپڈ کی کماں سے جو تیر چلایا تھا وہ اسی وقت میرے سینے میں اتر گیا تھا اور اسلام کی عظمت کا سکہ میرے قلب پر اس دن بیٹھا تھا جس دن میں نے تمہارے پاس مس میو کے مسودات میں نرملا والی کہانی پڑھی تھی۔ اب تک یاد آتا ہے تو نرملا کی قسمت پر رشک ہوتا ہے اور تم مجھے ہو بہو محمد خاں نظر آتے ہو۔ پیارے

اس نے نرملا کو اس کی پھوپھی سروجنی کے خوفناک موریتوں اور اس کے باپ کی حرص و آز سے بچالیا تھا (شبیر کے سینے سے لپٹ کر) پیارے کیا تم مجھے بچانے کو تیار نہیں ہو؟

شبیر صاحب: کیا تم واقعی اسلام میں داخل ہونے کو صرف اس لئے تیار ہو کہ تمہیں اس میں خوبیاں نظر آ رہی ہیں یا محض میرے خیال سے۔

سوشیلا: افسوس میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میرا دل مدت ہوئی اسلام کے نور سے منور ہو چکا ہے۔

شبیر صاحب: مگر تم تو آج تک مذہب کی مخالفت ہی کرتی جا رہی تھیں۔

سوشیلا: لیکن یہ صرف زبان تک محدود تھی۔ علاوہ بریں مجھے اس کا بھی پتہ نہ تھا کہ اسلام نے عورتوں کو قریب قریب مردوں کے مساوی حقوق دیئے ہیں اور اپنے قوانین میں اس کمزور جنس کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔ اس لئے میں تو جو کچھ کہتی تھی صرف تمہیں چھیڑنے کی خاطر کہتی تھی تاکہ تمہارے اندرونی جذبات کا اظہار ہو۔ تم دل کھول کر اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرو اور مجھے اپنے شکوک و شبہات دور کرنے کا موقعہ ملے۔

شبیر صاحب: خوب! ترکیب تو نرالی سوچی تھی۔

سوشیلا: مگر پھر بھی آپ نے اسلام کو نمایاں کرنے میں بخل ہی سے کام لیا اور میں تشنہ کام ہی رہ گئی۔ نہ تو تم نے اس موضوع پر کچھ زیادہ روشنی ڈالی کہ اسلام کی برکات میں عورتوں کو کیا کیا حصہ ملا اور نہ تم نے بانی اسلام کے متعلق ہی کچھ کہا۔ مسلمانوں میں پردہ کے موجودہ دستور سے میں بہت بدگمان ہو رہی تھی مگر خدا تمہاری محبوبہ کا بھلا کرے کہ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ پردہ اسلام کے سراسر خلاف ہے اور ہندوستان ہی کی پیداوار ہے۔

شبیر صاحب: (کچھ پریشان سے ہو کر) میری محبوبہ کون؟

سوشیلا: (شوخی کے ساتھ) اچھا آپ جانتے ہی نہیں آپ نے اس دن بنارسی باغ میں ستار کسے سنایا تھا؟

شبیر صاحب: کس دن۔ مجھے تو یاد نہیں آتا.......... اچھا! یاد آیا او ہو تم بھی کمال کرتی ہو۔ آخر بدگمانی کی کوئی حد بھی ہے۔ میں تو بار بار تم سے کہہ چکا کہ تمہاری بھابھی جان خواہ مخواہ میرے گلے میں پھندا اڈالنا چاہتی ہیں۔ اس دن بھی وہی مجھے باتوں باتوں

میں وہاں لے گئیں۔ ورنہ مجھے اور گلناز سے کیا واسطہ!

سوشیلا: جب ہی تو آپ مجھے مرتا چھوڑ کر کلکتہ روانہ ہو گئے تھے۔ افسوس آپ ہزار چھپائیں مگر میں اچھی طرح محسوس کرتی ہوں کہ آپ کے دل میں میری محبت نہیں ہے اور گلناز نے آپ کو مجھ سے چھین لیا ہے مگر کیا کروں عورت کی فطرت کمزور ہوتی ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔ (رونے لگتی ہیں)

شبیر صاحب: (سوشیلا کا سر اپنے سینے سے لگا کر) یا اللہ میں تمہیں کیوں کر یقین دلاؤں کہ میرے دل میں تمہارے سوا اور کسی کی جگہ نہیں ہو سکتی۔ تم تو خواہ مخواہ ہلکان ہوتی رہتی ہو۔

سوشیلا: تو پھر تم مجھے اس قید خانے سے چھڑانے پر کیوں نہیں تیار ہوتے۔

شبیر صاحب: میں بالکل تیار ہوں مگر اس کے لئے دو چار روز کی مہلت ملنی چاہئے تاکہ میں کچھ انتظام کر سکوں۔

سوشیلا: (فرطِ مسرت سے شبیر صاحب کے سینہ سے لپٹ کر میرے پیارے تم نے آج مجھے حقیقی زندگی بخش دی۔ خدا کرے مجھے تمہاری رفاقت اور خدمت نصیب ہو۔

شبیر صاحب: یقیناً خدا ہماری مدد کرے گا۔

سوشیلا: پیارے آج مجھے محسوس ہوا کہ تم اور تمہارا اسلام جنہیں میں کبھی سخت خیال کرتی تھی ایک کمزور فطرت عورت کے لئے باعثِ زندگی ثابت ہوئے۔

شبیر صاحب: تم اپنے کو کمزور فطرت کیوں سمجھتی ہو۔

سوشیلا: میں کیا عورت کو ساری دنیا ہمیشہ کمزور فطرت ہی سمجھتی رہی ہے۔

شبیر صاحب: مگر اسلام تو ان کو مردوں سے کسی طرح کمزور اور ادنیٰ نہیں سمجھتا اور اسلام کی عورتوں کے حق میں یہی سب سے بڑی بخشش ہے کہ اس نے انہیں سوسائٹی میں باعزت جگہ دی ورنہ ظہورِ اسلام سے پہلے ہر قوم میں عورت کی فطرت مرد کے مقابلے میں واقعی بہت کمزور اور گری ہوئی خیال کی جاتی تھی۔ یونانی کہا کرتے تھے کہ ''سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے لیکن عورت کے شر کا علاج محال ہے۔'' سقراط کہتا تھا کہ ''دنیا میں عورت سے زیادہ فتنہ و فساد کی چیز اور کوئی نہیں۔'' عورت کی تحقیر کا یہ خیال صرف

فلاسفروں کے دماغ تک محدود نہ تھا بلکہ مذہبی دنیا میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سینٹ برنا لکھتا ہے کہ "عورت شیطان کا آلہ ہے"۔ یوحنا کا قول ہے کہ "عورت برائیوں کی بیٹی اور امن وسلامتی کی دشمن ہے"۔ انجیل کی روایات کے مطابق حضرت مسیح کا بھی اپنی ماں کو جھڑک دینا ظاہر ہوتا ہے۔ انتونی لکھتا ہے کہ "عورت شیطان کے بازوؤں کا چشمہ ہے۔ اس کی آواز سانپ کی آواز ہے۔" بونا ویٹویر لکھتا ہے کہ "عورت اس بچھو کی مانند ہے جو ہر وقت نیش زنی کو تیار رہتا ہے۔"

سوشیلا: اُف اُف مرد کس قدر ظالم ہوتے ہیں جس آغوش میں پرورش پائی اسی کو زخمی کرنا جس سینہ سے اس کا رشتۂ حیات وابستہ تھا۔ اسی کو بس برا بتانا کس قدر ظلم اور کتنی بڑی احسان فراموشی ہے۔ (اپنا منہ شبیر صاحب کے منہ کے قریب کر کے) تو پیارے کیا تم مجھے بھی شیطان یا ناگن یا بچھو خیال کرتے ہو۔

شبیر صاحب: تمہارے وہم کا کوئی ٹھکانہ بھی ہے۔ میں تو یہ ظہور اسلام سے پہلے کے لوگوں کے یا غیر مسلم اصحاب کے خیالات نقل کر رہا ہوں۔ تمہارے متعلق تو بڑی بات ہے۔ میں اسلام کا پیرو ہو کر کسی عورت کے متعلق بھی یہ نہیں خیال کر سکتا (سوشیلا کی شانہ پر بکھری ہوئی زلف کو ہاتھ میں لے کر) ہاں ان ناگنوں کا ضرور قائل ہوں۔ جنہوں نے ڈس ڈس کر میرے وجود کو سراپا شعلۂ محبت بنا دیا ہے۔

سوشیلا: (بچپن کی ادا سے) مگر مجھے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کا وجود برف کی طرح ٹھنڈا اور منجمد نظر آ رہا تھا۔

شبیر صاحب: (سوشیلا کا ہاتھ اپنے دل پر رکھ کر) دیکھو تو سہی میرے پاس دل ہی کہاں ہے۔ وہ تو شملہ ہی میں پکنک والے دن (سوشیلا کے عنبرین گیسوؤں کی طرف اشارہ کر کے) ہی اس جال میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

سوشیلا: اب تو آپ شعر بھی کہنے لگے۔ ابھی یہ ناگنیں تھیں اور ابھی دل پھنسانے کا جال بن گئیں۔ اچھا اس شاعری کو ختم کر کے دلچسپ سلسلہ شروع کیجئے کہ سقراط جس عورت کو فتنہ وفساد کی جڑ اور بونا ویٹویر جسے بچھو سمجھتے تھے اسے دوسرے بزرگ کیا تصور فرماتے تھے اور اسلام نے اسے کیا بتایا۔

شبیر صاحب: (سوشیلا کی زلفوں کو چوم کر) اس وقت طبیعت تو یہ چاہتی ہے
کہاں ناگنوں کے زہر شیریں سے شادکام ہوں اور اس جال میں اپنا کھویا ہوا دل ڈھونڈوں
مگر خیر تعمیل حکم مقدم ہے۔

سینٹ سائپرین کا قول ہے کہ "عورت شیطان کا آلہ ہے۔ جس سے وہ ہماری روحوں پر قبضہ کرتا ہے۔" گریگری اعظم کا خیال ہے کہ "عورت میں بھڑ کی طرح اور اژدہے کی طرح کینہ ہے۔" سینٹ جان ڈمین کہتا ہے کہ "عورت جھوٹ کی بیٹی دوزخ کی رکھوالی اور امن کی دشمن ہے۔ اسی کی وجہ سے آدم نے بہشت کھوئی تھی۔" کرسوس ٹوم لکھتا ہے کہ "عورت دنیا کے تمام درندوں سے زیادہ خطرناک درندہ ہے۔"

سوشیلا: جنس عورت کے ان دشمن درندوں کی حد ہوگئی۔ آج اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو یورپ کی آزاد عورتیں ان سے واقعی وہی برتاؤ کرتیں جس کی یہ عورتوں سے توقع رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانہ کی عورتیں مردوں کے کہنے سے حقیقت میں بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھنے لگی تھیں۔

شبیر صاحب: اس زمانہ میں کیا ابھی چند صدی پہلے کی بات ہے کہ غیر مسلم اقوام میں عورتوں کی حالت لونڈیوں سے بھی بدتر تھی بلکہ بہت سے ممالک میں اب بھی ہے۔

روما میں جو عیسائیت کا مرکز تھا عورتوں پر جانوروں کی طرح حکومت کی جاتی تھی اور ذرا سے قصور پر عورتیں ذبح کردی جاتی تھیں۔ سولہویں سترہویں صدی عیسوی میں جادو اعتقاد بڑی پختگی سے دلوں میں جاگزیں تھا اور اس کا شکار اکثر عورتیں ہی ہوا کرتی تھیں۔ الیگزنڈر ششم اور لوئی دہم وغیرہ نے جس بیدردی سے عورتوں اور ان کے بچوں کو جادو کے الزام میں ذبح کیا اس سے تاریخ یورپ کے صفحات رنگین ہیں۔ ملکہ الزبتھ، جیمز اوّل اور لانگ ہیملٹ کے زمانہ میں ہزاروں عورتیں سحر کرنے کے جرم میں زندہ جلادی گئیں اور دار پر کھینچ دی گئیں۔ ڈاکٹر سپرنگ نے لکھا ہے یونانیوں نے اس عہد میں نوے لاکھ عورتیں زندہ جلادیں۔

سوشیلا: (کانپ کر) مگر اب تو یورپ والے عورت کی قدر و منزلت میں بڑی سرگرمی دکھا رہے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا کو عورت کے احترام کا سبق انہی کی قوم اور

انہی کے مذہب نے دیا ہے۔

شبیر صاحب: مگر مذہب، تاریخ اور واقعات ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ رومن کیتھولک مذہب کی رو سے عورت کلام مقدس چھو بھی نہیں سکتی اور نہ اسے گرجا میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ گرجا کی نگرانی کر سکتی ہے۔ اب اگر اس کے خلاف ہو رہا ہے تو وہ صرف تعلیماتِ اسلام کا اثر ہے یہ تو یورپ کی حالت تھی۔ اب اپنے ملک کی کیفیت سنیے۔

یہاں بھی عورت کی بے قدری اور ذلت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا۔ عورت کے لئے مذہبی تعلیم ناجائز تھی۔ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا۔ اس کا زندہ رکھنا باعث ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا۔ متعدد بھائیوں کی ایک بیوی ہوا کرتی تھی۔ بیویاں جوئے میں ہار دی جاتی تھیں۔ مردہ خاوند کے ساتھ زندہ عورتیں جلائی جاتی تھیں۔ نیوگ جیسی شرمناک رسم سے اُن کی عزت و عصمت برباد کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے مہاتما عورت کی چھوئی ہوئی چیز کو نجس سمجھتے تھے۔

سوشیلا: مس میو کے مسودات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ ان سے بھی زیادہ شرمناک بہت سی باتیں اب تک ہندو سوسائٹی میں موجود ہیں مگر شبیر صاحب ستی کی رسم کا تو صرف اس لئے رواج تھا کہ زندگی بھر آتش فراق میں جلتے رہنے سے ایک ہی بار جل مرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ پہلے دن جب کہ تم نے بے رُخی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ میری بھی طبیعت چاہتی تھی کہ کپڑوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگالوں اور اپنی محبت کی چتا پر قربان ہو جاؤں۔

شبیر صاحب: (سوشیلا کو سینہ سے لگا کر) پیاری میری بے رُخی زبان تک محدود تھی ورنہ دل تو تمہاری آگ میں پھنکا جا رہا تھا۔ مصلحت بینی اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ دل کی بات زبان تک آئے۔

سوشیلا: اچھا اب تو کوئی مصلحت مدنظر نہیں ہے۔

شبیر صاحب: اب تو میں زبان سے بھی وعدہ کر چکا اور دل تو تمہارے قبضہ میں ہے ہی۔

سوشیلا: مگر اس میں تو گلناز کی جھلک نظر آ رہی ہے۔

شبیر صاحب: اب تک آپ کو گلناز کا خیال لگا ہی ہوا ہے۔

سوشیلا: (مسکرا کر) اچھا اب نہیں کہوں گی۔ آپ جو کچھ بیان کر رہے تھے۔ وہ سلسلہ جاری رکھئے۔

شبیر صاحب: وہ میں بیان کر دوں گا مگر تم یہ بتا دو کہ کیا اب تک تمہیں میرے خلوص کا یقین نہیں ہے۔

سوشیلا: (شبیر صاحب کے گلے میں بانہیں ڈال کر) نہیں پیارے یہ تو میں مذاق کر رہی تھی۔

شبیر صاحب: آپ یورپ اور ہندوستان کی حالت سن ہی چکیں اب اس ملک کی حالت سنئے جہاں بانیٔ اسلام (صلعم) پیدا ہوئے تھے۔ دوسری برائیوں کی طرح اس سرزمین میں عورت پر دوسرے تمام ممالک سے زیادہ ظلم ہو رہا تھا۔ مرد آزاد تھا کہ جتنی عورتوں سے چاہے شادی کرے۔ دوسری قوم کی گرفتار شدہ عورتوں سے نہایت ذلیل اور جہاں سوز کام لیا جاتا تھا۔ عورت محض ایک جائیداد کے طور پر سمجھی جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس کا اپنے متوفی خاوند اور رشتہ داروں کی وراثت میں کوئی حصہ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ خود جائیداد کا ایک حصہ قرار پا کر ورثہ میں چلی جاتی تھی وارث چاہتا تو اس سے خود نکاح کر لیتا، چاہتا تو دوسرے سے کرا دیتا۔ یہاں تک کہ باپ کی عورتوں کو ورثہ کا حصہ سمجھ کر ان سے شادی کر لیتے تھے۔

سوشیلا: وحشت اور بے شرمی کی حد ہو گئی تھی۔

شبیر صاحب: نہیں یہ باتیں بے شرمی کی سمجھی ہی نہیں جاتی تھیں ورنہ عرب والوں میں شرم اور غیرت اس قدر بڑھی ہوئی تھی۔ باپ لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر سن کر اس ذلت کے خوف سے سیاہ پڑ جاتا تھا کہ کسی وقت اسے کسی کا سسر بننا پڑے گا۔ اسی غیرت کے مارے اکثر عرب اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات نکاح کے وقت یہ معاہدہ ہوتا تھا کہ لڑکی پیدا ہوگی تو اس کی ماں اسے مار ڈالے گی۔ غرضیکہ ساری دنیا میں عورتوں کی مٹی خراب ہو رہی تھی۔ نہ شریعت موسوی نے اس کی طرف توجہ کی تھی نہ مسیحؑ کی

سچائی نے اور نہ ہندوستان کے وید مقدس یا بدھ مذہب ہی نے اس مظلوم طبقہ کی دادرسی کی آخر دنیا کا سب سے بڑا مصلح حقیقی محسن اور سچا نجات دہندہ پیدا ہوا اور تاریکی کو روشنی سے، ظلم کو رحمت سے، گمراہی کو ہدایت سے، دہریت کو بھی مذہبیت سے بدل دیا۔ عدل اور انصاف رحم اور محبت، مساوات اور حریت کی بادِ صبا کے جھونکے چلنے لگے۔ مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلائی اور دنیا کو عورتوں کی بچی عزت اور حقیقی احترام کا درس دے کر ان کو مردوں کے ہم پلہ اور دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ عورتوں کے اس سچے محسن نے جب فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب سوال کیا جائے گا کہ زندہ لڑکی کو کس گناہ کے عوض مارا گیا تو ان الفاظ کی گونج کے ساتھ تمام خونخوار افعال کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور دنیا کی تمام قوموں اور تمام مذاہب کو سر تسلیم خم کر دینا پڑا۔

آپ نے فرمایا کہ تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ "حسنِ سلوک کرتا ہے۔" حقوق کے متعلق ارشاد ہوا کہ "مردوں پر عورتوں کے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے عورتوں پر مردوں کے۔" حصولِ علم کو مردوں کے ساتھ عورتوں کے لئے ایک فریضہ کی حیثیت دے کر عورتوں کی تعلیم اور ترقی کا دروازہ کھول دیا۔

ہمارے نبی صلعم نے یہ باتیں صرف زبان سے ہی ارشاد نہیں فرمائیں بلکہ اپنے عملی نمونہ سے بھی عورت کی عظمت اس کے حقوق اور مرتبہ کو قائم کر کے دنیا کو بتا دیا کہ آپ کے لائے ہوئے دین کے قوانین ازلی بھی ہیں اور آپ کی تعلیمات منبع اخلاق۔ پھر آپ نے عورتوں کی عزت و توقیر کو اپنے مذہب یا قوم ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ غیر مذاہب کی عورتوں کی عزت افزائی بھی کرتے رہے۔ ایک جنگ کے موقع پر قیدیوں میں آپ کی غیر مسلم رضاعی بہن آپ کے سامنے لائی گئیں تو آپ نے انہیں پہچان کر اُن کے لئے اپنی چادر بچھا دی۔ بنی طے اپنی شرارت کی پاداش میں قید کر کے لائے گئے تو ان میں حاتم طائی کی .... لڑکی بھی تھی جب رسولِ اکرم صلعم کو خبر پہنچی تو اسے بلا کر عزت و احترام سے واپس کرنا چاہا مگر سخی باپ کی بیٹی نے اکیلے رہا ہونے پر قید میں رہنے کو ترجیح دیا۔ اس پر آپ نے اس کے سب ہمراہی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ آپ اپنی بیویوں سے بے حد نرمی سے پیش آتے تھے اور ہمیشہ اُن کی دلجوئی فرماتے رہتے تھے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "تمہاری

بیویاں تمہارے ہاتھ میں خدا کی امانت ہیں۔ ان سے نیک سلوک کرو۔"

سوشیلا: شبیر صاحب ایک بات پوچھوں خفا تو نہ ہو گے۔

شبیر صاحب: ابھی خفا ہونے کا امکان باقی ہی ہے (سوشیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے)

سوشیلا: اچھا خفا نہ ہونا۔ بانیِ اسلام (صلعم) نے کئی شادیاں کیوں کی تھیں۔ اب بھی بہت سے مسلمان کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں۔ گلناز کے لئے کہیں تم بھی اس کی پیروی تو نہ کرنا۔

شبیر صاحب: خدا کی پناہ گلناز تمہیں بھولتی ہی نہیں۔ آج کل جو لوگ کئی کئی نکاح کرتے ہیں وہ میرے خیال میں بوالہوس اور ظالم ہیں۔ رسول اکرم صلعم نے کئی نکاح صرف اس لئے کئے تھے کہ انہی نکاحوں کی بدولت آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر کئی قبیلوں نے ہدایت پائی۔ علاوہ بریں آپ کا مقصد یہ بھی تھا کہ دنیا کو بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی قدر و منزلت قائم رکھنے کا سبق دیں۔ آپ سب بیویوں سے یکساں سلوک کرتے تھے اور سب صرف خوش ہی نہیں بلکہ آپ کے دامن سے وابستہ رہنے میں دین و دنیا کی سرخروئی محسوس کرتی تھیں۔ آج کوئی دو بیوی کرلے تو غیر ممکن ہے کہ دونوں سے خلوص قائم رکھ سکے۔

سوشیلا: بانیِ اسلام (صلعم) نے تو واقعی ایک ایسا دین پیش کیا ہے جو پورا معاشرتی اور سماجی مذہب ہے اور عورتوں کے لئے تو بس آیۂ رحمت ہے۔ شبیر صاحب اب دیر تو بہت ہو گئی ہے مگر اپنے رسول کی کچھ سوانح حیات سے بھی مجھے باخبر کر دو تو بہت اچھا ہو۔ اب تو میرے دل میں ولولہ اٹھتا ہے کہ اس پاک دین اور اس کے مقدس بانی کی ایک ایک بات سے واقف ہو جاؤں۔

شبیر صاحب: اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ بھائی اور بھابی آتے ہوں گے۔ اب اپنے کمرے میں چلئے پھر کسی وقت بیان کر دوں گا۔

سوشیلا: اچھا یہ تو بتاتے جایئے کہ مجھے ابھی کتنے دنوں اور اس آگ میں جلنا ہے۔

شبیر صاحب: پیاری سوشیلا اب تو ہم دونوں ایک ہیں۔ جلنے کی کون سی

بات ہے۔ کیا تمہیں اب تک میرے وعدہ کا یقین نہیں آیا۔

سوشیلا: (شبیر کے سینہ سے لپٹ کر) تم پر مجھے کامل اعتماد ہے مگر یونہی پوچھ رہی تھی۔

شبیر صاحب: میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ صرف دو تین روز کی مہلت ملنی چاہئے تاکہ میں کچھ انتظام کرسکوں۔ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئے۔ اس وقت وہ ایک بڑے بھاری بوجھ کے نیچے دب رہے تھے۔ ٹوپی اتار کر فرش پر پھینک دی اور عالمِ پریشانی میں ٹہلنے لگے اِن کی آنکھوں میں ایک طرف تو لگا تار آئندہ پیش آنے والی دقتوں کا نقشہ کھنچ رہا تھا دوسری طرف اپنی فرشتہ خصال معصوم دل نازنین منسوبہ گلناز کی تصویر سے باتیں کر رہے تھے کہ "اب اُسے کیا منہ دکھاؤں گا اور میری اس شادی کی خبر سن کر اُس پر کیا گزرے گی؟ وہ یتیم لڑکی پہلے ہی بہت مغموم رہتی ہے۔ یہ رشتہ قرار پا جانے سے اُسے کچھ سہارا ہو گیا تھا۔ آہ میں کیا عہد شکن اور جھوٹا ثابت ہوا وہ ہمیشہ مجھ پر لعنت کرے گی۔ میں بالکل بے سروسامان ہوں سوائے ہریش چندر کے اور کوئی لکھنؤ میں بے تکلف دوست بھی نہیں رکھتا اور یہ کام بلا کسی ایک مددگار کے انجام پانا محال ہے۔"

بڑی دیر غور کرنے کے بعد خیال میں آیا کہ "اپنے دوست سیّد مشیر حسن صاحب بیرسٹرایٹ لاء کانپور کو بذریعہ تار بلا لیا جائے۔

چنانچہ اسی وقت تار فارم لکھ کر بیرے کو ٹیلیگراف آفس بھیج دیا۔ صبح ۹ بجے کی ٹرین سے بیرسٹر صاحب آگئے اور "رائل ہوٹل" میں ٹھہرائے گئے انہوں نے تمام افسانۂ عشق اور قرارداد شادی اُن کے آگے بیان کی جس پر انہوں نے ظاہراً تو اپنے دوست سے خوشی کا اظہار کیا، دل کی خدا جانے۔

سیّد مشیر حسن: لباس وزیوراتِ عروسی کا بھی کچھ سامان کیا ہے؟

مسٹر شبیر: ابھی تک تو کچھ بھی نہیں۔

مشیر حسن: اچھا آج ہی سب ہو جائے گا۔

مسٹر شبیر: آپ کو اُس وقت سے پہلے ایک بار مس چندر جی صاحبہ سے ملاقات کر لینی چاہئے۔

مشیر حسن: بہت خوشی سے آج ہی مگر کس جگہ؟

مسٹر شبیر: وہ یہاں بھی آسکتی ہیں اور اگر آپ تشریف لے چلیں تو مسز ڈیوڈ کی کوٹھی پر آجائیں گی۔

اس وقت شبیر صاحب نے بھی کھانا مشیر حسن صاحب کے ساتھ ہوٹل ہی میں کھایا۔ اس کے بعد دونوں ڈیوڈ میڈیکل ہال گئے اور مس سوشیلا بائی سے ملاقات کی۔ وہیں سب نے چائے پی پھر مشیر حسن صاحب نے امین آباد جا کر عروس کے لئے ایک بیش قیمت سرخ بنارسی ساڑی خرید کر اور حضرت گنج آکر دو یاقوت کی انگشتریاں اور ایک بروچ لیا۔ یہ چاروں چیزیں قیمتی پانچ سو روپیہ اپنی طرف سے تحفہ دینے کو لیں۔ اس کے دوسرے دن سہ پہر کے چار بجے وقت عقد خوانی مقرر رہا۔

دو بجے دلہن غسل وغیرہ کر کے تیار ہوئیں۔ گلابی ریشمی جوڑہ پہنا معمولی روزمرہ کے زیورات تو پہن لئے اور کچھ چیزیں ہینڈ بیگ میں رکھ کر ساتھ میں اور ایک گلابی ریشمی رومال اور ہیرے کی انگشتری بوقت نکاح سسرال کی طرف سے نوشہ کے دینے کو۔ اپنی چھوٹی فٹن تیار کرائی اور میڈیکل ہال پہنچیں۔ یہاں دیکھا کہ خوش سلیقہ مسز ڈیوڈ نے اپنا ڈرائنگ روم دلہن سے زیادہ آراستہ کر رکھا تھا۔ علاوہ دیگر آرائشوں کے کمرہ خوش رنگ و خوشبو گلدستوں سے مہک رہا تھا سوشیلا جی کے اترتے ہی مسز ڈیوڈ نے بیرسٹر مشیر حسن کے تحائف پیش کر کے کہا "جلدی سے یہ لباس تبدیل کرلو تاکہ نکاح کے وقت سرخ جوڑا ہو۔ بیرسٹر صاحب تاکید فرما گئے ہیں۔" یہ سن کر وہ فوراً ڈریسنگ روم میں چلی گئیں اور مسز ڈیوڈ نے اپنے ہاتھ سے دلہن بنایا۔ ٹھیک چار بجے نوشاہ معہ بیرسٹر مشیر حسن و قاضی افتخار عالم صاحب کے مکان پر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے استقبال کیا اور ڈرائنگ روم میں لائیں اور دوسرے کمرے سے دلہن بلوائی گئیں اور نوشاہ کے مقابل میں اس مکلف کرسی پر جو زرین کشن اور پھولوں سے سجائی گئی تھی بٹھادی گئیں حسین مس چندر جی سرخ جوڑے میں دلہن بنی منہ کو رومال لگائے آنکھیں جھکائے اس شرمیں ادا سے بیٹھی تھیں کہ حاضرین رعب حسن سے آنکھ نہیں اٹھاسکتے تھے۔ اسی طرح ان کے نوشاہ بھی ایک بیش قیمت "ستھو لے اینڈ کمپنی" کے تیار شدہ کشمشی رنگ کے گرم سوٹ میں بے انتہا خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔

ان کے ساتھ والی کرسی پر سیّد مسٹر حسن صاحب پیرس کا سلا ہوا سیاہ سوٹ زیب تن کئے عجب شان سے متمکن تھے۔ بارعب چہرے سے بے حد انبساط و مسرت کا اظہار ہو رہا تھا اور دولہا دلہن کے درمیان دائیں جانب قاضی افتخار صاحب کی کرسی تھی۔ یہ بھی لباس اور صورت سے وجیہ معلوم ہوتے تھے۔ اچھے گہرے سانولے رنگ کے دراز ریش ساٹھ سالہ خوب چوڑے چکلے قوی ہیکل بزرگ تھے جو اس وقت خاص طور پر مکلف لباس فاختئی سرج کے شرعی پاجامے پر جامہ دار کا چوغہ پہنے ہوئے تھے جس پر ایک قیمتی کشمیری شال لپیٹ رکھی تھی اور سر پر خاکستری گرم عمامہ منہ میں چار چار پان کے دو بیڑے دب رہے تھے۔ جس سے بات کرنا بھی..........دشوار تھا اور جب گفتگو فرماتے لگتے تو دہنِ مبارک سے پیک کی چھینٹیں اڑتی تھیں اس پر بھی قانع نہ تھے۔ خاصدان پر ایک ہاتھ برابر دھرا رہتا تھا اور پانچ پانچ منٹ میں گلوریاں چبائے جاتے تھے۔ اس وقت ان کو دو اہم فرائض ادا کرنے تھے چنانچہ پہلے تو اس بدمذہب حورو ش دیوی کو داخلِ اسلام کیا اور مسز ڈیوڈ کی مسلمان کمپونڈر مسمات بسم اللہ بیگم کے ہاں سے ایک گلاس پانی منگوا کر پہلے خود پی لیا پھر دلہن کو پینے کے لئے دیا جس نے نہایت ادب سے تسلیم کر کے گلاس لے لیا۔ اس وقت دونوں بیرسٹر صاحبان کی نظریں اس گلاس پر تھیں جس کے کنارے پر مولانا کے پان کی سرخی لگ رہی تھی۔ ان دونوں کو قاضی صاحب کا یہ جاہلانہ فعل نہایت ناگوار ہوا تو بیرسٹر صاحب نے کہا۔

مسٹر شبیر حسن: قاضی صاحب اس کی تو کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی شام کا وقت ہے بے پیاس سرد پانی تکلیف دے گا۔

قاضی افتخار: نہیں جی یہ بہت ضروری ہے چونکہ اس وقت سے یہ قابل فخر و قابلِ قدر لڑکی ہمارے پاک و آزاد مذہب اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اب چھوت چھات کی پابندی ختم ہو جانی چاہئے جس کی ابتدا کے لئے یہی مبارک و متبرک وقت موزوں ہے۔ (دلہن سے) عزیزہ شبیر بانو اس کو پی لیجئے۔

مسٹر شبیر: (دلہن سے انگریزی میں کوئی ضروری نہیں۔ گلاس رکھ دو مگر محبت شبیر میں سرشار لڑکی نے ذرا کراہت نہ کر کے گلاس منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔ اس کی اس ہمت پر بیرسٹر صاحبان سخت متعجب ہوئے اور دونوں کے دلوں پر اس لئے محبت کی متوالی و

مدہوش نازنین کی بیخودی کا عجیب اثر ہوا اور مشیر حسن صاحب نے نوشاہ سے فارسی میں آہستہ سے کہا۔

بیرسٹر مشیر حسن: شبیر بڑا خوش قسمت ہے۔ دیکھتے ہو یہ کیا ہو گیا ایک ہندو لڑکی اور یہ ہمت مگر یہ سب شبیر صاحب کا اثر ہے۔

مسٹر شبیر: (مسکراتے ہوئے انگریزی میں) یہ تو جھوٹا پانی ہی تھا۔ وہ میرے نہ ملنے پر زہر کھانے کو تیار تھی۔

قاضی صاحب: اب اس مبارک تقریب کی شیرینی تقسیم ہو جانی چاہئے پھر دوسرا مبارک فرض ادا کرنا ہے۔ (ڈاکٹر سے)

"میم صاحب اٹھئے۔"

یہ حکم سنتے ہی کھڑی ہو گئیں اور دوسرے کمرے سے دو نقرئی کشتیاں جن میں شیرینی کی پلیٹیں چنی تھیں اور جگمگاتے خوان پوش ان پر ڈھکے تھے بسم اللہ بیگم اور آیا سے اٹھوا کر لائیں اور قاضی افتخار صاحب کے ساتھ میز پر رکھوا دی اور انہوں نے دستِ مبارک سے ایک ایک ڈلی تبرکاً سب کو عنایت کی۔ بعد اس رسم کے عقد خوانی ہوئی اور چھوہارے لٹائے گئے مسز ڈیوڈ نے وہ انگشتری و رومال نوشہ کو پیش کیا جو دلہن "چندر محل" سے لائی تھیں۔ پر سید مشیر حسن صاحب نے خود اُٹھ کر ایک انگشتری دلہن کے ہاتھ میں پہنا کر دولہا دولہن کو مبارک باد دی۔

پھر مسز ڈیوڈ ہار لے آئیں اور مشیر حسن صاحب نے دولہا دلہن و قاضی صاحب کو پہنائے اور ہنستے ہوئے مسز ڈیوڈ اور اپنے گلے میں خود ہی ڈال لئے۔ اس کے بعد قاضی صاحب دلہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے تو چائے لائی گئی اس وقت کی چائے کا مسز ڈیوڈ نے بڑا پر تکلف سامان کیا تھا۔ کئی قسم کی مٹھائیاں بسکٹ اور پھل اور اپنے ہاتھ کی کئی چیزیں بنائی تھیں۔ دلہن اس وقت پہلے سے بھی زیادہ شرمائی ہوئی پیچھے کو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مشیر حسن صاحب چائے بنا بنا کر سب کو دے رہے تھے۔

لیڈی ڈاکٹر: (مشیر حسن سے) آپ بھی تو نوش فرمایئے۔ بنانے ہی میں مصروف ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔

مشیر حسن: آج چائے کو بہت دیر ہو گئی ہے۔ بیگم شبیر صاحبہ کو بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ میں چاہتا ہوں۔ سب کو جلدی مل جائے۔ خود بھی پی رہا ہوں۔

مسٹر شبیر: دو دن سے آپ کچھ کم تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ ہم دونوں اس کا شکریہ ادا کرنے کے تو کہاں قابل ہیں۔ خدا کبھی آپ کے ہاں کی تقریب خوشی میں خدمت کرنے کا ہمیں بھی جلد موقعہ دے۔

مشیر حسن: پیارے شبیر اسے تم تکلیف کہتے ہو۔ واللہ اسی قدر خوشی حاصل ہوئی ہے جس قدر کہ عزیزی ضمیر کی شادی سے ہوئی تھی اور مخلص دوستوں میں شکریہ کیسا؟

شبیر صاحب: اس زمانہ میں کون کسی کے لئے تکلیف اُٹھاتا ہے اور آپ ایسا مخلص دوست کب کسی کو میسر آتا ہے۔ میں اس وقت سخت حیران و پریشان تھا۔ کچھ کرتے نہ بن پڑتی تھی۔ میں تو پاگل ہو جاتا اگر آپ فرشتۂ رحمت کی طرح پہنچ کر امداد نہ کرتے۔

مشیر حسن: مسز شبیر آپ بہت تکلف سے تکلیف میں بیٹھی ہیں۔ بس اب تو شادی کی رسوم ختم ہوئیں۔ دلہن پن کا وقت نکل چکا۔ اب اس قدر شرم نہ کیجئے۔ اچھی طرح بیٹھ کر کچھ باتیں کریں۔ صبح تو ہم چلے جائیں گے۔

شبیر بانو: میں بہت اچھی بیٹھی ہوں۔ یہی خیال ہے کہ آپ بے حد تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ گو میرا گھر یہاں موجود ہے مگر میں اس وقت آپ کو ذرا آرام نہیں دے سکتی۔ کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔ آپ غیروں کی طرح ہوٹل میں تشریف فرما ہیں۔ اس کا مجھے سخت رنج ہے۔

مشیر حسن: اوہ اس کی کوئی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ انشاءاللہ اب جو آیا کریں گے تو آپ کے اپنے گھر میں ٹھہرا کریں گے اور (شبیر سے مخاطب ہو کر) چلو نہ بھائی ہنی مون کانپور میں بسر کرو۔ بیگم مشیر بہت خوش ہوں گی۔

مسٹر شبیر: یہ تو عین راحت تھی مگر فی الحال مسز شبیر اور میں اکٹھے نہیں نکل سکتے۔

مشیر حسن: کیوں جب شادی ہو چکی تو اب خوف کس کا ہے؟

مسٹر شبیر: مگر یہ شادی کسی پر ظاہر تھوڑی ہی کی جائے گی۔

مشیر حسن: یہ کیوں؟ اب اور کس بات کا انتظار ہے۔

مسٹر شبیر: یہ تو ابھی معلوم بھی نہیں۔ یہ شادی کس دن اور کس طریق سے ظاہر کی جائے گی مگر فی الحال مسز شبیر کی یہی رائے ہے کہ ابھی کچھ عرصہ پوشیدہ رکھی جائے۔

مسز مشیر حسن: تو کیا بیگم شبیر بدستور "چندر محل" ہی میں رہیں گی۔

شبیر بانو: "ابھی تو کچھ دن اور وہیں رہوں گی۔ ابھی بیرسٹر صاحب بھی وہیں ہیں جتنے دن خاموشی سے گذر جائیں بہتر ہے۔

مشیر حسن: آخر کہاں تک اب تو پابندی کی تکلیف اٹھانا فضول ہے جب اس قدر ہمت کر لی تو تھوڑی اور بھی کیجئے اور چلئے کل ہمارے ہی ساتھ۔

شبیر صاحب: انشاء اللہ حاضر ہوں گے۔ ان کو کرسمس کے موقعہ کا انتظار ہے۔ اس وقت اس خفیہ شادی کا اعلان ہوگا۔

مشیر حسن: (گھڑی دیکھ کر) اوہو سات بج گئے۔ ہمیں جانا چاہئے۔ بیگم شبیر بہت تکلیف میں ہیں۔

شبیر بانو: میں بہت اچھی طرح ہوں۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی مہربانی کر کے کھانا یہیں تناول فرمایئے۔

مشیر حسن: نہیں اب مجھے جانا چاہئے۔ ساڑھے سات بجے ایک دوست سے ملاقات کا وعدہ ہے۔ آپ دونوں کھانا کھایئے۔ آج شب تو یہیں رہیں گی نہ؟

شبیر صاحب: نہیں جناب یہاں کہاں رہ سکتے ہیں۔ ابھی "چندر محل" چلیں گے۔

مشیر حسن: بھائی آپ کے بھی عجیب قواعد ہیں۔ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ارے بھائی آج یہیں ٹھہر جاؤ تو کیا حرج ہے۔

شبیر صاحب: جب تک کہ شادی راز میں ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ مسز ہریش چندر تو اس وقت کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔

مشیر حسن: (کھڑے ہو کر) واہ بھائی یہ تو کچھ نہ ہوا۔ اتنا بڑا حوصلہ کر کے ذرا سی ہمت نہیں۔ گڈ نائٹ مسز شبیر۔

شبیر بانو: (تعظیماً کھڑی ہو کر) گڈ نائٹ صبح میں بھی سلام کے لئے اسٹیشن

پر حاضر ہوں گی۔

مشیر حسن: نہیں نہیں آپ کو اس قدر تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں میں ابھی رخصت ہوتا ہوں۔ اب آپ بہت جلدی کانپور میں ملیں۔ ان تینوں سے شیک ہینڈ کیا اور سوار ہو گئے۔

لیڈی ڈاکٹر: ہیر سٹر صاحب ڈرائنگ روم میں تشریف لے چلیں گے یا کھانا یہیں منگوایا جائے؟

مسٹر شبیر: مسز ڈیوڈ اس وقت تو کھانے کی کچھ خواہش نہیں ہے ابھی تو آپ اس قدر کھلا چکی ہیں۔

مسز ڈیوڈ: تو میں جاؤں ذرا اپنی دو تین بیماروں کو دیکھ آؤں جو یہیں پڑی ہیں۔

یہ کہتی ہوئی مسز ڈیوڈ یہاں سے چلی گئیں تو مسٹر شبیر نے اُٹھ کر دروازوں کے پردے درست کر دیئے۔ پھر بیوی کو اُٹھا کر سوفے پر جا بیٹھے اور اس پری چہرہ کو شوق بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے ؎

جی چاہتا ہے صنعتِ صانع پہ ہوں نثار
تم کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں!
شکر اے خدا کہ ہجر کی مدت گذر چکی
آئی شب وصال میں حیراں ہوں کیا
کروں!

پیاری "شبیر رانی" کیا ہم یہ خواب دیکھ رہے ہیں یا عالمِ بیداری ہے۔

شبیر رانی: میرے شبیر میں خود حیران ہوں کہ یہ کیا ہو گیا۔ خدا کرے خوب نہ ہو، میرے اپنے شبیر کیا سچ مچ یہ خادمہ آج سے ہمیشہ کے لئے بالکل تمہاری ہو گئی۔ اب تو آپ کو مجھ سے کوئی نہ چھین سکے گا؟

مسٹر شبیر: ؎

دِل تری طرح کوئی فدا کر نہیں سکتا
اب مجھ کو کوئی تجھ سے جدا کر نہیں سکتا

جان شبیر یہ تو کہو اب ہم یہاں سے اُٹھیں گے کیسے؟ ہم تو آج ''چندر محل'' نہ جائیں گے اور کھانا بھی نہ کھائیں گے ؎

تم یونہیں بیٹھی رہو اور میں یونہیں دیکھا کروں

شبیر رانی: مجھے بھی علیحدہ ہونا کب گوارا ہے مگر گھر جانا تو ضروری ہے۔

مسٹر شبیر: میں سمجھا کرتا تھا کہ حسین عورت ہر حالت میں ہر وقت ہی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ آج ہی معلوم ہوا کہ ایک حسینہ جب دلہن بن جاتی ہے تو کچھ عجیب ہی دلکش اور ہوش ربا ثابت ہوتی ہے۔ بخدا ۲ بجے سے تم ایسی ملائک فریب بنی ہوئی غضب ڈھا رہی ہو کہ میں تو کیا در و دیوار نثار ہو رہے ہیں۔ میں نے قاضی افتخار صاحب اور مسٹر مشیر حسن صاحب کے سامنے نظر بھر کر دیکھا نہیں۔ اتنی دیر میں بڑی ہمت سے اپنے دل کو اور نظروں کو بچائے رہا۔ آپ مسٹر مشیر حسن صاحب کو کھانے کی دعوت دے رہی تھیں اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بیٹھ جائیں مگر انہوں نے مجھ پر رحم کیا اور چلے گئے۔

شبیر رانی: تو کیا اب آپ کھانا نہ کھائیں گے؟

مسٹر شبیر: ؎

اس گھڑی جوش جنوں ہے ترے دیوانے کو
پالیا تجھ کو نہیں چاہئے کچھ کھانے کو

شبیر رانی: خدا کا شکر ہے۔ آج آپ کو میں مطمئن حالت میں پاتی ہوں۔ ایسے خوش تو کبھی دیکھے نہیں۔

شبیر صاحب: ؎

پہلو میں ہو کے میری جو تو حور وش ہے آج
بے باک ہو کے اس لئے دل میرا خوش ہے
آج

شبیر رانی: (اُن کے شانے پر سر رکھ کر) بے شک اصلی راحت اور سچی خوشی تو آج ہی نصیب ہوئی ہے مگر پیارے یہاں کب تک بیٹھے رہیں گے۔؟ تھوڑا سا کچھ کھا لیجئے۔ چل کر آرام کیجئے۔

شبیر صاحب: یہاں سے چل کر آرام کیسا۔ آپ تو علیحدہ ہو جائیں گی اور اس وقت اگر کھانا کھانے بیٹھ جائیں تو جو تھوڑا سا وقت تنہائی کا ہے۔ وہ کھانے میں گذر جائے گا۔

شبیر رانی: لیکن گھر تو چلنا ہی ہوگا۔ میں دن کے دو بجے سے نکلی ہوئی ہوں۔ بھابی جلا رہی ہوں گی۔

شبیر صاحب: (گھڑی دیکھ کر) اونہہ۔ ابھی تو نو ہی بجے ہیں اور اگر آج یہاں رہیں تو کیا ہے۔ بھابی جان کھانا کھا کر سو رہیں گی۔ ان کے میاں صاحب تو موجود نہیں جن کا بہت خوف ہے۔

شبیر رانی: نہیں جی ابھی ہمیں وہی طریق رکھنا چاہئے جواب تک تھا۔

شبیر صاحب: تو آپ چلی جائیے۔ ہم سے تو جایا نہیں جاتا۔ یہیں پڑا رہوں گا۔

شبیر رانی: (ہنس کر طنزاً) اچھا یہ ارادہ ہے۔ شاید بسم اللہ بیگم پسند آ گئی ہو گی۔ (بسم اللہ بیگم ایک نو عمر خوبصورت بیوہ لڑکی تھی جو آگرہ سے کمپونڈری سیکھ کر آئی تھی اور اسی ہفتہ میں مسز ڈیوڈ نے اپنے یہاں اسے مقرر کر لیا تھا)۔

شبیر صاحب: جانِ شبیر مجھ پر یہ گمان ع

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

☆

تیرہواں باب

عشق کا اپنے خدائی میں فسانہ چھوڑا
ہم نے چھوڑا نہ تمہیں سارا زمانہ چھوڑا

ہریش چندر: تم جیسے شریف اور سمجھدار شخص سے ہمیں یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ ہم لوگ تمہیں اپنے عزیزوں سے زیادہ سمجھے ہوئے تھے۔ ہماری تمام محبتوں کا تمہاری طرف سے یہی بدلہ ملنا تھا؟

شبیر صاحب: یہ سب درست لیکن میں بالکل مجبور و ناچار تھا۔ چندر رانی صاحبہ سے آپ کو کچھ حالات معلوم ہوں گے۔

ہریش چندر: ہاں میں سن چکا ہوں کہ وہ احمق لڑکی جان دینے کو تیار تھی مگر تمہیں اتنا تو چاہئے تھا کہ اس کے اس نئے ارادے سے ہمیں مطلع کرتے۔ ہم اس کی شادی کی تیاریوں میں ہیں۔ انجینئر صاحب آنے والے ہیں۔ اب ان سے کیا کہا جائے اگر پہلے سے یہ معلوم ہو جاتا تو ہم لوگ یہ انتظام نہ کرتے۔

شبیر صاحب: میں تو اطلاع دے دینا چاہتا تھا مگر مجھے روکا گیا۔

ہریش چندر: (کھڑے ہو کر) اب تم کو فوراً "چندر محل" چھوڑ دینا چاہئے۔

یہ کہہ کر غصہ میں تھراتے ہوئے ہریش چندر اس کمرے سے چلے گئے اور مسٹر شبیر نے اپنا سامان درست کرنا شروع کیا۔ اب سنئے ادھر کی لیڈی مکرجی کے کمرے میں سب جمع ہو رہے ہیں۔ یہ تینوں ساس، خسر، بہو تو کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور گنہگار شبیر رانی مجرمہ کی

حیثیت سے ان کے قدموں میں بیٹھی ہیں۔ اس کے بال بھی اس وقت پیچھے کھلے پڑے ہیں کیوں کہ ڈریسنگ روم سے بلوائی گئی ہے۔ ساڑی کا آنچل فرش پر لوٹ رہا ہے۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں ہیں۔ بد بخت! سر مکرجی کا چہرہ غم و غصہ و غیرت سے سرخ ہو رہا ہے اور اسی طرح بد قسمت ماں لیڈی مکرجی رنج و غصہ سے کانپ رہی ہیں۔

سر مکرجی: "او بدکردار قبل اس کے کہ یہ روزِ بد مجھے دیکھنا نصیب ہوتا تو مرگئی ہوتی۔ خودکشی کی دھمکیاں تو دیتی رہی۔ کاش ایسا کر گذرتی جن شفیق والدین نے تجھ پر ہزاروں روپیہ خرچ کر کے انسانِ کامل بنانے کی کوشش کی۔ انہیں تو نے دنیا میں زندہ رہنے کے قابل نہ رکھا اور اس قدر دلیری کہ تبدیل مذہب کے بعد شادی تک کر لی اور ہمیں اطلاع تک نہ ہونے دی۔ چین چندر کے سامنے اس قدر ذلت نہ اُٹھانی پڑتی۔ او نابکار لڑکی ڈوب مرنا تھا اور اب بھی مرجا کہ تجھ روسیاہ سے دنیا پاک ہو جائے۔" باپ سے یہ غضبناک تقریر سن کر اس گنہگار بیٹی نے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ اس حرکت پر غصہ سے تھرا گئے اور پاؤں کھینچ لئے اور یہ کہتے ہوئے یہاں سے تشریف لے گئے کہ "ہٹ ہٹ دور ہو۔ تیرا ناپاک وجود اس قابل نہیں رہا کہ ہمیں چھونے کی جرأت کرے۔ رانی جی ابھی گھر سے نکال دو اس روسیاہ کو۔"

آہ یہ روزِ بد خدا کسی ذلیل باپ کو بھی نصیب نہ کرے۔ چہ جائیکہ سر مکرجی جیسا عالیجاہ والا تبار لیڈر قوم مشہور زمانہ باپ۔ اس وقت دنیا اُن کی نظروں میں اندھیر تھی۔ زندگی سے بیزار ہو رہے تھے۔ ان میں اپنے کمرے تک جانے کی طاقت نہ تھی۔ قدم دھرتے کہیں تھے اور پڑتا کہیں تھا۔ بمشکل تمام لائبریری تک پہنچے اور ایک آرام چوکی پر گر گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد بھاوج نے کہا۔

چندر رانی: اب جلدی تمہیں یہاں سے چلا جانا چاہئے ورنہ تمہیں دیکھ دیکھ کر سرکار جی کو سخت رنج ہوگا جس سے اُن کی صحت بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

لیڈی مکرجی: ہاں ہم کم بختوں پر رحم کر سرکار جی اس وقت بری حالت میں یہاں سے گئے ہیں۔ ان کے پاؤں نہیں اُٹھتے تھے تو نے کچھ کم غضب نہیں ڈھایا۔ بے شرم عشق کیا تھا تو کسی ہندو سے کیا ہوتا کہ کچھ پردے ڈھکے رہتے۔ دیدہ دلیری تو دیکھو کس خوبی

سے ہماری چھاتی پر مونگ دلے۔ اسی گھر میں رہ کر مذہب بدلا اور شادی تک کر لی اور گناہگار ہمارے ساتھ ساتھ رہی۔ (بہو کو دیکھ کر) کتنا عرصہ ہوا کالا منہ کیے؟

چندر رانی: چار ہفتہ غالباً اٹھائیس تاریخ نومبر تھی۔ بیرسٹر صاحب اس دن فیض آباد تشریف لے گئے تھے۔ مجھے ذرا بھی معلوم نہ ہونے پایا ورنہ آپ کو اطلاع نہ دیتی۔ ان دونوں نے اپنا وہی طریق معاشرت قائم رکھا جس سے شادی کا شبہ تک نہ ہو سکا جیسا کہ آپ اب دیکھ رہی ہیں۔

لیڈی مکرجی: بہو رانی وہ تو جو کچھ ہمارے نصیبوں میں لکھا تھا ہوا اور ہم نے دیکھا۔ اب اس وقت فکر تو یہ ہے کہ ہن چندر کو کیا منہ دکھایا جائے۔ اگر تمہارے ہی ذریعہ ہمیں اس روسیاہی کی خبر مل جاتی تو اس قدر جلدی کر کے یہاں پہنچ کر سامانِ شادی نہ پھیلاتے اب ہن چندر کے سامنے ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔

چندر رانی: بھابی جی ایشور کی قسم ہے کہ آج تک اب سے دو گھنٹہ پہلے مجھ کو بھی کچھ خبر نہ تھی جیسے ہی ان کی اطلاعی چٹھی ملی ہے۔ میں وہ لے کر فوراً آپ کے پاس حاضر ہو گئی ہوں۔

لیڈی مکرجی: (بیٹی کو دیکھ کر) ''او کمبخت آخر تو نے اتنے دن چھپائے کیوں رکھا۔ یہی چٹھی جو آج بھاوج کو دی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے ہی لکھ دیتی تو ہمیں اس بڑی مصیبت کا سامنا تو نہ ہوتا۔ اُٹھ اب دور ہو جا۔ ہماری نظروں سے اور اس بے ایمان محسن کش، احسان فراموش، مارِ آستین سمیت فوراً محل سے نکل جا (گھڑی دیکھ کر) دس بجے ہیں۔ بارہ بجے سے پہلے پہلے اپنے ناپاک وجود سے اس گھر کو پاک کر دے۔ بہو جی میں جاتی ہوں۔ خدا جانے سرکار جی کی طبیعت کیسی ہے۔ تم جاؤ اور اس دغاباز مکارہ کے ساتھ جا کر اس کا سامان دیکھ کر نکلوا دو۔ اب اس کا ذرا اعتبار نہیں رہا۔ تم صرف اس کے روزمرہ کے استعمالی زیورات و لباس تو اس کے حوالے کر دو اور سامان جہیز سے کوئی چیز نہ جانے پائے۔ اپنے سامنے اس کے بکس بستر نکلوا کر کمرہ مقفل کرا دو۔'' (لیڈی مکرجی کھڑی ہو گئیں)

اور یہ حکم دیتی ہوئی۔ لائبریری کی طرف چلی گئیں۔ چندر رانی معہ نند کے ساس کی تعمیل حکم میں مصروف ہوئیں۔

مسٹر شبیر نے اپنا کل اسباب بیرے کی مدد سے درست کر کے دو ٹھیلے اور ایک فٹن کرایہ کی منگائی۔ ادھر بیوی نے اپنا سامان درست کرلیا اور دونوں ساڑھے گیارہ بجے ''چندر محل'' سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ رنج و غم اور شرمندگی سے مسٹر شبیر کی اس وقت عجب حالت تھی۔ چہرہ زرد اور لب خشک ہو رہے تھے اور شبیر رانی کی حالت ان سے بھی بدتر تھی۔ ذلت و شرمندگی سے عرق عرق ہو رہی تھیں۔ تمام جسم لرز رہا تھا۔ مسٹر شبیر نے بیرے سے کہہ دیا تھا کہ فٹن پھاٹک پر رکھی جائے۔ دونوں وہیں جا کر سوار ہو گئے۔ شبیر رانی میں اس وقت بیٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ مسٹر شبیر نے سرہانے کشن لگا دیا اور انہیں تسلی دینے لگے۔

مسٹر شبیر: کیوں شبیر رانی طبیعت کیسی ہے۔؟

شبیر رانی: کچھ نہیں بالکل اچھی ہوں۔ اسباب وغیرہ درست کرنے میں تھک گئی ہوں۔ آپ بہت پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔

شبیر صاحب: آہ!

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن!

بہت بے آبرو ہو کر تری محفل سے ہم نکلے

اپنے پیارے شوہر سے یہ شعر سن کر شبیر رانی کو ضبط کا یارا نہ رہا اور بے اختیار رونے لگیں پھر تو یہ بہت گھبرا گئے اور سمجھانا شروع کیا۔

شبیر صاحب: ہیں ہیں۔ آپ تو اس وقت بہت بے حوصلہ ہو گئیں۔ خدا ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔ ممکن ہے پھر ملنا نصیب ہو جائے۔ لڑکیاں شادی کے بعد والدین سے الگ ہوا ہی کرتی ہیں۔

شبیر رانی: اس کا تو اتنا خیال نہیں مجھے تو یہ رنج ہے کہ میرے معزز شوہر کی آج سخت توہین ہوئی۔

شبیر صاحب: اوہ اس کا ذرا خیال نہ کرو۔ میں ان کا بڑا مجرم ہوں۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میری تو جتنی بھی ذلت و تحقیر کر کے تکلیف دی جائے کم ہے۔

شبیر رانی: آپ دیکھ رہے تھے جس وقت ہم سوار ہونے کو آ رہے تھے۔ ننھا جگدیش آیا کی گود سے ہمک ہمک کر میرے پاس آنا چاہتا تھا۔

شبیر صاحب: آپ اب ان باتوں کو نہ سوچیں۔ اپنا خیال بدل کر موجودہ مشکلات میں آسانی پیدا کرنے کی تدبیر نکالیے۔ فی الحال میں رائل ہوٹل جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچ کر جو آپ کی رائے ہوگی کیا جائے گا۔

شبیر رانی: میں ہر حالت اور ہر وقت میں آپ کی تابعدار ہوں جو مناسب ہو کیجیے۔ مجھے کچھ عذر نہ ہوگا۔

اتنے میں گاڑی ہوٹل پہنچ کر رک گئی اور یہ دونوں اترے۔ مسٹر شبیر نے منیجر سے مل کر کمرہ نمبر ۴ لے لیا۔ بیرے نے اسباب رکھوایا اور یہ دونوں جا کر آرام کرسیوں پر پڑ رہے۔ بیرا کھانا لینے چلا گیا۔

شبیر رانی: آپ منہ ہاتھ دھو ڈالیے۔ صبح سے تکلیف اٹھا رہے ہیں۔

شبیر صاحب: مجھے اپنی تکلیف کی تو پرواہ نہیں ہے۔ آپ کی بہت فکر ہے۔ غالباً اب تک کچھ کھایا بھی نہ ہوگا۔

شبیر رانی کے پھر آنسو جاری ہوئے اور شبیر صاحب اپنی کرسی سے اُٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھے۔

شبیر صاحب: میری رانی آپ تو بات بات پر رونے لگتی ہیں۔ مجھے بولنا مشکل ہو گیا ہے۔ بس اب چپ رہوں گا۔ تم خوش ہو جاؤ۔ ذرا ہنس کر تو دکھا دو میرے اپنے دل پر خدا جانے کیا گذر رہی ہے۔ آپ کی وجہ سے سنبھلا ہوا ہوں۔ ہائے مرا ہریش چندر مجھ سے کس طرح چھوٹ گیا۔ خیر ہمیں یہ رنجیدہ خیالات بھلا دینے چاہئیں۔ اٹھو منہ ہاتھ دھو ڈالو کھانا آتا ہوگا۔

گو شبیر رانی کا دل اس وقت بیٹھا جا رہا تھا مگر شوہر کی خوشی کے خیال سے کھڑی ہو گئیں اور باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھو کر بال درست کیے اور واپس آ کر شبیر صاحب کو غسلخانہ بھیجا۔ اتنے میں بیرا کھانا لے کر حاضر ہوا۔ شبیر بھی آ گئے اور دونوں نے نہایت خاموشی سے کھایا اور جب بیرا برتن وغیرہ لے کر چلا گیا تو شبیر رانی مسہری پر جا کر لیٹ رہیں اور شبیر صاحب قریب کی آرام کرسی پر لیٹ کر سگار پینے لگے۔

شبیر رانی: اب آپ کا یہاں کب تک قیام کا ارادہ ہے؟

شبیر صاحب: جب تک آپ کی رائے ہو۔ اور اگر کہیں چلنا منظور ہے تو میں بھی تیار ہوں۔

شبیر رانی: جہاں آپ کا ارادہ ہو میں حاضر ہوں۔ مسٹر مشیر حسن صاحب بھی بہت تاکید فرما گئے تھے۔

شبیر صاحب: بہت اچھا چلئے پہلے کانپور ہی ہو آئیں۔ وہاں سے گھر چلے چلیں گے۔ والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ نے جب سے اس شادی کی خبر سنی ہے۔ آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ اُن کے کئی تاکیدی خطوط آ چکے ہیں۔

شبیر رانی: بہت بہتر ایک دو روز کانپور ٹھہر کر کلکتہ چلئے۔

شبیر صاحب: میری گھڑی میز پر پڑی ہے۔ ذرا اپنی رسٹ واچ دیکھئے تو کیا وقت ہے؟

شبیر رانی: (گھڑی دیکھ کر) دو بج چکے ہیں۔

شبیر صاحب: میں ذرا سو جانا چاہتا ہوں۔ خدا جانے کیا سبب رات مجھے تین بجے تک نیند نہیں آئی۔ طرح طرح کے خیالات آتے رہے اوّل تو صبح سے سر بھاری تھا۔ اتنی رات تک جاگنے سے اور بھی طبیعت خراب ہو گئی۔

شبیر رانی: ضرور آپ تھوڑی دیر آرام کر لیجئے۔ لایئے میں سر دبا دوں۔

شبیر صاحب: مسکراتے ہوئے اُٹھے اور یہ گنگناتے ہوئے کالر ٹائی کھولنے لگے۔

میرے تو سر سے باندھ لے اپنا دوپٹہ صندلی

ان کو کپڑے اتارتے دیکھ کر شبیر رانی کھڑی ہو گئیں اور مدد دی پھر شبیر کو مسہری پر لٹا دیا اور خود کرسی پر بیٹھ کر سر دبانے لگیں۔

شبیر صاحب: (بیوی کے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر) اب بس کیجئے۔ یہ نرم و نازک ہاتھ اس قابل ہیں کہ ایسا بڑا پتھر سا سر دبا کر دکھائے جائیں؟ بس اب مجھے آرام ہو گیا۔ آپ آرام کیجئے۔

شبیر رانی نے بادل نخواستہ ہاتھ اُٹھا لئے اور آرام کرسی پر لیٹ گئیں۔ کوئی دس

منٹ بعد مسٹر شبیر نے اِن کی طرف دیکھا کہ آنکھوں پر رومال رکھے رو رہی ہیں۔ یہ بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے رومال ہٹایا اور کہنے لگے۔

شبیر صاحب: پیاری شبیر رانی آج یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ تو ایسی کم حوصلہ نہ تھیں۔ آپ کی اس حالت سے میرے دل کو سخت تکلیف ہو رہی ہے جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کا بدنصیب شبیر آپ کو دیکھ کر زیادہ بے چین ہو؟

شبیر رانی: خدا نہ کرے۔ آپ کیوں بے چین ہوتے ہیں۔ میں تو خاصی خوش ہوں۔ آپ لیٹ جایئے۔ کھڑے کیوں ہو گئے؟

شبیر صاحب: کیا خاک لیٹ جاؤں۔ آپ تو اس قدر پریشانی میں ہیں ؎

کون یہ دیکھ سکے کوئی حسیں روتا ہے

شبیر رانی: میں نہیں روتی۔ آپ خوش رہیں۔

شبیر صاحب: ہم کیوں کر یقین کریں کہ نہیں روتی ہو۔ اچھا ذرا مسکرا تو دو۔

شبیر رانی: اس وقت ہنسی نہیں آ رہی تو کیا کروں؟

شبیر صاحب: اچھا ذرا ہماری طرف تو دیکھو۔

اِن کے کہنے سے شبیر رانی نے اُن کے چہرے پر نظر کی تو انہوں نے مسکرا مسکرا کر شبیر رانی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے یہ کہا۔

ایلو وہ لب پہ آئی ہنسی
دیکھو وہ مسکراتے ہیں

☆☆☆

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KAUN, DELHI-6 (INDIA)
PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com